آجکل

اگست ۲۰۰۱ء

آجکل کی فائل سے:

ڈاکٹر امرناتھ جھا

اکبرالٰہ آبادی

سید اکبر حسین بارا ضلع الہ آباد میں ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے آباء کا ابتدائی وطن نیشاپور، ایران تھا۔ ان کے پردادا فوج میں صوبے دار تھے۔ انہوں نے جنگ پلاسی میں حصہ لیا تھا۔ ان کے دادا سید فضل محمد عالم آدمی تھے۔ انہیں اودھ کے نواب آصف الدولہ سے جاگیر ملی تھی۔ ان کے والد سید تفضل حسین نے نائب تحصیل داری تک ترقی حاصل کی اور ۱۸۸۸ء میں وفات پائی۔ ان کی والدہ صوبہ بہار کے ضلع گیا کی رہنے والی تھیں۔

اس عہد کے طبقہ وسطیٰ کے نمائندہ گھرانے کے نوجوانوں کی طرح اکبر نے فارسی اور عربی پڑھی۔ لیکن وہ انگریزی کی جانب بھی کھنچے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب شروع شروع انگریزی تعلیم ہندوستان میں رواج پانے لگی تو من حیث الجماعت مسلمانوں نے نئے اسکولوں سے کنارہ کشی اختیار کی تا آنکہ سر سید احمد خاں سامنے آئے اور ان کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ انگریزی تعلیم کے فائدوں سے متمتع ہوں گے۔

۱۸۶۷ء میں وہ نائب تحصیل دار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں انہوں نے پلیڈری کا آخری امتحان پاس کیا اور کچھ عرصے تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۶۷ء میں وہ ملازمت عدلیہ میں منصف کی حیثیت سے لئے گئے۔ وہ ترقی کرکے ضلع جج بنے اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر الہ آباد میں بس گئے۔ 'عشرت منزل' میں رہتے تھے۔ انہوں نے ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اکبر کی تدفین خسرو باغ کے قریب کالا ڈنڈا میں ہوئی تھی۔ ان کے مقبرے پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ ہیں:

قبر میں آئی تجلی روئے جاناں کی مجھے
زہر سمجھے تھے جسے وہ شربتِ دیدار تھا

کلیاتِ اکبر کی تین جلدیں ان کی زندگی میں چھپی تھیں۔ چوتھی جلد ۱۹۴۸ء میں کراچی میں چھپی۔ ان کے علاوہ اقبال اور اکبر کے خطوں کا ایک مجموعہ، نیز 'عورت نامہ' اور 'گاندھی نامہ' ہیں۔ اکبر پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سب سے مفصل سید طالب علی کی کتاب ہے۔ علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر میں قیمتی تنقیدی اور سوانحی مواد خاصا مل جاتا ہے۔ چند دلچسپ خطوط اور حکایتیں پدم سنگھ شرما کی "پدم پراگ" میں دستیاب ہوتی ہیں۔ اکبر کے متعلق تازہ ترین کتاب "ونود اور وینگ" ہے۔ اس میں شری پارس ناتھ سنہا نے اکبر کے سبھی مشہور اشعار کو جمع کردیا ہے۔ مناسب نوٹ بھی دئے ہیں۔ ترتیب مضامین کے لحاظ سے کی گئی ہے اور ایک باخبر تفصیلی مقدمہ بھی شامل ہے جس میں ہمدردانہ سمجھ بوجھ کی بھلی سی تنقید کلام ہے۔

شخصی لحاظ سے اکبر اتنے ہی دلچسپ تھے جتنے وہ شاعر کی حیثیت سے تھے۔ ان کی صحبت میں بے کیفی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہایت دلنواز اور جوش آفریں گفتگو کرنے والے تھے۔ لطیفے پر لطیفے سنائے جاتے۔ اشخاص و واقعات کے متعلق عیارانہ اشارات کئے جاتے۔ یادِ ایام کی باتیں ہوتی تھیں۔ چٹکلے، زندگی بداماں کہاوتیں، اقوال اور فی البدیہہ اشعار پیش کئے جاتے تھے۔ ان کی گفتگو شراب و کباب کی طرح کی ہوتی تھی، نشہ خیز اور مقوی۔ مجھے کئی بار انہیں دیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔ لیکن میں صرف ایک بار دو محترم دوستوں کے ساتھ ان سے ملنے ان کے گھر پر حاضر ہوا۔ افسوس! یہ دونوں حضرات مسٹر کچلو اور مولوی نصیر انتقال فرماچکے۔ وہ ہم سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ وہ اپنے بیٹے عشرت سے ملنے حال ہی میں پرتاب گڑھ گئے تھے۔ اس ملاقات کا مفصل طور پر ذکر کرتے رہے اور ہم لوگوں کو ایک گھنٹہ تک اپنی باتوں سے مسحور کئے رکھا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری سال میں تھے۔ لیکن ان کی گفتگو کی جانداری اور ولولہ سے ان کے آنے والے انجام کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ ہم نے پوچھا کہ پرتاب گڑھ کے لوگوں نے آپ کا دھوم دھام سے خیر مقدم کیا ہوگا۔ جواب ملا۔ "ایک دفعہ خدا نے شہر لنڈن کی سیر کی۔ دن بھر وہ سرگرداں رہے۔ گلی گلی کی خاک چھانی۔ دربدر دستک دیتے پھرے۔ لیکن ہر جگہ وہ دھکے دے کر نکال دئے گئے۔ کسی نے پانی بھی انہیں پینے کو نہ دیا۔ تھکے ہوئے اور بھوکے آخرش وہ ایک مکان پر پہنچے اور لوگوں کو بتلایا کہ وہ خدا ہیں۔ پھر انہوں نے ایک گلاس پینے کو پانی مانگا۔ لیکن یہ بات رد کر دی گئی۔ پھر وہ اِدھر اُدھر بھٹکنے پر مجبور ہوئے۔ تھکے ہارے وہ ایک اور مکان میں جا داخل ہوئے۔ انہیں شدت سے پیاس لگی ہوئی تھی۔ فرمایا — مجھے تھوڑا پانی پلاؤ۔ میں یسوع مسیح کا باپ ہوں۔ یہ سن کر گھر کے مالک نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور خاطر تواضع کی بارش سے انہیں ششدر کر دیا۔ بھائی! پرتاب گڑھ میں کسی نے اکبر کی طرف پھوٹی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا لیکن ڈپٹی صاحب کے والد کی بڑی قدر ہوئی۔" یہ ہماری اکبر الہ آبادی سے گفتگو کا محض ایک ٹکڑا تھا جو میرے حافظے میں باقی رہ گیا۔ اسی وقت انہوں نے ایک شعر کہا اور ہمیں سنایا۔ ملاحظہ ہو:

میں کسی چیز کا نہیں عادی
ایک عادت ہے سانس لینے کی

ایک دفعہ کوئی نوجوان شاعر ان سے ملنے گئے۔ فرمایا:

تحفۂ شب برات کیا بھیجوں؟
تم تو اے جان خود پٹاخہ ہو

اکبر نے روایتی انداز میں بہتیری غزلیں لکھیں جن میں اردو دنیا کے معروف عشقیہ تجربے پیش کئے گئے ہیں۔ آرزوئے ناکام، گریز محبوب، رقیب پر مہربانیاں، پروانے کا شمع سے لگاؤ۔ بہار میں قید قفس کی سختیاں، غم دوراں سے نجات کے لیے ساقی کی نوازشیں، حسن کافر اور مسجد کی خانہ ویرانی، واعظ کی حماقتیں، وغیرہ وغیرہ غرض یہ کہ یہی گھسے پٹے ہوئے استعارات اور علامتیں، جنہیں ہر پشت میں نئی زندگی مل جاتی ہے، اکبر نے بھی برتی ہیں۔ مثلاً جس نے اکبر کی صرف تفریحی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کو اکبر کی کاوش کا نتیجہ تسلیم نہیں کرے گا۔

جو ذبح کرنا ہے پر کھول دے مرے صیاد
کہ رہ نہ جائے تڑپنے کی آرزو باقی

ذیل میں چند اور اشعار درج ہیں جن میں تغزل کا رنگ نمایاں ہے:

نگاہ ناز سے تم نے اگر دیکھا نہیں مجھ کو
تو پھر میں کیوں تڑپتا ہوں نہ زخمی ہوں نہ بسمل ہوں

ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل اردو

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمٰن فاروقی
فون: 3386994

اسسٹنٹ ایڈیٹر
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر
محمد کاظم

جلد: ۶۰ شمارہ: ۱
اگست ۲۰۰۱ء ساون بھادوں شک ۱۹۲۳

سرورق: وگیان ورت
بیک کور: الکانائز
کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ سی آہوجہ

فی شمارہ: سات روپے — سالانہ: ۷۰/روپے
دو سال: ۱۳۵/روپے — تین سال: ۱۹۰/روپے
امریکہ، یورپ اور دوسرے ممالک کیلئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۰۰/روپے سالانہ
پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۵۰۰/روپے سالانہ

خریداری اور اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر، ڈائریکٹر، پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتہ پر بھیجیں
سرکولیشن منیجر 'آجکل' ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر کے پورم نئی دہلی۔۶۶
رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتوں کیلئے بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱

ترتیب

گوپی چند نارنگ



زبان کے ساتھ
کبیر کا جادوئی برتاؤ

کبیر کا درجہ ہندی کے سنت کویوں میں بہت اونچا ہے۔ ان کی پیدائش سمت ۱۴۵۵ بکرمی (۱۳۹۸ء) کی بتائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پوری پندرہویں صدی اور کچھ بعد تک زندہ رہے۔ وہ کاشی میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے کی پوربی یعنی اودھی اور بھوجپوری کا قدیم روپ جیسا اس وقت کاشی اور اس کے نواح میں بولا جاتا ہوگا، وہی کبیر کے بچپن کی زبان رہا ہوگا۔ لیکن چونکہ وہ زندگی بھر جوگیوں، سادھوؤں، سدھوں اور فقیروں کے ساتھ جگہ جگہ گھومتے رہے، اس زمانے کی عوامی زبان بھی ان کی زبان پر چڑھ گئی ہوگی۔ ان کی شاعری، شاعری کے لیے تھی ہی نہیں، بلکہ عام لوگوں تک اپنا روحانی پیغام پہنچانے کا وسیلہ تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں جو بولی یا بھاشا عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہوگی، کبیر نے کاشی کی بولی کے علاوہ اس کا اثر بھی قبول کیا ہوگا۔ اسی لیے کبیر کی بھاشا ملی جلی بھاشا ہے۔ اس میں پوربی کا پُٹ تو ہے ہی، کھڑی کا انداز بھی ہے جس نے ان کی شاعری کی قبولیت میں خاص کردار ادا کیا اور کبیر کے بول ملک کے طول و عرض میں ہر دل کی دھڑکن بن گئے۔

کھڑی بولی کی پرانی مستند تاریخ نہ ہونے کے برابر ہے۔ کھڑی کے قدیم نمونے نایاب ہیں۔ کھڑی کی جو بھی قدیم تاریخ قائم کی جاتی ہے، وہ زیادہ تر بالواسطہ اور قیاسی ہے جب کہ کھڑی کے مقابلے میں برج، اودھی یا راجستھانی کی قدیم تاریخ دستاویزی طور پر آسانی سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ امیر خسرو کا زمانہ (۱۲۵۳-۱۳۲۵) کبیر سے لگ بھگ ایک صدی پہلے کا ہے۔ کھڑی کے نقاش اول امیر خسرو ہیں۔ وہ ریختہ اور ہندوی کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام کی بنیاد کھڑی پر ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ کلام انہوں نے تفریحاً کہا یا دوستوں کے تفنن طبع کے لیے کہا، اصل شاعر تو وہ فارسی کے تھے اور ان کی عظمت کی بنیاد ان کی فارسی شاعری ہے، جب کہ کبیر کی عظمت کی بنیاد ان کی یہی ملی جلی نوزائیدہ زبان کی شاعری ہے۔ وہ بولی جس کو دوسروں نے تفریحاً منہ لگایا یا جس سے عارضی طور پر کام لیا، یا جو اس وقت ان گھڑ، ناپختہ، اور خام حالت میں تھی، یا گیلی مٹی کی طرح تھی، کبیر نے اسی ملی جلی، ان گھڑ، گری پڑی، ناپختہ زبان سے وسیع پیمانے پر کام لیا، حتیٰ کہ یہ ان کی شاعری کی عظمت کی بنیاد بن گئی۔ یہ معلوم ہے کہ کبیر کی شاعری کا تانا بانا اسی ناپختہ، معمولی اور خام زبان سے بُنا گیا ہے۔

کبیر اور اس عہد کے دوسرے بڑے شاعروں میں ایک فرق اور بھی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اس زمانے کے صوفیا اور مشائخ میں علمی روایت نہایت وقیع تھی اور صوفیا میں جتنے بھی شعرا ہوئے ان میں اکثر فارسی کی کلاسیکی شعریات سے کماحقہ واقف تھے اور اس کے امین تھے۔ یہی کیفیت ہندی کے بڑے شاعروں کی ہے جو سب کے سب کبیر کے بعد آئے، نیز ان میں سے کسی کی زبان کھڑی بولی نہیں ہے، مثلاً سورداس (۱۴۷۸-۱۵۸۰) اور رس کھان (۱۵۴۰-۱۶۳۰) برج کے شاعر تھے، ملک محمد جائسی (۱۴۷۷-۱۵۴۲) اور تلسی داس (۱۵۳۲-۱۶۲۳) اودھی کے شاعر تھے، اور یہ بولیاں سنسکرت میں رچی بسی تھیں جب کہ کھڑی ابھی بن رہی تھی۔ ان عالم شعرا کے مقابلے میں سنت کوی زیادہ تر اَن پڑھ تھے۔ کبیر نے نہ خود کو کبھی شاعر سمجھا نہ کبھی شاعری کا دعویٰ کیا۔ ان کی شاعری ان کے اندر کی آگ تھی، ذات پات کی تفریق، برہمنیت کی اجارہ داری یا فرقہ واریت کے خلاف ایک نعرۂ جنگ۔ چنانچہ سنسکرت کی کلاسیکی شعریات سے اس کے رشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ اگر کوئی رشتہ ہو سکتا تھا تو وہ انحراف اور بغاوت کا تھا جس نے کلاسکیت کے status quo کے ہر آثار کو ٹھکرا دیا تھا، لسانی آثار کو بھی اور شعری آثار کو بھی۔ کیونکہ پہلے کی شعریات کو ماننا زبان کو ماننا تھا اور زبان کو ماننا اس نظام کو ماننا تھا جس کے جبر کے خلاف یہ شاعری ایک نعرۂ جنگ تھی۔ خیال رہے کہ پندرہویں صدی کے صوفیا اور سنت کویوں میں کسی دوسرے نے اس ان گھڑ اور ناپختہ زبان کو اس وسیع پیمانے پر نہیں برتا جس وسیع پیمانے پر کبیر نے اسے برتا اور نتیجتاً اسے قبول عام پر فائز کر کے اسے سب کی زبان بنا دیا۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ کبیر کے شعری سفر کے دوران رفتہ رفتہ ایک نئی شعری زبان وجود میں آ گئی اور نیا شعری محاورہ اور روزمرہ بنتا چلا گیا، نیز کلاسیکی شعریات سے ہٹ کر ایک الگ عوامی شعریات کی بنیاد بھی پڑ گئی، تو غلط نہ ہوگا۔

سردست ہمارا مسئلہ اس نکتے پر غور کرنا ہے کہ کبیر کے زمانے میں "ہندی" یا "اردو" یا "ہندوستانی" نام کی زبانیں تو نہیں تھیں، فقط بولیاں تھیں، یا یہی کچی پکی،

ڈی ۲۵۲ سرودیا انکلیو، نئی دہلی۔۱۱۰۰۱۷

ناپختہ، ان گھڑ کھڑی بولی جو ابتدائی حالت میں تھی۔ لیوائی سڑاس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ زبان کیسی بھی ابتدائی حالت میں کیوں نہ ہو، بنیادی جذبات کو ادا کرنے کے لیے مکمل ہوتی ہے۔ سو تو ٹھیک ہے، کبیر کی بھاشا میں دھرتی کا جو نمک اور جڑوں کی جو طاقت ہے وہ تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے ایسے سیکڑوں ہزاروں مصرعوں اور بند شوں پر جو نہایت پختہ ہیں اور جن میں اقوال کا ایجاز اور کہاوت کی طاقت ہے۔ اگر اس وقت کی "ان گھڑ" زبان میں یہ سب کچھ تھا جسے کبیر نے برتا تو پھر وہ زبان "ان گھڑ" کیونکر تھی؟ یا اگر واقعی اس وقت کی زبان اتنی ہی ترقی یافتہ تھی تو پھر کبیر کے علاوہ دوسروں کے یہاں اس کی یہ شان کیوں نظر نہیں آتی۔ ایک دو صدی آگے پیچھے تک اگر کبیر ہی اکیلا ایسا شاعر ہے جس کے یہاں معمولی زبان اپنے اس غیر معمولی پن کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے تو پھر اس کا credit کسی اور چیز کو نہیں بلکہ کبیر اور فقط کبیر کے اختراعی ذہن اور اس کی تخلیقیت کو دینا پڑے گا۔ (واضح رہے کہ شعری تخلیق کے ساتھ ساتھ یہ زبان کو خلق کرنے کا عمل ہے، محض رائج محاوروں کو نظم کر دینے کا عمل نہیں۔)

کہاوتیں ہوں، اقوال یا امثال دراصل زبان کے fossils ہیں، یا زبان کی archeology ہیں جن کے گرد زبان کے معیار یا عوامی دانش کی تہیں تاریخی طور پر چڑھتی رہتی ہیں۔ یہ زبان کا core یا بنیادی حصہ ہیں جو کثرت استعمال سے وجود میں آتا ہے۔ کبیر کی زبان نوزائیدہ تھی، یعنی اس کی تاریخ تھی ہی نہیں، لیکن تعجب ہے کہ یہی عنصر یعنی قول اور کہاوت کی طاقت رکھنے والا عنصر جو اصولاً قدیمی عنصر ہونا چاہیے، کبیر کے یہاں خاصا نمایاں ہے۔ حیرت ہے کہ ایک ناپختہ، ان گھڑ، نوزائیدہ زبان میں یہ امثالی اور کہاوتی کیفیت کس طرح سے پیدا ہو گئی کہ زبان چلتا ہوا جادو بن گئی۔ اس مسئلہ پر کبیر کے ماہرین نے ضرور غور کیا ہوگا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس کا کوئی آسان جواب ممکن نہیں ہے۔ ذرا ان دوہوں کو دیکھئے (متن "کبیر وچناولی" پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیائے ہری اودھ کی معتبر کتاب، مطبوعہ ناگری پرچارنی سبھا، کاشی، سمت ۲۰۰۳ سے لیا گیا ہے)

جاکو راکھے سائیاں مار سکے نہیں کوئے
بال نہ بانکا کر سکے جو جگ بیری ہوئے

لوٹ سکے تو لوٹ لے ست نام کی لوٹ
پاچھے پھر پچھتائیں گے پران جانہہ جب چھوٹ

یہ تو گھر ہے پریم کا خالہ کا گھر نانہہ
سیس اتارے بھوئیں دھرے تب پیٹھے گھر مانہہ

جب میں تھا تب گورو نہیں اب گورو ہیں ہم نانہہ
پریم گلی ات سانکری تا میں دودھ نہ سمانہہ

جن ڈھونڈھا تن پائیا گہرے پانی پیٹھ
میں بپرا ڈوبن ڈرا رہا کنارے بیٹھ

ست نام کڑوا لگے میٹھا لاگے دام
دبدھا میں دوو گئے مایا ملی نہ رام

رات گنوائی سوئی کے دوس گنوایا کھائے
ہیرا جنم امول تھا کوڑی بدلے جائے

آچھے دن پاچھے گئے گورو سے کیا نہ ہیت
اب پچھتاوا کیا کرے چڑیاں چگ گئیں کھیت

کالہہ کرے سو آج کر آج کرے سو اب
پل میں پرلے ہوئے گی بہر کرے گا کب

کبیر کے یہ دوہے زبان زد خاص و عام ہیں۔ یہ ہمارے اجتماعی حافظے کا حصہ ہیں اور عوامی لاشعور میں اس قدر رچے بسے ہوئے ہیں کہ ہم سرسری ان سے گزر جاتے ہیں اور بالعموم غور ہی نہیں کرتے کہ کس طرح ہماری زبان کی صدیوں کا سنگیت کبیر کی زبان کی تہوں میں سمویا ہوا ہے۔ سو سوالوں کا سوال یہی ہے کہ پندرہویں صدی میں جب زبان ان گھڑ اور ناپختہ تھی، اس میں امثال کی چستی اور کہاوت کی طاقت کہاں سے پیدا ہو گئی؟ امثالی انداز بیان زبان کے صدیوں کے چلن کی پختگی کا مظہر ہوتا ہے اور کہاوتیں صدیوں کے انسانی تجربے کا نچوڑ ہوتی ہیں اور زبان کے متمول اور ترقی یافتہ ہونے کی نشانی ہیں۔ لیکن ایک نوزائیدہ ان گھڑ ناپختہ زبان میں ان کا ظہور اور وسیع پیمانے پر استعمال کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شاعری اندر کی آگ ہے لیکن اس آگ کو سماج یا قاری کے دل میں دہکانے کے لیے واحد حربہ تو زبان ہی ہے اور اگر زبان ہی ان گھڑ اور ناپختہ ہو تو شاعری جادو کیسے بن سکتی ہے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ یہی معمولی زبان کبیر کے یہاں غیر معمولی بن جاتی ہے اور شاعری معنی کا چراغاں کرتی ہے۔ ایک امکان یہ ہے کہ یہ امثال اور کہاوتیں بولیوں میں پہلے سے موجود تھیں، کبیر نے اپنی شاعری میں ان سے کام لیا، یا اس کے برعکس کبیر کی تخلیقی آگ ایسی تھی کہ اس نے معمولی شبدوں میں روح پھونک دی یا کبیر کی تخلیقی تپش نے لفظوں کو پگھلا دیا اور ان میں ایسی تاثیر اور دردمندی بھر دی کہ عوامی مقبولیت اور استعمال عام کے باعث صدیوں کے چلن میں زبانوں پر چڑھ کر ان اظہاریوں کا درجہ اقوال اور ضرب الامثال کا ہو گیا۔

اوپر مثالوں میں پہلے دوہے میں مصرعے پیوست ہیں۔ پہلے مصرعے میں بیان ہے / جاکو راکھے سائیاں مار سکے نہیں کوئے / دوسرے حصے میں ثبوت یا مزید وضاحت کہ / بال نہ بانکا کر سکے جو جگ بیری ہوئے /۔ پورا دوہا بطور قول / کہاوت استعمال ہوتا ہے۔ بال بیکا (یا بانکا) نہ ہونا عام محاورہ بھی ہے جو زبان میں راسخ ہو چکا ہے۔ دوسرے دوہے کا دوسرا مصرع / پاچھے پھر پچھتائیں گے پران جانہہ جب چھوٹ / بھی بطور ضرب المثل رائج ہے۔ کہاوت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ انسانی تجربے اور دانش کا پارہ ہوتی ہے اور اپنے اصل متن سے الگ ہو کر بھی ان گنت تناظر میں برتی جا سکتی ہے اور ہر موقع پر تناظر کے اعتبار سے اس میں معنی کی نئی شان

پیدا ہوتی ہے۔ گویا یہ ایسی گولی ہے جس کا بارود ختم نہیں ہوتا۔ تیسرے دوہے کے دوسرے حصے / سیس اتارے بھو میں دھرے تب پیٹھے گھر ماںہہ / میں زبردست تمثال ہے۔ لیکن پہلے مصرع / یہ تو گھر ہے پریم کا خالہ کا گھر نانہہ / سے سوال اٹھتا ہے کہ / خالہ / تو فارسی کا لفظ ہے یعنی ماں کی بہن، لیکن نہ تو قدیم فارسی میں / خانۂ خالہ / کوئی محاورہ تھا نہ قدیم ہندی بولیوں میں ایسا ہو سکتا ہے، اس لیے کہ لفظ / خالہ / ہندی الاصل ہے ہی نہیں۔ لفظ / خالہ / مسلمانوں کے آنے کے بعد ہی ہندی بولیوں میں رائج ہوا ہوگا۔ لیکن / خالہ / سے / خالہ کا گھر / (عیش و آرام کی جگہ کے معنی میں) کب بنایا کب رائج ہوا؟ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ محاوروں / کہاوتوں کی اصل تاریخی دھندلکے میں ہوتی ہے۔ (فارسی کے بڑے لغت Steingass میں 'خانۂ خالہ' کا ذکر نہیں ہے، Platts اس کو ہندی ترکیب بتاتا ہے) ظاہر ہے کہ کبیر نے ان معمولی اظہاریوں کو کچھ اس خوبی سے برتا اور زبان میں ایسا پرویا کہ انہیں ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا اور نہ صرف قائم کر دیا بلکہ بطور محاورہ imprint کر دیا۔ زبان بنتی تو چلن سے ہے، لیکن بڑا شاعر ایسے پیرایے وضع کرتا ہے جو چلن پاکر زبان کا زیور بن جاتے ہیں۔ غالب کو بھی بارہا اس مرحلہ سے گزرنا پڑا ورنہ کیوں کہتے کہ آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔ کبیر کے یہاں معمولی شبدوں کے پھیلنے اور غیر معمولی اظہار بننے کا یہ عمل خاصا نمایاں ہے۔ ایسی کوئی نہ کوئی نشانی ہر جگہ نظر آجاتی ہے خاص طور پر اوپر کی مثالوں میں ذیل کے ٹکڑے توجہ طلب ہیں:

ع: پریم گلی ات سانکری تا میں دو دھ نہ سماہیہ

ع: جن ڈھونڈھا تن پائیا

ع: دبدھا میں دو دو گئے مایا ملی نہ رام

ع: ہیرا جنم امول تھا کوڑی بدلے جائے

ع: اب پچھتاوا کیا کرے چڑیاں چگ گئیں کھیت

ع: کال کرے سو آج کر آج کرے سو اب

یہ اور ان جیسے سیکڑوں اقوال کا درجہ اب ضرب الامثال کا ہے جو بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں اور quote کیے جاتے ہیں۔ یہ زبان کے بے ساختہ اظہار کا حصہ ہیں۔ صرف اتنا نہیں بعض دوہے تو پورے کے پورے اجتماعی حافظے میں رچ بس گئے ہیں اور زبان کے خون میں شامل ہیں، جیسے:

جیوں تل ماںہیں تیل ہے جیو چقمق میں آگ
تیرا سائیں تجھ میں جاگ سکے تو جاگ

ہم گھر جارا آپنا لیا مُراڑا ہاتھ
اب گھر جاروں تاس کا جو چلے ہمارے ساتھ

کانکر پھاتر جوڑ کے مسجد دئی بنائے
چڑھ ملا بانگ دے کی بہرا ہوئی خدائے

چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے
دوے پٹ بھیتر آئے کے ثابت گیا نہ کوئے

دکھ میں سُمرن سب کریں سکھ میں کرے نہ کوئے
جو سکھ میں سُمرن کرے تو دکھ کاہے کو ہوئے

کبیر کے یہاں قول بانی یا کہاوت سازی کی یہ کیفیت خاصی عام ہے۔ لگتا ہے کبیر کے تخلیقی ذہن کو قول سازی یا کہاوت وضعی سے خاص مناسبت تھی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کبیر چونکہ کوئی پیشہ ور شاعر نہیں تھے، شاعری کی زبان یا اس کی سا کے تئیں ان کا جو بھی رویہ رہا ہوگا وہ شعوری سے زیادہ لاشعوری ہوگا۔ کبیر سامنے لفظوں کو لڑی میں پروتے ہیں اور ایسی بظاہر سادہ لیکن گہری، شعری منطق سے لیتے ہیں کہ 'کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے' کے مصداق کبیر کی بات سیدھی میں اتر جاتی ہے۔ کبیر کی دیہاتی منطق میں کوئی اینچ پینچ نہیں، یہ چونکہ صدیوں کی دا میں رچی بسی ہے، زبانوں پر چڑھ جاتی ہے اور جو چیز زبانوں پر چڑھ جاتی ہو اس ضرب المثل کی کیفیت پیدا ہو جانا قرین قیاس ہے۔ کچھ اور مثالیں دیکھیے:

مانی کہے کمہار سے تو کا روندھے موئے
اک دن ایسا ہوئے گا میں روندھوں گی توئے

درلبھ مانس جنم ہے دیہہ نہ بارم بار
تردوَر جیوں پتا جھرے بہُر نہ لاگے ڈار

پات جھرنتا یوں کہے سن تردوَر بن رائے
اب کے بچھڑے نا ملیں دور پریں گے جائے

ساتھی ہمرے چل گئے ہم بھی چالن ہار
کاگد میں باقی رہے تاتے لاگی بار

کبرا آپ ٹھگائیے اور نہ ٹھگیے کوئے
آپ ٹھگا سکھ ہوت ہے اور ٹھگا دکھ ہوئے

ہستی چڑھیے گیان کی سہج دلیچا ڈار
سوان (کتا) روپ سنسار ہے بھوسن رہے جھک مار

باجن دیہو جنتری کل ککہی مت چھیڑ
تجھے پرائی کیا پڑی اپنی آپ نبیڑ

جیسا ان جل کھائیے تیسا ہی من ہوئے
جیسا پانی پیجیے تیسی بانی ہوئے

مانگن مرن سمان ہے مت کوئی مانگو بھیک
مانگن تیں مرنا بھلا یہ ستگورو کی سیکھ

پڑھ پڑھ کے پتھر بھئے لکھ لکھ بھئے جو اینٹ
کبرا انتر پریم کی لاگی نیک نہ چھینٹ

کرتا تھا تو کیوں رہا اب کاہے پچھتائے
بووے پیڑ ببول کا آم کہاں سے کھائے

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت ہوا نہ کوئے
ایکے اچھر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

بڑا ہوا تو کیا ہوا جیسے پیڑ کھجور
پنچھی کو چھایا نہیں پھل لاگے ات دور

مورکھ کو سمجھاوتے گیان گانٹھ کو جائے
کوئلہ ہوے نہ اوجرو سو من صابن کھائے

روکھا سوکھا کھائے کے ٹھنڈا پانی پیو
دیکھ پرائی چوپڑی مت للچاوے جیو

ان اشعار میں بہت سے ٹکڑے ایسے ہیں جو عام بول چال کا حصہ بن گئے ہیں اور صدیوں سے نہ صرف بطور اقوال quote ہوتے ہیں بلکہ اظہار کی قوت بڑھانے کے لیے خود بخود زبان پر آجاتے ہیں اور ان سے نکتہ آفرینی کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ مثلاً

ع: ماٹی کہے کمہار سے تو کا رَوندھے موئے

ع: ترووَر جیوں پتا جھرے بہر نہ لاگے ڈار

ع: دوے پٹ بھیتر آئے کے ثابت گیا نہ کوئے

ع: اب کے بچھڑے نا ملیں دور پریں گے جائے

ع: سوان روپ سنسار ہے بھوسن دے جھک مار

ع: تجھے پرائی کیا پڑی اپنی آپ نبیڑ

ع: مانگن مرن سمان ہے /یا/ مانگن تیں مرنا بھلا

ع: پڑھ پڑھ کے پتھر ہونا

ع: بووے پیڑ ببول کا آم کہاں سے کھائے

ع: ایکے اچھر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

ع: بڑا ہوا تو کیا ہوا......

ع: کوئلہ ہوئے نہ اوجرو سو من صابن کھائے

ع: دیکھ پرائی چوپڑی مت للچاوے جیو

صاف ظاہر ہے کہ ان سب اظہاریوں میں یا تو تمام و کمال ضرب الامثال کی شان ہے یا ایسی نکتہ آفرینی ہے جو زبان میں کثرت استعمال سے کہاوت، قول یا محاورہ بن جاتی ہے۔ ایسی مثالیں کبیر کے کلام میں ان گنت ہیں اور پوری شاعری میں دور دور تک بکھری ہوئی ہیں۔

کبیر کے کلام کی اس خوبی کے بارے میں حیران کن سوال یہی ہے کہ کیا ایسے اجزا کو کبیر نے اپنے زمانے کی رائج بولیوں یا زبان سے لیا اور اپنی شاعری کی تاثیر سے انہیں رائج کر دیا، یا یہ کہ کبیر سے پہلے تو زبان ان گھڑ اور خام تھی، یہ کبیر کی تخلیقیت کا اعجاز ہے کہ کبیر کے سوز دروں سے تپ کر خام زبان کندن بن گئی اور اس کا معمولی پن غیر معمولی پن میں یا اس کی سادگی پرکاری میں بدل گئی اور وہی ان گھڑ اور خام زبان محاورے اور روزمرہ میں رواں ہو کر ضرب الامثال کی طرح دمکنے لگی۔ دیکھا جائے تو کبیر کی شاعری اس مفروضے کو توڑتی ہے کہ شاعری زبان سے ہے، زبان شاعری سے نہیں۔ کبیر سے پہلے یہ ان گھڑ ملواں زبان یا کھڑی بولی شاعری کی زبان کہاں تھی؟ کبیر نے اسے اپنی مسیحا نفسی سے شعری درجے پر فائز کر دیا۔ کیا یہ حیران کن paradox نہیں کہ "کچی" زبان میں "پکا" یا بڑا شاعر ہو سکتا ہے؟ کیا زبان شاعری کو خلق کرتی ہے یا شاعری زبان کو خلق کرتی ہے؟ یعنی زبان مقدم ہے یا شاعری؟ یا یہ کہ زبان ہی تو شاعری ہے، زبان نہیں تو شاعری نہیں؟ کبیر کی شاعری کا بڑا کمال یہی ہے کہ وہ شعری زبان کے ان پہلے سے چلے آرہے تمام مفروضوں کو القط کرتی ہے اور نہ صرف نئے امثالی اظہارات کو وضع کرتی ہے بلکہ انہیں کھڑی بولی کی archeology کا ہمیشہ رہنے والا، جیتا جاگتا حصہ بھی بنا دیتی ہے۔ یہ کبیر کے تخلیقی ذہن کا کرشمہ نہیں تو کیا ہے کہ اس نے اظہار کے ان پیرایوں کو زبان میں نقش کر دیا اور ایک خام اور فرومایہ زبان کو اپنی دلسوزی اور جادو بیانی سے لاکھوں کروڑوں لوگوں کے دل کی دھڑکن بنا کے عوامی چلن کی ایسی زبان بنا دیا جو صدیوں سے زندہ ہے اور آج ہندستان کی قومی زندگی کا کوئی تصور اس کے بغیر مکمل نہیں۔

ایک آخری بات اور۔ کبیر کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ اپنا سارا مسالا روزمرہ کی زندگی سے لیتے ہیں، یعنی کمہار، دھوبی، بنکر، لوہار وغیرہ پیشوں یا سامنے کی دیہاتی زندگی سے جس سے ان کا واسطہ پڑتا تھا۔ ان کی تمثالیں، تشبیہیں، استعارے، امیجری سب کی سب گاؤں دیہات قصبات کی زندگی سے ہیں۔ ان کی شعری منطق کے سگنیفائر بھی انہیں سرچشموں اور جڑوں سے آتے ہیں۔ لیکن پدوں اور ساکھیوں میں جہاں ان کی زبان قدرے مختلف ہے، انہوں نے ویدوں اور اپنشدوں سے چلی آرہی قدیمی انکاری جدلیات کو بھی برتا ہے۔ سالک یا صوفی کا سب سے بڑا مسئلہ اس شعور کلی یا حقیقت مطلقہ کا شعور قائم کرنا یا اسے لفظوں میں بیان کرنا ہے جو صفات و تعینات سے ماورا ہے۔ حقیقت مطلقہ یا نراکار کی تعریف کرنا گویا اس کی وحدت کو دوئی میں بدلنا ہے جو اس کی شان کے منافی ہے۔ زبان میں دوئی لازم ہے کیونکہ زبان موضوع اور معروض کی تابع ہے اور حقیقت مطلقہ جو زبان کے ورا الورا ہے، زبان میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اپنشدوں نے اس کے لیے انکار در انکار کی راہ اپنائی ہے جسے بعد میں بودھی مفکر ناگار جن نے شونیتا کے ذریعے مزید استحکام بخشا۔ روحانی تجربے کو بیان کرنے یا ذات مطلقہ کی توصیف کرنے کے لیے جوگیوں سنتوں اور فقیروں نے اکثر Language of Unsaying کا سہارا لیا ہے جسے Apophasis بھی کہا جاتا ہے۔ کبیر اپنے پدوں میں اکثر اس Language of Unsaying کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے ٹکڑے شعری طور پر نہایت کیف آور اور پرتاثیر ہیں۔ ان میں زبان کی حدود اور جکڑ بندی کو ٹھکراتے ہوئے ایسی وحدت مطلقہ پر اصرار ہے جو زبان و بیان سے ورا الورا ہے اور جس کے حضور زبان بے بس محض ہے۔ میں صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

سکھیاں وا گھر سب سے نیارا جنہ پورن پُرکھ ہمارا
جہں نہ سکھ دکھ سانچ جھوٹھ نہ پاپ نہ پن پسارا
نہ دن رین چند نہ سورج بنا جوت اجیارا
نہ تہہ گیان دھیان نہہ جپ تپ بید کتیب نہ بانی
کرنی دھرنی رہنی گہنی یہ سب وہاں ہرانی
گھر نہہ اگھر نہ باہر بھیتر پنڈ برہمنڈ کچھو ناہیں
پانچ تتو گن تین نہیں تہہ ساکھی سبد نہ تاہیں
مول نہ پھول بیل نہیں بیجا بنا برچھ پھل سوہے
اوہم سوہم اردھ اُرد نہہ سواسا لیکھن کو ہے
نہہ نرگن نہہ سرگن بھائی نہہ سوچھم استھول
نہہ اچھر نہ اوگت بھائی یہ سب جگ کے بھول
جہاں پُرکھ تہواں کچھ ناہیں کہہ کبیر ہم جانا
ہمری سین لکھے جو کوئی پاوے پد نروانا

(اے سہیلی وہ گھر سب سے نیارا ہے جہاں ہمارا پورن پُرکھ ہے
وہاں سکھ دکھ پاپ پن سچ جھوٹ وغیرہ کچھ نہیں ہے
نہ وہاں دن ہے نہ رات نہ چاند ہے نہ سورج، بغیر جوت اُجالا ہو رہا ہے
وہاں گیان دھیان جپ تپ، وید، کتاب یا کوئی بانی نہیں ہے
وہاں کرنی، دھرنی، رہنی سہنی سبھی گم ہو جاتی ہیں
وہ نہ مکان ہے نہ لا مکانیت نہ وہاں اندر باہر، جسم جہاں وغیرہ کچھ نہیں
وہاں پانچ عناصر نہیں ہیں نہ تین اوصاف، نہ وہاں دوہے ہیں نہ شبد
وہاں جڑ نہیں ہے نہ پھول نہ بیل نہ بیج، وہاں بغیر پیڑ کے پھل ہیں
نہ وہاں اوم ہے نہ سوہم، اونچا نیچا کچھ نہیں، بس سانس ہی ہے
نہ وہ باوصف خدا ہے نہ بے وصف نہ وہ لطیف ہے نہ کثیف
نہ وہ لا فانی ہے نہ نافہمیدہ، یہ سب باتیں تو دنیا کے بھرم ہیں
جہاں پُرکھ ہے وہاں کچھ نہیں ہے، کبیر کہتے ہیں کہ یہ ہم نے جانا ہے
ہمارا اشارا اگر کوئی سمجھے تو اسے نروان یعنی دنیا سے نجات مل جائے)

OOO

ماہیں دھرمی ناہہ ادھرمی نا میں جتی نہ کامی ہو
نا میں کہتا نا میں سنتا نا میں سیوک سوامی ہو
نا میں بندھا نا میں مکتا نا نربندھ سربنگی ہو
نا کاہو سے نیارا ہو نا کاہو کا سنگی ہو
نا ہم نرک لوک کو جاتے نا ہم سرگ سدھارے ہو
سب ہی کرم ہمارا کیا ہم کرمن تے نیارے ہو
یہ مت کوئی برلا بوجھے جو ست گورو ہو بیٹھے ہو
مت کبیر کا ہو کو تھاپے مت کا ہو کو میٹے ہو

(نہ میں دھرم والا ہوں نہ ادھرمی نہ پرہیز گار ہوں نہ شہوت زدہ
نہ میں کہتا ہوں نہ سنتا ہوں نہ مالک ہوں نہ خدمت گار
نہ میں بندھا ہوں نہ آزاد ہوں نہ مکمل رہائی یافتہ
میں نہ کسی سے علاحدہ ہوں نہ کسی کے ساتھ ہوں
نہ ہم نرک جاتے ہیں نہ سورگ کو جاتے ہیں
سب کرم ہمارے کیے ہوئے ہیں پھر بھی ہم ان سے علاحدہ ہیں یعنی ان سے بے نیاز ہیں
یہ بات کوئی خاص آدمی ہی سمجھ سکتا ہے جو سچا مرشد ہو
اے کبیر تو نہ کسی اصول کو قائم کر اور نہ ہی کسی کی تردید کر)

OOO

آخر میں اس بے مثل پد کا ذکر بھی ضروری ہے جس میں ذات مطلق بلکہ ذات انسانی (ذات انفرادی) یا خودی کا ذکر ہے جو اول و آخر فنا و بے ثبات گویا سکہ کا دوسرا رخ ہے۔ اس میں جو دردمندی، دلسوزی، محویت، گداز اور ترا[illegible] پڑھنے اور محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ عالمی ادب میں موضوع پر اس طرح کا بے پناہ اظہار کم ہوگا۔ یہاں کبیر نے بالکل ایک اچھو[illegible] اختیار کیا ہے۔ 'نکاریت' کو یہاں ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ کاتنے اور بننے کی اصطلاحیں کے یہاں جہاں تہاں ہیں، لیکن اس پد میں تمام و کمال انہیں کو برتا ہے اور بنکر و تانے بانے، کپڑے اور کرگھے کی تمثالوں کے ذریعے استعاراتی طور پر ساری با[illegible] اس طرح کہی ہے کہ چند مصرعوں کا یہ متن تحیر کا طلسم کدہ بن گیا ہے۔

جھینی جھینی بینی چدریا
کاہے کے تانا کاہے کے بھرنی کون تار سے بینی چدریا
انگلا پنگلا تانا بھرنی سکھمن تار سے بینی چدریا
آٹھ کنول دل چرخہ ڈولے پانچ تت گن تینی چدریا
سائیں کو سیت ماس دس لاگے ٹھوک ٹھوک کے بینی چدریا
سو چادر سُر نر مُنی اوڑھے اوڑھ کے میلی کینی چدریا
داس کبیر جتن سے اوڑھی جیوں کی تیوں دھر دینی چدریا

(بہت نازک چادر بُنی گئی ہے
اس چادر میں تانا بانا کیا ہے اور کس تار سے یہ بُنی گئی ہے
آٹھ پنکھڑیوں کے کمل کا چرخا گھومتا ہے، اس چادر میں پانچ عنصر اور تین گن ہیں
اڑا اور پنگلا ناڑیوں کا تانا بانا ہے اور سوشمنا ناڑی کے تار سے بنی گئی ہے
سائیں کو اسے تیار کرنے میں دس مہینے لگے، خوب ٹھونک ٹھاک کر چادر بُنی ہے
اس چادر کو دیوتاؤں، منیوں اور انسانوں نے پہنا اور پہن کر گندا کر دیا
داس کبیر نے اسے ہوشیاری سے اوڑھا اور اسے جیسے کا تیسا رکھ دیا)

کبیر کی شاعری میں جو قوت شفا ہے اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ کبیر نے معاشرے کی مسیحائی کی، لیکن مسیحائی کا یہ عمل دوہرا ہے۔ یعنی بالواسطہ طور پر ہی سہی کبیر نے زبان کی بھی مسیحائی کی اور اسے ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا۔

☆☆☆

۔وفیسر عبدالستار دلوی



ہندومصر کے تعلقات اور اردو

ہندوستان کی آزادی (۱۹۴۷ء) کے بعد جب مولانا ابوالکلام آزاد وزیر لیم بنے تو انہوں نے مختلف فنون اور ہندوستانی ادبیات کی ترقی اور اشاعت کی غرض ے کل ہند نوعیت کے سرکاری و نیم سرکاری ادارے قائم کیے۔ اسی طرح مختلف ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تہذیبی روابط کی اہمیت کے پیش نظر انڈین کاؤنسل آف کلچرل یلیشنز کی بھی بنیاد رکھی۔ انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز بیرونی ممالک کے ساتھ دوستان کے تہذیبی و ثقافتی روابط اور رشتے قائم کرتا ہے اور ہندوستان کی رنگارنگ ہذیبی زندگی کو دنیا سے متعارف کرانے کے فرائض انجام دیتا ہے۔ مختلف تہذیبی واحل کے ساتھ زبانیں نہ صرف ملک کی تہذیبی زندگی سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں، بلکہ لیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ ابلاغ و ترسیل کی لسانی سطح ابلاغ و ترسیل کی تمام راہوں میں سب ے زیادہ موثر راستے کا کام دیتی ہیں۔ زبانوں کے ذریعہ تاریخ و تہذیب و ثقافت سرعت ت سفر کرتے ہیں اور دلوں کو جوڑتے ہیں۔ موسیقی کی مدھر تانوں اور مصور کے قلموں رنگوں میں ابلاغ کی جو صورت ہے وہ بھی زبان کے تصور اور اس کے استعمال کی ر ہون منت ہے۔ سُر اور تال کی ہر لے اور تصویر میں مختلف رنگ اپنی زبان رکھتے ہیں۔ بان تہذیبی زندگی کی روح ہے۔ زبان اور تہذیبی رشتوں کو سمجھنے کے لیے مختلف لسانی ر تہذیبی منطقوں میں لوگوں کی آمدورفت ضروری ہے۔ اسی لیے مختلف ممالک میں ہذیبی و ثقافتی تبادل ضروری ہے۔ علما، ادیب، شاعر، اساتذہ اور مختلف فنون کے ماہرین کا تلف ممالک میں جاکر وہاں کے علما، ادبا، شعرا اور اساتذہ نیز طلبا کے ساتھ اظہار خیال کرنا لچرل ایکسچینج یا تہذیبی تبادل کا اہم کام ہے۔ یہ کام ادبی و ثقافتی سطح پر کتابوں کے ترجموں ے بھی انجام پاتا ہے۔ منتخب ادبی کتابوں یا رشحات قلم کے ترجمے ثقافتی و تہذیبی تبادل ں بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے ترجمہ کسی بھی طرح تخلیق سے کم اہم نہیں وتا، بلکہ اس مخصوص سیاق میں تخلیق پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہاں تخلیق کی ناکامی ترجمہ کی میابی میں بدل جاتی ہے۔

اردو میں عربی زبان کے ترجمے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ فورٹ ولیم کالج اور ںسویں صدی کی ابتدا میں متعدد کتابیں عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ سبعہ معلقات کے ترجمے ہوئے۔ یہ دور عربی، فارسی اور سنسکرت سے اردو میں نثری تراجم کا دور تھا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں جب سرسید اور ان کے رفقا نے زبان وادب کے لیے نئی جہتیں تلاش کیں اور علمی تحقیقات کا دور شروع ہوا تو تحقیقی اور علمی ضروریات کے پیش نظر علامہ شبلی نے مصر، ترکی اور شام کا سفر کیا تاکہ وہ اپنے تحقیقی منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ شبلی زعمائے اسلام پر اپنی تحقیقات کا آغاز کر چکے تھے۔ انہیں الفاروق، المامون، النعمان اور سیرت النبی جیسی کتابیں لکھ کر اسلام کے شاندار ماضی کی باز آفرینی کرنی تھی۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ وہ عالم اسلام کا سفر کرتے اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے۔ مصر، ترکی اور شام کے سفر میں شبلی نے اپنی تحقیقات کے لیے مواد اکٹھا کیا اور "ہیروز آف اسلام" کو نئے سرے سے علمی دنیا اور عوام کے سامنے پیش کیا۔ شبلی نے اس سفر کے حالات اور تجربات کو الگ سے "سفرنامہ مصر و روم و شام" کے نام سے قلم بند کیا اور تمام تر یادوں، ملاقاتوں اور تہذیب و تمدن اور نظام تعلیم پر روشنی ڈالی۔ شبلی نے مصر کے تعلق سے جامعہ ازہر اور اس کے نظام تعلیم پر ناقدانہ روشنی ڈالی ہے۔ علامہ شبلی کا یہ سفرنامہ غالباً مشرق وسطیٰ یا عالم عرب اور ترکی سے تعلق رکھنے والا پہلا سفرنامہ ہے جس سے ہندوستان اور مصر کے علمی و ثقافتی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ شبلی ایک تبحر عالم تھے۔ وہ عالم اسلام اور عالم عرب کے پرشکوہ کارناموں سے متاثر تھے۔ لیکن اپنے تبحر علمی اور اپنی فکر کی روشنی سے انہوں نے نظام تعلیم میں کوتاہیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ عالم عرب کے صرف مقلد نہیں تھے بلکہ ان کی اہمیت رہنما کی بھی ہے۔ اسکندریہ کا تاریخی کتب خانہ جو سکندر اعظم کے حملے کے بعد قائم ہوا اور جس میں ہزاروں مخطوطات اور فلسفہ و حکمت کے راز محفوظ تھے، جب دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا تو یورپی متعصب مورخین نے اس کتب خانہ کی بربادی کے لیے سیدنا عمرؓ کو نشانہ بنایا۔ یہ ایک عجیب تاریخی بہتان تھا، جس کا مقصد زعمائے اسلام اور مسلمانوں کو علم دشمن قرار دینا تھا۔ شبلی نے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کے تعلق سے متعصب یورپی مورخین کی قصہ گوئی کا علمی و تحقیقی انداز سے جواب دے کر اس سارے افسانے کو لغو قرار دیا۔ قطع نظر مذہبی اہمیت کے قرآن مجید کے ترجمے ادبی نقطہ نظر

۴۔الہلال، باندرہ ریکلیمیشن، ممبئی۔ ۴۰۰۰۵۰

سے بھی اہم ہے۔ ہندوستان میں قرآن کے ترجموں کا سلسلہ دکنی دور سے شروع ہوا اور بعد میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم سے ہوتا ہوا سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد اور پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن اور دیگر تراجم تک پہنچا، جس سے ایک مقدس آسمانی صحیفہ کے ساتھ عربی نثر کی سب سے اعلیٰ کتاب بلاغت، ایجاز اور اختصار اور قصص و علامات کا اردو میں تعارف ہوا۔ علامہ ابوصیری کے مشہور قصیدہ بردہ کے اردو تراجم جو دکن، بمبئی، گجرات اور شمال میں ہوئے ان کی اپنی جگہ مسلم ہے۔ تاریخی کتابوں میں البیرونی کی کتاب الہند اور کتاب آلاغانی کے اردو تراجم بھی اسی سلسلے کی چند کڑیاں ہیں۔

ہندوستان کی کتابوں کے عربی تراجم کے سلسلے میں سنسکرت ادب کا شاہکار "پنچ تنتر" ہے جس کا ترجمہ اولاً پہلوی اور پھر پہلوی سے عہد عباسیہ میں عبداللہ ابن مقفع نے عربی میں کیا اور یہ اس عربی ترجمے نے ان اخلاق آموز کہانیوں کو شہرت عام اور بقائے دوام کی عزت بخشی۔ ہندوستانی ادبیات کے ترجمے ممکن ہے اور بھی ہوں لیکن سردست یہاں انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز کے ترجمہ کی طرف توجہ منعطف کرانا مقصود ہے جو ہندوستان کی چودہ زبانوں کی منتخب کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی کہانیوں کا یہ ترجمہ عربی میں "**القصص القصیرہ من الهند**" کے نام سے سید احسان الرحمٰن نے کیا ہے اور جسے کیشب ملک نے مرتب کیا ہے۔ اس ترجمہ میں مہا بیندر ناتھ سائکیا (آسامی) تاراشنکر بندھو پادھیائے (بنگالی) وید راہی (ڈوگری)، گلاب داس بروکر (گجراتی) واتسائن (ہندی) بید وسار (انگریزی) یو۔ آر۔ اننت مورتی (کنڑ) کے علاوہ سبھی ہندوستانی زبانوں کی نمائندگی ہے۔ اردو کی نمائندگی عصمت چغتائی کے افسانہ کے ترجمہ سے ہوئی ہے۔ یہ کتاب غالباً ہندوستانی کہانیوں کا عربی میں پہلا تعارف ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی زبانوں کے منتخب شہ پارے عربی میں منتقل کیے جائیں۔ عربی اور اردو میں گہرا لسانی ادبی اور تہذیبی رشتہ ہے۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو میں عربی داں اہل کاروں کی ایک مستقل روایت ہے، لہٰذا یہ کام اردو کے حوالے سے بغیر کسی تاخیر کے آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ عرب دنیا سرسید اور ان کے رفقا، غالب اور حالی کی شاعری اور اقبال سے بڑی حد تک متعارف ہے اور اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھتی ہے۔ لہٰذا اردو کے ادبی منتخب شہکاروں مثلاً پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو وغیرہ کی منتخب کہانیاں، مرزا رسوا کا امراؤ جان ادا، سرشار کا فسانۂ آزاد (تلخیص)، تہذیبی مطالعوں کے پیش نظر شرر کی "گزشتہ لکھنؤ" اردو کے منتخب انشائیے، غزلوں اور نظموں پر مشتمل ایک جامع انتخاب کے تراجم عربی عوام سے اردو ادب کا تعارف پیش کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ کام ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور قاہرہ کی یونیورسٹیوں کے عربی داں اور اساتذہ کو کرنے چاہئے۔ یہ کام مشکل نہیں ہے، صرف تھوڑی دلچسپی اور توجہ چاہتے ہیں۔ میں ذاتی طور سے یہ سمجھتا ہوں کہ مصر اور ہندوستان کی وزارت ثقافیہ کی دلچسپی اور تعاون سے یہ کام بہتر طور پر انجام دیے جا سکتے ہیں۔ کیشب ملک کی مرتبہ کتاب "**القصص القصیرہ من الهند**" کی طرح جو ہندوستان سے شائع ہوئی چند منتخب ہندوستانی افسانوں کے عربی ترجمے "**حدیث النهر**" نامی کتاب میں شائع ہوئے۔ اس کتاب کے مرتب اور مترجم ثریال عبدالملک ہیں۔

رفعیہ نازلی بیگم (بیگم صاحبہ ریاست جنجرہ) نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اپنی بہنوں اور بھائیوں کے ہمراہ یورپ کا سفر کیا۔ اس سفر کی یادگار ان کا سفر نامہ "سیر یورپ" ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ سیر یورپ کے زمانے میں وہ مصر بھی تشریف لے گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے اس سفر نامے میں ضمناً مصر اور قاہرہ کا ذکر کیا ہے، لیکن شبلی کے بعد قدرے تفصیل کے ساتھ مصر اور قاہرہ کے تعلق سے تفصیلی تاثرات، تجربات اور مشاہدات کا ذکر مولانا منت اللہ رحمانی کے "سفر مصر و حجاز" میں ہے۔ قاہرہ میں "جامع شافعی" اور آس پاس کے حالات اور زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا رحمانی نے قاہرہ میں نماز جمعہ اور قرأت کلام پاک اور اس کے تاثر کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصری قاریوں کی قرأت ہلا دیتی ہے۔ یہ قرآن کا اور قرآن فہمی کا اعجاز ہے۔ اس سفر نامہ سے ۱۹۴۲ء کے بعد کے قاہرہ کی تصویر محفوظ ہو گئی ہے۔ **جامعۃ الازهر** کا بھی ذکر ہے لیکن شبلی کے ذکر سے قدرے مختلف۔ یہ جدید قاہرہ ہے، جہاں جدید علم کی روشنی پھیل رہی ہے، اونچی اونچی سر بفلک عمارتیں اور برج آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ **جامعۃ الازهر** کے بعد **جامعۃ القاهرہ** جیسی جدید علوم کی یونیورسٹی قائم ہے۔ مولانا رحمانی نے جدید قاہرہ اور مصر کو نئے تہذیبی و ثقافتی سیاق میں دیکھا اور ہر طرح سے اظہار پسندیدگی کیا ہے۔

مصر میں ہندوستانی زبانوں کے قصے کہانیوں اور شاعری سے رجحان بڑھ رہا ہے اسی طرح ہندوستانی مشاہیر کے علمی کارناموں سے استفادہ کرنے کا بھی شوق ہے۔ خود ہندوستان کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہندوستانی مشاہیر، شعر و ادب اور قصہ کہانیوں کو عربی عوام تک پہنچائے۔ اس سلسلہ میں امید افزا پیش رفت ہوئی ہے۔ انڈین کاؤنسل آف کلچرل ریلیشنز نے "نل دمن" کا ترجمہ "**نالا ودامینتی**" کے نام سے ۱۹۷۱ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کے مترجم ودیع البستانی ہیں۔ اسی طرح مشہور محب وطن شاعر سوبرامنیا بھارتی پر پروفیسر سوامی ناتھن کی کتاب کا ترجمہ عبدالحق بن شجاعت علی نے "**سوبرامنیا بهارتي: مختارات من شعره ونثره**" کے نام سے کیا۔ یہ کتاب بھی ICCR نے شائع کی۔ صبری الفضل نے "**مختارات من الآداب الآسيويه**" کے نام سے ہندوستان، چین اور کوریا کے منتخب کہانیوں کے ترجمے کیے۔ اس کتاب میں ہندوستانی ادبیات سے مندرجہ ذیل تراجم شامل ہیں۔

۱- **الساعة الذهبيه**(The Golden watch)از ملک راج آنند

۲- **حب السافتری**(Savitri's love)مہابھارت سے ایک کہانی

۳- **الرساله**(The Letter)از دھوم کیتو۔ (دھوم کیتو گجراتی کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ یہ کہانی دھوم کیتو کی مشہور کہانی 'پوسٹ مین' کا ترجمہ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر سکدیا جوہری نے راقم کی رہنمائی میں کیا تھا، جو رسالہ 'نقش کوکن' بمبئی میں شائع ہوا۔)

۴- **لعبه الخيزران**(The Bamboo Trick)از اچینتا کمار سین

۵- **اهل الثقه**(The Confidence men)از رابندر ناتھ ٹیگور

یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں مطبوعہ **الهيئة المصريه العامة الكتاب** سے شائع ہوئی ICSSR نے ایک اور کتاب **رؤ يا والهند:مختارات من كتابلت** کے زیر عنوان ۱۹۸۳ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں رابندر ناتھ ٹیگور، شری ویویکا نند، مہاتما گاندھی، شری آربندو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور جواہر لال نہرو کی

کتابوں سے ہندوستان کے بارے میں مضامین کے ترجمے ہیں۔

ایک ممتاز مصری عالم ڈاکٹر عبدالعزیز عزت نے جو عرصہ تک جامعہ ازہر سے وابستہ رہے اور ایک عرصہ تک بمبئی سے قریب بھیونڈی میں قیام فرمایا، مشہور عالم دین اور مورخ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی مشہور و مستند کتاب "ہندوستان عہد رسالت میں" کا **العرب و الهند فی عهد الرسالة** کے نام سے عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب بھی "**الهيئة المصرية العامة الكتاب**" سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔

عربی میں اردو قواعد:

انسان زبان اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔ تحصیل زبان کا تعلق انسانی ماحول اور فطرت سے ہے۔ جس طرح بچہ غیر محسوس طریقے سے مختلف کام انجام دیتا ہے اسی طرح وہ اپنے ماحول سے زبان بھی سیکھتا ہے۔ وہ زبان کی آوازوں کی مختلف کیفیات میں، حروف کی نشست و برخواست میں اور معنی کے تغیرات میں خود بخود فرق محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسم، فاعل، مفعول اور فعل میں تمیز خود بخود پیدا کر لیتا ہے۔ مگر ثانوی زبان کی حیثیت سے زبان کی تدریس میں قواعد زبان کی تعلیم اور جملوں میں الفاظ کی نشست و برخواست اور ان کی معینہ جگہ کی تدریس ایک اہم لسانی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ثانوی زبان کی حیثیت سے زبان کی تدریس کے پیش نظر قواعد کی کتابیں ترتیب دی گئیں۔ اردو کی قواعد کی کتابیں مثلاً پلیٹس، فوربس، فیلن کی اردو وانگریزی قواعد پر کتابیں اسی ضرورت کو مد نظر رکھ کر تحریر کی گئیں۔ اردو جو اپنی سرحدوں سے باہر قدم رکھ رہی ہے، اسے اپنے مخصوص ماحول میں تدریس کی ضروریات کے پیش نظر قواعد کی کتابوں کی ضرورت ہے۔ عرب ممالک اور بطور خاص قاہرہ میں اردو سے دلچسپی اور اس کی تدریسی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے غالباً پہلی بار **قواعد اللغة الاردوية** کے نام سے مرشد آباد (بنگال) کے جناب محمد لقمان الصدیقی نے اردو قواعد پر عربی میں کتاب لکھی۔ محمد لقمان صدیقی عرصہ تک مدرسۃ العالیہ کلکتہ اور جامعۃ الازہر سے منسلک تھے۔ یہ کتاب انہوں نے تقسیم ملک کے بعد **مطبعة جامعة فواد الاول** سے ۱۹۳۹ء میں شائع کی۔ اس کا پیش لفظ عربی زبان کے مشہور محقق و عالم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام پاکستان میں مصر کے سفیر رہ چکے ہیں اور سعودی عرب میں وائس چانسلر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے اپنے عالمانہ پیش لفظ میں اردو زبان کی اہمیت اور ہندوستان میں اس کی مقبولیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ زبان پاکستان کی قومی زبان بنی، یہ ہندوستان کی بھی مقبول ترین زبان ہے اور خود ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو انگریزی اور اردو ہی جانتے ہیں اور بولتے ہیں اور ہندی جو ہندوستان کی قومی زبان قرار دی گئی ہے صرف لغت کی مدد سے سمجھتے ہیں۔

محمد لقمان صدیقی کی **قواعد اللغة الاردوية** بڑی تقطیع پر تقریباً پونے دو سو صفحات پر مشتمل ایک تفصیلی قواعد ہے جس میں **حروف الهجائية** اصطلاحات علمیہ، پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرا باب "علم صرف" سے متعلق ہے جس میں اسم، اسم کی مختلف اقسام، ضمائر اور اس کی اقسام، مصدر، اقسام مصدر، حاصل مصدر، اسم فاعل اور اس کی اقسام، افعال، صفات، غرض کہ اردو قواعد کے سارے پہلو دقت نظر کے ساتھ اس طرح سے بیان کیے ہیں کہ ایک عرب طالب علم اردو زبان کی قواعد کو بہ آسانی سمجھ سکے۔ یہ کتاب وسعت علم اور دقت نظر اور قواعد زبان سے گہری دلچسپی کا نتیجہ ہے اور اردو زبان کی بڑی خدمت ہے۔ اس کتاب پر اردو کے نامور عالم اور محقق جناب مالک رام کا مقدمہ بھی ہے۔ جس میں مرحوم مالک رام نے لقمان صدیقی کے کام کی داد دی ہے اور ان کے کام کو سراہا ہے۔ محمد لقمان صدیقی کی طرح عربی میں اردو قواعد پر دوسری کتاب ایک عرب (مصری) اسکالر ڈاکٹر سمیر عبدالحمید کی وقیع کتاب ہے جو قاہرہ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی محمد لقمان صدیقی کی مذکورہ کتاب پر اضافہ کا کام کرتی ہے اور عرب اور مصر میں اردو کے طالب علم کی عملی ضروریات کے پیش نظر جدید تقاضوں کے تحت تالیف کی گئی ہے۔ اس طرح اردو قواعد سے متعلق ان دو کتابوں کے ذریعہ، عرب طلبا کی قواعدی ضروریات کسی حد تک پوری ہو گئی ہیں۔ اس بات کی البتہ ضرورت ہے کہ ایک نئی قواعد عربی میں توضیحی لسانیات کی روشنی میں لکھی جائے جسے صحیح معنوں میں توضیحی قواعد (Descriptive Grammar) کہا جا سکے۔ یہ کام بھی ڈاکٹر سمیر عبدالحمید اور جامعہ ازہر کے ایک نوجوان استاد ڈاکٹر احمد القاضی کے کرنے کا ہے۔ ڈاکٹر احمد قاضی نے چند سال پہلے (غالباً ۱۹۹۵ء میں) دلی یونیورسٹی سے اردو میں ڈاکٹریٹ کے علاوہ جدید لسانیات میں بھی ڈپلوما حاصل کیا ہے اور زبان پر اچھا عبور حاصل کیا ہے۔ اس طرح یہ دونوں مصری اساتذہ دیار عرب میں عربی اور اردو کی ایک قابل قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

مصر میں اردو سے دلچسپی:

مصر میں اردو زبان و ادب سے دلچسپی غالباً اس صدی کی ابتدا سے لی جا رہی ہے، اس کی غالباً ایک وجہ یہ ہے کہ مصر میں اردو زبان و ادب کو عربی رسم الخط سے پہچانا جاتا ہے۔ دوسرے انیسویں صدی کے اواخر میں مولانا شبلی کی شخصیت نے بطور خاص مصری علما کو اپنی طرف متوجہ کیا جنہوں نے اسلامی تاریخ اور زعمائے اسلام پر تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ الفاروق، المامون، النعمان، الغزالی اور سیرۃ النبیؐ جیسی غیر معمولی علمی تصانیف جن کی تحقیقات کے لیے بلادِ اسلامیہ کا سفر ضروری تھا اور جن کی تصنیف سے ہندوستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ عرب و ایران اور دنیا کے سبھی مسلمانوں کی دلچسپی وابستہ تھی، شبلی اور شبلی کے موضوع تحقیق کے واسطے سے اردو زبان و ادب سے بھی متعارف ہوئے۔ غالباً یہی وجہ رہی ہے کہ جامعۃ الازہر کے شعبۂ لغت و ترجمہ (**قسم اللغة والترجمة**) میں ایک مضمون کی حیثیت سے اردو بھی شامل نصاب رہی ہے۔ جامعۃ الازہر کے بعد ہندوستان میں دارالعلوم دیوبند اور پھر ندوۃ العلما لکھنؤ کو اسلامی علوم کے مراکز کی حیثیت کی وجہ سے ہندوستانی علما اور علمائے ازہر میں علمی روابط قائم ہوئے ہوں اور علوم دینی کے لیے ہندوستانی طلبا کی جامعۃ الازہر میں آمد و رفت سے جو بالعموم اردو داں تھے، جامعۃ الازہر اور دارالعلوم دیوبند اور بعد میں ندوۃ العلما میں یہ علمی ربط، اردو اور مصر میں لسانی ربط کا پیش خیمہ بنا ہو۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں نواب صدیق حسن خاں کی عبقری علمی شخصیت بھی اس علمی و لسانی ربط کا باعث بنی جن کی مساعی جمیلہ سے بمبئی کے شہرۂ آفاق عالم،

صوفی و فقیہہ اور مفسر قرآن حضرت فقیہہ مخدوم علی مہائمی کی قرآن مجید کی تفسیر "تبصیر الرحمن" جو چودہویں صدی میں لکھی گئی تھی قاہرہ سے پہلی بار شائع ہوئی اور یہاں داخل نصاب بھی رہی۔

مصر سے اردو زبان کے اس پس منظر کے ساتھ مصری یونیورسٹیوں میں اردو کی تدریس کے امکانات پیدا ہوئے اور ساری دنیا میں سامراجی طاقتوں کے خلاف رد عمل شروع ہوا۔ سیاسی حالات تیزی سے بدلنے لگے اور غلام ممالک ایشیائی ملکوں کی تحریک آزادی سے دلچسپی اور اپنی تحریک کو فعال اور جاندار بنانے کے لیے دوسرے ملکوں سے روشنی حاصل کرنے لگے تو مصر نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے حوصلہ پایا۔ آزادی کی تحریک میں اردو نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اقبال اس سلسلے میں اردو اور فارسی شاعر کی حیثیت سے عالم عرب میں مشہور و مقبول تھے۔ وہ ہندوستان بلکہ ایشیائی اور عرب دنیا کو سامراجی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما چاہتے تھے۔ اقبال کا یہ پیام آزادی جوان کی شاعری کا حصہ ہے، اس میں اسلامی تفکر کی تہہ داری شامل تھی اور اسلامی تاریخ کی عظمت کی پرشکوہ داستانیں پوشیدہ تھیں، مسلمانوں کے علم و حکمت کے جس میں اشارئیے محفوظ تھے، عرب دنیا نے ان کی شاعری سے دلچسپی لی اور ایک سیاست داں اور مفکر اسلام شاعر کی حیثیت سے اقبال کے پیغام پر لبیک کہا۔ اقبال کی شخصیت، شاعری اور پیغام کے واسطے سے عرب دنیا ان سے اردو اور فارسی ہندوستانی فلسفی شاعر سے متعارف ہوئی اور ان کی کتابوں اور نظموں کے ترکی، فارسی اور عربی میں ترجمے ہونے شروع ہوئے۔ اقبال کے واسطے سے بھی عرب دنیا شاعری کی زبان سے متعارف ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بک نے جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے، اقبال کی نظموں کے عربی میں ترجمے کیے۔

مصر میں اردو زبان و ادب کے تعارف کے ساتھ ہی غالباً جامعۃ الازہر کے بعد قاہرہ یونیورسٹی میں ۱۹۶۰ء کے قریب اردو کی تدریس کا انتظام کیا گیا۔ جامعۃ الازہر اور قاہرہ یونیورسٹی میں اردو کی تدریس ایک مضمون کی حیثیت سے گریجویشن (بی۔اے) کی سطح تک ہے جس میں طلبا حروف تہجی، ابتدائی اردو اور اردو قواعد سے واقف ہوتے ہیں۔ اردو زبان سے واقفیت کے ساتھ ان کا تعارف ہندوستان میں "عہد وسطیٰ کی تاریخ" اور اردو ادب کی تاریخ سے بھی کرایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی مسلم تاریخ اور ثقافت، تاریخ ادب سے تعارف کے بعد اردو زبان کی ثقافتی اہمیت سے وہ واقف ہو جاتے ہیں اور مستقبل میں اردو کے مطالعے کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ قاہرہ یونیورسٹی اور جامعۃ الازہر کے علاوہ اسکندریہ یونیورسٹی میں بھی ڈگری کی سطح تک اردو کی تدریس کا انتظام ہے۔ قاہرہ میں علاقہ عین شمس میں جو فراعنہ کے عہد کا شہر ہے اور جسے حال ہی میں دریافت کیا گیا، عین شمس یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ عین شمس یونیورسٹی قاہرہ کی یونیورسٹیوں میں ایک نو عمر یونیورسٹی ہے، تاہم اس کی وسعت بے پناہ ہے۔ ایک قلیل عرصہ میں اس یونیورسٹی نے مختلف سمتوں میں ترقی کی اور اب زبانوں میں عربی، انگریزی، فرانسیسی، عبرانی، اطالوی، فارسی، ترکی اور اردو شامل ہیں۔ سماجی علوم کے شعبوں کے علاوہ طب، انجینئرنگ، کامرس وغیرہ کی فیکلٹیاں بھی ہیں۔ یہ ایک مثالی یونیورسٹی ہے جو اپنے تعلیمی معیار کے لیے شہرت رکھتی ہے اور ہزاروں طلبا اور طالبات یہاں زیور تعلیم سے آراستہ ہوتے ہیں۔

جامعہ عین شمس میں ازہر اور قاہرہ یونیورسٹیوں کے برعکس اردو کی تدریس بی۔اے، ایم۔اے، اور پی ایچ ڈی کی سطح تک ہوتی ہے اور اساتذہ کو مختلف یونیورسٹیوں سے مہمان اساتذہ کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا ہے۔ ایم۔اے اور پی ایچ ڈی میں بھی انہیں اساتذہ سے مدد لی جاتی ہے۔ ڈاکٹر امجد حسین جو گزشتہ ۴۰ سال سے پاکستان کی جانب سے قاہرہ اور ازہر میں اردو کے استاد ہیں وہ یہاں بھی مصری الاصل اساتذہ کی مدد سے کام دیکھتے رہے۔ ۱۹۹۵ء میں جامعہ عین شمس نے نصاب کی ترتیب اور تدوین کے لیے باقاعدہ اردو پروفیسر کا تقرر کیا تاکہ ہر سطح پر صحیح خطوط پر اردو کی تدریس اور تحقیق کا کام ہو اور نئے سرے سے یہاں کی ضروریات کے لحاظ سے نصاب بنایا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ بی۔اے کے بعد جو طلبا ایم۔اے کرنا چاہیں ان کے لیے ایک سال کا ایم اے سے قبل تربیتی کورس پاس کرنا لازمی ہے۔ اس کورس کو "تمہیدی" کورس کہا جاتا ہے۔ یہاں کا نظام تعلیم اور نصاب دراصل فرانسیسی اور اطالوی یونیورسٹیوں کی طرز کا ہے۔

مصر میں اردو تحقیق:

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے، مصر میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام جامعہ عین شمس میں ہے۔ یہاں پر ایم۔اے (مینجستیر) ریسرچ سے ہوتا ہے اور طالب علم ایم۔اے کی تحقیق میں تین سے پانچ سال صرف کرتا ہے۔ اس کے بعد کہیں مشکل سے ڈاکٹریٹ کے لیے داخلہ ملتا ہے۔

جامعہ عین شمس سے جن طلبا نے ایم اے (تحقیق) کیا ہے ان کے نام اور موضوعات مندرجہ ذیل ہیں۔

ڈاکٹر ابتسام صالح نے بہادر شاہ ظفر پر مقالہ لکھا اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں انہوں نے دبستان دہلی کے چار شعرا شاہ نصیر، ذوق دہلوی، غالب اور مومن کی شاعری پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ایک خاتون حاجر نے سرسید کی ادبی خدمات پر ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور "حالی، شبلی، اکبر اور اقبال" کے حوالے سے اردو کی سیاسی شاعری پر ڈاکٹریٹ کے لیے مقالہ لکھ رہی ہیں۔ ایک اسکالر جلال حفناوی نے حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو معہ مقدمہ عربی میں تعلیقات و حواشی کے ساتھ ترجمہ کیا اور پھر علامہ شبلی نعمانی کی حیات اور الفاروق کے ترجمہ اور تدوین پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی طرح منیٰ مصطفیٰ نے میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی پر ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور فارسی کے شاعر وصال شیرازی اور شیخ ابراہیم ذوق کے اردو قصائد کے تقابلی مطالعے پر ڈاکٹریٹ کے لیے کام کر رہی ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر حازم محفوظ نے میر درد پر ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور محمد حسین آزاد کی آب حیات کے حوالے سے "آزاد بہ حیثیت نقاد" پر پی۔ایچ۔ڈی حاصل کی۔ ہنا عبدالفتاح نے ڈپٹی نذیر احمد کے مشہور ناول مراۃ العروس کا عربی میں ترجمہ کیا اور اسے مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایک خاتون فوزیہ نے اقبال پر ایم اے کے لیے مقالہ لکھا۔ ان میں سے چند مقالے راقم کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ ان تحقیقی مقالات کا (جن میں ترجمہ بھی شامل ہے) معیار قابل قدر ہے اور کئی مقالے

اعلیٰ معیار کے ہیں۔ مذکورہ تحقیقی مقالے عام طور پر ترتیب متن اور ترجمے کی حیثیت رکھتے ہیں اور چند ادبی شخصیات سے متعلق ہیں اس طرح کا کام ضروری ہے، تاہم ابھی لسانی، تہذیبی و ادبی نوعیت کے تحقیقی مقالات مثلاً "عربی و اردو الفاظ کا تقابلی مطالعہ، اردو میں مستعمل علمی اصطلاحیں، احمد شوقی اور اقبال کی وطنی شاعری کا تقابلی مطالعہ، اردو سفر ناموں میں عرب و مصر کی تہذیبی و علمی زندگی کا تنقیدی مطالعہ، اقبال کی شاعری اور عالم عرب، مصر اور ہندوستان کے علمی اور ادبی روابط" جیسے موضوعات پر کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو اور عرب ممالک اور مصر کے تہذیبی تعلقات کے لیے سود مند ثابت ہو سکیں۔

مصر میں اردو شاعری سے دلچسپی اور اقبال:

مصر میں اردو شعر و ادب سے متعلق عوامی سطح پر واقفیت کم ہے۔ اس کی وجہ شعر و ادب سے عدم دلچسپی نہیں بلکہ تعارف اور ابلاغ کی کمی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ، اساتذہ اور طلبا ہندوستانی ادبیات اور بطور خاص اردو شعر و ادب سے واقف ہونا چاہتے ہیں لیکن ان کی دلچسپیاں محدود ہو گئی ہیں۔ وہ سرسید اور ان کے چند رفقا اور علی گڑھ یونیورسٹی سے متعارف ہیں لیکن جدید اردو ادب، افسانہ، ناول، غزل، نظم سے واقف نہیں ہیں۔ ہندوستانی ادبیات میں وہ صرف دو شاعروں سے متعارف ہیں، ایک اقبال اور دوسرے ٹیگور۔ اب ادھر وہ مولانا حالی سے متعارف ہوئے ہیں اور وہ بھی بطور خاص حالی کی "مسدس مد و جزر اسلام" سے۔ مسدس مد و جزر اسلام سے دلچسپی کی بنیادی وجہ شاعری نہ ہوتے ہوئے اس کے موضوع، یعنی اسلامی تاریخ ہے۔ لیکن اب ادبی حلقوں میں مسدس بہ حیثیت صنف شعر سے بھی وہ متعارف ہیں۔ مسدس حالی کا دس بارہ سال قبل ڈاکٹر مجیب المصری نے عربی میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب قاہرہ سے شائع ہوئی ہے۔

اقبال مصر میں سب سے زیادہ مقبول شاعر ہیں۔ وہ ایک عظیم شاعر اور اسلامی مفکر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اقبال کی مصر میں مقبولیت کی دوسری وجہ ان کی اردو شاعری سے زیادہ فارسی شاعری ہے، چنانچہ اقبال کے فارسی کلام کے حوالے سے عربی میں ڈاکٹریٹ کے لیے مقالے لکھے گئے اور ان کی فارسی مثنویوں کے تراجم بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام نے "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کا عربی میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح انہوں نے اقبال کے تیسرے اردو مجموعہ کلام "ضرب کلیم" کو بھی عربی میں منتقل کیا۔ ڈاکٹر مجیب المصری نے "جاوید نامہ، ارمغان حجاز" اور "گلشن راز جدید" کا عربی میں ترجمہ کیا اور کئی کتابیں اقبال پر لکھیں۔ ڈاکٹر سعید جمال الدین نے "جاوید نامہ" پر تنقیدی مقالہ لکھا (ڈاکٹر سعید جمال الدین عین شمس یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں) اسی طرح ڈاکٹر سمیر عبدالحمید نے جو مصر کے رہنے والے ہیں اور آج کل ریاض میں اردو کے پروفیسر ہیں "ارمغان حجاز" کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر سمیر عبدالحمید کا کام دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد اقبال کی زندگی اور تصانیف پر تفصیلی کتاب ہے۔ دوسری جلد "ارمغان حجاز" کے عربی ترجمہ پر مشتمل ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "اقبال اور عالم عرب" بھی ہے۔ یہ ساری کتابیں محنت اور لگن سے لکھی گئی ہیں۔ اردو شاعری سے متعلق اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" کا "حدیث الروح" کے نام سے ترجمہ ہو چکا ہے جسے عالم عرب کے شہرۂ آفاق گلوکارہ امّ کلثوم نے ساز و آہنگ کے ساتھ گایا ہے۔ "حدیث الروح" کے واسطے سے اردو شاعری اور اقبال کا عوام الناس سے تعارف ہوا اور اس طرح اقبال سے عوام و خواص سبھی واقف ہیں۔[1] "شکوہ" کا عربی ترجمہ عربی کے نابینا شاعر تعبان (؟) نے کیا ہے۔

اردو زبان و ادب کو بین الاقوامی مقبولیت حاصل ہے۔ اردو کو یہ مقبولیت انگریزی زبان کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے، جن میں Teach Yourself Urdu اور اسی طرح کی متعدد کتابیں جان۔ ٹی۔ فرتھ، فرینکس، رالف رسل اور عبدالرحمٰن بارکر نے تالیف کیں۔ ابھی گزشتہ سال ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز اور محمد قاسم دلوی نے نئے زاویہ نظر سے پھر Teach Yourself Urdu تالیف کی جو لندن ہی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کے ساتھ اسباق Audio tape میں بھی محفوظ ہیں تاکہ زندہ آواز (Living voice) جو زبان سیکھنے کے لیے ضروری ہے، طالب علموں کے کانوں میں گونجتی رہے۔ اسی نوعیت کی کتابیں عربی میں بھی تالیف کی جا سکتی ہیں، جس سے عرب ممالک میں اردو سیکھنے میں آسانی ہوگی۔ یہ کام ڈاکٹر سمیر عبدالحمید (ریاض) اور قاہرہ میں مقیم اردو اساتذہ بہت آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔

اردو کی منتخب کتابوں کے ترجمے انیسویں صدی میں نصابی ضروریات کے پیش نظر کیے گئے تھے بعد میں ٹی گراہم بیلی نے انگریزی میں "مختصر تاریخ ادب اردو" لکھی اور یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ پروفیسر رالف رسل نے پروفیسر خورشید الاسلام کے اشتراک سے تین مغل شاعر (Three Moghal Poets) لکھی۔ پھر انہوں نے غالب پر کتاب شائع کی۔ امریکہ سے کولمبیا یونیورسٹی نے The Golden Tradition شائع کی جو ولی سے داغ تک اردو کی منتخب اردو غزلوں کا انگریزی ترجمہ ہے، جو عالمانہ مقدمہ کے ساتھ احمد علی کا کارنامہ ہے۔ یہاں انگریزی میں اردو تراجم سے بحث نہیں ہے لہٰذا مقصود یہ ہے کہ اس طرح کے کام عربی زبان میں نہیں ہوئے ورنہ ابتداً ولی، میر، غالب، مومن، اقبال، نظیر، جوش، فیض، فراق، علی سردار جعفری، اختر الایمان اور جاں نثار اختر وغیرہ کی شاعری پر مشتمل ایک جامع انتخاب مع سوانح، حواشی اور فرہنگ و مفصل مقدمہ کے ساتھ ضروری ہے۔ اسی طرح ایک انتخاب مع ترجمہ اردو افسانوں کا بھی ہونا چاہیے۔ چند منتخب ناول بطور خاص امراؤ جان ادا کا ترجمہ بھی عربی میں ضروری ہے۔ امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں اردو کے اساتذہ نے تدریس زبان کے ساتھ علمی کام کیا ہے اور طالب علموں سے کروایا ہے، اسی طرح کا کام عرب اور بطور خاص مصر کی یونیورسٹیوں میں اردو کے اساتذہ کو ضرور کرنا چاہیے تھا، تاکہ اردو زبان و ادب عالم عرب میں فروغ پائے۔ یہ کام اب مصری اسکالروں اور مصر میں مقیم اردو اساتذہ اور طلبہ کے کرنے کا ہے۔

☆☆☆

---

1 اقبال کی طرح مصر میں ہمارے نوبل انعام یافتہ بنگالی شاعر اور ادیب ربندر ناتھ ٹیگور سے لوگ عام طور سے متعارف بھی ہیں اور متاثر بھی۔ ٹیگور کی متعدد کہانیوں اور ڈراموں کے عربی میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ ایک ترجمے کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ ٹیگور ۱۹۲۶ء میں قاہرہ آئے تھے اور مصر کے ملک الشعرا احمد شوقی سے ملاقات کی تھی۔ اقبال کی بھی مصر کے ملک الشعرا اور محب وطن شاعر احمد شوقی سے اسپین میں ملاقات ہو چکی ہے۔

انیس چشتی



اردو زبان پر ترکی اثرات

سرزمین ہند تقریباً ۱۲۴۷ سال تک کلی یا جزوی طور پر مسلم حکمرانوں کے زیر نگیں رہی۔ پہلا فاتح جس نے اس سرزمین پر ۷۱۱ء میں قدم رکھا وہ ایک تیس سالہ عربی نوجوان محمد بن قاسم تھا اور جس حکمران نے ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد دکن سے اپنا راج پاٹ سمیٹا وہ ترکی النسل میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد تھے۔ اگر ۱۲۴۷ سال کے اس طویل عرصہ حکمرانی کو ہم نسلی اعتبار سے تقسیم کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ان صدیوں میں بھارت کا زیادہ حصہ ترکی نژاد حکمرانوں کے زیر نگیں تھا۔ جتنے بھی حکمران اس ملک میں درۂ خیبر، درۂ بولان اور درۂ قراقرم کی تنگنائیوں سے گزر کر آئے، چاہے وہ اپنے آپ کو افغانی، تورانی یا ایرانی کہتے ہوں، یہ سچ ہے کہ محمد بن قاسم کے علاوہ ان سب کے نسلی ڈانڈے کوہ قفقاز کی ترائیوں، بحر اسود کے ساحلوں، فرغانہ کے سبزہ زاروں اور ماوراء النہر کے برفزاروں میں بسنے والے اجداد سے ملتے ہیں۔ بابر فرغانہ میں پیدا ہوا۔ اسی لیے مغل اپنے آپ کو آل تیمور کہتے ہوئے نہ جھکتے تھے۔

بھارت پر ترکی تسلط کا یہ اتنا بڑا عرصہ ہے کہ اس دوران ملک کی بڑی آبادی کو ترکی ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن یہ بھارتی عوام کی سخت جانی اور ترکی حکمرانوں کی رواداری تھی کہ اس ملک میں رد و قبول کا ایک حسین امتزاج جنم پایا۔ یہی امتزاج آج پورے بھارت میں سیکولرزم اور تہذیبی رواداری کے روپ میں پایا جاتا ہے۔ حکمرانوں کو حکمرانی اور گلیوں میں امن کی بحالی سے غرض ہوتی ہے۔ اس سے انہیں کوئی مطلب نہیں کہ آپ کا مذہب کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ترک حکمرانوں نے یہاں کی عوام کے مذہب میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ اورنگ زیب اور ہمایوں کی وصیت اور تزک جہانگیری اور تزک بابری اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

ترکی، ترکستان یا ترک کا نام زبان پر آتے ہی ذہن میں متعدد خیالات در آتے ہیں۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران مغربی ایشیا اور یورپ سے تین ایسی شخصیتیں اٹھیں جنہوں نے ایک عالم کو متاثر اور متحیر کر کے رکھ دیا۔ ایک کا نام ہے ہٹلر، دوسرے کا مسولینی اور تیسرا نام کمال اتاترک[1] یہ تینوں بالترتیب جرمنی، اٹلی اور ترکی کے آمر تھے۔ ہٹلر اور مسولینی کا انجام برا ہوا۔ ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ مسولینی کو سزائے موت دی گئی اور اس کی لاش قتل کے بعد کئی دنوں تک روم کے چوراہے پر لٹکتی رہی۔ کمال اتاترک نے فطری موت پائی۔ لاش کو پہلے استنبول کے میوزیم میں اور پھر انقرہ میں دفنایا گیا۔

۱۹۷۔ نیا پیٹھ، پونے۔ ۴۱۱۰۴۲

ترکی تہذیب کئی راستوں سے بھارت کے اردو سماج اور سیاست میں دخیل ہے۔ ترکیہ، خلافت عثمانی کا دوسرا نام ہے۔ یہیں کے خلیفہ نے ٹیپو سلطان (۲۰ر نومبر ۱۷۵۰ء تا ۴ر مئی ۱۷۹۹ء) کو سلطان کا لقب عطا کیا تھا۔ اسی خلیفہ سے ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ طلب کیا تھا۔

بھارت کی جنگ آزادی میں سب سے طاقتور تحریک "تحریک خلافت" تھی۔ اسی تحریک نے بھارت میں انگریزوں کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کو کندھے سے کندھا ملا کر لا کھڑا کیا تھا۔ یہ ایسا ہندو مسلم اتحاد تھا جس کی نظیر بھارت کے آسمان نے کبھی نہیں دیکھی۔ بچے بچے کی زبان پر تھا:

بولی اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دیدو!

ترکستان میں خلافت دو بار ختم ہوئی۔ پہلی مرتبہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر ترکی کی شکست کے بعد ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے قانوناً خلافت کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ جس سے بھارت کی جنگ آزادی کے ہیرو بری طرح متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنا ایک وفد انگلستان بھیجا تاکہ وہ وہاں کے ارباب اقتدار سے گفت و شنید کے بعد ترکی خلافت کی بحالی کا فریضہ انجام دے سکیں۔ اسی وفد میں مولانا محمد علی جوہر، سید سلیمان ندویؒ اور سید حسن امام بیرسٹر پٹنہ شریک تھے۔ اس وفد نے برطانوی وزیر اعظم جارج لائیڈ سے ملاقات کی۔ برطانوی وزیر اعظم نے اس وفد کو نہایت روکھا پھیکا جواب دے کر ٹالنا چاہا۔ مولانا محمد علی جوہر نے جب اپنی بات پر اصرار کیا تو برطانی وزیر اعظم نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ "میں رات بھر بیٹھ کر آپ کی بات سننا نہیں چاہتا۔" اس نے صرف اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ملاقات کے خاتمے پر جب مولانا سید سلیمان ندویؒ نے خلافت کی اہمیت کے بارے میں ایک کتابچہ دینا چاہا تو برطانوی وزیر اعظم نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور کتاب لینے سے انکار کر دیا۔

جب یہ وفد مختلف ممالک کا دورہ کرتا ہوا نومبر ۱۹۲۰ء میں بھارت واپس پہنچا تو علی برادران اور گاندھی جی کے درمیان یہ طے پایا کہ خلافت کی بحالی کے لیے ملک گیر تحریک

---

[1] اس کا نام مصطفیٰ تھا۔ ۱۸۸۱ء میں سالونیکا میں پیدا ہوا۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔ مدرسہ سالونیکا میں ایک استاد نے اس کا نام مصطفیٰ کمال رکھا۔ لیکن آگے چل کر صرف 'کمال' رہ گیا جس کے معنی ترکی زبان میں قلعے کے ہیں۔ اس پر اتاترک بڑھا دیا گیا۔ یہ ایک ترکی کلمہ ہے جس کے معنی ہیں 'ترکوں کا باپ'۔

چلائی جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں "تحریک عدم تعاون" کی مسلمانوں اور ہندوؤں نے دل کھول کر حمایت کی اور دسمبر ۱۹۲۱ء اور جنوری ۱۹۲۲ء کے درمیانی دو مہینوں میں تین ہزار سے زائد ہندو اور مسلمان جیلوں میں بند کردیئے گئے۔ بھارت کی تاریخ آزادی میں تحریک خلافت کامیاب ہوئی یا نہیں یہ الگ بحث ہے، لیکن آج بھی پورے ملک میں "خلافت تحریک" ہندو مسلم اتحاد کی ایک علامت کے روپ میں جانی جاتی ہے۔

دوسری مرتبہ خلافت کے خاتمے کا اعلان خود ترکی سے ۱۹۲۶ء میں ہوا۔ جب بھارت میں یہ تحریک اپنے شباب پر تھی وہاں استنبول میں مصطفیٰ کمال پاشا، یعنی ترکی کا مرد آہن و برف "نقش نو اندر جہاں باید نہاد" کی فعالیت لیے، ترکی کے مرد بیمار کی رگوں میں قدیم نسخوں کی بجائے جہاد، خود مختاری اور عہد جدید کے مرکب کو سرایت کرانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک موقع پر کہا تھا:

"ہاں! وطنی اگر بھاگے تو غلام بن جائیں گے۔ لیکن جہاد کے بعد غلامی اور جہاد کے بغیر غلامی میں بہت فرق ہے۔ ایک قوم جہاد کرتی ہے۔ پھر گریہ وزاری میں عمر کاٹتی ہے اور دوسری قوم جہاد کے بغیر ذلت کی موت مر جاتی ہے۔"

کمال اتاترک نے پہلے خلیفہ وحید الدین اور پھر خلیفہ عبدالمجید کو جلاوطن کیا اور اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں خلافت کے خاتمے کا باقاعدہ اعلان کردیا۔ اس اعلان سے بھارت میں تحریک خلافت کو زبردست دھچکا لگا اور اس تحریک کے گرانڈیل قائد منہ کے بل گر پڑے۔ علامہ اقبال ابھی زندہ تھے۔ وہ پکار اٹھے:

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا

اقبال نے ترکی نژاد مولانا جلال الدین رومیؒ کو اپنا مجازی استاد تسلیم کیا ہے۔ انہیں اقبال نے "پیر رومی" کے حسین استعارے سے مخاطب کیا ہے۔ اقبال کا خمیر عرب، ترک، عجم اور ہندی روایات اور اولوالعزمیوں سے اٹھا تھا۔ ترکوں کے ذکر کے بغیر کلام اقبال میں ادب، فلسفہ اور تہذیب کی بحثیں نامکمل رہ جاتی ہیں۔ انہوں نے ترکوں کو "مردان حر" کہا ہے۔ ان کے کلام میں جابجا ترکوں کی عظمت اور سطوت کا اعتراف ملتا ہے۔ سقوط خلافت کے بعد جب "خلافت وفد" نے انگلستان، اٹلی اور فرانس کا دورہ کیا تو اقبال نے بجائے مخالفت کے ان پر فلسفیانہ تلقین سے مشوروں کی بارش کی۔ "دریوزۂ خلافت" نظم کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟ — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی!
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی!
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی!

یا پھر اقبال کی شہرہ آفاق نظم "خضر راہ" میں دنیائے اسلام سے متعلق یہ اشعار دیکھئے:

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں — مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز
مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست — مور بے پر! حاجتے پیش سلیمانے مبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر

اور پھر یہ شعر بطور خاص ملاحظہ فرمائیں:

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر!

ان کی نظر میں اگر عالم اسلام کا مومن اس جگر کاوی میں کامیاب ہوگیا تو طلوع اسلام اس کا عین مقدر ہے:

مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی!
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے — شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

آپ نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ کلام اقبال میں ترک، ترکی، ترکمانی بیک وقت جواں مردی، توانائی، بہادری، شمشیر زنی، جوانی و رعنائی، قد کی دلکشی و زیبائی، خوش پوشی، حاضر جوابی و آزادی اور چاق و چوبندی کی علامت ہے۔ حافظ نے بھی حسن و رعنائی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے اور جمال یار کو ترک کے استعارے سے مخاطب کیا ہے:

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دل مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اقبال ایک فقیر بے نوا تھے۔ محبوب کے تل کے عوض میں ہدیہ دینے کے لیے وہ سمرقند اور بخارا کہاں سے لاتے۔ انہوں نے 'اس دعا پر ہی اکتفا کی ہے:

بدستِ ما نہ سمرقند نے بخارا ایست
دعا بگو ز فقیراں بترکِ شیرازی!

اقبال کو سرزمین ترکستان سے گہرا لگاؤ تھا۔ اسی عقیدت کا اظہار ان کی نظم "بلادِ اسلامیہ" میں یوں ہوا ہے:

خطۂ قسطنطنیہ، یعنی قیصر کا دیار — مہدیِ امت کی سطوت کا نشانِ پائیدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے — آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا — تربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کے کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

ترک دنیا کی ان تین قوموں میں سے ایک ہے جو پوری کی پوری اسلام میں داخل ہوگئی۔ اس میں پہلی قوم عرب ہے، دوسری افغانی اور تیسری ترک۔ ترک نسل کی ایک دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تقریباً ہر ترک مسلمان ہوگا، سنی ہوگا اور حنفی ہوگا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو والوں نے ترکی زبان، تہذیب، لباس، نشست و برخاست، طعام، حتیٰ کہ ان سے اپنی نسبت کو کبھی عار نہیں بلکہ سرمایۂ افتخار سمجھا۔ مسلمانوں نے اپنے ناموں کے ساتھ بیگ، چغتائی، برلاس، بیگم، حیدر، یلدرم (بمعنی آگ) اور 'دین' وغیرہ نسلی علامات کو عین اسلامی شعائر کے طور پر استعمال کیا۔ غالب سے لے کر سرسید تک اور تیمور لنگ (۹/اپریل ۱۳۳۶ء تا ۱۸/فروری ۱۴۰۵ء) اور ظہیر الدین محمد بابر (۱۴/فروری ۱۴۸۳ء تا ۲۶/دسمبر ۱۵۳۰ء) سے لے کر والیٔ دکن نظام الملک آصف جاہ تک اپنے آپ کو ترکی اور ترکمانی ہونے پر داد دیتے ہیں اور اپنی

سپہ گری اور عالی ہمتی پر فخر کرتے ہیں۔

نادر شاہ، جو خالص ترکی النسل تھا، جب دہلی کی فتح اور مسلمانوں کے قتل عام سے فارغ ہوا تو اس کے بیٹے نصر اللہ کی شادی مغل بادشاہ محمد شاہ کی بیٹی سے طے ہو گئی۔ نکاح کے وقت دلہن والوں کی طرف سے اصرار ہوا کہ دولہا کی سات پشت تک شجرہ نسب بیان کیا جائے --- نادر شاہ طیش میں آ گیا اور بولا نصر اللہ بن نادر شاہ، بن شمشیر، بن شمشیر، بن شمشیر، بن شمشیر، بن شمشیر

اسلام لانے کے بعد ان ترک مغلوں نے یہ طے کر لیا کہ کسی صورت میں ہم اپنے سے دین کو جدا ہونے نہیں دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ناموں کے آگے لفظ 'دین' ردیف کا آغاز کیا۔ تاکہ ان کے ناموں سے کسی غیر اسلامی ہونے کا شائبہ تک باقی نہ رہے۔ مثلاً ظہیر الدین محمد بابر، جلال الدین محمد اکبر، ابو مظفر شہاب الدین شاہ جہاں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت میں ان کی حکمرانی، عمل داری اور نسلی اختلاط کی وجہ سے ناموں کے آگے 'دین' کا لاحقہ آج بھی مستعمل ہے۔ ریاست حیدر آباد اور بہار میں ایسے ناموں کا چلن عام ہے۔ ریاست حیدر آباد میں شرفا کے لباس میں آج بھی چمڑے کی سرخ کلاہ اور اس پر سیاہ ڈوریوں کا جھولتا ہوا پھندنا شامل ہے، جو "رومی ٹوپی" کہلاتی ہے۔

اردو زبان میں ترکی کے لا تعداد الفاظ مستعمل ہیں۔ خود لفظ "اردو" ترکی زبان میں لشکر کے لیے بولا جاتا ہے۔ فرش کے لیے اردو میں "توشک" اور "جاجم" مستعمل ہے۔ جو خالص ترکی الفاظ ہیں۔ گھوڑے کی گردن کے بالوں کے لیے "ایال" سپاہی کے لیے "یکتاش" گھوڑے یا ٹٹو کے لیے "یابو" بلکہ کم عقل اور کم فہم شخص کے لیے "یابو کا یابو رہنا" بلا تکلف اردو میں مستعمل ہے۔ اسی طرح دریا اور بحر ناپیدا کنار کے "جیحون" کا لفظ دراصل ایک دریا کا نام ہے جو بلخ و بخارا کے نزدیک بہتا ہے۔ افسر خزانہ کے لیے "خزانچی" خالصتاً ترکی ہے۔ دوا کی ایک Dosage اور غذا کے لیے "خوراک" کا لفظ بھی ترکی ہی ہے۔ اردو میں "تومان باندھنا" الزام تراشی ہے جب کہ ترکی میں "تومان" کے معنی پرگنہ اور دس ہزار جیسی خطیر رقم کے ہیں۔ شادی سے ایک روز پہلے دولہا کے گھر سے دلہن کے لیے کچھ میوہ، شیرینی اس کے عروسی لباس کے ساتھ آج بھی خواتین بھیجتی ہیں۔ یہ رسم "ساچق" کہلاتی ہے جو ترکی ہے۔ دشمن پر کی جانے والی چڑھائی "یلغار" ترکی "ایلغار" سے مشتق ہے۔ سپاہی بے چینی اور دشمن کے خلاف بغاوت "یورش" اور شاہی شان و شوکت تزک یا توزک ترکی ہے۔ "تزک جہانگیری" اور "تزک بابری" شاہی تحریریں ہیں جو بالترتیب فارسی اور ترکی زبان میں لکھی گئیں۔ ایلچی، چِک، اتالیق، توپ، پلاؤ، کباب، بریانی، لنگ، قرمز (سرخ) بوتل، کمرہ، تلاش، تغمہ (تمغہ) خانماں، خانساماں، رشتہ، ناشتہ وغیرہ بلا شرکت غیرے ترکی زبان کے الفاظ ہیں۔

کوئی رکشہ یا تانگے والا اگر اپنی بیوی کو "بیگم" کہہ کر بلائے تو وہ یقیناً مذاق کا موضوع بن جائے گا کیونکہ ترکی زبان کا یہ لفظ آج بھی امرا اور حکمرانوں کی خواتین کے لیے بولا جاتا ہے۔ مثلاً، بیگم آف بھوپال، بیگماتِ اودھ، شاہی بیگمات وغیرہ۔ بیگم حضرت محل، بیگم زینت محل وغیرہ تاریخ میں اپنا نام روشن کر چکی ہیں۔

دہلی اور فیض آباد کی معزز خواتین کا گھریلو لہجہ، مخصوص لفظیات، عزت آمیز اسلوب تکلم، محاورہ بندی، نسوانی حیا اور ایک دوسرے کا پاس و لحاظ رکھنے والی اور اونچے گھرانوں میں بولی جانے والی اردو "بیگماتی اردو" کہلاتی ہے۔ اس زبان کے لکھنے اور بولنے والے افراد آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ شہر حیدر آباد کے شرفا خواتین کو مزید عزت بخشنے کے لیے "پاشا" کا ترکی لفظ "بی پاشا" کہہ کر استعمال کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بقچہ، جلو، توشہ، چغہ، خانم بھی ترکی ہیں۔ اردو محاوروں میں "ترکی بہ ترکی جواب دینا" حاضر جوابی اور بے لاگ گفتگو کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اردو فلمی شاعری میں ترکی فوج کی سرخی اور سیلابی کیفیت کو "ترکاں کی فوج" اور جوبن کے ابھار کو تند رانار سے تشبیہ دی گئی ہے۔

اندرا گاندھی نے ۱۹۶۶ء میں بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے انتقال کے بعد کانگریسی اقتدار کو برقرار رکھنے اور بوڑھی قیادت سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے اپنے اطراف جن نوجوان ممبران پارلیمنٹ کو جوڑا تھا ان میں چندر شیکھر، آئی کے گجرال اور موہن دھاریہ آج بھی باحیات ہیں۔ نوجوان لیڈروں کا یہ ٹولہ "ینگ ٹرکس" (Young Turks) کہلاتا تھا اور میڈیا والے بھی انہیں اسی نام سے مخاطب کرتے تھے۔ ترکی وفد اور خالدہ ادیب خانم کے دوروں نے بھی یہاں کی سیاست میں بڑا کمال کیا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ جدید بھارت میں بھی "ترک" کا لفظ بلا تکلف نوجوان کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہو کہ ترکی افواج دونوں عالمی جنگوں میں اپنی جانوں کی پرواہ کیے بغیر یورپ اور ایشیا میں اتحادی فوجوں سے طرابلس، جرمنی، صوفیہ، درۂ دانیال، سمرنا، سیواس، انگورہ (انقرہ) اپنونو، سقاریہ، استنبول، لوزان اور گیلی پول وغیرہ میں لوہا لیتی پھر رہی تھیں۔ یا پھر سلطان تیمور لنگ کی وہ متحرک شخصیت تھی جو ایشیائے کوچک کے سبزہ زاروں سے لے کر چین کی دیوار تک فتوحات کے جھنڈے گاڑ رہی تھی یا پھر ترکی امیر البحر عروج بار بروسہ اور خیر الدین پاشا بار بروسہ کی ترک تازیوں کا نتیجہ تھی جس کے بحری بیڑوں نے مغرب میں بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) کے ساحلوں سے لے کر مشرق میں بحر احمر (Red Sea) تک کی ایک ایک موج کو کھنگال ڈالا تھا۔ مورخوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس سے بڑا امیر البحر آج تک دنیا نے پیدا نہیں کیا۔

صرف اسی پر بس نہیں۔ مہاراشٹر میں مراٹھی کا ایک نہایت مشہور محاورہ ہے۔ ترون ترک آنی مہاتارے ارک یعنی "جوان اوچھے بنے ہیں اور بوڑھے عرق عرق یعنی پشیمان و حیران ہیں۔" مراٹھی زبان والے سخت مزاج لیکن کڑیل بڑے میاں کو بھی "تروِن ترک" ہی کہتے ہیں۔ ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے۔

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم
چہ خوش بودی اگر بودی زبانش در دہانِ من

ترکی خلافتِ عثمانی ایک عرصے تک جزیرۃ العرب پر بھی حکمراں رہی ہے۔ اس ارض مقدس کو انہوں نے اپنا زیر نگیں نہیں سمجھا بلکہ حتی المقدور حرمین شریفین کی خدمت ہی کی ہے۔ آج بھی حرم مکی اور مدنی میں ترکی تعمیرات دیکھی جا سکتی ہیں۔ موجودہ گنبد خضرا سلطان ترکی قائیتبائی کا تعمیر کردہ ہے۔ جست کا ہے اور اس پر سبز رنگ لگایا گیا ہے۔ حرمین شریفین کی تعمیر کے وقت ترکوں نے قدیم تاریخی علامات، تلمیحات اور نشانیوں کو گارے اور چونے میں مشکل کر دیا ہے۔ ترکوں نے ہی مدینہ منورہ سے "تراب حجاز" استنبول اور انقرہ تک ریلوے لائن بچھوائی۔ معدوم نہر زبیدہ جاری کی تاکہ اس لق و دق صحرا میں حاجیوں کے لیے سقایہ کا فریضہ انجام دیا جا سکے۔ ☆☆

محمود شیخ



تمدنی شعور و ادب

تمدن جس قدر ترقی یافتہ ہوگا قومیں اتنی ہی راسخ العقیدہ، مغرور اور متکبر ہوں گی۔ متمدن زندگی جتنی ضروری ہے، اتنی ہی نقصان دہ بھی ہے۔ انسان علم و فن ہی میں نہیں اپنی جہالت میں بھی پختہ تر ہوتا ہے۔ تمدن، انسانی مذاق اور ذوق نظر کا شعور عکسی اور فن و فلسفہ خواہشات نفسی کی تعمیر و تدوین ہے۔ جغرافیائی ماحول، پیشہ، شہرت واقتدار انسانی مزاج اور اس کے شعور نفسی کی خانہ سازی میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ خاندان، معاشرہ اور نظام حکومت —— خواہش، آرزو اور امید کے ذریعہ قوت متخیلہ کو تحریک دیتے ہیں۔ جس سے شعور وادراک و بصیرت کا جنم ہوتا ہے۔ مگر اس کی بنیاد عصبیت پر ہوتی ہے۔ جیسے کم مایہ مٹی میں زرخیزی۔ انسان چونکہ مادی وجود رکھتا ہے، اس لیے عصبیت سے خالی نہیں ہوتا۔ انسان میں پانچ طرح کی عصبیت پائی جاتی ہیں۔ نسلی، قومی، ذاتی، نظریاتی اور بین الاقوامی عصبیت۔ کوئی بھی نظریہ زندگی، فن اور فلسفہ عصبیت سے خالی نہیں ہوتا۔ ذاتی عصبیت میں فرد کی نظر صرف اپنے مفاد پر ہوتی ہے۔ نسلی عصبیت انسان کو مغرور و متکبر بناتی ہے۔ نظریاتی عصبیت میں گرفتار افراد فکری سطح پر تہی دست اور ذہنی محکومیت کا شکار ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی عصبیت خصوصاً سرمایہ وتجارت کے فن میں نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن عصبیت کا مقصد صرف ایک ہے۔ سرمایہ دارانہ شعور اقتدار کی بالادستی جس کے ذریعہ سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی یافتہ اور طاقت ور قومیں غیر ترقی یافتہ ملکوں کی معیشت وتجارت پر اپنا تسلط قائم رکھنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

جسم انسانی حالانکہ مٹی ہی ہے مگر اس کا حسیاتی نظم فضاؤں میں منتشر افکار و نظریات کو اپنے اندر جذب کرنے کی زبردست صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ سماجی حالات اور قدرتی مظاہر، وقت اور ماحول کے مطابق مزاج کو ایک مخصوص جہت میں بیدار کرتے ہیں۔ اس عمل کو خواہشات نفسی کے تابع رکھنے کا مقصد معاشرہ کو زمام فطرت، ضمیر ادراک اور بصیرت کی پابندیوں سے آزاد کرانا ہے۔ اس طرح تعمیری ایثار، دوستی، محبت واخوت کے آفاقی جذبے قومی اور ذاتی نفع نقصان اور مادیاتی تخریبی شعور کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام جدلیاتی نظام عمل کا قائل ہے۔ اس نے سیرامک سائنس (Ceramic Seience) کی اہمیت وافادیت کا پہلے ہی دن اقرار کیا۔ جب اللہ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے دو باتوں کو سمجھنا چاہا۔ پہلی یہ کہ انسان کا وجود مٹی سے ہے دوسری یہ کہ وہ دنیا میں فتنہ و فساد پھیلائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ فرشتے مٹی کی نفسیات سے واقف تھے۔ اللہ نے کہا "جو باتیں میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے" فرشتے مطمئن ہو گئے کیونکہ وہ انسان نہ تھے۔ لیکن شیطان نے اپنی ذات کو مٹی سے بہتر سمجھا اور انکار کر دیا۔ یہ انکار اس میں ذات انا (Ego) کے بے جا تصور نے پیدا کیا تھا۔ اس کی انانیت کی بنیاد اپنی ذات کی برتری اور مٹی کی کم مائیگی کے سبب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل نظر کے یہاں ذات انائی نفی کی جاتی ہے۔ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کاندھے پر مٹی سے بھری بوری اٹھائے راستے سے گزر رہے تھے لوگوں نے دریافت کیا 'یا امیر المومنین یہ کیا کرتے ہیں؟' آپ نے فرمایا 'نفس کو سزا دے رہا ہوں' یہ نکتہ قابل غور ہے کہ امیر نفس کی حقیقت سے واقف ہیں اور کسی گوشہ تنہائی یا کسی خانقاہ میں نہیں برسر عام سزا دی جا رہی ہے۔

جسم کا محسوساتی نظام حواس خمسہ پر منحصر ہے۔ مشینوں کا شور، ٹرافک کی نفسا نفسی، گھنی آبادی، چھوٹے چھوٹے بے ترتیب رہائشی مکانات، دھول، دھواں، آوازیں، بدبو اور مچھر اعصابی نظام عمل میں خلل پیدا کرتے ہیں۔ بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی، اونچی اونچی عمارتیں، ازدواجی زندگی کی بے اعتدالی اور Anti Biotic دواؤں کا بے تحاشہ استعمال بھی اعصاب کو کمزور بنا دیتا ہے۔ جس کا اثر انسان کے حسیاتی نظام پر بھی ہوتا ہے اور بے اعتدالی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے حالات میں ذہنی سکون ضروری ہے۔ سستی تفریحات، جنسی مظاہر اور نفسیاتی لذت کے ذریعہ جسمانی سکون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ نشیلے مشروبات اور کیف آور دوائیں، ذہن کو وقتی طور پر جذباتی دباؤ (Suppression) سے چھٹکارا دلانے میں کامیاب تو ضرور ہوتی ہیں۔ مگر بیماری کا یہ کوئی مستقل علاج نہیں ہے۔ نفسیاتی انتشار کا بھیانک مظاہرہ سماج میں بڑھتی ہوئی درندگی، بے راہ روی، لوٹ کھسوٹ، جبر و استبداد کی صورت آج ہر طرف عام ہے۔ نفسیاتی جبر اور جنسی کج روی کے مظاہرے، سیاست، تجارت، معاشرت، ادب و صحافت میں عام ہیں۔

تہذیب و تمدن، عقل و شعور، سائنس، فلسفہ، تصورات اور علوم و فنون سب کا وجود مادی ہے۔ تحریر اور آواز مادی ہے۔ اور ان کا وجود ہی نفس ہے۔ جذبات

۵۹۲۔ نیا محلہ، مرزا غالب مارگ، جبل پور۔ ۴۸۲۰۰۲

واحساسات پر تو نفس۔ مذاہب نفس کی داخلی تربیت پر زور دیتے ہیں۔ سائنس ظاہر سے باطن کی طرف مراجعت کرتی ہے اور مادیاتی نظم و تسلسل پر یقین رکھتی ہے۔ سائنس کی اپروچ عقلی اور مدلل ہے۔ یہاں شاہد بھی ہے، مشہود بھی، نظر بھی ہے نظارہ بھی۔ انسان بھی ہے، دنیا بھی۔ خواہش بھی ہے اور اس کی تکمیل کے سامان بھی۔ مذاہب سائنسی نظم کو ماورائی یقین کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یقین جامد ہوتا ہے مگر سائنس وسوسہ اور تشکیک کے نئے نئے مفروضات قائم کرتی ہے اور مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہے۔ اس کے نزدیک 'یقین' ضروری نہیں 'تلاش' ضروری ہے۔ مذہب، سکوت، خاموشی اور طمانیت فکر و نظر ہے۔ مذہب و سائنس کا یہی عملی نشاۃ ثانی فکر و آگہی و بصیرت کو تمدنی زندگی کی تحریک دیتا ہے جس سے معاشرتی قدریں متعین ہوتی ہیں اور ذہن انسانی کی سمت شعور کا تعین ہوتا ہے۔

کائنات کی گردش نظام فطرت کے متعین کردہ معیار کے مطابق روز اول سے جاری و ساری ہے۔ زمین، آسمان، دریا، پہاڑ سب کا عمل اپنے محور پر قائم ہے۔ آفتاب معلوم کائنات پر محیط ہے۔ ہوائیں بکھرتی نہیں، بہتی اور معیار توازن برقرار رکھتی ہے۔ خلائی نظام کل پر ہوائی نظام کل کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو آئن اسٹائن (۹ـ۱۸ـ۱۹۵۵ء) ثابت کر چکا ہے۔ خلا میں چونکہ ہوائی پٹیاں نہیں ہوتیں اس لیے سرخ جرثومے بھی وہاں بیدار نہیں ہوتے۔ لہٰذا انسان اور چرند پرند کا بنیادی تصور زندگی سیاروں پر قائم نہیں رہ سکتا۔ وہ تصور حیات جس کی بنا خلا ہے اس کا اطلاق کرۂ ارض پر نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ روشنی اور پتھر، خلا کا سوناپن، تنہائی اور بے وزنی کا احساس کسی غیر مرئی شکل میں ہمارے اندر یا ہمارے آس پاس موجود ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آسمان پر چمکنے والے ستاروں کی روشنی جو زمین پر آ چکی اور جو لاکھوں برس سے زمین کی طرف سفر میں ہے۔ وہ اپنے اندر کچھ ایسے خلائی اثرات بھی رکھتی ہو جس سے انسان آج تک ناواقف ہے۔ قدرت جب تک اپنا اظہار خود نہ کرے انسان لاعلم ہی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سر آئزک نیوٹن نے کہا تھا "میں سمندر کے کنارے سیپیاں چنتا ہوں۔"

چارلس ڈارون (۱۸۰۹۔۱۸۸۲ء) کا ارتقائی نظریہ کائناتی حقائق کو مادیاتی سطح پر سمجھنے کی ایک کوشش ضرور ہے۔ لیکن اس کا اطلاق کل کائنات پر نہیں ہو سکتا۔ زمین کا ارتقائی عمل متضاد اور مخصوص حالات و واقعات کے تابع ہوتا ہے اور حالات پر کسی میکانکی نظریہ حیات کا کنٹرول نہیں ہوتا اس لیے عملی نتائج بھی بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک ہی خاندان ایک ہی ماحول اور ایک کلاس میں پڑھنے والے بچوں کا ذہنی معیار برابر نہیں ہوتا۔ دراصل ارتقائی عمل وقت اور ماحول کا اسیر ہے مگر اس کے اثرات جدا جدا ہوتے ہیں۔ خلا کے ارتقائی عمل کا وقت اور ماحول میں بھی نمایاں فرق ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وقت اور ماحول خود بھی کائناتی ارتقائی عمل کا ایک ادنیٰ سا حصہ ہیں۔ کائنات ہے، اس لیے ارتقاء ہے، ارتقاء ہے، اس لیے وقت اور ماحول ہے، وقت اور ماحول ہے، لہٰذا کائنات بھی ایک دائرہ عمل میں محیط ہے۔ اور انسانی فکر و شعور میں دائرہ کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ ظن و قیاس و تخمین خواہ کتنے ہی جامع کیوں نہ ہوں ناتمام ہی رہتے ہیں۔ لیکن فلسفی عقلی گھر لو پر کس کر انہیں اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ مثلاً فلسفیوں کے یہاں حواس خمسہ، مزاج اور دل کا کوئی اہم مقام نہیں ہے۔ فن و فلسفہ کی اس کمزوری کو خوبی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دراصل عصبیت فکر و نظر مغرور اور متکبر آدمی میں احساس برتری اور کمزور و معذور افراد میں احساس کمتری کو راسخ بنا کر تماشائے فکر و فہم دیکھتی ہے۔

مہاراجہ بھرتری ہری فرماتے ہیں:

> "غلام کے فرائض بھی کتنے کٹھن ہیں۔ یوگیوں کے لیے بھی ان کا نباہنا مشکل ہے۔ غلام اگر چپ رہے تو گونگا۔ بول چال میں چست ہو تو باتونی۔ نزدیک رہے تو ڈھیٹ، دور رہے تو بے وقوف، قوت برداشت رکھتا ہو تو ڈرپوک اور اگر نہ رکھتا ہو تو ذلیل کہلاتا ہے۔"

(ویراگ شتک)

عقل و خرد کا معیار صداقت سائنس اور ٹکنالوجی کے ترقی یافتہ شعور کا احساس و ادراک ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ فرانس، برطانیہ، جرمنی اور امریکہ کے سوا فلسفی اور فنکار، سائنس داں اور محقق دنیا کے کسی اور گوشے میں شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ امریکہ کو آباد ہوئے ابھی پانچ سو برس ہی گزرے ہوں گے۔ تہذیب و تمدن کی کوئی عظیم و صغیر روایت بھی وہاں نہیں ہے۔ اس کے باوجود فن و فلسفہ، سائنس و ٹکنالوجی کے ہر شعبہ میں اسے برتری حاصل ہے۔ تعمیر و ترقی کے سیکڑوں ادوار سے گزر کر بھی رنگ دار قومیں پسماندہ اور غیر مہذب ہی متصور کی جاتی ہیں۔

فن و فلسفہ، سائنس اور ادب کو تاریخ کے کسی دور میں عوامی مقبولیت حاصل نہ تھی۔ یونانی سوفسٹوں کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ یہ لوگ معقول معاوضہ پر بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ سقراط بذات خود ایک مجسمہ ساز کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنی اکادمی کے دروازے ادنیٰ و اعلیٰ سبھی پر کھول دیے، یہی اس کا جرم تھا۔ مگر ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کا استاد کون تھا۔ روم، مصر، چین اور ہندوستان میں بھی تعلیم کے حقدار صرف خواص ہی سمجھے گئے۔ سنسکرت ایک مخصوص طبقہ کی زبان تھی۔ مہاتما بدھ نے اس تعطل کو ختم کرنے کے لیے پالی پراکرت کو ترجیح دی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک تاریخی سچائی ہے کہ کسی بھی رہنما، فلسفی اور فنکار کے فن و فلسفہ پر برسر اقتدار طبقات سے وابستہ افراد اپنی خود ساختہ تاویلات کے ذریعہ قبضہ جما لیتے ہیں۔ علوم و فنون سے عوام کو کچھ خاص رغبت بھی نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی ضرورتوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظام تمدن کسی مضبوط تحریک اور جماعت سے وابستہ برسر اقتدار افراد کی سرپرستی اور حمایت چاہتا ہے۔ تارک الدنیا راہب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ سچائی کا اظہار کل بھی ایک کار زیاں تھا، آج بھی ہے۔ روزی، روٹی اور خانگی مسائل سے نبرد آزمائی روز اول سے ایک عام انسان کا مقدر رہی ہے۔ عوامی ادب، لوک کہانیاں، قصے اور گیت اور عوامی معتقدات کو ہمیشہ ہی متمدن زندگی کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ناول اور افسانے کے کردار کا تعلق بھلے ہی عوامی زندگی سے ہو مگر ان کی اہمیت کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ عوام کے نزدیک عمل کی شناخت کے لیے کوئی رشتہ ضروری ہے۔ محی الدین ابن عربی کے وحدۃ الوجود کا نظریہ خدا، انسان اور کائنات کے رشتوں پر قائم ہے۔ جب کہ یونانی فلسفیوں کے یہاں، عقلیت، سیاست اور معیشت کو غلبہ حاصل ہے۔ یہی تفریق متمدن معاشرہ میں فکر و شعور کو تحریک دیتی ہے۔ انسانی تعلقات اور مرد و زن کے جذباتی رشتوں کی تعبیر میں بھی تمدنی طرز عبودیت ہی کو اختیار کیا جاتا ہے۔ روسو (Rousseau) تمدنی زندگی کا ناقد ہے مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ اس نے رشتہ ازدواج پر

نفسی اور جنسی آزادی کو اہمیت دے کر تنقیدی شعور کو ایک آئیڈیل بھی فراہم کردیا۔ ژاں پال سارتر نے بھی 'عورت اور مرد' کے درمیان 'نکاح' کو ایک غیر ضروری فعل سمجھتا ہے۔ یہ دونوں عقلیت کی اتباع میں 'عمل' کی اس قوت اظہار کو نظر انداز کر گئے جس نے نہ صرف ان کی زندگی پر بلکہ عوامی معاشرتی قدروں پر بھی نہایت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ دنیا کے تمام مرد و زن اگر نکاح کے بغیر زن و شو کے فرائض انجام دیں تو شاید معاشرتی زندگی ایک ایسی بھیانک انارکیت کا شکار ہو جائے جہاں رشتے تو در کنار متمدن زندگی کا تصور بھی فوت ہو جائے گا۔ دراصل مشرقی اخلاقیات پر مغربی فلسفہ کی تنقید جدید تمدنی زندگی کو نفسی اور اخلاقی معیار فراہم کرتی ہے۔ نفس، مادہ اور معیشت کی ضرب حالانکہ مدلل اور کارگر ہے مگر اس کی کامیابی جذبات کے تجارتی شعور کے بغیر مشکوک تھی جیسے فیشن شو، مس ورلڈ شو، اور ماڈل ازم کے ذریعہ عوامی ذہنوں سے متعارف کرانے کی بھرپور کوشش جاری ہے۔ آج تو 'زن، وشو' کے فطری رشتوں کو دام دے کر خریدنے کا چلن عام ہو گیا ہے۔ جسم انسانی چونکہ مادہ ہے لہٰذا اشیا کی طرح اس کی بھی ایک تجارتی قدر و قیمت ہے۔ اس حقیقت کو عام کرنے کا مقصد انسانی رشتوں کو ایک نیا اخلاقی معیار فراہم کرنا، ارباب اقتدار اور جدید سائنس و ٹکنالوجی کا مطمح نظر تو ہو سکتا ہے مگر اسے تمدنی ضرورت اور عوامی رجحان ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ ضرورت اور خواہشات نفسی کے سوا عوام کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ اتباع اور تقلید ان کا مزاج ہوتا ہے اور مٹی کی طرح کسی بھی فکری سانچے میں ڈھلنے کی صلاحیت بھی ان میں ہوتی ہے۔ دولت، شہرت اور طاقت حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی بھی سمجھوتہ کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے شخصی اور قومی تشخص کی انفرادیت کے باوجود برسر اقتدار اور متمدن اقوام کے ساتھ خلط ملط ہونا پسند کرتے ہیں۔ با اثر افراد سے دوستی اور رفاقت ان کے لیے تسکین نفسی کا باعث ہوتی ہے۔

تمدنی زندگی کا معیار صداقت روز بروز بدلتا رہتا ہے۔ سبب یہ کہ اس کی بنیاد ارتھ، کام اور موکش پر ہے۔ مغربی فلسفیوں نے فلسفہ اقتصاد اور جنس کے مادی تصورات ادب کو اس قدر اہمیت دی کہ 'نجات' (موکش) کا تصور انسان کی ذہنی پسماندگی کا مترادف سمجھ لیا گیا۔ فلسفہ اقتصاد کو شعبہ ہائے زندگی پر مسلط کرنے کا مقصد سیاست نفسی کو 'مذہبی روحانیت' کا متبادل قرار دینا تھا۔ تاکہ اقوام عالم نفس اور مادہ کی تگ و دو میں شریک ہو کر ان کی دست گیری اور بالا دستی کی قائل ہو سکیں۔ مغربی نظام فن جس میں ادب و فلسفہ، صحافت و ثقافت کا نیٹ ورک بھی شامل ہے، اس قدر پاور فل ہے کہ 'نجات' کے کسی بھی روحانی نظریے کو پل میں دھواں کر سکتا ہے۔

موجودہ تمدنی زندگی کا انحصار اور سائنس و ٹکنالوجی کا سارا بوجھ Theory of motion اور Theory of relativity پر ہے۔ گزشتہ پانچ سو برس میں انہی دو نظریات فکر نے تمدنی زندگی پر بے پناہ اثرات مرتب کیے ہیں۔ قانون ثقل محض ایک سائنسی نظریہ ہی نہیں، انسان کی متمدن زندگی کا ایک لاشعوری محرک بھی ہے۔ جس کا اطلاق فن و فلسفہ و ادب پر بھی ہوتا ہے۔ دراصل قانون ثقل، عمل اور رد عمل کی تاویل پیش کرتا ہے۔ ادبی زبان میں اسے Tit for tat, Measure for measure جیسے کو تیسا، جیسی کرنی ویسی بھرنی، جو بوؤگے وہی کاٹوگے، اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے، جیسے محاوروں کے ذریعہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ سوا دو سو برس بعد آئن اسٹائن ثابت کرتا ہے کہ نیوٹن کے مذکورہ نظریہ کا اطلاق عظیم تر کائنات پر نہیں ہوتا اور 'نظریہ اضافت' کا قانون پیش کرتا ہے۔ اس طرح دو نظریے مل کر ایک ہی سچائی کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں، جن سے زمین، خلا اور آسمان کے باہمی رشتوں کو سمجھنا آسان ہوتا ہے اور سائنسی حقائق، حیاتیاتی پس منظر میں ایک نیا شعور تخلیقیت متعین کرتے ہیں۔ جس سے نظریات فکر و فن کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کا مشہور ناول 'آگ کا دریا' موضوعاتی نقطہ نظر سے قدیم اور جدید تہذیبوں کے 'عمل اور رد عمل' کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس ٹکراؤ کا نتیجہ 'چمپا احمد' کی تنہائی اور گوتم نیلمبر، کا انت ہیں۔ سفر خلائی منزلوں کی طرح مختلف ناموں سے جاری و ساری ہے۔ کیا اسے 'نظریہ اضافت' کی ادبی تخلیقیت قرار دیا جا سکتا ہے؟ 'شعر شور انگیز' کا مقدمہ مشرقی اور مغربی ادبا، شعرا اور مذہبی علما کے حوالوں سے مزین ہے۔ یہ ایک نئے ادبی رجحان کا عکاس بھی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف ماضی، حال اور مستقبل کو ادبی گلوبلائزیشن کے عصری تناظر میں ایک اکائی کی شکل میں دیکھتا ہے۔ وحدت میں کثرت، یہ ایک مشرقی انسان کی وسیع النظری بھی ہو سکتی ہے اور اس کا خواب اجتماعیت بھی۔ دراصل اجتماعیت کے بغیر تخلیقیت کا تصور بھی ناممکن ہے۔ کائنات میں فرد تو کچھ بھی نہیں۔

معاشرتی وحدت، مجموعہ اضداد ہے۔ زمین، آسمان، ہوا، پانی اور آگ کے درمیان انسان غور و فکر کے ذریعہ زندگی کا اعتبار حاصل کرتا ہے اور متمدن زندگی کی ابتدا ہوتی ہے۔ فلسفہ اقتصاد اور طرز معاشرت کے اخلاقی معیار متعین ہوتے ہیں۔ قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ ان کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔ مگر وہ جذبہ احساس فنا نہیں ہوتا، جس پر تمدنی اساس قائم ہوتی ہے۔

صوت و آہنگ اور جذبات فوراً ختم نہیں ہوتے بلکہ کسی بھی جاندار اور حساس بدن انسان میں ٹیلی ویژن کی تصویر و صوت کی صورت منتقل ہو جاتے ہیں۔ ادیب و شاعر چونکہ خود بھی معاشرتی جزو ہیں لہٰذا ان میں افکار و نظریات کو اختیار کیا جاتا ہے جو ان کی مادی اور نفسی ضرورتوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر تاریخ خود کو دہراتی ہے۔ معلم ثانی ابو نصر محمد بن فارابی (وفات ۹۵۰ء) نے اگر ارسطو کو دریافت نہ کیا ہوتا تو شاید وہ کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔

معاشرہ ارتقا پذیر ہے اور اپنے ماضی کے ذریعہ وسعت اختیار کرتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فن و فلسفہ بھی برگد کے پیڑ کی طرح اپنی جڑیں معاشرتی زمینوں میں گڑا دیتا ہے۔ جس پر ہر دم زندگی کی کونپلیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ پیڑ کی شاخوں کی طرح معاشرتی عوامل کی تعداد مقرر نہ ہونے کے سبب کچھ نہ کچھ سیکھنے کے لیے باقی رہ ہی جاتا ہے اور سمجھ دار آدمی سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان ہی رہتا ہے۔ ایک بار سقراط نے اپنے کسی شاگرد سے کہا۔ "دنیا میں تمام آدمی بے وقوف ہیں۔" اس نے دریافت کیا۔ "کیا، آپ بھی؟" سقراط نے جواب دیا۔ "ہاں، میں بھی! مگر مجھ میں اور عام انسانوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنی بے وقوفی کے بارے میں جانتا ہوں!" یہی وجہ ہے کہ ادب و فن و فلسفہ مسلسل تغیراتی مراحل سے دوچار ہیں۔ لیکن مجبور و محکوم و درماندہ افراد کے افکار و نظریات کی تعمیر میں شعور اقتدار اور توازن فکر و عمل کا فقدان ہوتا ہے۔ لہٰذا تاریخ کے ہر دور میں اصلاح معاشرت اور عالمگیر انسانیت کے جذبوں سے فکری انقلاب کی شروعات ہوتی ہے تاکہ عوامی کردار اپنے وجود کے یقین سے قوت و تحریک حاصل کر سکے اور بہ حیثیت ایک انسان وہ اس عالمگیر برادری کا حصہ بن کر سوچ سکے کہ کاروبار دنیا کا مزاج اور معیار کیا ہے؟ ☆☆

جوان کین

انگریزی سے ترجمہ: محبوب الرحمٰن فاروقی

گلوبل سوسائٹی

پتھروں کا دور ہو یا عہد شکار ہو لوگ اس کائنات کے بارے میں ایک جیسے خیالات رکھتے تھے کہ وہ بہت محدود ہے۔ دنیا کا ایک ایسا تصور جس کی بدولت زمان و مکان میں وہ اپنا قدم مضبوطی سے جما سکیں۔ لیکن کبھی ان کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آئی ہوگی کہ ایک ایسا وقت آئے گا جب پانچوں سمندر اور چھ براعظموں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گے۔ بعد میں دنیا کا یہ نظریہ کہ یہ کائنات ایک مکمل اکائی ہے صرف یورپ کے جدید عہد میں داخل ہونے کے بعد پیدا ہوا جب پوری دنیا میں شہنشاہیت کے نام پر علاقوں پر قبضہ کرنے ان کے وسائل پر تسلط جمانے اور وہاں کے لوگوں کو اپنا محکوم بنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی عیسائی مشنریوں کی وہ کوشش بھی کہ وہ اقتدار کا سہارا لے کر پوری دنیا کے لوگوں کی روحانی نجات کا ذریعہ بنیں یا پھر وہ عزم کہ پوری دنیا میں ایک نظریہ پر قائم جابر حکومت، فاشزم اور مارکسزم، لینن ازم کی آئیڈیالوجی کے تحت سب کو اپنا محکوم بنالیں، نے بھی کائنات کے ایک اکائی کے تصور کو کافی مستحکم کیا۔ پوری دنیا پر قبضہ کرنے کے ان منصوبوں نے دنیا بھر کے لوگوں کو، ان کی تنظیموں کے ماحولیاتی نظام کو بھی متاثر کیا۔ لیکن ہر کوئی اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اب ہمارے اپنے عہد میں ایک بالکل ہی مختلف عالمی نظریہ وجود میں آرہا ہے، جسے گلوبل سول سوسائٹی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

گلوبل سول سوسائٹی کی اصطلاح صرف دس سال پرانی ہے لیکن یہ اب اس طرح رائج ہوگئی ہے کہ ہر شخص، تجارتی تنظیمیں، سفارت کار، سیاست داں، NGOs (غیر سرکاری تنظیمیں) بھی اس کو بطور فیشن استعمال کرنے لگی ہیں لیکن فیشن میں رائج ہونے کے باوجود اس اصطلاح کا استعمال بہت احتیاط کے ساتھ کرنا چاہئے۔ سیاسی اصطلاحات سے بھاری بھر کم الفاظ کی طرح نہ تو ان کے مطلب کی اپنے آپ وضاحت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ تعصب سے پاک ہوتے ہیں۔ جب اسے احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے گا تو اس وقت گلوبل سول سوسائٹی سے مراد وہ غیر سرکاری تنظیمیں ہوں گی جو پوری دنیا میں مختلف فلاحی کاموں میں لگی ہیں اور جن کے اثرات دور تک محسوس کیے جارہے ہیں۔ یہ گلوبل سول سوسائٹی خود مختار تنظیموں اور ان کی طرز زندگی کا حرکی مکسچر ہے اور ان سب میں ایک بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے کہ بہت زیادہ فاصلے اور مختلف رکاوٹوں کے باوجود یہ آپس میں مل کر بین الاقوامی پیمانے پر اپنا کام اس طرح کرتی ہیں جو سرکاری نظام سے باہر ہو۔ یہ تشدد کا استعمال بالکل نہیں کرتیں اور مختلف طرز زندگی رعایت رکھتے ہوئے اور ان کی وقعت کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے وہ ایک دوسرے کے ساتھ دنیا میں اپنا تسلط قائم کررہی ہیں۔

گلوبل سول سوسائٹی عطیات، لابیز گروپس، عوامی احتجاج، چھوٹے بڑے بین الاقوامی صنعتی ادارے، آزاد میڈیا، ٹریڈ یونین اور کھیل کود کی تنظیموں سے اپنی توانائی حاصل کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایمنسٹی انٹرنیشنل، کیتھولک ریلیف فنڈ، فیڈریشن آف انٹرنیشنل فٹ بال ایسوسی ایشن، انٹرنیشنل ریڈ کراس، فورڈ فاؤنڈیشن، نیوز کارپوریشن انٹرنیشنل اور انڈی جینس پیوپلز بائیوڈائیورسٹی نیٹ ورک وغیرہ سے اسے تعاون ملتا ہے۔ بہت سی بین الاقوامی تنظیموں سے یہ امداد حاصل کرتی ہے اور غیر سرکاری تنظیموں کو قائم کرکے ان کے ذریعے پیداوار کے نئے طریقوں میں سرمایہ کاری کرتی ہے۔ ساتھ ہی زندگی کے مختلف طور طریقوں کو مزید مستحکم کرتے ہوئے وہ دور دراز کے مقامی لوگوں میں براہ راست کام کرکے ان کی فکر اور سوچ کو متاثر کرتی ہے۔

گزشتہ صدی کے دوران دنیا میں سول سوسائٹی کی مختلف تنظیموں میں تقریباً دو سو گنا کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ آج ہزاروں چھوٹی منجھولی اور بڑی فرمیں اپنے ملک کی سرحد سے باہر کے ممالک میں تجارت کررہی ہیں۔ اور یہ فرمیں دنیا کی کل پیداوار میں اپنا حصہ بیس فیصد ہونے کے باوجود دنیا کا ۷۰ فیصد سے زیادہ تجارت کررہی ہیں۔ اس کے علاوہ چالیس ہزار کے قریب بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیمیں بغیر کسی منافع کے کام کررہی ہیں۔ اور یہ غیر سرکاری بین الاقوامی تنظیمیں اقوام متحدہ، ورلڈ بینک اور انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ سے دی جانے والی امداد سے کہیں زیادہ رقم بطور امداد فلاحی کاموں میں خرچ کررہی ہیں کیونکہ یوروپین یونین کی طرف سے بطور راحت دی جانے والی امداد انہیں تنظیموں کے ذریعہ ممالک میں خرچ کی جاتی ہیں۔

آمریت پسند ممالک نے ابتدا میں جس عالمی جدید سول سوسائٹی کی بنیاد ڈالی تھی وہی آگے چل کر گلوبلائزیشن کے فروغ کا باعث بنی۔ مثال کے طور پر برٹش سلطنت نے جو کالونیائی طریقہ استعمال کیا اور جس کی بدولت وہ دنیا کی ایک تہائی آبادی پر حکومت کرتے تھے، آگے چل کر گلوبلائزیشن کے فروغ میں ایک تحریک پیدا کی۔ آج کا یہ گلوبلائزیشن کا نظریہ اس بات پر حد سے زیادہ زور دیتا ہے کہ آزاد سول سوسائٹی میں رہنے والے مرد اور عورتوں کو مکمل خود اختیاری حاصل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی آزادی میں رخنہ پیدا کرنے والی دوسری قوتوں کو یہ یکسر نظر انداز کر جاتی ہے۔ پیچ در پیچ سرمایہ کاری کا نظام بلاشبہ ان سب میں سب سے زیادہ قوت رکھتی ہے۔ ۱۹۴۵ء کے بعد معیشت کا جو دور تھا اس میں معیشت پر سرکار کا کنٹرول ہوتا اور سود اور ٹیکس کی شرح میں اپنی ضرورتوں کے تحت ردوبدل کرتے، جس کے دائرہ کار میں جاپان، امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں عوامی سطح پر استعمال کی جانے والی چیزوں کی پیداوار بھی شامل تھی۔ اس پیچ

درپیچ سرمایہ کاری نے ہر طرح کے کنٹرول کو عالمی پیمانے پر تقریباً ختم کردیا۔ بینکنگ، حساب کتاب، موٹر گاڑیاں، ایئر لائنس، مواصلاتی نظام اور اسلحہ کاری میں لگا مجموعی سرمایہ دنیا کے پیداواری سرمایہ کا صرف چوتھا حصہ ہے۔ لیکن پیداوار کی تقسیم صرف اپنے ملک تک محدود نہیں رہ گئی ہے بلکہ وہ اب وقت، قومیت، زبان اور رسم ورواج کو توڑتے ہوئے پوری دنیا میں سرمایہ کاری کا کام کر رہی ہے۔ اس میں ان کے کارکن، ان کی دولت، ان کی اطلاعات، ان کے خام مواد سبھی مل کر دنیا کو ایک چھوٹے سے گوشے میں تبدیل کر رہے ہیں۔ اس پیچ در پیچ سرمایہ کاری کا اثر ترقی یافتہ ممالک ہیں لیکن انہوں نے یورپ، ایشیا، بحر الکاہل لاطینی امریکہ کے علاقوں میں اپنا جال پھیلا رکھا ہے۔ یہ پیچ در پیچ سرمایہ کاری، لیبر مارکیٹ کے اصولوں کو توڑ کر اور قانون کی بالادستی کو ختم کرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے اور اسی لیے اب دنیا میں مشترکہ صنعتی گھرانے کا زیادہ فروغ ہو رہا ہے۔ یہ ہر قسم کے تشدد کے خلاف ہیں تاکہ اپنا کام بغیر رکاوٹ کے آزادانہ طور پر کر سکیں۔ لیکن یہ اس پیچ در پیچ سرمایہ کاری کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ انہیں یہ اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں اپنے کارکنوں کو ملازمت میں رکھیں اور جب چاہیں انہیں نکال دیں۔ پوری دنیا کو وہ مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنے یہاں طرز زندگی کا وہ معیار قائم کریں جہاں Window two thousand ماسٹر کارڈ، تجارتی اڈے، قائم ہوں اور جہاں صارف کو اس کی پسندیدہ چیز آسانی سے مل جائے۔ اس پیچ در پیچ سرمایہ کاری کی بدولت بڑی کمپنیاں جیسے فورڈ اور فلپ مارس کی مجموعی پیداوار ناروے اور نیوزی لینڈ جیسے ممالک کی گھریلو پیداوار سے کہیں بہت زیادہ ہیں۔ یہ اپنے ایکزیکیٹیو اور وکلا کے ذریعہ عالمی پیمانے پر اس طرح کا کام کرتی ہیں کہ ان کے خلاف کہیں بھی کوئی مزاحمت نہ ہونے پائے حالانکہ بین الاقوامی پیمانے پر دنیا کے مختلف ممالک میں ان کے بڑھتے اثرات کے خلاف احتجاج ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

لیکن ایسا نہیں کہ گلوبل سوسائٹی صرف پیچ در پیچ سرمایہ کاری نظام کی پیداوار ہے۔ اس کی تنظیمیں صرف ہمت یا بازار کی طاقتوں کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ اکثر یہ ایک ملک سے دوسرے ملک کو متاثر کرنے والے کاموں کی وجہ سے بھی پیدا ہوئے ہیں۔ خود حکومت کا نظام بھی انہیں آگے بڑھانے میں تعاون کرتا رہا ہے اس کے باوجود وہ غیر منافع بخش تنظیموں کو مدد دینے میں بہت آگے نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر عام طور پر سرکاریں اعلیٰ تعلیمی میدان میں سرمایہ لگاتی ہیں اور اس کے ذریعے وہ ایک جیسی زبان ایک جیسی طرز تعلیم وغیرہ کو بھی فروغ دیتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس گلوبل سوسائٹی کو آگے بڑھانے میں گلوبل کانفرنسز جیسے Earth Summit یا عورتوں کی آبادی اور حقوق سے متعلق قاہرہ اور بیجنگ میں ہوئی کانفرنسیں بھی معاون رہی ہیں۔ اس لیے گلوبل سوسائٹی کو سیاسی اداروں کا رقیب نہیں سمجھنا چاہئے۔ ادھر گلوبل سول سوسائٹی نے اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے بہت سے بین الاقوامی ادارے بھی قائم کر رکھے ہیں جیسے انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس، انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیمیں وغیرہ۔

تاہم اب بھی دنیا کا بڑا علاقہ اور آبادی کی اکثریت اس گلوبل سوسائٹی کے دائرہ کار سے باہر رہ گئی ہے۔ آج بھی دنیا کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی اس قدر غربت کا شکار ہے کہ وہ ایک کتاب بھی نہیں خرید سکتی۔ ان میں سے ایک بڑی اکثریت نے اپنی پوری زندگی میں کبھی ٹیلی فون کا استعمال نہیں کیا ہے اور آج بھی صرف ایک فیصد آبادی کو انٹرنیٹ کی سہولت حاصل ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ مقامی ناانصافیوں سے گھری ہوئی پریشان زندگیوں میں یہ گلوبل سول سوسائٹی ایک نخلستان کا ہی کام کر رہی ہے۔ لیکن اس نخلستان کو بھی ہمیشہ کے لیے پائیدار نہیں سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ ایسے بھی عناصر ہیں جو اپنی ملی ہوئی آزادی کا بے جا استعمال کر کے ان کے فائدے صرف اپنے تک محدود رکھ رہے ہیں۔ سرحدوں کے بغیر یہ ادلا بدلی بہت سے کام کرتی ہے۔ جیسے گلوبل کارپوریشن طاقت حاصل کرنے والے نظریوں کو فروغ دیتی ہے۔ اور اسی طرح سے مقامی اور قومی مفاد کو دیکھتے ہوئے سیاسی مزاحمت بھی پیدا کرتی ہے۔

وسط انیسویں صدی کے بعد سے مواصلات کے شعبے میں ہوئی ترقی نے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں سمیٹ لیا ہے اور جس نے زمان ومکان کے فاصلوں پر فتح پاتے ہوئے بیک وقت سب کو ایک دھارے سے جوڑ دیا ہے وہ بھی گلوبل سول سوسائٹی کے فروغ میں بہت اہم رول ادا کر رہی ہے اس مواصلاتی نظام کی شروعات زمینی اور زیر آب ٹیلی گرافی سے ہوئی اور اس نے رائٹر اور دوسری بین الاقوامی خبر رساں ایجنسیوں کو پیدا کیا اب اس کی بدولت آسمانوں کے چکر لگانے والے یا ایک جگہ پر مقیم سٹیلائٹس سے ڈیجیٹل میڈیا کا فروغ ہوا ہے اور اس نے CNN اور سونی جیسے میڈیا کو پیدا کیا۔ جن کا ہیڈ کوارٹر گرچہ امریکہ میں ہے لیکن انہوں نے اپنے اشتہارات کے ذریعہ پوری دنیا کو اپنے حصار میں لے لیا ہے اور یہ میڈیا خبروں، کھیل کود، فلم اور موسیقی کے ذریعہ دنیا بھر کی تجارت کو فروغ دے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی یہ لوگ کہیں بھی ایسے پیچ در پیچ سرمایہ دارانہ ذہنیت کے سامع نہیں پیدا کر رہے ہیں جو سیاسی طور پر فعال ہو سکیں۔ ان کا ناظر آج بھی ایک مجہول تماشہ بین ہوتا ہے لیکن یہ کہنا بھی بالکل صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کی وجہ سے میکڈونل اور پیپسی وغیرہ نے آج بھی پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہے۔ چاہے جنوبی ایشیا کے گاؤں ہوں یا وسط امریکہ، شنگھائی، سڈنی، جوہانسبرگ اور قاہرہ یہ سبھی ان کے زیر اثر مقامی ثقافتی اختلافات کو بھی بڑھاوا دے رہے ہیں۔ یہ مقامی ضرورتوں اور گلوبل سول سوسائٹی کی مختلف النوع ثقافتوں کے درمیان مفاہمت رکھتے ہوئے بھی دونوں کی حفاظت کر رہی ہے۔ اور دونوں کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ کثیر جمعی سرمایہ کاری بھی اس بات کی ضرورت محسوس کرتی ہے کہ وہ اپنے سامانوں کی مقامی زبان اور مقامی روایات کے پس منظر میں تشہیر کریں۔ ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے ان وسیع جیٹ ہوائی جہازوں، کمپیوٹرائزڈ مواصلاتی نظام اور سٹیلائٹ براڈ کاسٹنگ کا جس کے ذریعے ہم سرحد کے پار بھی دوسرے ممالک کے ایسے مناظر کو آنکھوں کے سامنے دیکھ سکتے ہیں جو دنیا کے کسی کونے میں ہوا ہو۔ کہیں بھی کوئی بھی حادثہ ہو جائے اسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے اور اس میں شامل ہوئے بغیر بھی ان سے ہمدردی کر سکتا ہے۔ ہمیں اب یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ کس طرح ملٹی نیشنل کمپنیز اپنے فائدے کے لیے ماحولیاتی توازن بگاڑ رہے ہیں۔ گلوبل سوسائٹی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر جگہ جمہوری نظام قائم ہو۔ ابھی گزشتہ سال برما میں ہوئے انتخابات کے بعد جس طرح وہاں منتخب وزیر اعظم اونگ سوئی ای کو نظر بند کیا گیا اس کے خلاف پوری دنیا نے آوازیں اٹھائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ گلوبل سوسائٹی جو اب وجود میں آچکی ہے اپنے قوانین خود وضع کرنے کہ وہ پوری دنیا میں کس طرح سے کام کرے، جس سے مقامی لوگوں کی ثقافت بھی محفوظ رہے اور وہ اپنے کو عالمی سوسائٹی کا باشندہ بھی سمجھیں۔ ☆☆

(بشکریہ: ٹائمس لٹریری سپلمنٹ لندن، ۱۸ر مئی ۲۰۰۱ء)

غزلیں

نشتر خانقاہی

تعمیر ہم نے کی تھی، ہمیں نے گرادیے
شب کو محل بنائے سویرے گرادیے

کمزور جو ہوتے ہوں، وہ رشتے کسے عزیز
پیلے پڑے تو شاخ نے پتے گرادیے

اب تک ہماری عمر کا بچپن نہیں گیا
گھر سے چلے تھے، جیب کے پیسے گرادیے

پتھر سے دل کی آگ سنبھالی نہیں گئی
کھائی ذرا سی چوٹ، پتنگے گرادیے

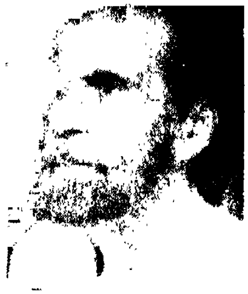
برسوں ہوئے تھے جن کی تہیں کھولتے ہوئے
اپنی نظر سے ہم نے وہ چہرے گرادیے

شہر طرب میں رات ہوا تیز تھی بہت
کاندھوں سے مہوشوں کے دوپٹے گرادیے

تاب نظر کو حوصلہ ملنا ہی تھا کبھی
کیوں تم نے احتیاط میں پردے گرادیے

۴۷۳۔ چمنڈا روڈ، جاٹان۔ بی۔ ۴، بجنور

بشر نواز



پھر دیے جلنے لگے آنے لگے پھر یاد لوگ
فاصلے رکھ رکھ کے پھر کرنے لگے بیداد لوگ

اور دل میں تھا ہی کیا ویرانیٔ دل کے سوا
اس خرابے میں بھی لیکن ہوگئے آباد لوگ

ہم ہیں اپنے آپ میں اک داستاں سن لو ہمیں
اپنے ہاتھوں آپ یوں ہوتے ہیں کم برباد لوگ

آندھیوں کے دوش پر بنیاد ہر رشتے کی ہے
کیا سمجھ کر ہو رہے اس قدر دلشاد لوگ

آنسوؤں میں بھیگ کر منظر سہانے ہوگئے
اور پیارے لگ رہے ہیں کچھ ستم ایجاد لوگ

ہم سے کیا دامن بچانا ہم سے کیا ناراضگی
ہیں تمہارے شہر کی رونق ہمیں برباد لوگ

اب اسے کہیے تو کیا کہیے، دعا یا بددعا
گلیوں گلیوں چیختے پھرتے ہیں زندہ باد لوگ

ایک اور طلسم ہوشربا

کئی شہر بسے بھی اجڑ بھی گیے
مرا اپنا شہر بسا ہی نہیں
کوئی خوف نہ تھا مجھے لٹنے کا
مرے دامن میں کچھ تھا ہی نہیں

سو بھول کے اپنا سود وزیاں
میں ڈوب گیا اس میلے میں
بس دید کو اپنا حق جانا
الجھا نہیں اور جھمیلے میں

تب ایک تماشا سامنے تھا
اور میں خاموش تماشائی
اک شوخ بگولا رقص میں تھا
ہر شخص تھا جس کا تمنائی

تھا رقص کچھ اتنا ہوشربا
سب محو ہوئے بچوں کی طرح
پھر جاگتی آنکھوں نے دیکھا
سب اڑنے لگے تنکوں کی طرح

وہ اپنے ہنر پر تھا نازاں
یہ خواب انوکھے بنتے تھے
یاد آنے لگی رہ رہ کے جو
بچپن میں کہانی سنتے تھے

میں ترساں، لرزاں، حیراں سا
چپ چاپ تماشا کرتا تھا
اس کھیل میں شامل کیا ہوتا
نظارے سے جس کے ڈرتا تھا

پھر ایک عجب انہونی ہوئی
میں چونک پڑا میں کانپ اٹھا
ان اڑتے گرتے تنکوں میں
خود میں بھی! میں بھی شامل تھا

جبلی پارک، بھڑکل گیٹ، اورنگ آباد۔ ۴۳۱۰۰۱

نظمیں

ساحل احمد



شیطنت

شیطنت جب قہقہے لگاتی ہے
راستی کی عمر اور بڑھ جاتی ہے
دھوپ جو زمین پر تھی
در و دیوار پر چڑھ جاتی ہے
صدق و صفا کو بارونق دیکھ کر
منافقوں کی شیطنت بڑھ جاتی ہے
جیسے کوئی امر بیل
حلیم درخت پر چڑھ جاتی ہے
لپٹ جاتی ہے
درخت کی حلیمی اور نرمی
رہائی کی دعا مانگتی ہے
دعا قبول ہوتی ہے
خزاں آتی ہے
بیل سوکھ کر جھڑ جاتی ہے
یہی انجام ہے شیطنت کا
اپنی موت مر جاتی ہے

خود کا حساب کرو

رہ راستی پر جتنا چل سکتے ہو چلو
حساب مت کرو
سمتیں خود معین ہو جاتی ہیں
سمتوں کا حساب مت کرو
حساب کرو تو
خود کا حساب کرو

کسی آئینے کا

میں خود کا تعارف کیا دے سکتا ہوں
آئینہ جب مجھ کو میرا ہی چہرہ دکھلاتا ہے
جیسے میرا چہرہ میرا نہیں
آئینے کا ہے
لیکن جس کا چہرہ اپنا چہرہ ہوتا ہے
واقعی اس کا چہرہ ہوتا ہے
آئینہ ایسے چہرے کو دکھلانے سے عاجز ہوتا ہے
وہ اس چہرے کو
منعکس کیسے کر سکتا ہے
کیوں کہ
جو چہرہ، چہرہ ہوتا ہے
محتاج نہیں وہ ہوتا ہے
کسی آئینے کا
کسی واسطے کا

کرب مسافت

راستے کے کرب سے گھبرا کر
نقش پا ہٹ جاتے ہیں
دھوپ اور سائے کے بوجھ سے
یا مٹ جاتے ہیں
پیچھے مڑ کر کس راہی نے دیکھا ہے
راہی نقش قدم کو گنتا کب ہے
پیچھے پیچھے دور تلک
نقش قدم کا میلہ لگ جاتا ہے
لیکن پہچان سبھی کی کھو جاتی ہے
یادیں کنکر چنتے چنتے سو جاتی ہیں
رکھ کر پتھر سرہانے راہی بھی
رات گئے تک سو جاتا ہے
کرب مسافت باندھ کے پلکوں سے
اشک لہو کے بو جاتا ہے

لٹریری بک سینٹر۔ ۱۲۶ چک، الہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

بھگوان داس اعجاز



مہمان

ابھی اور کچھ دن یہاں، ٹھہرے گا مہمان
لے آئے بازار میں، ہم گھر کا سامان

پہنچا کیسے شہر میں، پریشان مہمان
لوگ سبھی ہیں سرکنے، ہو کیسے پہچان

گھر کے باہر رکھ رہے، گھر والے سامان
تنگ کوٹھری دیکھ کر، گھبرایا مہمان

مہنگائی کے دور میں، پڑے دوہری مار
گھر میں ڈر مہمان کا، باہر چور چکار

شرم کرے بھوکا مرے، دو گھر کا مہمان
دو گھر جیسے تو مرے، کھاٹ پکڑ نادان

مہمانوں کا سلسلہ، اک آئے اک جائے
کاگا ناچے چھت پہ، گھر بن گیا سرائے

کیا جانوں کب آئے گا، وہ پیارا مہمان
بنوایا جس کے لیے، میں نے نیا مکان

کسی اور مہمان کا، تج تو خواب خیال
جو گھر میں موجود ہیں، پہلے انہیں تو پال

برسوں جس کو پیار سے، رکھا تھا مہمان
وہی لوٹ کر لے گیا، گھر کا سب سامان

بی ۵۱-۴ بلجیت نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۸

شان الحق حقی

دو غزلیں

اے وہ ارمانوں کے جھرمٹ وہ دھنک گوں سپنے
ہم اک آکاش لیے پھرتے تھے سر میں اپنے

من میں اُتساہ کہاں، آہ بچی ہے باقی
سوز الفت کی جگہ جسم لگا اب تپنے

پائے چوبیں پہ دسہرے کے ہوں راون جیسے
قد سرفرازوں کا ناٹھی سے لگا ہے نپنے

گھاٹ پر صبح کئی شوخ نظر بن کے مہنت
بیٹھ جاتے ہیں ہری اوم کی مالا جپنے

اپنا ممکن نہیں ہر کس سے تو سازو سنجوگ
غیر بھی آپ کی صحبت میں لگا اب ٹپنے

یارو اغیار سے ناتی وملاقاتی سے
ہم کو لینا نہیں کچھ، ہیں سبھی اپنے اپنے

ہے کھلی آنکھوں میں کیا سرمۂ عبرت کے سوا
نہ وہ آشاؤں کے گلشن نہ بہاریں سپنے

خوف تھا خونِ فصاحت کا نہ آئے الزام
کس کی لکھی یہ غزل آج چلی ہے چھپنے

کبھی تو جگ میں آئے گا صداقتوں کا راج بھی
مٹے گی یہ تمس گھمس تجے گا ست کا ساج بھی

مہان سورماؤں ہی کا نقش نو ہیں کچھ کہیں
کہ جیسے عاجِ فیل سے بنے ہیں فیلِ عاج بھی

غلام بال بیند ھا ہے دل اک نہ دو ہزار کا
ہے منتِ بتاں بھی اور سماجتِ سماج بھی

نہیں ہو توہین مت سمجھ انا کے ظرف کو
شکستہ ہو کے دھار دار ہو گیا زجاج بھی

مفر ہی کیا ہے مر بھکوں کو ترک زیست کے سوا
کہ گھر کے مول تل رہا ہے دانۂ اناج بھی

تونگروں کو برگ وساز عیش کی کمی نہیں
جفا کشوں کے واسطے نہیں ہے کام کاج بھی

نہ حقی آئے گا تمہیں یہ شدھ اشدھ کا میل راس
محال ہے کہ رکھ سکو سخنوری کی لاج بھی

گیان گوہر تو گم دل کے اندر ہی تھا
سیپ در سیپ میں جس کو ڈھونڈا کیا
جو کوئی قافلے کا ہوا رہنما
راہ میں میل پتھر کی صورت گڑا
کچھ سراغ بدھاتا نہ بھید بشر
یہ بھی بس ہے کہ دوارِ صنم مل گیا
رات ودن ایک کرکے جو منزل ملی
اس پہ بھی ہے وہی رات ودن ایک سا
خوب ہے آنکھ کی گپت گفتار بھی
اور ہونٹوں کا وہ سرگمِ بے صدا
آپ اپنا ہی ایما واچھا کہیں
ہے غرض دل کے ارمان و آشا سے کیا
چاہ دل کے لیے چاہِ یوسف بنی
قافلہ جس پہ کوئی نہ وارد ہوا
تھا پتنگا بھی کیسا چھلاوا صفت
دیکھتے دیکھتے لاپتہ ہو گیا
راہ دنیا نہیں دھار تلوار ہے
جس میں پڑتا ہے ہر پگ پہ پگ تھامنا
اوپری بھاو میں بھید باطن کہاں
اور بھروسا ہی کیا روغن و روپ کا
تم ہی ست رنگ کچھ دل کی باتیں کہو
آج ہر لب پہ ہے قفل ابجد پڑا

341, Frantenac, D. D.O, Que. H9G IR4 Canada

غزلیں

حامدی کاشمیری

سر دشت طلب کوئی نہیں ہے
وہی ہیں سب کے سب، کوئی نہیں ہے

یہ کیسا عرصۂ کرب وبلا ہے
یہاں نوحہ بلب کوئی نہیں ہے

ستارے بھی پکار آئے افق سے
سر صحرائے شب کوئی نہیں ہے

عزیزو، چارہ جوئی کیا کروگے؟
غمِ دل کا سبب کوئی نہیں ہے

بدل لیتے ہیں چہرے دم زدن میں
مگر اس میں عجب کوئی نہیں ہے

مرے ہمراہ تھا بس اک ستارہ
قریب ودور اب کوئی نہیں ہے

کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سرینگر

چندر پرکاش شاد



بے مسافت ہی سزا بنتے گئے ہم
گھر کے اندر گردِ پا بنتے گئے ہم

اَن سُنا سا ماجرا بنتے گئے ہم
اک مجسم واہما بنتے گئے ہم

دلدلوں کے ہم نوا چاروں طرف تھے
اور مسافر آشنا بنتے گئے ہم

سب پرائے ہوگئے سیل زیاں میں
آپ اپنا آسرا بنتے گئے ہم

نامکمل رابطوں کی سرزنش میں
ٹوٹا پھوٹا آئنہ بنتے گئے ہم

چھپے آبادیوں کے سب بھلاکر
اک جھلستی سی ہوا بنتے گئے ہم

آسمانی قہر ست تو بچ گئے تھے
خندقوں کی بد دعا بنتے گئے ہم

رفتہ رفتہ ہٹ گئے اپنی ڈگر سے
اور خطا اندر خطا بنتے گئے ہم

(۲)

بڑے دن ہوئے مجھے دشمنوں کی خبر نہیں
میں اب آپ اپنا حصار ہوں، کوئی ڈر نہیں

کئی مرحلے تھے جو کھائیوں میں پھسل گئے
رمِ ماہ وسال ضیافتوں کا سفر نہیں

میں تو بے مقام ہوں کون آکے ملے مجھے
مرے آس پاس تو راستوں کا گزر نہیں

کہ میں آپ اپنا شکار ہوں کئی سال سے
مرے شہر کا کوئی سانحہ ترے سر نہیں

کوئی آنے والا سماں بھی اس میں شریک ہے
یہ جو روشنی ہے گزشت ہی کا ثمر نہیں

میں گھرا ہوا ہوں خموشیوں کے ہجوم میں
کوئی غل نہیں کوئی جشن شاخ وشجر نہیں

مرے جسم وجاں کو دھواں بنا کے اچھال دے
مرے ارد گرد کی راکھ میں وہ شرر نہیں

جے ۲۱۲۔ جیون نکیتن، ایل آئی سی کالونی، پشچم وہار، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۸۷

مستزاد

فاروق جائسی

(شمس الرحمٰن فاروقی کی نذر)

"مجھ سے صد رنگ کو دنیا نہ سمجھ پائی کہ میں" کیسا ہوں
صاف ظاہر ہوئی اس سے مری یکتائی کہ میں کیسا ہوں

ایک ہی رخ پہ بہا ہوں میں بہے جاؤں گا
کوئی طاقت بھی مجھے روک نہیں پائی کہ میں دریا ہوں

حق نگر بھی ہوں حق آگاہ بھی ہوں مشرب میں
کس لئے ہو مجھے اندیشۂ رسوائی کہ میں سچا ہوں

ایک قطرہ نہ ملا ابر گہر بار سے بھی
خشکی و تشنہ لبی میرا مقدر ہے کہ میں صحرا ہوں

کوئی فاروق نہیں پاس وہ اپنا ہو کہ غیر
روح کیوں کر نہ رہے پھر مری گھبرائی کہ میں تنہا ہوں

۲۰۶۔ سنگیتا اپارٹمنٹس، ۵۹ / ۱۴۔ سول لائنز، کانپور۔۱

غزلیں

نوشاد مومن

وہ آنکھیں تر نہیں ہوتیں کہ آنچل نم نہیں ہوتا
مگر جو درد میرے دل میں ہے وہ کم نہیں ہوتا

وہی ہے دوست جو ہر مرحلے میں ساتھ دیتا ہے
ہزاروں چلنے والوں میں کوئی ہمدم نہیں ہوتا

یہ لگتا ہے یقیناً کوئی سازش رچ رہا ہوگا
وگرنہ کیوں وہ میری بات پر برہم نہیں ہوتا

طبیعت میں ہے خودداری یہی تو عیب ہے میرا
کہ گردن ٹوٹ جاتی ہے مگر سر خم نہیں ہوتا

مری بربادیوں پر اس قدر سرگوشیاں کیوں ہیں
کبھی گھر میں کسی کے کیا کوئی ماتم نہیں ہوتا

تکبر زندگی کی راہ میں دیوار ہے مومن
اسی کو مرتبہ ملتا ہے جس میں "ہم" نہیں ہوتا

جے ۸۵ ۰ نوپسیا روڈ، کولکاتا۔ ۷۰۰۰۳۹

ابرار اعظمی



مرے ذہن مضطرب کو، ہے سکون اب زیادہ
نہ ہے دید کی تمنا، نہ ہی اعتبار وعدہ

مری چشم نم کو دیکھا تو یوں مسکرا کے بولے
چلے آئے ہیں یوں ہی ہم، یہ کرم ہے بے ارادہ

مری شاخ آرزو کو نہ بہار راس آئی
نہ کوئی شگوفہ پھوٹا، نہ ہی برگ برگ زادہ

کسے عرض مدعا کا کوئی کب صلہ ملا ہے
کبھی گم ہوئی ہے منزل، کبھی کھو گیا ہے جادہ

یہ تری نظر ہے گویا کہ فریب ہے نظر کا
ہمہ رقص فرما جلوے، کبھی کم کبھی زیادہ

غم عشق ضوفشاں ہے، لئے جا رہا ہے مجھ کو
ہے یہ جسم و جاں کا رشتہ، کہاں عزم، کیا ارادہ

یہ عجیب کیفیت ہے شب روز ان دنوں کیوں
کبھی وہم لگتی مینا، کبھی خواب لگتا بادہ

کئی آسماں تراشے، کئی دن کے خواب دیکھے
یہ شعور لم یزل نے دیا مجھ کو کچھ زیادہ

مرے خواب مضمحل ہیں تو خطا ہے اس میں کس کی
ہے ترا ہی ابر امکاں، تو ہے لطف کا اعادہ

خالص پور، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۱۳۸

آر کے نارائن

انگریزی سے ترجمہ: عظیم اقبال

ایک نجومی کا دن

An Astrologer's Day

وقت کی پابندی برتتے ہوئے ٹھیک دوپہر کو س نے اپنا تھیلا کھولا اور اپنے پیشہ ورانہ ساز و سامان پھیلا دئے، ان میں یہ اشیا شامل تھیں—ایک درجن لوڑیاں، کپڑے کا ایک مربع نما ٹکڑا، جس پر مبہم ستو صفانہ جدول بنا تھا، ایک بیاض اور پام کے پتوں پر تحریر کچھ چیزیں۔ اس کی پیشانی متبرک راکھ اور سیندور سے منور تھی اور اس کی آنکھیں غیر معمولی طور سے روشن تھیں۔ یہ غیر معمولی چمک واقعتاً موکلوں کی متواتر تلاش کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی، لیکن جسے س کے سادہ لوح موکل پیغمبرانہ نور تصور کرتے تھے اور س سے متاثر ہوتے تھے۔ اس کی آنکھوں کی چمک ان کے مقام کے سبب گوناگوں ہو جاتی تھیں۔ روغن آمیز پیشانی اور سیاہ مونچھیں گالوں پر لہراتی دیکھ کر کسی سادہ دل کی آنکھیں بھی چمک اٹھتیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ زعفرانی رنگ کی پگڑی سر پر باندھ لیتا تھا۔

رنگوں کا یہ انتخاب کبھی بے اثر نہ ہوتا تھا۔ لوگ س کی جانب ایسے ہی کھنچے آتے تھے، جیسے شہد کی مکھیاں، کا سماس، یا ڈالیہ کی ڈنٹھل کی جانب کھینچتی ہوں۔ وہ ٹاؤن ہال سے گزرنے والی سڑک کے ایک جانب پھیلتے ہوئے املی کے ایک درخت کے نیچے بیٹھتا تھا۔ کئی طرح سے یہ ایک نمایاں جگہ تھی،

صبح سے رات تک اس تنگ سڑک پر آتے، جاتے لوگوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ راستے کے اغل بغل مختلف تجارتوں اور پیشوں کی نمائندگی ہوتی تھی، دوا فروش، چوری نیز کباڑ کی چیزیں فروخت کرنے والے، جادوگر اور مزید برآں، ارزاں کپڑے کی فروخت کرنے والا ایک شخص، جو سارے شہر کو متوجہ کرنے کے لیے سارا دن شور مچاتا رہتا تھا۔ شور مچانے میں اس سے ذرا ہی کم ایک خوانچے والا تھا، جو تلی ہوئی مونگ پھلی فروخت کرتا تھ، جو اپنے سودے کو ہر دن ایک نیا نام دیتا، جیسے ایک دن ”بمبے آئس کریم“ اور اگلے دن ”دہلی کے بادام“ اور تیسرے دن ”راجہ کے پکوان“ وغیرہ۔ اور لوگ اس کے گرد جمگھٹا لگائے رہتے۔

اس بھیڑ کا ایک خاطر خواہ حصہ نجومی کے گرد بھی جمع رہتا۔ نجومی اپنا کاروبار مونگ پھلی کے ڈھیر کے قریب ہی رکھے دئے کی لہلہاتی اور دھوئیں اگلتی روشنی میں انجام دیتا۔ اس جگہ کی نصف کشش اس لیے بھی تھی کہ اسٹریٹ لائٹ کی روشنی کی رسائی یہاں تک نہ تھی۔ دکانوں کی روشنیوں سے یہ جگہ روشن رہتی تھی۔ ایک دو جگہ پر شور گیس کی روشنی تھی، کچھ جگہوں پر کھمبوں پر ٹنگے مشعلوں کی روشنی تھی، کچھ جگہوں پر سائکل کے لیمپ کی روشنی تھی جس کی وجہ سے نجومی اپنی روشنی کے بغیر ہی کام چلا رہا تھا۔ روشنی کی کرنیں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی عجیب وغریب پرچھائیاں بنا رہی تھیں، جو نجومی کے لیے بڑی کارگر ہوتیں، اس کا سبب یہ تھا کہ نجومی نے جب زندگی شروع کی تھی تو اس نے ذرہ برابر نجومی بننے کا ارادہ نہ کیا تھا اور اسے علم تھا کہ اگلے منٹ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ ستاروں سے اسی قدر اجنبی تھا، جس قدر اس کے سادہ لوح موکل تھے، تاہم وہ وہی سب کہتا، جس سے سبھی خوش ہوتے اور حیرت کرتے۔ یہ مطالعہ، ریاض اور چالاکی سے لگائے گئے اندازے کے سبب تھا۔ بہرحال اس کی مشقت کسی بھی ایماندار شخص کی مشقت جیسی تھی اور دن کے اختتام پر وہ جو کچھ کمائی گھر لے جاتا، وہ اس کا مستحق تھا۔

اپنا گاؤں اس نے بنا سوچے اور بغیر کسی منصوبہ کے چھوڑ دیا تھا۔ گر وہ وہاں رہ جاتا تو وہ اپنے آباواجداد کے مشاغل کو ہی جاری رکھتا، یعنی کھیت جوتتا، جیتا رہتا، بیاہ کرتا اور اپنے اناج کے کھیت میں یا آبائی مکان میں بالیدہ ہوتا رہتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اسے بنا کسی کو بتائے گھر کو خیرباد کہنا پڑا اور گھر سو، دو سو میل پیچھے چھوڑ کر اسے چین نصیب نہ تھا۔ کسی دیہاتی کے لیے یہ بہت تھا۔ گویا کہ درمیان سے سمندر بہہ چلا ہو۔

اسے آدمی کی تکالیف، جیسے ازدواج، پیسہ اور انسانی رشتوں کی پیچیدگیوں کے متعلق کام چلاؤ تشریح آتی تھی۔ طویل ریاضت نے اس کے تصور کو جلا بخش دی تھی۔ پانچ منٹ میں اسے غلط کیا ہے کی سمجھ آجاتی تھی، وہ فی سوال تین پائی کے حساب سے لیتا تھا۔ کم از کم دس منٹ، جب تک دوسرا شخص بول نہ لیتا، وہ اپنا منہ ہرگز نہ کھولتا، اس سے اسے اتنا مواد مل جاتا کہ وہ ایک درجن جواب اور مشورے دے سکتا تھا۔ روبرو شخص سے جب وہ اس کی ہتھیلی دیکھتے ہوئے مخاطب ہوتا تو کہتا—

”کئی طرح سے تمہیں اپنی کوششوں کے پورے، پورے نتائج نہیں مل رہے ہیں“ دس میں سے نو افراد

گنج نمبر-۱، بتیا-۸۴۵۴۳۸

اس سے اتفاق کر لیتے، یا پھر دوسرا سوال کرتا—

"کیا تمہارے خاندان میں کوئی خاتون ہے، ممکن ہے کوئی دور کی رشتہ دار ہی ہو، جسے شادمانی میسر نہ ہو؟" یا پھر کسی کے کردار کی تشریح یوں کرتا— "تمہاری تکلیفیں تمہاری فطرت کے سبب ہیں۔ تم کسی اور طرح سے رہ بھی تو نہیں سکتے کیونکہ عمل اس مقام پر ہے؟ تمہاری فطرت تند ہے اور ظاہر نرم ہے یا ... ہو۔" اس سے وہ فوری طور پر ان کے دل میں جگہ بنالیتا۔ کیونکہ ہم میں سے حلیم ترین شخص کو بھی یہ سوچنا اچھا لگتا ہے کہ باطن سے وہ سفاک تو ہے۔

مونگ پھلی فروش نے ڈبی پھونک کر بجھادی اور گھر جانے کے لیے اٹھا۔ یہ نجومی کے لیے اشارہ تھا کہ وہ بھی بوریا بستر سمیٹ لے، کیونکہ اس کی جانب اندھیرا ہو گیا تھا۔ صرف سبز روشنی کی شعاع کہیں سے آکر اس کے سامنے کی زمین کو چھو رہی تھی۔ اس نے اپنی کوڑیاں اٹھائیں اور دیگر ساز و سامان اپنے تھیلے میں رکھے جب کہ سبز روشنی کی شعاع بھی اب دھندلانے لگی تھی، اس نے اوپر کی جانب دیکھا--- جہاں ایک شخص اس کے مقابل کھڑا تھا۔ اس نے اسے اپنا امکانی موکل سمجھا اور گویا ہوا---

"تم بہت پریشان حال ہو رہے ہو؟ تھوڑی دیر بیٹھ رہنے اور مجھ سے بات کرنے سے تمہارا بھلا ہو جائے گا۔"

اس شخص نے بھرائی ہوئی آواز میں مبہم سا جواب دیا۔ نجومی اپنی بات پر ڈٹا رہا۔ اس پر اس شخص نے اس کی ناک کے نیچے اپنی ہتھیلی یہ کہتے ہوئے پھیلادی---

"خود کو نجومی کہتے ہو؟"

نجومی نے اسے للکار سمجھا اور اس شخص کی ہتھیلی سبز روشنی کی جانب موڑتے ہوئے بولا---

"تمہاری فطرت ہے کہ......"

"آہ! یہ سب بند کرو۔" اس شخص نے کہا---

"مجھے کچھ کام کی باتیں بتاؤ۔"

ہمارے دوست کو بیزاری کا احساس ہوا---

"فی سوال میں صرف تین پیسے ہی تو لیتا ہوں، اور جو کچھ آپ پاتے ہیں اسے آپ کے پیسے سے مطابقت رکھنا چاہئے۔" اس پر اس نے اپنا بازو کھینچا، ایک آنہ نکالا اور یہ کہتے ہوئے اس کی جانب بڑھایا---

"مجھے کچھ سوال پوچھنے ہیں۔ اگر میں ثابت کردوں کہ تم مجھے احمق بنا رہے ہو تو تمہیں سود کے ساتھ میری اکنی لوٹانی پڑے گی۔"

"اگر آپ کو میرے جوابات تشفی بخش لگیں تو کیا آپ مجھے ایک کے پانچ دیں گے---"

"یا، کیا آپ مجھے آٹھ آنے دیں گے؟"

"ٹھیک ہے، بشرطیکہ اگر تم غلط ہوئے تو مجھے دوگنا دوگے۔" اجنبی نے کہا۔

تھوڑی تکرار کے بعد یہ معاہدہ قبول کر لیا گیا۔

نجومی نے کچھ دعائیہ الفاظ کہے اور دریں اثنا اس شخص نے چرٹ جلالیا۔ نجومی کو دیا سلائی کی روشنی میں اس کے چہرے کی ایک جھلک دکھائی دی۔ راستے پر پوں پوں کرتی کاروں، گھوڑے گاڑی والوں کو اپنے گھوڑوں کو ہنکانے میں تھوڑا وقفہ لگا، اور پارک کی نیم تاریکی میں لوگوں کی بھنبھناہٹ رہ گئی۔ وہ آدمی بیٹھ گیا۔ وہ اپنا چرٹ پی رہا تھا۔ دھواں چھوڑ رہا تھا، وہ وہاں بیگانگی سے بیٹھا تھا۔ نجومی پر بیزاری طاری تھی۔

"لو، اپنا ایک آنہ واپس لو، مجھے ایسی للکاروں سے واسطہ نہیں رہا۔ آج دیر ہو چکی ہے۔" وہ گٹھر باندھنے کی تیاری میں لگ گیا۔ اس شخص نے اس کی کلائی تھامی اور بولا---

"اب تم مجھ سے بچ نہیں سکتے۔ میں گزر رہا تھا تو تم نے ہی مجھے اپنی جانب کھینچا تھا۔" اس کی گرفت میں نجومی پر لرزہ طاری ہو گیا، اس کی آواز لڑکھڑا گئی اور مدھم ہو گئی۔

"آج تو مجھے چھوڑ دو تم سے کل نپٹ لوں گا۔"

اس شخص نے اپنی ہتھیلی اس کے چہرے کے سامنے لہرائی اور بولا۔

"للکار، للکار ہے۔ چلو، آگے بڑھو۔" نجومی نے خشک گلے کے ساتھ بات شروع کی۔

"ایک خاتون ہے......"

"رکو" دوسرے آدمی نے کہا۔

"مجھے ان سب خرافات سے کوئی سروکار نہیں۔ کیا میں اپنی حالیہ تلاش میں کامیاب ہوں گا یا نہیں؟ اس کا جواب دو اور چلتے بنو، ورنہ میں تمہیں تب تک جانے نہ دوں گا، جب تک تم اپنے سارے سکے مجھے نہ دے دیتے۔"

نجومی نے کچھ منتر بڑبڑائے اور کہا---

"ٹھیک ہے، میں بتاؤں گا، لیکن اگر میں تمہیں یقین دلانے والی کچھ باتیں بتاؤں تو تم مجھے ایک روپیہ دو گے ورنہ میں اپنا منہ نہ کھولوں گا۔ اور جاؤ، تمہارے من میں جو بھی آئے، کرلو۔" کافی مول تول کے بعد شخص نے حامی بھر لی۔ نجومی بولا---

"تمہیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ کیا درست ہوں؟"

"آہ! کچھ اور بتاؤ۔"

"ایک دفعہ تم پر چھری چلائی گئی تھی؟" نجومی بولا

"خوب!" اس نے زخم کا نشان دکھانے کے لیے اپنا سینہ برہنہ کر دیا--- "اور کچھ؟"

"اور پھر تمہیں کھیتوں کے قریب ہی ایک ... میں دھکیل دیا گیا۔ تمہیں مردہ جان کر چھوڑ دیا گیا۔"

"اگر کوئی راہگیر اتفاقاً کنویں میں نہ جھانکتا تو مر ہی جاتا۔" وہ آدمی پرجوش اور ششدر تھا۔

"اس شخص تک میری رسائی کب تک ہو گی؟" اس نے اس کی مٹھی بھینچتے ہوئے پوچھا۔

"دوسری دنیا میں۔" نجومی نے جواب دیا۔ "... ماہ قبل وہ دور دراز کے ایک قصبے میں فوت ہو گیا۔ اب تمہیں کبھی نہ مل پائے گا۔"

یہ سن کر وہ آدمی تڑپ اٹھا--- نجومی نے جاری رکھی---

"گرونایک۔"

"تمہیں میرا نام معلوم ہے!" وہ آدمی حیرت سے بولا---

"ویسے ہی جیسے مجھے ساری دیگر چیزوں کا [illegible] ہے۔ گرونایک، جو کچھ مجھے کہنا ہے، اسے غور سے [illegible] تمہارا گاؤں اس قصبے کے شمال میں دو دن کے [illegible] دوری پر واقع ہے۔ اگلی گاڑی پکڑو اور چلتے بنو۔ گھر

نکلنے پر تمہیں اب بھی بہت خطرہ ہے، جو مجھے دکھائی
دے رہا ہے۔" اس نے چٹکی بھر مقدس راکھ نکالی اور
اسے تھمادی۔ "اسے اپنے ماتھے پر رگڑلو اور گھر جاؤ۔
اب کی سمت کبھی سفر نہ کرنا، تم سو سال تک جیتے
رہوگے۔"

"دوبارہ گھر کیوں چھوڑوں گا بھلا؟" اس شخص نے
سنجیدگی سے کہا--- "میں تو صرف اس کی تلاش
میں ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا تھا، تاکہ وہ ملے تو اس کا کام تمام
کردوں۔" اس نے متاسفانہ انداز میں سر کو جنبش دی۔---
"وہ میرے ہاتھ سے بچ گیا، مجھے امید ہے وہ ویسے ہی مرا
ہوگا جس کا کہ وہ مستحق تھا---"

"ہاں" نجومی بولا--- "وہ ایک لاری کے نیچے
آ گیا تھا"--- اس شخص کو یہ سن کر راحت ملی---

نجومی نے اپنے سامان سمیٹے اور انہیں تھیلے میں
بھرنے تک وہ جگہ خالی ہو چکی تھی۔ سبز روشنی کی شعاع
بھی معدوم ہو چکی تھی اور وہ جگہ تاریکی اور خاموشی میں
ڈوب گئی تھی۔ اجنبی، نجومی کو مٹھی بھر سکے دے کر
تاریکی میں گم ہو چکا تھا---

نجومی کے گھر پہنچنے تک نصف شب بیت چکی
تھی۔ اس کی اہلیہ دہلیز پر کھڑی اس کی منتظر تھی، اس نے
تاخیر کی وجہ دریافت کی--- اس نے سکے اس پر اچھالتے
ہوئے کہا--- "ان کی گنتی کرو۔ ایک شخص نے یہ سب
دئے ہیں۔"

"ساڑھے بارہ آنے" وہ بولی، گنتی کرتے وقت اسے
بڑی مسرت ہو رہی تھی۔ "کل ہی تھوڑا گڑ اور ناریل
خریدوں گی۔ بچی کئی روز سے مٹھائی کی رٹ لگائے ہوئی
ہے۔ اس کے لیے کچھ بڑھیا پکوان بناؤں گی۔"

"بے غیرت نے مجھے دھوکہ دے دیا! اس نے
ایک روپے کا وعدہ کیا تھا۔" نجومی بولا۔

وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تم کچھ پریشان حال لگ رہے ہو۔ آخر ہوا کیا؟"

"کچھ نہیں۔"

کھانے کے بعد کھاٹ پر بیٹھ کر اس نے اسے
بتایا--- "کیا تمہیں پتہ ہے کہ میرے سر سے آج ایک
بڑا بوجھ اتر گیا ہے؟ گزشتہ برسوں میں میں سوچتا رہا تھا

کہ میں نے ایک آدمی کا خون کیا ہے۔ اسی سبب گھر سے
فرار ہوا اور یہاں آ بسا، اور تم سے بیاہ کیا، وہ زندہ ہے۔"

وہ کانپ اٹھی۔

"تم نے اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں، اپنے گاؤں میں، جب میں ایک سر پھرا
نوجوان تھا--- ہم نے شراب پی، جوا کھیلا اور ایک دن
خوب جھگڑے--- اب اس کے بارے میں کیوں
سوچوں؟ یہ تو سونے کا وقت ہے۔" وہ جماہی لیتے ہوئے
بولا اور کھاٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

وفیات

● عالمی اردو کانفرنس کے بانی جناب **علی صدیقی** کا گزشتہ دنوں حیدر آباد میں انتقال ہو گیا۔ وہ اردو کے ایک ایسے خادم تھے جو اردو والوں سے مایوسی اور شکستگی کا احساس دور کر کے اس میں ایک نئی زندگی عطا کی۔ گلی کوچوں سے نکال کر اسے فائیو اسٹار ہوٹلوں تک پہنچانا ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انہوں نے اردو کے سلسلے میں کئی عالمی کانفرنسیں بھی منعقد کیں۔ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے اردو کمپیوٹر تعلیم کی طرف توجہ کی اور اس کے لیے دہلی کے پرگتی میدان میں اپنا ٹریننگ سینٹر قائم کیا۔ تمام عمر اردو کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تمام لوگوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان کے انتقال سے اردو اور خود اردو والوں کا جو نقصان ہوا، اسے آسانی سے پر نہیں کیا جا سکتا۔

● تاخیر سے موصولہ خبر کے مطابق فارسی کے اسکالر اور اردو کے مشہور ماہر تعلیم پروفیسر **عبدالرب عرفان** کا انتقال مورخہ ۳۰ اپریل ۲۰۰۱ء کو ناگپور کے ایک اسپتال میں ہو گیا۔ وہ عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔

عبدالرب صاحب صدر شعبہ اردو و فارسی وسنت راؤ نائیک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز ناگپور نیز چیئر مین بورڈ آف اسٹڈیز ان فارسی ناگپور یونیورسٹی رہے۔

ان کے متعدد تحقیقی مضامین معارف، جامعہ، برہان اور خدا بخش لائبریری جرنل میں شائع ہو کر علمی حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کی پہلی مستقل تصنیف "دارا شکوہ دینی نگارشات کے آئینے میں" شائع ہو چکی ہے۔ ان کی عمر ۶۵ برس کی تھی۔ پس ماندگان میں ایک بیٹی اور تین بیٹے ہیں۔

● ۵ اپریل ۲۰۰۱ء کو **جناب رفیق عادل** (فیض پور) کا دل کے آپریشن کے بعد انتقال ہو گیا۔ ان کا مجموعۂ کلام "اعتراف" بہت پہلے زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکا ہے۔ وہ ایک معلم تھے۔ عمر کے غالباً ۵۰ سال مکمل کر چکے تھے۔

● پاکستان کے بزرگ شاعر **انجم رومانی** گزشتہ دنوں انتقال کر گئے۔ انجم رومانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پنجابی نژاد تھے، مگر ساری زندگی انہوں نے پنجابی نہیں بولی۔ اردو سے ان کی محبت بے مثال تھی۔ انجم رومانی شہرت بخاری، ناصر کاظمی اور احمد مشتاق جیسے اہل قلم کے قریبی دوستوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ مرحوم سہل ممتنع میں بہت کمال کی غزل کہتے تھے۔ ان کا یہ شعر اکثر لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہے:

دل سے اٹھتا ہے صبح و شام دھواں
کوئی رہتا ہے اس مکان میں ابھی

اسی طرح یہ شعر بھی مرحوم کی یادگار ہے:

مزدور کارخانہ قدرت تھا آفتاب
دن کا تھکا ہوا تھا سر شام سو گیا

ادارہ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور پسماندگان سے تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔

عبدالغنی شیخ



یہ زندگی

بیماری کی نوعیت سے متعلق ڈاکٹر کا منہ پر صاف صاف کہہ دینے سے نہ صرف اس کے دل و دماغ پر چوٹ لگی بلکہ بہت برا بھی لگا۔ 'یہ ٹھیک ہے میں ایک آرٹسٹ ہوں لیکن کیا آرٹسٹ انسان نہیں ہوتا؟ آرٹسٹ کا دل نہیں ہوتا؟ آرٹسٹ کے احساسات اور جذبات نہیں ہوتے؟ یہ بھی طریقہ ہے بتانے کا!' وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

ڈاکٹر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔ "آپ آرٹسٹ ہیں، فنکار ہیں، آپ سے چھپانا نہیں چاہتا۔ آپ کو معدے کا کینسر ہے۔"

اس کا دل ڈوب گیا اور آنکھوں کے سامنے [illegible] چھا گیا۔ چند لمحوں کے لیے اس کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اور ڈاکٹر کی پوری بات سنے بغیر تیزی سے مطب سے باہر نکل آیا۔

وہ سڑک پر بلاوجہ چلتا رہا۔ ایک دفعہ ایک گاڑی [illegible] آتے آتے بچ گیا۔ ڈرائیور نے غلیظ سی گالی دی لیکن نازک مزاج اور حساس ہونے کے باوجود اس پر اس [illegible] اثر نہیں ہوا۔

موسم بڑا سہانا تھا۔ فضا بڑی دلکش تھی۔ نیلے آسمان پر کہیں کہیں سپید بادل تیر رہے تھے۔ ڈاکٹر سے ملاقات سے پہلے انہیں دیکھ کر اس نے عجیب طمانیت محسوس کی تھی اور اس کے فنکارانہ ذہن میں یہ خواہش شدت سے ابھری کہ اس منظر کو کینواس پر اتارے۔ لیکن کلینک سے باہر آکر دنیا اسے مختلف لگی۔ اس کو یہ محسوس ہوا کہ دنیا کی ان خوبصورت چیزوں پر اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ چند ہی روز تو اسے اس دنیا میں رہنا ہے۔

مرنے کے بعد میری بیوی اور اکلوتی بچی کا کیا ہوگا؟ — انہیں جب اس کی بیماری کا علم ہوگا، تو ان کا کیا ردعمل ہوگا؟ اس تصور سے وہ کانپ اٹھا۔

اچانک اس کے سر کے اوپر سے کبوتروں کی ایک ڈار گزری۔ لیکن اس کو خبر تک نہیں ہوئی۔

تین روز پہلے وزیر ثقافت نے اس کی تصویروں کی نمائش کا افتتاح کیا تھا اور اس کے فن کی دل کھول کر تعریف کی تھی۔ نمائش میں اس کی بنائی ہوئی دو تصویریں دس دس ہزار روپے میں فروخت ہوئی تھیں۔

اس شام جب وہ تھکا ماندہ گھر لوٹا تو اس کی طبیعت کچھ خراب ہوئی۔ پچھلے ایک ماہ سے وہ معدے کے درد کا شکار تھا۔

"آپ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔" اس کی بیوی نے گلہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ "ایک اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیجیے۔ دن رات آپ اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ جب صحت نہیں ہے تو روپیہ پیسہ کس مصرف کا؟"

"میں کل ضرور دکھاؤں گا۔" اس نے بیوی کو یقین دلایا۔

ڈاکٹر کی ہدایت پر خون، پیشاب اور تھوک کے علاوہ Biopsia ٹسٹ کرایا۔

وہ ایک عظیم مصور بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ رافیل، پکاسو، لیونارڈو ڈاونسی، ایم ایف حسین کی طرح ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن اس کی تصویروں کی دنیا میں دھوم مچے گی لیکن اب اس کو اپنے سارے خواب بکھرتے نظر آئے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسی حالت میں گھر جائے اور بیوی کو شک ہو جائے۔ اس نے سوچا کہ اگر اس کی بیوی کو اس کی بیماری کی بھنک پڑ گئی تو اس کا گھر غم کدہ اور جہنم زار بن جائے گا۔

اس نے سگریٹ کی ایک ڈبیہ خریدی۔ سگریٹ چھوڑے اس کو ایک سال ہو گیا تھا [illegible] پیے گا۔

اس نے ایک [illegible] پر بیٹھ گیا۔

"کہاں جانا ہے بابو [illegible]

"پارک۔"

"پارک [illegible]

[illegible] والا [illegible]

"کوئی سا پارک [illegible]"

[illegible] نے غائب دماغی سے کہا [illegible]

اس کو [illegible] خوش و خرم [illegible]

پارک میں چاروں [illegible] گل لالہ، ڈالیہ اور [illegible] تھے۔ لیکن ان پھولوں میں [illegible] نہیں تھی۔ ایک سنگی بینچ پر ایک جوان [illegible] لڑکی بیٹھی تھی۔ شاید نو بیاہتا [illegible] سوچا۔ دونوں نے اس کی طرف ایک [illegible] لمحوں کے لیے اس نے [illegible] کینسر کا مریض ہوں۔

وہ درختوں کے ایک کنج میں دوب پر لیٹ گیا۔ [illegible] کا دماغ نت نئے خیالوں اور پریشانیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔

شیخ منزل، فورٹ روڈ، لیہہ لداخ۔ ۱۹۴۱۰۱

میاں بیوی نے کتنے سارے منصوبے باندھے [illegible] اپنے لیے ایک خوبصورت مکان بنانے کا، ایک کار [illegible]نے کا اور بیرون ملک جانے کا۔ اب یہ سارے [illegible]بے خاک میں ملتے ہوئے نظر آنے لگے۔

اس کو اپنے دوست خاص کر اکبر یاد آیا۔ ہمیشہ [illegible]ان رہنے والا دائم المریض اکبر۔

"اکبر، میں تم سے پہلے جا رہا ہوں؟" اس نے دور [illegible] میں نظریں جما کر آہستہ سے کہا۔

"مرنے کا مطلب ہے دنیا سے قطعی طور پر ہمیشہ [illegible] کے لیے قطع تعلق۔ خدا جانے امریکہ کا چھوڑا ہوا مصنوعی سیارہ کیا خبر لائے گا، جو ہمارے نظام شمسی کو [illegible]ند کر کائنات میں کسی ذی حیات کی تلاش کے لیے گیا [illegible] یہ خبر سننے کے لیے میں نہیں ہوں گا۔"

وہ بڑا حساس تھا۔ ایک دفعہ اس کی بیوی کو پکنک سے آنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے اسپتال فون کیا۔ اتفاق سے اس روز ایک بس کا حادثہ ہوا تھا۔ وہ اسپتال [illegible] میں اپنی بیوی کو ڈھونڈنے لگا۔ [illegible] آئے اب تین گھنٹے ہو رہے تھے۔ [illegible] وہ اپنے آپ میں آیا۔ "کئی دفعہ ایک بڑے [illegible] ہو جاتی ہے۔ اس کی تشخیص غلط ہو سکتی [illegible] اس کو تسلی دی۔ "میڈیکل رپورٹ کا [illegible] لیبارٹریوں میں اتنے کیس [illegible] رپورٹیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں — یہ [illegible] بیماری ابتدائی اسٹیج پر ہو اور ریڈیشن یا [illegible] جائے۔ مجھے ڈاکٹر کی بات پوری سننی [illegible] ضروری نہیں کہ کینسر کا ہر مریض [illegible] کا مریض معجزاتی طور پر صحت یاب [illegible] پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ خود اپنا نفسیاتی معالج بن گیا تھا۔ اس سے اس کے دل کو ایک گونہ اطمینان ملا۔ اس نے ڈاکٹر کے پاس [illegible] دوبارہ جانے کا ارادہ کیا۔

پارک سے نکلنے سے پہلے اس نے ایک دفعہ اور تہیہ کیا کہ وہ اپنے اندرونی کرب کو بیوی کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دے گا اور اپنے روزمرہ کا کام جاری رکھے گا۔

انہی خیالات میں غلطاں وہ اٹھا۔ اس کے معدے میں پھر درد ہونے لگا۔ جیب سے ایک ٹکیہ نکال کر اسے نگل لی اور تھوڑا سا افاقہ محسوس کیا۔

پارک سے باہر زندگی کی گہما گہمی اور لوگوں کی ریل پیل دیکھ کر موت کا سایہ دوبارہ لاشعوری طور پر اس کی آنکھوں کے سامنے منڈلانے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے دل کو جو دلاسہ دیا تھا، اس کا اثر کھونے لگا۔

گھر جانے کے لیے اس نے ایک آٹو رکشہ پکڑا۔ وہ گھر سے ذرا دور اتر گیا۔ پبلک نل پر بوڑھا سقہ اپنی مشک میں پانی بھر رہا تھا۔ اسے اس کی لمبی زندگی پر رشک آیا۔

گلی میں محلے کا موچی ہر آنے جانے والے کے جوتوں کی طرف نظر ڈالے کسی گاہک کا منتظر تھا۔ موچی کو دیکھ کر اس کو ترس آتا تھا۔ غریب کو چھ جوان لڑکیاں تھیں۔ آج اس نے اپنے دل میں موچی کے تئیں ہمدردی کی کوئی کسک محسوس نہیں کی اور موچی کے سلام کا جواب دیے بغیر اپنی الجھنوں میں الجھا آگے بڑھ گیا۔ 'اس کو کیا پتہ ہے کہ آج میں نے کتنی بڑی بری خبر سنی ہے اور میں کس ذہنی عذاب میں مبتلا ہوں۔'

گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک دفعہ اور مصمم ارادہ کیا کہ وہ بیوی پر اپنی پریشانیاں ظاہر ہونے نہیں دے گا۔ اس نے اپنے دماغ سے موت کا خیال کھرچ پھینکا۔ لیکن بیوی اور بچی کا چہرہ دیکھتے ہی وہ جذباتی بن گیا اور اس کے دل میں ان کی محبت عود کر آئی۔

'ڈاکٹر نے کیا کہا؟' بیوی نے بے تابی سے پوچھا۔

'معدے کی بیماری ہے۔ پرانی ہو گئی ہے۔' اس نے جھوٹ بولا۔

'میں کہتی تھی نا؟ آپ ٹھیک طرح علاج کرائیں۔ آپ تصویریں بنانے میں یوں مگن رہتے ہیں کہ دنیا و مافیہا کا خیال نہیں رہتا۔'

وہ چپکے سے بستر پر دراز ہو گیا اور اپنی کوفت کو چھپاتے ہوئے بولا۔ 'فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں جلدی ٹھیک ہو جاؤں گا۔'

وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ لیکن بیوی کے سامنے اپنے دلی کرب کو خوبصورتی سے درد کا لبادہ پہناتا رہا۔

رات کئی بار نیند سے جاگا۔ جب بھی آنکھ کھلتی تو سب سے پہلے ڈاکٹر کے الفاظ "آپ کو معدے کا کینسر ہے۔" اس کے دماغ میں گھس آتے۔

اسی عالم میں وہ صبح تڑکے بستر سے اٹھ بیٹھا۔ مو قلم اور برش سنبھالے اور بورڈ کے سامنے کھڑا ہوا۔ کینوس کے سامنے ایک انسان کی شبیہہ ابھرتی گئی۔

تصویر دیکھ کر اس کی بیوی بولی۔ 'یہ کس سنکی کو بنایا ہے؟'

'سنکی؟'

"ہاں رونی صورت، دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے ہوئے گال اور مریل جسم۔ کینسر کا مریض لگتا ہے۔"

اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔

بیوی نے اس کی پریشانی بھانپ لی۔ 'آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اسے کسی پل چین نہیں تھا۔ ناشتہ کے بغیر وہ ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ ڈاکٹر اس کا جانا پہچانا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب۔" کیا میں تین ماہ تک زندہ رہ سکوں گا؟' اس نے جاتے ہی یہ سوال داغ دیا۔

ڈاکٹر چونک پڑا۔

'میں اس مدت کے دوران چند شاہکار تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔ یہ شاہکار تصویریں مجھے شہرت دیں گی اور مدت تک میری بیوی اور بچی کی کفالت کریں گی۔'

'آپ تین ماہ کیا، تین سال کیا، تیس سال زندہ رہیں گے۔' ڈاکٹر بولا۔ 'کل آپ نے میری بات پوری سنی نہیں۔ میں نے کلینک سے باہر آکر آپ کو دو تین مرتبہ پکارا۔ شاید آپ نے سنا نہیں۔ آپ نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ ابھی آپ کی بیماری کا پہلا اسٹیج ہے۔ آپریشن سے ٹھیک ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا تھا کہ آپ علاج معالجے میں سستی نہ کریں۔ اس لیے بیماری کی نوعیت آپ سے چھپائی نہیں۔ ویسے بھی نئے ریسرچ کی روشنی میں یہ دریافت ہوئی ہے کہ کینسر کا جو مریض یاسیت کا شکار ہوتا ہے وہ جلدی مر جاتا ہے۔ جو تفکرات کو بھول جائے اور زندگی سے مایوس نہ ہو، وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آپ رجائی بنیں۔ امنگیں جوان رکھیں اور ہمت سے کام لیں۔ آپ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔'

ڈاکٹر کے الفاظ پر اس نے اطمینان کا اظہار کیا۔

'ڈاکٹر صاحب! آپ سے ایک استدعا ہے کہ میری بیوی کو اس بیماری کا علم نہ ہو۔'

"آپ اطمینان رکھیں۔ میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔" ڈاکٹر بولا۔

'عاصمہ! ایک کپ کافی؟' اس نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے مسکرا کر بیوی سے کہا۔

'او کے' اس کی بیوی نے مسکرا کر چولہے پر کیتلی چڑھائی۔

☆☆☆

گربچن سنگھ



ایسا بیٹا

اس طرف جاتے ہوئے پاؤں اچانک رک سے گئے۔

کمرہ خالی تھا۔ لیکن پھر بھی اس میں سے مالش کے تیل کی بو باہر آ رہی تھی۔ اس بو میں بوڑھی ماں کی تھکی ہاری سانسوں کی مہک بھی شامل تھی۔ وہیں کھانا، وہیں تھوکنا اور جو ٹھن پھینک دینا۔ کبھی کھانا ہضم نہ ہو تو قے کر دینا۔ کافی کوششوں کے بعد بھی صفائی نہیں رہ پاتی تھی۔

اماں دن رات اسی کمرے میں بیٹھی کھانستی رہتی۔ کمرہ کی کھڑکیاں بند رہنے کی وجہ سے ایک گھٹن سی بھری رہتی۔ کھانسی پرانی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے اگر کھانسی رک بھی جاتی تو اماں بڑبڑانے لگتی۔ دن بھر کچھ نا کچھ بولتی رہتی۔ دماغ میں آیا تو چیخ چیخ کر پکارنے لگتی۔

"ارے سب کہاں چلے گئے ... کوئی ہے؟"

"ماں کیا ہے؟" سریتا جواب میں کہتی۔ "کیا کوئی ہمیشہ ہی تمہارے پاس بیٹھا رہے ... اور بھی تو کام ہیں ..."

"سنتوش کہاں ...؟"

"لو یہ بھی بتانا پڑے گا۔ دفتر گئے ہیں۔"

"ارے ہاں۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔ کیا کروں بات ماتھے سے نکل جاتی ہے بہو۔ کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ اچھا جا تو اپنا کام کر۔ سنتوش جب آئے تو میرے پاس بھیج دینا۔ جلدی تھوڑے ہی لوٹیں گے۔ شام کو آئیں گے۔"

بیکار دل کڑھنے لگتا ہے۔ اماں نے سب کو پریشان کر رکھا ہے۔ مرتی بھی نہیں۔ جانے کب پنڈ چھوٹے گا ... ! اب لگتا ہے، بیکار ہی وہ کڑھا کرتی تھی۔ اسے ماں بیٹے کے معاملے میں بیکار کچھ نہیں سوچنا چاہیے تھا۔

جانے کیسے اسے بڑا عجیب سا لگتا، جب ماں بیٹا پاس پاس بیٹھ جاتے تو ان میں خوب باتیں ہوتیں۔ وہ ان باتوں کو سننے کے لیے بے قرار ہو اٹھتی۔ وہ اکثر کمرے کے دروازے کے پاس جا کھڑی ہوتی۔

ایک دن ماں نے اسے اپنے پاس ہی بلا لیا تھا اور بولی تھی۔ "بہو میرے بیٹے جیسا ہیرا کسے نصیب ہوگا۔ جانتی ہے، میں نے اسے کتنے جتنوں سے پالا ہے۔ پال پوس کر سیانا کیا ہے۔ کون ماں اپنے بیٹے کو اتنا دلار، پیار دے گی۔ ایسا کھانے کو دے گی، جو میں نے دیا۔ گھر میں جتنا دودھ ہوتا گرم کر کے سب کی ملائی نکال کر ایک کٹورے میں ڈال دیتی۔ بیٹا سیر ہو کر کھاتا۔ میرا بیٹا گھاس پھوس کھا کر سوکھی روٹی چبا کر نہیں، ملائی کھا کر جوان ہوا ہے۔ ٹولے محلے میں سب سے تگڑا بچہ ہوا کرتا تھا۔ جب اس کے پتا ... !" اماں گہری سانس بھر کر کہتی۔ "اسے گود میں لے کر باہر نکلتے تو دیکھنے والے اسے باری باری گود میں لے کر پیار کرتے۔"

سریتا یہ سب سن کر کچھ فخر سا محسوس کرتی۔

بوڑھی ماں نے یہیں بس نہیں کی تھی۔ اور بھی کہا تھا 'بہو تو کیا جانے میرا بیٹا اتنا دلارا تھا کہ کچھ لوگ بچپن ہی میں اسے اپنی لڑکی کے لیے چھینکنے کو تیار ہو گئے تھے۔ لیکن جس کی قسمت میں جو ہو، جہاں جس کے سنجوگ ہوں، وہیں بندھ جاتا ہے۔ اچھی بہو گھر میں لانے کی للک تو میرے من میں برسوں سے تھی لیکن ...!' ماں کے لہجے سے اطمینان کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

تب سریتا کا جی چاہتا تھا وہ ماں کے پاس سے ہٹ جائے اور کچھ سننا اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"سن ..." ماں کہہ رہی تھی۔ "سنتوش کی ایک بہن تھی۔ اس سے تین سال چھوٹی۔ بھائی بہن کا رنگ روپ اور چہرہ مہرہ قریب قریب ایک سا تھا۔ ایک دن باہر دھوپ میں کھیلتی کھیلتی گھر لوٹی، آتے ہی پانی پیا۔ پانی پیتے ہی اسے بخار چڑھ گیا۔ اور گھنٹہ دو گھنٹہ ہی میں گہری نیند سو گئی۔ ایسی کہ پھر کبھی آنکھ ہی نہیں کھولی۔" اماں کے منہ سے دردناک پھیکی ہنسی پھوٹ پڑی۔ جیسے پیڑ کے بوڑھے پتے ہوا سے الجھ الجھ کر شور پیدا کر رہے ہوں۔ "اتنی جلدی ہی پگلی کو اس گھر سے چلے جانا تھا تو آئی کیوں تھی ...." پھر ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔ "عجیب ہے ایشور کی مایا۔ جو جانا چاہتے ہیں انہیں روک لیا جاتا ہے اور جن کے ہنسنے کھیلنے، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے دن ہوتے ہیں وہ اٹھا لئے جاتے ہیں۔ بہت سندر روپ پایا تھا بٹیا نے۔ چاند شرماتا تھا دیکھ کر ......!"

سریتا سن کر سوچنے لگتی تھی، کیا اماں کی لڑکی نے اس سے زیادہ خوبصورتی پائی تھی۔ سریتا کو اپنے روپ پر فخر ہے۔

ماں اکثر سریتا سے مشکوک لہجے میں پوچھتی۔

"بہو میرے بیٹے کو ملائی دیتی ہے نا کھانے کو ......؟ دیکھو دودھ اور ملائی اسے ضرور دینا۔ وہ نہ مانگے تو بھی اسے دینا۔ اب میں تو اسے کچھ بنا کر کھلانے سے رہی۔" گہری سانس لیتی ہوئی مائی کہتی۔ "اب تو وہ میرے ہاتھ کا کھائے گا بھی نہیں۔ کیا پتہ اب اسے میرے ہاتھ کا کھانا اچھا لگے گا بھی یا نہیں۔ ایک دن پوچھوں گی۔"

سریتا دل ہی دل میں کڑھتی اور سوچتی۔ وہ کیا سنتوش کو بھوکا رکھتی ہے۔ اسے ملائی کھانے سے منع کرتی ہے۔ ماں کو اس پر شک نہیں کرنا چاہیے۔

اماں اگر اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو جاتی تو کافی تھا۔ سنتوش جب اس کے قریب آ کر بیٹھتا تو اس سے بھی یہی چرچا کرتی۔ پوچھتی، "ٹھیک طرح سے کھاتے پیتے

۹۔ اے، پنجابی لین، رام داس بھٹہ، جمشید پور۔ ۸۳۱۰۰۱

ہونا بیٹا۔ مجھے تو آنکھوں سے ٹھیک طرح سے دکھائی نہیں دیتا۔ اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتی۔ ورنہ اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھلاتی۔"

سنتوش ماں کو مطمئن کرنے کے لیے کہتا۔"ماں مجھے کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ مزے میں ہوں۔ کیوں میری چنتا کرتی ہو ......!"

"میں تیری چنتا نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا رے۔"ماں فوراً ممتا بھرے لہجے میں کہتی۔"کیا تو بھول گیا جب میں کٹورا بھر ملائی کھانے کو دیتی تھی تجھے۔ آہ!......" ماضی کی یادیں دل میں کروٹیں لینے لگتیں۔"سستی کا زمانہ تھا وہ۔ وہ دن پھر تھوڑے ہی لوٹ آئیں گے۔ تیرے بابو جی کہا کرتے تھے۔ ہماری ایک ہی تو اولاد ہے۔ اسے کھلا پلا کر جوان نہیں بنائیں گے، تندرست نہیں کریں گے تو وہ سمے (وقت) کے ساتھ کیسے چل سکے گا۔ وہ تمہیں خوب کھلا پلا کر تگڑا بنانے کی سوچتے تھے۔ بیٹا اب تمہیں ملائی کھانے کو ملتی ہے یا نہیں ......؟"

"کھاتا ہوں ماں۔ ڈٹ کر کھاتا ہوں۔"

سریتا دل میں سوچتی۔ دو جون کی چکنی چپڑی روٹی میں تو گھر کے خرچ کا پتہ نہیں چلتا یہاں ملائی کی بات ہو رہی ہے۔ ایک دن وہ کھنچے ہوئے لہجے میں سنتوش سے بولی۔"جاؤ ایک دن بازار سے کٹورا بھر ملائی خرید کر لے آؤ اور ماں کے قریب بیٹھ کر کھاؤ۔ انہیں تسلی ہو جائے گی کہ تم ملائی ضرور کھاتے ہو۔"

سنتوش کو اس کا یہ طنز اچھا نہیں لگا تھا۔"ماں کے کہے کا برا کیوں مانتی ہو۔ چپ چاپ سن لیا کرو۔"

تب سریتا کو من مار کر سوچنا پڑتا۔ بڑی عمر کے لوگوں میں بکنے بکانے کی بھی ایک بیماری ہوتی ہے۔

کوٹھری سے اکثر ایک آواز سنائی دیا کرتی تھی۔ "بیٹا سنتوش میرے لیے مالش تیل کی شیشی لائے۔"

جواب ملتا۔"تیل تو ہے ماں......!"

"ذرا بہو کو کہنا میرے ہاتھ پیروں میں مالش کر دے گی۔"

سریتا کو غصہ آ جاتا۔ جی چاہتا کہے "ابھی دوپہر کو تو مالش کی تھی۔ اب رات کو پھر مالش کرنے بیٹھ جاؤں کیا......!"

ادھر سنتوش ماں سے کہتا"ٹھیک ہے ماں سب کام نمٹا کر تیل مالش کر دے گی۔"

"لاؤ، تیل کی شیشی مجھے دو۔ میں خود ہی مل لوں گی۔"

اس مالش کے تیل کی بو سے تو سریتا کو ابکائی سی آنے لگتی تھی۔ اور جب بھی بوڑھی ماں کو گرم پانی سے نہلایا جاتا، جسم سے تیل اور میل کی تہوں کو صاف کرتے ہوئے صابن کی آدھی ٹکیہ گھس جاتی۔ نہا دھو کر جب دھوپ سینکنے کے لیے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ جاتی تو آگے پیچھے کے قصے سنانے شروع کر دیتی تاکہ سریتا اس کے قریب بیٹھی رہے اور اس کا من لگا رہے۔

بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ماں کے پاس بیٹھی اس کی باتیں سننے میں وقت ضائع کرتی رہے۔ کیا اسے دوسرا کام نہیں تھا......!

سریتا سوچنے لگتی اگر سنتوش کے پتا یعنی اس کے سسر صاحب زندہ ہوتے اور بابا اور ماں دونوں اسی طرح دھوپ سینکتے ہوئے باتیں کر رہے ہوتے تو دیکھنے میں کتنا اچھا لگتا۔ کانپنے والے پرانے پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ جیسی ان کی بوڑھی ہنسی سے میرا آنگن کھلکھلانے لگتا۔ اس نے سن رکھا ہے اس کے سسر بڑے خوش مزاج قسم کے آدمی تھے۔ خوب ٹھہاکہ لگا کر ہنستے تھے۔ کاش اسے بھی وہ ہنسی سننے کا موقعہ ملا ہوتا۔

بوڑھی ماں بھی کبھی کبھی سنتوش کے پتا کا بھی ذکر چھیڑ دیتی تھی۔ سارا دن اسی کا چرچا کرتی رہتی۔ سن سن کر کبھی من اوبنے لگتا۔ کبھی کبھی سوچنا پڑتا ماں یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ وہ اس کی بہو ہے۔ اس کے بیٹے کی بیوی۔ لیکن وہ اپنے سسر کے متعلق کچھ بھی سن کر ایسا محسوس کرنے لگتی ہے جیسے کچھ غیر مناسب ہونے جا رہا ہے۔ ماں کی یہ عادت اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔

"ماں"سریتا کوٹھری میں جھانکتی ہوئی دل ہی دل میں بولی۔"میں تمہارے بیٹے کے بارے میں تمہیں کچھ کہتی تھی تو برا کیوں مانتی تھی۔ بولو۔ جواب دو۔ نہیں بولو گی نا۔ اب کبھی نہیں بولو گی۔ معلوم ہے مجھے، اب کبھی نہیں بولو گی۔"

اسے کمرے میں ہلکے ہلکے سروں میں سنگیت کے ابھرنے کا احساس ہوا۔ کبھی ماں سوچ میں آکر خوب گاتی تھی پرانے گیت، جو اس نے بچپن میں یا چڑھتی عمر میں سیکھے ہوں گے۔ ایسا محسوس ہوتا وہ گیتوں کو دوہرا کر حال کی تلخیوں کو ماضی کے خوشگوار لمحوں کی یاد میں دلکش بنا دینا چاہتی ہے۔ ماں کو بیاہ شادی اور پرب تیوہار کے ڈھیر سارے گیت آتے تھے۔ جب وہ پوپلے منہ سے بے ڈھنگے سر الاپتی، تو سریتا کو اکثر ہنسی آ جاتی۔ گاتے گاتے ماں سریتا سے پوچھتی "آج کون سا دن ہے بہو؟"

"سوموار ہے ماں......!"

"پرنما (پونم) کب ہے......؟"

"پرسوں ہی تو تھی......!"

"کب دن آتا ہے اور کب بیت جاتا ہے، کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"ابھی پرسوں ہی تو بتایا تھا......!"

"دیوالی کب ہے......؟"

"ابھی تو ڈھیر سارے مہینے پڑے ہیں دیوالی کو۔"

اور پرب تیوہار کے دن تو ماں، اس نیم کے پیڑ تلے بچھی چارپائی پر بیٹھی منگل گیت گاتی رہتی۔ آس پڑوس کی عورتیں، لڑکیاں گانا سن سن کر ہنستی۔ مخول کرنے سے بھی باز نہ آتیں۔

اسے کہنا پڑتا"ماں اب بس بھی کرو۔ باقی پھر گا لینا۔"

"اکھڑتی سانسوں کا کیا بھروسہ بہو۔ اگلا پرب دیکھنے کو ملے کہ نہ ملے۔"

"وہاں جاکر کیا سناؤ گی؟"جانے کیسے ایک مرتبہ سریتا کے منہ سے نکل گیا تھا۔

"کہاں......؟"

"جہاں جانے کو تیار بیٹھی ہو!"

کوئی سننے والا ہوگا تو جو آتا ہے، وہاں بھی سنا دوں گی۔"

بات مذاق میں اڑ گئی تھی۔ تو ماں کو اس پار جانے کی کوئی چنتا نہیں تھی۔ اس انجانی دنیا میں جس کے خیال سے دل و دماغ میں پریشانیاں گھرنے لگتی ہیں۔ ہاں ماں کو تیرتھوں یعنی دھرم استھانوں کا خیال آتا تو کچھ اداس سی ہو جاتی۔"بیٹا مجھے تیرتھوں کے درشن کرا دو۔"

"ضرور کروا دوں گا ماں۔ تھوڑا اٹھ کر بیٹھنے کے قابل تو ہو جاؤ۔"

"اب میں پھر جوان تھوڑے ہی ہونے جا رہی ہوں بیٹا......"

"اٹھ کر بیٹھو گی نہیں۔ چل پھر نہیں سکو گی تو تیرتھوں کے درشن کیسے کرو گی ماں۔"

"ٹھیک کہتے ہو بیٹا۔ مجھے کہاں کہاں ڈھوئے پھرو گے۔ نہ بابا نہ۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی، انسان کا من ہی تو مندر ہے۔ یہیں سب کچھ ہے۔ دور کیوں جائے۔"

سنتوش بے بسی کے عالم میں چپ سادھ لیتا۔

"بہو۔" ماں شفقت آمیز لہجے میں کہتی۔ "پیاری بہو، تم اور سنتوش دونوں کو جہاں، جس تیر تھ کے درشن کرنے ہیں کر آؤ۔"

"تو یہاں تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا ماں۔"

"ارے میرا کیا ہے۔ جیسے تیسے چار چھ دن کاٹ لوں گی۔"

"ماں ایک بات کہوں۔"

"بولو...."

"زیادہ باتیں مت کیا کرو۔"

"بہو میں کیا پگلی ہوں، جو فالتو بولوں گی۔"

"ایسی بات نہیں ہے ماں۔ زیادہ بولنے سے سر تھک جاتا ہے۔"

"بہو، سر اور منہ تو میرا تھک ہی چکا ہے۔ کون سنتا ہے میری۔ نہ تو سنتی ہے نہ تیرا گھر والا۔ ارے ہاں بہو....!" فوراً ہی ماں کے دھیان میں کوئی اور بات آجاتی اور پوچھتی "تو دوا کھا رہی ہے نا....؟"

"دوا...." یہ لفظ بہو کو چونکا سا دیتا ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اسے کہنا پڑتا۔ "ہاں!" اور اس کی نظریں کمرے سے باہر کھڑے، نیم کے درخت کی طرف گھوم جاتیں۔ اس پیڑ پر ہر سال پھول اور پھل لگتے ہیں۔

اسے ماں کے ایسے سوالوں سے بہت چڑ تھی، جن کا اسے جواب دینا ہی پڑتا تھا۔ اس کے دل میں اتنی کھیج پیدا ہوتی تھی کہ وہ اس ہاں..... ہاں کے لفظ کو اتنی دیر تک متواتر دہراتی رہے، جب تک کہ ماں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر یہ نہ کہہ دے کہ بس بہو بس، میں نے سن لیا اب بس بھی کر.....!

"آہ....!"

اسے اب بھی ماں کے کراہنے کا بھرم ہو رہا تھا۔ اس کا پوچھنا فرض بنتا ہے۔ "کیا ہوا ماں؟" اور اگر وہ ایسا پوچھے گی تو جواب ملے گا۔" جانے کیوں چھاتی میں درد ہو رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ درد کیوں ہونے لگتا ہے۔"

"کف جم گیا ہوگا....."

"مالش تیل کی شیشی پکڑا دو.. خود ہی چھاتی پر مل لیتی ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو ماں۔ کیا میں نے ملنے سے انکار کیا ہے۔"

اسے ماں کی ان لٹکی چھاتیوں کا دھیان ہو آیا جن پر مالش کے وقت انجانے میں ہاتھ پھر جاتا تھا۔ وہ محسوس کرتی کہ گوشت کے انہی لوتھڑوں میں زندگی دینے والا آب حیات چھلکا کرتا ہوگا۔ جس کے بغیر عورت ادھوری رہ جاتی ہے۔ پھر اس نے خود پر غور کیا۔ وہ ابھی ادھوری ہے۔ اس کی گود سونی ہے۔

وہ وقت سے پہلے بوڑھی ہو گئی ہے۔ ماں کے بعد اس کوٹھری میں جو جگہ خالی ہو گی، جو چارپائی ویران پڑی ہوگی، اس میں اس کی زندہ لاش لیٹی رہا کرے گی۔ اس مالش تیل کے بو باس سے رچی ہوئی فضا میں۔

"اب تو تیل مالش کی ضرورت نہیں ہے نا ماں!" ایک سوال اٹھ رہا تھا دل میں۔ اور ایک جواب اس کے دل میں جگہ بنا رہا تھا۔ "نہیں بیٹی، اب درد نہیں ہے۔"

"ماں وہ درد کہاں چلا گیا....."

"اڑ گیا۔ سانسوں کے ساتھ اڑ گیا۔"

آج سریتا بھی اپنے دل میں درد محسوس کر رہی ہے۔ لگتا ہے یہ درد عمر کے ساتھ بڑھتا ہی جائے گا۔

ابھی چند دنوں پہلے کا واقعہ ہے، اماں کی تکلیف کچھ بڑھ گئی تھی۔ ڈاکٹر گھر میں بلانا پڑا تھا۔ ڈاکٹر جب معائنہ کرنا چاہتا تھا تو ماں نے اسے اپنے جسم میں ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ سنتوش سے بولی تھی۔ مجھے کیا ہوا ہے رے۔ ڈاکٹر کیوں بلا لیا؟"

"ماں! ڈاکٹر تمہیں نئی دوا دے گا۔"

تب ماں نے ڈاکٹر سے سوال کیا تھا۔ "ڈاکٹر مجھے کیا ہوا ہے۔"

"کچھ نہیں ماں..... کچھ خاص نہیں؟" ڈاکٹر سنتوش کو ماں کے کمرے سے باہر لا کر بولا تھا۔ "بڑھاپا اپنی حدیں پار کر رہا ہے۔ ماں شاید زیادہ دن نہ کاٹ سکے۔ وٹامن کی گولیاں لکھ دیتا ہوں۔ وہی دیتے رہا کرو۔ اور دیکھو ماں کے کمرے کی صفائی ضروری ہے۔"

جب ماں کو وٹامن کی گولیاں دی جاتیں، وہ انہیں خاموشی سے لے لیتیں۔ کبھی کبھی کہتی "بیٹا میرے لیے دوا پر خرچ مت کرو۔ اب کیا میری یہ عمر دوا کھانے کی ہے۔"

"ماں دوا سے جوڑوں کا درد چلا جائے گا۔"

"کہاں جاتا ہے درد بیٹا۔ درد تو زندگی کے ساتھ ہی جائے گا۔"

سریتا گہری سانس لیتی ہے۔ درد گیا کہاں۔ چلا جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ درد کا بھوت تو اب بھی اماں کے کمرے میں دُبکا بیٹھا ہے۔ یہ درد بھری اداسی، یہ بیزاری، ماں اب بھی گنگنا رہی ہے، بھولے بسرے گیتوں کو۔ ماں نے جانے یہ گیت کب سنے تھے، کس سے سنے تھے، کیسے یاد کر لئے تھے۔ رہ رہ کر وہ انہیں کیوں گنگنایا کرتی تھی۔

"سکھی ہو بہو۔" ایک دن ماں نے اسے پاس بٹھا کر کہا تھا۔ "میں جب اس گھر میں آئی تھی تو سنتوش کی دادی نے مجھ سے کیا کہا تھا سن۔ کہا تھا اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ اور پھر یہ سمجھو کہ یہ آنے والی نسل کی امانت ہے۔ میں نے ان باتوں کی من میں گرہ باندھ لی تھی۔ وہ بے چاری سب کچھ دیکھنے کو بیٹھی نہیں رہ گئی تھی۔ گھر میرے ذمہ چھوڑ گئی تھی۔ میں چاہتی تو کمائی کر کے گھر کا دیوالا نکال دیتی۔ پر ایسا نہیں ہوا۔" اتنا کہہ کر ماں نے گہری سانس لی تھی۔ "اب میں بھی بیٹھی تھوڑے ہی رہوں گی۔ لیکن جانے سے پہلے ایک مرتبہ کہیں تیر تھ یاترا کر آتی تو من کو سنتوش ہو جاتا۔ ایک بات تو ہی سنتوش سے پوچھ تو وہ مجھے یاترا پر کب لے جائے گا.....؟"

ماں کا دل رکھنے کے لیے اس نے کہہ دیا تھا۔ "ہم سب جلدی ہی یاترا پر جائیں گے ماں!"

ماں کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ جلد ہی تیر تھ یاترا کو جائے گی۔ اس لیے ادھر وہ روز ہی سفر کی بات کیا کرتی تھی اور اسے ایک اطمینان بخش جواب دے دیا جاتا تھا۔ پر آج صبح اس نے اس سے متعلق کچھ نہیں پوچھا تھا۔ سویرے سے خاموش تھی۔ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح جب سنتوش اس کی کوٹھری میں آیا تو دیکھا ماں بڑی میٹھی نیند سو رہی ہے، ایک ابدی نیند میں۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ کہہ رہی تھی مجھے نیند بالکل نہیں آتی۔ جی چاہتا ہے کچھ کھا کر گہری نیند سو جاؤں۔ سنتوش سے کہو وہ مجھے نیند کی دوا لا دے۔ پر کل رات کو خود بخود بغیر دوا کے نیند آگئی تھی۔ بہت گہری نیند۔

سریتا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب ماں کی ارتھی جا رہی تھی، تب سریتا نے محسوس کیا تھا، ماں اس سے پوچھ رہی ہے۔ "بہو یہ سب مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں۔"

"یاترا پر ماں......!"

"تیر تھ یاترا پر نا۔"

"ہاں ماں! بہت بڑا تیر تھ ہے۔ سب سے بڑا تیر تھ......!"

کوٹھری میں دیپک جل رہا ہے۔ اگر بتی بھی۔ جس کی خوشبو بیتے وقتوں، کڑوی کسیلی بو اور مہک میں گم ہوتی جا رہی ہے۔ سریتا پھر ساڑی کے آنچل سے آنکھیں پونچھنے لگتی ہے۔

☆☆☆

شکیلہ رفیق

ستہ شہ س

مسعود نے خط ختم کیا تو ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس خط میں جو کشش تھی اس نے اسی وقت جواب لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے قلم اٹھایا اور لکھا۔

میری گمنام عزیزہ! آداب

آپ نے اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔ یعنی نہ نام نہ پتہ، ایسے خطوط میں عموماً تلف کر دیا کرتا ہوں۔ مگر اس خط میں جانے کیا بات تھی جس نے مجھے جواب دینے پر مجبور کر دیا۔

محترمہ! آپ بلا خوف و خطر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے دل کا تمام حال مجھ سے کہہ ڈالیے۔ یقین جانئے آپ کے اس مسئلے یا راز سے میرے علاوہ صرف اللہ واقف ہو گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا یہ راز میرے سینے میں ہمیشہ دفن رہے گا۔ آخر اور بہنیں بھی تو سب کچھ مجھے لکھ دیتی ہیں۔ اگر انہیں رازداری کا یقین نہ ہوتا تو ایک لفظ زبان سے نہ نکالتیں نہ ہی قلم اٹھاتیں۔

تو — بس! یہ خط پڑھتے ہی پورے اعتماد کے ساتھ اپنا مسئلہ تفصیل سے لکھ بھیجئے — لیکن اس بار اپنا نام اور پتہ ضرور لکھئے گا — میری جانب سے مکمل رازداری کا یقین رکھئے — پریشان مت ہوں، کچھ عرصے بعد آپ یقیناً پرسکون ہو جائیں گی — بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بات بے حد معمولی ہوتی ہے مگر بہنیں اسے پہاڑ سمجھ لیتی ہیں اور جب انہیں میرا مشورہ ملتا ہے تب انہیں حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ یہ تو چٹکی بجاتے ہی حل ہونے والا مسئلہ تھا سو — ذہن پر بوجھ نہ ڈالیں اور جتنی جلد ہو سکے سب کچھ مجھے لکھ بھیجیں۔

منیر محمد

1-Velma Drive ONT M82,2N2 Toranto Canada

خط ختم کر کے اس نے اسے اگلے ماہ کی فائل میں لگا دیا۔ مگر...... فائل بند کرنے سے قبل ایک بار پھر اس گمنام خط کو پڑھنے لگا —

محترم منیر صاحب

جی تو یہ چاہتا ہے کہ آپ کو منیر بھائی کہوں۔ آپ کتنے ہمدرد ہیں کتنے اچھے! اگر دنیا کے سارے مرد آپ جیسے ہو جائیں تو شاید دنیا کی کوئی عورت دکھی نہ رہے۔ آپ سب کے مسائل حل کرتے ہیں۔ میرا بھی ایک مسئلہ ہے — لیکن — میں کہتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ میرا راز فاش نہ ہو جائے۔ آپ یقین کریں اگر کسی کو اس کی ذرا بھی خبر ہو گئی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔ میری برسوں کی کوشش پر پانی پھر جائے گا۔ آپ اگر اپنی سب سے عزیز ہستی کی قسم کھا کر رازداری کا وعدہ کریں تو اگلے خط میں آپ کو اپنے مسئلے سے آگاہ کروں مجھے امید ہے آپ بذریعہ رسالہ جواب ضرور دیں گے۔ پلیز صرف جواب دیں میرا خط نہ شائع کریں خدا آپ کو خوش رکھے آمین!

ایک گمنام

خواتین کے اس پرچے میں وہ کافی عرصے سے منیر کے نام سے بہنوں کے مسائل حل کیا کرتا تھا۔ اور اس میں کامیاب بھی تھا۔ نصابی لحاظ سے اس نے بی کام کیا تھا اور ایک بینک میں کام کرتا تھا۔ تاہم حصول تعلیم کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ نفسیات سے اسے خصوصی دلچسپی تھی اور — انسان کو جس چیز سے دلچسپی ہو، وہی کام کر کے اسے اصل سکون حاصل ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ — جو دن بھر کا تھکا ماندہ ہوتا رات کو بیٹھ کر خطوط کے جواب ضرور دیتا۔ اپنے گھر والوں سے اس نے یہ بات بالکل چھپا کر رکھی تھی — وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ (بقول ان کے) ایسے فضول کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتا ہے تو وہ کبھی اسے ایسا نہ کرنے دیں گے۔ اسی مصلحت کے تحت نام بھی مسعود سے منیر کر لیا تھا — جب کبھی گھر والے اسے آدھی آدھی رات تک کمرے بند کئے لکھتے پاتے تب خفا ہوتے، ٹوکتے، بگڑتے مگر وہ ہمیشہ یہی کہہ دیتا کہ آفس کا ضروری کام نمٹا رہا ہوں۔ یوں اس پردہ پوشی میں وہ کامیاب رہا تھا۔

اس کا معمول تھا کہ وہ آفس سے آتا تو نہا دھو کر سو جاتا — سو کر اٹھتا تو کچھ دیر کے لیے دوست احباب کے پاس چلا جاتا — پھر واپسی، رات کا کھانا اور — سگریٹ سلگا کر کمرہ بند کر کے لکھنے بیٹھ جاتا — اس کے لکھنے کا کمرہ سب سے الگ تھا اور مقفل بھی رہتا تھا — یوں اس کے پاس اپنی بیوی ناجیہ کے لیے بہت کم وقت بچتا — وہ خوش نصیب تھا کہ ناجیہ ایک صابر و صلح پسند عورت تھی۔ ورنہ گھر میں دن رات بس چخ چخ ہوتی رہتی۔ شادی کو کل ڈیڑھ دو سال ہی ہوئے تھے اور اس مختصر عرصے میں ہی وہ ناجیہ سے بلا ارادہ اتنی دور چلا گیا تھا جیسے ان کی شادی کو برسوں گزر گئے ہوں۔

ناجیہ سے ایک اتفاقیہ ملاقات نے اسے اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ ہوا یوں کہ وہ اس کے بینک میں اکاؤنٹ کھولنے آئی اور وہ — جو ایک سنجیدہ و منفرد لڑکا تھا بالکل عام لڑکوں کی طرح اس پر فریفتہ ہو گیا جب کہ وہ بھی

بس ایک قبول صورت لڑکی تھی۔

ناجیہ کو غیر متوقع طور پر پاکر کچھ عرصے تو وہ واقعی سب کچھ بھول کر اسی میں گم ہو گیا لیکن جوں ہی نئی نئی شادی کا نشہ ہلکا ہوا، اسے اپنی کتابیں اور نفسیات کی دنیا یاد آنے لگی۔۔۔ پھر وہ آہستہ آہستہ وہیں واپس چلا گیا جہاں سے چلا تھا۔۔۔ اب تو اسے دس پندرہ دن بعد ہی یاد آتا کہ اس کی ایک عدد بیوی بھی ہے۔ دراصل وہ خواتین میں اتنا مقبول ہو گیا تھا کہ جی چاہتا بینک کی نوکری چھوڑ چھاڑ کے بس ان کے الجھے مسئلے ہی سلجھاتا رہے مگر۔۔۔ بوڑھے والدین اور وفاشعار بیوی کی خاطر روزی تو کمانی تھی۔۔۔ وہ خوش رہتا تھا کہ گھر والے اس کے کام میں مداخلت نہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو ٹوکتے بھی نہ تھے۔ ادھر ناجیہ کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لائی، وہ بند کمرے میں آدھی آدھی رات تک کیا کرتا ہے۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو لڑ لڑ کر اس کی جان عذاب میں ڈال دیتی۔۔۔ بس کبھی کبھی آکر اسے بھیگی رات کا احساس دلا کر سونے کے لیے کہتی اور بس۔ پیار اور وفا کے ساتھ زندگی گزارنا ہی شاید اس کا نقطہ نظر تھا۔

یہ مہینہ، مسعود کو جانے کیوں، رینگتا نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا وقت تھم سا گیا ہے۔ اس ماہ کے شمارے میں خط چھپے گا پھر اسے پڑھ کر وہ اپنا جواب لکھیں گی اور۔۔۔ اس میں بھی وہ خاتون بے خوف ہو کر اپنا مسئلہ لکھتی ہیں یا نہیں؟ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مزید یقین دہانی چاہیں۔ بس، اسی قسم کے خیالات کے دائرہ میں وہ گھرا ہوا تھا ان دنوں۔ نہ جانے کیوں اسے اس گمنام خط سے اس قدر دلچسپی ہو رہی تھی ورنہ اس کے پاس تو ایسے ہزاروں بلکہ بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ پراسرار خطوط آتے تھے مگر اس خط میں جتنی دلچسپی و کشش محسوس ہو رہی تھی، کہ بس جلد اس کا مسئلہ معلوم ہو جائے۔

آخر کار وہ دن آپہنچا، دفتر سے واپسی پر جب وہ مقررہ دن ڈاک لینے پہنچا تو ایک لفافے کی شناسا سی تحریر دیکھ کر دل دھڑک اٹھا اور اس نے زیر لب تبسم سے مدیر سے کہا۔

"آئندہ سے ڈاک براہ راست ہی بھیجیے گا میں نے کبھی ضرورت سمجھی تو آجاؤں گا۔"

"جی بہتر۔"

وہ خطوط تھام کر جلدی سے باہر نکلا۔ وہ خط احتیاط سے جیب میں رکھا باقی بیگ میں ڈال دیے۔۔۔ آج گھر جانے کی کیسی جلدی تھی۔۔۔ خوش قسمتی سے جلد ہی ایک رکشہ مل گیا۔ جو اس کے رہائشی علاقے میں جانے پر رضامند بھی ہو گیا۔۔۔ ورنہ عام طور پر تو ان سے پوچھو، صدر چلو گے؟ تو بے نیازی سے جواب ملتا ہے، نہیں جی ہم تو لیاڑی جائیں گے اور۔۔۔ ابھی مسافر کشمکش میں ہی ہوتا ہے کہ رکشا آناً فاناً یہ جا وہ جا۔۔۔ یہی حال ٹیکسی والوں کا ہے۔۔۔ مسعود اکثر دوستوں سے ہنس کر کہا کرتا اب تو ان لوگوں سے یوں پوچھنا چاہیے۔ محترم گزارش یہ تھی کہ جہاں ہم جانا چاہتے ہیں اگر آپ بھی وہیں تشریف لے جا رہے ہیں تو پھر...... آپ کی اجازت سے اندر آجائیں؟ بہر حال آج ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔۔۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا، زور سے پکارا۔

"جلدی سے ایک پیالی چائے دے دو ناجیہ! آج بہت کام ہے۔"

"جی اچھا" کہیں دور سے ناجیہ کی آواز آئی۔

"بہت مصروف رہوں گا۔۔۔ سب سے کہہ دو کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔" اس نے ناجیہ کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے کہا۔

کمرے کے دروازے کے بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی اس کا دل بھی زور سے دھڑک اٹھا۔۔۔ نہ جانے کیا لکھا ہو گا اس میں؟ میرے خدشات درست ہوں گے یا غلط؟ پھر۔۔۔ عجلت سے لفافہ چاک کیا۔۔۔ تو وہی جانی پہچانی تحریر سامنے تھی۔

محترمی منیر صاحب

آپ کا جواب تازہ شمارے میں پڑھا۔ میرے دل کو اب بھی شکوک گھیرے ہوئے ہیں مگر۔ اس خیال سے کہ کہیں آپ خفا نہ ہو جائیں، ڈرتے ڈرتے آپ کو اپنے مسئلے سے آگاہ کر رہی ہوں۔ مگر میرا مسئلہ طویل اظہار بیان کا متقاضی ہے، اختصار سے کام اس لیے نہیں لوں گی کہ پھر۔۔۔ آپ کو اسے سلجھانے میں دقت ہو گی۔ خواہ آپ اس کی طوالت سے بور ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

بہ ظاہر بات بہت معمولی ہے لیکن...... میرے احساسات اس سلسلے میں بہت گہرے ہیں۔ تقریباً دو برس قبل میری شادی ہوئی۔ ابتدائی پانچ چھ ماہ تو میرے شوہر نے مجھے بہت توجہ اور پیار دیا۔ پھر آہستہ آہستہ جانے کیوں مجھ سے دور ہوتے چلے گئے میرے لیے خوشیوں کے سمندر سے بس چند قطرے ہی تھے۔ نہ جانے ان کی کیا مصروفیات ہیں جو وہ گھر والوں اور شریک حیات تک کے لیے وقت نہیں نکال سکتے۔ ذرا سا بھی نہیں۔۔۔ اتنے مصروف رہتے ہیں کہ بعض اوقات تو کئی کئی روز گزر جانے کے باوجود بات چیت بھی نہیں ہو پاتی۔ دفتر سے واپس آجاتے ہیں تو کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ تو خدا ہی جانتا ہے اندر کیا کرتے رہتے ہیں۔ منیر صاحب! مجھے کہنا تو نہیں چاہیے لیکن ...... آپ چونکہ میرے نفسیاتی معالج ہیں اس لیے تمام جزئیات سے آگاہی آپ کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی دوسری اقسام کے ڈاکٹروں کے لیے امراض کی تفصیل۔۔۔ میری عمر تقریباً بیس سال ہے۔ اس عمر میں کیا تقاضے ہوتے ہیں، آپ بخوبی واقف ہوں گے، ہر ماہ بیوی کے ہاتھ پر تنخواہ لاکر رکھ دینے والے کو میں شوہر یا شریک حیات تسلیم نہیں کرتی۔ اگر تمام مسائل کا حل پیسہ ہوتا تو...... آج کوئی بھی ذہن بیمار نہ ہوتا۔ ہمیں اس کے علاوہ بھی کچھ چاہیے۔۔۔ شوہر کی توجہ اور پیار...... یقین جانیے میں صرف گفتگو کو بھی ترستی ہوں۔ گھر میں صرف بوڑھے ساس سسر ہیں۔ ان لوگوں کو مجھ سے کتنی دلچسپی ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آپ خود لگالیں۔ دن بھر کے طویل انتظار کے بعد، جس میں یہ خواہشات شامل ہوں کہ وہ آئیں گے تو باتیں کریں گے، کہیں گھومنے جائیں گے، کسی رشتہ دار سے مل آئیں گے، جب...... بہ مشکل آدھے گھنٹے کا وقت ملے وہ بھی مشترکہ، تب پھر خواہشات دم توڑتے ہوئے کوئی بھی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔

میں ان کی اس مسلسل مصروفیت سے اوب چکی ہوں، مگر میں نے ابھی تک صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔۔۔ اور ازدواجی زندگی کے اس عرصے میں (جو اب مجھے طویل محسوس ہونے لگا ہے) میں نے ان سے ایک بار بھی لڑائی تو در کنار اونچی آواز میں بھی بات نہیں کی ہے۔ اور میرے اس صبر اور خاموشی کا الٹا اثر ہوا ہے وہ مزید بے حس ہو گئے ہیں۔

منیر صاحب! مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ وہ یہ بھی بھول چکے ہیں کہ وہ ایک شادی شدہ آدمی ہیں اور...... ان کی بیوی کے کچھ بشری تقاضے بھی ہو سکتے ہیں۔ ہاں۔۔۔ چار چھ ہفتے بعد انہیں میرے وجود کا احساس ہو جاتا ہے۔۔۔ میں درست طور پر یہ تعین نہیں

کم پار ہی تھی کہ مجھے آپ سے یہ باتیں کہنی چاہئیں یا نہیں مگر پھر...... میں نے کہہ دینا ہی مناسب جانا کہ...... آپ مسئلے کا تجزیہ ہر پہلو سے کر سکیں—— ان تمام ہاں کچھ شکایات کے باوجود مجھے ان سے لگاؤ بھی ہے اور محبت بھی اور میں زندگی انہی کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں—— مگر اب...... جب میں ایسا محسوس کرنے لگی کہ ان کی یہ مسلسل مصروفیت و بے نیازی کہیں مجھے:...... راہ سے نہ بھٹکا دے اور میں...... ان کے ساتھ بددیانتی کر بیٹھوں، پھر—— اگر مجھے سب کے بیچ رہ کر بھی تنہا ہی رہنا ہے تو میں...... ان سے علیحدگی کیوں نہ اختیار کرلوں؟ پر...... کیا کروں دل اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔

لیکن...... میں یہ سب کیوں سوچ رہی ہوں؟

اب تو سوچنا آپ کا کام ہے! آخر یہ سب آپ سے کہا ہی کیوں ہے...... لہٰذا...... ہاں یہ تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گئی کہ میرے سسر ایک عرصے سے صاحب فراش ہیں اور ساس زیادہ وقت عبادت میں گزارتی ہیں...... یوں وہ دونوں میرے ساتھ حسن سلوک روا رکھتے ہیں اور مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے...... شکایت ہے تو صرف اس سے جو میرا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی میرا کوئی نہیں—— منیر صاحب! خدارا یہ سب باتیں راز میں رکھئے گا ورنہ...... حشر کے روز دامن گیر ہوں گی...... وہ ایک مقامی بینک میں کام کرتے ہیں اور ان کا نام مسعود فیاض ہے—— جواب جلد دیجئے گا...... کہیں میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھوں۔ والسلام۔

ناجیہ مسعود

اور—— نیچے مسعود کا رہائشی پتہ درج تھا۔

چھن...... چھنا...... چھن چھن!! کے ساتھ ہی جیسے اس کے دماغ کے پرزے اڑ گئے——

"تو پہلا خط پڑھتے ہوئے جس خدشے نے گھیرا تھا وہ درست نکلا۔" اس نے اپنے گھومتے سر کو سنبھالا۔

کئی ساعتیں، کئی لمحے اسی سرسراہٹ کی نذر ہوگئے پھر...... اس نے گھومتے سر کو کرسی پر ڈال دیا۔

تو...... یہ خط واقعی میری...... بیوی...... یعنی...... ناجیہ کا ہے۔

اس کا پہلا خط دیکھ کر بھی اس کا ماتھا ٹھنکا تھا...... رسم الخط ناجیہ جیسا لگتا تھا—— مگر حالات واضح نہ تھے اور اسی شک کی بنا پر اس نے فوراً ناجیہ کو جواب دے دیا تھا—— پھر شدت سے جواب کا منتظر بھی تھا—— اس تمام عرصے میں اس نے وہ کچھ بھی نہ سوچا تھا جو اس خط میں لکھا تھا—— اس کا شکی ذہن بس یہی سوچتا رہا کہ وہ شادی سے قبل شاید کسی اور کو پسند کرتی تھی اور اب...... محبوب کی یاد ایک مسئلہ بن کر کھڑی ہوگئی—— اتنی زیادہ...... کہ اس سلسلے میں ایک ماہر نفسیات سے رجوع کرنا پڑا لیکن—— اب یہ سب خدشات پانی کے بلبلے ثابت ہوئے اور...... ناجیہ کے لیے وجہ فکر وہ خود نکلا۔

خطوط کے جوابات میں وہ خواتین کو اکثر لکھا کرتا کہ مسئلے چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہوتی ہیں...... جنھیں آپ لوگ اپنی حماقتوں سے ٹیلوں میں تبدیل کر دیتی ہیں مگر...... اس کے اپنے گھر میں تو ایک پہاڑ کھڑا تھا! مختلف قسم کے خیالات، شبہات اور کیفیات اس کے ذہن کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔

ناجیہ کو مجھ سے کوئی شکایت تھی تو...... براہ راست کہتی——!

اب مجھے اس سے کس قسم کا سلوک روا رکھنا چاہئے——!

اپنے گھر کی بات اس نے چار دیواری سے باہر کیوں نکالی——؟

ایک غیر مرد کو یہ سب بتانے کا اسے حق کس نے دیا؟

یہ بہت بڑی خطا ہے—— غیر مرد سے یہ سب باتیں! وہ بھی اتنی اپنائیت سے...... اسے اس کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔

یہ...... یہ...... تو محض اتفاق ہے کہ مرد میں ہوں—— خط کسی اور کے ہاتھ لگ جاتا تو! لیکن...... وہ یہ کب جانتی تھی کہ وہ یہ خط مجھے لکھ رہی ہے...... اس نے تو اپنے نزدیک منیر صاحب کو ہی اپنے مسائل سے آگاہ کیا تھا—— گویا—— وہ—— منیر جیسے غیر متعلق شخص سے یہ سب کچھ کہہ سکتی تھی۔

مگر......

مجھ سے کہتے حجاب آتا تھا۔

ہنہ! خوب ہے حجاب بھی...... غیر مرد سے وہ باتیں بھی کہہ دی گئیں۔ جو ایک حیادار عورت ہرگز ہرگز بھی کسی سے نہیں کہہ سکتی—— اس جرم کی...... سزا تو میں اسے ضرور دوں گا—— آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے—— جو دوسروں سے میرے شکوے کرتی پھرے! جسے میں ہمیشہ کھلی کتاب سمجھتا رہا—— اس کے دل میں میرے خلاف اتنا بغض بھرا ہے—— وہ تو ایسی بند اور مجلد کتاب ثابت ہوئی جس کے اندر آگ سے بنے لفظ تھے——

میں بھی...... کتنا خوش فہم تھا جو...... اپنی بیوی کو ایک وفادار اور صابر بیوی سمجھ کر ٹوٹ کر چاہتا رہا...... ہمیشہ دل سے اس کی قدر کی...... ابتدا سے لے کر آج تک اس سے بھرپور محبت کی لیکن اب......

میرا دل اس سے ہٹ گیا ہے—— اچھا ہوا جو یہ خوش فہمی دور ہوگئی کہ وہ بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہے...... اس خوش خیالی کا کھلا ثبوت یہ خط ہے...... جو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے—— میرے خلاف دل ہی دل میں منصوبے بنا رہی ہے۔

وہ......

وہ مجھ سے علیحدگی کو ایک معمولی سا قدم سمجھتی ہے! کتنے آرام سے لکھ دیا ہے کہ اس سے تو بہتر کہ میں—— ان سے علیحدگی اختیار کرلوں۔

ناجیہ بیگم! اگر آپ یوں خوش رہنا چاہتی ہیں تو میں آپ کی خوشیوں میں ہرگز حائل نہ ہوں گا—— آپ کے راستے سے ہٹ کر آپ کو آزادی دوں گا کہ آپ ایسے شخص کا انتخاب کر سکیں جو آپ کے معیار کے مطابق ہو...... اس کے پاس وقت ہی وقت ہو...... جو آپ کو بھرپور توجہ اور پیار دے سکے۔

یہی چاہتی ہیں نا آپ؟

تو بس...... کل صبح ہی...... یا ممکن ہے...... آج رات ہی آپ کی مطلوبہ خواہش پوری ہوجائے اور آپ...... مجھ جیسے غلط انسان کی قید سے آزاد ہوجائیں۔

بس...... تھوڑا انتظار اور...... ناجیہ بیگم...... تھوڑا سا......

اس تمام وقت میں وہ نہ جانے کتنی سگریٹیں پھونک چکا تھا...... اس نے ایک اور سگریٹ سلگایا اور ملحق باتھ روم میں چلا گیا—— اچانک نظر چہرے پر پڑی یہ کیا——؟

یہ میں ہوں؟ مسعود فیاض؟

مگر...... یہ چہرے پہ جرم کی چھاپ کیوں ہے؟ یہ اتنا بدل کیسے گیا ہے؟

پھر——

ایک پھندا کا سا ہوا۔

یہ...... تم...... کس ڈگر پہ سوچ رہے ہو؟ اور اس منہ سے؟ اسے سزا دینے کا فیصلہ کہیں اس جرم کی پردہ پوشی تو نہیں کہ تم ... خود... مجسم قصور وار ہو... ... اپنے گریبان میں تو جھانکئے منصور.... اس خط نے پس پشت یقیناً ایک معقول سبب ہے اسے یہ سب ایک غیر مرد سے کہہ ڈالنے پہ کس نے مجبور کیا؟ سینے پر رکھی صبر کی سل اب اس سے سہاری کیوں نہیں جا رہی؟

کیا واقعی وہ دل سے چاہتی تھی کہ یہ سب باتیں کسی سے کہے؟

ہرگز نہیں-- اس نے بار بار اس احساس کی نشان دہی کی ہے کہ یہ باتیں کہتے ہوئے اسے جھجک آ رہی ہے... اس بے قصور کو الزام دینے کی بجائے...... اپنا محاسبہ کیجئے مسٹر منیر!

پھر--

چھم سے وہ دن آ دھمکا جب وہ اسے بیاہ کر لایا تھا بے حد ارمان کے ساتھ — ان دنوں اس سے ایک پل کی جدائی کو بھی وہ گناہ سمجھتا تھا بلکہ بعض اوقات تو اس کا جی دفتر جانے کو بھی نہ چاہتا۔

اور اب—

اب وہ اس سے اسی قدر دور تھا— کئی کئی روز ہو جاتے اور پیار تو درکنار وہ اس سے بات بھی نہ کر پاتا۔

کیا— حقیقتاً وہ ... وہی مجرم تھی۔

وہ نہ تھا؟ جس کی موجودگی کے باوجود— اس کی بیوی کی راتیں تنہا گزرتی تھیں... یہ خط— یہ خط تو ایک الارم ہے مسعود فیاض! اگر وہ یہ خط نہ لکھتی... تو شاید وہ تم سے بہت دور چلی جاتی کہ پھر اس کا سایہ بھی نہ ملتا۔

اس نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے — پھر بھی بہت دیر تک وہیں کھڑا رہا— پھر آکر کرسی پر گردن ڈال دی۔

مسلسل سوچتے رہنے کے بعد — تصویر پازیٹو بن کر اس کے سامنے آ گئی... حقیقتاً ناجیہ نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے... بے حد ضبط سے کام لیا ہے... صبح ہوتے ہی وہ اسے سینے سے لگا کر اتنی پیاری باتیں کرے گا کہ وہ... سب کچھ... بھول جائے گی۔

مگر... صبح کیوں؟ اس اعتراف کے بعد دیر کس لیے؟

ابھی کیوں نہیں؟ اس تجزیاتی احساس کا اظہار ابھی کیوں نہیں؟

وہ— اس وقت بھی تو تنہا ہے— مجھے ابھی ... — اسی وقت اس کے پاس چلے جانا چاہئے

پھر—

اس نے تمام کاغذات سمیٹے...... ناجیہ کے دونوں خطوط ماچس دکھا کر تلف کر دیئے-- باہر نکل کر دروازے کو مقفل کرتے ہوئے اس کے ہاتھ رک گئے۔

اب— اس کمرے کو پراسرار نہیں رہنا چاہئے۔

میں— اسے یہ کبھی نہ بتاؤں گا کہ میں اچانک— بدل کیسے گیا۔ اس کو اس بات سے بے خبر رہنا ہی ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔

آج کئی ہفتوں بعد وہ ایک دوسرے ہی عالم میں بیڈ روم میں داخل ہوا۔ نہ تھکا تھکا سا— نہ ہی نیند بھری آنکھیں لیے— ناجیہ اس کی آمد سے بے خبر گردن جھکائے اپنی چپلیں ڈھونڈ رہی تھی— اس نے سر اٹھایا تو سامنے مسعود کو پایا اور— ہکا بکا رہ گئی۔

"آپ—!!!"

"ہاں ناجیہ۔"

وہ کچھ نہ بول سکی— بس اسے تکتی رہی۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور پیار سے بولا۔

"تم...... اب تک سوئی نہیں؟"

"آپ؟" وہ بدستور اسی حیرت کدے میں گم تھی۔

"اور...... یہ چپل پہن کر کہاں جا رہی تھیں؟" وہ مزید پیار سے بولا— ایک بار پھر اسے حیرانی سے دیکھ کر وہ نرمی سے بولی۔

"آپ کے پاس ہی آ رہی تھی...... کہ رات بہت ہو گئی ہے... سو جائیں اب۔"

"ناجیہ" اس نے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں بھر لیا— تو وہ— سمٹ کر وہیں گم ہو گئی۔

"مجھے معاف کر دو ناجیہ!"

"جی—" اس نے گردن اٹھا کر سوالیہ نگاہیں اس پر ٹکائیں۔

"ہاں— آج— آج" وہ رک گیا۔

"جی؟"

"یقین کرو— میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں ... میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں—"

"جی؟" اور اس جی کے ساتھ آنکھوں میں سوالوں کے بھنور چکرا رہے تھے۔

"تم سوچ رہی ہو گی کہ— یہ— یکایک مجھے کیا ہو گیا؟"

اس نے معصومیت سے صرف اثبات میں سر ہلا دیا—

"دراصل ابھی میں ایک انگلش ناول پڑھ رہا تھا--- جس میں ایک Couple کی کہانی بالکل ہم پر پوری اترتی تھی--- یعنی ایک مصروف شوہر اپنی بیوی کو بالکل وقت نہ دے پاتا تھا اس پر...... اس کی بیوی کے احساسات...... بس مجھے ایک دم ہی احساس ہوا کہ میں بھی اس شخص کی طرح نادانی کر کے تم پر ظلم کر رہا ہوں— بلا ارادہ ..... بلا منصوبہ...... میں نے بے ارادہ ہی تمہیں دکھ پہنچایا ہے میری جان! مگر اب تم سب کچھ بھول جاؤ...... اب...... اب...... تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو گی...... تم بن تو جیون ادھورا ہے ناجیہ! تم...... میرا سب کچھ ہو...... میری متاع حیات...... میں...... تمہارے بغیر کیوں کر جی سکتا ہوں— جان! اتنا عرصہ جو کچھ ہوا اسے ایک خواب سمجھ کر بھول جاؤ— یقین کرو— میں اتنا نادم ہوا کہ پورا ناول بھی نہ پڑھا اور— بھاگا ہوا— تمہارے پاس...... چلا آیا......" پھر اس نے اپنے مضبوط پنجے میں اس کا نازک سا ہاتھ تھام لیا۔

"تم......! تم نے...... مجھے...... معاف کر دیا نا؟"

"جی—!" ناجیہ نے سرور و شرم سے کہا اور— اس نے پوری قوت سے اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا

"بس! اب مجھے سب کچھ مل گیا— یہ دنیا— اور پیار کی ساری خوشیاں" اس کی آواز کیف و انبساط سے لبریز تھی۔

ناجیہ نے سر اٹھا کر مسکرا کر اسے پیار سے دیکھا تو وہ بولا۔

"بہت بہت شکریہ ناجیہ! تم واقعی ایک وسیع دل کی مالک ہو۔"

ناجیہ نے شرما کر اپنا سر اس کے چوڑے چکلے سینے میں چھپا لیا اور— دل ہی دل میں ہنس پڑی "چلو تم اسی میں خوش رہو کہ...... مجھے کچھ خبر نہیں...... اور آج تمہارا ضمیر جاگ گیا ہے۔ تم نے ضرور کوئی انگلش ناول پڑھا ہو گا مسعود!"

☆☆

ماہنامہ 'آجکل' نئی دہلی

نوجوان ورٹر کا درد

(The Sorrows of Young Werther)

اب چونکہ وہ تنہا تھی اور اس کے چھوٹے بھائی بہن بھی اس کے پاس نہیں تھے اس لیے وہ ان خیالات میں کھو گئی جو ان حالات کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اب وہ ہمیشہ کے لیے اپنے شوہر کی ہو چکی ہے۔ اس کی محبت اور وفاداری کا اسے احساس تھا اور وہ بھی اس سے پورے دل کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھی جس کی خاموشی اور بھروسے مندی کچھ اس طرح سے تھی جیسے اسی کے لیے وہ پیدا ہوا، اس نے محسوس کیا کہ وہ ہمیشہ اس سے اور اس کے بچوں سے والہانہ پیار کرتا رہے گا۔ اس کی محبت کچھ ایسی تھی جیسے کوئی بھی وفاشعار بیوی اپنے لیے سب سے بڑی نعمت سمجھ سکتی تھی۔ لیکن دوسری طرف ورٹر بھی اس کے اتنے نزدیک ہو چکا تھا کہ پہلی ملاقات کے بعد ہی ایسا لگتا تھا گویا دونوں کی روحیں ایک دوسرے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ ان میں ذہنی یکسانیت تھی اور اتنے دنوں کی رفاقت کے بعد جہاں ایسے بہت سے مواقع آئے کہ وہ ساتھ ساتھ ہر جگہ جاتے۔ اس کا اس کے دل پر گہرا نقش بن گیا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ اپنے دل کی ساری بات اس سے کہہ دیتی اور وہ بھی اس کی باتوں سے اتفاق کرتا۔ اب اس کی جدائی سے اس کے وجود میں ایک ایسا خلا پیدا ہونے والا تھا جسے پر کرنا ناممکن تھا۔ کاش کہ اس نے ایسے ہی کسی لمحے میں اسے اپنا بھائی بنا لیا ہوتا؟ اس وقت وہ کتنی خوش ہوتی! کاش کہ اسے اس بات کی بھی اجازت ہوتی کہ وہ اس کی شادی اپنی کسی سہیلی سے کرا دیتی اور البرٹ کے ساتھ اس کے تعلقات ویسے ہی استوار ہو جاتے جیسے کہ پہلے تھے۔

اس نے ایک کے بعد ایک اپنے تمام دوستوں کو یاد کیا اور ہر شخص میں اسے کوئی نہ کوئی خامی نظر آئی۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو ورٹر کی برابری کر سکتا۔

غور و فکر کے دوران اس نے بہت گہرائی سے اسے محسوس کیا تھا کہ اس کے اندر اور دل کی گہرائیوں میں ایک خواہش پنہاں تھی کہ وہ اسے اپنا بنا لے۔ لیکن اوپری دل سے وہ یہ کہتی رہی کہ اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکے گی۔ اسے رکھنا بھی نہیں چاہیئے۔ اس کے لاشعور میں ایک ایسی اداسی بھر گئی اور اس نے محسوس کیا کہ اب اس کی مسرتوں کی گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اس کا دل اسے کچوکے لگانے لگا اور اس کی آنکھوں میں گہری اداسی چھا گئی۔

اسی ادھیڑ بن میں شام کے ساڑھے چھ بج گئے جب اس نے سنا کہ ورٹر قدم بڑھاتا ہوا آرہا ہے۔ اس نے اس کے قدموں کی آہٹ پہچان لی اور اس کی آواز سن لی۔ وہ اسی کو پوچھ رہا تھا اس کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا اور شاید پہلی بار ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اس کی آمد پر اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑکا تھا۔ اسے خوشی ہوتی اگر وہ اس سے ملنے سے انکار کر دیتی۔ جیسے ہی وہ داخل ہوا وہ اس کے سامنے چاہت بھری گھبراہٹ کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ "تم نے اپنا وعدہ نہیں نبھایا۔"

"میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔" اس کا جواب تھا۔

"تو بھی تمہیں میری التجا کا لحاظ رکھنا چاہیئے تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "میں اس لیے آیا تاکہ ہم دونوں کو سکون حاصل ہو جائے۔"

وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور نہ ہی اسے یہ احساس ہوا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس نے اپنی چند سہیلیوں کو بلانے کے لیے کہا تاکہ ورٹر کے ساتھ کمرے میں اکیلے نہ رہ سکے۔ اس نے وہ کتابیں ایک طرف کر کے رکھ دیں جو وہ لایا تھا ساتھ ہی کچھ اور کتابوں کے بارے میں پوچھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی سہیلیاں فوراً آجائیں۔ لیکن نوکرانی واپس آگئی اور اس نے بتایا کہ اس کی دونوں سہیلیاں اس وقت آنے سے معذور ہیں۔

ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا کہ نوکرانی سے کہہ دے کہ وہ بازو والے کمرے میں بیٹھ کر اپنا کام کرے لیکن اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ورٹر کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ وہ اٹھ کر اپنے پیانو کے پاس بیٹھ گئی اور اسے بجانے لگی لیکن دھن بھی صحیح نہیں نکل رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور خاموشی کے ساتھ ورٹر کے پاس بیٹھ گئی جو اپنی خاص جگہ پر اس وقت تک بیٹھ چکا تھا۔

"کیا تمہارے پاس پڑھنے کے لیے کچھ نہیں ہے؟" اس نے کہا۔ "نہیں کچھ نہیں"۔ "میری میز کی دراز میں تمہارے وہ ترجمے رکھے ہیں جو تم نے اوشین کی نظموں کا کیا تھا۔ میں نے انہیں ابھی تک اس لیے نہیں پڑھا ہے کہ مجھے امید تھی کہ تم انہیں کسی دن مجھے سناؤ گے۔ لیکن ایسا کوئی موقع ابھی تک نہیں آیا۔" وہ مسکرایا اور اس نے ان ترجموں کو نکال لیا۔ لیکن اسے ہاتھ میں لیتے ہی اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر

اس نے انہیں دھیرے دھیرے پڑھنا شروع کیا۔

"گزرتی ہوئی رات کے روشن ستارے!

مغرب میں تمہاری روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ تم دھیرے دھیرے بادلوں سے اپنا سر نکال رہے ہو اور پہاڑیوں پر زینہ بہ زینہ ایک رفتار سے چل رہے ہو۔ لیکن میدانی علاقوں کے لیے تمہارے پاس کیا ہے۔ ہر طرف طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں۔ لہروں کی آواز دور سے آرہی ہے۔ اور گونج دار لہر دور دراز کے علاقے میں پہاڑیوں سے ٹکرا رہی ہے۔ رات کے روشن جگنو کی روشنی ماند پڑ رہی ہے وہ میدانوں کی طرف اڑ رہے ہیں۔ اے روشن ستارے تم کیا دیکھ رہے ہو۔ تم صرف مسکراتے ہو۔ اور پھر غائب ہو جاتے ہو۔ لہریں تمہاری طرف خوشی سے بڑھتی ہیں وہ تمہاری خوبصورت زلفوں کو غسل دے رہی ہیں۔ اے خاموش روشنی کی لہر، الوداع، الوداع۔ خدا کرے تمہارے ساتھ اوشین کی آتما جاگ اٹھے

اپنے غموں سے چور رنج و غم میں بیٹھا ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔ اور میں صبح کا انتظار کر رہا ہوں۔ اے گزرے ہوئے لوگوں کے دوست تم قبر میں جاؤ لیکن اسے اس وقت تک نہ ڈھانکنا جب تک میری معشوق نہ آجائے۔ ایک خواب کی طرح زندگی مجھ سے پیچھا چھڑا کر جدا ہو رہی ہے۔ پھر میں کیوں پیچھے رہ جاؤں۔ یہاں میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہی ابدی نیند سوؤں گا۔ جب پہاڑیوں پر رات اترے گی اور تیز زناٹے دار ہوائیں چلیں گی اس وقت میری پرچھائیں، میرا پریت وہاں کھڑے ہو کر میرے دوستوں کا غم کرے گا۔ دور سے شکاری اس کی آواز سنے گا اور وہ خوفزدہ ہو جائے گا لیکن میری آواز اسے اچھی لگے گی۔ کیونکہ میرے دوست میری آواز کو پسند کرتے تھے

اب ایک تنگ سی کوٹھری اس کی رہائش گاہ ہے اور رہائش کی جگہ بالکل تاریک ہے۔ تین قدموں سے میں تمہاری قبر ناپ لیتا ہوں۔ اوہ! تم جو اپنی زندگی میں بہت مہان شخص تھے صرف تمہارے سرہانے لگے ہوئے چار پتھر تمہاری یادگار رہ گئے ہیں۔ اب تو تمہاری ماں بھی نہیں بچی ہے جو تمہارا غم کرے اور نہ ہی کوئی ایسی لڑکی جو تم سے محبت کرتی رہی ہو اور جس کی آنکھوں میں آنسوں ہوں، جس نے تمہیں پیدا کیا وہ بھی مر چکی ہے اور جو تمہاری منظور نظر تھی وہ بھی۔ مرے ہوئے لوگوں کی نیند بہت گہری ہوتی ہے۔ اور خاک ہی ان کا تکیہ ہوتی ہے۔ اب ہم نہ تو تمہاری آواز سن سکیں گے اور نہ تمہاری آواز پر جاگ سکیں گے۔"

لوٹے کی آنکھوں سے اچانک بہنے والے آنسوؤں سے اس کے دل کی بے قراری کو قرار آگیا اور ورتر نے نظم سنانا بند کر دیا۔ اس نے ان کاغذات کو پھینک دیا، اس کا ہاتھ پکڑ کر بے تحاشا رونے لگا۔ لوٹے نے اپنے سر کو دوسرے ہاتھ سے سہارا دیا اور رومال سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں۔ دونوں عجیب شکست خوردگی کے احساس سے بندھے ہوئے تھے۔ ان نظموں میں انہیں اپنا ہی حشر نظر آیا۔ ان کے آنسو ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے۔ ورتر کی آنکھ اور اس کے ہونٹ لوٹے کے بازوؤں سے ڈھلکے ہوئے تھے اس میں ایک خوف سا پیدا ہوا اس نے ایک بازو ہٹانا چاہا لیکن درد اور ہمدردی نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ پھر اپنی حالت درست کرنے کے لیے اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ نظموں کو سنانا جاری رکھے۔ ورتر کانپ گیا اس کا دل اچھل کر باہر آگیا اس نے کاغذات اٹھالیے اور روتے ہوئے رندھے ہوئے لہجے میں سنانا شروع کر دیا۔

"اے بہار کی عطر بیز ہواؤ تم مجھے کیوں جگا رہی ہو۔ تم مجھے یہ کہہ کر اکسا رہی ہو کہ میں شبنمی قطروں سے تمہیں تر و تازہ کر دوں۔ لیکن میرے رخصت ہونے کا وقت نزدیک آچکا ہے۔ وہ دھماکہ جلد ہی ہونے والا ہے، جو میری زندگی کے درخت کی ساری سبز پتیاں مجھ سے چھین لے گا! کل جب وہ سیاح آئے گا جس نے مجھے اور میری جوانی دیکھی اس کی نگاہیں چاروں طرف مجھے کھیتوں میں تلاش کرتی رہیں گی۔ اور وہ مجھے کہیں نہیں پائے گا۔"

ان الفاظ کی معنویت اور جذبے کی شدت نے اس محروم اور شکستہ شخص کو مجروح کر دیا۔ اپنی ساری ناامیدی کے ساتھ وہ لوٹے کے سامنے گر گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی آنکھوں سے، اپنی بھوؤں سے لگانے لگا۔ اس کے خطرناک ارادوں سے اس کا دل بھر آیا۔ وہ حواس باختہ ہو گئی۔ اس نے اس کے ہاتھوں کو دبایا پھر انہیں اپنے سینے پر رکھا اور پھر اچانک اس کی طرف جھک گئی۔ اس کے گال اس سے مس ہو گئے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ اس نے اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے۔ اسے اپنے سینے سے لگالیا اور اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر بے تحاشا اپنے بوسے ثبت کر دیئے۔ وہ سخت آواز میں چیخی "ورتر ورتر" اور اس کے پاس سے ہٹنے کی کوشش کی۔ "ورتر!" — اور پھر اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دھکیل کر اس کے سینے سے اپنے کو الگ کیا! "ورتر" اس نے بہت نپے تلے اور بارعب انداز میں پکارا۔ اس نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ اپنے بازوؤں کو اس کے گرد سے ہٹالیا اور پھر اس کے قدموں میں گر گیا۔ وہ اس کے پاس سے ہٹی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں جس میں کچھ محبت اور کچھ غصہ بھرا ہوا تھا اس نے کہا "یہ آخری بار ہے ورتر اب تم مجھے پھر کبھی نہیں دیکھو گے۔" اور پھر اس پر بھرپور محبت کی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ جلدی سے بغل کے کمرے میں گھس گئی اور اندر سے بند کر لیا۔ ورتر نے اپنے ہاتھ اس کی طرف بڑھائے لیکن اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ فرش پر ویسے ہی پڑا رہا اس کا سر صوفے پر تھا اور اسی حالت میں وہ نصف گھنٹے سے زیادہ رہا جب کسی شور کی وجہ سے اسے ہوش آگیا۔ یہ خادمہ تھی جو کھانے کے لیے میز ٹھیک کر رہی تھی وہ کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا اور جب اسے تنہائی نصیب ہوئی تو وہ ملحقہ کمرے کے دروازے تک گیا اور دھیمی آواز میں کہا "لوٹے! لوٹے! صرف ایک لفظ اور الوداع!" وہ خاموش رہی اور بار بار اپنے الفاظ دہراتا رہا، منت سماجت کرتا رہا اور پھر بمشکل تمام اپنے کو اس سے جدا کیا اور چلاتے ہوئے کہا "خدا حافظ لوٹے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔"

وہ فصیل کے دروازے تک آیا محافظ، جو اسے پہچانتے تھے نے بغیر کچھ کہے اسے جانے دیا۔ وہاں ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ بارش اور برف باری کی درمیانی

چیز۔ تقریباً گیارہ بجے اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے کھولنے پر اس نے دیکھا کہ اس کے آقا کے سر پر ہیٹ نہیں ہے لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی لیکن اس نے اس کے لباس تبدیل کرنے میں اس کی مدد کی۔ ہر چیز بھیگی ہوئی تھی۔ بعد میں اس کا وہ ہیٹ ڈھلان والی پہاڑیوں کی چوٹی پر ملا۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ اس بھیگی ہوئی اندھیری رات میں بغیر گرے ہوئے وہاں کیسے پہنچا۔

اس نے اپنے کو بستر پر گرا لیا۔ اور دیر تک سوتا رہا جب دوسری صبح اس کے پکارنے پر نوکر کافی لے کر آیا تو وہ بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ لوئے کو لکھے گئے خط میں وہ ذیل کی عبارت تحریر کر رہا تھا۔

" آخری بار اور یقیناً آخری بار میں اپنی ان آنکھوں کو وا کر رہا ہوں۔ اب اس کے بعد وہ کبھی سورج کو نہیں دیکھ سکیں گی۔ کیونکہ آج کا یہ کہر آلود دن اپنے دبیز کہرے کی چادر میں سورج کو چھپائے ہوئے ہے۔ اس لیے اے فطرت کے عناصر تم اس کا غم کرلو! تمہارا بیٹا، تمہارا دوست اور تمہیں چاہنے والا اب چند ہی لمحوں میں تم سے بچھڑنے والا ہے۔ لوئے یہ ایک ایسا احساس ہے جس کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم یہ ایک نیم شعوری، خواب جیسی کیفیت ہے کہ کوئی اپنے آپ سے یہ کہے کہ یہ آخری صبح ہے۔ آخری! لوئے لفظ آخر کا استعمال کرتے ہوئے میرے جذبات میں کوئی ہیجان نہیں پیدا ہو رہا۔ کیا میں یہاں اپنی پوری طاقت کے ساتھ نہیں کھڑا ہوں اور کل میں بالکل سیدھا لیٹا رہوں گا۔ زمین پر ایک بوجھ بن کر مرنا! اس لفظ سے کیا مفہوم نکلتا ہے؟ جب ہم لفظ مرنا کہتے ہیں تو ہم ایک خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ میں نے خود بہت سے لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ لیکن انسان اس بات کا اتنا عادی ہو گیا ہے کہ اسے نہ تو اپنے وجود کا اور نہ اس کے خاتمے کا کوئی احساس ہوتا ہے۔ تاہم میرا وجود اور تمہارا وجود! تمہارا اے میری پیاری! اور ایک ہی لمحے میں--- علیحدگی، جدائی--- شاید ہمیشہ کے لیے؟ نہیں، لوئے، نہیں--- میں کیسے ختم ہو سکتا ہوں؟ تم کیسے ختم ہو سکتی ہو؟ کیوں، کیا ہم زندہ نہیں؟ ختم ہونا! اس کا کیا مطلب ہے آخر یہ بھی تو ایک لفظ ہے۔ ایک خالی بے معنی آواز! جسے سن کر میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ مر گیا لوئے! ٹھنڈی زمین میں دفن کر دیا گیا۔ اس میں محصور ہو گیا۔ اتنا اندھیرا--- میری ایک دوست تھی جو میری کم مایہ جوانی میں میرے لیے سب کچھ تھی! وہ مر گئی میں اس کے جنازے کے ساتھ ساتھ گیا پھر اس کی قبر کے کنارے کھڑا ہو گیا جب لوگوں نے اس کا تابوت نیچے رسے کے سہارے اتارا اور اسی تیزی سے وہ رسہ اوپر آ گیا اور پھر پھاوڑے سے مٹی ڈالی گئی تو تابوت سے ایک اداس سی گونج پیدا ہوئی جو دھیرے دھیرے اور مدھم ہوتی گئی اور آخر کار مٹی سے وہ ڈھانک دی گئی! میں نے قبر کے پاس زمین پر اپنے کو گرا لیا--- بہت رنجیدہ، ٹوٹا ہوا، خوف زدہ میرے اندر طغیانی سی اٹھ رہی تھی، لیکن میں نہیں جان سکا کہ میں نے کیا محسوس کیا۔ میں کیا محسوس کروں گا۔ موت! قبر! میں ان الفاظ کو نہیں جانتا نہ ہی سمجھتا۔

اُف مجھے معاف کر دو! معاف کر دو! کل شام اسے ہی میری زندگی کا آخری لمحہ ہونا چاہیے تھا۔ اے میری فرشتہ شاید پہلی بار وہاں بلاشبہ پہلی بار میرے اندرونی وجود کو وہ خوشیوں سے بھرے احساس کی رمق ملی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے! وہ مجھے چاہتی ہے! میرے ہونٹوں پر وہ مقدس آگ اس وقت بھی سلگ رہی ہے جو ہمارے ہونٹوں اور تمہارے عارض گلگوں سے نکلی تھی۔ اس کی شدت اور تاب میرے دل میں موجود ہے۔ معاف کر دو مجھے! معاف کر دو!

ہاں میں جانتا تھا کہ تم مجھے پیار کرتی ہو۔ اسے اس وقت سے جانا جب تم نے پہلی بار اپنی نگاہیں مجھ پر ڈالیں۔ جب میں نے پہلی بار تمہارے ہاتھوں کو دبایا اور پھر بھی جب میں تم سے دور ہو جاتا ہوں یا جب البرٹ کو تمہارے پاس دیکھتا ہوں اس وقت میں گہرے شبہ سے پیدا ہونے والی مایوسی میں ڈوب جاتا ہوں۔

کیا تمہیں وہ پھول یاد ہیں جو تم نے مجھے اس وقت بھیجا تھا جب اس شخص کے سامنے تم مجھ سے ایک لفظ بھی کہنے سے قاصر تھیں یا اپنا ہاتھ میری طرف بڑھانے سے معذور تھیں؟ ان پھولوں کو پاکر میں آدھی رات تک ان کے سامنے جھکا رہا۔ عبادت کے انداز میں اور انہوں نے مجھے تمہاری محبت کا یقین دلایا۔ لیکن افسوس! وہ احساسات اور وہ نقش بھی ٹھیک اس طرح ختم ہو گئے جیسے کوئی عبادت گزار اچانک اپنی عبادت اور اپنے معبود کی عبودیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ گرچہ اس کا وجود مختلف علامتوں سے ہر وقت اس کے سامنے ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

ہر چیز یہاں کی فانی اور لافانی ہے لیکن ابدیت بھی زندگی کی اس رمق کو نہیں ختم کر سکے گی۔ جس کا ذائقہ مجھے کل تمہارے ہونٹوں سے ملا۔ اور جسے پاکر میری روح اس وقت بھی سرشار ہے! وہ مجھے چاہتی ہے مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میرے ان بازوؤں نے اسے جکڑا تھا میرے ان ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا تھا۔ میرے اس منہ سے اس کے لیے آوازیں نکلی تھیں۔ وہ میری ہے! تم میری ہو! ہاں لوئے ہمیشہ کے لیے۔

اور اس حقیقت کا کیا کروں کہ البرٹ تمہارا شوہر ہے؟ شوہر--- اگر ہے بھی تو صرف اسی دنیا کا ہی ہے۔ --- اور اسی دنیا کے لیے یہ گناہ بھی ہے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے اور یہ کہ میں تمہیں اپنے بازوؤں میں جکڑنا چاہتا ہوں! گناہ! ٹھیک ہے اگر یہ گناہ تھا تو میں اس کے لیے اپنے کو سزا دے رہا ہوں۔ میں نے اس میں بہشت کی ساری مسرتوں کا ذائقہ محسوس کیا ہے۔ وہ گناہ جس میں مجھے زندگی کی ساری نمو کا نچوڑ ملا۔ اسی لمحے سے تم میری ہو گئی ہو! میری۔ اوہ لوئے! میں تمہارے سامنے جاؤں گا! جاؤں گا اپنے باپ کے پاس، تمہارے باپ کے پاس اسی کے سامنے میں اپنی حالت بیان کر دوں گا اور شکایت کروں گا اور وہ مجھے سکون دے گا، راحت دے گا۔ اس وقت تک جب تک تم نہ آجاؤ۔ اور میں اڑ کر تم سے ملنے جاؤں گا۔ تمہیں جکڑ لوں گا اور تمہارے ساتھ رہوں گا اس کی نگاہوں کے سامنے جو ازلی و ابدی ہے اور ہمیشہ کے لیے تمہیں بازوؤں میں جکڑے ابدیت میں کھو جاؤں گا۔

یہ میرا خواب نہیں ہے اور نہ ہی میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں اور نہ ہی میں کسی فریب میں مبتلا ہوں۔ جیسے جیسے میں اپنی قبر کے پاس پہنچ رہا ہوں میری اندرونی روشنی کی لو اور تیز ہوتی جارہی ہے۔ ہم ایک ساتھ رہیں گے! ہم پھر ایک دوسرے سے ملیں گے! میں تمہاری ماں سے ملوں گا! میں اسے تلاش کروں گا اور

پھر اس کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دوں گا تمہاری وہ ماں جس کی شبیہہ تم ہو۔

گیارہ بجے کے قریب ورٹر نے اپنے نوکر سے پوچھا کہ کیا البرٹ لوٹ آیا ہے۔ اس نے کہا ہاں ابھی اس نے دیکھا ہے کہ اس کا گھوڑا اصطبل میں لے جایا جا رہا ہے۔ تب اس نے اسے وہ نوٹ دیا جس میں یہ تحریر لکھی تھی۔

"کیا آپ مجھے مہربانی کر کے اپنا پستول عنایت کریں گے اس سفر کے لیے جو میرے ذہن میں ہے۔ خدا کرے آپ کے ساتھ سب ٹھیک ہو۔"

وہ مشفق عورت رات میں بہت کم سو پائی۔ اسے جس بات کا اندیشہ تھا اس کا فیصلہ ہو چکا تھا اور جس انداز میں اس کا فیصلہ ہوا تھا اس کا نہ وہ اندازہ کر پائی اور نہ خوف زدہ ہو سکی۔ اس کی رگوں میں آسانی کے ساتھ جو پاک خون دوڑ رہا تھا اس میں اب ہیجان پیدا ہو چکا تھا۔ اور اس کا دل عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ کیا یہ ورٹر کی بانہوں کی جکڑ سے پیدا ہوا شعلہ تھا جو وہ اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی یا اس کی اس حرکت سے پیدا ہوا غصہ تھا یا اپنی موجودہ حالت یا پہلے کی اس کیفیت کا جب وہ معصومیت کے ساتھ سارے راز اپنے اندر پوشیدہ رکھ لیتی تھی، سے مقابلہ تھا؟ اب وہ اپنے شوہر سے کس طرح ملے گی۔ وہ کیسے اس کے سامنے اس منظر کا اعتراف کرے جسے وہ آسانی سے کر سکتی تھی۔ لیکن اسے قبول کرنے کی اب اس کے اندر ہمت نہیں رہ گئی؟ ان دونوں نے ابھی تک اس معاملے کو لے کر ایک لمبی خاموشی طاری کر رکھی تھی۔ اور کیا اس خاموشی کو توڑنے میں وہ پہل کرے اور اپنے شوہر سے نامناسب وقت میں ایسے راز کو افشاں کرے جس کے لیے وہ تیار نہیں تھا۔ وہ پہلے سے ہی خوفزدہ تھی کہ ورٹر کے آنے کی خبر سے ہی اس پر غلط تاثر پڑے گا اور اب تو ایسا سانحہ ہو گیا جس کی اسے امید نہیں تھی۔ کیا وہ بجا طور پر یہ امید کر سکتی تھی کہ اس کا شوہر بغیر کسی تاثر کے ان باتوں کو اسی طرح لے گا اور کیا یہ امید کر سکتی تھی کہ وہ اس راز کو اس کی روح سے جان لے گا۔ اور پھر وہ اس آدمی کے سامنے یہ بیان دے جس کے لیے وہ ہمیشہ صاف شفاف شیشے کی طرح کھلی اور صاف رہی ہے اور جس نے اس سے کبھی بھی کوئی بات نہیں چھپائی اور نہ ہی اپنے کسی احساس کو چھپایا۔

وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتی اس سے وہ اور زیادہ فکر مند اور پریشان ہو جاتی اور پھر بار بار اس کا خیال ورٹر کی طرف جاتا جو اب اس کے لیے کچھ نہیں تھا۔ لیکن جسے وہ چھوڑ نہیں سکتی تھی اور جسے آخر کار چھوڑنا تھا۔ وہ جب اسے کھو دے گی تو اس کے پاس زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہیں بچے گا۔

اس کے دل پر کتنا بھاری بوجھ تھا — ایک ایسا بوجھ جو اپنے آپ میں بالکل واضح نہیں تھا۔ اس رکاوٹ کا بوجھ جو اب اس کے درمیان پیدا ہو گیا تھا! چونکہ وہ دونوں نیک اور سمجھ دار تھے اس لیے دونوں ہی ایک دوسرے سے خاموشی برتنے لگے اور یہ خاموشی اس وقت اور بڑھ جاتی جب ان میں اندرونی طور پر کچھ اختلاف پایا جاتا۔ ہر شخص اپنے کو صحیح سمجھتا اور دوسرے کو غلط اور حالات اس قدر پیچیدہ اور نازک ہو گئے کہ صحیح وقت پر ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہو گیا۔ کاش کہ ایک دوسرے سے یہ راز آشکار کر کے وہ ایک دوسرے کے نزدیک آتے اور محبت اپنی ساری گرمجوشی کے ساتھ ان پر آشکار ہو گئی ہوتی، جس کی بدولت وہ ایک دوسرے کے سامنے اپنا دل کھول سکتے تو شاید ہمارے اس دوست کی زندگی بچ گئی ہوتی۔

ان میں ایک اور عجیب و غریب کیفیت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ہم ورٹر کے خطوط سے واقف ہیں اس نے اس دنیا کو چھوڑنے کی خواہش کبھی راز نہیں رکھا۔ البرٹ نے اس کی ہمیشہ مخالفت کی اور اکثر لوٹے اور البرٹ اس سلسلے میں بات بھی کرتے لیکن البرٹ کبھی اسے سنجیدگی سے نہیں لیتا اور اپنے مزاج کے خلاف اس میں چڑچڑاہٹ بھی پیدا ہو جاتی۔ وہ کہتا کہ اس کے اندر ایسے کسی پختہ ارادے کی رمق بھی نہیں ملتی وہ اپنے اس شبہے کا اظہار لوٹے سے بھی کر دیتا۔ اس سے لوٹے کو کچھ سکون ملتا لیکن دوسری طرف اس موضوع پر اپنے شوہر سے مزید بات چیت کرنے سے وہ رک بھی جاتی۔

البرٹ لوٹ آیا اور لوٹے اس کی طرف گھبراہٹ کے ساتھ لپکی! وہ خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے معاملات مکمل نہیں ہوئے تھے اس کے علاوہ شکستہ حال سڑکوں نے اسے اور چور کر دیا تھا۔

اس نے پوچھا کہ کیا کوئی بات ہوئی ہے۔ بہت سرعت کے ساتھ اس نے جواب دیا کہ ورٹر کل شام یہاں آیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا کوئی خط وغیرہ آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ چند خطوط اور پارسل اس کے کمرے میں رکھے ہیں۔ وہ فوراً ادھر چلا گیا اور لوٹے تنہا رہ گئی۔ جس آدمی سے وہ محبت کرتی تھی اس کی موجودگی نے اس پر خوشگوار تاثر چھوڑا۔ اس کی شرافت، اس کی محبت اور اس کی مہربانی کا خیال کر کے اسے سکون ملا پھر بھی اس کے اندر ایک تجسس پیدا ہوا۔ وہ اس کے کمرے میں چلی گئی جیسے کہ وہ پہلے جایا کرتی تھی۔ اس نے اسے پارسل کھولنے اور خطوط کو پڑھنے میں مشغول پایا۔ اس نے کچھ سوالات کیے اور اس نے اسے جواب دے کر ٹرخا دیا اور خطوط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

اس طرح ایک گھنٹہ وہ ساتھ رہے اور لوٹے کے دل پر گہرے سائے منڈلاتے رہے۔ اس نے محسوس کیا کہ چاہے وہ کتنی بھی اچھی کیفیت میں ہو اس سے سب کچھ بتانا ناممکن ہو گا۔ وہ اداسی سے بھر گئی اور یہ اداسی اس وقت اور زیادہ خطرناک ہو گئی جب وہ اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ورٹر کے خادم کی آمد سے وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ نوکر نے وہ نوٹ البرٹ کو دیا جو اس نے خاموشی کے ساتھ اپنی بیوی کی طرف بڑھا دیا اور کہا "اسے پستول دے دو" پھر اس نے نوکر سے کہا "میری خواہش ہے کہ اس کا سفر پر مسرت ہو۔" اس سے اس پر بجلی سی گر گئی اور نہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کیا کر رہی ہے وہ اپنا قلم اٹھانے لگی۔ دھیرے دھیرے وہ دیوار تک گئی اور اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پستول کو اٹھایا اس کی گرد جھاڑی۔ اور بہت جھجک کے ساتھ، شاید وہ اسے دینے میں اور دیر کرتی اگر البرٹ نے اس کی طرف گہری نگاہوں سے نہ دیکھا ہوتا۔ بغیر کوئی لفظ کہے اس نے خاموشی کے ساتھ پستول اس کے حوالے کر دیا اور جب خادم وہاں سے چلا گیا اس نے اپنا کام سمیٹا اور اپنے کمرے میں عجیب سی پریشان کیفیت اور بے یقینی کے ساتھ داخل ہو گئی۔ اس کے دل نے اسے آنے والے خطرات

سے آگاہ کر دیا۔ وہ اسی موڑ پر پہنچ گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ خود کو اپنے شوہر کے قدموں میں گرا کر سب کچھ بتا دے گی، گزری ہوئی شام کا واقعہ اپنا جرم اور اپنے اور بیٹوں کے بارے میں لیکن اسے کوئی راستہ نہیں سجھائی دیا اور کوئی امید کی کرن نظر نہیں آئی کہ اپنے شوہر سے کہہ سکے کہ وہ ورٹر کو جا کر دیکھے۔ کھانے کی میز لگ گئی تھی اور ایک پڑوسی عورت جو چند سوال پوچھنے آئی تھی واپس ہونے لگی لیکن رک گئی جس کی وجہ سے کھانے کی میز پر بات چیت کا موضوع بدل گیا۔ اور وہ سب کچھ بھول گئے۔

نوکر پستول لے کر ورٹر کے پاس آیا اور اسے جب یہ معلوم ہوا کہ اسے لوٹے نے دیا ہے تو وہ خوش ہو گیا اس نے اپنا کھانا اور شراب منگائی اور نوکر سے کہا کہ وہ جا کر اپنا کھانا کھا لے اور پھر لکھنے بیٹھ گیا۔

"انہیں تمہارے ہاتھوں نے چھوا ہے اور تم نے اپنے ہاتھوں سے اس کی گرد جھاڑی ہے۔ اور میں ان کا ہزار بار بوسہ لوں گا کیونکہ تم نے اسے چھوا ہے اور تم اے آسمانی روح میرے ارادے کو پورا کرنے میں میری مدد کرو! اور تم، لوٹے، تم نے مجھے وہ ہتھیار دیا ہے جس کے ہاتھوں سے میں اپنی موت چاہتا تھا۔ آہ! آج میں نے اسے پالیا، میں نے اپنے نوکر سے سب کچھ پوچھا۔ تم اسے پستول دیتے وقت کانپ رہی تھیں اور تم نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ خدا حافظ بھی نہیں کہا! نہیں نہیں خدا حافظ نہیں — کاش کہ تم نے اپنا دل مجھ سے کھول دیا ہوتا۔ صرف ایک لمحے کے لیے جس کی وجہ سے تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری ہو گئیں۔ لوٹے ہزاروں سال کی کوشش کے باوجود بھی میرے دل سے وہ نقش محو نہیں ہو سکتا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ تم اس شخص سے نفرت نہیں کر سکتی ہو جو تم سے والہانہ پیار کرتا ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد اس نے اپنے نوکر سے کہا کہ وہ سامان باندھنے کا کام پورا کر لے۔ کچھ کاغذات اس نے پھاڑے، باہر نکلا اور کچھ چھوٹے موٹے بل کی ادائیگی کی۔ وہ واپس آیا پھر دروازے سے باہر گیا۔ اس نے بارش کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ کاؤنٹ کے پارک میں گیا۔ بے مقصد ادھر ادھر گھومنے لگا اور جب رات ڈھلنے لگی تو واپس آیا اور اس نے یہ تحریر لکھی:

"ولہلم آج آخری مرتبہ میں نے کھیتوں جنگلوں اور آسمان کو دیکھا ہے۔ تم سے بھی الوداع لیتا ہوں اور خدا حافظ کہتا ہوں! میری پیاری ماں، مجھے معاف کر دیجئے گا! ولہلم تم اسے تسلی دینا! خدا تم دونوں کو اپنی رحمتوں سے نوازے! میرے سارے معاملات درست ہو گئے ہیں۔ خدا حافظ! ہم پھر ایک دوسرے سے ملیں گے اور بہت خوشیوں کے ساتھ۔"

اس شام اس نے اپنے بہت سے کاغذات تلاش کیے، بہت سے کاغذ کو پھاڑ ڈالا یا انہیں نذر آتش کر دیا اور ولہلم کے نام کچھ پیکٹ کو مہر بند کیا ان میں کچھ چھوٹے چھوٹے انشائیہ اور متفرقات بھی تھے۔ جن میں میں نے بعد میں دیکھا رات کے دس بجے کے قریب اس نے آتش دان میں اور آگ سلگوائی۔ شراب کی ایک بوتل لانے کو کہا اور پھر نوکر کو جانے کا حکم دیا جس کا کمرہ اور دوسری خادماؤں کا کمرہ دور عقب میں تھا۔ لڑکا اپنے کپڑوں میں ہی لیٹا تاکہ صبح اپنے آقا کے پاس جلد پہنچ سکے کیونکہ اس نے بتایا تھا کہ ڈاک گاڑی صبح چھ بجے اس کے دروازے پر آ جائے گی۔

گیارہ بجے کے بعد۔

"میرے ہر طرف خاموشی چھائی ہے۔ میرے خیالات بھی خاموش ہیں۔ اے خدا میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ان آخری لمحات میں مجھے یہ طمانیت اور قوت بخشی!

میں کھڑکی کے پاس آتا ہوں اور باہر دیکھتا ہوں۔ اڑتے ہوئے طوفانی بادلوں کے درمیان سے میں اس اکیلے ٹمٹماتے ستارے کو دیکھ رہا ہوں۔ تم کبھی نہیں گرو گے۔ خدا تمہیں بھی اور مجھے بھی سنبھالے ہوئے ہے۔ جب میں رات میں تمہارے دروازے سے نکلا تو یہ میرے سامنے ہوتا کس قدر مدہوشی سے میں نے اسے دیکھا ہے اور اس وقت بھی — لوٹے ہر چیز سے مجھے تمہاری یاد آ رہی ہے۔ کیا تم ہمہ وقت میرے نزدیک نہیں ہو۔

اے لوٹے تمہارا پورٹریٹ اب میں تمہیں واپس کرتا ہوں اور تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ تم اس کی عزت کرنا۔ میں نے ہزار بار اس کے بوسے لیے ہیں اور جب کبھی باہر جاتا اور اندر آتا تو اپنے ہاتھ اس کے سامنے ہلاتا۔ "میں نے تمہارے والد کو ایک نوٹ بھیجا ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ میری لاش کی حفاظت کریں گے۔ گرجے کے میدان کے عقب میں کھیتوں کے سامنے لنڈن کے دو درخت ہیں میری خواہش ہے کہ مجھے وہیں دفن کیا جائے۔ وہ اپنے آپ ایک دوست کے لیے اتنا کر سکتے ہیں۔ تم بھی ان سے ایسا کرنے کے لیے کہہ دینا۔ میں یہ نہیں چاہوں گا کہ پاکباز عیسائی اپنے لاشوں کو مجھ جیسے بدقسمت شخص کے بغل میں دفن کریں۔ بلکہ میری خواہش ہے کہ تم مجھے سڑک کے کنارے یا اس خوبصورت وادی میں دفن کرو تاکہ پادری اور جو دوسرے لوگ اس راہ سے گزریں وہ میری مغفرت کی دعا کریں یا کوئی عاشق میرے لیے آنسو بہا دے۔

لوٹے اب میں اس ٹھنڈی اور خطرناک پیالی کو جس سے میں موت کا زہر پینے والا ہوں پکڑ کر لرز نہیں رہا ہوں۔ تم نے اسے اپنے ہاتھوں سے دیا ہے اور میں خوش ہوں۔ سب کچھ...... سب کچھ...... میری زندگی کی ساری خوشیاں پوری ہو گئی ہیں۔

مجھے اپنے مرنے سے کس قدر خوشی ہو رہی ہے کہ میں تمہارے لیے مر رہا ہوں۔ لوٹے میں اپنے کو تم پر قربان کر رہا ہوں۔ میں بہت ہمت کے ساتھ مروں گا اور میں خوشی سے مر جاؤں گا بشرطیکہ میری موت سے تمہاری زندگی کو سکون حاصل ہو جائے اور دن مسرتوں کے ساتھ گزرے لیکن افسوس ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنے چاہنے والوں کے لیے اپنا خون بہائیں اور جن کی موت سے ان کے دوستوں کی زندگیاں خوشیوں سے بھر جائیں۔

لوٹے میں اپنے انہی کپڑوں میں دفن ہونا چاہتا ہوں کیونکہ تم نے انہیں چھو کر کے متبرک کر دیا ہے اور میں نے تمہارے والد سے بھی یہی التجا کی ہے۔ میری روح میرے تابوت پر منڈلا رہی ہے کوئی بھی میری جیبوں کی تلاشی نہ لے یہ ہلکے گلابی رنگ کا بوجھ تم اپنے سینے پر پہنے ہوئی تھیں جب میں نے تمہیں پہلی بار تمہارے بچوں کے درمیان دیکھا تھا۔ ان کا ہزار بار

بوسہ لینا اور پھر ان سے اپنے بد قسمت دوست کا حال بتا دینا۔ یہ بو بھی میرے ساتھ ہی دفن ہوگا۔ تم نے میری بر تھ ڈے پر اسے دیا تھا۔ میں اسے پا کر کس قدر نشے میں آگیا تھا۔ تم خاموش رہنا روتا نہیں۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں!

پستول بھرا ہوا ہے۔ گھڑی بارہ بجا رہی ہے۔ وقت آگیا ہے۔ لوٹے! لوٹے! خدا حافظ! خدا حافظ!"

ایک پڑوسی نے پستول سے نکلتے ہوئے شعلے کو دیکھا اور گولی چلنے کی آواز سنی لیکن چونکہ ہر طرف خاموشی تھی اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی!

صبح چھ بجے جب نوکر روشنی کے ساتھ اندر آیا تو اس نے اپنے آقا کو فرش پر گرا ہوا دیکھا پاس میں ہی پستول پڑا ہوا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ اس نے پکارا، اسے اٹھانے کی کوشش کی، کوئی جواب نہیں صرف موت کی خاموشی! وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دوڑا۔ البرٹ کے پاس دوڑا۔ لوٹے نے گھنٹی کی آواز سنی اور کانپتے ہوئے اپنے دل کو پکڑ لیا اس نے اپنے شوہر کو جگایا وہ اٹھ بیٹھا روتے ہوئے نوکر نے یہ خبر سنائی اور لوٹے فوراً ہی البرٹ کے قدموں میں بے ہوش ہو کر گر گئی۔

ڈاکٹر آیا۔ اس نے اسے فرش پر گرا ہوا دیکھا اسے بچانے کی کوشش ختم ہو چکی تھی۔ گرچہ اس کی نبض اب بھی دھیمے دھیمے چل رہی تھی لیکن اس کے سارے اعضا جکڑ گئے تھے۔ اس نے اپنی داہنی آنکھ کے اوپر سے اپنے دماغ میں گولی ماری تھی جو باہر آگیا تھا۔ اپنی کوششوں میں انہوں نے اس کے بازوؤں کی ایک نس میں نشتر لگایا اس سے خون باہر نکل آیا وہ اب بھی ہلکی ہلکی سانس لے رہا تھا۔

کرسی کے ہتھے پر موجود خون کے دھبوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے بیٹھ کر اپنے کو گولی ماری تھی پھر پیٹھ کے بل گر گیا۔

یہ خبر فوراً مکان میں، پڑوس میں اور سارے قصبہ میں تیزی سے پھیل گئی اور پھیلتے ہی کہرام مچ گیا۔ لوگ ورٹر کو فرش سے اٹھا کر چارپائی پر لٹا چکے تھے۔ اس کا سر بندھا تھا اور موت کی زردی اس کے چہرہ پر آگئی تھی۔ اس کے اعضا بے حس و حرکت ہو گئے تھے لیکن سانس کبھی تیز اور کبھی سست آتی جاتی تھی، ہر لمحہ موت کا انتظار تھا۔ رات کو اس نے صرف شراب کا ایک گلاس پیا تھا۔ کتاب اس کی میز پر کھلی پڑی تھی۔

میں اب البرٹ کی پریشانی اور لوٹے کے غم کا کچھ بھی ذکر نہ کروں گا۔

یہ خبر سنتے ہی بڈھا نوکر فوراً مکان پر آیا اور نہایت رنج والم کی حالت میں رو کر اپنے مرتے والے عزیز دوست سے لپٹ گیا۔ اس کا بڑا لڑکا اس کے بعد فوراً آگیا۔ دونوں نہایت غم والم کی حالت میں اس کی چارپائی کے پاس بیٹھ گئے اور اس کے ہاتھوں کو اور چہرہ کو بوسہ دینے لگے۔ سب سے بڑا لڑکا جو ورٹر کا بڑا دوست تھا برابر اس وقت تک اس کے منہ کے پاس اپنا منہ رکھے ہوئے بیٹھا رہا جب تک کہ اس کی روح نے جسم کو نہیں چھوڑ دیا۔ ورٹر کے مرنے کے بعد اس کو بڑی مشکل سے وہاں سے ہٹایا گیا۔ بارہ بجے ورٹر کی روح نے اس قفس عنصری کو چھوڑ دیا۔ بوڑھے نوکر کی موجودگی اور دیگر احتیاط کی وجہ سے کوئی ہنگامہ وغیرہ نہیں ہوا۔ گیارہ بجے رات کو اس نے ورٹر کی لاش اسی جگہ دفن کرا دی جہاں کی اس نے خواہش ظاہر کی تھی۔

وہ بوڑھا نوکر اور اس کے لڑکے جنازہ کے ساتھ قبرستان تک گئے۔ البرٹ ساتھ نہ جا سکا۔ لوٹے کی زندگی بھی اب تب ہو رہی تھی۔ جنازہ مزدوروں نے قبرستان تک پہنچا دیا۔ کوئی پادری ساتھ نہیں تھا۔

(ختم شد)

☆☆☆

افلاطون کا تصور عشق

افلاطون نے عشق کا جو تصور پیش کیا اس کے بارے میں اپنے اپنے قیاس کے مطابق زیادہ تر لوگوں نے اسے ماورائی عشق سمجھا ہے، جب کہ افلاطون نے اسے ایک فلسفہ کی شکل دی تھی۔ اس موضوع پر اس کی کتاب "سمپوزیم" یا "ڈنر پارٹی" ہے جو اس کے اولین دور کی تصنیف ہے اور وہ بھی اس وقت کی جب افلاطون کے اندر کا پوشیدہ شاعر فلسفی افلاطون پر حاوی تھا۔ افلاطون کی مشہور زمانہ تصنیف "ریپبلک" کا ڈاکٹر ذاکر حسین نے اردو میں "ریاست" کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ اس کی چند اور کتابوں کا جستہ جستہ اردو میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے خصوصاً اس کے ان مکالموں کا جن کا سقراط نے زہر کا پیالہ پینے سے پہلے اپنے رفیقوں کے سامنے اظہار کیا تھا۔ ہم 'آجکل' کے اگلے شمارے سے "سمپوزیم" کا ترجمہ تلخیص کے ساتھ قسط وار قارئین کے لیے پیش کریں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اگر کسی کی نظر سے اس کا اردو میں کوئی ترجمہ گزرا ہو تو برائے مہربانی مطلع کریں تا کہ ہم اس کی اشاعت پر دوبارہ غور کر سکیں۔ یہ کتاب ایک "ڈنر پارٹی" سے تعلق رکھتی ہے، جہاں مہمان کھانا کھانے کے بعد اپنا وقت تفریح میں گزارنے کے بجائے عشق کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ اس بحث میں اس وقت کے آٹھ مشہور مفکرین اور شاعروں نے حصہ لیا تھا۔

(ادارہ)

مرزا کھونچ

بیاض چھپوانے کے لیے

بینک سے قرض کی درخواست

جناب برانچ منیجر صاحب
بینک آف ادبستان
غزل آباد

سبجیکٹ۔ بیاض چھپوانے کے لیے قرض۔

جناب عالی!

گزارش احوال یہ ہے کہ میں ایک غریب شاعر ہوں۔ ویسے بھی ہم شاعروں کے لیے غریب ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم غریب نہیں ہوں گے تو اپنی شاعری میں محرومی قسمت کا رونا کیوں کر روئیں گے۔ جب تک والد مرحوم کی جائداد باقی تھی، میں نے بیاض چھپوانے کے متعلق سوچا بھی نہیں تھا۔ ورنہ یہ حسرت کب کی پوری ہو چکی ہوتی۔ سچ پوچھیے تو میں نے اپنے والد کی جائداد کے بل پر شاعر بن کر اپنے شہر کی عزت بڑھائی ہے۔ مال مفت سے کئی چھوٹے بڑے مشاعرے کرا چکا ہوں۔ لیکن آج جب میرے پاس غزلوں، نظموں اور قطعات کا انبار لگا ہے، مجھے چھوٹی سے چھوٹی نشست میں بلانا گوارا نہیں کیا جاتا ہے۔ اپنے شہر کے کتنے ہی شاعروں کو میں نے سہارا دیا۔ ان کے لیے مناسب استاد کا انتظام کر دیا اور ان کی بیاض چھپوا کر جشن اجرا کا اہتمام کر دیا۔ لیکن آج وہ میرے پاس پھٹکتے بھی نہیں۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ بیاض چھپوانے کے لیے قرض کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔ میری جن غزلوں پر داد تحسین کے نعروں سے فضا گونجتی تھی، آج انہیں غزلوں کو اغلاط کا مجموعہ کہا جا رہا ہے۔

مجھ کو معلوم ہے کہ بینک کو قرض دینے کے لئے ضمانت کی ضرورت ہوتی ہے یا پھر اس قرض کے عوض قرض خواہ کو اپنی ملکیت بینک کے نام گروی رکھنی ہوتی ہے۔ لیکن میں آپ کو اس کے متعلق اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ ایک تو میں شاعر ہوں اس لیے میری ضمانت کوئی نہیں لے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرا صرف ایک گھر ہے، لیکن وہ بھی رہن شدہ۔ اس لیے بینک کی یہ شرط مجھے منظور نہیں۔ ہاں گروی رکھنے کے لیے بس ایک ہی چیز میرے پاس ہے، وہ ہے میری بیاض شاعری۔ یہی میرا گھر ہے، یہی میری کھیتی ہے اور یہی میرا پیشہ ہے۔ اگر آپ چاہیں تو بیاض شاعری آپ کے سپرد کر سکتا ہوں۔ آپ کا یہ پوچھنا حق بہ جانب ہوگا کہ اگر آپ پیسہ لے کر بھاگ گئے تو بینک کے قرض کا کیا ہوگا۔ تو جناب، میں صاف لفظوں میں آپ کو یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میرے قرض داروں کا پہرہ مجھ پر اتنا سخت ہے کہ میں ان کے ذریعہ بچھائے گئے بارودی سرنگوں کو پار نہیں کر سکتا۔ آپ اپنے ذرائع سے اس کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ میں بھاگوں گا بھی تو کس کے سہارے بھاگوں گا۔ آپ پڑھے لکھے ہیں، سنا ہے کہ ادب پسند بھی ہیں۔ تو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ ایک غریب شاعر کا بھلا اللہ کے سوا اور کون سہارا ہے۔ بھاگوں گا تو گمنامی کی موت ہوگی اور اگر گمنامی کی موت ہی مرنا ہے تو ایسی شاعری سے فائدہ۔ میری خواہش ہے کہ میرا ایک شاندار مزار بنے، ہر سال جشن وفات منایا جائے۔ میرے نام نہاد دوست مزار پر آکر گھڑیال کے دو آنسو بہائیں۔ وہاں میری غزلیں گائی جائیں۔ اخباروں میں اس کی مناسبت سے ضمیمہ نکلے۔ اب آپ بتائیے کہ میں بھاگ جاؤں گا تو کیا میری خواہش پوری ہوگی۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

مجھے بھروسہ ہے اپنی شاعری پر اور امید کرتا ہوں کہ جب چھپ کر بازار میں آئے گی تو ہاتھوں ہاتھ بکے گی۔ اور میں بینک کا پورا پیسہ ادا کر دوں گا۔ نہیں بکنے کی صورت میں بینک کو یہ اختیار ہوگا کہ ساری کتابیں ضبط کر لے اور خود فروخت کرے، ساتھ ساتھ مجھے اس کی رائیلٹی بھیجتا رہے۔ اگر بازار میں کتاب نہیں بکی تو آپ اپنے ماتحتوں کو جبراً بیچ سکتے ہیں۔ پھر بینک سے سیٹھ ساہوکاروں کا براہ راست تعلق رہتا ہے۔ آپ کے ایک اشارہ پر وہ بیاض کی ساری کاپیاں کھپت کرا سکتے ہیں۔

اگر آپ پھر بھی مجھے قرض نہیں دیں گے تو کوئی بات نہیں۔ لیکن آپ کو میری آخری خواہش کا احترام کرنا ہی پڑے گا اور مجھے شدت سے محسوس ہونے لگا ہے کہ یہ میری آخری خواہش ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں قلمی نسخے آپ کو سونپنے کو تیار ہوں۔ آپ ہی اپنے توسط سے اسے چھپوائیں، اجرا کرائیں اور اکادمیوں کو سپرد کر کے مجھے انعام دلوائیں۔ ہاں، قریب سو کاپیاں مجھے دینے کی زحمت کریں گے تاکہ میں اپنے نام نہاد دوستوں اور موقع پرست مداحوں کو دے کر اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ بحال کر سکوں اور رائیلٹی کے پیسے قرض داروں کو ادا کر سکوں۔

میری درخواست قبول ہونے کی صورت میں میں آپ کا ممنون رہوں گا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے خاندان کے لیے عمر بھر سہرا اور مرثیہ لکھتا رہوں گا۔

آپ کا بھروسہ مند
مرزا کھونچ
محلہ۔ شعرستان
ڈاکخانہ، ریگستان
ضلع، قبرستان

☆☆☆

نیاٹولہ، بتیہ۔ ۸۴۵۴۳۸

تبصرے

نام کتاب: اکتشافی تنقید کی شعریات

مصنف : پروفیسر حامدی کاشمیری
قیمت : ۳۰۰ روپے
ناشر : کمپیوڈیشی، راج باغ، سرینگر

اکیسویں صدی کے کروٹ بدلتے ہی ادبی تنقیدی نظریے نے جہاں عمل کیمیائی سے دیگر علوم کے ساتھ اپنے معدیاتی پیکروں کو نئے سانچے فراہم کئے وہیں ادبی نظریہ سازی نے فکر کی منطق کو عمیق سے عمیق تر کردیا۔ جہاں قاری ذات کے بحران سے لے کر تمدنی بحران کا شکار ہوتے ہوئے بھی تخلیق پاروں میں اپنے شعور کے حوالے سے معدیات کو دریافت کرنے کی سعی کرتا ہے۔ حامدی کاشمیری کی کتاب "اکتشافی تنقید کی شعریات" یہی مقولاتی ماجرہ ہمیں سناتی ہے۔ نئے نظریاتی مقبوضات کو تسخیر کرتے ہوئے قاری کو اس بات سے آگاہ کرتی ہے کہ ادب میں نظریہ سازی کا عمل ہزار رہا سال پرانا ہے۔ کتاب میں مغرب اور مشرق کے کئی حوالوں کی مدد سے تنقیدی نظریے اور ان کی جمالیات کی تفہیم کرتے ہوئے بعض اردو نثری اور شعری تخلیقی نمونوں پر بھی تجزیاتی انداز میں لکھا گیا ہے۔ کمار پاشی کی نظم "ولاس یاترا"، میر حسن کی "سحر البیان"، غالب کے ایک شعر کا قاری اساس تنقید کے طرز پر اچھا تجزیہ کیا گیا ہے۔ چند نظموں کے اچھے نمونے دے کر ان پر اچھی گفتگو کی گئی ہے مگر ایک نظم "الف کی خودکشی" کا تجزیہ کرتے ہوئے نہ جانے کیوں نقاد نے شاعر کا نام بتانے سے گریز کیا ہے۔

کتاب کی موضوعاتی درجہ بندی نہیں کی گئی ہے لہٰذا تحریر میں تجدیدات اور موضوعات ادھر ادھر بکھر گئے ہیں۔ کتاب کا نفس مضمون کا مقدمہ کتاب کا نام دیکھ کر اوراک میں آجاتا ہے مگر اس کی ذیلی مباحث بکھری ہوئی ہیں لہٰذا فکری تلازمے اور تحریر کا نامیاتی دائرہ نامکمل ہے۔ لہٰذا یہ کتاب کم بلکہ ایک طویل مقالہ محسوس ہوتا ہے، جو بہت عرق ریزی، بصیرت اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ جس میں ارسطو سے لے کر کانٹ، برگساں، مارکس، فرائڈ، برکلے، ہیوم، آئن اسٹائن، بریڈلے، فرائیڈ، سائیر، دریدا، ایلیٹ اور ہارٹ مین کے حوالوں کے علاوہ قرآن پاک، بایزید بسطامی، منصور حلاج، شمس تبریز، ابن العربی، الغزالی اور مولانا رومی مجدد الف ثانی کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ جس سے نقاد کی وسعت نظر کا ثبوت مہیا ہوتا ہے۔

کتاب میں کسی مناجیاتی رسائی کو نہیں اپنایا گیا لہٰذا قاری کو کتاب کے نفس مضمون کو پانے میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن اس کتاب نے نئے نظریاتی حوالوں کے توسط سے اردو تنقید کو نظریاتی اعتبار سے نئے ذائقے سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے اور اردو کے تنقیدی خزانے میں نئے فکری گوہروں کو دریافت بھی کیا گیا ہے۔

احمد سہیل، کناڈا

نام کتاب : بستیاں

مصنف : جوگندر پال
قیمت : ۵۰ روپے
ناشر : اردو اکادمی، گھٹا مسجد، دریا گنج، دہلی

آزادی کے بعد کے افسانہ نگاروں میں جوگندر پال کا نام ایک مخصوص انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کے تخلیقی ذہن نے ہم عصر افسانہ نگاروں کو بلاشبہ ایک خاص سمت بخشا ہے۔ ان کی پیش کش کا انداز جہاں قاری کو پڑھنے پر آمادہ کرتا ہے وہیں غور و فکر کی بھی دعوت دیتا ہے۔ ان کے افسانے ان کے وسیع تجربات کی غمازی کرتے ہیں۔

'بستیاں' پال صاحب کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں ۱۸ نئے افسانوں کے علاوہ متعدد افسانچے بھی شامل ہیں۔ یہ کہانیاں زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل، زندگی کے نشیب و فراز اور موجودہ سیاسی، سماجی صورت حال کی بھرپور عکاسی کرتی نظر آتی ہیں اور ساتھ ہی انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان کہانیوں میں جہاں مختلف النوع مسائل کے گہرے شعور کی نشاندہی ہوتی ہے وہیں زندگی کے تلخ تجربوں کا بیان بھی ملتا ہے۔ موصوف نے ان افسانوں میں اپنے فن کی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے اپنے مزاج اور شعور کی پختگی کا جیتا جاگتا ثبوت دیا ہے۔

مجموعہ میں شامل افسانہ 'مقلمات' میں جوگندر پال نے عوام کی نفسیاتی کیفیات اور بطور خاص دور جدید کے مسائل سے جوجھتے لوگوں کے تناظر میں ان کی ذہنی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ افسانہ 'سانس سمندر' اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھوتا ہے۔ اگرچہ تقسیم کے بعد اس سے متعلق مسائل پر بہت سارے افسانے لکھے گئے لیکن اس سے پیدا شدہ مسائل آج تک دونوں ممالک کے عوام کو پریشان کئے ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ اس مجموعے میں شامل تمام کہانیاں قابل توجہ ہیں اور کہانی کا ایک نیا رنگ و آہنگ اور اپنے عہد کے نمائندہ افسانوی رجحانات کا پتہ دیتی ہیں۔ تمام افسانوں میں موضوعات فکر کی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان افسانوں میں وہ مسائل صاف دکھائی دیتے ہیں جن سے ہمارے معاشرے کے افراد دوچار ہو رہے ہیں۔ مجموعے کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کی ساری باتیں ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہیں۔ جوگندر پال کے فن کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی 'مقصدیت' ہے جو آفاقی نوعیت کی ہے اور اس کا نصب العین بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں: "میں نے کہانیاں نہیں لکھی ہیں، بستیاں بسائی ہیں، میرے لئے ان کی آبادکاری سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ہر جگہ کچھ بسا بسا لگے۔" ان افسانوں میں موضوعات فن کی سطح پر عام روش سے ہٹ کر اپنی الگ شناخت کا ثبوت دیتے نظر آتے ہیں۔

غرض اس مجموعے کے تمام افسانے اور افسانچے پال صاحب کے مشاہدہ کی گہرائی اور بیداری شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ قوی امید ہے کہ اس افسانوی مجموعہ کی بھی

مگر مجموعوں کی طرح علمی و ادبی حلقوں میں یقینا پذیرائی ہوگی۔

ابو ظہیر ربانی، نئی دہلی

نام کتاب : لاکلام

شاعر : غلام مرتضیٰ راہی

قیمت : ۱۲۵ روپے

تقسیم کار : شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی، الٰہ آباد (یو پی)

'لاکلام' سے پہلے غلام مرتضیٰ راہی کے دو مجموعے 'لامکاں' اور 'لاریب' شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں ان کا ایک مجموعہ 'حرف مکرر' کے عنوان سے بھی شائع ہوا تھا لیکن اس میں زیادہ تر ایسی غزلیں تھیں جو 'لامکاں' اور 'لاریب' میں شامل تھیں مگر جنہیں کچھ ترمیم اور تجدید کے بعد شائع کیا گیا تھا۔ یوں دیکھئے تو 'لاکلام' غلام مرتضیٰ راہی کا تیسرا مجموعہ ہوا لیکن ایسا لگتا ہے کہ شاعر اب تک 'لا' کی منزلوں ہی میں ہے اور حال قال کی کیفیت طاری ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار:

زمین گھومتی ہے جیسے اپنے محور پر
خود اپنا میں نے بھی راہی یوں ہی طواف کیا
کھڑے کھڑے مجھے آتا ہے گھومنے کا مزا
زمین پاؤں تلے گردش مدام میں ہے

مجھے نہیں معلوم کہ غلام مرتضیٰ راہی کو اس رقص کا علم ہے کہ نہیں جو کھڑے کھڑے اپنے ہی پاؤں پر گھوم کر کیا جاتا ہے۔ مصر میں اس رقص کو 'تنورہ' کہا جاتا ہے (تنورہ بمعنی دامن، لہنگا، سایا) اس رقص کی روایت مولانا روم کے سلسلے سے منسوب کی جاتی ہے اور طواف کا مطلب ہے گردش کائنات۔

'لا' سے اثبات کی طرف آنا تو آسان ہے البتہ اثبات سے 'لا' کی طرف سفر خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب ہے وجوب اور امکان سے انکار۔ منزل 'لا' کی وجہ سے شاعر انسانی وجود کی 'حقانیت' کو بھی اہمیت دیتا ہے یعنی وہی منصور الحلاج کا نعرہ انا الحق۔ راہی کے یہ شعر دیکھئے۔

جہان والا وہی ایک اپنی ذات سے تھا
تھا وہ بھی ذرہ مگر ہٹ کے کائنات سے تھا
نہیں تھا بوند برابر بھی میں سمندر میں
شمار کچھ مرا ترک تعلقات سے تھا

'لا' کی ان کرشمہ سازیوں کے علاوہ غلام مرتضیٰ راہی کی شاعری کا ایک ایجابی پہلو ان کے مشاہدے کی فعالیت اور معنویت بھی ہے۔ مشاہدے کی توانائی تو اور شاعروں کے ہاں بھی مل جاتی ہے اور راہی نے بھی بڑی خوبصورت لفظی تصویریں کھینچی ہیں۔ مگر ان کے ہاں ان تصویروں میں معنویت کے رنگ اور تجرید کا عکس بھی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

کھانا ہر ایک موج کا وہ پیچ و تاب سا
وہ سطح آب پر مرا رہنا حباب سا
روشنی میں مجھے لے آئے ہو جب سے
میرا سایہ مجھے تنہا نہیں رہنے دیتا
ایک صدی نے لوٹ کے گھر پر دستک دی
اک پل نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا

'لاکلام' کی جو بات سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ سلاست زبان ہے۔ راہی صاحب نے معنی آفرینی کے لئے بھاری بھرکم فارسی آمیز ترکیبوں کا سہارا نہیں لیا اور سلیس لیکن دلنشیں لفظیات میں اپنی بات کہہ گئے۔ تاہم ان کی شاعری میں جو چیز کھٹکتی ہے وہ غم جاناں کی کمی ہے لیکن یہ مسئلہ صرف غلام مرتضیٰ راہی کا نہیں بلکہ ہر اس شاعر کا ہے جو دانشورانہ شاعری کرنا چاہتا ہے۔

صہبا وحید، دہلی

نام کتاب : آسمان خوابوں کا

شاعر : کفیل آزر

قیمت : ۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد، دہلی۔ ۶

مصحفی کے وطن امروہہ سے تعلق رکھنے والے فن کاروں اور اہل علم حضرات کا کسی عہد میں فقدان نہیں رہا۔ یہاں کی فضا دیگر فنون کے ساتھ ساتھ شعر گوئی اور شعر فہمی کی مناسبت سے بڑی سازگار ہے۔ ہر عہد میں یہاں شہرت یافتہ فنکار وقت کی تاریخ کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ یہ مثال کہ "گدڑیوں میں لعل ہوتے ہیں" جناب کفیل آزر پر صادق آتی ہے۔ ان کا مجموعہ کلام "آسمان خوابوں کا" کا انتساب اسی پہلو کی نشاندہی کرتا ہے:

"زندگی کے ان اذیت ناک لمحوں کے نام!
جنہوں نے مجھے شاعر بنایا۔"

یوں تو پڑھنے میں ایک سادہ سا جملہ ہے لیکن اپنی پراسرار تہوں میں بڑا معنی خیز ہے۔ اسی کے ساتھ "بدلتے موسم" عنوان کے تحت ان کی مختصر خود نوشت اس انتساب پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے اور زیادہ بامعنی بناتی ہے۔

مجموعی طور پر کفیل آزر ایک فطری شاعر ہیں۔ جب اور جس صنف کی ضرورت، ان کے موضوعات کو نظم کرنے کی اہل ثابت ہوئی ان اصناف کو انہوں نے برجستہ اور برمحل استعمال کیا:

ابھرتے، ڈوبتے سورج کا منظر
بسوں کی کھڑکیوں سے دیکھتا ہوں
صدیوں کے بعد طے جسے صدیاں نہ کر سکیں
صدیوں کا وہ طویل سفر ہے ہماری ذات
تری یادوں کے انگاروں کو اکثر
تصور کے لبوں سے چومتا ہوں

غزلیات کے علاوہ ان کی نظمیں بھی پر تاثیر ہیں جن میں احساس جمال بھی اور فن کا کمال بھی ایسی ہی ایک نظم ڈائری ہے جس کو ایک نئے رخ سے انہوں نے روشناس کرایا ہے:

"میرے چہرے پہ / میری تنہائی / روز و شب کے تمام ہنگامے / حادثے، / واقعات لکھتی ہے /
میرا چہرہ ہے ڈائری میری"

فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے بھی کفیل آزر نے اپنی فنکاری کا لوہا منوایا ہے اور مشاعروں میں ایک کامیاب شاعر کے طور پر بھی وہ بہت مقبول ہیں۔ "آسمان خوابوں کا" ایک قابل قدر اور غیر معمولی شعری دستاویز ہے جسے ہر اہل دل اور اہل نظر پڑھ کر پذیرائی پر مجبور ہوگا۔

ظفر مراد آبادی، دہلی

نام کتاب : تیشۂ صدا

مصنف : م ق خاں

قیمت : ۱۲۵ روپے

تقسیم کار : موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹۔ اے گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

اردو میں افسانے کی روایت قدیم نہیں۔ اس نے جتنی کم مدت میں مقبولیت کی جن اعلیٰ و ارفع منزلوں کو

گیا ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کو ابتدا میں ہی جو تخلیقی کار میسر آئے ان کا تخلیقی انہماک بھی قابل رشک تھا اور وہ اپنی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔

انہوں نے اردو افسانے کے سرمائے میں گراں مایہ اضافہ کیا۔ ان میں پریم چند، منٹو، کرشن چندر، بیدی اور اختر اورینوی وغیرہ کو فکشن کی تنقید کبھی فراموش نہیں کر سکتی لیکن جدیدیت کے زیر اثر اکثر و بیشتر افسانہ نگار اس کے فنی تقاضوں کو پورا کرتے رہے اور بعض نقاد مصلحت سے اوپر اٹھ کر بے ماجرا افسانوں کی مذمت کرتے رہے لیکن اردو افسانہ ہر دور میں بیانیہ کے سہارے ہی آگے بڑھتا رہا۔ م ق خان جن کا افسانوی مجموعہ "سیفۂ صدا" کے نام سے شائع ہوا ہے، بھی انہیں افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: "افسانہ ایک فن ہے یہ نہ فلسفہ ہے نہ سائنس۔ یہ وجود ماورا کے سارے مسائل کے حل کی متحرک کوشش ہے لیکن یہ حکم صادر نہیں کرتی، برین واشنگ نہیں کرتی یہ خاموش اشارہ کرتی ہے جیسے چاند کی شیتل کرنیں گدگدا جاتی ہیں۔ کچھ کہتی ہیں لیکن کسی کو ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب زبردستی نہیں کھینچتی ہیں۔"

اور یہ احساس ان کے ہر افسانے میں موجود ہے جو اسے ذہنی جمناسٹک نہیں بننے دیتا۔ انہیں افسانے کے فنی تقاضوں کا احساس ہے اور وہ اسے پورا کرنا چاہتے ہیں ان کی زبان افسانوی ہے اور زبان پر قدرت حاصل ہے اور موضوعات میں بھی خاصی رنگا رنگی ہے۔ جدت ان کی نظر میں قدیم موضوعات سے پرہیز کا نام نہیں مثلاً 'ایک تشنہ سوال' میں فساد کے موضوع کو اٹھایا ہے، 'کاغذی عمارت' بھی اسی موضوع سے متعلق ہے اور ان میں اجنبی تلذذ کے ذریعے قاری کو متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ بالکل نئے زاویے سے برتا ہے۔ 'خوف کا عفریت' بھی اسی طرح کا افسانہ ہے 'ایک مشت غبار' میں سرحد سے اٹھنے والی بیگانگی کو افسانے کا رنگ دیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل تمام افسانے اچھے ہیں اور فرداً فرداً تجزیے کی دعوت دیتے ہیں جو ظاہر ہے یہاں ممکن نہیں۔

جاوید دربھنگوی، نئی دہلی

نام کتاب : ناٹک تو ہوگا

مصنف : یوگ راج ٹنڈن

قیمت : ۱۵۰/روپے

تقسیم کار : می انٹرپرائزز، ۴۳۵۳ گلی قاسم جان، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

ایک زمانہ تھا جب لوگوں کی تفریح کا واحد ذریعہ اسٹیج/ تھیٹر ہوا کرتا تھا۔ پھر ریڈیو کا چلن ہوا تو اسٹیج تھوڑا متاثر ہوا۔ لیکن جب سنیما اور پھر ٹیلی ویژن آیا تو تھیٹر بری طرح متاثر ہوا۔ ظاہر ہے کہ فلم اور ٹیلی ڈرامے کا جتنا بڑا کینوس ہے، اسٹیج اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور پھر فلم اور ٹیلی ویژن کی چمک دمک اور گلیمر اپنی جگہ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریڈیو، فلم اور ٹی وی اسٹیج کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں اور یہ ایک ارتقائی عمل ہے جو فطری طور پر ہوتا رہتا ہے۔

اس کے باوجود بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فن اور فنکار کی اصل پرکھ اسٹیج پر ہی ہوتی ہے اور تھیٹر ہی وہ وسیلہ ہے جہاں فن کار کی تربیت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرتھوی راج کپور جو فلموں کے بہت اچھے فنکار تھے، انہوں نے آخر دم تک اسٹیج سے ناطہ نہیں توڑا۔ فلموں کے عروج کے زمانے میں پرتھوی تھیٹر کے لئے بے لوث محنت و مشقت پرتھوی راج کپور کی اسٹیج کے تئیں محبت اور ان کے سچے فنکار ہونے کی دلیل ہے۔

پرتھوی راج کپور، حبیب تنویر یا پھر یوگ راج ٹنڈن کی اس دلیل کو اگر مان لیں تو پھر اسٹیج اور تھیٹر کی معنویت اور اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

زیر نظر کتاب "ناٹک تو ہوگا" ایک ایسا ہی ڈرامہ ہے جو اسٹیج اور تھیٹر کے مسائل سے جڑے سوالات کو اٹھاتا ہے اور ڈرامہ نگار یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ چاہے جیسے بھی حالات ہوں ناٹک تو ہوگا، ناٹک کبھی مر نہیں سکتا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ جس اسٹیج اور تھیٹر کی حمایت میں یہ ڈرامہ لکھا گیا ہے وہ ایک ٹی وی ڈرامہ ہے۔ مصنف اعتراف کرتا ہے: "تھیٹر کو جس میڈیا نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور پہنچا رہا ہے میں اسی میڈیا کا سہارا لے کر تھیٹر کی بقا کے لیے چیخ و پکار کر رہا ہوں۔" اب اسے حالات کی ستم ظریفی کہئے یا حقیقت سے چشم پوشی لیکن یہی حقیقت ہے۔ پھر بھی مصنف کی کوشش لائق تحسین ہے۔

ابرار رحمانی

نام کتاب : لہو لہو آنکھیں

شاعر : ماجد دیوبندی

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی-۲۵

ماجد دیوبندی نے ادھر آٹھ دس سال میں مشاعروں کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کی ہے۔ آج کل مشاعروں میں شاعر کی مقبولیت کا دار و مدار اس کا ترنم ہوتا ہے۔ جس شاعر کا ترنم جتنا اچھا ہوگا وہ اتنا ہی مقبول ہوگا اور مشاعروں میں مقبولیت کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ شاعر کا کلام بہت ہلکا پھلکا، سہل ممتنع میں اور اکہرے معنی کا حامل ہو۔

ادھر ماجد دیوبندی مشاعروں میں نظامت کے بھی فرائض انجام دے رہے ہیں اور اب سامعین کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ بہ حیثیت اناؤنسر بہتر ہیں کہ بہ حیثیت شاعر؟ لیکن انہوں نے مشاعروں کی ایک روایت کی پاسداری ضرور کی ہے کہ اسٹیج پر کھڑے ہو کر یہ نہیں کہتے "حضور اگر آپ نے میرے اس شعر پر داد نہیں دی تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔" یا "یہ شعر تو میں نے آپ ہی کے لیے کہا ہے۔" غنیمت ہے کہ مشاعروں کو میلہ بنانے کے اس دور میں کچھ ایسے لوگ باقی ہیں جو قدیم روایتوں کا لحاظ کرتے ہیں۔

"لہو لہو آنکھیں" انہیں غزلوں کا اولین مجموعہ ہے جو ابھی تک وہ مشاعروں میں سناتے رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس اکہری شاعری میں بھی اچھے شعر نہیں کہے جا سکتے۔ چند شعر دیکھیں:

منتشر جب گھر کا شیرازہ ہوا
ہر کسی کا اپنا دروازہ ہوا

ہم جیئے خانہ بدوشوں کی طرح
اپنی قسمت میں مکاں کوئی نہ تھا

ہم نے اسلاف سے یہ سیکھا ہے
عہد کرنا تو پھر وفا کرنا

اللہ مرے رزق کی برکت نہ چلی جائے
دو روز سے گھر میں کوئی مہمان نہیں ہے

کتابت و طباعت خوبصورت اور جاذب نظر ہے۔ چونکہ اب وہ مجموعہ شائع کرا رہے ہیں اس لئے امید ہے کہ آئندہ ان کی شاعری میں تجربات و مشاہدات کے عناصر بھی شامل ہوں گے۔

م۔ ر۔ ف

کہتی ہے خلقِ خدا

● 'آجکل' بابت ماہ جون ۲۰۰۱ء کا سرورق جون جولائی کی تپش میں تسکین قلب و نظر ثابت ہوا۔ آپ قارئین کی نفسیات پر نظر رکھتے ہوئے بڑی ہنر مندی سے رسالہ ترتیب دیتے ہیں۔ مرحبا!

آنجہانی کالی داس گپتا رضا نے اردو زبان و ادب کی خدمت تو کی ہی ہے۔ لیکن 'غالب شناسی' کے میدان میں انہوں نے جو تحقیقی گلکاریاں کی ہیں وہ جوئے شیر لانے کا حکم رکھتی ہیں۔ آپ کا مضمون آنجہانی کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ جس میں آپ نے رضا صاحب کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

معتبر افسانہ نگار سریندر پرکاش کے اساطیر طرز اسلوب اور ان کے افسانوں کے مزاج کو اجاگر کرتے سبھی مقالات سیر حاصل ہیں۔ اقبال مہدی کی کہانی سب پر منفرد ہے۔

ظفر گورکھپوری، اختر سعید خاں، ولی بجنوری اور شکیب ایاز کا کلام متاثر کرتا ہے۔ "نوجوان ورتر کا درد" بھی کامیاب اور عمدہ ترجمہ ہے۔

حبیب راحت حباب، ایم پی

● گوشہ سریندر پرکاش کے سبھی مضامین عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ "اسطور پیغام اور سریندر پرکاش" مہدی جعفر نے لکھا ہے۔ جس میں موصوف نے "بجوکا" کی کہانی پر تبصرہ کیا ہے۔ جو منشی پریم چند کی کہانیوں کی کاربن کاپی ہے۔ تاہم سریندر پرکاش کا شمار اردو کے ممتاز علامتی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے یہاں موضوعات اسالیب اور تکنیک میں تنوع پایا جاتا ہے۔ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت داستانی فضا کی تعمیر میں چابکدستی بظاہر غیر متعلق اور غیر اہم واقعات کی نزاکت و لطافت سے جوڑنے اور تجریدی علامتی رنگ و آہنگ تیار کرنے کی بے پناہ صلاحیت نے ان کے افسانوں کو انفرادیت کا حامل بنادیا ہے۔ جب تک قاری اور لکھنے والے کے درمیان ابلاغ کا رشتہ نہ ہو تو کہانی لکھنا بے کار ہے۔ پروفیسر شمیم حنفی کا لکھا مضمون خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ نظمیں غزلیں بھی پسند آئیں۔ کہانیاں بھی متاثر کرتی ہیں۔ محبوب الرحمٰن فاروقی کا لکھا "آہ! کالی داس گپتا رضا" پڑھ کر چشم نم ہو گیا۔

شمس الہدیٰ انصاری، دھنباد

● سریندر پرکاش صاحب پر مضامین بڑی کاوش سے لکھے گئے ہیں۔ نظمیں و غزلیں بھی اپنے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ اقبال مہدی صاحب کی کہانی بے حد پسند آئی۔ خدا سے دعا ہے کہ 'آجکل' کی آب و تاب یوں ہی قائم رہے۔

ڈاکٹر ایم۔ اے خاں

● جناب اقبال مہدی صاحب کا افسانہ 'ایک لمحہ کی حدت کا سکوں' بڑا پر لطف اور دل نشیں ہے۔ یہ افسانہ ٹوٹتی بکھرتی زندگی کے بالکل قریب معلوم ہوتا ہے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ ایک لمحہ ہی ایسا آتا ہے جو زندگی کی بنیاد ثابت ہوتا ہے۔ افسانے کی زبان شیریں، سلاست اور ندرت سے بھرپور ہے۔ اتنے کامیاب افسانہ کے لیے میں اقبال مہدی صاحب کو بصمیم قلب مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سریندر پرکاش جی حسین افسانوں کے حسین افسانہ نویس ہیں۔ اس کی تائید اور اس کا اظہار خیال اپنے اپنے طویل مضمونوں میں جناب مہدی جعفر، جناب انور خاں، جناب ڈاکٹر نثار احمد، راشد انور راشد صاحبان نے خوب خوب بڑھ چڑھ کر کیا ہے۔

عبداللہ حسینی، بیگو سرائے

● یقیناً 'آجکل' ایک ادبی رسالہ ہے اور اس رسالے کے معیار کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں آپ کی طرف سے کی گئی تمام کاوش و کوشش ہر اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ دوسری طرف میں بھی کہنا چاہوں گا کہ اردو کے معہود نمائندے 'آجکل' کے معرفت اپنی معیاری تخلیقات کی بدولت اردو ادب کو زندہ و جاوید رکھنے کے سلسلے میں جو خدمات انجام دے رہے ہیں وہ حقیقی طور پر اردو تہذیب کے لیے ایک بہترین اور خوبصورت عطیہ ہے۔ بہر کیف!

'آجکل' کی فائل سے اطہر صاحب کی طرف سے لکھا گیا مضمون 'فٹز جیرلڈ مترجم رباعیات عمر خیام' خاصا معلوماتی ہے۔ اس بار گوشہ سریندر پرکاش نے بے حد متاثر کیا۔

لیکن افسوس کہ ایک مقالے نے نہ صرف آہ! کہنے پر ہی مجبور کیا بلکہ دل پر ایک سخت چوٹ پہنچی۔ وہ مقالہ تھا "آہ! کالی داس گپتا رضا" گرچہ ان سے ہماری کوئی ملاقات نہیں تھی لیکن ان کی تصویر و تحریر نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ مثلاً فروری ۲۰۰۱ء کے شمارے میں ایک مقالہ شائع ہوا "غالب اور اکبر آباد" اگر گزشتہ برس دیکھا جائے تو اگست ۲۰۰۰ء کے شمارے میں مجروح صاحب اور اکتوبر ۲۰۰۰ء کے شمارے میں جعفری صاحب پر انہوں نے تعزیتی مضمون لکھے تھے۔ لیکن افسوس کہ آج اس شخص نے لوگوں کو غم کا ایک تحفہ دے کر خود کو زمانہ کی نظروں سے چھپالیا۔ حقیقتاً اردو ادب کے میدان پر رضا صاحب نے بے شمار خدمت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ رضا صاحب کی جدائی نے اردو ادب کے دیوانوں پر جو زخم لگایا ہے پتہ نہیں جلد بھرپائے گا یا نہیں۔

اس بار تمام غزلیں پسند آئیں۔ اقبال مہدی صاحب اور رویندر پٹواری صاحب دونوں ہی قلم کاروں کی کہانیاں بھی خوب ہیں۔ قسط وار ناول "نوجوان ورتر کا درد" کا ایک قسط پڑھنے کے بعد اگلے قسط کا بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ ثریا فاروقی نے اس ناول کے ذریعہ 'آجکل' کے ادبی وقار میں جو اضافہ کیا ہے اس کے بدلے میں ان کو ایک دو نہیں بلکہ لاکھوں مبارکباد۔

یوسف جمیل، روہتاس

● جون کا شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ مجھے اس کے مضامین، غزلیں، کہانیاں، کرشن موہن کی نظمیں وغیرہ بے حد پسند آئیں۔ میں نے پہلی بار اتنا خوبصورت اور معلوماتی ماہنامہ پڑھا۔ میری خدا سے دعا ہے کہ 'آجکل' دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جائیں۔

شکیل احمد فرینک، گورکھپور

● ماہ جون کا 'آجکل' موصول ہوا جہاں ایک

طرف گوشۂ سریندر پرکاش توجہ کا مرکز بنا رہا۔ جناب اقبال مہدی کا افسانہ "ایک لمحہ کی حدت کا سکوں" بھی بہت پسند آیا۔ اسی سال ماہ جنوری کے 'آجکل' میں اقبال مہدی کا ایک افسانہ بعنوان "چل خسرو گھر آپنے" شائع ہوا تھا جو مجھے بھی پسند آیا تھا۔

کالی داس گپتا رضا کے انتقال پر آپ نے جو تعزیتی نوٹ شائع کیا وہ خاصہ کی چیز ہے اور ہم سب اردو والے آپ کے تاثرات کے ہمنوا ہیں۔ اردو زبان رضا صاحب کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کرپائے گی۔

محمد حنیف، ہردوئی

● جون کے شمارہ میں گوپال متل کی کتاب "لاہور کا جو ذکر کیا" پر چھپے تبصرے کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ 'آجکل' پرانی کتابوں پر تبصرے بھی شائع کرتا ہے۔ گوپال متل کی یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ ناشر تھے مکتبہ تحریک، ۹ /انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مکتبہ جناب گوپال متل کا ذاتی ادارہ تھا۔ ان دنوں آپ 'تحریک' نام سے ایک اردو ماہنامہ نکالتے تھے۔ اور 'مکتبہ تحریک' اسی رسالہ سے منسلک تھا۔ اس کے لیے غالباً امریکی سفارت خانہ سے کچھ مالی امداد بھی ملتی تھی۔ یہ ایڈیشن کتابی سائز کے ۱۶۸ صفحات پر مشتمل تھا اور قیمت تھی چھ روپے۔ اب جب کہ رسالہ 'تحریک' کو بند ہوئے زمانہ گزر چکا ہے اور گوپال متل صاحب بھی خدا کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے اسے دوبارہ شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ قانونی طور پر شاید اسے سرقہ نہ کہا جاسکے کیونکہ پہلے ایڈیشن کو شائع ہوئے لگ بھگ تیس سال کا عرصہ ہو چکا ہے یا ہونے کو ہے پھر بھی موجودہ ناشر کے لیے یہ واجب (یا لازم) تو تھا کہ یہ حقیقت تو قارئین پر واضح کر دیتے کہ یہ اس کتاب کی اشاعت ثانی ہے۔ ہاں اس بات کے لیے میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس کا ممنون بھی ہوں کہ انہوں نے اس نایاب کتاب کو دوبارہ شائع کر کے اردو ادب پر احسان کیا ہے خاص طور پر ایسے حالات میں جب کہ اردو کتابوں کی خریداری نہ کے برابر ہے۔

اوم پرکاش گرگ، غازی آباد

● جون کے شمارے میں محترمہ فاطمہ وصیہ جائسی کی ایک تعمیری اور دلکش غزل شائع ہوئی ہے جو مایوسی کے اندھیرے میں زندگی اور حوصلہ کا پیام والہانہ طور پر لاتی ہے۔

محمد البدیع، بھاگلپور

● آپ نے گوشۂ سریندر پرکاش کے تحت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرح کے شاعر و ادیب پر گوشہ ہی سہی نکال کر اردو زبان کو محض زبان مسلم کہنے سننے والوں کو یہ باور کرایا جائے کہ "اردو" ہندستان کی زبان ہے۔ اللہ کرے آپ کی ادارت میں 'آجکل' خوب سے خوب تر بنے۔

کوثر آفتاب، مغربی چمپارن

● اس بار آپ نے سریندر پرکاش کے فکر و فن پر معتبر اہل قلم سے مقالہ لکھوایا ہے۔ ان مقالوں سے سریندر پرکاش کے فکر و فن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ میرے خیال میں افسانوی ادب میں سریندر پرکاش کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کی بلندی کا احاطہ ممکن نہیں، ویسے بھی بقول سریندر پرکاش "نقاد میری نظر میں بے اعتبار ہو چکا ہے" حالانکہ "تنقید" کی اپنی اہمیت و افادیت ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے گا کہ آج کے اکثر لوگ جس میں ہمارے نقاد بھی شامل ہیں، "من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو" والے مصداق کا شکار ہو کر اپنی اپنی وقعت کھو رہے ہیں۔ سنجیدہ ناقدین کو "تنقید کے تازہ ترین مسئلے:" پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنا چاہئے کیونکہ یہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔ تنقید کے معیار کو گرنے سے ہمیں بہر حال بچانا چاہئے۔

اس بار کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہو رہی ہے کہ ہمارے شاعر و افسانہ نگار موجودہ ناگفتہ بہ حالات سے مایوس نہیں ہیں۔ ملاحظہ ہو پرویز اختر کا یہ شعر:

دیکھو تو سہی زیست کے امکان بھی ہوں گے
شاید کہ اسی بھیڑ میں انسان بھی ہوں گے

اس شمارہ میں جناب ذکی برنی کا یہ شعر بھی بڑا اہم پیغام رکھتا ہے:

زمانے لد گئے رحم و کرم کی بھیک ملنے کے
یہاں محنت کرو آہ و فغاں سے کچھ نہیں ہوتا

ماہنامہ 'آجکل' کو خوب سے خوب تر بنانے کی کامیاب سعی کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

ڈاکٹر محمد فاروق اعظم، بھاگلپور

● ادھر کئی مہینوں سے میں مشاہدہ کر رہا ہوں کہ "آجکل" کے معیار میں دنوں دن اضافہ ہو رہا ہے۔ بہترین مقالات، عمدہ افسانے، معیاری غزلیں تو ہر شمارے کی زینت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ قسط وار ناول، گوشے کی اشاعت اور دوسری زبانوں سے ترجمہ، کتابوں پر بے لاگ تبصرے بھی شمارے میں نظر آتے ہیں۔ یہ آپ کی بہترین کاوش ہے۔

جون کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ابھی دو ماہ پہلے بلراج مینرا پر آپ نے گوشہ شائع کیا تھا اور جون میں ایک انوکھے فکشن نگار سریندر پرکاش پر آپ نے اچھا خاصا گوشہ شائع کر دیا۔ یوں تو مہدی جعفر، اور خاں کے مضامین بھرپور ہیں اور ان سے سریندر پرکاش کے فن پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے مگر راشد انور راشد کا مضمون بھی خاصا اہم ہے اور سریندر پرکاش کی افسانوی جہتوں کا سمت متعین کرنے میں معاون ہے۔ انور قمر کا انٹرویو گرچہ مختصر ہے مگر سریندر پرکاش سے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔ پرکاش کا افسانہ "شیشے کا گھر" سے بھی لطف اندوز ہوا۔

آہ! کالی داس گپتا رضا پر آپ نے جو مضمون قلم بند کیا ہے اس کی ہر سطر سے خلوص و محبت اور دیانت داری کی بو آتی ہے۔ آپ نے بالکل سچ لکھا ہے کہ گپتا رضا صاحب جب تک دفتر 'آجکل' میں رہتے علمی باتوں سے گریز کرتے تاہم وہ عالم ہی کیا جو باتوں باتوں میں اپنے علم سے دوسروں کے ذہن کو منور نہ کرے۔

انور انصاری، رانچی

● "آجکل" مئی ۲۰۰۱ء کے مقالات میں دیویندر اسر کا "گلوبلائزیشن اور کلچر" محبوب الرحمن فاروقی کا مضمون "استیفن ہاکنگ اور بے نقابی رازہائے زندگی" بے حد عمدہ مضامین ہیں۔ ادب کا حصہ اتنا مفید نہیں ہوتا ہے کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ ادب پڑھ کر وقت ضائع ہوا۔ اردو پڑھنے کو جی چاہتا ہے مگر ادب سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔

مضمون "بے نقابی رازہائے زندگی" میں جینس سے متعلق مفید باتیں اور معلوماتی چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ مگر جینس بذات خود کیا ہے اس پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ ازراہ کرم آسان لفظوں میں جینس سے متعلق پوری معلومات فراہم کریں تو خوشی ہوگی۔ اگلا مضمون اس طرح ہو کہ جینس کیا ہے؟

سید [illegible]

بقیہ ٹائٹل ۲ کا

مریض محبت تما مرگیا　　خدا کی طرف سے دوا ہو گئی

ان کا گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں　　دل ہی کے ساتھ میں ٹھہرتا ہوں

یاں گفتگو کس کو ہے ان کے حسن کے آگے　　زبانیں بند کر دیں ان بتوں نے بے زباں ہو کر

ارشاد آپ کا بالکل بجا ہے حضرتِ واعظ　　مگر میں کیا کہوں، بن کچھ نہیں پڑتی جواں ہو کر

کلامِ منظوم کی فنکاری میں اکبر نے حیرت ناک کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ غیر ملکی الفاظ اور اسمائے خاص کو بھی قافیہ میں نہایت مکمل طور پر برتتے ہیں۔

تو نے پڑھا ہے دنیا کو صرف ہسٹری میں　　دنیا کو دیکھ غافل قدرت کی مسٹری میں

پانی پینا پڑا ہے پایپ کا　　حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

وہ اسلام کے معتقد تھے۔ مگر وہ متشدد نہیں تھے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ دوسرے مذاہب کو قائم رہنے اور پھولنے پھلنے کا حق ہے۔ اپنے بعض اشعار میں وہ سر سید احمد خاں اور ان کے تعلیمی پروگرام پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ سر اکبر حیدری مرحوم کے در دولت پر ہونے والی ایک گفتگو مجھے اس سلسلے میں یاد آتی ہے۔ انہوں نے مجھے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کو کھانے پر بلایا تھا۔ بر سبیلِ تذکرہ سر حیدری نے پوچھا "ضیاء الدین! مجھے بتاؤ تو بھلا علی گڑھ تحریک سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافات بڑھ نہیں گئے؟" ڈاکٹر ضیاء الدین خاموش رہے مگر وہ نمایاں طور پر پریشان خاطر تھے۔ بہر کیف اکبر طلبائے کالج پر عموماً اور طلبائے علی گڑھ پر خصوصاً فقرے کسنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی قومی تہذیب کو ترک کیا تھا۔

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

ہندی ساہتیہ سمیلن کو ایک پیام بھیجتے ہوئے انہوں نے صحت کی خرابی کی وجہ سے عدم شرکت کی معذرت پیش کی تھی۔

میری جانب سے و لیکن دل کو رکھیے مطمئن
بت کا جو مداح ہو ہندی کا حامی کیوں نہ ہو

چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیے:

اے برہمن! ہے میرا اور تیرا ایک عالم　　ہم خواب دیکھتے ہیں، تو دیکھتا ہے سپنا

ہم اردو کو عربی کیوں نہ کریں　　وہ ہندی کو بھاشا کیوں نہ کریں

جھگڑے کے لئے اخباروں میں　　مضمون تراشا کیوں نہ کریں

آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں　　لیکن اک اکھاڑہ قائم ہے

جب اس سے فلک کا دل بہلے　　ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی　　اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو

میں نے ختم کلام کے لیے اکبر کی شاعری کا وہ حصہ چھوڑ رکھا تھا جو اس کا بہترین حصہ ہے یعنی طنز و ظرافت۔ یہ تیز اور کٹیلی ہے مگر اس سے زخم نہیں لگتا۔ اس کی زد پر شکار تلملا اٹھتا ہے لیکن اس کا مقصد تربیت و ترقی ہے۔ نفرت و عداوت کا زہر اس نام کو نہیں۔ مزاحِ لطیف اس زہر کا مداوا بن جاتا ہے۔ مثالیں تو بھری پڑی ہوئی ہیں۔

کے بھائی گرہ کٹ تو سنا کرتے تھے　　اب یہ سنتے ہیں اڈیٹر کے برادر لیڈر

کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ　　روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

کے ... کھاتے ہیں حکام کے ساتھ　　رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

دیکھو جسے وہ پارٹیز آفس میں ہے ڈٹا　　بہرِ خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے

ہنگامہ محشر کا تو مقصود ہے معلوم　　دلی میں یہ دربار ہے معلوم نہیں کیوں

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی　　کیک کو چکھ کے سویّوں کا مزا بھول گئے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی　　یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

تھی بہت ان کو مسلمانوں کی تہذیب کی فکر　　بولے مسجد کے تلے مے کا بھی سامان رہے

آگے انجیل کے دین ہے کیا چیز　　بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

الہ آباد نے بڑے بڑے ماہرین سیاست، جج، قانون داں اور اہل تدبر پیدا کئے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے یہ علم کا مرکز رہا ہے۔ لیکن عصر حاضر کے ہندوستانی ادب میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ اکبر ہے۔

(مترجم : اختر اوریںوی)

فضا ابن فیضی

ہمارے شاعر اور مشاعرے

وہ برپا ہوئی ہال میں انجمن　　ہوئے جمع اربابِ شعر و سخن

غزل در غزل گنگنانے لگے　　سماعت کو نشہ پلانے لگے

وہ اک تان کھینچی سماں بندھ گیا　　فضاؤں میں گھونگرو سا بجنے لگا

سنا تھا کہ ناہید غش کھا گئی　　سرِ چرخ زہرہ بھی چکرا گئی

نہ جدت نہ ندرت کوئی سوچ میں　　مگر لہجہ ڈوبا ہوا لوچ میں

نہیں ان کی محفل میں محو سرود　　وہ فن، جس سے کارِ جہاں کی کشود

یہ الجھے ہیں زلفوں کی پیچاک میں　　یہ گوہر ہیں غلطیدہ کس خاک میں

وہ روشن فسانہ رخِ سادہ کا　　وہ اڑتا فسوں نشۂ بادہ کا

وہ بے مغز اور نارسیدہ شعور　　ادب، زندگی کے تقاضوں سے دور

ہر اک روشنی تیرگی میں اسیر　　تخیل میں پیوست آہوں کے تیر

نظر میں اندھیرا ارادوں پہ زنگ　　دبی سی دلِ مضطرب کی امنگ

نگاہوں میں بے چارگی کا خمار　　تفکر پہ چھایا ہوا اک غبار

نہ طبع لطیف و نہ ذوقِ سلیم　　سرِ طور پر بے تجلی کلیم

سوئے جہل و تخریبِ فن کی لگام　　یہ صالح عناصر کا فقدان عام

یہ غل ناشناسوں کی تحسین کا　　ہے اک مرحلہ جھوٹی تسکین کا

نہ پوچھو کہ ہیں کن سرابوں میں گم
یہ دریا ہیں اپنے حبابوں میں گم

آجکل کی فائل سے

ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: بال مکند عرش ملسیانی

جلد: ۱۳　　نمبر: ۱　　اگست ۱۹۵۴

/2001 Licenced U (DN)-50/2001 to post without pre-payment
Post) RMS Delhi
No. 1 Rs. 7/- Ajkal (Urdu) August 2001 AD



Published by Suresh Chopra, Director General, on behalf of Publications Division
Printers & Publishers (P) Ltd. W-30, Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-20
New Delhi-1, Editor: M.R.Farooqi

گل کدہ

اس عنوان کے تحت ہر ماہ مختلف ہندوستانی زبانوں کا ادب شائع کیا جاتا تھا —— ادارہ

پنجابی

امرتا پریتم

مایا

(مشہور چترکار ونسنٹ وینگاگ کی خیالی محبوبہ مایا کو)

۱- پریئے نی پریئے
حوراں شہزادیئے
گوریئے ونسنٹ دیئے
سچ کیوں بن دی نہیں

اے پری، اے پری
حوروں کی شہزادی
ونسنٹ کی حسینہ
تو حقیقت کیوں نہیں بنتی

۲- حسن کاہدا؟ عشق کاہدا؟
توں کیہی اکھیسار کا؟
اپنے کسے محبوب دی
آواز توں سن دی نہیں

حسن کیسا، عشق کیسا
تو کیسی محبوبہ ہے
اپنے کسی محبوب کی
آواز نہیں سنتی

۳- سول دے اندر چنگ پا کے
ساہ جدوں لیندا کوئی
سلگدے انگیار کتنے
توں کدے گن دی نہیں

جب کوئی اپنے سوز دل سے
مجبور ہو کر سانس لیتا ہے
تو کتنے شرارے سلگتے ہیں
تو کبھی نہیں گنتی

۴- کاہدا ہنر؟ کاہدی کلا؟
ترلا ہے اک ایہہ جیون دا
ساغر تخیل دا کدے
توں کدے من دی نہیں

ہنر کیسا، آرٹ کیا
یہ سب جینے کی ایک حقیر کوشش ہے
تو تخیل کے ساغر کو
کبھی نہیں ناپتی

۵- پریئے نی پریئے
حوراں شہزادیئے
خیال تیرا پارنہ
اور وار دیندا ہے

اے پری اے پری!
اے حوروں کی شہزادی
ترے خیال کا
آر پار نہیں

۶- سروز سورج ڈھونڈدا ہے
منہ تیرا او سدا نہیں
منہ تیرا جو رات نوں
اقرار دیندا ہے

سورج روز تلاش کرتا ہے
تیرا چہرہ [illegible] نہیں آتا
وہ چہرہ جو رات کو
وعدے کرتا ہے

۷- تڑپ کس نوں آکھدے نے
توں نہیں ایہہ جان دی
کیوں کسے توں زندگی
کوئی وار دیندا ہے

تڑپ کسے کہتے ہیں
تو یہ نہیں جانتی
کوئی کسی پر زندگی
کیوں قربان کر دیتا ہے

۸- دونویں جہان آپنے
لاندا ہے کوئی کھیڈ تے
ہسدا ہے نامراد
تے پھر ہار دیندا ہے

کوئی دونوں جہان
بازی پر لگا دیتا ہے
نامراد ہنستا ہے
اور دونوں جہان ہار جاتا ہے

۹- پریئے نی پریئے
حوراں شہزادیئے
لکھاں خیال اس طراں
آون گے ٹر جان گے

اے پری اے پری!
اے حوروں کی شہزادی
اس طرح لاکھوں خیال
آئیں گے اور چلے جائیں گے

۱۰- ارغوانی زہر تیرا
روز کوئی پی لویگا
نقش تیرے روز جادو
اس طراں کر جان گے

تیرا ارغوانی زہر
روز کوئی پی لے گا
اور تیرے نقوش اسی طرح
روز جادو کریں گے

۱۱- ہسے گی تیری کلپناں
تڑپے گا کوئی رات بھر
سالاں دے سال اس طراں
اس طراں کھر جان گے

تیری یاد مسکرائے گی
اور کوئی رات بھر تڑپے گا
اس طرح سے [illegible]
ختم ہوتے جائیں گے

۱۲- ہنر بھکھار دے نئے
پیار بھکھا گوریئے
کنے کو تیرے وینگاگ
اس طراں مر جان گے

[illegible]

۱۳- [illegible] نی پریئے
حوراں شہزادیئے
حسن کاہدی کھیڈ اے
عشق [illegible] نہیں

[illegible]

ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمٰن فاروقی
فون: 3386994

اسسٹنٹ ایڈیٹر
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر
محمد کاظم

جلد: ۶۰ شمارہ: ۳
اکتوبر ۲۰۰۱ء اشون۔کارتک شک ۱۹۲۳

سرورق: دیپتی سیٹھی
کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ سی آہوجہ

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ سات روپے سالانہ: ۷۰ روپے
دو سال: ۱۳۰ روپے تین سال: ۱۹۰ روپے
امریکہ یورپ اور دوسرے ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۰۰ روپے سالانہ
پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۵۰۰ روپے سالانہ

خریداری اور اشتہارات کے لئے [illegible] پوسٹل آرڈر،
ڈائرکٹر جنرل [illegible] کے نام [illegible] بھیجیں
سرکولیشن منیجر [illegible] نئی دہلی۔۶۶
رسالے [illegible] ضرور کریں

[illegible]

ترتیب

ابوالکلام قاسمی

سردار جعفری کے تنقیدی رویے

ادبی تنقید، اگر تخلیقی سرگرمیوں کے برخلاف ایک خاص شعبۂ علم یا سائنس ہے تو اس کے اصول اور معیار کو بھی تخلیقی اظہار کے مقابلے میں واضح طور پر غیر شخصی اور معروضی ہونا چاہئے۔ یوں تو ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو تنقید کو تاثریا راست رد عمل کا نعم البدل تصور کرتے ہیں، مگر وہ بھی اپنے رد عمل کو بہ حیثیت ناقد معروضیت کے التباس کے ساتھ ہی پیش کرنے میں اپنی عافیت محسوس کرتے ہیں۔ تاہم جب کوئی ایسا تخلیق کار بھی تنقیدی سرگرمیوں میں مصروف ہو جو بنیادی طور پر ایک شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت متعین کرا چکا ہو تو اس کی تنقید سے اپنے تخلیقی رویوں کا جواز فراہم کرنے کا اندیشہ بہر حال لاحق رہتا ہے--- علی سردار جعفری نہ صرف یہ کہ ایک ممتاز صاحب اسلوب شاعر ہیں بلکہ انہوں نے اپنے شاعرانہ اسلوب کے ذریعہ ترقی پسند اصول و نظریات کی عملی تصویریں پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ان کو کسب فیض کے لیے جو شعری سرمایہ ملا تھا وہ میر انیس، اقبال اور جوش کے اسالیب کا سرمایہ تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری کا اسلوب عوامی یا عام فہم بننے کی کوشش میں مصروف نظر آنے کے باوجود ان کے اپنے آئیڈیل شعرا کے غیر عوامی ڈکشن سے قریب اور بڑی حد تک متاثر معلوم ہوتا ہے۔ سردار جعفری کے تنقیدی رویوں کو سمجھنے کی خاطر اس تمہید کی ضرورت اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں پر اپنے شاعرانہ کردار کی توثیق اور اپنی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کے لیے جواز فراہم کرنے کا الزام بالعموم عائد کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سردار جعفری کے تنقیدی مزعومات سے ان کے اپنے شعری اسلوب کے ہم آہنگ ہونے کا تاثر قائم ہوتا ہے، مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کی تنقید کا آئیڈیل محض ان کی اپنی شاعری رہی ہو۔ سردار جعفری کی ذہنی نشو و نما میں اردو کی قدیم ادبی روایت، کلاسیکی اقدار اور ان کے رچاؤ کا عمل دخل بہت نمایاں ہے، جب کہ وہ ابتدائی زمانے کی تنقید میں پرانی معاشرتی اقدار کو جاگیر دارانہ اقدار، اور ماضی کی ادبی روایت کو فرسودہ اقدار پر مبنی روایت قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ان تضادات کو حل کیے بغیر نہ تو ان کے تنقیدی رویوں کو سمجھنا آسان ہے اور نہ ان کی تنقید کے مضمرات تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

سردار جعفری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری کے ساتھ بعض تنقیدی مضامین سے کیا تھا، جن کی منظم اور مربوط شکل ان کی کتاب "ترقی پسند ادب" میں سامنے آئی۔ ترقی پسند تحریک کے ابتدائی برسوں میں تحریک سے وابستہ افراد کی جذباتی وابستگی، ہر تحریک یا رجحان کی ابتدا سے وابستہ شدت اور جذباتیت کی طرح فطری اور ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ صورت حال اس وقت زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے جب معاملہ کسی عام اور غیر منطقی مقلد کے بجائے سردار جعفری جیسے پختہ کار شاعر اور نظریہ ساز نقاد کی کارکردگی زیر بحث ہو تو اسے سرسری رائے زنی سے ٹالا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ سردار جعفری کو ان کے تنقیدی رویوں کے ارتقا کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے اور کسی ایک کتاب یا ایک زمانے کی تحریروں پر اکتفا کر کے جلد بازی میں رائے قائم کرنے کے بجائے ان کی تنقیدی فکر کی تبدیلیوں پر بھی نظر رکھی جائے۔

سردار جعفری کی تنقیدی تحریروں کو بڑی آسانی سے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا دور ترقی پسند تحریک کی ابتدا اور اس کے بعد کے بیس پچیس برسوں کا احاطہ کرتا ہے، جب کہ دوسرے دور میں ان کی ان تنقیدی تحریروں کو شمار کرنا چاہئے جو "ترقی پسند ادب" کی اشاعت دوئم (۱۹۵۷ء) کے بعد یعنی چھٹی دہائی کے آغاز سے ماضی قریب تک کی تقریباً چار دہائیوں پر مشتمل ہیں۔ اس دور میں 'پیغمبران سخن' اور 'اقبال شناسی' میں شامل تحریریں اور اردو اور انگریزی میں شائع شدہ تنقیدی مضامین کے علاوہ اس لیکچر کو بھی اہمیت حاصل ہے جو انہوں نے "ترقی پسند تحریک کی نصف صدی" کے عنوان سے دیا تھا اور بعد میں اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ ادوار کی تقسیم کا سب سے بڑا منطقی جواز تو یہ ہے کہ اگر ہم "ترقی پسند ادب" اور ترقی پسند تحریک کی نصف صدی، یعنی ایک ہی موضوع پر ان کی دو اہم کتابوں کا موازنہ کریں تو دونوں کے درمیان تنقیدی رویے کا نمایاں فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ انہوں نے تحریک کی نصف صدی کا جائزہ لیتے ہوئے ترقی پسند ادب میں پیش کیے جانے والے خود اپنے تصورات اور تعصبات کی اگر کوئی خاص تردید نہیں کی تو ان کی توثیق بھی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کے اندر اس اعترافی جرأت کی کمی ہے جو کسی شخص کو اپنے ذہنی ارتقا یا تغیر پذیر فکری تبدیلیوں کے مختلف پڑاؤ کو نشان زد کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ اگر اس نوع

سرسبز، بدر باغ، جیل روڈ، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

کی تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہو تو اس کے لیے آل احمد سرور کے فکری ارتقا سے، اور اختلاف کی حد تک ہی سہی، محمد حسن عسکری کی تنقیدی فکر کی تبدیلی سے رجوع کرنا چاہیئے۔ تاہم یہ بات بھی کم اہم نہیں کہ سردار جعفری نے اپنی تحریک کی نصف صدی کا احاطہ کرتے ہوئے اپنے پرانے تنقیدی تحفظات پر اصرار کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اپنی تنقید نگاری کے دوسرے دور میں وہ ادب کو نسبتاً زیادہ وسیع سیاق و سباق میں دیکھنے کی طرف مائل ہیں اور ادبی اسالیب کے متعین سانچوں اور نو آبادیاتی طرز کے روایتی تحفظ پر مبنی تصورات کے دائرے سے باہر نکل آتے ہیں۔

سردار جعفری نے اپنی کتاب میں ترقی پسند جمالیات کی شیرازہ بندی کا جو فریضہ انجام دیا تھا وہ بالعموم کرسٹوفر کاڈول اور لوکاچ کے تصورات سے استفادے پر مبنی تھا اور جس کی منتشر شکلیں اردو میں اختر حسین رائے پوری، سجاد ظہیر، اختر انصاری، مجنوں گورکھپوری اور سید احتشام حسین کی تحریروں میں تلاش کی جاسکتی تھیں۔ مگر جعفری کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں کہ انہوں نے ادب کی ماہیت، جمالیات، افادیت سے اس کے تعلق، شعر و ادب کے عوامی سروکار، براہ راست یا بالواسطہ اظہار اور ادیب کی وابستگی یا عدم وابستگی جیسے مسائل کو بنیاد بنا کر ترقی پسند شعر و ادب کے لیے منظم، مربوط اور مدلل انداز میں ایک نوع کی شعریات کو مرتب کرنے کی اہم ذمہ داری نبھائی۔ لیکن جس طرح یہ بات واضح ہے کہ ترقی پسند شعریات کو مرتب کرنے کی کوشش کسی معمولی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا نہ تھی اسی طرح اسی جمالیات سے جن ادبی اور تخلیقی اقدار کی نفی ہوتی تھی ان کے رمز شناسوں کا ہدف ملامت بننا بھی ایک فطری رد عمل سے دوچار ہونے کے مترادف تھا۔ اس سلسلے میں سردار جعفری نے اپنے آپ کو کبھی نقاد کے منصب پر فائز نہیں بتایا اور نہایت انکسار کے ساتھ ایک قاری یا ادبی منظر نامے میں شریک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اپنے نقطہ نظر کو مرتب کرنے کی طرف توجہ مبذول رکھی۔ انہوں نے اپنی پہلی تنقیدی کتاب میں یہ بات واضح کی:

"حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیئے ہیں۔ کیونکہ مجھے نقاد ہونے کا دعوی نہیں ہے۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا ہے، جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس سے میرا شروع سے قریبی تعلق رہا ہے، اسے کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔"

اسی طرح بہت بعد کے زمانے میں انہوں نے پیغمبران سخن کے دیباچے میں بھی اس بات کا اعادہ کیا:

"میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ کبھی نہیں اختیار کیا ہے۔ میرے لیے کبیر، میر اور غالب کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعر گوئی کے لیے ضروری ہے۔"

مختلف ادوار کے ان بیانات سے سردار جعفری کا موقف بالکل واضح ہے، لیکن ان وضاحتوں کے باوجود اردو کی ادبی تاریخ ان کی شاعری کے ساتھ شاعری کا، اور تنقید کے ساتھ خود مکتفی تنقید کا ہی برتاؤ کرے گی۔ یہ بات درست ہے کہ معاصر ادبی منظر نامے میں شریک ادیب کو اس کے شخصی حوالوں کے بغیر سمجھنے کی روایت اردو میں ہنوز رائج نہیں ہو سکی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ سردار جعفری کی تنقید کو جن بعض نقادوں نے موضوع بحث بنایا ہے انہوں نے بالعموم ان کی شخصیت کے سروکار اور شاعرانہ حیثیت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ تاہم اس صورت حال کے باوجود اس بات کی کوشش تو کی ہی جاسکتی ہے کہ ان کی تنقید نگاری کے دو واضح رویوں کے فرق کو سمجھا جائے اور اسی تناظر میں تنقید نگاری میں ان کی کارکردگی کا تعین کیا جائے۔

سردار جعفری کے پہلے دور کی تقریباً تمام تنقیدی تحریریں "ترقی پسند ادب" میں شامل تصورات کا واضح عکس معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے ان تحریروں میں ان کا ناقدانہ کردار انفرادی ہونے سے کہیں زیادہ تحریک کی مدافعت یا وکالت کا تنظیمی انداز لئے ہوئے ہے۔ شاید اس وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں کہ جب تنقید دفاع یا وکالت کا فریضہ انجام دیتی ہے تو اس کو سب سے پہلے معروضیت اور غیر جانبداری سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ ان کی دور اول کی تنقیدی تحریروں میں کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ انہوں نے انفرادی انداز میں تعین قدر کرنے کے بجائے اپنی تنقید میں اجتماعی اور سماجی قدروں پر زور دیا، پرانی شعری، حتی کہ اخلاقی اقدار کو ساختی اقدار سے تعبیر کیا، ادب کی ماہیت کو اس کی افادیت پر قربان کیا اور اپنے ادبی سرمائے کے بارے میں جانب دارانہ تنظیمی نوعیت کے فیصلے صادر کئے اور اس ضمن میں ان کا عام رویہ پرانے اسالیب پر تنقید اور نئے اسالیب کی تلقین کا رہا۔ مگر تضاد کی صورت وہاں نمایاں ہوتی ہے کہ جب وہ اس عمومی رویے کے باوجود ابتدائی تحریروں میں نئی ہیئتی تبدیلی اور تجربے کو بھی ہدف تنقید بناتے ہیں۔ انہوں نے نظم کی آزاد ہیئت یا بلینک ورس کو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبہ قرار دیا تھا۔ لیکن ترقی پسند ادب میں ان کے یہاں اس نوع کی شدت اور جذباتیت میں قدرے کمی آئی اور انہوں نے اپنی کتاب میں ہیئت یا صنف کے معاملے میں اس طرح کی انتہا پسندی کا ثبوت تو کم دیا مگر اردو کے ادبی سرمائے میں موجود اجتماعی اور بنیادی رویوں کو ہدف ملامت بنانے سے باز نہ آئے۔ حالانکہ اگر انہوں نے ترقی پسند جمالیات کی ضابطہ بندی کے دوران اردو کی روایتی اور بیانیہ اصناف سخن مثلاً مثنوی، مرثیہ، واسوخت اور شہر آشوب کو بھی نظیر بنا کر پیش کیا ہوتا تو کسی طرح کا منفی رویہ اختیار کئے بغیر وہ ترقی پسند جمالیات کی تشکیل زیادہ مستحکم بنیادوں پر کر سکتے تھے۔ سردار جعفری ادب کی ماہیت کا تعین کیوں کر کرتے ہیں اور ترقی پسند شعریات کے لازمی عناصر کن چیزوں کو شمار کرتے ہیں؟ اس کا ایک خاکہ مندرجہ ذیل بیانات سے مرتب کیا جاسکتا ہے:

۱- میرے نقطہ نگاہ کی بنیاد یہ ہے کہ وہ کسی داخلی تعصب کے بجائے مادی، تاریخی اور عمرانی حقائق پر مبنی ہے۔

۲- جو لوگ جمالیاتی ذوق کو وجدانی، داخلی اور بالکل انفرادی سمجھتے ہیں وہ خیال پرستی، تصوریت، عینیت اور ماورائیت کے مرتکب ہوتے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور سے رجعت پرستی کے لیے راستے کھولتے ہیں۔ جن کے پیچ و خم بظاہر کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں بہر حال ہوتے ہیں خطرناک۔

۳- ہر دور کا عظیم ادب وہی ہے جس میں عوامی سچائی اور عوامی قدریں ہیں۔

۴- آج ترقی پسند ادیبوں کے سامنے بنیادی سوال عوامی ادب کی تخلیق کا سوال ہے...... دنیا کا بہترین ادب ہمیشہ عوامی رہا ہے۔ عوامی قدروں کے بغیر ادب کی

تخلیق نہیں ہو سکتی۔

۵- اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہر حسین چیز انسان کے مفاد سے وابستہ نظر آئے گی۔ جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی۔

۶- اردو کی پرانی غزل جو اپنا رشتہ عوام سے نہیں جوڑ سکی اس کے بھی شاہکار اپنے عہد کی ایک دل دوز تنقید ہیں۔ خواہ ان کی لے میں میر کا سوز و گداز، تڑپ اور ٹیس ہو، خواہ غالب کا نشاط انگیز حزن و ملال--

ان بیانات میں سردار جعفری ایک آزاد قدری یا تنقید نگار کے بجائے ایک مخصوص تنظیم کے ترجمان اور مبلغ نظر آتے ہیں۔ ان کے بیانات سے بسا اوقات خود ان کے اپنے بعض شعری طریق کار کی نفی ہوتی ہے اور اس شعری سرمائے پر بھی خط تنسیخ کھینچنے کا انداز ملتا ہے جس سرمائے کے زیر اثر انہوں نے خود بھی اپنے اسلوب اور ڈکشن کو متعین کیا تھا۔ جہاں تک جمالیات کے معاملے میں افادیت پر اصرار کا سوال ہے تو انسان کی سرشت میں احساس جمال، جذباتی اور حسی ضرورتیں، حد سے بڑھی ہوئی مادیت اور افادیت سے اکتاہٹ اور تمام ظاہری وسائل زندگی کی فراہمی کے باوجود وجدانی، روحانی اور مابعد الطبعیاتی رویوں کی طرف میلان، جیسے مخفی رجحانات نے جمالیات اور افادیت کے رشتے کو انسانی تاریخ میں بار بار مشتبہ اور بے معنی ثابت کیا ہے۔ اور جہاں تک عوامی ادب کی تخلیق کا قضیہ ہے تو یہ معاملہ کچھ اس قدر اضافی نوعیت رکھتا ہے کہ تہہ دار، دور رس، جامع اور معنوی امکانات کی حامل شاعری کے مقابلے میں نسبتاً کم تہہ دار اور کم جامع اور پھر اس کے بعد اکہری اور سپاٹ شاعری کو زیادہ عوامی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس معیار کو اگر جعفری صاحب خود اپنی بعد کی تنقیدی تحریروں میں اپناتے تو نہ وہ میر اور غالب کی تحسین کر سکتے تھے اور نہ اقبال کی۔ یوں تو سردار جعفری نے "ترقی پسند ادب" کے پیش لفظ میں لکھا تھا:

"میری کتاب کا موضوع صرف نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور رجحانات تک محدود ہے۔ اس لیے بیشتر ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا ذکر صرف حوالوں اور مثالوں کی شکل میں آیا ہے——"

لیکن جب وہ ادیبوں اور شاعروں کا انفرادی جائزہ لیتے ہیں تو ان کی رائے تجزیاتی سے زیادہ مفتیانہ اور ضمنی سے زیادہ بنیادی نوعیت اختیار کر لیتی ہے۔ ترقی پسند ادب میں راشد، اختر الایمان، حتیٰ کہ فیض اور مخدوم پر جس طرح کے اعتراضات کیے گئے ہیں یا منٹو اور عصمت چغتائی کے بارے میں جس طرح کی رائے کا اظہار کیا گیا ہے، ان کو خود ترقی پسند حلقوں میں قبول نہیں کیا جا سکا۔ اور ان ادیبوں اور شاعروں کی فنی اور جمالیاتی قدروں نے اس طرح کی کسی رائے کو رائج ہونے کا موقع نہیں دیا۔ جہاں تک فیض اور مخدوم پر اعتراضات کا سوال ہے تو اس ضمن میں شعر کی بنیادی ماہیت سے ان کی چشم پوشی کا اندازہ غیر ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ بعض ترقی پسند نقادوں نے بھی لگایا ہے۔ فیض کی نظم 'صبح آزادی' پر انہوں نے لکھا تھا:

"فیض نے 'صبح آزادی' میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیے ہیں جن کے پیچھے پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے: یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر، وہ انتظار تھا جس کا وہ یہ سحر تو نہیں—— اور آخری مصرعہ ہے: چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی—— لیکن یہ بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نظم میں داغ داغ اجالا ہے، شب گزیدہ سحر ہے، حسینان نور کا [illegible] تاروں کی آخری منزل ہے، پکارتی ہوئی باہیں اور بلاتے ہوئے بدن [illegible] ہے، لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی، غلامی کا دور [illegible] ایسی نظم ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اگر ہمیں فیض کی ترقی پسندی کا علم نہ ہو تو ہم اس نظم کا کوئی مفہوم نہیں نکال سکتے۔ یہ شاعری کے سماجی [illegible] اور ہیئت پرستی کا نتیجہ ہے۔"

عوامی ادب اور عوامی انقلاب کا یہ مطالبہ فیض نے ہی کیا خود سردار جعفری کی متعدد نظموں مثلاً "میرا سفر، تخلیق کا کرب اور شاعر" وغیرہ کے لیے درست نہیں معلوم ہوتا۔ فیض کی فنی ہنر مندی، ڈکشن کی تہہ داری اور استعاراتی جہات نے جس طرح اردو کے جدید نظم گو شعرا میں ان کو ممتاز اور سربر آوردہ بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور نہیں کہ انہوں نے سردار جعفری کی ہدایات اور ان جیسے انتہا پسند ادیبوں کی ضابطہ بندی کو ہمیشہ ناقابل اعتنا تصور کیا۔ اگر سردار جعفری کو فیض کے یہاں غلامی کے احساس اور اس کے مداوا ہی کی تلاش تھی تو انہیں راشد کی نظم "انتقام" یا سماجی اور انسانی معاملات و مسائل سے گہرا سروکار رکھنے والی دوسری نظموں کو مسترد کرنے کے بجائے ترقی پسندی کا نمونہ قرار دینا چاہیے تھے۔ ویسے ابھرے پن پر مبنی اس قسم کے تنقیدی بیانات پر اگر ہم ایک اور ترقی پسند نقاد ممتاز حسین کی رائے ملاحظہ کر لیں جو انہوں نے اقبال اور مخدوم کے بارے میں دی تھی تو اس سے سردار جعفری کے اس رویے کی تردید بھی ہو جاتی ہے اور ترقی پسند تنقید میں رد و قبول کی صورت حال کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مخدوم کی نظم "انقلاب" کا یہ بند دیکھیے:

اے جان، نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سر رہ گزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

"میرا خیال ہے کہ مخدوم کے اس بند کو مسیح موعود کا انتظار شوق سمجھ کر کوئی بھی مسلمان پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اس سے اس بند کے حسن میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ میں خود علامہ اقبال کے مختلف اشعار کو استعمال کرتا ہوں، حالانکہ جس شعور اور اغراض کے ماتحت انہوں نے اشعار لکھے ہیں وہ میرے شعور اور اغراض سے مختلف ہیں۔ شعر میں اگر اتنی ہمہ گیری اور آفاقیت ہو کہ انسان کی اکثریت کی زبان پر چڑھ جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس سے ہماری طبقاتی بندی پر حرف آتا ہے۔"

(صورت و معنی، ممتاز حسین: شاہراہ)

ترقی پسند ادب میں سردار جعفری نے غزل کی صنف اور غزل کے ذریعہ سامنے آنے والی روایتی اقدار کو متعدد مقامات پر اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ مگر وہ غزل کی صنف کو اپنے ذوق و شعور کے ذریعہ سمجھنے کے بجائے غزل کے بعض نقادوں کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"آج بھی غزل کی مخالفت میں بعض غیر ترقی پسند حضرات شامل ہیں جن میں ترقی پسند ادب کے ایک بہت بڑے مخالف کلیم الدین احمد صاحب پیش پیش ہیں، جنہوں نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہہ کر مردود قرار دے دیا۔ اس لیے اس کا سارا الزام

صرف ترقی پسندوں کے سر تھوپنا صحیح نہیں ہے۔ غزل میں ایسے عناصر موجود تھے اور اب بھی ہیں جن کی شدت سے مخالفت کی ضرورت تھی اور ہے۔ یہاں یہ بتادینا مناسب ہوگا کہ جس بنیاد پر ترقی پسند ادیبوں نے غزل کی مخالفت کی تھی وہ وہی ہے جسے ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے اپنی کتاب میں غزل کا طرہ امتیاز قرار دیا ہے۔"

اس بیان میں وہ ایک طرف کلیم الدین احمد کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں جن کی نظر میں ان کی کتاب مارکسی رنگ کے مستعار خیالات کی بنیاد پر لکھی ہوئی غیر ہضم شدہ خیالات کی لمبی ڈکار کے مترادف ہے۔ اسی طرح غزل پر اعتراض کرتے ہوئے انہوں نے یوسف حسین خاں کے اس تجزیے کو بنیاد بنایا ہے جس میں انہوں نے صرف دروں بینی اور داخلیت کو غزل کی شناخت قرار دیا ہے --- چونکہ یوسف حسین خاں کا تجزیہ ناقص ہے اور غزل کی روایت کی پوری تفہیم سے عاری ہے اس لیے جعفری صاحب کی یہ بنیاد بھی غزل کی غلط تعبیر کی تردید بن جاتی ہے، جس کے لیے وہ کہتے ہیں کہ "غزل کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے اس فلسفہ کی مخالفت ضروری ہے" --- اگر آپ غزل پر تنقید کے اس رویے کو تاریخ میں پیچھے کی طرف لے جائیے تو اندازہ ہوگا کہ یہ وہی منطق ہے جس کے سہارے کرنل ہالرائڈ اور ان کے زیر اثر محمد حسین آزاد نے غزل کی صنف کو از کار رفتہ قرار دیا تھا۔ اسی نوآبادیاتی فکر کا سلسلہ سردار جعفری تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے جو بظاہر جاگیردارانہ اقدار کے مخالف ہیں۔ لیکن ان کو یہ اندازہ نہیں کہ اس نوآبادیاتی طریق کار کے ذریعہ دراصل اردو کی قدیم ادبی اقدار اور پرانے سرمائے کو بے وقعت ثابت کرنے کا ایجنڈا بھی روبہ عمل آرہا ہے۔ اس لیے یہ سارا انداز نقد دراصل اس ورثے کو جو عوامی، اجتماعی اور کلاسیکی شعور کا زائیدہ تھا، اسے عوامی ادب کے نام پر مطعون قرار دینے کی طرف مائل نظر آتا ہے۔

"ترقی پسند ادب" کے ساتھ سردار جعفری کی تنقید نگاری کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان کے جن تنقیدی افکار پر سخت تنقید کی ہے اور ان افکار کو ان کی ذہنی اور فکری سوانح عمری قرار دیا ہے، ان کا تعلق بھی 'ترقی پسند ادب' میں شامل بیانات اور اسی زمانے میں شائع شدہ مضامین میں سامنے آنے والے تنقیدی رویوں سے ہے۔ مگر سردار جعفری کے پرانے فیصلوں سے انحراف اور بدلی ہوئی صورت حال میں تنقید نگار کی حیثیت سے اپنے جواز کی صورتیں صحیح معنوں میں ان کی دو کتابوں 'پیغمبران سخن' اور 'اقبال شناسی' میں نظر آتی ہیں۔ ان تحریروں میں مصنف کا زاویہ نظر نسبتاً لچک دار، قدرے معروضی اور ادبی اقدار سے ہم آہنگ ہے۔ 'پیغمبران سخن' دراصل کبیر، میر اور غالب کے انتخابات کے تنقیدی مقدمات پر مشتمل ہے، جن میں ان تینوں شاعروں کو ہندوستانی سماج کی مخصوص صورت حال اور ادبی روایت کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہی تصوف، جو سردار جعفری کی پرانی تحریروں میں جاگیردارانہ معاشرے کی فرسودہ اقدار اور مابعد الطبعیاتی حوالوں کے باعث وجدان اور دروں بینی کا زائیدہ نظر آتا تھا، ان شعراء کے حوالے سے عوامی اقدار کی بنیاد بن جاتا ہے۔ مزید یہ کہ تصوف کا عوامی پہلو بعض مذہبی حوالوں سے بھی زیر بحث آتا ہے۔ اس کتاب میں کبیر کو بھگتی تحریک کا نمائندہ قرار دینے اور انسان دوستی یا ہمہ گیر عوامی اپیل کے باعث اسلامی تصوف سے قریب دکھایا گیا ہے۔ کبیر کی شاعری کے اس تجزیے میں بھگتی، ویدانت اور متصوفانہ فکر کے یکساں سرچشموں کا سراغ لگاتے ہوئے انہوں نے کبیر کا موازنہ جلال الدین رومی اور دوسرے صوفی شعرا کے افکار سے علمی اور تحقیقی بنیادوں پر کیا ہے، ترقی پسند ادب میں انہوں نے "تصوف کو بے وقت کی راگنی قرار دیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ تصوف میں عوامی بھلائی کا کوئی تصور نہیں ملتا۔" مگر جب وہ کبیر یا میر کے حوالے سے تصوف اور بھگتی پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کو تصوف، قرون وسطیٰ کی ایک اہم اور ہمہ گیر تحریک نظر آتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "جدید عہد کی سیاسی، انقلابی تحریکوں کو قرون وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہیے۔ اس منزل میں صوفیوں اور بھگتوں کی روایتوں کے ساتھ کبیر، میر اور غالب ہمارے لئے اہم ہیں۔" سردار جعفری کی اس فکری تبدیلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شاعری کی روایت کے تئیں ان کے رویے میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بعد کے برسوں میں انہوں نے اردو کی ادبی روایت کے بنیادی عناصر کے مابین ان مخفی رشتوں کا سراغ لگایا ہے جن کی تفہیم کے بغیر ان کی پرانی تحریروں میں یک رخاپن پیدا ہو گیا تھا۔

ویسے تو کبیر، میر اور غالب کے تنقیدی جائزے میں سردار جعفری نے ان شعرا کے تخلیقی محرکات کی بھی نشاندہی بڑی خوبی سے کی ہے اور ان کے اشعار کا جگہ جگہ تجزیہ کر کے ڈکشن، اسلوب، لہجہ اور موضوع کو ماہرانہ عملی تنقید سے گزارا ہے، مگر میر کے مطالعے میں انہوں نے خصوصیت کے ساتھ نقد میر کے اس ٹائپ کو بھی مسترد کیا ہے جس کو قائم کرنے میں محمد حسین آزاد، عبدالحق اور ان کے بعد کے نقادوں نے اہم رول ادا کیا تھا۔ وہ اس ضمن میں میر کے بارے میں رائج تصورات، سادگی، افسردگی، قنوطیت اور لہجے کی پستی اور انفعالیت پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔ اس طرح میر کی تفہیم کے سلسلے میں جعفر علی خاں اثر کی طرح سردار جعفری کو یہ امتیاز حاصل ہوتا ہے کہ انہوں نے میر کے متنوع لہجوں کو دریافت کیا اور اشعار کے انتخاب اور ان کی تشریح و تعبیر کے ذریعے شاعر کی بے دماغی اور اس کے لہجے کی صلابت اور بلند آہنگی کو نمایاں کیا۔ ان کا خیال ہے:

"میر کو سمجھنے کا ایک آسان طریقہ رائج ہو گیا ہے۔ وہ ۷۲ نشتروں کے شاعر مشہور ہو گئے، جن کا کلام صرف آہ ہے۔ کیونکہ کسی نے کہہ دیا کہ سودا کی شاعری واہ ہے اور میر کی شاعری آہ۔ چنانچہ تنقید بھی اسی ڈگر پر چل کھڑی ہوئی اور لوگوں کی توجہ ایسے اشعار کی طرف سے ہٹ گئی جن میں آہوں کا گزر نہیں تھا اور سپردگی، افتادگی، معصومیت اور سادگی کے بجائے میر کی بے دماغی بول رہی تھی۔ میر کی شاعری جتنی سادہ اور دل نشین ہے اتنی ہی ٹیڑھی، بانکی، ترچھی اور تیکھی بھی ہے۔ اس میں جتنی نرمی اور گداز ہے اتنی ہی تلخی اور صلابت بھی ہے۔"

اس غیر مروجہ تنقیدی نقطہ نظر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے میر کے متن کے براہ راست مطالعہ کے ذریعے میر تنقید کی بنیادیں نئے سرے سے متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے میر کی زبان کی نوعیت پر بھی اظہار خیال کیا ہے، اور بتایا ہے کہ میر فارسی الفاظ کے مقابلے میں ہندوستانی بول چال کی زبان کو کیوں کر ترجیح دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ شاعری کی عوامی زبان پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے اپنی کتاب 'ترقی پسند ادب' میں بولی ٹھولی اور عوامی زبان کو شاعری کے لیے آئیڈیل قرار دیا تھا۔ اب وہ یہاں میر کی زبان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"میر اور ان کے ہم عصر شعرا ایک طرف عام بول چال کی زبان کو شعروں میں

[illegible] ہے تھے اور الفاظ کے نئے نئے جوڑ بٹھا کر اظہار و بیان کے [illegible] اور دوسری طرف فارسی کی ادبی روایتوں سے استفادہ [illegible] وترجمہ کر کے ہندی اور ریختہ میں کھپاتے جاتے تھے —"

[illegible] کا مطلب یہ ہوا کہ اب سردار جعفری کو عام بول چال کی زبان اور اس زبان کو قبول عام کی سطح تک لانے کے لئے نئی ترکیبوں کی تراش خراش اور مقامی زبان سے فارسی کی ہم آہنگی کی صورتوں کا اندازہ ہو چلا ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ انہوں نے اس ضمن میں [illegible] اثرات کے معاملے میں سبک ایرانی اور سبک ہندی کی تفریق قائم نہ کی۔ اگر انہوں نے سبک ہندی کی فارسی شاعری کے مزاج پر ذرا بھی توجہ صرف کی ہوتی تو انہیں یہ آسانی اندازہ ہو جاتا کہ سبک ہندی کی سب سے بڑی خصوصیت مقامی اثرات کو جذب کرنا ہی رہی ہے۔ اس لیے سبک ہندی کی روایت سے وابستہ میر اور ان کے معاصر شعرا اس رویے کو اپنی اردو کی ساخت میں بھی برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح یہ امتیاز میر کا اکیلا امتیاز نہیں بلکہ اس عہد کی لسانی شناخت کا حصہ ہے، اور اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ میر ہی کیا غالب تک کے زمانے کی اردو غزل بھی لسانی روایت کے لحاظ سے سبک ہندی کی فارسی روایت کا ہی تسلسل ہے۔

غالب کے معاملے میں سردار جعفری نے شروع سے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا اور غالب کو ہندوستانی اور یونانی فلسفے کی روایت کے ساتھ غیر عوامی لسانی ساخت کے وسیلے سے سمجھنے کا ثبوت دیا ہے۔ اس سلسلے میں امیجری اور حرکی پیکروں کی تخلیق اور حواس کو متحرک کرنے والی لفظیات اور تراکیب کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ان کا خیال ہے:

"غالب کی متحرک اور رقصاں امیجری تصویر گری کی معراج ہے۔ جب وہ اپنی اچھوتی تشبیہوں اور نادر استعاروں کا جادو جگاتا ہے تو ایک ایک لفظ حرکت کرنے لگتا ہے، ٹھہرے ہوئے نقوش سیال ہو جاتے ہیں اور خیال ایک پیکر نور بن کر سامنے آ جاتا ہے۔"

اس رائے میں جہاں ایک طرف غالب کی رقصاں امیجری کو نشان زد کیا گیا ہے وہیں استعارہ سازی کو بھی اس کا لازمہ بتایا گیا ہے۔ یہ وہی استعارہ سازی ہے جس کی بدولت شاعری میں پیدا ہونے والے دھندلکے اور ابہام کو سردار جعفری اپنی ابتدائی تنقید میں سب سے زیادہ ہدف تنقید بنا چکے ہیں۔ ان کی ناقدانہ فکر کے ارتقا اور تبدیلی کا سلسلہ پیغمبران سخن کے ابتدائی صفحات سے شروع ہو جاتا ہے جہاں انہوں نے پیش لفظ میں معنوی امکانات کی حامل شاعری کو مختلف زمانوں اور مختلف صورت حال کے قاری کے لئے بدلے ہوئے سیاق و سباق میں سمجھنے پر زور دیا ہے:

"ان مضامین میں اس مشکل کا جواب مل جائے گا کہ صدیاں گزر جانے اور حالات تبدیل ہو جانے اور زبان کے انداز بدل جانے کے بعد بھی ان بزرگ شعرا کا کلام ہمارے ذوق کی تسکین کا باعث کیوں کر بن سکتا ہے۔ عظیم ادب کی جڑیں اس کے عہد میں پیوست ہوتی ہیں لیکن پھول پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں۔"

اس نوع کے تجزیے سے جہاں ایک طرف ادب فہمی کے معاملے میں سردار کی پختہ کاری کا پتہ چلتا ہے وہیں اس بات کا بھی اندازہ ان کے پہلے دور کی تنقید میں شاعری کی تہہ داری، تفہیم اور ہمہ گیری سے صرف نظر کرنے کا انداز صحیح معنوں میں ان کے مزاج سے کہیں زیادہ تنظیمی ضرورتوں کا تابع تھا۔

'پیغمبران سخن' کی طرح سردار جعفری نے 'اقبال شناسی' کے [illegible] اپنے پختہ کار اور تجزیاتی، تنقیدی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے [illegible] اشتراکیت سے متاثر، حب الوطنی کے جذبے سے سرشار [illegible] کے علم بردار ہونے کے باعث اپنی ابتدائی شاعری کے حوالے سے [illegible] تعریف کے مستحق ٹھہرے تھے۔ قدرے بعد کی شاعری میں مرد کامل کے لیے [illegible] کی علامت کے استعمال کے سبب ان کے معتوب ہو گئے تھے اور انہوں نے [illegible] ادب میں لکھا تھا:

"اقبال نے اپنے شاہین کو تیمور، ابدالی، نپولین اور مسولینی کی شکل میں دیکھا، اور اقبال کے نزدیک پوری انسانی تاریخ ایسے ہی خودی سے سرشار افراد کے اشاروں پر چلتی ہے۔ اور فوق البشر کی تلاش میں ہے۔ یہ انفرادیت پرستی اور ہیرو پرستی خالص بورژوا تصور ہے جو اپنی آخری شکل میں فاشسٹ ڈکٹیٹر کا روپ دھار لیتا ہے اور یہ ڈکٹیٹر (شاہین) لہو گرم رکھنے کا بہانہ ڈھونڈنے کے لئے جاتا ہے تو اقبال کا انسان دوست دل تڑپ اٹھتا ہے۔"

"اقبال شناسی" کے مضامین میں جلال کو جمال اور عقل کو دل سے الگ کر کے دیکھنے کا انداز نہیں ملتا اور وہ اقبال کے مختلف ادوار کے کلام کو ایک ہی سلسلے کی کڑی تصور کرتے ہیں۔ ان کو خودی کے استحکام کے سارے عناصر ہندوستان اور ایشیا کی مسلم بیداری کے وسائل دکھائی دیتے ہیں اور یہ مسلم بیداری ان کے نزدیک دراصل عالم انسانیت کی بیداری کا حصہ ٹھہرتی ہے۔ ان کا خیال ہے:

"اقبال صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔ چونکہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکری روایات اور استعارات کا استعمال کیا ہے اور قوم پرستی (نیشنلزم) کو سیاسی سطح پر قبول نہیں کیا، اس لئے بعض لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جو اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔ اقبال کے یہاں حب الوطنی ایمان کا درجہ رکھتی ہے اور ان کی شاعری میں سامراج دشمنی کی لے شعلہ نوائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔"

اقبال کے متعلق اپنے دو مضامین "خودی اور خود شناسی" اور "اقبال کا تصور وقت" میں سردار جعفری نے اعلیٰ درجے کی عملی اور تجزیاتی تنقید کا ثبوت دیا ہے۔ خودی کی تکمیل کے عناصر کے ضمن میں وہ اقبال کو ان کی نظموں، غزلوں اور مابعد الطبعیات سے متعلق ان کی کتاب کا نہایت جامع اور وسیع سیاق و سباق سامنے رکھا ہے اور تصور وقت کے معاملے میں اسلامی روایت کے ساتھ وقت سے متعلق مغربی فکر کے پس منظر میں اقبال کے تصور وقت کا عالمانہ جائزہ لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سردار جعفری کی تنقید کا بنیادی رویہ تاثراتی تنقید کے دبستان کے قریب معلوم ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے مارکسی تنقید کے علاوہ نئی مغربی تنقید کے طریق کار سے بھی استفادہ کیا ہے۔

سردار جعفری کی تنقیدی فکر اور نقاد کی حیثیت سے ان کے تجزیہ پر تنقیدی شعور کی روشنی میں اگر یہ بات کہی جائے تو غلط نہ ہو گی کہ ان کی ابتدائی زمانے کی تنقید اگرچہ ترقی پسند جمالیات کی ترتیب و تدوین کے باعث قابل قدر ہے اور قدرے بعد کی تنقیدی تحریروں میں انہوں نے شعر و ادب کے محاسن و معائب کو ایک کہنہ مشق نقاد کی حیثیت سے دیکھا ہے اور یہی تنقید ان کے تنقیدی رویوں کی معراج ہے۔ ☆☆

رضا جعفری

سردار جعفری کا بلرام پور

اگر ہم سردار جعفری کی بلرامپور کی زندگی کا مطالعہ ذرا قریب سے کریں تو ہمیں ایک بڑی عجیب اور خوبصورت سی قوس قزح دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسی قوس قزح جس میں ان کی زندگی کے مختلف اور متعدد رنگ کبھی چاروں طرف بے ترتیبی سے بکھرے نظر آتے ہیں اور کبھی وہی رنگ ایک مرکز پر آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش ۲۹ر نومبر ۱۹۱۳ء ہے اور انہوں نے ۱۹۳۳ء میں بلرامپور کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس طرح کل بیس سال وہ بلرامپور میں مستقل طور سے رہے۔ ان برسوں میں ان کے بچپن کا وہ زمانہ بھی شامل ہے جب وہ شیر خوار رہے ہوں گے، گھٹنوں چلے ہوں گے اور برگ زباں پر نطق و صدا کی کلی کو بیٹھنے کے لئے وقت کا انتظار کرنا پڑا ہوگا۔ بلرامپور میں سید صاحب کی کوٹھی کے اندر نیم کا ایک بہت قدیم درخت لگا ہوا تھا جس کی شاخیں اس کوٹھی کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ والد، چچا اور چھوٹے چچا کا خاندان اسی کوٹھی کے الگ الگ حصوں میں آباد تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کی شرارت کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی گھر میں دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ اسی نیم کی شاخوں شاخوں وہ ہر گھر میں آتے جاتے رہتے تھے۔ چھ سات سال کی عمر میں ان کو تقریباً پانچ سو اشعار زبانی یاد تھے۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ اس زمانے میں وہ زیادہ تر سوالوں کا جواب شعر میں دیتے تھے۔ رمضان میں سب کے ساتھ روزے رکھتے تھے۔ مگر سحری کھانے سے پہلے نہلائے جاتے تھے کہ بستر گیلا کرنے کی عادت ان میں کافی بڑی عمر تک رہی۔ سحری کھانے کے بعد جب ان کی والدہ اور بڑی بہنیں نماز اور دعائے سحر میں مشغول ہوتیں، یہ لہک لہک کر انیس کی رباعیاں اور اقبال کا کلام پڑھنا شروع کر دیتے۔ تاز اں تو ایک جام پر اپنے ہے ساقیا جو وہ پلانے والے ہیں پروا ہے مجھ کو کیا۔ اور آں امام عاشقاں پور بتول، سرو آزادے زبستان رسول۔ کبھی کبھی تو اتنی موج میں ہوتے تھے کہ ان کی تیز آواز نماز میں خلل ڈالنے کے علاوہ سوتے ہوؤں کو بھی جگا دیتی تھی۔

جب ذرا بڑے ہوئے تو چھوٹے چچا جو چھوٹے بابا کہلاتے تھے اور جو بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے ان کے بڑے کام آئے۔ ان کے پاس بہترین نسل کے گھوڑے، عمدہ بندوقیں اور کیمرے تھے۔ اب وہ خوب گھوڑے دوڑاتے اور بندوق لے کر شکار کھیلنے کے لیے ہال پور، رمضان پور، رام پور اور پرتاپور کی تعلقہ داریوں کی طرف نکل جاتے اور شکار کی تلاش میں ہفتوں ان علاقوں میں قیام کرتے۔ شاید یہی وہ زمانہ تھا جب ان کا شعور جاگنا شروع ہوا تھا اور ان کی نگاہیں حالات پر ٹھہرنے لگی تھیں۔

پھر جب ذرا اور بڑے ہوئے تو قوس قزح کے رنگ بھی بدلے اور احساسات کے زاویے بھی۔ اس زمانے کی ایک تصویر وہ خود ان الفاظ میں کھینچتے ہیں: "اس کے (نیم کے پیڑ کے) چاروں طرف کئی مکانات ہیں، ہر مکان میں ایک گھرانہ آباد تھا، انہیں میں ایک گھر میرا بھی تھا۔ بڑے سے صحن، وسیع دالان اور کوٹھے کی دو کھلی ہوئی چھتوں کا گھر۔ اس کی پورب کی دیوار کی طرف سے ایک مندر کا خوبصورت کلس اور شیشم کا ایک بلند قامت درخت اندر جھانکتا تھا اور پیڑ کے پیچھے سے صبح کا سورج اور چودھویں کا چاند نکلتا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب پلنگ بچھ جاتے تھے تو یہ آنگن چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ اور جاڑوں کی راتوں میں اتنا لمبا کہ میں دوڑ کر اس آنگن سے گزرا کرتا تھا۔ اسی آنگن میں میں نے پہلی بار اپنی رگوں میں جوانی کا خون محسوس کیا۔ گرمی کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں دیوار کے سائے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کا پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ غافل سو رہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اس سے زیادہ حسین چیز نہیں دیکھی ہے۔ وہ چہرہ آج نظروں سے اوجھل ہو کر اور زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔" (لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ صفحہ ۱۷)

آج جب سردار جعفری ہمارے درمیان نہیں ہیں اور وہ نسل بھی نہیں ہے جس نے ان کو بلرامپور میں دیکھا تھا تو سطحی طور سے ایسا لگتا ہے کہ چونکہ ان کی زندگی کا بڑا حصہ بمبئی میں گزرا وہی شہر ان کے رگ و پے میں رچ بس گیا ہوگا اور وہ اپنا تخلیقی مواد بھی وہیں سے حاصل کرتے ہوں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ جہاں بھی رہے ہوں، جہاں بھی گئے ہوں بلرامپور کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹا۔ اور وہ بیس سال جو انہوں نے بلرامپور میں گزارے ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔ دراصل یہی وہ بیس سال تھے جن کی بھٹی میں تپ کر وہ کندن بنے اور ان کا ادبی، سماجی، سیاسی اور مذہبی شعور پختہ ہوا۔ یہی وہ بیس سال تھے جن کی بنیاد پر ان کی علمیت، وسعت نگاہ، شاعری، انسان دوستی اور ایک دلکش شخصیت کی عظیم انسانی عمارت کھڑی ہوئی۔ ان کی زندگی کے یہ بیس سال اپنے اندر جمال و جلال اور فکر و نظر کی ایک بڑی خوبصورت کہکشاں لے کر ہمارے سامنے سے گزرتے ہیں۔ کبھی ان کی شاعری امن عالم اور عظمت انسان کے گیت سناتی نظر آتی ہے۔ کبھی طبل و علم کے ساتھ مظلوموں کی آواز میں آواز ملاتی تلواروں کی جھنکار سنائی دیتی ہے اور کبھی ان کی اپنی دلنواز آواز ملکوں ملکوں محبت اور اخوت کے چراغ جلاتی نظر آتی

۵۰۔ مقبرہ، گولا گنج، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۸

ہوئے۔ ملاقات ہوتی رہی، صبح تلک شام ملاقات چلے۔

بلرامپور اس وقت اودھ کی سب سے بڑی اور زرخیز ریاست تھی۔ اس ریاست میں سردار جعفری کے والد اسلحہ خانے اور توشہ خانے کے انچارج تھے۔ چچا ریاست کے اسسٹنٹ منیجر، برٹش اسمبلی کے ممبر اور مقامی اور غیر مقامی مذہبی اور سیاسی اداروں سے وابستہ تھے۔ چھوٹے چچاؤں تو ولی عہد کے ٹیوٹر تھے مگر شکار، فوٹو گرافی اور جانے کتنے فنون کے ماہر تھے۔ پورا خاندان مذہبی ماحول اور مذہبی رسومات میں ڈوبا ہوا تھا۔ سال میں مختلف موقعوں پر مجالس اور محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں ملک کے مشہور اور مقتدر شعرا، علما اور ذاکرین شریک ہوتے تھے۔ اسی ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور جب ذرا سن شعور کو پہنچے تو جو بھی کتاب ہاتھ لگی اس کو پڑھ ڈالا۔ ان کے والد کے پاس مذہبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ وہیں انہوں نے قرآن کے علاوہ پیغمبروں اور چودہ معصومین کے حالات پڑھ کر یاد کر لیے اور چھوٹی سی عمر میں ہی مرثیہ خوانی اور حدیث خوانی کرنے لگے۔ اس زمانے میں وہ اپنی سب سے بڑی بہن زبیدہ خاتون سے جن کو وہ آپا کہتے تھے، ذہنی طور سے بہت قریب تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ان کے پاس اس زمانے کے مشہور رسالے "تہذیب نسواں، عصمت اور ریاست" برابر آتے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے پاس صفیہ بیگم، راشد الخیری کے ناولوں اور اخلاقی اور سماجی مسائل پر کتابوں کے ساتھ اور بھی بہت کچھ سیکھنے کو تھا۔ یہ وہی بہن تھیں جن کی موت کا ماتم انہوں نے اپنی اہلیہ سلطانہ جعفری کے نام جیل سے لکھے گئے اپنے ۱۰ر جولائی ۱۹۴۹ء کے خط میں اس طرح کیا ہے۔ "اتنے میں بلرام پور سے آپا کے انتقال کی خبر آگئی۔ آپا سے مجھے بے حد محبت تھی کیونکہ انہوں نے مجھے پالا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ اس کا ہے کہ میں آپا کو آخری وقت نہیں دیکھ سکا——"
(گفتگو۔ ترقی پسند ادب نمبر۔ صفحہ :۱۴۵) آپا کی باتوں اور آپا کی کتابوں نے ان کے آگے، مذہب سے باہر، علم کی کھڑکیاں کھول دیں۔ مگر ان کتابوں میں اتنا علم نہیں تھا جو ان کے اندر ابھرتے سوالوں کا جواب دے سکتا۔ وہ جب بھی اپنی زمینوں پر جاتے وہاں کے حالات ان کے ذہن میں نئے سوالات کی بھرمار کر دیتے۔ وہاں ان کو جو کچھ نظر آرہا تھا اس کی تصویر وہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

"یہ خوبصورت گیتوں، دھان اور گیہوں کے کھیتوں اور انتہائی افلاس کی سرزمین ہے۔ اس میں اتنی پگڈنڈیاں نہیں ہوں گی جتنے خون کے دھارے اس کے جسم میں جذب ہو چکے ہیں۔ میری یاد میں اس کی انتہائی بھیانک تصویریں محفوظ ہیں۔ گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں جھکے ہوئے کسان جن کی پیٹھوں پر اینٹیں لدی ہوئی ہیں، ان کے جوتے مارے جا رہے ہیں اور وہ دہائیاں دے رہے ہیں۔ پیڑ کی شاخوں میں بالوں سے لٹکی ہوئی عورتیں۔ پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور باہر نکلے ہوئے پیٹوں کے بچے۔ بڑی بڑی سیاہ مگر بجھی ہوئی آنکھیں۔ ایک بار میرے سامنے ایک کسان عورت ننگی کر دی گئی۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار تصویریں ہیں جو اگر کوئی مصور پردے پر بنادے تو دنیا چیخ اٹھے۔"
(لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ صفحہ ۲۴)

ان ہی سوالوں اور جوابوں کی کشمکش کے دوران ان کے ذہن میں تخلیق کے سوتے پھوٹنے شروع ہوئے۔ "آتشیں قیس، لالۂ صحرائی، ہجوم و تنہائی اور تین پاؤ گندھا ہوا آٹا" یہ وہ انسان تھے جن کو لکھ کر وہ گھر کی ڈیوڑھی میں بنے اپنے چھوٹے سے کمرے میں، جو اس زمانے میں ان کی سب سے بڑی پناہ گاہ تھا ڈال دیا کرتے تھے کہ کسی کی نظر ان پر نہ پڑ جائے۔ یہ وہ افسانے تھے جن میں فلاں اور فلاں کی ذکر ان کے ساتھ سماجی برائیوں اور بندھنوں کو توڑ دینے کی بات کہی گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ان کے بڑے بھائی کانپور سے اپنی پڑھائی پوری کر کے آئے اور انہوں نے بلرامپور میں صحافت کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے بلرامپور سے "ہم صفیر" نام کا ایک ہفت روزہ جاری کیا۔ "ہم صفیر" کے نکلتے ہی جلدے میں "نیرنگ خیال، ساقی" اور بہت سے دوسرے رسائل گھر میں آنے لگے۔ جنہوں نے ان کی ادبی، سماجی اور سیاسی دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ اب وہ چھوٹی چھوٹی نظموں کے ساتھ مضامین بھی لکھنے لگے تھے جو ان کی کہانیوں کے ساتھ چھپ کر دور دور تک پہنچنے لگے۔ اسی زمانے میں ان کی لکھی ہوئی دو چیزوں نے خاندان میں بزرگوں کے کان کھڑے کر دیئے۔ انہوں نے ایک نظم "تلاش حق" لکھی جس میں لکھا کہ خدا نہ تو غرناطہ اور بغداد کے ایوانوں میں ملے گا اور نہ امیروں کے محلوں میں۔ خدا تو جو کی روٹی میں ہے، پیوند لگی چادر میں ہے اور حق کے لیے میدان کربلا میں چمکنے والی تلوار میں ہے۔ پھر انہوں نے ایک مضمون لکھا جو کہ دراصل آگرے کے ایک جید مولانا مبارک علی کے عقد بیگواں کی مخالفت میں لکھے گئے مضمون کا جواب تھا۔ جس پرچے میں مضمون چھپا تھا اسی میں دونوں کے درمیان بہت دنوں تک بحث چلتی رہی۔ اور ایک دن مولانا کے ترکش کے سارے تیر ختم ہو گئے اور وہ سید صاحب کی کوٹھی بلرامپور میں ان سے شرف ملاقات کے لیے آئے۔ بزرگوں نے مولانا کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن جب وہ اپنے مدمقابل سے ملے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جسے وہ ایک سن رسیدہ بزرگ سمجھ رہے تھے، اس کی تو ابھی مسیں بھی پوری طرح نہیں بھیگی تھیں——

ان کے والد کے دوست التجا حسین جو گورنمنٹ کے تحصیل دار تھے۔ انہوں نے ان کے مضامین، نظموں اور کہانیوں کو پڑھ کر اس بو کو محسوس کر لیا جو بڑی تیزی سے اپنے قدم بڑھا رہی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ سید صاحب برٹش اسمبلی کے ممبر ہیں۔ اگر ان کے گھر سے باغیانہ چیزیں لکھی جانے لگیں تو ایک دن خان صاحب کا خطاب اور ساری مراعات چھین لی جائیں گی۔ خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی۔ ان کے بزرگ اتنا تو جانتے تھے کہ دریا کے بہاؤ اور چلتی ہوئی ہوا کو نہیں روکا جا سکتا۔ اس لیے انہوں نے دریا کو تو بہنے دیا بس اس کے رخ کا تعین اس طرح کیا کہ ان کے بیٹے کی صلاحیتیں بھی ضائع نہ ہوں اور ان کی اپنی سماجی حیثیت پر بھی آنچ نہ آئے۔ گھر کے بزرگ اور قریبی دوست سر جوڑ کر بیٹھے اور ایک ایسی حکمت عملی تیار کی گئی جس کے تحت انہوں نے ان کو اس بات کے لیے راضی کر لیا کہ وہ ہر شب جمعہ کو منعقد ہونے والی مجلس کو خطاب کیا کریں۔ اس طرح انہوں نے جوش ملیح آبادی کے اس شعر سے مجلس میں حدیث پڑھنے کا آغاز کیا:

جو جواں بیٹے کی میت پہ نہ رویا وہ حسین
جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین

اور پھر حدیث کے بعد سلام، رباعی، مرثیہ اور قصیدہ لوگ تعریف کرتے گئے اور وہ سب کچھ کہتے گئے۔ پھر، کسی نے جب یہ کہا کہ میر صاحب مرثیہ خوب پڑھتے ہیں تو رگ شاعری پھڑک گئی اور مجلسیں اور محفلیں ان کے لیے اکھاڑا بن گئیں، خوب خوب داد ملی:

اے بلبلِ ریاضِ بیاں نغمہ بار ہو
اے نو عروسِ طبعِ جواں ہم کنار ہو
اے خامۂ شگفتہ زباں لالہ کار ہو
اے حاسدِ دریدہ دہاں شرم سار ہو

کیا اس سخن میں مجھ سے ہیچ مداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمتِ ربِّ غفور ہے

'حزیں' کے قلمی نام سے اب وہ ایک کے بعد ایک مرثیے کہنے اور پڑھنے لگے۔ بزرگ خوش تھے کہ لاڈلا راہِ راست پر آگیا اور شاعرِ اہلِ بیت بن کر ان کا نام روشن کر رہا ہے۔ مگر دراصل ایسا تھا نہیں۔ ان کے دل میں تو اور ہی آگ لگی تھی۔ ان کا تجسس دماغ اور روشن آنکھیں سید صاحب کی کوٹھی کے حصار سے پرے، دورِ حاضر کی اس تازہ کربلا پر لگی ہوئی تھیں جہاں حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان ایک اور ہی جنگ چل رہی تھی۔ ان کی نظریں بلرامپور کے اطراف میں پھیلی اس رزمگاہ کو دیکھ رہی تھیں جہاں ایک طرف مفلس، جاہل اور بے بس عوام غلامی اور محکومی کی زندگی جینے پر مجبور تھے اور دوسری طرف جاگیردارانہ نظام اس کو اللہ کی مرضی کہہ کر اور انگریزوں کی شہہ پر مظالم کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ انہوں نے ان مظالم کو بلرامپور میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اسی لیے اس غم اور اس صدمے کو وہ ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ المیہ ان کی پوری شخصیت میں اتر آیا تھا۔ کرشن چندر کو ان کی گفتگو فلسفہ کی ایک شق معلوم ہوتی تھی اور ان کے چہرے پر ہنسیہ اور ہتھوڑے کا نشان نظر آتا تھا۔ (رپورتاژ، پودے، کرشن چندر) فراق کو ان کی شاعری میں خون خرابہ نظر آتا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی پوری شاعری انسانی زندگی کی بے بسی اور کم مائیگی کے خلاف جنگ میں مصروف نظر آتی ہے۔ اس میں گھن گرج بھی سنائی دیتی ہے اور چلتی ہوئی تلواروں کی جھنکار بھی۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی ہے اور بہتے ہوئے خون کی بو کے ساتھ جلتی ہوئی آگ کی گرمی بھی۔ اور اسی سب کے درمیان وہ عظمتِ انسان کے خواب دیکھتے اور صبحِ فردا کے منتظر بھی نظر آتے ہیں۔ یہ سب بلرامپور کی دین ہے۔

'حزیں' سے سردار جعفری بننے میں ان کو کس آگ کے دریا سے گزرنا پڑا، یہ تو بس ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ حزیں کے دور کو یاد رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے دوست جناب کالی داس گپتا رضا بمبئی کی دسمبر ۱۹۸۱ء کی ایک صبح کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "میں نے جعفری صاحب سے عرض کیا کہ نظمیں تو ہم ان سے بہت سن چکے، آج کوئی غزل سنائیں۔ انہوں نے فرمایا کہ شروع شروع میں تو غزلیں کہی تھیں مگر اب وہ انہیں یاد نہیں۔ میں نے کہا کہ شروع شروع میں تو آپ مرثیہ بھی کہتے تھے اور اس وقت آپ کا تخلص حزیں ہوتا تھا۔ انہوں نے تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا کہ یہ مجھے کیوں کر معلوم ہے۔ میں نے 'الناظر' لکھنؤ کا ایک قدیم شمارہ ان کو پیش کر دیا جس میں جعفری صاحب کا مرثیہ حزیں تخلص کے ساتھ چھپا تھا۔ جاتے جاتے یہ متاعِ گم گشتہ اپنے ساتھ لے گئے۔ اب یاد نہیں کہ انہوں نے وہ شمارہ واپس کیا تھا کہ نہیں۔" (ماہنامہ 'آجکل' دہلی۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء۔ صفحہ:۵)

افسوس یہ ہے کہ اب نہ سردار جعفری ہیں اور نہ کالی داس گپتا رضا۔ حزیں کے تخلص سے لکھے گئے مرثیے اب ان کے مجموعوں میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔

(ماہنامہ 'آجکل' دہلی۔ اکتوبر ۲۰۰۰ء۔ صفحہ:۵)

یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے ذہن میں ایک کشمکش چل رہا تھا۔ بیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے علم و فن کی بہت سی منزلیں سر کر لینے کے علاوہ غلامی اور محکومی کے درمیان پل رہے ظلم، جبر اور بربریت کو بہت قریب سے دیکھ لیا تھا اور اتنے بالغ نظر ہو چکے تھے کہ اگر ان کو علی گڑھ کا آؤٹ لیٹ نہ ملتا تو شاید وہ کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہو جاتے۔ وہ خود لکھتے ہیں: "اب پھر بلرامپور کا کنواں تھا اور میں۔ عمل کا کوئی راستہ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ ذہنی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں بے بس تھا اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔" (لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ صفحہ ۳۲) ایک طرف حقیقی زندگی کے سوالات تھے جن کے جواب بلرامپور کے پاس نہیں تھے اور دوسری طرف بلرامپور سے باہر کی دنیا تھی جہاں اس وقت کے رہنما مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور دوسرے دانشور تھے جن کی کتابوں اور بیانات نے ان کو سوالوں کے گھیرے سے نکلنے کا راستہ بتا دیا تھا۔ اسی ذہنی کشمکش کے دور کے ایک واقعے نے ساری طنابیں کاٹ دیں اور وہ صبحِ فردا کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ وہ لکھتے ہیں: "مجھے سن یاد نہیں۔ لیکن ایک مرتبہ یہ ہوا کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے بغاوت کر دی۔ ریاست کی فوج نے جواب میں سارے گاؤں میں آگ لگا دی اور کسان عورتوں کو بے عزت کیا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ اخباروں میں خبریں چھپیں اور کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو معاملے کی تحقیقات کرنے آئے۔ ریاست کے عملے نے ان کو گاؤں تک جانے سے روک دیا اور راستے کی کچی سڑک پر جا بجا گڈھے کھودے گئے تاکہ پنڈت نہرو کی کار وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

غالباً عید غدیر کا دن تھا یا یوں ہی، ہمارے گھر میں کوئی محفل تھی۔ میں اس میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے اس عام جلسے میں چلا گیا جہاں پنڈت نہرو نے جاگیرداری ظلم و استبداد کے خلاف تقریر کی۔ جلسے کے بعد میں گھر آیا تو گھر کے لوگ مجھ سے خفا تھے اور میں ساری کائنات سے بے زار۔ ظلم اور افلاس کے سماجی اسباب کے پہلے علم نے میرے دل میں چراغ جلا دیے تھے۔" (لکھنؤ کی پانچ راتیں۔ صفحہ:۲۷)

اور پھر اپنے دل میں ان ہی چراغوں کی روشنی لیے وہ بلرام پور سے ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی پہنچ گئے اور وہاں ان خوابوں کو حقیقت میں بدلنے میں لگ گئے جو آدمی کے لیے ازل سے آج تک خواب ہی خواب ہیں:

کس سے ممکن ہے تمناؤں کے زخموں کا حساب
آستینوں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو
اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لہو کے گرداب
دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب
در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب
سرکشی پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
میں ترا شاعرِ آوارہ و بیباک و خراب
پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور ابھی ہمتِ دشوار پسند

(نظم: "ایک خواب اور" سے)

نصرت جبیں

سردار جعفری بحیثیت نثر نگار

ادبی اظہار کی دو بڑی اور واضح شکلیں ہیں ایک نثر اور دوسری شاعری۔ شاعری میں براہ راست بات نہ کہہ کر اشاروں اور کنایوں میں کہی جاتی ہے۔ لیکن نثر کا دائرہ اس سے مختلف ہے نثر ایک عام چیز ہے جس کو ہر شخص استعمال کرتا ہے۔ انسان ابتدائے آفرینش سے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کرنے کے لیے یا اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لئے نثر سے کام لیتا رہا ہے۔ نثر کا تعلق چونکہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے ہے اس لیے اس کے بے شمار موضوعات ہیں اور تمام موضوعات کے لیے اس کا ایک ہی انداز نہیں ہے۔ بلکہ اپنے میدان کی وسعت اور موضوعات کے تنوع اور رنگا رنگی کے لحاظ سے ہر موضوع اور ہر مقصد کی وضاحت کے لیے نثر کا مخصوص اور منفرد لہجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موضوعی اعتبار سے نثر کو مختلف ناموں اور قسموں میں بانٹ سکتے ہیں۔ (۱) بول چال کی نثر (۲) علمی نثر (۳) ادبی نثر۔

بول چال کی نثر جذبات وخیالات کی ترسیل کا کام انجام دیتی ہے عام معنوں میں اس کو عوامی بولی کے نام سے پکارا جاسکتا ہے۔ اس نثر میں الفاظ سادہ طریقہ پر ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس میں خیال کی بلندی اور فکر کی گہرائی اس حد تک نہیں ہوتی کہ بات کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنادے۔ علمی نثر نثر کی بہت سادہ اور صاف شکل ہے۔ اس کے ذریعہ علوم وفنون کی اشاعت ہوتی ہے۔ اس کا کام معلومات بہم پہنچانا ہے اس لیے اس کو معلوماتی نثر بھی کہا جاسکتا ہے اور خالص نثر بھی۔ ادبی نثر نثر کی ایک اہم مخصوص اور اعلیٰ قسم ہے۔ جس کا تعلق براہ راست ادب سے ہے۔ یہ عام طور پر اعلیٰ خیالات کی حامل ہوتی ہے۔ اس میں بیان کی پوری صلاحیتیں اور ذہن وفکر کو متاثر کرنے اور لطافت بخشنے کی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ اپنی ایمائیت، تخیل، ابہام اور زور بیان جیسی متعدد خصوصیات کے ذریعہ اپنی پہچان کراتی ہے۔ ادبی نثر دو حصوں پر مشتمل ہے ایک خالص ادبی نثر جس کو سادہ ادبی نثر بھی کہتے ہیں۔ اور دوسری تخلیقی ادبی نثر جس میں افسانہ، ناول، انشائیہ اور اسی نوع کی دوسری اصناف نثر بھی شامل ہیں۔ سادہ ادبی نثر میں تحقیق، تنقید اور تجزیہ کی زبان شامل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ رنگین بیان، جذباتی اظہار اور حسن آفرینی سے مبرا ہو۔ مگر لفظوں کا اچھا استعمال، جملوں کی صحیح ترتیب، زبان کا فطری لوچ اور آہنگ اس میں بھی ہونا ضروری ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں جن کی آمیزش سے سادہ ادبی نثر وجود میں آتی ہے۔ مگر اعلیٰ ادبی نثر کے لیے حسن آفرینی جمال اور جذبہ بھی ضروری ہے۔ بشرطیکہ لہجہ منطق ودلالت سے بھرپور ہو۔ اردو نثر کی یہی صورتیں ہیں جس کو ہر ادیب اختیار کرتا ہے اور جس کی تشکیل وترقی میں مختلف تحریکات نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔

علی سردار جعفری کثیر الجہات فنی شخصیت کے حامل تھے۔ شعر وادب کے علاوہ دیگر فنون کی ترقی اور فروغ کے لیے بھی ان کی تخلیقی اور ترغیباتی سرگرمیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ادب وفن کے ساتھ ساتھ وہ صحافت اور سیاست کے میدان میں بھی سرگرم عمل رہے۔ نظم ونثر دونوں میں ان کا ادبی اثاثہ اور عملی زندگی میں ان کا کام بہت گراں مایہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تعداد کے اعتبار سے ان کی نثری تصانیف شعری تصانیف سے کم ہیں۔ لیکن ان کے مضامین اور تنقیدی کتابیں اس بات کی شاہد ہیں کہ ان کی نثری تحریریں نہ صرف ان کے زمانے کی علمی، ادبی اور سماجی صورت حال کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ مصنف کے تنقیدی اور فکری شعور وبصیرت کی بھی غماز ہیں۔

سردار جعفری کے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی افسانے لکھنے شروع کردیے تھے جن میں بیشتر ضائع ہوگئے اور چند جو باقی بچے وہ حلقہ ادب لکھنؤ کی توجہ سے ۱۹۳۸ء میں منزل کے نام سے منظر عام پر آئے۔ اس دور میں پہلی بار ادب کو بالراست انداز میں زندگی کے ساتھ ساتھ لگ کر چلنے کی راہوں پر ڈالا گیا تھا۔ چنانچہ اس دور کی شاعری، ناول نویسی، افسانہ نگاری، رپورتاژ وغیرہ تمام اصناف ادب وشعر کے مواد کا تنوع دراصل زندگی کا سچا اور زندہ احاطہ تھا۔ "حسن بیان کی خاطر بڑھا بھی لیتے ہیں زیب داستاں کے لیے" تو بالکل الگ ہی بات ہے۔ البتہ یہ ادب صرف اور محض زیب داستاں کی خاطر ہوائیاں چھوڑنے والا ادب نہیں تھا۔ یہ نظریاتی ادب تھا جو آج بھی ہے اور جس کی بنیاد پریم چند کے اس مقولہ پر رکھی گئی کہ ہمیں "حسن کا معیار بدلنا ہوگا" یہ حسن کا معیار کیسے بدلے گا اس کی وضاحت بھی انہوں نے اپنے خطبہ میں کردی تھی۔

سردار جعفری نے اپنی تخلیقات میں اس معیار حسن کو اپنا مطمح نظر بنایا اس لیے ان کے افسانوں میں نہ عشق وعاشقی کی چاشنی ہے نہ ہجر کی نہ کٹنے والی راتیں ہیں نہ وصال کے لمحات کے لیے اضطراب نہ رومانی فضا ہے نہ کہانی کہنے سے پہلے کی طولانی تمہید نہ

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سردار جعفری نے یہ زبان دلی کے مظاہرے ہے۔ یہ افسانے سیدھے سادے بیانیہ انداز کے ہیں۔ جس میں ہزار رنگ اور ہزار زاویے دکھاتی زندگی ہے۔ اسی لیے اگر سردار جعفری کے افسانوں میں حسن و دلکشی اور رعنائیاں دیکھنی ہیں تو اس دور میں کی جانے والی زندگی کے استحصال اور اضطراب کی عکاسی میں دیکھئے جس کی بہترین مثال ان کا مشہور افسانہ "پچھڑا نہیں" ہے۔ ہر چند کہ آج علی سردار جعفری کے افسانوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور انہیں بہ حیثیت نقاد اور شاعر کے پہچانا جاتا ہے مگر اس کے باوجود سردار جعفری کے تخلیقی سفر میں افسانوں کا ایک اہم مقام ہے۔

منزل کے علاوہ ان کی نثری تخلیقات "لکھنؤ کی پانچ راتیں" "ترقی پسند ادب"، اقبال شناسی، "پیغمبران سخن"، ترقی پسند تحریک کی نصف صدی اور غالب کا سومنات خیال" ہیں۔ یہ کتابیں دو قسم کی تحریروں سے آراستہ ہیں۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں مصنف کے قلبی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ یہ خود نوشت بھی ہے اور رپوتاژ بھی۔ دوسری تصنیفات مصنف کی ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس کے حسن اکتساب، جستجو، عمیق مطالعہ اور جودت طبع کا عکس و نقش ہیں۔

بحیثیت نقاد سردار جعفری کے سفر کا آغاز ۱۹۵۰ء میں اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے سنہرے دور کی تکمیل کر چکی تھی۔ سردار جعفری نے اپنے تنقیدی مضامین کے لیے توضیحی نثر کا استعمال کیا۔ توضیحی نثر سے مراد وہ نثر ہے جس میں کسی خیال کی وضاحت کی جائے۔ خیال ایک مجرد حقیقت ہے۔ اس مجرد حقیقت کا اظہار ہم جن صوتی علامتوں کی مدد سے کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کہلاتے ہیں۔ الفاظ کے تانے بانے سے فقرے اور جملے بنتے ہیں۔ اور اس طرح خیال ظہور میں آتا ہے۔ گویا الفاظ کی ایک منطقی ترتیب توضیح خیال کے لیے اولین شرط قرار پائی، اب جہاں تک خیال کی ساخت کا تعلق ہے یہ مشتمل ہے دو چیزوں پر۔ ایک دعوی دوسرے دلیل۔ دعویٰ اگر دلیل سے عاری ہے تو خیال وضاحت سے محروم رہ جائے گا۔ یہ تو ہوئے وہ لوازم جن کے بغیر توضیح خیال ممکن ہی نہیں۔ اب یہ لکھنے والے کا کمال ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا کرے۔ نثری اسلوب کے اسی وصف کو کمیت الفاظ کے اعتبار سے ایجاز اور کیفیت الفاظ کے لحاظ سے بلاغت کہتے ہیں۔ گویا توضیحی نثر کی چار بنیادی خصوصیات قرار پائیں۔ وضاحت، ترتیب، استدلال، ایجاز اور بلاغت۔ وضاحت اور استدلال کے بہت سے طریقے ہیں، جن میں سے ایک خطابت بھی ہے۔ علی سردار جعفری نے اپنی نثر کے لیے خطیبانہ اسلوب کو ہی منتخب کیا۔ الفاظ کا آہنگ، جملوں کا زیر و بم، تشبیہوں سے بیان کی دلکشی بڑھانا، استفہامیہ لہجہ فن خطابت کے ناگزیر اجزا ہیں۔ سردار جعفری نے ان میں سے بیشتر وسائل سے کام لے کر اپنی تحریروں میں خطابت کا سحر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

خطابت حقائق کے بیان پر اکتفا کرنے کے بجائے حقائق کے تئیں اپنے رویہ پر اصرار سے عبارت ہے، مخاطب کو آزادانہ فیصلہ دینے کے بجائے خطابت اسے اپنا ہم خیال بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ اور علی سردار جعفری کے یہاں یہ رویہ بہت زیادہ موجود ہے۔ وہ اپنی بات کو دلیلوں سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں:

"ترقی پسند ادب پر پروپیگنڈے کا الزام زیادہ تر ہیئت پرست حلقوں کی طرف سے آتا ہے اور اس الزام کو تقویت اس سے پہنچتی ہے کہ ترقی پسند ادیب کھلم کھلا یہ کہتے ہیں کہ ادب کے سامنے ایک مقصد ہونا چاہئے اور ادب جانبدار ہوتا ہے۔ مقصد اور جانب داری اگر پروپیگنڈہ نہیں تو کیا ہے۔ لیکن کیا دنیا کے ادب میں ایک بھی ایسی مثال ملے گی جو بے مقصد اور غیر جانبدار ہو؟ ادیب کچھ چیزوں کو اچھا سمجھتا ہے، کچھ چیزوں کو برا۔ اچھی چیزوں کی اچھائی بیان کرتا ہے۔ بری چیزوں کی برائی۔ کوئی ادیب کھل کر بیان کرتا ہے۔ کوئی اشارے کرتا ہے۔ لیکن یہ تو انداز بیان کا فرق ہوا۔ یا زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ فنی اعتبار سے اچھے یا برے ادب کا فرق ہوا لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکلتا ہے کہ وہ ادب غیر جانبدار اور بے مقصد ہے۔ جیسے ہی ادیب اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے وہ جانبدار ہو جاتا ہے۔ ہیئت پرست ادیب کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ادیب کس کا جانبدار ہے۔ ترقی پسند ادیب کہتے ہیں کہ ہمیں اس سے یقیناً بحث ہے کہ ادیب کس کا جانبدار ہے۔ حسن عسکری فاشزم کے جانبدار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ادیب تخلیق کے وقت اپنی سماجی حیثیت کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے وہ آندرے ژید کے مداح ہیں۔ جس نے نازی جرمنوں کے ساتھ اس وقت تعاون کیا جب وہ اس کے وطن فرانس کو غلام بنا کر فرانسیسی عوام کے خون کی ندیاں بہا رہے تھے۔ حسن عسکری اور ژید کے برعکس جوش ملیح آبادی اور کرشن چندر عوام کے جانبدار ہیں۔ اس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ فاشزم، سامراج، ظلم اور استحصال کی جانبداری ادب ہے۔ لیکن عوام کی جانبداری پروپیگنڈہ ہے۔ حسن عسکری کے مطابق منٹو ادیب ہیں، فنکار ہیں۔ کیونکہ وہ ظالم اور مظلوم میں فرق نہیں کرتے۔ کرشن چندر پمفلٹ باز ہیں، نعرے باز ہیں کیونکہ وہ ظالم اور مظلوم میں فرق کرتے ہیں۔"

یہ اقتباس خطیبانہ طرز کی بہترین مثال ہے۔ اس میں اپنی رائے اور اس کی اصابت پر اصرار ملتا ہے۔ اس عبارت کے آخری فقرے اس مخصوص خطیبانہ رجحان کے مظہر ہیں جس کو طنز و تعریض کہا جاتا ہے۔

"حسن عسکری کے مطابق منٹو ادیب ہیں، فنکار ہیں۔ کیونکہ وہ ظالم اور مظلوم میں فرق نہیں کرتے۔ کرشن چندر پمفلٹ باز ہیں، نعرے باز ہیں کیونکہ وہ ظالم اور مظلوم میں فرق کرتے ہیں۔"

یہاں سردار جعفری حسن عسکری پر طنز کرتے ہیں۔ کیونکہ حسن عسکری کے مطابق ادیب پر کوئی سماجی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ منٹو کو بڑا فنکار اور کرشن چندر کو نعرے باز اور پمفلٹ باز مانتے ہیں۔

اس نثر کی دوسری خوبی استفہام ہے۔

مقصد اور جانبداری اگر پروپیگنڈہ نہیں تو کیا ہے؟

کیا دنیا کے ادب میں ایک بھی ایسی مثال ملے گی جو بے مقصد اور غیر جانبدار ہو؟ اس طرح کے استفہامیہ جملوں سے سردار جعفری نے نثر میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی خطیبانہ اسلوب کی فنی خصوصیت ہے۔ اس کے علاوہ سردار جعفری کی نثر میں جملوں کی ترتیب کے وہ مختلف ڈھنگ بھی مل جاتے ہیں، جن میں الفاظ کے جوڑے ایک خاص سلیقہ سے بنائے جاتے ہیں۔ جس کو علم بیان کی اصطلاح

میں مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"محض چند سکوں، چند پیالوں اور چند بوسوں کی آرزو نہیں ہے۔ بلکہ ایک نا آفریدہ گلشن کی تمنا ہے، جس کے نشاط تصور نے نغمہ سنجی پر مجبور کر دیا ہے۔"

یہ انداز بیان خطابت ہی کی پیداوار ہے۔ نثر میں اثر آفرینی کے لیے کبھی کبھی اس انداز بیان کو استعمال کیا جاتا ہے تاکہ قاری تحریر کے تاثر کو پوری طرح قبول کریں۔ سردار جعفری نے اپنی بات کو پرزور اور پراثر بنانے کے لیے شاعرانہ اسلوب کا بھی استعمال کیا ہے۔ غالب کی تعریف میں انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے اس سے نثر کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت منضبط اور مرتب انداز میں الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جس سے جملے زیادہ مربوط اور مستحکم ہو جاتے ہیں۔

"اس شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے صرف لفظی معنوں سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے، شعروں کو بار بار پڑھنا بھی ضروری ہے۔ پھر لفظ حرفوں کے مجموعہ کی شکل میں نہیں بلکہ تصویروں کی شکل میں پہچانے جائیں گے۔ آدمیوں کے چہروں کی طرح وہ آہستہ آہستہ مانوس ہوں گے اور اپنی شخصیت ظاہر کریں گے۔ لفظوں کا صوتی لوچ محسوس ہوگا اور ان کے باہمی ٹکراؤ کی جھنکار سے کان آشنا ہوں گے۔ تب جاکر معنوی ترنم اور داخلی آہنگ کے دروازے کھلیں گے۔ اس طرح لفظی مفہوم سے گزر کر شاعرانہ مفہوم تک پہنچنے کا راستہ ملے گا اور وہ وجدانی کیفیت پیدا ہوگی۔ جہاں وفا کا لفظ محبوب کی زلفوں کی طرح مہک اٹھے گا اور سر دچراغاں کرتا نظر آئے گا۔ عشق ذوق اور عمل بن جائے گا۔ حسن محبوب حسن کائنات میں تبدیل ہو جائے گا۔ تازہ وہ آدرش بن جائے گا جس کے حصول کے لیے دل و جان کی بازی لگانا خوش مذاقی کی دلیل ہے۔ شمشیر و سناں کا جلال اور انداز و ادا کا جمال جلوہ گر ہوگا۔ فراق کا درد آرزو کی لطافت میں تبدیل ہو جائے گا اور وصال لذت طلب کی سرشاری میں۔ شوق ایک قوت تخلیق بن کر ابھرے گا اور جستجو بن جائے گا۔ جس کی راہیں کبھی زنداں کی زنجیریں روکیں گی اور کبھی دیر و حرم کی دیواریں۔ جنھوں نے اپنے اندر شوق کی درماندگی کو سجا رکھا ہے اور میخانہ مکمل انسانیت اور مکمل آزادی کی منزل بن کر ابھرے گا۔ پھر دیوان غالب کے ہر ورق پر اس کے تخیل کی مخلوق انگڑائیاں لینے لگے گی۔ اس کے سراپا ناز محبوب آنکھوں کے سامنے مسکرائیں گے اور دنیا زیادہ خوبصورت ہو جائے گی اور انسان زیادہ قابل احترام۔"

جلال و جمال، فراق و وصال، دیر و حرم وہ علامتیں ہیں جن کو اکثر شاعر اپنی شاعری میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن سردار جعفری نے ان علامتوں کو نثر میں استعمال کر کے نثر کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ ان علامتوں میں معانی کی وہ وسعتیں پنہاں ہیں۔ جن کی گہرائی میں جاکر ہی ہم مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔ حروف عطف اور مترادفات کا بکثرت استعمال خطابت کا مخصوص طریقہ کار ہے۔ سردار جعفری نے اپنی نثر میں جوش اور ولولہ کی کیفیت پیدا کرنے کے لیے ان دونوں چیزوں کو بکثرت استعمال کیا ہے۔ شمشیر و سناں، انداز و ادا، دشت و صحرا، دیر و حرم جیسے الفاظ کا استعمال ان کی نثر کے زور بیان کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ الفاظ کی تکرار بھی خطابت کا لازمہ ہے اور سردار جعفری نے اپنی نثر میں الفاظ کی تکرار سے بھی جوش، ولولہ اور زور پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن انہوں نے خطابت کی اس خوبی کا استعمال نثر میں بہت کم کیا ہے۔ کہیں کہیں الفاظ کی تکرار کے نمونے مل جاتے ہیں جیسے:

"غالب کی شاعری میں ترک دنیا، ترک لذت اور ترک طلب کے مضامین شاذ و نادر ہی ملیں گے۔"

ترک دنیا، ترک لذت اور ترک طلب جیسے الفاظ عبارت کو خطابت سے قریب تر کر دیتے ہیں۔

علی سردار جعفری نے جہاں فن خطابت کی بیشتر فنی خصوصیات کو اپنی نثر میں استعمال کر کے جوش، ولولہ اور بیان میں زور پیدا کیا ہے وہیں الفاظ کا شکوہ، لہجہ کی گونج، تشبیہہ و کنایہ کا استعمال، جملوں کی نحوی ساخت کا استعمال ان کی نثر کو شاعرانہ نثر کی سرحدوں میں داخل کر دیتے ہیں۔ میر کی شاعری کی تعریف میں الفاظ کے تضادات سے نثر میں ایک خوبصورت کیفیت پیدا کی ہے۔

"میر کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستاں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ بلبل بھی ہے اور صیاد بھی، نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی۔ زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانے کے بھول جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔"

اقبال شناسی میں اقبال کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس منزل پر پہنچ کر اقبال کی شاعری بے انتہا حسین اور زوردار ہو جاتی ہے۔ اس میں سیلاب کا بہاؤ اور آبشاروں کی روانی آجاتی ہے۔ اور ایک ایسا آہنگ پیدا ہوتا ہے جس کی مثال ایک ہزار برس کی فارسی اور اردو شاعری کی روایت میں نہیں ہے۔ اس کے سامنے کوئی منزل منزل نہیں، کوئی حد حد نہیں۔ بے قراری اور تڑپ، آگے بڑھے جانے کا جذبہ۔ جب کسی حسین چہرہ پر نظر پڑتی ہے تو دل اس سے زیادہ خوبصورت محبوب کے لیے تڑپ اٹھتا ہے۔ شرر سے ستارے اور ستاروں سے آفتاب بن رہے ہیں۔ فقط ذوق پرواز ہے زندگی، سکون و قرار موت کا دوسرا نام ہے۔"

اس اقتباس میں "سیلاب کا بہاؤ" اور "آبشاروں کی روانی" جیسے الفاظ عبارت میں ایک شان پیدا کر دیتے ہیں۔ منزل منزل نہیں، حد حد نہیں، بے قراری اور تڑپ ایسے الفاظ ہیں جو عبارت میں خوبصورتی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں اقتباس سردار جعفری کے شعری اسلوب کی بہترین مثال ہیں۔

سردار جعفری نے اپنی نثر میں تشبیہات کا استعمال کیا ہے۔ لیکن دوسرے نثر نگاروں کی طرح نثر کی آرائش و زیبائش کے لیے نہیں بلکہ جملے کی معنی خیزی اور تہہ داری کو بڑھانے کے لیے کیا ہے۔

"غالب نے یقیناً اس عقیدے سے ایک جارحانہ نقطہ نگاہ اختیار کیا ہے جو اس کی شاعری میں خون بہار کی طرح دوڑ رہا ہے۔"

اس جملہ میں سردار جعفری نے جو تشبیہ استعمال کی ہے اس سے جملے کی معنی خیزی اور تہہ داری میں اضافہ ہو گیا ہے۔

سبط حسن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سبط حسن سر سے پاؤں تک عشق کا مجسمہ کسی افسانوی سرزمین کے شہزادے کی طرح جو پاروں کے محلوں اور پارہ دریوں سے سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگاتے ہیں۔ حسین چہرہ، جامہ زیب جسم، نفیس ترشے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں اور نہایت مہذب اور سجی ہوئی زبان۔"

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نثر نگار کو برمحل تشبیہات کے انتخاب کا غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی نثر میں تشبیہات کا زیادہ استعمال نہیں کیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ سردار جعفری کا اسلوب تشبیہوں اور استعاروں کا محتاج نہیں ہے۔ نثری اسلوب کا یہ رجحان قابل ستائش ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر نثر نگار کا ذخیرہ الفاظ وسیع ہو اور اس کو الفاظ کے انتخاب کا ملکہ بھی ہو تو تخئیل پیکروں کا سہارا لیے بغیر بھی نثر میں وہ حسن اور دلکشی پیدا کی جاسکتی ہے جس کی خاطر عام طور پر غیر محتاط نثر نگار تشبیہ اور استعارہ کی بہتات کر کے نثر کو شعر کی سرحدوں میں داخل کر دیتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وضاحت کے بجائے نثری اسلوب میں وہ ابہام پیدا ہو جاتا ہے جو شاعری کے لیے تو جائز ہے لیکن نثر کے لیے نہیں۔

سردار جعفری کے یہاں سادہ ادبی نثر کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادبی نثر بھی ملتی ہے۔ تخلیقی ادبی نثر، ادبی نثر کی ہی ایک شکل ہے۔ لیکن اس میں افسانہ، ناول، انشائیہ اور اسی نوع کی دوسری تصانیف شامل ہیں۔ جب کہ سادہ ادبی نثر میں تحقیق، تنقید اور تجزیہ کی زبان شامل ہے۔ اسی لیے ضروری ہے کہ وہ رنگینیٔ بیان، جذباتی اظہار اور حسن آفرینی سے مبرا ہو۔ مگر اعلیٰ ادبی نثر کے لیے حسن آفرینی، اجمال اور جذبہ بھی ضروری ہے۔ اور یہ تینوں خوبیاں سردار جعفری کی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں موجود ہیں۔ یہ ایک خود نوشت ہے۔ جس میں رنگارنگ بزم آرائیوں کی داستان ہے۔ اس کتاب کا آغاز ہی پڑھنے والے کو اس کے حسن اور تاثیر کا احساس دلا دیتا ہے:

"مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرش بریں سے وحی الہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دنیا نظم، افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے۔ اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔"

جس کتاب کا آغاز ہی ان خوبصورت ہاتھوں کی تعریف سے ہو جو تخلیق کرتے ہیں تو سوچئے ان ہاتھوں نے اس کتاب میں کتنے خوبصورت انشائیے تحریر کیے ہوں گے۔ انشائیے چونکہ بیانیہ نثر کے ذیل میں آتے ہیں۔ اس لیے ان انشائیوں میں ہمیں بیانیہ نثر کی بیشتر خصوصیات ملتی ہیں۔ بیانیہ نثر وہ ہے جس میں کسی خاص واقعہ شخص یا شے کا بیان ہو۔ واقعات، اشیا اور اشخاص کا بیان شخصی بھی ہو سکتا ہے اور فرضی بھی۔ بیانیہ نثر کی خوبی یہ ہے کہ واقعات ہوں یا مفروضات۔ بیان تجریدی سے زیادہ حقیقی ہو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ واقعہ نگار صرف اچھا، برا، شاندار، معمولی جیسے مجرد توصیفی الفاظ پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ بلکہ واقعہ یا شے کو اس طرح بیان کرتا ہے جس طرح دیکھا یا سنا ہے۔ اس لیے واقعہ نگار کو تفصیل میں جانا پڑتا ہے اور جزئیات کا بیان اس کے لیے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں سردار جعفری نے اپنی پانچ راتوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"باغوں کے کنارے گزرتی ہوئی ٹھنڈی اور خاموش شاہ نجف روڈ پر جو ہمارے گھر سے بہت دور نہیں تھی۔ ہم سب سے پہلے ایک پولیس سپرنٹنڈنٹ کے گھر پہنچے۔ وہ مجاز کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ اور اس پرچے میں مجاز کی نئی نظم چھپی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب خود تو گھر پر موجود نہیں تھے۔ لیکن ان کے چھوٹے بھائی نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی۔ چائے پینے کے بعد ہم نے سگریٹ جلایا اور ان کو نیا ادب کا پرچہ پیش کیا۔ انہوں نے بڑے شوق سے رسالہ لیا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر حاضر کر دیا۔ ہمارے پاس واپس کرنے کے لیے چھ روپے نہیں تھے۔ انہوں نے پانچ کا نوٹ دیا۔ لیکن ہمارے پاس تو ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے پانچ کا نوٹ بھی واپس لے لیا اور دوسرے دن نوکر کے ہاتھ چار روپے بھیجنے کا وعدہ کر کے ہمیں رخصت کر دیا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔ ان کا یہ فقرہ بڑی دیر تک ہمارے کانوں میں گونجتا رہا۔ 'آپ تینوں کے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے' شام ڈھل کر رات ہو چکی تھی اور فضا میں رات کی رانی کی خوشبو پھیل گئی تھی۔ سڑک سنسان تھی اور میں سبط حسن دونوں خاموش تھے۔ اور مجاز زیر لب گنگنا رہا تھا۔"

لکھنؤ کی پانچ راتیں کی نثر سادہ اور دلکش ہے۔ اس میں خطیبانہ، شاعرانہ اور بیانیہ نثر کی متعدد خصوصیات کے امتزاج نے نثر میں ایک نئی شان اور ایک منفرد انداز پیدا کر دیا ہے۔

سردار جعفری کی نثری تحریروں میں ان کے مضامین بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ خاص طور سے "لمحوں کے چراغ" اور "دیکھو تو کس منزل طوفان سے آئی ہے حیات" بہت اہم ہیں۔ اس میں پانچ ہزار برس کی ہندوستانی تہذیب کی مشترکہ تعمیر کی کہانی ہے۔ جس مضمون کے لیے پانچ ہزار صفحات بھی کم تھے اس کو سردار جعفری نے بیس بائیس صفحات میں بہت خوبصورتی سے قلم بند کر دیا ہے۔ یہ مضامین نثری خوبی "اجمال" کی بہترین مثال ہیں۔

مختصر یہ کہ سردار جعفری ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی نثری تخلیقات تعداد میں کم ہوتے ہوئے بھی بہت اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ ان سے سردار جعفری کی تنقیدی بصیرت کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ ان کی نثری خوبیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ جن کی بنا پر ان کو بہترین نثر نگار قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے ناقدین اور ارباب نظر نے جتنی توجہ ان کی شاعری کی طرف کی اتنی نثر نگاری کی طرف نہیں کی۔ حالانکہ سردار جعفری نے نظم و نثر دونوں کو یکساں کوشش و محنت سے نکھارا اور سنوارا ہے۔ شعری اسلوب کی طرح ہی ان کا نثری اسلوب بھی ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ جو ان کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ ان کے کردار کی صحیح تصویر اور ان کے خیالات و نظریات کا عکس ہے۔ وضاحت، سادگی، استدلال، جوش، ولولہ، لہجہ کا وقار اور بلند آہنگی سردار جعفری کی نثر کا شناخت نامہ ہے۔

☆☆

سید فضل امام رضوی

مجروح: مذہبِ دل کا شاعر

اردو غزل نیم وحشی صنف سخن یا قابل گردن زدنی ہی سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا جادو کل بھی چلتا تھا، آج بھی ہے اور کل بھی جاگے گا۔ آخر وہ کیا اسباب ہیں جن کے باعث سخت ترین مخالفت کے باوصف یہ صنف سخن زندہ اور پائندہ ہے، صرف زندگی اور پائندگی ہی نہیں اردو شاعری کی شناخت بنی ہوئی ہے۔ غزل کے چھیڑنے کی دیر ہے سوز و ساز تو از خود پیدا ہو جاتے ہیں اس لیے کہ اس صنف میں عمر رفتہ، گزشتہ، موجودہ اور مستقبل کی آوازیں کچھ اس طرح مضمر ہو گئی ہیں کہ جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے غزل کی جو روایتی تعریفیں کتابوں اور لغات میں ملتی ہیں وہ ناقص اور ادھوری ہیں یا یوں کہئے کہ فن غزل کی ناواقفیت کا سبب ہیں۔ غزل صرف فنون عشقیات تک محدود نہیں اس میں جہد حیات بھی ہے۔ اس میں زمانے کا ساتھ دینے کا ہنر ہے۔ حیات انسانی کے تغیرات، انقلابات کو آئینہ غزل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اردو میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم نگاری کے رجحان کو تقویت ملی لیکن غزل گوئی کی طرف کم توجہ کی گئی۔ جگر جیسا خالص غزل کا شاعر یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے:

فکر جمیل ذہن پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

چونکہ ترقی پسند شاعر و ادیب مارکس کے جدلیاتی مادی نظریے سے متاثر تھے اس لیے وہ شعری و ادبی نیز فنی نکتہ نظر کے لیے بھی مارکسزم کو ہی بنیاد بناتے تھے۔ حالانکہ ان لوگوں کا کہنا تھا:

"فن کا ارتقا کبھی براہ راست خطوط پر نہیں ہوتا۔ نہ فن لازمی طور پر سماجی تبدیلیوں سے مربوط ہوتا ہے۔ فن کا ارتقا سماجی ارتقا سے کلیتاً ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ نہ ہی معاشی تبدیلیاں فن کے ارتقا پر حتماً اثر انداز ہوتی ہیں۔[1]"

اس کے باوصف ہر مارکسی نقاد، ادیب اور دانشور ادب میں ترقی پسندی کو اشتراکیت سے ربط رکھنا لازمی سمجھتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری جیسے اہم اور معتبر ترقی پسند نقاد نے اس پر اظہار تحیر و استعجاب کیا ہے:

"مارکس کے بعد اس کے شاگرد اس نظریے کو اتنی دور لے گئے کہ اس کا اصل مقصد کچھ سے کچھ ہو گیا۔ آج اشتراکیت ادب سے جو مطالبات کرتی ہے وہ ادب کو ادب نہیں رہنے دے گا۔ اب ادب کو بھی جماعت کا ایک آلہ جنگ سمجھنے کی تحریک ہو رہی ہے۔ ۱۹۳۲ء میں خارکاف کے مقام پر جو اشتراکی کانگریس ہوئی تھی، اس میں جو باتیں طے پائی تھیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

حسن کاری جماعت کا معیار ہے۔ حسن کاروں اور ادیبوں کو انفرادیت ترک کر دینی چاہئے، جمالیات کی اجتماعی تنظیم ہونی چاہئے اور اس کو فوج اور دفاتر کی طرح ایک مرکزی سرکار اور مرکزی قوانین کے ماتحت ہونا چاہئے اور یہ سب اشتراکی جماعت کے ماتحت انجام پائے گا۔

آپ نے سنا! اشتراکیت سپاہیوں کی طرح اپنے ادیبوں اور شاعروں کو بھی سرخ وردی پہنانا چاہتی ہے۔ اس لیے کہ ان سے بھی قواعد کرائی جائے گی۔ لیکن یہ ہونا تھا۔ موسیٰ اور فرعون دنیا میں ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ خالص جمالیت نے جو افراط کی تھی اس کا جواب اس تفریط سے دیا جاسکتا ہے۔[2]"

ترقی پسندوں نے غزل کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ سجاد ظہیر نے اپنے ایک مضمون "اردو شاعری کے چند مسئلے" میں ترقی پسند غزل گو شعرا پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس سلسلے میں سب سے زیادہ ہولناک بات یہ ہے کہ ترقی پسند اور کئی ایسے اچھے شاعروں کی کوششوں کے باوجود جو اپنے کو ترقی پسند کہنا نہیں چاہتے ہماری شاعری میں فی الجملہ اس کا ہلکا پھلکا، بے تہہ، سستا، فرسودہ اور تفریحی پہلو ابھی تک اس کا غالب عنصر ہے اور ہماری بدذوقی کا یہ عالم ہے کہ زیادہ تر لوگ اردو شاعری کے اسی پہلو کو پسند کرتے ہیں۔"[3]

ترقی پسندی کے اس محدود اور انتہا پسندانہ نکتہ نظر کے پیش نظر معین احسن جذبی جیسے شاعر کو اپنے مجموعہ کلام "فروزاں" کی طباعت دوم میں اس امر کا اظہار کھل کر کرنا پڑا:

"ادھر کچھ دنوں سے ترقی پسندوں میں ایک رجحان پیدا ہو گیا ہے جو بڑی حد تک تنگ نظری پر مبنی ہے۔ ہمارے شاعر و ادیب یہ سمجھنے لگے ہیں کہ حسن اور عشق کا ذکر

10-A/1 بینک روڈ، الہ آباد۔ ۲۲۱۰۰۲

ترقی پسندی کے مذہب میں وہ نکتہ ہے جو شاید ہی کھلنا چاہئے۔ ترقی پسندی صرف سیاست کا نام ہے۔ اس کے علاوہ مذہب میں جو چیز بھی آئے گی غیر ترقی پسند ہو گی۔ "۴ؔ

بہر کیف ان سب اختلافات و ترمیمات کے باوجود مجروح تنہا وہ شاعر ہے جس نے غزل کی مشعل کو روشن رکھا ہے اور اس کو "مشعل جاں" بنایا۔ مجروح نے غزل کے مزاج کو بخوبی سمجھا، پرکھا اور برتا ہے۔ وہ غزل کو سہل آفرینی، تہہ داری اور کیفیت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ وہ روح عصر (Spirit of time age) کو بڑے سلیقے سے پیانہ غزل میں ڈھال دیتے ہیں جیسے فرماتے ہیں:

> لہو بہا دو اس مجروح جس میں روح ساعت ہو
> کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے

اردو غزل کے جدید دور میں اقبال جیسا کوئی شاعر تو نہیں ہوا، دراصل اقبال سے جدید غزل کے عہد کی ابتدا ہوتی ہے۔ حالانکہ حالی نے غزل کے کینوس کو وسیع کرنے کی کوشش کی تھی۔ اقبال کے بعد فیض نے اس تحریک کو تقویت عطا کی۔ ان کے یہاں غم دوراں اور غم جاناں کے ارتباط سے جہد حیات کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ جس میں احتجاجی کیفیت نے دل آویزی پیدا کر دی ہے۔ فیض کے یہاں قدیم علائم جدید انداز اور فن سے اپنی پھبن دکھاتے ہیں۔ مجروح نے یہ انداز اقبال اور فیض دونوں سے اخذ کیا ہے اور غزل میں سیاسی اور سماجی شعور کو بطور خاص سمویا ہے۔

مجروح نے فارسی، اردو اور ہندی کے اکابر شعرا سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کا یہ کہنا درست نہیں کہ انہوں نے اچھوتے موضوعات کو اپنایا ہے اور اس کے قبل کسی نے اسے نظم نہیں کیا ہے۔ حالانکہ وہ دعویٰ کرتے ہیں:

> دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
> میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

یہ ان کا صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے جو محتاج دلیل ہے۔ مجروح کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے:

> جلا کے مشعل جاں ہم جنوں صفات چلے
> جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے

دراصل یہ مضمون کبیر کے اس دوہے سے ماخوذ ہے جس میں کہا گیا ہے:

> جو گھر پھونکے آپنے چلے ہمارے ساتھ

یہ اچھوتا مضمون نہیں ہے بلکہ اور بہت سے ہندی، اردو کے شعرا نے اسے بطور خاص اپنے اپنے ڈھنگ سے نظم کیا ہے۔

مجروح کی غزل گوئی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ غزل اور صرف غزل کہتے ہیں جس میں تغزل کا عنصر غالب رہتا ہے۔ میں سجاد ظہیر کے اس نکتہ نظر سے متفق ہوں:

> "یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مضامین کی جدت، ترقی پسند نظریے اور خلوص کے باوجود ان (مجروحؔ) کی غزلوں کا ساز و سامان، الفاظ، تلمیحات، استعارے، کنائے، روایتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جہاں آباد کے شاہی قلعہ کے دیوان خاص کو سرخ پرچموں سے سجا دیا گیا ہے یہ ترقی ہے مگر ایک حد تک ہی۔" ۵ؔ

ترقی پسندوں کی مخالفت کے باوجود مجروح نے جس حد تک غزل کو سنوارا اور نکھارا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے انتہائی جرأت اور بے باکی سے غزل میں ان مضامین کو ڈھالا ہے جو تغیرات اور انقلابات کی آواز کو بلند کرتے ہیں۔ مثلاً

> پکاریے کف قاتل کو اب معالج دل
> بڑھے جو ناخن خنجر، گرہ کشا کہیے
>
> پڑے جو سنگ تو کہیے اسے نوالہ زر
> لگے جو زخم بدن پر اسے قبا کہیے
>
> پلا کر خوں دل کھیتی کو اے شوق چمن بندی
> کف ہر غنچہ میں تقدیر صحرا ہم بھی دیکھیں گے
>
> مجروح مرے ارمانوں کا انجام شکست دل ہی سہی
> جی کھول کے خود پر ہنس نہ سکوں اتنا بھی مجھے غم کیا ہو گا
>
> جفا کے ذکر پہ تم کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
> تمہاری بات نہیں بات ہے زمانے کی
>
> سنگ تو کوئی بڑھ کے اٹھاؤ شاخ ثمر کچھ دور نہیں
> جس کو بلندی سمجھے ہو ان ہاتھوں کی کوتاہی ہے

مجروحؔ کی زبان و لفظیات کا سرمایہ زیادہ نہیں وہ پرگو اور بسیار گو شاعر بھی نہیں ہیں۔ جنون، ستم، خنجر، تیغ، تیغ قلم، جبریل جنوں، مقتل، ستون دار، اندھیری رات، فراز دار، کلاہ کج، بانکپن، زنجیر، پیاس، صحرا، ظل الٰہی، جبر، دہان زخم، سیاہ رات، راہبر، راہزن، آتش و آہن، قدح اران گل، حریفان بہار، طوفان، ساحل، سیر ساحل، تیغ ستم، زنداں، جبر سیاست، مجبور فغاں، زخموں کی مہک، داغوں کا دھواں، صیاد، سایہ زنداں، وغیرہ وغیرہ الفاظ و تراکیب کو مجروح نے اپنی غزلوں میں فنی التزامات کے ساتھ نظم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ الفاظ و تراکیب پہلی بار استعمال نہیں ہوئے ہیں مگر انہوں نے بڑے سلیقے اور ہنر سے اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے۔

اردو غزل کے مزاج میں تلون کی زیادتی ہے یہ تلون مزاجی معشوق سے بھی زیادہ ہے لیکن مجروح نے غزل کی تلون مزاجی کو زمانہ کے نشیب و فراز سے ہم آہنگ کر کے ایک منفرد لب و لہجہ عطا کیا ہے یہ خوبی ان کی غزل گوئی کو سب سے نمایاں اور ممتاز کرتی ہے۔

صنف غزل کے ذیل میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ کچھ آشنائے غزل اسے عشق حقیقی اور عشق مجازی کے خانوں میں منقسم بھی کرتے ہیں۔ ہمارے قدیم تذکرہ نگاروں نے اس تقسیم کو بطور خاص برتا ہے۔ دور جدید میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے "اردو غزل" میں اس تقسیم کو روا رکھا ہے۔ لیکن ڈاکٹر سید عبداللہ اس تفریق و تقسیم کو جائز تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ ان کا نکتہ نظر ہے کہ اپنی "اصل" کے اعتبار سے عشق کی سب صورتیں مجازی ہوتی ہیں۔ جس چیز کو عرف عام میں عشق حقیقی کہا جاتا ہے وہ عشق مجازی کی ہی ایک صورت ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے کہ خواہ عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی، دونوں کی اصل عشق ہے اور عشق کا تعلق جذبات سے ہے۔ جب جذبہ ایک ہے تو پھر اختلاف کا ہے کا۔ لیکن جذبہ میں دو مدارج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ ایک وہ جذبہ جس میں معشوق ایک صنم کے طور پر عاشق کا پرتو دکھاتا ہے

صاحبِ عاشق خود فریفتگی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ دوسرا جذبہ وہ ہے جب جہاں کا فر صنم عاشق کے جذبہ عشق کو وسعتیں عطا کرتا ہے اور اس کے پر تو کو ہر آئینے میں جھلکتا ہے۔

مجروح نے غزل کے ان دونوں رجحانات کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

قطار شیشہ ہے یا کاروانِ ہم سفراں
خرام جام ہے یا جیسے کائنات چلے

بلا ہی بیٹھے جب اہل حرم تو اے مجروح
بغل میں ہم بھی لئے اک صنم کا ہات چلے

وہ تو کہیں ہے اور مگر دل کے آس پاس
پھرتی ہے کوئی شے نگہِ یار کی طرح

ہمیں شعور جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
نگاہ بن کے حسینوں کی انجمن میں رہے

تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

جنہیں سب سمجھتے ہیں مہر و مہ نہ ہوں صرف چند نقوش پا
جسے کہتے ہیں کرۂ زمیں، فقط ایک سنگِ سفر نہ ہو

ترے پا زمیں پہ رکے رکے، ترا سر فلک پہ جھکا جھکا
کوئی تجھ سے بھی ہے عظیم تر، یہی وہم تجھ کو مگر نہ ہو

مجروح نے غزل کے کلاسیکی مزاج کو بطور خاص برتا ہے لیکن سماجی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر اس کی رمزیت کو مزید تہہ دار بنادیا ہے۔ ہمارے بعض ناقدین اس رمزیت اور استعاریت میں مجروح اور فیض کو ایک ہی خانے میں رکھتے ہیں یا اکثر فیض کا اثر قرار دیتے ہیں حالانکہ مجروح اور فیض میں لہجے کا بڑا واضح فرق نمایاں ہے۔ مجروح کی غزل ہماری کلاسیکی غزل اور اس کی شاندار روایت سے تعلق خاطر رکھتی ہے جب کہ فیض کی غزلوں میں جدید اسلوب کی نمایاں کھنک اور دھمک ہے۔ مجروح کے یہاں تیقن اپنی حد کمال تک ہے جب کہ فیض کے یہاں تشکیک کا پہلو نظر آتا ہے۔ مجروح کا جنونِ دل صرف اک گل پیرہن تک محدود نہیں۔ ملاحظہ ہو:

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے
کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تیری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوشِ بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان یہ بلندی
یہ رکتے ہوئے عمامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

ترے خانماں خراموں کا چمن نہ کوئی صحرا
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہے دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

بچالیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند غزل میں بھی مجروح نے اپنی علیحدہ راہ نکالی، انہوں نے غزل کی قدیم روایت سے کسبِ فیض بھی کیا ہے اور اقبال کی غزل کے آہنگ کو اپناتے ہوئے اپنا ایک نیا رنگ پیدا کیا ہے جس میں سیاسی روپ نے بڑی برجستگی اور دلکشی کا نظارہ پیش کردیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

ہوئے ہیں قافلے ظلمت کی وادیوں میں رواں
چراغ راہ کئے خوں چکاں جبینوں کو

تجھے نہ مانے کوئی تجھ کو اس سے کیا مجروح
چل اپنی راہ بھٹکنے دے نکتہ چینوں کو

مجروح نے اپنے نکتہ چینوں کی بھی پرواہ نہیں کی بلکہ اپنی راہ چلتے رہے۔ یہی ان کا البیلا پن ہے جس سے اردو غزل ایک نئے بانکپن سے آشنا ہوئی۔ ان کا سرمایہ شاعری کم ہی سہی لیکن اس کمیت میں کیفیت کے دریاؤں کی روانی، آبشاروں کا ترنم، چٹانوں کی مضبوطی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی بھر غزل اور صرف غزل کے اسلوب پہ فریفتہ رہے۔ نگاہِ غزل کا جادو ان کے شاعرانہ افکار پر سر چڑھ کے بولتا رہا۔ خود مجروح کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے:

مجھے نہیں کسی اسلوبِ شاعری کی تلاش
تری نگاہ کا جادو مرے سخن میں رہے

دراصل مجروح کا اسلوب غزل گوئی بھی کسی غیر کے اسلوب کا رہین منت نہیں۔ ان کا مسلک و مذہب بھی کسی کا پابند نہیں بلکہ وہ مذہب دل کے شاعر ہیں اور اس کی آگہی انہیں جبریل جنوں نے وحی الٰہی کے طور پر عطا کی ہے:

مجھ سے کہا جبریل جنوں نے یہ بھی وحی الٰہی ہے
مذہب تو بس مذہب دل ہے باقی سب گمراہی ہے

حواشی

۱ The non interchange ability of the Arts in Arts and Society by A. Zib- page 25

۲ ادب اور زندگی، مجنوں گورکھپوری، دانش محل لکھنؤ ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۸۔۱۹

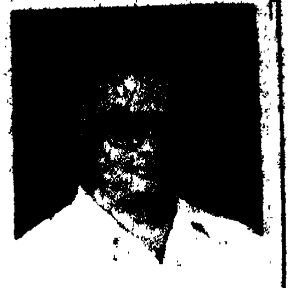
۳ مضامین سجاد ظہیر۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۷۹ء صفحہ ۹

۴ دیباچہ "فروزاں" طباعت دوم، نومبر ۱۹۵۱ء

۵ مضامین سجاد ظہیر۔ صفحہ ۱۱

٭٭

ڈاکٹر وہاب قیصر



ماحولیات

تحقیق کے تناظر میں

[illegible] انسان معیاری رہن سہن، تیز رفتار ذرائع حمل و نقل اور نت نئے مواصلاتی نظاموں کے حصول کے لئے برسہا برس سے تحقیق و اختراع میں مشغول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاور اور اسٹیل پلانٹس، پٹرولیم ریفائنریز، کیمیائی اشیا اور کھاد کے کارخانے، کپڑا، کاغذ، گودے کی ملیں اور دیگر روز مرہ استعمال کی چیزوں کی فیکٹریوں کا قیام عمل میں لایا جاسکا۔ ان صنعتوں کا قیام جہاں صنعتی شہروں کے بسائے جانے کا موجب بنا ہے وہیں ان سے خارج ہونے والے فاضل مادے ہوا، پانی اور مٹی میں شامل ہو کر سرسبز و شاداب، فرحت بخش و خوشگوار اور پر لطف و پر سکون ماحول کو آلودہ کرنے کا سبب بنے ہیں۔ اس طرح شہروں میں فضائی، آبی اور خاکی آلودگی کے ساتھ ساتھ صوتی اور شعاعی آلودگی جیسے ماحولیاتی مسائل پیدا ہوگئے۔

دور جدید میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے ثمرات کو عام انسان تک پہنچانے کے لئے سائنس دانوں کو جہاں کافی جتن کرنے پڑے ہیں وہیں ماحول کو مکدر کرنے والی آلودگیوں کی وجوہات جاننے، شہریوں پر ان کے مضر اثرات کا پتہ لگانے اور ان کے تدارک کے لیے انہیں شبانہ روز مصروف کر دیا ہے۔ حالیہ تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ فیکٹریوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھویں سے کہیں زیادہ سڑکوں پر دوڑنے والی موٹر گاڑیاں فضا کو آلودہ کرتی ہیں۔ فضائی آلودگی جو ماحولیاتی سائنس کا ایک بہت ہی سنگین مسئلہ ہے، اس کے ذمہ دار اجزا گرد، کاربن مونو آکسائیڈ، گندھک، نائٹروجن کے آکسائیڈس اور مختلف ہائیڈرو کاربن پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ اجزا نہ صرف سانس کی نالیوں، پھیپھڑوں اور خون میں داخل ہو کر شہریوں کو مختلف بیماریوں میں مبتلا کرتے ہیں بلکہ شہروں کی بلند و بالا خوبصورت عمارتوں اور تاریخی یادگاروں کی ہیئت بھی بگاڑ دیتے ہیں۔ چنانچہ گرد سانس کی نالیوں کو متاثر کر کے سردی، کھانسی اور الرجی پیدا کرتی ہے۔ اگر وہ دھاتی ذرات پر مشتمل ہو تو اور بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً سیسہ کے ذرات پر مشتمل گرد خون کو زہریلا کر دیتی ہے اور جسم میں خون پیدا کرنے کی صلاحیت کو ختم کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے شہریوں کی انتظامی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے اور ان کے حافظے میں کمی واقع ہوتی ہے۔ بچوں کی صحت کے لئے سیسے پر مشتمل گرد کافی حد تک نقصان دہ ہوتی ہے۔ وہ ان کے دماغی خلیوں کو متاثر کر کے ان میں سوچنے، سمجھنے اور سیکھنے کی صلاحیت گھٹا دیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ذہنی معذوری بھی پیدا کرتی ہے۔ کاربن مونو آکسائیڈ جیسی زہریلی گیس سے اگر فضا آلودہ ہو تو وہ آکسیجن کی جگہ خون میں خود شامل ہونے لگتی ہے۔ جس سے اچھا خاصا صحت مند انسان بھی کند ذہنی، سستی اور تھکان کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص پہلے ہی سے خون کی کمی یا دل کا مریض ہو تو کاربن مونو آکسائیڈ اس کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ فضا میں اگر سلفر ڈائی آکسائیڈ ہو تو حلق میں خراش، آنکھوں میں جلن اور سانس میں گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ نائٹروجن ڈائی آکسائیڈ کی صورت میں فلو، سانس کی نالیوں اور پھیپھڑوں میں ورم جیسی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ فضا میں آلودہ ہائیڈرو کاربن مرض کینسر میں مبتلا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

جب کبھی ہم فضائی آلودگی کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری توجہ صرف صنعتوں اور موٹر گاڑیوں سے ہونے والی آلودگی پر مرکوز ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں کبھی ہم اپنے گھروں اور دفتروں کی فضا کے بارے میں نہیں سوچتے۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ سب سے زیادہ آلودہ مقامات عمارتوں کے وہ اندرونی حصے ہوتے ہیں جنہیں رہائش یا دفتری امور کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور جہاں لوگوں کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرتا ہے۔ اس بات کا بھی پتہ چلا ہے کہ عمارتوں کے باہر کی بہ نسبت ان کی اندرونی فضا میں آلودگی پیدا کرنے والے اجزا زیادہ جمع ہوتے ہیں۔ کوئلے کی انگیٹھیاں، کیروسین کے چولہے، الیکٹرک جنریٹرس، ریفریجریٹرس اور ایئر کنڈیشنڈ سسٹم کی گیس اور تمباکو کا دھواں وغیرہ عمارتوں کی اندرونی فضا کو آلودہ کرنے کے اہم ذرائع ہوتے ہیں۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ ان عمارتوں میں رہنے والے یا ان میں واقع دفاتر میں کام کرنے والے اکثر افراد مستقل طور پر کسی نہ کسی عارضہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ جیسے سر درد، آنکھوں میں جلن، اعضا شکنی، کھانسی، زکام وغیرہ۔

حالیہ تحقیق کی روشنی میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ فضائی آلودگی، بارش اور برف باری میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ آلودگی پیدا کرنے والے ذرات، بادلوں کو بارش کے قطروں میں یا برف کے گالوں میں تبدیل ہونے نہیں دیتے۔

پرنسپل ممتاز کالج، ملک پیٹ، حیدر آباد۔۳۶

فضائی آلودگی اور بارش میں پائے جانے والے تعلق پر ماہرین کے درمیان کئی سال سے بحث جاری تھی۔ بیشتر ماہرین کا خیال تھا کہ فضائی آلودگی، بارش کے لئے معاون ثابت ہوتی ہے جو آخر کار غلط ثابت ہوا۔ پچھلے دس سال میں چینی ایئرپورٹ پر کہرا چھا جانے کے واقعات میں بہت زیادہ تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ جس کے لئے ایئرپورٹ سے قریب موٹر گاڑیوں کی نقل و حرکت اور صنعتی ادارے ذمہ دار ہیں۔ کہرا کے چھا جانے کے واقعات کی کثرت ایئرپورٹ پر ہوابازی کے لئے ایک مستقل مسئلہ ثابت ہو رہی ہے۔ جس کی بنا پر جہازوں کی اڑان میں تاخیر عمل میں آرہی ہے اور لینڈ کرنے والے جہاز کے رخ کو موڑ دینا پڑ رہا ہے۔

سطح زمین سے ۲۵ تا ۳۰ کلو میٹر دور فضا میں بہت زیادہ مقدار میں اوزون گیس پائی جاتی ہے جو اوزون کی پرت کہلاتی ہے۔ اوزون کی یہ پرت زمین کی تمام مخلوقات کے لئے باعث نعمت ہے۔ اس کے بغیر زمین پر زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسی کی بدولت سورج سے آنے والی طاقتور بالا بنفشی شعاعیں (UV-Radiations) سطح زمین تک پہنچ نہیں پاتیں۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ کلورو فلورو کاربن کی وجہ سے اوزون کی پرت میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ یہ وہ مرکبات ہیں جنہیں ہم روزمرہ استعمال کی مختلف چیزوں اور صنعتوں میں بروئے کار لاتے ہیں جیسے ریفریجریٹرس، ایئر کنڈیشنرس، Aerosol Spray، ڈرائی کلیننگ، پلاسٹک فوم کی تیاری، کیمیائی اور جراثیم کش مرکبات اور دواؤں کی تیاری، الیکٹرانکس آلات کی صفائی اور سوپر سونک طیاروں کی اڑان قابل ذکر ہیں۔ اوزون کی پرت میں کمی اس میں شگاف پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے جس کے نتیجہ میں لاتعداد لوگ Sun burn، جلدی کینسر اور موتیابند کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جانوروں اور پودوں کی نشو و نما متاثر ہو سکتی ہے۔ آبی جاندار، مچھلیاں اور ساحل سمندر پر رہنے والے پرندوں کی نسلیں تباہ ہو سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ سمندری جانداروں کی غذائی ناپید ہو سکتی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ تباہی کا یہ سلسلہ انسانوں تک کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

اعداد و شمار شاہد ہیں کہ ماحولیاتی تپش میں آئے دن تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ جو اوزون کی پرت میں کمی کا نتیجہ ہے۔ پچھلے پچیس سال میں تپش میں اضافے کی رفتار دو ڈگری سلسیس فی صدی رہی ہے۔ تپش میں یہ اضافہ اکیسویں صدی کے لئے قائم کردہ اندازے سے بھی زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۹ء کا شمار اب تک کے گرم ترین پانچ سالوں میں رہا ہے اور وہ بیسویں صدی کا دوسرا گرم ترین سال تھا۔ امریکی ادارہ NASA کے سٹیلائیٹ نے ۹ ستمبر ۲۰۰۰ء کو انٹارکٹیکا کے اوزون کی پرت میں بہت بڑے سوراخ کے پائے جانے کی اطلاع دی ہے جو ماحولیاتی مسئلہ Global Warming کے لئے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہر سال موسم بہار میں انٹارکٹیکا کے اوزون کی پرت میں سوراخ پیدا ہوتے ہیں۔ تحقیقی نتائج کی روشنی میں اس بات کی پیش قیاسی کی جارہی ہے کہ اکیسویں صدی، زیادہ گرم دن، سرد راتیں، موسلادھار بارش، برف باری اور باڑھ آنے کے واقعات سے بھری ہوگی۔

دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے قدرتی، حیاتیاتی اور انسانی [illegible] مختلف گیسوں کا اخراج کرتے ہیں وہ بارش کے پانی سے [illegible] سلفیورک ترشہ اور نامیاتی ترشے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ [illegible] تیزاب سے آلودہ ہو جاتا ہے اور یہ تیزابی بارش کہلاتی ہے۔ [illegible] بارش والی اصطلاح تیزابی برف باری، تیزابی ژالہ باری اور تیزابی کہر کے [illegible] مستعمل ہوتی ہے۔ جھیلوں میں مچھلیوں کی آبادی میں [illegible] کی [illegible] کو ظاہر کرتا ہے کہ وہاں پر ہونے والی بارش میں تیزابیت زیادہ ہے۔ [illegible] بارش کی صورت میں مچھلیوں میں انڈے دینے کی اور ان کے بچوں کے زندہ رہنے کی صلاحیت کافی گھٹ جاتی ہے۔

ہماری صحت پر تیزابی بارش کے ممکنہ اثرات راست زہر کے طور پر یا بالواسطہ سبزیوں، اجناس کے پودوں، مچھلی اور جھینگوں وغیرہ کے ذریعہ مرتب ہوتے ہیں۔ تیزابی بارش نہ صرف انسانی جلد بلکہ سر کے بالوں کی جڑوں پر بھی اثر انداز ہو کر نقصان پہنچاتی ہے۔ نباتات پر اس کے اثرات دو مختلف طریقوں سے رونما ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ تیزابی بارش پتوں کی سطح کو متاثر کرتی ہوئی پودوں کو نقصان پہنچاتی ہے اور دوسرے کھیت کی مٹی کو متاثر کرکے پودوں کی افزائش پر اثر انداز ہوتی ہے۔ درختوں کی جڑیں پانی میں تیزاب کی وجہ سے ایسی کمزور ہو جاتی ہیں کہ وہ تیز ہواؤں میں جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں۔

تحقیق نے اس بات کو واضح کردیا ہے کہ ہر تیزابی بارش نقصاندہ نہیں ہوتی۔ اس کے اثرات کا انحصار جن اجزا پر ہوتا ہے، ان میں بارش کی تیزابیت کا تناسب، بارش کی مقدار اور اس کے برسنے کے مقام پر موجود معدنیات شامل ہیں۔ اگر بارش کے پانی میں تیزاب کم ہو اور کم مقدار میں وہ ایسے مقام پر برس رہی ہو جہاں کی معدنیات اس کے تیزاب کی تعدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں تو وہاں تیزابی بارش کا اثر قابل نظر انداز ہوگا۔

فیکٹریوں اور ملوں سے ٹھوس اور سیال مادے جب نالیوں کے ذریعہ دریاؤں میں جاملتے ہیں یا زرعی مقاصد کے لئے ڈالی گئی کھاد، چھڑکاؤ کی ہوئی جراثیم کش دوائیاں اور فضا میں پائے جانے والے مرکبات بارش کے پانی کے ساتھ بہہ کر دریاؤں میں شامل ہوتے ہیں تو ان کا پانی آلودہ ہو جاتا ہے۔ یہ پانی نہ شہریوں کے استعمال کے لائق رہتا ہے اور نہ اس کو آبپاشی اور دیگر صنعتوں کے لیے کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اگر آلودہ پانی کو پینے کے استعمال میں لایا جائے تو کئی ایک بیماریاں لاحق ہوتی ہیں جن میں ہیضہ، ٹائیفائیڈ، جگر اور پیٹ کی بیماریاں قابل ذکر ہیں۔ اس پانی میں مچھلیوں کے [illegible] آبی پودوں اور جانوروں کا زندہ رہنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ تحقیق کے ذریعہ [illegible] سامنے آئی ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں سمندری پانی کے آلودہ [illegible] دنیا بھر میں تقریباً ایک ہزار آبی پودوں اور جانداروں کی نسلیں [illegible] سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے پہلی مرتبہ اس بات کا پتہ [illegible] (Methane) گیس سے متاثر ہونے [illegible]

جانے والے کئی جانداروں کے ناپید ہونے کا سبب بنی ہے۔ اس کے علاوہ سالہا سال سے کیمیائی اشیاء کے ذخیرہ کرنے کی حوض اور پائپ لائن کی شگافوں سے ان کے رسنے کی وجہ سے زیر زمین آبی ذخائر کا پانی متاثر ہو رہا ہے۔ ماحولیات کے ماہرین نے حال ہی میں اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے حیاتیاتی تعاملات پر مشتمل ایک حل ڈھونڈ نکالا ہے۔

یورپی ماہرین کی اطلاع کے بموجب پانی کے جہازوں سے نکلنے والا گندھک پر مشتمل دھواں آئے دن تیزابی بارش برسانے کی وجہ بنتا جا رہا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۲۰۱۰ء تک زمینی ذرائع سے فضا کے آلودہ ہونے والی گندھک کا ۳۰ فیصد ان جہازوں سے ہی آلودہ ہوگا۔ دنیا میں اب تک جہاز رانی کی وجہ سے ہونے والی آلودگی کے بارے میں کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ یورپی جہازوں سے ہونے والی یہ آبی آلودگی ۱۵ میگاواٹ کے ۹۰ پاور پلانٹس سے ہونے والی آلودگی کے برابر ہوتی ہے۔

خاکی آلودگی بظاہر زیادہ نقصان دہ محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن موٹر گاڑیوں کی آمد و رفت سے جب یہ آلودگی گرد کی شکل میں فضا میں شامل ہوتی ہے یا زمین میں جذب ہو کر زیر زمین آبی ذخائر میں شامل ہوتی ہے تو وہ مضر اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کھیت کی مٹی دھات ذرات سے آلودہ ہو تو اس میں اگائی جانے والی سبزیاں اور پھل آلودگی کا شکار ہو جاتے ہیں جن کے استعمال سے ہماری صحت متاثر ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے ختم پر انفارمیشن ٹکنالوجی اور اس کے لئے درکار سافٹ ویئر کی بڑھتی ہوئی مانگ، ماحولیات کو نقصان پہنچائے بغیر عمل پیرا ہونے کو بہت زیادہ شہرت بخشی ہے۔ لیکن اس ٹکنالوجی کا ہارڈ ویئر تصویر کا دوسرا ہی رخ پیش کرتا ہے۔ کیونکہ کمپیوٹر اور اس سے متعلق مختلف آلات اور کل پرزے بنانے کے دوران ماحولیاتی آلودگی کے ذرائع قابل تشویش ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ۲۵ کلو گرام وزنی کمپیوٹر کی تکمیل کے لئے ۶۳ کلو گرام ناکارہ مادہ خارج ہوتا ہے۔ جس میں ۲۲ کلو گرام زہریلا مادہ ہوتا ہے جو ماحول کو سنگین طور پر آلودہ کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ ان حقائق کے پس منظر میں ماہرین ماحولیات نے انفارمیشن ٹکنالوجی کو فروغ دینے والی تمام ریاستوں کو یہ انتباہ دیا ہے کہ وہ ہارڈ ویئر کی صنعتوں کے مقامات پر کڑی نظر رکھیں اور آلودگی کنٹرول کرنے والے ایک بااثر نظام سے استفادہ کریں۔

صوتی آلودگی یا شور آج کی شہری زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکا ہے جو شہریوں پر کئی ایک مضر اثرات کا موجب بنتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی سماعت عارضی یا مستقل طور پر معدوم ہو جاتی ہے۔ سانس پھولنے لگتی ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ نبض تیز چلنے لگتی ہے۔ علاوہ ازیں ہائی بلڈ پریشر، ہائپر ٹینشن، ہارٹ اٹیک اور السر جیسی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ دوسرے اثرات میں متلی، چکر، تھوک کا زیادہ بہنا اور آنکھوں کی پتلیوں کا پھیلنا شامل ہیں۔ ایسا شور جس سے ہم مانوس ہو جاتے ہیں وہ بھی مستقل خرابی لے آتا ہے۔ جس میں گھنٹی بجنا، کان اور حلق کی خرابیاں قابل ذکر ہیں۔ [illegible] شور کی وجہ سے [illegible] اور انتہائی خوف طاری [illegible] نکلنے والی گھن گرج آواز، ایئرپورٹ پر کام کرنے والے انجینئروں کے سینے میں سخت درد پیدا کرتی ہے۔

ضعیف، بیمار، ذہنی توازن کھوئے ہوئے لوگ اور چار چھ سال تک کی عمر کے بچے شور کے لئے بہت حساس ہوتے ہیں۔ جب وہ سو رہے ہوں تو شور ان کی نیند میں مسلسل خلل انداز ہوتا ہے۔ حاملہ عورتوں پر کئے گئے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ بلند آواز کا شور نہ صرف پیٹ میں بچوں کے دل کی دھڑکن کو بڑھاتا ہے بلکہ ان کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچاتا ہے۔ شدت کا شور صحت کو نقصان پہنچانے کے علاوہ ہمارے معمولات میں خلل انداز بھی ہوتا ہے۔ یہ ہمیں بے چین کر دیتا ہے اور ہمارے کام کرنے کی صلاحیت کو گھٹا دیتا ہے۔ جانوروں پر اس کے مضر اثرات ہوتے ہیں اور یہ بے جان عمارتوں اور اسٹرکچرز کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

ماہرین نے پتہ لگایا ہے کہ برف باری بھی بالواسطہ طور پر صوتی آلودگی کا موجب بنتی ہے۔ خاص کر ایسے علاقوں میں جہاں آبی ذخائر موجود ہوں۔ چنانچہ آبی ذخائر پر جب برف باری ہوتی ہے تو برف کے گالوں میں پائے جانے والی ہوا کی وجہ سے پانی میں بے شمار ہوائی بلبلے پیدا ہوتے ہیں جن کے پھٹنے سے آواز پیدا ہوتی ہے جو صوتی آلودگی پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

شور کے مضر اثرات کو کم کرنے کی سمت میں کی گئی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ دفتروں کے شور میں ۲۰ ڈی سی بل اکائیوں کی کمی کام کی صلاحیت کو ۹ فیصد کی حد تک بڑھاتی ہے اور عملے کی تحریر میں ۳۰ فیصد املا کی غلطیوں کا تدارک کرتی ہے۔ ماہرین ماحولیات نے بہت زیادہ آواز پیدا کرنے والی صنعتوں میں کام کرنے والوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ مشینوں پر روزانہ صرف آٹھ گھنٹے کام کریں اور بقیہ وقت آرام کرنے میں گزاردیں۔ صنعتوں کے مالکان اور انجینئروں کو بھی انہوں نے یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے مشینوں اور مشینی نظاموں میں ساؤنڈ پروفنگ کا انتظام کریں۔

نیوکلیئر پاور اسٹیشن کے ناکارہ تابکار مادوں سے نکلنے والی خطرناک شعاعوں سے انسان اور دیگر جانداروں کو محفوظ رکھنے کے لئے انہیں زیر زمین محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ دیکھا گیا ہے کہ ان ناکارہ مادوں سے زمین کے مختلف حصے آلودگی کا شکار ہو کر شعاعی آلودگی پیدا کرتے ہیں۔ اس سمت میں ہنوز تحقیق جاری ہے۔ غرض ماحولیاتی سائنس کے سنگین مسائل کے حل کے لئے اتنی ہی تحقیق کی ضرورت پیش آرہی ہے جتنی کہ قدرتی وسائل کو انسانیت کے لئے بروئے کار لانے میں درکار ہوتی ہے۔

☆☆

☆ تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں لازماً ارسال کریں۔ کتاب کے ساتھ تبصرہ نہ بھیجیں۔
☆ ضروری نہیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع ہو۔ تقاضہ کرکے شرمندہ نہ کریں۔
☆ غیر مطبوعہ مضامین کی واپسی کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

ستیہ پال آنند

میں اور وپنگ ولّو

بارش ہے، اور میں وپنگ ولو کے ساتھ جڑا بیٹھا ہوں
ٹپ ٹپ نیر بہاتی ولو اور میں ——— دونوں
بچپن سے اک سنگ رہے ہیں
جب وہ ننھا سا پودا تھی / اور میں ننھا سا بالک تھا
اکثر میں اور ولو بچپن کی باتوں میں کھو جاتے تھے
بارش کب ہو گی؟ وہ مجھ سے
ہوا کی شائیں شائیں کرتی بولی میں ہر روز پوچھتی
اور میں اکثر بادل کے بھیگے آنچل کو
بالک ہٹ سے کھینچ کھینچ کر
اس کے سر پہ لے ہی آتا
ٹپ ٹپ رونے لگتی ولو
اس کا رونا اس کی ہنسی تھی!

آج میں ستر سال کا بوڑھا
اور وہ ستر سال کی بوڑھی
پھر اک بار جو مل بیٹھے ہیں، تو وہ خوش ہے
چھتری، چلمن، سائبان سی وپنگ ولو
بارش کی بوچھار کے نیچے
ٹپ ٹپ آنسو روتی روتی
ہنستے ہنستے جھوم رہی ہے

میں لیکن وامانده، بے دم
اعضا شکنی کی الجھن کا مارا بوڑھا
اس کی جانب جھک کر دھیرے سے کہتا ہوں
ولو، تم تو بالکل ویسی ہی شاداب نظر آتی ہو
جیسے بچپن میں ہوتی تھیں
اور میں اک ہلکان کھلاڑی
دنیا کی ہر دوڑ میں اول آتے آتے
پاؤں زخمی کر بیٹھا ہوں

پھولا سانس، دھڑکتا دل، ہاتھوں میں رعشہ
میں تو ولو، انتم دوڑ میں ہار گیا ہوں!

اس کے آنسو
اپنی ٹپ ٹپ کے سرگم میں
مجھ سے گویا پوچھ رہے ہیں
دنیا کی ہر دوڑ میں اول آنا ہی کیا اہم تھا اتنا
جس کی خاطر تم نے خود کو مار دیا ہے؟
میں تو اپنی جڑیں زمیں میں گاڑے گاڑے
ایک جگہ ہی پھلتے پھولتے بڑی ہوئی ہوں
بارش جب ہوتی ہے، میں روتی ہنستی ہوں
مجھے کسی بھی دوڑ میں اول آنے کی تشویش نہیں ہے
اب بھی آخر کیا بگڑا ہے؟
آ ہی گئے ہو تو پھر مجھ سے ناطہ جوڑو
آؤ ہم دونوں پھر مل کر
بالک ہٹ سے بادل کے آنچل کو پکڑیں
بارش لائیں!
بارش ہے، اور میں وپنگ ولو کے ساتھ جڑا بیٹھا ہوں!

(۲)

ہنسنا رونا ایک عمل کے دو پہلو ہیں
ٹپ ٹپ روتی وپنگ ولو ہنستے ہنستے یہ کہتی ہے
اپنے چہرے سے ہنسنے کی پرت اٹھاؤ
نیچے گالوں پر آنسو بہتے دیکھو گے
غم اور خوشی کو ایک سا جانو
دل کا فولادی مادہ پگھلاؤ ——— اس کو موم بناؤ
آنکھوں میں آنسو چھلکاؤ!
تم نے ولو، میں کہتا ہوں
یہ پیچیدہ باتیں، ایسی گہری رمزیں

ایک جگہ ہی کھڑے کھڑے کیسے سیکھی ہیں؟
میں تو ولو
رونے کو کائر لوگوں کا کام سمجھ کر
مرد آدمی، ساری عمر نہیں رویا!!

اسی لئے تو مرد آدمی
ولو روتے ہنستے پھر کہتی ہے
تم کھل کر ہنس سکنے کے نااہل رہے ہو!!

(۳)

اوپر اٹھنا، آسمان کو چھونے کی کوشش میں گرنا
کندھوں سے دو پنکھ باندھ کر
سورج تک اڑ سکنے کی بیکار سعی میں
واپس دھرتی پر گر جانا
محل ماڑیوں کو آکاش کی سرحد تک اونچا لے جانا
چاند ستاروں کے خوابوں میں غلطاں رہنا
میناروں کو بادل کی اونچائی تک پہنچانے میں اک عمر گنوانا
——— ولو روتے ہنستے روتے یہ کہتی ہے
تم انسانوں کا شیوہ ہے!
پیڑ، گھنے، چھتنار
جڑیں پیوست کئے اونچے اٹھتے ہیں
لیکن اونچائی تک جا کر
اپنی شاخوں کو لٹکا کر
پھر دھرتی کو چھونے کی کوشش کرتے ہیں
میں بھی اپنی
گھنی گھنیری شاخیں، باہیں
دھرتی پر واپس پہنچا کر خوش رہتی ہوں
میرے گر جانے کا کچھ امکان نہیں ہے!
سچ کہتی ہو! رشک بھری نظروں سے اس کی جانب
دیکھ کے میں کہتا ہوں!

معرفت ایس ایس کوہلی، کوٹھی نمبر ۵۶۶، فیز۔۱، موہالی، پنجاب۔۱۶۰۰۵۵

غزلیں

محسن زیدی

کچھ نہ اچھا نہ کچھ خراب لگا
مجھ کو سب کچھ بس ایک خواب لگا

اس نے کھولے جو لب تو اس کا سخن
پنکھڑی پنکھڑی گلاب لگا

اس کی نظروں کے صرف تیر نہ گن
میرے زخموں کا بھی حساب لگا

جستہ جستہ مطالبہ جو کیا
وہ ورق در ورق کتاب لگا

اس کی باتوں میں وزن تھا لیکن
اس کا لہجہ بہت خراب لگا

ہم کہیں بھی نہ ہو سکے سیراب
ہر سمندر ہمیں سراب لگا

وہ کھلے دل سے کب ملا محسن
اس کے ملنے میں اجتناب لگا

(۲)

ہم بھی آکر کہاں ہوئے آباد
جہاں آدم نہ کوئی آدم زاد

خوش ہوں پوری ہوئی تمہاری مراد
میری جانب سے بھی مبارکباد

عمر بھر ہم رہے ہیں تیشہ زن
یوں ادا کی ہے سنتِ فرہاد

کہہ دیا ہم نے جو بھی کہنا تھا
اب کریں آپ بھی تو کچھ ارشاد

کچھ دوانے یہاں بھی رہتے تھے
یہ خرابہ بھی تھا کبھی آباد

اس سفر میں نہیں ہے کوئی ساتھ
ہم سفر ہے تو بس مرا ہم زاد

جو بھی جس پر یہاں گزر جائے
داد کوئی یہاں نہ ہے فریاد

دل کا احوال کیا کہیں محسن
یہ کبھی شاد ہے کبھی ناشاد

۱۸/۵۳۔ اندرا نگر، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۶ (یوپی)

صبا اکرام

ہوئی ہے رات چپ تو یہاں [illegible] بولتا ہے
سر سر کی چاپ سے صبا [illegible] بولتا ہے

ہوتا ہے یوں بھی چپ ہو اگر صاحب لباس
تن کا حسین و قیمتی کم خواب بولتا ہے

سب خیریت ہے خط میں بھلا اور کیا لکھوں
ہاں، گھر کا سونا پن تمہیں آداب بولتا ہے

سرحد عبور لوگ حویلی کے کر گئے
چیلوں کا غول اب سر محراب بولتا ہے

کب گم ہوئی ہے ماضی میں تہذیب کی صدا
وارث کی ہیر میں صبا پنجاب بولتا ہے

سی ۱۰۲۔ اے، روفی سویٹ ہوم، گلشن عمیر،
مین یونیورسٹی روڈ، کراچی۔ ۷۵۲۸۰

غزلیں



مظفر حنفی

صاف کہنے میں شرم آئے کہ ہاں
اور انکار مسکرائے کہ ہاں

اس نے ہم سے کوئی دعا بھی نہ کی
ہم نے اتنے فریب کھائے کہ ہاں

پیڑ گردن ہلا رہے ہیں کہ بس
گرد باد اور سر اٹھائے کہ ہاں

ریڈیو کی صدا بڑھا دینا
جب ترا جسم گنگنائے کہ ہاں

چھاؤں زنجیر پاؤں میں ڈالے
تازیانہ ہوا لگائے کہ ہاں

ہاتھ کب تک نہیں نہیں کرتے
شاخ نے سیب یوں چھپائے کہ ہاں

آگہی، پیش بندیاں، انجام
گمرہی حوصلہ بڑھائے کہ ہاں

۳۵۸-۳-علا ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی-۲۵

صہبا وحید

سب کچھ ہے اس کا ہم ہوں کہ گھر دیکھنا نہیں
کرتا ہے کتنا زیر و زبر دیکھنا نہیں
رکھنا ہے ہم کو نیچی نظر دیکھنا نہیں
یعنی کسی کے عیب و ہنر دیکھنا نہیں
احساس یوں دلایئے اپنے وجود کا
آئے وہ سامنے بھی اگر دیکھنا نہیں
کمبخت دل کہ باز ہی آتا نہیں کبھی
ہم نے کہا تھا لاکھ ادھر دیکھنا نہیں
دیکھو اسے ضرور کہ ہے دیکھنے کی چیز
پھر پیش و پس ادھر نہ ادھر دیکھنا نہیں
دیکھوگے بار بار تو بڑھ جائے گی ہوس
اچھا یہی ہے بار دگر دیکھنا نہیں
آتے رہیں گے آپ کے دیدار کے لئے
ہم کو کسی کی خیر خبر دیکھنا نہیں
کوئی صدا کرے گی تعقب تمام عمر
پیچھے پلٹ کے اس کو مگر دیکھنا نہیں
دے دو اٹھا کے ہاتھ کہ معلوم ہی نہ ہو
ہے کون کتنا دست نگر دیکھنا نہیں
ہم اس کے ہو چکے ہیں تو سود و زیاں سے کیا
صہبا رہے کہ جائے یہ سر دیکھنا نہیں

۹۶/۱۳ سرسوتی کنج، ۲۵ آئی پی ایکسٹنشن، دہلی-۹۲

عطا عابدی

تشنہ خواہش نکالتا ہی نہیں
دل کو صحرا میں ڈالتا ہی نہیں
منتظر دائرے کا ہے، پوکھر
میں کہ پتھر اچھالتا ہی نہیں
گر گئیں قیمتیں دواؤں کی
اب کوئی زخم پالتا ہی نہیں
دیتا رہتا ہے اک جہاں آواز
اور دل اس کو ٹالتا ہی نہیں
لفظ و معنی میں بعد ہے لیکن
خود کو قاری سنبھالتا ہی نہیں
چاہتا ہوں کہ سب مجھے دیکھیں
چہرہ شیشے میں ڈھالتا ہی نہیں
حق بیانی کا غم نہ ہو کیوں کر
نیزہ جب سر اچھالتا ہی نہیں
ہم بھی سو جاتے روتے روتے مگر
پانی پتھر ابالتا ہی نہیں
وقت آنے پہ وقت کا رہبر
خود کو زحمت میں ڈالتا ہی نہیں
ہے وہ محروم حال و مستقبل
خود کو ماضی میں ڈالتا ہی نہیں
مشتعل پل کا ہے رفیق عطا
پاؤں حد سے نکالتا ہی نہیں

شعبہ اردو، بہار لجس لیٹو کونسل، پٹنہ-۸۰۰۰۱۵

غزلیں

ڈاکٹر نریش

وہ کیوں نہ کرتا بھلا قطعِ گفتگو مجھ سے
کہ آ رہی تھی اسے حق گوئی کی بو مجھ سے

انانیت کی ردا درمیان حائل ہے
وگرنہ دور نہ میں تجھ سے ہوں نہ تو مجھ سے

شکم کی آگ میں جلنا قبول ہے مجھ کو
گداگری نہیں ممکن ہے کوبہ کو مجھ سے

تو دیکھنے میں بھلا آدمی سہی لیکن
فساد مانگ رہا ہے ترا لہو مجھ سے

ترا پتہ تو کہاں اپنا بھی ملا نہ سراغ
حساب مانگتی ہے میری ہی جستجو مجھ سے

نریش ترکِ تعلق کا کچھ سبب بھی تو ہو
نہ بدگمان ہوں میں تجھ سے اور نہ تو مجھ سے

شعبہ جدید ادب، پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ۔ ۱۴

ظفر مراد آبادی

لہجہ لہجہ ہے اثر بابِ رسا سے منحرف
ہاتھ بھی اب تو ہوئے جیسے دعا سے منحرف

واگزاری کے لیے، اے خود پسندی کیا کروں؟
ہیں لبِ اظہار، حرفِ مدعا سے منحرف

خود سے باہر ہوگئے، تھے ظرف کے ناپائیدار
سب خدا بننے لگے، ہوکر خدا سے منحرف

برق جیسی شعلگی، اس کا سراپا، الاماں
جسم ہے اپنی قبا میں بھی قبا سے منحرف

لٹ گئی اہلِ سخن میں، شاعری کی آبرو
ہیں برہنہ حرف، تہذیبِ ردا سے منحرف

ابر کی صورت رہے، ہم بھی ہواؤں کے غلام
جب بنے دریا، چلے ہوکر ہوا سے منحرف

ہر نفس ہے زندگی کا، موت کی دستک مگر
زندگی خوش فہم ہے، سیلِ فنا سے منحرف

منفرد ہے، اب بھی اس کی غیرتوں کا سلسلہ
ہے طلب گاروں میں، طرزِ التجا سے منحرف

اے ظفر جب سے ہوئیں بارِ انا ہمدردیاں
دوست سے منکر ہوئے ہم، آشنا سے منحرف

۱۸۸۹۔ گلی کوہلیان، سوئی والان، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

تسنیم فاروقی



اے غزل ہم تری سانسوں کو چھوا چاہتے ہیں
جو کسی کو نہ لگی ہو وہ ہوا چاہتے ہیں

پیاس ایسی ہے کہ آنکھوں کو بھرا چاہتے ہیں
دھوپ کے رقص میں دیوانہ ہوا چاہتے ہیں

خون دل دے کے ہر اک ہاتھ کو رنگین کرو
درو دیوار بہت رنگِ حنا چاہتے ہیں

ہم کو سکوں سے پرکھنے کی سیاست نہ کرو
ہم وفا بیچنے نکلے ہیں وفا چاہتے ہیں

اب بڑا شوق ہے لوگوں کو بکھر جانے کا
روز اک شہر میں ہنگامہ نیا چاہتے ہیں

اس کی آنکھوں میں کوئی عکس اترتا ہی نہیں
چھوڑیئے آپ بھی کس شخص سے کیا چاہتے ہیں

اب عبادت بھی تجارت کی طرح ہونے لگی
سر کو سجدے سے اٹھاتے ہی صلا چاہتے ہیں

آپ تسنیم کے سائے سے الگ رہئے گا
کچی دیوار ہیں بارش میں گرا چاہتے ہیں

فن کدہ، تلسی داس مارگ، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۴

غزلیں گیت

بسمل ساہنی

یہ صورت فشار جہاں کیا عجب نہیں
لوگوں میں جو خلوص تھا پہلے وہ اب نہیں

مانا کہ بے قراریٔ دل بے سبب نہیں
پھر بھی تو دیکھیے کہ میں شکوہ بہ لب نہیں

واعظ ہو یا کہ زاہد شب زندہ دار ہو
یہ میکدہ ہے یاں کوئی نام ونسب نہیں

ممکن ہے کچھ نکھار پہ ہو رنگ گلستاں
لیکن گلوں میں پہلے جو خوشبو تھی، اب نہیں

مجھ میں ہزار عیب نمایاں سہی مگر
یہ وصف کم نہیں ہے کہ میں بے ادب نہیں

سچ ہے کہ تیرے جلووں کی دنیا میں دھوم ہے
حسن نظر مرا بھی تو بے تاب وتب نہیں

بسمل تو میں ضرور ہوں اک چشم ناز کا
لیکن یہ میرا نام نہیں ہے، لقب نہیں

غزل کدہ G7/CAE/6 جنک پوری نئی دہلی ۵۸

مصطفےٰ مومن

درد کی بات، جب چبھن سوچے
آگ کیا شے ہے، یہ جلن سوچے

زخم کی بات سوچتا ہے دل!
فکر کو جب کوئی بدن سوچے

منجمد برف سا رہے یہ دل
ذہن کی طرح میرا تن سوچے

چار جانب برس رہا ہے لہو
خوف میں گھر کے ہر بدن سوچے

رحمت گنج پانی ٹینک ... [illegible]

سوہن راہی

جائے گی اپنی راکھ یہاں سے، جائے گی اپنی راکھ
آئے تھے لینے لاکھ یہاں سے، آئے تھے لینے لاکھ
کیسے لکھے بھاگ ودھاتا، کیسے لکھے بھاگ

دور سنہرا چاند کنول، نت جھلمل کرنیں بوئے
اپنی مٹی سے کہہ موڑ کے ہم کتنا ہیں روئے
اس مٹی کو اپنانے کی من میں تھی کیا آگ
کیسے لکھے بھاگ ودھاتا، کیسے لکھے بھاگ

اسوون ہار پروتے جیون یا لٹتا جائے
اپنی ایک عمریا جوگن ہم سے روٹھی جائے
سوچ کی اجلی چنری پر اب [illegible]
کیسے لکھے بھاگ ودھاتا، کیسے لکھے بھاگ

[illegible]

ٹوٹ پٹے

[illegible] ہے اللہ دے اور بندہ لے۔ اوپر رب العالمین تھا اور نیچے سردار آلا سنگھ۔ دونوں اپنی اپنی کائنات کے بلاشرکتِ غیرے مالک۔ تاحد نظر چک کوتوال کی زمینیں، فصلیں، کھیت کھلیان سب سردار آلا سنگھ کی واحد ملکیت تھی اور لوگ سردار آلا سنگھ کی رعایا۔ اس کی کئی پشتیں اس سرزمین پر رہ چکی تھیں۔ اس کے آباؤاجداد نے زمین کے اس خطے پر حکومت کی تھی اور آج اس ساری کائنات کا واحد مالک عمر رسیدہ انسان محوِ خیال تھا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے اور نہ کبھی آج تک ایسا ہوا ہی تھا۔ وہ تن تنہا [illegible] رات کی واردات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سردار آلا سنگھ کا کوئی بزرگ اس علاقے کا کوتوال تھا۔ مہاراجہ نے اس کے کسی کارنامے سے خوش ہو کر یہ سارا علاقہ اسے جاگیر میں [illegible] سے آج تک یہ علاقہ چک کوتوال کے [illegible] سے موسوم ہے۔ چک کوتوال کی حد [illegible] سے چند بازی گراں کی حد [illegible] اس علاقے کے لوگوں کا [illegible]

[illegible]

چک کوتوال کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔

چک بازی گراں کا سردار ولدل پر یچھ، ادھیڑ عمر کا انسان تھا۔ اس کا گٹھا ہوا کسرتی جسم، ناٹا قد، سیاہ فام رنگت اور موٹی موٹی کالی آنکھیں اس کے کردار کی چغلی کرتی تھیں۔ لوگ اکثر کہتے 'جتنا چھوٹا اتنا کھوٹا۔' اس کے بزرگوں کو بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہاں لا کر بسایا تھا۔ لوگ مہاراجہ صاحب کی ستم ظریفی کی داد دیتے اور کہتے چک کوتوال کے پڑوس میں پیشہ ور مجرموں کو بسا کر مہاراج نے 'چور سپاہی بھائی بھائی' کے قول کی تصدیق کر دی تھی۔ مگر اب تو یہ بات بھی پرانی ہو گئی تھی۔

ان دنوں سردار آلا سنگھ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر یہاں آ بسا تھا۔ بے شک وہ اپنے خاندان کا اکلوتا پڑھا لکھا چشم و چراغ تھا اگر چاہتا تو کوئی عہدہ اسے دستیاب ہو سکتا تھا مگر اپنی خاندانی روایت کو قائم رکھنے کے لئے اس نے اپنی بیوی سمیت یہاں رہنا قبول کر لیا تھا۔

چک کوتوال کا حساب کتاب سنبھالنے کے لئے اس کے باپ کے زمانے سے [illegible] خود دار [illegible]

[illegible]

کماتے تھے۔ مگر آلا سنگھ کے وہاں بس جانے کے بعد اب اس کے وہ پہلے والے ٹھاٹ نہ رہے تھے۔ نتھو شاہ نے خود بڑی کوٹھی خالی کر کے چھوٹی کوٹھی میں اپنی رہائش منتقل کر لی تھی۔

آلا سنگھ کو یہاں آئے ابھی کچھ دن ہی ہوئے تھے۔ گرمی کا موسم تھا وہ اور اس کی بیوی باہر آنگن میں چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ اچانک ایک رات اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے کوئی شخص اس کے مکان کی چھت پر کھڑا ہے۔ جوں ہی آلا سنگھ نے کروٹ لی وہ اسے دیکھ کر ایک دم پچھلی چھت پر کود گیا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ آلا سنگھ اٹھ کر سیدھا اپنے مکان کے اندر چلا گیا۔ اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ گھر میں نہ کوئی کپڑا بچا تھا نہ برتن۔ چور سارے گھر کا صفایا کر گئے تھے۔ آواز سن کر اس کی بیوی اٹھ کر سیدھی اس کے پاس آ گئی اور گھر کی حالت دیکھ کر رونے لگی۔ وہ بولا:

"بھاگوان شکر کر تیرے تن پر تاگی ہے اور [illegible]

[illegible]

باندھ کر حاضر کر دیا۔ پولیس نے مار مار کر ان کی چمڑی ادھیڑ دی۔ پر دلدل کی رعایا کوئی کچی گولیاں تھوڑی کھیلی تھی۔

"مار لے اور مار لے۔ جتنا مرضی پیٹ لے"۔ وہ مار کھاتے جاتے اور دھرتی پر اوندھے لیٹتے جاتے، مگر کیا مجال کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا ہو۔

چڑ بازی گراں کے سارے مجرم، پولیس کے رجسٹر میں درج تھے۔ شام کے بعد کسی کو بھی گھر سے باہر نکلنے کی ممانعت تھی مگر سارے کے سارے لوگ جو دور مار تو چیں کہلاتے تھے، رات کو اپنے گھروں میں نچلے بیٹھ جائیں تو ان کے خاندانی پیشے کو لاج نہ لگے گی اور قبروں میں پڑے ان کے بزرگوں کی روحیں بے قرار نہ ہوں گی؟ ایک بار گھر سے باہر نکلنے کے بعد خالی ہاتھ لوٹنا انہیں زیب نہ دیتا اس لئے واپسی پر جو کچھ بھی ان کے ہاتھ لگ جاتا، مال غنیمت سمجھ کر اسی پر قناعت کرتے دوسرا ان کا اصول تھا کہ ایک بار جو چیز گھر میں گھس جاتی اس کی برآمدگی ناممکن تھی۔ کیونکہ وہ لوگ اصول کے پابند تھے۔ اس لیے اگر تھانیدار زیادہ تنگی ترشی کرتا تو مال کا ہر جلنہ بھرنے کو تیار ہو جاتے۔ کیا مجال کہ مال کی ایک جھلک بھی کسی کو دکھ جائے۔ ہاتھوں ہاتھ مال نہ جانے کہاں سے کہاں غائب ہو جاتا۔

سردار آلا سنگھ کے کپتان چاچا نے سارے گاؤں کو الٹا لٹکا دیا، مار مار کر ان کی کھال ادھیڑ دی مگر کوئی اتہ پتہ نہ چل سکا۔ آخر آلا سنگھ کو ہی رحم آگیا۔ اس نے کہا:

"چاچا جی چھوڑو، دفع کرو۔"

"تو کہتا ہے تو ٹھیک ہے پر یہ سارے ہیں حرام کے جنے۔ ان کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے یہی ہتھکنڈے اپنانے پڑتے ہیں۔" مایوس ہو کر آلا سنگھ اپنے گھر لوٹ آیا۔ اس حادثے کا اثر یہ ہوا کہ اس دن سے وہ اپنے ہاتھ میں ایک بیت کی چھڑی رکھنے لگا جس کی ایک طرف چاندی کی مٹھی تھی اور دوسرے سرے پر چاندی کا چھلا جڑا تھا۔ یہی اس کے پرکھوں کا چلن تھا۔

ایک بار رات کو حویلی کے آنگن میں سوئی ہوئی سردارنی کی آنکھ کھل گئی۔ چاندنی رات تھی اور صحن میں لگے بھاری بھرکم شیشم کے پیڑ کے ٹہنیاں ہوا کے تھپیڑوں سے والہانہ جھول رہی تھیں۔ ان سے لگا دو ہمائے بڑے دیلوں سے چمکتے ہوئے چاندنی میں آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ ہوا کے جھونکے ٹہنیوں اور پتوں کو ہلاتے۔ کبھی ان کے وجود کو چھپا دیتے اور کبھی آشکار کر دیتے۔ تھوڑی دیر تک وہ یہ نظارہ دیکھتی رہی۔ پھر ماجرا اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے آہستہ سے ساتھ کی چارپائی پر سوئے ہوئے آلا سنگھ کی چادر کا پلو پکڑ کر کھینچا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "لگی میں نے کہا شیشم کی ٹہنیوں میں دو چور چھپے ہوئے ہیں اور بغور ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔" آہستہ سے سردار نے اپنے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی چھڑی کو اٹھایا اور چادر کے اندر سے ہی بندوق کی طرح تان کر شست باندھنے لگا۔

"میں نے کہا جی گولی نہ چلانا۔" یہ سردارنی کی آواز تھی، جسے سنتے ہی چوروں کے حواس باختہ ہو گئے۔ ایک تو یکدم کود کر بھاگ گیا اور دوسرے کی پیڑ سے گر کر ٹانگ ٹوٹ گئی۔ درد سے کراہتے ہوئے زخمی چور کو سردار نے دبوچ لیا۔ اگلے دن اس کی مشکیں کس کر وہ اس کو اپنے کپتان چچا کے سپرد کر آیا۔

جب پولیس نے پٹائی کی تو اس نے بک دیا۔ "ہمیں تو نتھو شاہ نے پانچ سو روپے دئے تھے کہ سردار کا صفایا کر دو۔ صبح ہو جانے پر باقی کے پانچ سو اور دوں گا۔" معاملہ گھر کا تھا، بات رفع دفع ہو گئی۔ سودا سلف سے لے کر زیور گہنے تک آج تک سردار کے گھر کی ہر شے کی خرید و فروخت نتھو شاہ کے سپرد تھی اس دن سے سردار نے سارا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ دن اور یہ دن آج تک پھر کوئی واردات نہیں ہوئی مگر آج پھر یہ کیسا مسئلہ آپڑا تھا۔ سردار حیران تھا۔ لوگ حیران تھے۔ سردار کے کارندے دانتوں تلے انگلیاں ڈال کر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ گھڑی گھڑی ایک ہی بات دہرا رہا تھا۔

"خیر جو ہوا سو ہوا مگر [illegible]

مجھ سے دو چار ہو جائے تو میں [illegible] سردار کی [illegible] ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی [illegible] کیا کرے گا؟" [illegible] آنکھیں نئے آنے والے [illegible]

"بتا تو [illegible] گا کہ انعام دے [illegible]"

"یقیناً میں اس کو انعام سے نوازوں گا۔"

دلدل سردار کو دیکھ کر آلا سنگھ آگے بڑھا اور اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"سردار تمہیں یاد ہے ایک بار تمہارے چھوٹے بیٹے کی بائیسکل، میرے گاؤں کے کسی چھورے نے چھین لی تھی۔"

"ہاں ان دنوں نئی بائیسکل بھی کسی کی بیوٹی سے کم حیثیت نہ رکھتی تھی اور میرا بیٹا تو ویسے بھی شوقین مزاج تھا۔ بڑی جھاڑ پونچھ کر رکھتا تھا اور ٹھاٹھ باٹ سے سواری کرتا تھا۔"

"ہاں اسی ٹھاٹھ نے تو اس کی چغلی کی۔ ہر روز شہر آتے جاتے جب وہ میرے گاؤں کے قریب سے گزرتا تو اس زور سے اس کی گھنٹی بجاتا کہ سارے گاؤں کو خبر ہو جاتی۔ تمہیں یاد ہوگا اس میں بیٹری والی گھنٹی لگی ہوئی تھی۔ جب وہ نہیں دباتا تو پیں پیں کی آواز نکلتی تھی۔ اور سارا گاؤں اکٹھا ہو جاتا۔ تمام گاؤں کے چھورے چھوریاں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے۔"

"دن میں کہ رات میں؟"

"سردار میرے گاؤں کے لوگ رات کو سوتے کہاں ہیں؟ وہ تو الو کی طرح رات کو جاگتے ہیں اور دن میں سوتے ہیں۔ اس دن جب وہ لوگ سو رہے تھے تو تمہارا بیٹا بائیسکل لے کر وہاں آدھمکا۔ پیں پیں کرتا ہوا وہاں سے ایسے نکلتا تھا جیسے ساری کی ساری بیٹری وہیں پھونک دے گا۔"

"اچھا" سردار ہنسنے لگا۔

پھر ایک منچلا چھورا اس کے راستے میں ڈٹ کر

گیا ہو گیا۔ پھر روز کی ٹیں ٹیں کون سنتا۔ پھر اس نے تمہارے بیٹے کی بائیسکل چھین لی۔ جب مجھے خبر ملی تو میں نے اسے کہا اس چھوکرے کو ادھ موا کر دیا۔ بودے کو گھسیٹتا ہوا تمہارے پاس لے آیا۔

"ہاں دلدل۔ تم نے تو بائیسکل کو زمین پر گھسیٹنے ہی نہ دیا تھا اور بائیسکل اس کے کندھوں پر لاد کر لایا تھا۔ مجھے کل کی طرح یاد ہے۔ تم نے کہا تھا"

"لے سردار یہ تیرا گنہگار ہے اور تیرے سامنے پیش ہے۔ تو چاہے تو مرتا ہے، تو چاہے تو چھوٹتا ہے۔"

اور تم نے اپنی دریا دلی سے اسے معاف کر دیا تھا۔

"ہاں دلدل پہلے ان وقتوں کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ان دنوں لوگوں کی آنکھوں میں شرم و حیا تھی۔ اب تو لوگوں نے شرم حیا گھول کر پی لی ہے۔"

"ہاں سائیں آج کل کے لوگوں کی آنکھوں میں سور کا بال آ پڑا ہے۔ تمہیں یاد ہو گا سردار، کیسے ایک بار راتوں رات تمہارے سنترے گڑ میں بدل گئے تھے۔"

"ہاں دلدل سردار۔" اور آلا سنگھ کی ہنسی فوارہ بن کر ابل پڑی۔ اسے یاد آیا کیسے ایک رات وہ گاڑیوں کی قطار لے کر دلدل کے گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا۔ وہ خود گھوڑے پر سوار کبھی آگے کبھی پیچھے گاڑیوں کی رکھوالی کرتا ہوا جا رہا تھا۔ گاڑیاں کچے راستے کی دھول اڑاتی، گڑھوں میں پھنستیں، نکلتیں کھڑ کھڑ چلی جا رہی تھیں۔ گاڑی بان اونگھ رہے تھے اور بوجھا ڈھوتے ہوئے بیل خاموش قدم بڑھاتے، لگاتار آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ رات کے جھٹ پٹے میں دلدل کے گاؤں کے دو بندوں نے بوریوں میں بند سنتروں کو گڑ کی بھیلیاں سمجھ کر اتار لیا۔ ادھر سویرے منڈی میں پہنچ کر سردار کو مال کم لگا۔ واپسی پر اس نے دلدل کو بلا بھیجا۔

"سردار وہ تو گڑ سمیت بوریوں کو ڈھال کر پی جاتے مگر دھوکہ ہو گیا۔"

"دھوکہ تیرے ساتھ ہوا کہ میرے ساتھ؟"

"دونوں کے ساتھ تمہاری بوریاں پھوکٹ میں گئیں اور مجھے گڑ بھی نہ ملا۔ آلا سنگھ کو یاد تھا اگلے دن دلدل دو 'پاپیوں' کو پکڑ کر لے آیا اور اس کے سامنے پیش کر دیے۔

"سردار یہ ہیں ترے چور۔" ان دونوں کو غور سے دیکھتے ہوئے سردار نے ہاتھ میں چاندی کے مٹھے والا بید پکڑا ہوا تھا کہ وہ تھر تھر کانپنے لگے۔ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ زمین پر ناک سے لکیریں کھینچیں اور رندھے ہوئے گلے سے گڑگڑا کر معافی مانگتے ہوئے کہا۔

"سائیں ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔ اب کی بار معاف کر دو پھر کبھی ایسی حرکت نہیں ہو گی۔" اور آلا سنگھ نے انہیں معاف کر دیا۔ خیر یہ تو پرانی بات تھی مگر آج جیسی واردات تو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ حیرت زدہ بھی تھا اور سوچ سوچ کر مسکرا بھی رہا تھا۔

بھئی کمال ہو گیا۔ آگے پیچھے چلتی ہوئی اناج سے بھری گاڑیوں میں سے ایک گاڑی ہی غائب ہو جائے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو۔ باقی کی گاڑیاں بدستور چلتی جا رہی ہیں۔ بیلوں کے گلے میں لٹکتی گھنٹیاں لگاتار بج رہی ہیں۔ گاڑی بان جوں کے توں اونگھ رہے ہیں اور درمیان میں سے چلتے چلتے ایک گاڑی غائب ہو جاتی ہے۔

دلدل غضب کا کھوجی مانا جاتا تھا۔ اس کی سراغ رسانی کا یہ عالم تھا کہ پاؤں میں جوتے ہوں یا نہ ہوں۔ وہ نشان دیکھ کر بتا دیتا تھا کہ یہ آدمی میرے گاؤں کا نہیں۔ یہ واردات کس نے کی ہے۔ کیسے کی ہے اور مال کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا ہو۔ مگر اس بار پاؤں کے نشان دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ راستہ تو اس کے گھر کی طرف ہی جاتا ہے۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس کے منہ سے نکلا، اس کمینے نے تو میرا منہ کالا کروا دیا۔"

"تو یہ تیرا صاحبزادہ ہے دلدل سردار!"

"صاحبزادہ نہیں، حرامزادہ ہے کتے کا پلا۔" پھر اس نے اپنے ساتھ آئے لوگوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اس حرام کے تخم کو سامنے شیشم کے پیڑ کے ساتھ باندھ دو اور اس کے دوسرے دونوں ساتھیوں کے ہاتھ پیر باندھ کر میرے سامنے زمین پر ڈال دو پھر تماشا دیکھو میں کیسے چھی سے ان کی کھال ادھیڑتا ہوں۔"

"کھال تو بے شک کھینچ لینا مگر پہلے مجھے یہ جان لینے دو کہ یہ واردات ہوئی کیسے۔" سردار آلا سنگھ ہاتھ میں دست تھامے دونوں ملزموں کی طرف بڑھا تو دونوں خوف سے لرزنے لگے۔

"سچ سچ بتا دے یہ ہوا کیسے؟" ایک نوجوان جس کی تہمد کھول کر دلدل نے پہلے ہی ننگا کر دیا تھا۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے اپنی داستان بیان کرنے لگا۔ سردار آلا سنگھ اس واقعہ کو یوں بیان کرتے تھے۔

کالی سیاہ رات تھی۔ اندھیرے میں گاڑیوں کی قطار رینگ رہی تھی۔ چور پہلے کافی دور تک گاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ گاڑی بان اونگھ رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک چور نے آہستہ سے ایک بیل کو کھولا اور اس کی رسی دلدل سردار کے بیٹے کے ہاتھ میں تھما دی اور خود بیل کی جگہ لے کر گاڑی کھینچنے لگا۔ چھوٹا سردار بیل کو پیڑ کے ساتھ باندھ کر واپس آ گیا۔ اتنی دیر میں دوسرے چور نے دوسرے بیل کو کھول کر اس کی جگہ لے لی۔ چھوٹا سردار دوسرے بیل کو بھی باندھ آیا۔ گاڑیاں بدستور چلتی رہیں اور ان دونوں نے مل کر آہستہ آہستہ اپنی والی گاڑی کو قطار سے باہر نکالنا شروع کر دیا۔ سردار کے صاحبزادے نے پچھلے بیل کی نکیل پکڑ کر اگلی گاڑی کے پیچھے باندھ دی اور قطار بدستور رینگتی رہی۔ جب تمام قافلہ نکل گیا تو انہوں نے گاڑی کھیتوں میں لے جا کر کھڑی کر دی اور باری باری ساری بوریاں اٹھا کر دلدل سردار کی حویلی میں جمع کر دیں۔

"ابے او حرام کے تخمے، سات گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔ تم تو بدروحوں سے بھی بڑھ گئے۔" دلدل نے ایک ایک چھی زمین پر پڑے ہوئے دونوں چوروں کی پیٹھ پر اس طرح لگائی کہ وہ بلبلا کر چیخنے لگے۔ ان کی پیٹھ سے خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ سردار آلا سنگھ نے دونوں جوانوں کی مشکیں

کھلواڑیں اور ایک ایک زناٹے دار چانٹا دونوں کو رسید کیا اور کہا بھاگ جاؤ اب اگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو گولی مار دوں گا۔ دونوں ننگ دھڑنگ نوجوان ایک ہاتھ آگے اور ایک ہاتھ پیچھے رکھ کر سرپٹ بھاگ گئے۔ نہ انہوں نے غائب ہونے میں تاخیر کی اور نہ لوگوں نے ہنسنے میں دیر لگائی۔ بھاگتے ہوئے چوروں کی ماں بہن سے کوئی نزدیک کا رشتہ جوڑتے ہوئے دلدل نے کہا:

"سردار ان کمینوں کو تم نے بھگا دیا، اس حرامی کے پلّے کو میں نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے اپنے بیٹے کی طرف اشارہ کیا جو سامنے شیشم کے پیڑ کے ساتھ بندھا ہوا پہلے ہی خوف سے ادھ موا ہو رہا تھا۔ نہ جانے وہ اپنی کرتوت پر شرمندہ تھا یا باپ کے کیے پر شرمسار تھا۔

"ایسی اولاد سے تو بندہ بے اولاد ہی بھلا۔"

"یہ تمہارا برخوردار ہے دلدل سردار!" پھر آلا سنگھ نے آگے بڑھ کر اپنی تین فوٹ کی کرپان سے وہ رسیاں کاٹ دیں جنہوں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ پھر اس نے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"میاں صاحبزادے، اپنے ابا جان سے معافی مانگ۔ دیکھ وہ تیری وجہ سے کتنے شرمسار ہیں۔"

"نہیں" سردار دلدل ایک دم چیخ کر بولا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے ایک مہربان دوست کے سامنے مجھے ذلیل کیا ہے۔ پھر اس نے ایک دم اپنے کندھے سے دونالی بندوق اتار لی اور لڑکے پر شست باندھ کر لبلبی پر انگلی رکھنے کی دیر تھی کہ آلا سنگھ نے ایک جھٹکے کے ساتھ بندوق کی نالی کو اوپر اٹھا دیا۔ زور کا دھماکہ ہوا۔ گولی اوپر ٹہنیوں اور پتوں کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ لرزتے ہوئے بے سہارا پتے ٹوٹ کر فضا میں ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔ اتنے میں دلدل کا شہزادہ فرار ہو گیا۔

"سردار! یہ پتے میرے آوارہ بیٹے کی طرح ہیں۔ ایک بار ٹوٹنے کے بعد اب دوبارہ یہ ٹہنی کے ساتھ جڑ نہیں پائیں گے۔ ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا۔ ہوا کے کندھوں پر بیٹھ کر نہ جانے یہ کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔"

"ٹوٹنا تو آسان ہے دلدل مگر جڑنا بہت مشکل ہے۔"

"ہاں سردار! پہلے وہ تیرا گنہگار تھا۔ میں سزا دینے لگا تو تم نے اسے آزاد کر دیا اور بھگا دیا۔ پھر تو میرا گنہگار بن گیا اور اب میں تیرا گنہگار ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"سردار تیرا مال میری حویلی میں پڑا ہے۔ تم جانتے ہو ہم خاندانی بازی گر ہیں اور اپنے اصول کے پکے ہیں۔ مالِ غنیمت کی برآمدگی ہمارے گھر سے ہو نہیں سکتی اور تم اپنا مال اپنے گھر لے جا نہیں سکتے۔ مگر ایک صورت ہے میں تمہارے مال کی قیمت چکا سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی تہمد کی گرہ میں بندھی ہوئی نوٹوں کی گڈیاں کھول کر زمین پر بچھا دیں۔ سارا گاؤں عش عش کرنے لگا۔ مسئلہ پیچیدہ تھا۔ آلا سنگھ نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر بولا:

"دلدل تو یہ ساری رقم اٹھا لے۔ تم سے بڑا کھوجی اس سارے علاقے میں اور کوئی نہیں۔ جہاں کہیں بھی وہ گیا ہے تو اسے کھوج نکالے گا۔ اسے ڈھونڈ کر میرے پاس لے آ۔ کل ہمیں یہی روپے اس کی شادی پر خرچ کرنے ہیں۔ اس کا گھر گھاٹ بسانا ہے۔ تو اسے اگر اپنے گاؤں سے دربدر کر دے گا تو بھی چک کوتوال میں بہت زمین پڑی ہے۔"

دلدل نے بندوق زمین پر پھینک دی۔ سردار آلا سنگھ کے پاؤں چھوئے اور اس کی خاک اپنی آنکھوں اور پیشانی سے لگائی۔ دونوں سرداروں نے ایک دوسرے کو اپنی مضبوط بانہوں کے گھیرے میں کس لیا۔

☆☆☆

● شعری تخلیقات بھیج کر ہمیں معذرت کرنے پر مجبور نہ کریں۔

● نثری تخلیقات اور مقالات صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف ہی تحریر کریں۔ تخلیقات بھیجنے کے بعد ادارے کے جواب کا انتظار کریں۔

(ادارہ)

شعیب رضا فاطمی

آہ

آہ کی عمر ہی کیا ہوتی ہے
دل کے تہہ خانے سے
لب تک کا سفر کرنے میں
اک صدی یا کبھی اس سے بھی زیادہ کی تھکن
ذہن پر بوجھ کی مانند اتر آتی ہے
بلبلے کی طرح کم عمر ہے آہ
لیکن ایک لمحے میں یہ دوش ہوا پر چڑھ کر
عرش تک جاتی ہے
اور مالک کل کی رحمت
اپنے دامن میں اٹھا لاتی ہے
آہ کی عمر کہاں ہے کہ اثر کرنے تک
اک مدت کا تعین کیجیے
دل سے رہوار تنفس کے سہارے نکلی
اور تحلیل ہوئی
آہ کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟

۸۳۸/۲۳۔ فرسٹ فلور، نیو مارکیٹ، چتلا گیٹ
چاوڑی بازار دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

ایوان بونن

انگریزی سے ترجمہ: شرجیل احمد خاں

لو

Sunstroke

ایوان بونن پہلے روسی مصنف ہیں جنہیں ۱۹۳۱ء میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اس کہانی کو سمرسٹ مام میں دنیا کی ایک بہترین کہانی تسلیم کرتے ہوئے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ روشنی سے جگمگاتے ڈائننگ ہال سے باہر آ گئے۔ جہاز کے عرشے پر لوہے کے جنگلے سے لگ کر تھوڑی دیر ٹھہر گئے۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اپنے ہاتھوں کو رخسار پر رکھتے ہوئے وہ بہت دلکش انداز سے مسکرائی۔ ہر شے مستی سے جھوم رہی تھی۔

"میں مستی سے سرشار ہوں۔ میں ہوش میں تو ہوں؟--- تم کہاں سے آ گئے؟ تین گھنٹے قبل تمہارے وجود کا سایہ تک نہیں تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تم کس جگہ جہاز پر سوار ہوئے۔ کیا وہ تمہارا تھا؟ لیکن پیارے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آہ! میرا تو سر گھوم رہا ہے۔ ایسا تو نہیں کہ جہاز چکر کاٹ رہا ہے۔"

آگے تاریکی تھی اور روشنی بھی۔ تاریکی میں تیز ہوائیں ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھیں جب کہ روشنیاں آگے آگے پھسلتی چل رہی تھیں، وولگا کی لہروں پر بہتا ہوا جہاز تیزی سے خم کھا کر گودی (Pier) سے جالگا۔

لیفٹیننٹ اس کے ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔ سنولائے ہوئے ہاتھوں کی بو اس کے نتھنوں کو بھلی لگی۔ معاً اسے خیال آیا کہ ہلکے سوتی پوشاک سے ڈھکا اس کا جسم لگاتار ایک ماہ تک سورج کی حدت سے کمہلا گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر خوشی اور لذت کے ملے جلے جذبات سے اس کا دل لرز گیا۔

لیفٹیننٹ بڑبڑایا "اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے۔"

"کہاں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"یہاں، گودی پر۔"

"کیوں؟"

وہ خاموش رہا--- "تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔"

لیکن وہ بضد تھا۔ اس نے اپنا جملہ دہرایا۔ "تم سے التجا کرتا ہوں، یہاں سے چلو۔"

"اچھا! تم جیسا چاہو۔"

جہاز ایک جھٹکے سے گودی سے جا ٹکرایا۔ دونوں تقریباً ایک دوسرے پر گر پڑے۔ تار کا ایک سرا ان کے سر پر آلگا۔ جہاز تیزی سے چکر کھایا۔ پانی میں اضطراب پیدا ہوا۔ لیفٹیننٹ سامان لانے دوڑا۔

وہ دونوں نیم خوابیدہ گودی سے باہر نکلے۔ باہر ٹخنے بھر ریت میں دھنستے ہوئے وہ ایک بگھی کے پاس پہنچے۔ خاموشی سے بگھی پر سوار ہو گئے۔ بگھی چڑھائی پر روانہ ہوئی۔ سڑک کی سیدھی چڑھائی جس کی دونوں جانب دور دور تک بجلی کے قمقمے ایستادہ تھے، ختم ہونے کو نہیں آتی تھی۔ آخر کار وہ بلندی پر پہنچ گئے۔ گاڑی پتھریلے راستے پر کھڑکھڑاتی آگے بڑھتی گئی۔ آگے گرجا گھر کی انتظامیہ کی عمارت تھی۔ گاڑی روشنی سے جگمگ دروازے کے پاس آکر رکی کواڑ کھلے تھے۔ سامنے لکڑی کی سیڑھی صاف نظر آرہی تھی۔ ایک بوڑھا خادم جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور جو گلابی رنگ کی شرٹ اور فراک پہنے تھا، سامان اٹھا کر لے گیا۔ وہ لوگ ایک کشادہ لیکن سامان سے منسلک شبستان میں داخل ہوئے۔ کمرہ سورج کی حدت سے ابھی تک گرم تھا۔ کھڑکیوں میں سفید پردے لٹک رہے تھے۔

آئینہ سے مزین انگیٹھی پر موم بتی رکھی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے اور جیسے ہی خادم دروازہ بند کرکے باہر چلا گیا وہ دیوانہ وار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ دونوں جیسے کہیں کھو گئے تھے۔ خود فراموشی کے عالم میں انہوں نے وہ سب کچھ پالیا تھا، جو انہیں پہلے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ سرور، یہ وجد کا عالم، یہ خود فراموشی، ان کی آئندہ زندگی کی سرمایہ تھیں جو یادیں بن بن کر ستاروں کی طرح ہمیشہ چمکتی رہیں گی۔

دوسرے دن صبح دس بجے جب سورج اپنی گرمی بکھیر رہا تھا، گرجا گھر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں اور ہوٹل کے سامنے بازار میں لوگوں کی چہل پہل تھی وہ اپنے ساتھی کو اکیلا چھوڑ کر آگے سفر پر روانہ ہو گئی۔ وہ جس کا کوئی نام نہیں تھا جو اپنے کو مذاقاً خوبصورت اجنبی کہتی تھی، داغ مفارقت دے گئی تھی۔

وہ لوگ رات پوری نیند سو نہیں پائے تھے، لیکن جب وہ خواب سے جاگی، نہا دھوکر دھلے اور صاف کپڑے زیب تن کئے باہر برآمدہ میں نمودار ہوئی تو اس کے چہرے پر سترہ سالہ دوشیزگی کی شگفتگی اور رعنائی عیاں تھی۔ کیا وہ پریشان تھی، نہیں بالکل نہیں۔ اس کی سادگی، اس کی شگفتگی بدستور قائم تھی۔ سب کچھ عین فطرت کے مطابق تھا۔

اس لیفٹیننٹ کا مشورہ کہ وہ بھی سفر میں اس کے شریک ہو، مسترد کر دیا گیا تھا۔ نہیں پیارے تم دوسرے جہاز کا انتظار کرو۔ اگر ہم تم ساتھ جائیں گے تو سارا معاملہ بگڑ جائے گا، جو میں نہیں چاہتی۔ یقین مانو میں اس قماش کی عورت نہیں ہوں جس کی تصویر شاید خود میں نے تمہارے ذہن میں بنائی ہے۔ جو کچھ بھی یہاں گزرا، پہلے کبھی نہیں گزرا تھا اور نہ آئندہ کبھی گزرے گا۔ اچانک کچھ ایسا ہوا جیسے کہ مجھے گرہن لگ گیا ہو یا یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ہم دونوں تیز لو میں جھلس گئے۔

۳۔ ہمیکن پور، بھاگلپور۔۸۱۲۰۰۱ (بہار)

لیفٹیننٹ آخر کار راضی ہو گیا۔ وہ اس کو گودی تک لے گیا۔ گلاب کے پھول کی رنگت کا جہاز کھلنے ہی والا تھا۔ اس نے سب کی نظروں کے سامنے اس کو بار بار چوما۔ اس پر بے خودی کا عالم طاری تھا۔ وہ بمشکل تیزی سے پیچھے کھسکتے ہوئے تختے سے کود پایا۔

وہ غم سے نڈھال اپنے ہوٹل میں واپس لوٹا۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ کمرے کی ہر شے جیسے بدل گئی تھی۔ کمرہ اس کے وجود سے بھرا تھا، پھر بھی خالی خالی لگ رہا تھا۔ کتنا عجیب سماں تھا۔ کمرے سے اب بھی ایڈ ونونگ کی بو آرہی تھی۔ آدھی پی ہوئی چائے کی پیالی اب بھی ٹرے میں رکھی ہوئی تھی۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ لیفٹیننٹ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"کتنا عجیب واقعہ تھا۔" وہ بڑبڑایا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں پرنم ہیں۔ کانوں میں اب بھی یہ فقرے گونج رہے تھے۔ "یقین مانو میں اس قماش کی عورت نہیں ہوں جس کی تصویر شاید خود میں نے تمہارے ذہن میں بنائی ہے۔" اور اب وہ نظروں سے اوجھل تھی، بیوقوف عورت۔

پردہ ایک طرف سے ہٹادیا گیا تھا۔ بستر ابھی تک تیار نہیں تھا۔ اس کو محسوس ہوا کہ اب اس میں اتنی سکت نہیں ہے کہ بستر کو ایک نظر دیکھے۔ اس نے پردے ٹھیک کئے اور کھڑکیاں بند کردیں تاکہ بازار سے آتی ہوئی بھنبھناہٹ اور گاڑیوں کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی نہ دے۔ اور پھر نڈھال دیوان پر بیٹھ گیا۔

تو یہ تھا اس سے اتفاقیہ "مڈ بھیڑ" کا انجام۔ جہاز کے عرشے پر خاموش بیٹھی سورج کے کرنوں سے جگ مگ کرتی تا حد نظر پھیلی ندی، تیز بھاگتی لہریں۔ Berges ندی کے کناروں پر پھیلے ریت، پانی اور آسمان کی چمک وولگا ندی کی بے پایاں وسعت کو نظروں میں بسائے وہ چلی جارہی تھی، دور بہت دور۔ الوداع۔ ہمیشہ کے لئے۔ ابد تک کے لئے الوداع۔ اب وہ کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں پائیں گے۔ میں کسی حال میں بھی اس شہر نہیں جاسکتا جہاں وہ اپنے شوہر اور اپنی تین سالہ بچی کے ساتھ رہتی ہے وہ من ہی من میں بڑبڑایا۔

اور وہ شہر اسے عجوبہ لگا۔ ایک ممنوعہ شہر۔ اس اجنبی شہر میں وہ اپنی زندگی کے بقیہ دن تنہا گزار دے گی۔ شاید اکثر اسے میری یاد آتی رہے اور اچانک وہ "مڈ بھیڑ" بھی یاد آجائے جس نے اس کی زندگی میں ایک طوفان برپا کردیا ہے۔ لیکن اب وہ اسے کبھی نہیں دیکھ پائے گی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ نڈھال ہو جاتا۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا سوچنا لغو ہے۔ غیر فطری اور ناقابل یقین ہے۔ اس طرح کے خیالات نے اسے اتنی اذیت پہنچائی کہ وہ خوف و ہراس سے کانپنے لگا۔ اس کو زندگی بے کار، لغو اور بے معنی نظر آئی۔ "کیسی شیطنت ہے۔" اس نے خیال کیا۔ وہ اٹھا اور دوبارہ کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس کی نظریں پردے کے پیچھے پلنگ سے ٹکرا کر لوٹ آئیں۔ وہ اس جانب دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر مجھے کیا ہو گیا ہے؟ وہ کون تھی؟ اور آخر وہاں کیا گزری۔ ایسا لگتا ہے سچ مچ کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ لیکن اصل سوال تو یہ ہے کہ یہ پہاڑ سا دن اس کی جدائی میں کیسے کٹے گا۔ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

اس کا سراپا اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ اس کی دلکش ادائیں، اس کی نزاکتیں، اس کا بانکپن یاد آتیں تو دل میں ایک خلش پیدا ہو جاتی۔ وہ بے چین ہو اٹھتا۔ اس کے جسم کا سونا پن، اس کے ہلکے پھلکے لباس کی بو، اس کی مترنم زندہ آوازیں، اس کے ساز دل کو چھیڑتی تو اس کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہو جاتی۔

اس کی نسوانی دلکشی، دلبری نے اس پر جو موڈ طاری کردیا تھا اس کا نشہ اب بھی باقی تھا۔ لیکن پھر بھی اصل بات تو یہ ہے کہ ایک بالکل نیا موڈ، انجانا، انوکھا جس کا کل وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جب کہ وہ دونوں ایک ساتھ تھے، اور جس کا ذکر وہ کسی سے نہیں کر سکتا تھا، اس موڈ کا وہ کیا کرے۔

"ہاں۔" وہ سوچتا رہا "اصل بات تو یہ ہے کہ اب میں کبھی کسی سے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ پاؤں گا۔ اب میں کیا کروں یہ سلسلہ روز و شب! کسی طرح گزر جائیں یہ دن۔ یہ دل کی خلش، یہ یادیں، وولگا کے کنارے بسا وہ چھوٹا سا ممنوعہ شہر۔ وہی روشن وولگا جس کی سطح پر گلاب کے پھولوں کی رنگت کے جہاز پر بیٹھ کر وہ دور افق پار چلی گئی۔ میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ دل کی خلش کس طرح مٹے گی۔"

اگر حالات اسی طرح رہے تو میری جان چلی جائے گی۔ مناسب ہے کہ میں خیالات کو دوسری جانب موڑوں۔ کچھ سیر و تفریح میں دل بہلاؤں۔ اس خیال نے مہمیز کا کام کیا۔ اس نے ٹوپی پہنی اور تیزی سے طویل لیکن سنسان Corridor سے گزرتے ہوئے زینے سے اترا اور دروازے کے قریب ٹھہر گیا۔ وہ کہاں جائے؟ باہر دروازے پر ایک نوجوان کورٹ پینٹ میں ملبوس کھڑا سگار پی رہا تھا۔ وہ کسی کا منتظر تھا۔ لیفٹیننٹ نے اس کی جانب بے توجہی سے دیکھا۔ وہ حیران تھا کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی دنیا و مافیہا سے بے خبر خاموشی سے اپنی گاڑی کی سیٹ پر بیٹھا سگار کے کش لگا رہا ہو، ظاہر ہے اس پورے شہر میں ایک میں ہی ہوں جو غم کا مارا ہے اس نے متفکرانہ نظروں سے بازار کی جانب دیکھا۔

دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ غیر ارادی طور سے سبزیوں کے ڈھیر کو پاؤں سے روندتا ہوا وہ اس جگہ پہنچا جہاں برتن بک رہے تھے۔ عورتیں آواز دے دے کر اس کو بلا رہی تھیں۔ "دیکھو یہ برتن کتنے سستے ہیں اور یہ کھیرے اور ککڑیاں کتنے تازے اور عمدہ ہیں۔ لے جاؤ۔ مٹی کے بھاؤ لے جاؤ۔" یہ سب اس کو احمقانہ اور بے ہودہ لگا۔ وہ وہاں سے بھاگ کر چرچ پہنچا۔ چرچ میں دعائیں پڑھی جارہی تھیں۔ انہیں احساس تھا کہ وہ ایک مذہبی فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ان کے چہروں پر طمانیت اور سکون کی جھلک تھی۔ لیکن وہاں بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی وہ بھاگا بھاگا گلیوں میں آگیا۔ سورج کی تمازت کے باوجود گھنٹوں گلیوں میں پھرتا رہا۔ وہ ایک غیر آباد چھوٹے سے پارک میں پہنچا۔ پارک پہاڑی کے ڈھلان پر واقع تھا۔ اس کے کندھے کے فیتے اور یونیفارم کے بٹن اتنے گرم ہو گئے کہ چھونے سے ہاتھ جلتے تھے۔

ہوٹل واپس آنے پر اسے قدرے سکون ملا۔ کشادہ ڈائننگ ہال میں اسے بہت آرام محسوس ہوا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور کھڑکی کے قریب اسٹول پر بیٹھ گیا۔ اس نے سوپ کا آرڈر دیا۔ ہر شے خوشی سے جھوم رہی تھی۔ باہر سے آتی ہوئی ہواؤں میں نمک کی بو تھی۔ چھوٹے سے ہوٹل کے در و دیوار جوش مسرت سے وجد کر رہے تھے۔ چہار طرف مستی سرشاری کے باوجود اس کا دل فرط غم سے پاش پاش ہو کر فضا میں جیسے بکھر رہا تھا۔ اس نے وڈکا (Vodka) کے کئی چھوٹے چھوٹے گھونٹ لئے۔ اس کا دل مسوس رہا تھا۔ دل نے پکارا کاش کسی طرح ایک لمحے کے لئے، ایک پل کے لئے اسے وصال نصیب ہو جائے تو وہ بڑے آرام سے دوسرے دن موت کی آغوش میں سو جائے گا۔ کیا کسی صورت بھی اسے موقع میسر ہو جائے کہ وہ ثابت کر سکے کہ اس کی محبت پاک اور سچی ہے۔ اس کی محبت

لئے آگے سب کچھ ہیچ ہے۔ اس کی محبت ایک روشنی ہے جو آج بھی گرمی اور سکون بخش رہی ہے۔ لیکن وہ اس کے جذبات بیان ہونے کا اظہار کیوں کرے؟ دل کی دھڑکن اور دل کی دھڑکنوں کے لئے ٹوٹنے کی باتیں ان سے کیوں کہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ لیکن زندہ رہنے کے لئے ضروری تھا کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو۔

"میرے اعصاب مجھے دھوکہ تو نہیں دے رہے ہیں۔" اس نے پانچواں گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے سوچا۔

وہ پوری بوتل پی چکا تھا۔ اسے امید تھی کہ نشے کے عالم میں وہ تمام درد و غم بھول جائے گا۔ لیکن درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

اس نے یخ بستہ سبزی کا سوپ پرے ہٹایا۔ اور کالی کافی کا آرڈر دیا۔ ایک سگریٹ سلگائی۔ وہ سنجیدگی سے غور کرنے لگا کہ کس طرح اس ناخواستہ محبت سے نجات حاصل کرے۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس دل کی لگی سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ درد دل تو لادوا ہے۔ وہ اچانک تیزی سے اٹھا اور لوگوں سے پوچھ کر پوسٹ آفس کی جانب روانہ ہوگیا۔ ٹیلی گرام کا مضمون اس کے ذہن میں نقش تھا۔ آج سے میں اپنی پوری زندگی تم پر نثار کرتا ہوں تم وفا کرو نہ کرو۔ پوسٹ آفس کی عمارت کے قریب وہ رک گیا۔ وہ اس خیال سے چونک گیا کہ اسے تو اس کا نام معلوم نہیں ہے۔

وہ جس شہر میں رہتی تھی اس کا نام اسے معلوم تھا۔ یہ بھی اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے شوہر اور تین سالہ بچی کے ساتھ اس شہر میں رہتی ہے۔ لیکن اسے اس کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس نے اپنا نام کبھی بتایا ہی نہیں۔ جب بھی وہ نام پوچھتا وہ ٹال دیتی "تمہیں اتنی فکر کیوں ہے کہ میں کون ہوں۔ میں ناریا گرین یا فیری لینڈ کچھ بھی ہوسکتی ہوں۔ یا پھر فقط۔ ایک خوبصورت اجنبی۔ کیوں کیا اتنا کافی نہیں ہے۔"

پوسٹ آفس کے قریب ایک کونے میں شوکیس میں کچھ تصویریں آویزاں تھی۔ وہ ایک فوجی افسر کی تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی باہر کو نکلی ہوئی آنکھیں، تنگ پیشانی، شاندار گھنی مونچھیں۔ انعامات کے نشانات سے مزین کشادہ سینہ۔ سب اسے احمقانہ اور معمولی لگا۔ لغویات۔ اب جاکر اس پر یہ راز کھلا کہ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ وہ دل ہار بیٹھا تھا۔ محبت کی دیوی نے اس کا دل شکار کرلیا تھا۔ جیسے کہ کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ درد عشق میں خوشی کی لہر تھی۔ زیست کا مزہ بھی تھا۔ پھر اس کی نگاہ ایک شادی شدہ جوڑے پر پڑی۔ ایک نوجوان فراک کوٹ اور سفید نکٹائی میں ملبوس۔ اس کے بازوؤں میں اس کی دلہن، چہرے پر ہلکا نقاب۔ اس نے اپنی نظر ایک دوشیزہ کی تصویر پر ڈالی۔ خوبصورت چہرہ۔ زندگی سے متحرک دو حسین آنکھیں۔ اور [illegible] شدید رقابت کے جذبے سے [illegible] تڑپ اٹھا۔ یہ خوش نصیب لوگ مرے دل کی آگ کی لپٹیں کیا جانیں۔ انھیں کیا معلوم۔

اب وہ نیچے گلی کی جانب دیکھنے لگا۔ میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ اس طرح کے سیکڑوں سوالات اس کے ذہن میں اٹھتے رہے۔

گلی ویران تھی۔ گلی کے دونوں کناروں پر ایک ہی طرح کے سفید مکانوں کی قطار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ سارے مکانات غیر آباد ہیں۔ راہ گزر پر گرد کی موٹی تہہ جم گئی تھی۔ ہر شے چمک رہی تھی۔ ہر شے گرم، شوخ سورج کی کرنوں میں لپٹی خوشی سے جھوم رہی تھی۔ گلی بل کھاتی، لڑھکتی دور بہت دور نیلگوں آسمان کے کناروں پر چمکتے روشن افق سے گلے مل رہی تھی۔ وہ آگے جانا نہیں چاہتا تھا جہاں گزرے لمحات کی تلخیاں یادوں کے جھروکے سے جھانک رہی تھیں لیفٹیننٹ سر جھکائے، زمین پر نظریں گاڑے آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

وہ ہوٹل لوٹ آیا۔ وہ بہت تھک گیا تھا جیسے صحارا اور ترکستان کے لمبے سفر سے واپس آیا ہو۔ بہت ہمت کرکے وہ اپنے کشادہ لیکن ویران کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں صفائی کی گئی تھی۔ ساری یادگار چیزیں ہٹادی گئی تھیں۔ صرف ایک اکیلا پیپر پن (Paperpin) پلنگ کے قریب اسٹول پر پڑا اس کی یاد دلا رہا تھا۔ اس نے اپنا جیکٹ اتارا اور آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ آئینہ سے اس کا سانولا چہرہ جھانک رہا تھا۔ ایک افسر کا معمولی چہرہ۔ سورج کی کرنوں سے ڈھلی سفید مونچھیں۔ نیلی، اجلی آنکھیں۔ ان آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ یہ جنونی منتظر آنکھیں جیسے غموں کی داستان سنا رہی ہوں۔

وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں، پردے گرے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے وقفہ سے وولگا کی طرف سے آتی ہوئی نرم ہوائیں کمرے میں بھر جاتیں۔ وہ اپنے بازوؤں کو سر کے نیچے رکھے خلا کو تک رہا تھا۔ اس کے ذہن میں دور جنوب میں سورج اور سمندر کی تصویریں بنتی بگڑتی رہیں، لیکن یہ سب فقط ایک طلسم تھا گویا وہ شہر جہاں وہ چلی گئی اور اب رہائش کر رہی ہے وہ شہر ضرور دوسرے شہروں سے مختلف ہوگا۔ اور پھر اس کے ذہن میں گرم گرم آنسوؤں کے قطرے اور پرنم آنکھوں کی تصویریں ابھریں۔ اس کے اعصاب تھک گئے تھے اور پھر وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ جب اس کی آنکھیں کھلیں تو سرخ سورج پردے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ ہوائیں چلنی بند ہوگئی تھیں۔ کمرہ خشک، گھٹا گھٹا سا تھا جیسے تندور سے آتی ہوائیں کمرے میں آکر جلد ہوگئی ہوں۔ اور اسے محسوس ہوا کہ کل سے آج تک تو دس سال گزر چکا تھا۔

پھر آہستہ سے وہ اٹھا۔ بہت اطمینان سے بدن کو دھویا، پردے کو ایک طرف سرکایا اور بیرا کو بلانے کے لئے گھنٹی بجائی۔ بیرا کو بل لانے کو کہا، بہت دیر تک لیموں کے ساتھ چائے پیتا رہا۔

اس نے بگھی منگوائی۔ سامان کو اس پر لادا اور بوسیدہ پھٹے سیٹ کی گدی پر جا بیٹھا۔ جاتے جاتے بیرا کے ہاتھ پر پانچ روبل بطور ٹپ رکھ دیا۔ "جناب؟ میں ہی آپ کو گزشتہ شب یہاں لایا تھا۔ کیوں؟" کوچوان لگام سنبھالتے ہوئے بولا۔

جب وہ گودی پر پہنچے۔ رات ہوچکی تھی۔ وولگا کے سطح آب پر رنگ برنگ شعلے تیر رہے تھے۔ آتا ہوا جہاز کا مستول پر خوش رنگ شعلے جھول رہے تھے۔

"دیکھا۔ میں آپ کو ٹھیک وقت پر لے آیا" کوچوان نے چہکتے ہوئے کہا۔ لیفٹیننٹ نے اس کو بھی پانچ روبل دیا۔ پھر ہاتھ میں ٹکٹ تھامے گودی پر چلا گیا۔

جہاز چیخا۔ تار کا ایک سرا اس کے سر سے ٹکرایا۔ پانی میں اضطراب پیدا ہوا۔ دوسرے لمحے جہاز روانہ ہوگیا۔ اسی رخ مڑ گیا جس رخ صبح وہ گئی تھی۔

آگے دور شام کے سائے تیزی سے پھیل رہے تھے۔ ڈوبتے سورج کی اداس کرنیں سطح آب پر قوس و قزح کے رنگ کے جھلملاتے بھنور بنا رہے تھے۔ تاریکی میں جہاز سے لپٹے شعلے معلوم ہوتے گئے۔

لیفٹیننٹ عرشے پر چھپا بیٹھا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ دس سال بوڑھا ہوگیا ہے۔

☆☆☆

البرٹ کامیو　　　　قسط:۱　　　　مترجم: ثریا فاروقی

غلط فہمی

کردار

بوڑھا نوکر :
مارتھا　: جان کی بہن، عمر ۳۰ سال
ماں　: عمر ۶۰ سال
جان　: لڑکا، عمر ۳۸ سال
ماریا　: جان کی بیوی، عمر ۳۰ سال

پہلا ایکٹ

دوپہر کا وقت سرائے کا روشن صاف ستھرا کمرہ اور ہر چیز صاف ستھری قرینے سے لگی ہوئی۔

ماں: وہ واپس آئے گا؟

مارتھا: کیا اس نے آپ سے ایسا کہا تھا؟

ماں: ہاں۔

مارتھا: اکیلے؟

ماں: یہ میں نہیں کہہ سکتی

مارتھا: وہ ایسا تو نہیں نظر آرہا تھا، جس سے سمجھا جائے کہ وہ غریب ہے۔

ماں: نہیں، اور نہ ہی اس نے یہ پوچھا کہ مکان کا کرایہ کیا ہوگا؟

مارتھا: یہ تو اچھی بات ہے لیکن عام طور پر دولت مند لوگ اکیلے سفر نہیں کرتے اور شاید اس وجہ سے یہ بات مشکل نظر آرہی ہے۔ آپ کو صدیوں انتظار کرنا ہوتا ہے خصوصاً جب آپ ایسے شخص کا انتظار کر رہے ہوں جو دولت مند بھی ہو اور تنہا بھی۔

ماں: ہاں اس طرح کے مواقع کم ملتے ہیں۔

مارتھا: اس کا مطلب ہے کہ پچھلے سالوں سے ہمارا دھندا بہت مندا چل رہا ہے۔ یہ جگہ اکثر خالی رہتی ہے۔ غریب لوگ یہاں زیادہ دنوں قیام نہیں کرتے اور کوئی دولت مند یہاں شاید ہی آتا ہو۔

ماں: اس بارے میں زیادہ فکر نہ کرو مارتھا۔ امیر لوگ آتے ہیں تو ہمارا کام بھی بہت بڑھ جاتا ہے۔

مارتھا: (ماں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) لیکن وہ بہت زیادہ دیتے بھی تو ہیں۔ (تھوڑی خاموشی) ماں مجھے بتایئے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ دنوں سے محسوس کر رہی ہوں کہ آپ کچھ عام دنوں جیسی نہیں نظر آرہی ہیں۔

ماں: عزیزم میں بہت تھک گئی ہوں۔ صرف یہی بات ہے۔ میں طویل آرام کرنا چاہتی ہوں۔

مارتھا: ماں سنئے میں ان سارے کاموں، گھریلو کاموں کی ذمہ داری لے سکتی ہوں جو آپ کرتی ہیں تب آپ کو زیادہ فرصت کے اوقات مل جائیں گے۔

ماں: میں اس طرح کے آرام کی بات نہیں کر رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک بوڑھی عورت کا واہمہ ہے۔ میری خواہش صرف سکون کی ہے۔ کچھ دیر آرام کرلوں۔ (وہ ہلکی ہنسی ہنستی ہے) میں جانتی ہوں میرا یہ کہنا کتنا احمقانہ لگتا ہے۔ لیکن اکثر شاموں کو میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میں مذہبی بن جاؤں۔

مارتھا: ماں آپ زیادہ بوڑھی تو نہیں ہوئی ہیں۔ نہ ہی آپ کی عمر ابھی بہت زیادہ ہوئی ہے میں سمجھتی ہوں ابھی آپ بہت دنوں تک چاق وچوبند رہ سکتی ہیں۔

ماں: ہاں ٹھیک کہتی ہو بیٹی میں تو مذاق کر رہی تھی۔ یہ میرا خیال نہیں ہے۔ جب زندگی کی شام ہونے لگے تو چیزوں کو بہت سہولت سے لینا چاہئے۔ آدمی ہمیشہ نہ سیدھا اور نہ ہی ایک جیسا رہ سکتا ہے۔ مارتھا اور تمہاری عمر کی دوسری لڑکیوں کو جانتی ہوں جو تمہارے ساتھ پیدا ہوئیں اور وہ زندگی میں صرف تفریح کے بارے میں سوچتی رہیں۔

مارتھا: ان کی تفریح اور ان کی آسائشیں ہمارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ ماں، کیا آپ کو اس سے اتفاق نہیں؟

ماں: میں چاہوں گی کہ تم اس طرح کی باتیں نہ کرو۔

مارتھا: (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں یہ ضرور ہے ماں کہ آج کل بولتے ہوئے بہت سے الفاظ ٹوٹ جاتے ہیں۔

ماں: اس سے تم سے کیا مطلب؟ تم دیکھو کہ میں کسی کام سے جی نہیں چراتی۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میرا صرف اتنا ہی مطلب ہے کہ میں تم کو مستقبل میں مسکراتے ہوئے دیکھ سکوں۔

مارتھا: میں اکثر ہنستی ہوں۔ آپ یقین رکھئے۔

ماں: واقعی؟ لیکن میں نے تمہیں ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

مارتھا: ایسا اس لیے ہے کہ ہنستے وقت میں اپنے بستر میں ہوتی ہوں۔

ماں: (اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) تمہارا چہرہ کتنا سخت ہو گیا ہے۔

مارتھا: (نزدیک آتے ہوئے) کیا آپ کو میرا چہرہ اچھا نہیں لگتا۔

ماں: (کچھ دیر کی خاموشی کے بعد) مجھے حیرت ہے، میرا خیال ہے کہ میں تمہیں بہت چاہتی ہوں۔

مارتھا: (جذباتی ہو کر) او ماں آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ ایک بار ہمارے ہاتھوں میں ڈھیر سارا پیسہ آجائے ہم اس بند گھاٹی سے نکل سکیں۔ اور ہم لوگ اس سرائے کو خیر باد کہہ سکیں۔ اس قصبے سے جہاں ہر وقت بارش ہوتی ہے۔ ایک بار جب ہم اس زمین کی

پر چھائیوں کو بھول جائیں گے۔ تب اس وقت میرا خواب پورا ہو جائے گا۔ تب ہم لوگ سمندر کے کنارے رہیں گے۔ اس وقت آپ مجھے ہنستے ہوئے دیکھیں گی۔ سمندر کے کنارے رہنے کے لیے بہت زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ہمیں لفظوں سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ جو آدمی یہاں رہنے کے لیے آیا ہے اس کے لیے ہمیں تکلیف برداشت کرنی چاہئے۔ اگر وہ دولت مند ہوا تو شاید میری آزادی اس کے ساتھ شروع ہو۔

ملی: ہاں اگر وہ دولت مند ہو اور اکیلا بھی ہو اتو۔

مارتھا: ایسا ہی ہے۔ وہ اکیلا ہی ہے اور کیا اس نے آپ سے زیادہ باتیں کی ہیں؟

ملی: نہیں اس نے بہت کم بات کی۔

مارتھا: جب اس نے کمرے کے بارے میں پوچھا تو وہ کیسا نظر آرہا تھا؟

ملی: میری آنکھیں کمزور ہیں۔ جیسا کہ تم جانتی ہو۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا بھی نہیں۔ میں نے اپنے تجربے سے سیکھا ہے کہ لوگوں کی طرف غور سے دیکھنا بھی نہیں چاہئے۔ اس وقت جان سے مارنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے جب جانتے نہ ہوں۔ (تھوڑی خاموشی) اس سے تمہیں خوشی ہونی چاہئے۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ میرے پاس لفظوں کی کمی ہے۔

مارتھا: ہاں ماں، میں اس کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ اشارے کنائے میرے لئے کوئی مطلب نہیں رکھتے۔ جرم تو جرم ہے۔ بس یہ جاننا چاہئے کہ کیا کرنا ہے اور جو کچھ آپ نے ابھی کہا ہے اس سے لگتا ہے کہ جب آپ مسافر سے بات کر رہی تھیں تو آپ کے دماغ میں بھی منصوبہ تھا۔

ملی: نہیں اس وقت میرا یہ ارادہ نہیں تھا۔ بلکہ فطرتاً یہ خیال آیا تھا۔

مارتھا: فطرتاً؟ لیکن آپ نے تو خود ہی کہا ہے کہ اس طرح کے مواقع زندگی میں بہت کم آتے ہیں۔

ملی: یقیناً، لیکن فطرت تو دوسرے جرم کے بعد بنتی ہے۔ پہلے کے ساتھ کچھ شروع نہیں ہوتا بلکہ ختم ہی ہو جاتا ہے۔ اور تب جب کہ ہمیں موقع بھی کم ملتا ہے اور وہ بھی کئی سالوں کے وقفے کے بعد کیا جاتا ہے صرف یادداشت کی بدولت عادت بنتی ہے۔ ہاں ایسا عادت کی ہی وجہ سے ہوا کہ میں نے اس آدمی کے اوپر نگاہیں ڈالیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہمارا شکار بن جائے گا۔

مارتھا: ہمیں ضرور اس کی جان لینی چاہئے۔

ملی: (دھیمی آواز میں) ہاں میرا خیال ہے تمہیں ایسا کرنا پڑے گا۔

مارتھا: آپ نے یہ بات عجیب سے لہجے میں کہی۔

ملی: میں تھکی ہوئی ہوں۔ یہ سچ ہے تاہم میں چاہوں گی کہ ہمارا یہ کام آخری ہو۔ کسی کی جان لینا بہت تھکا دینے والا کام ہے۔ اور گرچہ مجھے اس کی فکر نہیں ہے کہ میں کہاں مروں گی۔ سمندر کے کنارے یا یہاں یا دور دراز کسی علاقے میں۔ مجھے امید ہے کہ جیسے ہی یہ کام ختم ہوگا ہم دونوں فوراً یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔

مارتھا: بیشک...... وہ کتنا شاندار لمحہ ہوگا۔ اس لیے ماں خوش ہو جاؤ ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ تم جانتی ہو کہ اسے مارنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ چائے پی کر سونے جائے گا۔ وہ اس وقت بھی زندہ ہوگا۔ جب ہم اسے ندی تک لے جائیں گے۔ کچھ دنوں بعد بلکہ کافی دنوں بعد اسے پشتے سے ٹکراتا ہوا پایا جائے گا۔ ان لوگوں کے ساتھ جن کی ایسی قسمت نہیں تھی۔ جنھوں نے کھلی آنکھوں سے ندی میں چھلانگ لگا دیا۔ کیا تمہیں یاد ہے جب ہم پچھلے سال نہر کے پھاٹک کی مرمت دیکھ رہے تھے تو تم نے کیسے کہا تھا کہ اس شخص نے کم تکلیف اٹھائی اور زندگی اس کے لیے اتنی ظالم نہیں تھی جتنی کہ ہم۔ اس لیے دل چھوٹا نہ کیجئے۔ آپ کو جلد ہی آرام مل جائے گا۔ میں بھی وہ دیکھ سکوں گی جسے آج تک نہیں دیکھا۔

ملی: ہاں مارتھا۔ میں دل برداشتہ نہیں ہو رہی ہوں۔ اور یہ بھی بالکل صحیح ہے جو کچھ تم نے ہم لوگوں کے بارے میں کہا ہے۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ ان لوگوں نے زیادہ دکھ نہیں جھیلا۔ ہاں واقعی یہ کوئی جرم نہیں ہے بلکہ ایک طرح کی مداخلت، کچھ انجانی زندگیوں پر انگلیوں کے نشان اور یہ بھی بالکل صحیح ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ہم سے زیادہ زندگی ان کے لیے ظالم ہے۔ شاید یہی وجہ ہے میں خود کو مجرم نہیں محسوس کرتی، میں صرف تھوڑی تھکاوٹ محسوس کرتی ہوں۔ (بوڑھا خادم اندر آتا ہے وہ باہر کاؤنٹر کے پیچھے خاموش بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جان اندر داخل ہو جاتا ہے)

مارتھا: اسے ہم کس کمرے میں ٹھہرائیں گے۔

ملی: کسی بھی کمرے میں بشرطیکہ وہ پہلی منزل پر ہو۔

مارتھا: ہاں پچھلی بار ان دو زینوں کی وجہ سے ہمیں خواہ مخواہ کی پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ (پہلی بار وہ بیٹھتی ہے) ماں کیا یہ سچ ہے کہ ساحل کے نیچے بالو اتنا گرم ہوتا ہے کہ پیروں میں چھالے پڑ جائیں۔

ملی: جیسا کہ تم جانتی ہو مارتھا میں وہاں کبھی نہیں گئی۔ لیکن مجھے بتایا گیا ہے وہاں سورج کی شعاعیں سب کچھ جلا دیتی ہیں۔

مارتھا: میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ وہ آدمیوں کی روحوں کو بھی جلا دیتی ہیں اور ان کے جسموں کو سونے کی طرح چمکا دیتی ہیں۔ کیا وہ بالکل خالی ہوتے ہیں۔ ان کے اندر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

ملی: کیا یہی وجہ ہے کہ تم وہاں جانے کی بہت زیادہ خواہش مند نظر آتی ہو۔

مارتھا: ہاں میری روح میرے لئے بوجھ بن گئی ہے۔ اسے میں نے بہت زیادہ سہہ لیا ہے۔ اب میں دیہی علاقے میں جانے کی خواہش مند ہوں۔ جہاں سورج سارے سوالوں کو جلا دیتا ہے۔ میں اس جگہ کے لیے نہیں ہوں۔

ملی: بدقسمتی سے ہمیں بہت کچھ تیاری پہلے سے کرنی پڑتی ہے۔ ہاں جب سب قصہ ختم ہو جائے گا۔ اس وقت میں بھی تمہارے ساتھ وہاں جاؤں گی۔ لیکن میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔ میرے اندر یہ احساس کبھی نہیں پیدا ہوگا کہ میں وہاں جا رہی ہوں۔ جو علاقہ میرے لیے بنا ہے۔ ایک عمر کے بعد آدمی کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے ٹھکانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ بیشک اس گندے اینٹ کے مکان کے لیے بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ جسے ہم نے اپنا مکان بنایا ہے اور جس میں اپنی ساری یادیں سمودی ہیں۔ جب ہم ان یادوں میں سو سکتے ہیں اس وقت اس کی اہمیت زیادہ بڑھ جائے گی اگر میں سب کچھ بھول کر سو سکوں (وہ اٹھتی ہے اور دروازے تک جاتی ہے) چھلا مارتھا تم ساری تیاری مکمل کر لو۔

(وقفہ)

اگر ہماری کوششوں کا نتیجہ نکل سکے۔

(ملازمہ تعجب سے اسے باہر جاتے ہوئے دیکھتی ہے۔ پھر وہ
خود بھی دوسرے دروازے سے باہر نکل جاتی ہے۔ کچھ
لمحے کے لیے بوڑھا خادم اسٹیج پر اکیلا رہ جاتا ہے۔ جان
داخل ہوتا ہے۔ رکتا ہے۔ کمرے کے چاروں طرف نگاہ
دوڑاتا ہے۔ پھر اس بوڑھے خادم کو کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا
دیکھتا ہے)

جان: یہاں کوئی نہیں (بوڑھا آدمی اسے دیکھتا ہے۔ کھڑا ہوتا ہے اور پھر باہر نکل جاتا ہے۔ ماریا داخل ہوتی ہے۔ جان اس کی طرف جاتا ہے) تو تم میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آگئیں۔

ماریا: مجھے معاف کرنا میں مجبور تھی۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گی۔ مجھے صرف وہ جگہ دیکھ لینے دو جہاں تم کو چھوڑ کر جاؤں گی۔

جان: یہاں کوئی آجائے گا اور تمہاری موجودگی سے میرا منصوبہ خاک میں مل جائے گا۔

ماریا: کوئی بات نہیں مجھے یہ چانس لینے دو کوئی یہاں آئے اور میں بتادوں کہ تم کون ہو؟ مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں چاہتے ہو لیکن...... (وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے مڑتا ہے۔ خاموشی، ماریا کمرے کو جانچتی ہے) تو یہی جگہ ہے۔

جان: ہاں یہی وہ دروازہ ہے جس سے بیس سال پہلے میں باہر نکلا تھا۔ میری بہن اس وقت بہت چھوٹی سی بچی تھی۔ وہ اس کنارے پر کھیل رہی تھی۔ میری ماں مجھے پیار کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھی تھی اس وقت مجھے اس کی فکر بھی نہیں تھی۔

ماریا: جان مجھے اس بات پر یقین نہیں کہ وہ تمہیں پہچان نہ لیں۔ ماں تو اپنے بچے کو پہچاننے کے لیے مجبور ہے۔ کم سے کم وہ اتنا تو کر سکتی ہے۔

جان: شاید لیکن بیس سال کا وقفہ کافی فرق لا دیتا ہے۔ میرے جانے کے بعد بھی زندگی بہر طور گزرتی رہی۔ میری ماں بوڑھی ہو گئی ہے۔ اس کی آنکھوں کی روشنی بھی کم ہو گئی ہے۔

ماریا: (بے چینی سے) مجھے معلوم ہے تم اندر آرہے ہو۔ یہ کمرہ اس طرح کا نہیں ہے جو تمہاری یادداشت میں محفوظ رہے۔

جان: ہاں میری یادداشت نے مجھے دھوکہ دیا۔ انہوں نے ایک لفظ بھی کہے بغیر میرا استقبال کیا۔ مانگنے پر انہوں نے ایک گلاس بیئر دیا۔ انہوں نے میری نگہبانی کی۔ لیکن میری طرف دیکھا نہیں۔ ہر بات میری امید کے برخلاف نظر آئی۔

ماریا: تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ اتنا مشکل نہیں ہوتا۔ تمہیں تو صرف بولنا تھا۔ ایسے موقعے پر کہا جاتا ہے یہ میں ہوں۔ اور پھر بات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

جان: صحیح ہے لیکن میرے تصور میں بہت سی دوسری باتیں تھیں۔ مجھے امید تھی کہ ایک لڑکے کی طرح میرا استقبال کیا جائے گا۔ جب کہ قیمت کی ادائیگی کے بعد مجھے ایک گلاس بیئر دی گئی اس وجہ سے سارے الفاظ میرے منہ سے پھسل گئے۔ میں نے سوچا واقعات اپنے آپ راز افشا کر دیں گے۔

ماریا: کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ سلسلہ آگے بڑھتا یہ تو صرف تمہارا خیال تھا۔ ایک لفظ بھی اس وقت کافی ہوتا۔

جان: میں نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ لیکن چیزیں ویسی ہی ہو گئیں۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ انہیں کچھ اپنی رقم دے سکوں۔ اور اگر ممکن ہو تو خوشیاں جب میں نے اپنے باپ کی موت کی خبر سنی تو مجھے احساس ہوا کہ ان دو عورتوں کے لیے میری کچھ ذمہ داریاں ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ کر رہا ہوں جو میرے لئے مناسب ہے۔ لیکن بظاہر اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا لوگ سمجھتے ہیں اپنے پرانے گھر میں آکر ایک اجنبی کو اولاد بننے میں وقت لگتا ہے۔

ماریا: لیکن تم نے سچ باتیں انہیں فوراً کیوں نہیں بتادیں۔ ایسے بھی حالات ہوتے ہیں۔ جب صاف اور سچی بات کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے اگر یہ خواہش ہے کہ لوگ آپ کو پہچانیں۔ سمجھداری کی بات یہی ہے۔ آپ اپنا نام فوراً بتادیں۔ تم کو کیسے امید تھی کہ تم اس گھر میں اجنبی نہیں سمجھے جاؤ گے۔ جب کہ تم اپنا چہرہ بدل کر آئے ہو۔ نہیں ڈیئر جس طرح کا تم نے برتاؤ کیا وہ مناسب نہیں تھا۔

جان: ارے چھوڑو ماریا۔ یہ ایسی اہم بات نہیں ہے جیسی تم سمجھ رہی ہو۔ یہ بھی تم خیال رکھو کہ یہ میرے منصوبے کے مطابق ہے۔ اس سے مجھے موقع ملے گا کہ میں انہیں دور سے دیکھ سکوں۔ تبھی میں یہ سمجھ سکوں گا کہ انہیں خوشی دینے کے لیے کیا کرنا چاہئے۔ اس کے بعد ہی میں کچھ ایسا کروں گا کہ جس سے وہ مجھے پہچان لیں۔ یہ تو لفظوں کے انتخاب پر منحصر ہے۔

ماریا: نہیں اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہی راستہ جو ہر آدمی اپناتا ہے کہ یہ میں ہوں اس کے بعد تو بات چیت شروع ہو جاتی ہے۔

جان: یہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ لیکن تمہیں سیدھے سیدھے لفظ کو استعمال کرنے اور یہ کہنے میں کوئی دشواری بھی نہیں ہوگی۔ میں تمہارا لڑکا ہوں یہ میری بیوی ہے۔ میں اس کے ساتھ ایسے ملک میں رہ رہا ہوں جس کو ہم دونوں پسند کرتے ہیں۔ ایک ایسی سرزمین جہاں بہت زیادہ سورج کی روشنی ہے اور سمندر بھی ہے لیکن میری خوشیوں کو مکمل کرنے میں کچھ کمی رہ گئی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجھے آپ لوگوں کی ضرورت ہے۔

جان: ماریا ایسی ناانصافی کی بات نہ کرو۔ مجھے ان لوگوں کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف یہ محسوس ہوا کہ ان لوگوں کو میری ضرورت ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان صرف اپنے آپ تو نہیں رہ سکتا۔

(تھوڑی خاموشی)

(ماریا دوسری طرف دیکھتی ہے)

ماریا: شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے افسوس ہے جو میں نے کہا۔ یہاں آکر میں حد سے زیادہ شک میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ بہت تلاش کرنے کے بعد بھی مجھے کوئی یہاں مسکراتا ہوا چہرہ نظر نہیں آیا۔ تمہارے یورپ کا یہ حصہ بہت غمگین ہے۔ یہاں آنے کے بعد میں نے تمہیں بھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا اور ذاتی طور پر میں خود ایک تناؤ محسوس کر رہی ہوں۔ تم نے مجھے...... میرا منہ کیوں کھلوایا۔ چلو ہم لوگ یہاں سے چلیں جان۔ یہاں ہمیں کوئی خوشی نہیں ملے گی۔

جان: ہم یہاں خوشی کے لیے نہیں آئے ہیں۔ ہمیں پہلے بھی زیادہ خوشی حاصل تھی۔

ماریا: (جذباتی ہو کر) تو تم اس خوشی سے مطمئن کیوں نہیں ہو گئے؟

جان: خوشی ہی سب کچھ نہیں ہے، کچھ ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ میری ذمہ داری اپنے ملک میں اپنی ماں کے پاس آنے کی تھی۔

(ماریا احتجاج کے انداز میں اسے جواب دینا چاہتی ہے۔ جان اسے روکتا ہے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے)

کوئی آسکتا ہے تم جلدی جاؤ۔

ماریا: نہیں۔ اور کسی صورت میں ابھی نہیں۔

جان: (قدموں کی آہٹ پاس آتی ہے) تم یہاں جاؤ۔ (وہ اسے پیچھے سے دھکا دے کر پچھلے دروازے کی طرف لے جاتا ہے۔ بوڑھا خادم جان کو دیکھے بغیر کمرے سے گزرتا ہوا دروازے کے باہر نکل جاتا ہے)

تم فوراً یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔ دیکھو قسمت ہماری یاوری کر رہی ہے۔

ماریا: مجھے یہاں رہنے دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایک لفظ نہیں بولوں گی۔ تمہارے ساتھ اس وقت تک رہوں گی جب تک تم یہاں نہ لئے جاؤ۔

جان: نہیں، تم ہمارا راستہ صاف کردو۔

(ماریا دوسری طرف مڑتی ہے واپس آتی ہے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہے)

ماریا: جان ہماری شادی ہوئے پانچ سال ہو چکے ہیں۔

جان: ہاں پانچ سال پورے ہو گئے۔

ماریا: (نگاہیں نیچی کرتی ہے) اور یہ ہماری پہلی رات ہوگی جسے ہم الگ الگ گزاریں گے۔

(وہ کچھ بولتا نہیں ہے اور ماریا اس کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھتی ہے)

میں نے ہمیشہ تمہاری ہر چیز سے پیار کیا ہے۔ حتیٰ کہ ان چیزوں سے جنہیں میں سمجھ نہیں سکی۔ میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ تم جو کچھ ہو اس کے لیے کچھ اور ہو جاؤ۔ میں بہت زیادہ پریشان کرنے والی بیوی نہیں ہوں، لیکن اب اس وقت میں اس خالی بستر سے بہت زیادہ خوفزدہ ہو رہی ہوں جس پر تم مجھے بھیج رہے ہو اور میں اس وجہ سے بھی خوفزدہ ہوں کہ تم مجھے اپنے سے جدا کر رہے ہو۔

جان: یقیناً تمہیں میری محبت پر پورا بھروسہ ہونا چاہئے۔

ماریا: مجھے تم پر بھروسہ ہے لیکن تمہاری محبت کے علاوہ تمہارے اپنے خواب ہیں یا تمہاری ذمہ داریاں۔ دونوں کو ایک ہی سمجھو۔ یہ دونوں مل کر اکثر تمہیں مجھ سے دور کر دیتے ہیں۔ ان لمحوں میں میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ تم مجھ سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو لیکن میں تم سے رخصت نہیں لیتی اور آج کی رات (وہ روتے ہوئے اس کے قریب آتی ہے) ہاں آج کی رات تمہارے بغیر...... میں اسے برداشت نہیں کر سکوں گی۔

جان: (اسے گلے سے قریب کرتے ہوئے) لیکن یہ تمہارا بچپنا ہے۔

ماریا: ہاں یہ بچپنا ہے لیکن...... ہم وہاں کتنا خوش تھے۔ یہ میری غلطی نہیں ہے اس قصبے کی راتیں مجھے ڈراتی ہیں۔ میں آج کی رات بالکل اکیلے نہیں سونا چاہتی۔

جان: مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، مجھے ایک وعدہ پورا کرنا ہے اور یہ بہت اہم ہے۔

ماریا: کون سا وعدہ؟ کیسا وعدہ؟

جان: وہ وعدہ جو میں نے اپنے آپ سے کیا تھا۔ اس دن جب میری سمجھ میں آیا کہ میری ماں میری ضرورت محسوس کرتی ہوگی۔

ماریا: تمہیں ایک دوسرا وعدہ بھی تو پورا کرنا ہے۔

جان: ہاں؟

ماریا: وہ وعدہ جو تم نے میری زندگی میں شامل ہونے والے دن کیا تھا۔

جان: یقیناً میں دونوں وعدہ پورا کر سکتا ہوں۔ میں آج جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں وہ بہت خطرناک نہیں ہے اور نہ ہی یہ واہمہ ہے۔ صرف ایک شام، صرف ایک رات جس میں میں یہاں اپنا سب کچھ نکال سکوں۔ ان دو عورتوں کو اچھی طرح سمجھ سکوں جو مجھے عزیز ہیں انہیں خوشیاں دے سکوں۔

ماریا: (اپنا سر ہلاتے ہوئے) ان لوگوں کے لئے جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، جان سے بڑھ کر محبت۔ ان کے لئے جدائی ہمیشہ بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔

جان: اے رومانٹک لڑکی۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔ میری چاہت اصلی ہے۔

ماریا: نہیں جان مرد یہ نہیں جانتے کہ اصلی محبت کیسی ہوتی ہے۔ جو کچھ بھی انہیں مل جائے، اس سے وہ کبھی بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ خواب دیکھتے ہیں۔ نئی نئی ذمہ داریاں پیدا کرتے ہیں۔ نئے نئے ملکوں اور نئے نئے گھروں میں جاتے ہیں۔ عورتیں ان سے مختلف ہوتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ زندگی مختصر ہوتی ہے اس لئے محبت کرنے میں جلدی کرنی چاہئے۔ وہ مرد کے ساتھ ایک بستر پر سونا چاہتی ہیں جن سے محبت کرتی ہیں ان سے ہم آغوش ہونا چاہتی ہیں۔ جدائی کا ہر لمحہ ان کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب آدمی محبت کرتا ہے اس وقت اس کے پاس خوابوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

جان: میری پیاری! تم بہت زیادہ جذبات سے کام لے رہی ہو۔ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ بہت سیدھی سی بات ہے۔ اپنی ماں سے دوبارہ ربط پیدا کرنے، اس کی مدد کرنے اور اس کو خوشیاں دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جہاں تک میرے خواب اور میری ذمہ داریوں کی بات ہے۔ تمہیں انہیں اسی طرح قبول کرنا ہے جیسے ان کے بغیر میں اپنی پرچھائیں بن کر رہ جاؤں گا اور شاید ان کے بغیر اتنی محبت نہ کرو جتنی کرتی ہو۔

ماریا: (اچانک اس کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے) ہاں مجھے معلوم ہے تم اسی طرح بات کرتے رہوگے۔ جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو اس کے لیے بہت سی دلیلیں جمع کرلیتے ہو۔ لیکن میں یہ سب کچھ نہیں سننا چاہتی ہوں۔ جب تم اس خاص لہجے میں جس سے میں اچھی طرح واقف ہوں بولنا شروع کرتے ہو تو میں اپنے کانوں کو بند کر لیتی ہوں۔ یہ تمہارے اکیلے پن کی زبان ہے محبت کی نہیں۔

جان: (اس کے پیچھے کھڑے ہوکر) اب اس وقت اس طرح کی باتیں نہ کرو۔ ماریا، میں اس وقت تم سے چاہتا ہوں تم مجھے تنہا چھوڑ دو تاکہ جو کچھ میرے ذہن میں ہے اس کا نقشہ بنا سکوں اس میں گھبرانے، پریشان ہونے یا عجوبے کی کوئی بات نہیں۔ اگر میں ایک کمرے میں اپنی ماں کے ساتھ سو رہا ہوں۔ اس کے بعد کا پورا منصوبہ خدا پورا کرے گا اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس طرح کی اداکاری کرنے میں میں تمہیں بھول نہیں رہا ہوں۔ صرف جلاوطنی یا تعلقات کے ختم ہونے سے کوئی خوش نہیں ہوتا اور نہ ہی تمام عمر کوئی اجنبی بن کر رہ سکتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ انسان کو خوشیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان کے ساتھ وہ دنیا میں اپنا مقام ڈھونڈنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور میرا یقین ہے کہ اپنے ملک میں واپس اور جن لوگوں کو میں پیار کرتا ہوں انہیں خوش کر کے میں اپنی جگہ تلاش کرلوں گا اس کے علاوہ میں کچھ نہیں چاہتا۔

ماریا: یقیناً تم سب کچھ کر سکتے ہو...... ان پیچیدگیوں کے بغیر نہیں۔ جان اندیشہ ہے کہ تم یہ کام غلط طریقے سے کرنے جا رہے ہو۔

جان: یہی ٹھیک طریقہ ہے کیونکہ اسی طریقے سے میں یہ
جان سکوں گا کہ میں نے یہ خواب سجا کر اچھا کیا یا
نہیں۔
ماریا: مجھے امید ہے، تمہیں احساس ہو گا کہ ذاتی طور پر
میرا بھی ایک خواب ہے۔ اس ملک کا جہاں ہم دونوں
خوشی خوشی رہ رہے تھے۔ میری بھی ایک ذمہ داری
ہے۔ صرف تمہاری۔
جان: (اسے گلے لگاتے ہوئے) میری پیاری مجھے اپنے
راستے پر چلنے دو میں ایسا حل تلاش کر لوں گا جس سے
ہر چیز مناسب طریقے سے انجام پا جائے۔
ماریا: (بہت زیادہ جذباتی ہو کر) پیارے اپنا خواب پورا
کرو۔ اگر تمہاری محبت ہمارے لئے ہی رہتی ہے تو
یہی سب کچھ ہے۔ عام طور پر جب تم میرے نزدیک
ہوتے ہو مجھے اپنی بانہوں میں لے لیتے ہو اس وقت
کسی بات پر ناراض نہیں ہوتی ہوں۔ میں اپنا وقت کاٹتی
ہوں۔ میں اس وقت تک انتظار کرتی ہوں جب تک تم
بادلوں سے نیچے نہیں آ جاتے تب پھر ہماری گردش
شروع ہوتی ہے۔ گرچہ مجھے تمہاری محبت پر یقین ہے
تاہم مجھے یہ یقین نہیں کہ تم اپنے ساتھ رہنے دوگے یا
نہیں۔ شاید یہی وجہ ہو کہ مرد کی محبت بہت ظالم ہوتی
ہے دل توڑنے والی۔ وہ ان چیزوں کو چھوڑتے ہوئے
بھی نہیں ہچکچاتے جنہیں بہت عزیز رکھتے ہیں۔
جان: (اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر مسکراتے
ہوئے) بالکل بجا لیکن ادھر میری طرف دیکھو۔
جیسا کہ تمہیں اندیشہ ہے؟ مجھے کوئی اندیشہ نہیں
ہے۔ میں صرف اپنے منصوبے کو پورا کر رہا ہوں۔
مجھے معلوم ہے کہ اس کا انجام بہتر ہی ہوگا تم صرف
ایک رات کے لیے مجھے میری ماں اور بہن کی
حفاظت میں چھوڑ رہی ہو۔ اس میں گھبرانے کی کیا
بات ہے؟
ماریا: (اپنے آپ کو اس کی بانہوں سے الگ کرتے
ہوئے) اچھا تو خدا حافظ۔ خدا کرے میری محبت
ڈھال بن کر تمہاری حفاظت کرتی رہے۔ (وہ
دروازے تک جاتی ہے اور اپنا ہاتھ آگے بڑھاتی
ہے) دیکھو میں کتنی غریب ہوں خالی ہاتھ جا رہی
ہوں تم جو کچھ بھرا کام کر رہے ہو۔ میں صرف انتظار
کر سکتی ہوں۔
(تھوڑا تامل کے بعد وہ باہر نکل جاتی ہے۔ جان
بیٹھتا ہے۔ مارتھا داخل ہوتی ہے)
جان: Good Evening، میں کمرے کے لیے آیا
ہوں۔
مارتھا: میں جانتی ہوں۔ کمرہ صاف کیا جا رہا ہے لیکن اس
سے پہلے میں تمہارا نام مہمانوں کے رجسٹر میں لکھ
دوں۔
(وہ باہر جاتی ہے اور رجسٹر لے کر آتی ہے)
جان: میں تمہیں بتا دوں کہ تمہارا نوکر مجھے بہت برا آدمی
لگا۔
مارتھا: یہ پہلی بار ہے کہ اس کے بارے میں میں کوئی
شکایت سن رہی ہوں۔ وہ ہمیشہ اپنی ذمہ داری
اطمینان بخش طریقے سے انجام دیتا ہے۔
جان: میں شکایت نہیں کر رہا ہوں میں صرف یہ کہہ رہا
ہوں کہ وہ عجیب سا لگا۔ کیا وہ گونگا ہے؟
مارتھا: نہیں۔
جان: کیا وہ بول لیتا ہے؟
مارتھا: بہت کم، صرف جب بہت ضروری ہو۔
جان: تاہم ایسا لگتا ہے جیسے جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ سن نہیں
رہا۔
مارتھا: ہاں وہ بہت زیادہ نہیں سنتا بہت مشکل سے سنتا
ہے۔ اب آپ مجھے اپنا نام اور پتہ بتائیے۔
جان: ہیزک کارل۔
مارتھا: صرف کارل۔
جان: ہاں۔
مارتھا: آپ کی تاریخ اور جائے پیدائش؟
جان: میں ۳۸ سال کا ہوں۔
مارتھا: ہاں آپ پیدا کہاں ہوئے؟
جان: (کچھ دیر سوچتے ہوئے) بوہیمیا میں۔
مارتھا: کیا کام کرتے ہیں۔
جان: کچھ بھی نہیں؟
مارتھا: (خود سے) یا تو آدمی بہت دولت مند ہو گا یا غریب
جو کوئی کام نہ کرتے ہوئے بھی سفر کرے۔
جان: (مسکراتے ہوئے) میں بہت غریب نہیں ہوں اور
بہت سے وجوہات کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ
غریب نہ ہونے پر مجھے خوشی ہے۔
مارتھا: (بدلے ہوئے لہجے میں) میرا خیال ہے تم کی
الحسن ہو۔
جان: یقیناً۔
مارتھا: عام طور پر رہائش کہاں تھی۔
جان: بوہیمیا میں۔
مارتھا: کیا تم وہیں سے آئے ہو؟
جان: نہیں میں جنوب سے آ رہا ہوں (وہ اس کی طرف
سوالیہ نگاہ سے دیکھتی ہے) سمندر کے پاس سے۔
مارتھا: وہ ٹھیک ہے۔ (تھوڑی خاموشی) کیا تم وہاں اکثر
جاتے ہو؟
جان: ہاں اکثر۔
مارتھا: (ایسا لگتا ہے جیسے کسی سوچ میں ڈوب گئی ہو پھر
سوال شروع کرتی ہے) اب تم کہاں جا رہے ہو؟
جان: یہ میں نے ابھی طے نہیں کیا اور میرا جانا بہت سی
باتوں پر منحصر ہے۔
مارتھا: تو کیا تم یہاں کافی دنوں رہنا چاہتے ہو؟
جان: میں نہیں جانتا یہ اس پر منحصر ہے کہ میں یہاں کیا
پاتا ہوں؟
مارتھا: ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ کیا یہاں کوئی
تمہارا انتظار کر رہا ہے۔
جان: میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یہاں میرا انتظار
کر رہا ہے۔
مارتھا: میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس اپنے شناختی
کاغذات ہیں۔
جان: ہاں میں تمہیں انہیں دکھا سکتا ہوں۔
مارتھا: کوئی بات نہیں۔ مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ
تمہارے پاس شناختی کاغذات اور پاسپورٹ ہیں یا
نہیں۔
جان: (جیب سے اپنا پاسپورٹ نکالتے ہوئے) ہاں یہ میرا
پاسپورٹ ہے لو دیکھ لو۔
(وہ اسے لے لیتی ہے لیکن اس کے خیالات کہیں
اور ہیں وہ اس کو ہاتھوں میں لے کر تولتی ہے پھر اسے
واپس کر دیتی ہے)
نہیں تم اسے رکھو۔ جب تم وہاں ہوتے ہو تو کیا تم
سمندر کے قریب بھی رہتے ہو۔
جان: ہاں۔
(وہ اٹھتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے رجسٹر کو رکھ رہی ہو
پھر اس کے خیالات بدل جاتے ہیں اور وہ سامنے اسے
دوبارہ کھولتی ہے)
مارتھا: (بہت جلد لیکن تیز لہجے میں) ہاں! ارے میں
بھول رہی تھی۔ کیا آپ کی فیملی ہے۔

جان: پہلے میری فیملی ہوا کرتی تھی۔ لیکن میں نے انہیں کئی سال قبل کھو دیا۔

مارتھا: نہیں میرا مطلب ہے کہ آپ شادی شدہ ہیں۔

جان: آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہیں؟ آج تک مجھ سے کسی ہوٹل میں یہ سوال نہیں کیا گیا۔

مارتھا: سوالوں کی لسٹ ہمیں پولیس نے دی ہے اس میں یہ بھی ہے۔

جان: آپ تو مجھے حیرت میں ڈال رہی ہیں...... ہاں میں شادی شدہ ہوں۔ کیا آپ نے میری انگلی میں شادی کی انگوٹھی نہیں دیکھی۔

مارتھا: نہیں، میں نے نہیں دیکھی نہ ہی میرا کام ہے کہ آپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھوں۔ میں یہاں رجسٹر میں خانہ پوری کرنے آئی ہوں۔ آپ اپنی بیوی کا پتہ بتائیے۔

جان: ٹھیک...... بات یہ ہے کہ وہ میرے پیچھے اپنے ملک میں رہ رہی ہے۔

مارتھا: او بہت اچھا (رجسٹر بند کرتی ہے) کیا میں آپ کے پینے کے لئے کچھ لاؤں۔ جب تک آپ کا کمرہ صاف کیا جا رہا ہے۔

جان: نہیں شکریہ۔ لیکن اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں یہیں ٹھہر جاؤں۔ میں آپ کی راہ میں نہیں آؤں گا۔

مارتھا: آپ کیوں میری راہ میں آنے لگے۔ یہ تو عوامی کمرہ ہے جو ہمارے کرایہ دار استعمال کرتے ہیں۔

جان: ٹھیک ہے۔ لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک اکیلا شخص بھیڑ سے زیادہ تکلیف دہ ہو جائے۔

مارتھا: کیوں؟ میرا خیال ہے کہ آپ کا ارادہ ادھر ادھر کی بکواس کر کے وقت برباد کرنے کا نہیں ہے۔ میرا ان لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں جو یہاں آتے ہیں اور بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کو اس کا اندازہ پہلے ہی ہونا چاہئے تھا۔ یہاں کے لوگ یہ سب پہلے سے جانتے ہیں۔ پھر بھی آپ جلد ہی محسوس کر لیں گے کہ اس سرائے میں خاموشی رہتی ہے۔ آپ کو جتنی خاموشی پسند ہو یہاں ملے گی۔ یہاں مشکل سے کوئی آتا ہے۔

جان: تب تو یہ تجارت کے لیے اچھی جگہ نہیں ہوگی۔

مارتھا: ہاں ہمیں کچھ نقصان ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تلافی ہم سکون سے کر لیتے ہیں۔ اور سکون ایسی شئے ہے جس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت بھی کم ہوتی اسی لئے ہم لوگ ایسے شخص کی تلاش میں رہتے ہیں جو اچھا کرایہ دار ہو۔

جان: لیکن...... (وہ جھجکتا ہے) کیا اکثر...... یہاں آپ کی زندگی بہت بور نہیں گزرتی؟ کیا آپ اور آپ کی ماں اکثر اکیلی نہیں ہو جاتیں۔

مارتھا: (غصے سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی) میں آپ کے ان سوالوں کے جواب دینے سے معذور ہوں۔ نہ ہی آپ کو اس طرح کے سوال کرنے کا حق ہے اور آپ کو یہ جان لینا چاہئے تھا۔ مجھے آپ کو بتانا پڑے گا کہ یہاں کے اصول کیا ہیں۔ اس سرائے میں ایک مہمان کی حیثیت سے آپ کو مہمان کے سارے حقوق حاصل ہیں لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ تاہم آپ ڈرتے ہیں۔ آپ پر اسی طرح توجہ دی جائے گی جس کے آپ حق دار ہیں۔ آپ کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے گی اور اس سلسلے میں آپ کو اگر کوئی شکایت ہو تو مجھے حیرت ہوگی۔ آپ کس بنا پر اپنی تسلی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے سوالات غلط جگہ پر ہوئے ہیں۔ آپ کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اکیلا پن محسوس کرتے ہیں یا نہیں۔ اسی طرح سے آپ کو اس سے بھی کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے کہ آپ کی وجہ سے ہمیں تکلیف ہو رہی ہے یا نہیں۔ آپ مہمان کی حیثیت سے اپنے حقوق کا استعمال کیجئے۔ اس سے آگے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

جان: میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں میرا مقصد آپ کو تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ میں تو صرف اپنی نیک خواہشات کا اظہار کر رہا تھا۔ میرے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ جتنا آپ سوچتی ہیں شاید ہم ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

مارتھا: میں جو کچھ کہہ رہی تھی اسے دوبارہ کہنا پڑے گا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی۔ کیونکہ آپ ایسا رویہ اختیار کر رہے ہیں جس کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ میں اور بھی واضح کر دینا چاہتی ہوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میں جھنجھلائی نہیں ہوں، پریشان نہیں ہوں لیکن آپ کے اور ہمارے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ ہم فاصلہ بنائے رکھیں۔ لیکن اگر آپ اسی طرح بات کرتے رہے۔ جو ایک مہمان کو زیب نہیں دیتا تو ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ہم کمرہ دینے سے انکار کر دیں۔ لیکن اگر آپ یہ سمجھ سکیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ سمجھ لیں گے کہ دو عورتیں جنہوں نے آپ کو ہوٹل میں کمرہ دیا ان پر اس طرح کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ مالی فائدے کے عوض وہ آپ کو اپنا دوست سمجھیں تو سب صحیح ہو جائے گا۔

جان: میں آپ سے بالکل اتفاق کرتا ہوں اور میرا آپ کے سامنے اس طرح کا اظہار کرنا کہ میں آپ کو سمجھ نہیں سکا ہوں نا قابل معافی ہے۔

مارتھا: نہیں کوئی ایسی بات نہیں کوئی زیادہ تکلیف نہیں پہنچی۔ آپ ہی پہلے شخص ہیں جس نے اس طرح کے سوال نہیں کئے ہیں۔ لیکن ہم نے ہمیشہ یہ واضح کر دیا کہ ہم لوگوں کا رویہ اس بابت کیا ہے اور بات وہیں ختم ہو گئی۔

جان: ہاں آپ نے یقیناً بات واضح کر دی تھی اور میرا خیال ہے کہ مجھے اس معاملے پر نہیں بولنا چاہئے۔

مارتھا: نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ بہ حیثیت مہمان بات کرنے کی آپ کو کوئی ممانعت نہیں ہے۔

جان: ایک مہمان کو کس طرح کی بات کرنی چاہئے؟

مارتھا: میرے مہمان بہت ساری چیزوں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ جیسے سیاست، ان کا اپنا سفر، دیگر باتیں اور کبھی میری ماں یا میرے بارے میں بات کرتے ہیں اور یہی ہونا بھی چاہئے۔ اس میں سے کچھ لوگ تو کبھی کبھی اپنی شخصی زندگی یا اپنے پیسے کے بارے میں بات کرتے ہیں لیکن اپنے دائرے میں رہتے ہیں۔ آخر ہماری یہ بھی تو ایک خدمت ہے جس کے لیے ہمیں معاوضہ ملتا ہے کہ ہم اپنے کرائے داروں کی باتیں سنیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ رہائش اور کھانے کا جو بل ادا کیا جاتا ہے اس سے ہوٹل کا مالک اس بات کے لیے مجبور نہیں ہوتا کہ وہ ذاتی سوالوں کے جواب دے۔ میری ماں کبھی کبھار ایسا کر سکتی ہے لیکن میں ہمیشہ انکار کر دیتی ہوں۔ آپ جب ایک بار اس بات کو سمجھ جائیں گے تو نہ صرف یہ کہ ہمارے تعلقات بہتر ہوں گے بلکہ آپ کو یہ بھی پتا چلے گا کہ بات کرنے کے لیے بہت سی چیزیں ہیں اور جب کوئی شخص اپنے بارے میں بات کر رہا ہو تو اسے سننا بھی اچھا لگتا ہے۔

(ماں داخل ہوتی ہے)

ماں: Good Evening جناب آپ کا کمرہ بالکل صاف ہو گیا ہے۔

جان: بہت بہت شکریہ میڈم۔

(ماں بیٹھتی ہے)

ماں: (مارتھا سے) کیا تم نے سارے فارم بھر دئے۔

مارتھا: ہاں میں نے فارم بھر دئے۔

ماں: کیا میں انہیں دیکھ سکتی ہوں؟ جناب آپ مجھے معاف کریں گے لیکن یہاں کی پولیس اس معاملے میں بہت سخت ہے۔ (رجسٹر کو دیکھتے ہوئے) میں دیکھ رہی ہوں کہ میری بیٹی نے یہ نہیں بھرا کہ آپ یہاں تجارت یا صحت کی غرض سے یا بطور سیاح آئے ہیں۔

جان: بطور سیاح ہی سمجھئے۔

ماں: غالباً آپ پادری کا گھر دیکھنے آئے ہیں۔ لوگ اکثر اس کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔

جان: ہاں میں نے بھی اس کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ میں اس جگہ کو دوبارہ بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ بہت سی یادیں اس سے وابستہ ہیں۔

ماں: کیا آپ یہاں کبھی رکے ہیں۔

جان: نہیں، لیکن بہت پہلے میں اس راستے سے گزرا تھا۔ میں اسے بھول نہیں سکا ہوں۔

ماں: تاہم یہ بہت معمولی سا چھوٹا سا قصبہ ہے۔

جان: ہاں یہ تو ہے لیکن مجھے اس سے گہرا تعلق ہے جس وقت سے میں یہاں آیا ہوں، محسوس کر رہا ہوں کہ میں اپنے گھر آ گیا ہوں۔

ماں: کیا آپ زیادہ دنوں ٹھہریں گے۔

جان: دراصل مجھے خود بھی نہیں معلوم اور شاید آپ کو بھی اس پر حیرت ہو کیونکہ یہی سچائی ہے۔ کسی ایک جگہ پر رہنے کے لئے کئی چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ دوستی، ایسے لوگوں کی موجودگی، جنہیں آپ چاہتے ہوں۔ اس کے بغیر یہاں رہنا یا کہیں رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اور چونکہ یہ جاننا مشکل ہے کہ یہاں مجھے چاہا جائے گا یا نہیں اس لئے میرا ارادہ ابھی پکا نہیں ہے۔

ماں: یہ تو عجیب سی بات ہے۔

جان: مجھے معلوم ہے لیکن میں اس سے بہتر طریقے سے اظہار کرنے سے قاصر ہوں۔

ماں: کچھ بھی ہو مجھے امید ہے کہ تمہاری طبیعت یہاں سے جلد بھر جائے گی۔

جان: نہیں میں اپنے اندر ایک وفادار دل رکھتا ہوں اگر مجھے موقع ملے تو میں لگاؤں اور یادیں بھی قائم کر لوں۔

مارتھا: (بے چینی سے) ایک وفادار دل بیشک یہاں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

جان: (ایسا لگتا ہے جیسے اس نے سنا نہیں اور ماں سے کلام جاری رکھتا ہے) مجھے لگتا ہے آپ بہت زیادہ غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ کیا آپ اس ہوٹل میں بہت زمانے سے رہ رہی ہیں۔

ماں: نہ جانے کتنے سالوں سے۔ اتنے زیادہ سالوں سے کہ میں یہ بھول گئی کہ میں نے اسے کب شروع کیا تھا اور اس وقت میں کیسی تھی۔ یہ لڑکی میری بیٹی ہے۔ یہ میرے ساتھ ایک عرصے سے رہتی آئی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس کو اپنی بیٹی جانتی ہوں۔ ورنہ میں اسے بھی بھول گئی ہوتی۔

مارتھا: ماں، ان سے آپ کو یہ سب کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

ماں: ہاں مارتھا تم ٹھیک کہتی ہو۔

جان: (جلدی سے) اب آپ اس کے بارے میں کچھ نہ کہیں۔ میڈم میں آپ کے خیالات اور جذبات کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ یہ وہ تاثرات ہیں جو ایک مشکل اور مشقت بھری زندگی کے خاتمے کے وقت پیدا ہوتے ہیں۔ شاید حالات اس سے بہت زیادہ مختلف ہوتے اگر آپ کو مدد ملی ہوتی۔ جیسی ہر عورت کو مدد ملتی ہے اور ایک مرد کے بازوؤں کا سہارا ملا ہوتا۔

ماں: ہاں ایک وقت تھا کہ جب مجھے سہارا حاصل تھا۔ تب ہمیں بہت کام کرنا پڑتا تھا۔ میرا شوہر اور میں دونوں مل کر بھی کام ختم نہیں کر پاتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں سوچنے کا بھی موقع نہیں ملتا تھا۔ اور میں نے شاید اسے اس کی موت کے پہلے ہی بھلا دیا تھا۔

جان: ہاں میں سمجھ سکتا ہوں۔ (ذرا جھجکتا ہے) شاید آپ کو کوئی لڑکا ہوتا جو آپ کی مدد کرتا ہوتا شاید آپ اسے نہ بھولی ہوتیں۔

مارتھا: ماں آپ کو معلوم ہے ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔

ماں: ایک لڑکا؟ میں بہت بوڑھی ہو چکی ہوں اور بوڑھی عورتیں اپنے لڑکوں سے محبت کرنا بھی بھول جاتی ہیں۔ دل ہر چیز سے بھر جاتا ہے۔

مارتھا: (دونوں کے درمیان جلدی سے کھڑے ہو کر) اگر ان کا لڑکا بھی یہاں آ جائے تو اس کے ساتھ بھی رویہ ایک معمولی سے مہمان جیسا ہو گا۔ لاتعلقی کا نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ یہاں جتنے بھی مرد آئے ہیں ان کے ساتھ یہی رویہ رہا اور اسی سے وہ مطمئن بھی رہے۔ انہوں نے کمرے کا کرایہ دیا اور انہیں کنجی دے دی گئی۔ وہ کبھی اپنے دل کے بارے میں بات نہیں کرتے۔ (خاموشی) اس سے ہمارا کام آسان ہو جاتا ہے۔

مارتھا: آپ دولت مند ہیں یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن آپ بھولے سے بھی اپنے دل کی بات مت کیجئے گا۔ اس کے لیے ہم لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔ دراصل آپ جس انداز میں اپنے دل کی بات کر رہے تھے اس سے میں پریشان ہو گئی تھی اور میں آپ سے یہاں سے جانے کے لیے کہنے والی تھی۔ اپنے کمرے کی کنجی لیجئے اور آرام سے رہئے لیکن یہ یاد رکھئے کہ آپ جس جگہ ٹھہر رہے ہیں وہاں دل کی ضرورتیں نہیں پوری کی جاتیں۔ وسطی اور اس چھوٹے سے مقام میں اتنے زیادہ خالی سال گزرے ہیں کہ انہوں نے اس مکان سے ساری گرم جوشی ختم کر دی۔ انہوں نے دوستی کی ساری خواہشات کو بھی مار دیا اور میں اپنی بات پھر دہراؤں گی یہاں آپ لگاؤ جیسی کوئی چیز نہیں پائیں گے۔ آپ کو وہی چیزیں ملیں گی جو یہاں مختصر قیام والے مسافروں کو ملا کرتی ہیں۔ اور ان کا جذبات سے کوئی لین دین نہیں رہتا اس لئے اپنی چابی لیجئے اور اپنے دماغ میں اسے بٹھا لیں۔ ہم اپنے لاتعلقی کے انداز میں آپ کو بہ حیثیت ایک مہمان اپنے ذاتی مفاد کی خاطر قبول کر رہے ہیں اور اگر ہم آپ کو یہاں اسی طرح بغیر کسی لگاؤ کے رہنے دیں گے تو صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر۔

(جان کنجی لیتا ہے اور اسے جاتے ہوئے دیکھتا ہے)

ماں: جو کچھ وہ کہتی ہے اس پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کے بارے میں وہ بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ (وہ اٹھنے کی کوشش کرتی ہے جان اس کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے) میرے بچے تم تکلیف نہ کرو میں ابھی معذور نہیں ہوئی ہوں۔ میرے ہاتھوں کی

طرف دیکھو یہ اب بھی بہت مضبوط ہیں یہ اتنے مضبوط ہیں کہ مرد کی گردنوں کو اٹھا سکیں۔

(تھوڑی خاموشی)

کیا [illegible] نے کہا ہے تم اسی کے بارے میں سوچتے۔

جالن: مجھے افسوس ہے میں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ لیکن آپ مجھے بتائیں کہ ابھی آپ نے مجھے میرا اچانک کیوں کہا۔

ملی: ہاں مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے۔ یہ تو شاید...... حماقت کا ایک انداز ہے۔

جالن: جناب میں اپنا کمرہ دیکھوں گا۔

ملی: یقیناً جناب ہمارا بوڑھا خادم راہداری میں آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ (وہ اس کی طرف غور سے دیکھتا ہے کچھ کہنا چاہتا ہے) کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے۔

جالن: (ہچکچاتے ہوئے) نہیں میڈم سوائے اس کے کہ اس گرم جوشی کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔

(وہ باہر جاتا ہے)

ملو تھا: تم پھر بیٹھے بیٹھے دن میں خواب دیکھنے لگیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں۔

ملی: میں اس آدمی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ شاید میں اپنے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔

ملو تھا: بہتر ہو کہ آپ سوچنے کا کام کل کے لیے ملتوی کردیں۔ پھر اس آدمی کو نہ دیکھنے کا کیا فائدہ۔ تم اپنے خیالات اس سے ہٹا نہیں پا رہی ہو۔ تم نے خود کہا تھا کہ جنہیں نہ جانتے ہوں انہیں مارنا آسان ہوتا ہے اس لئے سنجیدہ ہو جایئے۔

ملی: یہ تمہارے والد کا خاص لفظ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کو سنجیدہ ہونا پڑے گا۔ لیکن میں اب یہ یقین کرنا چاہتی ہوں کہ یہ آخری مرتبہ ہوگا جب سنجیدہ ہونا پڑے گا۔ جب تمہارے والد اس لفظ کو استعمال کرتے تو ان کا مقصد اس خوف کو دور کرنا ہوتا تھا کہ کہیں پتا نہ لگ جائے۔ لیکن جب تم سنجیدہ ہونے کو کہتی ہو تو اس کا مطلب رحم دلی کی اس چھوٹی سی چنگاری کو بجھانا ہوتا ہے جو میرے دل میں روشن ہو گئی تھی۔

ملو تھا: تم جسے اچھائی کا ایک شعلہ بتا رہی ہو وہ صرف نیند ہے۔ لیکن اپنی اس شعاع کو کل تک بجھادیں پھر باقی زندگی آپ کے واسطے آسان ہو جائے گی۔

ملی: میں جانتی ہوں تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن مقدر نے ایسا مسافر کیوں بھیجا...... جو بالکل ہی ناموزوں ہے۔

ملو تھا: اس میں مقدر کا کوئی سوال نہیں۔ میں یہ مانتی ہوں کہ یہ مسافر اپنائیت لیے ہوئے ہے۔ اس کی معصومیت بھلی ہے۔ یہ دنیا کیا ہے کیا ہو جائے گی اگر پھانسی کی سزا پانے لوگ جلاد کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرنے لگیں۔ نظریاتی طور پر یہ بالکل غلط ہے۔ لیکن جب میں اس سے بات کرتی ہوں تو مجھے وبلا دیتا ہے اور مجھے آدمیوں کی حماقتوں پر جو غصہ آتا ہے اسے کچھ حد تک برداشت کرنا پڑتا ہے۔

ملی: تمہارا یہ بات بھی غیر منطقی ہے۔ ماضی میں ہم نے اپنے کام میں نہ ہی غصہ نہ ہی رحم دلی کو داخل ہونے دیا۔ صرف اس لاتعلقی کو بھلائے رکھا جس کی ضرورت تھی لیکن آج کی رات میں تھکی ہوئی ہوں۔ اور تم بھی غصے میں نظر آرہی ہو کیا ان حالات میں ہمیں وہ سب کچھ کرنا پڑے گا۔ تھوڑی سی رقم کے لیے اپنے احساسات کو دبانا ہوگا۔

ملو تھا: دولت کے لیے نہیں بلکہ سمندر کے کنارے ایک گھر اور اس قابل نفرت قصبے کو چھوڑنے کے لیے۔ تم زندگی سے تھک گئی ہو اور میں بھی اس افق سے موت کی طرح تھک چکی ہوں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اب میں یہاں ایک مہینہ بھی نہیں رک سکتی۔ تم جو بوڑھی ہو چکی ہو اب تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں سوائے اس کے کہ آنکھیں بند کرو اور سب کچھ بھول جاؤ لیکن میں آج بھی اپنے دل میں ان ساری پیار کی خواہشوں کو زندہ پاتی ہوں جو اس وقت پیدا ہوئی تھیں جب میں بیس سال کی تھی اور میں اس کے لیے اب اس طرح کا کام کرنا چاہتی ہوں جس کے بعد کسی کام کی ضرورت نہ ہو، چاہے جس کے لیے اپنی اس زندگی کو چھوڑنے کے لئے چاہے جتنی زیادہ محنت کرنی پڑے۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم اس کام میں ہماری مدد کرو۔ تم نے مجھے ان بادلوں اور کہروں کی زمین میں پیدا کیا۔ بجائے اس کے کہ چمکتی ہوئی دھوپ کے علاقے میں۔

ملی: مارتھا مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے۔ کیا میرے لئے بہتر نہیں ہوگا کہ میں بالکل بھلادی جاؤں جیسے تمہارا بھائی مجھے بھول چکا ہے۔

ملو تھا: تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ (تھوڑی خاموشی۔ جذباتی انداز) تمہارے بغیر کیا کروں گی۔ میرا کیا ہوگا اگر تم مجھ سے دور چلی جاؤ گی۔ تاہم میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔ اور اگر کبھی اس زندگی کی کشمکش مجھے یہ انداز اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے جس میں میں تمہارا وہ احترام نہیں کرپاتی ہوں تو تم مجھے معاف کردو۔

ملی: تم ایک اچھی لڑکی ہو مارتھا۔ اور میں یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اکثر بوڑھی عورتوں کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے لیکن میرے خیال میں وہ لمحہ آگیا ہے جسے میں اتنی دیر سے کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ صاف کہہ دوں آج کی رات نہیں۔

ملو تھا: کیا؟ ہمیں کل تک انتظار کرنا پڑے گا؟ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ پہلے ہمارے دل میں اس طرح کا خیال کبھی نہیں آیا تھا اور جب اسے ایک بار یہاں کے لوگوں سے ملنے کا موقع مل گیا تو پھر ہم کبھی یہ نہیں کرپائیں گے۔ نہیں وہ جب تک ہمارے ساتھ مقیم ہے اسی وقت تک ہمیں عمل کرنے کا موقع ہے۔

ملی: شاید میں نہیں جانتی لیکن آج کی رات نہیں۔ آج کی رات اس کی اپنی رات ہونے دو اس سے ہم لوگوں کو بھی کچھ راحت ملے گی، ہم بھی تھوڑی دیر آزادی کی سانس لے سکیں گے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں گھناؤنے جرم کرنے والوں کو بھی امن و سکون مل جاتا ہے اس لئے آج ہمیں سکون سے رہنے دو۔ شاید اسی کے سبب ہم اپنے آپ کو بچا سکیں۔

ملو تھا: اپنے آپ کو بچا سکیں؟ ہم اپنے آپ کو کیوں بچانا چاہیں گے اور یہ کہنا ہی کتنی حماقت کی بات ہے جو کچھ تمہیں فائدے کی امید ہو سکتی ہے وہ اسی میں ہے کہ تم آج ہی یہ کام کرو تاکہ اس کے ختم ہونے کے بعد آرام سے سو سکو۔

ملی: میرا ابھی یہی مطلب تھا جب میں نے اپنے کو بچانے کو کہا تاکہ نیند کی امید کو قائم رکھا جاسکے۔

ملو تھا: بہت خوب میں قسم کھاتی ہوں۔ اپنی نجات کا راستہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ماں ہمیں اس غیر یقینی حالات کو ختم کرنا ہے، یہ کام آج ہی ہونا ہے ورنہ کبھی نہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

(جاری)

تبصرے

نام کتاب: چلو کچھ رنگ ہی بکھرے

مصنف : خوشبیر سنگھ شاد

قیمت : ۱۰۰ روپے

ناشر : مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک، لکھنؤ

زیر نظر تخلیق کا مصنف محض غزل گوئی میں ہی دلچسپی رکھتا ہے اور وہ بھی اس ذوق و شوق کی تشفی کے لئے جو قدرت نے اسے عطا کیا ہے۔ ایک سچے ادیب کی طرح اس نے بڑے انکسار کے ساتھ اس مجموعے کو "چلو کچھ رنگ ہی بکھرے" کا عنوان دیا ہے۔ اس کے منظر عام پر آنے کا یہ ایک معصوم سا انکشاف بھی ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ نام و نمود کی بدولت اسے نہ ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا۔

چھوٹی موئی کے مزاج میں رچی بسی اس نے چھوٹی چھوٹی، صاف ستھری غزلیں کہی ہیں جن میں نئی سوچ کے ساتھ ساتھ سچا احساس اور بے ساختہ جذباتی اظہار خاطر خواہ جذب و اثر کا جادو جگاتا ہے۔ ویسے تو ان غزلوں کی مجموعی فضا خاصی خوشگوار ہے اور دعوت مطالعہ دیتی ہے لیکن جن غزلوں میں اس نے فکر و فن کی انفرادیت کے ساتھ سلجھے ہوئے قاری کو خصوصاً متوجہ کرنے کا حق اور فرض ادا کیا ہے ان میں سے دو تین غزلوں کے کچھ منتخب اشعار، مثال کے طور پر نذر قارئین ہیں:

وہ تو تخی تھا، دے کے سمندر بھول گیا
لیکن مجھ کو قطرا قطرا یاد رہا
کیا کیا چہرے تھے اس بستی میں لیکن
شاد مجھے بس ایک ہی چہرا یاد رہا
تھکن سے آبلوں تک جو بھی ہے سب کچھ سفر کا ہے
فقط یہ نیند زیر سایۂ اشجار اپنی ہے
کچھ ایسا درد کا رشتہ ہے دل کے ساتھ دنیا کا
یہ لگتا ہے کہ ہر گرتی ہوئی دیوار اپنی ہے
شامل صدائے دل بھی نہ ہو، ساز کے سوا
نغمے میں کیا بچے گا بھلا آواز کے سوا
ادراک و آگہی کی حدیں ختم ہیں کہاں
ہر راز آشکار ہے اس راز کے سوا

خوشبیر سنگھ جو شاد تخلص کرتا ہے، جب اپنی خوش مزاجی کی لے میں یہ کہتا ہے کہ:

اجازت ہو تو میں یہ عرض کر دوں انکساری سے
مرا انداز اپنا ہے، مری گفتار اپنی ہے

تو کتاب کی قرأت متقاضی ہو جاتی ہے کہ اس سے اتفاق کر لیا جائے۔ یہ دیدہ زیب پیش کش خود اپنی قیمت کا جواز بھی لئے ہوئے ہے۔

رام پرکاش راہی، دہلی

نام کتاب: اسلام، معاشیات اور ادب

مولف : محمد نجات اللہ صدیقی

قیمت : ۲۰۰ روپے

ناشر : ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکٹ، علی گڑھ

زیر تبصرہ کتاب "اسلام، معاشیات اور ادب، خطوط کے آئینہ میں" دراصل مشہور ماہر معاشیات پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی سابق استاذ شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام مختلف مسالک و مکاتب فکر کے علماء اور دانشوران کے تحریر کردہ خطوط کا گراں قدر مجموعہ ہے۔ جس میں چھوٹے بڑے سائز کے تقریباً ۲۲۲ خطوط شامل ہیں، جن میں ۳۲ وضاحتی نوعیت کے خطوط ہیں، جو خود فاضل مرتب کے قلم گوہر بار سے نکلے ہوئے ہیں۔ کتاب کے شروع میں ایک مختصر مقدمہ ہے اس کے بعد "عکس تحریر" کا جاذب عنوان ہے۔ اس کے ذیل میں چند مخصوص خطوط کا عکس شائع کیا گیا ہے، مگر "عکس تحریر" میں تشنگی محسوس ہوتی ہے، اس میں وسعت دی جا سکتی تھی۔ غالباً کوئی مصلحت مانع رہی ہوگی۔

واضح رہے کہ اس مجموعہ میں کچھ گمنام اور کچھ نامور اصحاب قلم کی نگارشات و رشحات ہیں، مشاہیر علماء و دانشوران میں مولانا یوسف بنوری، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، پروفیسر سلیم چشتی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد تقی امینی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وغیرہ شامل ہیں۔

عطاء الرحمن قاسمی، نئی دہلی

نام کتاب : مجنوں گورکھپوری

حیات اور ادبی خدمات

مصنف : ڈاکٹر شاہین فردوس

قیمت : ۲۵۰ روپے

ناشر : ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکٹ، علی گڑھ

زیر تبصرہ کتاب شاہین فردوس کا تحقیقی مقالہ ہے جس کے لئے موصوفہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ ڈاکٹر شاہین فردوس نے اپنے اس تحقیقی مقالہ میں مجنوں گورکھپوری کی حیات اور ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ کتاب پانچ ابواب میں تقسیم ہے۔ پہلا باب مجنوں صاحب کی حیات و شخصیت کے بارے میں ہے۔ دوسرے باب میں مجنوں گورکھپوری کی افسانہ نگاری کا جائزہ ہے۔ اس میں محقق نے افسانوں کا فنی اور فکری جائزہ لیا ہے تو افسانوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے اور مجنوں گورکھپوری کی شخصیت کو ان کے افسانوں کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ تیسرا باب مجنوں گورکھپوری کی تنقید نگاری کے بارے میں ہے اور یہاں ان کی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔ چوتھا باب مجنوں گورکھپوری کی مکتوب نگاری کا جائزہ ہے۔ اس صنف ادب میں مجنوں کا کنٹری بیوشن "پردیسی کے خطوط" کے نام سے مشہور ہے۔ دو جلدوں میں شائع ہونے والے یہ تمام خطوط فرضی ہیں مگر چونکہ ان میں ادبی اور علمی موضوعات کو شعوری طور پر اٹھایا گیا ہے اس لیے اگر انہیں تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ پانچویں باب میں مجنوں گورکھپوری کی شخصیت کو بطور صحافی، شاعر اور مترجم کے پرکھا گیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مجنوں گورکھپوری کی زندگی اور ادبی خدمات پر زیر تبصرہ کتاب ایک سیر حاصل کام ہے۔ اس کے بعد مجنوں پر جو بھی کام کیا جائے گا اس کی اساس اسی ماخذ پر ہوگی۔ کتاب کے آخر میں ان کتب و رسائل کی فہرست دی گئی ہے جن سے مصنفہ نے استفادہ کیا ہے۔ اس فہرست کے بعد ضمیمہ ہے جس کے تحت مجنوں گورکھپوری کی نظم و نثر سے ایک بہت ہی مختصر انتخاب دیا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں مجنوں صاحب کا وہ پیش لفظ بھی دیا گیا ہے جو انہوں نے اپنے ہونہار شاگرد شمس الہدیٰ قیسی الفاروقی کے افسانوی مجموعہ زیب النسا اور دیگر افسانے کے لئے خصوصی طور پر لکھا تھا۔ دیباچہ میں مجنوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اس ہونہار شاگرد کو معاشی دباؤ کی وجہ سے سرکاری ملازمت اختیار کرنی پڑی ہے۔ شاید اس وجہ سے قیسی الفاروقی کو اب افسانہ تخلیق کرنے کے لئے اتنا وقت نہ مل سکے اور یہ اردو افسانے کا بڑا نقصان ہوگا۔

یہ ایک ایماندارانہ تحقیقی کام ہے جس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔ ڈمائی آکٹو وسائز کے ۳۸۰ صفحات پر پھیلی یہ کتاب لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔

انور کمال حسینی، دہلی

نام کتاب: سخن گسترانہ

مصنف : ڈاکٹر منصور عمر

قیمت : ۱۰۰؍روپے

ملنے کا پتہ : شعبہ اردو، سی ایم آرٹس کالج، دربھنگہ

ان دنوں اردو میں ایک روش چل پڑی ہے کہ سیمیناروں کے لیے وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہلکے پھلکے مقالوں کو بعد میں کتابی شکل دے کر صاحب کتاب ہونے کا دعویٰ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب "سخن گسترانہ" کے مطالعہ کے بعد ایسی کتابوں کے بارے میں اس قسم کا تاثر ختم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کتاب میں شامل تمام مضامین ڈاکٹر منصور عمر نے نہایت عرق ریزی سے لکھے ہیں۔ انہوں نے ہر مضمون میں کوئی نئی بات، نیا گوشہ یا نیا پہلو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر منصور عمر نے تحقیق اور تنقید کے نقطہ نگاہ سے کچھ ایسے مضامین لکھے ہیں جن میں اختر انصاری کا ڈراما "فردوس جہاں بیگم" کی بازیافت شامل ہے۔ روشنائی کے موضوع پر ناقدانہ بحث ہے تو ساتھ ہی مظہر شہاب اور دیپک قمر کی شاعری پر سیر حاصل گفتگو بھی ہے۔ اس کے علاوہ چند ایسے مضامین بھی شامل کتاب ہیں جو اب موضوع کے اعتبار سے اردو میں بار بار لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر منصور عمر نے زیادہ تر ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے جس کی طرف لوگوں کی نگاہ نہیں گئی یا ان پر کم لکھا گیا ہے۔ انہوں نے ایک طرف تحقیق کی ہے تو دوسری طرف شاعری اور فکشن کی تنقید کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

کتاب کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ تحقیق و تنقید کے میدان میں بت شکنی کی نئی راہ نکالی گئی ہے اور ایسا ہے بھی۔ ایک طرح سے اردو کے مستقبل کے ناقد کے لیے ایک نئی راہ دکھائی گئی ہے۔

کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ پروف کی غلطیوں سے تقریباً پاک ہے۔ مواد کی مناسبت سے قیمت ۱۰۰؍روپے مناسب ہے۔

محمد کاظم، نئی دہلی

نام کتاب: بزور آمد

مصنف : سید طالب حسین زیدی

قیمت : ۱۲۵؍روپے

ناشر : زندہ دلان حیدر آباد۔ بچلرز کوارٹرس معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدر آباد۔۱

سید طالب حسین زیدی کا نام 'آجکل' کے قارئین کے لئے نیا نہیں ہے۔ اردو کے مشہور اشعار خصوصاً غالب کے شعروں پر مبنی ان کے کارٹونوں کو آجکل نے دو سال سے زائد عرصے تک شائع کیا ہے۔ کسی ادبی رسالے میں اشعار پر مبنی کارٹونوں کا یہ سلسلہ آجکل کا اپنا کارنامہ تھا جسے قارئین نے کافی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ افسوس کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ہم یہ سلسلہ مستقلاً نہیں چلا سکے لیکن آج بھی تمام دنیا میں نکلنے والے اخباروں کے لیے کارٹون ناگزیر ہو گئے ہیں۔ آڑی ترچھی لکیروں کے ذریعہ ایک کارٹونسٹ طنز و مزاح کے جو تیر چلاتا ہے وہ بڑے بڑے مضامین بھی پیش نہیں کر سکتے۔ کارٹون بھی وہی شخص بنا سکتا ہے جس کے اندر طنز و مزاح کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ کچھ تو حیدر آباد کے زندہ دلوں کی صحبت اور کچھ ماہنامہ شگوفہ کے ایڈیٹر مصطفیٰ کمال کی جوہر شناس شخصیت کے باعث طالب حسین زیدی کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں نے انہیں ان تحریروں کی طرف مائل ہونے پر مجبور کیا۔ ان کے اکثر مضامین شگوفہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ پہلی بار انہوں نے چند پرانے اور چند نئے مضامین کا مجموعہ "بجنگ آمد" کے مصداق "بزور آمد" کے نام سے شائع کیا ہے۔

اس کتاب کا پیش لفظ مصطفیٰ کمال صاحب نے لکھا ہے۔ مصطفیٰ کمال صاحب انہیں مزاح نگار سے زیادہ انشائیہ نگار سمجھتے ہیں لیکن انشائیہ کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اس کے اندر مزاح اور اس کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر پوشیدہ ہو اور جس کے یہاں یہ عنصر جس قدر زیادہ ہوگا وہ اتنا ہی بڑا انشائیہ نگار ہوگا۔ طالب حسین زیدی، کرنل محمد خاں اور مشتاق احمد یوسفی سے خصوصی طور پر متاثر ہیں اور اگر ان دونوں کی نثر کی شگفتگی دیکھنی ہو تو 'بزور آمد' میں جگہ جگہ دیکھی جا سکتی ہے۔ کرنل محمد خاں کی "بجنگ آمد" اور یوسفی کی "آب گم" کی مقبولیت کی یہ انتہا ہے کہ ان کتابوں کے نہ جانے کتنے جعلی ایڈیشن نکلتے جا رہے ہیں جب کہ ان لوگوں کی کتابیں Legally بھی متعدد بار شائع ہو چکی ہیں۔

"بزور آمد" میں سولہ مضامین ہیں۔ کچھ زندہ مگر گمنام شخصیتوں کی کردار نگاری کے علاوہ اس میں چند شہروں کی بھی کردار نگاری کی گئی ہے۔ پہلا ہی طویل مضمون "دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا" ہے۔ اس مضمون میں پرانی دلی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس صورت حال کا آج کی صورت حال سے مقابلہ کرنے میں جو تضاد پیدا کیا گیا ہے اور درمیان میں جہاں جہاں دلی کی کرخنداری زبان کے Patches دیئے گئے ہیں اس سے مرزا غالب کی دلی اور آج کی دلی میں جو تضاد ابھرتا ہے وہ دلی کی کراہ کے ساتھ ساتھ قاری کو سوچنے، جھنجھوڑنے اور متضاد کیفیت پر چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی طرح "چار مینار سے نوے پل تک" میں حیدر آباد کی آج کی شہری زندگی کا خاکہ چار مینار کے پس منظر میں اور درمیان میں ٹھیٹھ حیدر آبادی زبان کے Patches نے اسے ایک

مضمون ہوا ہے جسے قاری کبھی بھول نہیں سکتا۔ کئی مضامین انہوں نے ہائیڈ پارک لندن میں بھی برقرار رکھا ہے۔ لیکن سب سے دلچسپ مضمون 'ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ بیوی رکھتے تھے' ہے۔ جس میں اپنی شریک حیات کی بیماریوں کا تذکرہ کیا ہے۔

'گمزور آمد' ایک ایسی کتاب ہے جسے یوسفی کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے تقریباً دس سال کی کڑی مشقت اور محنت کے بعد انہوں نے تحریر کی ہے۔ لیکن اس کی زبان کہیں کہیں آج کے اردو کے قاری کے حساب سے کچھ مشکل ہو گئی ہے اسی لیے مشفق خواجہ صاحب نے اس کی لطافت اور شگفتگی کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں طنزاً مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو فارسی میں بھی بہترین انشائیہ لکھ سکتے ہیں۔ آج کے دور میں جب کہ اردو ادب اخباروں میں کالم نگاری کی بدولت مشہور مزاح نگاروں کی تحریر سے محروم ہوتا جا رہا ہے، یہ کتاب غنیمت ہے۔ امید ہے کہ ہمارے باذوق قارئین اس سے لطف اندوز ہوں گے۔

نام کتاب: سرمایہ سخن (جلد اول)

مصنف : علی سردار جعفری

قیمت : ۲۷۵؍روپے

ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

'سرمایہ سخن' علی سردار جعفری کی وہ آخری نثری تحریر ہے جسے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں بیماریوں سے جوجھنے کے باوجود انہوں نے تیار کیا تھا جو ان کے انتقال کے ایک سال بعد شائع ہو سکی۔ کتاب میں دیباچہ کے علاوہ ذوق جمال، لحن داؤدی، مقبول استعاروں کا خزانہ، استفادہ اور ضمیمہ جیسے ابواب قائم کئے گئے ہیں۔ اور ضمیمہ ہی اس کا سب سے طویل باب ہے۔ ذوق جمال، لحن داؤدی، مقبول استعاروں کا خزانہ وغیرہ ابواب میں سردار جعفری نے شاعری کو انسانی فطرت اور انسانی تہذیب کا جزو لاینفک قرار دیتے ہوئے اس کی تاریخ اور تفصیل پیش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کیفیت ہے جس سے شاعر دوچار ہوتا ہے۔ ان ابواب میں انہوں نے اردو شاعری خصوصاً اردو غزل کی خصوصیت کو اجاگر کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان اور اردو شاعری میں جو خصوصیت پائی جاتی ہے وہ دنیا کی دیگر زبانوں میں ملتا ہے اور اس کا ترجمہ بھی کسی اور زبان میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح جو لوگ اردو زبان کو ہندوستانی شیلی میں لکھنے کی بات کرتے ہیں ان کا حتمی جواب بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا کرنے سے اردو زبان کی اپنی خصوصیت مجروح ہو جائے گی اور اس کی شناخت بھی باقی نہیں رہے گی۔ ضمیمہ میں انہوں نے میر، غالب سے لے کر اقبال اور تمام دوسرے مشہور شعرا کے اشعار کی جمالیاتی تشریح پیش کی ہے اور یہ دکھلایا ہے کہ ذوق جمال ہی اس شاعری کو سمجھنے اور لطف اندوز ہونے کا واحد ذریعہ ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش ہے جس میں ذوق جمال کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کتاب جلیل مانکپوری کی تذکیر و تانیث ہے جس میں تمام اردو شعراء کے اشعار کے ذریعہ تذکیر و تانیث کی شناخت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مکتبہ جامعہ نے بہت خوبصورت انداز میں اس کتاب کو شائع کیا ہے۔

نام کتاب: اردو تلفظ لغت

مصنف : ڈاکٹر علی احمد جلیلی

قیمت : ۵۰؍روپے

ناشر : اردو اکادمی، آندھرا پردیش

۶۳۷-۴-۱۱، اے سی گارڈز، حیدرآباد۔

'اردو تلفظ لغت' اردو اکادمی آندھرا پردیش نے مجلّہ کی صورت میں شائع کیا ہے۔ علی احمد جلیلی صاحب، جلیل مانکپوری کے صاحبزادے ہیں۔ لغت نویسی کی طرف ان کا پدری اور فطری رجحان پایا جاتا ہے۔ اس مجلّہ میں انہوں نے اردو کے تمام مشہور اشعار کے ذریعہ الفاظ کے تلفظ اعراب کے ساتھ اجاگر کئے ہیں۔ یہ ایک بڑا وقیع کام تھا اور یہ وہی شخص انجام دے سکتا تھا جس کے اندر شعری خصوصیات خصوصی طور پر ودیعت کی گئی ہو اور جسے لاکھوں اشعار زبانی یاد ہوں۔ اس مجلّہ میں حروف تہجی کے اعتبار سے الفاظ اور ان کے ساتھ ساتھ اشعار بھی دئے گئے ہیں۔ آج کے پس منظر میں جب عام طور پر لوگوں کا تلفظ غلط ہوتا ہے اور جگہ جگہ الفاظ کے تلفظ بدلتے جا رہے ہیں۔ کتاب کی افادیت مسلم ہے۔ طالب علموں اور اردو زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

نام کتاب: اردو کا ابتدائی زمانہ

(ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو)

مصنف : شمس الرحمن فاروقی

قیمت : ۱۵۰؍روپے

ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

مکتبہ جامعہ کا ایک اور کارنامہ شمس الرحمن فاروقی کی اس کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن شائع کرنا ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے مکتبہ 'آج' نے کراچی سے پچھلے سال شائع کیا تھا۔ کراچی ایڈیشن کی قیمت ۱۲۰؍روپے تھی جب کہ یہ ایڈیشن ۱۵۰؍روپے کا ہے۔ چونکہ کراچی ایڈیشن ہندوستان میں آسانی سے دستیاب نہیں ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اب اس سے قارئین کی تشنگی مٹ جائے گی۔ کتاب کے آخری کور پر مصنف کا تعارف اور تصویر کے ساتھ اس کتاب کی دیگر خصوصیات کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ کتاب کا انگریزی ایڈیشن بھی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب پر ہم تفصیلی تبصرہ پہلے شائع کر چکے ہیں۔

نام کتاب: سائنس اور غالب

مصنف : ڈاکٹر وہاب قیصر

قیمت : ۱۲۵؍روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

وہاب قیصر صاحب اردو میں ۱۹۷۰ء سے سائنسی موضوعات پر مضامین لکھ رہے ہیں اور یہ حیدر آباد کے ممتاز کالج میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ درس و تدریس سے ان کو خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ وہ طلبہ میں سائنسی شعور پیدا کرنے کی کاوش ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔ چونکہ غالب اردو کے طالب علموں اور نقادوں کا خاص موضوع رہا ہے اور غالب کی شاعری کے تعلق سے ایسا کوئی بھی موضوع نہیں بچا ہے، جس پر اب تک کئی کئی بار طبع آزمائی نہ کی گئی ہو، ہر بڑے شاعر کی طرح غالب کے اشعار کی تشریح بھی اپنے اپنے ذوق اور فطری مناسبت سے کی جاتی رہی ہے۔ ان دنوں سائنس کے حوالے سے غالب کے اشعار کی تشریح کا ایک رجحان چل پڑا ہے۔ کوئی انہیں ماہرین فلکیات ثابت کر رہا ہے، کوئی انہیں ماہرین طبعیات، کوئی کیمیا گر، کوئی فلسفی، کوئی مابعد الطبعیات کا حامی شاعر ثابت کر رہا ہے۔ آج تک اردو کے مشہور ناقدین محققین اور شارحین نے غالب کے اشعار

کے ساتھ جو موشگافیاں کی ہیں اور سائنس کے مختلف نظریات کی تشریح ان کے اشعار کے پس منظر میں کی ہے ان ساری تحریروں کو اس کتاب میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ خود بھی وہاب قیصر صاحب نے سائنس اور غالب، دشت امکاں اور غالب کا سائنسی شعور وغیرہ پر مضامین لکھے ہیں۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر ایم۔ ایم تقی صاحب کے مضامین دئے گئے ہیں۔ کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک تھوڑا بہت سائنسی شعور نہ ہو غالب کے اشعار کو سمجھنا ناممکن ہے۔ ڈاکٹر وہاب قیصر صاحب اس کاوش کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نام کتاب : قنطار

مصنف : رؤف خیر

قیمت : ۱۰۰ر روپے

ناشر : خیری پبلی کیشنز، ۱۹/ ۲۰۲-۱۰-۹ رسالہ بازار، گولکنڈہ، حیدر آباد-۸

شاعری کا ترجمہ چاہے نثر میں ہو یا نظم میں بہت ہی مشکل کام ہے کیونکہ نفس مضمون کے خبط ہونے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ قنطار میں رؤف خیر صاحب نے علامہ اقبال کے پیام مشرق میں شامل فارسی قطعات لالۂ طور کا منظوم اردو ترجمہ پیش کیا ہے جسے جناب کالی داس گپتا رضا صاحب نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ آج کے دور میں جب اردو جاننے والے ہی کم ہو گئے ہیں، فارسی کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا۔ اقبال ایک ایسے شاعر ہیں جن کا فارسی کلام اردو سے کم نہیں اور جنہیں بغیر فارسی جانے سمجھنا ناممکن ہے۔ کتاب میں زبور عجم کی افتتاحیہ دعا اور فارسی کے ساتھ ساتھ تنہائی کا متن اور اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ میں روانی پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب طالب علموں کے لیے بہت کار آمد ثابت ہوگی۔ ہر قطعہ کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ رؤف خیر جو بذات خود شاعر ہیں انہوں نے فارسی سے اردو میں ترجمانی کا حق بخوبی ادا کیا ہے۔

نام کتاب : معرکہ: وہاب اشرفی، محمود ہاشمی شمس الرحمٰن فاروقی

مصنف : ڈاکٹر ارتضی کریم

قیمت : ۹۰ر روپے

ناشر : ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔

اردو ادب میں جدیدیت کے ابتدائی دور میں 'شب خون' کے اشاعت کو ایک سال ہوئے تھے۔ اردو افسانے میں انحراف کی ٹیڑھی کھیر کے عنوان سے لکھنؤ میں فاروقی صاحب کے مکان پر ایک سمپوزیم کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس سمپوزیم میں اس وقت کے مشہور افسانہ نگاروں اور نقادوں نے حصہ لیا تھا جو ستمبر ۱۹۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس سمپوزیم میں مشہور افسانہ نگار اور صحافی کلام حیدری بھی شریک ہوئے تھے بعد میں کلام حیدری نے اپنے رسالہ "مورچہ" ہفتہ وار میں سمپوزیم کے تعلق سے وہاب اشرفی صاحب کے چند اعتراضات کو شائع کیا، جن کا جواب محمود ہاشمی نے دینا شروع کیا۔ اس کے بعد ان دونوں نقادوں کی معرکہ آرائی کا سلسلہ شروع ہوا جسے کلام حیدری "مورچہ" کے صفحات پر نمایاں طور پر شائع کرتے رہے۔ اس معرکہ میں شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی شرکت کی۔ یہ معرکہ ستمبر ۱۹۶۹ء سے شروع ہو کر ۲۲ر نومبر ۱۹۶۹ء تک چلتا رہا۔ جدید افسانے کی بحث سے شروع ہوئی یہ معرکہ آرائی بعض اوقات ناقدین کی Ego اور ان کی سربلندی کی کوشش میں بھی تبدیل ہوتی رہی لیکن معترضین نے ہمیشہ ایک دوسرے کی ذاتیات پر کیچڑ اچھالنے سے گریز کیا اور احترام کے ساتھ اعتراضات کرتے رہے۔ اردو کے مختلف ادوار میں جو مشہور معرکے ہوئے اسی طرح کا یہ بھی ایک یادگار معرکہ تھا۔ افسوس کہ کلام حیدری صاحب کے انتقال کے بعد مورچہ اور آہنگ کی اشاعت بند ہو گئی اور اس کے بعد آج تک اس طرح کی کوئی معرکہ آرائی نہیں ہوئی۔ یہ ایک تاریخی معرکہ آرائی تھی اس میں ادب، فکشن اور افسانے کے ہر پہلو اور مغربی اثرات پر کھل کر بحث ہوئی۔

نئی نسل نہ تو کلام حیدری سے واقف ہے اور نہ ہی ان کے رسالے 'مورچہ' اور 'آہنگ' سے۔ ارتضیٰ کریم کی یہ 'بازیافت' ہمارے تاریخی شعور کی بازیافت ہے۔ آج بھی یہ مباحث اردو کے افسانے کے قارئین کے لئے اتنی ہی تازہ اور کار آمد ہیں۔ قاعدے سے تو کتاب کا انتساب کلام حیدری کے نام یا اس بحث کے شرکا کے نام ہونا چاہئے تھا لیکن شاید جیسا کہ ہندی کے مشہور مزاح نگار ہری شنکر پرسائی نے اپنے ایک کالم میں انتساب کی مختلف قسمیں گناتے ہوئے ایک قسم 'جیون سدھار سرپن' کی بتائی تھی اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ اس طرح کے انتسابات نوکری دلاتے ہیں، ترقی دلاتے ہیں اور کتاب کو نصاب میں شامل کراتے ہیں۔ ممکن ہے مرتب کا منشا بھی یہ ایسا ہی ہو۔

نام کتاب: A Picador Book of Modern Indian Literature

مرتبہ : امیت چودھری

قیمت : ۳۹۵ر روپے

ناشر : پیکاڈور انڈیا، نئی دہلی

ان دنوں دنیا بھر کے انگریزی اخباروں، رسالوں میں امیت چودھری کی مرتب کردہ ماڈرن انڈین انتھالوجی پر زبردست گرما گرم بحث چل رہی ہے۔ ہندوستان سے نکلنے والے سبھی انگریزی اخبارات اور دہلی سے شائع ہونے والے ہیلیو نیز انڈین بک ریویو میں اس پر تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ لندن بک ریویو اور ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کے علاوہ لندن اور امریکہ کے سبھی اخباروں میں اس پر سیر حاصل تبصرے کئے جا رہے ہیں۔

امیت چودھری اس وقت ہندوستانی نسل کے انگریزی کے مشہور ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک کہانی کا ترجمہ ہم نے آجکل میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب کو لے کر مبصرین کے دو حلقے پائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے سلمان رشدی کی مرتبہ کتاب کا جواب مانتے ہیں اور کچھ اسی سلسلہ کی آگے کی ایک کڑی۔ امیت چودھری کا بھی کچھ یہی خیال ہے کہ سلمان رشدی نے ہندوستانی زبانوں کے ناول نگاروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ کیونکہ بقول تابش خیر ان کی ہندوستان اور یہاں کی زبانوں کی تخلیقات کے بارے میں بہت سرسری معلومات ہیں۔ اس مجموعہ میں امیت چودھری نے کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی سبھی زبانوں میں آج کے عہد میں لکھی جانے والی سبھی زبان کی کہانیوں کا ایک نمائندہ انتخاب شائع کیا جائے تاکہ مغرب کے لوگوں میں ہندوستانی زبانوں کے بارے میں جو ناواقفیت پائی جاتی ہے اسے دور کی جا سکے۔ حالانکہ وہ خود بھی ہندوستان کی سبھی زبانوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہیں۔ اور انہوں نے انگریزی میں اچھے اور معتبر تراجم کی کمی کا جواز پیش کیا ہے۔ گرچہ اس کتاب کے لئے وہ پانچ سال سے محنت کر رہے تھے۔

تھی۔ اگر انہوں نے سنجیدگی سے تلاش کی ہوتی تو انہیں تقریباً ہر زبان میں انگریزی میں معتبر تراجم کہانیوں اور ناولوں تک مل جاتے۔ ۳۲۳ صفحات کی اس کتاب میں آسامی، گجراتی، مراٹھی اور پنجابی زبان کی کوئی نمائندگی نہیں کی گئی ہے جب کہ ۳۲۳ صفحات میں سے تقریباً تین سو صفحات انگریزی میں لکھنے والے مصنفین کو دے گئے ہیں۔ حالانکہ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے ہندوستان کے تمام مشہور انگریزی مصنفین کو نظر انداز کر دیا ہے اور ۱۳۰ صفحات صرف بنگلہ ادب کے لئے مختص کئے گئے ہیں کیونکہ انہیں دو زبانوں سے وہ واقف ہیں۔ باقی ۱۳۰ صفحات میں ہندی، اردو اور دیگر جنوبی زبانوں کو جنہیں صرف جنوب کی زبان کے نام سے نمائندگی دی گئی ہے۔ گویا جنوب کی ساری زبانیں ایک ہی ہیں۔ بنگلہ کو زیادہ صفحات دینے کے جواز میں وہ کہتے ہیں کہ بنگال میں پیدا ہونے والے ادبی نشاۃ ثانیہ نے ساری ہندوستانی زبانوں کو متاثر کیا ہے۔ اس پر اپنا تاثر پیش کرتے ہوئے مشہور ڈرامہ نگار گریش کرناڈ کا کہنا ہے کہ ایسا کر کے انہوں نے اردو زبان کے ساتھ سخت ناانصافی برتی ہے کیونکہ انگریزوں سے مزاحمت کرنے اور ہندوستان میں جنگ آزادی کی روح کو بیدار کرنے میں اردو ادب نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا مقابلہ کوئی دوسری زبان نہیں کر سکتی۔ انہوں نے مثال دیتے ہوئے امراؤ جان ادا کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ اس ناول کا انگریزی میں بیسوں تراجم موجود ہیں اور وہ محنت کرتے تو انہیں اس کے اچھے تراجم مل سکتے تھے۔

اردو میں جن تین افسانہ نگاروں کی کہانیاں اس میں شامل ہیں ان میں منٹو، قرۃ العین حیدر اور نیر مسعود کی ایک ایک کہانی شامل ہے۔ جب کہ اس وقت اردو کے بہت سے مصنفین کی کہانیاں انگریزی میں موجود ہیں جنہیں اردو کی نمائندہ کہانیاں کہی جا سکتی ہیں۔ کتاب اچھی چھپی ہے اور چونکہ اسے دنیا کے مشہور ترین ناشر نے شائع کیا ہے اس لئے یہ کتاب ہر مشہور کتب فروش کے یہاں موجود ہے۔

م۔ ر۔ ف

☆☆☆

وفیات

مشہور صحافی، مترجم اور ناول نگار **واحد سبزواری** کا ۲۶ جولائی کو دہلی میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ وہ ۶۹ سال کے تھے لیکن صحت کے اعتبار سے ابھی وہ ماشاء اللہ بالکل جوان لگتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی انہوں نے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور اردو کے ایک معدوم ہوتے ہوئے روزنامے کی ادارت سنبھالی۔ انہوں نے اپنی ملازمت "سینک سماچار" سے شروع کی تھی۔ لیکن تقریباً پوری ملازمت انہوں نے ریڈیو کے خبروں کے شعبے میں گزاری۔ ملازمت کے آخری دور میں ان کا تبادلہ پبلی کیشنز ڈیویژن میں ہو گیا۔ یہاں انہیں بلایا تو گیا تھا 'آجکل' کی ادارت کے لئے لیکن ذمہ داری انہیں اردو کتابوں کی سونپی گئی۔

مرحوم بہت کم گو شخص تھے اور بہت اکسانے پر ہی کچھ بولتے تھے۔ لیکن اپنی راست گوئی کی وجہ سے وہ علمی حلقوں میں مقبول تھے۔ ادارہ آجکل سے ان کا تعلق اور محبت ہمیشہ بنی رہی۔ انہوں نے تبصروں کے ذریعے اس تعلق کو قائم رکھا۔ وہ ان مبصرین میں سے تھے جو تبصرہ کرنے سے پہلے کتاب کو کئی کئی مرتبہ پڑھتے اور سمجھ بوجھ کر قلم اٹھاتے تھے۔

اردو کے معروف کہنہ مشق شاعر، ادیب اور استاد ڈاکٹر **مغیث الدین فریدی** کا جاج مئو کانپور میں گزشتہ دنوں انتقال ہو گیا۔ وہ ۷۵ سال کے تھے۔ ڈاکٹر فریدی گیارہ سال پہلے شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی سے بہ حیثیت ریڈر ریٹائر ہوئے۔ وہ پچھلے دس سال سے جاج مئو میں مقیم تھے۔ موصوف کو تاریخ گوئی، تضمین نگاری اور عروض میں جو قدرت حاصل تھی اس کی دوسری مثال اس دور میں نظر نہیں آتی۔ فریدی صاحب کا شعری مجموعہ "کفر تمنا" ۱۹۸۹ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ نثر میں ان کی متعدد کتابیں ہیں۔

شیواجی گنیشن اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ لیکن اپنی طویل زندگی میں تمل سنیما میں ادا کئے گئے اچھے رول کی وجہ سے تمام جنوبی ہندوستانی سنیما کے شائقین کے لئے وہ ایک لیجنڈ بن گئے۔ ان کی اداکاری اور مکالمہ کی بہترین ادائیگی کی وجہ سے انہیں ایک دیوتا کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

انہوں نے اپنی اداکاری کی شروعات "پراسکتی" فلم سے کی تھی جو فوراً ہی پورے جنوبی ہند میں حد سے زیادہ کامیاب اور مقبول ہوئی۔ انہوں نے تقریباً تین سو فلموں میں کام کیا اور تاریخی اور پورانک کرداروں کی ادائیگی اس کامیابی سے کی کہ انہیں اسی طرح کا ایک پورانک اور تاریخی کردار سمجھا جانے لگا۔ ان کی مشہور فلمیں "ویرا پانڈیا، کٹا بومن، تامیلن اور نوراتری" تھی۔ نوراتری ایک ایسی سماجی فلم تھی جس میں انہوں نے نو مختلف کرداروں کو بیک وقت ادا کیا۔ تاریخی کرداروں کی ادائیگی نئی نسل کے اداکاروں کے لئے ایک مثال بن گئی۔ انہیں فرانس نے کیویلیر کے خطاب سے نوازا۔ انہیں ہندوستان کا سب سے بڑا فلمی انعام دادا صاحب پھالکے ایوارڈ بھی دیا گیا۔ ان کی موت کی خبر سے پورے جنوبی ہند میں سوگواری کی لہر پھیل گئی۔

گرچہ تمل سیاست میں ہمیشہ سے فلمی شخصیتیں حاوی رہی ہیں لیکن شیواجی گنیشن نے اپنے کو سیاست سے بالکل الگ رکھا اور یہی ان کے ایک سچا فنکار ہونے کی دلیل ہے۔ (ادارہ)

☆☆☆

کھلے خط

● 'آجکل' (اگست ۲۰۰۱) ملا۔ ہو عمر میں دیکھ رہا ہوں کہ چندماہ سے آپ نے 'آجکل' کا معیار اعلیٰ کر دیا ہے۔ یہ آپ کی مستقل محنت کا صلہ ہے۔ امید ہے آپ اسے قائم رکھیں گے۔

میرے خیال میں اس شمارے کی جان پروفیسر نارنگ کا کبیر پہ مقالہ ہے۔ اس نسبتاً مختصر سے مضمون میں انہوں نے ہمیں اس عجیب وغریب بھگت، سیاح، سادھو شاعر کے بارے میں اہم باتیں بتائی ہیں۔ میں کبیر کے متعلق متضاد خیالات رکھتا ہوں۔ چند باتیں عرض کر دوں۔ کبیر کی زبان، انداز بیان، ادائیگی وغیرہ سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ یہ شاعری پندرہویں صدی میں نہیں بلکہ ڈیڑھ دو سو برس بعد ضبط تحریر میں لائی گئی ہے۔ اس وقت ایسا صاف ظاہر ہے کھڑی بولی نے اپنے پروں کو سنوارا نہیں تھا، پھر کبیر کے ہاں کھڑی کے اتنے سارے نقوش کیوں ملتے ہیں! جواب یہی ہوگا کہ کبیر کی شاعری وقت کے ساتھ ساتھ سنورتی اور شریف ہوتی چلی گئی۔ ایسا کہنا غالباً زیادہ صحیح نہ ہوگا۔ لیکن ایسا کہے بغیر چارہ نہیں کہ کبیر کے جن اشعار میں اودھی اور بھوجپوری کا رواج زیادہ ہے، وہ حصہ کبیر کا کہا ہوا کلام زیادہ ہے بہ نسبت اس حصے کے جہاں کھڑی بولی اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے۔ امیر خسرو کے ہندوی کلام کا زیادہ تر حصہ الحاقی محسوس ہوتا ہے۔ ہم کبیر کے متعلق کیا ایسی بات نہیں کہہ سکتے ہیں؟ کبیر غیر معمولی طور پر عوامی شاعر تھے۔ ان کے دوہے غربا میں زیادہ مقبول رہے ہوں گے؟ اور ان کے باغیانہ خیالات کو زبان وادا کے آلات کے ذریعہ دھیما کرنے کی بتدریج ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے زیادہ تر محاورے اور امثال جو اس شاعری میں پائے جاتے ہیں، وہ غالباً الحاقی ہیں اور عوام سے ابھر کر اس شاعری میں جمع ہو گئے ہیں۔

یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ فلاطوں (ہم 'افلاطون' کیوں لکھتے ہیں میری سمجھ میں بالکل نہ آتا ہے، پلاٹوں کو فلاطوں کہنا زیادہ مناسب ہے) کے مکالمے 'سمپوزیم' کا ترجمہ قسط وار چھاپنے والے ہیں۔ اس مکالمے کو اردو میں 'ضیافت' کہنا مناسب رہے گا۔ یونان میں سمپوزیم رہ گئے ہیں جو کہ آج تسلیم کی جاتی ہے۔ فلاطوں نے جب 'ضیافت' لکھی تھی، تو وہ جوان نہیں رہ گیا تھا۔ وہ ۴۴ سال کا ہو چکا تھا، کیونکہ یہ تقریباً طے ہے کہ یہ مکالمہ ۳۸۴ قبل مسیح کے لگ بھگ تحریر کیا گیا تھا۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس مکالمے کے ذریعہ ہم اس کیفیت کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ جسے 'فلاطونی عشق' کے نام سے بعد میں جانا گیا، جو کہ جنسی اختلاط پر منحصر نہیں کرتا ہے پر ایک قسم کا روحانی اتصال ہے۔ یہاں جنسوں کے ملاپ کی ایک دلچسپ تصوری اساطیری لہجے میں بیان کی گئی ہے۔ یہاں مختلف تاریخی ہستیوں کو جمع کیا گیا ہے۔ ماحول تقریباً جنسی ہے۔ رقاصائیں ایسی محفلوں میں عریاں ناچا کرتی تھیں اور ہر قسم کے جنسی افعال ایسی محفلوں میں ظہور پذیر ہوتے تھے۔ فلاطوں کے دیگر عظیم مکالموں کی مانند یہاں فلاطوں کے فن کی جادوگری اپنے شباب پر ہے۔

حبیب حق، گیا

● آپ نے رسالے کو اتنا تنوع دے دیا ہے کہ اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ مبارکباد۔

مقالات سبھی عمدہ ہیں۔ گوپی چند نارنگ نے کبیر کی لسانی اور ادبی خدمات کا حق ادا کر دیا ہے۔ نارنگ اور فاروقی کی گروپ بندیاں اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں ناقدین ادب نے اردو زبان کو اتنی جلا بخشی ہے کہ دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا کرے دونوں کی سرپرستی ہمارے ادب پر قائم رہے۔

آپ کا ترجمہ "گولڈن بوساتی" وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اداریہ نویسی میں اپنی جانب دیکھ کر آپ ترجمہ نگاری کی طرف مائل ہوئے ہیں، [illegible] آپ کے احباب نے اگر آپ کو "علامہ" کا خطاب دیا ہے تو کیا غلط کیا ہے۔

نظمیں بھی اچھی ہیں۔ غزلوں میں [illegible] خانقاہی، حامدی کاشمیری اور نوشاد مومن نے متاثر کیا۔

بینک سے قرض کی درخواست جناب مرزا کھونچ کا مزاحیہ خط پڑھ کر بہت لطف آیا۔ کبھی کبھی شاعروں کی بے بسی پر ترس آتا ہے۔

'آجکل' میں شائع ہونے والی نگارشات کی درجہ بندی کی جائے تو ہمیشہ آپ کے یہاں کہانیاں سبقت لے جاتی ہیں۔ اس بار بھی آر کے نارائن، عبدالغنی شیخ، گربچن سنگھ اور شکیلہ رفیق بازی مار لے گئے۔

طارق متین، لکھنؤ

● جناب آر کے نارائن کے ایک افسانے کا اردو ترجمہ پڑھنے کا موقع ملا۔ نارائن نے نجومی کے کردار کا عمدہ نفسیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ اگر نارائن کے ۶ ناولوں کی ایک مختصر ادبی رپورٹ شائع کی جاتی تو اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوتا۔ عبدالغنی شیخ کا افسانہ "یہ زندگی" بھی ایک کامیاب افسانہ ہے۔ انسان اپنی موت سے کتنا ڈرتا ہے اس افسانے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ گربچن سنگھ کا افسانہ "ایک سفر" بوڑھے لوگوں کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ بزرگ گھر کے لئے قیمتی ورثہ ہوتے ہیں۔ ان کو اپنے گھر سے گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ نوجوان نسل ضعیفوں کی اس ذہنی کیفیت سے ناآشنا رہتے ہیں اور ضعیفوں کی بات سن کر ان کو اکتاہٹ ہوتی ہے۔ شکیلہ رفیق کا افسانہ "ستارہ شناس" پڑھ کر ذکی انور مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ شکیلہ نے خطوں کی مدد سے ایک اچھے افسانے کا تانا بانا جوڑا ہے۔

'گوشے' کی آخری قسط پڑھ کر تشنگی رہی۔ اب آپ اس طرح کا کوئی دوسرا سلسلہ شروع کریں تاکہ قاری کو ذہنی آسودگی حاصل ہوتی رہے۔

مقالات میں جناب نارنگ صاحب اور محمود شیخ کے مقالے معیاری اور عمدہ ہیں۔ آپ کا ترجمہ

ا ئٹی" بھی بہترین ہے۔ آجکل کی فائل سے
ی پر جہا صاحب کا مضمون بھی اچھا لو جہت
وقابل ہے۔

"آجکل" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس
مضامین، مقالے، نظمیں، غزلیں توازن
شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا کوئی حصہ کمزور
ہے۔ یقینا آپ کو اور دیگر اراکین کو محنت
تی ہو گی۔

انوار انصاری، رانچی

آجکل کی فائل سے میں نے اکبر الٰہ آبادی
ڈاکٹر امر ناتھ جھا کا مضمون پڑھا۔ یہ مضمون
چھا لگا۔ نارنگ صاحب کا مضمون بھی عمدہ
تو ہم لوگوں کے کورس میں کبیر کی وانیاں
یں مگر نارنگ صاحب نے اچھے انداز میں
ں کیا ہے۔ محبوب الرحمٰن فاروقی صاحب کا
مضمون "گلوبل سوسائٹی" بھی پڑھا۔ یہ بھی
جمہ ایک مشکل فن ہے مگر فاروقی صاحب
انداز میں ترجمہ کیا ہے۔

کہانیاں میں شوق سے پڑھتی ہوں۔ "ایک
، یہ زندگی، ایک سفر" سبھی اچھی کہانیاں
کھونچ کا مختصر مضمون "بینک سے قرض کی
" پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔

ترانہ تبسم، رانچی

● گوپی چند نارنگ کے مضمون کی اہمیت اپنی
، عبدالستار دلوی اور انیس چشتی کے مضامین
معلومات افزا ہیں اور تحقیقی کاوشوں کی اچھی
کرتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انیس چشتی
ں میں بہت سی باتیں زیب داستاں کے طور
ہیں۔ شعری تخلیقات میں نشتر خانقاہی اور
ہری کی غزلوں نے زیادہ متاثر کیا۔ جب شان
ں غزلیں دو غلی ہیں تو پھر ان کا یہ خوف کہ
"خون فصاحت" کا الزام نہ آجائے۔ کچھ بے
ہے۔

● "آجکل" کی پرانی فائلوں سے جو مضامین
ے شائع کئے جا رہے ہیں وہ بھی بہت اہمیت

کے حامل ہوتے ہیں۔ "آجکل" کے تبصرہ نگار حضرات کتابوں کے بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ہی تبصرے لکھتے ہیں اس سلئے ان کے تبصرے بہت جاندار ہوتے ہیں۔

شمیم اعظمی، گورکھپور

● آجکل کی فائل سے اکبر الٰہ آبادی پر مضمون اسی کی رعایت سے طنزیہ 'ہمارے شاعر اور مشاعرے' مزید بر آں 'بینک سے قرض کی درخواست' خصوصیت سے پسند آئے گویا ہمہ کا ذائقہ بدلا۔ عبدالغنی شیخ کا افسانہ 'یہ زندگی' اچھا ہے۔ 'ستارہ شناس' نفسیاتی تحلیل کا خوبصورت اظہار ہے۔ گلوبل سوسائٹی 'وقت کی آواز' یہ شعر:

وہی ہے دوست جو ہر مرحلے میں ساتھ دیتا ہے
ہزاروں چلنے والوں میں کوئی ہمدم نہیں ہوتا

دل کو چھو گیا۔

شہناز صبیح، الٰہ آباد

● اس بار کے تینوں افسانے قابل تسکین ہیں۔ ایک تسلسل تمام افسانوں کے درمیان موجود ہے وہ ہے انسانی رشتوں کا دروبست۔ افسانے میں ایک دوسرے سے جڑاؤ اور تسلسل کا شائبہ ہوتا ہے۔ میری طرف سے گربچن سنگھ، عبدالغنی شیخ، شکیلہ رفیق کو مبارکباد۔ جناب آر کے نارائن مرحوم کا 'ایک نجومی کا دن' ہماری کورس کی کتابوں میں شامل ہے۔

تابش رحمٰن گیلانی، گیا

● محترمہ شکیلہ رفیق کا افسانہ 'ستارہ شناس' بے حد پسند آیا۔ افسانہ ان تمام شوہروں کے لئے یقینا تازیانہ ثابت ہو گا جو اپنی مصروفیات کو عذر بنا کر بیویوں سے بے توجہی برتتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ بیوی کے کچھ فطری تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ ویسے یہ افسانہ ہم لکھنے پڑھنے والوں کے لئے بھی لمحہ فکریہ عطا کرتا ہے۔ مرزا کھونچ کے طنز و مزاح میں طنز ہے نہ مزاح۔ بقیہ تمام مشمولات قابل مطالعہ ہیں۔

اشتیاق سعید، ممبئی

● 'کبیر کا جادوئی برتاؤ' گوپی چند نارنگ کا لکھا ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ میرا نظریہ تو یہ ہے کہ اس مقالہ پر موصوف کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنی چاہئے۔ 'ہندو مصر کے تعلقات اور اردو' پروفیسر عبدالستار دلوی کا لکھا ایک اچھا مقالہ ہے۔ اسے پڑھ کر اردو کی مقبولیت کا اندازہ ہوا جو نہایت وسیع ہے۔ اردو اور عربی رسم الخط ایک ہونے کے سبب تھوڑی محنت سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ ایک تحقیقی مقالہ ہے جو لائق تحسین ہے۔ دیگر مقالات بھی انتہائی معلوماتی ہیں۔ نظمیں اور غزلیں بھی دل کو شاد کرتی ہیں۔ افسانہ 'ایک نجومی کا دن' ایک نفسیاتی کہانی ہے۔ عبدالغنی شیخ کا لکھا 'یہ زندگی' بھی متاثر کرتا ہے۔ گربچن سنگھ کا لکھا افسانہ 'ایک سفر' ماں بیٹے کی محبت بھری کہانی ہے۔ مرزا کھونچ کا لکھا 'بینک سے قرض کی درخواست' پڑھ کر زیر لب مسکراتا رہا۔ قوی امید ہے اس طرح آپ رسالے کو سجاتے سنوارتے رہیں گے۔

شمس الہدیٰ انصاری، دھنباد

● ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقالہ زبان اور کبیر کے مابین رشتوں پر مبنی ہے۔ جب کہ کبیر کا یہ دوہا کسی طرح گلے نہیں اترتا۔

کانکر پاتھر جوڑ کے، مسجد دیئی بنائے
چڑھ مُلا بانگ دے، کا بہرہ ہوئی خدائے

کیونکہ اس دوہے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کبیر نے کہ مسجد کے اوپر چڑھ کر مُلا بانگ دے کر خدا کو پکارتا ہے، کیا خدا بہرہ ہے جو اتنی زور سے اسے پکارنا پڑتا ہے۔ جب کہ مُلا کی بانگ خدا کے بندوں کو عبادت کے لئے بلاوا ہے۔ افسوس اور حیرت کی بات ہے کہ اہل علم و دانش بھی اس حقیقت سے آشنا ہیں۔ لیکن وہ اس کی تشریح میں ہمیشہ کبیر کی سیکولر امیج کی تلاش کرتے ہیں اور ایک مذہب کے نقطہ نظر کو نہایت غلط ڈھنگ سے عوام کے سامنے رکھتے ہیں۔

حبیب راحت حباب، کھنڈوہ

● شروع کے دونوں مقالے اردو کے قد آور ادیب گوپی چند نارنگ اور عبدالستار دلوی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں جن کی تحریریں ہمارے لئے تحفہ عظیم ہیں۔ نارنگ صاحب نے کبیر کی زبان کی جن خصوصیات کو اجاگر کیا ہے وہ کبیر کی اپنی مثال آپ ہی پیش کرتی ہیں۔ دلوی صاحب نے ہندو مصر کے

[...] کا اردو زبان و ادب کے حوالے سے جس جامعیت کے ساتھ جائزہ لیا ہے ہمیں حیرت و حسرت میں ڈال دیا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ مصر کی مذکورہ دونوں یونیورسٹیاں اردو زبان و ادب کی اتنی گوناگوں اور زبردست خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اس سے اردو کے روشن مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں اردو کی طرف سے اب زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اپنے طور پر اسے ترقی دینے اور تحفظ کے لئے اقدام کرتے رہنا چاہئے۔ اردو زبان پر ترکی کے اثرات اور تمدنی شعور ادب میں انیس چشتی اور محمود شیخ صاحبان نے تحقیق و تنقید کو شیر و شکر کردیا ہے۔ ان دونوں مضامین سے آنکھیں روشن ہوجاتی ہیں۔ جان کین کے مضمون گلوبل سوسائٹی کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرکے آپ نے ایک اور اچھی تحریر پڑھنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ مضمون آج کے گلوبلائزیشن کے تصور کا ایک اہم پہلو اجاگر کرتا ہے، دوسرے یہ کہ آپ کے ترجمہ میں بلا کی روانی اور ایسا حسن پیدا ہوگیا ہے گویا یہ اردو کا اپنا مال نظر آتا ہے۔

اس شمارے کی ساری کہانیاں پسند آئیں۔ نجومی کا اپنے جانی دشمن سے چھٹکارا، آرٹسٹ کا کینسر سے آگاہی کے باوجود پھر سے بھرپور زندگی جینے کا عزم قاری کو زندگی کا حوصلہ بخشتا ہے۔ ستارہ شناس کا فرض اولین سے پہلو تہی کرنا اس کی شریک زندگی کے درماں کی صورت مراجعت کہانی کے مثبت پہلو کی غمازی کرتی ہے۔ یہ ساری چیزیں بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ورتر کے درد کی آخری قسط دل میں درد پیدا کرنے کے ساتھ کچوکے لگاتی ہے کہ اب انتاروا اور تخلیق کی غمازی کرنے والے ترجمہ سے مزید لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ کیا ہی اچھا ہو تاکہ ثریا فاروقی کسی اور شاہکار کا ترجمہ کرکے پھر سے قسط وار شائع کروانے کی زحمت کرتیں۔ ان کے قلم میں کافی جان اور زبان و بیان پر ان کو خاصی دسترس حاصل ہے۔

نظموں اور غزلوں کے انتخاب اور کتابوں پر تبصروں نے ادبی ذوق کو مہمیز کیا ہے۔ آپ کے حسن ترتیب اور حسن انتخاب کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ آجکل کی فائل سے ڈاکٹر امرناتھ جھا کی تحریر "اکبر الہٰ آبادی" ترجمہ اختر اوریبوی اور فضا ابن فیضی کی نظم "ہمارے شاعر اور مشاعرے" آپ کے انتخاب کی زندہ مثالیں ہیں۔ آج اکبر الہٰ آبادی پر بہت کچھ مواد منظر عام پر آچکا ہے، اس کے باوجود جھا صاحب کی تحریر سے بعض نئی باتیں معلوم ہوئیں اور ان کے انداز تحریر کا لوہا ماننا پڑا۔

اخترالزماں، مبارکپور

● تازہ شمارہ موصول ہوا اور میں نے اس کا ایک ایک لفظ پڑھ بھی ڈالا۔ آپ کا ایک ترجمہ اور ایک تبصرہ بھی پڑھنے کو ملا۔ ترجمہ ایسا ہے کہ ترجمہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ آپ نے موضوع کا انتخاب بھی خوب کیا ہے۔ اکبر الہٰ آبادی پر مضمون بھی (آجکل کی فائل سے) کارآمد ہے۔ یہ سلسلہ آپ نے اچھا شروع کیا ہے جو کسی دوسرے رسالے میں نہیں ملتا۔ گوئٹے کا سلسلہ ختم ہوگیا اب جو آپ دوسرا سلسلہ شروع کرنے جارہے ہیں اس کا انتظار ہے۔ مقالات سبھی محنت سے لکھے گئے اور کافی معلوماتی ہیں۔ کبیر پر گوپی چند نارنگ کا مضمون زبان کے حوالے سے بڑا قیمتی ہے مگر کبیر کے بعض مشہور شعر کی اس میں سمائی نہیں ہو سکی، جیسے کبیر داس کی الٹی بانی، برسے کمبل بھیگے پانی۔ کبیر داس کے متعلق ایک بات عام طور پر یہ بھی کہی جاتی ہے کہ ان کے یہاں بہت سا کلام الحاقی ہے۔

انیس چشتی صاحب کا مضمون بھی کافی متاثر کرتا ہے۔ پروفیسر عبدالستار دلوی کے مضمون نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ اس شمارے کے افسانے اور شعری تخلیقات بھی متاثر کرتی ہیں۔ مجموعی لحاظ سے آجکل آپ کی ادارت اور قیادت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کررہا ہے۔ آر کے نارائن سے آپ نے متعارف کرایا اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اشفاق احمد اعظمی، اعظم گڑھ

● زیادہ تر مشمولات بہت خوب ہیں۔ محترم انیس چشتی صاحب کی تخلیق 'اردو زبان پر ترکی اثرات' خاصے کی چیز ہے۔ 'تحریک خلافت' بلاشبہ جنگ آزادی کی سب سے بڑی سب سے طاقتور تحریک تھی لیکن محترم کا ارشاد: "اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں خلافت کے خاتمہ کا باقاعدہ اعلان کردیا۔ اس اعلان سے بھارت میں تحریک خلافت کو زبردست دھچکا لگا اور اس تحریک [...] گراںڈیل قائد منہ کے بل گر پڑے۔" علامہ اقبال [...] زندہ تھے وہ پکار اٹھے "چاک کردی ترک [...] نے خلافت کی قبا" ظاہر ہے تحریک خلافت کے گراںڈیل قائد' سے مراد مولانا محمد علی جوہر ہیں۔ ان کی [...] شخصیت کے لئے محترم انیس چشتی صاحب 'منہ کے بل گر پڑے' سے بہتر جملہ استعمال فرماتے تو ہم سب [...] مند ان جوہر کی دل آزاری نہ ہوتی۔ یہ گراںڈیل [...] منہ کے بل نہیں گرا بلکہ آج بھی قبلہ اول میں [...] آرام فرما ہے۔

سید آفتاب علی، عزت نگر، [...]

● اگست والے شمارے میں آپ نے [...] غزل اور نظم شائع کی۔ لیکن ایک شکایت بھی ہے۔ کہ کمپیوٹر نے نظم کے دو بند چھوڑ دئے جس کی وجہ [...] وہ بے ربط ہوگئی۔ ان بندوں کے حذف ہونے سے [...] کچھ عجیب ہوگئی۔ ویسے بھی میر صاحب قبلہ، [...] والوں کے بارے میں فرما چکے ہیں " [...] مربوط بر نخاستہ" اب اتنے دنوں بعد مغفور کے قو[...] سچ ثابت کرنا کیا ضروری ہے۔ کبیر پر نارنگ صاحب [کا] مضمون عمدہ ہے انہوں نے بہت اہم اور برمحل [سوال] اٹھایا ہے کہ زبان شاعری کو خلق کرتی ہے یا شا[عری] زبان کو خلق کرتی ہے؟ نشتر خانقاہی، حامدی کاشمیری، چندر پرکاش شاد کی غزلیں اچھی ہیں۔ ہندی اردو یا [...] اور فارسی کی تراکیب و مرکبات غزل یا عبارت کو نہیں بناتے۔ دکنی میں یہ چلن عام رہا ہے۔ 'لب [...]' جیسی تراکیب اب بھی عام ہیں۔

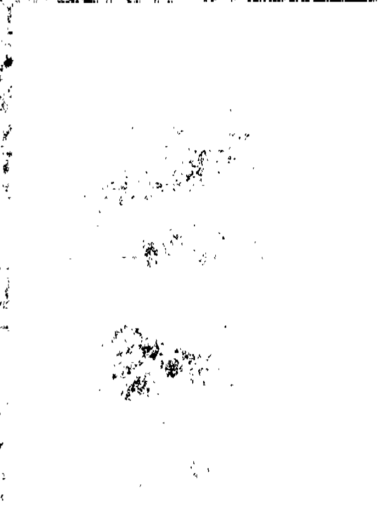
بشر نواز، اورنگ[آباد]

● اگست ۲۰۰۱ء میں صفحہ ۲۴ پر میری [...] شائع فرمائی ہے، جس کے آخری شعر میں شاید [...] سے کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ اس کو یوں پڑھا جائے۔

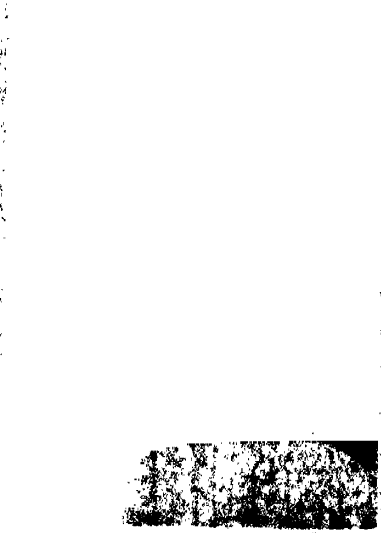
"مجھ سے صدر نگ کو دنیا نہ سمجھ پائی کہ میں" ...... کیسے
صاف ظاہر ہوئی اس سے مری یکتائی کہ میں ...... یا
ایک قطرہ نہ ملا ابر گہر بار سے بھی
خشکی و تشنہ لبی مجھ میں ہے در آئی کہ میں ...... صحرا

فاروق جائسی، [...]

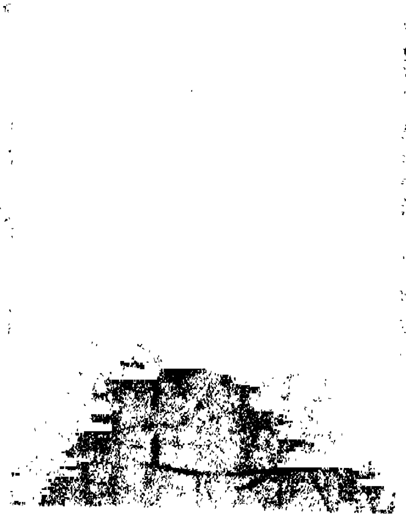
۱۹۵۴ء میں پدم وبھوشن اعزازیافتہ تین نامور شعرا



جوش ملیح آبادی



میتھلی شرن گپت



ولا تھول

۱۴۔ رات ہے کالی بڑی
عمراں کسے نے بالیاں
جن سورج کیہے دیوے
جے دی جگ دے نہیں

رات بہت کالی ہے
اس میں کسی نے کتنی عمریں جلاڈالی ہیں
چاند اور سورج کیسے چراغ ہیں
کہ آج بھی روشن نہیں ہوتے

۱۵۔ بت تیرا سوہنئے
نے اک سٹہ کنک دا
کاہدیاں ایہہ دھرتیاں
اجے دی اگدے نہیں

اے حسینہ تیرا بت
اک خوشۂ گندم ہے
یہ زمینیں کیسی ہیں
کہ وہ خوشے بھی اگتے نہیں

۱۶۔ ہنر بھکھا روٹی
پیار بھکھا گورئیے
کاہدا ہے رکھ نظام دا
پھل کوئی لگدے نہیں

ہنر روٹی کا بھوکا
اور پیار محبوبہ کا
موجودہ نظام کا درخت کیسا ہے
کہ اسے کبھی پھل نہیں لگتا

ہندی

بیت جاتی زندگی سب کی مگر کیا
روک پایا کیا کبھی کوئی صبح کو
راہ پر چلتا کسی کو دیکھ کر کیا
راستے سے روشنی کو دور کرنے
پاؤں میں ہے شکتی من میں حوصلہ ہے؟
دیکھ کر ہنستا ہمیں کب مند تارے
بیت جاتی زندگی یہ سن چکے ہم

سی۔ پی۔ راؤ

خود بتائی زندگی اپنی کسی نے
کیونکہ اس کی نیند پوری ہو نہ پائی
شام نے سوچا کبھی جاؤں نہ اس کے
کیونکہ یہ راہی نڈر چلتا رہے گا
کب کڑکتی دھوپ بدلی چاندنی میں
پڑگئے پاکر ہمارے گھر اندھیرا؟
پھر کبھی کوئی سنے گا یہ کہانی
جو ہوئی پوری ہماری زندگی تھی

بنگالی

سورجر شوئی رو گن شند ھامکھے
تاؤ موچھے دے راتیر اندھکار
تمھو کا گوجے امر کالیر شوئی
پورو مایو لویو کوتو گلو تار آر

پریندر متر

شام کے شفق آلود بادلوں پر خورشید عالم
تاب اپنے دستخط ثبت کر رہا ہے۔ لیکن رات
کی تاریکی اس سنہری تحریر کو بھی مٹا دیتی ہے
میں نہایت معمولی کاغذ پر معمولی روشنائی سے
لکھ رہا ہوں۔ یہ تحریر کب تک قائم رہے
گی۔ اسے بھی زمانہ مٹا دے گا

بنگالی

آج شوندھاے سراون کور چھے پون
شندھے دیے تار بیسا کھی یو تورین

بدھ دیو بوس

آج ساون کے مہینے میں زور سے بارش
ہو رہی ہے۔ غالباً آسمان بیساکھ کے مہینے کا
قرض چکا رہا ہے۔

آجکل کی فائل سے

ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عرش ملسیانی

جلد: ۱۳ نمبر: ۳ اکتوبر ۱۹۵۴

Regd. No. DL- 12033/2001 Licensed U (DN)-56/2001 to post without pre-payment
(Delhi Post) New Delhi
Vol. 60 No. 3 Rs. 7/- Ajkal (Urdu) October 2001

Printed and Published by Suresh Chopra, Director General, on behalf of Publications Division
Printed at Aravali Printers & Publishers (P) Ltd. W-30, Okhla In dustrial Area,Phase-II, New Delhi-20
Published at Publications Division, Patiala House, New Delhi-1, Editor: M.R.Farooqi

آجکل



آجکل کی فائل سے:

دیویندر ستیارتھی

پنجاب کے لوک گیت

ایک چینی شاعر کے قول کے مطابق "زمین میں دفن جواہرات اور موتی اس دن کے انتظار میں رہتے ہیں جب کہ انہیں باہر نکل کر دور دور تک اپنی چمک دکھانے کا موقعہ ملے گا۔" یہی مثال لوک گیتوں پر بھی صادق آتی ہے۔ لوک گیت بھی ایسے ہی دن کے منتظر رہتے ہیں۔ پنجاب میں مختلف اقسام کے لوک گیت مقبول ہیں۔ ان لوک گیتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ پنجابی لوک گیتوں کی بعض اقسام کے نام بہت دلچسپ ہیں مثلاً (۱) ہولار (۲) لوری (۳) تھال (۴) ڈھولا (۵) ماہیا (۶) گھوڑی (۷) سہاگ (۸) سٹھنی (۹) جھوک (۱۰) سی (۱۱) گدا (۱۲) ڈین یا الاہیاں۔

ان گیتوں کے بعض سر بالکل امتیازی نوعیت کے ہیں۔ بالخصوص کانگڑے کے ضلع میں گائے جانے والے گیتوں کے سر لہرے کی مانند کچھ اس طرح اٹھتے بیٹھتے ہیں کہ انہیں سن کر انسان پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ان میں سے غم میں ڈوبے گیتوں کے لہردار سروں میں سوز ہمیشہ حاوی رہتا ہے اور اگر یہ عشق و محبت کے گیت ہوں تو یہ جذبات سے اتنے بھرپور ہوتے ہیں کہ انہیں گانے والے کی ہر ایک تان گہرے جذباتی تجربے کی آئینہ داری کرتی ہے۔ ہر گیت کی تال نمایاں ہوتی ہے اور اسے ایک خاص سر میں گایا جاتا ہے۔

بچے کو جھولا جھلانے، الاؤ کے پاس بیٹھنے کی مسرت، بکری کے کسی خوبصورت بچے کی پیدائش، شادی کے موقع پر نرت، نئے خوبصورت زیور، گاؤں کے کسی میلے یا سارس کی اڑان، غرضیکہ بے شمار موضوعات پر نئے گیت لکھے جاتے ہیں، زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو دیہاتی شاعر کو گیت لکھنے پر نہ ابھارتا ہو۔ لوگ ان گیتوں میں حسب منشا تبدیلیاں کرتے ہیں اور بالآخر یہ ایسی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس میں یہ بآسانی ایک سے دوسرے شخص کو زبانی منتقل کئے جا سکتے ہیں۔

بچے کو سلانے کے لئے ماں کی لوری، یا فصل کی فراوانی پر کسان کی مسرت و شادمانی کا گیت، خواہ یہ گیت دیومالا سے متعلق ہوں یا لوگوں کی ابتدائی جدوجہد کے آئینہ دار، ہر حالت میں یہ گزشتہ یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ اگر ہم پنجاب کے ایک ضلعے سے دوسرے ضلعے میں جائیں تو وہاں کے لوک گیتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ہم پر بخوبی منکشف ہو جاتی ہے۔

تہواروں اور مختلف رسوم سے متعلقہ مختلف زبانوں میں مروجہ گیتوں میں زیادہ فرق نہیں پایا جاتا اس کے علاوہ گاؤں کی عورتیں جب کبھی مل کر چرخہ کاتنے بیٹھتی ہیں تو اس موقعے پر مختلف گیت گاتی ہیں۔ یہ گیت بعض دفعہ سنہری چرخہ حاصل کرنے کے خواب اور بعض اوقات چرخے کی 'مال' (وہ دھاگہ جس کے گرد چرخے کا پہیہ گھومتا ہے) کے بارے میں گائے جاتے ہیں۔ مل کر چرخہ کاتنے کا یہ کام بعض اوقات سارا سارا دن اور ساری ساری رات جاری رہتا ہے۔ بھارت کے کسی اور حصے میں یہ رواج شاید ہی ہو۔ اس موقع پر گائے جانے والے بعض گیت کتنے پیارے ہوتے ہیں مثلاً۔

(۱) گھوں گھوں چرکھڑا	چرخہ گھوں گھوں چلتا
لال پونی کتاں کہ ناں	میں لال پونی کاتوں یا نہ
کت بی بی کت	کاتو بی بی کاتو
(۲) دور میرے سوہرے	میری سسرال دور ہے
میں سوہرے گھر وساں کہ ناں	میں سسرال رہوں یا نہ
وس بی بی وس	رہو بی بی رہو
(۳) لماں میرا دکھڑا	میرے دکھوں کی داستان لمبی ہے
میں دساں کہ ناں	اسے بیان کروں یا نہ
دس بی بی دس	بتاؤ بی بی بتاؤ
(۴) نیانڑا میرا کنت	میرا خاوند چھوٹی عمر کا ہے
میں کنت گھر وساں کہ نہ	میں اس کے گھر رہوں یا نہ
وس بی بی وس	رہو بی بی رہو

ان گیتوں کے الفاظ کو ان کے اندرونی ترنم سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چرخے کی ہر مترنم گھوں گھوں کے ساتھ یہ الفاظ بھی نغمے کے 'پروں' پر اڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ چند ایک اور مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) یار میرا مصری دا کوزا	میرا یار مصری کی مانند میٹھا ہے
مٹھی مٹھی گل کردا	وہ میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے
(۲) یار میرا سرو دا بوٹا	میرا یار سرو کے پودے کی مانند ہے
رب کولوں لے لیا منگ	میں نے اسے خدا سے مانگ کر لیا ہے
(۳) جوگی اترے پہاڑوں	چرخے کی گونج سن کر پہاڑوں سے
چرخے دی گونج سن کے	جوگی بھی نیچے اتر آئے ہیں

باقی [illegible] پر

ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمٰن فاروقی
فون: 3386984

اسسٹنٹ ایڈیٹر
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر
محمد کاظم

جلد: ۶۰ شمارہ: ۴
نومبر ۲۰۰۱ء کارتک۔ اگرہن شک ۱۹۲۳

سرورق: وجے صراف
کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ سی آہوجہ

فی شمارہ: سات روپے سالانہ: ۷۰ روپے
دو سال: ۱۳۵ روپے تین سال: ۱۹۰ روپے
امریکہ یورپ اور دوسرے ممالک کیلئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۰۰ روپے سالانہ
پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۵۰۰ روپے سالانہ

خریداری اور اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر، ڈائرکٹر جنرل، پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتہ پر بھیجیں
سرکولیشن منیجر 'آجکل' ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر کے پورم نئی دہلی۔ ۶۶
رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتوں کیلئے بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱

ترتیب

[illegible]

تخلیق، تخیل اور ست رنگی تتلیاں

"یہ خیال بہت عام تھا کہ ادیب کو صرف اپنے عہد سے وابستگی کے باعث لکھنا چاہئے تاکہ وہ معاشرے میں تبدیلی لاسکے۔ اب دس یا اس سے زیادہ برسوں کے بعد ادیب (اپنے وقار کی بحالی کے بعد) بڑی مسرت سے تخلیق کے خالص عشق کے لئے لکھ سکتا ہے۔ اس لئے اب میں بیانیہ کے نشاط کے لئے ہی لکھنے کو آزاد ہوں۔"

(امبر تو ایکو)

بڑا سے بیت گیا۔ کہیں پڑھا تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں خندقوں میں پڑے کچھ ایسے بھی جرمن سپاہی تھے جو تنہائی کے لمحوں میں رلکے کی شاعری پڑھتے تھے اور میرے سامنے ایک فلم کا منظر آئینہ سا گھوم گیا جس میں ایک سپاہی ایک تتلی کو پکڑنے کے لئے خندق سے ہاتھ باہر نکالتا ہے تو دن سے گولی اس کے ہاتھ میں لگتی ہے اور وہ دم توڑ دیتا ہے۔ بڑا عجیب احساس تھا کہ انسان کے گرد موت اور تتلی مسلسل منڈلاتی رہتی ہے تو وہ تتلی کو پکڑنے کے لئے موت قبول کرلیتا ہے۔ رلکے کی شاعری پڑھتا ہے۔

کئی برس بیت گئے کہ یہ تتلی پھر انسان کے گرد منڈلانے لگی جب نرمل ورمانے 'شتابدی کے ڈھلتے ورشوں میں' میں لکھا: "اگر میں نے فن پارے کے سچ کا تتلی کی اڑان سے مقابلہ کیا ہے تو یہ محض ایک پرکشش تشبیہ نہیں ہے۔ ایک زندہ جاوید کہانی یا ناول کا سچ کہیں رکا ہوا انجام نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنی روانی میں اپنے اسرار سے پردہ ہٹاتا ہے۔ کسی روانی یا اڑان میں ہم کسی شے کو پورے کا پورا نہیں دیکھ سکتے۔ اگر پہلے صفحہ پر اس کی ایک جھلک ملتی ہے تو پچاسویں صفحہ پر آتے آتے اس کا دوسرا رنگ دکھائی دیتا ہے جس کا ہم نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ہم ایک صداقت کے مختلف پہلو الگ الگ اجزا میں دیکھتے ہیں۔ کبھی ایک حصہ پانی کے اوپر ہوتا ہے تو دوسرا تاریک سطح میں ڈوب جاتا ہے۔ مکمل صداقت کیا ہے؟ اس کا چہرہ کیسا ہے؟ اسے ہم ایک بنے بنائے قول یا ایک صاف ستھرے ڈھنگ سے تشکیل شدہ تصور میں نہیں پکڑ سکتے۔"

بیسویں صدی بیت گئی۔ نئی صدی کا ظہور ہوگیا لیکن اب بھی جب کوئی تتلی اڑتی ہے تو پنجابی کے ایک لوک گیت کی یہ سطریں یاد آجاتی ہیں: 'کالی تتری کہوں چوں نکلی / تے اڈدی نوں باز پے گیا۔' آج ادب کی حالت بھی کچھ کچھ تتلی جیسی ہے۔ جب جب وہ اڑنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے کوئی نہ کوئی باز دبوچ لیتا ہے۔ یہ باز بظاہر بڑا معصوم نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر نہ جانے کتنے حملہ آور خونخوار جانور پرورش پا رہے ہیں۔ کبھی نظریے کے نام پر اور کبھی نظریاتی وابستگی کے نام پر، کبھی طبقے، نسل، ذات، مذہب اور جنس کے نام پر ادب پر جھپٹنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے کہ اس تقسیم شدہ ادب کی تنقید سے وہ تمام الفاظ غائب ہوتے جارہے ہیں جو کبھی ادبی ذوق کے مظہر تھے۔ اس کا مقام سیاست کی خطیبانہ لفاظی لے رہی ہے اور سیاست کی زبان روز بروز جارحانہ، اشتعال انگیز اور کریہہ ہوتی جارہی ہے اور اب ادبی ڈسکورس میں بھی آرویلین نیو اسپیک / ڈبل اسپیک کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔

نظریاتی خطابت میں ہر قسم کی تنقید شامل ہے جس میں نظریے کو بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مرکز یا محور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ریاست، سیاست، قوم، مذہب، فرقہ، نسل، رنگ، طبقہ، جنس وغیرہ۔ کیونکہ مارکسیت تنقید کے شعبے پر کافی عرصے سے حاوی رہی ہے اس لئے آئیڈیولوجی اور مارکسیت ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ لیکن فسطائیت، مذہبی بنیاد پرستی، جارحانہ قوم پرستی، نسل پرستی اور تانیثیت بھی نظریات ہیں جو ادبی تخلیق اور تنقید کو متاثر کررہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ فسطائیت اور مذہبی بنیاد پرستی تنقیدی نظریے نہیں۔ وہ تو ہر فن پارے پر تخلیقی اور فنی اظہار پر پابندی عائد کردیتے ہیں جسے وہ اپنے عقیدے اور لائحۂ عمل کے لئے خطرناک سمجھتے ہیں تاکہ سوائے ان کی کوئی دوسری آواز سنائی نہ دے۔ فن ہو یا فکر یا فرد کوئی 'سر اٹھا کے نہ چلے'۔

ایک زمانہ تھا۔ سرخ سویرا کی آمد آمد تھی۔ نظریے کی مسحور کن کشش تھی۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے سرخ سورج کو گرہن لگ گیا۔ جن دیوتاؤں کی پرستش کی تھی وہ پتھر کے صنم نکلے۔ پھر از فِدہ سحر کی ایسی لہر چلی کہ ہر قسم کے ایقان سے یقین متزلزل ہوگیا۔ ایسا بھرم ٹوٹا کہ بعض ادیب بغیر کاز کے باغی ہوگئے اور دوسرے برافروختہ

B-3/153 جنک پوری، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۵۸

روشنی کی ... جدیدیت کی لاش کی قبروں میں سجنے لگے۔ اور کوئی شاعر چلا اٹھا "خدا مجھے گولی مار دے — میں اپنے ذہن کے انجماد کے لئے تیار ہوں۔" بعض دانشوروں نے ... نظریے کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ اور پھر وفیات کا ایسا سلسلہ چلا کہ ... انسان، تاریخ، ادب اور فن، جدیدیت اور یہاں تک کہ ادیب کی موت کا بھی اعلان ہو گیا۔ اور ... 'احساسِ مرگ' میں مبتلا ہو گیا۔ مشل فوکو نے کہا: "سمندر کے کنارے ریت پر بنائے گئے چہرے کی مانند انسان کا نشان مٹ جائے گا۔" ایک نقاد نے یہ تک کہہ دیا کہ ادب کی ابہام و تفہیم سنتے سنتے میں تھک گیا ہوں۔ میری دلچسپی اس میں نہیں کہ ادب کے معنی کیا ہیں بلکہ اس میں ہے کہ اس کا استعمال کیسے کیا جاسکتا ہے؟ مسئلہ ادب کا نہیں بلکہ اس کا ہے کہ اس میں کیا شامل ہے اور اس کا مصرف کیسے کیا جاسکتا ہے۔ ساجد حمید نے لکھا: "ہر ایک شے ہے زد در زد / رقصِ مرگ کو بہ کو / سلگتی ریت بجھ گئی ہے روح میں / یہ کس کی زد میں کون آگیا۔" تو دوستو اس کی زد میں ادب آگیا ہے۔ ادبی تیتری نوں باز پے گیا ہے۔

۲

جب ہر جانب پس ساختیات اور مابعد جدیدیت کی چرچا شروع ہو گئی تو نظریے کے خلا میں بھٹکتے نقادوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ آخر گودو کا انتظار ختم ہوا۔ نئے مسیحاؤں کا جنم ہو گیا۔ نظریے کا مقام تھیوری نے لے لیا۔ ہر شے اور فن پارہ محض متن بن کے رہ گیا۔ ادب نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ وہ محض 'ورک' ہے یا دوسرے متنوں کی مانند محض ایک متن ہے۔ نہ کالیداس رہا نہ کارل مارکس۔ کام سوتر اور داس کیپٹل اور کوک شاستر کا فرق مٹ گیا۔ کسی متن کو کسی دوسرے متن پر فوقیت حاصل نہیں اور اس طرح ادب کی نظریے کے بجائے تھیوری سے گھیرابندی شروع ہو گئی۔ حربہ نیا تھا لیکن مقصد ایک ہی تھا۔ ادب کی کوئی الگ شعریات نہیں۔ کوئی مہابیانیہ نہیں۔ ادب بین المتونی اور بین العلومی ہوتا ہے۔ ہر 'ادبی' متن بنیادی طور پر سیاسی ہوتا ہے۔ ہر متن میں کئی ذیلی متون ہوتے ہیں۔ ان کی تفتیش ہونی چاہئے۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ یہ متون، ادب کے عناصر، شعریات اور کلاسکس سب اشرافیائی، پدری نظام، مرد غالب معاشرے اور نسلی جبر کے پروردہ ہیں۔ تہذیب، معیشت اور معاشرے پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے ذرائع ہیں۔ لہٰذا سب آلٹرن، دلت، خواتین کا تخلیق کردہ ادب یا ان کی حمایت میں تحریر کیا گیا ادب ہی (سیاسی طور پر) صحیح ادب ہے۔ ہم عصر مسائل، سماجی افادیت اور اقتدار کی جنگ کی نسبت سے ہی ادب کی قدر و قیمت معین کی جاسکتی ہے۔ مزاحمت اور کسرِ منفی ہی ادب کے بنیادی عناصر ہیں۔ اس صورت حال میں ادب کی خود مختاری اور جمالیاتی نشاط کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ اس طرح کے سوال اٹھاتے ہیں وہ ہیئت پرست ہی نہیں انحطاط پرست بھی ہیں۔ ادب سے یہ بیزاری روپ بدل بدل کر سامنے آتی ہے۔ ادب ثقافتی مطالعات کا حصہ بن گیا اور اس کی ساخت شکنی شروع ہو گئی۔ ادیب کی موت تو پہلے ہی ہو چکی تھی اب نقاد بھی ڈسکورس اینالسٹ بن گیا۔ ادب، ثقافت اور معاشرے میں حیرت انگیز فکری 'انقلاب' رونما ہونے لگے۔ ثقافتی مطالعات، پس ساختیات، ساخت شکن تنقید، نو تاریخیت، ثقافتی مادیت اور مابعد جدیدیت اور اب پس مابعد جدیدیت۔ سب نئی تھیوری کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ پہلے تنقید کو نئی تھیوری کے نام سے الگ کیا گیا۔ پھر تھیوری کا ادب پر سامراج قائم کیا گیا۔ پھر نئی تھیوری کے نام پر ایسی دہشت پھیلائی گئی کہ تنقید تنقید نہ رہی، ادب ادب نہ رہا۔ (ادب اب تیرا اعتبار نہ رہا) اور پال دی مان نے کہا کہ ادبی تخلیقات کی تفسیر کرنے کا (تاکہانی) رجحان اپنے میں ہی سیاسی عمل ہے۔ ادبی تنقید اپنے ہی میں تشدد آمیز عسکری حکمت عملی ہے۔

۳

آج اگر تنقید تشدد انگیز عسکری حکمت عملی بن گئی ہے اور ادب 'پولٹریچر' بن گیا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ ادب بھی سیاست کی مانند 'حلقہ انتخاب' اور مختلف النوع تشخص کی بائزی اپوزیشن اور ریزرویشن کے ماڈلوں پر تخلیق ہونے لگا ہے۔ اس لئے ان ماڈلوں کے پیروکار یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آج ادب میں کتنے کردار سب آلٹرن، دلت اور اقلیتی طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر تشخص کی سیاست کی یہی رفتار رہی تو کل نسوانی کرداروں کے بارے میں بھی یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ ان میں کتنی دلت، کتنی اقلیتی اور کتنی پسماندہ جاتیوں کی ہیں۔ لامرکزیت کا یہ مسئلہ الجھتا جا رہا ہے کیونکہ ہر فرد کی کئی شناختیں ہوتی ہیں اور وہ طبقے، نسل، ذات، مذہب، جنس، علاقے، زبان اور قومیت کی بنیاد پر الگ الگ حالات، مقامات اور زمان میں کبھی ایک اجتماعی تشخص کا حصہ ہوتا ہے اور کبھی دوسرے تشخص کا۔ اس طرح کشمکش اور اشتراک کی صورت حال مسلسل بنی رہتی ہے۔ تشخص کی سیاست پر مبنی ادب صرف کشمکش پر ہی مرکوز ہوتا ہے۔ والٹ وہٹ مین کے الفاظ میں I am big enough, I contain multitudes در حقیقت فرد اور ادب کو سمیٹ سکتے ہیں۔ وہ اتنے وراٹ ہوتے ہیں کہ ان میں پوری نسل انسانی اور ساری دنیائیں سما سکتی ہیں۔ لیکن ہم صرف ان میں سے چند پہلوؤں کا اظہار کر سکتے ہیں اور کچھ مناظر کا ہی نظارہ کر سکتے ہیں۔

سیاست، نظریہ اور تھیوری کی ایک ہی جہت ہوتی ہے۔ ادب میں فرد کے ہزار روپ ہوتے ہیں۔ اس معنی میں ادب کی صداقت دیگر علوم کی تعمیم اور تسہیل کی صداقت سے الگ ہوتی ہے۔ ادب ہر طرح کی تحویلیت کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ بقول آنند کمار سوامی 'ہم اندر سے آرکی ٹائپل ہیں اور باہر فی نومی نل۔' انسان کو اپنی فطرت کے کسی جزو کو رد کرنے کے لئے نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ ارفع اور ادنیٰ جوہر اور وجود میں باہمی ربط کی امید کی جاسکتی ہے۔ ہم اور وہ کی تفریق اور مخالف دائروں میں تقسیم نے اقتدار کی جنگ میں جو تشدد اور شور پیدا کیا ہے اور جس کے باعث تفریقات تفرقات میں بدل گئی ہیں ان کے بارے میں جارج کونرڈ نے مایوس ہو کر کہا: 'یہ ایک خطرناک دور ہے۔ لفظ کی حرمت فنا ہو رہی ہے۔ کردار ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے ہیں اور یادیں منتشر ہو رہی ہیں اور کوئی بھی یہ کہہ کر اپنے کو تسلی نہیں دے سکتا کہ حالات

بدلیں گے۔ لیکن حالات بدل رہے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آشو وتز کی اذیت گاہوں سے بچ نکلے ایک ۷۲ برس کے شخص نے کہا کہ مرنے سے پہلے اذیت سے بے حال میرے دادا نے کہا تھا کہ اگر تم بچ گئے تو سب کچھ سچ سچ کہہ دینا۔ بغیر کسی فلسفیانہ تشریح کے۔ قل قل ہے۔ اور بقول فیض احمد فیض: "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے / بول زباں اب تک تیری ہے / بول کہ تھوڑا وقت بہت ہے / جسم وزباں کی موت سے پہلے / جو کچھ کہنا ہے تو کہہ لے / بول کہ سچ زندہ ہے اب تک۔"

میرا یقین اب بھی ادب میں ہے کہ ادب کا سچ اور ادب میں سچ اب بھی زندہ ہے کیونکہ کسی فن پارے کا کوئی ایک صحیح اور مستند سچ نہیں ہوتا۔ بلکہ سچ کی تہہ در تہہ کئی پرتیں ہوتی ہیں۔ نئے امکانات ہوتے ہیں۔ کسی تخلیق کا سچ اس کے پورے متن اور فنی پیکر میں مضمر ہوتا ہے۔ اس کے کسی ایک ذیلی متن میں نہیں۔ مکمل متن (اور ساخت) کی قرأت کے بعد سچ کا جو احساس ہوتا ہے وہ پہلے سے تشکیل شدہ اور معین سچ کا نہیں ہوتا۔ فن پارے اور قاری کے مابین سچ پارے کی طرح حرکت پذیر اور بے چین تھرکتا رہتا ہے۔ اس لئے سچ کا سامنا ایک مخصوص متحرک لمحے میں ہی ممکن ہے۔ اگلے لمحے سچ کی کوئی اور جھلک، کوئی اور نوعیت سامنے آسکتی ہے۔ سیاست، نظریہ اور تھیوری کے ذریعے ادب کی اس لافانی قوت اور آفاقی صداقت کو جب جب جھٹلانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ روپ بدل بدل کر نمودار ہو جاتی ہیں۔ جو بات کیتھی این ڈیوڈسن نے نو مور سیپریٹ سفیرز (No more Separate Spheres) میں امریکی ادب کے بارے میں کہی ہے وہ ہمارے لامرکزیت کے حامل ادب اور نظریے کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ 'انیسویں صدی کی امریکی تاریخ کی جنونی نوعیت انجام کار غیر تسلی بخش ہے۔ کیونکہ وہ امریکی معاشرے اور ادب کی مختلف النوع پیچیدہ ساختوں کو سمجھنے کا بہت ہی اجڈ، بہت ہی جامد آلہ ہے لہٰذا یہ اپنی نوعیت میں مایوس کن ہے۔'

۴

آج ادب میں کچھ ایسا ماحول بنایا جارہا ہے اور تمام ڈسکورس کو کچھ اس طرح منظم اور منضبط کیا جارہا ہے کہ جن تھیوریوں کو مشتہر کیا جارہا ہے ان سے باہر خلا ہے یا دانش کا فنا ہے۔ جمالیات اور ادبیات کا ذکر آتے ہی ادیب کی نیت اور شخصیت پر شک کیا جاتا ہے۔ اس وقت جو چیز مکمل طور پر غالب ہے وہ ہے سیاست۔ سیاست 'سیاسی' ہو یا ادبی اس کا مقصد ہے کہ ادبی فارم اپنے پر شرمندہ ہو اور وہ ادیب خجالت محسوس کریں جو ادب کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اس خطابت کے باعث فکریات تو محبوس ہوتی ہی ہیں سماج اور ادب میں مختلف آوازیں بھی مصلوب ہوئی ہیں۔

ایک مثال تانیثیت کی ہی لیجئے۔ فیمنزم کے دوسرے دور کی اولین مفسر بیٹی فریڈن نے کہا: "میں نے وہ سننا شروع کردیا ہے جو میں پہلے کبھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ ان عورتوں کے اندیشوں اور احساسوں کی آواز جو ہماری تحریک کو تشویش کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ نسوانی لبریشن کا اولین دور ختم ہو چکا ہے۔ ہم نے کچھ انتہا پسند نعرے بھی دیے۔ ان کا اثر بھی پڑا۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ہم عورت اور مرد کے باہمی رشتوں اور ازدواجی زندگی اور کیریئر کے بیچ توازن قائم کریں۔ اور اس نے تلی ہاؤ جیفار (؟) لکھی اب منظم ڈسکورسوں کے علاوہ دیگر آوازوں کو سننے کا وقت آگیا ہے۔"

ادب میں کوئی ایک آواز نہیں ہوتی۔ ادبی متن میں بہت سی آوازیں ہوتی ہیں اور ان میں مکالمے کی موجودگی ناگزیر ہے۔ میخائل باختن نے اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے: "کسی تخلیقی فن پارے میں کئی آوازیں ہوتی ہیں۔ قاری اپنے قرأت کے عمل میں ان آوازوں میں انتخاب کرتا ہے۔ یہ مکالمے کی صورت ... کے ساتھ ہر انسانی تخلیقی عمل میں متحرک رہتی ہے۔ ادب کی یہ مکالماتی نوعیت اس کی بنیاد میں موجود رہتی ہے۔ ادب کی اس کثیر الصوتیاتی نوعیت کو جب ایک آواز بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ ادب میں انتشار پیدا کرتی ہے۔ اور یہ انتشار وہ ہے جو نہ صرف معاشرے کو ہی منتشر کر رہا ہے بلکہ ادبی اور اخلاقی اقدار میں بھی خلفشار کی صورت حال پیدا کر رہا ہے۔

ایک سرے پر یہ انتشار ہے اور دوسرے سرے پر آہنگ ہے۔ ایک بڑا فن پارہ اس انتشار کو آہنگ میں بدل دیتا ہے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے جسے اگیئے نے اس طرح پیش کیا ہے: 'شبد میں میری سمائی نہیں ہوتی / میں سناٹے کا چھند ہوں'۔ اسی بات کو نرمل ورما بھی محسوس کرتے ہیں: 'مکالمے کی صورت ختم نہیں ہوتی۔ بغیر کسی مکالمے کے کوئی افسانہ (فن پارہ) نہیں بنتا۔ چاہے وہ مکالمہ فرد کا خود اپنے سے ہی کیوں نہ ہو۔ مکالمے کی شکل ضرور بدل سکتی ہے۔ لیکن مکالمے کا عنقا ممکن نہیں۔'

آج ادبی ڈسکورس میں مکالمے کی نفی اور ادبی تخلیقات میں موضوعات اور مواد کی یک رنگی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم فکر اور دانش کی بند گلی میں گھوم رہے ہیں جہاں نہ دھوپ ہے نہ روشنی اور نہ تازہ ہوائیں۔ ایک ایسا ریگستان ہے جس میں دور دور تک کوئی نخلستان نہیں، نہ ہری بھری کونپلیں ہیں اور نہ بہتے پانی کا سنگیت۔ ایک ویرانی سی ویرانی ہے۔ تنگ دامنی ہے۔ ہم بھولتے جارہے ہیں کہ بظاہر ایک سطح پر کھڑی اینا کیرینینا مادام بووری سے مختلف ہے اور لیڈی چیٹرلی دونوں سے الگ۔ لیکن آج کئی بار تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگ مل کر اجتماعی طور پر الگ الگ ناموں اور الگ الگ عنوانوں سے ایک ہی افسانہ لکھ رہے ہیں۔ اگر ان پر تبصرے پڑھیں تو پاپولر سماجیات کی اصطلاحات میں مرد غالب معاشرہ اور پدری نظام کے خلاف احتجاج کرنے اور رودالی اور نوحہ خوانی کی روایت کو آگے بڑھانے کے بعد تبصرہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی صورت حال تنقید میں بھی ہے۔ (یہ سطریں لکھتے وقت میرے سامنے ہندی ادب میں مروجہ رجحانات ہیں)۔ وارث علوی نے صحیح کہا ہے: 'افسانہ اور ناول چاہے علامتی، تجریدی یا حقیقت پسندانہ ہو، تھیم اور مواد کے اعتبار سے ایک ایسی تاریک سرنگ سے گزر رہا ہے جہاں دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ کمیونسٹ آئیڈیلزم کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ موضوع افسانہ میں یہ یک رنگی اور تنگ دامنی فکشن کے لئے بہت ہی براشگون ہے۔ اتنا برا کہ یہ فکشن کی موت کی علامت ہے۔' آگے چل کر وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: 'وہ ہاتھ میں عقیدے کا لوٹا لے کر تیرتھ یاتراؤں پر نکلنے والے اور

نظریات کی ٹکسالوں میں چاک کھینچنے والوں کی ہمارے یہاں کوئی کمی نہیں رہی۔ یہ سب ان بیوپاریوں کے گورکھ دھندے ہیں جن کے پاس ادب میں پیش کرنے کے لئے کوئی عمل نہیں ہوتا۔ ("ناول بن جینا بھی کوئی جینا ہے")۔ سوال نظریے یا تھیوری کا اتنا نہیں جتنا کہ یہ ہے کہ انسان اور اس کی تخلیقات نہ نظریہ ہے اور نہ ہی تھیوری۔ انسان اور ادب نے ہر ڈیفی نیشن اور حصار بندی کی مزاحمت کی ہے۔ لہٰذا سوال سماجی سروکاروں کی بحالی کا نہیں ادب کی بحالی کا ہے۔

۵

سوال یہ نہیں کہ ادب میں سماجی سروکار یا سیاسی کاروبار ہیں یا نہیں یا نہیں ہونے چاہئے۔ ادب میں کوئی بھی موضوع یا فکر ممنوع نہیں۔ دنیا بھر میں ہر دور میں ادیب نے اپنے اپنے طور اور طرز پر مختلف موضوعات اور فکریات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتے رہے ہیں۔ ایسی متعدد تخلیقات ہیں جنہیں اس کے لئے یا اس کے باوجود اعلیٰ ادب کا مقام حاصل ہے۔ سوال تو بہت سادہ ہے کہ کیا سماجی سروکار اور سیاسی پرچار اور نظریاتی وابستگی ہی کسی تخلیق کو اعلیٰ بناتے ہیں۔ جن تخلیقات میں 'یہ سب کچھ نہیں' وہ کثافت آلودہ ہیں یا نئے ادبی ڈسکورس جس میں سماجی سروکاروں کی بحالی کا جشن منایا جارہا ہے سے باہر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کوئی بھی ادیب تعصبات اور ترجیحات سے آزاد نہیں ہوتا جو کسی نہ کسی روپ میں اس کی تخلیقات میں در آتے ہیں۔ اعتراض تو صرف اس بات پر ہے کہ جب کچھ بھی ذاتی نہیں سب سیاسی ہے تو بحث فن پارے پر نہیں سیاست پر ہوگی۔ مجھے گابرئیل گارسیا مارکیز کی بات یاد آرہی ہے: "میں چاہتا ہوں کہ سماج اشتراکی ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا ہی ہوگا۔ لیکن نظریاتی وابستگی کے ادب جس کا نقطۂ انتہا سماجی مزاحمت کا ناول ہے کے بارے میں میرے ذہن میں شبہہ ہے۔ اس کا بنیادی باعث یہی ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ اس کی محدود عالمی نظر سے سیاست میں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ شعور کے فروغ کے بجائے اسے زوال کی جانب لے جائے گی۔ لاطینی امریکی ناانصافی اور جبر سے واقف ہیں۔ انہیں ناول سے کچھ اور چاہئے۔" جب ادب کو اس کچھ اور سے الگ کر کے دیکھا جاتا ہے تو اس کو اپنے مقام سے سرکائے جانے کے بعد جو خلا پیدا ہوتا ہے اسے نظریے اور تھیوریوں سے بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک مہابیانیہ کے مقام پر دوسرا مہابیانیہ قائم ہو جاتا ہے۔ کیا مارکسیت، تانیثیت اور دلت ساہتیہ نئے مہابیانیہ نہیں۔ کسی ایک نظریے یا نظام پر اصرار چاہے وہ مذہب کی بنیاد پر ہو یا کسی دوسرے مسلک کی، درحقیقت بنیاد پرستی کے مترادف ہی ہے۔ نعرہ تکثیریت کا ہے لیکن سوچ آمریت کی ہے۔ اسی لئے میلان کندیرا نے کہا ہے: "ناول ہمیں دنیا کو ایک سوال کی شکل میں دیکھنے کے باعث خود مختار بناتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس آمروں کی دنیا چاہے مارکس مذہب یا کسی دوسری بنیاد پر تعمیر کیوں نہ ہو سوال کے بجائے جوابات کی دنیا ہوتی ہے۔ اس میں ناول کے لئے کوئی مقام نہیں، جب ادب کی آواز دب جاتی ہے تو رہ جاتا ہے نعروں اور نقاروں کا شور۔

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ جو لوگ گلوبلائزیشن، صارفیت اور میڈیا کی یلغار کو ادب اور کلچر کے زوال کا باعث قرار دیتے ہیں وہ ہی ان کے مقاصد —— ادب، کلچر، جمالیات اور کلاسیکس سے بیزاری —— کو پورا کرنے کے سب سے بڑے آلہ کار ثابت ہو رہے ہیں۔ لیکن ان کی بدقسمتی یہ ہے کہ نہ تو ادب کی موت ہوتی ہے اور نہ ہی کلاسیکس تاریخ کے صفحات بنتے ہیں بلکہ نظریے اور تھیوریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس بات کو میں ایک بار پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ نئی صدی میں ادب کی بحالی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ میں نے لکھا تھا کہ بیسویں صدی کے آخری برسوں (۱۹۹۴ء) میں امریکی جامعات میں غالب تھیوریوں جنہیں سماجی علوم کی حصار بندی کہا گیا ہے کو چیلنج کرتے ہوئے ادب کی بحالی کے لئے ایک نئے ادارے 'ایسوسی ایشن آف لٹریری اسکالرز اینڈ کرٹکس' کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ ادارہ برسر اقتدار ماڈرن لینگویج ایسوسی ایشن کی نظریہ سازی اور تھیوری پر مرکوز رجحان کی سیاست زدگی اور ادب کو کلچرل مطالعات کی نو آبادی بنانے کی کوشش کی مذمت کرتا ہے۔ وہ ادب کو دوسرے متون کی مانند متن محض تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کی مخصوص نوعیت اور ندرت کے لئے انسان کی روحانی بالیدگی اور ذہنی نشوونما کے لئے لازمی تسلیم کرتا ہے۔ تخلیقیت، تخیل، ادبی اقدار، فنی پیکر سازی، جمالیاتی نشاط، ذوق کی تربیت بھرم یا بے معنی الفاظ نہیں۔ ادیب مزاحمت اور تخلیقی مداخلت بھی کرتا ہے اور ممکنہ دنیاؤں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ پس ساختیات کے ایک ممتاز مفسر اسٹینلے فش نے کہا ہے: "کسی نظم کے کیا معنی ہیں اور اس بات میں کہ نظم کی کون سی تفسیر پدری نظام کو فنا کرنے یا جنگ کی کوششوں میں معاون ہوگی بہت فرق ہے"۔ جب 'تنقید نو' کی ہیئت پرستی کی مذمت کی گئی تو اس کے ایک مفسر نے کہا کہ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ نظم کچھ نہیں کہتی بلکہ اس کے برعکس وہ اتنا کچھ کہتی ہے کہ اسے کسی دوسرے ذریعے سے کہنا ممکن نہیں۔

آخر میں:

یہ کائنات، یہ دنیا اور یہ لوگ اپنے اندر کتنی بوقلمونی، کتنی رنگارنگی، کتنی محفلوں اور کتنی تتلیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب اپنے جوہروں اور اپنے ہونے کے معنی کو نمایاں کرنے کے لئے منتظر ہیں۔ ہم ان کے 'جسم کی مایوس پکار (اور) دل کی بے سود تڑپ' کو محسوس کر رہے ہیں۔ جب تتلیاں اڑنا بند کر دیں گی یا تتلیوں کو پکڑنے کی انسان کی خواہش مر جائے گی تو ہاتھوں میں بندوقیں رہ جائیں گی اور ذہنوں میں بارود بھر جائے گا۔ تتلیوں کو بند بوتلوں میں مقید کر کے مردہ بنانے کے بجائے انہیں کھلے آسمانوں اور لہلہاتے سبزہ زاروں میں آزاد اڑنے دو اور تخیل کو نظریوں اور تھیوریوں کی حبس گاہوں میں دم توڑنے پر مجبور کرنے کے بجائے انہیں تفریقات اور تفرقات کی سرحدوں کے آر پار پرواز کرنے دو --- کہ تخیل اور تتلیوں کے بغیر انسان اور ادب کی نجات ممکن نہیں۔ گلزار کا ایک شعر ہے:

لفظ کاغذ پر بیٹھتے ہی نہیں
اڑتے پھرتے ہیں تتلیوں کی طرح

کسی ادب اور ادیب میں تخلیق کی کتنی قوت ہے اس پر منحصر ہے کہ وہ تتلیوں کی مانند اڑتے لفظوں کو کتنے معنی خیز حسن کے ساتھ کاغذ پر بٹھا سکتا ہے۔ ☆☆

قدوس جاوید

مابعد جدید تصور ادب

"لفظ"۔ مجرد معنی نہیں۔ معنی کے متغیر امکانات فراہم کرتا ہے۔

اسی لئے لفظ کا خواہ کسی بھی پس منظر میں کیسا ہی علامتی، استعاراتی یا اصطلاحی استعمال کیوں نہ کیا جائے اس کا مفہوم بہرحال وقتی اور عارضی ہوگا جس میں کبھی بھی ردوبدل، ترمیم یا اضافہ ممکن ہے لہٰذا حوالہ سماجیات کا ہو، ادب کا یا کسی اور شعبہ علم یا فن کا۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی اصطلاحات کے معنی و مفہوم اور تشریح و تعبیر کی حیثیت بھی عارضی اور وقتی ہی ہوگی اور چونکہ روزافزوں علمی، سائنسی اور سماجی ارتقا کے سبب تغیر ہر معاشرہ کے مزاج اور ثقافت کا مقدر قرار پاتا ہے۔ اس لئے ہر معاشرہ کی الگ الگ ثقافتی صورت حال (Cultural Condition) میں ایک ہی لفظ، علامت، استعارہ یا اصطلاح سے الگ الگ معنی، مفہوم اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ پرانے طے شدہ معنی و مفہوم کو رد (Deconstruct) بھی کیا جاسکتا ہے اور نئے معانی و مفاہیم کی تشکیل (Construction) بھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بسا اوقات علوم وفنون میں بعض معاشرتی عوامل کی بنا پر کسی مخصوص لفظ یا اصطلاح سے متعلق کوئی معنی یا تعبیر، دوسرے معانی یا تعبیروں پر حاوی ہو جاتی ہے اور غور و فکر اور بحث و مباحثہ کی فعال متحرک اور بااثر لہروں کو اپنی جانب متوجہ کرلیتی ہے۔ دریدا نے لفظ سے کشف معنی کے حوالے سے نطشے کے جس اصول تفریقیت (Principle of Differentiation) کی حمایت کی ہے اس کا خلاصہ بھی کم و بیش یہی ہے لیکن یاد رہے کہ وقتی طور پر غالب کسی معنی یا تشریح کے سبب لفظ یا اصطلاح کے معنوی امکانات کے سوتے خشک نہیں ہوئے۔ واقعتاً آنے والا کون سا لمحہ، لفظ یا اصطلاح کے معنوی امکانات کا کون سا ورق کھول کر سامنے لے آئے گا، کوئی نہیں کہہ سکتا چنانچہ انہیں اسباب کی بنا پر جدیدیت کی طرح مابعد جدیدیت کی بھی ایسی تعریف، تشریح یا تعبیر سامنے نہیں آپارہی ہے جس میں دیرپا استقلال ہو اور جو ہر معاشرہ، زبان وادب اور مکتبہ ہائے فکر کے لئے یکساں طور پر قابل قبول ہو۔

یہ صحیح ہے کہ سماجیات، فنون لطیفہ، تاریخ اور جمالیاتی تھیوری کے باب میں مابعد جدیدیت ایک مسلمہ رویے (Notion) کا حکم رکھتی ہے۔ گزشتہ ایک دو دہائیوں سے گرچہ مابعد جدیدیت پر غور وخوض اور بحث و مباحثہ کا عمل تیز ہو گیا ہے لیکن کثرت تعبیر کے سبب مسئلہ سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھتا ہی جارہا ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ اگر یہ مسئلہ ابھی حل نہیں کیا گیا تو ڈر ہے کہ مابعد جدیدیت چیستاں بن کر نہ رہ جائے۔ اہاب حسن نے اس ضمن میں بڑی پتے کی بات کہی ہے۔

> The time has come to theorise the term (Post-modernism) if not to defined, before it fades from awkward neologism to derelict cliche without over altaining to the dignity of a cultural concept.

لیکن مابعد جدیدیت کی تعریف (Definition) قائم کرنا یا اسے Theorise کرنا بھی آسان نہیں ویسے مابعد جدیدیت کی اصطلاح کی تشفی بخش تفہیم، تشریح و تعبیر اور نظریہ سازی کے لئے اول تو مابعد جدیدیت کی اصطلاح کے استعمال کی تاریخ اور اسباب پر غور کیا جائے پھر یہ جائزہ بھی لیا جائے کہ مابعد جدیدیت اور جدیدیت (اور دیگر سماجی، ثقافتی اور ادبی نظریات) کے مابین کیا فرق یا مماثلت ہے؟ اور یہ بھی کہ مابعد جدیدیت تھیوری ہے یا صورت حال وغیرہ۔ مابعد جدیدیت کی اصطلاح کے اولین استعمال اور توضیح و تشریح کے ضمن میں مشہور مورخ اور سماجی دانشور آرنلڈ ٹوائن بی کی تصنیف The study in History-vol-8 کا حوالہ کثرت سے دیا جاتا ہے مثلاً چارلس جینکس نے اپنی کتاب What is post-modernism. 1989 میں لکھا ہے کہ Post-modernism کی اصطلاح سب سے پہلے ٹوائن بی نے اپنی تصنیف میں استعمال کی۔ ٹوائن بی نے اپنی تصنیف ۱۹۳۸ء میں مکمل کرلی تھی لیکن اس کی اشاعت ۱۹۴۷ء میں عمل میں آئی۔ ٹوائن بی نے جنگ عظیم کی جاہ کاریوں کے نتیجے میں انسانی، اخلاقی، سماجی اور ثقافتی اقدار کی شکست وریخت کے حوالے سے یوروپ کی مختلف ذیلی تہذیبوں کے فروغ کے سبب بین التہذیب (Multi Culturalism) کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر مابعد جدیدیت دور (Post-modern Era) کی ترکیب استعمال کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عالمی جنگوں کے بعد مختلف النوع سماجی و ثقافتی اداروں کی خود مختاری، فعالیت، افتراقات، تضادات، مسابقت Antagonism اور بعض پہلوؤں سے مماثلت کے سبب جو نئی ثقافتی صورتحال (New Cultural Condition) پیدا ہوئی اس نے دنیا بھر کے دانشوروں

شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سرینگر۔ ۱۹۰۰۰۶

کی جانب مبذول کرائی تھی۔ چنانچہ اپنی تحریر 'Cultural Differentiation' کے لیے میکس ویبر (Max Weber) نے ۱۹۱۸ء میں اپنے ایک خطبے میں اقدار کی تکثیریت کا ذہنی تصادم (Neo Kantian value [illegible]) اور وٹگنسٹائن (Wittgenstein) کے لسانی کھیل (Language Game) کے حوالے سے "نئی ثقافتی صورت حال" کی تشکیل کے ساتھ وضاحت کی۔ علاوہ ازیں ویبر نے اپنے اس خطبے میں ایک اعتبار سے مابعد جدیدیت کی ایک بنیادی صفت تکثیریت (Pluralism) سے منطقی انداز میں بحث کی ہے۔ گویا ویبر کو زندگی کے تمام شعبوں میں قدروں کی شکست و ریخت اور اقداری معقولیت کی قوت کا شدید احساس بھی تھا۔ اسی لئے ویبر نے معاشرتوں کی ہر طرح کے دلائل اور توضیحات کو خواہ وہ سائنسی ہی کیوں نہ ہوں، اصولاً فرسودہ اور لاحاصل قرار دیتے ہوئے یوروپی معاشرہ میں رونما ہونے والی انقلابی، سماجی، ثقافتی اور فکری تبدیلیوں کا محاسبہ پیش کیا ہے۔ اس سے تاریخ کے کلیت پسندانہ فلسفہ کے ارتداد اور مابعد جدیدیت کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ ویبر نے "Science as a vocation" کے عنوان سے اپنے خطبے میں کہا:

"Scientific pleading (for practical and interested stands) is meaningless in principle because the various value spheres of the world stand in irreconciliable conflict with each other...... we realise again today that something can be sacred not only I inspite of its not being beautiful, but rather because and in so far as it is not beautiful..... It is a piece of everyday wisdom that something may be true although it is not beautiful and not holy and not good..... these are only the most elementary cases of the struggle between the gods of the various orders and values....... (1948)

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ۴۰ سال بعد، فرانسیسی دانشور لیوتارڈ (J.F Lyotard) نے اپنی معلوماتی رپورٹ The post-modern Condition میں کم و بیش ویبر کی ہی باتیں دہرائی ہیں:

"Science possesses no general metalanguage in which the other languages can be transcribed and evaluated. There is no reason to think that it would be possible to determine metaprescriptives common to all... language games or that a revisable consensus like the one in force at given moment in the scientific community could embrace the totality of statements circulating in the social collectivity (1984)

اتنی بات ضرور ہے کہ لیوتارڈ کے بیان میں اول تو ویبر کے بیان کے مقابلے میں زیادہ پختگی اور وسعت ہے دوسرے یہ کہ لیوتارڈ کے یہاں مابعد جدیدیت کے مختلف پہلوؤں اور امتیازی خصوصیات کی واضح نشاندہی ملتی ہے۔ لیکن مابعد جدیدیت سے متعلق لیوتارڈ کے افکار کی وضاحت آئندہ سطور میں کی جائے گی۔ فی الحال اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۹۴۰ء سے قبل تک کا زمانہ جدیدیت سے عبارت ہے اور اس عرصہ میں مابعد جدیدیت عام طور پر ایک ارتقا پذیر تھیوری کی حیثیت سے محض ایک قابل غور اور لائق توضیح موضوع ہی بنی رہی لیکن پھر مابعد صنعتی سماج (Post Industrial Society) کے تصور کا فروغ اور سرمایہ داریت (Capitalism) کے داخلی ثقافتی تضادات کی ناگزیریت سے متعلق ڈینیل بیل (Daniel Bell) کی تحریروں (۷۶۔ ۱۹۷۳ء) نے مابعد جدیدیت کو ایک "تھیوری" کی شکل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ بیل کے بعد گرچہ متعدد دانشوروں نے مابعد جدیدیت کے موضوع پر بہت کچھ لکھا لیکن لیوتارڈ (J.F Lyotard) اور بودریلارڈ (Boudrillard) سے قطع نظر جن دانشوروں نے خصوصیت کے ساتھ مابعد جدیدیت کے موضوع پر لکھا ان میں اووینس (C.Owens) اہم ہے۔ اووینس کی تین تحریریں اس ضمن میں مشہور ہیں۔

1. Feminists and Post-modernism.
2. The Discourse of Others.
3. Post-modern Culture.

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹوائن بی نے جنگ عظیم کے بعد یوروپ کی ذیلی تہذیبوں کو اپنے مطالعے اور تجزیے کی بنیاد بنا کر مابعد جدید دور Post-modern Era کی بشارت دی تھی۔ اووینس نے بھی یوروپ کی انہیں ذیلی تہذیبوں کو جن کے تضادات و افتراقات پورے طور پر نمایاں ہو کر یوروپی ثقافت کو ایک نئی صورت حال کا اسیر بنا چکے تھے، اپنے مطالعے اور تجزیے کا موضوع بنایا اور مابعد جدیدیت کی توضیح و تشریح زیادہ منطقی انداز میں کی۔ غرض یہ کہ ۸۵-۱۹۸۰ء کے آس پاس تک آکر مابعد جدیدیت ایک مضبوط، ثمر آور، معنی خیز سماجیاتی تصور Sociological Concept کی حیثیت سے اپنی اہمیت منوا چکی تھی اور نظریاتی سطح پر مابعد جدیدیت کا دائرہ جیسے جیسے وسیع ہو رہا تھا جدیدیت کی بساط ویسے ویسے الٹتی جا رہی تھی۔ چنانچہ جدیدیت کے سب سے بڑے نقیب ہیبرمس (Jurgen Habermas) نے یوروپ کے تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی و ثقافتی حالات (Socio-cultural conditions) سے متعلق ویبر سے لے کر لیوتارڈ تک کے تجزیوں سے بحث کرتے ہوئے نئی ثقافتی صورت حال کے پیش نظر جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے متعلق نئے زاویوں سے بحث کی۔ ہیبرمس نے جہاں یوروپ کے Enlightenment Project of Modernity کی بنیاد پر جدیدیت کی شد و مد سے حمایت کی وہیں مابعد جدیدیت کو واضح لفظوں میں جدیدیت کا مخالف قرار دیا۔ مابعد جدید فن تعمیر (Post-modern Architecture) کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ہیبرمس نے کہا کہ:

"یہ ہمارے عہد کی تشخیص ہے (لیکن)
مابعد جدیدیت قطعی طور پر جدیدیت کی مخالف ہے۔"

It is diagnosis of our times, Post-modernity definitely presents itself as anti- modernity
Habermas-1983

اتفاقاً ہیبرمس نے مابعد جدیدیت کو "نو قدامت پسندی" (Neo conservativa) قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت بھی کی اور اسے Enlightenment Project of Modernity کا کٹر مخالف بھی ثابت کرنے کی کوشش کی۔

رچرڈ گاٹ نے بھی مابعد جدیدیت کو رجعت پسند رویہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

> The revolution was Modernism (......) The counter revolution is Postmodernism. (.......) It is not difficult to comprehend this cultural and aesthetic trend now known as Postmodernism .....in art and architecture, music and film, drama and fiction.... as a reflection of (or 3 comparable Phenomenon to)the present wave of Political reaction sweeping the Western world. Gott 1986.

واضح رہے کہ اس وقت تک مابعد جدیدیت سے متعلق غور و خوض اور بحث و مباحثہ کا عمل سماجیات، سیاست، ثقافت اور فنون لطیفہ میں زیادہ سے زیادہ فن تعمیر Architecture تک ہی محدود تھا لیکن چونکہ اسی عرصے میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مابین افتراقات اور مماثلتوں کی بنا پر جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی اصطلاحوں کے معنوی امکانات اور تاریخی حوالوں کا نئے سرے سے جائزہ لینے کا عمل بھی شروع ہو گیا تھا لہٰذا بیری اسمارٹ (Barry Smart) نے ہیبرمس کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لفظ "جدید" (Modern) کے اولین استعمال کی تلاش و جستجو کے بعد واضح کیا کہ "جدید" کی اصطلاح، لاطینی لفظ Modernus سے مشتق ہے جس کا استعمال پانچویں صدی میں عیسائیوں کو پاگان دور (Pagan Era) سے ممیز کرنے کے لئے کیا جاتا تھا۔ یعنی لفظ Modernus سے جن امکانی معانی و مفاہیم کا اخراج ہو سکتا ہے وہ ہیں الگ، مختلف، منفرد، متضاد، مخصوص اور ممتاز وغیرہ گویا پانچویں صدی عیسوی میں ہی جدت یا جدید کا مطلب، عام دھارے سے الگ یا الگاؤ تھا لیکن بیری اسمارٹ نے یہ بھی واضح کیا کہ لفظ "جدید" کے عصری اصطلاحی استعمال کی جڑیں کانٹ (Kant) کے "تصور تاریخ عالم" میں پیوست ہیں، جس کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ آج ادب اور سماجیات اور دیگر علوم و فنون میں بھی جدید (Modern) جدت پسندی (Modernity) جدیدیت (Modernism) جیسی متعدد ملتی جلتی اصطلاحیں مروج ہیں لیکن کسی بھی اصطلاح سے متعلق نہ تو کوئی تشفی بخش امتیازی معنوی وضاحت موجود ہے اور نہ ہی کسی اصطلاح کے استعمال کی ابتدا وارتقا سے متعلق ٹھوس تاریخی حوالے بلکہ ہر اصطلاح سے متعلق منفی اور مثبت تعبیرات کی اتنی کثرت ہے کہ کسی ایک اصطلاح کے بارے میں بھی کوئی قطعی رائے قائم کرنا آسان نہیں۔

جدت، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسی اصطلاحوں کی تشریح و تعبیر کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اسکاٹ لیش (Scott Lash) نے یہ مشورہ دیا ہے کہ ہمیں ویبر اور ہیبرمس کی پیروی کرتے ہوئے، جدید کاری (Modernisation) کو اس کے تمام تر مترادفات اور انسلاکات کے ساتھ ایک تہذیبی امتیاز (Cultural Differentiation) اور سماجی خود مختاری (Social Autonomization) کے اثر انگیز کرنا چاہئے۔ ہیبرمس نے اپنی تحریروں Modernity Versus Post- Modernity— 1981 اور The Philosophical discourse of Modernity— 1987 میں جدیدیت کے معنی و مفہوم کی وضاحت، قدامت پرستی اور روشن خیالی کے حوالے سے کی ہے اور مابعد جدید ثقافتی صورت حال کی حمایت نہ کرنے کے باوجود مابعد جدیدیت کو عصر حاضر کی ایسی ثقافتی لہر قرار دیا ہے جسے کسی بھی عنوان سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مابعد جدیدیت کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت کے ضمن میں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہئے کہ مابعد جدیدیت کی تفہیم ہی نہیں تشریح و تعبیر کے لئے بھی جدیدیت (Modernism) ایک ناگزیر حوالے کا حکم رکھتی ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مابین مشابہات اور تضادات کے ان گنت رشتے ہیں ہر رشتہ تفصیلی وضاحت کا تقاضہ کرتا ہے لیکن جدیدیت اور روشن خیالی (Modernity and Enlightenment) کے حوالے سے مابعد جدیدیت کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت جن لوگوں نے کی ہے ان میں درج ذیل مصنفین بطور خاص اہمیت کے حامل ہیں:

1. Lietek van vuch Tijssen	Women between Modernity and post- Modemi
2. Bryan,S. Turner	Defining Post-Modernity
3. Hutcheon Linda	Poetics of Post-Modernity
4. Scott Lash	Post-Modernism as Humanism.
5 .Ihab Hassan	The Dismemberment of Orpheus Towards a Post-Modern Literature.
6. Charts Jenks	What is post-Modernism?
7. J.F. Lyotard	1. The Post- Modern Explained to Children 2. The Post- Modern Condition
8. R.Rorty	Habermas and Lyotard on Post-Modernism.
9. Fredric Jameson	The Post- Modernism.
10. Adam B.Seligman	Towards a Re-interpretation of Modernity in an age of Post-Modernity

ان کے علاوہ مابعد جدیدیت کی اصطلاح کی تفہیم و تعبیر کے لئے جن دیگر دانشوروں کے خیالات و تصورات کا مطالعہ ضروری ہے اور جن کے حوالے مابعد جدیدیت سے متعلق ہر بحث میں لازمی طور پر دئے جاتے ہیں ان میں بودریلارڈ (Baudrillard) فوکالٹ (Michel Foucault)، وٹگنسٹین (Wittgenstein) اور درخیم (Emile Durkheim) وغیرہ اہم ہیں۔ لیکن مابعد جدیدیت کی اصطلاح کی تفہیم و تعبیر کے لئے صرف مذکورہ بالا دانشوروں کے خیالات و تصورات کو پیش نظر رکھنا ہی

باقی نہیں بلکہ ادب سمیت علم و فن کے مختلف شعبوں میں مروج بعض دیگر بنیادی اصطلاحات کو بھی وسیع تناظر میں دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ سبب یہ ہے کہ مابعد جدیدیت اصلاً ایک ثقافتی صورت حال کا نام ہے اور چند ایک اصطلاحات ایسی ہیں، جو سیاسی و سیاسی، معاشی و تاریخی، لسانی و فلسفیانہ اور علمی و فنی حوالوں کے ساتھ مابعد جدید ثقافتی صورت حال کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتی ہیں ایسی اصطلاحات میں سے چند ایک اس طرح ہیں:

۱۔ عالمیت۔ (Globalisation) ۲۔ صارفیت۔ (Consumerism) ۳۔ تاریخیت (Historicity) ۴۔ ناسٹلجیا۔ (Nostalgia) ۵۔ حوالیت۔ (Referentiality) ۶۔ افتراقیت۔ امتیازیت (Defferentiality) ۷۔ کثرتیت (Pluralism) ۸۔ پہل کار۔ پہل کاری (Avant gards) ۹۔ بین المتونیت (Intertextuality) ۱۰۔ مہابیانیہ (Grand Narration) ۱۱۔ ڈسکورس۔ مدلل بیان (Discourse) ۱۲۔ مسئلہ خیزی، مسئلہ زائی، قضیہ مسئلہ (Problematic) ۱۳۔ تصور معنی (Signified) ۱۴۔ معنی نما۔ (Signifier) ۱۵۔ لسان (زبان کا جامع تجریدی نظام) (Langue) ۱۶۔ تکلم۔ تکلم کی فی الواقعہ مثال (Parole) ۱۷۔ تحریک نسوانیت (Feminism) ۱۸۔ تفہیمیت۔ علم تفہیم (Hermeneutics) ۱۹۔ مظہریت (Phenomenology) ۲۰۔ شےیت۔ (Comoditification)۔

انسانی معاشرہ، زبان اور ادب کے حوالے سے ہی مابعد جدید صورت حال، نظریات اور رویوں سے متعلق اب تک جو بحثیں سامنے آئی ہیں ان کی روشنی میں مابعد جدیدیت اور مابعد جدید تصور ادب کی حد بندی مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اس لئے کہ گرچہ مابعد جدیدیت عام مفہوم میں تھیوری نہیں اور نہ تحریک ہے بلکہ ایک نئی "صورت حال" ہے جس کی تشکیل متضاد و متخالف دانشورانہ لہروں کے ان گنت دائروں سے ہوئی ہے۔ یہ صورت حال اپنے اندر متعدد و متنوع شعبوں کے مثبت و منفی امتیازات اور نامساعدتوں (Inadequacies) کو سمیٹے ہوئے ہے لیکن اب مابعد جدیدیت کی اصطلاح خصوصیت کے ساتھ جن شعبوں میں مستعمل اور موضوع بحث ہے وہ شعبے ہیں: آرٹ، کلچر اور سوسائٹی۔ اور چونکہ یہ تینوں موضوعات کسی نہ کسی پہلو سے ادب کے لازمے ہیں اس لئے عالمی سطح پر مابعد جدیدیت کی اصطلاح ایسے مفاہیم کا اخراج کرتی ہے جو مابعد جدید تصور ادب کو واضح طور پر ترقی پسند اور جدید تصورات ادب سے ممیز کرتے ہیں چنانچہ تاریخی، سماجی، ثقافتی، لسانی اور جمالیاتی تناظرات میں مابعد جدید تصور ادب کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے:

۱- ادب میں مابعد جدیدیت --- تھیوری یا تحریک نہیں ایک رویہ ہے

☆ تخلیقی آزادی کا تخلیقی خود روی اور طبعی آمد کا
☆ اپنے ثقافتی تشخص پر اصرار کرنے کا
☆ معنی کو سکہ بند تعریفوں سے آزاد کرنے کا
☆ مسلمات کے بارے میں از سر نو غور کرنے اور سوال اٹھانے کا
☆ دی ہوئی ادبی لیک کے جبر کو توڑنے کا، ادعائیت (خواہ سیاسی ہو یا ادبی) کو رد کرنے کا
☆ زبان یا متن کے حقیقت کے عکس محض ہونے کا نہیں، بلکہ حقیقت کے خلق کرنے کا
☆ معنی کے معمولہ رخ کے ساتھ اس کے دبائے یا چھپائے ہوئے رخ کو دکھانے کا
☆ قرأت کے تفاعل میں قاری کی کارکردگی کا۔

۲- مابعد جدیدیت کی فکری اساس ساختیات، پس ساختیات، فلسفہ لسان، نسوانیت، نئی تاریخیت اور رد تشکیل جیسے نظریات اور فلسفوں پر قائم ہے اس لئے ادب کے حوالے سے مابعد جدیدیت ادبی تخلیق کی نوعیت و ماہیت پر نئے تناظرات میں غور کرتی ہے اور زبان کو مرکز و محور مان کر قاری اور قرأت کی بنیاد پر متن کے وحدانی اور کلیت پسندانہ کی جگہ تکثیری اور بوقلموں معانی کی تشکیل پر اصرار کرتی ہے۔

۳- مابعد جدیدیت کسی بھی آئیڈیالوجی کو حتمی یا آخری سچائی نہیں مانتی اور معنی کے "دوسرے پن" (The other) کی تعبیر پر اور اس تعبیر میں قاری کی شرکت پر اصرار کرتی ہے۔

۴- مابعد جدیدیت فن کے جبریت آشنا اور کلیت پسندانہ میکانکی تصور کی نفی کرتی ہے اور فن کی آزاد تخلیقیت کی حمایت کرتی ہے جو اپنے شعری تجربہ اور جمالیاتی کردار کے اعتبار سے غیر یکساں، غیر منظم اور بے محابہ ہوتی ہے۔

۵- مابعد جدیدیت کسی بھی مہابیانیہ یعنی بڑی فلسفیانہ روایات پر یقین نہیں رکھتی۔ ہیگل ہو کہ مارکس، مابعد جدید ذہن سب کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس لئے مابعد جدیدیت "چھوٹے بیانیہ" کی حمایت کرتی ہے یعنی ضمنی اور مقامی روایات کو ترجیح دیتی ہے۔

۶- مابعد جدیدیت کی رو سے "حقیقت" اصلاً وہی نہیں ہوتی جو سامنے نظر آتی ہے۔ واقعتاً حقیقت کے بارے میں انسان مفروضات گھڑتا ہے۔ یہ مفروضات حد درجہ مغالطہ آمیز ہوتے ہیں۔ لہٰذا مابعد جدیدیت حقیقت کی عکاسی یا ترجمانی پر نہیں بلکہ حقیقت کی اصل حقیقت کو جمالیاتی و فنی دروبست کے ساتھ منکشف کرنے پر اصرار کرتی ہے۔

۷- مابعد جدیدیت یہ مانتی ہے کہ ہر تخلیق کار کو اپنے انفرادی نقطہ نظر اور تخلیقی مزاج کے مطابق راست سادہ، استعاراتی یا علامتی کسی بھی اسلوب میں اظہار خیال کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔

۸- مابعد جدیدیت "زبان" کو مرکز و محور مان کر قاری اور قرأت کے حوالے سے زبان کی بنیاد پر ہی "متن" کے وحدانی اور کلیت پسندانہ کی جگہ تکثیری اور بوقلموں معانی کی تشکیل پر زور دیتی ہے۔

۹- مابعد جدیدیت --- جدیدیت کی طرح سماجی احساس اور ثقافتی سروکار سے انکار نہیں کرتی۔ لیکن ترقی پسندوں کی طرح سماجی و ثقافتی سروکار کے عنوان سے کسی وحدانی نظریہ سے نیاز مندانہ اور غیر فطری وابستگی کی نفی ضرور کرتی ہے۔

۱۰- لہٰذا --- ہر وہ ادب جس میں وحدانیت، کلیت پسندی، ادعائیت، غیر فطری وابستگی یا عدم وابستگی اور آمریت کے مقابلے میں تکثیریت، لامرکزیت، آزاد تخلیقیت، رنگا رنگی، بوقلمونی، غیر یکسانیت اور مقامیت جیسے خصائص موجود ہوں، مابعد جدید ادب ہے خواہ یہ ادب غزل اور نظم کی شکل میں سامنے آئے یا ناول اور افسانہ کی صورت میں۔

☆☆

اظہار اثر

اڑن طشتریاں

ہندو مائتھولوجی کے مطابق تمام دیوتا اگنی بان یا اگنی ومان میں بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے ہندوستان میں آگ کے ذریعہ اڑنے والے جہازوں کا تصور ویدوں اور شاستروں کے زمانے سے ہے۔

اگنی بان یا اگنی ومان سے تصور ہوائی جہاز کی طرف نہیں جاتا بلکہ خلا میں بھیجے جانے والے راکٹ یا خلائی جہاز کی طرف جاتا ہے کیونکہ راکٹ ہی آگ اگلتے ہوئے اوپر جاتے ہیں یا اوپر سے نیچے آتے ہیں۔

ہندو مائتھولوجی میں اگنی ومان کا تصور کیسے آیا اس کے بارے میں تفصیل سے کسی اور مضمون میں بحث کی جائے گی اس وقت صرف دو اہم مثالیں پیش کروں گا۔

جب ہماری دنیا سے پہلا راکٹ چاند پر بھیجا گیا اور پہلا انسان چاند پر اترا تو اس راکٹ سے آگ نکلتی تھی یعنی وہ بھی ایک طرح سے اگنی ومان کہا جاسکتا تھا۔ اگر اتفاق سے چاند پر انسانوں کی قسم کے کچھ لوگ آباد ہوتے یعنی وہ ہماری طرح سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوتے لیکن ارتقا کے ابتدائی دور میں ہوتے یعنی سائنس نے ابھی "پہیے" سے "زیادہ ترقی نہ کی ہوتی تو وہاں کے باشندے بھی ہمارے راکٹ کو "اگنی ومان" کی قسم کا کوئی نام دیتے اور ہمارے خلا بازوں کو دیوتا مان کر ان کی پوجا شروع کردیتے کیونکہ یہ ان کے لئے ایک معجزہ ہوتا کہ آسمان کی گہرائیوں سے آگ اگلتا ہوا "بان" (تیر) کی شکل کا ایک منتر (ومان) اترا اور اس میں سے انسانوں جیسے دو آدمی نکلے جن کے لباس، عجیب شکلیں ان سے مختلف تھیں اور ان کے پاس ایسے آلات تھے کہ وہ ایک جگہ کھڑے ہو کر دور کی پہاڑی کے پتھروں کو توڑ سکتے تھے اور پگھلا سکتے۔ (لیزر شعاعوں کے ذریعہ ایسا کیا جاسکتا ہے)

مطلب یہ ہے کہ اب سے چالیس پچاس ہزار سال پہلے اگر کسی دوسرے نظام شمسی میں پہنچنے والے کچھ انسانوں جیسے سائنسداں خلائی جہاز کے ذریعہ ہماری زمین پر اترے ہوں گے تو اس زمانے کے انسانوں نے یہی سوچا ہوگا کہ اگنی بانوں کے ذریعہ دیوتا آکاش سے دھرتی پر اتر آئے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر الگ سے ایک مضمون لکھنے کی بات اس لئے کی ہے کہ جرمنی کے ایک محقق ادیب نے اپنی ایک کتاب "کیا خدا خلا باز تھا" میں یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہماری اس کائنات میں لاتعداد ستاروں کے گرد گھومنے والے ان گنت سیاروں پر انسانوں جیسی بے شمار مخلوقات آباد ہوں گی جن میں سے کچھ ارتقا کی اولین منزلوں پر ہوں گی اور کچھ سائنس میں ہم سے ہزاروں گنا زیادہ ایڈوانس ہوں گی۔

کتاب کے مصنف کا نام Van deni khen ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان جب ارتقا کی بالکل پہلی منزل میں تھا۔ یعنی گوریلوں کی طرح جنگلوں میں رہتا تھا تو کوئی خلائی جہاز اس سیارے کو ہرا ابھرا دیکھ کر ہماری زمین پر اترا تھا۔ اس نے یہاں رہ کر دیکھا کہ یہاں آباد بہت سے جانوروں میں دماغ تو ہے لیکن سوچنے سمجھنے کا شعور نہیں۔ وہ سائنسداں بہت ایڈوانس تھے۔ (اسی لئے وہ خلائی جہاز بنا کر خلا میں سفر کرسکتے تھے) اس لئے انہوں نے گوریلا یا بندر کی قسم کے ایک جانور کا ڈی۔ این۔ اے کوڈ بدل کر چھوڑ دیا۔ مصنف کا خیال ہے کہ ان سائنسدانوں نے اس بندر یا گوریلے کا ڈی۔ این۔ اے کوڈ اپنے جسم کے ڈی۔ این۔ اے کے مطابق بدلا ہوگا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ انہوں نے یہاں گزارا ہوگا تاکہ اپنے تجربہ کا نتیجہ دیکھ سکیں۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ ڈی۔ این۔ اے کوڈ بدلنے سے ان جانوروں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے یعنی وہ باشعور ہوگئے تھے اور جسمانی طور پر ان کے ہم شکل نظر آنے لگے تھے تو وہ لوگ اپنے سیارے پر واپس چلے گئے "وان ڈینی خین" کے نظریہ کے مطابق آج کا انسان اسی تجربہ کا نتیجہ ہے۔ اپنے اس نظریہ کے ثبوت میں اس نے بہت سے سائنسی اور تاریخی ثبوت پیش کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ وان ڈینی خین کے اس نظریہ کی نہ کسی سائنس داں نے مخالفت کی ہے اور نہ اسے سچ مانا ہے۔ امریکہ کے NASA کے ڈائرکٹر سے جب ایک صحافی نے سوال کیا کہ کیا وہ اس نظریہ سے اتفاق کرتے ہیں تو ڈائرکٹر نے جواب دیا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتے نہ وہ اس کو صحیح مان سکتے ہیں نہ غلط کہہ سکتے ہیں۔

بہر حال یہ نظریہ میرے اس مضمون سے کچھ تعلق ضرور رکھتا ہے لیکن میں سائنسی دنیا کے ایک متھ کے خلاف یہ مضمون لکھ رہا ہوں۔

ویدوں میں اگنی ومان کے ذکر کے باوجود کبھی کسی انسان نے پرندوں کی طرح اڑنے کا خواب نہیں دیکھا اس کے باوجود آج انسان ہوائی جہاز میں بیٹھ کر پرندوں کی طرح اڑ کر دنیا کے کسی بھی حصہ میں جاسکتا ہے۔

وائی۔5 ڈی ڈی اے کالونی، نیو رنجیت نگر، نئی دہلی۔110008

پرندوں کی طرح اڑنے کا خواب سب سے پہلے دنیا کے عظیم مصور اور سائنسداں لیونارڈو دا ونچی نے دیکھا تھا۔ لیونارڈو ۱۴۵۲ء میں اٹلی میں فلورنس شہر کے نزدیک ایک گاؤں ونسی (Vinci) میں پیدا ہوا تھا۔ مصوری کی دنیا میں اس کا نام ایک Legend بن چکا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی دو تصویروں کے بارے میں دنیا کا تقریباً ہر شخص جانتا ہے، جن میں سے ایک تصویر "مونالیزا" ہے جس کی پراسرار مسکراہٹ پیرس کے عجائب گھر میں لاکھوں انسانوں کا دل جیتتی رہتی ہے۔ اس کی دوسری عالمگیر شہرت والی تصویر "دی لاسٹ سپر" (The last supper) ہے، جو حضرت عیسیٰ اور ان کے وفادار دوستوں کی آخری ملاقات کی تصویر ہے۔

لیونارڈو دا ونچی دنیا کے مصوروں میں بہت اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ونچی مصور ہونے کے ساتھ ساتھ بہت عظیم سائنسداں بھی تھا اور لیونارڈو ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے پرندوں کی طرح انسان کے ہوا میں اڑنے کی بات سوچی تھی۔

ایک بار وہ ایک پہاڑی پر کھڑا پرندوں کا ایک پنجرہ کھول رہا تھا۔ پنجرہ کھلتے ہی پرندے پر پھڑپھڑاتے ہوا میں اڑنے لگے۔ کچھ پروں کو صرف پھیلا کر ہوا میں تیرنے کا لطف لینے لگے ان کو اس طرح اڑتے دیکھ کر لیونارڈو نے سوچا:

"کیا انسان بھی اس طرح ہوا میں اڑ سکتا ہے؟"

اس خیال کو ذہن میں رکھ کر اس نے سوچنا شروع کیا اور انسان کے اڑنے کے لئے نقشے بنانے شروع کر دیے۔ آخر اس نے بہت سوچ سمجھ کر پہلا طریقہ یہ سوچا کہ اگر انسان کسی بہت ہلکی چیز کے مضبوط پر بازوؤں پر باندھ کر اونچائی سے چھلانگ لگا دے تو وہ اڑ سکتا ہے۔ اس کے لئے اس نے پروں کی ساخت کے نقشے بھی بنائے جو پرندوں کے پروں کو نظر میں رکھ کر بنائے گئے تھے۔ لیکن وہ اپنے نظریہ کو عملی شکل نہ دے سکا۔ ویسے بطور سائنسداں وہ پہلا شخص تھا جس نے پہلی بار ملٹری ٹینک کا تصور پیش کیا۔ پہلی بار آبدوز کشتی کے نقشے بنائے۔ اس نے کسی انجن کے بغیر بہتے پانی کی دھار سے کام لے کر پن چکی وغیرہ کے نقشے بنائے۔ اس نے بہت سے عجیب و غریب ہتھیاروں کے نقشے بنائے لیکن پھر خود ہی یہ سوچا کہ اس کی ایجادوں کے یہ نقشے کسی لالچی بادشاہ کے ہاتھ پڑ گئے تو وہ ان کے ذریعہ لوگوں کو ہلاک کر کے دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنے لگے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی یہ تمام ایجادیں ایک "کوڈ زبان" میں لکھ کر رکھ دیں تاکہ کوئی دوسرا ان کو نہ سمجھ سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے جو کوڈ زبان ایجاد کی تھی وہ "آئینہ کی زبان" کہلائی یعنی اصل تحریر کو آئینہ میں دیکھا جائے تو وہ الٹی نظر آتی ہے۔ لیونارڈو اسی زبان میں اپنے خفیہ فارمولے لکھتا تھا جو اس زمانے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔

لیونارڈو نے پہلی بار ایسی گھڑی بنائی تھی جو گھنٹوں کے ساتھ منٹ بھی بتاتی تھی اس سے پہلے جتنی گھڑیاں بنتی تھیں وہ صرف گھنٹے بتاتی تھیں۔

یہاں لیونارڈو دا ونچی کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ وہ بہت بڑا مصور یا بہت جینیس سائنسداں تھا بلکہ صرف اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ لیونارڈو پہلا انسان تھا جس نے انسان کے ہوا میں اڑنے کے بارے میں سوچا تھا۔

اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے فرانس کے ایک ناول نگار جیولز ورنی (Jules Verni) نے چاند کا سفر نام کی ایک کتاب لکھی تھی اور چاند تک پہنچنے کے لئے اس نے ہوائی غباروں کا استعمال کیا تھا۔

پھر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں رائٹ برادرز نے ہوائی جہاز اڑانے کا پہلا تجربہ کیا اور ان میں سے ایک بھائی پہلی بار چند ہی سولہ سیکنڈ ہوا میں اڑتا رہا۔ یعنی ہم رائٹ برادرز کو آج کے ہوائی جہازوں کا جنم داتا کہہ سکتے ہیں۔ یہ دونوں بھائی تھے جنھوں نے پہلا ہوائی جہاز بنایا اور انسان کو اڑنا سکھایا۔ ان کے تجربات کا نتیجہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ انسان نے ہوائی جہازوں کے ذریعہ پہلے اپنی زمین پر ہر جگہ آنا جانا آسان بنایا اور پھر ترقی کر کے چاند تک پہنچ گیا۔ دوسرے تمام سیاروں تک بلکہ نظام شمسی سے باہر تک اپنے بنائے ہوئے راکٹ بھیج چکا ہے۔ آج کل خلا میں ایک انٹرنیشنل خلائی سینٹر بنایا جا رہا ہے وہ بن جائے گا تو امید کی جاتی ہے کہ ۲۰۲۰ء تک انسان مریخ سیارے پر کچھ سائنسداں بھیجنے کے قابل ہو جائے گا۔

یہ تمام تمہید میں نے اس لئے باندھی ہے کہ گزشتہ پچاس ساٹھ سال سے ایک نئی اڑنے والی چیز لوگوں کی دلچسپی کا موضوع بن گئی ہے جب کہ اس چیز کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ چیز ہے "اڑن طشتری۔"

اڑن طشتری کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ کائنات کے کسی دور دراز حصے سے آتی ہیں جن میں عجیب و غریب قسم کی مخلوقات ہوتی ہیں جو ہماری دنیا پر حملہ کرنے آتی ہیں (حالانکہ آج تک دنیا پر کسی مخلوق نے حملہ نہیں کیا) اڑن طشتری کی شکل گول بتائی جاتی ہے جس طرح چائے کی دو طشتریاں الٹا کر ایک دوسرے پر ڈھک دی جائیں بالکل اسی طرح کی شکل ہوتی ہے اس لئے اس کا نام اڑن طشتری پڑا۔ لیکن کچھ اڑن طشتریاں سگار کی شکل کی بھی دیکھی گئی ہیں۔

دوسری عالم گیر جنگ کے بعد سے ان اڑن طشتریوں کو دیکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کئی بار تو ہوائی جہاز کے پائلٹوں نے بھی ان اڑن طشتریوں کو دیکھا اور ان کا پیچھا بھی کیا لیکن وہ رفتار تیز کر کے نظروں سے غائب ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد کچھ لوگوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کیا کہ ایک ویران مقام پر اس نے زمین پر ایک اڑن طشتری رکھی دیکھی تھی جس میں سے تین چار فٹ لمبے عجیب و غریب بلکہ خطرناک شکل والے جاندار نکل کر انسانوں کی طرح باہر آ رہے تھے اور اندر جا رہے تھے۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ کچھ عجیب و غریب قسم کے آدمی اس کو پکڑ کر اپنی اڑن طشتری میں لے گئے۔ چند گھنٹے یا چند روز اس کو اڑن طشتری میں رکھا پھر اس کو کسی ویران مقام پر چھوڑ کر چلے گئے۔ تقریباً پچاس سال سے اڑن طشتریاں دیکھنے کی کہانیاں سننے میں آ رہی ہیں۔ امریکہ اور روس کے سائنسدانوں نے ان کی باقاعدہ چھان بین کی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جو اڑن طشتریاں اب تک لوگوں کو نظر آئی ہیں وہ سب نظری دھوکہ تھیں۔ اب تک اڑن طشتریاں یا عجیب و غریب مخلوق کے دیکھے جانے کے اہم واقعات بحث کا سبب بن چکے ہیں یا جن کے بارے میں سائنٹفک طریقہ پر چھان بین ہو چکی ہے ان میں سے چند واقعات ذیل میں درج ہیں۔

۲۴/جون ۱۹۴۷ء کو امریکہ میں کینتھ آرنلڈ نام کا ایک شخص واشنگٹن کے رینئر ماؤنٹ کے قریب اپنے پرائیویٹ جہاز میں جا رہا تھا۔ اچانک اس کو آسمان میں کچھ عجیب سی چیزیں اڑتی نظر آئیں وہ پہاڑ کی چوٹی کے بالکل قریب اڑ رہی تھیں اور اس طرح اڑ رہی تھیں جیسے کسی نامعلوم طور پر ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوں۔ آرنلڈ

تین منٹ تک ان کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ پہاڑی چوٹیوں کے درمیان نظر آتی رہیں۔ ان پر سورج کی تیز روشنی چمک رہی تھی دیکھنے میں وہ گول تھیں۔ پھر وہ غائب ہو گئیں۔ کینتھ آرنلڈ خوفزدہ ہو گیا اور یاکیما (واشنگٹن) میں آکر اس نے بتایا کہ اس نے پراسرار اڑن طشتریاں دیکھی ہیں۔ کچھ دنوں بعد پتہ چلا کہ وہ اڑن طشتریاں کچھ اور لوگوں نے بھی دیکھی تھیں۔ شاید یہ پہلی بار تھا کہ عوام میں کسی دوسرے سیارے سے آنے والی اڑن طشتریوں کا خوف پھیلا۔

اس کے بعد ۷ جنوری ۱۹۴۸ء میں ایک حادثہ نے اس خوف کو اور بڑھا دیا۔ اس روز دوپہر کے وقت امریکہ کی "گوڈمین ایر بیس" کا ایک پائلٹ جہاز لے کر جا رہا تھا کہ اس نے "آئس کریم کون" جیسی ایک عجیب چیز کو اڑتے دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ کسی قسم کا پراسرار جہاز ہے اس نے ریڈیو سے فوراً ایئر کنٹرول کو بتایا کہ "ایک بڑا مخروطی جہاز اوپر اڑ رہا ہے اور وہ اس کا پیچھا کر رہا ہے تاکہ جان سکے کہ کیا ہے۔"

کچھ دیر کے بعد پائلٹ نے بتایا کہ "اس پراسرار چیز کا سائز بہت بڑا ہے اور وہ کسی قسم کی دھات سے بنا ہوا ہے۔ اب یہ بہت تیزی سے اوپر اٹھ رہا ہے۔ میں اس وقت تین سو ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اس وقت میں بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ہوں۔" پائلٹ کی یہ آخری رپورٹ سوا تین بجے موصول ہوئی تھی پھر اس سے ریڈیو کنکشن ٹوٹ گیا۔ جب کوئی اور رپورٹ نہ ملی تو ایئر فورس کے کچھ جہاز اس کی تلاش میں بھیجے گئے اور شام تک تلاش کرنے والوں کو "فورٹ نوکس" کے پاس پائلٹ کی لاش اور جہاز کا ملبہ مل گیا اس وقت کے سائنسدانوں نے پراسرار جہاز کی پوزیشن کا اندازہ لگا کر سوچا کہ ممکن ہے یہ پراسرار جہاز سیارہ زہرہ (Venus) سے آیا ہو۔ لیکن بعد میں چھان بین سے پتہ چلا کہ سیارہ زہرہ اس دن آسمان میں نظر ہی نہیں آیا تھا۔

یہ اڑن طشتری کے سلسلے میں پہلی موت تھی۔ ان دو واقعات کے بعد امریکہ کے مختلف حصوں میں اڑن طشتریاں دیکھے جانے کی خبریں آنے لگیں۔ دیکھنے والے پائلٹ، راڈار کنٹرولر، ایئر پورٹ ٹریفک کنٹرولر، میزائلوں پر نظر رکھنے والے سائنسداں شامل تھے۔ زیادہ تر اڑن طشتریاں جنوب مغرب کے ریگستانی علاقہ میں نظر آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ میکسیکو، کناڈا، جنوبی افریقہ، یوروپ، آسٹریلیا، افریقہ، ہوائی اور گرین لینڈ سے بھی اڑن طشتریاں دیکھے جانے کی خبریں آنے لگیں۔

آخر ۵۳-۱۹۵۲ء میں کناڈا کی رائل ایئر فورس نے ان کو یو۔ ایف۔ او (UFO) کا نام دیا جو (Unidentified Flying Objects) کا مخفف تھا اس کا مطلب تھا ایسی اڑنے والی چیزیں جن کی کوئی شناخت نہ ہو۔ پھر انہوں نے اڑن طشتریوں کے بارے میں باقاعدہ تحقیق کے لئے ایک کمیٹی بنائی اور دنیا بھر کی رپورٹیں جمع کر کے تحقیق شروع کر دی۔ اب تک جتنی بھی اڑن طشتریاں دیکھی گئی تھیں وہ سو فٹ قطر سے لے کر چند انچ قطر تک بتائی گئی تھیں ان میں کچھ سگار کی شکل کی بھی اڑن طشتریاں یا خلائی جہاز تھے ان کی لمبائی سو فٹ سے ایک ہزار فٹ تک بتائی گئی تھی۔

کچھ لوگوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے ان اڑن طشتریوں میں سوار ایک عجیب و غریب قسم کی مخلوق بھی دیکھی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں فرانک اسکلی (Frank Scully) نام کے ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ اس نے سیارہ زہرہ سے آئی مخلوق کی لاشیں دیکھی ہیں۔ ان کا خلائی جہاز یا اڑن طشتری زمین پر گر کر ٹوٹ گیا تھا جس سے وہ سب مر گئے تھے۔ یہ حادثہ نیو میکسیکو کے قریب پیش آیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ زہرہ سیارے کے یہ باشندے چالیس پینتالیس انچ لمبے تھے اور ایسے کپڑے کے لباس پہنے ہوئے تھے جو پھٹتا نہیں تھا۔ بعد میں نیو میکسیکو ایئر فورس کے پائلٹ ان کی لاشیں اور اڑن طشتری کا ملبہ اٹھا کر لے گئے۔

اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں ایک عورت اور اس کے تین بچوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے ایک اڑن طشتری دیکھی جس میں سے ایک عجیب و غریب چیز آدمی جیسی شکل کی نکلی جس کا قد کم از کم نو فٹ لمبا ہوگا۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا تھا اور آنکھیں چہرے پر ایک فٹ آگے تک نکلی ہوئی تھیں۔ جب وہ عجیب آدمی ان کی طرف بڑھا تو اس کے منہ سے سانپ کی جیسی پھنکاریں نکل رہی تھیں۔ یہ لوگ اس سے ڈر کر جان بچا کر بھاگ آئے۔

کچھ لوگوں نے اڑن طشتریوں اور ان میں اڑنے والی مخلوقات کے فوٹو بھی بنا کر اخباروں کو بھیجے۔ آخر ایئر فورس کے سائنسدانوں نے باقاعدہ ان کہانیوں کی چھان بین شروع کی اور کئی سال کی تحقیق کے بعد ایک کتاب "اڑن طشتریاں" کے نام شائع ہوئی جس میں بتایا گیا کہ اڑن طشتریوں کا کوئی وجود نہیں۔ زیادہ تر یہ Mirage یعنی ریگستانی سراب کی طرح نظری دھوکہ ہوتے ہیں کہیں روشنی عجیب زاویوں سے پڑنے پر یہ تماشہ دکھاتی ہے، کہیں بڑے شہاب ثاقب جلنے کی وجہ سے روشن ہو کر اڑن طشتری بن جاتے ہیں اور کہیں بڑے غبارے جو انسان کے قابو سے باہر ہو کر فضا میں تیرنے لگتے ہیں ان کہانیوں کا سبب بنتے ہیں بعد میں انسان کا تصور ان سے کہانیاں گھڑ لیتا ہے تاکہ اسے کچھ شہرت مل سکے۔ اس سلسلے میں جتنے بھی فوٹو پیش کئے گئے وہ سب یا تو روشنیوں کا کرشمہ ثابت ہوئے یا فوٹو ٹرکس (Photo Tricks) ثابت ہوئے۔ ثابت ہوا کہ اڑن طشتریوں کا کوئی وجود نہیں اور نہ ہی کائنات کی کوئی عجیب مخلوق ہمارے سیارے پر حملہ آور ہوئی۔ آج کے زمانے میں اڑن طشتری یا خلائی جہاز یا کسی دوسرے نظام شمسی کی مخلوق کے حملہ آور ہونے کے تمام نظریات بچکانہ باتیں کہے جا سکتے ہیں۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ یہ سب باتیں ناممکن کیوں ہیں؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ سورج کے گرد نو سیارے گھومتے ہیں اور ان سیاروں کے گرد بہت سے چاند بھی گھومتے ہیں لیکن آج ہماری خلائی سائنس اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ ہمارے مصنوعی سیاروں یا خلائی جہازوں نے نظام شمسی کے تمام سیاروں اور ان کے چاندوں کو بہت قریب سے دیکھ لیا ہے اور ان کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر لی ہیں۔ بہت سے سیاروں پر تحقیق کرنے والے روبوٹ بھی اتارے جا چکے ہیں۔ اس وقت تک کی تحقیق کے مطابق نظام شمسی میں ہماری زمین کے علاوہ کسی سیارے یا اس کے چاند پر کسی طرح کی حیات کے آثار نہیں ملے لیکن پھر سائنسداں ابھی تک پُر امید ہیں کہ اگر وہ مریخ پر اتر سکے تو شاید وہاں جراثیمی حیات مل جائے۔ بہرحال اس کا فیصلہ تو مستقبل کرے گا لیکن یہ طے شدہ امر ہے کہ کسی بھی سیارے یا اس کے چاند پر انسانوں جیسی باشعور حیات کا وجود نہیں۔ چنانچہ ان سیاروں سے کسی اڑن طشتری یا خلائی جہاز کا آنا ناممکن ہے۔

اب رہ جاتی ہے کائنات میں پھیلی کروڑوں کہکشاؤں اور ان کہکشاؤں کے ان گنت سورجوں کی بات تو سائنسدانوں کا یقین ہے کہ ان اَن گنت سورجوں میں بے شمار

سورجوں کے گرد کچھ سیارے بھی گھوم رہے ہوں گے، جن میں سے کچھ ایسے سیارے بھی ہوں گے جن پر زمین جیسی آب و ہوا اور فضا ہو جس میں باشعور حیات پیدا ہو سکتی ہو اور پنپ سکتی ہو۔ ہماری اپنی کہکشاں میں تقریباً تیس ارب ستارے ہیں۔ کہکشاں کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک روشنی ایک لاکھ سال میں پہنچتی ہے۔ ان تیس ارب ستاروں کا بہت تنقیدی نظر سے جائزہ لینے کے بعد سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ ہماری کہکشاں میں ہی کم از کم اٹھارہ ہزار سیارے ایسے ضرور ہوں گے جن پر کسی نہ کسی قسم کی باشعور مخلوق بستی ہوگی اور یہ مخلوقات سائنس میں ہمارے برابر یا ہم سے کم یا ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو سکتی ہیں۔ یعنی ایسی مخلوقات ہو سکتی ہیں جو ستاروں کے درمیان سفر کرنے کے قابل ہو گئی ہوں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ستاروں کے درمیان سفر کرنے کے لئے روشنی کی چوتھائی یا اس سے کچھ کم رفتار پر چلنے والے خلائی جہاز بنانا بہت ضروری ہے۔

ہمارے سورج سے سب سے زیادہ قریبی سورج "الفاقنطوری" ہے مگر وہ بھی اتنی دور ہے کہ اس کی روشنی ہم تک ساڑھے تین سال میں پہنچتی ہے جب کہ روشنی ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر کی رفتار سے چلتی ہے۔ ہمارے اپنے سورج کی روشنی ہم تک آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے اور ہمارے راکٹ زیادہ سے زیادہ ایک سیکنڈ میں سات میل کی رفتار سے چل سکتے ہیں اس کا مطلب ہے اگر ہم اپنے بنائے ہوئے راکٹ سے الفاقنطوری کے لئے روانہ ہوں تو کم از کم ڈھائی تین سو سالوں میں وہاں تک پہنچ سکیں گے، اس لئے ستاروں کے درمیان سفر کرنے والے خلائی جہاز روشنی کی رفتار سے چوتھائی یا کم از کم دسواں حصہ رفتار سے سفر کرنے والے بنانے ہوں گے۔ دوسرے سیاروں تک پہنچنے میں یا وہاں کی مخلوق کا ہمارے سیارے تک آنے میں دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ ابھی تک ہمیں پتہ نہیں کسی باشعور مخلوق سے آباد سیارہ ہم سے کتنے فاصلہ پر ہوگا اور کس طرف ہوگا۔

بحث کے لئے ہم مان لیتے ہیں کہ ہمارے سورج سے بیس نوری سالوں کے فاصلے پر ایک سیارے میں باشعور مخلوق کے آثار نظر آتے ہیں۔ اب اگر ہم یا وہاں کی مخلوق ہم تک پہنچنے کے لئے خلائی جہاز بناتے ہیں تو وہ جہاز کم از کم کسی چاند کے برابر بنانا ہوگا جس میں زندگی برقرار رکھنے کا ہر قسم کا سامان ہو۔ خوراک، پانی، ہوا حاصل کرنے کا قدرتی بندوبست ہو یا مصنوعی قدرتی فضا اور حالات بنائے جائیں تاکہ اگر ہمیں کئی نسلوں تک سفر کرنا پڑے تو سفر کرتے ہوئے اس سیارے تک پہنچ سکیں۔

ستاروں کے درمیان سفر کرنے والے اس جہاز کو اسٹیلر شپ (Steller Ship) یعنی خلائی جہاز کہا جائے گا اور یہ جہاز اس قدر بڑا ہوگا اور اس قدر تیز رفتار سے سفر کرے گا کہ اپنے گرد ایک قسم کا Force Field بنالے گا جسے ہم توانائی کا غلاف کہہ سکتے ہیں جس میں خلا میں تیرنے والے شہاب ثاقب گھس کر جہاز کو نقصان نہیں پہنچا سکیں اور یہ جہاز صرف ستاروں کے درمیان عظیم فاصلوں میں ہی سفر کر سکے گا۔ یعنی اگر کوئی باشعور مخلوق اپنے اسٹیلر شپ میں بیٹھ کر ہمارے نظام شمسی تک آجاتی ہے تو وہ براہ راست ہمارے سیارے پر نہیں آسکیں گے نہ ہی ہمارے سیاروں کے درمیان سفر کر سکیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اس جہاز کا فورس فیلڈ اس جہاز کو بھی اور ہمارے نظام شمسی کے سیاروں کو نقصان پہنچائے گا۔ چنانچہ اس خلائی جہاز کو جسے Mother Ship بھی کہا جا سکے گا۔ سب سے پہلے ہمارے نظام شمسی سے باہر رہ کر اپنا مدار قائم کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد اس مدر شپ سے چھوٹے خلائی راکٹ یا جہاز بھیجے جائیں گے جو سیاروں کے درمیان بغیر کسی خطرے کے سفر کر سکیں گے اور کسی سیارے پر اتر سکیں گے۔

ان تمام چیزوں کو نظر میں رکھ کر اب اگر ہم اندازہ لگائیں تو اڑن طشتری نام کی کسی چیز کا وجود ہو ہی نہیں سکتا۔ آج ہماری سائنس اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ ہم خلا میں گھومنے والے بڑے شہاب ثاقبوں تک کا پتہ لگا لیتے ہیں پھر کوئی اڑن طشتری ہماری دوربینوں اور ہمارے ریڈار سسٹموں سے بچ کر ہمارے نظام شمسی میں کیسے آسکتی ہے۔

دس سال پہلے پائینیر نمبر ایک نام کا ایک خلائی راکٹ ہم نے پلاٹو سیارے تک بھیجا تھا بلکہ سچ یہ ہے کہ اسے سیارہ پلاٹو سے آگے گہرے خلا میں جانے کے لئے تیار کیا گیا تھا تاکہ ستاروں کے درمیان پہنچ جائے یہ کوشش اس لئے کی گئی تھی کہ شاید ہمارا وہ خلائی جہاز کائنات کی کسی باشعور مخلوق کے ہاتھ لگ جائے اور اسے معلوم ہو جائے کہ ہم بھی ایک سورج کے سیارے پر آباد ہیں اس طرح وہ ہم سے رابطہ قائم کر سکیں گے۔

ہمارا وہ سیارہ پائینیر نمبر ایک ہمارے نظام شمسی سے بہت دور نکل گیا ہے۔ ابھی چند دن پہلے دس سال بعد اس سیارے سے زمین پر سگنل وصول ہوئے تھے۔ سیارہ اتنے فاصلے پر پہنچ چکا ہے کہ اس کا سگنل ساڑھے اکیس منٹ میں ہم تک پہنچا ہے اس سگنل کا جواب بھی اتنی ہی دیر میں سیارے تک پہنچ سکے گا۔

اس طرح آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ہمارے سائنس دانوں اور خلائی اسٹیشنوں کی نظروں سے بچ کر کسی اجنبی مخلوق کا خلائی جہاز یا اڑن طشتری ہم تک کیسے پہنچ سکتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس لامحدود خلا کے لاتعداد ستاروں میں کس کس سیارے پر کوئی مخلوق آباد ہو سکتی ہے اس محاورے سے بھی مشکل ہے جس میں کہا جاتا ہے بھوس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے کی کوشش ـــ! اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اڑن طشتریوں کا وجود ایک سائنسی معمہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

لیکن اگر ہم اڑن طشتریوں کے اس معمہ کا تجزیہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ وہم اور خوف دو چیزیں ایسی ہیں جو معمہ بناتی ہیں یا کسی چیز کے معمہ بن جانے کا سبب بنتی ہیں۔ مثلاً دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے کوئی اڑن طشتریوں کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ فرانس کے جیولز ورنی نے چاند تک جانے کی بات سوچ لی تھی اس سے آگے کچھ نہیں تھا۔ پہلا ہوائی جہاز بیسویں صدی کی ابتدا میں بنا۔ پہلی اور دوسری عالم گیر جنگوں میں ہوائی جہازوں کا خوب استعمال ہوا اس کے بعد کہانی کاروں اور فلم سازوں نے لوگوں کو حیران کر دینے والی عجیب و غریب سائنسی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ امریکہ نے سائنسی فلمیں بنانے کی ابتدا کی۔ اس صدی کے چوتھے دہے میں سائنس پر کئی فلمیں بن چکی تھیں مثلاً ایک فلم میں دکھایا گیا تھا کہ سیارہ مریخ کے باشندوں نے اڑن طشتریوں کے ذریعہ ہماری زمین پر حملہ کر دیا ہے۔ تین انگلیوں والی ایک عجیب و غریب مخلوق کو اڑن طشتریوں کے ذریعہ امریکہ پر حملہ کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس طرح کی کئی فلمیں بنیں تو عام انسان کے ذہن نے بھی نئی نئی باتیں سوچنا شروع کر دیں۔ انگریزوں کا ایک مقولہ ہے کہ Fear is the key یعنی خوف ہر چیز کی کنجی ہے۔ انسان کے ہر کام کے پیچھے خوف کا جذبہ ہوتا ہے۔ ہم خدا کی عبادت اور انسانیت کے کام اس لئے کرتے ہیں کہ دوسری دنیا میں ہماری بخشش ہو سکے اور ہندو عقیدے کے مطابق ان کی آتما کو "موکش" یعنی نجات مل سکے۔ ہم کڑوی دوائیں اس لئے کھاتے ہیں کہ بیماری سے مر نہ جائیں۔ خوف وہم کو پیدا کرتا ہے اندھیری رات

میں ہم سایوں سے بھی ڈر جاتے ہیں کیونکہ ہمارا وہم ان سایوں کے نہ جانے کتنے خوفناک روپ بنا کر پیش کر دیتا ہے۔

جب کہانیوں اور فلموں میں دوسرے سیاروں سے آئی اڑن طشتری کا ذکر ہونے لگا اور ان سیاروں کی مخلوق کو خوفناک شکلوں میں دکھایا جانے لگا تو لوگوں کے اندر خوف اور وہم نے بھی اپنا کام شروع کر دیا۔ اس مضمون میں بتایا جا چکا ہے کہ پہلی اڑن طشتری امریکہ کے کینتھ آرنلڈ نے ۲۴ جون ۱۹۴۷ء کو دیکھی تھی۔ بعد میں تحقیقات پر پتہ چلا کہ اس نے پہاڑی چوٹیوں پر روشنی کا کوئی سراب دیکھا ہوگا اس کا پیچھا کیا اور پیچھا کرتے ہوئے کسی پہاڑی چوٹی سے ٹکرا گیا اور مر گیا۔ اس حادثے نے لوگوں میں خوف کی لہر دوڑا دی اور لوگوں نے بھوتوں کی طرح اڑن طشتریاں دیکھنی شروع کر دیں۔ کچھ لوگوں نے شہرت حاصل کرنے کے لئے عجیب و غریب مخلوقات دیکھنے کی کہانیاں بنانا شروع کر دیں جب کہ ان چیزوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس طرح اڑن طشتریاں ایک سائنسی متھ بن گئیں۔

لیکن ان تمام سچائیوں کے باوجود یہ بات بھی ممکن ہے کہ کبھی بھی کسی دوسرے نظام شمسی میں آباد کوئی باشعور مخلوق ہمارے سورج تک آ سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنسداں پورا یقین رکھتے ہیں کہ اس کائنات کے ہزاروں سورجوں کے گرد سیارے ہوں گے۔ ان میں سے بہت سے سیاروں کی فضا ہماری زمین سے ملتی جلتی ہو سکتی ہے اور انسانوں جیسی کوئی باشعور مخلوق آباد ہو سکتی ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ ستاروں کے درمیان فاصلے اتنے عظیم ہیں کہ ہم خلائی جہاز بنا لینے کے باوجود اپنے سب سے قریبی سورج تک نہیں جا سکتے۔ ابھی تو سائنسداں صرف یہ امید کرتے ہیں کہ شاید کسی دوسرے نظام شمسی میں آباد کوئی مخلوق طاقتور مائکرو سسٹم کے ذریعہ ہم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ مائکرو سسٹم کی لہریں روشنی کی رفتار سے سفر کر کے کم سے کم وقت میں ہم تک پہنچ سکتی ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اتنے عظیم فاصلوں کے درمیان گفتگو کرنے کے لئے بہت طاقتور مائکرو ویوز (Waves) ہی کام کر سکتی ہیں۔ کیونکہ خلا میں ہر وقت کاسمک شعاعیں اور طرح طرح کی برقناطیسی لہریں رہتی ہیں وہ کمزور لہروں کو دبا دیں گی اور سننے کے ناقابل بنا دیں گی۔ بلکہ اس سلسلہ میں باقاعدہ تجربات اور مشاہدے کئے جا رہے ہیں۔ پہلی بار اپریل ۱۹۶۰ء میں گرین بیک ویسٹ ورجینا میں ۸۵ فٹ کی ایک دوربین کا رخ ایک ستارے تاؤ سیٹی (Tao seti) کی جانب موڑا گیا۔ یہ ستارہ ہمارے سورج سے تقریباً ساڑھے گیارہ نوری سالوں کے فاصلے پر ہے۔ اس ستارے سے کچھ عجیب قسم کے بہت طاقتور ریڈیو سگنل وصول ہو رہے تھے۔ اس لئے سائنس دانوں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے اس ستارے کے کسی سیارے پر کوئی باشعور مخلوق آباد ہو اور وہ ہم سے ریڈیو سگنلوں کے ذریعہ رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چنانچہ اوزما (Ozma) نام کا ایک باقاعدہ پروجیکٹ بنایا گیا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اس ستارے سے وصول شدہ ریڈیو سگنلوں کو ڈی کوڈ کرنے یعنی سمجھنے کی کوشش کرے۔

اسی طرح کے بہت سے پروجیکٹ کئی ملکوں میں جاری ہیں جو کسی اجنبی مخلوق سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ملی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات میں پھیلے ان گنت ستاروں اور کہکشاؤں میں سے کس پر کوئی باشعور مخلوق ہو سکتی ہے یہ اندازہ لگانا قطعی ناممکن ہے۔ یہ کامیابی اتفاق سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ [illegible] تحقیق سے کائنات میں کوئی آباد سیارہ تلاش کرنا قطعی ناممکن

ہے۔ اس کے باوجود دنیا بھر کے سائنسداں کسی باشعور مخلوق کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور اس وقت تک ستر ایسے نظام شمسی تلاش کر چکے ہیں جن کے گرد سیارے گھوم رہے ہیں لیکن وہ سیارے ہمارے سیارے جیوپٹر (مشتری) کی طرح بہت بڑے اور گیسوں سے بھرے ہوئے ہیں دوسرے ان کے بیضوی مدار اس طرح کے ہیں کہ جب وہ چکر لگاتے ہوئے سورج کے قریب جاتے ہیں تو اس قدر گرم ہو جاتے ہیں کہ اس حرارت میں کوئی زندگی نہیں پنپ سکتی جیسا کہ ہمارے سیارے عطارد اور زہرہ کی [illegible] درجہ حرارت ہیں اور جب اپنے مدار کے دوسرے سرے پر ہوتے ہیں تو اس قدر سرد ہو جاتے ہیں کہ ان کا درجہ حرارت ۱۸۰ نفی میں چلا جاتا ہے۔ حال ہی میں ماہر فلکیات سائنس دانوں کو ایک کامیابی حاصل ہوئی ہے جس نے وقتی طور پر ساری دنیا میں ہلچل کی ایک فضا پیدا کر دی ہے۔ زمین جیسے سیاروں کو تلاش کرنے والے سائنسدانوں کو بگ ڈپر (Big dipper) نام کے سورجوں کے ایک جھمکٹ میں ایک ایسا ستارہ ملا ہے جس کے گرد زمین سے ملتے جلتے سیارے ملنے کی امید ہو گئی ہے۔ فی الحال اس سورج کے گرد چھ چار سائز کے سیارے نظر آ گئے ہیں جو اس نظام شمسی کے بیرونی سرکل میں ہیں۔ ہر نظام شمسی میں عام طور پر دو سرکل مانے جاتے ہیں۔ ایک اندرونی سرکل اور ایک بیرونی سرکل، ہمارے سورج کے اندرونی سرکل میں عطارد، زہرہ، زمین اور مریخ آتے ہیں اس کے بعد کے تمام سیارے بیرونی سرکل میں مانے جاتے ہیں۔

یہ سورج جو ابھی تلاش کیا گیا ہے وہ کیمیاوی طور پر ہمارے سورج سے بہت ملتا جلتا ہے اور سائنس دانوں کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ اس کے اندرونی سرکل میں بھی وہ سیارے گھوم رہے ہیں جن کو ابھی تک دیکھا تو نہیں گیا ہے مگر بیرونی سرکل کے سیاروں کی رفتار میں کبھی کبھی بے ترتیبی ہونے سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اندرونی سرکل کے سیارے ہی اس گڑبڑ کا باعث ہو سکتے ہیں۔

سیارہ پلاٹو جب تک دیکھا نہیں گیا تھا سائنس دانوں نے یورینس سیارے کے مدار میں اس کی رفتار کی گڑبڑ سے اندازہ لگا لیا تھا کہ نیپچون کے پاس ضرور کوئی اور سیارہ ہے۔ اور یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد سیارہ پلاٹو دریافت کر لیا گیا۔ ستاروں پر انسانوں سے مماثل پائی جانے والی مخلوق کے بارے میں ہندوستانی ماہر فلکیات جینت نارلیکر بہت آگے ہیں۔ ان کا یقین ہے دوسرے سیاروں میں انسانوں سے مماثل ذی روح یقیناً بستے ہیں بس ان کا انکشاف نہیں ہو سکا ہے۔

یہ سیارے دریافت ہونے کے باوجود ان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔ اگر ان سیاروں پر کوئی باشعور مخلوق بھی آباد ہے تو بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ نظام شمسی ہم سے ۴۵ نوری سالوں کے فاصلے پر ہے۔ یعنی [illegible] اگر کوئی مخلوق آباد بھی ہے اور وہ کوئی ریڈیو سگنل بھی ہمیں بھیجے تو وہ بھی ۴۵ سالوں میں ہم تک [illegible] اس لئے یہ بہت اہم دریافت ہونے کے باوجود ابھی ہمارے لئے [illegible] انقلاب اس دن آئے گا جب ہمارا ریڈیو رابطہ کسی باشعور مخلوق سے [illegible] اسٹیلر شپ کسی اجنبی مخلوق کو لئے ہمارے خلائی [illegible] ایسا ہوگا ضرور لیکن کب ہوگا اس کے بارے میں کوئی [illegible] روشنی کی رفتار سے چلنے والے خلائی جہاز [illegible] کائنات میں [illegible] کہ ہم [illegible]

محبوب الرحمٰن فاروقی

کیا انسان کی کلوننگ ممکن ہے



انسانی کلوننگ آج کل دنیا بھر کے اخبار میں بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر خود کلوننگ اور جینٹک کے ماہر سائنس دانوں میں زبردست اختلافات بھی ابھر کر سامنے آرہے ہیں۔ کچھ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ابھی ہمیں ایسی جامع اور مکمل تکنیک نہیں حاصل ہوئی ہے جس سے ہم یہ کہہ سکیں کہ انسانوں کا کلون تیار کیا جاسکے گا یا جسم کے کسی بھی اعضا کا کلون ممکن ہوگا جب کہ یوروپ، آسٹریلیا اور چین اور خود امریکہ کے ایک سائنس داں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ چھ مہینے کے اندر مکمل انسان کا کلون تیار کرلیں گے۔ دوسرے سائنس دانوں نے اس سلسلے میں یہ بھی کہا ہے کہ انہیں انسانی جسم کے بعض اعضا کی کلوننگ میں مکمل کامیابی حاصل ہوچکی ہے اور یوروپ کے کئی دوا ساز اور کلوننگ لیبارٹریز میں تجربہ کررہے سائنس دانوں نے تو ساری دنیا میں ویب سائٹ پر اپنا یہ اشتہار بھی دیا ہے کہ جو بھی ابدالآباد تک زندہ اور توانا ہونے کے خواہش مند ہوں وہ مطلوبہ کوائف فوری طور پر اس کمپنی کو بھیج دیں۔ جانچ پڑتال کے بعد جو لوگ ان شرائط کو پوری کرلیں گے ان کی کلوننگ ان کے جسم سے خلیے حاصل کرکے کردی جائے گی۔ کلون کیا ہوا ان کا ہمزاد انسان ہو بہو انہیں جیسا ہوگا ... وہی شکل، وہی خیالات ویسے ہی احساسات اور ... اصل اور نقل میں فرق کرنا بھی ...

یہ الگ بات ہے کہ حال ہی میں امریکہ کے ایوان نمائندگان (House of Representatives) نے اس سلسلے میں ایک بل پیش کرکے پورے امریکہ میں انسانی کلوننگ کو ممنوع قرار دیا ہے اور ہر اس سائنس داں پر جو مکمل انسان کی یا اس کے جسم کے کسی اعضا کی کلوننگ کرے گا اسے بھاری جرمانے کے ساتھ دس سال کی قید بامشقت کی سزا بھی دی جائے گی۔ ایوان نمائندگان نے یہ قانون اخلاقی اور مذہبی جواز کے تحت بھاری اکثریت سے پاس کیا ہے لیکن ابھی اس سلسلے میں قانون نہیں نافذ ہوسکا ہے کیونکہ ابھی یہ بل کانگریس میں بحث کے لئے پیش نہیں کیا جاسکا ہے۔ جب تک کہ اس پر امریکی صدر دستخط نہ کردے وہ قانون کا درجہ نہیں لے سکتا۔ ایسی بھی خبریں آئی ہیں کہ خود صدر بش اس بل کے حق میں نہیں ہیں کیونکہ ایسا کرنے سے امریکہ میں تحقیق کی ساری راہیں مسدود ہوجائیں گی جب کہ طبی نقطہ نگاہ سے بعض اعضا کی کلوننگ اب از حد ضروری سمجھی جارہی ہے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسانوں کے اسٹم سیل (Stem Cell) پر تحقیق کے راستے ہمیشہ کھلے رہیں۔ کیونکہ اسی سے حاصل جینٹک کوڈ کو لے کر ہی ان کے ان اعضا کا متبادل تیار کیا جاسکتا ہے جنہیں تبدیل کرنا ہے۔ اس سلسلے میں بعض اخبارات نے تو اس قسم کی بھی خبریں شائع کی ہیں کہ دنیا کے بعض ممالک میں بہت راز دارانہ اور خفیہ طریقے سے انسان کا کلون تیار کرلیا گیا ہے لیکن اسے ابھی پوشیدہ رکھا گیا ہے۔

جاتے ہیں کیونکہ انہیں کی بدولت سب سے پہلے اس دنیا میں انسانی زندگی کی شروعات ہوئی تھی۔ وہ اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ جسم کے کسی بھی حصے کا خلیہ بن سکتے ہیں۔ سائنس دانوں کو یہ امید ہے کہ جلد ہی انہیں یہ تکنیک حاصل ہو جائے گی کہ اس سے وہ اعضا کو بدلنے سے لے کر دماغ کے نئے خلیے تک تیار کرسکیں گے، جن سے پارکنسن میں مبتلا لوگوں کا علاج ممکن ہو سکے گا یا ذیابیطس کے مریضوں کے لئے نئے طرح کے Pancreas تیار کئے جاسکیں گے۔

جن دواساز کمپنیوں نے انسانوں کی بہت جلد کلون تیار کئے جانے کی امید جتائی ہے ان میں سب سے بڑی کمپنی کلونوڈس (Clonodes) ہے۔ کلونوڈس کا کہنا ہے کہ وہ انسانی کلون دو مرحلوں میں تیار کرے گا۔ پہلے مرحلے میں وہ ہو بہو زندہ نقل یا کلون تیار کرے گا، دوسرے مرحلے میں کلون میں آپ کی ساری یادداشت کو منتقل کرنے کی تکنیک ترقی دی جائے گی۔ یہی نہیں بلکہ آپ کی موجودہ پوری ذہنی اور دماغی کیفیت کو بھی منتقل کرنا ممکن ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کو لافانی بننے کے لئے اور کیا چاہئے؟ آپ جیسے آج ہیں ویسے ہی بن جائیں گے۔ بلکہ آپ جتنے چاہیں گے اتنے بن جائیں گے۔ آپ کے اندر وہی صلاحیت پوشیدہ ہوگی اور آپ ترقی کی ساری منازل اس طرح طے کریں گے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کمپنی کو قائم کرنے والے خود ایک مذہبی فرقے کے لوگ ہیں جن کا نام ریلینس (Raelians) ہے۔ اس فرقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ زمین پر انسانی زندگی کی ابتدا کلوننگ کے ذریعہ ہی ہوئی تھی۔ جو کسی اور سیارے سے سائنس دانوں نے زمین پر تیار کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ کلون کئے گئے انسان کا ذکر قدیم اصل عبرانی بائبل میں ہے لیکن بعد میں مترجموں نے اسے خدا کا نام دے دیا۔ اس فرقے کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر برجیٹی بوائسلیر (Brigitte Boisselir) کا کہنا ہے کہ کلوننگ کی ٹکنالوجی آج کے انسان کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے جس شخص نے سب سے پہلے سرمایہ فراہم کیا اس کا دس ماہ کا بچہ مر گیا تھا۔ باپ بچے کو از حد پیار کرتا تھا اور وہ اس نقصان کو برداشت نہیں کر سکا۔ اس سائنس داں نے مخالفین سے پوچھا ہے کہ کیا دنیا میں کوئی بھی سائنس داں خود بچے کو واپس کر سکتا ہے۔ بچہ واپس ہونے کا کام صرف کلوننگ کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے لوگ اپنے بچوں کے خلیے محفوظ کرانا چاہتے ہیں تاکہ اگر ضرورت ہو تو بچے کا کلون تیار کیا جاسکے۔ جو مادہ تولید سے محروم ہیں وہ بھی اس تکنیک کی ترقی میں دلچسپی دکھارہے ہیں۔

جب کہ دوسری طرف جانوروں کی کلوننگ پر تجربہ کررہے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ چونکہ ابھی جانوروں کی کلوننگ کے سلسلے میں مکمل کامیابی حاصل نہیں کی جاسکی ہے اس لیے انسان کی کلوننگ ممکن ہی نہیں۔ امریکہ کے میسوچسٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے ماہر کلوننگ روگولف جنش کا کہنا ہے کہ ابھی تک جانوروں کے سلسلے میں کلوننگ کے جو تجربے کیے گئے ہیں ان میں سے پانچ فی صد سے کم معاملوں میں ہی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور جو کلون جانور زندہ ہیں ان میں بھی بہت سی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔ دوسری طرف 'ڈالی' جو اپنی عمر کے پانچ سال پورے کررہی ہے اس میں بھی اب شکست وریخت کے آثار پائے جارہے ہیں۔ 'ڈالی' کے خالق آئن ولمسٹ کا بھی کہنا ہے کہ موجودہ صورت حال میں جب ہم کوئی مکمل ٹکنالوجی جو ہر نقص سے پاک ہو ابھی تک ترقی نہیں دے سکے ہیں، ایسے میں انسانوں کی کلوننگ کے سلسلے میں تجربوں کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔ مشہور میگزین سائنس میں لکھتے ہوئے ولمسٹ نے کہا:

"ایسا کوئی جواز اس یقین کے لئے نہیں پایا جاسکتا کہ انسان کی کلوننگ جانوروں سے مختلف ہوگی۔"

جب کہ بایو کیمسٹری کے ماہر آرٹ کیپلن نے ایک قدم آگے جاتے ہوئے کہا "زیادہ سے زیادہ آپ ایک موٹا/فربہ پاگل کینسر میں مبتلا انسان کی کلوننگ کر سکتے ہیں۔" یہی نہیں اس سلسلہ میں آگے کئے گئے تجربات سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جن ماؤں سے خلیے نکال کر جانوروں کی کلوننگ کی گئی ان میں بھی اب مختلف بیماریوں کے آثار پائے جارہے ہیں۔ ڈالی کے سلسلے میں کئے گئے تجربات میں ۲۷۷ تخلیق شدہ انڈے ۲۹ رحم میں داخل کئے گئے تھے جن میں سے ۱۳ کو فطری طور پر نشوونما پاتے ہوئے پایا گیا تھا ان میں سے صرف ایک ڈالی ہی ایسی تھی جو ابھی تک زندہ ہے۔ اس طرح کامیابی کی شرح ایک فیصد سے بھی کم رہی۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ چونکہ ایک نارمل عورت دواؤں کے بعد دس سے پندرہ انڈے دے سکتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ۴۰۰ ایسے انڈے نکال کر ۵۰ ماؤں کے رحم میں داخل کیا جائے اس کے بعد ہی کوئی ایک نقص سے آلودہ بچہ پیدا ہو سکتا ہے۔ بہرحال امریکہ اور یوروپ کے سائنس داں انسانی کلوننگ کی حمایت اور مخالفت میں جو بھی دلیلیں پیش کرتے ہوں، آسٹریلیا

کی ایک سائنس داں ایل کیمان نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ چوہوں کے بیچ کے خلیوں سے چوہے کے بچے پیدا کر سکتی ہیں۔ اس کام میں مادہ تولید کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹیکن کی ایک سائنس داں نے اخباری نمائندوں کے سامنے خود اپنا کلون کیا ہوا بتا دکھایا۔ اس کی قیمت بھی ابھی بہت زیادہ ہے۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ جسم کے کسی بھی حصے کی کامیاب کلوننگ کر سکتی ہیں لیکن اس کی قیمت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔

امریکہ میں چاہے Stem Cells پر ریسرچ کرنے کے سلسلے میں پابندی لگ جائے لیکن یوروپ اور دنیا کے دیگر ممالک کے سائنس داں جہاں اس طرح کی کوئی پابندی عائد نہیں ہے وہ کلوننگ کے سلسلے میں کیے گئے تجربات کے بارے میں اپنے دعوے لگاتار پیش کر رہے ہیں۔ دنیا کے لوگ چاہے کچھ بھی کہیں، کتنی بھی مخالفت کریں لیکن منافع کی عادی کمپنیاں اس قسم کی پیش رفت کے سلسلے میں لگاتار تجربے کرتی جارہی ہیں۔

آج (۲۸؍اگست ۲۰۰۱ء) کے انگریزی اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ہندوستان کی دو ریسرچ لیبارٹری دنیا کی ان دس اہم Labe میں شمار کی گئی ہیں جنہیں امریکی حکومت کی طرف سے Stem Cell پر ریسرچ کرنے کے لئے فنڈ فراہم کیے جائیں گے۔ ان میں سے ایک مشہور صنعتی گھرانہ ریلائنس گروپ کا ریلائنس لائف سائنسز اور دوسرا بنگلور کا نیشنل سینٹر فار بایولوجیکل سائنسز ایسے دو ادارے ہیں جو غیر تیار شدہ رحم یا پانچ سے دس دن تک کے رحم سے نکالے گئے Stem Cells پر مکمل طور پر ریسرچ کریں گے۔ کہا جاتا ہے کہ ان دو اداروں کے پاس ایسے دس اسٹیم سیل پہلے سے ہی موجود ہیں۔ اسٹم سیل سے ہی وہ بنیادی خلیہ حاصل ہوتا ہے جن سے کسی بھی طرح کے یا جسم کے خلیے بآسانی تیار کیے جاسکتے ہیں۔ ان خلیوں سے حاصل نتائج کا استعمال دماغی بیماریوں، خصوصاً الزائمر، پارکنسن، دل کی بیماریوں اور ذیابطیس کے سلسلے میں کیا جاسکے گا۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح جینٹک کوڈ کی دریافت کے سلسلے میں مذہب پرست لوگوں نے اسے کتاب زیست کا نام دیا تھا اسی طرح انسانی کلوننگ کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ آخر حضرت حوا بھی تو آدم کی پسلی سے بنائی گئی تھیں، یہ کلوننگ کی پہلی مثال ہے۔

☆☆

وفیات

اردو اور پنجابی کے مشہور و معروف افسانہ نگار اور دانشور **لوچن بخشی** کا ۲۳؍اگست کو نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۸۷ برس کے تھے۔ جناب بخشی ۱۹۸۱ء میں اسٹیشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ جناب بخشی نے کئی کتابیں لکھیں، جن میں سمک پوئنٹس آف پنجاب، سینٹ پوئنٹس آف گرو گرنتھ صاحب، ڈسٹ آف تھائی فیف کے علاوہ اردو کی متعدد کہانیاں شامل ہیں۔ انہوں نے ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ اور پبلی کیشنز ڈویژن کے لئے کئی ترجمے بھی کیے۔ انہیں متعدد انعامات سے نوازا جاچکا ہے۔ 'آجکل' نے ان کی کہانی 'ٹوٹے پتے' اکتوبر کے شمارے میں شائع کی ہے، جو ان کی آخری کہانی ہے۔

اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار **انور خاں** کا طویل علالت کے بعد ممبئی میں ۴؍ستمبر کو انتقال ہوگیا۔ انور خاں یکم مارچ ۱۹۴۲ء کو ممبئی میں پیدا ہوئے لیکن ان کے آباواجداد کا تعلق حیدر آباد سے تھا۔ انہوں نے انگریزی ادب، تاریخ اور فلسفے میں گریجویشن کے بعد اردو اور فارسی میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے بمبئی پورٹ ٹرسٹ میں ملازمت کرلی۔ انور خاں کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں "راستے اور کھڑکیاں، فنکاری اور یاد بسیرے" افسانوی مجموعے ہیں جب کہ "پھول جیسے لوگ" ان کا ناول ہے۔ اترپردیش اردو اکادمی اور مہاراشٹر اردو اکادمی نے ادبی خدمات کے لئے انہیں انعامات سے نوازا۔ انہوں نے 'بچوں کی کہانیاں' بھی لکھیں اور "چینی کہانیاں اور عرب دیسوں کی کہانیاں" کے نام سے بچوں کے لئے ترجمے بھی کیے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔

اردو، فارسی اور انگریزی کی ممتاز شاعرہ اور ادیبہ ڈاکٹر **بانو طاہرہ سعید** کا مختصر علالت کے بعد ۱۷؍اگست ۲۰۰۱ء کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۸۰ برس سے زائد تھی۔ ان کا کلام ملک و بیرون ملک کے ادبی رسائل میں اکثر و بیشتر شائع ہوتا رہا ہے۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی سولہ کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ "دامن گلزار (مجموعہ کلام) آخری کتاب تھی۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کی کتابوں پر آندھرا پردیش، بہار، مغربی بنگال اور اترپردیش اردو اکادمی نے انعامات دیئے۔ بین الاقوامی اعزازات ایران، کیمبرج، اٹلی اور عالمی ادبی ایوارڈ (امریکہ) سے نوازا گیا۔

مشہور ماہر فلکیات **فریڈ ہوائل** (Fred Hoyle) کا ۲۰؍اگست کو انگلینڈ میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۸۶ سال کے تھے۔ ہوائل ان کائناتی سائنس دانوں کے سخت مخالف تھے جو کائنات کی ابتدا اچانک بھاری دھماکے کے ساتھ مانتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۴۸ء میں کائنات کی ابتدا کے سلسلے میں ایک نیا نظریہ پیش کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ سے ایک جیسی حالت میں رہی ہے۔ انہوں نے اپنے نظریے کو Big Bang کا نام دیا تھا۔ اس کے بعد سے اس لفظ کا استعمال ساری دنیا کے لوگ کرنے لگے۔ گزشتہ سال انہوں نے مشہور ہندوستانی ماہر فلکیات جینت نارلیکر کے ساتھ مل کر ایک کتاب A Different Approach to Cosmology لکھی۔

مشہور ماہر امراض قلب ڈاکٹر **کرسٹین برنارڈ** کا ۲؍ستمبر کو کیپ ٹاؤن میں انتقال ہوگیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۸ سال کی تھی۔ ڈاکٹر کرسٹین برنارڈ دنیا کے ایسے پہلے سرجن تھے جنہوں نے سب سے پہلے ہارٹ ٹرانس پلانٹ کا کامیاب تجربہ کیا تھا اور اب تک نہ جانے کتنے مریضوں کو ان کے دل بدل کر یا آپریشن کر کے صحت یاب کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر برنارڈ نے تمام عمر سرکاری اسپتال میں غریبوں کا مفت علاج کرنے میں گزار دی۔ انہوں نے کسی بھی آپریشن کے لئے کبھی کوئی فیس نہیں لی۔ سفید فام ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی نسلی امتیاز بھی نہیں برتا۔ ان کے مریض اور ان کے شاگردوں میں آج بھی زیادہ تعداد سیاہ فاموں کی ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ مداوائے دل رنجور کرنے والے کا کام بھی آخر بیماری دل سے ہی تمام ہوا۔ یعنی وہ جو علاج دل بیمار کیا کرتے تھے خود دل کے دورے سے جاں بر نہیں ہو سکے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ڈاکٹر برنارڈ نرے ڈاکٹر ہی نہیں تھے انہوں نے اپنی حیات میں پندرہ کتابیں بھی لکھیں۔ ان کی دو کتابوں پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ ان کا ناول The Unknown ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوا۔

(ادارہ)

ادارہ

گیان پیٹھ انعام یافتہ

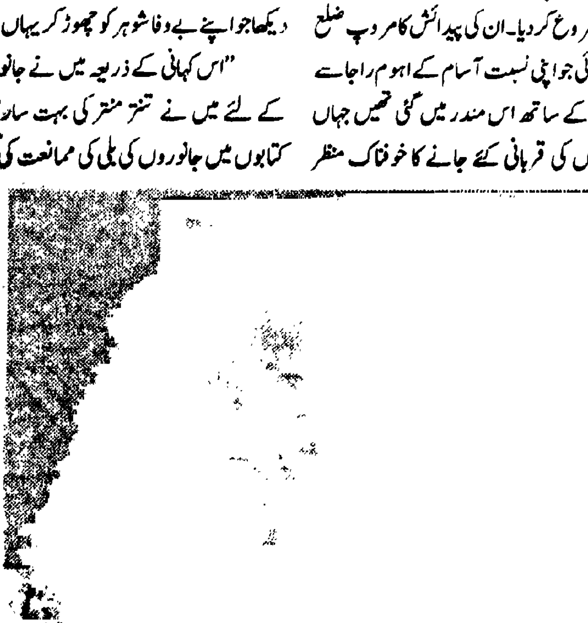
اندرا گوسوامی

امسال کا گیان پیٹھ انعام اسمیا کی مشہور ناول نگار ڈاکٹر اندرا گوسوامی کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گوسوامی کو آسام میں زیادہ تر لوگ ماموني رہسم کے نام سے جانتے ہیں۔ اس وقت وہ دلی یونیورسٹی میں شعبہ انڈین لینگویجز کی صدر ہیں۔ ڈاکٹر گوسوامی کو شہرت اس وقت ملی جب انہوں نے اپنے مشہور ناول چھنامااسٹر منوتھو (Chhinamastar Manutho) میں اوپری آسام کے مشہور کاماکھیا مندر میں مروجہ جانوروں کی قربانی کے خلاف آواز اٹھائی اور اسی وقت سے اس مندر کے پروہتوں سے ان کا جھگڑا شروع ہو گیا۔ مندر کے پروہتوں نے ان کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور ان کو ہر طرح سے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ان کی پیدائش کامروپ ضلع کے ایک انتہائی متمول ادھیکار خاندان میں ہوئی جو اپنی نسبت آسام کے اہوم راجاسے جوڑتے ہیں۔ بچپن میں ایک بار وہ اپنے والد کے ساتھ اس مندر میں گئی تھیں جہاں انہوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے جانوروں کی قربانی کئے جانے کا خوفناک منظر دیکھا۔ وہ لکھتی ہیں:

"بڑے تنومند قسم کے بیل مندر میں لائے جاتے اور لوگوں کی نگاہوں کے سامنے انہیں بے دردی سے ذبح کر دیا جاتا اور پورے مندر میں ان کا خون پھیل جاتا۔"

اس کا ان کے دل پر بہت گہرا اثر پڑا۔ انہوں نے اپنا یہ مشہور ناول کاماکھیا مندر کے پس منظر میں اسی بے رحمانہ رواج کے خلاف لکھا۔ یہ ناول ایک سچے واقعے پر مبنی ہے اس کا ترجمہ جلد ہی انگریزی اور ہندی میں شائع ہو گا۔ انہیں یاد ہے کہ "میرے والد نے مجھے ایک ایسی ہی کہانی سنائی تھی جب میں بچی تھی۔ یہ ایسی کہانی تھی جو نسل در نسل ہر شخص کو سنائی جاتی ہے اور اس میں ایسے خوفناک عناصر شامل کئے گئے ہیں کہ ہر شخص کے دل میں دیوی کی دہشت بیٹھ جائے۔" کہانی ۱۹۲۰۔۳۰ء کے پس منظر کی بتائی جاتی ہے جس میں ایک نوجوان تانترک بنارس سے اپنی زندگی سے تنگ چنامستا میں آکر بستا ہے، جس کے آس پاس کاماکھیا کے بہت سے چھوٹے مندر پائے جاتے ہیں۔ یہ تانترک جو جانوروں سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے اکثر اس مندر میں بیٹھ کر دھیان میں مگن رہتا ہے اور اس کے سر کے بالوں میں بہت سے سانپ الجھے رہتے۔ اسی دھیان کے دوران اس نے تصور میں ایک انگریز عورت کو دیکھا جو اپنے بے وفا شوہر کو چھوڑ کر یہاں مندر میں آکر رہنے لگی تھی:

"اس کہانی کے ذریعہ میں نے جانوروں کی بلی کے خلاف ایک مہم چھیڑی۔ اس کے لئے میں نے تنتر منتر کی بہت ساری کتابیں دھیان سے پڑھیں۔ تنتر منتر کی کتابوں میں جانوروں کی بلی کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس میں ایسے حوالے ملتے ہیں جس میں دیوی اپنے پجاریوں سے کہتی ہے کہ وہ اس کی پوجا کے لئے پھولوں کا استعمال کرسکتے ہیں بجائے انسانوں یا جانوروں کے خون کے۔"



اس ناول اور اسمیا کے ایک اخبار سادن میں جانوروں کی بلی کے خلاف چلائی جارہی مہم سے مشتعل ہو کر پجاریوں نے گوسوامی کے خلاف زبردست مہم چلائی جس میں انہیں جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی۔ انہیں تنگ کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ نکالا گیا کہ جب مندر میں جانوروں کی بلی چڑھائی جاتی تو انہیں مندر میں آکر یہ نظارہ دیکھنے کی دعوت دی جاتی۔ ڈیڑھ سال کے عرصے یعنی جب تک یہ ناول مکمل نہیں

کرنا پڑا بھی ہر طرح سے دیکھا جاتا رہا۔ لیکن چونکہ اب ناول اشاعت کے مرحلے میں ہے اس لئے انہوں نے لکھنا بند کر دیا ہے۔

وہ ہر ناول ہر ناول لکھنے سے پہلے تقریباً سال ڈیڑھ سال تک موضوع سے متعلق کتابیں پڑھنے اور اس جگہ جا کر رہنے اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے میں وقت لگاتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "میں بچپن سے ہی شرارتی عناصر سے بخوبی جوجھتی رہی ہوں۔" ایک بار بچپن میں جب ان کے والد نے ایک نجومی سے ان کا حال دریافت کیا تو اس نے ان کے بارے میں پیشین گوئی کی کہ اس کے ستارے بہت خطرناک ہیں اور آگے جا کر اسے ٹکڑوں میں کاٹ کر برہم پتر میں پھینک دیا جائے گا۔ وہ اس پیشین گوئی کو ہنستے ہوئے سناتی ہیں۔ گرچہ ان کے والدین نے اس پیشین گوئی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا لیکن بعد میں انہیں ان کے خاندانی پروہت نے سب کچھ بتا دیا۔

بچپن سے ہی انہوں نے خود پر بھروسہ کرنا سیکھا اس لئے انہیں اب کوئی بات پریشان نہیں کرتی۔ وہ خود کو تانیثیت پسند مصنفہ نہیں مانتیں لیکن انہیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ انسانیت پسند مصنفہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ملک کے اور صوبوں کے مقابلے میں آسام کا قاری بہت وسیع النظر ہے اور اس لئے انہوں نے زیادہ تر ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو ہر وقت لوگوں کی زندگیوں کو متاثر کرتے ہیں۔

اپنے مشہور ناول "نیل کنٹھی براجا" (Nilkanthi Braja) اور اپنی سوانح حیات "آدھا لیکھا دستاویز" (Adhalekha Dastabej) میں انہوں نے بیواؤں کے مسئلے پر کھل کر لکھا ہے۔ نوجوانی میں ہی وہ خود بھی بیوہ ہو گئی تھیں اور پھر انہیں آسام حکومت کے وظیفے پر برنداابن میں جا کر رہنے اور مطالعہ کرنے کا موقع ملا جہاں انہوں نے بیواؤں کی قابل رحم حالت کا بغور مشاہدہ کیا۔ ان کی چچی بھی گیارہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں اور تمام عمر انہوں نے اپنے اس مرحوم شوہر جسے کبھی نہیں دیکھا تھا کی چپلوں کی پوجا کرنے میں گزار دی۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان بیواؤں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی اپنی زندگی نہیں ہے بلکہ انہیں سب سے بڑی فکر یہ ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد ان کی چتا کو آگ کون لگائے گا۔

ان کے ناولوں کے کینوس صرف اسی موضوع تک محدود نہیں بلکہ ان کے ناول "اہی رون" (Ahiron) میں انہوں نے مزدوری کر رہے لوگوں خصوصاً عورتوں کی مصیبت زدہ زندگی کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ ابھی ان کی شادی ہی ہوئی تھی کہ ان کے انجینئر شوہر کی تعیناتی کشمیر میں ہو گئی۔ جہاں ایک حادثہ میں وہ ختم ہو گئے۔ انہیں سرکار نے صرف دس ہزار روپے کا معاوضہ دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ ان غریب مزدوروں کی حالت کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں جنہیں اس طرح کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا اور جن کے خاندان کا اکیلا روٹی کمانے والا ختم ہو جاتا ہے۔

اس طرح کے موضوعات پر قلم اٹھانے سے آسام میں ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے اصل قاری تو گاؤں میں بستے ہیں۔ ان کے ناولوں اور سوانح کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

☆☆☆

Dennis Evans

ترجمہ: روحی مجید

First, The Silence

پہلے خاموشی

First, the silence....

Then the dance.

Walking, running,

sitting, skipping;

all can join the dance.

And from confusion

comes the dance.

Threads,fragments

linking lives, selves.

Each is in the dance.

Now the music......

and the dance.

Building, breaking,

giving, taking.

All are in the dance.

First the silence....

Then the dance.

اک سکوت کا عالم

لمحہ خاموش

پھر......

رقص کا آغاز

رقص اندام

سست رفتار، تیز قدم

جستہ جولاں، نشستہ دم

نشست و برخواست

ہم سبھی، رقص میں شامل

یہ انتشار، ہنگامہ

رقص کا جنم ہے یہیں

جس کی ڈوری نے باندھ دیا

رشتہ، حیات، استوار کیا

ہر کوئی رقص میں شامل

بزم موسیقی

رقص، اک تال

توڑتے جوڑتے

کچھ دیا کچھ لیا

جھکتے بڑھتے قدم

ہم سبھی رقص میں شامل

پہلے خامشی

پھر رقص کا آغاز

58-Helen Close, East Finchley
London N2 OUU, UK.

7,Woodville Road Golders
Green, London, NW-11 9UH.UK

منظور ہاشمی

اذا زلزلت الارض زلزالها

بس ایک آن میں منظر کی آنکھ بند ہوئی
تمام رنگ، مہکتی ہوئی فضاؤں کے
تمام گیت، بہکتی ہوئی ہواؤں کے
تمام نور کے چشمے، تمام دل کے دیار
تمام خواب، تمناؤں کے گل و گلزار
تمام حرف و بیاں شوق کی نگاہوں کے
تمام لفظ بلکتی ہوئی دعاؤں کے
اتھاہ، گہرے اندھیرے کی سرد کھائی میں
بس ایک آخری ہچکی کے بعد
ڈوب گئے!!!
اور اس کے بعد
فضا نے غبار اوڑھ لیا
سحر کی ٹھنڈی ہوا اپنے بال بکھرا کر
نہ جانے کس کے لئے بین کر کے روتی رہی
سیاہ سوگ کی گہرائی میں ڈبوتی رہی
حقیقتوں کی نہ پوچھیں کہ خواب بھی نہ رہے!!
نہ جانے کون سا غم تھا
کہ جس کے بوجھ تلے
بلند و بالا مکانوں نے خودکشی کر لی
جنوں میں صحرا نے
کھیتوں نے، سبزہ زاروں نے
خود اپنے جیب و گریبان چاک کر ڈالے
زمین بھوک میں
اپنے بدن کو کھانے لگی
یہ لگ رہا تھا
کہ جیسے قیامت آنے لگی!!
مگر کسی کو، کرشمے دکھانے آتے ہیں
کرامتوں کے بھی اچھے زمانے آتے ہیں
کہ یہ بھی تھا
کہ اندھیرے کی سرد کھائی میں
کہ خوف اور اذیت کی بے پناہی میں
جو انتظار کی، امید کی ڈھلان پہ تھے
مگر یقین کا اپنے دیا جلائے ہوئے تھے
اور اپنے پالنے والے سے
لو لگائے ہوئے تھے
تو ان کو نیک فرشتے بچانے آئے ہوئے تھے
کہ روشنی کی بہر حال جیت ہوتی ہے!!

۱۷۔ بدر باغ، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

نسیم عزیزی

Cyber Era

فون، انٹرنیٹ، کمپیوٹر پہ بچے
اس قدر مصروف ہیں
ان کو بھلا اس سے غرض کیا
میز پر کاغذ، قلم، پنسل پڑے ہیں یا نہیں
اک بھی کتاب اب شیلف پر
موجود ہے بھی یا نہیں
ان کا وجود اب ہے عبث
اس زندگی کی دوڑ میں
یہ ساتھ بھی دیتے نہیں
اب انگلیوں کی نوک پر ہیں
علم کے اکثر خزانے
ساعتوں کی مٹھیوں میں بند ہیں
اک اک صدی کی داستانیں
ایک اک لمحے کے لب پر ہیں رواں
امروز فردا کے فسانے

۳۱۲۔ بیلیلیس روڈ۔ ہوڑہ۔ ۷۱۱۱۰۱

غزلیں

کاوش بدری

(۱)

لفظ کی بہتات اتنی فکر وفن میں آگئی
مسخ ہوکر صورتِ معنی سخن میں آگئی

اب نہ وہ احباب زندہ ہیں نہ رسم الخط وہاں
روٹھ کر اردو تو دہلی سے دکن میں آگئی

نصف آنکھیں کھول کر ہی اس نے دیکھا تھا مجھے
چلنے پھرنے کی سکت مفلوج تن میں آگئی

کثرتِ اموات سے ہے نالہ کش شہرِ بتاں
عید کی رونق مکانِ گورکن میں آگئی

ایک بوسہ ہونٹ پر پھیلا، تبسم بن گیا
جو حرارت تھی مری اس کے بدن میں آگئی

کیوں سپیرا پن ترے نینوں میں پیدا ہوگیا
اس قدر شوخی کدھر سے بانکپن میں آگئی

اس کے چہرے کا مجھے مردانہ پن اچھا لگا
چاشنی نمکین سی سارے بدن میں آگئی

نورِ ماضی شمعِ مستقبل فضائے روز وشب
روشنی کیا کیا غزل کی انجمن میں آگئی

(۲)

غزل کی شمع کو دن میں جلا کے دیکھتے ہیں
ضرورتاً کبھی شب میں بجھا کے دیکھتے ہیں

بہ وقت ذکر فقط تم امام ضامن ہو
ہمیشہ عطر میں اس کو بسا کے دیکھتے ہیں

کبھی کبھی تو بہت کفر بکنے لگتے ہو
چلو خدا سے تمہیں بھی ملا کے دیکھتے ہیں

جوان دور تھا سب کچھ لٹادیا ہم نے
جہاں بھی جاتے ہیں سب مسکرا کے دیکھتے ہیں

نئے امیر ہیں وہ اور نئے فقیر ہیں ہم
وہ گڑگڑا کے تو ہم لڑکھڑا کے دیکھتے ہیں

ہمارا سازِ سخن بھی ہے فاریابی سا
ہنسا کے دیکھتے ہیں پھر رلا کے دیکھتے ہیں

شراب پی کے تو دیکھا ہے بارہا تم کو
لوندا آنکھوں کے باطن میں جا کے دیکھتے ہیں

مجاوری کے تو قابل نہیں ہیں کاوش ہم
مزارِ غالب، فن کو منا کے دیکھتے ہیں

۱۴۔اسمال ماسک اسٹریٹ، آمبور۔ ۶۳۵۸۰۲ (اترانچل)

مصور سبزواری

یہ لگتا ہے ابھی اترے ہوئے نشے نہیں اترے
بلندی سے ہمارے خواب بھی نیچے نہیں اترے

ہماری مٹھیوں سے وقت کا دریا بہا سارا
ترے معیار پر ہم لمحہ بھرپورے نہیں اترے

یہ کیسے دھند میں لپٹے ہوئے منظر بلاتے ہیں
ذرا بھی دھیان کی دیوار سے جالے نہیں اترے

فلک سے میرے حصے کا من وسلویٰ تو اترا تھا
شکم میں ایک دن بھی مطمئن لقمے نہیں اترے

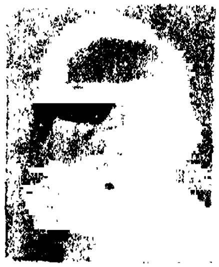
تغیر تو ہوا نقل مکانی سے بہت لیکن
نئے گھر سے پرانے گھر کے کچھ سائے نہیں اترے

پرایا کیا ہم اپنا دکھ بتانے سے بھی قاصر ہیں
یہ اچھا ہی ہوا اس گھر میں ہمسائے نہیں اترے

چودھری سرائے، سنبھل (مرادآباد) یوپی

غزلیں

کرشن کمار طور



تکتا ہوں جس کو لطف گراں بار سے الگ
صورت ہے ایک وہ بھی تو انکار سے الگ

کچھ ایسے اس نے کردیا مجھ کو مجھی سے دور
دیوار جیسے ہوتی ہے دیوار سے الگ

جو مٹ چکے ہیں کیسے بتائیں بھلا، کہ ہے
یہ گردش جہاں تری رفتار سے الگ

دونوں طرف سے ایک ہی جذبہ ہے آشکار
ہم سے ہے یار، ہم ہیں اگر یار سے الگ

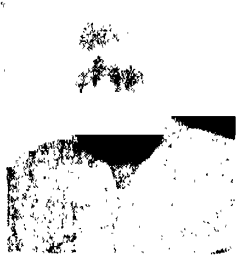
پورا نہیں اترتا جو میں اس کے قول پر
یہ دہر بھی تو ہے مرے معیار سے الگ

روشن اس اک خیال سے ہے دل کی واردات
ہے میری خامشی مرے اظہار سے الگ

اس کارزار زیست میں میری انا نے طور
رکھا ہے خود کو رونق بازار سے الگ

ای۔۱۳۴۔خانیارہ روڈ، دھرم شالہ۔۱۷۶۲۱۵

انجم عرفانی



سنتِ گوشہ نشینی رہی جاری ہم سے
ربط کیا رکھتے یہ شہرت کے بھکاری ہم سے

کب سے مشتاق ہیں سننے کے لئے ہم سایے
اور ہوتی ہی نہیں گریہ وزاری ہم سے

کفش برداریٔ ارباب دوَل کیا کرتے
اٹھنے والا تھا کہاں بوجھ یہ بھاری ہم سے

پھر نہ دیکھے ہیں پلٹ کر کبھی پچھلے اوراق
ہونے والی بھی نہ تھی زخم شماری ہم سے

گویا ہوجاتی ابھی لمسِ بدن سے مسموم
کیسا کترا کے گئی بادِ بہاری ہم سے

مانگتے ہیں تو ہم اوروں کے لئے مانگتے ہیں
نہ ہوئی اپنے لئے عرض گزاری ہم سے

قافلے والوں سے پہلے ہی اتر آئے کہ اور
ہوسکی دوشِ ہوا پر نہ سواری ہم سے

اٹھ گئے چھوڑ کے یاران خوش اوقات کو دنگ
پوری کھیلی نہ گئی اپنی ہی پاری ہم سے

بجھ گئے ٹوٹ کے آغاز شبِ غم انجم
ہجر کی کٹتی کہاں رات یہ بھاری ہم سے

۸۱۔بلوہا، بلرامپور۔۲۷۱۲۰۱

بیکل اتساہی



باغ میں یوں ہوا چلی اب کے
ہوش کے پنچھی اڑگئے سب کے

صلح کی بات دشمنوں سے کرو
دوست تو ہوگئے ہیں مطلب کے

پھول جب فکر کا شگفتہ ہوا
رہ گیا بس کتاب میں دب کے

جن کی ٹھوکر میں بادشاہی تھی
وہ یہاں سے چلے گئے کب کے

شہر میں سکھ ہے صرف اک دکھ ہے
مسئلے رہ گئے ہیں منصب کے

ساری دنیا تباہ ہے لیکن
ٹھاٹ اب بھی وہی ہیں صاحب کے

ان پہ کیا نشہ ہو سیاست کا
جام جو پی چکے ہیں مذہب کے

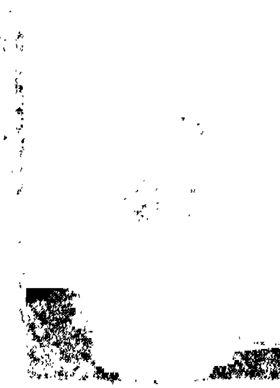
بونے ہوجاتے ہیں بلندی پر
جانے یہ لوگ بھی ہیں کس ڈھب کے

میں ہوں بیکل نہ پوچھو حال مرا
مجھ پہ لطف وکرم تو ہیں رب کے

سول لائن، بلرامپور۔۲۷۱۲۰۱

غزلیں

مہدی پرتاپگڈھی



اک شخص کہ مجھ میں ہے مگر مجھ سے جدا بھی
ہے مجھ سے کبھی خوش تو کسی وقت خفا بھی

بیٹا ابھی چلتا ہے پکڑ کر مری انگلی
بن جائے گا اک روز یہی مرا عصا بھی

ہم سائے کی دہشت ہے مرے گھر پہ مسلط
بے اس کی اجازت نہیں آئی ہے ہوا بھی

تاریکیٔ اوہام دلوں سے نہیں جاتی
پیغام نئی صبح کا سورج نے دیا بھی

یہ موسم گل اور لہو تھوکتے غنچے
آئی نہ پسند آپ کی سوغات ذرا بھی

وہ اس کے لئے کیسہ سود کھول ہی دیتے
بازار میں ملتی جو کہیں جنس وفا بھی

لفظوں سے معانی کا ہے ٹوٹا ہوا رشتہ
کام آتی نہیں حسن بصیرت کی عطا بھی

ہے میرا وجود ایک سلگتا ہوا صحرا
شاید ادھر آئے کبھی ساون کی گھٹا بھی

جب آئے برے دن تو جدا ہو گیا سایا
کام آئی نہ مہدیؔ کسی مخلص کی دعا بھی

۲۸۔ اسکول وارڈ، پرتاپ گڑھ۔۲۳۰۰۰۱

ارشد کمال

اپنا ٹھکانہ ہی ٹھہرا جب اک صحرا کے دامن میں
کیوں نہ سجالیں بزم جنوں ہم ذہن و دل کے آنگن میں

وقت کا دریا کاٹ رہا ہے ساحل ساحل بستی کو
پھر بھی کھیل گھروندوں کا ہے جاری آنگن آنگن میں

کھلتے تھے جن کے دروازے ایک ذرا سی دستک پر
شورِ قیامت سن کر بھی اب آتے نہیں وہ روزن میں

عکس تو الٹا روپ ہمیشہ ہوتا ہے سچائی کا
جھانک سکو تو جھانک لو خود میں، کیا رکھا ہے درپن میں!

خاموشی کے جنگل کاٹو شہر صدا کے دیوانو!
آوازوں کے پیڑ اگاؤ اپنے گونگے آنگن میں

ان کے لطف کے دریا میں کچھ ایسا عکس ابھرتا ہے
باسی ٹکڑا ڈال رہے ہوں جیسے بھیک کے برتن میں

لاکھ بچاؤ بچ نہ سکے گی ناؤ تمہاری حکمت کی
آگ کا دریا چڑھ جائے گا جب تیزابی ساون میں

ایچ ۷ سی۔ ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

ناظم بریلوی

اشک چشم بتِ بے جاں سے نکل سکتا ہے
آہِ پر سوز سے پتھر بھی پگھل سکتا ہے

اپنے انداز تکلم کو بدل دے ورنہ
میرا لہجہ بھی ترے ساتھ بدل سکتا ہے

لوگ کہتے تھے کہ پھلتا نہیں نفرت کا شجر
ہم کو لگتا ہے کہ اس دور میں پھل سکتا ہے

میرے سینے میں محبت کی تپش باقی ہے
میری سانسوں سے ترا حسن پگھل سکتا ہے

چاند کی چاہ میں اڑتے ہوئے پنچھی کی طرح
دل بھی ناداں ہے کسی شے پہ مچل سکتا ہے

جذبۂ عشق سے روشن ہے مرا دل ناظمؔ
یہ دیا تیز ہوا میں بھی جل سکتا ہے

۲۶۔ کھنواری لین، لکھنؤ۔۲۲۶۰۰۱

غزلیں

قمر گونڈوی

زندگی کی ہے ترے نام سے یاری میں نے
عمر اک جھوٹی تسلی پہ گزاری میں نے

نشۂ عشق کیا دل پہ یوں طاری میں نے
روبرو رکھی ہے تصویر تمہاری میں نے

مجھ سے کترا کے دبے پاؤں گزر جاتی ہے
تیری دیکھی ہے ادا بادِ بہاری میں نے

اپنی غربت کا سفر طے کیا میں نے تنہا
ماہ و انجم کی نہیں ڈھونڈھی سواری میں نے

کوئی غم ہو، کوئی موسم ہو، کوئی عالم ہو
رقصِ احساسِ جنوں رکھا ہے جاری میں نے

بندگی کا نہ ترے حق میں ادا کر پایا
سر جھکایا ہے بہت رحمت باری میں نے

عرق آلود قمر ہوگئی تاروں کی جبیں
چاندنی لاکے کہاں غم میں اتاری میں نے

کوچہ جگر، گونڈہ۔ یوپی

سید عابد نظر

شیرازۂ حیات جو زیر و زبر ہوا
صحرا نورد ہوگیا اور در بدر ہوا
محنت سے اپنی آج بفضل ہنر ہوا
اک شخص تھا غریب مگر اہل زر ہوا
تقدیر لے کے آیا تھا اپنی علیحدہ
قطرہ جو بطن سیپ میں پہنچا گہر ہوا
حیران تھے خلاؤں کو تسخیر کر کے لوگ
دارالاماں جو مرکز برق و شرر ہوا
جس نے صلیب وقت کو تسخیر کرلیا
میری نظر میں شخص وہی ذی ہنر ہوا
صحرا نما سراب کو دریا سمجھ لیا
یہ آپ کا جناب فریب نظر ہوا
اپنی شکستہ حالی کا کیونکر کروں بیاں
میرا وجود مثل شکستہ شجر ہوا
جو تھے رفیق خاص وہ چھٹتے گئے مگر
پاؤں کا آبلہ ہی رفیق سفر ہوا
جس نے فصیل غم پہ بھی روشن کئے چراغ
ہے یہ یقیں کہ شخص وہی معتبر ہوا
موسیٰ یہ چاہتے تھے کہ دیکھیں جمال کو
اس کا مشاہدہ تو انہیں طور پر ہوا
دست طلب میں تیشہ پرنور تھا نظر
اس واسطے دعاؤں میں میری اثر ہوا

۳/۴-پیاتالا، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ۔ ۳

راجندر بہادر موج

ستم یہ ہے کسی کی آنکھ تک پرنم نہیں ہوتی
یہ دنیا غم تو دیتی ہے شریک غم نہیں ہوتی

یہ ہے آئینہ خانہ حسرتوں کا آرزوؤں کا
کسی حالت میں دل کی اضطرابی کم نہیں ہوتی

مسافر ساتھ اس کے چل سکے یا تھک کے رک جائے
یہ رفتارِ زمانہ ہے کبھی مدھم نہیں ہوتی

طوافِ دیر و کعبہ سے نہیں ملتا ہے کچھ زاہد
تلاشِ حق میں سچی جستجو جس دم نہیں ہوتی

اثر اس پر نہیں ناکامیوں کے سرد جھونکوں کا
مری شمع حقیقت کی کبھی لو کم نہیں ہوتی

ترا ملنا بھی ہوگا یا نہیں ہوگا خدا جانے
ترے ملنے کے وعدے کی خوشی کچھ کم نہیں ہوتی

محبت اور بھی پروان چڑھتی ہے جدائی میں
جدائی سے محبت کی حرارت کم نہیں ہوتی

نہ ہو مایوس کشتی دیکھ کر اے موجِ طوفاں میں
کبھی بیکار کوئی کوشش پیہم نہیں ہوتی

موج روڈ، رام گڑھ۔ ۲۰۹۶۰۱

حاشیے اندر کا آدمی

ایک عرصے سے اس کے اندر ایک عجیب بوجھل سی بے قراری پیدا ہو گئی تھی۔ کسی بھی دن اسے قرار نہیں تھا کہ وہ بات بات پر جھلانے لگا تھا اور اس کی اس جھلاہٹ سے گھر کے سارے افراد پریشان تھے کہ بقول ان کے وہ معمولی معمولی باتوں پر بھی غصے سے بھڑک اٹھتا تھا لیکن اکثر اس کا غصہ لمحاتی ہوتا تھا۔ مگر بعض وقت وہ لمبے طویل بھی ہو جاتے تھے۔ حالانکہ پہلے، بہت پہلے جب وہ سبھوں کا کفیل تھا۔ بے حد نرم مزاج، کم گو اور سمجھوتہ کرنے والا ایک خوش مزاج و خوش اخلاق آدمی تھا۔ لیکن پچھلے کئی ماہ سے یعنی جب سے وہ بیٹھ گیا تھا۔ اس کے مزاج میں بڑی تبدیلی آگئی تھی اور موم مزاجی، گرم دھوپ میں بدل گئی تھی اور اس کے مزاج کی اس تبدیلی سے نہ صرف اس کے گھر کے تمام افراد پریشان ہو گئے تھے بلکہ اس کے دوست احباب بھی اس سے کترانے لگے تھے کہ پتہ نہیں وہ کب بھڑک اٹھے۔ چنانچہ ایک اچھے نفسیاتی ڈاکٹر سے اسے رجوع کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی لیکن اس کے لئے وہ تیار ہی نہیں ہوا تھا اور جب بہت مجبور کیا گیا تو جھلا کر کہا تھا۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اچھا بھلا ہوں اور مجھے کسی قسم کی کوئی بیماری نہیں ہے۔ بس ایک عجیب قسم کی کترتی ہوئی سے بےچینی اندر محسوس ہوتی ہے اور یہ بے کلی صرف تم لوگوں کے نئے نئے تماشے دیکھ کر مجھے ہوتی ہے تو طبیعت جھلانے لگتی ہے۔ تم لوگوں میں ذرا سی بھی انسانیت باقی نہیں ہے مگر تم لوگ الٹا مجھے ہی ڈانٹتے رہتے ہو حالانکہ تمہاری بدتمیزی اور غیر انسانی حرکتوں نے ہی مجھے چڑچڑا بنا دیا ہے۔ کیونکہ اس عمر میں مجھے ذہنی سکون کی بڑی ضرورت ہے جو مجھے نصیب نہیں ہے کہ اب میں تم سبھوں کے دانتوں میں تنگ ہو گیا ہوں۔ اس کی ایسی باتیں سن کر اس کے گھر کے آزاد مزاج افراد کہتے ہیں کہ آپ ان جلالی لمحوں میں گھر کے کسی بھی فرد کی کوئی بھی معقول بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے اور بس سبھوں پر ایک ساتھ غصہ اتارنے لگتے ہیں جب کہ ہم سب اپنے اپنے نارمل انداز سے آپ کو سمجھانے کی ناکامیاب کوشش کرتے ہیں مگر آپ تو کسی کی کوئی بھی سنجیدہ بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے اور سبھوں پر بے تحاشہ غصہ کرنے لگتے ہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے کی ہی بات ہے کہ آپ اپنی پسند کا گوشت نہ ملنے پر قصاب سے جھگڑ بیٹھے تھے کہ وہ بوڑھے اور خراب جانوروں کا گوشت فروخت کرتا ہے جب کہ سبھی لوگ اس قسم کا گوشت کھانے کے عادی ہو چکے ہیں اور پھر جانتے ہیں آپ کہ قصاب کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں، سوائے مارنے اور کاٹنے کے انہیں کچھ آتا ہی نہیں۔ لیکن آپ نے ہماری اس بات کی یہ اوندھی دلیل پیش کی تھی کہ کیا صرف گوشت بیچنے والے ہی قصاب ہوتے ہیں۔ کیا اس زمین پر ان سے زیادہ بڑے بڑے قصائی موجود نہیں ہیں۔ بلکہ آپ کی نظر میں تو آج ساری زمین قصائیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ بھی کوئی دلیل ہوئی کہ زمین پر قصائی ہی قصائی بھرے ہوئے ہیں۔ بتایئے کہ آپ کی کون کون سی باتوں سے آپ کو روکا جائے، آپ تو اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتے ہیں۔ اس پر وہ بوڑھا بھڑک کر ان سے کہتا کہ تم سب لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو، میری ہر بات کا جھگڑا بنا دیتے ہو، جب سے میں خزاں کا موسم ہو گیا ہوں تم سبھوں نے مل کر مجھے جھاڑنا شروع کیا ہے حالانکہ میرے جسم پر اب ایک پتا بھی باقی نہیں ہے--- کیا یہ معمولی باتیں ہیں۔ اس پر اس کے گھر کے تمام افراد اس سے کہتے کہ کون کون سی حرکتوں اور کن کن چیزوں یا باتوں سے آپ کو روکا جائے کہ کبھی آپ کوؤں کی آوازوں پر الجھنے لگتے ہیں تو کبھی کتوں کے بھونکنے پر برہم ہو جاتے ہیں اور کبھی آوارہ جانوروں کے گھر میں گھس آنے پر غصہ اتارنے لگتے ہیں تو کبھی الوؤں کی بوم پر بےچین ہو جاتے ہیں یا پھر لڑکوں کے سیٹیاں بجانے پر بل کھانے لگتے ہیں---ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہی ہے کہ آپ نے اپنے بستر پر گرد دیکھ کر کس بری طرح سے سب کو ڈانٹ دیا تھا— پتہ نہیں آپ کو کس بھوت کا سایہ ہو گیا ہے کہ آپ کا مزاج ہی بدل گیا ہے کیونکہ آپ کو صبح بانگ دینے والے مرغ اچھے لگتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ اب بانگ دینے والے مرغ اس کرہ ارض پر ہیں کہاں۔ اور پھر پرندوں کی چہچہاہٹیں بھی آپ کو بھلی لگتی ہیں مگر اب پرندے کہاں سے لے آئیں کہ وہ تو آج کل کہیں دکھائی ہی نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ آپ کو آنگن میں پھیلی ہوئی صبح کی نرم نرم دھوپ سے عشق ہے لیکن اب گھروں میں آنگن ہیں کہاں، سب کے سب گھر تو بے آنگن کے ہو گئے ہیں...... اور...... اور پھر آپ کو بالکونی میں، الگنی پر ٹنگی کوٹ، برا، شلوار، بلاؤز اور ساڑیاں وغیرہ سکھانا پسند نہیں ہے۔ ذرا سوچئے کہ بالکونی پر کپڑے سکھانے کے سوائے اب گھر میں جگہ ہے کہاں؟ بالکونی کی دھوپ تو صرف کپڑے سکھانے کے لئے ہی آتی ہے اور اس سے ہٹ کر اگر بچے آپ سے اونچی آواز میں بات کرتے ہیں تو آپ چراغ پا ہو جاتے ہیں اور پھر ان پر تیزابی بارش کی طرح برسنے لگتے ہیں۔ بتایئے کہ ہم اپنے سمجھدار

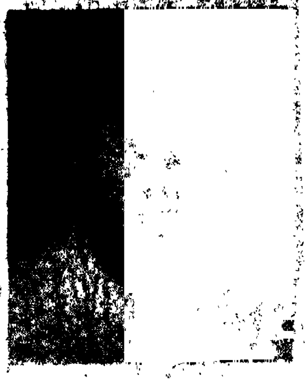
۵۴۴ جے۔ ایس پی ایل، سی آئی پی، بوگی گڈا، حیدر آباد

اور تم بھلا بچوں کی آوازوں کو کیسے دبا سکتے ہیں کہ وہ اونچی آوازوں میں باتیں کرنے کے عادی ہوگئے ہیں لیکن آپ کو اونچی آواز گراں گزرتی ہے۔ مگر ان تمام چیزوں کے درمیان ہی تو ہم سب کے سب گھرے ہوئے ہیں۔ پھر ان سے چھٹکارا کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہی تو زندگی ہے۔ لیکن آپ تو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ بس اپنی ہی چلی چلاتے رہتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے آپ کو گھر کے ہر معاملے سے باہر رکھا ہے تاکہ آپ گھر کی کسی بھی بات میں مداخلت نہ کریں۔ تاہم آپ باز ہی نہیں آتے اور ہر معاملے میں مداخلت کرنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ کھانے پینے کی چیزوں میں بھی آپ کیڑے نکالتے رہتے ہیں کہ ان میں لذت ہی نہیں ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ آپ کی زبان ہی ضعیف ہوگئی ہے۔ بہرحال آپ کی آخر کون کون سی باتوں کو کب تک اور کہاں تک برداشت کیا جائے، آپ تو ہر چیز کو اپنی بے کانٹے کی ترازو میں تولنے کے عادی ہوگئے ہیں کیونکہ آپ کی نظروں میں ہم سب کے کردار اور معیار دونوں پست ہوکر رہ گئے ہیں۔ ان کی ایسی جلی کٹی باتیں سن کر وہ بوڑھا ان سے کہتا کہ ہاں ہاں تم سب کے سب بے اوقات، بداخلاق اور بے ادب ہوگئے ہو، تمہارا کوئی معیار ہی نہیں ہے، تم لوگ بات بات پر ہنستے رہتے ہو، چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑی اہمیت دیتے ہو، اخلاق سے گری ہوئی حرکتوں کو اچھی سمجھنے لگتے ہو اور یہ سب کچھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا کہ تم لوگ گھٹیا سے گھٹیا کام کرتے رہو اور میں خاموش تماشائی بنا رہوں۔ اور اس کی ان باتوں پر اس کے گھر کے تمام افراد بیک وقت اس پر ٹوٹ پڑتے کہ آپ کو اگر ہماری ایسی کوئی بھی بات یا پھر حرکت پسند نہیں آتیں تو آپ چپ چاپ سوجایا کیجئے، سوجانے سے آپ کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا لیکن آپ تو سوتے بھی نہیں۔ اگر سوجایا کریں گے تو زبردستی کی الجھنوں اور مسائل سے آپ کو نجات بھی مل جائے گی اور خواہ مخواہ کا تناؤ بھی ختم ہوجائے گا۔ لیکن گھر کے افراد کی تلخ باتیں سن کر وہ کہتا کہ میں سونے والوں میں سے نہیں ہوں، میں تو جاگتے رہنے والوں میں سے ایک ہوں اور جاگتے رہنے کی وجہ سے بیدار رہتا ہوں اور بیدار رہنے کی وجہ سے ہی سب کچھ دیکھتا ہوں اور یہ سب دیکھ دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اس لئے الجھ جاتا ہوں اور مسلسل الجھتا ہی چلا جا رہا ہوں۔ اس بات پر اس کے گھر کے افراد اس سے کہتے کہ اگر آپ سو نہیں سکتے تو اپنے منہ پر تالا لگا لیجئے یا اپنی آنکھیں پھوڑ لیجئے تاکہ آپ کو کچھ بھی نظر نہ آئے۔ یا پھر سنیاس لے کر جنگلوں میں نکل جائیے اور کسی ایسے پہاڑ پر جاکر بیٹھ جائیے جہاں آپ کو کوئی آدم زاد دکھائی نہ دے۔

اور اس طرح اس بوڑھے کے لئے یہ روز کا معمول بن گیا تھا کہ کسی نہ کسی بات پر کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو جاتی تھی—— چنانچہ ایک رات کھانے پر گھر کے تمام افراد کی بداخلاقی اور بد زبانی پر وہ کچھ اس قدر جھلا گیا تھا کہ اس کی آنکھیں بھر آئیں تھیں اور وہ بغیر کچھ کھائے پیے ہی اٹھ گیا تھا اور طول سا اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا تھا۔ لیکن رات بھر وہ سو نہ سکا تھا کہ بار بار اس کے کانوں میں سبھوں کی سخت کلامی کے علاوہ اس کی بیوی کی آواز بھی گونج رہی تھی——اب آپ ایک بیکار اور ناکارہ آدمی ہوگئے ہیں—— چنانچہ وہ بے چین ہوکر بستر پر مسلسل کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے پاؤں اندر سے اسے کھینچ رہے تھے، درد اس کی رگوں میں گرم دھوپ ہوگئی تھی۔ تاہم وہ بار بار بستر سے اٹھ اٹھ کر پانی پیتا رہا اور بار بار چھوٹی حاجت کے لئے جاتا رہا۔ بس رات جب ڈھل گئی اور صبح نے اپنی آمد کا الغوزہ بجادیا تو وہ چپکے سے اپنے بستر سے اٹھا اور پھر دیوار پر پھیلی ہوئی بے جڑوں والی بیل پر ایک نظر ڈالی اور اپنی گزری ہوئی معصوم زندگی کے ایک ایک دن پر اپنے پاؤں رکھتا ہوا گھر کے نئے دروازے کو چھوڑ کر قدیم دروازے سے باہر نکل گیا۔ صبح ابھی پوری طرح آئی نہیں تھی، اندھیرا اور اجالا ہنوز ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے اور وہ گھر کے دروازے کی دہلیز پر کھڑا نچوڑے ہوئے گنوں کے چھلکوں کے ڈھیر کو دیکھتا رہا جو نیم کے درخت کے نیچے ایک ٹھیلے کے قریب پڑے ہوئے تھے اور پھر آنکھیں گھما کر ذبح کی جانے والی بھیڑوں کو گھورنے لگا جنہیں مذبح کی طرف ہانکا جارہا تھا کہ صبح انہیں ذبح ہونا تھا۔ لیکن سردی اور اندھیرے کی وجہ سے بھیڑیں ہانکنے والوں کے چہرے صاف دکھائی نہیں دے رہے تھے کہ بھیڑیں ہانکنے والوں نے اپنے جسموں اور چہروں کو چادروں سے چھپا رکھا تھا۔ چنانچہ چند لمحوں تک وہ دہلیز پر ہی کھڑا آپ ہی آپ بدبداتا رہا کہ اب میں متن سے نکل کر حاشیے میں آگیا ہوں کہ اس عمر میں سب میری ہی طرح متن سے نکل کر حاشیے میں آجاتے ہیں۔

اور پھر فٹ پاتھ سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا خود بھی بھیڑوں میں شامل ہوگیا!!

☆☆☆



کاگا سب تن کھائیو......

وہ نہ تو اپنے ملک کی سرحد پر تعینات فوجی تھے اور نہ ہی ملک کے سیاست داں بلکہ دو غیر ملکی ایشین تھے جو کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں ڈان ملز پر واقع ایک کئی منزلہ عمارت کی مختلف منزلوں پر رہتے تھے۔ لیکن یہاں ان دونوں کو اتفاق سے ملنے پر ذرا بھی احساس نہ ہوا تھا کہ وہ دو پڑوسی ملک کے باشندے ہیں بلکہ انہیں ایسا احساس ہوا جیسے وہ ایک ہوں۔ ایک ہی جگہ...... ایک ہی خطہ اور ایک ہی شہر کے رہنے والے ہوں۔ ان میں کوئی فرق نہیں تھا کوئی امتیاز نہیں تھا۔

اور در حقیقت ان میں فرق ہی کیا تھا؟ ان دونوں کا رنگ گندمی تھا۔ ان کا رہن سہن، کھانا پینا بھی ایک ہی طرح کا تھا یہاں تک کہ ان کی زبان بھی ایک ہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پہلی ملاقات ہی میں اپنی 'قومیت' کو بھول کر ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ وہ الگ الگ ملک کے باشندے ہیں۔

دراصل یہ 'قومیت' کا تصور ان کے ملکوں میں ہی پایا جاتا تھا۔ یہاں اس قسم کے جذبات، احساسات اور تصورات کے لئے کوئی جگہ نہ تھی اور وہ ایک دوسرے سے بڑے کھلے دل سے ملتے اور شامیں تک اکٹھی گزارتے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ٹورنٹو میں آج کی طرح ان دو ممالک کے لوگ لاکھوں کی تعداد میں موجود نہ تھے بلکہ وہ خال خال ہی نظر آتے تھے اور یہ لوگ اپنے کسی ہم زبان سے بات کرنے کے لئے ترستے رہتے تھے اور جب انہیں کوئی اچانک مل جاتا تھا تو ایسے خوش ہوتے تھے جیسے کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ تب وہاں آج کی طرح ان کی آبادی لاکھوں میں نہیں تھی بلکہ ہزاروں تک محدود تھی۔

ان ہی دنوں کرشن گوپال بھی نیا نیا ہی آیا تھا اور وہ یہاں اپنے کسی ہم زبان سے باتیں کرنے کے لئے ترستا تھا — تبھی ایک دن اسے معلوم ہوا کہ اسی بلڈنگ کی گیارہویں منزل پر محمود اشرف نامی ایک انجینئر رہتا ہے۔ اس اطلاع سے وہ اتنا خوش ہوا کہ اسی شام بغیر کسی دعوت کے یا پیشگی اپوائنٹمنٹ کے وہ اس سے ملنے چل پڑا اور جاتے ہی جلدی سے دروازے پر لگی گھنٹی بجادی۔ ایسا جان پڑتا تھا جیسے وہ اپنے پڑوسی سے ملنے کے لئے بری طرح بے تاب ہے۔ گھنٹی بجتے ہی ایک طویل قامت گورے چٹے نوجوان نے دروازہ کھولا اور ایک اجنبی کو کھڑا دیکھ کر حیرت و استعجاب سے اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھورتا ہوا بولا...... "جی فرمایئے۔"

کرشن گوپال کو بات کرنے کے لئے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ چند ثانیوں کے لئے وہ گنگ سا ہو گیا۔ پھر بڑے دھیرے سے لہجے میں اس نے کہا۔ "معاف کیجئے گا۔ میں کرشن گوپال ہوں۔ میں چند مہینے قبل لکھنؤ سے یہاں آیا ہوں اور اسی بلڈنگ میں رہتا ہوں۔"

"لیکن آپ کی زبان تو لکھنوی نہیں۔ آپ تو......"

"جی آپ نے درست فرمایا۔ دراصل ہم لوگ تقسیم سے پہلے پنجاب کے شہر گوجر خان میں رہتے تھے۔"

"عجیب بات ہے" محمود اشرف اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "میں بھی اتفاق سے اسی شہر میں پیدا ہوا تھا۔"

اور پھر انگریزی بولتے بولتے وہ اپنی پوٹھوہاری زبان میں بات چیت کرنے لگے۔ وہ بھول گئے کہ وہ ہندوستانی اور پاکستانی ہیں، ان دونوں کے ملکوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو دشمن ملک تصور کرتے ہیں۔

پھر چند ہی دنوں میں وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے — کہ وہ اپنا زیادہ تر وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے لگے۔ حالانکہ دونوں کی قومیت الگ الگ تھی۔ لیکن آخر ان میں فرق بھی کیا تھا؟ وہ دونوں ایک ہی طرح کا کھانا کھاتے تھے، ان کا رنگ روپ ایک سا تھا، ان کی زبان ایک تھی۔ ان کے رسم و رواج بھی لگ بھگ ایک سے تھے اور وہ ایک ہی تہذیب و تمدن کے منبع سے نکلی ہوئی ندی کی طرح تھے جو کچھ مسافت طے کرنے کے بعد پھر الگ الگ دو دھاروں میں بٹ کر الگ الگ سمتوں میں بہنے لگتی ہے۔ پھر بھلا وہ ایک دوسرے سے نفرت کیوں کرتے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی وہ دو قالب ایک جان ہو گئے۔ انہیں ایک دوسرے سے

سی-۶، کرشن نگر، دہلی-۱۱۰۰۵۱

بغض و عناد کی کبھی بو نہ آئی اور انہیں ہمیشہ مل کر اپنے پن کا احساس ہوا اور چونکہ ان دنوں وہ دونوں اکیلے رہتے تھے لہٰذا ان کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گزرنے لگا اور وہ ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔

کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر کرشن گوپال اشرف سے سوال کر بیٹھتا۔

"یار اشرف! مجھے آج تک احساس تک نہیں ہوا کہ تم غیر ملکی ہو۔" اور اشرف مذاق کے لہجے میں جواب دیتا۔ "گوپال تم کیوں بھول جاتے ہو کہ میں ......"۔

"لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے۔ "میں یہاں بھی رہتے ہوئے وہاں کی گلیوں اور کوچوں میں گھومتا رہتا ہوں اور وہاں کی یادوں کو کبھی فراموش نہیں کر پایا اور یہ خواہش ہمیشہ دل کو کچوکے لگاتی رہتی ہے کہ کیا میں کبھی گوجر خان کے بازاروں میں گھوم پاؤں گا؟ کیا مجھے مری کی برف سے ڈھکی سر بفلک چوٹیاں دیکھنی نصیب ہوں گی۔ کیا وہاں کا برف کی طرح یخ اور شیریں پانی پینا نصیب ہو گا؟"

کرشن گوپال ہمیشہ اشرف کے مذاقیہ لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی طرح جذبات کی رو میں بہتے ہوئے کہتا...... "یہ سب اتفاق ہے کہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا اور تم ایک مسلم گھرانے میں۔ اگر اس کے برعکس ہوتا تو............"

اشرف محمود اسے چپ کرانے کی غرض سے کہتا۔ "اچھا بابا اب اپنا لیکچر بند کرو۔"

مگر کرشن گوپال پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا وہ اسی طرح جذبات کی رو میں بہتا اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتا رہتا۔ "کیا ہم ہمیشہ اسی طرح دشمنی اور نفرت کے ماحول میں زندگی گزارتے رہیں گے؟ سرحدی پابندیوں نے ہمیں الگ تھلگ کر دیا ہے۔" "اشرف! پھر چند ثانئے چپ رہ کر وہ سوالیہ انداز میں اس سے پوچھتا "کینیڈا کے لوگ بغیر کسی روک ٹوک کے امریکہ چلے جاتے ہیں اور امریکہ کے لوگ کینیڈا...... انہیں کسی قسم کی دقت یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مگر ہم تمیس میل کا راستہ طے نہیں کر سکتے۔ اگر ملک کے قوانین ہمارے درمیان حائل ہیں تو امریکہ اور کینیڈا کے عوام کے درمیان کیوں حائل نہیں؟ وہ ایک دوسرے کے ملک میں بلا روک ٹوک کیسے چلے جاتے ہیں؟"

اسی طرح وقت کا پرندہ اپنی مخصوص رفتار میں اڑانیں بھرتا رہا...... اور پھر ایک دن کرشن گوپال کے والدین بھی کینیڈا اپنے بیٹے کے پاس آ گئے۔ ان کے آ جانے سے اشرف کا ان کے گھر آنا جانا اور بھی بڑھ گیا کیونکہ اسے ان میں کوئی غیریت نظر نہ آئی اور وہ اسے بھی اپنے بیٹے کی طرح ہی چاہتے تھے۔ کرشن کے والد مدن گوپال فوج کے ریٹائرڈ کیپٹن تھے اور طویل مدت سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور وہ یہاں اپنا علاج کرانے کے لئے آئے تھے۔ وہ بڑے خوش باش اور ملنسار تھے اور بات بات پر قہقہے لگاتے تھے۔ ایک دن جب انہیں باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ اشرف کے والد بھی پنجاب رجمنٹ میں صوبیدار تھے تو انہیں بڑی حیرت ہوئی کیونکہ وہ اسی رجمنٹ سے وابستہ رہے تھے اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اس سے واقف نہ ہوں اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ وہ ان ہی کے علاقے کے رہنے والے ہوں۔ انہوں نے بڑے تعجب سے پوچھا۔

"کیا نام تھا تمہارے والد کا؟"

"جی۔ راجہ صابر محمود۔"

"ارے وہی نا جن کے بڑے بھائی راجہ خالد محمود ہاکی کے مشہور کھلاڑی تھے؟"

"جی وہی۔"

"ارے میں تو انہیں اسکول کے زمانے سے جانتا ہوں۔ وہ اسلامیہ اسکول کے کیپٹن تھے اور میں سناتن دھرم اسکول کا۔ ڈسٹرکٹ اسکولوں کے مقابلے میں ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے اور ہماری دوستی تو اکٹھے ہائی اسکول کے زمانے سے تھی اور فوج جوائن کرنے کے بعد اتفاقاً ہماری رجمنٹ بھی ایک ہی تھی۔ لیکن بٹوارے سے پہلے ان کی پوسٹنگ دہرہ دون میں تھی اور میری جالندھر میں۔ اس لئے تقسیم کے بعد اچانک حالات ایسے ہو گئے کہ ہم ایک دوسرے سے مل نہ پائے اور پھر ملاقات نہ ہو سکی۔"

اس واقعہ کے بعد ان کی قربت مزید بڑھ گئی اور پھر ان کی اس کے والد کے ساتھ خط و کتابت بھی شروع ہو گئی۔ جنہوں نے اسے کئی خطوط میں اسے اپنے ملک آنے کی دعوت دی تھی۔ ان خطوط کو پڑھ کر وہ بڑے جذباتی ہو جاتے تھے اور کہا کرتے تھے "اشرف اگر زندہ رہا تو تمہاری شادی پر میں ضرور گوجر خان جاؤں گا۔ اور اس طرح تمہاری شادی میں شرکت کے ساتھ ہی اپنی جنم بھومی کے بھی درشن کرنے کی برسوں پرانی خواہش کو بھی پورا کر لوں گا۔" ایسی باتیں کرتے کرتے وہ حد سے زیادہ جذباتی ہو جاتے اور کبھی کبھی تو ان کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور وہ کسی نامعلوم دنیا میں کھو جاتے۔ لیکن پھر ایک دن ان کی حالت بہت بگڑ گئی اور بیماری کی شدت کے مدنظر انہیں اسپتال میں بھرتی کرا دیا گیا۔

کرشن گوپال کی طرح اشرف بھی ان کی بیماری سے بہت فکرمند تھا اور اس کے ساتھ لگ بھگ روز ہی انہیں دیکھنے اسپتال جایا کرتا تھا۔ لیکن ایک دن اچانک اشرف کو کنگسٹن میں اپنی بہن کے یہاں جانا پڑ گیا جہاں کوئی تقریب تھی۔ اشرف چاہتا تھا کہ کرشن گوپال بھی اس کے ساتھ تقریب میں شرکت کے لئے چلے مگر والد کی بیماری کی شدت کے پیش نظر اس نے جانے سے معذرت کا اظہار کیا اور معاملے کی شدت کا احساس کر کے اشرف کو اکیلے ہی جانا پڑ گیا۔ لیکن شومیٔ قسمت کہ واپسی پر آتے ہوئے اس کی کار ایک حادثے کی لپیٹ میں آ گئی جس سے وہ شدید زخمی ہو گیا۔ بروقت اسپتال میں پہنچ جانے سے اس کی زندگی تو بچ گئی لیکن وہ اپنی آنکھوں سے محروم ہو گیا۔

اگرچہ اس حادثے کی اطلاع پا کر اس کے بہنوئی بہن کنگسٹن سے اور کچھ رشتہ دار اسٹیٹس سے بھی پہنچ گئے تھے۔ کرشن گوپال بھی اس کی حالت سے بے حد پریشان رہتا اور روزانہ اس کی خیر و عافیت جاننے کے لئے اسپتال جاتا۔ شاید اگر اسپتال میں رہنے کی اجازت ہوتی تو وہ وہیں رک بھی جاتا لیکن کیا کرتا مجبوری تھی۔ اور پھر اپنے والد کی شدید بیماری کی وجہ سے بھی تو اس کی نیندیں حرام

جسے وہ ٹھیک سے دیکھنے کی خواہش لئے کافی دور واقع ایک دوسرے اسپتال ملاقات چلا کرتا تھا۔

لیکن کرشن گوپال ہی نہیں اس کے والد بھی اس کی حالت سے بہت فکر مند تھے اور وہ بھی تین چار بار اسپتال سے ٹیلی فون کرکے اس کی خیر و عافیت پوچھ چکے تھے اور بیماری کے کارن خود نہ آسکنے پر معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس کے جلد رو بہ صحت ہونے کی دعا بھی کی تھی۔

آخر کچھ دنوں کی جانچ پڑتال کے بعد ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کی آنکھوں میں روشنی لوٹ آنے کی کافی امید ہے اور اس کے لئے آئندہ ہفتے جب بھی ڈونیٹ کی گئی آنکھیں دستیاب ہوجائیں گی اس کا آپریشن کردیا جائے گا۔

اور پھر اشرف کے اعزا و اقارب اور کرشن گوپال بے صبری سے اس کے آپریشن کا انتظار کرنے لگے۔

اور آخر آٹھ دن بعد آنکھیں دستیاب ہو جانے پر اس کا آپریشن کردیا گیا جو کامیاب ثابت ہوا اور اس کی بینائی دوبارہ لوٹ آئی۔ اس پر یوں تو سبھی کو بے حد خوشی ہوئی تھی مگر کرشن گوپال کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

چند دنوں بعد اسے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ وہ گھر واپس آیا تو اسے کرشن گوپال کے والد کی یاد آئی جن کی حالت کچھ دنوں سے بہت خراب چل رہی تھی۔ اس نے کرشن گوپال سے پوچھا "کرشن! انکل کا کیا حال ہے؟"

کرشن گوپال کے چہرے پر اچانک اداسی کے بادل چھاگئے اور اس نے بڑی مایوسی کے عالم میں جواب دیا۔ "پہلے کی طرح چل رہے ہیں۔"

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"ڈاکٹر...... "اس کے چہرے کی اداسی مزید گہری ہوگئی، جیسے وہ ان کی زندگی سے بالکل مایوس ہوچکا ہو۔ کچھ ثانیے وہ چپ سا رہا۔ پھر بولا۔ "ڈاکٹر تو آخری وقت تک امید دلاتے رہتے ہیں۔ لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"حالت اطمینان بخش نہیں۔"

یہ سن کر اشرف بھی اداس سا ہوگیا۔ وہ کچھ دیر کچھ گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر بولا "اچھا تو ایسا کرتے ہیں کل انہیں دیکھنے میں بھی تمہارے ساتھ اسپتال جاؤں گا۔"

"لیکن ابھی تو تم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئے اس لئے تم کچھ دن بعد جانا۔"

"ارے نہیں اب میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور کل تمہارے ساتھ اسپتال ضرور جاؤں گا۔"

"اچھا بھئی جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن باؤجی نے کہا تھا اشرف کو کہنا، ابھی وہ دیکھنے نہ آئے اور کچھ دن آرام کرے۔ اور ہاں۔ باؤجی نے تمہارے نام ایک خط بھی دیا تھا جس میں تلقین کی تھی کہ تم جب تک پوری طرح رو بہ صحت نہ ہو جاؤ اسپتال نہ آنا" اتنا کہہ کر کرشن گوپال نے جیب سے ایک خط نکالا اور اسے تھماتے ہوئے بولا۔ "یہ لو باؤجی نے اس سلسلے میں تمہیں یہ خط لکھا تھا۔" اتنا کہہ کر اس نے خط اشرف کے ہاتھ میں تھمادیا اور خود تھکا تھکا سا پاس ہی پڑی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اشرف نے خط کھولا اور وہیں کھڑے کھڑے اسے پڑھنے لگا، لکھا تھا:

"پیارے اشرف!

یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ڈاکٹروں نے چند دنوں بعد تمہارے آپریشن کا فیصلہ کرلیا ہے اور جلد ہی تمہاری آنکھوں کی روشنی واپس آجائے گی۔ لیکن روشنی آنے کے بعد بھی کئی دن تک تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہوگی۔ اس لئے جب تک تم پوری طرح رو بہ صحت نہ ہوجاؤ آرام کرنا اور ہاں! میں بیان نہیں کرسکتا کہ تمہاری اس بینائی کے واپس آنے پر میں کتنا خوش ہوں۔ تمہیں تو معلوم نہیں کہ ادھر ڈاکٹر بھی میری زندگی سے مایوس ہوچکے ہیں۔ یہ مجھے ان کے رویے سے محسوس ہو رہا ہے، اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتے وہ غالباً میری زندگی سے مایوس ہوچکے ہیں اور اب میں زیادہ سے زیادہ چند دن کا مہمان ہوں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ جس پر حیرانی ہو۔ آخر کینسر کا مریض کب تک زندہ رہ سکتا ہے؟ اسے تو جانا ہی ہے۔ لہٰذا میں نے ڈاکٹروں سے استدعا کی ہے کہ اگر میں تمہارے آپریشن سے پہلے مرجاؤں تو وہ مہربانی کرکے میری ڈونیٹ کی گئی آنکھیں تمہیں لگادیں۔ اس طرح ایک تو تمہیں نئی آنکھیں مل جائیں گی اور تمہاری بینائی دوبارہ لوٹ آئے گی اور پھر میری برسوں کی یہ حسرت بھی پوری ہوجائے گی کہ میں ایک بار اپنی جنم بھومی کے درشن کرسکوں۔ وہ جگہیں دیکھ سکوں جہاں میں نے اپنا بچپن، لڑکپن اور جوانی گزاری تھی۔ مگر افسوس زندگی میں یہ ممکن نہ ہو پایا۔ چلو اب میری آنکھیں تمہارے توسط سے وہ سب کچھ دیکھ سکیں گی جنہیں دیکھنے کی خواہش لئے میں اس دنیا سے کوچ کر رہا ہوں۔ میں نے کرشن گوپال سے کہا ہے کہ میری موت کے بعد جب تم رو بہ صحت ہوکر گھر آجاؤ تو یہ خط تمہارے حوالے کردے اور کہہ دے کہ میری خواہش کو جلد پوری کرنا اور......"

......اور اس سے آگے اشرف کچھ نہ پڑھ پایا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور الفاظ چیونٹیوں کی طرح اس کی پرنم آنکھوں کے سامنے رینگنے سے لگے۔ چند ثانیے وہ یوں ہی بت بنا ساکت و صامت کھڑا رہا اور پھر پاس ہی پڑی کرسی پر دھڑام سے گر پڑا۔

☆☆☆

گزارش

☆ خط و کتابت / تخلیقات بھیجتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ تخلیقات صاف، خوشخط اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھ کر بھیجیں۔

☆ تبصرے کے لئے کتاب کی دو کاپیاں لازماً ارسال کریں۔ کتاب کے ساتھ تبصرے نہ بھیجیں۔

☆ ضروری نہیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع ہو۔

☆ شعری تخلیقات بھیج کر ہمیں شرمندہ نہ کریں۔

☆ جواب طلب امور کے لئے مناسب ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

اعجاز

ہنستے رہو

ایک — دو — تین —

تیسری سیٹی پر انہوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔

وہ سو تھے۔ مرد اور عورتیں۔ لافنگ ایسوسی ایشن کے ممبر۔

نناوے پرانے ممبر تھے جنہیں از خود ہنسنے کی مشق ہو چکی تھی۔

سوواں شخص نووارد تھا۔ اس کی عمر ۶۳ سال تھی۔ اس سے ہنسا نہیں جا رہا تھا۔ آج صبح ہنسنے کے پروگرام میں وہ پہلی بار آیا تھا تاکہ ہنسنے والوں کی یہ محفل اسے پسند آئے تو وہ اس کا سالانہ ممبر بن جائے۔ اس کے دوست اور فیملی ڈاکٹر اشوک جھن جھن والا نے اسے لافنگ ایسوسی ایشن کی رکنیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ جھن جھن والا اس ایسوسی ایشن کا صدر تھا۔

ساتھیوں کے اصرار پر وہ ہنسنے کی کوشش کرتا لیکن صرف ہونٹ کھینچ کر رہ جاتے۔ کبھی دانت نمایاں ہو جاتے یا منہ سے کھانسی کی آواز یا ہوا خارج ہو کر رہ جاتی۔ تھوڑی دیر بعد جب سبھوں کے ہنسی کے جھولوں کی پینگیں بڑھنے لگیں اور قہقہے طوفان میں بدل گئے اس وقت بھی وہ نہیں ہنس سکا۔

اس نے سوچا" میں متوسط درجے کا آدمی سہی لیکن کوئی ایسا غم پرست بھی نہیں۔ پھر بھی مجھ سے ہنسا کیوں نہیں جاتا۔ شاید ہنسی اور آنسو میں نناوے اور سو کا فرق ہے اور میں اس فرق کی علامت بن گیا ہوں۔"

اس کی ہنسی کی پاٹنر نے جب دیکھا کہ وہ ہنستا نہیں ہے تو شرارت سے اس کی چھجے دار ٹوپی کا چھجہ کھینچ کر پیچھے گردن کی طرف کر دیا اور اس کے پیٹ کے مٹکے میں گدگدی کرنے لگی۔ ہنسنے ہنسانے کے لئے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لافنگ ایسوسی ایشن کی طرف سے ہر بات کی کھلی اجازت ہے۔

لیکن دیوداس ہنسی کا ایکشن پھر بھی چہرے پر نہیں لا سکا۔ اس کا دوست اشوک جھن جھن والا دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ صرف معالج نہیں، ماہر نفسیات بھی تھا۔ وہ اس کے قریب آیا اور اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

"دیوداس ہنسو۔ ہنسو دیوداس۔ ہنستے کیوں نہیں۔ بھئی کچھ ہا ہو کرو۔ ہنسو گے تو پھیپھڑے کھلیں گے۔ تناؤ دور ہوگا۔ نیند بھی اچھی آئے گی۔"

اتنا کہہ کر جھن جھن والا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ قہقہہ کیا تھا جیسے کوئی گھنگھرودار جھنجھنا بج رہا ہو۔

ہنسنے والوں کا کارواں شہر کی سڑکوں سے گزرتا رہا۔ کہیں کہیں وہ سب رک جاتے اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر تصویروں کے لئے پوز بناتے۔ جیسے خدا سے کچھ مطالبہ کر رہے ہوں۔ اس سے ہنسی کی بھیک مانگ رہے ہوں یا پھر اسے بھی ہنسانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اس وقت ہر ایک کا چہرہ عجیب عجیب لگتا۔ انہیں اس عالم میں دیکھ کر راہ گیر اور مکانوں کے لوگ پہلے تو کسی فکر میں مبتلا ہو جاتے لیکن جب ہنسنے والوں کے ہاتھوں میں مضحکہ خیز بینر دکھائی دیتے تو وہ بھی ٹھٹھہ اڑانے لگتے۔ کچھ عمر دراز لوگ انہیں پاگل کہہ کر اپنے گھروں کی کھڑکیاں دروازے بند کر لیتے کہ ان کی ہنسی سے فضا میں نوائز پولوشن پھیلتا ہے۔

سب ہنسے لیکن دیوداس چاہ کر بھی نہیں ہنس سکا۔ اسے یاد آیا کل ہی وہ اپنی پوتی کی پہلی سالگرہ پر اس کے لئے بیٹری سے ہنسنے والی ایک گڑیا خرید کر گھر لے گیا تھا۔ بیٹری آن کرتے ہی گڑیا کلکاری مار کر ہنسنے لگتی اور آف کرتے ہی اس کی ہنسی کا فوارہ بند ہو جاتا۔ اس نے سوچا وہ اس مشینی عمل سے کیوں نہیں گزر پا رہا ہے۔ اسے اپنی بے چارگی پر ترس آیا۔

ڈاکٹر جھن جھن والا ایک بار پھر اس کے پاس آیا اور اپنی جھنجھنا بجاتی ہنسی کے درمیان بولا "دیوداس ہنسو۔ پیارے خوب ہنسو۔ تمہارا باپ مر گیا ہے تو بھی ہنسو۔"

دیوداس نے ڈاکٹر کے چلبلے جملے کو دیکھ کر پھر ہنسنے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے جھینگر کی سی آواز نکلی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس [illegible] گیا ہو۔ اس نے کہا

"ڈاکٹر۔ مجھے بے وجہ ہنسنے میں دقت ہو رہی ہے۔ تین ہزار روپے سالانہ ممبری فیس ادا کر کے میں سال بھر ہنستا رہوں۔ یعنی ڈھائی سو روپے ماہوار ہنسی کی قیمت چکاؤں۔ تم ہی بتاؤ، تم کہتے ہو ہنسی [illegible] سے دور رکھتی ہے۔ پھر بھی مہینے میں دو ایک بار تم میرے گھر ضرور آتے ہو۔ ایک وزٹ کے چار سو روپے لیتے ہو۔ تم میرے دوست بھی ہو۔ تمہارے پیشے پر ترس کھاؤں اور اپنی دوستی کا خیال کروں تو خود پہ ہنسنا مجھے ممنوع قرار دینا پڑے گا۔"

دیوداس کا جواب سن کر ڈاکٹر کی ہنسی غائب ہو گئی۔ اس کی سنجیدگی دیکھتے ہوئے دیوداس نے ایک لمبی سانس لی اور بولا:

"ڈاکٹر ایسا کچھ ہو کہ لافنگ ایسوسی ایشن کا ہر ممبر مجھے ڈھائی سو روپے ماہوار دے کر ہنسنے کی نوکری پر رکھ لے۔ میں وعدہ کرتا ہوں مجھ سے ڈیوٹی میں کبھی چوک نہیں ہوگی۔ بلا وجہ ہنسنے سے اعصاب کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ بھی سہوں گا۔ جس دن میرا باپ مر جائے گا اس دن بھی تم مجھے ہنستا ہوا دیکھو گے — جیسا کہ تم چاہتے ہو۔ کہو منظور ہے؟"

ڈاکٹر کی ہنسی گم ہو گئی۔ دیوداس نے چھیڑا "کیوں ڈاکٹر، کیا تمہاری نانی مر گئی ہے؟ — ہنستے کیوں نہیں؟"

اس کے بعد جلوس کا سب سے بھاری اور طویل قہقہہ فضا میں گونجا جو کالی کھانسی کی طرح، پسلیوں کی پوری طاقت سے دیوداس کے منہ سے نکلا تھا!

نناوے ممبروں کی ہنسی تھوڑی دیر کے لئے سناٹے میں آگئی۔ پھر ایک فلک شگاف جھن جھنے دار آواز ابھری۔

"رونے والی سوسائٹی کے لوگو! ہنسنا ضروری ہے۔ یہ انڈیا ہے۔ ہنسو گے نہیں تو آنسوؤں کا قحط پڑ جائے گا۔ ہنسی تمہارے خوشیوں کا انشورنس ہے۔ قہقہہ اس بیمے کی قسط ہے۔ اس لئے ہنسو، ہنستے جاؤ — ہاہاہا — ہوہوہو — ڈھائی سو روپے ماہوار — ہی ہی ہی۔"

اچانک وہ سب ایک ساتھ ہنسنے لگے اور پھر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر گویا فریز ہو گئے۔ ان کے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے جیسے وہ الٹے بادلوں میں گدگدی کرنا چاہ رہے ہوں۔

اگلی بار دیوداس بھی آسمان میں قہقہے چپکا رہا تھا!

☆☆☆

۲۵۔بی، زکریا اسٹریٹ، کولکاتا۔ ۷۰۰۰۷۳

بھیشم ساہنی

ہندی سے ترجمہ: محمد کاظم

ساگ میٹ

ساگ میٹ بنانا کیا مشکل ہے۔ آج شام کھانا یہیں کھا کر جانا۔ میں تمہارے سامنے بنواؤں گی، سیکھ بھی لینا اور کھا بھی لینا۔ رکو گی نہ؟! ہمیں ساگ میٹ بہت پسند ہے۔ جب کبھی دوستوں کی دعوت کرتے ہیں تو ساگ میٹ ضرور بنواتے ہیں۔ اوہ! ساگ میٹ تو جگا بناتا تھا، وہ ہوتا تو میں اس سے ساگ میٹ بنوا کر کھلاتی۔ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ وہ اس میں دہی ڈالتا، لہسن ڈالتا اور نہ جانے کیا کیا ڈالتا۔ بڑے شوق سے بناتا تھا۔

میرے تو تین تین ڈبے گھی کے مہینے میں نکل جاتے ہیں۔ نوکروں کے لئے ڈالڈا رکھا ہوا ہے لیکن کون جانے کمبخت ہمیں ڈالڈا کھلاتا ہو اور خود خالص گھی ہڑپ جاتا ہو۔ آج کے زمانے میں کسی کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ میں تالے تو نہیں لگا سکتی۔ مجھ سے تالے نہیں لگتے۔ میں کہتی ہوں کھاتے ہیں تو کھائیں۔ کتنا کھا لیں گے۔ مجھ سے اپنی جان تو سنبھالی نہیں جاتی، اب کون تالے لگائے۔ یہ متھرا سات روٹیاں صبح اور سات روٹیاں گن کر شام کو کھاتا ہے۔ بیچ میں اسے دو چائے بھی چاہئے اور گھر میں جو مٹھائی ہو وہ بھی اسے دو۔ لیکن میں کہتی ہوں ٹکا ہوا تو ہے، آج کل کسی نوکر کا کیا بھروسہ کسی بھی وقت اٹھ کر کہہ دیتے ہیں — 'میں جا رہا ہوں۔'

یہ بھی مجھے ہی کہتے ہیں۔ کتے کے منہ میں ہڈی دئے رہو تو نہیں بھونکے گا۔ ستر روپے پر اسے رکھا تھا۔ اب سو لیتا ہے، پھر بھی اس کا مزاج چڑھا رہتا ہے۔ لیکن جگا — بڑا نیک آدمی تھا۔ بڑا نمک حلال۔ وہ نوکر تھوڑے ہی تھا وہ تو گھر کا فرد تھا۔ وہ انہیں بہت مانتا تھا۔ ایک بار یہ کچھ کہہ دیں تو مجال ہے وہ پورا نہ کرے۔ بڑا وفادار تھا۔ یہ بھی تو نوکر کو نوکر نہیں سمجھتے۔ گھر کا آدمی سمجھتے ہیں۔ جب کبھی سو پچاس کی اسے ضرورت ہوتی تو جھٹ سے نکال کر دے دیتے۔ کوئی لکھا پڑھی نہیں، کوئی حساب نہیں۔

جگا شادی کر کے بیوی لایا تو جوڑے اور ایک گرم کوٹ سلوا کر دیا۔ میں ان سے کہوں — "اجی کیوں پیسے لٹاتے ہو۔ نوکر کسی کا اپنا نہیں ہوتا۔ اسے پانچ روپے کہیں سے زیادہ مل گئے تو وہ پیٹھ پھیر لے گا۔" یہ کہتے "تو اپنا کام دیکھ۔ پانی نکالنے سے کنواں خالی نہیں ہوتا۔ یہ ہمیں ساگ میٹ کھلاتا رہے بس۔ مجھ سے جو مانگے گا دوں گا۔ اس جیسا باورچی تو پورے شہر میں نہیں ہوگا۔"

مجھے وہ دن یاد ہے جب جگا کو لے کر آئے تھے۔ باہر سے ہی آواز لگائی۔ "لے سمترا، تیرے لئے نوکر لے آیا ہوں۔ جب بھی یہ تجھ سے کہے اسے چائے کے ساتھ کھانے کے لئے ضرور کچھ دے دیا کر۔ ایک مٹھی زیادہ دے دینے سے تیرا نقصان نہیں ہوگا۔ اسے گھر سے ہمدردی پیدا ہو گئی تو ہمیشہ تیرا ہی رہے گا۔ تیرا سارا کام کر دیا کرے گا۔"

جگا بھی ایسا جیسے جنگل سے ہرن پکڑ لائے ہوں۔ بڑی بڑی آنکھیں، ہرن کی طرح حیران سا دیکھتا رہتا۔ وہی بات ہوئی۔ جگا کو ہمدردی ہو گئی لیکن یہ کچی عمر میں ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مسٹنڈے نوکر جو سڑکوں پر گھومتے ہیں انہیں کیا ہمدردی ہوگی۔ بچے معصوم ہوتے ہیں، جیسا سکھاؤ سیکھ جاتے ہیں۔ جانور سیکھ جاتے ہیں تو یہ کیوں نہ سیکھیں گے۔ انہیں بس میں کرنے کے بہت سے طریقے آتے ہیں۔

تمہیں 'جیکی' یاد ہے نہ؟ ہائے۔ تم جیکی کو بھول گئیں۔ ارے جیکی، اپنا کتا، جسے یہ ایک دوست کے گھر سے اٹھا لائے تھے۔ کبھی پر بھونکتا پھرتا تھا۔ پر انہوں نے اسے ایسا بس میں کیا کہ انہیں کے قدموں میں چکر کاٹتا پھرتا تھا۔ اسے بھی ایسی ہی محبت ہو گئی تھی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں، دفتر سے ان کے لوٹنے کا وقت ہوتا تو جیکی کے کان کھڑے ہو جاتے۔ باہر دن بھر سیکڑوں موٹر دوڑتی رہتی لیکن جس وقت ان کی موٹر آتی تو اسے فوراً پتہ چل جاتا اور دوڑتا ہوا باہر گیٹ پر پہنچ جاتا۔ وہیں پر ایک دن اپنی ہی گاڑی کے نیچے کچلا گیا۔ یہ محبت بہت بری چیز ہوتی ہے۔

یہ ٹوپس کہاں سے بنوائے ہیں؟ بہت خوبصورت ہیں۔ ہیرے کتنے کے آئے؟! اصلی ہیں نا؟ آج کل ہر چیز کو آگ لگی ہوئی ہے۔ میں نے یہ ناک کی لونگ بنوائی، اتنا چھوٹا سا ہیرا اس میں لگا اور پورے سات سو روپے نکل گئے۔ اب تو مجھے پہنتے بھی ڈر لگتا ہے۔ جب جگا تھا تو زیور کی پٹاری بھی باہر پڑی رہتی تھی۔ کبھی دو پیسے بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے۔ میں ایسی بھلکو ہوں، کبھی چین غسل خانہ میں رہ جاتی، کبھی تپائی پر رہ جاتی۔ جگا اٹھا کر دے دیتا لیکن اب تو ایسے نوکر آئے ہیں، کیا بتاؤں۔ میں نے سارے زیور اٹھا کر بینک میں رکھ دئے ہیں۔

متھرا سے پہلے ایک نوکر تھا، منسا نام کا۔ اوپر سے بڑا شریف۔ ایسا لگتا کہ اس کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔ پر ایک دن میں پچھواڑے کی طرف سے گھر آ رہی تھی تو کیا دیکھتی ہوں منسا چھت پر کھڑا ہے اور گلی میں کھڑے آدمی کو اوپر سے ایک ایک کر کے کپڑے پھینک رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں چمپت ہو گئے۔ منسا گلی میں کود گیا اور وہیں سے فرار ہو گیا۔ آج کل نوکر رکھنے کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ اگر گھر سے باہر جاؤ تو ڈر لگا رہتا ہے کہ غیر موجودگی میں نوکر گھر کی صفائی نہ کر جائے۔ جگا تھا تو مجھے بھی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔

۱۰/۸۰۸ ج، گولف اپارٹمنٹس، سجان سنگھ پارک، نئی دہلی

تو کچھ کھا بھی لو۔ تو تو کچھ بھی نہیں کھاتی۔ گرم چائے منگواؤں؟ اسے پھینکو دے یہ ٹھنڈی ہو گئی ہو گی۔ یہ کیک لے۔ بکری کا ہے لیکن اچھا ہے۔ کیک تو بناتی ہے کملا کی ساس، ایک سے بڑھ کر ایک۔ کبھی اس میں چاکلیٹ ڈالتی ہے کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ 'ونگر' سے لینے جاؤ تو جو کیک کمبخت اٹھارہ روپے میں بیچتے ہیں کملا کی ساس پانچ روپے میں بناتی ہے۔ بیچ میں انڈے بھی، دودھ چینی بھی، کشمش اور بادام بھی اور جانے کیا کیا۔

مجھ سے اپنی جان تو سنبھالی نہیں جاتی میں کیا کروں گی۔ کیک جگا بھی بہت اچھے بناتا تھا لیکن اس کی قسمت خراب تھی ورنہ آج تمہیں اسی کے ہاتھ کا بنا کیک کھلاتی۔ ہر تیسرے چوتھے دن کیک بناتا تھا لیکن خود کبھی نہیں کھاتا۔ میں اس سے کہتی "تو بھی ایک ٹکڑا کھالے۔" وہ کہتا —"بی بی جی یہاں کیک کھاؤں گا تو باہر مجھے کیک کون دے گا؟"

کسے معلوم تھا کہ یوں چلا جائے گا۔ میں تو اب بھی کہتی ہوں کہ بک دیتا تو بچ جاتا۔ پر اپنی اپنی قسمت ہے۔ کوئی کیا کرے۔ ان کے سامنے اس نے منہ ہی نہیں کھولا۔ انہیں بہت مانتا تھا۔ بولا اس لئے نہیں کہ ان کے دل کو ٹھیس پہنچے گی۔ اور کیا بات ہو سکتی تھی؟ اب اندر کی بات انہیں کیا معلوم؟ وہ تو میں جانتی تھی اس کے دل میں کیا تھا اس نے ہوا تک نہیں لگنے دی۔

آہستہ بول... دوپہر کے وقت کسی کو کیا معلوم، سویا آدمی تو مردہ کے برابر ہوتا ہے۔ ہمارے گھر میں تو اس وقت پرندے بھی نہیں اڑتے — کسی کو کیا خبر، گھر کے پچھواڑے میں کیا ہو رہا ہے؟ مجھ سے اپنی جان تو سنبھالی جاتی نہیں — بھگوان جھوٹ نہ بلوائے ایک دن دوپہر کو میں اٹھ کر غسل خانے کی طرف جا رہی تھی جب مجھے کھٹکا سا ہوا۔ مجھے لگا جیسے کوئی جگا کی کوٹھری کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے کیا خبر کون ہے، کون نہیں ہے — پھر بھی میرے اندر سے آواز آئی — اس وقت یہاں پر کون ہو سکتا ہے؟ جگا کو تو اس وقت یہ اپنے دفتر میں بلا لیتے ہیں۔ ان کے لئے چائے بناتا ہے، چپراسی گری کرتا ہے — یہ کہتے تھے کہ اگر گھر کے لئے کوئی دوسرا نوکر مل جائے تو جگا کو میں دفتر میں رکھ لوں گا۔ پھر اس وقت یہاں کون ہو سکتا ہے؟

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ ہائے یہ تو وکی ہے، میرا دیور۔ کالا سوٹ پہنے دبے پاؤں چلا جا رہا تھا۔ اور سیدھا جگا کی کوٹھری کے اندر چلا گیا — میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ہائے وکی یہ جگا کی کوٹھری میں کیا کرنے گیا ہے۔ پھر میں نے سوچا کسی کام سے آیا ہوگا — پر جگا کی کوٹھری میں اس کا کیا کام؟ اور یہ اتنا دبے پاؤں جا رہا ہے؟ دل میں آیا ابھی اسی سے جا کر پوچھوں — لیکن مجھ سے میری جان تو سنبھالی جاتی نہیں — لوٹ کر پھر سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ لیکن خیال میرا بار بار اسی طرف جاتا۔ بھلے مانس گھروں میں ایسا کام نہیں کرتے — جو ایسا کام کرنا ہے تو شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ کسی کا گھر کیوں خراب کرتا ہے؟

تم نے جگا کی گھر والی کو دیکھا تھا؟ بڑی بھولی اور پیاری سی لڑکی تھی۔ گوری اتنی کہ ہاتھ لگانے پر میلی ہو جائے — یہ کلموہا کسی بہانے دفتر سے بھاگ آتا اور اس کی کوٹھری میں جا گھستا تھا — اس دن میری نظر پڑ گئی — معصوم سی گاؤں کی لڑکی اس چنٹ کے سامنے کیا بولتی۔

اب ایسی باتیں چھپی تو نہیں رہ سکتی نا — ایک دن جگا نے ہی دیکھ لیا۔ انہوں نے تھرمس منگوانے کے لئے گھر بھیجا — میں نے اسے تھرمس دیا اور وہ اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا — اچانک میں نے کھڑکی کے باہر جھانک کر دیکھا — وکی وہی کالا سوٹ پہنے جگا کی کوٹھری سے باہر نکل رہا تھا — وکی بابو...... جگا نے کہا — پھر اس کا منہ جیسے بند ہو گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ادھر وکی اس کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے نکل گیا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے سوچا اب اس کی گھر والی کی خیر نہیں۔ یہ اسے دھن دے گا — کیا معلوم جان سے ہی مار ڈالے — ان لوگوں کا کچھ پتہ تھوڑے ہی لگتا ہے، پر کوٹھری کے اندر سے نہ ہوں منہ ہاں۔

میں نہیں جانتی جگا کتنی دیر تک اندر رہا — اس نے اپنی بیوی سے کچھ کہا یا نہیں — میں تو جا کر لیٹ گئی لیکن میں نے دل میں سوچا کہ آج رات ان سے بات کروں گی — یا تو جگا کو چلتا کریں یا اس سے کہیں کہ وہ اپنی بیوی کو گاؤں چھوڑ آئے — یہاں اس کا رہنا ٹھیک نہیں۔

لیٹے لیٹے بھی میرے کان کوٹھری کی طرف لگے رہے — ابھی وہاں سے رونے پیٹنے کی آواز آئے گی۔ لیکن وہ بالکل خاموش۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ ایسا شریف آدمی بھی کس کام کا جو اپنی گھر والی کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ دو طمانچے اس کے منہ پر لگاتا، وہ خود بخود سیدھے راستے پر آجاتی — دس طریقے ہیں عورت کو سیدھے راستے پر لانے کے — [illegible] ہوں منہ ہاں۔

پلنگ پر لیٹے لیٹے ہی مجھے ایسی گھبراہٹ [illegible] باتھ روم جانے کی حاجت ہو گئی — مجھے [illegible] بھی تو رہتا ہے نا — روز رات کو اسپغول کی [illegible] میں ڈال کر لیتی ہوں تب جا کر صبح پیٹ صاف ہوتا ہے — کبھی کبھی تو دل اتنا گھبراتا ہے کہ کیا بتاؤں — ایک بار پورے پانچ دن تک قبض رہا — یہ مذاق کرتے تھے — کہتے تھے کہ اب باتھ روم جاؤ گی تو باتھ روم صاف کرنا مشکل ہو جائے گا — ہائے اب تو ہنسا بھی نہیں جاتا — ہنستی ہوں تو سانس پھولنے لگتا ہے۔ مجھے بواسیر کی شکایت بھی تو رہتی ہے نا — یہاں ایک مصیبت تھوڑی ہی ہے — ایک نہیں بیسیوں دوائیاں کھا چکی ہوں۔

ڈاکٹر کہتا ہے چلا پھرا کرو — اب اس جسم کے ساتھ کون چل پھر سکتا ہے؟ تھوڑا سا بھی چلوں تو سانس پھولنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ "مٹھائی مت کھایا کرو۔" لیکن میرا ہاتھ رکتا ہی نہیں — گھر میں دو تین ڈبے مٹھائی کے ہر وقت موجود رہتے ہیں — برفی کا ٹکڑا منہ میں ڈالنے کی دیر ہے کہ پیٹ میں گڑگڑ ہونے لگتی ہے — ڈاکٹر کمبخت بار بار کہتا ہے کہ مٹھائی کھانا چھوڑ دو — پر ایک ٹکڑا بھی منہ میں نہ ڈالوں تو کیا جنگلوں میں جا بیٹھوں، دنیا سے پھر کیا لینا؟ میں ڈاکٹر سے کہتی ہوں۔ "ڈاکٹر جی مجھے بیٹھے بیٹھے ہی ٹھیک کر دو — نہ میری مٹھائی بند کرو نہ مجھے گھومنے کو کہو۔ اگر مجھے سیر کر کے ہی ٹھیک ہونا ہے تو تمہاری کیا ضرورت؟ جب آتے ہو پچاس روپے لے جاتے ہو۔ ہم تمہیں اتنے پیسے بھی دیں اور پھر بھی تم ٹھیک نہ کر سکو تو پھر فیس کس بات کی لیتے ہو؟ ہم مزدور کسان تھوڑے ہی ہیں کہ گھومتے پھریں۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا تو ڈاکٹر خود بخود سیدھا ہو گیا، کہنے لگا۔ "کوئی بات نہیں۔ کھانا کھانے کے بعد دو بڑا چمچہ اس دوا کی پی لیا کرو۔" میں نے کہا "اب آیا سیدھے راستے پر۔ اب دو چمچہ روز پی لیتی ہوں۔ ڈکار آنی تو بند ہو گئی ہے۔ پر کوئی بات ادھر ادھر کی ہو جائے اور دل گھبرانے لگے تو باتھ روم کی حاجت ہونے لگتی ہے۔ اس دن کلب میں گئی تو ہر چرن کی بیوی مہتو تو پر بڑا رعب دکھا رہی تھی۔ کہہ رہی تھی "میں سات گولیاں

بند کھلی ہوں گے؟" میں نے سنا اور چپ رہی۔ میں نے کہا "یہ بھی کوئی فکر کی بات ہے؟ بھگوان جھوٹ نہ بلوائے چند چھپے گولیاں بھی روز کھائی ہیں پر باہر جاکر اندر جھوٹا کہہ دیتا کہ دوائی کی چودہ گولیاں روز کھاتی ہوں۔ وہ آخر گھر کھا کھاتا ہے۔ تین سو روپے اسے بندھا بندھایا ہر ماہ دیتے ہیں، گھر میں کوئی بیمار ہو یا نہ ہو۔ ابھی بھی کھانے والی میز پر جاکر دیکھو کچھ نہیں تو دس دوائیوں کی شیشیاں رکھی ہوں گی، کچھ طاقت کی گولیاں، کچھ ہاضمے کی اور طرح طرح کی۔ جگا کو سب معلوم تھا کہ کون سی گولی مجھے کس وقت چاہئے۔ خود بخود لا کر دے دیا کرتا تھا۔ وہ گیا تو دوائی کا سارا سلسلہ ہی خراب ہو گیا..... تم کچھ لونا، تم تو کچھ بھی نہیں کھا رہی ہو۔

اس دن جو شام کو یہ گھر آئے تو آتے ہی کہنے لگے۔ "کہاں ہے جگا؟ اس سے کہو پانچ آدمی رات میں کھانا کھانے آئیں گے۔ اچھی ترکاری بنائے اور ساگ میٹ ضرور بنائے۔ جگا آیا تو گم سم ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ چہرہ ایسا پیلا جیسا مردے کا ہوتا ہے۔ انہوں نے بڑے پیار سے پوچھا۔ "کیوں جگا کیا بات ہے؟ اتنا چپ کیوں ہے؟ کیا گاؤں سے کوئی بری خبر آئی ہے؟" پر جگا چپ۔ نہ ہوں، نہ ہاں۔ انہیں کہتا بھی تو کیا؟ ان سے کیسے کہتا کہ آپ کا بھائی میری گھر والی سے منہ کالا کر رہا ہے۔ کوئی غیرت بھی تو ہوتی ہے۔ ان کے آگے تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ پر ان کے مزاج کو تو تم جانتی ہو بگڑ جائیں تو سخت بگڑتے ہیں۔

جب جگا کچھ نہیں بولا تو انہیں غصہ آگیا۔ جگا پتھر کی مورت بنا کھڑا تھا۔ پتہ نہیں اس کے دل میں کیا تھا۔ بول دیتا تو اس کے دل کا غبار تو نکل جاتا۔ مگر وہ چپ۔

یہ اسے ڈانٹنے لگے تو میں نے روک دیا۔ میں نے کہا۔ "جی مہمان آنے والے ہیں۔ ابھی سارا کام پڑا ہے۔ جا جگا تو باورچی خانہ میں چل"۔ وہ اسی طرح گم سم کچن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کچن میں گئی کہ کھانے والے کا دیکھوں تو وہ ویسے کا ویسا گم سم کھڑا تھا۔ کچن کے بیچ و بیچ پتھر کی مورت بنا ہوا۔ میں نے کہا، اس کی عقل جاتی رہی یہ کوئی کام نہیں کرپائے گا۔ میں انہیں قدموں لوٹ آئی۔ میں نے ان سے کہا "جی اسے تو کچھ ہو گیا ہے۔ یہ بولتا نہیں، مجھے تو ڈر لگتا ہے۔ تم باہر سے کھانا منگوا لو اور اسے آج کے دن چھٹی دے دو۔"

میں نے ان سے کہا تو یہ خود اٹھ کر کچن کی طرف چلے گئے اور جاتے ہی اسے چھٹی دینے کے اسے ڈانٹنے لگے۔ میں تھر تھر کانپنے لگی۔ کیا معلوم جگا نے کوئی چھرا چھپا رکھا ہو۔ ان لوگوں کا کیا بھروسہ؟ "بدذات بولتا کیوں نہیں؟" یہ ایسے چلائے کہ میں نے انہیں ایسے چلاتے کبھی نہیں سنا۔ میری تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے۔ میں کروں تو کیا کروں؟ میں دوڑ کر ان کے پاس گئی۔ میں نے سوچا انہیں کھینچ کر باہر لے آؤں گی۔ لیکن انہوں نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "کمینے میں بار بار پوچھ رہا ہوں، بتا کیا بات ہے اور تو بولتا تک نہیں۔ تیری زبان گھستی ہے مجھے جواب دینے میں۔ نکل جا یہاں سے ابھی، چلا جا۔ میری آنکھوں سے دور ہو جا۔" اور جگا کو کان سے پکڑ کر کچن سے باہر لے آئے۔ میں انہیں سمجھانے لگی۔ "کچھ نہ کہو جی۔ گھنٹے دو گھنٹے میں مہمان آنے والے ہیں اور ابھی تک کچھ بھی نہیں بنا۔ یہ چلا جائے گا تو کھانا کون بنائے گا۔ جا جگا جا۔ تو کچن میں جا۔" اور میں انہیں جیسے تیسے کھینچ لائی۔

رات کو جب مہمان چلے گئے..... ہاں جی بنایا، جگا نے سارا کھانا بنایا۔ بڑا اچھا کھانا بنایا لیکن رہا گم سم، منہ سے ایک لفظ نہیں بولا۔ کھانا کھاتے کھاتے ان کا دل بھی نرم پڑ گیا۔ مہمانوں کے سامنے ہی اس سے کہنے لگے۔ "جگا جا تیری دس روپے کی ترقی۔ رائے صاحب کہتے ہیں ساگ میٹ بہت اچھا بنا ہے۔ شاباش، جا تیرا قصور معاف کیا۔" یہ دینے پر آئیں تو منہ مانگی مراد پوری کرتے ہیں ان کا دل تو سمندر ہے۔

رات کو مجھ سے نہیں رہا گیا۔ میں نے کہا۔ "جی، وکی بڑا ہو گیا ہے۔ اب اس کی شادی کی فکر کرو۔" تو کہنے لگے "تمہیں اس کی شادی کی کیا پڑی ہے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ابھی تو اس کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔" میں نے کہا "جی، شادی نہیں کروگے تو کھونٹا توڑے سانڈ کی طرح جگہ جگہ منہ مارے گا۔" میں نے گول مول الفاظ میں کہا پر وکی سے انہیں بہت پیار ہے۔ اس کی اپنے بچے کی طرح انہوں نے پرورش کی۔ اس کی برائی یہ نہیں سن سکتے۔ میں نے پھر سے اس کی شادی کی بات چلائی تو کہنے لگے۔ "مارنے جتنا منہ مارتا ہے، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ دو دن ہنس کھیل لے۔ شادی کی ڈور سے تو ایک دن بندھ ہی جائے گا۔" میں نے کہا "جی جوان لڑکا ہے غلط راستے پر بھی پڑ سکتا ہے۔ اس کی تو جتنی جلد ہو سکے شادی کر دیں۔" اس پر کہنے لگے "ابھی تو اس نے پڑھائی بھی پوری نہیں کی۔ کچھ نہیں تو تیس چالیس ہزار اس کی پڑھائی پر خرچ کر چکا ہوں۔ اس کی شادی کروں تو کم سے کم یہ رقم تو وصول ہو اور ابھی اس نے بی اے پاس بھی نہیں کیا ہے۔"

مرد لوگ بڑے سمجھ دار ہوتے ہیں۔ انہیں تو دس باتوں کا خیال رہتا ہے۔ اب میں اور کیا کہتی؟ میں نے صرف اتنا کہا "آپ اس کے کان کھینچتے رہا کیجئے۔ جوانی بڑی مستانی ہوتی ہے۔" اس پر یہ بگڑ گئے۔ "تمہیں کچھ معلوم ہے کیا؟ بولتی کیوں نہیں؟" یہ اتنے خشک لہجے میں بولے کہ میں چپ ہو گئی۔ میں نے سوچا پھر کبھی موقع ملے گا تو بات کروں گی۔ انہیں آرام سے سمجھاؤں گی۔ پر مجھے کیا معلوم تھا کہ دوسرے ہی دن گل کھلنے والا ہے۔

دوسرے دن صبح میں پچھلے برآمدے میں بیٹھی بال سکھا رہی تھی، وہاں دھوپ اچھی پڑتی ہے۔ جگا کی گھر والی بہت پیار سے میرے بال سنوارتی تھی۔ میں نے سوچا بال سوکھ جائیں تو اسے بلالوں گی۔ یہی آٹھ ساڑھے آٹھ کا وقت ہوگا۔ اسی وقت فرنٹیر میل آتی ہے۔ گھر کے پچھواڑے تھوڑی دور پر ہی تو ریلوے لائن ہے۔ اگر گاڑیوں کو سگنل نہیں ملے تو یہیں پر رک جاتی ہے پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے۔ لیکن فرنٹیر میل یہاں نہیں رکتی۔ وہی ایک گاڑی ہے جو یہاں کھڑی نہیں ہوتی۔

جگا نے پہلے ہی سے سب کچھ سوچ رکھا ہوگا۔ ادھر سے گاڑی آئی تو جگا اپنی کوٹھری میں سے نکلا۔ میں نے کہا جگا، سرستا کو میرے پاس بھیج دے۔ لیکن مجھے لگا جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔ وہ دوڑ کر پچھواڑے کی دیوار کود گیا اور ریلوے لائن کی ڈھلان چڑھنے لگا۔ یہ سب پلک جھپکتے ہو گیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا ہی نہیں۔ میری بھی عقل ماری گئی۔ مجھے سوجھا ہی نہیں کہ وہ کیوں بھاگا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا کسی کام سے جا رہا ہوگا۔ گاڑی کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا ورنہ میں اسے روک نہیں لیتی۔ ڈھلان چڑھنے کے بعد میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کہاں گیا اور کس طرح گیا۔

جھوٹ کیوں بولوں شام کا وقت ہے۔ بس پھر مجھے وہ نظر نہیں آیا۔ مجھے تو اندیشہ تب بھی نہیں ہوا۔ جب گاڑی دھم دھم کرتی آئی اور کچھ دیر بعد پہیے گھسیٹتے رک گئی۔ پہیے گھسٹنے کی آواز آتی ہے نا جیسے کسی نے چین کھینچی ہو لیکن میں نے خیال نہیں کیا۔ یہاں روز گاڑیاں رکتی ہیں۔ میں نے سوچا کسی نے چین کھینچی ہوگی۔

تھوڑی دیر میں مالی بھاگا آیا کہنے لگا "کوئی حادثہ ہو گیا ہے" اور وہ بھی پچھواڑے کی دیوار کود کر ڈھلان چڑھنے لگا۔ مجھے پھر بھی شک نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر بعد پڑوس والے نوکر نے چلا کر کہا --- جگا مارا گیا ہے۔ جگا گاڑی کے نیچے کچلا گیا ہے۔

میرا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا۔ اس کے ساتھ لگاؤ تھا نا۔ وہ تو جیسے گھر کا فرد تھا کوئی غیر تھوڑے ہی تھا۔ یہ تو اس کے ساتھ بیٹے جیسا سلوک کرتے تھے۔ وہ بھی انہیں باپ کی طرح مانتا تھا۔ یہی چیز اسے اندر ہی اندر کھا گئی۔ میں تو اب بھی کہتی ہوں اگر جگا بول پڑتا تو بچ جاتا۔ یہ ضرور کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ نکالتے۔ یہ سب ترکیبیں جانتے ہیں، بڑے سمجھ دار ہیں۔ پر وہ بولا ہی نہیں۔

وہ دن تو ایسا برا گزرا کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ بار بار ٹیلی فون آتے۔ تین بار تو پولیس انسپکٹر آیا۔ بار بار انہیں بلاتا، بار بار کوٹھری میں جھانک کر دیکھتا۔ اندر بیٹھی تھی وہ بد چلن۔ جانچ کے بہانے انسپکٹر بار بار اندر آتے۔ مرد تو بھیڑیے کی طرح عورت کو گھورتے ہیں نا اور وہ اندر بے ہوش پڑی تھی۔ اسے بار بار غش آ رہا تھا۔ اب میں کس کام کی۔ مجھ سے اپنی جان تو سنبھالی جاتی نہیں۔ دو ایک بار دل میں آیا بھی کہ جاؤں۔ سرستا کو دیکھ آؤں لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ یہ کہنے لگے کہ قانون کا معاملہ ہے اس لیے دور ہی رہو۔ جب تک پولیس اپنی کارروائی نہ کر لے کوٹھری میں قدم نہیں رکھنا۔ مرد سمجھ دار ہوتے ہیں نا۔ انہوں نے دنیا دیکھی ہوتی ہے۔ پولیس نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔ "وہ پچھلے دن سے ہی پگلایا پگلایا سا لگ رہا تھا۔ میاں بیوی کی آپس میں کوئی بات ہوئی ہو تو ہم نہیں جانتے۔ نوکروں کے اندر کی باتوں سے مالکوں کا کیا کام!" ایک بار اندر آئے تو میں نے کہا۔ "جی، تم وکی کو کہیں باہر بھیج دو۔ میں کہوں انہیں معلوم نہیں پر آس پاس کے کسی آدمی کو معلوم ہوا تو مشکل آن پڑے گی۔" لیکن انہوں نے سمجھ داری کی، وکی کو باہر نہیں بھیجا۔ مرد لوگ سمجھ دار ہوتے ہیں۔ وکی لاپتہ ہو جاتا تو پولیس کو شک ہو سکتا تھا نا۔

ایک مٹھری اور لو۔ لو نا۔ تم نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ کھالو گی تو صحت بنی رہے گی۔ بس میری طرح موٹی مت ہونا۔ موٹا جسم کس کام کا۔ تم آ گئی تو گھنٹہ آدھا گھنٹہ دل بہل گیا۔ کبھی کبھی آ جایا کرو نا۔ تم دور تو نہیں رہتی ہو۔ کہو تو موٹر بھیج دیا کروں؟ اکیلے میں تو گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ یہ تو دفتر سے آ کر سیدھے برج کھیلنے چلے جاتے ہیں۔ جب تک تین چار گھنٹے برج نہ کھیل لیں انہیں چین نہیں ملتا۔ یہ تاش تو مری سوتن آئی ہے۔ اس گھر میں جب سے شادی کر کے آئی ہوں یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ روز شام کو انہیں اڑا لے جاتی ہے۔ ہائے۔ اب تو ہنس بھی نہیں سکتی۔ ہنستی ہوں تو سانس پھولنے لگتی ہے۔ چھاتی میں شاں شاں ہوتی ہے۔ میں ان سے کہوں کہ تم تاش بہت نہ کھیلا کرو جی۔ اپنی صحت کا بھی کچھ خیال کیا کرو۔ جانتی ہو کیا کہتے ہیں؟ کہنے لگے۔ "اسی تاش کے طفیل میں ہی تو میرے دس کام سنورتے ہیں۔ پولیس کا بڑا افسر تاش کا ساتھی تھا۔ تبھی تو جگا والا معاملہ اتنی آسانی سے رفع دفع ہو گیا۔ ورنہ گھر میں کوئی خودکشی کرے تو پولیس والے کیا گھر والوں کو پریشان نہیں کریں گے؟" میں نے کہا "ٹھیک ہے مرد لوگ جانیں، ہم کیا جانیں۔" بس وہی دن ہمارا برا گزرا۔ ان کو دن کے وقت سونے کی عادت ہے تھوڑا سو نہ لیں تو بدن بھاری بھاری محسوس کرتے ہیں۔ لیکن کوئی سونے دے تو۔ اس دن وہ بھی نہیں ہوا۔ سونے کے لئے بستر پر گئے تو کبھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگے تو کبھی کوئی سرکاری آدمی آ جائے۔ لیکن دوسرے دن سے سکون ہو گیا۔ پھر کوئی نہیں آیا۔

جب معاملہ رفع دفع ہو گیا تو ایک دن میں نے وکی کی ساری کرتوت انہیں بتائی۔ یہ کہنے لگے۔ "مجھے تو پہلے دن سے معلوم تھا۔" میں سکتے میں آ گئی۔ "جوانی میں سبھی بے وقوفیاں کرتے ہیں اگر اس نے بھی کر لی تو کیا ہوا۔" میں نے کہا۔ "جی، وکی کو سمجھا تو دیا ہوتا۔" کہنے لگے "کسی طوائف کے پاس تو نہیں گیا۔ کوئی بیماری تو نہیں لے آیا۔ ہو گئی بات جو ہونی تھی۔ آگے کے لئے خود ہوشیار ہو جائے گا۔" میں نے کہا "جی، پر بات تو اچھی نہیں نا۔ ایسا وکی کو کرنا تو نہیں چاہئے تھا نا۔ وکی نے اگر ایسا نہیں کیا ہوتا تو جگا جان پر تو نہیں کھیلتا۔" تو کہنے لگے۔ "تم کیا چاہتی ہو بھائی کو پولیس میں دے دیتا؟" "پر جی، اس نے جرم تو بہت بڑا کیا ہے نا۔" وہ بگڑ گئے۔ "اس کا جرم دیکھتا یا اس کی جان بچاتا؟ تم کیا چاہتی ہو اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈلوا دیتا۔"

پھر تھوڑی دیر بعد آہستہ سے بولے۔ مجھے سمجھانے لگے۔ "اول تو کون جانے وکی خود اندر گیا تھا یا جگا کی گھر والی ہی اشارہ کرتی رہی ہوگی۔ [illegible] سے تو نہیں بھتی۔ عورت [illegible] گمراہ ہوتا ہے۔ لڑکی اشارہ بھی کرے تو آدمی [illegible] ہے۔ کوٹھری کے باہر پردہ لگا رہتا ہے۔ کیا معلوم پیچھے کی آڑ میں وہ اسے اشارہ کرتی رہی ہو۔ [illegible] تو کیا مجال تھی کہ وکی اس کے کمرے میں جاتا۔ ایسے ہی کوئی کسی کے کمرے میں گھس جاتا ہے؟ اتنی ہی شریف تھی تو اندر سے کمرہ بند کر کے کیوں نہیں بیٹھتی تھی؟ اندر سے کنڈی لگا کر بیٹھتی۔ تیرا مرد باہر کام پر گیا اور تو کوٹھری میں اکیلی ہے۔ تو اندر سے کوٹھری بند کر کے بیٹھ۔ دروازہ کھول کر بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟ دن کے وقت تیرے پاس آ سکتی تھی کسی نے منع کیا تھا؟"

میں سنتی رہی۔ میں نے بھی سوچا کسی کے دل کی بات کون جانتا ہے۔ لڑکی کے دل میں چور تھا یا وکی کے دل میں، بھگوان جانے۔

آخر میں انہوں نے سارا معاملہ سنبھال لیا۔ ان سے سب مطمئن ہو گئے۔ جگا کا بھائی گاؤں سے آیا۔ بہت رویا گڑگڑایا۔ اسے انہوں نے دو سو روپے نکال کر دے دیئے۔ جگا کی گھر والی کا باپ آیا اسے بھی انہوں نے روپے دیئے۔ میں نے ان سے کہا "جی، معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے اب یہ ہمارے کیا لگتے ہیں، تم پیسے لٹا رہے ہو۔" یہ کہنے لگے۔ "جگا نے دس سال تک ہماری خدمت کی ہے اسے ہم کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔" پھر کہنے لگے "سو پچاس دے دو تو غریب کا منہ بند ہو جاتا ہے۔" یہ سب کا بھلا سوچتے ہیں، کسی کا برا نہیں سوچتے۔ ہر کسی کی مدد ہی کریں گے۔

یہ ذرا گھنٹی تو بجانا۔ کمبخت جانتے ہیں کہ شام ہو گئی ہے۔ مگر مجال ہے کہ خود آ کر بتی جلائے۔ بار بار گھنٹی بجانی پڑتی ہے۔ کانوں میں تیل ڈالے پڑے رہتے ہیں۔ اب آئی ہو تو کھانا کھا کر جانا۔ یہ جانے کب لوٹیں گے۔ کبھی دس بجے آتے ہیں تو کبھی کھانا کھا کر آتے ہیں۔ میں دن بھر اکیلی بیٹھی کوے اڑاتی رہتی ہوں۔ اب کھانا کھائے بغیر تو میں تمہیں جانے بھی نہیں دوں گی۔ تم آ گئی تو تھوڑی دیر دل بہل گیا۔ ہم نے اپنی باتیں تو ابھی تک کی ہی نہیں۔ دونوں بیٹھی باتیں کریں گے۔ تم نے ساگ میٹ کا پوچھا تو بیچ میں کمبخت جگا کی بات چل پڑی۔ میں تمہیں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔

☆☆

غلط فہمی

دوسرا ایکٹ

(سرائے کا ایک کمرہ۔ شام کا دھندلکا پھیل رہا ہے۔ جان کھڑکی سے باہر جھانک رہا ہے)

جان: ماریا ٹھیک کہتی تھی۔ شام کا یہ وقت بہت تکلیف دہ ہے۔ مجھے پتا نہیں کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی ہوگی۔ دوسرے ہوٹل کے کمرے میں کیا کر رہی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک کرسی میں دھنسی بیٹھی ہے۔ وہ چلا تو نہیں رہی ہے لیکن اس کا دل برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا ہے لیکن یہاں...... (کمرے میں چاروں طرف دیکھتا ہے) وحشت۔ اس قدر پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں جب انسان کوئی کام شروع کرتا ہے تو اسے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہئے۔ اسی کمرے میں سارا معاملہ طے ہو جائے گا۔

(دروازے پر زوردار دستک ہوتی ہے۔ مارتھا اندر داخل ہوتی ہے)

مارتھا: مجھے امید ہے کہ میں نے مداخلت نہیں کی ہے میں صرف تولیہ اور آپ کا جگ بدلنا چاہتی ہوں۔

جان: اوہ! میں سمجھ رہا تھا کہ یہ کام ہو گیا۔

مارتھا: نہیں، جو بوڑھا خادم کام کرتا ہے وہ اکثر ان چیزوں کو بھول جاتا ہے۔

جان: خیر تو یہ ضمنی باتیں ہیں...... لیکن میرے اندر یہ کہنے کی ہمت نہیں ہے کہ آپ کے آنے سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

مارتھا: کیوں؟

جان: میں یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتا لیکن شاید ہمارے معاہدے میں یہ بات بھی ہوئی ہے۔

مارتھا: جناب آپ کو عام آدمیوں کی طرح جواب نہیں دینا چاہئے۔ خصوصاً جب آپ ماحول کو اور خوشگوار بنانا چاہیں۔

جان: (مسکراتا ہوا) مجھے افسوس ہے کہ مجھے کچھ مشق کرنی پڑے گی۔ اس کے لئے آپ مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیجئے۔

مارتھا: (کمرے میں مشغول) ہاں یہی بات ہے۔ (جان مڑتا ہے اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگتا ہے۔ مارتھا اسے بہت غور سے دیکھتی ہے۔ اس کی پیٹھ اس کی طرف ہے۔ کام کرتے ہوئے وہ بولنا جاری رکھتی ہے) مجھے افسوس ہے صاحب یہ کمرہ آپ کی خواہش کے مطابق اتنا آرام دہ نہیں ہے۔

جان: کمرہ بہت صاف ستھرا ہے اور ایسے ہی آدمی چاہتا ہے۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو آپ نے اسے جلد ہی صاف کیا ہے۔

مارتھا: بالکل صحیح۔ لیکن آپ کو کیسے اندازہ ہوا۔

جان: بہت سی باتوں سے۔

مارتھا: ہمارے بہت سے مہمان اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ یہاں ٹونٹی سے پانی نہیں آتا۔ میں انہیں الزام بھی نہیں دیتی۔ اس کے علاوہ بستر کے اوپر لیمپ ہونا چاہئے تھا۔ بہت دنوں سے ہم اسے لگوانا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے یہ ایک بہت تکلیف کی بات ہوتی ہے جو بستر پر لیٹ کر پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں کہ اٹھ کر بجلی کی روشنی گل کریں۔

جان: (اس کی طرف مڑتے ہوئے) اچھا تو یہ بات ہے۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تاہم یہ کوئی بہت بڑی کمی نہیں ہے۔

مارتھا: آپ کی مہربانی کہ آپ اسے ایسے ہی پسند کرتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ ہمارے ہوٹل کی کمیوں سے آپ پریشان نہیں ہیں۔ اور شاید آپ اسے محسوس نہیں کرتے جتنا ہم اسے محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ایسے بھی لوگ آئے جو ان خامیوں کو دیکھ کر سیدھے یہاں سے واپس چلے گئے۔

جان: مجھے امید ہے کہ آپ مجھے ایک ایسا جملہ کہنے کی اجازت دیں گی جو ہمارے معاہدے میں شامل نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کی شخصیت بڑی عجیب و غریب ہے۔ ہوٹل کے مالکوں سے ایسی امید نہیں کی جاتی کہ وہ اپنے کمروں کی خامیوں کو بتلائیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کی خواہش ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔

مارتھا: نہیں میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی (اچانک کچھ فیصلہ کرتے ہوئے) لیکن یہ حقیقت ہے کہ میری ماں اور میں خود بھی آپ کو یہاں رکھنے میں پس و پیش میں ہیں۔

جان: میں بھی کہنا چاہوں گا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے آپ دونوں مجھے یہاں رکھنے کے لئے آمادہ نہیں

ہیں۔ لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ کیوں؟ آپ کو میرے دولت مند ہونے پر شبہ نہیں ہونا چاہئے اور نہ میں نے آپ کو کوئی ایسا ثبوت دیا جس سے آپ یہ سمجھیں کہ میرے ضمیر میں چور ہے۔

مارتھا: یقیناً نہیں۔ اگر آپ جاننا ہی چاہتے ہیں تو سنئیے۔ آپ ہم دونوں کو کہیں سے مجرم نہیں نظر آتے بلکہ اس کے برخلاف آپ نے جو اثر چھوڑا ہے وہ بہت زیادہ معصومیت کا ہے۔ آپ جو سوچ رہے ہیں۔ ہماری فکر اس سے بہت مختلف ہے۔ ہم لوگ اس دھندے کو بہت جلد چھوڑنا چاہتے ہیں۔ روز اسے بند کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں اور اس میں کوئی دشواری بھی نہیں ہے۔ یہاں مہمان بہت کم آتے ہیں۔ لیکن ہم کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر پائے ہیں۔ صرف آپ کے آنے سے یہ احساس ہوا کہ ہم اس کام کو ختم کرنے کے ارادے کو ترک کر چکے ہیں۔

جان: کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھے یہاں سے جاتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں۔

مارتھا: جیسا کہ میں نے کہا کہ میں فیصلہ نہیں کر سکی جب کہ یہاں ہر چیز میری مرضی پر منحصر ہے اور اس سلسلے میں میں نے ابھی اپنا ذہن نہیں بدلا ہے۔

جان: یہ آپ یاد رکھئے۔ میں آپ پر بوجھ نہیں بننا چاہتا اور جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی کروں گا تاہم اپنی طرف سے یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر میں یہاں ایک دو دن ٹھہر سکوں تو میرے لئے بہتر ہوگا۔ میں یہاں سے جانے سے پہلے کچھ مسائل حل کرنا چاہتا ہوں اور میں نے یہاں اس کے لئے ضروری سکون اور خاموشی پایا ہے۔

مارتھا: میں آپ کی خواہش کا احترام کرتی ہوں اور اگر آپ چاہتے ہیں تو اس بات پر غور کروں گی۔ (تھوڑی خاموشی، وہ اپنا قدم دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھاتی ہے) کیا میں سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ یہاں سے اپنے اسی ملک واپس جائیں گے جہاں سے آئے ہیں۔

جان: ہاں اگر ضروری ہوا۔

مارتھا: کیا وہ بہت خوبصورت علاقہ ہے کیا ایسا نہیں ہے؟

جان: (کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے) ہاں بہت خوبصورت علاقہ ہے۔

مارتھا: کیا یہ سچ ہے کہ وہاں دور دور تک ساحل پھیلا ہوا ہے جہاں ایک آدمی بھی نظر نہیں آتا۔

جان: بالکل سچ وہاں کوئی ایسی علامت نہیں ملتی جس سے معلوم ہو کہ انسان بھی رہتے ہوں کبھی کبھی صبح سویرے چڑیوں کے پیر کے نشان بالو پر مل جاتے ہیں۔ یہی یہاں زندگی کی نشانی کا پتا دیتے ہیں اور شام کے وقت......

مارتھا: (ہلکے سے) ہاں وہاں شام کیسی ہوتی ہے؟

جان: بہت خوبصورت بہت رنگین۔ بہت خوبصورت علاقہ ہے۔

مارتھا: (بالکل ایک نئے انداز میں) میں نے اس کے بارے میں بار بار سوچا ہے۔ سیاحوں نے مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے اور جہاں تک ممکن ہوا ہے میں نے اس کے بارے میں پڑھا بھی ہے اور اکثر یہاں سے سخت اور ظالم بہار کے دنوں میں میں نے وہاں کے سمندروں اور پھولوں کا تصور کیا ہے۔ (تھوڑی سی خاموشی کے بعد بہت دبی اور غمگین آواز) اور جو کچھ بھی وہاں کے بارے میں میں تصور کر سکتی ہوں۔ اس کی وجہ سے آس پاس کی فضاسے میں بے بہرہ ہو جاتی ہوں۔

(کچھ دیر غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جان اس کی طرف رخ کر کے بیٹھ جاتا ہے)

جان: میں تمہارے خیالات اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ وہاں کا موسم بہار تمہیں مسحور کر دیتا ہے۔ وہاں ہزاروں کی تعداد میں پھول کھلتے ہیں۔ سفید دیواروں کے اوپر اگر تم ان پہاڑیوں پر سیر کرو ایک گھنٹہ یا اس سے زیادہ جو میرے شہر کے پاس ہیں تو تمہارے کپڑے پیلے گلابوں کی میٹھی اور بھینی مہک سے معطر ہو جائیں گے۔

(مارتھا بھی بیٹھ جاتی ہے)

مارتھا: وہ کلی خوبصورت اور پر فضا جگہ ہوگی۔ جس چیز کو ہم یہاں بہار کا نام دیتے ہیں وہ تو چند دنوں کے عرصے میں ایک پھول اور چند کلیوں کے کھلنے کا نام ہے (طنز کے ساتھ) اور بہار کی اس علامت کو بھی دیکھ کر یہاں کے لوگوں کا دل خوش ہو جاتا ہے جن کے دل بھی اتنے ہی پژمردہ ہوتے ہیں جتنے کہ یہ گلاب کا درخت۔ ذرا سی خوش گوار ہوا ان کے دلوں کو نرم کر دیتی ہے۔ جیسے لوگ ہیں ویسے ہی انہیں بہار کا موسم بھی ملتا ہے۔

جان: تم انصاف سے کام نہیں لے رہی ہو یہاں خزاں بھی تو آتی ہے۔

مارتھا: موسم خزاں کیسا ہوتا ہے۔

جان: بہار کا دوسرا موسم جب ہر کلی پھول بن جاتی ہے۔ (وہ اس کی طرف دلچسپی سے دیکھتا ہے) شاید کچھ دلوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی محنت سے ان کی مدد کریں تو ان کی پژمردگی دور ہو جائے گی اور وہ کھل اٹھیں گے۔

مارتھا: میرے نزدیک اب اس خشک یورپ کی کوئی وقعت نہیں ہے جہاں خزاں بہار کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور بہار سے غربت کی مہک آتی ہے۔ نہیں میں ان زمینوں کے تصور میں کھو جانا چاہتی ہوں جہاں موسم گرماں میں شعلے لپٹتے ہیں جہاں سردیوں میں بارش سے سیلاب آجاتا ہے اور جہاں...... چیزیں جیسی ہیں ویسی نظر آتی ہیں۔ (خاموشی۔ جان اسے دلچسپی سے گھورتا ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتی ہے اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔)

مارتھا: تم میری طرف اس طرح سے گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو۔

جان: چونکہ ہم نے پہلی بار بات کرنے کا وہ روایتی انداز ختم کیا ہے تو میں تم کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے تم مجھ سے پہلی بار انسانی احساس کے ساتھ بات کر رہی ہو۔

مارتھا: (غصے سے) اس بارے میں یقین سے مت سوچو اور اگر انسانی لہجے میں بات کر بھی رہی تھی تو

تمہارے لئے یہاں رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے
جسے تم انسانی جذبے کا نام دے رہے ہو وہ میرا
کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میرے اندر جو کچھ بھی
انسانی صفت بچی ہے وہ ہے جسے میں چاہتی ہوں اور
جو چاہتی ہوں اسے حاصل کرنے کے لئے میں کسی
چیز سے لگاؤ نہیں پیدا کر سکتی۔ میں اپنی راہ میں
آنے والی ہر رکاوٹ کو ٹھوکروں سے دور کر دیتی
ہوں۔

جان: میں تمہارے اندر کی اس شدت پسندی کو سمجھ رہا ہوں۔ اس سے مجھے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری راہ کا کوئی پتھر نہیں ہوں اور نہ ہی تمہاری پسند سے اختلاف کرنے کا کوئی میرا مقصد ہے۔

ملو تھیا: اختلاف کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے اور نہ ہی ان اختلافات کو بڑھاوا دینے کا کوئی جواز ہے جو اس حد تک بڑھ جائیں۔

جان: اتنا یقین کہ میں انہیں بڑھاوا نہیں دوں گا؟

ملو تھیا: میرا ذہن مجھ سے یہ کہہ رہا ہے ساتھ ہی میری خواہش بھی کہ تمہیں اس منصوبے سے دور رکھوں۔

جان: اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنے روایتی انداز پر واپس آ گئے ہیں۔

ملو تھیا: ہاں! اور اس سے ہٹ کر ہم نے غلطی کی تھی۔ تم خود بھی ایسا سمجھ سکتے ہو۔ اب مجھے اس بات کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرنا باقی رہ گیا ہے کہ جس ملک میں تم رہتے ہو اس کے بارے میں تم نے مجھے بتایا اور مجھے تمہارا قیمتی وقت ضائع کرنے کا افسوس ہے۔ (وہ باہر جانے کے لئے دروازے تک جاتی ہے) تاہم میں تمہیں بتا دوں کہ وقت کا زیاں نہیں ہوا ہے۔ ہماری بات چیت سے میرے اندر وہ خواہش پھر بیدار ہو گئی ہے جو ختم ہو رہی تھی اور اگر تم نے یہاں رہنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو انجانے میں تمہاری فتح ہو گئی ہے۔ جب میں اس کمرے میں داخل ہوئی تھی تو میں فیصلہ کر کے آئی تھی کہ تم سے کمرا چھوڑنے کے لئے کہوں لیکن تم نے میرے اندر کے انسانی جذبات کو ابھار دیا۔ مجھے امید ہے کہ تم اب یہاں قیام کرو گے اور اس سے میرے اندر سمندر اور سورج کی تمازت کی خواہش کو اور تقویت ملے گی۔

(وہ اس کی طرف خاموشی سے بغور دیکھتا ہے)

جان: (سوچتے ہوئے) تمہارا بات کرنے کا انداز بہت نرالا ہے۔ تاہم اگر تمہیں اور تمہاری ماں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہیں قیام کروں گا۔

ملو تھیا: میری ماں کی قوت ارادی مجھ سے بھی زیادہ کمزور ہے لہٰذا ایسا ہونا بھی چاہئے نہ تو وہ ان سمندروں کے بارے میں سوچتی ہے اور نہ ان تنہا ساحلوں کے بارے میں جس سے وہ تمہارے وہاں قیام کی ضرورتوں کو محسوس کر سکے اس لیے تمہارے یہاں رکنے کے بارے میں اس کا کوئی خاص نظریہ نہیں ہے اور نہ ہی میری مخالفت کرنے کا کوئی جواز ہے۔ اس سے معاملہ طے ہو جائے گا۔

جان: میں اگر سمجھنے میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو تم مجھے ایک تو اپنے مالی فائدے کے لئے روکنا چاہتی ہو دوسری بغیر کسی سبب کے۔

ملو تھیا: ایک سیاح اس سے زیادہ کیا امید کر سکتا ہے لیکن تم نے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں سچائی ہے۔

(وہ دروازہ کھولتی ہے)

جان: میرا خیال ہے مجھے اس سے خوش ہونا چاہئے تاہم اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں تو مجھے یہاں کی ہر چیز بڑی عجیب و غریب لگتی ہے۔ یہاں کے لوگ بھی اور بولنے کا انداز اور خود یہ گھر بھی حیرتناک ہے۔

ملو تھیا: شاید ایسا اس لئے بھی ہے کہ تم خود یہاں عجیب و غریب انداز اختیار کر رہے ہو۔

(وہ باہر جاتی ہے)

جان: (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) شاید وہ ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے حیرت ہے (بستر تک جاتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے) سچ پوچھئے کہ جو واحد خواہش اس لڑکی نے میرے اندر پیدا کی ہے وہ یہ ہے کہ میں یہاں سے فوراً چلا جاؤں بلکہ ماریا اور اپنی خوشیوں کی دنیا میں واپس لوٹ جاؤں۔ میں یہاں بے وقوفی کی حد تک کر رہا۔ میرا یہاں کیا کام ہے؟ — نہیں یہاں آنے کی خاص وجہ ہے میری ماں اور میری بہن کے لئے خصوصی ذمہ داریاں ہیں۔ میں نے انہیں بہت دنوں تک نظر انداز کیا ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری نہیں کہ میں اس بات کا اعلان کر دوں کہ میں کیا ہوں بلکہ ضروری یہ ہے کہ اپنے کو ایسا بنا کر پیش کروں کہ لوگ مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ (وہ کھڑا ہو جاتا ہے) ہاں یہی وہ کمرہ ہے جہاں ہر چیز کا فیصلہ ہو جائے گا۔ ویسے یہ کمرہ بہت ٹھنڈا ہے اور میں اس میں کچھ بھی نہیں پہچان پا رہا ہوں۔ یہاں کی ہر چیز بدل گئی ہے اور شاید یہ ان تجارتی ہوٹلوں میں سے سونے کا ایک کمرہ بن گیا ہے۔ جہاں لوگ گزرتے ہوئے ایک رات کو سونے کے لئے ٹھہرتے ہیں۔ میں نے بھی ایسے بہت سے کمروں کا تجربہ کیا ہے۔ میں یہ سوچا کرتا تھا کہ کوئی ایسی بات ہے جو لوگ کہنا چاہتے ہیں جیسے کوئی خبر ہو یا اطلاع۔ شاید مجھے بھی آج ہی کی رات جواب مل جائے۔

(وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے) میں دیکھ رہا ہوں کہ بادل چھا رہے ہیں۔ ہوٹل کے سونے کے کمرے میں ایسا ہی نظر آتا ہے اور تنہا آدمی کے لئے شام بہت بھیانک ہوتی ہے۔ میں اسے دوبارہ محسوس کر رہا ہوں۔ وہ بے نام بے چینی جو میں پرانے دنوں میں محسوس کیا کرتا تھا۔ یہاں اپنے سینے کی خالی جگہوں میں۔ ایک خالی جگہ کی طرح جہاں معمولی سی حرکت بھی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کیا ہوتی ہے۔ یہ خوف ہے ہمیشہ ہمیشہ کی تنہائی کا خوف۔ اس بات کا خوف کہ اس کا کوئی جواب نہیں اور پھر ہوٹل کے بیڈ روم میں جواب دینے کے لئے کون آئے گا۔

(وہ گھنٹی کے پاس جاتا ہے) کچھ ہچکچانے کے بعد گھنٹی کے پش سوئچ پر انگلی رکھ دیتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی رہتی ہے پھر کسی کے آنے کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ دروازے پر تھپ تھپاہٹ ہوتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے۔ وہ بوڑھا خادم دروازے کی دہلیز پر

ساکت کھڑا ہے)

جان: نہیں، کچھ نہیں مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پریشان کیا۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ گھنٹی کام کر رہی ہے یا نہیں۔ (بوڑھا آدمی اسے گھور کر دیکھتا ہے اور دروازہ بند کر لیتا ہے اس کے واپس جانے کے قدموں کی آواز آتی ہے)

جان: گھنٹی تو بولتی ہے لیکن یہ آدمی نہیں بولتا، یہ کوئی جواب نہیں ہوا (وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہے) بادل اب بھی جمع ہو رہے ہیں۔ اندھیرے کا وہ ٹھوس گولا جو پھٹ کر زمین پر گر جائے۔ میں کیا کروں کون صحیح ہے۔ مارتھا یا میرے خواب۔

(دروازے پر دوبارہ دستک ہوتی ہے مارتھا ٹرے لے کر اندر داخل ہوتی ہے)

جان: یہ کیا ہے؟

مارتھا: آپ نے چائے کا آرڈر دیا تھا۔

جان: نہیں میں نے کسی چیز کا آرڈر نہیں دیا تھا۔

مارتھا: اس بوڑھے آدمی نے شاید غلط سنا۔ وہ اکثر غلط سن لیتا ہے۔ چونکہ چائے آگئی ہے میرا خیال ہے آپ اسے پی لیں گے۔ (وہ ٹرے کو میز پر رکھتی ہے۔ جان عجیب وغریب اشارہ کرتا ہے) پریشان مت ہو اس کی قیمت بل میں نہیں جوڑی جائے گی۔

جان: نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم میرے لئے چائے لائیں شکریہ۔

مارتھا: نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنے فائدے کے لئے کرتے ہیں۔

جان: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے طے کر لیا ہے کہ مجھے کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دوگی۔ لیکن یہ سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ اس معاملے میں تمہارا کیا فائدہ ہے۔

مارتھا: نہیں اس سے فائدہ ہوتا ہے آپ یقین کیجئے کبھی کبھی ایک پیالی چائے کی وجہ سے ہی ہمارے مہمان یہاں رہ جاتے ہیں۔ (وہ باہر جاتی ہے۔ جان پیالی اٹھاتا ہے۔ اسے غور سے دیکھتا ہے اور رکھ دیتا ہے)

جان: اس طرح تمام نہاد بیٹے کی دعوت جاری ہے۔ پہلے بیئر کا ایک گلاس پھر قیمت کے عوض پھر چائے کی پیالی۔ کیونکہ اس سے اکثر مہمان رک جاتے ہیں۔ لیکن ساری غلطی میری ہی ہے کیونکہ میں سیدھی طرح سے بات نہیں کر سکا۔ جب میرے سامنے وہ لڑکی آتی ہے اور بہت ہی جان لیوا صفائی سے بات کرتی ہے تو اس وقت میں ان لفظوں کو تلاش کرنے لگتا ہوں جس سے ہمارے اور اس کے درمیان مکالمہ صحیح طریقے سے ادا ہو سکے۔ یقیناً ایسے میں لفظوں کو تلاش کرنا جن سے منہ پھٹ طریقے سے جواب دیا جا سکے آسان ہے۔ ان لفظوں کے جن سے دوستی قائم ہو سکے مشکل ہے۔

(وہ پیالی اٹھاتا ہے۔ خاموش ہو جاتا ہے اور پھر دھیمی آواز میں بات جاری رکھتا ہے)

اے میرے خدا مجھے قوت دے کہ میں صحیح لفظوں کا انتخاب کر سکوں یا مجھے ان کوششوں کو چھوڑنے کی قوت دے تاکہ میں ماریا کی آغوش میں لوٹ جاؤں۔ یا خدا پھر مجھے قوت دے میں جو فیصلہ کروں اس پر قائم رہوں۔ (وہ پیالی کو اپنے ہونٹوں سے لگاتا ہے) اولاد کے لوٹنے کی دعوت میں یہی کر سکتا ہوں کہ میں چائے کو عزت کے ساتھ پیوں تاکہ جب لوٹوں تو اپنا کام پورا کر چکوں (وہ پیتا ہے دروازے پر زوردار دستک ہوتی ہے) کون ہے؟

(دروازہ کھلتا ہے۔ ماں داخل ہوتی ہے)

ماں: آپ کو تکلیف دیتے ہوئے مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ لیکن میری لڑکی نے بتایا وہ آپ کے لئے چائے لائی ہے۔

جان: ہاں یہ ہے۔

ماں: کیا آپ نے پی لی۔

جان: ہاں آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟

ماں: معاف کیجئے میں ٹرے لینے آئی تھی۔

جان: (مسکراتے ہوئے) مجھے افسوس ہے کہ اس چائے کی وجہ سے اتنی پریشانی ہو گئی۔

ماں: نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ یہ چائے آپ کے لئے نہیں تھی۔

جان: تو اب صاف ہوا یہ میرے آرڈر کے بغیر لائی گئی تھی۔

ماں: (تھکی ہوئی) ہاں یہ بات ہوئی۔ بہرحال ... چلئے کوئی اہم بات نہیں آپ نے اسے پی لیا ... پی۔

جان: (پریشان سے لہجے میں) ہاں مجھے بہت افسوس ہے لیکن آپ کی لڑکی نے اسے یہاں چھوڑنے پر اصرار کیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا......

ماں: مجھے افسوس ہے۔ اس کے لئے آپ افسوس نہ کیجئے (وہ پیالی اور طشتری ٹرے میں رکھتی ہے اور دروازے کی طرف چلی جاتی ہے)

جان: میڈم۔

ماں: ہاں

جان: میں ایک بار پھر آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں رات کا کھانا کھانے کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن میں کمرے کا کرایہ پوری رات کا دوں گا۔ (وہ اس کی طرف خاموشی سے دیکھتی ہے) میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ مجھے حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ لیکن یہ نہ سوچئے کہ میرے اچانک ارادہ تبدیل کرنے کی آپ ذمہ دار ہیں۔ میں آپ کی بہت زیادہ عزت اور تکریم کرتا ہوں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں یہاں آرام نہیں محسوس کر رہا ہوں اس لئے رات میں یہاں نہیں گزاروں گا۔

ماں: بالکل ٹھیک جناب جو آپ کی طبیعت چاہے وہ آپ کریں لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت سے رات کے کھانے کے وقت تک آپ کا فیصلہ بدل جائے کبھی کبھار لوگ جذباتی طور پر اچانک فیصلہ کر بیٹھتے ہیں۔ لیکن بعد میں وہ انہیں چیزوں کے عادی ہو جاتے ہیں۔

جان: مجھے شبہ ہے میڈم۔ تاہم میں یہ نہیں چاہوں گا کہ آپ کو اس طرح کا کوئی خیال آئے کہ میں یہاں سے یا آپ کے سلوک سے مطمئن نہیں ہوں گا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ [illegible] آپ نے خیر مقدم کیا [illegible] مجھے [illegible]

ماں: جیسا ہو فطری بھی تھا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کی طرف سے یہاں کا کوئی خیال لانے کا میرے پاس کوئی جواز ممکن ہے۔

جان: (بستر پر بیٹھتے ہوئے) کافی جاتے ہوئے شکریہ ادا کرنے ایسا ہی ہے۔ لیکن میں نے آپ سے اپنے جانے کی اطلاع اس لئے دی کہ میں تعلقات اچھے بنا کر یہاں سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے میں پھر واپس آؤں۔ میں پھر واپس آؤں گا۔ اس وقت حالات بہتر ہو جائیں گے۔ تب ہمیں ایک دوسرے سے مل کر خوشی بھی ہو گی لیکن اس وقت مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے غلطی کی۔ مجھے یہاں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو عجیب سا لگے لیکن مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ مکان میرے لئے نہیں ہے۔

ماں: میں آپ سے متفق ہوں۔ میں سمجھ رہی ہوں جو آپ کہنا چاہتے ہیں لیکن عام طور پر لوگوں کے دلوں میں یہ احساس یہاں آتے ہی پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ اس معاملے میں بہت دیر سے جاگے۔

جان: ہاں آپ صحیح کہتی ہیں لیکن اصل میں میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ میں ضروری کام کے سلسلے میں یورپ آیا۔ بہت سالوں کے بعد اپنے ملک واپس آ کر عجیب سا لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری باتیں سمجھ رہی ہیں۔

ماں: ہاں میں سمجھ رہی ہوں لیکن میری خواہش یہ تھی کہ چیزیں آپ کے مطابق ہو جاتیں۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

جان: ہاں وہ سب تو آپ نے کیا ہے۔ تاہم یقین ہے۔

ماں: پھر بھی میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں نے وہ سب کچھ کیا ہے جس سے آپ یہاں میرے ساتھ رہ سکیں۔

جان: ہاں آپ نے بہت کیا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہی بات تو ہے کہ میرے یہاں آنے کے بعد آپ وہ پہلے شخص ہیں جس سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ کوئی [illegible] بات ہے کہ آنے والی [illegible]

ہو جائے شاید اس کے لئے میں خود ہی ذمہ دار ہوں کہ میں کچھ قدم نہیں اٹھا سکا۔

ماں: زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کبھی کبھی تشریحات بہت بڑی ہوتی ہے اور اس کے لئے کوئی کچھ کر بھی نہیں سکتا لیکن جو کچھ ہوا ہے اس سے مجھے بھی پریشانی ہوتی ہے۔ لیکن تب میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتی ہوں کہ اسے اہمیت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

جان: یہی بات ہے کہ آپ میری پریشانیوں کو سمجھ رہی ہیں اور اس میں برابر کی شریک ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ آپ کے اس سلوک کی وجہ سے کتنا اثر پڑا ہے۔ اور میں اس کی اتنی قدر کرتا ہوں۔ (وہ اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتا ہے) دراصل میں.....

ماں: جسے آپ میرا سلوک کہہ رہے ہیں وہ تو فطری بات ہے۔ یہ تو ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ مہمانوں کی خواہش کے مطابق سہولت دیں۔

جان: (مایوسی کے لہجہ میں) ہاں ایسا ہے۔ (تھوڑی دیر کی خاموشی) بات کا لب لباب یہ کہ میں آپ سے معافی مانگوں اور کچھ معاوضہ دوں۔ (وہ اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھتا ہے اور تھکا ہوا نظر آتا ہے اور بات کرنے میں مشکل نظر آ رہی ہے) آپ نے کمرہ درست کرنے میں کچھ خرچ کیا ہو گا اس لئے آپ کے لئے مناسب ہو گا.....

ماں: ہم نے اتنی ہی تیاری کی جتنی ان حالات میں ہمیشہ کرتے ہیں اور ہمارا کوئی خرچ بھی نہیں ہوا اس لئے معاوضے کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ کے فیصلہ نہ لے پانے پر افسوس ہے اور یہ افسوس بھی اپنے لئے نہیں بلکہ تمہاری ہی وجہ سے ہے۔

جان: (میز پر جھکتا ہوا) کوئی بات نہیں۔ اچھی بات تو یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے بھی لگے ہیں۔ میں یہاں سے جانے سے پہلے اپنا کوئی خراب تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا اور اس گھر کو بھی کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ جب بھی کسی اچھے موڈ میں یہاں آؤں گا تو شاید اسے چاہنے بھی لگوں۔

(وہ بغیر کچھ بولے ہوئے دروازے تک جاتی ہے)

جان: میں چاہوں گا..... معاف کریں میں سفر سے تھک گیا ہوں۔ (بستر پر بیٹھتا ہے) تاہم میں چائے کے لئے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی جان جائیں کہ جب میں اس گھر سے جاؤں تو کوئی مجھے اجنبی نہ سمجھے۔

ماں: جناب ہم نے آپ کے لئے بہت کچھ نہیں کیا۔ نہ یہ سمجھئے کہ اس چائے کے بارے میں ہمارا آپ سے کوئی اختلاف ہوا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ آپ کے لئے نہیں تھی۔ غلطی سے کوئی بات ہو جائے تو اس کے لئے شکریہ ادا کرنا اور پریشانی کی بات ہو جاتی ہے۔ (وہ باہر جاتی ہے)

(جان اسے باہر جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ ہلنے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسا کہ ان حالات میں ہوتا ہے وہ ہل نہیں پا رہا ہے۔ پھر تکیے پر کہنی رکھ کر لیٹ جاتا ہے ایسا لگتا ہے کہ اس نے اپنے کو اسی حالت میں چھوڑ دیا ہے)

جان: ہاں مجھے اسے سیدھے سادے اور آسان طریقے سے حل کرنا ہو گا۔ کل میں یہاں ماریا کے ساتھ آؤں گا ان سے کہوں گا یہ میں ہوں۔ مجھے خوشی دینے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ مجھے لگتا ہے کہ ماریا ٹھیک کہتی ہے۔

(وہ ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور پیچھے تکیے کی ٹیک لگاتا ہے) مجھے یہ شام محسوس نہیں ہو رہی بلکہ ہر چیز بہت دور ہو گئی ہے۔

(تھوڑی دیر اونگھنے کے بعد جان سو جاتا ہے۔ کمرے میں مکمل اندھیرا طاری رہتا ہے۔ لمبی خاموشی کے بعد دروازہ کھلتا ہے۔ دو عورتیں لیمپ لئے اندر داخل ہوتی ہیں)

مارتھا: (اس سوتے ہوئے آدمی کو غور سے روشنی میں دیکھتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں) سب ٹھیک ہے۔

ماں: (دھیمی آواز میں پھر آواز تیز کرتے ہوئے) نہیں مارتھا تم نے اس کام کے لئے مجھے مجبور کیا۔ مجھے

پسند نہیں۔ تم نے زبردستی مجھے اس کام میں کھینچا ہے اور تم نے شروع بھی اس انداز میں کیا کہ میرے لئے پیچھے ہٹنے کا کوئی راستہ نہ رہ جائے۔ میرے نہ چاہنے کے باوجود تمہارا اس طرح مجبور کرنا قطعی پسند نہیں۔

مارتھا: یہی وہ راستہ ہے جو ہر چیز کو آسان کر دیتا ہے۔ اگر آپ نے اپنی ناراضی کا کوئی ٹھوس جواز دیا ہوتا تو میں اس پر غور کرنے کے لئے مجبور ہوتی لیکن چونکہ آپ کوئی فیصلہ خود سے نہیں کر سکیں میرے لئے یہ مناسب تھا کہ پہل کرتے ہوئے آپ کی مدد کروں۔

ماں: مجھے معلوم ہے کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ آدمی یا دوسرا آدمی، آج یا کچھ دنوں کے بعد، آج کی رات یا کل، یہ ہونا ہی تھا تاہم میں اس کے بارے میں بہت خوش نہیں ہوں۔

مارتھا: چھوڑئے ماں کل کے بارے میں سوچئے۔ آج کی رات کے خاتمے سے ہماری آزادی کی شروعات ہوگی۔ (وہ جان کے کوٹ کا بٹن کھولتی ہے۔ اُس کا پرس نکالتی ہے اور نوٹوں کو گنتی ہے)

ماں: وہ کتنی گہری نیند سو رہا ہے۔

مارتھا: وہ اسی طرح سو رہا ہے جیسے سب سوئے تھے۔ اب ہمیں شروعات کرنی چاہئے۔

ماں: تھوڑا اور انتظار کر لیں۔ یہ کتنی عجیب بات لگتی ہے کہ یہ معصوم لوگ جب سوتے ہیں تو کتنے مجبور اور بے چارے لگتے ہیں۔

مارتھا: یہ وہ آرام ہے جو وہ کرتے ہیں۔ وہ بیوقوف بننے سے پہلے کا آرام ہے۔

ماں: (کچھ سوچتے ہوئے) نہیں، مرد اتنے عجیب نہیں ہوتے جتنا تم سوچتی ہو اور سونے میں بدل بھی نہیں جاتے۔ یہ ہم ہیں جو انہیں مختلف نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کے چہرے کا اچانک نظر آنے والا ننگا پن جس پر کوئی چمک نہ ہو یا ناراضگی کے آثار نہ ہوں، ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن مارتھا تم یہ نہ سمجھ سکتیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔

مارتھا: ماں میں نہیں جانتی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ ہم وقت برباد کر رہے ہیں۔

ماں: (بہت تھکے لیکن استہزا کے انداز میں) ایسی بھی کوئی جلدی نہیں ہے بلکہ یہی وہ وقت ہے جب ہم آرام کر سکتے ہیں کیونکہ اصلی کام تو پورا ہو گیا۔ یہ کام نہیں ہے جس کی اہمیت ہے بلکہ کام تو کرنے کا عمل ہے جو اہم ہے۔ ایک بات جب شروع ہونے کے بعد مکمل کیا جاتا ہے پھر ذہنی سکون واپس آجاتا ہے۔ تم اپنے کو اتنا تھکا کیوں رہی ہو۔ کیا یہ اس قدر تھکان کے لائق ہے۔

مارتھا: جب تک آدمی اس کے بارے میں بات کرتا ہے تو کوئی خاص بات نہیں ہوتی بہتر یہ ہے کہ ہاتھ میں جو کام ہے اسے پورا کیا جائے۔ اپنے سے کوئی سوال نہیں کیا جائے۔

ماں: (سکون سے) مارتھا اب ہم لوگ بیٹھ جائیں۔

مارتھا: یہاں؟ اس کے بغل میں؟

ماں: کیوں نہیں؟ وہ اب ایسی نیند سو گیا ہے جو اسے بہت دور تک لے جائے گی۔ اب اس کے جاگنے کا کوئی سوال نہیں۔ وہ اٹھ کر یہ پوچھے یہاں کیا کر رہے ہیں۔ جہاں تک دنیا کا سوال ہے یہ اس دروازے پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم لوگوں کو جو سانس لینے کا موقع ملا اس سے سکون کے ساتھ کیوں نہ لطف اندوز ہوں۔

مارتھا: آپ مذاق کر رہی ہیں۔ اب میری باری ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے آپ کے بات کرنے کا انداز پسند نہیں آیا۔

ماں: نہیں، تم غلط سمجھیں۔ میں تم سے بالکل مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ میں صرف تم سے سکون کی بات کر رہی ہوں جب کہ تم میں تناؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ نہیں مارتھا بیٹھ جاؤ۔ (وہ عجیب طرح سے ہنستی ہے) اس آدمی کی طرف دیکھو جو اپنی نیند میں زیادہ معصوم نظر آرہا ہے۔ بہ نسبت اپنی باتوں کے اور کچھ بھی ہو وہ اب اس دنیا سے گزر چکا۔ اب اس لمحہ کے بعد اس کے لئے ہر چیز آسان ہو جائے گی۔ وہ خوابوں بھری نیند سے نکل کر خوابوں سے عاری نیند میں پہنچ گیا ہے۔ جو دوسرے لوگوں کے لئے ظلم کی بات ہوگی، اس کے لئے ایک طویل آرام ہے۔

مارتھا: معصوم لوگوں کو وہی نیند ملتی ہے جس کا تقاضہ ان کی معصومیت کرتی ہے۔ اس سے نفرت کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ میں خوش ہوں کہ یہ ہر تکلیف سے نجات پا گیا۔ لیکن اس کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں اس کی طرف دیکھوں۔ میرے خیال میں آپ کے لئے بھی یہ بری بات ہے کہ آپ اس آدمی کو گھور کر دیکھیں۔ جسے آپ کو اٹھا کر لے جانا ہے۔

ماں: (اپنا سر ہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں) جب وقت آئے گا ہم اسے اٹھا کر لے جائیں گے۔ لیکن ابھی اس کے لئے کافی وقت ہے اور یہ کوئی بری بات نہیں۔ اس شخص کے لئے بھی نہیں۔ اگر ہم اس کی طرف غور سے دیکھیں کیونکہ ابھی بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ نیند موت نہیں ہے۔ ہاں مارتھا اس کی طرف دیکھو وہ ایک ایسے لمحے سے گزر رہا ہے جب اپنے مقدر کے بارے میں وہ کچھ نہیں کر سکتا، جب اس کی زندگی کی امید اجنبی ہاتھوں میں پڑ گئی ہو۔ یہ ہاتھ وہیں ہیں، جہاں ہیں، ہماری گود میں، بس صبح تک اور یہ جانے بغیر کچھ نئی زندگی میں داخل ہو چکا ہوگا۔ لیکن اگر یہ ہاتھ اس کی طرف بڑھتے ہیں اور اس کے ٹخنوں کو جکڑ لیتے ہیں تو شاید ہمیشہ کے لئے کسی پوشیدہ قبر میں سو جائیں۔

مارتھا: (اچانک کھڑی ہوتی ہوئی) یہ آپ بول رہی ہیں کہ ہر رات کی سحر ہوتی ہے اور اس سے پہلے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے پہلے ہم اس کی جیب میں پڑے کاغذات کی جانچ پڑتال کریں گے پھر اسے نیچے لے جائیں گے پھر ہمیں ساری روشنیاں گل کرنی پڑے گی پھر دروازے سے اس کی اس وقت تک نگرانی کریں گے جب تک اس کی ضرورت ہوگی۔

ماں: ہاں! ہمیں بہت کچھ کرنا ہے اور ہمیں ہمارا اصطبل ان سے مختلف ہوجاتا ہے۔ کم از کم وہ اپنی زندگی کے بوجھ سے آزاد ہو گیا۔ کام جو کرتے ہیں ان کی طرح پھر تھکی تھکاوٹ اور سبھی پریشانیوں سے وہ نجات حاصل کر چکا ان کے کاندھوں سے وہ صلیب اٹھالی گئی ہے۔ اندرونی زندگی کی وہ صلیب جو نہ آرام لینے دیتی نہ تھکن سے بیٹھنے دیتی اس لئے وہ اب آپ سے کچھ کشید نہیں کر رہا ہے اور میں جو تھکی اور بوڑھی ہوں میں یہ سوچتی ہوں کہ اسی کیفیت میں مسرت پنہاں ہے۔

مارتھا: اب ہمارے پاس یہ سوچنے کے لئے وقت نہیں ہے کہ خوشی کہاں اور کیسے ملتی ہے۔ جب میں اس کی ضرورت کے حساب سے نگرانی کر چکی ہوں تو بھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ پہلے ہمیں ندی تک جانا ہوگا اور یہ یقینی بنانا ہوگا کہ اس کے کنارے کوئی شرابی وحشت تو نہیں پڑا ہے۔ پھر اسے وہاں بہت تیزی سے پہنچانا ہوگا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کتنا دشوار کام ہے۔ اسے ہمیں کئی مرحلوں میں کرنا ہوگا اور ایک بار ندی کے کنارے پہنچنے پر اسے ندی کے تیز دھارے میں پھینکنا ہوگا۔ میں آپ کو یاد دلادوں کہ یہ رات ہمیشہ کے لئے نہیں ہے۔

ماں: ہاں وہ سارے کام کرنے ہیں جو باقی ہیں اور ان کے بارے میں صرف سوچ کر مجھے ابھی سے تھکان آرہی ہے۔ وہ تھکان جو اتنے دنوں سے چلی آرہی تھی کہ اب میرا خون بھی ان پر جینے کے قابل نہیں رہ گیا۔ اس دوران یہ آدمی جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو گیا ہے وہ اپنی غفلت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اگر ہم کسی صورت اسے بیدار کر دیں تو اسے اپنی زندگی از سر نو شروع کرنی پڑے گی جیسا کہ میں نے اسے دیکھا ہے میں جانتی ہوں یہ بھی عام انسانوں کی طرح ہے اور سکون سے نہیں رہ سکتا شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں اسے وہاں لے جانا ہے اور اسے گہرے پانی کے رحم و کرم پر چھوڑنا ہے (وہ گہری سانس لیتی ہے) لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ کسی آدمی کو اس کی حماقتوں سے نجات دلانے کے لئے اور اسے سکون عطا کرنے کے لئے اتنی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔

مارتھا: ماں میں صرف یہ سوچ سکتی ہوں کہ تمہارا دماغ بھٹک رہا ہے۔ میں پھر کہتی ہوں کہ ہمیں بہت سا کام کرنا ہے لیکن اسے ندی میں پھینکنے کے بعد ہمیں ساحل سے اس کا نشان مٹانا پڑے گا۔ راستے میں اپنے قدموں کا نشان مٹانا پڑے گا۔ اس کے کپڑوں کو اور سامان کو ختم کرنا پڑے گا اور اس کی ہر نشانی کو زمین سے مٹانی پڑے گی۔ وقت گزر رہا ہے۔ جلدی ہی اتنی دیر ہو جائے گی کہ ان سارے کاموں کو سکون کے ساتھ انجام دینا ناممکن ہو جائے گا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کو کیا ہو رہا ہے۔ اس آدمی کے بستر کے کنارے بیٹھ کر آپ اسے گھور رہی ہیں گرچہ اس کی شکل آپ کو نظر نہیں آرہی ہے اور اپنی اول جلول باتوں میں لگی ہیں۔

ماں: مجھے بتاؤ مارتھا کیا تم جانتی تھیں کہ اس شام کو وہ یہاں سے جانے والا تھا۔

مارتھا: نہیں میں نہیں جانتی تھی۔ اور اگر میں جانتی بھی تو اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں نے اس کام کو کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ماں: اس نے مجھ سے بھی یہ بات کہی تھی اور مجھ سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔

مارتھا: تو تم نے اس سے بات بھی کی تھی۔

ماں: ہاں جب تم نے مجھے بتایا کہ تم نے اس کو چائے پہنچائی ہے۔ میں یہاں آئی میں اسے چائے پینے سے منع کر دیتی اگر اتنا وقت ہوتا۔ لیکن میں نے یہ حالات پر چھوڑ دیا۔

مارتھا: اگر تم اب بھی یہی محسوس کر رہی ہو تو یہاں بات کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کرسی سے اٹھو اور مجھے اپنا کام ختم کرنے دو جو مجھے اب مضمحل کر رہا ہے۔

ماں: (کھڑے ہوتے ہوئے) ہاں میرا خیال ہے تمہاری مدد کرتے ہوئے میں ختم ہو جاؤں تم صرف چند منٹ کی مہلت اس بوڑھی عورت کو دے دو جس کے خون میں تمہارے جیسی روانی نہیں رہ گئی ہے۔ تم صبح سے ہی بہت تیزی سے کام کرتی رہی ہو۔ تم امید کرتی ہو کہ میں بھی قدم بقدم تمہارا ساتھ دوں۔ تمہاری تیز رفتاری کا مقابلہ تو یہ شخص بھی نہیں کر سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرہ چھوڑنے کا فیصلہ کرتا وہ تمہاری دی ہوئی چائے پی چکا تھا۔

مارتھا: اگر تم جاننا ہی چاہتی ہو تو سنو اسی شخص نے میرے ذہن کو اس کام کے لئے تیار کیا تھا۔ تم نے مجھ سے اس کی ڈھل مل یقینی کا ذکر کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ان ملکوں کا ذکر چھیڑ دیا جہاں جانے کی ایک عرصے سے میری تمنا ہے اس نے میری آرزوؤں کو جگا کر میرے دل کو اس کے لئے پتھر بنا دیا۔ معصومیت کا انعام اسی طرح ملتا ہے۔

ماں: اس کے باوجود بھی وہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ مکان اس کا اپنا گھر نہیں ہے۔

مارتھا: (بے چینی کے ساتھ غصے میں) بیشک یہ اس کا گھر نہیں ہے، نہ ہی کسی اور کا گھر ہے اور کسی بھی شخص کو اس مکان میں نہ سکون ملے گا نہ آرام اور نہ گرم جوشی۔ اگر اسے اس بات کا احساس جلد ہو گیا ہوتا تو شاید اس کی زندگی بچ جاتی اور شاید ہم لوگوں کو بھی بچا دیتا۔ ہم اسے یہ سبق سکھانے کی زحمت سے بھی بچ جاتے کہ یہ کمرہ صرف سونے کے لئے بنا ہے اور دنیا مرنے کے لئے۔ اٹھو تیار ہو جاؤ اور خدا کے لئے جسے تم اکثر یاد کرتی ہو۔ ہمیں یہ کام پورا کر لینے دو۔

ماں: (ماں بستر کی طرف ایک قدم بڑھاتی ہے) ٹھیک ہے مارتھا ہم شروع کرتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے اندر یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ کل کا سورج ہمارے لئے کبھی نہیں نکلے گا۔

(پردہ گرتا ہے)

(جاری)

پسند نہیں۔ تم نے زبردستی مجھے اس کام میں کھینچا ہے اور تم نے شروع بھی اس انداز میں کیا کہ میرے لئے پیچھے ہٹنے کا کوئی راستہ نہ رہ جائے۔ میرے نہ چاہنے کے باوجود تمہارا اس طرح مجبور کرنا قطعی پسند نہیں۔

مارتھا: یہی وہ راستہ ہے جو ہر چیز کو آسان کر دیتا ہے۔ اگر آپ نے اپنی ناراضگی کا کوئی ٹھوس جواز دیا ہوتا تو میں اس پر غور کرنے کے لئے مجبور ہوتی لیکن چونکہ آپ کوئی فیصلہ خود سے نہیں کر سکیں میرے لئے یہ مناسب تھا کہ پہل کرتے ہوئے آپ کی مدد کروں۔

ماں: مجھے معلوم ہے کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ آدمی یا دوسرا آدمی، آج یا کچھ دنوں کے بعد، آج کی رات یا کل، یہ ہونا ہی تھا تاہم میں اس کے بارے میں بہت خوش نہیں ہوں۔

مارتھا: چھوڑئے ماں کل کے بارے میں سوچنے۔ آج کی رات کے خاتمے سے ہماری آزادی کی شروعات ہوگی۔ (وہ جان کے کوٹ کا بٹن کھولتی ہے۔ اُس کا پرس نکالتی ہے اور نوٹوں کو گنتی ہے)

ماں: وہ کتنی گہری نیند سو رہا ہے۔

مارتھا: وہ اسی طرح سو رہا ہے جیسے سب سوئے تھے۔ اب ہمیں شروعات کرنی چاہئے۔

ماں: تھوڑا اور انتظار کرلیں۔ یہ کتنی عجیب بات لگتی ہے کہ یہ معصوم لوگ جب سوتے ہیں تو کتنے مجبور اور بے چارے لگتے ہیں۔

مارتھا: یہ وہ آرام ہے جو وہ کرتے ہیں۔ وہ بیوقوف بننے سے پہلے کا آرام ہے۔

ماں: (کچھ سوچتے ہوئے) نہیں، مرد اتنے عجیب نہیں ہوتے جتنا تم سوچتی ہو اور سونے میں بدل بھی نہیں جاتے۔ یہ ہم ہیں جو انہیں مختلف نظروں سے دیکھتے ہیں اور ان کے چہرے کا اچانک نظر آنے والا ننگا پن جس پر کوئی چمک نہ ہو یا نار اضگی کے آثار نہ ہوں، ہمیں حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ لیکن مارتھا تم یہ نہ سمجھ سکتیں کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔

مارتھا: ماں میں نہیں جانتی لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ ہم وقت برباد کر رہے ہیں۔

ماں: (بہت تھکے لیکن استہزا کے انداز میں) ایسی بھی کوئی جلدی نہیں ہے بلکہ یہی وہ وقت ہے جب ہم آرام کر سکتے ہیں کیونکہ اصلی کام تو پورا ہو گیا۔ یہ کام نہیں ہے جس کی اہمیت ہے بلکہ کام تو کرنے کا عمل ہے جو اہم ہے۔ ایک بات جب شروع ہونے کے بعد مکمل کیا جاتا ہے پھر دماغی سکون واپس آجاتا ہے۔ تم اپنے کو اتنا تھکا کیوں رہی ہو۔ کیا یہ اس قدر تھکان کے لائق ہے۔

مارتھا: جب تک آدمی اس کے بارے میں بات کرتا ہے تو کوئی خاص بات نہیں ہوتی بہتر یہ ہے کہ ہاتھ میں جو کام ہے اسے پورا کیا جائے۔ اپنے سے کوئی سوال نہیں کیا جائے۔

ماں: (سکون سے) مارتھا اب ہم لوگ بیٹھ جائیں۔

مارتھا: یہاں؟ اس کے بغل میں؟

ماں: کیوں نہیں؟ وہ اب ایسی نیند سو گیا ہے جو اسے بہت دور تک لے جائے گی۔ اب اس کے جاگنے کا کوئی سوال نہیں۔ وہ اٹھ کر یہ پوچھے یہاں کیا کر رہے ہیں۔ جہاں تک دنیا کا سوال ہے یہ اس دروازے پر آکر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ہم لوگوں کو جو سانس لینے کا موقع ملا اس سے سکون کے ساتھ کیوں نہ لطف اندوز ہوں۔

مارتھا: آپ مذاق کر رہی ہیں۔ اب میری باری ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے آپ کے بات کرنے کا انداز پسند نہیں آیا۔

ماں: نہیں، تم غلط سمجھیں۔ میں تم سے بالکل مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ میں صرف تم سے سکون کی بات کر رہی ہوں جب کہ تم میں تناؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ نہیں مارتھا بیٹھ جاؤ۔ (وہ عجیب طرح سے ہنستی ہے) اس آدمی کی طرف دیکھو جو اپنی نیند میں زیادہ معصوم نظر آرہا ہے۔ بہ نسبت اپنی باتوں کے اور کچھ بھی ہو وہ اب اس دنیا سے گزر چکا۔ اب اس کے بعد اس کے لئے ہر چیز آسان ہو جائے گی۔ وہ خوابوں بھری نیند سے نکل کر خوابوں سے عاری نیند میں پہنچ گیا ہے۔ جو دوسروں کے لئے ظلم کی بات ہوگی، اس کے لئے ایک خوبی کی بات ہے۔

مارتھا: معصوم لوگوں کو وہی نیند ملتی ہے جس کا تقاضا ان کی معصومیت کرتی ہے۔ اس سے نفرت کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے۔ میں خوش ہوں کہ یہ ہر تکلیف سے نجات پا گیا۔ لیکن اس کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں اس کی طرف دیکھوں۔ میرے خیال میں آپ کے لئے بھی یہ بری بات ہے کہ آپ اس آدمی کو گھور کر دیکھیں۔ جسے آپ کو اٹھا کر لے جانا ہے۔

ماں: (اپنا سر ہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں) جب وقت آئے گا ہم اسے اٹھا کر لے جائیں گے۔ لیکن ابھی اس کے لئے کافی وقت ہے اور یہ کوئی بری بات نہیں۔ اس شخص کے لئے بھی نہیں۔ اگر ہم اس کی طرف غور سے دیکھیں کیونکہ ابھی بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ نیند موت نہیں ہے۔ ہاں مارتھا اس کی طرف دیکھو وہ ایک ایسے لمحے سے گزر رہا ہے جب اپنے مقدر کے بارے میں وہ کچھ نہیں کر سکتا، جب اس کی زندگی کی امید اجنبی ہاتھوں میں پڑ گئی ہو۔ یہ ہاتھ وہیں ہیں، جہاں ہیں، ہماری گود میں، بس صبح تک اور یہ جانے بغیر کچھ نئی زندگی میں داخل ہو چکا ہوگا۔ لیکن اگر یہ ہاتھ اس کی طرف بڑھتے ہیں اور اس کے ٹخنوں کو جکڑ لیتے ہیں تو شاید ہمیشہ کے لئے کسی پوشیدہ قبر میں سو جائیں۔

مارتھا: (اچانک کھڑی ہوتی ہوئی) یہ آپ بول رہی ہیں کہ ہر رات کی سحر ہوتی ہے اور اس سے پہلے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے پہلے ہم اس کی جیب میں پڑے کاغذات کی جانچ پڑتال کریں گے پھر اسے نیچے لے جائیں گے پھر ہمیں ساری روشنیاں گل کرنی پڑے گی پھر دروازے سے اس کی اس وقت تک نگرانی کریں گے جب تک اس کی ضرورت ہوگی۔

ماں: ہاں ہمیں بہت کچھ کرنا ہے اور ہمیں ہمارا مستقبل ان سے مختلف ہو جاتا ہے۔ کم از کم وہ اپنی زندگی کے لئے تو آزاد ہو گیا۔ کام جو کرنے ہیں ان کی فہرست بہت لمبی ہے اور ابھی پریشانیوں سے وہ نجات حاصل کر چکا ان کے کاندھوں سے وہ صلیب اتار لی گئی ہے۔ اندرونی زندگی کی وہ صلیب جو نہ آرام لینے دیتی نہ شکن سے بیٹھنے دیتی اس لئے وہ اپنے آپ سے کچھ کشید نہیں کر رہا ہے اور میں جو تھکی اور بوڑھی ہوں میں یہ سوچتی ہوں کہ اسی کیفیت میں مسرت پنہاں ہے۔

مارتھا: اب ہمارے پاس یہ سوچنے کے لئے وقت نہیں ہے کہ خوشی کہاں اور کیسے ملتی ہے۔ جب میں اس کی ضرورت کے حساب سے نگرانی کر چکی ہوں تو بھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہوگا۔ پہلے ہمیں ندی تک جانا ہوگا اور یہ یقینی بنانا ہوگا کہ اس کے کنارے کوئی شرابی وحشت تو نہیں پڑا ہے۔ پھر اسے وہاں بہت تیزی سے پہنچانا ہوگا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کتنا دشوار کام ہے۔ اسے ہمیں کئی مرحلوں میں کرنا ہوگا اور ایک بار ندی کے کنارے پہنچنے پر اسے ندی کے تیز دھارے میں پھینکنا ہوگا۔ میں آپ کو یاد دلادوں کہ یہ رات ہمیشہ کے لئے نہیں ہے۔

ماں: ہاں وہ سارے کام کرنے ہیں جو باقی ہیں اور ان کے بارے میں صرف سوچ کر مجھے ابھی سے تھکان آ رہی ہے۔ وہ تھکان جو اتنے دنوں سے چلی آ رہی تھی کہ اب میرا خون بھی ان پر ہنسنے کے قابل نہیں رہ گیا۔ اس دوران یہ آدمی جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو گیا ہے وہ اپنی غفلت سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اگر ہم کسی صورت اسے بیدار کر دیں تو اسے اپنی زندگی از سر نو شروع کرنی پڑے گی جیسا کہ میں نے اسے دیکھا ہے میں جانتی ہوں یہ بھی عام انسانوں کی طرح ہے اور سکون سے نہیں رہ سکتا شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں اسے وہاں لے جانا ہے اور اسے گہرے پانی کے رحم و کرم پر چھوڑنا ہے (وہ گہری سانس لیتی ہے) لیکن یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ کسی آدمی کو اس کی حماقتوں سے نجات دلانے کے لئے اور اسے سکون عطا کرنے کے لئے اتنی زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔

مارتھا: ماں میں صرف یہ سوچ سکتی ہوں کہ تمہارا دماغ بہک رہا ہے۔ میں پھر کہتی ہوں کہ ہمیں بہت سا کام کرنا ہے۔ ایک بار اسے ندی میں پھینکنے کے بعد ہمیں ساحل سے اس کا نشان مٹانا پڑے گا۔ راستے میں اپنے قدموں کا نشان مٹانا پڑے گا۔ اس کے کپڑوں کو اور سامان کو ختم کرنا پڑے گا اور اس کی ہر نشانی کو زمین سے مٹانی پڑے گی۔ وقت گزر رہا ہے۔ جلدی ہی اتنی دیر ہو جائے گی کہ ان سارے کاموں کو سکون کے ساتھ انجام دینا ناممکن ہو جائے گا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کو کیا ہو رہا ہے۔ اس آدمی کے بستر کے کنارے بیٹھ کر آپ اسے گھور رہی ہیں گرچہ اس کی شکل آپ کو نظر نہیں آ رہی ہے اور اپنی اول جلول باتوں میں لگی ہیں۔

ماں: مجھے بتاؤ مارتھا کیا تم جانتی تھیں کہ اس شام کو وہ یہاں سے جانے والا تھا۔

مارتھا: نہیں میں نہیں جانتی تھی۔ اور اگر میں جانتی بھی تو اس سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ میں نے اس کام کو کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ماں: اس نے مجھ سے بھی یہ بات کہی تھی اور مجھ سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔

مارتھا: تو تم نے اس سے بات بھی کی تھی۔

ماں: ہاں جب تم نے مجھے بتایا کہ تم نے اس کو چائے پہنچائی ہے۔ میں یہاں آئی میں اسے چائے پینے سے منع کر دیتی اگر اتنا وقت ہوتا۔ لیکن میں نے یہ حالات پر چھوڑ دیا۔

مارتھا: اگر تم اب بھی یہی محسوس کر رہی ہو تو یہاں بات کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کرسی سے اٹھو اور مجھے اپنا کام ختم کرنے دو جو مجھے اب مشتعل کر رہا ہے۔

ماں: (کھڑے ہوتے ہوئے) ہاں میرا خیال ہے تمہاری مدد کرتے ہوئے میں ختم ہو جاؤں تم صرف چند منٹ کی مہلت اس بوڑھی عورت کو دے دو جس کے خون میں تمہارے جیسی روانی نہیں رہ گئی ہے۔ تم صبح سے ہی بہت تیزی سے کام کرتی رہی ہو۔ تم امید کرتی ہو کہ میں بھی قدم بقدم تمہارا ساتھ دوں۔ تمہاری تیز رفتاری کا مقابلہ تو یہ شخص بھی نہیں کر سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرہ چھوڑنے کا فیصلہ کرتا وہ تمہاری دی ہوئی چائے پی چکا تھا۔

مارتھا: اگر تم جاننا ہی چاہتی ہو تو سنو اسی شخص نے میرے ذہن کو اس کام کے لئے تیار کیا تھا۔ تم نے مجھ سے اس کی ڈھلمل یقینی کا ذکر کیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ان ملکوں کا ذکر چھیڑ دیا جہاں جانے کی ایک عرصے سے میری تمنا ہے اس نے میری آرزوؤں کو جگا کر میرے دل کو اس کے لئے پتھر بنا دیا۔ معصومیت کا انعام اسی طرح ملتا ہے۔

ماں: اس کے باوجود بھی وہ سمجھ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ مکان اس کا اپنا گھر نہیں ہے۔

مارتھا: (بے چینی کے ساتھ غصے میں) بیشک یہ اس کا گھر نہیں ہے، نہ ہی کسی اور کا گھر ہے اور کسی بھی شخص کو اس مکان میں نہ سکون ملے گا نہ آرام اور نہ گرم جوشی۔ اگر اسے اس بات کا احساس جلد ہو گیا ہوتا تو شاید اس کی زندگی بچ جاتی اور شاید ہم لوگوں کو بھی بچا دیتا۔ ہم اسے یہ سبق سکھانے کی زحمت سے بھی بچ جاتے کہ یہ کمرہ صرف سونے کے لئے بنا ہے اور دنیا مرنے کے لئے۔ اٹھو تیار ہو جاؤ اور خدا کے لئے جسے تم اکثر یاد کرتی ہو۔ ہمیں یہ کام پورا کر لینے دو۔

ماں: (ماں بستر کی طرف ایک قدم بڑھاتی ہے) ٹھیک ہے مارتھا ہم شروع کرتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں میرے اندر یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ کل کا سورج ہمارے لئے کبھی نہیں نکلے گا۔

(پردہ گرتا ہے)

(جاری)

تبصرے

نام کتاب : چراغ نوا

شاعر : رئیس نعمانی

قیمت : ۳۰؍روپے

ملنے کا پتہ : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

رئیس نعمانی اپنی فارسی دانی کے لحاظ سے ہندستان کے چند لوگوں میں سے ایک ہیں۔ اس دور میں جب کہ فارسی کا چلن چلاؤ ہے، وہ فارسی کے صاحب دیوان شاعر ہیں، وہ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں سے یکساں طور پر استفادہ کرتے ہیں۔

شعری مجموعہ 'چراغ نوا' کی ابتدا دو حمد سے ہوئی ہے، اس کے بعد پندرہ نعتیں ہیں اور اس کے بعد کعب بن زہیر کا مشہور تاریخی قصیدہ "بانت سعاد" ہے، جسے انہوں نے آں حضورؐ کے حضور پیش کیا۔ آپؐ اسے سن کر اس قدر غیر معمولی طور پر خوش ہوئے کہ بطور انعام اپنی چادر انہیں پیش کردی۔ صرف یہی چیز اس قصیدہ کی عظمت ور فعت کے لئے کافی ہے۔ اسی وقت سے اس قصیدہ کو "قصیدۂ بردہ" کہا جاتا ہے۔ میری اپنی رائے میں قصیدہ بردہ کا منظوم ترجمہ اس مجموعہ کی جان ہے۔ چونکہ میں عربی کا طالب علم ہوں اس لئے پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نعمانی صاحب نے پورے طور سے قصیدہ کے اندر کار فرما جذبات واحساسات کو سمجھ کر اسے اپنے شعری قالب میں منتقل کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کامیابی انہیں اس لئے ملی ہے کہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے عربی داں بھی ہیں۔ وہ ندوۃ العلما کے فارغ التحصیل ہیں۔ میں عربی کے ساتھ ساتھ نعمانی صاحب کے تراجم پڑھ رہا تھا تو محسوس ہوا کہ انہوں نے الفاظ اور تراکیب کے انتخاب میں بڑی ریاضت سے کام لیا ہے۔ ان کی ہر شعر کے ساتھ یہ کوشش رہی ہے کہ شاعر کے مفہوم کی بھرپور ترجمانی ہو اور ترجمہ سے شاعری اور نغمگی ہرگز متاثر نہ ہونے پائے۔ پڑھتے ہوئے محسوس ہی نہیں ہوتا کہ یہ منظوم ترجمہ ہے۔ میری اپنی دسترس کی حد تک غالباً یہ قصیدہ بردہ کے منظوم ترجمہ کی اولین کوشش ہے۔

'چراغ نوا' میں پندرہ نعتیں ہیں۔ یہ اپنے اسلوب، الفاظ وتراکیب اور طرز ادائیگی کے لحاظ سے بھرپور ہیں۔ پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر پوری طرح محبت رسول میں غرق ہے۔ محبت رسولؐ اس کے یہاں جزو ایمان ہے۔ چند اشعار سے نعمانی صاحب کی نعتیہ شاعری اور ذات نبی کریمؐ سے گہرے تعلق کا پتہ لگایا جاسکتا ہے:

اے ہوا یاد رہے تجھ کو وصیت میری
خاک اڑ کر مری آقا کے گھر تک پہنچے

خاک طیبہ اترے ذروں سے عقیدت ہے مجھے
کس لئے میری نظر لعل وگہر تک پہنچے

یہ عزو جاہ زمانہ ہے سب فریب نگاہ
بس ان کے در کی غلامی کو عزو جاہ کہو

انہیں کے نور کے پرتو سے ہے جہاں روشن
اگر کہو تو انہیں مرکز نگاہ کہو

مذکورہ اشعار میں آپؐ کے نقوش قدم کو نعمانی صاحب نے مختلف اسالیب میں استعمال کیا ہے۔ نعمانی صاحب کے ان چند نعتیہ تبرکات سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ نعتیہ شاعری میں مزید اضافے کرسکتے ہیں۔ دعا ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری اور بہتر کی طرف گامزن ہو۔

ابوسفیان اصلاحی، علی گڑھ

نام کتاب : صاحب فن

مصنف : ف۔ س۔ اعجاز

قیمت : ۱۰۰؍روپے

ملنے کا پتہ : انشا پبلی کیشنز [illegible]

"صاحب فن" نظموں پر مشتمل ف۔ س۔ اعجاز کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے نظموں کے دو مجموعے "مالک یوم الدین" اور "لا شریک" منظر عام پر آچکے ہیں۔ شعروادب سے متعلق چند دنوں کے فرق سے کوئی نہ کوئی کتاب چھپ کر بازار ادب میں آجاتی ہے۔ کتابوں کی اس بھیڑ میں اگر کوئی کتاب مطالعہ کا حصہ بن کر ہمارے ذوق کی تسکین کرتی ہے تو یقیناً اس کے لئے صاحب کتاب مبارکباد کا مستحق ہے۔ "صاحب فن" بھی ان ہی کتابوں میں ہے جو ٹھہر کر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

ف۔ س۔ اعجاز نے کتاب کے شروع میں "میرا پورٹریٹ" کے عنوان سے اپنے شعری رویے کا اظہار کیا ہے، جس میں انہوں نے لفظ کی اہمیت کے ساتھ ساتھ جذب واحساس کو بھی اچھی شاعری کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ کتاب کا انتساب بھی بڑی حد تک ان کی شاعری کا تعارف ہے۔

شاعر نے اپنی اس شاعری کو ترقی پسندی کا نیا منشور کہا ہے۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ کسی شاعری کو کسی خاص نام یا اصطلاح سے جوڑنے کے بجائے اسے صرف شاعری سمجھ کر پڑھا جائے تو خود شاعری کے ساتھ زیادہ انصاف ہوسکتا ہے۔ ترقی پسندی اگر کسی شاعر یا ادیب کے فکروخیال کی دنیا پر پہرہ بٹھائے رہتی ہے کہ تم یہ کہو اور یہ نہ کہو تو یقیناً ایسی ترقی پسندی شاعر کے تخلیقی عمل اور تخلیق پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ ف۔ س۔ اعجاز اپنی شاعری کو زندگی کے "معمولی پن کی شاعری" سمجھتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی وہ بدصورتیاں جن کا سامنا کرنے سے ہم گھبراتے ہیں یا جن سے سرسری گزر جاتے ہیں، ان سے شاعر کا ذہن الجھتا رہا ہے۔ اس مجموعہ میں ۸۳ نظمیں شامل ہیں اور ہر نظم پر عنوانات قائم ہیں۔ ان عنوانات سے شاعر کے فکروفکر کی وسعت اور کشادگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض

[illegible] موضوعات سے [illegible] ہو سکتا ہے کہ شاعر [illegible] کی طرح ایک ہی رنگ کی ہوگی۔ مگر ان کی [illegible] میں زبان اور لہجے کی خوبیاں موجود ہیں۔ [illegible] ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ف۔ س۔ اعجاز کی زبان [illegible] ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر نظموں کی [illegible] اور فنی فضا پس منظر میں چلی جاتی ہے اور اس طرح [illegible] ہے جذبات کی شدت کو بے نقاب ہونے نہیں دیتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ فنی دسترس کا ثبوت دیتے ہیں۔ انہوں نے فکر و زبان دونوں سطحوں پر اپنی تازہ کاری سے خوبصورتی پیدا کی ہے۔ ان کی ایک چھوٹی سی آزاد نظم پیش کی جاتی ہے۔

ہوا کے بدن میں
جو تیز اور نوکیلے پنجے گڑے ہیں
اسی دھوپ کے ہیں
جو اپنی سہیلی ہوا کی رفاقت پہ نازاں رہی ہے
خدا جانے کیا ہو رہا ہے
کہ میں مر رہا ہوں
مرے چاروں جانب
خدا کی بنائی
مرتی جاتی پہچانی مخلوق چپ ہے

مجموعی اعتبار سے ف۔ س۔ اعجاز کا یہ شعری مجموعہ موجودہ اردو شاعری میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اعجاز صاحب کا یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

سرور الہدیٰ، نئی دہلی

نام کتاب : ڈھائی گھر (ہندی ناول)

مصنف : گری راج کشور
مترجم : حیدر جعفری سید
قیمت : ۲۰۰/روپے
ملنے کا پتہ : ساہتیہ اکادمی سواتی، منڈی مارگ، نئی دہلی

"ڈھائی گھر" ہندی کے مشہور ادیب و ناول نگار گری راج کشور کا وہ ضخیم اور اہم ترین ناول ہے جسے ساہتیہ اکادمی دہلی نے انعام سے نوازا ہے اور جسے اکادمی کے ہی ایما پر ہندی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے ممتاز مترجم حیدر جعفری سید نے۔ اس طرح یہ ناول اردو کے سرمایے میں بھی اضافہ کر گیا ہے۔

چار سو سالہ سلطنت کا یہ ناول شمالی ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کے شکست و ریخت کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے لیکن اس بکھراؤ کے عقب سے شان و شکوہ کا وہ منظر نامہ بھی ہے جو انیسویں صدی میں تو تھا ہی بیسویں صدی کے نصف اول تک بھی بڑی حد تک موجود رہا۔ تہذیبیں پیدا ہوتی ہیں، غروب ہو جاتی ہیں، عروج کے اپنے عوامل ہیں اور زوال کے اپنے، لیکن تہذیبوں کا عروج و زوال دراصل ایک قانون فطرت کے تابع ہے جس کا مزاج ایک طویل اور اکتا دینے والی یکسانیت سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی لئے تہذیبوں کا مٹ جانا ایک فطری عمل ہے، مگر اس کے آثار و نشان یک قلم ختم نہیں ہوتے۔ آثار و نشان دراصل عبرت گاہیں ہیں جس میں آنے والی نسلیں گم شدہ ماضی کو تلاش کرتی ہیں۔ اس ویران محفل میں پروانوں کی اڑتی ہوئی راکھ کو یکجا کر کے کچھ تصویریں بنانے کی سعی میں لگی رہتی ہیں۔

"ڈھائی گھر" ایک ضخیم ناول ہے ایسے بڑے ناول کو تکنیک، ہیئت اور بنت کے اعتبار سے سنبھالے رکھنا ایک ماہر کہانی کار کا کام ہے اور گری راج کشور اس میدان کے شہسوار ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک بے مثال تحفہ پیش کیا ہے جو ماضی کی بازیافت بھی ہے اور عصری حسیت کا ثمر شیریں بھی۔ اس طرح یہ ناول ہندی اور اردو دونوں زبانوں کا سرمایہ بن گیا اور یہ اکیسویں صدی کی شاہراہ پر ایسا اولین سنگ میل ہے جس کے قامت بالا کی روشنی میں آئندہ سنگ میلوں کی تنصیب ہوتی رہے گی۔

عشرت ظفر، کانپور

نام کتاب : شب گزیدہ سحر

مصنف : رفعت شمیم
قیمت : ۵۰/روپے
ناشر : قلم پبلی کیشنز ۷/۱/۷۔ ایل آئی جی کالونی کرلا (مغربی) ممبئی۔ ۴۰۰۰۷۰

اپنے پیش لفظ یعنی اعتذار کے تحت مصنف نے یہ انکشاف کیا ہے کہ اوائل عمر میں وہ ترقی پسند تحریک سے بڑی حد تک متاثر رہا۔ میرے خیال میں بھی وہ صورت حال ہے جس کی بدولت اس نے سماجی شعور کے گوناگوں خد و خال کو اپنی تخلیقی زنبیل میں محفوظ کر لیا اور ان پر حتی المقدور شاعری میں طبع آزمائی کی۔ چنانچہ فکری اور فنی اعتبار سے اس کی شاعری عام زندگی کے متفرقات کا احاطہ کرتی ہے۔ اپنے گرد و پیش سے خاص وابستگی سے میسر آنے والے مشاہدات اور تلخ و شیریں تجربات کی روشنی میں وہ اگرچہ خوشی کے مواقع سے در گزر کا مرتکب نہ ہو سکا مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ یاس و حرماں کی بھرپور ترجمانی کرنے میں آگے آگے رہا ہے اس نے خود کہا ہے:

ناامیدی صبح فردا سے
چشم امروز بھی فسردہ ہے

کتاب کا عنوان ہی رفعت شمیم کے گمبھیر محسوسات اور تیکھے جذبات کا کلیدی عنصر فراہم کرتا ہے جن سے عبارت ہیں رنج و غم سے بھرپور وہ خیالات جو نغمگیت میں ہر دل مانوس شیرینی کے ضامن بن جاتے ہیں اس لحاظ سے موصوف کی نظمیں: "اور گوارا کر لیں، سال نو، ہم ہیں، تحریک خیال اور فرصت خیال" بڑا متاثر کرتی ہیں۔

شاعر کے گیتوں کی فضا اگرچہ صنفی لحاظ سے بالکل الگ تھلگ ہے مگر ان کا سریلا پن اسی سوز و ساز سے ودیعت ہے جو یاس و حرماں کی تلخ بیانی سے معرض وجود میں آتا ہے۔ اس سلسلے میں: "نیر بہے مسکانوں سے، طوفان اٹھ گیا دل ڈوب گیا، دیپ جلے، جل جل کے بجھے اور کل نہیں آنے والا" خاص کر پڑھنے اور گنگنانے کے قابل ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو کا شاعر غزل کہے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا ہے۔ رفعت شمیم نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا ہے۔ بہت سی غزلیں بھی اس نے کہی ہیں۔ ان میں رنگ و آہنگ کی چھوتی ہوئی یکسانیت کے ساتھ چھائی ہوئی ایک رواں دواں کیفیت تو ہے لیکن فکری اور فنی تنوع خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس نے خود کہا ہے:

فکر ناپید ہو تو روئے سخن
کچھ بھی کیجئے بھلا نہیں لگتا

الغرض کہ اشعار اپنی شعریت اور تغزل کی بدولت ضرور متوجہ کرتے ہیں:

ان سے مل کر یقیں نہیں ہوتا
ایسا لگتا ہے خواب دیکھا ہے
کہاں گئی سر ہنگام صبح آنکھوں سے
وہ روشنی جسے نذر سواد شام کیا
دل وہ خاموش گزرگاہ کہ سر شام جہاں
قافلے چپکے سے یادوں کے گزر جاتے ہیں

رام پرکاش راہی، دہلی

نام کتاب : ذیابیطس (شکر مرض)

مصنف	: ڈاکٹر دیپک جوشی
مترجم	: محمد عرفان
قیمت	: ۴۰ روپے
ملنے کا پتہ	: کانتی ڈائبٹک اینڈ ہارٹ کیئر سینٹر سدانند مارگ، رشی کیش (اترانچل)

شعری مجموعوں کے منہ زور سیلاب میں جب کوئی علمی، سائنسی یا طبی کتاب منظر عام پر آتی ہے تو اچھا لگتا ہے۔ ڈاکٹر دیپک جوشی، ایم بی بی ایس، ایم ڈی (انگلینڈ) بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ ذیابیطس ان کا خاص میدان ہے۔ مختلف اخبارات و رسائل اور میڈیکل کانفرنسوں میں ڈاکٹر صاحب کے مقالات شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر جوشی نے انگریزی میں Living with Diabetics اور ہندی میں "آپ اور مدھومیہ" جیسی مقبول اور معلومات سے پُر کتب لکھی ہیں۔ ان کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ موصوف اردو جاننے والے مریضوں اور عام شہریوں کے لئے اپنی ان کتابوں کا ترجمہ کرانے کے خواہش مند تھے۔ ان کی اس خواہش کے احترام میں جناب محمد عرفان اور ان کی اہلیہ محترمہ نصرت جہاں نے "آپ اور مدھومیہ" کا آسان اور رواں زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ہر چند کہ کسی بھی طبی کتاب کا ترجمہ آسان کام نہیں ہوتا۔ طبی اصطلاحات قدم قدم پر ترجمہ کا راستہ روک لیتی ہیں لیکن مترجمین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اس وادی پرخار سے بعافیت پار ہو گئے۔ زیر نظر کتاب ذیابیطس سے متعلق تمام چھوٹی بڑی اطلاعات سے پُر ہے۔ اصطلاحات کو اردو کے ساتھ انگریزی میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ ضروری اسکیچ یز تصاویر سے بھی یہ کتاب مزین ہے۔ اس کا مطالعہ ہماری معلومات میں بے پناہ اضافے کا باعث ہوگا۔ شفاف چکنے کاغذ پر ۲۳۲ صفحات کی اس کتاب کی طباعت بے حد نفیس اور واضح ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس مفید اور پُر از معلومات کتاب کی پذیرائی ہو اور ہماری ذاتی لائبریری کی ہی نہیں ہمارے ہاتھوں کی زینت بھی اسے بننا چاہئے۔

راشد جمال فاروقی، دہرہ دون

نام کتاب : کالی داس گپتا رضا:
شخص اور شاعر

مولف	: ساحر شیوی
قیمت	: ۱۷۵ روپے
ناشر	: مثل بک ایجنسی، دریا گنج، نئی دہلی

ماہنامہ 'آجکل' دہلی کے جون ۲۰۰۱ء کے شمارے میں کالی داس گپتا رضا کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ "جناب رضا صاحب گوناگوں شخصیت کے حامل تھے۔ اردو شاعروں کے مزاج کے خلاف وہ بہت بڑے تاجر بلکہ بینکر بھی تھے۔ کھاتہ بھی دیکھتے وقت فی البدیہہ شعر کہنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ وہ بلند پایہ محقق تھے، ماہر غالبیات میں ان کا شمار ہوتا تھا بلکہ موجودہ دور میں غالب کے بارے میں ان کی ہر بات قول صادق ہوتی۔ ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے جن میں اکیلے غالب کے سلسلہ میں ان کی تقریباً بیس کتابیں ہیں۔ غالب کے علاوہ چکبست اور داغ بھی ان کی تحقیق کے جولانگاہ تھے۔ وہ ایسے مفکر تھے جن کی نثر معیاری سمجھی جاتی۔ وہ چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا تھے۔ کسی حرف کسی لفظ کے بارے میں پوری پوری تفصیل اشعار کے حوالے سے بتاتے۔ نو شعری مجموعے اردو میں اور دو انگریزی میں انہوں نے چھوڑے۔ شعر کی ہر صنف پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ غزلیں، نظمیں، گیت، بھجن، مراثی، رباعیات سبھی کچھ ان کے مجموعوں میں شامل ہے۔ دو شعری مجموعے صرف نعت، حمد اور دیگر اسلامی موضوعات پر مشتمل ہیں۔۔۔ اردو کے وہ مجاہد تھے۔ اردو کا کوئی کاز ہو وہ اس کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔" اسی اردو دوست کی زندگی اور کارناموں کو سامنے لانے کے لئے [illegible] شاعر ساحر شیوی نے زیر تبصرہ کتاب [illegible] شخص اور شاعر مرتب کی ہے جسے [illegible] دہلی نے شائع کیا ہے۔ رضا صاحب [illegible] ماہر غالبیات بھی تھے مگر اس کتاب میں [illegible] خاندان وغیرہ کے بارے میں ان کے [illegible] مضمون (انگریزی سے ترجمہ) ابتدائی اوراق کا حصہ ہیں اور ۱۹ مضامین اردو شاعری میں ان کے [illegible] کنٹری بیوشن کو سامنے لاتے ہیں، جن کے لکھنے والے فراق گورکھپوری، یوسف ناظم، فیاض فیضی، شمیم طارق، ابراہیم اشک، ورد نکودری، شین کاف نظام، انور ظہیر خاں، عبدالاحد ساز، نذیر فتحپوری، عبدالرؤف خاں، مشتاق مدنی، حسن عباس فطرت، اعجاز سیمابی اور محمد ایوب واقف ہیں۔ رئیس الزماں خاں کا مضمون رضا صاحب سے ان کی دو ملاقاتوں کے انٹرویو پر مشتمل ہے جن میں سوال و جواب کی صورت میں رضا صاحب کی زندگی، کردار اور ادبی رویوں، کنٹری بیوشن اور اردو کے تعلق سے ان کے خیالات کے بارے میں معتبر معلومات فراہم ہوتی ہے۔ کتاب خراج عقیدت ہے اس لیے توصیفی ہے لیکن رضا صاحب کے شعری کنٹری بیوشن کے بارے میں وافر معلومات کا ماخذ ہے۔ ویسے بھی اپنے دانشوروں، قلم کاروں اور فنکاروں کی پذیرائی اردو زبان کی خوبصورت روایت ہے جو اسی طرح جاری رہنی چاہئے۔ کتاب ڈمائی آکٹوو سائز کے ۱۹۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جو لیزر کمپوزنگ میں سفید وہیز کاغذ پر صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔

نام کتاب: پریم چند کا سیکولر کردار اور دیگر مضامین

مصنف	: مانک ٹالا
قیمت	: ۲۰۰ روپے
ناشر	: مکتبہ جدید، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

بطور افسانہ نگار مانک ٹالا کی شناخت مستحکم ہے۔ ان کے افسانوں کے اب تک تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ پیاسی بیل تھا، دوسرا گمنام کار شدہ۔ تیسرا پنجرے کے پنچھی، چوتھا مجموعہ ہوری کا دوسرا جنم تھا

میں بھی ان کے ساتھ کی عمریں اور مزاج میں مطابقت
ہی نہیں بلکہ مانک ٹالا پریم چند سے بہت متاثر ہیں
جس کا عکس ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ دوسری کا دوسرا
ثبوت اس بات کا ثبوت ہے کہ انھوں نے پریم چند کے
ہی مضمون گرد کو پرکھا اور اسے اپنی تخلیق کا موضوع بنایا
اور پریم چند سے ان کی نسبت ذاتی ہے کہ انھوں نے
پریم چند کی شخصیت پر ایک دانشور نقاد کے روپ میں
پریم چند کے کردار کو پرکھ کر ان کی سیکولر قدروں کو
اجاگر کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب مانک ٹالا کی تخلیقی پیش کش بھی ہے اور تاریخی کاوش بھی۔ اس میں پریم چند کا سیکولر کردار اور پریم چند اور تحریک آزادی کو پریم چند کی شخصیت اور رویوں کا تجزیہ کہا جاسکتا ہے تو چند ترجمے پریم چند کی تحریروں کے مانک ٹالا نے اس کتاب میں شامل کیے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ذکاء الدین شایاں، فیاض الدین احمد خاں، علی سردار جعفری، سید حامد، مسعود حسین خاں، ڈاکٹر گیان چند وہ لکھنے والے ہیں جن کے اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے بارے میں مضامین اس کتاب کا حصہ ہیں۔ مانک ٹالا افسانے اچھے لکھتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں وہ تحقیق و تنقید کے خارزار کو اپنا بیٹھے ہیں۔ ویسے اس کتاب میں ان کا اپنا کارنامہ بہت کم ہے۔ زیادہ تر مانگے کا اجالا ہے لیکن کتاب کے سرورق سے پوری کتاب ان ہی کے مضامین کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔ اردو کے مسائل کے تعلق سے مانک ٹالا نے اچھے مضامین کا انتخاب کیا ہے لیکن یہ اگر موزوں عنوان کے ساتھ بطور تالیف شائع کیے جاتے تو بہتر ہوتا۔ اس کتاب کا پہلا مضمون آنجہانی کالی داس گپتا رضا کا ہے جس میں انھوں نے مانک ٹالا کو ماہر پریم چندیات کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پریم چند کے تعلق سے یہ مضمون اہم اور معلوماتی ہے۔ اس کتاب کو مانک ٹالا کی طرف سے پریم چند کے لیے خراجِ عقیدت سمجھا جاسکتا ہے۔ کتاب صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔ پریم چند اور اردو کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کو پسند آسکتی ہے۔

نام کتاب : دستِ رس

شاعر : نثار جیراجپوری

قیمت : ۱۵۰روپے

ملنے کا پتہ : ۶۷ چاند عمری، اعظم گڑھ (یوپی)

نثار جیراجپوری، شبلی کالج اعظم گڑھ میں ریڈر ہیں۔ شاید اردو کے استاد ہیں اس لئے اردو شاعری کو اپنے ذہنی و جذباتی اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ نثار غزل کے شاعر ہیں اور غزل کے مدھم لہجہ میں انھیں اپنی بات کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ 'دستِ رس' میں ایسے اشعار بھی ہیں جو بقول ضیاء الدین اصلاحی اپنی مہک سے مشامِ جان معطر کرسکتے ہیں۔ نثار جیراجپوری نے اپنی غزلوں میں روایت اور جدیدیت میں توازن قائم رکھتے ہوئے زندگی کے احساسات و جذبات کی معنی خیز عکاسی کی ہے۔ یہ چند شعر دیکھئے:

سورج کو پگھل گئے جب سے
ہے بلندی، بہت اڑانوں میں

پتھروں سے مصالحت کرلی
ہم کو شیشے کا گھر بنانا تھا

اس زمانے میں سچ کا حامی ہوں
مجھ میں اتنی بڑی کمی کیوں ہے

بلاشبہ نثار کے ہاں غزل کی روایتی عشقیہ لطافت اور جمالیاتی نزاکت بھی ہے اور عصری زندگی کے سفاک حقائق کی ترجمانی بھی۔ سیاسی اور سماجی مسائل کو بھی انھوں نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی 'دستِ رس' غزلوں کا ایسا مجموعہ ہے جس میں ہر قاری کو اپنی پسند کے اشعار مل سکتے ہیں۔ ڈمائی آکٹوو سائز کے ۱۹۰ صفحوں پر پھیلی یہ کتاب بہتر کتابت میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔

انور کمال حسینی، نئی دہلی

نام کتاب : علامہ سید سلیمان ندوی
بحیثیت مورخ

مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

قیمت : ۵۰روپے

ناشر : خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی زندگی کے کئی پہلو ہیں وہ بیک وقت ادیب و شاعر، عالم دین اور محقق و مورخ بھی ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو بہ حیثیت مورخ کے ہے۔ انھوں نے تاریخ ہند میں بھی نمایاں کارنامہ انجام دیا اور تاریخ اسلام میں بھی۔ 'عرب و ہند کے تعلقات' ان کا بہترین تاریخی مقالہ ہے جو آج بھی بیشتر تعلیمی اداروں میں داخل نصاب ہے۔

انھوں نے ۱۹۴۴ء میں "کل ہند تاریخ کانگریس" کی صدارت کی تھی۔ اس موقع پر کلمہ صدارت میں انھوں نے تاریخ نویسی کے جن نکات کی طرف توجہ دلائی تھی وہ آج بھی مورخین کے لئے مشعل راہ ہے۔

مصنف نے بجا طور پر لکھا ہے کہ 'سید صاحب کا خیال تھا کہ تاریخ قوموں کی روح ہوتی ہے اور وہ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا نام نہیں بلکہ ہر زمانے میں ملک کی عام علمی، تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی کیفیات کا جائزہ ہی تاریخ کا اہم موضوع ہے۔ ان کو احساس تھا کہ قدیم تاریخوں کا بہت بڑا نقص رہا ہے کہ ان میں صرف سیاسی واقعات لکھے گئے اور قدیم مورخین نے اسی کو اصل تاریخ تصور کیا جس سے یہ نقصان ہوا کہ تہذیب و تمدن کے بہت سے نقوش و آثار مٹ گئے۔'

زیر نظر تصنیف "علامہ سید سلیمان ندوی: بہ حیثیت مورخ" علامہ کی شخصیت کے اسی اہم پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔ کتاب چھوٹے چھوٹے ۴۴ ابواب پر مشتمل ہے۔

کچھ عنوانات اس طرح ہیں: علامہ سید سلیمان ندوی اور غلط تاریخ نویسی پر نقد و جرح، انگریزوں کی غلط تاریخ نویسی کے بنیادی مقاصد، غلط تاریخ نویسی کا نتیجہ، جزیہ اور چوتھ، عرب و ہند کے تعلقات، تجارتی تعلقات کی تاریخ، علمی تعلقات کی تاریخ، مذہبی تعلقات کی تاریخ وغیرہ۔ کتاب اپنے موضوع کا بھرپور احاطہ کرتی ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ تاریخ کے طلبا کے لئے بطور خاص یہ ایک تحفہ ہے۔

ابرار رحمانی

☆☆☆

کچھ خط خطا

● 'آجکل' ستمبر ۲۰۰۱ء میں سرور الہدیٰ کے مقالے سے بہت مسرور ہوا جو حیدر آباد کے تین شاعر خورشید احمد جامی، سلیمان اریب اور شاذ تمکنت پر مشتمل ہے۔ اریب اور شاذ میرے گہرے دوست تھے، جامی کی غزلیہ شاعری جدیدیت کے باوصف نظمیہ آہنگ لئے ہوئے ہے۔ اریب کی غزلیہ شاعری شاذ سے کہیں زیادہ کلاسیکی اور گہری ہے۔ جاں نثار اختر کی طرح اریب کو بھی دانشور بیگم نصیب تھی۔ دونوں بیگمات کے نام صفیہ ہیں۔ شاذ کی شہرت ان کی شاعری سے کہیں زیادہ ہوئی۔ پروفیسر وحید اختر مرحوم سے شاذ مرحوم اور جناب راشد آذر کی پرخاش تھی۔ آزادی کے بعد صنف غزل کے نمائندہ غزل گو شعرا کو (جن میں چند مرحوم اور چند زندہ ہیں) ناقد نصیب نہ ہوئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سرور الہدیٰ کو یہ توفیق وہدایت نصیب ہوئی کہ انہوں نے ایسا پرمغز اور تحقیقی، تنقیدی اور علمی وادبی مقالہ لکھا۔ جامی، اریب اور شاذ نے غزل کی آبرو میں اضافہ کیا اور چند زندہ جاوید شعر بھی کہے۔

حصہ غزل میں بہت سارے شعر پسند آئے۔ فضیل جعفری کی غزل کے تیسرے شعر کے مصرع اول میں لفظ "شرف" کا تلفظ غلط ہوا ہے لفظ شرف میں "ر" بالفتح ہے، ساکن نہیں۔ موصوف نے شرف قبولیت کی ترکیب میں 'ر' کے زبر کو ساکن کر دیا جس طرح مولانا الطاف حسین حالی کے اس مصرع میں لفظ حرکت وبرکت کے 'ر' غلط تلفظ کے حامل ہیں: کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت زیادہ۔ دونوں جگہ 'ر' کو بالفتح ہونا چاہئے۔ دانشور ہندو شعرا میں تلوک چند محروم، فراق وغیرہ نے مولوی نہ ہونے کے باوصف عربی تلفظ کی پاسداری کی ہے۔ مسلم شہزاد کی غزل میں چوتھے شعر کا مصرع اول خارج از بحر ہے۔ اگر اس مصرع میں لفظ 'آہنگ' کو مد ازا کر اہنگ پڑھا جائے تو باوزن ہے مگر اہنگ کوئی لفظ نہیں۔ اسی طرح اسی غزل کے چھٹے شعر کا مصرع اول بھی "طلوع صبح میں دیر ہوتا" خارج از وزن ہے۔

کاوش بدری، امبور

● پیارے لال رتن اور اسعد بدایونی کی پہلی غزل پسند آئی۔ ارشد صدیقی کی پوری غزل مرصع ہے، خصوصا یہ شعر غضب کا ہے:

گیان کی چیتنا جاگ اٹھی ہے اب رہیں گے نہ من میں اندھیرے
بچے اسکول جانے لگے ہیں گھر میں سورج نکلنے لگے ہیں

مسلم شہزاد کی دوسری غزل کا مطلع کچھ عجیب سا ہے۔ لفظ 'اندر' سمجھ نہیں پایا۔ صفحہ ۲۴ کی درمیانی غزل کے اشعار بہت قریب قریب لکھ دیئے گئے ہیں۔ بارہ اشعار کی اس غزل کے بعض اشعار بہت معمولی ہیں، حذف کئے جاسکتے تھے۔ ناظم جعفری کے مطلع اور مقطع کے ثانی مصرعوں میں "کو" کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ "جاڑے کا چاند" کا یہ مصرع: "ساری دنیا کو نظر آتا نہیں" یوں ہوتا تو زیادہ جاندار لگتا: یاں کسی کو بھی نظر آتا نہیں۔

کہانیوں میں "ایک سفید دن کا سیاہ سورج" اور "بھورے بالوں والی لڑکی" نے بہت متاثر کیا۔ سرور الہدیٰ کا مقالہ اچھا ہے۔ چند نکات کی غیر ضروری تکرار سے بچا جاسکتا تھا۔ مقالے میں کمپوزنگ کی کئی غلطیاں در آئی ہیں۔

زین الدین، ناسک

● لائبریری کے موضوع پر منتخبہ مضامین پسند آئے۔ "حیدر آباد کے تین شاعر" جامی، اریب اور شاذ تمکنت پر مبنی مضمون تینوں شاعروں کا مکمل تعارف ہے۔ اگرچہ اریب ترقی پسندی کے لپیٹے میں آگئے تھے لیکن اس میں کوئی کلام [illegible] شدت سے اور برجستگی بالعمل [illegible] پر سبقت لے جاتی ہے۔ شاذ تمکنت [illegible] میرے پسندیدہ شاعروں میں [illegible]

لائبریری پر [illegible] اہمیت وافادیت کا تعین کرتے [illegible] تاریخ وثقافت کا تحفظ بھی کرتی [illegible] کی کہانی ان ساری کہانیوں پر سبقت لے گئی ہے جو رسالہ میں شامل ہیں۔ [illegible] کا علیہ ذوقی نے بڑی خوبی کے ساتھ [illegible]

حبیب راحت حبیب [illegible] (یوپی)

● جوگندر پال صاحب کا "[illegible]" نے ذہن ودماغ کو خاصا متاثر کیا یہاں تک کہ کسی کمی کر دامن دل ہاتھوں سے چھوٹتا نظر آیا۔

آجکل کی فائل سے بزرگ محقق اور شفیق استاد جناب مختار الدین آرزو کا مضمون "[illegible] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، شعبہ مخطوطات" کو کہ ستمبر ۱۹۵۳ء کا شائع شدہ ہے لیکن اس میں بیان کردہ باتیں آج بھی ہمیں نئی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ہم اپنے علمی، ادبی، ثقافتی سماجی ورثے سے اس قدر بے نیاز ہیں کہ ان گراں قدر نعمتوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ کاش [illegible] میراث حاصل کرنے سے پیشتر اپنی [illegible] سکتے۔ اس سلسلے کی کڑی شعائر اللہ خاں [illegible] کا مضمون "صولت پبلک لائبریری، رامپور" ہے۔ مذکورہ لائبریری ۱۹۴۷ء میں جس حادثے کا شکار ہوئی وہ دلخراش تو ہے لیکن خوشی اس بات سے ضرور ہوتی ہے کہ آج بھی صولت لائبریری میں کثرت سے مطبوعہ غیر مطبوعہ نوادرات موجود ہیں جن میں سے بعض کہیں اور نہیں ہیں۔

"عظمت رفتہ کے نوحہ" [illegible] کا ترجمہ حیدر جعفری سید کا [illegible] ہے لیکن ہم اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں کہ "[illegible]" افسوس کہ اب نئی نسل میں [illegible] عالم سعید احمد اور غلام [illegible] ہے اور نہ ہی ہم [illegible] تحقیق کے عادی [illegible]

● [illegible] بزرگوں کی کاوش اور اصول تحقیق [illegible] ہیں لیکن ہم روشنی سے اپنا [illegible] اپنی عظمت [illegible] ہیں۔ تو کیا اس [illegible] "داستانوں" میں کبھی [illegible]

اختر الزماں، اعظم گڑھ

● سرورالہدیٰ کا مقالہ "حیدر آباد کے تین شاعر" [illegible] دونوں تقاضوں کو پورا کرتا ہے [illegible] ایک معیاری مقالہ ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے ایک مقالہ میں توازن و اعتدال کے ساتھ بیک وقت تین شاعروں کی شاعری کا مطالعہ پیش کر کے اپنی [illegible] تنقیدی [illegible] کہنہ مشقی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اکثر [illegible] دیکھا جاتا ہے کہ اس طرح کے مقالے میں [illegible] آجاتا ہے لیکن یہ مقالہ ایسی کمزوری سے مبرّا ہے۔ سرورالہدیٰ نے جامی، اریب اور شاذ تینوں کی شاعری پر کما حقہ سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

حصہ منظومات میں فضیل جعفری، مسلم شہزاد، ارشد صدیقی، اسعد بدایونی اور ذکی طارق کی غزلیں اچھی ہیں۔ حنیف ترین اور کوثر جہاں کوثر کی نظمیں بھی اچھی لگیں۔ جوگندر پال اور محترمہ شہناز کنول کی کہانیاں بھی قابل مطالعہ ہیں۔ مجموعی طور پر یہ رسالہ اپنے سابقہ معیار کے مطابق ہے۔

ظفر انصاری ظفر، مظفر پور

● زیر نظر شمارہ میں سرورالہدیٰ کا مقالہ حیدر آباد کے تین شاعر انتہائی وقیع اور خاصے کی چیز ہے۔ دیگر مضامین بھی اہم اور معلومات افزا ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی خوب ہے۔

مسلم شہزاد کی پہلی غزل کے چوتھے اور چھٹے شعر کے مصرعہ اولیٰ ناموزوں ہیں اور مقطع کے دونوں مصرعے ساقط الوزن ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ غزل آپ کی نگاہ نکتہ رس سے کیسے بچ نکلی۔ ارشد صدیقی کی غزل ہندی اردو کے شیریں اور سبک الفاظ کا حسین امتزاج لئے ہوئے خالص ہندوستانی فضا میں سانس لیتی ہوئی بہت اچھی لگی۔

حباب ہاشمی، الہ آباد

● سوامی واحد کاظمی کا مقالہ "عظمت رفتہ کے شواہد" اور سرورالہدیٰ کا مقالہ "حیدر آباد کے تین شاعر" بہت عمدہ مقالہ ثابت ہوا۔ سرورالہدیٰ کے مقالہ کو اگر حاصل شمارہ کہا جائے تو بجا نہ ہوگا۔ میر اور غالب کی شاعری یا زندگی کا کوئی گوشہ اب پردۂ اخفا میں نہیں رہا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب ایسے شعرا اور ادبا کو متعارف کرایا جائے جن کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں۔ بیسویں صدی میں گزرنے والے بہت اچھے اچھے شعرا و ادبا کے کارنامے ادبی دنیا کی نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں انہیں متعارف کرانے کی ضرورت ہے اور یہی کام سرورالہدیٰ احسن طریقے سے کر رہے ہیں۔

جمیل فاطمی، بیگوسرائے

● سرورالہدیٰ کا مقالہ "جامی، اریب اور شاذ" طویل، معلوماتی اور ایک ہی علاقہ پر مبنی ہے۔ اب تک موصوف بہ حیثیت شاعر ہی متعارف تھے لیکن اب وہ بہ حیثیت نثار بھی روشن ہو رہے ہیں۔ چونکہ موصوف نے بیک وقت تین تین شعرا کرام کی تخلیقات کو اپنا موضوع بنایا ہے اس لئے مقالہ از خود طویل اور پر مواد ہو گیا ہے۔ جہاں تک ان کی زبان اور لسانیت کی بات ہے تو وہ سادہ، شگفتہ اور رواں ہے۔ وہ اپنی کوشش و کاوش میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے آغاز زندگی میں ایسا شاندار و جاندار مقالہ تحریر کیا ہے تو امید ہے کہ عمر کے ساتھ مقالات میں بھی مزید پختگی آتی جائے گی۔

محترمہ شہناز کنول کی کہانی "ایک سفید دن کا سیاہ سورج" غماز ہے کہ محترمہ صرف ادب سے ہی شغف نہیں رکھتی ہیں بلکہ سائنس میں بھی درک حاصل ہے۔

عبداللہ حسینی، بیگوسرائے

● سوامی واحد کاظمی کا مضمون "عظمت رفتہ کے شواہد" کئی نئی راہیں دکھاتا ہے۔ جوگندر پال چھوٹی کہانیوں میں بڑی باتیں درج کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انہوں نے اردو میں منی کہانیوں کو جگہ دی ہے۔ مشرف عالم ذوقی کی کہانی بہت پسند آئی۔ شاعری کے حصے میں فضیل جعفری، ذکی طارق اور حنیف ترین پسند آئے۔

شہاب اختر، جھریا

● آج پہلی بار میں نے 'آجکل' کا مطالعہ کیا، بہت ہی بہتر رسالہ لگا۔ دل باغ باغ ہو گیا خاص کر زندگی کے میلے اور ایک سفید دن کا سیاہ سورج بہت بہتر لگا۔ نشیب و فراز پر جب میں نے توجہ ڈالی تو حسن نظام لگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس رسالے کو بلند و بالا کرے، شمطراق کرے اور ترقیوں کی سیڑھیاں چڑھائے اور تمام اردو کے شاعر و ادیب کو اس رسالے کا مطالعہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

محمد راشد کمال ثاقب، دربھنگہ

● تازہ شمارے میں سبھی ادبی فن پاروں نے بچ بچ انتہائی متاثر کیا ہے۔ 'آجکل' میں اگر قارئین کے تبصروں، کتب و رسائل پر تجزیہ نگاری کو مزید جگہ دی جائے تو نئے قلم کاروں کو اور رہنما خطوط فراہم ہو سکتے ہیں۔ ویسے اس میں موجود افسانے، غزلیں، نثری و آزاد نظمیں اور تجزیہ نگاری ادبی شائقین کے لئے رہبر ثابت ہو رہے ہیں۔ بارگاہ خداوندی میں دعا گو ہوں کہ وہ 'آجکل' کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

مجتبیٰ نجم، بیڑ (مہاراشٹر)

● پرنٹ میڈیا کی ترقی پسندانہ اور جدیدیت کی دوڑ میں رسالہ 'آجکل' شانہ بہ شانہ مستقبل کی سمت رواں دواں ہے۔ شعبہ زندگی کا کوئی پہلو پس پشت نہیں ہے۔ معاشیات ہو یا اقتصادیات، ادب ہو یا ثقافت، تجارت ہو یا علم و فن، گلوبلائزیشن ہو یا کلوننگ کی پیش رفت۔ غرض کسی بھی شعبہ میں دور جدید کے معیاری رسالوں سے 'آجکل' ذرا بھی پیچھے نہیں۔

محمد الیسع، بھاگلپور

● مقالات بے حد ثقیل و سقیم ہیں۔ ضمیمہ میں فرہنگ آجکل اور شائع کرنا شروع کر دیں تو مجھ جیسے کم علم قاری کو آسانی ہو جائے گی۔ غزلیں کم ہیں، بہت اچھا ہے، مگر قابل ستائش ہیں۔ نظموں میں نام نہاد آزادی زیادہ ہے مگر سر اور ترنم کا فقدان ہے۔

کہانیاں تمام ہی بے جان اور گنجلک ہیں۔ 'آجکل' میں تو اچھے اور پایہ کے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ڈرامہ کا رواج تو اب اردو ادب سے کالعدم سا ہو چکا ہے۔ دیویندر سنگھ کی پھلجھڑی رونق نہیں پھیلا

کی۔ تبصرے کی جان 'آجکل کی فائل سے' ہے۔ آپ کا انتخاب قابلِ داد ہے۔ سرورق بھی دیدہ زیب و جاذب نظر ہے۔ تبصرے میں ابوالحسن علی ندوی اور تصوف بہت احترام سے پڑھا۔

سید ماجد رضوی، رامپور

● اس بار کے چاروں مقالات پسند آئے۔ سرورالہدیٰ نے "حیدر آباد کے تین شعرا" جامی، ادیب اور شاذ کا بھرپور تعارف کروایا ہے۔ سوامی واحد کاظمی کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ شعائراللہ خاں وجیہی کا مضمون "صولت پبلک لائبریری" اور عبدالعلیم قدوائی کا مضمون "ہفتہ وار سچ: ایک تعارف" معلوماتی ہے اور بڑی محنت سے لکھا گیا ہے۔ ان تمام قلم کاروں کے ساتھ آپ کو بھی بہت بہت مبارکباد۔

شعری حصہ کچھ کمزور سا ہے۔ اس پر بھی خاص توجہ دیجئے۔ کہانیوں میں جوگندر پال، شہناز کنول اور مشرف عالم ذوقی کی کہانیاں اچھی لگیں۔

ڈاکٹر محمد فاروق اعظم، بھاگلپور

● 'نیا سفر' الہ آباد کا علی سردار جعفری اور مجروح سلطانپوری نمبر عرصہ ہوا موصول ہو گیا تھا۔ اس نمبر میں ایک مضمون احمد طارق صاحب کا مجروح پر شائع ہوا ہے جس میں تین چار صفحات میرے مضمون بعنوان "مجروح سلطانپوری" مطبوعہ 'آجکل' دہلی بابت اپریل ۱۹۹۳ء شامل کر لئے گئے ہیں بلکہ مضمون مسروقہ شروع ہی میرے مضمون کے پہلے پیرا سے ہوتا ہے۔ یہاں اپنے مضمون کا وہ شروع کا حصہ جو چرا لیا گیا ہے درج کر رہا ہوں:

"غالب کے بعد اگر اردو کی غنائی شاعری کے ایک ہزار بہترین اشعار کا انتخاب کیا جائے جس میں حالی، داغ، اقبال اور نہ جانے کتنے بلند اقبال شاعر نظر آئیں گے تو اس انتخاب میں مجروح سلطانپوری کا کوئی شعر ضرور آ جائے گا اور اگر بیسویں صدی میں پیدا ہونے والے تمام شاعروں کے کلام سے سو بہترین غزلیں منتخب کی جائیں تو اس میں مجروح کی کئی غزلیں آ جائیں گی اور پھر سب سے اہم بات یہ کہ اگر ایسے اشعار کو یکجا کیا جائے جو اس وقت باذوق لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں تو اس میں مجروح کے شعروں کی تعداد اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ہو گی۔"

احمد طارق صاحب نے میری مندرجہ بالا تمہید کی سطروں سے پہلے اپنے ایک جملہ کا اضافہ کر کے مالِ مسروقہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جملہ یہ ہے:

"مجروح سلطانپوری ان شعرا میں سے ایک ہیں جو بعض وجوہات کی بنا پر ناقدینِ ادب کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے لیکن جن کے کلام نے عوام و خواص میں یکساں مقبولیت حاصل کی۔"

اس ایک جملے کے بعد میرے مضمون کی مندرجہ بالا سطریں شروع ہوتی ہیں اور پھر تھوڑی تھوڑی سی اپنی عبارت لکھ کر میرے مضمون کے طویل اقتباسات شامل کر لئے ہیں، یکے بعد دیگرے، اتنے طویل اقتباسات کا یہاں لکھنا بہت مشکل ہو گا کیونکہ مجھے اپنا آدھا مقالہ یا اس سے کچھ زیادہ ہی دوبارہ لکھنا پڑے گا۔ قارئین میرے مضمون سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اوپر حوالہ مع تاریخ طباعت دے چکا ہوں۔ آٹھ سال پہلے چھپے ہوئے اس مقالے کا ملنا اگر دشوار طلب ہو تو ابھی حال میں چھپی ہوئی کتاب "مجروح سلطانپوری: مقام اور کلام" مرتبہ ڈاکٹر محمد فیروز میں صفحہ ۲۰۳ پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔

وارث کرمانی، بارہ بنکی

● 'آجکل' اگست ۲۰۰۱ء موصول ہوا۔ گوپی چند نارنگ کا مضمون "زبان کے ساتھ کبیر کا جادوئی برتاؤ" پڑھا۔ نارنگ صاحب نے لسانی تناظر میں کبیر داس کی شاعری کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ کافی پر از معلومات ہے اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے دعوت فکر بھی دیتا ہے۔ غزلوں میں شان الحق حقی کی دو غزلیں مزہ دے گئیں ان کا مصرعہ "خوف تھا خون فصاحت کا نہ آئے الزام" معنی خیز ہے اور زبان غزل میں نئی تراکیب لفظی کی غمازی کرتا ہے۔ افسانے سبھی اچھے اور حیات افروز بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔

شیدا رومانی، رائچور (کرناٹک)

● گوپی چند نارنگ نے کبیر سے متعلق اپنے مضمون میں ان کے ایک شلوک کا متن اس طرح تحریر فرمایا ہے:

روکھا سوکھا کھائے کے ٹھنڈا پانی پیو
دیکھ پرائی چوپڑی مت للچاوے جیو

سکھوں کی مقدس کتاب 'گرو گرنتھ صاحب' میں شلوک فرید کے" کے عنوان کے تحت بابا فرید کا ایک شلوک مندرجہ ذیل متن میں ملتا ہے:

رکھی سکھی کھائے کے ٹھنڈا پانی پی
فریدا دیکھ پرائی چوپڑی نہ ترسائے جی

تنویر چغتائی، ٹونک

● 'آجکل کی فائل سے' میں ڈاکٹر امرناتھ جھا کا اکبر الہ آبادی کے متعلق مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی۔ لوگ اکبر الہ آبادی کو بھولتے جا رہے ہیں۔ حسب حال الہ آباد میں کالا ڈانڈا قبرستان میں اکبر کی قبر کسمپرسی کے عالم میں موجود ہے۔ اس کا تحفظ بہت ضروری ہے۔

ڈاکٹر امرناتھ جھا نے اپنی ڈائری میں ۱۴ر اگست ۱۹۱۲ء کو اندراج کیا ہے کہ وہ مشہور اردو شاعر اکبر سے ملے۔ اسی ڈائری میں ۱۸ر اگست کو اندراج کیا گیا ہے کہ وہ مسٹر کچلو اور مولوی ناصری کے ساتھ حضرت اکبر سے ملے تھے اور ان سے پر لطف گفتگو ہوئی تھی۔ مترجم اختر اورینوی نے مولوی نصیر کا نام غلطی سے لکھ دیا ہے۔

امتیاز الدین خان، پرتاپ گڑھ

● پروفیسر عبدالستار دلوی کا بڑا وقیع اور بڑا معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔ "ہند و مصر کے تعلقات اور اردو" موصوف نے تحریر فرمایا ہے: "علامہ بوصیری کے مشہور قصیدہ بردہ کے اردو تراجم جو دکن، بمبئی، گجرات اور شمال میں ہوئے ان کی جگہ مسلم ہے۔" اس سلسلے میں عرض ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں کی طرح وسط ہند میں بھی قصیدہ بردہ پر کام ہوا ہے۔ میرے دادا استاد علامہ غریق خیر آبادی (۱۸۶۸ء-۱۹۴۳ء) جو اپنے وقت کے مشہور شاعر ہی نہیں بلکہ عربی و فارسی میں ماہرانہ قابلیت رکھتے تھے اور تصوف کے رمز شناس بھی تھے، انہوں نے قصیدہ بردہ کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جو مطبع سرکار جاورہ سے اگست ۱۹۴۳ء میں کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

وسط ہند میں بھی عربی سے اردو میں تراجم پر تحقیق کا کام شروع ہو تو مزید معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ انیس چشتی صاحب کا مقالہ "اردو زبان پر ترکی اثرات" بھی بیحد معلوماتی ہے۔

رشید اندوری، اندور

بقیہ ٹائٹل ۲ کا

بھارت میں چرخہ کاتنے کا رواج تاریخی ہے اور آج بھی بھارت کے مختلف حصوں میں یہ قدیم روایت کسی نہ کسی شکل میں قائم ہے۔ اڑیسہ میں اور بالخصوص ضلع سمبل پور میں سسرال میں قیام کے پہلے سال کے دوران میں دولھن چرخہ کاتنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کرتی۔ پنجاب کے صوفی شاعر حسین (۱۵۳۹ء سے ۱۵۹۳ء) نے قدرتی طور پر اپنی روح کو ایک ایسی لڑکی سے تشبیہ دی ہے جو محض اس وجہ سے کنواری بیٹھی رہی کہ وہ قدیم روایت کے مطابق اپنے ہونے والے خاوند کے لئے اپنے ہاتھوں سے سوت کات کر شادی کا جوڑا تیار نہ کر سکی تھی۔ جس طرح خاوند جہیز میں ہاتھ سے کتا ہوا اور ہاتھ سے بنا ہوا کپڑا لانے والی بیوی سے پیار کرتا تھا اسی طرح خدا کو اس صوفی سے محبت تھی جس نے زندگی میں نیک کاموں کا کپڑا بنا ہو۔

پنجابی کے بعض گیت گھریلو زندگی کا تمام نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ پنجاب کے لوک گیت ہمیں سماجی و تہذیبی امور کے مطالعے کے لئے اہم مواد مہیا کرتے ہیں۔ یہ گیت تہواروں و مختلف پرانی رسوم، گاؤں کے کسی میلے کی رونق وغیرہ موضوعات غرضیکہ کسی ایسی دیہاتی دوشیزہ کے متعلق بھی ہوسکتے ہیں جسے آرائش کے لئے زیورات تو میسر نہیں آتے لیکن وہ کاجل کے استعمال سے اپنی آنکھوں میں جادو کا اثر پیدا کرنے سے کبھی نہیں چوکتی۔ ان میں سے بعض گیت ناچ کے ساتھ گائے جاتے ہیں۔ دیہات میں عورتیں بیٹے کی پیدائش پر مل کر کئی گیت گاتی ہیں جو "ہولار" کے نام سے مشہور ہیں۔ شادی کے گیتوں میں عورت کے بالوں میں سیندور لگائے جانے کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ سیندور کسی عورت کے شادی شدہ ہونے کی علامت ہے۔

علاوہ ازیں پنجاب کے لوک گیت شاعروں کے مطالعے کے لئے اہم مواد مہیا کرتے ہیں۔ پنجاب کے کئی نوجوان شاعر اب لوک گیتوں کی اصطلاحیں و استعارے استعمال کر رہے ہیں۔ نئے سماجی ڈھانچے میں جدید شاعری کے تقاضوں کی روشنی میں لوک گیتوں میں استعمال کیے گئے استعاروں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے نہ صرف یہ بلکہ لوک گیت ہلکے پھلکے سنگیت کی تجدید میں بھی مدد و معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔

☆☆☆

سروش عسکری طباطبائی

عہد و پیماں

ایک دن وہ دلبر شیریں ادا و گلبدن ۔۔۔ جس کے لعل لب کی خاموشی بھی ہے جانِ سخن
نو بہار ناز، شامِ بت کدہ، صبح حرم ۔۔۔ جانِ موسم، جوہر مئے، عطر گل، روحِ ختن
جس کا رنگِ نو دمیدہ، رہزنِ ہوشِ بہار ۔۔۔ جس کا حسنِ نو شگفتہ، آفتِ جانِ چمن
قامتِ رنگین و رعنا، فتنۂ صبح نشور ۔۔۔ حسنِ تاباں و برشتہ، برقِ انوارِ عدن

ناز سے کہنے لگی، گردن میں بانہیں ڈال کر
"اے مرے سودائی زلفِ شکن اندر شکن!"

اے کہ میرے چشم و ابرو تجکو شمشیر و سناں ۔۔۔ اے کہ میرے قامت و گیسو، تجھے دار و رسن
اے کہ میرے پاؤں کی آہٹ، تجھے سازِ بہار ۔۔۔ اے کہ میرے جسم کی خوشبو، تجھے بوئے سمن
سچ بتا کیا عشق رہ جائے گا تیرا برقرار؟ ۔۔۔ وقت جب کر دے گا برہم حسن کا میرے چمن
کیا یوں ہی پھر بھی رہے گا تو مرا حلقہ بگوش؟ ۔۔۔ جب سپیدی کی مرے بالوں میں پھوٹے گی کرن؟

ہوش اڑا ڈالے مرے بیدرد کی تقریر نے!
ہوگئے احساس سے مجروح ذہن و جان و تن

پھر سنبھل کر عرض کی میں نے کہ اے جانِ بہار ۔۔۔ حشر تک قائم ترے حسن جواں کا بانکپن
تا قیامت تازہ، تیری دلربائی کا غرور ۔۔۔ تا ابد باقی ترے حسن و جوانی کی پھبن
میں ازل سے ہوں تری زلفِ مسلسل کا اسیر ۔۔۔ اور ابد تک دل سے مٹنے کی نہیں تیری لگن
لاکھ طوفاں سر اٹھائیں انقلاب وقت کے ۔۔۔ یاد رکھ اے جانِ من، جانانِ من، ایمانِ من

سوزِ بلبل کم نہ گردد، گر رود گل از چمن!
حسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست!

آجکل کی فائل سے

ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عرش ملسیانی

جلد: ۱۳ نمبر: ۴ نومبر ۱۹۵۴

Regd.No.D.L. 12063/2000 — Licenced U (DN)-50/2001 to post without pre-payment
RN 942/57 (Delhi Post) — RMS Delhi
Vol.60 No.4 Rs. 7/- Ajkal (Urdu) November 2001

ہماری اردو مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
آجکل اور غبار کارواں	ادارہ	170/=
آجکل کی کہانیاں	ادارہ	162/=
آجکل اور سفر نامہ	ادارہ	105/=
آجکل اور صحافت	ادارہ	115/=
آجکل کے ڈرامے	ادارہ	125/=
آجکل کے مضامین	ادارہ	112/=
آجکل اور اقبال	ادارہ	95/=
آجکل اور طنز و مزاح	ادارہ	112/=
اردو ادب کے پچاس سال	ادارہ	95/=
اٹھارہ سو ستاون	سریندر ناتھ سین/خورشیدہ پروین	556/=
کلاسیکی موسیقار	مترجم: خورشید اکرم	137/=
عوام الناس کے لیے گائڈ	مترجم: عادل صدیقی	145/=
مہاتما گاندھی	آچاریہ کرپلانی / لکشمی چند ریاس	300/=
مہاتما بدھ کی حکایتیں	پال کاروس / مسعود فاروقی	155/=
شہیدوں کے خطوط	ادارہ	110/=
قلی قطب شاہ	نریندر لوتھر / زبیر رضوی	280/=
سفینۂ غالب	ادارہ	95/=
آئینہ غالب (طبع دوم)	ادارہ	75/=
گنجینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	60/=
یادیں مجاہدین آزادی کی	نوین جوشی / راحت جبیں	120/=
غالب بہ صد انداز	تشکیل: برجندر سیال	1000/=
پہیلیاں - امیر خسرو	مرتب شہباز حسین، نندکشور وکرم	22/=
کاغذی ہے پیرہن	عصمت چغتائی	65/=
کشمیر کی لوک کتھائیں	جے۔ این۔ کھمبر	45/=
ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر	ڈاکٹر محمد عمر	127/=
راگ راگنیوں کی تصویریں	شکیل الرحمٰن	325/=
ہند اسلامی طرز تعمیر	ضیاء الدین ڈیسائی / اختر الواسع	54/=
ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز	ضیاء الدین ڈیسائی / بہار برنی	54/=
ہماری تہذیبی وراثت	راجندر پرشاد، بی این پانڈے	50/=

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
ہندوستان کے عظیم موسیقار	شمبھوناتھ مشرا / رئیس مرزا	65/=
سروجنی نائیڈو	تارا علی بیگ / لکشمی چند ریاس	[illegible]
حکیم اجمل خاں	نثار احمد فاروقی	[illegible]
سردار ولبھ بھائی پٹیل	آئی سے پٹیل / یعقوب یاور	[illegible]
مختار احمد انصاری	مشیر الحسن / فرحت احساس	60/=
رفیع احمد قدوائی	ڈاکٹر ہاشم قدوائی	60/=
سر سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی / اصغر عباس	35/=
حسرت موہانی	ڈاکٹر خلیق انجم	50/=
مولانا آزاد (طبع دوم)	عرش ملسیانی	40/=
بدر الدین طیب جی	اے جی نورانی / راجندر انجم	70/=
مظہر الحق	قیام الدین احمد، جٹا شنکر جھا، مترجم: رضوان احمد	55/=
رابندر ناتھ ٹیگور	ہرن مے بنرجی / اشہر ہاشمی	80/=
جواہر لال نہرو	ایم چلاپتی راؤ / کے پی شرما	105/=
مشعل آزادی	ساغر نظامی	40/=
رامائن — بچوں کے لئے	مترجم: ساوتری	18/=
دنیا کی منتخب لوک کہانیاں	ادارہ	11/=
دھنواں راجہ	مترجم: وشوناتھ سکہ	13/=
ہیرے کی لونگ	ادارہ	5/50
امر شہید گنیش شنکر ودیارتھی	مالتی شنکر	11/=
بھارت خلائی دور میں	موہن سندر راجن	12/=
ہم ایک ہیں	عرش ملسیانی	10/=
پھولوں کی وادی	رفعت سروش	16/=
روشنی کے مینار	مرتب: شہباز حسین	25/=
جاتک کتھائیں	مترجم: راجندر انجم	32/=
ہندوستان کی مسجدیں	ضیاء الدین ڈیسائی	18/=
ہندوستان کے دریا	شیخ سلیم احمد	11/=
پنجاب اور کلو کی کہانیاں	مترجمہ: آمنہ ابوالحسن	27/=
وقت کا مسافر	غلام حیدر	23/=
دادی ماں کی کہانیاں	مولف: مخمور سعیدی	10/=

نوٹ: کتابیں اور رسالے منگوانے کے لئے رقم پیشگی ارسال کریں۔
کتابیں کسی بھی صورت میں وی پی سے نہیں بھیجی جائیں گی۔

ملنے کا پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی

Printed and Published by Suresh Chopra, Director General on behalf of Publications Division
Printed at Aravali Printers & Publishers (P) Ltd. W-30 Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-20
Published at Publications Division, Patiala House, New Delhi-110 001 Editor: M.R. Farooqi

بقیہ ٹائٹل ۲ کا

آجکل کی فائل سے:

مائل نقوی

بھوپال تال اور رانی کملاپتی

ہندوستان میں یہ کہاوت بہت مشہور ہے کہ

تال تو بھوپال تال اور سب تلیاں

رانی تو کملاپتی اور سب گدھیاں

کہاوتوں کی بابت اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ لوگوں اور قوموں کے سیکڑوں سال کے تجربے ہوتے ہیں جنہیں سادہ اور مختصر الفاظ میں ادا کر دیا جاتا ہے۔ ان کے ذریعہ کسی حقیقت کو بیان کیا جاتا ہے یا فطرت کے کسی پوشیدہ ورق پر سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہ باتیں چونکہ اصلیت کے مطابق ہوتی ہیں اس لئے بہت جلد قبول عام حاصل کر کے زبانوں پر جاری ہو جاتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ حال بھوپال تال اور رانی کملاپتی کا بھی ہے۔

بھوپال تال سے گزرنے والے مسافر بھوپال تال دیکھنے کا شوق ضرور اپنے دل میں لئے رہتے ہیں اور جن کو ذرا دیر کے لئے بھی ٹھہرنے کا موقع مل جاتا ہے وہ یہاں کے قابل دید مقامات میں سب سے پہلے تالاب ہی کا رخ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تالاب کو اگرچہ مذہبی اعتبار سے کوئی بڑائی حاصل نہیں پھر بھی اس کے گھاٹوں پر اشنان اور تفریح کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ یہ لوگ جب تالاب کی وسعت اور آس پاس کے شاندار منظر دیکھتے ہیں تو بیساختہ ان کی زبان سے تالاب کے لئے عظمت کے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ لیکن ناظرین کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ بھوپال تال جس کی اتنی کچھ شہرت ہے یہ وہ نہیں ہے۔

اصلی بھوپال تال موجودہ شہر بھوپال سے جنوب کی طرف چند میل کے فاصلے سے شروع ہو کر چالیس میل تک چلا جاتا تھا اور اس کا پانی ڈھائی سو میل مربع سے زیادہ زمین کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھا، اس تالاب کو مالوے کے مشہور فرماں روا راجہ بھوج نے آج سے چودہ سو سال قبل تعمیر کرایا تھا۔

اتنا بڑا تالاب کیوں تعمیر کیا گیا؟ تاریخ اس کا جواب دینے سے خاموش ہے۔ اس لئے اصل سبب کا کھوج لگانے کی غرض سے ان روایتوں کی طرف آنا پڑے گا جو اس علاقے میں نسل در نسل بیان ہوتی چلی آئی ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ مہاراجہ بھوج کو اپنے جسم میں مرض برص کے کچھ آثار نظر آئے۔ راجہ یہ دیکھ کر بہت گھبرا گیا اور سلطنت کے راج ویدوں کو علاج کی طرف متوجہ کیا۔ ان کی جماعت نے آپس میں صلاح مشورے کے بعد یہ علاج تجویز کیا کہ راجہ روزانہ طلوع آفتاب کے وقت چند ایسے نالوں اور ندیوں میں نہایا کرے جن کا پانی خاص قسم کی جھاڑیوں اور درختوں میں سے ہو کر گزرتا ہو۔ یہی تجویز تھی جو تالاب کی صورت میں عمل میں لائی گئی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ راجہ نے ایک رات بڑا ہولناک خواب دیکھا جس میں خود اس کی جان اور خاندان اور حکومت کی تباہی کی طرف اشارہ پایا گیا۔ راجہ نیند سے چونک پڑا۔ صبح ہوتے ہی دربار کے پنڈتوں کو طلب کر کے اپنا خواب بیان کیا اور آنے والی بلا کو ٹالنے کی تدبیر دریافت کی۔ گنوان پنڈتوں نے بتایا کہ راجہ کو دان پن کے لئے خزانوں کے منہ فوراً کھول دینا چاہئے اور ہر روز سات ندیوں اور ۷۷ نالوں میں اشنان کرنے کے بعد راج پاٹ کے کام سنبھالا کرے۔

تیسری روایت جو سب سے معتبر مانی جاتی ہے یہ ہے کہ راجہ بھوج کے باپ راجہ مالی چھترپتی پنوار چندر بنسی کے محل میں کئی رانیاں تھیں۔ ان میں ایک رانی قوم کرد کا اعزاز سب میں بڑھا ہوا تھا۔ جب اس کے یہاں ولادت کا وقت قریب آیا تو راجہ نے دربار کے نجومیوں، جوتشیوں کو بلا کر دریافت کیا کہ یہ ساعت ولادت اولاد کے لئے کیسی ہے۔ سب نے بچار کر دیکھا تو زحل کو تیسرے خانے میں سیدھی نگاہ سے اور مریخ کو پانچویں خانے میں ٹیڑھی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پایا۔ عرض کی کہ مہاراج، یہ ساعت جو اس وقت گزر رہی ہے اس میں جو لڑکا پیدا ہوگا نہایت منحوس ہوگا۔ تمام عمر سخت بیماریوں میں مبتلا رہے گا۔ اس کو کسی پر حکومت کرنے کا حق نہ ہوگا بلکہ دوسروں کی تابعداری کرے گا۔ اور اس کی نحوست سے راج پاٹ ملیامیٹ ہو جائے گا۔ اگر اس ساعت کو ٹال دیا جائے تو بچہ نہایت سعید اور صاحب اقبال ہوگا۔ اس کا نام دنیا میں ہمیشہ رہے گا۔ سب راجاؤں سے خراج لے گا اور راج کو بڑھائے گا۔ اس لئے کہ ڈھائی گھڑی کے بعد سورج چھٹے خانے میں آنے والا ہے۔ ساعت ٹالنے کی غرض سے رانی کو الٹا لٹکا دیا گیا، جب ساعت بدل گئی تو بھوج پیدا ہوا۔ مگر رانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ بعض کا قول ہے کہ رانی کے انتقال کے بعد پیٹ چاک کر کے نکالا گیا تھا۔ جب بھوج کچھ بولنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تو راجہ مالی نے محل میں کڑی تاکید کر دی کہ راج کمار کے سامنے ہرگز ہرگز یہ واقعہ کسی کی زبان پر نہ آنے پائے۔ اس حکم کی پوری طرح تعمیل کی گئی۔

باپ کے بعد جب بھوج راجہ ہوا تو ایک مرتبہ درباریوں اور پنڈتوں کی بہت بڑی جماعت لے کر بمقام سٹھور تیرتھ کرنے گیا، وہاں کے سب برہمن جمع ہو کر راجہ کو آشیرباد دینے اور ناریل پیش کرنے آئے، مگر ایک برہمن لڑکا جو بڑا روشن ضمیر مشہور تھا، حاضر نہ ہوا۔ برہمنوں نے واپس جا کر راجہ کے سامنے نہ جانے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں ایسے مہاپاپی راجہ کے نہ سامنے جاؤں نہ ناریل دوں۔ یہ بات راجہ کے کانوں تک پہنچی۔ اس نے لڑکے کو بلا کر کہا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے تو کوئی ایسا پاپ نہیں کیا ہے، اس پر لڑکے نے راجہ کی پیدائش کا حال بیان کیا۔ تحقیقات سے لڑکے کا بیان صحیح ثابت ہوا۔ اب راجہ کو بڑی فکر ہوئی۔ راجدھانی میں آتے ہی اس نے اپنی حکومت کے جوگی، سادھو، پنڈت، جوتشی سب ہی کو جمع کیا اور پاپ کو ناش کرنے کی ترکیب پوچھی۔ سب نے ایک زبان ہو کر کہا کہ راجہ کو کوئی بڑی تپسیا کرنا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ راجہ کو ایک مقررہ مدت تک ہر روز سورج نکلنے سے پہلے نو ندیوں اور ننانوے نالوں میں اشنان کر کے شیو کے مندر میں جا کر پوجا کرنا پڑے گا۔

راجہ ہر قربانی دینے کے لئے تیار تھا۔ مگر اس زمانے میں جب کہ ذرائع آمد و رفت کی آسانیاں نہ تھیں ہر روز اتنے نالوں، ندیوں تک پہنچنا اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے اشنان سے فارغ ہو جانا امر محال تھا، ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ ہر روز ان نالوں اور ندیوں کا پانی راج محل پر مہیا کرنے کا انتظام کیا جاتا لیکن دشواری یہ آ پڑی کہ گرمی کے موسم میں تمام نالے خشک ہو جاتے تھے اور ان میں ایک قطرہ پانی کا ملنا ممکن نہ تھا، ادھر راجہ کی یہ حالت کہ مارے فکر کے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام تھی۔

آخر دربار کے انجینئروں نے اسکا ایک حل نکال ہی لیا۔ انہوں نے وندھیاچل کے دو سلسلوں کے درمیان ایک ایسے علاقے کا پتہ لگایا جو ننانوے نالوں اور سات ندیوں سے سیراب ہوتا تھا، اب دو ندیوں کی تلاش باقی رہ گئی۔ بہت دور وسط ہند کا مشہور دریا بیتوا بہتا تھا۔ اس کو بھی انہوں نے اپنی فہرست میں داخل کیا۔ اب صرف ایک ندی رہ گئی۔ مگر وادی میں

باقی ٹائٹل ۳ پر

ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمٰن فاروقی
فون: 3386994

اسسٹنٹ ایڈیٹر
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر
محمد کاظم

جلد: ۶۰ شمارہ: ۵
دسمبر ۲۰۰۱ء اگرہن۔پوس شک ۱۹۲۳

سرورق: برجند رسیال
کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ سی آہوجہ

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ: سات روپے سالانہ: ۷۰ روپے
دو سال: ۱۳۵ روپے تین سال: ۱۹۰ روپے
امریکہ یورپ اور دوسرے ممالک کیلئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۰۰ روپے سالانہ
پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۵۰۰ روپے سالانہ

خریداری اور اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر، ڈائریکٹر جنرل، پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتہ پر بھیجیں
سرکولیشن منیجر 'آجکل' ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر کے پورم نئی دہلی۔۶۶
رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتوں کیلئے بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱

ترتیب

ڈاکٹر ناظم جعفری



کالی داس گپتا رضا



بچپن سے سنتے آئے ہیں کہ بچوں کا نام سمجھ کر رکھو۔ اس کا اثر ان کی تمام زندگی پر پڑتا ہے۔ اس لئے لوگ اپنے اپنے طور پر قرآن یا گیتا سے، مولوی یا پنڈت سے بچے کی پیدائش پر اس کا نام رکھواتے ہیں۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے یا غلط یہ ایک الگ مسئلہ ہے مگر کچھ واقعات و مشاہدات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کی شخصیات میں ان کے نام کا اثر واضح طور پر دیکھنے کو ملتا ہے اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہمارے محترم کالی داس گپتا رضا مرحوم کی ذات ہے۔ ان کے نام کو اگر الگ الگ طور پر دیکھا جائے تو تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

'کالی داس' ان کا اصل نام ہے جو یقیناً ان کے والدین نے رکھا ہوگا۔ یہ ایک ایسا نام ہے جو رضا صاحب سے پہلے ہی تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ سنسکرت زبان کا جید عالم اور ادیب جو آج بھی دنیا کی کئی زبان کے قلم کار کے بالمقابل رکھا جا سکتا ہے۔ رضا صاحب کا ستارہ بھی اسی برج میں آتا ہے جہاں کالی داس (اول) کا ستارہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی ہی میں ادب میں ایک غیر معمولی مقام حاصل کر لیا تھا۔ میری طرح ہندوستان اور پاکستان اور اردو والوں کی دوسری بستیوں میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے رضا صاحب کو بھی نہیں دیکھا اور نہ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ رہا مگر ان کی تصانیف اور ان کی شاعری سے برابر مستفید ہوتے رہے اور وقتاً فوقتاً ان کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار بھی کیا۔

رضا صاحب کے نام کے ساتھ 'گپتا' اس لئے لگا تھا کہ ان کا تعلق اگروال خاندان سے تھا جو کہ تجارت کے لئے مشہور ہے۔ رضا صاحب نے بھی تجارت کے جوہر اپنے کینیا کے قیام کے دوران خوب دکھائے اور ایک انتہائی کامیاب تاجر کی طرح عمر کے بیس سال کینیا میں گزارے، مگر تجارتی مصروفیات ادبی ذوق کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ آخر کار وطن لوٹ کر ادبی سرگرمیوں میں معروف ہو گئے۔

کالی داس گپتا نے اپنا تخلص رضا رکھا۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ ان کا بچپن ایسے ماحول میں گزرا تھا جہاں ماہ محرم میں عزاداری ہوتی تھی اور اس میں ان کے گھر کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے۔ اس ماحول نے انہیں امام رضا کا گرویدہ بنایا اور اسی مناسبت سے انہوں نے اپنا تخلص رضا رکھا۔ اس کا اعتراف خود رضا صاحب نے علی سردار جعفری سے اپنے ایک انٹرویو میں کیا ہے۔ کہتے ہیں:

> "ہمارے یہاں تعزیہ داری ہر سال ہوتی تھی۔ جی ہاں محرم میں۔ اس میں میرے والد محترم، چونکہ ہمارے خاندان میں یہ روایت چلی آرہی تھی، سبیلیں لگایا کرتے تھے۔ ہمارا خاندان آریہ سماجی ہے، وہ بہت شوق سے سبیلیں لگاتے اور ہم سب یوں کہیے کہ تشنگان راہ کربلا کی پیاس بجھاتے اور میں تعزیہ والوں کو سوز پڑھتے دیکھتا، نوحے وغیرہ۔ ہمارے یہاں مکان کے آگے ایک چھوٹا سا میدان ہے وہاں تعزیہ دار سوز پڑھتے تو بڑا لطف آتا اور تنہائی میں میں انہیں گنگناتا۔ شاید وہیں سے مجھے رضا کا نام ملا۔ اردو میں میں نے شعر کہنے شروع کر دئے۔"

اس دعوے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ کالی داس کی شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی۔ حالانکہ عام طور پر اردو کے شعرا غزل سے ابتدا کرتے ہیں اور غزل ہی کو منزل مقصود بنا کر درجہ کمال تک پہنچنے کی فکر میں ساری عمر گزار دیتے ہیں۔

کالی داس گپتا رضا کی ادبی زندگی اتنی پہلودار ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں ان کی شخصیت کا احاطہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ محقق، نقاد، شاعر، ادیب اور مرتب کی حیثیت سے ان کے جو کارنامے سامنے آئے ہیں ان کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ انہوں نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہندوستانی سماج اور کلچر کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب اور رسم و رواج سے متعلق ان کا جو کلام ہے وہ انہیں برج نارائن چکبست اور درگا سہائے سرور جیسے شاعروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ ہندوستانی ثقافت و تہذیب کی ترجمانی، صالح اقدار کی نمائندگی اور انسان دوستی کا فروغ ان کی شاعری کا محور ہے۔ رضا صاحب مجموعی طور پر ایک اچھے شاعر تھے، ہر رنگ میں کہنے والے۔ ان کے چار دیوان شائع ہو چکے ہیں، اس میں غزلیں، رباعیاں، قطعات، منقبت، منظوم ترجمے، سیاسی سماجی شاعری، مذہبی شاعری۔ کوئی صنف ایسی نہیں جو ان کے دائرہ فکر سے باہر رہی ہو۔ لیکن وہ مشاعروں اور رسالوں میں زیادہ نظر نہیں آئے۔ گمان غالب ہے کہ شاعری انہوں نے سوز تمام کے ہاتھوں مجبور ہو کر

حکیم جعفر روڈ، دوال منڈی، بنارس۔ ۲۲۱۰۰۱

اظہار شکست کے طور پر اختیار کی اور اس میں وہ اپنی پوری قوت صرف کر کے شہرت حاصل کرنا نہیں چاہتے تھے۔

رضا صاحب ہندو تھے مگر انہوں نے تمام مذاہب کا احترام کیا۔ یہی نہیں دوسرے مذاہب سے قلبی لگاؤ کا اظہار اس طرح کیا کہ اس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے ملے گی۔ انہوں نے مسلمان، سکھ، عیسائی پارسی سبھی سے یکساں مراسم رکھے اور سب کا احترام خلوص دل سے کرتے رہے۔ انہوں نے واقعات کربلا پر انتہائی پر اثر مرثیہ لکھا۔ نعتیں، قطعات اور رباعیات میں جگہ جگہ اس کا اظہار کرتے رہے۔ منقبت کے اشعار بھی کثرت سے کہے۔ اس کے علاوہ گرونانک، کرشن کنہیا اور ٹیگور و اقبال پر بھی ان کی نظمیں موجود ہیں۔ "ہند کا پالن اور رفیقی شعو" کے عنوان سے ایک محب وطن کی حیثیت سے انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

رضا صاحب کو ہندوستان کے ہر مذہب سے محبت تھی۔ انہیں ہندوستان کی تہذیب میں روحانیت نظر آتی تھی اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ رضا صاحب ایک سیکولر ادیب ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ لیکن ان کا سیکولرازم لامذہبیت نہیں ہمہ مذہبیت کی شکل میں نمایاں ہوا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رضا صاحب اصلاً غزل کے شاعر تھے مگر میرے نزدیک ان کے فن اور قدرت کلام کا اظہار نظموں میں زیادہ بھرپور طور پر ہوا ہے۔ چاہے وہ طبع زاد نظمیں ہوں یا تراجم۔ ذاتی کرب اور احساس کا ادھورا پن جس شدت کے ساتھ ان کی نظموں میں ظاہر ہوا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ رضا کی شاعری کھلی فضاؤں کی طرح آزاد ہوتے ہوئے بھی فن کے مخصوص دائروں سے باہر نہیں جاتی۔ انہوں نے اپنی شاعری کو مصنوعی حد بندیوں سے پاک رکھا ہے۔ تخیل کی لطافتوں اور نزاکتوں کو بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے، اور یہی ان کا اپنا مخصوص رنگ ہے۔

کوئی پختہ کار شاعر جب اپنے فن کا اظہار اس صورت میں کرنا چاہتا ہے کہ اسے اہل نظر کے سامنے اعتبار حاصل ہو جائے تو وہ رباعی کا سہارا لیتا ہے۔ یہ صنف اپنے فنی تقاضوں کی بنا پر قادر الکلام شعرا کے لئے بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان تقاضوں سے کماحقہ عہدہ برآ ہونا ایک عمر کی ریاضت کے بغیر ناممکن ہے۔ رضا صاحب بھی رباعی کی صنف کی جانب ملتفت نظر آتے ہیں اور اپنے اس تجربے میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ یہ ان کی فنکارانہ مہارت اور چابکدستی کی دلیل ہے۔

رضا صاحب کی رباعیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> "جو شخص تحقیق میں سر کھپاتا ہو اس کی طبیعت کو مشکل پسندی سے ایک گونہ مناسبت تو ہوگی ہی۔ رباعی کو مشکل صنف کہا گیا ہے۔ شاید ہیئت کے اعتبار سے نہیں معنی کے اعتبار سے کہ تین مصرعوں میں بات کو کھولنا اور چوتھے میں مکمل کرنا۔ یعنی ایسی بات پیدا کرنا جو تین مصرعوں میں نکل سکے اور چوتھے مصرعے میں مکمل بلکہ اکمل اس طرح سے ہو کہ نکتہ آفرینی کا حق ادا ہو جائے۔ یہ ہے رباعی کا کمال۔ کتنے اہل قلم اس پر پورے اترتے ہیں۔ چار مصرعوں کی جگل بندی تو سب کر لیتے ہیں۔ رضا کی رباعیوں کو پڑھ کر خوشی یوں ہوئی کہ ان میں خیال کی تحلی کو پکڑنے، اس کے رنگوں کو گرفت میں لینے اور ان سے اظہار کا ہیولا تیار کرنے کا جوہر ملتا ہے۔" (رضا نمبر تناظر صفحہ ۲۴۷)

شاید اسی لئے شمس الرحمٰن فاروقی نے رضا صاحب کو رمز شناس رباعی گو کہا ہے۔

تخلیق شعر کے بارے میں عام طور پر جو نظریات پائے جاتے ہیں، ان میں دو نظریے بطور خاص اہم ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ شاعر پر شعر و سخن کی کیفیت بلاارادہ طاری ہوتی ہے اور شاعر شعر کہنے پر اس طرح مجبور ہوتا ہے جیسے خوشبو ہوا کے دوش پر سفر کرنے پر یعنی شعر کی تخلیق میں شعور کو براہ راست دخل نہیں ہوتا۔ دوسرے نظریے کے مطابق شعر کی تخلیق میں شعور کا دخل بے حد ضروری ہے۔ شعر یا وحشت یا جنون سے وجود میں نہیں آتا۔ اور نہ تو الہامی کیفیت کی دین ہوتا ہے بلکہ انسانی تخیل، فکری تلازمات اور تصورات کے سمندر میں نرم و نازک لہروں کے درمیان ہلکا سا طوفان پیدا کر کے ایک پیکر تیار کرتا ہے جو ذہن کے کسی نامعلوم گوشے میں پہلے سے موجود رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں نظریوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مناسب نہیں جب یہ دونوں کیفیتیں بیک وقت یکجا ہوتی ہیں تبھی کوئی اچھا شعر وجود میں آتا ہے۔

کالی داس گپتا رضا کے کلام پر نظر ڈالنے سے پتا چلتا ہے کہ ان کی شاعری میں ان دونوں ہی کیفیتوں کی کارفرمائی موجود ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں صرف رومانی ماحول یا خشک حکیمانہ فضا نہیں ملتی بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے ایک تیسرا نیا راستہ نکل آیا ہے جسے کالی داس گپتا کی اپنی دریافت کہا جا سکتا ہے۔ کالی داس روشن ضمیر، روشن خیال اور ترقی پسند خیالات والے شاعر ہیں۔ وہ ظلم و ناانصافی، تعصب و تنگ نظری اور ہر قسم کے استبداد و استحصال کے خلاف نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ رضا صاحب کا کینوس کافی بڑا ہے خصوصاً محبت کو وہ کسی مخصوص دائرے میں نہیں رکھنا چاہتے۔ اسے ایک آفاقی جذبے کے طور پر برتنا ان کا محبوب انداز ہے۔ انسان سے محبت، انسانی رشتوں سے محبت، وطن سے محبت ان کے نزدیک ایک ایسا فطری تقاضا ہے جس سے کوئی باہوش انسان بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ ان کے یہ قطعات ان کے اس مسلک کی نشان دہی کرتے ہیں۔

آدمی جانتا ہوں مفلس کو — بے زروں کو بشر سمجھتا ہوں
عیب جوئی نہیں مرا مسلک — سنگ ریزوں کو زر سمجھتا ہوں

یا

فطرتاً سادگی سے نہیں مانوس — صاف سچا بیان ہے اپنا
ہم کو پہچاننا نہیں مشکل — درد مندی نشان ہے اپنا

رضا صاحب اپنے دیگر ہم عصروں سے قدرے مختلف ہیں وہ اپنے کل، آج اور آئندہ یعنی تینوں یگوں میں پوری طرح زندہ ہیں ایسے شاعر کو کبھی مخصوص عہد میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ رضا صاحب نے اپنے شب و روز دوسرے شعرا کی بہ نسبت مختلف انداز میں گزارے ہیں۔ مگر اس زمین و آسمان کے درمیان رہنے والے ہر شخص کے ہمدوش و ہم سفر رہے۔ ان کے غم ان کی خوشیاں ان کی اپنی بھی ہیں اور دوسروں کی بھی۔ غم و اندوہ کے حصار سے آزادی کی خواہش اور ایک پر سکون اور نشاط آگیں ماحول میں

سانس لینے کی فرصت نہیں ہے۔ وقت مضطرب بھی رکھتی ہے اور ان کی قوت عمل کو مہمیز بھی کرتی رہتی ہے۔ ان کیفیتوں کی آمیزش سے انہوں نے اپنی شاعری کی جو قوس وقزح تیار کی ہے اس کے رنگ کتنے پرکشش اور دلآویز ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

ٹھٹھرتی رات بھی ہے کوئی جاگتا بھی نہیں — الاؤ جلتا ہے تھوڑی سی آگ ہی لے لیں

اڑتے بکھرتے ہوئے رکھتے ہیں شعور ہستی — ہم غباروں کی طرح جوش سے پھٹ جاتے ہیں

ذہنوں سے شرر پھوٹیں حرفوں سے دھواں اٹھے — اب جو بھی نتیجہ ہو اک آگ لگالی ہے

گھورتی آنکھیں ہزاروں ایک میں — ان گنت تارے اکیلا آسماں

جگمگا اٹھی رات بن باتی — رکھ دیا دل چراغ میں کس نے

میں ان گہرائیوں میں ہوں جہاں اب — سمندر بھی کنارا ہو گیا ہے

ہم افق تا بہ افق اونچے مکانوں میں رہے — اک مکاں بھی نہ ملا قصر بدن سے اونچا

آج دیر و حرم کھلے رکھو — آج دن ہے گناہ گاروں کا

اچھا ہوا کہ ہم کو جہنم ہوا نصیب — ہر اک گناہ آتش دوزخ میں جل گیا

روتے روتے تھک گئے رک رک کے دم آنے لگا — ہچکیوں نے آ کے ٹکڑے کر دیئے فریاد کے

شعر و شاعری سے ہٹ کر اگر کالی داس صاحب کی نثری کاوشوں پر غور کیا جائے تو ان کا تجزیہ بھی آسان نہیں ہے۔ سوانحی خاکے، تنقیدی تبصرے، تحقیقی مقالے، عروضی مسائل اور فنی مباحث۔ ان تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ یہ وہ میدان ہیں جنہیں عمیق مشاہدے، منطقی استدلال، تحقیقی ریاضت اور تنقیدی توازن کے بغیر سر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ عروض، صرف و نحو اور فارسی و عربی سے بقدر ضرورت عبور نیز ادبیات و شخصیات سے کماحقہ واقفیت انتہائی ضروری و لازمی ہے۔ مزید برآں اصول پسندی غیر جانب داری، بے تعصبی اور حق گوئی و بے باکی کے بغیر کوئی محقق اپنی تلاش میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

کالی داس گپتا قابل رشک محقق ہیں اور یہ رشک ایسا بھی نہیں کہ اس کا سر قلم کر کے اسے شک کے دائرے میں لے آیا جائے۔ اصل محقق سند یافتہ محققین کی بھیڑ میں گم تو ہو سکتا ہے مگر اس کا وقفہ گمنامی طویل نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جذبات کا تعلق تحقیق سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ اور جو لوگ جذبات کی رو میں آسانی سے بہہ جاتے ہیں ان کی نظر انتخاب کبھی معتبر نہیں ہو سکتی۔

کسی بھی محقق کے اندر چند صفات کا موجود ہونا بے حد ضروری ہے۔ مثلاً وسیع مطالعہ، بہترین حافظہ، غور و فکر کی عادت، محنت کرنے کی لگن وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس کے مزاج میں عجلت پسندی اور شہرت طلبی کی ہوس نہ ہو اور بے باکی و حق گوئی اس کا نصب العین ہو۔ ایک ایماندار محقق جب قلم اٹھاتا ہے تو ادب اور ادیب کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہوتی ہے کہ اسے کسی طرح کا خوف یا لالچ نہیں ہوتا۔ میری اس بات کو محترم ڈاکٹر گیان چند کی تحریر سے تقویت ملتی ہے۔ کالی داس گپتا رضا کے بارے میں گیان چند صاحب لکھتے ہیں:

> "تحقیق میں آپ کچھ لکھنے سے قبل جملہ مواد کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہایت حزم و احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ آپ نے تحقیقی یادداشتوں کی تقریباً ڈیڑھ سو فائلیں تیار کر رکھی ہیں۔ امید ہے کہ وقت کے ساتھ ان کے تحقیقی کام سامنے آتے جائیں گے۔ یہ یاد رہے کہ اردو ان کا ضمنی شغل ہے لیکن وہ اپنے کاروباری دفتر میں صرف تین گھنٹے بیٹھتے ہیں اور اردو کے مطالعے کو روزانہ کم و بیش دس گھنٹے دیتے ہیں۔ درسگاہوں والے دھیان دیں۔"

(متعلقات غالب تعارف از گیان چند، صفحہ ۹)

کالی داس گپتا رضا کے پاس اردو کی بڑی بڑی ڈگریاں نہیں تھیں۔ وہ ان کی کمی کو محسوس کر کے کبھی احساس کمتری کا شکار بھی نہیں ہوئے۔ اپنی آپ بیتی میں انہوں نے لکھا ہے:

> "میری تعلیم کچھ زیادہ نہیں ہے میں نے اردو فارسی پنجاب یونیورسٹی کے ادیب فاضل اور منشی فاضل تک، انگریزی کیمبرج کے سینئر سرٹیفکیٹ تک پڑھی۔ مگر اس نصابی تعلیم کی کمی کو میں نے ایک حد تک اکتسابی تعلیم سے پورا کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ میں نے کم و بیش تین ہزار کتابیں اردو فارسی انگریزی کی حرف بہ حرف پڑھی ہوں گی اور تقریباً اتنی ہی کتابوں کا جزوی طور پر مطالعہ کیا ہوگا۔ مختلف رسائل بھی ہزاروں کی تعداد میں نظر سے گزرے ہوں گے۔ حوالے کی کتابوں کی ورق گردانی تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ کاروبار کے علاوہ ہر روز تقریباً دس گھنٹے پڑھنے لکھنے کی نذر ہوتے ہیں۔"

(تناظر صفحہ ۶۵۸)

رضا صاحب کو بچپن میں پامسٹری کا شوق تھا۔ یہ زیادہ آگے نہیں بڑھ سکا۔ دوسرا شوق شطرنج کھیلنے کا تھا۔ افریقہ جا کر انہوں نے اس شغل کو بھی ختم کر دیا۔ ان کی جیسی مصروف زندگی میں کوئی اس کھیل کے لئے وقت نہیں نکال سکتا کیونکہ اس کے لئے فراغت اور غیر معمولی انہماک کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا تیسرا شغل موسیقی سے دلچسپی کا تھا۔ وہ گانے کے اصول و آداب سے واقف تھے اور اس کا عملی تجربہ بھی رکھتے تھے مگر ان کا رجحان سازوں کی طرف زیادہ تھا چنانچہ انہوں نے طبلے اور ستار کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ ایک اور فن جس میں وہ ماہر تھے وہ ہومیوپیتھک طریقہ علاج تھا۔ ان کے پاس اس فن کی بہت سی کتابیں موجود تھیں جنہیں وہ بغور پڑھ چکے تھے۔ روزانہ صبح کو گھنٹہ دو گھنٹہ مریضوں کو بھی دیکھ لیتے تھے۔

رضا صاحب اتنی مختلف النوع مصروفیات کے باوجود بھی ادب کے لئے اتنا وقت نکال لیتے تھے یہ بڑی بات ہے اس سے ان کی اردو زبان و ادب سے دلچسپی ظاہر

ہوتی ہے۔ معروف کاروباری زندگی گزارنے والوں میں شاید ہی ایسا کوئی دوسرا شخص ہو جس نے اردو کی اس قدر خدمت کی ہو۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے لئے ایک بڑا مسئلہ اپنی تصنیفات و تخلیقات کی طباعت و اشاعت کا ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنے ادیب اور شاعر یہ تمنا لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں کہ ان کی نگارشات بھی چھپ کر منظر عام پر آئیں اور انہیں بھی دوسروں کی طرح روشناس خلق ہونے کا موقع ملے۔ رضا صاحب اس منزل سے بھی بہ آسانی گزر گئے۔ اللہ کا دیا اتنا تھا کہ اپنے کلام اور اپنی تصانیف کی اشاعت کے ساتھ ساتھ وہ دوسروں کے کلام اور ادبی کاوشوں کو بھی روشناس کرواتے رہتے تھے۔ ان کو اس کی بھی فکر نہیں تھی کہ شائع شدہ کتابیں کوئی خریدتا ہے یا نہیں۔ وہ اپنی تصانیف بہت سے لوگوں کو تحفتاً بھیجتے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اوسط درجے کے ایسے بہت سے اہل علم کو بھی جو بصورت دیگر ان کتابوں سے ناواقف رہتے ان سے استفادے کے مواقع حاصل ہو گئے اور ان کی معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ ان کی شائع شدہ کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) مکتوبات جوش ملسیانی بنام رضا:

اس کتاب میں رضا صاحب نے جوش ملسیانی کے خطوط بڑی خوبصورتی سے معہ حاشیے کے شائع کئے ہیں۔ ساتھ ہی اردو کے متروک اور غیر متروک لفظوں پر تبصرہ کیا ہے۔ لفظوں میں زیر و زبر پر بھی مختصر ابحث کی ہے۔

(۲) منشورات جوش ملسیانی:

اس مجموعے میں بیشتر مضامین کا تعلق زبان و بیان سے ہے۔ انہوں نے املا کی خاص غلطیوں میں مرکب لفظوں کے اہم اجزا کو الگ الگ لکھنے کی سفارش کی ہے جیسے بے کار وغیرہ۔

(۳) دعائے صباح:

عربی دعائے صباح کا فارسی ترجمہ نثر اور نظم دونوں میں غالب نے کیا ہے۔ اور یہ کئی بار مختلف عنوانات سے شائع ہو چکا ہے۔ رضا صاحب نے اسے ایک بار پھر شائع کیا ہے۔ اس میں کتابت کی غلطیوں کی اصلاح بھی کی ہے۔

(۴) چکبست اور باقیات چکبست:

یہ رضا صاحب کا ایک بڑا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں چکبست کی نظم و نثر کی وہ تحریریں یکجا کر دی گئی ہیں جو ان کے مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔

(۵) انتخاب آتش و غالب از چکبست:

اپنے رسالے "صبح امید" میں چکبست نے "بادہ کہن" کے عنوان سے آتش و غالب کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ یہ چکبست کی اپنی پسند تھی جسے جمع کر کے رضا صاحب نے شائع کر دیا۔

(۶) کلیات چکبست:

یہ ایک معتبر محقق کا معتبر کارنامہ ہے (بقول گیان چند) اس کتاب میں رضا صاحب نے اس عام رائے کی تردید کی ہے کہ چکبست غالب و آتش کے مقلد تھے۔ انہوں نے مدلل طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ غالب و آتش کا رنگ اور ہے چکبست کا اور۔

(۷) مقالات چکبست:

اس میں چکبست کی متفرق تحریریں شامل ہیں۔ آخری حصہ اشاریہ ہے۔ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

> "رضا صاحب نے چکبست کے سلسلے میں جو وقیع کام کیا ہے وہ ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری سے بھی زیادہ ہے، جو محقق ڈگری سے بے نیاز ہو کر اپنے طور پر تحقیق کرتے ہیں وہی تحقیق کے بہتر اور پائیدار کارنامے پیش کرتے ہیں۔ جہاں تک چکبست کا سوال ہے ان کے سب سے بڑے محقق محب اور محسن کالی داس گپتا ہی ہیں۔"

(ڈاکٹر گیان چند۔ تناظر صفحہ ۲۱۱)

(۸) متعلقات غالب:

یہ مجموعہ کل چھ مضامین پر مشتمل ہے، جن میں سے صرف ایک براہ راست غالب پر ہے۔ باقی سب غالب کے اقربا و تلامذہ کے بارے میں ہیں۔ ان سارے مضامین میں دلچسپی پر افادیت کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔

(۹) سہو و دو سراغ:

اس مجموعہ میں تحقیقی اور تخلیقی دونوں نوعیت کے مضامین شامل ہیں۔

(۱۰) غالبیات چند عنوانات:

یہ رضا صاحب کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اور اتفاق سے غالبیات کے سلسلے کی بھی ان کی تیسری کتاب ہے۔ اس مجموعے میں جو مضامین شامل ہیں اسی قسم اور اسی پائے کی تحریروں کی بنا پر رضا صاحب غالبیات کے میدان میں ایک معتبر مقام بنانے میں کامیاب ہوئے۔

(۱۱) دیوان غالب کامل (تاریخی ترتیب سے):

یہ غالبیات کے سلسلے کا رضا صاحب کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ ہے۔ اس دیوان میں غالب کا تمام متداول اور غیر متداول کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔ دیوان غالب نسخہ عرشی کے بعد یہ اس سلسلے کی سب سے زیادہ معتبر اور مفید و کار آمد کوشش ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ نظر ثانی کے بعد دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں طبع ہوا۔ ایک ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں پاکستان سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ دراصل پہلے ہندوستانی ایڈیشن کی بازاشاعت ہے۔ اسی پاکستانی ایڈیشن کی مزید دو اشاعتیں ۱۹۹۴ء اور ۹۷-۱۹۹۶ء میں چھپ کر عام ہو چکی ہیں۔

(۱۲) ہندوستانی مشرقی افریقہ میں:

یہ صرف ۱۲۸ صفحات کی ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں رضا صاحب نے مشرقی افریقہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور وہاں کے حالات قلم بند کئے ہیں۔ اس میں وہاں بسے ہوئے چند ہندوستانیوں کا تذکرہ بھی ہے۔

نثری تصانیف کے پہلو بہ پہلو رضا صاحب کے متعدد شعری مجموعے شائع ہو کر سامنے آ چکے ہیں۔ انہیں مختلف اصناف پر جو قدرت حاصل تھی یہ مجموعے اس کا

منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہی شعور اور رنگارنگی ان کی شاعری کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز ہے۔

شعلۂ خاموش: رضا صاحب کا پہلا شعری مجموعہ جو شاعری کی مختلف اصناف پر مشتمل ہے۔

شورشِ پنہاں: یہ بھی غزلوں، نظموں اور رباعیات و قطعات کا مجموعہ ہے۔

شاخِ گل: یہ ہندوستان واپسی کے بعد کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں طبع زاد نظموں کے ساتھ ساتھ کچھ انگریزی نظموں کے ترجمے بھی شامل ہیں۔

اجالے: مذہبی کلام کا مجموعہ ہے۔ نعت و منقبت وغیرہ۔

شعورِ غم: اعجاز سیمابی کا مرتبہ کردہ مجموعہ جس میں زیادہ تر کلام اجالے سے ماخوذ ہے۔

شعاعِ جاوید: ۱۶۳ رباعیوں کا مجموعہ جسے بلراج ورما نے ترتیب دیا ہے۔

شب نشین: یہ مجموعہ ۳۱ مارچ ۱۹۸۳ء تک کے کلام کا احاطہ کرتا ہے اور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ شب نشین نظموں کا ہے۔ اور دوسرا حصہ "شاہدِ صبح" غزلوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

غزل گلاب: رضا صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جس کی اشاعت ۱۹۹۲ء میں ہوئی ہے۔ اس میں کل ۱۵۱ غزلیں ہیں۔ رضا صاحب کی شاعری کا حسن ان کا اسلوب و لفظیات اور نئے طرزِ اظہار اور رموز و علائم کے ساتھ فن کی اساسی قدروں کو برقرار رکھنے میں مضمر ہے۔

کالی داس گپتا رضا نے اردو کی خدمت جس انداز اور جس انہماک سے کی ہے اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ شاعری، تنقید اور تبصرے سب کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن رضا صاحب کا اصل میدان تحقیق ہے۔ اس میدان میں ان کے دو کارنامے ایسے ہیں جو انہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ ان میں ایک کا تعلق غالب سے اور دوسرے کا برج نارائن چکبست سے ہے۔ رضا صاحب نے دیوانِ غالب کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دے کر غالب کے محققین و ناقدین کے لئے یہ آسانی فراہم کر دی کہ وہ وقت، حالات اور ماحول کی تبدیلیوں کے پس منظر میں ان کی فکر اور فن کے عہد بہ عہد ارتقا اور کلام کے داخلی و خارجی محرکات کا پورے اعتماد کے ساتھ جائزہ لے سکتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے چکبست کے تمام مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کی ادھر ادھر منتشر متفرق تحریروں کو یکجا کر کے انہیں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اردو ادب میں چکبست کی جو اہمیت ہے اس کے پیش نظر یہ کام توجہ کا مستحق تھا۔ رضا صاحب نے اس کی ضرورت محسوس کی اور اسے سرانجام دے کر محسنینِ ادب کی صف میں شامل ہو گئے۔

کالی داس گپتا رضا اب ہمارے درمیان موجود نہیں مگر جو شمع وہ جلا گئے وہ ہمیشہ روشن رہے گی۔ ان کے علمی و تحقیقی کارنامے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ان کی وفات کے بعد ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تمام کارناموں کا پوری غیر جانبداری کے ساتھ خالص علمی انداز میں جائزہ لے کر ادب میں رضا صاحب کے مقام کا تعین کیا جائے اور جن کاموں کو وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں انہیں مکمل کر کے اس مشن کی تکمیل کی جائے جس کی خاطر انہوں نے وقت اور پیسے دونوں کی قربانی سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ ان کے کتب خانے کے تحفظ کا ہے جو اپنے نوادر بالخصوص ذخیرہ غالبیات کی وجہ سے ملک کے انتہائی بیش قیمت کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔

☆☆☆

نذیر فتح پوری

مثنوی، تعارفِ گپتا رضا

شکر کیجیے اس خدائے پاک کا — لفظ و معنی کا ہنر جس نے دیا
عقل و دانش کی عطا کی روشنی — ہم کو بخشی ہے متاعِ آگہی
کر کے روشن آرزوؤں کے دیے — راز کتنے منکشف ہم پر کیے
اور بخشا سوچنے والا دماغ — تاکہ ہم تخلیق کا پالیں سراغ
بے زبانوں کو زباں دی شعر کی — اور بھر دی اس میں فن کی روشنی
بعد میں تخلیق دی، تحریر دی — اور پھر تنقید بھی، تحقیق بھی
ایک سے بڑھ کر اک دے اہلِ قلم — جن سے قائم فکر و فن کا ہے بھرم
میر اور غالب کے جیسے بے مثال — ذوق اور مومن کے جیسے باکمال
داغ اور اقبال جیسے منفرد — ہم نے پائے کیسے کیسے منفرد
یوں ملے دیر و حرم کے سلسلے — جوش اور چکبست بھی ہم کو دیے

جن کی خاطر آج یہ محفل بجی
ہیں قلم قرطاس کے یہ بھی دھنی

ساٹھ سے زائد کتابیں آپ کی — ہر طرف پھیلا رہی ہیں روشنی
معتبر ہے ان کا سب لکھا ہوا — مستند ہے ان کا فرمایا ہوا
یہ تخیل میں کبھی بہتے نہیں — بے حوالہ بات کچھ کہتے نہیں
آپ مفروضوں کے آگے کب جھکے — بے نشاں رستوں ہی پہ آگے بڑھے
رنگ بخشے دیدۂ خوں ناب کے — حرف روشن کر دیے اوراک سے
تول کر ہر لفظ کو میزان میں — رنگ بھرتے ہیں خیالستان میں
تازہ دم، تازہ قلم، تازہ دماغ — آپ ہیں تخلیق کے سرسبز باغ
آپ اردو کے گگن کا چاند ہیں — ان کے آگے سب ستارے ماند ہیں
ہر طرف ہے تازگی احساس کی — چار جانب بات کالی داس کی
کیا کہوں میں شاعری کی آب کی — نظم نامہ بھی، غزل محراب کی
ہے رباعی آپ کی صنفِ عزیز — فن میں یکتا، مثنوی میں باتمیز

ابتدا حالی نے کی جس کام کی
آپ نے اس کو مکمل کر دیا
تشنہ تھے غالب کے بادہ کش ابھی
آپ نے ان سب کا ساغر بھر دیا

سائرہ منزل، ۱۰۲/بی/۲۳۰۔ وماں درشن، لوہیگاؤں، پونے ۴۱۱۰۳۲

عبدالاحد ساز



گپتا رضا کی غزل گوئی

کالی داس گپتا رضا صاحب مرحوم شعر و ادب کے اس مقام پر اپنی عمر عزیز کے ہکلے سے بہت پہلے ہی پہنچ چکے تھے، جہاں ایک مستند شاعر اپنی طویل فنی خدمات اور اپنے شعری سرمائے کی مسلمہ و مصدقہ حیثیت پر مطمئن اور اس کے سامع و قاری اس کی خاموشی پر بہ صد احترام قانع ہو چکے ہوتے ہیں۔ ایسے میں اگر وہ فنکار نئی اور شگفتہ دھنوں کے ساتھ اپنی نغمہ سرائی جاری رکھے، بلکہ اس کی تازگی و ندرت بھی روز افزوں ہو، تو یہ اس کے پرستاروں کے لئے تسکین و سرشاری کی ایک دیگر ہی صورت ہوتی ہے۔ رضا صاحب کے تواتر شعر گوئی کی یہی کیفیت ان کی آخری سانسوں تک رہی۔ ان کا آخری شعری مجموعہ "ابھی ناؤ نہ باندھو" ۱۹۹۹ء کے اوائل میں شائع ہوا جو ان کی ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۸ء کے دوران کہی گئی تازہ غزلوں اور ان کے ساتھ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۹۳ء تک کہی گئی غزلوں کے مبسوط انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس طرح نصف صدی سے زیادہ پر محیط ان کی غزلیہ شاعری کی یہ ایک سیر حاصل نمائندگی ہے۔ تعداد کے لحاظ سے یہ ان کی چودھویں شعری تصنیف ہے جس پر مستزاد یہ کہ اسی دہائی میں ان کی غزلوں، نظموں اور نعتوں کے تین مجموعے علی الترتیب "غزل گلاب، نظم سمندر" اور "احترام" شائع ہو چکے ہیں۔ غزل کے علاوہ بیشتر پابند اصناف نظم، آزاد نظم اور رباعی بھی رضا صاحب کے شعری اظہار کا اہم حصہ ہیں۔ ان کے ابتدائی مجموعوں "شعلہ خاموش" اور "شورش پنہاں" میں بھی غزلوں کے ساتھ نظمیں شامل ہیں اور رباعیات کا الگ سے ایک مجموعہ "شعاع جاوید" ۱۹۸۵ء میں آ چکا ہے۔ تاہم ان کے شعری کردار کی بھرپور نمائندگی ان کی غزل ہی کرتی ہے۔ کیفیت کے اعتبار سے بھی اور کمیت کی رو سے بھی۔ کالی داس گپتا رضا صاحب پر بہ حیثیت ماہر غالبیات، بطور محقق و مولف اور ان کی ادبی شخصیت کے دیگر پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، مگر ان کے کلام پر ناقدین کی توجہ نسبتاً کم مرکوز ہوئی ہے اور اس دائرے میں بہت کچھ لکھا جانا بھی باقی ہے۔

رضا صاحب کی پختہ کلامی، کہنہ مشقی، شعر گوئی اور فنی دسترس کے بارے میں کچھ کہنا تو محض اک اعادہ ہی ہوگا کہ یہ اوصاف کب کے تسلیم شدہ ہیں۔ جو بات ان کی تازہ غزلوں میں خاص طور پر متاثر کرتی ہے وہ ہے عصری افکار و احساسات سے پوری وابستگی کے ساتھ اک ایسا تازہ پیرایہ اظہار جس میں روایت اور کلاسیکیت کی لفظی و معنوی لطافتیں تو ہیں ہی، جدت کے اچھوتے رنگ اور عکس بھی ہیں۔ انہیں کسی حد تک جدید اور مابعد جدید غزلیں بھی کہا جا سکتا ہے اور یہ ان اصطلاحی دائروں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ان سے الگ چیزے دیگر بھی ہیں۔ اس کمیاب امتزاج کے حسن کو ان کی تازہ غزلوں کے چند اشعار میں مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے:

پلک پلک پہ وہی انتظام ہے اب تک
کبھی اک آنسو ڈھلک کر ٹھہر گیا تھا وہاں

سچ کو گرتی دیواروں میں کیا چنواتا
جب ایمان کی بنیادوں میں جھوٹ بھرا ہے

ہیشگی سی لہو میں، دوام ہاتھوں میں
پرانی قدروں کا مرکز بھی تھا وہی احوال

کچھ زخم کے چھل جانے کا منظر بھی نہیں تھا
کیا جانئے کن معنوں میں الفاظ لہو روئے

میں مگر محافظ ہوں، آپ کے اشارے تک
اس اکیلی مسجد کا میں اک محافظ ہوں

ڈھلے مکان میں مجھ کو بٹھا گیا کوئی
میں خشک آنکھ کا آنسو ہوں کل کی دولت ہوں

رضا قدیم زمانے میں جا اترتا ہے
جدید ذہن سے اپنا فسانہ کہتے ہوئے

رضا صاحب نے اپنی غزلوں کی اس نمائندہ پیش کش کو زمانی ادوار میں تقسیم کیا ہے اور اس کی ترتیب کو کتاب میں معکوس رکھا ہے۔ یعنی ابتدا میں ۹۸-۱۹۹۳ء تک کا کلام پھر ۱۹۷۴ء تا ۱۹۹۲ء اور پھر ۱۹۴۱ء تا ۱۹۷۳ء۔ تخلیقی سفر کے ادوار کے اس اختصاص کے پیچھے یقیناً شاعر کا اپنے ذہنی و فنی رویوں کے مدارج کے بارے میں خود کا ایک احساس رہا ہوگا لیکن بادی النظر میں بھی ۱۹۷۴ء کے بعد کی اور اس کے پہلے کی غزلوں میں بین فرق نظر آتا ہے۔ ۱۹۷۴ء کے بعد کی غزلیں تازہ کاری کے اسی رخ پر رواں ہیں، جس پر تازہ غزلیں آگے اور مزید آگے بڑھی ہیں۔ کسی بھی عہد کی اچھی شاعری صرف اسی عہد کے پیش پا افتادہ کوائف میں محصور نہیں رہتی بلکہ وہ اپنے عصر

ذکریا میٹور۔ چوتھی منزل، ۱۴۹۔ یوسف مہر علی روڈ، ممبئی۔ ۴۰۰۰۰۳

ہیں، اگرچہ اس دور میں بھی شاعر کے
کی جولانی متوجہ کن ہے
لیکن جس کرم

... کرکے ... چھوڑ جانا

... ہیں ... کے ہیں یہ پہچان لیا

... یہ ... بھی اچھائی بہت ہے

... کی غزلوں کا ایک خاص وصف "سہل ممتنع" بھی ہے۔ پتھر کہانی ... سے ... فکر کی آنچ پر پگھلا کر سیال کرنے کا ہنر ایسا وصف ... کی غزلوں میں برابر ملتا آتا ہے، بلکہ اس کا تناسب بڑھتا بھی آیا

مت ہے ایک ... کی ... زندگی دونوں ہاتھوں ...
... بات تو ... دم بھی ... پول سانسوں سے
ساگر میں ایک ... ڈالا تھا
... سے ... ہیں ...

[illegible]

ہر حال زندگی میں گم کردہ [illegible] سب گم کی آمد

[illegible] (۱۱۲)

[illegible]

[illegible] کے حال میں [illegible]

[illegible] کے بعد اپنی [illegible] کرنے کے لیے [illegible]

[illegible]

کا اور اک زندگی کے دائمی تناظر میں کرتی اور کرواتی ہے۔ اس میں عصری تجربے کا کشادہ آفاقی شعور کے تحت ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ کالی داس گپتا رضا جیسے بالغ نظر شاعر سے یہ توقع ہی نہیں کی جانی چاہئے کہ وہ محدود اصطلاحی معنوں میں جدید غزل کی ہم نوائی کریں گے۔ ہاں البتہ وسیع معنوں میں وہ ہم عصر غزل کے ہم قدم ہی نہیں، رہنما و سرپرست بھی نظر آتے ہیں۔ ۱۹۷۴ تا ۱۹۹۲ء کے عرصے میں کہی گئی غزلوں کے چند اشعار دیکھئے اور یہ اندازہ بھی لگائیے کہ ان میں خوبو انہیں اشعار کی سی ہے، جن کی مثال اوپر تازہ غزلوں میں سے دی گئی:

چاہئے تھا، نوچتے بڑھ کر نقاب جو فروش　　کل پہ ہم رکھتے گئے، سود اگراں ہوتا گیا

افق سے دو قدم آگے ملے گی حد یقیں　　یہیں سحر کو ہوئی تھی خدا سے بات مری

نکالیے تو کہ ذہن پاتے تھے ان سے ٹھنڈک　　وہ سرد خانوں میں رکھی نادانیاں کہاں ہیں

ہمارے کام کرنے کا یہی ڈھب　　غلط کر کے خدا پر چھوڑ جانا

انجانے، ٹھہرے سے یہ پل چھن کیا ہیں　　باطن کے لمحے ہیں، یہ پہچان لیا

سمجھ ہی کو نہ منزل مان لینا　　یہ پگڈنڈی بھی انجانی بہت ہے

رضا صاحب کی غزلوں کا ایک خاص وصف 'سہل ممتنع' بھی ہے۔ پتھر کو پانی کرنے کا فن —— خیال کے لوہے کو تخلیق کی آنچ پر پگھلا کر سیال کرنے کا ہنر! یہ وصف گزشتہ تیس برسوں کی غزلوں میں برابر ملتا آتا ہے، بلکہ اس کا تناسب بڑھتا بھی آتا ہے:

موت ہے ایک ہاتھ کی تالی　　زندگی دونوں ہاتھ کی پیکار

کہہ چکوں بات تو پھر دم بھی لوں　　بول سانسوں سے بڑے لگتے ہیں

ساگر میں اک مٹھی صحرا　　ڈالا تھا اب گھول رہا ہوں

جو لمحے انگلیوں سے چھن چکے ہیں　　ابھی تک کہہ رہے ہیں داستاں کیوں؟

کون کس کو ڈھونڈتا ہے　　خاک سے دور، نمو تک

۱۹۷۰ء سے پہلے کی غزلوں میں روایتی رنگ گہرا ہے۔ اس کی طرف شاعر نے اپنے پیش لفظ میں خود بھی اشارہ کیا ہے:

"لگ بھگ ربع صدی غیر ممالک میں گزارنے کے بعد جنوری ۱۹۷۰ء میں میرے ہندوستان پلٹنے تک میری شاعری کم و بیش انہیں (روایتی) خطوط پر رواں دواں رہی۔ پھر میں نے یک لخت اپنی غزل کو روایتی و اتباعی شاعری سے آزاد کر لیا۔ زبان و فن کے استعمال میں احتیاط تو برتی، مگر شاعری کا فکری رخ بدل گیا۔"

اس دور کی غزلوں میں زبان و بیان کے روایتی رکھ رکھاؤ کے ساتھ خیال کی ادائیگی نسبتاً صریحانہ ہے۔ ان میں وہ لطیف اشاریت و ایمائیت بہت کم ہے جو بعد کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ گپتا صاحب کی شاعری کو غور سے پڑھنے والے طالب علم یا قاری کے لئے مگر ان غزلوں کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے کہ ان میں معانی کے گہر ہائے آبدار کلاسیکی طرز ادا کی نفیس سیپیوں میں خوبصورتی کے ساتھ بند ہیں:

حیات لاکھ ہو فانی مگر یہ سن رکھئے　　حیات سے جو ہے مقصود، غیر فانی ہے

موئے سفید ہجر کا کانٹا تھا غالباً　　لگ کر جو میرے پاؤں میں میرے گلے لگا

ہے عین لطف اجل کی مداخلت ورنہ　　جفا شعار زمانے میں زیست مرگ تھی

جمال دوست پہ بھی معصیت کے ہیں آثار　　ضرور کوئی گنہ گار جلوہ گاہ میں ہے

ابتدائی غزلوں میں جو ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۰ء کے بیچ کہی گئی ہیں، بیشتر لطفِ سخن آرائی اور شوقِ شعر گوئی سے عبارت ہیں، جن میں کرافٹ، آرٹ پر غالب ہے اور لفظوں کی تخلیقی و اختراعی دروبست کی جگہ مرصع کاری اور مہارت آفرینی کا عنصر نمایاں ہیں، اگرچہ اس دور میں بھی شاعر کے تشکیل پاتے ہوئے ذہن کی اُپج، اُٹھان اور طبیعت کی جولانی متوجہ کن ہے:

نشیمن جس کرم فرما کے ایما سے بنایا تھا　　تعجب ہے اسی نے آگ زیرِ آشیاں رکھ دی

روتے روتے تھک گئے، رک رک کے دم آنے لگا　　ہچکیوں نے آ کے ٹکڑے کر دیئے فریاد کے

چھپا نہ اپنے تخیل کو اے رضا ہرگز　　یہ تیغ وہ ہے جسے حاجتِ نیام نہیں

کم و بیش ساٹھ برسوں کے اس طویل غزل سفر کی کامرانی و سرشاری کا احساس خود شاعر کو بھی ہے اور اس سفر کو جاری رکھنے اور قدیم کو کلیجے سے لگائے، جدید کو آنکھوں میں بسائے بڑھتے چلنے کا حوصلہ اور توانائی بھی۔ اس کیفیت کا اظہار کس قدر لطف کے ساتھ ان دو شعروں میں ہوا ہے:

لکھ چکا ہوں میں سبھی، خواب، روایت، حسرت　　وقت باقی ہے، کوئی باب نیا بھی لکھوں

بوتا ہوں نئی نویلی فصلیں　　پرکھوں کو لگان دے رہا ہوں

اور اسی کیفیت کا غماز ان کے آخری مجموعہ غزل کا نام "ابھی ناؤ نہ باندھو" بھی ہے، جو شاعر کے تحت الشعور سے بے ساختہ ابھر کر کتاب کے سرورق پر نمایاں ہو گیا ہے، جس کی پہلی غزل کا پہلا شعر ہی یہ ہے:

دور کہیں موجوں میں ہے گھر، ابھی ناؤ نہ باندھو
مانجھی رے باقی ہے سفر، ابھی ناؤ نہ باندھو

ان کی عمر کی کشتی اچانک کنارے آ لگی ورنہ جو لوگ رضا صاحب سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ ابھی ناؤ باندھنے کے حق میں بالکل نہیں تھے۔ اپنی غزل گوئی کے طویل سفر میں کالی داس گپتا رضا نے نہ صرف اساتذہ اور اسلاف کے نقوش پا اجاگر کئے ہیں بلکہ وہ اپنے ساتھ کے اور اپنے بعد کے غزل کہنے والوں کے لئے ہم عصر غزل کے نئے راستوں کو تلاش کرتے ہوئے خود اپنے نقوشِ قدم بھی فراہم کر گئے ہیں۔

☆☆☆

سیماب سلطانپوری

آہ! شاعر گپتا رضا

۲۰۰۱ء

شہر دلی آج چپ ہے ایک سناٹا ہے پچھلی رات کا
لگ رہا ہے قصر دنیا مجھ کو اے سیماب اک ماتم کدا

منجمد سانسیں ہیں شب کی ہر خوشی اپنی جگہ ماتم زدہ
کیا کریں ماتم گسارانِ ادب کیسے لکھیں نوحہ ترا

کاروانِ جوشِ کاروچ رواں تھا، ناز تھا غالب شناسی پر اسے
عاشقِ اردو زباں وہ ساتھ رکھتا تھا خزانہ علم کا

آج سب اہلِ خرد اہلِ جنوں خاموش ہیں چپ ہیں قلم
راستے چپ راہرو حیراں امیر کارواں کو کیا ہوا

ہم زباں و ہم خیال و ہم قلم، سب غم گسار و ہم نفس
آج مجمع دوستوں کا بھی ہے چپ، جو چپ کبھی رہتا نہ تھا

آنکھ میں ہیں خشک آنسو، دل میں ہے جذبات کا سیلِ رواں
نوحہ خواں خاموش ہے اے زندگی تجھ کو بہت وہ رو چکا

مصرعِ تاریخ غم پوچھا تو ہاتف نے کہا یہ تو بتا
"چل دیا کیا صاحبِ فن باکمال انسان وہ گپتا رضا"

۲۰۰۱ء

22C/A1P پچھم وہار، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۳

انور شمیم

برموقع انتقالِ رضا

۲۰۰۱ء

ہے جہانِ ادب میں ملالِ رضا
آہ! یہ صدمہ ارتحالِ رضا

جس کے کردار و عادات و اطوار میں
"نور ایثار" — "حسن و جمالِ رضا"

ہوگیا ہے غروب آفتابِ ادب
دیکھ اے چشمِ پرنم مآلِ رضا

ہو وہ تحقیق، تنقید یا شاعری
قابلِ ناز، فکر و خیالِ رضا

آشنائے عروض اور تاریخ گو
کیجئے یاد کیا کیا کمالِ رضا

یوں تو غالب شناس اور بھی ہیں مگر
لائے اردو کہاں سے مثالِ رضا

محوِ غم ہے دلِ اردو انور شمیم

۲۰۰۱ء

کہہ دے۔ "برموقع انتقالِ رضا"

۲۰۰۱

۴۹۳۔ چوک حاجی پورہ، فیروز آباد۔ ۲۸۳۲۰۳

کوثر امروہی

ہائے ہائے رضا ہوئے خاموش

۲۰۰۱ء

دارِ فانی سے جس وقت اٹھے رضا
ساری دنیا پہ غم کی گھٹا چھاگئی
کوثر امروہی یہ سالِ رحلت لکھو
ہائے ہائے رضا کو قضا آگئی

۲۰۰۱ء

ماہر 'غالبیات' تھے جو رضا
آج وہ ہم کو داغِ اجل دے گئے
کوثر امروہی یہ سالِ رحلت لکھو
سب کو افسوس ہے اب رضا چل بسے

۱۴—۲۱ھ

چل بسے کالیداس گپتا رضا
ساری دنیا کو رنج ہے اس کا
دلِ 'احباب' توڑ کر کوثر
مرگئے ہائے کالیداس رضا

۱۴—۲۱ھ

حضرت کالیداس گپتا رضا
آگئی آپ کو قضا ہے ہے
دل احباب سے ہے یہ تاریخ
مرگئے محترم رضا ہے ہے

۲۰۰۱ء

حضرت کالیداس گپتا کا
آکے دلی میں انتقال ہوا
کہہ دو کوثر یہ مصرعِ تاریخ
شافع کالیداس گپتا رضا

۲۰۰۱ء

غالب دہلوی کے جو مداح تھے
سب کو افسوس ہے وہ رضا مرگئے
کوثر امروہی یہ سالِ رحلت لکھو
ماہر غالبیات کیا مرگئے

۲۰۰۱ء

JB6/104 وکلم سیلم پور، دہلی۔ ۱۱۰۰۵۳

پہلی قسط

عبدالغنی شیخ



قلم، قلم کار اور کتاب

دو ہزار آٹھ سو سال قبل مسیح زیر زمین دبی مٹی کی ایک تختی پر لکھا تھا۔

"دنیا ختم ہونے والی ہے۔ بچے اپنے ماں باپ کا حکم نہیں مانتے ہیں
اور ہر آدمی ایک کتاب لکھنا چاہتا ہے۔"

یہ اس دور کی بات ہے۔ جب کتاب لکھنا کارے دارد' والا معاملہ تھا۔ چھپائی کی مشین تو در کنار، لکڑی کے چھپائی کے بلاک بھی نہیں بنے تھے۔ کاغذ ایجاد نہیں ہوا تھا۔ زبان نے نشو و نما نہیں پائی تھی۔ تصویریں قدیم ترین تحریریں تھیں۔ تصویروں کی بجائے اب درختوں کی چھال اور مٹی کی تختیوں پر انسان نے حروف سے لکھنا سیکھا تھا۔

دنیا کی قدیم ترین کتاب تقریباً ساڑھے چار ہزار سال پہلے پاپرس نام کے ایک پودے کی چھال پر لکھی گئی تھی۔ عراق میں نینوا کے قدیم شہر میں دس ہزار مٹی کی ٹکیوں کی ایک پبلک لائبریری دریافت ہوئی ہے۔

کاغذ کی ایجاد سے پہلے انسان درختوں کی چھال اور نرم مٹی کی تختیوں کے علاوہ جانوروں کی کھال، پتے، ٹھیکروں، ہڈیوں، پتھروں، کپڑے، موم وغیرہ پر لکھتا تھا۔ ایک اوسط قدیم کتاب کے لئے بارہ بھیڑوں کی کھالیں درکار تھیں۔ بکری کی اس سے زیادہ کھالیں لگتی تھیں۔

قدیم زمانے میں انسان نے انہیں چیزوں پر اپنے علوم محفوظ رکھے۔ ۳۷۰ ق م یونان میں دنیا کا پہلا انسائیکلو پیڈیا مرتب ہوا۔ روم اور چین نے اس کی پیروی کی۔ ۲۳۷ ق م قدیم مصر کی ایک لائبریری میں کتابوں کی فہرست ایک چٹان کی دیوار پر تراشی گئی تھی۔

لکڑی کے بلاک پہلے پہل ۷۷۰ء میں جاپان میں بنائے گئے۔ چین نے ۱۰۵ء میں کاغذ دیا۔ Phonecia نے حروف تہجی دئے۔ یونان نے حروف کو بہتر اشکال دیں۔ روم نے کتاب کا روپ دیا۔ چھپائی کی مشین جرمنی کی دین ہے۔

قلم انسان کی قدیم ایجاد ہے۔ جو سرکنڈے، سینٹھے، نرکل کی شاخ، دھات، مور، بلخ، ہنس اور قاز کے پروں سے بنائے جانے لگے۔ ایک پیسے سے لے کر ہزاروں روپے کی قیمت کے قلم بنے ہیں۔ قلم چاہے جس چیز سے بھی بنا ہو، یہ تلوار سے طاقتور ہے۔

شیخ منزل، فورٹ روڈ، لیہہ، لداخ

سولہویں صدی میں پنسل ایجاد ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران بال پین ایجاد ہوا۔ کیونکہ محاذ جنگ پر دوات قلم لینا دو بھر تھا۔

قلم، قلم کار اور کتاب کی تکون نے علم و ادب کو فروغ دیا اور انسانی تہذیب اور تمدن کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔

گوٹین برگ کی چھپائی مشین کی ایجاد سے کتاب کی قیمت راتوں رات اسی فیصد گھٹ گئی۔ اس کے پچاس سال بعد یورپ کا ہر بڑا ملک کتابیں شائع کرنے لگا۔ سولہویں صدی میں پانچ لاکھ بیس ہزار عنوانات سے کتابیں چھپیں۔ سترہویں صدی میں ساڑھے بارہ لاکھ، اٹھارہویں صدی میں بیس لاکھ اور انیسویں صدی میں اسی لاکھ ٹائٹل چھپے۔ بیسویں صدی میں صرف ایک سال میں پانچ لاکھ نئی کتابیں تصنیف ہوئیں۔

سائنس اور علوم کے فروغ کے ساتھ یورپ میں اٹھارہویں صدی میں جامع انسائیکلو پیڈیا لکھے گئے۔

چھپائی مشین سے پہلے کتابوں کی رسائی صرف خواص تک تھی اور کتابوں کو زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا تھا۔

اب دنیا اکیسویں صدی میں داخل ہوئی ہے۔ کمپیوٹر اور الیکٹرانک بک E. Book کا دور آیا ہے۔ جس نے کتاب کی اشاعت کی صنعت میں انقلاب لا دیا۔ ناشر الیکٹرانک کتابوں کو نقل کرنے اور چوری سے چھاپنے سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں ڈیجیٹل تالوں میں مقفل کرتے ہیں۔ لیکن شاطر دماغ تالہ کھولنے کے نئے گر کی تلاش میں ہیں۔

بہر حال جدید مواصلاتی معجزانہ ترقی کی بدولت ایک قاری گھر بیٹھے دنیا کے کسی بھی کتب خانے سے استفادہ کر سکتا ہے۔

انسان کیوں لکھتا ہے؟

اس کے کئی اسباب ہیں۔ لکھنے کا سب سے بڑا محرک یہ ہے کہ انسان اپنے نظریات، اعتقادات، تجربات اور مشاہدات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ورثہ میں دینا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں ہم پچھلی صدی کے دو سر کردہ فلسفی اور قلم کار برٹرینڈ رسل اور ژاں پال سارتر کو مثال میں پیش کر سکتے ہیں۔

ہیڈ کلیائی ہتھیاروں کی وجہ سے دونوں کو دنیا کے مستقبل اور انسان کی سلامتی کی بڑی فکر تھی۔ دونوں نے ویتنام میں امریکی جارحیت کی سخت مخالفت کی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران رسل فوج میں لازمی بھرتی کے خلاف قائم کردہ ایک تنظیم میں شامل ہوا اور اپنے قلم سے اس کے خلاف تحریک چلائی۔ بطور سزا رسل پر جرمانہ عائد کیا گیا۔ جرمانہ کی رقم ادا نہ کرنے کی پاداش میں ان کی متعدد کتابیں اور سامان ضبط کر لئے گئے۔

سارتر نے ہنگری اور چیکو سلواکیہ میں روس کی فوجی مداخلت کی پرزور مخالفت کی۔ الجیریا کی جنگ آزادی میں وہ قوم پرست الجیریاؤں کے ساتھ تھا۔ جب سارتر کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو فرانس کے صدر ڈیگال نے کہا تھا۔ کوئی والٹیر کے خلاف مقدمہ نہیں چلاتا۔ ۱۹۶۴ء میں جب سارتر کو نوبل پرائز دیا گیا تو اس نے ٹھکرا دیا۔ سارتر کو یہ خبر ایک ریستوران میں ملی۔ جہاں وہ آلو کھا رہا تھا۔ سارتر بولا۔ "میرے لئے یہ آلو اس انعام سے بہتر ہیں۔"

اس کے برعکس ہیگل اور نطشے جنگ کو ضروری سمجھتے تھے۔ نطشے کہتا تھا۔ "جنگ کے بغیر انسان کمزور ہو جاتا ہے۔" جب کہ ہیگل کا خیال تھا کہ جنگ مملکت کی قوت کے اظہار کے لئے ضروری ہے۔

ہیگل نے اپنی اہم تصنیف ۱۸۰۶ء میں جنگ جینیا سے چند گھنٹے پیشتر مکمل کی۔ اس کے استغراق کا یہ عالم تھا کہ فرانسیسی فوجیں سارے شہر پر گولے برساتی رہیں لیکن وہ اپنے کمرے میں کواڑ بند کئے اس کتاب پر نظر ثانی کرتا رہا۔

انسان کو اپنی کتاب بڑی پیاری ہوتی ہے۔ وہ اسے لکھنے کے لئے خون جگر دیتا ہے۔ روم کے شہنشاہ قیصر کا جہاز جب سمندر میں غرقاب ہوا تو وہ تیر کر کنارے تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ تب اس کے ساتھ اس کی مشہور کتاب Commentaries کا مسودہ تھا۔ جس پر وہ اس جہاز میں کام کر رہا تھا۔ یہی اس کی سب سے قیمتی دولت تھی۔

برٹرینڈ رسل اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتا ہے:

> "میں نے اپنی کتاب Principia Mathematics پر برسوں کام کیا۔ اور مسودہ ضخیم ہو تا گیا۔ جب میں سیر کے لئے گھر سے نکلتا تھا تو مجھے یہ فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ کہیں مکان کو آگ نہ لگ جائے اور مسودہ جل جائے۔"

نوبل انعام یافتہ ادیب گبرائیل گارشیا مارکیز نے حال میں اپنے Lymphatic کینسر کی تشخیص کے بعد اپنی یادداشت لکھنے کے لئے دوستوں سے تقریباً قطع تعلق کر لیا ہے۔ مصنف نے ایک بیان میں کہا ہے۔ "اپنی یادداشت کی تین جلدیں اور افسانوں کے دو مجموعے ختم کرنے کے لئے کافی وقت نہ ہونے کے خوف سے میں نے اپنے دوستوں سے بہت کم میل جول رکھا ہے اور ٹیلی فون کاٹ دیا ہے...... میں ہر روز دو سے آٹھ بجے کے درمیان اپنے کو کمرے میں مقفل رکھ کر لکھتا ہوں۔"

لکھنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ انسان لافانیت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اسپین کا فلسفی مائیکل ڈی اونا مونو لکھتا ہے کہ ہر انسان چاہتا ہے کہ موت کے بعد وہ ایک ایسا خلا اپنے پیچھے چھوڑ جائے، جس کو کوشش کے بعد پُر کرنا ممکن نہ ہو۔ زندگی میں نہ سہی، موت کے بعد خود کو دوسروں کی نظروں میں منفرد ترین دکھائی دینے کی آرزو رکھتا ہے اور جاودانی زندگی گزارنے کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ کوشاں ہے کہ موت کو ٹالتا رہے اور زندگی کو دراز سے دراز کرتا رہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ موت سے مفر نہیں۔ ادب سمیت فنون لطیفہ کی ترقی کے پس پشت انسان کا یہی فطری رجحان کارفرما ہے۔ ایک پرانی یہودی کہاوت ہے:

> "اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے بچے تمہیں یاد رکھیں تو ایک جھونپڑی بناؤ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے پوتے پوتیاں تمہیں یاد کریں، تو پتھروں کا ایک مکان تعمیر کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے پڑپوتے پڑپوتیاں تمہیں یاد کریں، تو فصیلوں والا ایک شہر آباد کرو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ آنے والی ساری نسلیں تمہیں یاد کریں تو ایک کتاب لکھو۔"

بائرن کہتا ہے۔ "ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنا نام کہیں نہ کہیں چھپا ہوا دیکھے۔"

ہر قلم کار یہ تسلیم کرتا ہے کہ لکھنا ایک مشکل بلکہ صبر آزما عمل ہے۔ لیکن اس کے باوجود داخلی کرب اور جبلی فطرت اس کو لکھنے کے لئے اکساتی ہے۔ اور وہ لکھنے کے مصائب کو سہن کر لیتا ہے۔

گراہم گرین لکھتا ہے: 'لکھنا ایک قسم کا علاج معالجہ ہے۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ جو نہیں لکھتے۔ مصوری یا دھنیں نہیں بناتے، وہ کیسے دیوانگی، مالیخولیا اور خوف سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جو انسانی فطرت میں داخل ہیں۔'

دوسرے قلم کار کیا کہتے ہیں؟

'جب کسی کو ادب کا ذوق ہو۔ تو ماسوائے خامہ فرسائی کوئی علاج نہیں۔'

(سموئل لوور)

'میں تبھی بھرپور مطمئن ہوتا ہوں جب میرے ایک ہاتھ میں قلم اور کمرے میں خاموشی ہو۔' (سینٹ بیو)

> "میں عمر بھر تذبذب میں رہا۔ جب سوچنے لگتا تو مجھے اپنے بارے میں عجیب بیزاری ہوتی تھی۔ مگر جب لکھتا تھا تو میرا دل قوی ہو جاتا تھا۔ بہرحال زندگی میں قلم کا درجہ بڑا ہے۔ بشرطیکہ ادیب قلم کی آبرو رکھے اور اس سے اپنا مقام قائم رکھے۔" (کافکا)

روسو جب اپنی زندگی کی روداد لکھنے لگا تو کانپ اٹھا۔ قلم کی ذمہ داری سے وہ ہراساں تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اعتراف کیا ہے کہ وہ حتی المقدور انسانی بساط کے مطابق سچ لکھے گا۔ انسان نے ہر ماحول میں کتابیں لکھی ہیں۔

ایڈنا فربر نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے: 'میں نے بستر، سفر، حضر، ریل گاڑیوں، لکڑی کے شیڈز، غسل خانوں، کمروں، خواب گاہوں، باغات، ہوٹلوں، تھیٹروں، جہاز کے عرشے، باورچی خانوں، ڈیوڑھیوں اور اخبار کے دفتروں میں لکھا ہے۔'

بہت سارے قلم کار اپنی علمی تشنگی بجھانے اور ادبی ذوق کی تسکین کے لئے لکھتے

ہیں۔ ہر وے ڈ سے نے اس سلسلے میں ایک جوڑی ایڈن پال اور سیڈن پال کی مثال دی ہے۔ وہ مجھے ہوئے مترجم تھے۔ انہوں نے جرمنی، فرانسیسی اور اطالوی مصنفوں کی کتابوں کا انگریزی میں خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ سے ان کو خاص آمدنی نہیں تھی۔ ایڈن پال بطور ڈاکٹر پانچ گنا زیادہ کما سکتا تھا اور اس کی بیوی سیڈن پال کنسرٹ سے زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ تاہم وہ بطور مترجم زیادہ خوش تھے۔ کیونکہ لکھنے سے ان کو قلبی سکون ملتا تھا۔'

داستان گوئی:

انسان کو ازل سے کہانیوں کا شوق رہا ہے۔ داستان گوئی زمانہ قدیم سے چلتی آئی ہے۔ انسان نے جب لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ تب کہانیاں اور حکایتیں سنی سنائی جاتی تھیں۔ کہانی سننا اور سنانا اس کی فطرت میں داخل ہے۔

پنچ تنتر اور ایسوپ کی کہانیاں صدیوں سے بڑی مقبول ہیں۔ Croesus ایسوپ کی کہانیاں پڑھ کر اتنا خوش ہوا کہ اس نے یونان کو آزاد کر دیا۔

عالمی لوک کہانیوں کا ذخیرہ بہت زیادہ ہے۔ داستان گوئی کی روایت کچھ حد تک آج بھی قائم ہے۔ لیکن ابلاغ عامہ اور تفریحوں کی وجہ سے کہانی گوئی کی مقبولیت کم ہوئی ہے۔

گزری ہوئی صدی کی اسی کی دہائی میں داستان گوئی کی روایت کو زندہ کرنے کے لئے انگلینڈ میں Collective Touring Coy of Story tellers کے نام سے ایک کمپنی قائم کی گئی۔ لندن میں بین الاقوامی داستان گوئی کا آٹھ روزہ میلہ منعقد ہوا۔ ایک نوجوان اداکار بین ہیگارٹی اس کا روح رواں تھا۔ کمپنی کے داستان گو اسکولوں، کمیونٹی مرکزوں اور گاؤں کے ہالوں میں جا کر اپنی کہانیاں سناتے ہیں۔

جانوروں کی خصلتوں اور عادتوں کو کہانیوں کا جامہ پہنانا قدیم زمانے سے قلم کاروں کا خاصہ رہا ہے۔ چنانچہ جانوروں سے متعلق ایسوپ کی حکایتیں اور پنچ تنتر آج بھی بہت پسند کی جاتی ہیں۔

امریکی قلم کار تھورنٹن والڈون برجیس نے گزشتہ صدی کے دوران جانوروں پر اسی کتابیں لکھیں۔ جو بچوں اور بڑوں دونوں میں مقبول ہیں۔ اس کے کردار پیٹر، خرگوش، خوش جیک گلہری اور سی جے امریکہ میں بڑے مقبول ہیں۔ امریکی صدر ٹرینک مصنف کی قدر کرتا تھا۔

تھورنٹن نے پہلے پہل اس موضوع پر Old Mother West Wind کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جو بڑی مقبول ہوئی۔

ایک اور امریکی قلم کار البرٹ دے سون نے کتوں پر کہانیاں لکھ کر شہرت اور دولت دونوں کمائی۔

ایک بلی سے متعلق ایلن اسمتھ کی کتاب Rhubarb بڑی پسند کی گئی۔ اس پر فلم بنی۔ اس کے بعد کتاب کے کئی ایڈیشن نکلے۔

ایک قلم کار کے لئے تجربہ، مشاہدہ اور تخیل ضروری ہیں۔ بقول ایک نقاد تجربہ سننے، پڑھنے، بات چیت، مشاہدہ اور غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ تخیل کی اڑان اپنی جگہ بڑا اہم ہے۔ قلم کار اپنے پرواز تخیل سے ایک معمولی واقعہ کا حیرت انگیز اور دلنشیں نقشہ پیش کرتا ہے اور قاری کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔

جولیس ویریو نے کبھی چاند کا سفر نہیں کیا تھا۔ کبھی زمین کے مرکز تک نہیں پہنچا تھا۔ سمندر کے نیچے آبدوز کشتی میں مہینوں نہیں پہنچا تھا لیکن اس نے ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔

ایچ جی ویلز کو ٹائم مشین کے ساتھ براہ راست رابطہ نہیں رہا تھا۔ آر۔ ایل۔ سٹیونسن کو کبھی سمندری سفر کے دوران بحری ڈاکوؤں سے پالا نہیں پڑا تھا۔ پی۔ ڈی جیمز اور رتھ رینڈل نے جرائم کی سراغ رسانی نہیں کی تھی اور نہ کسی جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ تاہم ان قلم کاروں نے سائنس، بحری ڈکیتی اور جاسوسی جیسے موضوعات پر کامیاب ناول لکھے ہیں۔

امریکہ میں لڑی گئی سب سے بڑی جنگ سے متعلق دو ناول Red Badge of Courage اور Stephen Cranes ایک ایسے لڑکے کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ جس نے خود کبھی جنگ نہیں دیکھی تھی۔

ارنسٹ ہیمنگوے کا شاہکار ناول A Farewell to Arms پہلی جنگ عظیم پر ایک مشہور تصنیف ہے۔ ہیمنگوے ایک ایمبولنس یونٹ کے ساتھ چند ہفتوں کے لئے وابستہ رہا تھا۔ اس مختصر مدت کے لئے لڑائی دیکھی تھی اور زخمی ہوا تھا۔ لیکن اپنے مشاہدہ اور خاص کر اپنی تخیل آرائی سے جنگ کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ آنکھوں کے سامنے جنگ کا پورا منظر آتا ہے۔ اسی لئے ہیمنگوے کو ایک جنگ آزمودہ اور جنگی ہیرو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی ردعمل لیو ٹالسٹائی کے ناول 'جنگ اور امن' اور مشل کے Gone with the wind پڑھ کر ہوتا ہے۔

ناول نگار لوڈلم کے جاسوسی ناولوں کو پڑھ کر بہت سارے پیشہ ور سراغ رسانوں کو شک ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہوا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی جاسوس رہا ہوگا۔ لیکن خود لوڈلم نے ہمیشہ انکار کیا ہے کہ وہ کبھی جاسوس رہا ہے۔ ولیم اسٹیفلسن کے مطابق یہ لوڈلم کے تخیل کی دین ہے۔

ایک مجھے ہوئے ادیب کے لئے ایک چھوٹا سا واقعہ اس کے پرواز تخیل کے لئے محرک ثابت ہوتا ہے۔ موسیقی کی ایک تان، ایک خوبصورت چہرے کی جھلک اور خیالات کی ایک اٹھان سے لکھنے کا اچھا مواد ملتا ہے۔ اسٹینڈ ہال نے اپنے مقبول ناول Scarlet and Black کی تعمیم اخبار کی ایک چھوٹی سی خبر سے حاصل کی۔ ٹالسٹائی نے اپنے ناول Anna karenina ایسی ہی ایک مختصر رپورٹ پڑھ کر قلم بند کیا۔

بقول کسے ہنری جیمز کو اپنی کہانی لکھنے کے لئے مکان کا دروازہ کھولنا کافی تھا کہ وہاں مکین کیسے بیٹھے ہیں۔ کو ہارڈ نے محض ایک جھلک دیکھ کر اپنے اہم کردار تخلیق کئے۔

ایک مرتبہ ولیم جیمز چارلس آئی پیرسی کا ایک لیکچر سننے گیا۔ جس نے عملیت Pragmatism کا فلسفہ پیش کیا۔ جیمز لکھتا ہے۔ میں لیکچر کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ اس میں میرے لئے ضرور ایک پیغام ہے۔ بعد میں ولیم جیمز نے عملیت کو ایک جاندار اور بامقصد روپ دیا۔

ایک تبصرہ نگار رقم طراز ہے۔ تخیل ہو تو یہ ضروری نہیں کہ Coriolanous کا مصنف (شیکسپیر) درباری زندگی سے واقف ہو یا ہنری پنجم کے خالق نے بطور ایک سپاہی کام کیا ہو۔ یا میکبتھ کا مصنف سیریل کیلر (نفسیاتی قاتل) ہو۔ تخیل حاکم اعلیٰ ہے۔ تجربے اور مطالعے کے بل بوتے پر ایک ذہین قلم کار ہر موضوع پر لکھ سکتا ہے۔

بہت سارے نقادوں اور دانشوروں کو شک تھا کہ شیکسپیر کے شہرہ آفاق ڈرامے اس کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ مدتوں اس پر بحث چلی۔ حتیٰ کہ شیکسپیر کی قبر تک کھودی گئی کہ وہاں سے کچھ سراغ ملے۔ اینوک پاویل طنزیہ انداز میں لکھتا ہے: 'Hamlet کا مصنف یقیناً یارک شائر کا لڑکا نہیں ہے اور Coriolanous کے قلم کار نے دربار میں سیاسی زندگی بسر کی ہونی چاہئے۔' اس کے جواب میں ایلین لکھتا ہے۔ 'یہ پاویل کے تخیل کا جھول ہے۔ جس کی وجہ سے رائے زنی میں اسے غلطی ہوئی ہے۔'

Coriolanous سمیت شیکسپیر نے رومیوں سے متعلق تین ڈراموں کا مواد یونانی مورخ اور سوانح نگار پلوٹارک کی تصنیفات سے حاصل کیا تھا۔

ایم کاؤلے Writers at work کے پیش لفظ میں لکھتا ہے۔ 'کہانی کا پہلا مسودہ بڑی تیزی سے لکھا جاتا ہے۔ غالباً لکھنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ ڈوروتھی کون فیلڈ فیشر نے پہلے مسودے کی لکھائی کو ایک گہری ڈھلوان سے اسکیٹنگ کرنے سے مثال دی ہے۔

کتاب چار دیواری میں پڑھی جاتی ہے۔ درختوں کی چھاؤں میں پڑھی جاتی ہے لیکن اس کا اثر ہر جگہ دیکھا جاتا ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے ساتھ علم کا اجالا پھیلا۔ جہالت کا اندھیرا مٹنے لگا اور ادب کو فروغ حاصل ہوا۔ خیالات کی جنگ میں کتابوں نے ہتھیار کا کام دیا ہے۔ امریکی صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ نے دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکن بک سیلرز ایسوسی ایشن کو یہ پیغام دیا: 'کتابیں آگ سے ختم نہیں کی جاسکتیں۔ لوگ مرتے ہیں لیکن کتابیں نہیں مرتیں۔ اس جنگ میں کتابیں ہمارے ہتھیار ہیں۔'

صدیوں تک انسانی فکر و ذہن پر کلاسیکل ادب کا غلبہ رہا۔ قدیم ادب میں ہومر کے Iliad اور Odyssey گراں مایہ علمی سرمایہ ہیں۔ متعدد شعرا اور قلم کار ان تصنیفات سے متاثر ہوئے۔ بقول فرانسس جیکسن 'ہومر کا کلام ڈھائی ہزار سال گزرنے کے بعد بھی ایک حرف کھوئے بغیر موجود ہے' جب کہ اس دوران ان گنت محلات، مندر، قلعے اور شہر تنزل پذیر اور تباہ ہوئے --- ہومر نویں صدی قبل مسیح فوت ہوا۔

ڈانٹے نے 'بادشاہت' تصنیف کی۔ وہ رومی شان و شوکت کو دوبارہ بحال، یکجا چاہتا تھا اور پاپائے اعظم کی سیاسی اور دینوی معاملوں میں دخل اندازی کے خلاف تھا۔

علم و ادب کی پیش رفت کے ساتھ انسانی فکر و نظر میں وسعت آئی۔ آئیڈیالوجی نے ادب کی مختلف تحریکوں کو جنم دیا ہے۔ کلاسیکل کی جگہ رومانیت اور نورومانیت نے لی۔ انیسویں صدی کے آخر میں رمزیت (Symbolism) کا نظریہ آیا۔ یہ نقطہ نظر ادب میں عامیانہ طرز فکر کے خلاف رد عمل تھا۔ ہر آئیڈیالوجی زاویہ نگاہ کی Anti-ideology ہوتی ہے۔ رمزیت عام لوگوں میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس کا مقصد لاشعور میں چھپے ہوئے حقائق کی ترجمانی تھا۔ بیسویں صدی کے نصف میں سرریلزم (Surrealism) رمزیت کے رد عمل میں ظاہر ہوا۔

ادب میں جمالیات آگئی۔ ہیگل، شوپنہار اور دوسرے فلسفی اس کے موید تھے۔ وہ آرٹ کا مقصد تلاش حسن قرار دیتے ہیں۔

فلسفہ کے مختلف نظریات جیسے سریت، عقلیت، تجربیت، عملیت، وجودیت اور نفسیات نے ادب پر دوررس اثر ڈالا۔

انسان، خدا اور فطرت کے باہمی تعلقات پر سپنوزا کے تجزیے سے نطشے، ہیگل، شوپنہار اور نطشے جیسے فلاسفروں اور ورڈز ورتھ، شیلے، کیٹس، ایمرسن اور گوئٹے جیسے رومانی تحریک کے شعرا اور ادبا متاثر ہوئے۔

انیسویں صدی کے وجودی فلسفی کر کے گارڈ نے اپنے بعد کے فلسفیوں اور قلم کاروں پر اثر ڈالا۔

ولیم جیمز کی عملیت Pragmatism سے دانشور وائٹ مین، ایمرسن، سیاست داں تھیوڈر روز ویلٹ اور ووڈرو ولسن متاثر ہوئے۔ آج امریکہ سائنس اور مادی ترقی میں دنیا میں پیش پیش ہے۔ جیمز کے فلسفے کا اس میں اہم کردار ہے۔ ولیم جیمز کی زبان بڑی سادہ اور عام فہم ہے۔ ایک نقاد نے لکھا ہے: "ولیم جیمز فلسفہ یوں لکھتا تھا گویا فکشن ہے۔ جب کہ ان کے بھائی ہنری جیمز کے فکشن لکھنے کا اسلوب اور طرز تحریر فلسفیانہ تھا۔

ولیم جیمز لکھتا ہے۔ 'جدید نفسیات کا سب سے بڑا انکشاف یہ ہے کہ زندگی کے متعلق زاویہ نگاہ بدلنے سے تمام زندگی بدل جاتی ہے۔'

ادب میں فرائڈ کے جنسی نظریات اور تحلیل نفسی کا اپنا اہم رول ہے۔

نظریہ اضافیت اور قانون ثقل نے فلسفہ، ادب اور لوگوں کے فکر و نظر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

روس میں انقلاب کے بعد اشتراکیت کا بول بالا ہوا اور ترقی پسند تحریک چلی۔

ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کے متضاد نظریات پر خوب گرما گرمی رہی۔ پرناسی ادب، ادب برائے ادب کا دوسرا نام ہے۔ اس نظریے کے مطابق ادب تفریح طبع کا ایک ذریعہ ہے اور اس کا کوئی اور مقصد نہیں۔

ادب اور مذہب، ادب اور سماجی اصلاح، ادب اور قومیت اور صالح ادب موجودہ دور کی چند مقتدر آوازیں ہیں۔ پھر ادب میں جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریکیں آئیں۔

عصری کرب ادیبوں کا اہم موضوع رہا ہے۔ کافکا، کامو اور کونارڈ جیسے نراجی ذہنیت والے ادبا آئے۔ وہ انسان کی زندگی کو مہمل، بے مقصد اور عبث سمجھتے تھے اور انسانی وجود کو لغویت سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی تخلیقات زندگی کے مصائب اور اس کی تلخ نوائی کی ترجمان ہیں۔ سارتر نے بھی ان کی ہمنوائی کی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ موت کی وجہ سے انسان کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔

ادبی تحریکوں کے اس شور و غوغا میں ماضی کی قدروں اور روایات کا احترام ایک بااثر ادبی حلقے کی ایک سنجیدہ آواز رہی ہے۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ جیسا قد آور قلم کار رقم طراز ہے: 'کوئی شاعر، کوئی فنکار، خواہ وہ

کسی بھی لٹریچر سے تعلق رکھتا ہو، تن تنہا اپنی کوئی مکمل حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت اور بڑائی اس میں مضمر ہے کہ پچھلے شعرا اور فنکاروں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟..... شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ماضی کا شعور حاصل کرے یا اسے ترقی دے اور پھر ساری عمر اس شعور کو پروان چڑھاتا رہے۔'

ساتھ ہی وہ لکھتا ہے: 'اگر روایات کے معنی یہ ہیں کہ اپنے سے پہلی نسل کے طریقوں اور کامیابیوں کا آنکھیں میچ کر یا سہمے سہمے اتباع کیا جائے تو ایسی صورت میں یقیناً روایت کی حمایت سے گریز کرنا چاہئے۔ ہم نے خود بہت سے رجحانات کو مرتے دیکھا ہے۔'

فرد پر کتاب کا اثر:

جس دن مجھے کتابوں سے جدا کر دیا جائے، وہ میرا آخری دن ہو گا۔ (شیکسپیئر)

'مطالعہ کتب کا معنی کسی دوسرے کے دماغ سے سوچنا۔' (شوپنہار)

کتاب نے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بہت ساری شخصیتوں اور قلم کاروں نے اعتراف کیا ہے کہ ایک کتاب نے ان کی زندگی کا رخ پلٹ دیا ہے۔ ہم یہاں سماج کے چند منتخب سرکردہ افراد کے تاثرات پیش کرتے ہیں۔

گاندھی جی کے نظریات میں جان رسکن کی کتاب Unto the last نے انقلاب لایا۔ انہوں نے لکھا ہے: 'میں نے اس کتاب کی روشنی میں اپنی زندگی بدلنے کا عزم کیا۔ میرا یقین ہے کہ اس کتاب سے میرے چند گہرے عقائد تازہ ہوئے، جن کا مجھ پر گہرا اثر ہوا اور فوری طور پر اپنی زندگی بدلنے کی تحریک ملی۔'

یہ کتاب انہوں نے جنوبی افریقہ میں جہانس برگ سے نٹال ریل میں سفر کرتے ہوئے پڑھی تھی۔ اور سفر کے دوران اسے ختم کی تھی۔ ہندوستان آکر انہوں نے سب سے پہلے کتاب کا گجراتی میں ترجمہ کیا اور تہیہ کیا کہ وہ بقایا زندگی اس کتاب کے نفس مضمون کے مطابق عدم تشدد اور سچائی پر عمل پیرا ہو گا۔

ٹالسٹائی بھی اس کتاب سے متاثر ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

'رسکن نہ صرف انگلینڈ اور ہمارے دور کی ایک عظیم شخصیت ہے بلکہ وہ تمام ملکوں اور ہر زمانے کی عظیم شخصیتوں میں ایک ہیں۔'

برنارڈ شا اور مارشل پراؤسٹ بھی رسکن کے پرستار تھے۔ ایک مفکر کے علاوہ رسکن ایک بڑے شاعر، ادیب اور مصور بھی تھے۔

فلسفی کانٹ روسو اور ہیوم سے بڑا متاثر تھا۔ کانٹ لکھتا ہے کہ ان دونوں نے اس کی زندگی کا رخ پلٹ دیا۔

خاتون ناول نگار جو جارج ایلیٹ کے قلمی نام سے لکھتی آئی ہے۔ روسو کو پہلی بار پڑھ کر از خود رفتہ ہو گئی تھی۔

نطشے نے پہلی مرتبہ جب شوپنہار کو پڑھا تو اس کو اپنی رگ و پے میں ایک برقی لہر جیسا دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں کہ تھامس ہارڈی کا ناول Jude the obscure پڑھ کر وہ بے اختیار رونے لگے تھے۔

عصمت چغتائی نے لکھا ہے: 'برنارڈ شا نے میرا دل مٹھی میں لے لیا اور اپنا پہلا مضمون ڈرامہ 'فسادی' اسی سے متاثر ہو کر لکھا۔ میری ہم جماعت عذرا مجھے برنارڈ شا کہہ کر خوب چڑایا کرتی تھی۔

ٹیگور فلسفی برگساں، کروچے، یوکن اور آئنسٹائن سے متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے سوامی وویکانند سے تحریک پائی۔

سامرسٹ مام موپاساں سے متاثر ہوا تھا۔

مارک ٹوئین کو فرانس کی قومی ہیروئن جان آف آرک کی زندگی سے لکھنے کی تحریک ملی تھی۔ ایک روز ٹہلتے ہوئے انہوں نے کاغذ کا ایک ٹکڑا پایا۔ اس ایک صفحہ میں بتایا گیا تھا کہ کیسے جان آف آرک کو ایک قلعے میں قید کیا گیا تھا۔ مارک ٹوئین اسے پڑھ کر بڑا متاثر ہوا اور جان آف آرک سے متعلق تفصیل سے پڑھا۔ بعد میں مارک ٹوئین نے کئی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں۔

ڈاکٹر مونس رضا سابق وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی دوستووسکی کے ناول "برادر کرمازوف" سے متاثر ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "برادر کرمازوف پڑھنے کے بعد میں پہلے کا سا آدمی نہیں رہا۔ ایک کتاب پڑھنے کے بعد قاری کا دانشورانہ تجربہ اور قلم کار کی فطانت Interface روبرو آتی ہے۔ اور کتاب سے کچھ زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص ایک اچھی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ الگ سا انسان بنتا ہے اور کتاب بھی جداگانہ رخ اختیار کرتی ہے۔ اس طرح کتاب دوستووسکی نہیں رہتی بلکہ مونس رضا بنتی ہے۔ ہر کتاب کا اثر ایک سا نہیں ہوتا۔"

ایل۔ کے۔ اڈوانی لکھتے ہیں: 'ایک ادیب جس نے میرا زاویہ نگاہ بدل دیا۔ وہ ڈیل کارنیگی ہیں۔ میں اسکول میں تھا' جب میں نے پہلی دفعہ ان کی کتاب How to win friends and Influence people پڑھی۔ میں جب پلٹ کر اپنے ماضی کو نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کتاب نے میرے طرز عمل، کردار اور خاص طور پر دوسروں سے میرے تعلقات پر اثر ڈالا۔'

سجاد ظہیر لکھتے ہیں: "ایک کتاب، جس کا مجھ پر اثر ہوا اور جس کو میں نے کئی بار پڑھا۔ برٹرینڈ رسل کی Road to Freedom تھی۔ جس کو پڑھ کر میں نے کمیونزم، سوشلزم اور انارکزم کو سمجھا۔ ان کی دوسری کتاب Why I am not a christian نے بھی مجھے متاثر کیا۔

سردار جعفری رقم طراز ہیں: 'اسکول کے زمانے میں میں نے دو اہم کتابیں پڑھیں۔ جنہوں نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ ایک مہاتما گاندھی کی کتاب 'تلاش حق' اور دوسری پلوٹارک کی 'مشاہیر روما و یونان' تھی۔ بانگ درا میری سب سے پسندیدہ کتاب تھی، جو مجھے زبانی ازبر تھی۔'

لیکھک بھیشم ساہنی لکھتے ہیں 'میں نے Phylis Bothom کی کتاب The Mortal Storm دوسری عالمی جنگ کے دوران پڑھی۔ ناول میں نازی ازم کے فلسفے کو اجاگر کیا گیا ہے، جس کی گرفت میں جرمنی کے سارے جوان آئے تھے۔ اس نظریے کا انجام کتنا خوفناک تھا۔ اس زمانے میں اس کتاب کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔

☆☆☆

ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی

مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کی برید فرنگ

مولانا سید سلیمان ندوی کی دوسو ستائیس (۲۲۷) صفحے پر مشتمل ڈیمائی سائز میں ایک تاریخی تصنیف 'برید فرنگ' بھی ہے۔ اس میں بیس صفحے کا ان کا ایک مقدمہ شامل ہے۔ یہ دراصل سید صاحب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنے سفر یورپ کے دوران لکھے تھے یہ تعداد میں ۳۷ ہیں اور ۳ر فروری تا ۲۸ر ستمبر ۱۹۲۰ء آٹھ ماہ کی مدت میں لکھے گئے لیکن اس کے ۳۲ سال بعد ۱۹۵۲ء میں مکتبہ اشرف کراچی سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ یہ سید صاحب کی آخری تصنیف ہے جس کو انہوں نے ترتیب دے کر شائع کرایا۔ انہوں نے یہ سفر خلافت وفد کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے کیا تھا جو دولت عثمانیہ کی خلافت کو بحال کرانے کی غرض سے لندن گیا تھا۔ سید صاحب نے خود بھی اس کتاب کو تاریخی تصنیف قرار دیا ہے وہ اپنے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں:

> "یہ خطوط اب محض تاریخی ہیں...... ۳۲ سال پہلے شائع ہوتے تو یہ سیاحت نامہ کا کام دیتے مگر اب ۳۲ برس بعد ان کی اشاعت صرف تاریخی افادیت رکھتی ہے۔ ان سے آج سے ۳۲ برس پہلے کے ہندوستان، دنیائے اسلام اور یورپ کی سیاست کی وہ تصویر نظر آتی ہے جو میرے قلم نے کھینچی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کا نقشہ کو بدل چکا ہے۔ ایسی حالت میں نہیں کہا جاسکتا کہ کیا چیز باقی ہے اور کیا مٹ گئی تاہم ایک تاریخی دستاویز ہے۔"

(برید فرنگ، صفحہ ۱۹)

یہ خطوط اس زمانے کے ہیں جب پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ روس میں بالشویک انقلاب آچکا تھا اور ہندوستان میں جلیانوالہ پنجاب کا سانحہ عظیم گزر چکا تھا اور دنیا میں ایک گہرا سناٹا طاری تھا۔ اتحادی دنیا پر غالب آچکے تھے۔ دنیا کی دوسری طاقتیں بری طرح پسپا ہو چکی تھیں ان میں اپنے دفاع کی بھی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی لہٰذا بہت سارے وفود اتحادی طاقتوں سے اپنے حقوق مانگنے کے لئے دنیا کے کونے کونے سے آکر یورپ میں پڑے ہوئے تھے۔ علامہ اقبال کی نظم خضر راہ کے ابتدائی بند میں بھی دنیا کی اس حالت کی ایک تصویر استعاراتی انداز میں پیش کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
> تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
> رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
> انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

اس وقت دنیا پر جو بسیط سناٹا مسلط تھا وہ ایک بڑے طوفان کے گزرنے کی علامت اور ایک بڑے طوفان کے آنے کا پیش خیمہ بھی تھا۔

سید صاحب نے آج سے نصف صدی قبل خطوط کے اس مجموعہ کو تاریخی دستاویز قرار دیا ہے۔ تو آج تو اس کی تاریخی حیثیت اور بھی مستحکم ہو گئی ہے۔ حالانکہ اب بھی اس کی سفرنامہ کی حیثیت برقرار ہے لیکن سفرنامے بھی تاریخ کی ایک شاخ رہے ہیں اور تاریخ نگاری کے لیے ایک اہم ماخذ بھی۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے ان خطوط سے بجا طور پر سید صاحب کے اعلیٰ سیاسی شعور کا اندازہ لگایا ہے اور اپنی تصنیف "سید سلیمان ندوی کی تصانیف-ایک مطالعہ" میں برید فرنگ کے اسی پہلو کو بطور خاص اجاگر کیا ہے۔ سید صاحب نے خود بھی اپنے مقدمہ میں اپنی سیاسی رایوں کو اہمیت دی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

> "ان خطوط میں کہیں کہیں سیاسی پیش گوئیاں اور سیاسی رائیں بھی ہیں۔ پیش گوئیاں خیالات اور قیاسات ہوتے ہیں۔ آپ خود دیکھیں گے کہ ایک مستقبل سے ناواقف انسان کہاں کہاں بھٹکا اور کیسے کیسے انکل کرتا رہا ان میں سے کتنا حصہ صحیح اترا اور کتنا غلط ثابت ہوا۔"

(ایضا، صفحہ ۱۹)

لیکن اس کے بعد اپنے اسی مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

> "اس سخت مایوسی کی رات میں جب ہر طرف...... بادل گھرے تھے۔ سیاسی حالات و قیاسات کی روشنی میں...... جس نئی عمارت کا نقشہ ہم کو نظر آیا تھا مستقبل نے اس کو کس طرح صحیح اور سچا کرکے دکھایا ہے۔ ہندوستان آزاد ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ایران، عراق، شام، مصر اور ترکی کو

کٹھنہا، سنجرپور، اعظم گڑھ ۲۲۳۲۲۲

کس طرح از سر نو ترقی اور قوت اور خود مختاری اور آزادی بخشی اور پاکستان، انڈونیشیا، طرابلس اور لیبیا کی تین نئی سلطنتیں کس طرح پردہ غیب سے ظہور میں آگئیں۔ تیونس، الجیریا اور مراکش میں جدوجہد روبہ ترقی ہے۔" (ایضاً، صفحہ ۲۹)

سید صاحب نے خود بھی لکھا ہے اور دوسرے صاحب شعور اور دانشوروں نے بھی اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے کہ حالات اور واقعات مسلسل غور و فکر کرتے رہنے سے مستقبل غیب سے ظہور میں آجاتا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی کہا ہے کہ

"چشم دل وا ہو تو ہے تقدیر عالم بے حجاب"

انہوں نے اپنی تیسری آنکھ سے دیکھ لیا تھا کہ آئندہ فرنگ کی کیا حالت ہوگی جس کو وہ اپنی نظم "مسجد قرطبہ" میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

یہی بات سید صاحب کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے جس کو آپ آئندہ دیکھیں گے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ سید صاحب کے سفر یورپ کے زمانے میں دنیا کی سب سے عظیم قوت حکومت برطانیہ تھی جس کے وزیر اعظم اس وقت لائیڈ جارج تھے۔ جس کی حکومت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا لیکن وہ بھی چند سالوں ہی کے اندر سمٹ سمٹا کر پھر اسی چھوٹے سے جزیرہ برطانیہ میں محبوس ہو کر رہ گئی۔ جیسا کہ سید صاحب نے اسی کتاب میں لکھا ہے:

"برطانیہ کا دارالسلطنت لندن ریاست رامپور کے برابر صرف چالیس میل وسیع ہے۔" (ایضاً، صفحہ ۷۵)

اور برطانیہ کا رقبہ بھی کوئی زیادہ نہیں تھا۔ اس حقیقت سے وہ فلسفہ عروج و زوال مرتب کرتے ہیں جو یہ ہے:

"لیکن سچ پوچھو تو ترقی کے لئے نہ تو تعداد کوئی چیز ہے اور نہ رقبہ کا کوئی سوال ہے صرف روحانی طاقت اور اخلاقی قوت اصل بنیاد ہے...... رقبہ اور تعداد کے لحاظ سے روس اور جاپان میں کیا نسبت ہے اور انگلینڈ اور ہندوستان میں کیا مناسبت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر مسلمان اب اس نئے عقیدے کو اچھی طرح سمجھ لے۔" (ایضاً، صفحہ ۶۰)

خلافت وفد اپنے مقصد میں ناکام رہا لیکن سید صاحب اس سے بالکل مایوس نہیں ہوئے بلکہ اس ناکامی سے ان کے اندر اور بھی توانائی پیدا ہوگئی کیونکہ ان کو اپنی روحانی طاقت اور اخلاقی قوت پر پورا بھروسہ تھا اور خدا کی نصرت پر مکمل یقین تھا کہ یہ ناکامی دیرپا نہیں ثابت ہوگی کیونکہ اسی جگہ سے کامیابی کا زینہ شروع ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مجھے یقین کامل ہوگیا ہے کہ دنیا ایک بار اور پلٹا لے گی۔ آپ خوش ہوں۔ توقعات اور زیادہ پیدا کریں موجودہ حوادث ایک بادل ہے جس کے پیچھے خوشی اور مسرت کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۷۳)

مولانا سید سلیمان ندوی کے اندر یہاں وہی رجائی روح بولتی نظر آتی ہے جو علامہ اقبال کے اندر جس کی اس وقت ضرورت بھی تھی۔ علامہ کا تصور خودی بھی ایک فلسفہ رجائیت ہے۔ انہوں نے اپنے تصور عشق اور دیگر حرکی تصورات سے بھرپور اپنے سرمدی نغموں کے ذریعہ بھی قوم میں بیداری اور عزم و حوصلہ کی روح پھونکنے کا برابر کام لیا ہے یہی کام سید صاحب نے اس کتاب میں اپنی نثر نگاری سے لیا ہے علامہ اقبال کہتے ہیں:

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کاباداں کنند
می نہ دانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

اور سید صاحب کہتے ہیں:

"علامات و آثار اگر موسم کا پتہ دے سکتے ہیں تو یقین کیجئے کہ فتح و نصرت کا موسم عنقریب شروع ہوگا۔ ناامیدی ہی امید کا دیباچہ ہے اور خاتمہ نئے آغاز کا مطلع ہے۔ جن ترکوں کے سامنے یہ عہد نامہ پیش کیا گیا ہے وہ قبول و انکار کی صلاحیت نہیں رکھتے۔" (برید فرنگ، صفحہ ۹۹)

سید صاحب کی یہ بات بالکل صحیح ثابت ہوئی کیونکہ آئندہ کے حالات بتاتے ہیں کہ ترکوں نے اسی عہد نامہ کو قبول نہیں کیا جو ان کی موت کا پروانہ بن کے سامنے آیا تھا۔ سید صاحب کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اس راکھ کے ڈھیر میں ایک چنگاری چمک رہی ہے جو شعلہ جوالہ بھی بن سکتی ہے جس کو مصطفیٰ کمال پاشا کہتے ہیں۔ اس تاریخی حقیقت کی طرف سید صاحب نے کئی جگہ اشارے بھی کئے ہیں۔ مثلاً

"ترکی کا معاملہ مصطفیٰ کمال پاشا کے زور بازو پر آکر رک گیا ہے اور یورپ کے ارباب سیاست اب ترکی اور یونان کی کشتی کا موازنہ (کذا) کر رہے ہیں، جس طرف پلہ جھکے گا اودھر ہی رخ پلٹے گا۔"

(برید فرنگ، صفحہ ۱۴۷)

"ترکی کی طرف سے صلح نامہ کا جواب تیار ہو رہا ہے لیکن بہترین جواب وہ ہے جو توفیق پاشا کی زبان سے نہیں بلکہ مصطفیٰ کمال پاشا کے دست و بازو سے ملے گا۔ یہ یقین ہے، کامل یقین ہے۔"

(برید فرنگ، صفحہ ۱۰۳)

سید صاحب کا جو یقین ترکوں کے متعلق تھا وہ صحیح ثابت ہوا۔ بعض آدمیوں نے صلح کے معاہدہ پر ۱۱ راگست ۱۹۲۰ء کو دستخط ضرور کردئے لیکن اس کو ترکی گورنمنٹ کا اعتراف کہا جاسکتا ہے اور نہ ترک قوم نے اس کو جائز تسلیم کیا۔ (برید فرنگ، صفحہ ۱۷۳) سید صاحب نے اس سلسلہ میں ایک بدترین ترک کا بھی ذکر کیا ہے جو ہر طرح سے انگریزی حکومت کا پٹھو تھا اس کے سامنے بھی معاہدہ پیش ہوا تو اس نے بھی اس پر دستخط کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا کہ عہد نامہ ناقابل قبول ہے۔

(برید فرنگ، صفحہ ۱۰۵)

ترک قوم نہایت خوددار، ایمان دار اور محنت کش قوم تھی اور اسلامی شریعت کی سخت پابند بھی جو اپنے انتہائی عروج اور انتہائی پستی کے دور میں بھی کبھی عیش پرستی کے قریب نہیں گئی لہٰذا اس کی خلافت اس طرح کی تمام آلائشوں سے ہر زمانے میں

پاک صاف رہی۔ سید صاحب نے تو اس لحاظ سے اس کے دور خلافت کو خلافت راشدہ کے بعد سب سے عمدہ دور قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ دولت عثمانیہ زیادہ طویل عرصہ تک برقرار رہی لیکن قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ ہر کمالے را زوال۔ لہٰذا بعض اسباب کی بنا پر اس کو بھی زوال اور پستی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جس وقت کے حالات اور واقعات برید فرنگ میں مندرج ہیں وہ اس کی نہایت پستی کا دور تھا۔ وہ مغربی قوتوں کے پنجے میں بری طرح جکڑ چکی تھی۔ روس بھی اس کی تباہی و بربادی کے عرصہ دراز سے درپے تھا۔ ترکی کے انہی ناگفتہ بہ حالات میں اتحادیوں کا یہ صلح نامہ معرض وجود میں آیا تھا جو انگریزی کہاوت "مائیٹ از رائٹ" اور اردو کہاوت "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے مصداق تھا۔ جس کو ہم طاقت کی سیاست کہہ سکتے ہیں۔ اتحادیوں نے پہلے دولت عثمانیہ کو اپنی مکر و فریب کی سیاست اور کچھ اپنی جدید فوجی قوت سے کمزور کیا پھر اس کے مختلف علاقوں کو طرح طرح کے بہانوں سے نگلنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ بیشتر حصہ نگل گئے۔ انگریزوں نے یہی ہندوستان میں بھی کیا تھا۔ یہاں کی مختلف قوتوں کو آپس میں لڑا کر کمزور کیا اور ان پر الزام تراشیاں کیں اور رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے سب کو ہڑپ لیا اور یہاں کے حکمراں بن بیٹھے۔

اس زمانے میں خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے لئے فرنگیوں نے جو حیلہ تراشا تھا وہ آرمینیا کی مظلومیت کا حیلہ تھا حالانکہ جو داستانیں ترک حکومت کے ظلم و استبداد کی تراشی گئی تھیں وہ سب بالکل بے بنیاد اور من گھڑت تھیں لیکن ان کا پروپیگنڈہ اتنے زوروں سے اور اتنے وسیع پیمانے پر کیا گیا کہ وہ جھوٹ بھی سچ معلوم ہونے لگا اور اس زمانے کی ایک تاریخی حقیقت بن گیا۔

یہ پروپیگنڈہ عوام، خواص، امیر و غریب ہر قسم کے لوگوں تک اخباروں، رسالوں، ناٹکوں، سنیما اور تھیٹروں کے وسیلوں سے پہنچا دیا گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت وفد جس شخص سے خلافت عثمانیہ کے متعلق بات شروع کرتا وہ آرمینیا پر ترکوں کے مظالم کی بات چھیڑ دیتا۔ یہی الزام لگا کر برطانیہ کے وزیر اعظم لائیڈ جارج نے وفد کے مطالبہ کو مسترد کر دیا اور فرانس کے وزیر اعظم موسیو ملیران نے بھی اس سلسلہ میں وہی سبق فرفر دہرا دیا۔ اس ضمن میں سید صاحب لکھتے ہیں:

"وزیر موصوف (وزیر اعظم فرانس) ایک رٹے سے سبق کی طرح
اپنے ایک ہم پیشہ نامور وزیر اعظم کے خیالات کی اپنی زبان میں ترجمانی
کی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سیاسی پیغمبر کسی مصنوعی جبرئیل (لائیڈ
جارج) کے تعلیمی سبق کو اپنے الفاظ میں ادا کر رہا ہے"

(برید فرنگ، صفحہ ۱۷۴)

نذیر احمد نے منتخب الحکایات میں ایک حکایت یہ بھی پیش کی ہے کہ ایک میمنا دریا میں پانی پی رہا ہے۔ ایک شیر وہاں پہنچ جاتا ہے اور اس پر الزام لگاتا ہے کہ تو نے پانی جھوٹا کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں پانی نیچے پی رہا ہوں جدھر پانی بہہ رہا ہے۔ میرا جھوٹا پانی اوپر کیسے جا سکتا ہے، اس پر شیر کہتا ہے کہ تو بقراط بھی ہو گیا ہے اور اس کو توڑ ڈالتا ہے۔ یہی طاقت کی سیاست ہے جو فرنگیوں نے اپنے زمانے میں کی۔ اسی بنا پر علامہ اقبال کی طرح سید صاحب بھی اپنی قوم و ملت کو طاقتور بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس نکتہ کو بعد میں ترکوں نے بھی سمجھا اور عہد نامہ پر دستخط کرنے کے بجائے طاقت کا جواب طاقت سے دینے کے لئے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں تیار ہو گئے اور دیا۔ علامہ اقبال نے اسی واقعہ سے متاثر ہو کر اپنی شہرہ آفاق نظم "طلوع اسلام" تخلیق کی۔ لیکن بعد میں کمال پاشا نے خود خلافت ختم کر دی اور ترکی میں مغرب کے اثر سے ایک مختلف نظام حکومت قائم کیا تو اقبال کو ان سے مایوس ہو کر یہ کہنا پڑا:

نہ مصطفیٰ، نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

علامہ اقبال نے بھی ترک قوم کی شجاعت جفاکشی اور کردار کی پختگی اور عربوں کی غداری کی طرف خضر راہ کے اس شعر میں کہا ہے:

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

کیونکہ عربوں نے پہلی جنگ عظیم میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کا ساتھ دیا تھا جنہوں نے ان کو خلیفہ بنانے کی لالچ دی تھی۔ لیکن سید صاحب نے یورپ میں بہت سے عربی رہنماؤں سے بھی ملاقاتیں کیں۔ ان سے خلافت عثمانیہ کے متعلق گفتگو بھی کی اور بیشتر نے یہی کہا کہ ہم اس کے مخالف نہیں نیز یہ بھی کہا کہ ہم اتحادیوں کی سیاست کو سمجھ رہے ہیں۔

برید فرنگ علامہ اقبال کی بہت سی نظموں خاص کر خضر راہ کو سمجھنے میں معاون بھی ہے جو اسی تاریخی پس منظر میں تخلیق کی گئیں جس کی کہ یہ کتاب ترجمان ہے۔ اس زمانے کی تاریخ لکھنے والوں کے لئے یہ ایک اہم ماخذ کا کام بھی دیتی ہے۔ خلافت تحریک کی ابتدائی تاریخ تو اتنے بھرپور انداز میں شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کن تاریخی اور سیاسی حالات کی بنا پر ہمارا موجودہ عہد معرض وجود میں آیا ہے۔ سید صاحب تاریخ کے اس اصول سے آگاہ تھے کہ کسی تاریخی واقعہ کو پیش کرنے کے لئے اس کی جڑ ماضی بعید میں تلاش کرنی چاہئے۔ وہ برید فرنگ میں ایک جگہ رقم طراز ہیں: "آج جو کچھ پیش ہے وہ آج کا واقعہ نہیں بلکہ اس کی تمہید دو سو سال پہلے سے ہو رہی تھی تو اس کا رد و مدافعت آپ دو دن میں نہیں کر سکتے۔"

(برید فرنگ، صفحہ ۱۶۰)

دراصل سید صاحب یہ بتا رہے تھے کہ اپنی حالت کو درست کرنے کے لئے ایک مستقل اور طویل جدوجہد کی ضرورت ہے کیونکہ یورپ کا جو نقشہ ان کے سامنے تھا اچانک سامنے نہیں آ گیا تھا بلکہ فرنگیوں کی صدیوں کی کوششوں اور کاوشوں کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ خلافت عثمانیہ اور دیگر مسلم قوتوں اور یورپ کی مسیحی طاقتوں کے مابین کئی صدی سے کشمکش اور تصادم جاری تھا، پہلے کافی عرصے تک مسلم قوتیں غالب تھیں۔ پھر ان کا زوال شروع ہوا اور وہ رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئیں۔ ان کے برخلاف مسیحی قوتیں مضبوط ہوتی گئیں اور جنگ عظیم اول نے دولت عثمانیہ کو بالکل ہی بے جان کر دیا۔ اب اس میں اپنے دفاع کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی جس کے

نتیجے میں یہ ہتک آمیز صلح نامہ اس کے سامنے آیا تھا جس نے اس کو چاروں طرف سے جکڑ کے رکھ دیا تھا۔ جس سے وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سید صاحب نے اس معاہدہ کو اپنے سفر یورپ کی بدولت اس وقت پڑھا تھا جب ابھی اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی اور ترکی نے اس پر دستخط نہیں کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "ان شرائط کے معنی ترکی پابہ زنجیر زندگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مقامات مقدسہ برٹش حکومت کے زیر سایہ ہوں گے۔ اس ننگ کو کون مسلمان گوارا کرے گا۔ اب تک انگریزوں کی آنکھیں نہیں کھلی ہیں اور واقعات پس پردہ سے قصداً تغافل برت رہے ہیں۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۰۰ و ۱۰۱)

اتحادیوں کی کامیابی ان کی جدید سائنسی ایجادات کے علاوہ ان کی مکر و فریب کی پالیسی کے سبب بھی ہوئی۔ جنہوں نے اپنی جدید قوتوں کو آزمانے سے پہلے مسلمانوں کی مختلف طاقتوں کو آپس میں ٹکرایا اور سلطنت عثمانیہ میں طرح طرح کے رخنے ڈالے، شورشیں برپا کیں، عیسائیوں کے تحفظ کا مسئلہ اٹھایا۔ اس کے بعد اپنی بری اور بحری قوتوں کے ذریعہ ترکی پر اپنی فوجی برتری قائم کی اور اپنی حیلہ سازیوں کے ذریعہ اس کے علاقوں کو ایک ایک کر کے ہڑپنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اس کے تمام علاقے ہڑپ لئے جنہیں عیسائی حکومتوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ آخر میں قسطنطنیہ پر بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ دولت عثمانیہ کو روس نے پہلے ہی کافی کمزور کر دیا تھا جو ایک زمانے سے خود قسطنطنیہ کو ہڑپنے کی کوشش میں تھا مگر انگلستان ایسا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس سے روس کا عمل دخل یورپ میں بڑھ جاتا۔ انگلینڈ قسطنطنیہ پر اپنا تسلط چاہتا تھا۔ قسطنطنیہ دولت عثمانیہ کا اس وقت دارالسلطنت تھا۔ یہی مکر و فریب کی پالیسی اس سے قبل انگریز ہندوستان میں بھی برت چکے تھے۔ اس طرح انگریز قوم کی ظفریابی میں اس کی حیلہ سازی اور مکر و فریب کی پالیسی کا بھی بڑا ہاتھ ہے لیکن یہ قوم بڑی محنت کش اور دلیر بھی رہی ہے جس کے سبب اس کو دنیا میں اس قدر عروج حاصل ہوا۔ علامہ اقبال نے بھی اس کا احساس اس شعر میں کیا ہے۔

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب

اس کے علاوہ ایک انگریزی خاتون ناول نگار ورجینیا وولف (Verginia woolf) نے اپنے ناول اور لینڈو (Orlando) میں انگریز قوم کے مردانہ اور زنانہ صفات کو اس ناول کے مرکزی کردار اور لینڈو کے ذریعہ پیش کیا ہے جو تین سو سال زندہ رہتا ہے۔ شروع میں ایک سو پچاس سال مرد رہتا ہے اور باقی ڈیڑھ سو سال عورت۔ وولف نے یہ ناول ۱۹۲۸ء میں لکھا تھا۔ جب کہ سید صاحب نے انگریز قوم کے نسوانی کردار کو ۱۹۲۰ء ہی میں سمجھ لیا تھا۔

سید صاحب نے برید فرنگ میں یورپ کے صرف سیاسی حالات ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ اس کے تہذیبی اور تمدنی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یورپ میں اس زمانے میں بھی جو عریانی اور بے حجابی تھی اس کا بیان بھی انہوں نے مختلف جگہوں پر اس کتاب میں کیا ہے۔ وہ ویشی (فرانس) کے متعلق جہاں وہ زیر علاج تھے، لکھتے ہیں:

"مگر یہاں چشمہ ہائے شور کے گرد مردم و مور و مرغ کا مجمع ہے البتہ شور چشموں کی تقریب سے زندہ اور رواں چشمے ہر جگہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں...... مسافروں کے اس عارضی شہر میں دماغی، علمی تفریح گاہ سے لے کر جسمانی عیش و عشرت گاہ تک پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں اور یہی فرانسیسی تمدن کے خصائص ہیں۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۴۲)

اس کے علاوہ سید صاحب کے قلم سے فرانس کی ایک جگہ کا اور بیان ملاحظہ کیجئے:

"جس مقام سے میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں یہ اس شہر (ویشی) کا جو عارضی طور سے اس موسم میں آباد ہو جاتا ہے کلب ہے۔ ایک وسیع باغ و عمارت ہے جس میں مختلف مقامات پر کئی ہزار کرسیاں پڑتی ہیں جس کے ممبران پر بیٹھ سکتے ہیں...... اس کے ایک گوشے میں تھیٹر ہے۔ دوسرے گوشے میں ریستوراں ہے.... باغ کی روش پر "لذت شب" کے سوداگروں کا بازار ہے۔ تماشا خود محو خرام ہے اور تماشائی زر بجیب چکر کاٹ رہے ہیں۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۵۰ و ۱۵۱)

انگلستان میں بھی عیش پرستی اور عریانیت کافی تھی۔ سید صاحب نے کئی جگہوں پر اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"یہاں (ہائڈ پارک میں) اکثر لوگوں کو بے حجاب جلوے نظر آتے ہیں۔ جابجا درختوں کی جڑوں میں، کنج باغ میں، جھاڑیوں میں دو دو کرسیاں بچھی ہوئی ملیں گی۔ قرآن کی آیت پاک من کل شئی خلقنا زوجین کی تفسیر کا عملی مشاہدہ آپ کو اسی جگہ ہو گا...... انگریزوں کو فخر ہے کہ ان کے صرف ان کے ملک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ قانوناً فاحشہ کا وجود نہیں لیکن عملاً ان کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ ان کے ملک کا کوئی راستہ، گلی، چوراہا، باغ، دریا غرض ہر وہ تمام مقام جہاں کوئی مادی جسم رہ گزر پا سکتا ہے اس شریف طبقہ سے محروم نہیں۔"

(برید فرنگ، صفحہ ۱۲۵ و ۱۲۶)

سید صاحب نے ایک جگہ انگریزی رقص کا بھی بڑے فطری انداز میں بیان کیا ہے۔

سید صاحب نے انگلستان کے معیار زندگی پر بھی کھل کے لکھا ہے جہاں دولت کی ریل پیل تھی اور عیش و عشرت اور آرام و آسائش اور شان و شوکت کی فصل بہار آئی ہوئی تھی۔ لیکن اسی جگہ یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ یہاں جو ہر طرف چراغاں کا عالم ہے اس میں کسی ملک کا خون جل رہا ہے۔ انہوں نے سب کھول کر لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ان کے خطوط سنسر ہوتے تھے ان کی اس جرأت مندی اور بے باکی پر حیرت ہوتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں میں شائع بھی ہوتے تھے۔ 'ہمدم' لکھنؤ ان میں خاص تھا۔ اس کے علاوہ 'زمیندار' لاہور، 'خلافت' بمبئی،

"وکیل" امرتسر اور ان سے نقل ہو کر اکثر دوسرے اخباروں میں بھی چھپا کرتے تھے۔" (مقدمہ، برید فرنگ صفحہ ۱۲)

بہرکیف ایسے زمانے میں جب حکومت برطانیہ کا ہر طرف طوطی بولتا تھا اور ان کے ظلم و جبر کی چکی گردش میں تھی سید صاحب نے مجاہدانہ اسپرٹ کے زیر اثر جو صحیح سمجھا برملا لکھ دیا۔ سچ اور سچی بات کہنے سے انہیں نہ تو موت کا خوف روک سکا اور نہ کوئی لالچ ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکی۔ انہوں نے وہاں کے نظام حکومت، وہاں کی تہذیب و تمدن اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ، ظلم و ستم ہر چیز کا برملا بیان کر دیا ہے۔ ایک جگہ انگلینڈ کی تہذیب و تمدن، عیش و عشرت وغیرہ کو صاف صاف بیان کیا ہے اور وہاں کی اعلیٰ معیار زندگی پر روشنی ڈالی ہے جس کی طرف نذیر احمد نے "ابن الوقت" کے ذریعہ ۱۸۸۸ء میں اشارہ کر دیا تھا۔ لیکن اس نکتہ کی طرف کوئی واضح اشارہ نہیں کیا تھا کہ دولت کی یہ فراوانی کیوں کر ہے لیکن سید صاحب نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "سوال یہ ہے کہ دولت کی یہ بہتات آئی کہاں سے، کیا ہماری جیبوں سے۔" شاعر متنبی نے کہا ہے "مصائب قوم عند قوم فوائد" یعنی ایک قوم کی مصیبت کے معنی دوسری قوم کی نعمت کے ہیں۔ "ایشیا لٹ کر یورپ آباد ہوا۔ ہمارے گھر خالی ہوئے ہیں تو یہاں کے گھر بھرے ہیں....." (برید فرنگ، صفحہ ۱۳۲)

یہ بات تو بہت زمانے سے مشہور ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو لوٹ کر اپنا گھر بھر لیا اور اس کو کنگال کر دیا جسے کبھی سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ لیکن سید صاحب نے اپنے ذاتی مشاہدہ کے ذریعہ اس روایت کو تاریخی حقیقت میں بدل دیا۔

یورپ میں صنعتی انقلاب آیا تو جاگیردارانہ نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام شروع ہوا۔ اور نثر نگاری کے دور کی ابتدا ہوئی۔ انگریزی کا پہلا ناول Pamela اسی انقلاب کے خلاف ایک احتجاج تھا، جس کو سیموئیل رچرڈسن نے ۱۷۴۰ء میں خط کے فارم میں پانچ جلدوں میں لکھا تھا، جس میں پمیلا نام کی ایک نوکرانی اپنے مالک کی زیادتیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے جو اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا ہے لیکن وہ باکردار ثابت ہوتی ہے۔ اپنے حق کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ انجام کار اس کے مالک کو اس سے شادی کرنا پڑتی ہے۔ جب سرمایہ دارانہ نظام آیا تو حویلیوں اور رقص و سرور کی محفلوں کی جگہ مل اور کارخانے قائم ہو گئے۔ عیش و عشرت کے لئے فلیٹس اور کلب معرض وجود میں آگئے۔ اس نظام نے دنیا میں ایک سے ایک لعنتوں کو جنم دیا۔ ان کی طرف علامہ اقبال نے بھی اس طرح اشارہ کیا ہے:

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

اور فرنگی مدنیت کی بنیاد اسی سرمایہ پرستی پر تھی جس کے خاتمہ کی خواہش اس نظم کے آخر میں اس طرح کی ہے:

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

(لینن خدا کے حضور میں)

سید صاحب نے جس زمانے میں سفر یورپ کیا تھا مغرب سرمایہ پرستی میں چور تھا۔ وہ سرمایہ ہی کو اپنا خدا مانتا تھا اور دنیا کی ہر چیز کو تجارتی اور مہاجنی نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا حتی کہ علاج بھی اس کی نظر میں تجارت بن گیا تھا۔ انہیں ویشی میں اپنے علاج کے دوران یہی محسوس ہوا۔ انہوں نے برید فرنگ میں اپنے احساسات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتے لکھتے انہیں بہار کی ایک جگہ راجگیر بھی یاد آجاتی ہے۔ ویشی کی طرح یہاں بھی ایسے قدرتی چشمے ملتے ہیں جن سے مختلف امراض کا علاج ہو سکتا ہے لہٰذا وہ لکھتے ہیں "اگر یہ چشمے یورپ میں ہوتے تو یہ صحت جسمانی اور سامان تجارت و دولت کے سرچشمے ہوتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا ملک ہندوستان بھی ایک متمدن یورپین سلطنت کے زیر سایہ ہے۔ کیا یہ سچ ہے۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۴۵)

سید صاحب نے اپنے خطوط میں حکومت برطانیہ اور قوم انگریز کے متعلق کہیں کہیں اتنے سخت کلمات لکھ دئے ہیں کہ ان کی اس جسارت پر حیرت ہوتی ہے مثلاً:

"لیکن اس کا یقین کیجئے کہ مسلمانان عالم کی تاریخ میں انگریزوں کا نام چنگیز و ہلاکو کی طرح ہمیشہ کے لئے بدنام ہو گیا۔"

(برید فرنگ، صفحہ ۶۸)

"لائیڈ جارج کی اس پالیسی (خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے کی پالیسی) نے برٹش شہنشاہی کی عمارت میں خود رخنہ پیدا کر دیا اور تاریخ بتاتی ہے اور قرائن حال نظر آتے ہیں کہ اس عہد ستم کا عنقریب خاتمہ ہو جائے گا۔" (برید فرنگ، صفحہ ۹۸)

سید صاحب نے برید فرنگ میں کئی جگہوں پر فرانس اور انگلینڈ کے سیاسی خیالات اور انداز فکر کا موازنہ بھی بڑی دقت نظری سے کیا ہے جس کے لحاظ سے دونوں ملکوں کا ذہنی رویہ دوسری قوموں کے لئے جن پر ان کا اقتدار قائم تھا ایک ہی تھا۔ انگلینڈ اپنے محکوموں کو رعایا تصور کرتا تھا جب کہ فرانس اپنا ہم پلہ کہتا تھا لیکن عملاً ان کو مساوی حقوق دینے کا روادار نہیں تھا۔ پھر بھی فرانس اور انگلینڈ کے مابین یہ فرق ضرور تھا کہ اول الذکر کی فکر بین الاقوامی تھی جس کی بنا پر وہ امن عالم کے قیام میں معاون ہو سکتا تھا جب کہ ثانی الذکر کی فکر قومی تھی جس کے تحت وہ اپنی قوم کے سامنے کسی دوسری قوم کو اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے وہ امن عالم کے قیام میں معاون نہیں ہو سکتا تھا۔

سید صاحب نے برید فرنگ میں اپنا تصور امن بھی پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "وہ فلسفہ امن جس کی آپ (مولانا عبدالماجد دریابادی) ہندوستان میں تبلیغ کرنا چاہتے ہیں غریب ہندوستان کو چھوڑ دیئے انگلینڈ میں آکر تبلیغ کیجئے۔ اب تک میں نے

نتیجے میں یہ ذلت آمیز صلح نامہ اس کے سامنے آیا تھا جس نے اس کو چاروں طرف سے جکڑ کے رکھ دیا تھا۔ جس سے وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سید صاحب نے اس معاہدہ کو اپنے سفر یورپ کی بدولت اس وقت پڑھا تھا جب ابھی اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی اور ترکی نے اس پر دستخط نہیں کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "ان شرائط کے معنی ترکی پابہ زنجیر زندگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مقامات مقدسہ برٹش حکومت کے زیر سایہ ہوں گے۔ اس ننگ کو کون مسلمان گوارا کرے گا۔ اب تک انگریزوں کی آنکھیں نہیں کھلی ہیں اور واقعات پس پردہ سے قصداً تغافل برت رہے ہیں۔" (بریدِ فرنگ، صفحہ ۱۰۰ او ۱۰۱)

اتحادیوں کی کامیابی ان کی جدید سائنسی ایجادات کے علاوہ ان کی مکر و فریب کی پالیسی کے سبب بھی ہوئی۔ جنہوں نے اپنی جدید قوتوں کو آزمانے سے پہلے مسلمانوں کی مختلف طاقتوں کو آپس میں ٹکرایا اور سلطنت عثمانیہ میں طرح طرح کے رخنے ڈالے، شورشیں برپا کیں، عیسائیوں کے تحفظ کا مسئلہ اٹھایا۔ اس کے بعد اپنی بری اور بحری قوتوں کے ذریعہ ترکی پر اپنی فوجی برتری قائم کی اور اپنی حیلہ سازیوں کے ذریعہ اس کے علاقوں کو ایک ایک کر کے ہڑپنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اس کے تمام علاقے ہڑپ لئے جنہیں عیسائی حکومتوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ آخر میں قسطنطنیہ پر بھی اپنا قبضہ جما لیا۔ دولت عثمانیہ کو روس نے پہلے ہی کافی کمزور کر دیا تھا جو ایک زمانے سے خود قسطنطنیہ کو ہڑپنے کی کوشش میں تھا مگر انگلستان ایسا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس سے روس کا عمل دخل یورپ میں بڑھ جاتا۔ انگلینڈ قسطنطنیہ پر اپنا تسلط چاہتا تھا۔ قسطنطنیہ دولت عثمانیہ کا اس وقت دارالسلطنت تھا۔ یہی مکر و فریب کی پالیسی اس سے قبل انگ[illegible] ہندوستان میں بھی برت چکے تھے۔ اس طرح انگریز قوم کی ظفریابی میں ا[illegible] ساحری اور مکر و فریب کی پالیسی کا بھی بڑا ہاتھ ہے لیکن یہ قوم بڑی محنت[illegible] بھی رہی ہے جس کے سبب اس کو دنیا میں اس قدر عروج حاصل[illegible] بھی اس کا احساس اس شعر میں کیا ہے۔

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب

اس کے علاوہ ایک انگریزی خاتون ناول [illegible]
(Woolf) نے اپنے ناول اور لینڈو (Orlando)
مقامات کو اس ناول کے مرکزی کردار اور لی[illegible]
زندہ رہتا ہے۔ شروع میں ایک سو پچا[illegible]
عورت۔ وولف نے یہ ناول ۱۹۲۸ [illegible]
کے نسوانی کردار کو ۱۹۲۰ء ہی میں [illegible]
سید صاحب نے برید فرنگ [illegible]
[illegible] کے تہذیبی اور تم[illegible]
[illegible] اور[illegible]
[illegible]

"مگر یہاں چشمہ ہائے شور کے گرد [illegible]
شور چشموں کی تقریب سے زندہ [illegible]
آتے ہیں...... مسافروں کے اس[illegible]
سے لے کر جسمانی عیش و [illegible]
یہی فرانسیسی تمدن [illegible]
اس کے علاوہ [illegible]
کیجئے:
"جس [illegible]
عارضی طور سے اس مو[illegible]
باغ و عمارت ہے جس میں [illegible]
جس کے ممبران پر بیٹھ سکتے ہیں [illegible]
دوسرے گوشے میں ریستوران [illegible]
کے سوداگروں کا بازار [illegible]
چکر کاٹ رہے ہ[illegible]
انگلستان [illegible]
پر اس کا ذک[illegible]

[illegible]

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

[illegible]

ضرب المثل کی ہو گئی ہے لہٰذا یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

سید صاحب نے سرمایہ دارانہ نظام اور بالشویک طرز حکومت پر بھی [illegible]
طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

، ساسانی نہ

ے تو جلال الدین

یضاً، صفحہ ۵۴)

ہے۔ انہوں نے نیو فن

رہ کے لئے تجربہ گاہوں

، کارناموں کو انجام دینے کے

ـ جوئے کم آب

اس ہے زندگی

یا بادی) میں علت و معلول کے تعین میں

ہے میں کہتا ہوں پہلے آزاد ہندوستان، محکوم

چو عقد نماز می بندم

خورد بامداد فرزندم"

(برید فرنگ، صفحہ ...)

مقصد میں ناکام رہا لیکن اس ...

ساس اور ...

ے یہی بات کہلائی ...

اور ہندوستانی ...

(اقبال)

... آزادی کی طلب بے حد

... ن کی سمجھ میں آ گیا کہ

... ہمارا مقصد پورا نہیں

... ہے لہٰذا حکومت

... ہے۔ اس وقت سے ان

... نہوں نے اس کتاب میں بار بار

... کو ایک پلیٹ فارم پر آنے نہیں

دے گی۔ ایک فرنگی خاتون نے لکھا مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ اگر مسلمان متحد ہو کر کوئی مجلس قائم کریں تو سید صاحب نے کہا کہ اگر یہ جلسہ ایسا ہو تو نے گلے دیں گے کہ کیں گے یہ دعا دیں اسلام مرحوم کا بھوت ہے جو تمام یورپ کو نگل جائے گا اس کو ہرگز ہرگز زندہ نہ رہنے دیا جائے۔" (ایضاً صفحہ ۷۱)

ایک دوسری جگہ سید صاحب انگریز قوم کو شیطان سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں علامتی انداز میں یہی کہا ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ دراصل انگریزوں یا فرنگیوں کی مجلس شوریٰ ہے۔ علامہ کا ایک لطیفہ بھی جس کو "اقبال کامل" میں مولانا عبدالسلام ندوی نے اس طرح نقل کیا ہے:

"کیمبرج کے زمانہ میں چند ہم عصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی ایک صاحب پوچھنے لگے مسٹر اقبال یہ کیا بات ہے کہ جتنے پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا میں آئے وہ بلا استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پینترا جمالیا اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو اس لئے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے وہ ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ وہ صاحب بول اٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے۔ انہوں نے جواب دیا یہ تمہارے میکائیولی اور مشہور اہل سیاست اس کے رسول ہیں۔ اس پر بہت قہقہہ پڑا۔" (اقبال کامل، صفحہ ۹۴)

اس عبارت سے انگریزوں کی شیطنت اور واضح ہو جاتی ہے۔

سید صاحب نے اپنی تحریروں میں ایک جگہ انگریز قوم کو شیطان سے تعبیر کیا ہے ان کے ایک مکتوب الیہ عبدالماجد دریابادی نے انگریز اور انگریزیت میں اپنی ایک تحریر میں فرق کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے لکھا:

"آپ فرماتے ہیں کہ تم انگریز کو برا کہتے ہو اور میں انگریزیت کو، تم شیطان کو لعنت کرتے ہو میں شیطنت کو۔ یہ تفریق میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر انگریز میں انگریزیت اور شیطان میں اگر شیطنت نہ ہو تو اس کو کیوں برا کہیے۔ شیطنت نہ ہو تو شیطان شیطان نہیں۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۳۸)

ظاہر ہے جب تک شیطان کا بس چلے گا وہ پریشان و ہلکان کرنے سے باز نہیں آ سکتا۔ لہٰذا اس سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو کمزور کر دو اور یہی طریقہ انگریزی حکومت کے لئے بھی کارگر ہو سکتا ہے جو کمزور ہو گی ہندوستان کی آزادی سے۔ اسی بنا پر سید صاحب نے برید فرنگ میں کئی جگہوں پر یہی بات کہی ہے کہ ہندوستان کی آزادی سب پر مقدم ہے۔ اس کے بعد سید صاحب کا یہی سیاسی ایمان و عقیدہ بن گیا اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں:

"خاتمہ مباحث کے طور پر میں یورپ کے خاتمے پر میں اپنا سیاسی ایمان و عقیدہ اب آپ کے سامنے اور آپ (مولانا عبدالباری فرنگی محلی) کے ذریعہ تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ہم مسلمانوں نے تقریباً اپنی عمر کی نصف صدی اس طرح بسر کی کہ ہندوستان کی پالیٹکس سے عملاً کوئی غرض و مقصد نہیں رکھا اور آزادی اور

نتیجے میں یہ جنگ آمیز صلح نامہ اس کے سامنے آیا تھا جس نے اس کو چاروں طرف سے جکڑ کے رکھ دیا تھا، جس سے وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سید صاحب نے اس معاہدہ کو اپنے سفر یورپ کی بدولت اس وقت پڑھا تھا جب ابھی اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی اور ترکی نے اس پر دستخط نہیں کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر انہوں نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "ان شرائط کے معنی ترکی پابہ زنجیر زندگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مقامات مقدسہ برٹش حکومت کے زیر سایہ ہوں گے۔ اس ننگ کو کون مسلمان گوارا کرے گا۔ اب تک انگریزوں کی آنکھیں نہیں کھلی ہیں اور واقعات پس پردہ سے قصد اتغافل برت رہے ہیں۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۰۰ اور ۱۰۱)

اتحادیوں کی کامیابی ان کی جدید سائنسی ایجادات کے علاوہ ان کی مکر و فریب کی پالیسی کے سبب بھی ہوئی۔ جنہوں نے اپنی جدید قوتوں کو آزمانے سے پہلے مسلمانوں کی مختلف طاقتوں کو آپس میں ٹکرایا اور سلطنت عثمانیہ میں طرح طرح کے رخنے ڈالے، شورشیں برپا کیں، عیسائیوں کے تحفظ کا مسئلہ اٹھایا۔ اس کے بعد اپنی بری اور بحری قوتوں کے ذریعہ ترکی پر اپنی فوجی برتری قائم کی اور اپنی حیلہ سازیوں کے ذریعہ اس کے علاقوں کو ایک ایک کر کے ہڑپنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اس کے تمام علاقے ہڑپ لئے جنہیں عیسائی حکومتوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ آخر میں قسطنطنیہ پر بھی اپنا قبضہ جمالیا۔ دولت عثمانیہ کو روس نے پہلے ہی کافی کمزور کر دیا تھا جو ایک زمانے سے خود قسطنطنیہ کو ہڑپنے کی کوشش میں تھا مگر انگلستان ایسا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس سے روس کا عمل دخل یورپ میں بڑھ جاتا۔ انگلینڈ قسطنطنیہ پر اپنا تسلط چاہتا تھا۔ قسطنطنیہ دولت عثمانیہ کا اس وقت دارالسلطنت تھا۔ یہی مکر و فریب کی پالیسی اس سے قبل انگریز ہندوستان میں بھی برت چکے تھے۔ اس طرح انگریز قوم کی ظفریابی میں اس کی حیلہ سازی اور مکر و فریب کی پالیسی کا بھی بڑا ہاتھ ہے لیکن یہ قوم بڑی محنت کش اور دلیر بھی رہی ہے جس کے سبب اس کو دنیا میں اس قدر عروج حاصل ہوا۔ علامہ اقبال نے بھی اس کا احساس اس شعر میں کیا ہے۔

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب

اس کے علاوہ ایک انگریزی خاتون ناول نگار ورجینیا وولف (Verginia woolf) نے اپنے ناول اور لینڈو (Orlando) میں انگریز قوم کے مردانہ اور زنانہ صفات کو اس ناول کے مرکزی کردار اور لینڈو کے ذریعہ پیش کیا ہے جو تین سو سال زندہ رہتا ہے۔ شروع میں ایک سو پچاس سال مرد رہتا ہے اور باقی ڈیڑھ سو سال عورت۔ وولف نے یہ ناول ۱۹۲۸ء میں لکھا تھا۔ جب کہ سید صاحب نے انگریز قوم کے نسوانی کردار کو ۱۹۲۰ء ہی میں سمجھ لیا تھا۔

سید صاحب نے برید فرنگ میں یورپ کے صرف سیاسی حالات ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ اس کے تہذیبی اور تمدنی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یورپ میں اس زمانے میں بھی جو عریانی اور بے حجابی تھی اس کا بیان بھی انہوں نے مختلف جگہوں پر اس کتاب میں کیا ہے۔ وہ ویشی (فرانس) کے متعلق جہاں وہ زیر علاج تھے، لکھتے ہیں:

"مگر یہاں چشمہ ہائے شور کے گرد مردم و موز و مرغ کا مجمع ہے البتہ شور چشموں کی تقریب سے زندہ اور رواں چشمے ہر جگہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔.... مسافروں کے اس عارضی شہر میں دماغی، علمی تفریح گاہ سے لے کر جسمانی عیش و عشرت گاہ تک پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں اور یہی فرانسیسی تمدن کے خصائص ہیں۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۴۲)

اس کے علاوہ سید صاحب کے قلم سے فرانس کی ایک جگہ کا اور بیان ملاحظہ کیجئے:

"جس مقام سے میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں یہ اس شہر (ویشی) کا جو عارضی طور سے اس موسم میں آباد ہو جاتا ہے کلب ہے۔ ایک وسیع باغ و عمارت ہے جس میں مختلف مقامات پر کئی ہزار کرسیاں پڑی ہیں جس کے ممبران پر بیٹھ سکتے ہیں..... اس کے ایک گوشے میں تھیٹر ہے دوسرے گوشے میں ریستوراں ہے..... باغ کی روش پر "لذت شب" کے سوداگروں کا بازار ہے۔ تماشا خود محو خرام ہے اور تماشائی زر بجیب چکر کاٹ رہے ہیں۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۵۰ اور ۱۵۱)

انگلستان میں بھی عیش پرستی اور عریانیت کافی تھی۔ سید صاحب نے کئی جگہوں پر اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"یہاں (ہائڈ پارک میں) اکثر لوگوں کو بے حجاب جلوے نظر آتے ہیں۔ جابجا درختوں کی جڑوں میں، کنج باغ میں، جھاڑیوں میں دو دو کرسیاں بچھی ہوئی ملیں گی۔ قرآن کی آیت پاک من کل شئی خلقنا زوجین کی تفسیر کا عملی مشاہدہ آپ کو اسی جگہ ہوگا..... انگریزوں کو فخر ہے کہ ان کے صرف ان کے ملک کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ قانوناً فاحشہ کا وجود نہیں لیکن عملاً ان کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ ان کے ملک کا کوئی راستہ، گلی چوراہا، باغ، دریا غرض ہر وہ تمام مقام جہاں کوئی مادی جسم رہ گزر پا سکتا ہے اس شریف طبقہ سے محروم نہیں۔"

(برید فرنگ، صفحہ ۱۲۵ اور ۱۲۶)

سید صاحب نے ایک جگہ انگریزی رقص کا بھی بڑے فطری انداز میں بیان کیا ہے۔

سید صاحب نے انگلستان کے معیار زندگی پر بھی کھل کے لکھا ہے جہاں دولت کی ریل پیل تھی اور عیش و عشرت اور آرام و آسائش اور شان و شوکت کی فصل بہار آئی ہوئی تھی۔ لیکن اسی جگہ یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ یہاں جو ہر طرف چراغاں کا عالم ہے اس میں کسی ملک کا خون جل رہا ہے۔ انہوں نے سب کھول کر لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ان کے خطوط سنسر ہوتے تھے ان کی اس جرأت مندی اور بے باکی پر حیرت ہوتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ ہندوستان کے اخباروں اور رسالوں میں شائع بھی ہوتے تھے۔ 'ہمدم' لکھنؤ ان میں خاص تھا۔ اس کے علاوہ 'زمیندار' لاہور، 'خلافت' بمبئی،

ٹونکل، ہمر جسر اور ان سے نقل ہو کر اکثر دوسرے اخباروں میں بھی چھپا کرتے تھے۔"

(مقدمہ، برید فرنگ صفحہ ۱۶)

بہر کیف ایسے زمانے میں جب حکومت برطانیہ کا ہر طرف طوطی بولتا تھا اور ان کے ظلم و جبر کی چکی گردش میں تھی سید صاحب نے مجاہدانہ اسپرٹ کے زیر اثر جو صحیح سمجھا برملا لکھ دیا۔ سچ اور کچی بات کہنے سے انہیں نہ تو موت کا خوف روک سکا اور نہ کوئی لالچ ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکی۔ انہوں نے وہاں کے نظام حکومت، وہاں کی تہذیب و تمدن اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ، ظلم و ستم ہر چیز کا برملا بیان کر دیا ہے۔ ایک جگہ انگلینڈ کی تہذیب و تمدن، عیش و عشرت وغیرہ کو صاف صاف بیان کیا ہے اور وہاں کی گراں معیار زندگی پر روشنی ڈالی ہے جس کی طرف نذیر احمد نے "ابن الوقت" کے ذریعہ ۱۸۸۸ء میں اشارہ کر دیا تھا۔ لیکن اس نکتہ کی طرف کوئی واضح اشارہ نہیں کیا تھا کہ دولت کی یہ فراوانی کیوں کر ہے لیکن سید صاحب نے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ "سوال یہ ہے کہ دولت کی یہ بہتات آئی کہاں سے، کیا ہماری جیبوں سے۔" شاعر متنبی نے کہا ہے "مصائب قوم عند قوم فوائد" یعنی ایک قوم کی مصیبت کے معنی دوسری قوم کی نعمت کے ہیں۔ "ایشیا لٹ کر یورپ آباد ہوا۔ ہمارے گھر خالی ہوئے ہیں تو یہاں کے گھر بھرے ہیں۔ ....." (برید فرنگ، صفحہ ۱۳۲)

یہ بات تو بہت زمانے سے مشہور ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو لوٹ کر اپنا گھر بھر لیا اور اس کو کنگال کر دیا جسے کبھی سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا۔ لیکن سید صاحب نے اپنے ذاتی مشاہدہ کے ذریعہ اس روایت کو تاریخی حقیقت میں بدل دیا۔

یورپ میں صنعتی انقلاب آیا تو جاگیردارانہ نظام کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام شروع ہوا۔ اور نثر نگاری کے دور کی ابتدا ہوئی۔ انگریزی کا پہلا ناول Pamela اسی انقلاب کے خلاف ایک احتجاج تھا، جس کو سیموئیل رچرڈسن نے ۱۷۴۰ء میں خط کے فارم میں پانچ جلدوں میں لکھا تھا، جس میں پمیلا نام کی ایک نوکرانی اپنے مالک کی زیادتیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے جو اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا ہے لیکن وہ باکردار ثابت ہوتی ہے۔ اپنے حق کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ انجام کار اس کے مالک کو اس سے شادی کرنا پڑتی ہے۔ جب سرمایہ دارانہ نظام آیا تو حویلیوں اور رقص و سرور کی محفلوں کی جگہ مل اور کارخانے قائم ہو گئے۔ عیش و عشرت کے لئے فلیٹس اور کلب معرض وجود میں آگئے۔ اس نظام نے دنیا میں ایک سے ایک لعنتوں کو جنم دیا۔ ان کی طرف علامہ اقبال نے بھی اس طرح اشارہ کیا ہے:

بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

اور فرنگی مدنیت کی بنیاد اسی سرمایہ پرستی پر تھی جس کے خاتمہ کی خواہش اس نظم کے آخر میں اس طرح کی ہے:

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

(لینن خدا کے حضور میں)

سید صاحب نے جس زمانے میں سفر یورپ کیا تھا مغرب سرمایہ پرستی میں چور تھا۔ وہ سرمایہ ہی کو اپنا خدا مانتا تھا اور دنیا کی ہر چیز کو تجارتی اور مہاجنی نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا حتی کہ علاج بھی اس کی نظر میں تجارت بن گیا تھا۔ انہیں ویشی میں اپنے علاج کے دوران یہی محسوس ہوا۔ انہوں نے برید فرنگ میں اپنے احساسات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس سلسلہ میں لکھتے لکھتے انہیں بہار کی ایک جگہ راجگیر بھی یاد آجاتی ہے۔ ویشی کی طرح یہاں بھی ایسے قدرتی چشمے ملتے ہیں جن سے مختلف امراض کا علاج ہو سکتا ہے لہٰذا وہ لکھتے ہیں "اگر یہ چشمے یورپ میں ہوتے تو یہ صحت جسمانی اور سامان تجارت و دولت کے سرچشمے ہوتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا ملک ہندوستان بھی ایک متمدن یورپین سلطنت کے زیر سایہ ہے۔ کیا یہ سچ ہے۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۴۵)

سید صاحب نے اپنے خطوط میں حکومت برطانیہ اور قوم انگریز کے متعلق کہیں کہیں اتنے سخت کلمات لکھ دیے ہیں کہ ان کی اس جسارت پر حیرت ہوتی ہے مثلاً:

"لیکن اس کا یقین کیجئے کہ مسلمانان عالم کی تاریخ میں انگریزوں کا نام چنگیز و ہلاکو کی طرح ہمیشہ کے لئے بدنام ہو گیا۔"

(برید فرنگ، صفحہ ۶۸)

"لائیڈ جارج کی اس پالیسی (خلافت عثمانیہ کو ختم کرنے کی پالیسی) نے برٹش شہنشاہی کی عمارت میں خود رخنہ پیدا کر دیا اور تاریخ بتاتی ہے اور قرائن حال نظر آتے ہیں کہ اس عہد ستم کا عنقریب خاتمہ ہو جائے گا۔" (برید فرنگ، صفحہ ۹۸)

سید صاحب نے برید فرنگ میں کئی جگہوں پر فرانس اور انگلینڈ کے سیاسی خیالات اور انداز فکر کا موازنہ بھی بڑی دقت نظری سے کیا ہے جس کے لحاظ سے دونوں ملکوں کا ذہنی رویہ دوسری قوموں کے لئے جن پر ان کا اقتدار قائم تھا ایک ہی تھا۔ انگلینڈ اپنے محکوموں کو رعایا تصور کرتا تھا جب کہ فرانس اپنا ہم پلہ کہتا تھا لیکن عملاً ان کو مساوی حقوق دینے کا روادار نہیں تھا۔ پھر بھی فرانس اور انگلینڈ کے مابین یہ فرق ضرور تھا کہ اول الذکر کی فکر بین الاقوامی تھی جس کی بنا پر وہ امن عالم کے قیام میں معاون ہو سکتا تھا جب کہ ثانی الذکر کی فکر قومی تھی جس کے تحت وہ اپنی قوم کے سامنے کسی دوسری قوم کو اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے وہ امن عالم کے قیام میں معاون نہیں ہو سکتا تھا۔

سید صاحب نے برید فرنگ میں اپنا تصور امن بھی پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "وہ فلسفہ امن جس کی آپ (مولانا عبدالماجد دریابادی) ہندوستان میں تبلیغ کرنا چاہتے ہیں غریب ہندوستان کو چھوڑ دیجئے انگلینڈ میں آکر تبلیغ کیجئے۔ اب تک میں نے

انگلینڈ میں کسی شخص کی زبان سے امن کا نام نہیں سنا۔

(برید فرنگ، صفحہ ۷۲)

"دنیا میں امن و سلامتی کے دور کا خواہاں مسلمانوں سے بڑھ کر کون ہوگا۔ کمزور قوموں کے لئے تو یہ آواز نوید حیات ہے لیکن میرا یہ کہنا ہے کہ اس آب حیات کی حاجت ستمگر، جفا پیشہ، اپنی قوت و طاقت پر مغرور اور امن و سلامتی کو اپنی تلوار سے وابستہ سمجھنے والی قوموں کو ہے آپ غریب ہندوستان کو اس اسپرٹ کو اس امن و سلامتی کے وعظ سے کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ ہاں یہ ہوگا کہ اس میں زندگی کی جو روح ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۴۹)

علامہ اقبال کی طرح سید صاحب نے بھی یورپ خاص کر انگلینڈ اور فرانس کی جمہوریت کا خوب پردہ فاش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہندوستان میں بیٹھ کر یورپ کی جمہوریت اور آزادی و حریت کے بڑے قصے سنے جاتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ عملاً یہاں بھی ارباب حکومت اسی درجہ مبتلا ہیں جس درجہ مشرق میں۔"

(فرید فرنگ، صفحہ ۸۹)

اسی سلسلہ میں فرانس کی جمہوریت کو بھی انہوں نے آڑے ہاتھوں لیا ہے اس کے مطابق فرانس کی جو ری پبلک کہلاتا ہے، حالت انگلینڈ سے بھی بدتر ہے۔ امیر و غریب طبقہ میں معاشرتاً اس درجہ بعد ہے جس قدر خدا اور بندہ میں۔ (ایضاً)

اسی جگہ انہوں نے انگلینڈ کے مزدور کا یہ ریمارک بھی پیش کیا ہے کہ "موجودہ برٹش حکومت ہندوستان کے ساتھ کیا بھلائی کر سکتی ہے جب کہ خود انگلینڈ میں مزدور طبقہ کے ساتھ وہ کچھ نہیں کرتی۔" (ایضاً صفحہ ۸۹)

یہیں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اب سمجھ میں آیا کہ یہاں سوشلزم کے برگ و بار پیدا کرنے کے کیا اسباب ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۸۹)

علامہ اقبال نے بھی یورپ کی جمہوریت کے متعلق کچھ اسی طرح کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ ان کا بھی خیال تھا کہ یورپ میں بھی ایک نہایت چھوٹا طبقہ یہاں کی سائنسی ترقیوں سے پورا فائدہ اٹھا رہا ہے اور عوام ان سے محروم ہیں۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات

(لینن۔ خدا کے حضور میں)

خضر راہ میں جمہوریت کے متعلق علامہ نے جو اشعار لکھے ہیں ان کی حیثیت ضرب المثل کی ہوگئی ہے لہٰذا یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

سید صاحب نے سرمایہ دارانہ نظام اور بالشویک طرز حکومت پر بھی راست طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"انگلینڈ ہمہ تن ایک سرمایہ دار ملک ہے یہاں وزرا سے لے کر عام تاجروں تک اپنے سرمایہ سے دوسروں کی محنت پر فائدہ کرتے ہیں۔"

(برید فرنگ، صفحہ ۱۷۵)

اب بالشوزم کے متعلق ان کا خیال ملاحظہ ہو۔

"بہرحال مشرقی اقوام خواہ بالشویک روس کی نسبت کوئی رائے رکھتے ہوں مگر مجھے ان سے نیکی کی توقع نہیں۔ انقلاب کے آغاز میں ان کی روش بین الاقوامی محبت اور ہمدردی کیوں نہ ہو مگر رفتہ رفتہ وہ قومی محبت اور مخصوص روسی عنصریت کی سیاست کی صورت میں بدل جائے گی اور اس وقت انگلستان کو بھی اس سے مخالفت نہیں ہوگی۔" (ایضاً صفحہ ۱۷۶)

سید صاحب کو یورپ میں ہندوستان کی چند مایہ ناز ہستیوں سے بھی تفصیلی ملاقات کا موقع ملا۔ ان شخصیتوں سے انہوں نے اس دور کے حالات پر تبادلہ خیال بھی کیا اور ان سے کافی متاثر ہوئے۔ وہ ہستیاں تھیں سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور اور جگدیش چندر بوس۔ برید فرنگ میں انہوں نے ایک جگہ علامہ اقبال کا بھی حوالہ دیا ہے جو ایک فرانسیسی مستشرق موسیو لوئی سیناں کی ایک گفتگو کے سلسلہ میں آیا ہے۔ وہ بڑی میٹھی میٹھی باتیں کرتے تھے۔ بات بات پر قرآن کی آیت پیش کرتے تھے۔ تصوف کا بھی دعویٰ تھا۔ مسلمانوں کے تمام واقعات تقدیر کے حوالے کرتے تھے۔ صبر و شکر سے کام لینے کی تلقین کرتے اور بتاتے کہ انبیاء و اولیا کا یہی طریقہ تھا۔ اس موقع پر سید صاحب کو ڈاکٹر اقبال کی مثنوی کا وہ واقعہ یاد آیا جس میں انہوں نے بھیڑیے اور بکری کا قصہ لکھا ہے۔ امیر فیصل کو بہکانے کے لئے انہیں صاحب کو عرب بھیجا گیا تھا۔ ان کی اس طرح کی حوصلہ شکن باتوں کو سن کر سید صاحب کو بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے ان کا نہایت ترش و سخت جواب دیا۔ (برید فرنگ، صفحہ ۱۱۵)

سید صاحب اور علامہ اقبال مغرب کی ان چالوں سے بخوبی واقف تھے اور اپنی قوم کو بھی ان سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ مغرب والے اسی طرح مشرق کے باشعور طبقے کو سلانے اور حالات سے غافل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے جیسا کہ اوپر درج کیا گیا اور یہ دونوں قوم کو بیدار کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں علامہ نے مغرب کی اس چالاکی کی طرف اس شعر میں جو نظم کا آخری شعر ہے اس طرح اشارہ بھی کیا ہے:

مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

سید صاحب کا بھی یہی خیال تھا کہ حکمراں کا جو طلسم ہے اس کو توڑا جائے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے معارف (اعظم گڑھ) کے ایک شمارہ میں لکھا تھا کہ خسرو کی ضرورت ہے تغلق کی نہیں۔ تو سید صاحب نے ان کے اس خیال کی تردید کی اور لکھا: "معارف پہنچا۔ میں قطعاً آپ کی اس رائے کا موئد نہیں کہ خسرو کی تلاش کرو تغلق کی نہیں، سعدی چاہئے سعد زنگی کی حاجت نہیں، حافظ مطلوب ہے شاہ شجاع نہیں...... میرے امن پسند دوست اور سکوں پسند فلسفی تخیل و عمل دو مختلف عالم

ہیں۔ تغلق نے خسرو کو پیدا کیا۔ اکبر نے عرفی کو نشوونما بخشا...... دولت سامانی نہ ہوتی تو ابن سینا کو تحفۂ کتب خانہ میسر نہ آسکتا تھا۔ سلجوقی و ترک نہ ہوتے تو جلال الدین رومی ایشیا کوچک کی سرزمین میں نہ پیدا ہوتے......" (ایضاً، صفحہ ۵۲)

یہی خیال نذیر احمد نے بھی اپنی ایک تقریر میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے نیوٹن اور سائنس کے لئے فورڈ کو بھی ضروری قرار دیا ہے تاکہ تجربہ کے لئے تجربہ گاہوں کی تعمیر کی جاسکے۔ علامہ اقبال کے خیال میں اعلیٰ معیار کے کارناموں کو انجام دینے کے لئے آزادی ضروری ہے کیونکہ:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

اور سید صاحب بھی کہتے ہیں:

"ہمارے آپ (مولانا عبدالماجد دریابادی) میں علت و معلول کے تعین میں جھگڑا ہے۔ آپ کہتے ہیں پہلے شیکسپیئر چاہیئے میں کہتا ہوں پہلے آزاد ہندوستان، محکوم قوم اور اس کی علم دوستی کی مثال یہ ہے:

شب چو عقد نماز می بندم
چہ خورد بامداد فرزندم"

(برید فرنگ، صفحہ ۵۳)

خلافت وفد اپنے مقصد میں ناکام رہا لیکن اس سفر سے سیاسی اور تاریخی شعور پیدا ہو گیا۔ غلامی کا احساس اور بڑھ گیا۔ سجاد ظہیر نے بھی لندن کی ایک رات میں اپنے ایک کردار سے یہی بات کہلائی ہے۔ سید صاحب بھی کتاب زیر بحث میں لکھتے ہیں: "ہندوستان اور ہندوستانی ہونا ہندوستان کے باہر کسی ذلت آمیز تخیل کو پیدا کرتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۷))

گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے مولانا محمد علی جوہر لندن گئے تو یہی غلامی کا داغ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا، انہوں نے اپنی تقریر میں برملا کہا "مجھے آزادی دو ورنہ قبر کے لئے دو گز زمین، میں ایک غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا۔ اور خدا نے بھی اس مرد مجاہد کی اس بات کو سچ کر دکھایا۔ لندن میں ان کا انتقال ہوا اور بیت المقدس میں آسودہ خاک ہوئے جہاں سے ہو کر نہ جانے کتنے پیغمبر گزرے۔
(اقبال)

اس طرح اسی سفر یورپ نے سید صاحب کے دل میں آزادی کی طلب بے حد شدید کر دی۔ اس کے علاوہ یہ کارآمد نکتہ بھی اس شعر سے ان کی سمجھ میں آگیا کہ جب تک ہم طاقتور نہ ہوں گے یا حکومت برطانیہ کمزور نہ ہوگی۔ ہمارا مقصد پورا نہیں ہو سکتا اور اس کی طاقت کا راز ہندوستان کی غلامی ہی میں چھپا ہوا ہے لہٰذا حکومت برطانیہ کو کمزور کرنے کے لئے ہندوستان کو آزاد کرانا ضروری ہے۔ اس وقت سے ان کا مقصد اولین ہندوستان کی آزادی بن گیا جس کا اظہار انہوں نے اس کتاب میں بار بار کیا ہے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر آنے نہیں دے گی۔ ایک فرنچ خاتون نے جو مسلمانوں کی حامی تھی کہا کہ مسلمان متحد ہو کر کوئی مجلس قائم کریں تو سید صاحب نے کہا کہ امپریلسٹ ایسا ہونے نہیں دیں گے وہ کہیں گے یہ وہی پین اسلام ازم کا بھوت ہے جو تمام یورپ کو نگل جائے گا اس کو ہرگز ہرگز زندہ نہ رہنے دیا جائے۔" (ایضاً صفحہ ۶۷)

ایک دوسری جگہ سید صاحب انگریز قوم کو شیطان سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں علامتی انداز میں یہی کہا ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ دراصل انگریزوں یا فرنگیوں کی مجلس شوریٰ ہے۔ علامہ کا ایک لطیفہ بھی جس کو "اقبال کامل" میں مولانا عبدالسلام ندوی نے اس طرح نقل کیا ہے:

"کیمبرج کے زمانہ میں چند ہم عصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی ایک صاحب پوچھنے لگے مسٹر اقبال یہ کیا بات ہے کہ جتنے پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا میں آئے وہ بلا استثنا ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا بھئی شروع شروع میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پینترا جمالیا اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو اس لئے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آتے ہیں ایشیا میں مبعوث ہوئے۔ وہ صاحب بول اٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے۔ انہوں نے جواب دیا یہ تمہارے میکائیولی اور مشہور اہل سیاست اس کے رسول ہیں اس پر بہت قہقہہ پڑا۔" (اقبال کامل، صفحہ ۹۲)

اس عبارت سے انگریزوں کی شیطنت اور واضح ہو جاتی ہے۔

سید صاحب نے اپنی تحریروں میں ایک جگہ انگریز قوم کو شیطان سے تعبیر کیا ہے ان کے ایک مکتوب الیہ عبدالماجد دریابادی نے انگریز اور انگریزیت میں اپنی ایک تحریر میں فرق کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے لکھا:

"آپ فرماتے ہیں کہ تم انگریز کو برا کہتے ہو اور میں انگریزیت کو، تم شیطان کو لعنت کرتے ہو میں شیطنت کو۔ یہ تفریق میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر انگریز میں انگریزیت اور شیطان میں اگر شیطنت نہ ہو تو اس کو کیوں برا کہے۔ شیطنت نہ ہو تو شیطان شیطان نہیں۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۳۸)

ظاہر ہے جب تک شیطان کا بس چلے گا وہ پریشان و ہلکان کرنے سے باز نہیں آسکتا۔ لہٰذا اس سے نجات حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو کمزور کر دو اور یہی طریقہ انگریزی حکومت کے لئے بھی کارگر ہو سکتا ہے جو کمزور ہو گی ہندوستان کی آزادی سے۔ اسی بنا پر سید صاحب نے برید فرنگ میں کئی جگہوں پر یہی بات کہی ہے کہ ہندوستان کی آزادی سب پر مقدم ہے۔ اس کے بعد سید صاحب کا یہی سیاسی ایمان و عقیدہ بن گیا اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں:

"خاتمہ مباحث کے طور پر میں یورپ کے خاتمے پر میں اپنا سیاسی ایمان و عقیدہ اب آپ کے سامنے اور آپ (مولانا عبدالباری فرنگی محلی) کے ذریعہ تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ہم مسلمانوں نے تقریباً اپنی عمر کی نصف صدی اس طرح بسر کی کہ ہندوستان کی پالیٹکس سے عملاً کوئی غرض و مقصد نہیں رکھا اور آوارہ اور

سرگرداں افریقہ اور ایشیا کے صحراؤں اور بیابانوں میں سر مارتے پھرے۔ ہماری مثال بالکل ایسی تھی کہ ہمارے ہی گھر سے کھڑے ہو کر ہمارے دشمن ہمارے ان بھائیوں پر تیر برسا رہے تھے۔ ہم ان کو بچانا چاہتے تھے تو اس طرح کہ اپنے گھروں سے نکل نکل کر دیوانہ وار اپنے بھائیوں کے گھروں کی طرف دوڑتے تھے اور ان کی چھتوں پر کھڑے ہو کر دشمنوں کو زجر و تہدید سے تو کبھی طعن و طنز سے اور کبھی تملق و خوشامد سے اس فعل سے روکتے تھے۔ نیا یہ حماقت نہیں۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۸۹)

جب قسطنطنیہ پر اتحادیوں نے قبضہ کیا تو ایک شخص نے اس کی روداد بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس مہم میں ہندوستان کی فوج نے بڑا اہم رول ادا کیا جس میں مسلمان سپاہی بھی شامل تھے تو سید صاحب کو بڑا قلق ہوا۔

بہر کیف سید صاحب نے اپنے ان خطوط میں برملا کہنا شروع کر دیا کہ پہلے ہندوستان کی آزادی ضروری ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یورپ کے شش ماہانہ تجربہ اور مسلمانانِ عالم سے تبادلہ خیالات کے بعد مجھے نظر آتا ہے کہ ہمارے کام کے تین طریقے ہیں۔ اتحاد اسلامی، اتحاد مشرقی اور اتحاد قومی۔ پہلا اور دوسرا طریقہ وہ ہے جن کا یورپ اپنی قوت بھر سخت سے سخت مقابلہ کرے گا۔ اور ان کو ناکام بنانے میں بڑی کوشش کرے گا...... دوسرا راستہ قومیت کا ہے یعنی ہندوستان کے لوگ ہندوستان کی، ایران والے ایران کی، اہل مصر مصر کی۔ آزادی کی کوشش کریں، یہ راستہ آسان اور جلد کامیاب ہونے والا ہے۔ سبب یہ ہے کہ یورپ کے آزاد خیال قومیت کے اصول پر ایمان رکھتے ہیں۔ خصوصاً موجودہ جنگ کے ہنگامے نے اس آواز کو اور زیادہ پر شور بنا دیا ہے ... بہر حال میرا عقیدہ اب یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی دنیا کی آزادی ہے۔ "کعبہ آزاد کرانا ہے تو ہندوستان آزاد کراؤ۔" (برید فرنگ، صفحہ ۱۸۵)

ہندوستان کی آزادی کے متعلق سید صاحب ایک دوسری جگہ اس طرح رقم طراز ہیں کہ: "اصل کام ہندوستان میں ہے...... دنیا کی آزادی ہندوستان کی آزادی پر موقوف ہے۔" (ایضاً صفحہ ۱۸۲)

سید صاحب ایک جگہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان پر زور دیتے ہیں کہ اپنی آزادی کے لئے اپنی پوری قوت سے اپنی خواہش پیش کرے۔ (ایضاً صفحہ ۱۸۸) یورپ نے بھی انہیں ایسا کہنے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ جہاں وہ ترکی کی آزادی کی بات کرتے تو آرمینیا پر ترکی کے مظالم کا الزام عائد کرنے کے علاوہ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ پہلے ہندوستان کی آزادی کی فکر کرو۔

یہی تمام حالات اور واقعات تھے جن کے ذریعہ سید صاحب اچھی طرح سمجھ گئے کہ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا۔ اسلامی دنیا یا دنیا کے دوسرے غلام ملک بھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ سید صاحب کا یہ سیاسی اور تاریخی شعور بعد کے حالات سے صحیح بھی ثابت ہوا کہ ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی دنیا کے دوسرے ممالک بھی آزاد ہونا شروع ہو گئے اور رفتہ رفتہ سبھی آزاد ہو گئے۔ پروفیسر عزیز احمد نے ایک جگہ لکھا ہے:

"خلافت تحریک دو لحاظ سے انقلابی تحریک تھی ایک تو یہ کہ مغربی سامراج کے مقابل مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک خصوصاً ترکی کو آزاد دیکھنا چاہتی تھی۔ دوسرے وہ ہندوستان کی آزادی کی خواہاں تھی اس وجہ سے بھی کہ مصر سے لے کر ملایا تک بہت سے اسلامی ممالک محض ہندوستان کی وجہ سے برطانوی سامراج کے غلام تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خلافت کانفرنس اور اس کے لیڈروں نے ہندوستان کی کامل آزادی کو ڈومینین اسٹیٹس کے مقابلے میں کانگریس سے پہلے اور کانگریس کے مقابلے میں زیادہ جوش سے ترجیح دی۔" (اقبال، نئی تشکیل، صفحہ ۸۸)

یورپ خاص کر انگریزوں نے اپنے خاص نظریہ وطنیت کے ذریعہ ایک زمانے میں مختلف قوموں، فرقوں اور مختلف ملکوں میں آباد مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کی اور ان کو پارہ پارہ کر دیا جس سے وہ کمزور ہو گئے جس کے سبب علامہ اقبال کو کہنا پڑا:

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

لیکن یہی حکمت مغرب ایک زمانے میں برطانوی تسلط کے پیروں میں بیڑی بھی بن گئی، یعنی صیاد خود ہی اپنے دام میں آ گیا اس کو بھی علامہ نے محسوس کیا اور اسی خضر راہ میں اس شعر سے اس کا اظہار بھی کیا:

تو نے دیکھا سطوت رفتار دریا کا عروج
موج مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ

لیکن موج مضطر کس طرح زنجیر بن سکتی ہے یہ گر خلافت وفد خاص کر سید صاحب نے بتایا اور دنیا کے وہ تمام ممالک جو برطانوی سامراج کے غلام تھے اپنی آزادی کے لئے الگ الگ اٹھ کھڑے ہوئے اور زنجیر غلامی کو توڑ پھینکنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ حکومت برطانیہ جیسی جابر حکومت کے لئے بھی اتنے ملکوں کا بیک وقت مقابلہ کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

اس طرح برید فرنگ پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد کے اہم تاریخی حقائق پر مشتمل ایک تاریخی تالیف ہے۔ جس میں خلافت تحریک کی ابتدائی تاریخ بھی ہے جس کے تمام حالات و واقعات مورخ کے چشم دید ہیں جس سے اس کی تاریخی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ خلافت وفد نے یورپ میں کیا کارنامے انجام دئے اس وقت دنیائے اسلام اور یورپ کے کیا حالات تھے اس کی سچی تصویر برید فرنگ سے زیادہ شاید ہی کہیں اور ملے۔ اس کے پس منظر میں ہندوستان اور ایشیا کے دوسرے ممالک کا عکس بھی کہیں کہیں ابھرتا ہے۔ کلام اقبال سے بھی اس کتاب میں پیش کئے گئے حالات و واقعات کی تصدیق و توثیق ہوتی ہے جو اسی تاریخی پس منظر میں تخلیق ہوئے۔ لہٰذا برید فرنگ خطوط کے فارم میں لکھی گئی ایک عہد کی مستند تاریخ ہے اور اپنے فارم کے لحاظ سے اچھوتی بھی۔

☆☆☆

اداریہ

دیوانہ مر گیا آخر...

نجد کے صحرا میں پھرنے والا دیوانہ یقیناً خوش قسمت تھا کہ اس کی موت سے غزالاں کو واقفیت ہو چکی تھی اور ویرانہ اداس ہو چلا تھا لیکن اس چار گرہ کپڑے کی قسمت کو کیا کہئے کہ جس کی قسمت میں کسی عاشق کا گریباں ہونا لکھا تھا۔ کپڑے کی بات تو دور رہی کچھ عاشقوں کا مقدر بھی ایسا ہی رہا ہے کہ زندگی میں ان کی دیوانگی سے لوگ انگشت بدنداں تو رہے لیکن نہ ان کی موت کو کسی نے یاد رکھا اور نہ خود انہیں ہی۔ شاید اس چار گرہ کپڑے کی قسمت کا ماتم کرنے والے غالب اور اس کے عاشقوں کا بھی یہی مقدر رہا۔ وہ شخص جو زندگی بھر غالب کا دیوانہ رہا۔ حافظ غالب رہا۔ بات کرتا تو غالب کے اشعار میں۔ تحریر بھی اشعار میں ہوتی۔ جس نے غالب کے اشعار کی تفہیم سنگریزوں میں کی اور غالب ہی کے تخیل میں گل بوٹے بنائے۔ جس کی پہنچ غالب کے تخیل کی انتہا تک تھی۔ جس نے پتھروں میں نقش کندہ کیا تو خود پتھر بول اٹھے۔ 'ہاں ہم غالب کے ہم پلہ و ہم نوا ہیں۔' جس نے دنیائے فن کو متحیر کر کے استعجاب میں ڈال دیا کہ دیکھو یوں کہتے ہیں اشعار اور یوں پکارتے ہیں نقش و نگار۔ میری مراد کیپٹن برجندر سیال سے ہے۔

سیال نے اپنی انگلیاں غالب کے اشعار کی تشریح میں فگار کر لیں اور اسی تیشہ کے ساتھ مر گیا۔ کیپٹن برجندر سیال جو فوجی بھی تھا، شاعر بھی تھا، مدرس بھی تھا اور فنکار بھی تھا۔ دل درد مند رکھتا تھا جس کی آنکھوں میں تفسیر غالب کی چمک کی روشنی رہی، وہ کیپٹن بھی اس دنیا سے یوں خاموشی سے گزر گیا کہ دلی والوں میں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی۔ وہ دلی جہاں قبر غالب بھی صدیوں تک ویرانے میں انجانے میں اپنی حسرت کی کہانی سناتی رہی، وہ دلی جس کی خاک سے غالب کے مقتدر ناقد پیدا ہوئے اور غالب کے نام پر کئی ادارے اور انجمنیں تجارت کے پیشے میں لگی ہیں۔ وہ دلی جس نے غالب کے انتقال پر نہ اسے کاندھا دیا اور نہ اس کے لئے فاتحہ خوانی کی اور جو آج اسی غالب کو ہر طرح کی آمدنی کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں، اسی دلی میں غالب کے اس عاشق صادق کا بھی غالب کے جیسا ہی حشر ہوا۔ اسی لئے تو غالب کبھی اردو شاعری کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے اور جب خود غالب کا یہی حشر ہوا تو ان کے عاشقوں کا حال ان سے مختلف کیسے ہوتا۔ واہ رے اردو دنیا جو اپنے گنج گراں مایہ کے کھو جانے کا افسوس بھی نہ کرے، ہم بھی اس سے الگ نہیں ہیں۔ ہم نے بھی اپنے فرض سے کوتاہی کی۔ ہمیں معلوم تھا کہ سیال صاحب اب چند دنوں کے ہی مہمان ہیں لیکن ہم نے بھی ان کی خبر گیری نہیں کی۔ باوجودیکہ 'آجکل' سے انہیں بے حد محبت اور خلوص تھا اور مرنے سے پیشتر بھی جب ان کا رنگ سفید پڑ گیا اس وقت بھی انہوں نے ہمیں یاد کیا۔ لیکن ہمیں بھی اطلاع کیسے ہوتی جب ان کے عزیزان گرامی کو یہ معلوم ہونے کے بعد بھی کہ سیال صاحب کو 'آجکل' کے اراکین سے انہیں والہانہ لگاؤ ہے، انہوں نے ہمیں درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اور ہم آج بھی بے خبر رہتے اگر گربچن چندن صاحب نے ہم سے اس سلسلہ میں احتجاج نہ کیا ہوتا۔ معلوم ہوا کہ اس عاشق غالب کا انتقال کئی ماہ پہلے ہی ہو چکا ہے اور ہم ابھی اسی امید میں بیٹھے تھے کہ شاید سیال صاحب ہمیں حسب معمول جلد ہی فون کریں گے اور اپنی خیریت سے نوازیں گے۔ اب تو وہ مستقل خیریت ہی خیریت سے ہیں اور ایسی جگہ پہنچ چکے ہیں جہاں سے انہیں خود اپنی خبر نہیں آتی۔

برجندر سیال ۱۹۲۰ء میں ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے جو اب پاکستان میں ہے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فارسی آنرس کے ساتھ گریجویشن کیا۔ ۱۹۴۱ء میں سیال صاحب نے انڈین آرمی جوائن کیا جہاں سے وہ آرمی ایجوکیشن کور کیپٹن کی حیثیت سے ۱۹۷۵ء میں سبکدوش ہوئے۔ سیال شروع سے اردو فارسی کے دلدادہ رہے، یہی وجہ ہے کہ آرمی جیسے شعبہ میں ہوتے ہوئے بہت خوبصورت لہجہ میں خوبصورت نظمیں کہتے رہے۔ ان کی آخری نظم ہم نے گزشتہ سال کارگل جنگ کے بعد شائع کی تھی۔

سیال کو غالب سے شروع سے ہی شغف رہا لیکن غالب کے اشعار کے سنگی مرقع کا خیال ان کے ذہن میں کیسے آیا؟ یہ وہ کون سی گھڑی تھی جب سیال صاحب اس کی طرف راغب ہوئے۔ پس منظر کافی دلچسپ ہے۔ سیال صاحب نے ہمیں بتایا تھا کہ غالب سے انہیں قریب لانے میں اور ان مرقعوں کی تشکیل میں ان کی رفیقہ حیات کا بھی اہم رول رہا ہے۔ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر جب وہ دنیا سے رخصت ہو رہی تھیں تو انہوں نے دم آخر یہ شعر پڑھا تھا:

> جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے
> ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

جو سیال کے سینے میں ایک پیکان کی طرح پیوست ہو کر رہ گیا۔ بیوی کے انتقال کے بعد بمبئی کے ساحل سمندر پر سیال کا گھومنا معمول سا بن گیا اور یہیں سے سیال کے ان مرقعوں کی کہانی شروع ہوتی ہے:

یہیں پانی سے تراشے چٹان کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر برجستہ غالب کا ایک شعر زبان پر آگیا، اور شعر کا جمالیاتی خاکہ پورے کرداروں کے ساتھ دماغ میں گھوم گیا۔ خیال ہوا کہ اگر باقی کردار بھی مل جائیں تو سنگریزوں سے غالب کے شعر کی پوری منظر نگاری کا مرقع بن سکتا ہے۔ اسے اتفاق کہئے یا قدرت کا غیبی ہاتھ کہ چند ہی دنوں کی جستجو کے بعد بہت دور کسی اور جگہ سے بالکل ایسا سنگریزہ مل گیا جس کا تصور میں نے کیا تھا۔ اس مرقع کی تشکیل اور تکمیل سے ایک گونہ روحانی مسرت بھی ہوئی اور اسی ڈگر پر آگے بڑھنے کے لئے ایک تخلیقی مشغلہ بھی مل گیا جس نے اپنی لپیٹ اس جنون کی حد تک مجھے لے لیا کہ زندگی کے ہر دکھ سکھ بھول کر اس خود قبول کردہ اپنے اسی عشق میں محو رہے۔ اس طرح سیال کا یہ مشغلہ، جو یقیناً غالب کے اشعار کی تشریح و تفہیم سے جڑا تھا، ان کی رفیقہ حیات کی موت سے شروع ہوا اور یہ مشغلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک ان کو موت نہیں آگئی۔

ایک اندازے کے مطابق کیپٹن سیال نے غالب کے چھ سو اشعار کی تشکیل ان سنگریزوں کی زبان کی ہے۔ اور ان کا ارادہ اس طرح کے ایک ہزار مرقعوں کا تھا۔ ان کا گھر چھوٹے بڑے، آڑے، ترچھے، نوکیلے اور تیز دھار دار پتھروں کا میوزیم بنا ہوا تھا۔ امید تھی کہ وہ اپنا نشانہ پورا کریں گے۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ ان کے کچھ نقش نگار غالب اکیڈمی میں بے کسی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں، کچھ ہم نے شائع کئے اور باقی [illegible] رضا لائبریری والے رامپور لے گئے۔

سیال کے ان مرقعوں کی پہلی نمائش دسمبر ۱۹۸۷ء میں غالب اکیڈمی دہلی میں ہوئی۔ اس کے بعد ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی تقریبات کے موقع پر لکھنؤ میں تین دنوں تک ان کی نمائش ہوئی۔ اسی موقع پر لکھنؤ دوردرشن نے ان خوبصورت مرقعوں کی خوبصورت ڈاکومینٹری تیار کی اور ٹی وی پر بار بار دکھایا۔ آگرہ میں بھی ان مرقعوں کی بار بار نمائش لگائی گئیں۔ میڈیا نے نمائش کی خبروں کی جلی حرفوں میں شائع کیا۔ ہر طرف سے ان کی قدردانی ہوئی۔ لیکن وہ شہرت کے بھوکے نہیں تھے۔ بس گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر اپنے کام میں مگن رہے۔ غالب کے ہی عشق میں وہ اس طرح مرا کہ کوئی نوحہ خواں نہ تھا۔ ☆☆

مجھ کو لے چل

مجھ کو لے چل
جہاں پہ دنیا کے چرچے
کم کم ہوتے ہیں
جہاں پہ میں اور تو کا رشتہ
غیر مجرد ہو جاتا ہے
ہم معنی الفاظ کی مانند
ظاہر و باطن ہو جاتے ہیں

مجھ کو لے چل ایسی جگہ
جہاں پہ استاد و شاگرد
کچھ ایسے بیٹھے ہوں
جیسے ان کے بیچ
سمندر علم کا بہتا ہو، اور
دونوں ہم پلہ ہوں

مجھ کو لے چل وہاں جہاں پر
فلموں کا ہیرو عام انسانوں سے
ہاتھ ملانے کو ترسے
اور اک عامی بھی اس سے
کترا کر آگے بڑھ جاتا ہو

مجھ کو لے چل
شہر کے آخری کونے میں
جس جگہ ہوس کے مارے روز پہنچتے ہیں
تاکہ میں دیکھوں
سب چہرے جانے پہچانے، کالک پوتے

مجھ کو لے چل انساں کی بستی سے باہر
گھنگھور اندھیرے جنگل میں
گھبرایا ہوں روشنیٔ علم و دانش سے
کاش مری آنکھیں اندھی ہو جاتیں
اور میں بہرا بھی ہو جاتا

اے بھائی!
مجھ کو لے چل وہاں پہ لے چل
جہاں پہ دنیا کم کم دیکھنے میں آتی ہے!

پڑوسی کے لیے

جمال اُویسی



میں نے تم سے کہی
تم نے اس سے کہی
اس نے سب سے کہی
بات پھیلی یہاں سے وہاں تک
پھر تو لوگوں نے مجھ کو
سرِ راہ حرمت وہ بخشی
کہ جس کا
میں حق دار بالکل نہ تھا
ایک موہوم سی گفتگو، جو
تمہارے مرے درمیاں راز تھی
کیوں شکایت کا موجب بنی؟
میں نے تم سے کہا تھا بس اتنا
ہم ملیں گر دوبارہ تو کیا ہو
ذہن کو صاف کر لیں تو بہتر
اک محلّہ میں رہ کر ہمیشہ
یوں کشیدہ نہیں رہ سکیں گے
اس سے بہتر ہے غم بانٹ لیں ہم
کچھ ہمیں تم سمجھ لو، تمہیں ہم!
لیکن اس بات کو ---
تم نے لوگوں سے کیسے کہا، کیا کہا؟
سب مجھے اپنا دشمن سمجھ کر
قتل کرنے کے درپے ہوئے ہیں
میرے گھر میں سبھی خوف سے ہیں!

تو

(سنگِ سیاہ کا بے مثال مجسمہ دیکھ کر)

عمار قریشی



ترے خال و خد کا بیان کیا
لبِ سنگ سے یوں ہمو کیا
تو ہزارہا مہ وسال کے
شبِ انتظار کا وصل ہے
تو کلی ہے شاخِ شباب کی
. تو گلاب ہے
تو ہے نسترن
سرِ بام ایسے چمک اٹھی
کہ بدن میں سارے مہک اٹھی
رگِ جاں کا سارا نصاب تو
سرِ گل کی شرحِ جمال تو
بہ انتہا کا کمال تو
بھری چاندنی میں نہائی ہو
افقِ نفس میں سمائی ہو
کہ تبسم رخِ ناز پر
. ہمہ جاں فدا
ہمہ دل فدا

۷-۸۴-۶، قریش چوک، گلبرگہ۔ ۵۸۵۱۰۴
محلّہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ، ۸۴۶۰۰۴

غزلیں

ظفر گورکھپوری

گلے تک آگیا دلدل، لبوں پہ پھر بھی تالے ہیں
اب اس سے اور بڑھ کے کیا برے دن آنے والے ہیں

ہمیں سودا تھا ناہموار راہوں کی مسافت کا
ہوا نے خود ہمارے پاؤں کے کانٹے نکالے ہیں

وہ جو اک انجمن ہے دھیان میں، ویسی کہاں دنیا
تمہارے شہر اور گاؤں ہمارے دیکھے بھالے ہیں

لہو کی گردشوں تک آگیا آئنہ رو کوئی
اب اس مٹی میں اے دنیا اُجالے ہی اُجالے ہیں

چتا کوئی خوشی سے جلی ہے دیر تک گھر میں
جھروکوں میں دھواں ہے، کھڑکیوں کے رنگ کالے ہیں

اُزار کمی تھی شب کی نیند خواہش کے پرندوں نے
کسی کو مار ڈالا، پر کسی کے نوچ ڈالے ہیں

اسی کارن تو ہیں بے چہرہ لوگوں کے نشانے پر
ہم نے پتھروں کی رُت میں آئینے سنبھالے ہیں

بہت خوش ہیں کہ دنیا جیت لی، پر دل ہی جانے ہے
کہ ہم نے اس سفر میں کیا اثاثے پھونک ڈالے ہیں

تو کیا یہ مان لیں وہ پیاس بھی اپنی بجھائیں گے
ظفرؔ چھت پر ہماری یہ جو بادل کالے کالے ہیں

اے-۲۰۳ - فلوریڈا، شاستری نگر، اندھیری ویسٹ، ممبئی

فرید پربتی

سکوتِ مرگ نہ شورِ ثبات سے مجھ کو
ملا رہا ہے کوئی میری ذات سے مجھ کو

تقاضہ اس کے سلجھنے کا دن کرے گا ضرور
ہے ایک مسئلہ درپیش رات سے مجھ کو

وہ کوئی دوست ہے میرا کہ دشمنِ جانی
ڈرا رہا ہے جو آبِ حیات سے مجھ کو

بہت دنوں سے کوئی خواب بھی نہیں آتا
چھڑا کے کون گیا ممکنات سے مجھ کو

جو میری راہ میں آسانیاں بچھاتا تھا
دو چار کرتا ہے اب مشکلات سے مجھ کو

تمہارے بارے میں چھوڑا ہے سوچنا جس نے
رہا نہ انس کوئی شش جہات سے مجھ کو

سخن سخن میں کھلاتا ہے پھول جو اکثر
ہوا ہے رنج بہت اس کی بات سے مجھ کو

جو نقدِ جاں کی طلب ہو تو شوق سے دے دوں
نواز دینا وفا کی زکات سے مجھ کو

کوئی پیام گلوں کا نہ خوشبوؤں کی خبر
ملا نہ کچھ بھی صبا تیرے ہات سے مجھ کو

شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر

حنیف ترین

پے بہ پے حالات کی تبدیلیاں
وقت کو پھر دیں گی خوش آثاریاں

ذات کے صحرا سے اب باہر نکل
چل رہی ہیں کالی پیلی آندھیاں

بال کھولے کس نے یہ صحراؤں میں
اڈیں ہر سو کالی کالی بدلیاں

آئینہ خانوں کو دھندلا کر گئیں
عکس کے دامن پہ اڑتی تتلیاں

کون آیا آنکھیں روشن ہو گئیں
کھل گئیں پھر دل کی ساری کھڑکیاں

بعد اس کے بستروں میں تھیں حنیفؔ
شب گزیدہ خواب اور گولیاں

عرعر، سعودی عربیہ

غزلیں





بیتاب چلپی بھیتی

صبح ہونے کو ہے اور رات ڈھلی جاتی ہے
تم سے اک بات جو کہنی تھی رہی جاتی ہے

یاد آتی ہے تو آتی ہی چلی جاتی ہے
اشک تھمتے ہیں نہ پلکوں کی تری جاتی ہے

ہاتھ میں لے تو لیا پھول مگر کب سوچا
ہاتھ سے پھول کی خوشبو تو اُڑی جاتی ہے

وضع داری ہی رہی اور نہ رواداری ہے
ہم سے اب ساری وراثت ہی چھنی جاتی ہے

اس کے اظہار محبت کا طریقہ ہے عجیب
منہ سے کچھ کہتا نہیں آنکھ جھکی جاتی ہے

وہ غریبی ہے جو مجبوری ولاچاری میں
ایک زردار کے پیروں پہ گری جاتی ہے

بات کرنی نہیں آتی ہے تو ہم سے سیکھو
کس طرح بات سلیقے سے کہی جاتی ہے

اب کسی شخص کی پہچان نہیں ہو پاتی
وقت کی گرد یوں چہروں پہ جمی جاتی ہے

آگ بن کر یہ دہک اٹھے گی اک دن بیتاب
راکھ کے نیچے جو چنگاری رہی جاتی ہے

قصبانہ، مسلم چوک، فتحپور۔۲۱۲۶۰۱

شمیم انجم وارثی

آگ رکھ دے جو آب کے اندر
وہ ہنر ہے شباب کے اندر

ایک بڑھیا ہے قید صدیوں سے
بے سبب ماہتاب کے اندر

باوضو ہو کے جب بھی پی میں نے
تجھ کو دیکھا شراب کے اندر

تربتر خون میں تھیں تعبیریں
خواب ٹوٹا تھا خواب کے اندر

غم کا زہریلا ناگ پلتا ہے
اس دلِ اضطراب کے اندر

ایک چہرہ گلاب کے جیسا!
مسکرائے گلاب کے اندر

خود کو رکھنا بہت ضروری ہے
دوستو! احتساب کے اندر

خون مژگاں سے رس رہے تھے شمیم
آنکھ زخمی تھی خواب کے اندر

ایم ڈی روڈ، گارولیا، اتر ۲۴ پرگنہ، ۷۴۳۱۳۳

ضمیر یوسف

اپنا تو یہ شوق ہے پرانا
آندھی میں چراغ دل جلانا

صحرا صحرا بھٹک رہے ہیں
دیوانوں کا گھر نہ آشیانہ

عرصہ ہوا ہے یوں تو ہم کو بچھڑے
یادوں کا مگر ہے آنا جانا

ورثے میں یہ فن ملا ہے مجھ کو
پتھر کو بھی آئینہ بنانا

درد جگر کو سب نہیں سمجھتے
اندھوں کو چراغ مت دکھانا

تنہائی اگرچہ مار ڈالے
کم ظرفوں سے رسم مت بڑھانا

یہ شہر خلوص تھا مگر اب
ذہنیت ہے اس کی تاجرانہ

دل پر ہے ضمیر بوجھ بھاری
اچھی سی کوئی غزل سنانا

۲/۶ ۳۔۷ ایس سی روڈ، بی گارڈن ہوڑہ ۷۱۱۱۰۳

غزلیں

سردار آصف



مرے وجود کے کردار جانے کتنے ہیں
عجب اثاثہ ہے حقدار جانے کتنے ہیں

ابھی تو ایک بھی کشتی پلٹ کے آئی نہیں
پھنسے ہوئے ابھی اس پار جانے کتنے ہیں

یہ پہلا موڑ ہے اور تم ابھی سے اوب گئے
ابھی کہانی میں کردار جانے کتنے ہیں

نہ جانے دیکھی ہے لوگوں نے اس میں خوبی کیا
کہ جان دینے کو تیار جانے کتنے ہیں

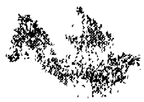
تمہارا نام بھی شامل ہو ان میں ممکن ہے
مری تباہی کے آثار جانے کتنے ہیں

نہ جانے ختم کہاں ہو سفر یہ لپٹوں کا
ابھی تو راہ میں اشجار جانے کتنے ہیں

لکیریں ہاتھ کی تلوار سے نہیں کٹتیں
بغیر تاج کے سردار جانے کتنے ہیں

ڈی پی آر او، بجنور (یوپی)

فراق جلال پوری



جو مقدر ساز ہے کیوں کر وہ ٹھوکر کھائے گا
دربدر کی مار تو رستے کا پتھر کھائے گا

کچی دیواریں کہیں گی بارشوں والا عذاب
آندھیوں کی چوٹ مجبوروں کا چھپّر کھائے گا!

آدمی کا مسئلوں کی جونک چاٹے گی دماغ
غم کا کیڑا بیٹھے بیٹھے اندر اندر کھائے گا

تھوڑا عیاروں سے مل جل کوٹھیاں بن جائیں گی
تھوڑا سا مکار بن جا لقمۂ تر کھائے گا!

جھوٹ بولے گا تو مل جائے گی شہرت شہر میں
سچ اگر بولا تو چوراہے پہ پتھر کھائے گا

آج تو لوٹا ہے مہنگائی کی ڈائن نے تجھے!
بھوک کا شیطان کل بیوی کے زیور کھائے گا

تاج کا احسان سر پر مفت میں مت رکھ فراقؔ
وقت بدنیت ہے ورنہ کل ترا سر کھائے گا

جلال پور، قاضی پورہ، امبیڈکر نگر۔۲۲۴۱۴۹

طارق متین



یہاں کے لوگ ہیں بس اپنے ہی خیال میں گم
کوئی عروج میں گم ہے کوئی زوال میں گم

نصابِ عشق میں ہجر و وصال ایک سے ہیں
ہے میرے ہجر کا رشتہ ترے وصال میں گم

یہ اک نظارہ الگ ہے سبھی نظاروں سے
مری نظر کا تسلسل ترے جمال میں گم

یہ نازکی مرے شعروں کی بے سبب تو نہیں
کہ میری فکرِ سخن ہے اُس غزال میں گم

تمہیں ہو کیسے خبر، خود مجھے نہیں معلوم
میں کس جواب میں گم ہوں، میں کس سوال میں گم

تمہیں ہو کیسے خبر، خود مجھے نہیں معلوم
میں کس جواب میں گم ہوں، میں کس سوال میں گم

بچا ہے کون یہاں وقت کے تھپیڑوں سے
ہے میری عمر گریزاں بھی ماہ و سال میں گم

لکھمنیا، بیگوسرائے۔۸۵۱۴۱۱

شوکت حیات

بزرگ مرشد کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

سوال کرنے والے عقیدت مند کے لئے یہ کیفیت حیرت انگیز تھی۔

اس نے خلوص نیت سے کچھ سیکھنے کے جذبے کے تحت سوال کیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بزرگ اس کے سوال کو سن کر خالی خالی آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھنے لگیں گے۔

چہرہ ہر طرح کے جذبے سے عاری۔ جیسے آج وہ زندگی کی دہلیز پر پہلی بار قدم رکھ رہے ہوں اور کسی شیر خوار بچے کی طرح معصوم ہوں۔

یہاں تک تو بات اتنی غیر متوقع اور پریشان کن نہیں تھی۔ بزرگ، صوفی، مجذوب، فن کار اور بعض دیگر حضرات کا زندگی کے تئیں رویہ عام طور پر عام آدمیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن جب چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھیل اور آبشار بننے لگیں تو حیرت میں مبتلا ہونا فطری ہے۔

کچھ نے سوال کرنے والے کی طرف ناگوار نگاہوں سے گھورا۔

"کیا ضرورت تھی حضور سے اس طرح کی بات پوچھنے کی؟"

"کون سی بات کب نازک دل کو ٹھیس پہنچادے اور قطرے دریا کا روپ لینے لگیں، کون جان سکتا ہے؟"

سوال کرنے والا بھی تاسف سے دم بہ خود تھا۔ کچھ حاصل کرنے کی نیت تھی لیکن حضور صدمے سے دوچار ہوگئے۔

لیکن وہ سوال آخر کیا تھا جس نے حضور پر سکتہ ساطاری کردیا، یہ سوالی کے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا۔ اس نے اتنے قریب جاکر دھیمے لہجے میں سوال کیا تھا کہ آس پاس کے لوگ بھی اس کی آواز کو سن نہیں پائے۔

دروازے پر پاپوش کے نزدیک بوسیدہ جوتے اور چپلوں کے متعدد جوڑے بکھرے پڑے تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہال میں بچھی ہوئی قالین لوگوں کے بوجھ سے دبی ہوئی کراہ رہی تھی۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ زخموں کے داغ دھبے اس کی طویل العمری کی داستان سنا رہے تھے۔

اس قالین پر ایک نسل ادھیڑ سے بوڑھی ہونے کے بعد اپنا رول ختم کرچکی تھی اور دوسری جوان نسل ضعیفی کے اوبڑ کھابڑ راستوں کی سمت گامزن تھی۔ ہال میں سناٹا چھایا تھا۔ بزرگ کی آنکھوں کے کناروں تک پہنچتے ہوئے آنسوؤں کے ہلکوروں کی لے دھیرے دھیرے تیز ہوتی جارہی تھی۔

آستانے کی دیوار جگہ جگہ سے شکستہ تھی۔ ایک دیوار پر خوشنما مذہبی طغرئی کسی کی آمد کا جیسے صدیوں سے منتظر تھا۔ اس کی بغل میں کسی مسجد کی فلک بوس عمارت اور اونچے گنبد ہال کی خاموشی اور سناٹے کو جیسے چپ چاپ اپنے اندر جذب کرتے ہوئے محویت کے عالم میں مغموم تھے۔

ایک زمانے سے چونے گرودانی کو ترستی ہوئی دیواریں اور چھت حیرت سے کبھی بزرگ کا سپاٹ چہرہ، بھیگی آنکھیں اور استغراق کا عالم دیکھ رہی تھیں، کبھی آستاں بوس مجمع کے متغیر اور سر جھکائے پریشان لوگوں کے پشیمان چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اگربتی کی دھیمی دھیمی خوشبو کو کریدتی ہوئی حیات فہمی کی ترغیب دے رہی تھی۔

کھڑکی کے باہر امرود کے درخت کی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے ہلتی ہوئی بزرگ سے خاموشی اور سکتے کا عالم توڑنے کی استدعا کررہی تھیں۔ پیڑ کے پھل کئی مہینے پہلے فروخت کئے جاچکے تھے اور ٹھیکہ لینے والے نے انہیں کب کا منڈی میں پہنچادیا تھا۔ پھل سے خالی درخت اس حال میں بھی سرسبز و شاداب دکھائی دے رہے تھے۔

دور بیٹھا ہوا ایک آدمی دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا سوال کرنے والے شخص کے قریب آیا۔ اپنا منہ اس کے کان کے پاس لاکر اس نے سرگوشیوں میں پوچھا۔

"تم نے مرشد سے کون سا سوال کیا؟"

"میں نے تو......!"

وہ ہکلانے لگا۔

بہت دھیمی آواز میں پھسپھساتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں نے سیکھنے کی غرض سے محض یہ پوچھا تھا کہ حضور اس زمانے میں جب کہ بڑے بڑے عالم

ڈاکٹر مہابیر بھون، مہندرو، پٹنہ ۔ ۸۰۰۰۰۶

چاپلوس، چرب زبان اور جاہل مرتبت لوگ در پردہ گردن تک دنیاداری، لہو و لعب اور گھوٹالوں میں ڈوبے ہوئے ہیں، آپ نے خود کو اب تک کیسے بچائے رکھا۔ اپنی بے داغ اور پاک و صاف زندگی کا راز بتانے کی مہربانی کریں۔"

اس نے بھی سوالی کو اس انداز میں گھورا جیسے اس نے مرشد کی شان میں گستاخی کردی ہو۔

"سنو........"

مرشد کے چہرے پر تناؤ تھا۔ آنکھوں میں فکر کے ڈورے ہچکولے کھا رہے تھے۔ پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی۔

مرشد کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ انہوں نے پھر خاموشی اختیار کرلی۔

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔

ان کی جہاں دیدگی نے جانے کون سا نظارہ دیکھا تھا جو مردہ سی بے کیفی کا سمندر ان کے وجود کی مٹی کو نگلتا جارہا تھا۔ تھوڑے توقف کے بعد سوال کرنے والے کو انہوں نے اشارے سے قریب بلایا۔ کیفیتوں کا ایک متلاطم دریا ان کے اندر موجزن تھا اور وہ بلند آہنگی کی استطاعت سے محروم دکھائی دے رہا تھا۔ اوپر سے نیچے تک ان پر نقاہت اور بے بسی طاری تھی۔ صدیوں کے سفر کی تکان کے بوجھ سے ان کے کندھے دکھ رہے تھے۔ اشارے سے اسے قریب بلانے میں بھی انہیں پوری قوت صرف کرنی پڑی تھی۔

"تمہارے اس سوال کا جواب مجھ پر قرض رہا۔ وقت آنے پر میں اس کا جواب دوں گا!"

مرشد کے تذبذب کے انداز اور کنپٹیوں کی تنی ہوئی نسوں سے لوگوں کو ان کے گوشہ نشیں ہونے کی ضرورت کا اشارہ ملا۔ انہیں استراحت کی حاجت تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے سے بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ کتنوں کے ٹیڑھے اور پیچیدہ سوالوں کے انہوں نے تفصیلی جواب یوں دئے تھے جیسے کوئی صاف و شفاف دریا مدھر سنگیت کے ساتھ دھیرے دھیرے بہہ رہا ہو۔ اس سوالی کے سیدھے سادے سوال نے انہیں الجھا دیا اور اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے۔

لوگ دھیرے دھیرے کھسکنے لگے۔

ہال خالی ہو گیا۔

مرشد کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کا باندھ ٹوٹ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے انہیں پہلی بار دیکھا گیا تھا۔

(۲)

ایک عرصہ بیت گیا۔

مذکورہ واقعہ بھولی بسری باتوں کی طرح دھند کی گہری تہوں میں دب گیا۔

کسی نے اس سوالی تک پیغام پہنچایا کہ مرشد نے اسے یاد کیا ہے۔

دست بوسی کے بعد بزرگ کے سامنے وہ دو زانو بیٹھا تھا۔

"کئی سال پہلے تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا؟"

حیران و پریشان سوالی کو چشم زدن میں سب کچھ یاد آگیا۔ مرشد کا سکتہ، گہری اداس ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں، جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی بوسیدہ قالین، کسی کی آمد کا منتظر طغری، پاپوش پر بکھرے ہوئے مرمت طلب نعلین اور چپلوں کے ڈھیر، فلک بوس مسجد کی آنکھوں میں منظر نامے کو جذب کرتی ہوئی حیرت و استعجاب کی جہاں دیدگی۔

"آج میں نے سوچا کہ اپنے اس قرض کی ادائیگی کردوں۔ تمہارے سوال کا تشفی بخش جواب دے دوں۔ میں یہ بوجھ لے کر رب العزت کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتا.....!"

"جی مرشد......!"

اس نے سر جھکائے ہوئے پورے اشتیاق کے ساتھ مرشد کی تجویز پر اثبات میں اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔

"لیکن..........!"

مرشد نے پہلو بدلا۔

"لیکن تمہارے سوال کا جواب دینے سے پہلے تمہیں ایک اہم اطلاع دینی ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس سوال کا جواب لئے بغیر تشنہ کام روانگی اختیار نہ کرو......!"

"میں سمجھا نہیں مرشد!"

عجیب سی بے چینی اور اضطراب میں اس نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"دیکھو.....!"

مرشد کہتے کہتے رک گئے۔

انہوں نے آنکھیں بند کیں۔

کچھ دیر یہی کیفیت رہی۔ پھر دھیرے دھیرے آنکھیں کھولتے ہوئے انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"دیکھو تمہارا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ تم چند گھنٹے کے مہمان ہو۔ صبح سورج کی پہلی کرن کے طلوع ہوتے ہی تم اس دنیا سے کوچ کر جاؤ گے۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ آخرت کے ابدی سفر پر تم اس سوال کے بوجھ سے لدے پھندے روانگی اختیار کرو......!"

"مرشد..........!"

اس کے منہ سے لمبی چیخ نکلی۔

"اب جب کہ موت میرے سامنے مجھے نگلنے کے لئے منہ پھاڑے کھڑی ہے، اس سوال کا جواب میرے کس کام کا؟"

وہ روہانسا ہو گیا۔

"اس جنازے کو رخصت کی اجازت دیجئے مرشد......!"

کہتے کہتے سوالی کے جسم کی ساری قوت سلب ہو گئی۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کاٹو تو لہو نہیں۔ وہ رینگتے ہوئے واپس مڑا اور گرتے پڑتے، ہانپتے کانپتے اپنے گھر پہنچا۔

"کیا ہوا..... اس طرح ڈرے سہمے ہوئے کیوں ہو..... چہرہ کیوں پیلا پڑ گیا ہے......؟"

بیوی نے سوال کیا۔

"مرشد نے کہہ دیا ہے کہ میری موت قریب ہے..... صبح کی پہلی کرن اور..... مرشد کی کوئی پیشین گوئی آج تک غلط نہیں ہوئی۔ وہ آدمی کے بھیس میں

فرشتہ ہیں۔ انہیں غیب کی سربستہ باتوں کا علم ہے......؟"

بیوی بدحواس ہو گئی۔ اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ اس کے آگے کا رکھا ہوا کھانا ٹھنڈا ہو گیا۔ رات بھر وہ گڑگڑاتا رہا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ بیوی بچے روتے روتے جانے کب نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔

(۳)

پو پھٹتے ہی فضا کے سینے کو چیرتی ہوئی فجر کی اذان کی لا، ہوتی آواز گونجی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد لاٹھی ٹیکتے ہوئے معمر مرشد سوالی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

نماز پڑھ کر لوٹتے ہوئے راہ گیروں نے انہیں حیرت سے دیکھا۔

سوالی کے گھر پر دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دروازہ کھلا تھا اور سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔

"مرشد!...... اپنے شوہر کی زندگی کی بھیک چاہیے۔ آپ خدا سے دعا کریں کہ اس کی موت ٹل جائے......!"

بیوی مرشد کے پیروں سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

مرشد دھیرے دھیرے سوالی کے بستر کی طرف بڑھے۔

"تم اپنے سوال کا جواب سننے کے بعد ہی اس دنیا سے رخصت کا سفر اختیار کرو......!"

"حضور میں اب جواب جان کر کیا کروں گا۔ میری زندگی کے چند لمحے ہی باقی رہ گئے ہیں......!"

"تمہارے سوال کا جواب تمہیں مل چکا ہے...... بتاؤ اپنی موت کی آگہی کے بعد سے اب تک تم نے کتنے گناہ کیے......؟"

"مرشد......!"

وہ رونے لگا۔

"گناہ کا ارتکاب تو بہت دور کی بات ہے...... میرے لئے گناہ کے بارے میں سوچنا بھی مشکل ہے۔ رات بھر میں نے توبہ استغفار کیا......!"

"تم نے جب موت سامنے دیکھی تو گناہ کے بارے میں سوچنا بھی مشکل ہو گیا۔ زندگی پر موت کی پرچھائیں بے داغ زندگی کی ضامن بن جاتی ہے...... میں نے ہوش کی آنکھیں کھلتے ہی اپنی زندگی کو موت کی ڈور سے باندھ دیا...... لغزش کا سوال کہاں تھا...... مری بے داغ زندگی کا راز اسی جھولنے سے ٹکنے میں مضمر ہے!"

مرشد نے چاروں طرف ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔

اس کی بیوی کی طرف دیکھ کر زیر لب مسکرائے۔

پھر سوالی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

"میں نے تمہیں تمہارے سوال کا جواب دینے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیا!"

مرشد کے ہونٹوں پر رینگتی ہوئی مسکراہٹ کا دائرہ پھیل گیا۔

"موت اور زندگی سب اس کے اختیار میں ہے!"

چند لمحوں کے توقف کے بعد بزرگ کچھ سوچنے لگے۔

ان کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

ان کی آنکھیں ایک بار پھر ڈبڈبانے لگیں۔

اس سے پہلے کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے دروازے کی طرف تیزی سے واپس مڑ گئے۔

نرم نرم ہوا کا اٹھلاتا ہوا جھونکا ان کے دھیمے دھیمے اٹھتے ہوئے پیروں کو بوسہ دیتا ہوا کچھ دور پر ایستادہ پہاڑیوں سے ٹکرانے کے لئے اپنی دھن میں آگے بڑھ گیا۔

شاداب درختوں کی ٹہنیاں ایک مدت کے بعد انہیں اس راستے سے گزرتے دیکھ کر پھولے نہیں سما رہی تھیں اور ہواؤں کے دوش پر رقص کرتے ہوئے کورنش بجا لا رہی تھیں۔

مرشد کا متذکرہ نکتہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا۔

لیکن ان کے آبدیدہ ہونے کا سبب ذہن پر کافی زور دینے کے باوجود اس کے لئے ناقابل فہم تھا۔

☆☆☆

اعلان

☆ تخلیق کار حضرات سے اپیل ہے کہ وہ اپنی نگارشات صاف ستھری اور خوشخط تحریر میں بھیجیں۔ صفحہ کے ایک ہی طرف لکھیں۔ فوٹو کاپی / کاربن کاپی قابل قبول نہیں ہوگی۔

☆ تخلیق کے ساتھ تازہ پاسپورٹ سائز بلیک اینڈ وہائٹ تصویر ضرور ارسال کریں۔

☆ غیر طلبیدہ مضامین ناقابل اشاعت ہونے کی صورت میں تلف کر دئے جائیں گے۔

☆ جواب طلب امور یا نگارشات کی واپسی کے لئے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔

☆ تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں لازماً ارسال کریں۔ کتاب بھیج کر تبصرے کا انتظار کریں۔ بار بار تقاضا کر کے ہمیں پریشان نہ کریں۔ نمبر آنے پر ہی ہم تبصرہ شائع کریں گے۔ کتاب کے ساتھ تبصرے کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ ہر کتاب پر ہم تبصرہ شائع کریں۔

☆ ایجنٹ حضرات کے لئے اب رسالہ وی۔ پی سے بھیجنے کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ جو لوگ ایجنسی لینا چاہتے ہیں وہ رسالے کی مطلوبہ تعداد کی تین مہینے کی رقم بعد وضع کمیشن بینک ڈرافٹ / چیک / منی آرڈر / پوسٹل آرڈر بنام ڈائریکٹر، پبلی کیشنز ڈویژن، سرکولیشن منیجر کو پیشگی بھیجیں۔ یہ بھی نوٹ کر لیں کہ خریداری یا ایجنسی کی رقم موصول ہونے کے تقریباً دو مہینے کے بعد ہی رسالہ جانا شروع ہوگا، اس وقت تک انتظار کریں۔ (ادارہ)

م۔ م۔ راجندر



میاں دورنگی

لطف علی صاحب کا نام ان کے بٹیر کے نام پر میاں دورنگی کیسے پڑگیا تھا یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ تھا۔ بہر حال انہیں سب ہی لوگ میاں دورنگی کہہ کر بلاتے تھے۔ لطف علی کبھی اس نام سے پکارے جانے پر کسی قسم کے تردد یا ناراضگی کا اظہار نہ کرتے۔ اس کے برعکس وہ ہر کسی سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔

لطف علی، خاں صاحب شرافت حسین ریٹائرڈ جیلر کے اکلوتے لڑکے تھے اور اک پرانی بنی ہوئی لمبی چوڑی حویلی میں اگر کوئی آواز آتی تھی تو وہ لطف علی کی ہوتی تھی یا ان کے بٹیر دورنگی کی۔ خاں صاحب پر فالج گرا ہوا تھا اور وہ اوپر کی منزل میں پڑے رہتے تھے۔ شریک حیات زمانۂ ملازمت میں ہی داغِ مفارقت دے گئی تھیں۔ بس ایک خادم تھا جو خان صاحب کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا اور گھر کا سارا کام بھی اسی کی ذمے داری تھی۔ گھر میں کئی سالوں سے رہنے والی بلی کی طرح وہ بھی سبک قدم اور خاموش تھا۔

میاں دورنگی کے بارے میں بھی کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کہاں تک پڑھے ہوئے ہیں۔ تھوڑی انگریزی موقع محل سے بول لیتے تھے مگر جو فقرہ کہتے صحیح کہتے۔ عمر کا اندازہ اگر اڑتے ہوئے بالوں سے لگایا جائے تو ۴۵ تک کی ہو سکتی تھی مگر جسم کی بناوٹ، چہرے مہرے اور اس پر رونق سے تیس کے لگتے تھے۔ نہ شادی کرائی تھی نہ ملازمت کی تھی۔ اس لئے ہر لحاظ سے آزاد تھے۔

۶۸۔ چتراوہار، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

میاں دورنگی سے میری ملاقات اپنے دوست اکرم کے توسط سے ہوئی تھی۔ میں چھٹیوں میں آیا ہوا تھا اور ایک شام کو اکرام کے ساتھ بازار میں ٹہل رہا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے میاں دورنگی مل گئے اور اکرم نے ان کا تعارف مجھ سے ان لفظوں میں کرایا کہ اردو کے اچھے شاعر ہیں۔ اس وقت وہ اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور نوک دار جوتی پہنے ہوئے تھے اور ان کے داہنے ہاتھ کی پشت پر لال رنگ کی ریشمی ڈوری سے بندھا ہوا ان کا بٹیر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ نہایت شستہ لہجہ، شکل وصورت سے خاندانی شرافت مترشح۔ بات بات میں اکرم صاحب نے میرے بارے میں یہ بھی کہہ دیا کہ کیرم کے بہت اچھے کھلاڑی ہیں۔ میاں دورنگی کیرم کھیلنے کے بھی شوقین تھے اور یہ سن کر بولے کہ میں کل صبح ان کے یہاں اکرم کے ساتھ پہنچ جاؤں اور ایک دو کیرم کے گیم ان کے ساتھ بھی لگ جائیں۔ میں نے ہاں کردی۔

اسی طرح میاں دورنگی کے ساتھ میری دو چار ملاقاتیں ہوگئیں اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگرچہ ان کی شرافت اور بردباری مسلم تھی، وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور شاید میٹرک پاس بھی نہ ہوں۔ اردو ادب سے بھی کوئی ایسا واسطہ معلوم نہیں دیا مگر کبھی اپنے منہ سے یہ انکار نہیں کیا کہ وہ شاعر نہیں ہیں۔ بلکہ احباب مذاقاً زور دیتے تھے تو کوئی چھوٹی سی غزل یا دو چار متفرق اشعار سنا بھی دیتے تھے۔ خوش حال باپ کے اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے شاید کچھ بگڑ گئے ہوں گے اور چونکہ کوئی خاص پڑھے لکھے بھی نہیں تھے اور کوئی ملازمت یا کام بھی نہیں کرتے تھے اس لئے غالباً شادی بھی نہیں ہوئی۔ خان صاحب کے پاس اتنا پیسہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ گزر اوقات آسانی سے ہو جائے۔ ویسے بھی ان کی پنشن تو آتی ہی تھی اور گھر کا مکان تھا۔

آہستہ آہستہ مجھ پر یہ راز بھی وا ہو گیا کہ ان کا نام دورنگی ان کے بٹیر کے نام کی نسبت سے نہیں تھا بلکہ یار لوگوں نے ان کی خصلت کی بنا پر رکھ دیا تھا۔ میاں دورنگی اپنے لباس میں کوئی نہ کوئی ایسی چیز پہنتے تھے جو دوسروں کو کھٹکتی تھی۔ اگر کوٹ اور ٹائی پہنے ہوئے ہیں تو سر پر پھندنے دار ٹوپی لگا رکھی ہے۔ ململ کا کرتہ ہے تو پاجامے کی بجائے پتلون پہنی ہوئی ہے اور اس کے ساتھ پشاوری چپل۔ کئی دفعہ ٹائی کی جگہ رنگین رومال گرہ لگا کر باندھ لیتے۔ یہی حال اپنے بٹیر کے ساتھ کر رکھا تھا۔ کبھی اسے کسی رنگ میں رنگ دیتے، کبھی کسی میں۔ کبھی گلے میں کچھ باندھ دیتے اور کبھی کپڑے پہنادیتے۔ اس کے پاؤں میں پڑے ہوئے گھنگرو اور چھلے بھی ہر روز بدلتے رہتے تھے۔

ایک روز اکرم نے صبح صبح یہ خبر سنادی کہ آج شام کو آٹھ بجے قربان علی کے چھاپے خانے میں مشاعرہ ہے اور میری بانہہ پکڑ کر بے اختیار ہنستے ہوئے بولا کہ ضرور چلنا مشاعرے کی صدارت میاں دورنگی

کریں گے۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر اشتہار پڑھا جو قربان علی نے اپنے پریس میں محلّے اور بازار میں بانٹنے کے لئے مفت چھاپ دئے تھے۔ اس میں لکھا تھا کہ صدارت میاں دور نگی گردش فرمائیں گے۔ اس طرح ان کے تخلص کا انکشاف ہوا۔ بہر حال طے ہوا کہ شام کو مشاعرے میں چلیں گے۔

قربان علی کے اردو پریس میں مشکل سے اتنی جگہ تھی کہ پچاس ساٹھ آدمی دری پر بیٹھ سکیں۔ بہر حال یہ محلّے کے شائقین اردو کا چھوٹا سا مشاعرہ تھا اور اتنا اجتماع بھی کافی تھا۔ میں اور اکرم ذرا دیر سے پہنچے۔ اگرچہ مشاعرہ تو شروع نہیں ہوا تھا مگر لوگ توقع سے زیادہ آگئے تھے اور کہیں کوئی جگہ نہیں تھی اگرچہ قربان علی نے پیچھے سے بھی کچھ سامان اور بے کار مشینوں کے پرزے اٹھواکر ایک دری ڈائس کے پیچھے بھی بچھوادی تھی۔ لوگوں کے کہنے سے ڈائس جو چھوٹی سی میز اور چھ کرسیوں پر مشتمل تھا خالی ہوئی جگہ پر پیچھے کھسکا دیا گیا تاکہ سامعین شعرا کے چہرے تو دیکھ سکیں۔ اس تبدیلی بلکہ افراتفری میں میں اور اکرم آگے کھسک گئے اور زور لگاکر زبردستی ایسی جگہ پر بیٹھ گئے جہاں سے شعرا کو صاف دیکھا اور سنا جاسکتا تھا۔

میاں دور نگی کرسی صدارت پر بیٹھ چکے تھے اور مشاعرے کی کارروائی قربان علی کی تقریر سے شروع ہوگئی تھی۔ آج میاں دور نگی پر غضب کی بہار تھی۔ سیاہ اچکن زیب تن کئے ہوئے تھے اور اس کے بٹن ہول میں ایک بڑا سا سرخ گلاب کا پھول لگا ہوا تھا اور کسی دیسی عطر کی مہک یہاں تک آرہی تھی۔ میں حیران ہوا کہ آج میاں دور نگی کے لباس میں ایسی ہم آہنگی کیوں مگر دفعتاً ان کے سامنے میز پر رکھی ہوئی فیلٹ کیپ پر نظر پڑ گئی۔ یہ انگریزوں کے زمانے کا ہیٹ ان کے سوا اور کسی کا نہیں ہوسکتا تھا!

میاں دور نگی نے لسٹ کے مطابق شعرا کے نام پکارے اور انہوں نے اپنا کلام سنایا مگر میں نے یہ دیکھا کہ نہ تو شعرا کلام سنانے میں سنجیدہ تھے اور نہ کوئی اشعار ہی ایسے تھے جو واقعی معنوں میں داد کے مستحق ہوں۔ مگر چونکہ ہر قسم کے لوگوں کی کافی بھیڑ تھی ہر شعر پر خوب واہ واہ ہوتی اور شور مچتا۔ کوئی آدھ گھنٹہ ہی ہوا ہوگا اور مشکل سے چار شعرا نے اپنا کلام پڑھا ہوگا کہ بھیڑ بے تاب سی ہوگئی اور چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ 'صاحب صدر اپنا کلام سنائیں۔' 'ہم گردش صاحب کو سنیں گے' وغیرہ وغیرہ۔ مجبوراً منتظمین نے میاں دور نگی سے درخواست کی کہ وہ اپنے کلام سے حاضرین کو نوازیں۔ میاں دور نگی کھڑے ہوئے تو ایک صاحب نے ان کے گلے میں گیندے کے پھولوں کا ہار ڈال دیا اور اس پر خوب شور مچایا اور تالیاں بجیں۔ میاں دور نگی نے کلام سنانے سے پہلے ایک منٹ کے لئے سوچا تو اس پر لوگوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ میاں دور نگی نے لب کشائی کی تو خاموشی چھاگئی۔ ان کے ہر شعر پر واہ واہ، تالیوں اور سیٹیوں کا کانوں کو بہرہ کرنے والا شور بلند ہوتا۔ جب شور ختم ہوتا تو میاں دور نگی اگلے شعر پر آتے۔ ابھی چار پانچ اشعار ہی پڑھے ہوں گے کہ بھیڑ میں سے کسی نے آواز دی "یہ اشعار تو شکیل بدایونی کے ہیں۔" اس پر وہ غل غپاڑہ ہوا کہ توبہ ہی بھلی اور ایکا ایکی میاں دور نگی پر جوتوں اور دوسری اشیا کی بارش ہونے لگی اور ایسے میں کسی نے بتی گل کر دی۔

میں اور اکرم بچتے بچاتے فوراً باہر آگئے۔ باہر نکل کر اس نے مجھے ہنس ہنس کر بتایا کہ یہ مشاعرہ تو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کرایا گیا تھا اور نقلی تھا اور جن شعرا نے کلام پڑھا تھا وہ بھی دراصل شاعر نہیں تھے۔ محلّے کے نوجوان لڑکوں نے میاں دور نگی کی درگت بنانے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا اور ان کے لئے یہ ایک کھلواڑ اور تماشہ تھا۔ ایک دو موقعوں پر پہلے بھی میاں دور نگی کی یہ گت بن چکی تھی۔

اکرم برابر ہنس رہا تھا مگر مجھے یہ فکر دامن گیر تھا کہ میاں دور نگی کو اس ہڑ دنگ میں شدید چوٹیں نہ آئی ہوں۔ یہ سراسر بدتمیزی کا مظاہرہ تھا۔ اکرم نے مجھے بتایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہوگی۔ جتنا ان کے ساتھ کرنا تھا اتنا ہی ہوا ہوگا۔ یہ طے ہوگیا تھا کہ جوں ہی میاں دور نگی پر جوتوں، گندے انڈوں اور ٹماٹروں کی بارش ہو دو چار آدمی انہیں بچا کر چھاپہ خانے کے پیچھے کے دروازے سے ان کے گھر چھوڑ آئیں گے۔

"مگر ان کا ہیٹ جو میز پر رکھا تھا؟" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"اس بھیڑ بھڑکے اور افراتفری میں ہیٹ کا کیا پتہ چلے گا۔" اکرم بولا "وہ تو یار لوگوں نے گیند بنا کر اچھال دیا ہوگا۔ اچکن کے اوپر ہیٹ پہنتے ہیں تو اس سے بھی لوگ چڑتے ہیں۔"

میں تو دراصل مشاعرے کا حقیقی لطف لینے آیا تھا اور اگرچہ اکرم کی باتیں سن کر مجھے دکھ ہو رہا تھا۔ میں نے اکرم کو کچھ نہیں کہا۔ دل نے چاہا کہ تھوڑی دیر میں میاں دور نگی کے گھر جاکر ان کی خیریت پتہ کر آؤں مگر کچھ سوچ کر اس وقت جانا مناسب نظر نہیں آیا۔

اگلے روز صبح کوئی دس بجے میں میاں دور نگی کے مکان پر پہنچا۔ ان کی بیٹھک کھلی ہوئی تھی اور میاں دور نگی نے میز پر کیرم بورڈ بچھایا ہوا تھا اور گوٹیوں سے وائی بنا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر بولے۔

"آیئے میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

میں نے سامنے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے قدرے حیرانی سے کہا۔

"لیکن آج تو میں نے آنے کے لئے نہیں کہا تھا۔"

"لیکن میں نے دیکھا تھا کہ کل آپ مشاعرے میں تھے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ میری خیریت پوچھنے آئیں گے اور آئیں گے تو کیرم کھیلیں گے ہی۔"

میاں دور نگی مسکرا رہے تھے جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ میں نے غور سے دیکھا ان کی دائیں آنکھ سوجی ہوئی تھی اور چہرے پر ایک دو جگہ خراشیں تھیں۔ میں نے کہا۔

"آپ کی ایک آنکھ سوجی ہوئی لگتی ہے۔"

"جی ہاں ایک جوتا میری اس آنکھ پر کافی زور سے لگا تھا۔"

"کل لوگوں کا رویہ بڑا شرمناک تھا۔" میں بولا۔

"یہ اپنا اپنا اخلاق کی بات ہے۔" میاں دور نگی بولے۔ "چند احباب میرے پاس آئے تھے اور بضد تھے کہ مشاعرے کی صدارت میں کروں۔ اگرچہ میں اپنے آپ کو ہرگز اس کا اہل نہیں سمجھتا، ان کے بہت زور دینے پر ان کی خوشی کی خاطر ہاں کر دی۔ میں نے زندگی میں بڑا غم دیکھا ہے اور مجھ سے کسی کی دل شکنی نہیں ہوتی اور نہ میں کسی کو برا سمجھتا ہوں۔"

"کل جوان لوگوں نے حرکت کی وہ ناقابل معافی ہے۔ آپ کو ان سے بچنا چاہیے۔"

میاں دور نگی نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ ان کے ہاتھوں میں کیرم کی دو تین گوٹیاں تھیں جنہیں وہ غیر شعوری طور پر اپنی انگلیوں سے مسل رہے تھے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولے۔

"اس دنیا میں کون اچھا ہے اور کون برا، اس بارے میں میں نے پریشان ہونا چھوڑ دیا ہے۔ میں بڑا تنہا اور اداس ہوں۔ ابا جان چراغِ سحری ہیں اور ان کے بعد یہ اداسی اور گہری ہو جائے گی اور تنہائی شاید مجھے ڈس لے گی۔ یہ بٹیر ہی میرا ساتھی اور دوست ہے مگر یہ بھی بوڑھا ہو چلا ہے۔ میں نے اس بٹیر کا نام دور نگی صرف اس لئے رکھا تھا تاکہ مجھے اس دنیا کی دور نگی یاد رہے لیکن لوگوں نے مجھے ہی میاں دور نگی کہنا شروع کر دیا۔ یہ دنیا بڑی ایذا پسند ہے۔ آپ کو شاید یہ پتہ نہیں کہ یہ لوگ مجھے ان پڑھ سمجھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بی۔ اے پاس ہوں۔ ٹھہریئے میں آپ کو اپنی بی۔ اے کی سند دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اندر گئے اور ایک منٹ میں شیشے میں فریم کی ہوئی اپنی سند لے آئے اور میں یہ دیکھ کر کہ وہ دس سال پہلے کے الٰہ آباد یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں، بڑا شرمندہ ہوا کیونکہ میرا ابھی خیال تھا کہ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ میں نے دیکھ کر ڈگری لوٹائی تو وہ بولے۔

"لوگوں کا خیال ہے کہ میں شاعر نہیں ہوں اور چرایا ہوا کلام پڑھتا ہوں مگر بخدا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں بلاشبہ میں بہت کم کہتا ہوں اور وہ بھی کہیں چھپنے کے لئے نہیں بھیجا۔ اس لئے میں نے شاعر ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا اور میرے مشہور ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر جو اشعار میں نے سنائے ہیں وہ میرے اپنے ہیں اور میرے سوا کسی کے نہیں۔ مگر یہ ظالم دنیا کسی کے درد اور دکھ کو سمجھنے کی بجائے نیچے گرے ہوئے آدمی کو ٹھوکر لگاتی اور اس کا تمسخر اڑاتی ہے۔"

لطف علی صاحب نے اپنا سر جھکا لیا اور مجھے محسوس ہوا کہ ان کی آنکھیں کچھ نم ہو گئی تھیں۔ سنبھل کر بولے۔

"یہ لوگ مجھ سے بے جا باتوں پر چڑتے ہیں۔ مذہب کو خود نہیں سمجھتے اور مجھ پر الزام لگاتے ہیں۔ میرے کئی ہندو دوست ہیں اور کیوں نہ ہوں۔ ان کے گھروں میں ہمارا پرانا آنا جانا ہے۔ کوئی بہن مجھے راکھی باندھ دیتی ہے تو میں خوشی سے بندھوا لیتا ہوں۔ ہولی پر میرے کوئی گلال مل دیتا ہے تو میں خوشی سے ملوا لیتا ہوں اور ان سے گلے ملتا ہوں۔ یہ نا سمجھ لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ عید، دیوالی اور ہولی تو ہمارے قومی تہوار ہیں اور ہم سب مل کر منائیں تو اس میں کسی کے مذہب پر داغ کیسے لگ سکتا ہے۔ اسلام میں تو سب مذاہب کی حرمت کی تاکید ہے۔"

"آیئے ایک گیم کھیلتے ہیں" میں نے کہا۔

ہم ابھی کیرم بورڈ پر دائی لگا ہی رہے تھے کہ ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا آیا اور ایک پچکا ہوا ہیٹ جس پر مٹی کیچڑ کے نشان تھے، لطف علی کو دیتے ہوئے بولا۔

"چچا قربان علی نے آپ کا یہ ٹوپ بھجوایا ہے۔"

لطف علی نے ہیٹ کو دیکھا اور قربان علی اور لڑکے کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے ہاتھ سے پچکے ہوئے حصے کو ابھارا اور ایک کپڑے سے اسے صاف کر کے اسی وقت اپنے سر پر رکھ لیا۔ جیسے ان کی شخصیت اسی لمحے مکمل ہو گئی ہو، وہ بچوں کی طرح مسکرا کر مجھے دیکھنے لگے!

☆☆☆

شبیر آصف

ہم نے گپتا رضا کو دیکھا ہے

جسم و جاں میں عجب رفاقت ہے
زندگی موت کی امانت ہے
کوئی تدبیر چل نہیں سکتی
ساعتِ مرگ ٹل نہیں سکتی
قلزمِ وقت ہے کہ بہتا ہے
کب کسے کوئی یاد رہتا ہے
پر کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں
غیر بھی جن کے غم میں روتے ہیں
ایسے لوگوں میں اک رضا بھی ہے
بات اس کی مگر نرالی ہے
وہ سبھی کا لحاظ کرتا تھا
ہر کوئی اس پہ ناز کرتا تھا
مخلصی میں کمال تھا اس کو
ہر کسی کا خیال تھا اس کو
حسنِ سیرت میں بے مثال تھا وہ
علم و حکمت میں باکمال تھا وہ
وہ تھا اور اس کی وضع داری تھی
دشمنوں سے بھی اس کی یاری تھی
رنج و غم میں وہ شرکتیں اس کی
کون بھولے گا شفقتیں اس کی
اہل علم و ہنر میں یکتا تھا
وہ بھرے شہر میں اکیلا تھا
اس کے اخلاق یاد آئیں گے
ہم کہاں اس کو بھول پائیں گے
جب بھی ہوگا بیاں فضیلت کا
ذکر ہوگا رضا کی عظمت کا

سروے نمبر ۶۴۔ پلاٹ نمبر ۴، نشاط نگر، مالیگاؤں

سوامی واحد کاظمی

ترجمہ: فرحت پروین



پرتراشیدہ پرندہ

کوئی اسے دیوانگی کہے یا صحرا نوردی، سچ یہ ہے کہ وقت بے وقت کا خیال کئے بغیر نکل پڑتا ہوں جس کا اب کہیں نقش پا بھی موجود نہیں!

اسی دھن میں اس روز چلتے چلتے بے خبری میں گنجان آبادی سے بہت دور نکل گیا۔ یہاں میں نے ویرانے میں کھڑے ایک گھنے درخت کی نچلی شاخ پر چھوٹے سے ایک خوبصورت و پرکشش پرندے کو دیکھا۔ درخت کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس کے گھنے سائے میں راہ گیر اپنے سفر کا تکان مٹانے کے لئے آرام کرتے تھے۔ وہ پرندہ اپنے سریلے نغموں اور غم واندوہ میں ڈوبی آواز سے راہ گیروں کا دل اس طرح بہلا رہا تھا کہ سبھی راہ گیر ہمہ تن گوش اس میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ایسا لگا کہ پنچھی کا نغمہ کسی پراسرار گہرے درد سے پھوٹ رہا ہے اور وہ بہت ہی غمگین ہے۔ طائرانہ خصلت کے مطابق وہ چہکنے کے ساتھ ادھر ادھر پھدک بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے اس کا یہ عمل عجیب سا لگا۔ جب اس کا نغمہ ختم ہو گیا، راہ گیر اپنی اپنی گٹھریاں اور توشہ سفر سنبھال کر اپنے اپنے راستے چلے گئے تب میں اس شاخ کے عین نیچے پہنچا اور اس پرندے کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے ہمدردی سے بولا "تم واقعی ایسا گاتے ہو کہ دل موہ لے! مگر تم پھدکتے کیوں نہیں، اس ڈال سے اس ڈال پر جاتے کیوں نہیں!"

میری بات سن کر اس کی ننھی ننھی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہوئی اور پل بھر میں غائب بھی ہو گئی۔ ایسا لگا کہ وہ پہلے سے زیادہ اداس اور غمزدہ ہو گیا ہے۔ پھر اس نے اپنے بازوؤں کو کچھ ایسے انداز میں پھڑ پھڑایا جیسے وہ اپنے تمام رنج و غم نکال باہر پھینک دینا چاہتا ہو۔ یک لخت میرے دل میں کسی درد اور کسک کی چبھن کا احساس ہوا۔ اتنے خوبصورت پنچھی کے پر تھے ہی نہیں! بس تھوڑے بہت کچھ آدھے کچھ پورے وہ بھی کترے ہوئے۔

پنچھی نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، پھر اپنی پیاری سی چونچ نکال کر بولا! ہاں میرے پر نہیں ہیں لہٰذا میں اڑ نہیں سکتا آج تک مجھے ایسی ہمدردی اور شفقت بھری نظروں سے کسی نے نہیں دیکھا تھا لہٰذا آج پہلی بار تمہیں اپنی آپ بیتی سنانا چاہتا ہوں، سنو گے نا؟

"ضرور" میں نے کہا اور وہیں زمین پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ پنچھی کچھ پل خاموش رہا اور میرے چہرے سے ظاہر ہونے والے تجسس کو پڑھ کر کہنے لگا:

"کبھی میں بھی پر کیف مقام پر واقع ہرے بھرے گلشن میں بسیرا کرتا تھا، وہاں تمہاری ہی طرح کا ایک آدم زاد یعنی انسان آیا کرتا تھا اس کے پاس اس جیسی میرے پاس مجھ جیسی سمجھ تھی۔ نہ معلوم کب اور کیسے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ اس کے پاس اور میرے پاس محبت کے اظہار کے اپنے اپنے انداز تھے۔ پھر دنیا نے نہیں، سماج نے نہیں، دل و جذبات کے دشمنوں نے نہیں بلکہ ہماری سمجھ اور طور وطریقے کے فرق نے ہم دونوں کے درمیان ایک نامعلوم سی دیوار کھڑی کر دی۔ اس وجہ سے ہم دونوں کو ہی بڑے بڑے خطرے جھیلنے پڑے تھے تو کبھی مصیبتیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ بہت کوشش کی مگر سمجھ کا فرق ہمیشہ آڑے آجاتا تھا جب کہ ہماری محبت کی شدت میں چنداں فرق نہ تھا وہ جوں کی توں قائم تھی۔

آخر جب مجھ سے اپنے دکھ جھیلے نہ گئے اور اس کا دکھ دیکھا نہ گیا تو بادل نخواستہ ایک دن اڑ کر اتنی دور چلا گیا جہاں میرے خیال میں وہ نہیں پہنچ سکتا تھا اس سے میری پہلی جدائی تھی، میں فراق یار کی بے چینی و بے قراری سے دوچار ہو کر شب و روز آہ و زاری کرتا رہا اور اس کی یاد میں تڑپتا رہا نہ معلوم میری کون سی دردناک آہ اس تک جا پہنچی اور اس کے زخم کو چھو گئی، وہ لمبا اور دشوار گزار فاصلہ نہ جانے کیسے طے کرتا بے تاب اور بے حال بھٹکتا ایک دن مجھ تک آ ہی پہنچا اور مجھے اپنے سینے سے لگائے چل پڑا۔

اتنا سنانے کے بعد پنچھی لمحہ بھر کے لئے ٹھہرا پھر کچھ ایسے انداز میں جیسے وہ یہاں نہیں کہیں بہت دور کھویا ہوا ہو، اس نے آگے کہنا شروع کیا۔

"اسی درخت کے نیچے ہم نے پہلا پڑاؤ ڈالا تھا وہ کچھ عرصہ میرے ساتھ رہا پھر بہت سی تسلیاں دے کر امیدیں بندھا کر کتنے ہی وعدوں اور قسموں کی سوغات دے کر چلا گیا! جب وہ رخصت ہو رہا تھا تو صدمے کی شدت سے مجھے اپنے تن بدن کی سدھ نہیں تھی! روتے روتے اس نے آہستہ سے مجھے اپنے سینے سے الگ کیا اور اتنا ہی یاد ہے کہ اس خاردار دو رخی شاخ پر بٹھا دیا۔ میں

۱۰۔ راج ہوٹل، پل چمیلی، انبالہ کانٹ۔ ۱۳۳۰۰۱ (ہریانہ)

[illegible] تھا۔ میں رنج وحیرت میں ڈوب گیا کہ آخر میرے پر کس نے کترے؟ کیوں کترے؟ لیکن محبوب کی جدائی کے غم کا ایسا غلبہ تھا کہ اپنے پر تراشیدہ ہونے کا احساس بھی دھیرے دھیرے ختم ہو گیا۔ یوں ہی بھوکا پیاسا رہ کر اسی شاخ پر وقت گزارتا رہا اور اپنی موت کو یاد کرتا رہا۔"

ایک آہ بھر کر پنچھی آگے سنانے لگا۔

"ایک دن میرا محبوب پھر آیا اور بڑی بے قراری سے اس نے مجھے اپنے سینے سے لگایا، میرے بدن کو سہلایا پیار کیا اور بوس وکنار سے ہمکنار کیا۔ چند دن گزار کر جب وہ جانے لگا تو اس نے والہانہ انداز میں آغوش میں بھر لیا اور جو نئے پر نکل آئے تھے انہیں دھیرے دھیرے بڑی احتیاط سے تراش لیا پھر مجھے اسی جگہ بٹھا دیا اور خود بھی آنسو بہاتا چلا گیا۔"

اے میرے ہمدرد! بس تبھی سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ کبھی کبھی میرا محبوب اپنی دنیا سے بھاگ کر یہاں میرے پاس آ پہنچتا ہے۔ تب ہم دونوں ساتھ ساتھ کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، روتے، رقص وسرور اور نغمہ سرائی کرتے ہیں۔ ایام فرقت میں جو دل پر گزرتی ہے ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ اس پوری مدت میں وہ پل بھر کے لئے مجھ سے الگ نہیں ہوتا۔ اس کی ہنستی ہوئی آنکھیں ہر دم میری صورت تکتی رہتی ہیں۔ بھینچ بھینچ کر وہ والہانہ انداز میں پیار کرتا ہے اپنی ہتھیلی پر رکھتا ہے بہت ہی پیار سے وہ میرا جسم چھوتا اور سہلاتا ہے۔

قسم سے! کچھ دنوں کے لئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ میرا بسیرا وہاں ہو جس مقام پر تم آدم زادوں کے تمام مذہبی صحیفوں میں باغ بہشت کے نام سے ذکر ہوا ہے پھر ایک دن وہ چلنے کی تیاری کرنے لگتا ہے وہ رخصت ہوتے وقت میرے بال و پر کتر کر چلا جاتا ہے۔ تب مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہی وہ حالت ہے جس کا ذکر تمہارے مذہبی صحیفوں میں جہنم کے نام سے کیا گیا ہے۔

پہلے پہلے اس کے وعدوں کو پورا نہ کرنے پر یوں ہی گلے شکوے بھی کیے۔ مگر اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتا دیکھ کر اب میں اس سے کچھ بھی نہیں کہتا ہوں وہ پھر بھی بس جاتا امیدیں بندھا کے، دلاسہ دے کر چلا جاتا ہے۔ خیر! اچانک اس پرندہ نے تنبیہ کی کہ تم سو تو نہیں رہے ہو میری باتیں تم سن رہے ہو نا؟

"بغور سن رہا ہوں" جواب دیا۔ تمہاری کہانی بہت دلچسپ، افسوسناک اور حیرت انگیز ہے۔ سلانے والی نہیں جگانے والی ہے آگے کہو۔"

پنچھی نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

"جب میرا محبوب میرے پاس ہوتا ہے تو انہی دنوں میں کھا پی لیتا ہوں۔ مجھ میں زندگی کی رمق آجاتی ہے۔ باقی ایام میں جسم میں زندگی کی لہر دوڑتی ضرور ہے مگر مجھ میں زندگی کی سرگرمی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ تم دیکھ رہے ہو نہ میرے دانہ پانی کا کچھ انتظام نہیں ہے۔ پر نہ ہونے سے خود اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتا، سردی گرمی، آندھی طوفان، پانی اندھیرا اجالا آتا اور گزر جاتا ہے میں اس کا مقابلے کرتے ہوئے یہیں پڑا رہتا ہوں کہیں جا نہیں سکتا۔

جب میرے دلبر کو یہاں پہنچنے میں کچھ زیادہ دن لگ جاتے ہیں اور ہجر کا عرصہ دراز ہونے لگتا ہے اور میرے پر ذرا بڑے ہونے لگتے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ اس بار اس سے التجا کروں گا کہ میرے محبوب! تم پنجرے میں بے شک ڈال جاؤ مگر میرے پر نہ کترا کرو، جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ میرے پر کاٹتا ہے تو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوتی ہیں، اس کا گلا روتے روتے رندھ جاتا ہے تو مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا جاتا۔ یہاں تک کہ وہ چلا جاتا ہے۔"

اتنا کہہ کر پنچھی نے جیسے ایک ٹھنڈی سانس بھری پھر آگے سناتے ہوئے کہنے لگا۔

"میر ہم جنس بھائیوں نے کسی ہم قوم پرندے سے نہیں بلکہ ایک آدم زاد سے ایسی آشنائی کا رشتہ جوڑنے اور پھر نبھانے کے اخلاقی جرم میں مجھے برادری سے باہر کر دیا ہے۔ وہ میری طرف دیکھنا تک پسند نہیں کرتے۔ کبھی جب کسی دور دراز کا اجنبی لیکن رحم دل پرندہ اس درخت پر آرام کرنے بیٹھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ شاید کسی بیماری یا حادثے میں میرے پر ضائع ہو گئے ہیں۔ لہٰذا وہ میری حالت زار پر ترس کھا کر کہتا ہے کہ بھائی چل! تجھے ہم اپنی پیٹھ پر بٹھا کر لے چلتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ رہنا، ہم عمر بھر تیری دیکھ بھال کریں گے، مگر میں اس کی یہ پیش کش بہت شکریہ کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہوں۔ میں کسی پر اپنا راز کیوں کھولوں! میں اپنے محبوب کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں۔ میرے بنا پتہ نہیں وہ زندہ رہے گا بھی یا نہیں...... "مجھے ایسا لگا جیسے کہ پنچھی یک لخت کسی انجانی مسرت سے بھر گیا ہو اس نے چہکتی آواز میں کہا۔

"جب میرا چت چور آنے والا ہوتا ہے تو میرا رواں رواں ایک اندرونی خوشی سے بھر جاتا ہے۔ ہوائیں اس کی آمد کا پیغام سنانے لگتی ہیں۔ کرنیں اس کے پہنچنے کا وقت بتانے لگتی ہیں۔ تب اس کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گزارنا ایک برس کاٹنے جیسا محسوس ہوتا ہے۔ پھر جب ایک دن وہ مجھے بہت دور سے دکھائی دیتا ہے تو اس کی راہ میں پلکیں بچھائے بیٹھا میں فرط مسرت سے کلکاریاں بھرنے اور گانے لگتا ہوں۔ خوشی اور امنگ کے جوش سے بھرا وہ دور سے ہی اپنی بانہیں پھیلائے اس طرح میری سمت لپکتا چلا آتا ہے جیسے کوئی ماں اپنی گود سے چھوٹ گئے ننھے سے بچے کو چھاتی سے لگانے لپکی چلی آتی ہے۔ خوشی اور جوش میں اس ڈال سے اس کی گود میں لڑھک جاتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے سینے سے چپکا کر دیوانہ وار چومنے لگتا ہے! ہم دونوں کی آنکھیں ایک ساتھ چھلکنے لگتی ہیں۔"

اتنا کہنے کے بعد ننھا سا پنچھی لمحہ بھر خاموش رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کبھی کبھی ایک ارمان میرے دل میں بری طرح مچلنے لگتا ہے کہ جب میرا محبوب آتا ہے تو کہیں سے میرے دو پنکھ لگ جایا کرے۔ میں اس کے راستے پر پہلے سے ہی میلوں اڑ کر پہنچوں! پھر جب وہ آتا دکھائی دے تو اس کے پریشان اور پسینے سے شرابور پیشانی پر پنکھ کا سایہ کئے یہاں تک لایا کروں، مگر دیکھو نا، میں تو اتنی بھی سکت نہیں رکھتا کہ اس درخت کی سب سے اونچی ٹہنی تک ہی پہنچ سکوں۔ اسے بہت دور سے آتا دیکھ سکوں، یوں بھی ایک پرندے کے لئے اس کے پر ہی سب سے قیمتی شے ہے......"

میں نے بیچ میں ٹوکنا چاہا "تم نے اسے......"

پنچھی نے مجھے ڈانٹا "بیچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ! سنتے جاؤ" اور آگے کہنے لگا۔ "اتنا تو وہ بھی خوب جانتا ہے کہ اگر میرے وہ کیا ہزار پر بھی ہوتے تب بھی میں بے وفا اور بے مروت ہو کر کہیں اور نہیں اڑ کر جاؤں گا۔ پھر بھی نہ معلوم کیوں وہ مجھے اپنے اس پیدائشی حق یعنی آزادی کا سکھ نہیں اٹھانے دینا چاہتا جو مجھے پروں کی صورت میں قدرت نے عطا کی ہے۔ بخدا اگر میرے پنکھ سلامت رہیں تو میں اپنے محبوب کے گرد ہی منڈراتا رہوں۔ کہیں بھی نہ جاؤں۔ جہاں وہ جائے وہیں جاؤں، جدھر وہ ہو ادھر ہی اڑتا چہکتا پھروں۔

دوست! تم دیکھ ہی رہے ہو کہ یہ مقام ایسا نہیں جہاں لوگوں کی آمد و رفت کی بہتات ہو پھر بھی جب کوئی راہ گیر اس پیڑ کے نیچے آرام کرنے کے لئے ٹھہرتا ہے تو ایک بار میں اسے غور سے دیکھتا ہوں۔ عورت مرد، بوڑھا جوان، جاہل عالم، غریب و امیر خواہ وہ کوئی بھی جو بھی اس پیڑ کے نیچے ٹھہرتا ہے میرا خیال ہے کہ اسکی تھوڑی بہت تفریح ہو ہی جاتی ہوگی۔ کیونکہ ہر طرح کی دلچسپی کا اندازہ کر کے یعنی کسی کو چہک سے تو کسی کو اپنی سریلی آواز اور نغموں سے تو کسی کو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اور کسی کو یوں ہی محض لب و لہجہ سے دل بہلانے کی کوشش کرتا ہوں۔

خواہ اس وقت میں خود کتنا ہی اداس اور غمگین کیوں نہ رہوں، مگر ان کے لئے تکان مٹانے اور آگے کے سفر کے لئے تازہ دم کرنے کا ایک چھوٹا سا ذریعہ تو بن ہی جاتا ہوں۔ چند منٹوں کے لئے ہی سہی ان راہ گیروں کو اپنا مہمان ہی مانتا ہوں۔ ان کی خاطر تواضع کے لئے میرے پاس کچھ اور ہے بھی کیا! اب تو ادھر بہت دن گزر گئے میرا محبوب بھی نہیں آیا ہے، انتظار میں ایک ایک دن کاٹ رہا ہوں۔ بس دوست یہی میری مختصر سی کہانی ہے۔"

اتنا کہہ کر پرندہ خاموش ہو گیا۔

میں بھی چپ بیٹھا رہا، انسانی فطرت کے تئیں میرے دل میں بڑی گہری لعنت و ملامت محسوس ہونے لگا جسے ہم انسانوں کی زبان میں نہ جانے کتنے ملمع سے سجا کر استعمال کیا جاتا ہے اور جسے یہ معصوم پرندہ اب تک سمجھ نہیں پایا۔ اپنے دل کی گہرائیوں میں میں نے اس ننھے سے قابل رحم بے پر پرندے کے لئے ایک ساتھ ترس، ہمدردی، شفقت اور ایک عجیب سا لگاؤ کا بڑا گہرا جذبہ لذتا محسوس کیا۔ پھر اسی جذبے کے موجوں پر تیرتا ایک سوال نہ معلوم کیسے میری زبان سے پھسل پڑا "خوبصورت پنچھی! تم کب تک یوں ہی انتظار کرتے رہو گے؟ کب تک ایسی زندگی جیتے رہو گے؟"

میرا سوال سن کر پہلے تو وہ اس طرح میری صورت دیکھتا رہا جیسے میری نادانی پر دل ہی دل میں ہنس رہا ہو پھر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کہا "دوست اگر چاہت و محبت لا متناہی ہو سکتا ہے تو کیا انتظار بھی مدت لامحدود نہیں ہو سکتا۔"

ایک چھوٹے سے پنچھی کے منہ سے اتنی بڑی بات سن کر میری زبان گنگ ہو گئی۔ اپنے علم و دانش مندی کے غرور پر زندگی میں پہلی بار شرم سے پانی پانی ہو گیا! کئی انسانی تہذیبیں مجھے اس پر تراشیدہ پرندے کے سامنے سجدہ کرتی محسوس ہوئیں۔

اچانک اس نے پھر اپنی نازک سی چونچ ذرا سا کھول کر اپنے تراشیدہ پر پھڑ پھڑائے۔ جیسے وہ ماحول پر چھائے اپنی روداد غم کے اداس اثرات کو زائل کر دینا چاہتا ہو۔ پھر وہ سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔ سیاہ موتیوں کی مانند آبدار آنکھیں بند کر لیں۔ بڑی شدت سے میرے دل میں یہ خیال آیا کہ لپک کر اسے اس شاخ سے اٹھا کر بھاگ جاؤں مگر اس خیال نے مجھے روک لیا کیونکہ غیر معمولی وفادار پرندہ میرے ساتھ ہرگز نہیں جائے گا۔ گھٹ کر مر جائے گا۔

اس کے بعد نہ معلوم ایسا کیا ہوا کہ محسوس ہوا کہ وہاں کا ہر ذرہ اداسی کی دھوئیں سے بھر گیا ہو۔ پرندہ مراقبے میں تھا مگر میرا دم گھٹا جا رہا ہو۔ کسی انجانی کربناک تڑپ سے میں چیخنا چاہتا ہوں۔ لگا کہ اگر میں چند منٹ بھی وہاں ٹھہرا رہا تو میری تمام رگیں پھٹ جائیں گی یا میرے اندر کوئی دھماکہ ہو جائے گا۔ میں سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتی سی تیزی کے ساتھ قدم اٹھاتا دور بہت دور نکل آیا۔ اس کے بعد میں نے اس پرندے کو کبھی نہیں دیکھا۔

لیکن تب سے مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی سے پر اسرار لمحے میں میرا کل وجود اس پرندے میں تحلیل ہونے لگتا ہے۔

☆☆

بہار

سمستی پور: شمسی بک سینٹر، اسٹیشن روڈ۔

رانچی: موڈرن بک اسٹال، مین روڈ

پٹنہ: سیلز امپوریا، بہار اسٹیٹ کو آپریٹو بینک بلڈنگ، اشوک راج پتھ۔

مظفر پور: ٹھاکر پستک کیندر، اسٹیشن روڈ۔

جمشید پور: خیال برادرس، بارگی مینشن، مین روڈ۔

بھاگلپور: بی۔ کے۔ بک اسٹال، اسٹیشن چوک

چھپرہ: مشرا بک اسٹال، بیلی روڈ، رتن پورہ۔

اترپردیش:

بنارس: سنگھ اینڈ برادرس، بی ۳۲/ ۴، ودیا پیٹھ روڈ۔

مکتبہ اسلامی، ہاؤس نمبر سی ۸۷/ ۱۰، ضیا پورا چیت، چیت گنج۔

مراد آباد: محمد عمر، محلہ مین پور، معرفت رفیق ہوٹل۔

لکھنؤ: سیلز امپوریا، ۶/ ۷/ ۲، رام موہن لال مارگ،

اردو نیوز ایجنسی، بی ۶، رجن پتھ مارکیٹ، حضرت گنج۔

کانپور: مہندرا کمار اروڑہ۔ بی۔ ۱۔ ۳۱۔ تریپوتی نگر کینٹ۔

غازی آباد: جے ایس۔ جولی بک سینٹر، نیو گیٹ۔

گورکھپور: اسٹوڈنٹس کارنر، سنیما روڈ۔

علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔

الٰہ آباد: شمع بک اسٹال۔ ۲۰۳ کلاک ٹاور۔

رام ابھیلاش دوبے۔ ۷، ۱۰ بادشاہی منڈی۔

بستی: گپتا بک اسٹال، نزد روڈویز گیٹ۔

بلند شہر: جے درگا پستک بھنڈار، کچہری روڈ۔

مغربی بنگال:

کولکاتا: سیلز امپوریا۔ ۸، اسپلینیڈ ایسٹ۔

دھلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد۔

نئی دھلی: شمسی بک ڈپو، سلہ ہاؤس، جامعہ نگر۔

سیلز امپوریا، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس۔

سیلز امپوریا، سپر بازار، کناٹ پلیس۔

تیسری اور آخری قسط

مترجم: ثریا فاروقی



غلط فہمی

(Cross Purpose)

تیسرا ایکٹ

سرائے کا کمرہ

(ماں مارتھا اور بوڑھا خادم اسٹیج پر ہیں۔ بوڑھا آدمی کمرے میں جھاڑو دے کر اسے صاف کر رہا ہے۔ مارتھا باہر کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی اپنے بال ٹھیک کر رہی ہے۔ ماں دروازے کی طرف جا رہی ہے)

مارتھا: اب صبح ہونے والی ہے۔ بغیر کسی دشواری کے رات گزر گئی۔

ماں: ہاں۔ کل میں یہ سوچوں گی کہ اس کام کو انجام دے کر ہم نے اچھا کیا یا برا۔ لیکن اس وقت میں بری طرح تھک گئی ہوں اور میرا دل اندر ہی اندر بیٹھ رہا ہے۔ آہ! یہ کتنی مشکل اور دشوار رات تھی۔

مارتھا: کئی سالوں کے بعد آج ایسی صبح آئی ہے جس میں میں آزادانہ طور پر سانس لے سکتی ہوں اس سے پہلے کہ جان لینے کا مجھ پر اثر ہو میں لہروں کے اٹھتے ہوئے شور کو سنتی ہوئی محسوس کر رہی ہوں اور خوشی سے چلانا چاہتی ہوں۔

ماں: جو ہوا ٹھیک ہوا مارتھا، جو ہوا سو ٹھیک ہوا۔ جہاں تک میرا سوال ہے میں آج کی صبح اپنے کو اتنی بوڑھی محسوس کر رہی ہوں کہ تم سے بات کرنے کے بھی قابل نہیں۔ شاید کل میں تم سے کچھ بات کر سکوں۔

مارتھا: ہاں اور مجھے امید ہے کہ سب کچھ بہتر ہوگا لیکن آپ تھوڑی دیر کے لئے اپنی شکایتیں بند کر دیجئے اور مجھے تازہ مسرتوں سے لطف اندوز ہونے دیجئے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آج کی صبح میں ایک کمسن لڑکی کی طرح ہو گئی ہوں۔ میں رگوں میں دوڑتے اپنے خون کی گرمی کو محسوس کر رہی ہوں۔ میں ناچنا چاہتی ہوں، گانا چاہتی ہوں ماں! کیا میں آپ سے کچھ پوچھ سکتی ہوں؟

وقفہ

ماں: تم کو کیا ہو گیا ہے مارتھا! تم ایک دوسری ہی شخصیت لگ رہی ہو۔

مارتھا: ماں۔ (جھجکتی ہے پھر اچانک پوچھتی ہے) ماں کیا میں اب بھی خوبصورت لگ رہی ہوں؟

ماں: ہاں۔ میرا خیال ہے کہ تم آج صبح کچھ زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ بعض کاموں کا تم پر اچھا اثر پڑتا ہے۔

مارتھا: ارے نہیں۔ جس کام کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں۔ لیکن آج کی صبح میں ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے میں دوبارہ پیدا ہوئی ہوں ایک نئی زندگی لے کر۔ آخر کار میں ایک ایسے ملک میں جا رہی ہوں جہاں میں خوش رہوں گی۔

ماں: بیشک۔ ایک بار جب میری تھکان دور ہو جائے گی۔ میں بھی آزادی کی سانس لے سکوں گی اور اس وقت یہ جان کر کہ ہماری ساری بے خوابی شب نے تمہارے لئے خوشیاں جمع کر دی ہیں، جاگنے کی تلافی کر دی ہے۔ لیکن آج کی صبح مجھے ہر حال میں آرام کرنا ہے۔ گزری ہوئی رات ہمارے لئے بہت بھاری تھی۔

مارتھا: گزری ہوئی رات کا کیا ذکر۔ آج کا دن عظیم دن ہے۔ (خادم سے) جھاڑو دیتے وقت اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔ ہم سے باہر جاتے ہوئے کچھ کاغذات گر گئے اور میں انہیں اٹھانے کے لئے ٹھہر نہیں سکی۔ وہ فرش پر ہی کہیں پڑے ہوں گے۔

(ماں کمرے سے باہر جاتی ہے۔ میز کے نیچے اس بوڑھے آدمی کو جان کا پاسپورٹ ملتا ہے۔ اسے کھولتا ہے۔ غور سے تصویر دیکھتا ہے۔ اور کھلا ہوا صفحہ مارتھا کے سامنے پیش کرتا ہے)

مجھے یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں اسے دوسری چیزوں کے ساتھ رکھ دو، اسے ہم ایک ساتھ جلا دیں گے۔

(وہ بوڑھا آدمی پھر مارتھا کو پاسپورٹ دکھاتا ہے وہ اسے لے لیتی ہے) یہ کیا ہے؟

(بوڑھا خادم باہر جاتا ہے۔ مارتھا دھیرے دھیرے پاسپورٹ پڑھتی ہے بغیر کسی تاثر کے۔ اور پھر پکارتی ہے) ماں......

ماں: (دوسرے کمرے سے) اب تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے۔

مارتھا: یہاں آیئے۔ (ماں واپس آتی ہے۔ مارتھا اسے پاسپورٹ دیتی ہے) اسے پڑھئے۔

ماں: تم اچھی طرح جانتی ہو میری آنکھیں تھکی ہوئی ہیں۔

مارتھا: اسے پڑھئے۔

(ماں پاسپورٹ کو لیتی ہے، میز پر بیٹھتی ہے، اسے کھولتی ہے اور پڑھتی ہے۔ بہت دیر تک وہ اپنے سامنے کے صفحے کو دیکھتی ہے)

ماں: (سپاٹ لہجے میں) ہاں مجھے ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ

ایک دن ایسا ہی ہوگا۔ اور وہ آخری دن ہوگا ہر چیز کا خاتمہ۔ (وہ ایک طرف بڑھتی ہے)

(مارتھا باہر کاؤنٹر کے پیچھے سے آتی ہوئی اور اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے)

ماں: نہیں مارتھا اب تو میں وہی کروں گی جو چاہتی ہوں۔ میں کافی لمبی زندگی جی چکی۔ میں اپنے بیٹے سے بھی کئی سال زیادہ جی چکی۔ ویسا نہیں ہوا جیسا ہونا چاہئے تھا۔ اب میں جاؤں گی اور ندی کی گہرائی میں اس سے ملوں گی جہاں جھاڑ جھنکاڑ نے اس کے چہرے کو چھپا دیا ہوگا۔

مارتھا: ماں مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے تنہا نہیں چھوڑیں گی۔

ماں: تم نے میری بہت مدد کی ہے مارتھا۔ تمہیں چھوڑتے ہوئے مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ اگر ان الفاظ کی اب ہمارے لئے کوئی وقعت رہ گئی ہے۔ میں پوری ایمانداری سے یہ کہہ رہی ہوں کہ تم میری بہت اچھی بیٹی ہو، تم نے مجھے ہمیشہ وہی عزت اور تکریم دی جو ایک لائق بیٹی ماں کو دیتی ہے۔ لیکن اب میں بہت زیادہ تھک گئی ہوں۔ میرا پرانا دن جو تقریباً ہر چیز سے لاتعلق ہو گیا تھا آج اس نے جانا ہے کہ غم کسے کہتے ہیں۔ اب میری ایسی عمر نہیں رہ گئی ہے کہ میں اسے سہہ سکوں اور جب ایک ماں اس قابل نہ رہ جائے کہ وہ اپنے ہی بیٹے کو پہچان سکے تو اس کا مطلب ہے کہ زمین پر اس کے وجود کی اہمیت ختم ہو گئی۔

مارتھا: نہیں۔ تمہیں بیٹی کی خوشیوں کو دیکھنا ہے۔ میرا دل ہی نہیں، میری امیدیں بھی چکنا چور ہو جاتی ہیں جب میں آپ کو اس طرح سے اس حیرتناک انداز میں باتیں کرتی سنتی ہوں۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کسی چیز کی زیادہ عزت نہ کروں۔

ماں: (بہت بے چین انداز میں) یہ ثابت کرتا ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز سے انکار کیا جا سکتا ہے، لیکن کچھ ایسی بھی طاقتیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں اور زمین پر جہاں کوئی بھی چیز یقینی نہیں وہاں ہمارا خاتمہ یقینی ہے۔ (ترش لہجے میں) اور ایک بیٹے کے لئے ماں کی محبت اب میرے لئے یقین بن گئی ہے۔

مارتھا: کیا اب آپ کو یقین نہیں رہ گیا کہ ماں اپنی بیٹی کو بھی چاہ سکتی ہے۔

ماں: میں تمہیں زیادہ مجبور نہیں کرنا چاہتی لیکن لڑکی کی محبت وہی چیز نہیں ہے۔ یہ ہے لیکن اتنی گہری نہیں۔ میں اب بیٹے کی محبت کے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں۔

مارتھا: بڑی عجیب و غریب محبت ہے۔ جو بیس سال سے آپ کو بھولی ہوئی تھی؟

ماں: ہاں یہ عجیب و غریب محبت ہے جو بیس سال سے خاموش تھی جو اس کے بیٹے کو اس کے گھر لے آئی۔ تمہاری جو مرضی ہو وہ کرو میرے لئے یہ ایک بڑی عجیب و غریب محبت ہے۔ اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ (کرسی سے اٹھتی ہے)

مارتھا: یہ ممکن نہیں کہ آپ اس طرح کی بات کریں۔ آپ کو اپنی بیٹی کا کوئی خیال نہ آئے اور آپ کے اندر اس کے لئے ذرا بھی رحم نہ پیدا ہو۔

ماں: تمہارے لئے یہ سمجھنا دشوار ہے لیکن ایسا ممکن ہے اب میرے اندر کسی کا کوئی خیال نہیں ہے اور نہ رحم۔ یقیناً یہ سزا ہے اور قتل کے بعد سبھی کے ساتھ ایک وقت ایسا آتا ہے جب میری طرح سب کچھ اندر سوکھ جاتا ہے، بنجر ہو جاتا ہے، زندہ رہنے کے لئے کچھ نہیں بچتا ہے اور یہی وجہ ہے سماج ان سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ ان کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

مارتھا: میں آپ کو جرم و سزا کے بارے میں اس طرح بات کرتے ہوئے برداشت نہیں کر پا رہی ہوں، یہ نفرت انگیز ہے۔

ماں: میں تمہیں اپنی پیروی کرنے کے لئے نہیں کہہ رہی ہوں۔ اب میرے لئے کسی چیز کی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اپنے ایک عمل سے میں نے سب کچھ برباد کر دیا۔ میری آزادی ختم ہو گئی اور میرے لئے دوزخ کی زندگی شروع ہو گئی۔

مارتھا: (بہت تیزی سے ماں کے پاس جاتے ہوئے) اس سے پہلے تم نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی۔ ان تمام سالوں میں تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ تمہارے ہاتھوں میں کبھی کوئی لرزش نہیں پیدا ہوئی ان لوگوں کو پیروں سے پکڑتے ہوئے جو مرنے والے تھے۔ ان دنوں بھی تم اکثر جہنم اور آزادی کی بات کیا کرتی تھیں تب تمہیں یہ خیال نہیں آیا [illegible] تمہیں جینے کا کوئی حق نہیں ہے [illegible] کام کو کرتی رہیں۔ اب تمہارے [illegible] تو تمہارے اندر یہ تبدیلی آگئی۔

ماں: ہاں صحیح ہے کہ میں اس طرح کرتی [illegible] وقت میں جیسے جیتی رہی اپنی [illegible] جیتی رہی جو موت سے کسی طرح [illegible] ہے۔ رنج و غم کا ایک احساس [illegible] لئے کافی تھا۔ میرے بیٹے کی آمد نے یہ [illegible] لا دی۔

(مارتھا کو اشارہ کرتی ہے اور بات کرنے کی کوشش کرتی ہے)

میں جانتی ہوں مارتھا ان کا کوئی مطلب نہیں [illegible] ایک مجرم کو غم سے کیا لینا دینا۔ شاید تم نے ابھی [illegible] ہوگا، محسوس کیا ہوگا کہ میرا غم دوسری ماؤں کی طرح غم نہیں ہے۔ ابھی تک میں چیخی یا چلائی بھی نہیں ہوں۔ یہ اس دکھ کا احساس ہے جو محبت نے میرے [illegible] میں پیدا کیا۔ میں جانتی ہوں کہ اس دکھ کا بھی کوئی مطلب نہیں۔ (بدلے ہوئے لہجے میں) لیکن جس [illegible] میں ہم رہتے ہیں اس کا بھی کوئی مطلب نہیں اور یہ [illegible] حق ہے کہ میں فیصلہ کر سکوں کیونکہ زندگی سے جو ملنا تھا، میں سب کچھ حاصل کر چکی۔ تخلیق سے بربادی تک۔

(وہ بہت عزم سے دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ مارتھا فوراً اس کے سامنے آکر اس کا راستہ روکتی ہے)

مارتھا: نہیں ماں آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گی نہ بھولئے کہ میں ہی تھی جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہی اور وہ دور چلا گیا۔ پوری زندگی میں آپ کے ساتھ رہی ہوں اور اس نے خاموشی سے آپ کو چھوڑ دیا۔ اس کا تو آپ کو خیال ہونا چاہئے اور اس کی ادائیگی بھی ہونی چاہئے۔ یہ آپ کی [illegible] داری ہے کہ آپ میرے پاس رہیں۔

ماں: (نرمی سے) ہاں یہ صحیح ہے مارتھا لیکن وہ میرا [illegible] اس کی جان میں نے لی۔

مارتھا: (جو اس سے کچھ ہٹ گئی تھی دروازے کی طرف غور سے دیکھتی ہے۔ کچھ خاموشی کے

(اٹھتے ہوئے جذبات کے ساتھ)

زندگی ایک شخص کو جو کچھ بھی دے سکتی ہے اس نے اس شخص کو دے دیا تھا۔ اس نے اس ملک کو چھوڑ دیا۔ وہ نئے افق کا متلاشی رہا۔ سمندروں کو دیکھا لیکن میں یہیں رہی اپنے دل میں غم کا پہاڑ اٹھائے ان سایوں تلے جو چھوٹے اور مختصر تھے۔ یورپ کے وسط میں اسی غمگین وادی میں دفن رہی۔ میں زندہ دفن ہو گئی آج تک کسی نے بھی میرا بوسہ نہیں لیا اور کسی بھی شخص حتیٰ کہ آپ نے بھی مجھے برہنہ نہیں دیکھا۔ ماں میں قسم کھا کر کہتی ہوں اس کا معاوضہ ملنا چاہئے۔ اب میں وہ سب کچھ پانے والی ہوں جس کی حقدار ہوں۔ آپ صرف اس بہانے مجھے نہیں چھوڑ سکتیں اور آپ کو چھوڑنا بھی نہیں چاہئے آخر آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ ایک آدمی جو اپنی زندگی جی چکا ہے اس کے لئے موت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ہم اپنے بھائی اور تم اپنے لڑکے کو بھول سکتی ہو۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہ کوئی اہم بات نہیں ہے اسے اب زندگی سے اور کچھ نہیں ملنے والا تھا لیکن میرے لئے ..... آپ مجھے ہر چیز سے محروم کر رہی ہیں۔ ان مسرتوں سے بھی جسے اس نے اٹھایا ہے۔ آخر کیوں؟ وہ شخص مجھے میری ماں کی محبت سے محروم کر رہا ہے اور آپ کو مجبور کر رہا ہے کہ دریا کے برفیلے اندھیرے میں آپ کھنچتی چلی جائیں۔

(وہ خاموشی سے ایک دوسرے کو گھورتی ہیں۔ مارتھا اپنی آنکھیں جھکا لیتی ہے اور دھیمے لہجے میں بولتی ہے) میں نے زندگی سے بہت کم مانگا ہے۔ ماں کچھ ایسے بھی لفظ ہیں جنہیں میں کبھی استعمال نہیں کروں گی لیکن ——کیا آپ نہیں سوچتیں کہ میں اپنی زندگی اسی طرح دوبارہ شروع کروں، میں اور آپ مل کر —— کتنی سکون بخش ہوگی۔

ماں: کیا تم نے اس کو پہچان لیا تھا؟

مارتھا: نہیں۔ میں نے نہیں پہچانا تھا اور مجھے یہ بھی نہیں یاد ہے کہ وہ کیسا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ ہونا مقدر میں لکھا تھا۔ ابھی آپ نے ہی تو کہا ہے کہ دنیا کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ لیکن آپ نے مجھ سے یہ سوال غلط نہیں کیا کیونکہ اب میں جان گئی ہوں کہ اگر میں اسے پہچان بھی لیتی تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ماں: میں بھی سوچوں گی کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو وہ سچ نہیں ہے۔ کوئی بھی شخص مکمل طور پر مجرم نہیں ہوتا اور شاطر سے شاطر قاتل پر بھی ایسا وقت آتا ہے جب وہ اپنا ہتھیار رکھ دیتا ہے۔

مارتھا: میرے ساتھ بھی ایسا ہی موقع آیا ہے۔ لیکن ایسے بھائی کے سامنے میں اپنا سر نہیں جھکاتی جسے میں جانتی نہیں تھی، جو میرا کچھ بھی نہیں تھا۔

ماں: تو تم کس کے سامنے سر جھکاؤ گی۔

(مارتھا اپنا سر جھکا لیتی ہے)

مارتھا: آپ کے سامنے۔

(تھوڑی خاموشی)

ماں: (دھیمے دھیمے) بہت دیر ہو چکی مارتھا اب میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔

(اپنی آنکھیں جھکا کر)

آخر اس نے اسے راز کیوں بنائے رکھا۔ راز اور خاموشی خطرناک ہوتی ہے۔ لیکن بولنا بھی تو خطرناک ہوتا ہے جو مختصر سی بات اس نے کی اس سے اور عجلت ہو گئی۔

(اپنی بیٹی کی طرف مڑتے ہوئے)

کیا تم رو رہی ہو مارتھا۔ نہیں تم یہ نہیں جانتیں کہ کیسے رویا جاتا ہے۔ کیا تم اس وقت کو یاد کر سکتی ہو جب میں تمہارا بوسہ لیتی تھی۔

مارتھا: نہیں ماں۔

ماں: میں سمجھتی ہوں ایک زمانہ گزر گیا اور میں یہ بھی بھول گئی کہ اپنی بانہیں تم تک پھیلاؤں۔ لیکن میں نے تمہیں پیار کرنا بھی ختم نہیں کیا۔ (وہ دھیرے سے مارتھا کو کنارے کرتی ہے جو اس کے لئے راستہ بناتی ہے)

میں اب اسے جان گئی ہوں۔ اب جب کہ تمہارے بھائی کے آنے سے زندگی میں ایک ایسی محبت دوبارہ پیدا ہو گئی ہے جسے مجھے ختم کرنا ہے۔ اپنے ساتھ۔

(اس کے جانے کے لئے دروازے کا راستہ صاف ہے)

مارتھا: (دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے ہوئے)

لیکن کون سی چیز آپ کے نزدیک بیٹی کے درد سے زیادہ اہم ہو سکتی ہے؟

ماں: تھکان —— شاید۔ اور آرام کرنے کی میری خواہش۔

(وہ باہر جاتی ہے۔ مارتھا اسے روکنے کی کوشش نہیں کرتی۔ ماں کے جانے کے بعد وہ دروازے تک جاتی ہے۔ دروازہ بند کرتی ہے اور خود دروازے سے لگ کر کھڑی ہو جاتی ہے اور تیز آواز میں چیخنے لگتی ہے) نہیں۔ نہیں۔ میرا اس سے کیا واسطہ تھا کہ میں اپنے بھائی کا خیال کروں۔ نہیں۔ نہیں کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اب میں اپنے ہی گھر میں بے دخل کر دی گئی ہوں۔ میرے لئے کوئی جگہ نہیں ہے جہاں میں اپنا سر چھپا سکوں۔ میری ماں بھی مجھ سے لاتعلق ہو چکی ہے۔ اس سے بڑی ناانصافی کیا ہو گی کہ کسی معصوم کے ساتھ زیادتی کی جائے۔ وہ جو کچھ چاہتا تھا اسے مل گیا ہے۔ اب میں یہاں اکیلی چھوڑ دی گئی ہوں۔ ان سمندروں سے دور جن کی مجھے خواہش تھی۔ میں اس سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔ اپنی تمام زندگی میں نے اس موج کا انتظار کیا تھا جو مجھے اٹھاتی اور دور پھینک دیتی اور اب میں جانتی ہوں وہ کبھی بھی نہیں آئے گی۔ میری قسمت میں اب یہیں سڑنا لکھا ہے اور وہ سارے ممالک اور دوسرے ملک جو میرے داہنی طرف، میرے بائیں طرف، میرے سامنے، میرے پیچھے، وہ سارے میدان اور پہاڑ جو سمندروں سے چلنے والے نمکین ہواؤں کے لئے رکاوٹ بنتے ہیں جن سے ٹکرا کر ان کی آواز خاموش ہو جاتی ہے۔

(دھیمے لہجے میں) ایسی بھی جگہیں ہیں جو سمندر سے کافی دور ہیں وہ شام کی ہوائیں سمندر کی پتوار دیتی ہیں۔ لیکن وہ ہوائیں یہاں نہیں پہنچتی ہیں اور مجھے وہ سب کبھی نہیں ملے گا جو ملنا چاہئے تھا۔ میں اگر اپنے کان زمین سے لگا دوں تو مجھے کبھی سمندر کی لہروں کی آواز نہیں ملے گی جسے میں چاہتی ہوں۔ اس سے کتنی دور ہوں اور میری جلاوطنی لاعلاج ہے۔ میرا واحد مکان اس بند اور گندے اور سڑے ملک کا اداس یہ کمرہ، جہاں آسمانوں کا کوئی کنارہ نہیں۔ بھوک مٹانے کے لئے میرے پاس سڑی روٹی کے علاوہ کچھ نہیں اور پیاس بجھانے کے لئے وہی خون جو میں نے بہایا ہے، یہ قیمت ہے جو ماں کی محبت کے لئے مجھے ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ اب میرے لئے اس کے پاس کوئی محبت نہیں رہ گئی، مجھے مر جانا چاہئے۔ ہر دروازہ میرے لئے بند ہو جائے۔ میری اتنی ہی خواہش ہے کہ میں تنہائی میں خاموشی سے چھوڑ دی جاؤں، میرا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ آسمان کی طرف اپنی آنکھیں اٹھاؤں اور مرنے سے پہلے اس سے

معاف کیئے جانے کی دعا کروں۔ جنوبی زمینوں میں جو سمندروں سے گھری ہوئی ہے جہاں جاکر آدمی فرار حاصل کر سکتا ہے آزادی سے سانس لے سکتا ہے۔ لہروں میں تیر سکتا ہے۔ اس سمندروں سے گھری زمین میں خدا کی کوئی پہنچ نہیں ہے۔ میں اس محدود دنیا سے نفرت کرتی ہوں جہاں آدمی مجبور ہوتا ہے کہ خدا کی طرف دیکھے۔ لیکن میں نے ابھی اپنے حقوق نہیں چھوڑے ہیں اور میرے ساتھ ہوئی ناانصافی کو یاد کر رہی ہوں۔ میں جھکوں گی نہیں۔ مجھے دنیا میں جو جگہ ملنی چاہئے تھی وہ نہیں ملی۔ میرے ساتھ دھوکہ کیا گیا اور ماں کے ساتھ چھوڑ دیا گیا، صرف میرے جرائم میرے ساتھ ہیں۔ اس دنیا سے مصالحت کیئے بغیر میں اسے چھوڑ دوں گی۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

کون ہے؟

ماریا: ایک مسافر۔

مارتھا: اب ہم کوئی مہمان نہیں لے رہے ہیں۔

ماریا: لیکن میرا شوہر یہاں ہے میں اس سے ملنے آئی ہوں۔ (اندر داخل ہوتی ہے)

مارتھا: (اسے گھورتی ہوئی) تمہارا شوہر! یہاں؟

ماریا: وہ یہاں کل شام آیا تھا اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ آج صبح آئے گا۔ معلوم نہیں وہ کیوں نہیں آیا؟

مارتھا: اس نے تو کہا تھا کہ اس کی بیوی کسی دوسرے ملک میں ہے۔

ماریا: اس کی ایک خاص وجہ تھی لیکن ہم نے آج صبح ملنے کے لئے طے کیا تھا۔

مارتھا: (جو ابھی تک ماریا کو گھور رہی تھی) اب یہ مشکل ہے۔ آپ کے شوہر چلے گئے۔

ماریا: چلے گئے؟ میں سمجھی نہیں۔ کیا انہوں نے یہاں کمرہ نہیں بک کرایا تھا؟

مارتھا: ہاں۔ انہوں نے رات ہی میں اسے چھوڑ دیا۔

ماریا: کیا واقعی؟ مجھے یقین نہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ اس جگہ پر ٹھہرنے کے لئے ان کے پاس کافی وجوہات تھیں۔ لیکن آپ کی باتوں سے خطرے کی بو آ رہی ہے۔ آپ مجھ سے صاف صاف کہیئے جو کچھ آپ کو کہنا ہے۔

مارتھا: میرے پاس آپ کو بتانے کے لئے کچھ نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اب آپ کے شوہر یہاں نہیں ہیں۔

ماریا: میں اسے بالکل سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔ مجھے لئے بغیر وہ یہاں سے جانے والے نہیں ہیں۔ کیا انہوں نے کہا تھا کہ اس جگہ کو وہ چھوڑ رہے ہیں یا وہ واپس آئیں گے؟

مارتھا: انہوں نے اپنے سکون کی خاطر چھوڑ دیا۔

ماریا: سنئے، میں اس طرح کی گول مول بات برداشت نہیں کر سکتی۔ کل سے میں ان کا انتظار کر رہی ہوں۔ انتظار، انتظار اس عجیب سے ملک میں۔ میری پریشانی مجھے یہاں لائی ہے۔ میں یہاں سے اس وقت تک نہیں جاؤں گی جب تک میں اپنے شوہر کو نہ دیکھ لوں یا آپ یہ نہ بتادیں کہ وہ اس وقت کہاں ہیں؟

مارتھا: آپ کے شوہر کہاں ہیں۔ یہ آپ کا سردرد ہے میرا نہیں۔

ماریا: آپ غلطی پر ہیں۔ آپ بھی اس معاملے سے متعلق ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ میرے شوہر اس بات کو پسند کریں گے یا نہیں۔ لیکن میں صاف بتاتی ہوں کہ جو شخص کل یہاں آیا تھا وہ آپ کا بھائی تھا۔ جس کے بارے میں آپ نے کئی سالوں سے کچھ نہیں سنا تھا۔

مارتھا: میرے لئے یہ خبر نہیں ہے۔

ماریا: (بہت غصہ سے) پھر کیا ہو گیا؟ جب ہر بات صاف ہو گئی تھی تو پھر جان یہاں کیوں نہیں ہے؟ کیا آپ نے اسے گھر آنے پر خوش آمدید نہیں کہا۔ آپ اور آپ کی ماں اس کی واپسی پر خوش نہیں ہوئیں؟

مارتھا: میرا بھائی یہاں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ مر چکا ہے۔ (ماریا اس کی طرف چونک کر دیکھتی ہے اور خاموشی سے اسے گھورتی ہے۔ پھر اس کی طرف مسکراتے ہوئے ایک قدم بڑھاتی ہے)

ماریا: آپ میرے ساتھ مذاق کر رہی ہیں۔ جان نے مجھے اکثر بتایا ہے کہ جب آپ چھوٹی تھیں تو لوگوں کو پریشان کرنا آپ کو اچھا لگتا تھا۔ آپ اور میں تقریباً آپس میں بہنیں ہیں اور......

مارتھا: مجھے چھوئیے نہیں۔ جہاں ہیں وہیں رہئے۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کے ساتھ مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ آپ کے شوہر کل رات مر گئے ہیں۔ اس لئے اب یہاں آپ کے رکنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ماریا: آپ پاگل ہو گئی ہیں۔ بالکل پاگل پن کی بات کرتی ہیں۔ لوگ اس طرح سے نہیں مرتے۔ اور جب ملاقات طے ہو گئی ہو تو ایک لمحے سے دوسرے لمحے میں اچانک۔ میں آپ کی بات پر یقین نہیں کرتی۔ مجھے دیکھنے دیجئے۔ شاید میں اس بات پر یقین کر سکوں جس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

مارتھا: یہ ناممکن ہے وہ ندی کی تہہ میں پڑا ہے۔ (ماریا اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی ہے) میں پھر کہتی ہوں مجھے مت چھوؤ جہاں ہو وہیں رہو۔ وہ ندی کی تہہ میں پڑا ہے۔ میری ماں اور میں دونوں اسے ندی تک لے گئے، اسے نیند کی دوا دی تاکہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو، اور وہ مر گیا۔ ہم نے اسے مار ڈالا۔

ماریا: (خوف سے پیچھے ہٹ کر) میں پاگل ہو رہی ہوں۔ میں ان الفاظ کو سن رہی ہوں جو آج تک میں نے نہیں سنے، مجھے معلوم ہے کہ یہاں رہنے سے کچھ نہیں ہونے والا لیکن یہ ایسا پاگل پن ہے جس میں میں حصہ نہیں لوں گی۔ تمہارے الفاظ میرے دل میں اترتے ہوئے تیر کی طرح لگ رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تم کسی اور شخص کے بارے میں بات کر رہی ہو۔ اس شخص کے بارے میں نہیں جو رات میں میرا ہم بستر ہوتا تھا۔ یہ کسی ایسے زمانے کی کہانی لگ رہی ہے جس میں میری محبت کا کوئی رول نہیں رہا۔

مارتھا: یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں آپ کو یقین دلاؤں صرف آپ کو حقیقت بتا رہی ہوں۔ ایسی حقیقت جسے آپ کو جلد ہی قبول کرنی پڑے گی۔

ماریا: (نیم خوابی کی حالت میں) لیکن تم لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟

مارتھا: یہ سوال کرنے کا تم کو حق کس نے دیا؟

ماریا: (جذباتی ہو کر) حق کیسا حق۔ اس کے لئے میری محبت نے۔

مارتھا: اس کا کیا مطلب ہے؟

ماریا: اس کا مطلب اس کا وہی مطلب ہے جو اس لیے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے مجھ کی وہ لہر جو میرے ہاتھوں کو قتل کے لئے اکسا رہا ہے، اس کا مطلب ہے میری بجھی ہوئی ساری خوشیاں اور غم کا پہاڑ جو ہمارے اوپر ابھی ٹوٹ پڑا ہے۔ تم عجیب سنگی عورت ہو۔ تم اس لفظ کا مطلب اس وقت سمجھوگی جب میرے ناخنوں کے نشان اپنے گالوں پر دیکھوگی۔

مارتھا: تم ایسی زبان استعمال کر رہی ہو جو میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ محبت وخوشی اور دکھ جیسے الفاظ میرے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

ماریا: (نرم لہجے میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) سنو مارتھا۔ یہی ہے نا تمہارا نام؟ اب ہمیں اس کھیل کو ختم کر دینا چاہئے۔ بے معنی لفظوں کا استعمال بھی بند کرو۔ اب یہ صاف صاف بتاؤ جو کچھ میں جاننا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں غش کھا کر گر پڑوں۔

مارتھا: ہم نے تمہیں صاف صاف بتادیا۔ ہم نے تمہارے شوہر کے ساتھ پچھلی رات وہی کیا جو اس سے پہلے ہم دوسرے مسافروں کے ساتھ کر چکے تھے۔ ہم نے اسے جان سے مار دیا اور اس کی دولت لوٹ لی۔

ماریا: گویا اس کی ماں اور بہن ہی اس کی قاتل ہیں؟

مارتھا: ہاں۔ لیکن یہ ان کا کام ہے، کسی اور سے مطلب نہیں۔

ماریا: (اپنے آپ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے) کیا تمہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ تمہارا بھائی ہے جب تم نے اسے قتل کیا تھا؟

مارتھا: اگر تم جاننا ہی چاہتی ہو تو سنو۔ ہمارے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر تمہیں دنیا کا کچھ بھی تجربہ ہے تو تمہیں ذرا بھی حیرت نہیں ہونی چاہئے۔

ماریا: (میز کی طرف جاتے ہوئے اپنا ہاتھ سینے پر باندھ کر بہت دھیمے اور دکھ بھرے لہجے میں) اف میرے خدا! مجھے معلوم تھا کہ اس کی اس ایکٹنگ کا نتیجہ خراب نکلے گا۔ اسے اور ہمیں سزا ملے گی۔ وہ یہاں آکر آپ لوگوں کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اسے پہلے پہل تو وہ الفاظ نہیں ملے تھے جس کی ضرورت تھی اور جب وہ لفظوں کو تلاش کر رہا تھا اسے مار دیا گیا۔ (روتے ہوئے) وہ بہت شاندار اور عظیم شخص تھا۔ تم اس شخص کی دل کی وسعت کو کبھی نہیں جان سکوگی جسے رات تم نے مار دیا۔ شاید آپ فخر کر لیں جیسے میں کرتی ہوں، لیکن نہیں، آپ تو اس کی دشمن تھیں۔ ورنہ آپ اس طرح اپنے غصے لہجے میں بات نہ کر سکتیں۔ آپ کو پاگلوں کی طرح سے سڑک پر نکل جانا چاہئے تھا اور اسی طرح کراہنا چاہئے تھا جس طرح زخمی جانور۔

مارتھا: ساری باتیں جانے بغیر ایسا فیصلہ کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ اب تک ماں بیٹے کے پاس لیٹ چکی ہو گی اور پانی کی لہریں ان کے چہرے کے نقوش مٹا رہی ہوں گی۔ وہ سڑ رہے لکڑی کے تختوں سے ٹکرا رہی ہوں گی۔ جلد ہی ان کے جسم کھینچ لئے جائیں گے اور وہ دونوں زمین کے ایک ہی ٹکڑے میں دفن کر دیئے جائیں گے، لیکن اس میں بھی مجھے کوئی ایسی وجہ نہیں نظر آرہی ہے کہ میں چیخنے چلانے لگوں۔ انسان کے دل کے بارے میں میرے خیالات مختلف ہیں اور میں صاف صاف کہوں تمہارے آنسو میرے اندر بغاوت پیدا کر رہے ہیں۔

ماریا: (اس کے اوپر تیزی سے گرتے ہوئے) میرے آنسو ان خوشیوں کے لئے ہیں جنہیں ہم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ زندگی کی ان مسرتوں کے لئے جو مجھ سے چھین لی گئیں۔

مارتھا: یہ مت سمجھو کہ ان باتوں کا مجھ پر کچھ اثر ہوگا۔ مجھ پر ان سب سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ کیونکہ میں نے بھی بہت کچھ دیکھا اور سنا ہے۔ میں نے خود مرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ لیکن میں ان میں شامل ہو کر نہیں مروں گی اور مجھے ان کی رفاقت چاہئے بھی کیوں؟ میں انہیں ان کی نئی ملی محبت میں چھوڑ دوں گی۔ اندھیرے میں ان کو ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے۔ اس میں ہمارا اور تمہارا کوئی رول نہیں رہا۔ سب کچھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا، وہ ہمیشہ کے لئے بے وفا ہو گئی۔ خوش قسمتی سے میرا اپنا کمرہ ہے اور چھت مضبوط رسی کی طرح لٹک رہی ہے۔

ماریا: مجھے اس سے کیا مطلب کہ تم مرو یا جیو یا ساری دنیا برباد ہو جائے کیونکہ میں نے تمہارے ذریعے اس آدمی کو کھو دیا ہے جس سے میں محبت کرتی ہوں۔ اس کے بعد تنہائی کی راتیں میرا مقدر ہو گئیں جو ہر لمحہ مجھ پر نشتر زنی کریں گی۔

(مارتھا اس کے پیچھے آتی ہے اور اس کے کانوں میں بولتی ہے)

مارتھا: زیادہ مبالغہ آرائی سے کام نہ لو۔ تم نے اپنا شوہر کھویا اور میں نے اپنی ماں کو کھویا۔ ہم دونوں اب کچھ کھونے والے نہیں۔ لیکن تم نے برسوں تک اس کی محبت سے لطف اندوز ہونے کے بعد جس میں اس نے تمہیں کبھی اپنے سے الگ نہیں کیا، ایک بار کھویا ہے۔ میری تقدیر تم سے بھی بری ہے۔ پہلے میری ماں نے مجھے چھوڑا اور پھر وہ مر گئی۔ میں اسے دوبار کھو چکی ہوں۔

ماریا: شاید میں تم سے ہمدردی کرنے پر تیار ہو جاؤں اور اپنا غم تم سے بانٹ لوں۔

مارتھا: (آواز میں دل شکستگی کے لہجے کے ساتھ) میری حالت بھی تمہارے شوہر جیسی ہے۔ کیونکہ میں نے بھی اتنی ہی اذیت اٹھائی ہے جتنی اس نے۔ اسی کی طرح میں نے بھی سوچا تھا کہ مجھے اپنا مکان ہمیشہ کے لئے مل جائے گا۔ میں نے سوچا تھا کہ اس جرم سے میرے اور ماں کے درمیان وہ رفاقت قائم ہو جائے گی جو کبھی نہیں ٹوٹے گی اور دنیا میں میں اس پر بھروسہ کروں گی سوائے اس عورت کے جس نے میرے ساتھ مل کر جرم کیا لیکن یہ میری غلطی تھی کیونکہ جرم کا مطلب تنہائی بھی ہوتا ہے چاہے ایک ہزار لوگ مل کر اسے کریں اور یہ مناسب بھی ہے کہ اب میں تنہا مروں تنہا زندہ رہنے اور مارنے کے بعد۔

(ماریا اس کی طرف مڑتی ہے۔ اس کے آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے ہیں۔ مارتھا پیچھے ہٹتی ہے اور اس کی آواز پھر سخت ہو جاتی ہے)

مارتھا: وہیں ٹھہرو...... میں نے کہا کہ مجھے چھوؤ نہیں۔ نفرت اور غصے سے میرا خون کھول رہا ہے۔

ماریا: (کھڑی ہوتی ہے اب دونوں عورتیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کافی قریب کھڑی ہیں)

ڈرو نہیں۔ تمہاری جو خواہش ہے۔ میں تمہیں مرنے سے نہیں روکوں گی۔ کیونکہ میرے اندر جو درد اٹھ رہا ہے اور جو اسے جکڑ رہا ہے، میں محسوس کر رہی ہوں کہ میری آنکھوں سے روشنی ختم ہو رہی ہے اور میرے چاروں طرف اندھیرا بڑھ رہا ہے۔ نہ تو تمہاری ماں اور نہ ہی تم میرے لئے اس دھندلے چہرے سے زیادہ کوئی حیثیت رکھتی ہو، جو ایک سانحے کے دوران آئیں اور چلی گئیں۔ ایسا سانحہ جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔ مارتھا نہ میں تم سے نفرت کر سکتی ہوں نہ محبت۔ میرے اندر سے کسی شخص سے نفرت و محبت کرنے کی قوت ختم ہو گئی ہے۔ (اچانک وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیتی ہے) مجھے تو اتنا وقت بھی نہیں ملا کہ میں اس دکھ کو جھیل سکتی۔

مارتھا: (جو دروازے کی طرف قدم بڑھا چکی تھی واپس ماریا کی طرف مڑتی ہے) لیکن اتنا بڑا بھی نہیں۔ ابھی تمہارے پاس رونے کے لئے آنکھیں بچی ہیں اور تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑنے سے پہلے مجھے کچھ اور کرنا ہے — تمہیں پاگل کرنا ہے۔

ماریا: (خوف سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے) پلیز مجھے تنہا چھوڑ دیجئے اور جائیے۔

مارتھا: ہاں میں جا رہی ہوں۔ تبھی مجھے اور تمہیں سکون ملے گا۔ تمہاری محبت اور تمہارے آنسو میرے اندر وحشت پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن جانے سے پہلے میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتی ہوں کہ تم درست ہو یا یہ محبت۔ محبت فضول شئے نہیں ہے اور یہ جو کچھ ہوا وہ ایک حادثہ تھا۔ اس کے برخلاف ہم ویسے ہی ہیں جیسے عام چیزیں ہوتی ہیں اور مجھے تمہیں اس کا یقین دلانا ہے۔

ماریا: اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟

مارتھا: عام حالات میں لوگوں کی اکثر شناخت نہیں ہوتی۔

ماریا: (بے چین ہو کر) اس کی مجھے کیوں فکر ہو۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میرا دل تار تار ہو گیا ہے اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ آپ نے جس شخص کی جان لی وہ.....

مارتھا: (وحشی انداز میں) خاموش ہو جاؤ۔ میں اس آدمی کے بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ میں اس سے نفرت کرتی ہوں۔ وہ تمہارے لئے بھی کچھ نہیں رہ گیا۔ اسے دائمی جلاوطنی نصیب ہو گئی ہے۔ وہ بیوقوف شخص، جو کچھ چاہتا تھا اسے مل گیا۔ وہ اب اس عورت کے ساتھ ہے جس کی تلاش میں وہ سمندر پار سے آیا تھا۔ ہمیں وہ سب کچھ مل گیا جو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین کر لو کہ نہ یہ اس کے لئے ہے نہ ہی ہمارے لئے۔ نہ زندگی میں نہ موت میں۔ امن ہے یا وطن ہے۔ (طنز سے مسکراتے ہوئے) کیونکہ تم بھی اس بات سے اتفاق کرو گی کہ اس جگہ کو وطن نہیں کہا جا سکتا۔ نیچے زمین پر۔ وہ زمین کا اندھیرا ہم جہاں جاتے ہیں اور کیڑے مکوڑے کی خوراک بن جاتے ہیں۔

ماریا: (روتے ہوئے) نہیں، میں تمہاری ان باتوں کو برداشت نہیں کر پا رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بھی نہیں برداشت کر پاتے۔ اپنے دوسرے مکان کی تلاش کے لئے ہی ہم سمندر پار کر کے یہاں آئے تھے۔

مارتھا: (جو دروازے تک جا چکی تھی پھر اس کی طرف مڑتی ہے) اس کی بیوقوفی کا صلہ اسے مل چکا ہے اور جلد ہی تمہیں بھی تمہارا صلہ ملنے والا ہے۔ (پہلے کی طرح ہنستے ہوئے) ہم سب کو دھوکہ ملا ہے۔ میں تم سے کہتی ہوں فریب اور دھوکہ یہ چیزیں کیا کرتی ہیں۔ یہ اندھے جذبات جو ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے، وہ خواہش جو ہمارے اندر پیدا ہوتے ہیں وہ خواہش جو ہماری روح کو تڑپا دیتی ہے۔ سمندر یا محبت کے لئے کیوں چیخ رہی ہو۔ تمہارے شوہر کو اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا جواب کیا ہوتا ہے۔ وہ اندھیرا، اذیت ناک گھر جہاں آخر میں ہم سب پڑ پتوں کی طرح لیٹے رہیں گے ساتھ ساتھ۔ (بدلہ لینے کے انداز میں) ایک وقت آئے گا جب تم بھی اسے جان جاؤ گی۔ تب کیا تمہیں کچھ یاد رہے گا، تم اس دن کو ایک بھولی بسری یاد کی طرح محسوس کرو گی جسے آج تم اپنی زندگی کا سب سے خوفناک، اذیت ناک اور جلاوطنی کا دن سمجھ رہی ہو۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہارا دکھ کبھی بھی اس آدمی کے ساتھ ہوئی ناانصافی کے برابر نہیں ہو سکتا [illegible] — جانے سے پہلے میں تمہیں نصیحت کرنا چاہتی ہوں اور یہ نصیحت مجھ پر [illegible] میں نے تمہارے شوہر کو مارا ہے۔ [illegible] دعا کرو کہ وہ تمہیں پتھر کی طرح سخت کر [illegible] اکیلی خوشی ہے جو اس نے اپنے تک محدود کر [illegible] ہے۔ ویسا ہی کرو جیسا وہ کرتا ہے۔ ساری [illegible] گزارش، دعاؤں سے اپنے کو بری کر لو۔ ابھی وقت ہے، اپنے دل کو پتھر بنا لو — اگر تم محسوس کرتی ہو کہ تمہارے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ پتھر [illegible] سکون حاصل کر سکو تو آؤ ہمارے مشترکہ گھر میں شامل ہو جاؤ۔ خدا حافظ بہن۔ ہر چیز بہت آسان ہے۔ پتھروں جیسی بے حسی، خوشی یا اس اندھیرے بستر کو جس میں ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں جس کو چاہو انتخاب کرو۔

(وہ چلی جاتی ہے۔ ماریا جو ابھی تک خوف اور حیرت سے اسے سن رہی تھی۔ اپنا بازو اس کی طرف بڑھاتی ہے)

ماریا: (چیختے ہوئے) اے میرے خدا! میں اس ویران جگہ پر نہیں رہ سکتی۔ اب تمہیں ہو جو میرا سہارا ہو اور میں تم پر ہی آسرا رکھتی ہوں۔ (وہ گھٹنوں کے بل جھکتی ہے) میں نے اپنے آپ کو تمہارے سپرد کر دیا ہے۔ مجھ پر رحم کر اور میری مدد کر، میری گزارش سن اور مجھے اس زمین سے اٹھا لے۔ اے میرے آقا ان پر رحم کر، جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور پھر جدا ہو جاتے ہیں۔

(دروازہ کھلتا ہے بوڑھا خادم دہلیز پر کھڑا ہے)

بوڑھا خادم: یہ کیسی آوازیں آ رہی ہیں۔ کیا تم نے مجھے پکارا ہے؟

ماریا: (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) میں نہیں جانتی لیکن میری مدد کرو، مدد کرو مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔ کہو کہ تم میری مدد کرو گے۔

بوڑھا نوکر: (اسی لہجہ میں) نہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

ختم شد

ہندوستانی خواتین

ایک نئے کردار میں





اب جب کہ خواتین انسانی سرگرمیوں کے تمام شعبوں میں اپنی موجودگی کا لوہا منوا رہی ہیں، تو آیئے
بابائے قوم کے ۱۳۲ ویں یومِ پیدائش پر ان کے تصور کو سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کا روپ دیں

davp 2001/323

تبصرے

نام کتاب : رلکے، کافکا، منٹو:
دی ڈیپیاکس آف کومالا کف اینڈ اتھم

مصنفہ : روزی سنگھ

قیمت : ۵۶۰ روپے

ناشر : ہرمن پبلشنگ ہاؤس، اے ۲۳، نارائنا انڈسٹریل ایریا۔ فیز ۲، نئی دہلی۔ ۲۸

رلکے، کافکا اور منٹو میں کیا مشترک ہے۔ نہ زمانی نہ مکانی اور نہ زبان نہ ادبی روایت اور نہ تہذیبی وراثت۔ تو پھر ان کو ایک کتاب میں مشترک اساسی ڈسکورس بنانے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ اور اب ان میں سے کوئی بھی بقید حیات نہیں۔ روزی سنگھ کی زیر تبصرہ کتاب ان ادیبوں کی تخلیقات کا کوئی تقابلی مطالعہ نہیں۔ لیکن اس امر کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ ان تخلیق کاروں نے خارج کے مقابلے انسان کے باطن کے اسرار سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں جھانک کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کتنی دنیائیں آباد ہیں۔ جبر و اختیار اور خیر و شر کی کشمکش میں جب انسان ذات کے بحران کے روبرو ہوتا ہے تو کیا وہ سرخرو ہو کر نکلتا ہے یا شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ تشویش ناک صورت حال اور اخلاقی ڈائلیما سے ایک وجودی سوال کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ آخر انسان ہونے کے کیا معنی ہیں۔ روزی سنگھ نے رلکے، کافکا اور منٹو کی تخلیقات کے نشانیاتی / معنیاتی مطالعے میں ان ہی اساسی سوالات پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنفہ کی نظر میں معاشرہ اور معیشت تو محض بیک ڈراپ کا کام کرتے ہیں اصلی مسئلہ تو انسان کے Angst کا ہے اور یہ سب ادیب کسی نہ کسی طور پر اسی تشویش / عذاب سے نبرد آزما ہو رہے ہیں۔

روزی سنگھ نے رلکے، کافکا اور منٹو کے جداگانہ یونیورسس میں داخل ہوتے ہوئے اس امر کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے کہ ان کی بے پناہ تخلیقی قوت کس طرح اس الگ الگ 'کائنات' کے کرداروں میں تذبذب اور شبہات، تشویش اور تشکیک ان کے وجود کے اسناد کا مسئلہ بن جاتے ہیں۔ کس طرح خارج اور باطن کی ثنویت / جدلیات ایک نامیاتی کل میں بدل جاتی ہے جس میں وجود اور جوہر کا تہہ در تہہ پیچیدہ باہمی اشتراک عمل جاری و ساری رہتا ہے۔

رلکے کی شاعری اور کافکا اور منٹو کے بیانیہ کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنفہ نے مروجہ نئی 'ادبی' تھیوری اور اس سے قبل مارکسی نظریاتی تنقید اور حالیہ کلچرل مطالعات کو رد کرتے ہوئے Open ended ڈسکورس کے طریقہ کار کو اپنایا ہے۔ ان کے خیال میں موجودہ سماجی ثقافتی سیاق پر مبنی تنقید تاریخی جدلیات کے زمانی و مکانی میں محبوس ہونے کے باعث ان تخلیق کاروں کی Textual Power پر Contextual جبر کو حاوی کر دیتی ہے متن کی گنجانی دنیا، ویرانا بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی تنقید حقیقت کے انکشاف کا دعویٰ کرنے کے باوجود غیر مستند ہے۔

اس کتاب کا نصف حصہ (۱۴۴ صفحات) منٹو کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ یہ ایک ایسا مثالیاتی مطالعہ ہے جو منٹو کو رلکے، کافکا اور دوسرے کلاسیکی ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کر دیتا ہے۔ روزی سنگھ نے منٹو کے دو افسانوں ہتک اور ٹھنڈا گوشت کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ٹھنڈا گوشت کے متن کے تجزیہ میں اردو رسم الخط میں افسانے کے کچھ اقتباسات بھی شامل ہیں جب کہ مصنفہ نے منٹو کے افسانوں کا مطالعہ ہندی کے تراجم اور لیپی انترن اور انگریزی کے تراجم کے ذریعے کیا ہے۔ یہ بات قابل تعریف ہے کہ انہوں نے انگریزی کے تراجم کی انحطاط کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے جو نہ صرف متن کے معنی کو بدل دیتے ہیں بلکہ اسے مسخ بھی کر دیتے ہیں جس کے باعث منٹو کے افسانے محض 'سماج کا آئینہ' بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے زبان و بیان کی جانب بڑے سخت تحفظات کئے ہیں۔

ہتک کی قرأت میں روزی سنگھ نے عمرانی ساجیاتی مطالعے پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایسے تھیوریٹیکل / نظریاتی تجزیات منٹو کے متن کو سمجھنے میں قاصر ہیں۔ سوگندھی کا کردار تاریخی / صنفی تنقید سے پرے انسانی وقار اور اختیار کا حاصل ہے۔ یہ محض عورت کی توہین کا مسئلہ نہیں۔ اس سلسلے میں مصنفہ نے خوشیا اور نعرہ کے بین المتونی مطالعہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خوشیا اور کیجو لعل کے وقار کو ٹھیس لگنے سے جو بے چینی، اختیار پر جبر کے غلبے اور وجود کے عدم وجود میں بدلنے سے جو ... ہوئی ہے وہ کتنی اذیت ناک ہوتی ہے۔ Angst کو جنم دیتی ہے۔ منٹو کے افسانوں میں یہ تشویش دو سطحوں — جسمانی اور ذہنی — پر جاری رہتی ہے۔ کبھی جسمانی سطح ابھر کر سامنے آتی ہے اور کبھی ذہنی۔ اس سلسلے میں مصنفہ نے طوائف کے کردار پر مرکوز بریخت اور سارتر کے دو ڈراموں اور موپساں کے افسانے کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ہتک کی فکری اور فنی گہرائی کو بہتر قرار دیا ہے۔ روزی سنگھ کے خیال میں ہتک میں انسانی وقار اور اختیار جہاں زمان و مکان کی حدوں کو پار کر جاتا ہے۔ وہاں وہ جنس اور عمر کی قید سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب رلکے، کافکا اور منٹو کی تخلیقات میں موجود وجودی صورت حال کی پیچیدگیوں کو پیار، زندگی اور موت کے مسائل کے پس منظر میں سمجھنے کی ایک سنجیدہ اور جدت پسندانہ سعی ہے۔

کتاب میں ان ادیبوں کے سوانحی اشارے، ان کی تصویریں، منٹو کی قبر کا کتبہ اور واگہہ بارڈر کے عکس اور کچھ پینٹنگز بھی شامل ہیں۔ یہ امر باعث تسکین ہے کہ موجودہ غالب ڈسکورس میں یہ کتاب ایک جداگانہ منفرد کلام کی روایت کو مستحکم کرتی ہے۔ اور انگریزی داں قارئین پر یہ واضح کرتی ہے کہ منٹو اس عظیم روایت سے وابستہ ہے جو رلکے اور کافکا کی روایت ہے۔

دیویندر اسر، نئی دہلی

نام کتاب: رباعیات عادل

شاعر : عادل اسیر دہلوی
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : ملک بک ڈپو، ۲۲۱۲ ترکمان گیٹ دہلی

عادل اسیر کی شناخت بچوں کے ادیب اور شاعر کے طور پر بڑی مستحکم ہو چکی ہے اور اس میں شک نہیں کہ عادل اسیر نے مولانا اسماعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر، شفیع الدین نیر کی طرح بڑی یکسوئی اور خلوص سے بچوں کے لئے نظم ونثر میں ادب کی تخلیق کی ہے اور یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ آج کی گروپ بازی کے دور میں ان کے کنٹری بیوشن کی پذیرائی ہوئی ہے اور ان کی کاوشوں کے لئے انہیں پہچانا بھی گیا ہے۔ اس کا ثبوت وہ اعزازات و اکرام ہیں جو انہیں اکیڈمیوں اور اداروں سے ملے ہیں۔

بچوں کے ادب کی آبیاری اگر عادل اسیر کی زندگی کا مقصد ہے تو اس مقصد سے کبھی کبھی الگ ہو کر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرنا ان کا فطری جذبہ کہا جاسکتا ہے۔ 'رباعیات عادل' ان رباعیات کا مجموعہ ہے جن سے ان کے ہم عمر اور ہم عصر بہتر انداز میں لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ 'رباعیات عادل' صرف ۸۷ رباعیوں کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے لیکن اس مجموعہ کی زیادہ تر رباعیاں پر اثر اور معنی خیز ہیں۔ چند رباعیاں دیکھئے:

ہر چند کے دنیا میں سویرا ہوگا
خفاش کا ظلمت میں بسیرا ہوگا
جس دل میں کیا ہو بے ضمیری نے قیام
سورج بھی جلا دو تو اندھیرا ہوگا

جب خواب نہ دیکھو گے تو کیسی تعبیر
جب رنگ نہ ہوگا تو کہاں کی تصویر
جب آج نہ بنیاد رکھو گے عادل
کل کس طرح دیوار کروگے تعمیر

دانائی تو غصے کی ہے اک ادنیٰ کنیز
ہیں ہوش وخرد بھی یہاں بے کار سی چیز
ہوجاتا ہے غصے میں جنونی انسان
پھر نیک یا بد کی نہیں رہتی تمیز

'رباعیات عادل' کمپیوٹر کمپوزنگ میں سفید کاغذ پر صاف ستھری شائع ہوئی ہے جس کا سرورق بھی جاذب نظر ہے۔

نام کتاب: اسرار فن

مصنف : ڈاکٹر ظفر مراد آبادی
قیمت : ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتہ : ۸۸۹/۹ سوئیوالان، نئی دہلی

یوں تو شاعری ایک پسندیدہ اور مقبول صنف سخن ہے اور ہم قدم قدم پر شعرائے کرام سے متعارف ہوتے رہتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ اچھا شعر کہنے کے لئے شاعر کو دل کا خون کرنا پڑتا ہے۔ بلاشبہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے اور یہی وہ صنف سخن ہے جس میں شاعر اپنے جذبات، تاثرات اور تصورات کی لفظی تصویروں میں عکاسی کرتا ہے۔ غزل کے اشعار میں یک رنگی نہیں ہوتی بلکہ غزل کی دل کشی اور جاذبیت مضامین کے تنوع اور رنگا رنگی میں ہے اور غزل کا وہی شعر سب سے زیادہ پر کیف، پر اثر اور معنی خیز ہوتا ہے جس میں سلسلہ بیان کی زیادہ کڑیاں چھپی نظر آئیں۔ ڈاکٹر ظفر مراد آبادی، میری رائے میں بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن زیر تبصرہ مجموعہ 'اسرار فن' میں تین رباعیات اور نو نظمیں بھی شامل ہیں۔ ابتدائی دو نظمیں 'انتخاب نبی' اور 'اشک سنگ و آہن' ہیں جنہیں ڈاکٹر ظفر نے منظوم ثانیت (سانیٹ) کی شناخت دی ہے۔ نظم گوئی پر طبع آزمائی کے باوجود غزل ہی وہ صنف سخن ہے جسے ان کا میدان کہا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر ظفر مراد آبادی کی غزلوں کے اشعار بھی ان کی زندگی کے مسئلوں، مرحلوں، کشاکش اور جدوجہد کا اظہار ہیں۔ یہ چند اشعار دیکھئے:

سفر میں دھوپ ملی، اپنے گھر میں دھوپ ملی
ہمیں تو وقت کے ہر اک پہر میں دھوپ ملی

زخموں کے ساتھ بخش گئے دل کا درد بھی
کچھ ایسے خوش مذاق ہمیں چارہ گر ملے

سوتیلے اور سگے کا نہیں امتیاز کچھ
جب خوں ہوا سفید تو رشتہ سمٹ گیا

اور اپنے اثاثے کا اظہار ڈاکٹر ظفر نے اس طرح کیا ہے:

مال ومتاع! لوح وقلم کے علاوہ کیا
پاس اپنے ہے اس ایک بھرم کے علاوہ کیا

'اسرار فن' ایک خوبصورت شعری مجموعہ ہے جس میں اردو شاعری کے مداحوں کو اپنی پسند کے اشعار ضرور ملیں گے اور ایسے بھی جو دل پر براہ راست اثر کرتے ہیں کیونکہ بقول شاعر اسرار فن زندگی کے مجبور لمحات کا احاطہ کرتا ہے۔' اور چونکہ درد کا رشتہ بڑا ہوتا ہے اس لئے شاعر کے محسوسات سے گزرتے ہوئے قاری بھی اس میں شامل ہو جائیں گے۔ صاف ستھری کتابت میں سفید کاغذ پر یہ مجموعہ جاذب نظر شائع ہوا ہے جس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔

انور کمال حسینی، نئی دہلی

نام کتاب: سکھی ساجن

مصنف :ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
قیمت :۱۰۰ روپے
ناشر :نرالی دنیا پبلی کیشنز، دہلی گیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے آج کے دور میں تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنی امتیازی سربراہی کو برقرار رکھتے ہوئے امیر خسرو کی کہہ مکرنیوں کی صدیوں پرانی دیوار چین کے سایہ میں اردو کے کچھ بزرگوار اور کچھ عصری شعرا کی چیدہ چیدہ طبع زاد کہہ مکرنیوں کا بڑا ہی خوشگوار منظر نامہ اردو ادب کی نذر کیا ہے۔ اس کوشش میں وہ کوئی اٹھارہ شعرا کو شامل انتخاب کر سکے ہیں اور اسی لئے اسے صریحاً پہلا انتخاب کہنے میں حق بجانب ٹھہرے ہیں۔

کہہ مکرنیوں کے سلسلے میں مصنف کی تحقیقی اور تدوینی کدو کاوش کا لب لباب ان کے پیش لفظ یعنی حرف اول کے تحت نمایاں ہے جس میں انہوں نے اس صنف سخن کی Genesis اور متعلقہ عروضی خدوخال پر سیر حاصل بحث کا حق ادا کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریزی ادبیات کے معلومات فراواں کی زد میں موصوف کی تحریر شروع شروع میں Over-doing کی سرحدیں چھو گئی ہیں۔

متعدد ثقافتی صلاحیتوں کے مادر زاد مالک حضرت امیر خسرو کی صاحبقرانی ایک ناقابل تردید تاریخی ماہیت کا دوسرا نام ہے۔ اگر موصوف کے ہمہ گیر شاعرانہ مذاق فن کے سرمائے میں سے صرف Folk-lore کو ہی لیا جائے تو پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں میں بنیادی فرق یہی لگتا ہے کہ پہیلیوں میں خطاب کرنے والا خود شاعر ہی لیکن جس کو مخاطب کیا جارہا ہے وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے یعنی مرد، عورت یا سمجھ دار بچہ۔ کہہ مکرنیوں میں دو سہیلیاں ہی کردار ادا کرتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں میں معاملہ آرائی کی فضا الگ الگ

ہے۔ البتہ شعریت کے اعتبار سے کہہ مکرنیوں کا مرتبہ پہیلیوں سے زیادہ دلچسپ ہے کیونکہ ان میں نسوانی وارفتگی کا رنگ و آہنگ انہیں تغزل کے قریب تر کر دیتا ہے اور وہ ہے کی طرح ان میں ادبیاتی چاشنی در آتی ہے۔

بڑی توقع ہے کہ اردو کی شعری ادبیات میں یہ خاطر خواہ اضافہ بسرو چشم لیا جائے گا۔ یہ بہت ہی خوبصورت کتاب اپنے شعری اندوختہ میں ہی قیمت کا جواز فراہم کرتی ہے۔

رام پرکاش راہی، دہلی

نام کتاب: عمر گزشتہ کا حساب (دو جلدیں)

مصنف : مخمور سعیدی

قیمت : ۳۰۰روپے (فی جلد)

ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولہ مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی۔

مخمور سعیدی اب اپنی عمر کے اس پڑاؤ پر پہنچ چکے ہیں جہاں عام طور پر لوگ تھک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن مخمور سعیدی اب بھی اسی روانی سے لکھ رہے ہیں اور زندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ البتہ اب انہوں نے مناسب سمجھا ہے کہ اپنی "عمر گزشتہ کا حساب" بھی کرتے چلیں:

کل ہمارے اندر بھی / نت نئی ترنگیں تھیں /
ان گنت امنگیں تھیں / اب تھکے ہوئے ہیں ہم / وقت
کے تعاقب کی / تاب کھو چکے ہیں ہم۔

(ڈھلتی عمر کی ایک نظم)

مخمور سعیدی نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں شاعری شروع کی تھی اور ۱۹۶۰ء کے بعد ابھرنے والے جدید لب ولہجہ کے شعرا میں انہوں نے اپنا ایک خاص مقام بنالیا تھا۔ اس طرح مخمور سعیدی کی ادبی اور شعری زندگی کم وبیش پچاس سال کے عرصے پر بسیط ہے۔ نصف صدی کا عرصہ وہ عرصہ ہوتا ہے جب عام طور پر آدمی خالی ہو جاتا ہے اور شاعر بھی اس سے مبرا نہیں۔

جدید لب ولہجہ کی شاعری کا وصف ہی یہ رہا ہے کہ اس نے 'تنہائی' اور 'فرد' کی فردیت کو کلید کے طور پر اپنایا۔ انہیں احساسات کو جدید شاعروں نے اپنی شاعری میں پورے زور وشور سے پیش کیا:

غم ونشاط کی ہر رہگذر میں تنہا ہوں
مجھے خبر ہے میں اپنے سفر میں تنہا ہوں
مجھی پہ سنگ ملامت کی بارشیں ہوں گی
کہ اس دیار میں شوریدہ سر میں تنہا ہوں
مجھی سے کیوں ہے خفا میرا آئینہ مخمور
اس اندھے شہر میں کیا خود نگر میں تنہا ہوں

تنہائی جدیدیت کا اسم اعظم ہے اور مخمور سعیدی نے اسے نہ صرف اپنی غزلوں بلکہ نظموں میں بھی پورے طور پر اپنایا ہے۔ نظم 'شام کا بسیرا' کی چند سطریں ملاحظہ کریں:

شام ہوئی اور گھر سے نکلے تم جھولی پھیلائے
روپ نگر میں تمہیں شاید کچھ بھکشا مل جائے
کوئی تمہارے خشک لبوں کو موج تبسم دے دے
مہر بہ لب دل کی دھڑکن کو اذن تکلم دے دے
قید تنہائی سے چھڑا دے کسی نظر کا جادو
بڑھ کے مشام جاں مہکا دے کسی بدن کی خوشبو

جدید شاعری استعارات وعلامات کی شاعری ہے اور مخمور سعیدی استعارات کے بادشاہ ہیں لیکن مفکرانہ ضبط کے ساتھ۔

مخمور سعیدی کے اب تک چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "گفتنی، سیہ بر سفید، آواز کا جسم، آتے جاتے لمحوں کی صدا، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا اور دیوار ودر کے درمیاں"۔ 'عمر گزشتہ کا حساب' ایک جامع انتخاب ہے، جس میں ان چھ مجموعوں کی منتخب تخلیقات شامل ہیں۔ یہاں اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ "عمر گزشتہ کا حساب" کی پہلی جلد میں ان کی غزلیں شامل ہیں جب کہ جلد دوم میں مخمور سعیدی نے اپنی نظمیں یکجا کر دی ہیں۔

مخمور سعیدی کے قارئین اور ان کی شاعری پر کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک تحفہ سے کم نہیں۔ امید کہ اس کی پذیرائی ہوگی۔

نام کتاب : جدیدیت اور اردو افسانہ

مصنف : ڈاکٹر اسلم جمشید پوری

قیمت : ۱۵۰روپے

ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولہ مارکیٹ دریا گنج، نئی دہلی۔

جدیدیت ۱۹۶۰ء کے آس پاس ایک زبردست رجحان کی شکل میں سامنے آیا۔ چونکہ ترقی پسند تحریک کے سخت گیر اصول وضوابط اور سیاسی وابستگی سے ادیب وشاعر اوب چکے تھے چنانچہ جدیدیت [illegible] کار افکار ونظریات کی وجہ سے لوگوں کی کشش کا [illegible] بنی۔ جدیدیت نے ادب کے تقریباً سبھی اصناف پر [illegible] اثر ڈالا۔ تنقید، افسانہ اور شاعری سبھی اس سے [illegible]

اردو افسانہ خاص طور پر جدیدیت سے [illegible] ہوئی، نتیجہ میں بہت سے خوبصورت اور [illegible] افسانے اس دور میں تخلیق ہوئے۔ زیر نظر کتاب میں مصنف ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے مختلف عنوانات کے تحت اس موضوع کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

پہلے باب میں "جدیدیت اور اردو افسانہ" کے تحت اسلم نے اردو افسانہ سے زیادہ جدیدیت کے رجحان کا جائزہ لیا ہے اور اس کے حسن وقبح کو ظاہر کیا ہے۔ مصنف نے جدیدیت کے فروغ میں 'شب خون' کے رول پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بجا طور پر شمس الرحمٰن فاروقی کو جدیدیت کا امام قرار دیا ہے۔ مصنف نے جدیدیت کو فروغ دینے والے رسائل میں 'شب خون' کے علاوہ 'آہنگ، جواز' الفاظ اور شاعر کے ہی نام گنائے ہیں، جب کہ محمود ایاز کا سوغات، گوپال متل کی تحریک، بلراج ورما کا تناظر، کمار پاشی کا سطور اور محور وغیرہ بھی اس رجحان کو فروغ دینے میں 'شب خون' کے شانہ بشانہ رہے ہیں۔ یہیں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ جس 'شب خون' نے جدیدیت کو فروغ دیا اس کے اولین ایڈیٹر سید احتشام حسین اور اعجاز حسین تھے۔

کتاب کا سب سے دلچسپ اور اہم حصہ چند کہانیوں پر مصنف کے تجزیے ہیں، جس میں دو: بلراج مین را، دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم: سریندر پرکاش زناری: انتظار حسین، تماشا: محمد منشا یاد، کاٹے: انور سجاد کنواں: بلراج کومل، تعاقب: قمر احسن وغیرہ [illegible] کے تحت لکھی گئی بہترین کہانیاں شامل ہیں۔

جدیدیت کے منفی رویے کے [illegible] سرنگ: سریندر پرکاش، [illegible] کالی بلی: دیویندر اسر [illegible] قمر احسن کو شامل کیا گیا ہے جن کے تجزیے [illegible] پہنچتا ہے کہ ان میں [illegible] پسندی کا نتیجہ ہے۔

بہتر ہوتا [illegible] کو بھی شامل کیا جاتا [illegible]

نام کتاب: اردو غزل گوئی

مصنف : فراق گورکھپوری

قیمت : [illegible] روپے

ناشر : نصرت پبلشرز، امین آباد، لکھنؤ

فراق کی ادبی شخصیت کے دو نمایاں پہلو ہیں۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے اور دوسرے تنقید نگار کے روپ میں۔ عام طور پر شاعر کی حیثیت سے وہ زیادہ پہچانے جاتے ہیں جب کہ تنقید میں بھی انہوں نے جوہر دکھائے ہیں۔ 'انداز ے' اور 'اردو کی عشقیہ شاعری' ان کی مشہور و معروف تصانیف ہیں۔ تنقید میں ان کی ایک تیسری تصنیف 'اردو غزل گوئی' بھی شائع ہوئی تھی جو نسبتاً کم مشہور ہوئی۔ جب کہ بوجوہ یہ تصنیف ان دو تصانیف کے مقابلے زیادہ اہم اور وقیع ہے۔

'اردو غزل گوئی' اولاً ۱۹۳۶ء میں 'نگار' میں ایک طویل مقالے کی صورت میں شائع ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب غزل اور نظم کے درمیان تنازعہ ایک معرکہ آرائی کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ناقدین اور شعرا کا ایک گروہ غزل کی حمایت کر رہا تھا تو دوسرا اس کی مخالفت میں سرگرم تھا۔ مذکورہ کتاب کی وجہ تصنیف نیاز فتحپوری اس طرح بیان کرتے ہیں:

"اردو غزل گوئی پر یہ مضمون ہمارے عزیز دوست جناب فراق گورکھپوری کا ہے۔ اس کی شان نزول یہ ہے کہ مئی کے رسالہ کلیم میں کسی صاحب کا مضمون 'نقاد' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں آزاد انصاری کے ایک مضمون کو سامنے رکھ کر جس میں 'غزل گوئی' کی حمایت کی گئی تھی نہ صرف آزاد بلکہ تمام غزل گو شعرا کا ذکر 'لب لعلِ شکر خا' کیا گیا تھا۔"

یہ حضرت 'نقاد' کون تھے؟ عقدہ نہیں کھلتا۔ نہ فراق نے اس طرف کوئی اشارہ کیا ہے اور نہ ہی نیاز فتحپوری نے۔ 'کلیم' کی ادارت جوش کر رہے تھے، اور وہ خیر سے نظم کے بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ غزل سے انھیں کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نقاد کے پردے میں یہ خود حضرت جوش تھے؟

اس مضمون کو لے کر کلیم اور نگار میں ایک معرکہ شروع ہو گیا جو باذوق قارئین کے لئے ایک دلچسپ چیز تھی۔ فراق نے غزل کی حمایت میں گو کہ ایک بھرپور مقالہ لکھا ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی اعتراف کیا کہ آج کل کی غزل گوئی بہت سی خوبیوں کے باوجود ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے۔'

۱۹۳۶ء میں شائع شدہ یہی مقالہ ۱۹۵۵ء میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوا اور بات آئی گئی ہو گئی۔ اب ۱۹۹۸ء میں شاید اس کی افادیت کے پیش نظر نصرت پبلشرز نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے، جو باذوق حضرات کے لئے فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔

نام کتاب : مولود شریف

مصنف : خواجہ الطاف حسین حالی

مرتب : ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی

قیمت : ۱۰۰ روپے

تقسیم کار : انجمن ترقی اردو، راؤز ایوینیو، نئی دہلی

کتاب کے اولین ناشر سجاد حسین کے مطابق زیر نظر کتاب کا سال تصنیف ۱۸۶۴ء تا ۱۸۷۰ء کے درمیان ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان پورے طور پر انگریزوں کا غلام بن چکا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مختلف مذاہب میں اصلاحی تحریکیں شروع ہوئیں اور لوگ مذہب کی طرف رجوع ہوئے۔ اسی زمانے میں مسلمانوں کے درمیان ذکر رسول کا ایک نیا طریقہ رائج ہوا، جسے عرف عام میں میلاد شریف کے نام سے جانا جاتا ہے۔

حالی کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ زیر نظر تصنیف ان کی اس ادبی حیثیت سے میل نہیں کھاتی۔ یہی وجہ ہے کہ حالی نے یہ کتاب لکھی ضرور لیکن شائع کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ واضح ہو کہ اس کتاب کی پہلی اشاعت حالی کے صاحبزادے سجاد حسین نے حالی کے انتقال کے کم و بیش بیس سال بعد ۱۹۳۲ء میں کی اور اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ مذکورہ کتاب روایتی انداز میں لکھی گئی ہے۔ دیگر میلاد ناموں کی طرح اس کتاب میں بھی صحیح سے صحیح اور ضعیف سے ضعیف حدیث و روایات کا سہارا لیا گیا ہے۔

حالی کے اس میلاد نامے میں تمہید کے علاوہ مقدمہ فضائل مجلس مولد کے بیان میں، ذکر ولادت، حلیہ شریف، مناجات کے عنوانات کے تحت ذکر رسولؐ ہوا ہے۔

مرتب کتاب آفتاب احمد آفاقی قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے نہ صرف اس کتاب کو ڈھونڈ نکالا بلکہ اپنے عالمانہ اور محققانہ تعارف و محشیہ سے آراستہ کر کے شائع کیا۔ حالی کی تصنیف پچاس صفحات پر مشتمل ہے اور کم و بیش اتنے ہی صفحات میں مرتب نے تعلیقات و حواشی اور فارسی و عربی میں درج اشعار و فقرے کی فرہنگ شامل کر کے یقیناً اسے مفید عام بنا دیا ہے۔

نام کتاب: فنون لطیفہ

مصنف : راشد انور راشد

قیمت : ۱۵۰ روپے

ناشر : علی سنز پبلی کیشنز، ۲۳/۸۳۸ نیو مارکیٹ، چتلی گیٹ، چاوڑی بازار، دہلی

فنون لطیفہ اور آرٹ اینڈ کلچر ہماری روزمرہ کی زندگی کا ایک اہم جزو ہیں۔ ہر انسان پیدائشی طور پر فنون لطیفہ کا دلدادہ اور شوقین ہوتا ہے۔ شعوری اور غیر شعوری طور پر ہر انسان فنون لطیفہ سے جڑا ہوتا ہے، اس کا حصہ بنتا ہے، اس سے لطف اندوز یا مستفید ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی لطف اندوز کرتا ہے اور مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو اس طرف سنجیدہ توجہ دیتے ہیں؟ اردو میں فی زمانہ زبیر رضوی اور ذہن جدید کے علاوہ کوئی اور نام سامنے نہیں آتا۔ شکر ہے راشد نے اس طرف توجہ دی ہے۔

'فنون لطیفہ' میں عام طور پر موسیقی، فوٹوگرافی، رقص، تھیٹر، اسٹیج، سنیما اور مصوری سبھی کچھ آتے ہیں۔ راشد انور راشد نے ان میں سے کچھ موضوعات پر مضامین لکھے ہیں، جن میں فوٹوگرافی، ہندستانی مصوری، مصوری کا فن اور پکاسو، جدید فرانسیسی مصوری، ہندوستانی موسیقی، ہندوستانی رقص اور کٹھ پتلی کا رقص شامل ہیں۔ راشد نے ان میں سے ہر مضمون پر لکھتے ہوئے حتی الامکان اس موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہیں۔

اردو میں عام طور پر اس طرح کے موضوعات کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا ہے یا یوں کہہ سکتے ہے ہیں کہ اردو میں ادب کے نام پر شعر و افسانے کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے اور اس طرف توجہ دینے کی عام طور پر ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے۔ راشد نے ان موضوعات پر لکھتے ہوئے دوسری زبانوں سے خاص کر انگریزی کتابوں سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ تعجب ہے کہ راشد نے حواشی و کتابیات اور ماخذ دینے سے احتراز کیا۔ ماخذ اور کتابیات سے نہ صرف کتاب کی اہمیت بڑھتی ہے بلکہ اس کے قارئین کے لئے مزید مطالعہ کی طرف رہنمائی بھی ہوتی ہے۔ کتاب موجودہ صورت میں بھی ایک اہم پیش کش ہے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب اور معنی خیز ہے۔

ابرار رحمانی

خط خطا

● آپ میرا خط پاکر تعجب تو ضرور کریں گے۔ وجہ ایک فطری کیفیت ہوتی ہے؟ اس ناپسندیدہ خط کی وجہ تسمیہ "آجکل کا شمارہ (ستمبر)" ہے۔ آپ نے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادبی معیار کی کوئی اونچی بلکہ بہت اونچی سیڑھی جیسی کہ فائر بریگیڈ والے استعمال کرتے ہیں! لگا رکھی ہے۔ 'آجکل' بلا مبالغہ اونچے درجے کی چیز ہے۔ زیر نظر پرچہ میں ظاہر ہے یوں تو سبھی مقالے 'دامن دل می کشد' والے ہیں لیکن میں خصوصی طور پر سرورالہدیٰ کے مقالے کا شیدائی ہوگیا۔ اس کی اصل وجہ تو خیر ان کی تحریر ہے لیکن ضمنی وجہ اس مضمون کے 'صاحبان اعزاز' تھی۔ خورشید احمد جامی، سلیمان اریب اور شاذ تمکنت سے ذاتی اور شخصی دیرینہ اور پارینہ تعلقات اور وابستگی بھی ہے۔ فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ یہ مضمون ان کے مقالے کا ابتدائی حصہ ہے۔ خدا کرے اصل مقالے کی تحریر اس سے زیادہ روشن اور چمکدار ہو۔ جب منگنی کی رسم اتنی شاندار ہے تو شادی کی تقریب کیسی ہوگی؟ موصوف کو فی الفور اپنا مقالہ مکمل کرلینا چاہئے۔ ان کی نظر گہری، تجزیہ کھرا اور پیش کش دلفریب ہے۔ میری طرف سے ان کی جناب میں مبارکباد۔

ہفتہ وار 'سچ' کے بارے میں قدوائی صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت ہوں کہ مجھے عبدالماجد دریابادی سے مصافحہ کرنے کا شرف حاصل ہوچکا ہے۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب عظیم المرتبت صحافی، ادیب اور طنز نگار ممبئی تشریف لائے تھے۔ اب تو مجھے سنہ بھی یاد نہیں رہا لیکن یہ یاد ہے کہ اس وقت مرحوم جانثار اختر بھی اس محفل میں موجود تھے۔ آپ کے اداریے نہیں چھپ رہے ہیں لیکن کتابی صورت میں تو بہر حال چھپ چکے ہیں اور اس کتاب پر تبصرے بھی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوچکے ہیں۔

یوسف ناظم، ممبئی

● اکتوبر کے 'آجکل' میں مضامین کا حصہ کمزور لگا۔ اس میں وہ تنوع نہیں ہے جو گزشتہ شماروں میں شامل کرکے آپ نے 'آجکل' کو دوسرے رسائل سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی۔

شرجیل احمد خاں کا ترجمہ خصوصیت سے پسند آیا۔ ان کی زبان اچھی ہے اور ایوان بونن کے امپریشن کو قاری تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ لیکن یہ جملہ ہضم نہیں ہوسکا کہ 'اس کہانی کو سمرسٹ مام نے دنیا کی ایک بہترین کہانی تسلیم کرتے ہوئے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔' سمرسٹ مام نے اس کہانی کا ترجمہ نہیں کیا ہے۔ اطلاعاً تحریر ہے۔ 'ہمیر پن' کو 'پیپر پن' لکھنا اور 'معدوم' کو 'معلوم' بنانا محل نظر ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی، بھاگلپور

● 'آجکل' کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس میں معیاری مقالے نظمیں، غزلیں اور کہانیاں توازن کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ لکھنا پڑرہا ہے کہ زیر نظر شمارہ (اکتوبر) افسانوں کے اعتبار سے کمزور ہے۔ آپ افسانے کو خاطر خواہ جگہ دیں۔ فقط دو افسانے، اس میں بھی ایک انگریزی سے ترجمہ کیا ہوا ہے۔ بہر کیف گوشہ علی سردار جعفری پسند آیا۔ آپ نے اسے گوشہ نہ کہہ کر دیانت داری کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ 'ماحولیات: تحقیق کے تناظر میں' وہاب قیصر کا لکھا کافی معلوماتی ہے۔

شمس الہدیٰ انصاری، دھنباد

● اس شمارے (اکتوبر) میں کل پانچ مقالات میں ابوالکلام قاسمی کا "سردار جعفری کے تنقیدی رویے" نہایت اہم ہے کہ انہوں نے سردار کے تنقیدی رویے پر غائرانہ نظر ڈالی ہے۔ رضا جعفری کا "سردار جعفری کا بلرام پور" محض عقیدت اور سردار صاحب کی اوائل زندگی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ نصرت جبیں کا مقالہ "سردار جعفری بحیثیت نثر نگار" ویسا ہی ہے جیسا کہ سردار جعفری نے اوائل میں جیسے پیش کیا تھا یعنی ناقدانہ نگاہ ڈالنے کی جگہ خلیفہ طرز کی بحث مقصود ہے۔ سید فضل امام رضوی نے "مروجہ دل کے شاعر" میں غزل کے جادو اور ترقی پسندی پر زور صرف کیا البتہ "ماحولیات: تحقیق کے تناظر میں" ہر شخص کے لئے مفید مقالہ ہے۔

م۔ ق۔ خاں، گیا

● میں نے ایک ہم نشیں سے جو کہ صاحب ذوق تھے، کہا: "لاپچو چائے اچھی نہیں ہوتی ہے" یہ سنتے ہی ان کے تیور ترچھے ہوگئے اور آنکھیں کچھ پھیل گئیں۔ پھر انہوں نے استفسار کیا، کیسے؟ میں نے کہا "لاپچو چائے پینے کے بعد دوسری چائے اچھی لگتی ہی نہیں ہے۔ اس نسبت سے لاپچو ٹھیک نہیں ہے۔ میرے اس جواب کو سن کر وہ بہت شاداں ہوا تھے۔ کچھ ویسی ہی بات "آجکل" میں ہے اس کے مطالعے کے بعد دوسرے جریدے بالکل ہی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔

جناب ابوالکلام قاسمی کا مقالہ "سردار جعفری کے تنقیدی رویے" مثل بحر بیکراں اور قابل ستائش ہے۔ موصوف نے جملوں کی انگوٹھی میں الفاظ کے خوبصورت نگینے جڑدئے ہیں۔ مقالہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے آنے والی نسلیں بھی سردار جعفری سے استفادہ حاصل کرتی رہیں گی۔

جناب رضا جعفری کا مضمون 'سردار جعفری کا بلرام پور' روشن، رنگین اور دلچسپ ہے۔ اس مضمون سے سردار جعفری مرحوم کے ذہین و ذکی ہونے کا علم ہوتا ہے۔ ان کی ذہانت و ذکاوت جناب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ذہانت و ذکاوت سے مماثلت رکھتی ہے۔ یہ مضمون ہنساتا بھی ہے اور رلاتا بھی ہے۔

جناب ڈاکٹر وہاب قیصر کا تحقیقی مضمون "ماحولیات" معلوماتی، فعال اور نہایت کارآمد ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے ایسے ایسے انکشافات سامنے لائے ہیں جہاں عام آدمی کی ذہنی رسائی ہوتی ہی نہیں ہے۔

جناب لوچن بخشی کی کہانی "تمغے سچے؟" روایتی کہانیوں سے منفرد ہے۔ اس کہانی سے یہ علم حاصل ہوتا ہے کہ انسان کسی بھی فن میں ماہر ہوتا ہے تو وہ صاحب کمال بن جاتا ہے خواہ فن چوری ہی کیوں نہ ہو۔

عبداللہ حسینی، بیگوسرائے

بقیہ صفحہ ۱۷۲

کوئی اور ندی بہتی تھی۔ باہر جو ندیاں تھیں ان کے اور وادی کے درمیان گہری گھاٹیاں اور اونچے پہاڑ تھے۔ آخر کلیان سنگھ مہتا نے جو کہ راجا کی طرف سے مالوہ اور گونڈوانہ کا گورنر تھا یہ کام اپنے ذمہ لیا۔ جس پہاڑی پر اب شہر بھوپال آباد ہے اس زمانے میں اس کے قریب سے ہو کر ایک ندی بہتی تھی۔ کلیان سنگھ نے اس ندی کا انتخاب کیا اور گھاٹیوں کو پاٹتا پہاڑوں کو کاٹتا ہوا سوا میل تک ندی کے لئے راستہ بنا کر وادی تک پہنچا دیا۔ پہاڑی سلسلے اس طرح واقع ہیں کہ شروع میں ان کے درمیان دس بارہ کوس کا فاصلہ ہے۔ مگر جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے ہیں ایک دوسرے سے قریب ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں بہت کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔ اس مقام پر انجینئروں نے ایک بہت بڑا سنگین بند تعمیر کیا۔ اس کے بعد تمام نالوں، ندیوں کا رخ پھیر کر اس وادی میں لا ڈالا۔

پہلی ہی بارش میں تالاب میں اتنا پانی آ گیا کہ راجہ اشنان کر کے شیو مندر میں پوجا کرنے کے قابل ہو گیا۔ جب راجہ پہلی دفعہ تالاب میں اشنان کرنے اترا ہے تو اس نے نو سو گائیں دان کیں، نو سو برہمنوں کو بھوجن کرایا اور خلعت دیئے اور نو سو تولہ سونا غریبوں میں تقسیم کیا۔ اس سلسلے میں چونکہ کلیان سنگھ مہتا نے بڑی خدمت انجام دی تھی۔ لہٰذا جو ندی اس کے اہتمام سے لائی گئی تھی کلیان سوت اس کا نام رکھا گیا جو کہ اب کلیاسوت کے نام سے مشہور ہے۔ تال کے قریب اسے ایک بڑی جاگیر دی گئی۔ یہاں اس نے ایک گاؤں کلیاں کھیڑی آباد کیا۔ یہ اب ایک بڑا قصبہ اور ضلع کا صدر مقام ہے اور کلیاکھیڑی کہلاتا ہے۔ جو گاؤں تالاب کی حد میں آ گئے تھے۔ ان کے باشندوں کو معقول معاوضہ دیا گیا اور ان کے لئے نئے گاؤں آباد کیے گئے جن ندیوں کا رخ پھیر کر وادی میں لایا گیا تھا ان کے نام یہ ہیں:

گوڈر، باسنہ، جاکھلہ، پیپلیا، سوتیاڈوڈا، کیروان، کلیاسوت، بیتوال۔

پورا تالاب سو سال میں پُر ہوا اور "بھیم ساگر" اس کا نام رکھا گیا۔ کتابوں میں اس کے نام بھوج ساگر، بھوج تال اور اندر تال بھی آتے ہیں۔ مگر بھیم ساگر زیادہ مشہور ہے۔ تاریخ فرشتہ کے مولف نے بھی اسے "حوض بھیم" ہی کے نام سے یاد کیا ہے۔

وہ پہاڑیاں جو تال کے بیچ میں آ کر پانی کی سطح کے اوپر نمودار رہ گئی تھیں اس چھوٹے سے سمندر میں جزیروں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ ان پر مندر اور سادھوؤں کے لئے خانقاہیں تھیں۔ آگے چل کر کچھ ماہی گیروں نے سکونت اختیار کی۔ عرصہ دراز تک مالوہ کے راجہ اور بادشاہ انہیں بطور تفریح گاہ کے استعمال کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ آبادی بڑھ گئی۔ ان کے نام بھی جزیرے کے طور پر رکھ گئے تھے۔ مثلاً دیپ (جزیرہ) یہ ریلوے اسٹیشن اور کاروباری قصبہ ہے۔ دیپڑی (چھوٹا جزیرہ) سانسل دیپ۔ آخری دونوں زرخیز اور آباد گاؤں ہیں۔

عہد قدیم میں یہ تال بھارت کے عجائبات اور طلسمی مقامات میں شمار ہوتا تھا۔ چنانچہ پوتھی پدم پران چودھویں ادھیائے اور شیو پران سترہویں ادھیائے میں جہاں امر کنٹک اور دیول اور باغ و حوض بکاؤلی کا ذکر آتا ہے وہاں تال بھوپال کا بھی بیان ہے۔ یہاں یہ بات لکھ دینے کے قابل ہے کہ آج سائنس کی ترقی کے عہد میں جب کہ ہر قسم کی سہولتیں اور ایجادیں انسان کی امداد کے لئے موجود ہیں صرف ایک دریا کا بہاؤ بدل دینے کے لئے کس قدر سرمائے، آدمیوں کی کتنی بڑی فوج، کتنے آلات اور کتنی مدت درکار ہوتی ہے۔ نہ کہ اس زمانے میں جب ان ذرائع کا نام و نشان تک نہ تھا اتنے پہاڑوں نالوں، ندیوں کا رخ پھیر دینا اگر انسانی قوت کا معجزہ نہیں تو اسے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

پانی کا یہ زبردست ذخیرہ پانچ سو سال تک پوری شان و شوکت کے ساتھ موجیں مارتا رہا۔ ۱۴۳۴ء میں جب ہوشنگ شاہ حاکم مالوہ نے نربدا کے قریب ہوشنگ آباد آباد کیا اور دھار کے پاس مانڈو پہاڑ پر شادی آباد شہر آباد کر کے اسے اپنا پایہ تخت قرار دیا اس وقت اتنے بڑے رقبہ زمین کو پانی میں بیکار دیکھ کر تالاب کے بند توڑنے کا حکم دیا۔ مزدوروں کی فوج کی فوج کام پر لگ گئی۔ چھ مہینے کی سخت محنت و مشقت کے بعد بند کا ایک تھوڑا سا حصہ ٹوٹ سکا۔ پانچ سال تک برابر پانی بہتا رہا۔ اور تیس سال کے بعد زمین آبادی کے قابل ہو سکی۔ اب یہ علاقہ ایک پوری تحصیل ہے۔ جسے "پرگنہ تال" کہتے ہیں اور اس میں تین سو ساٹھ گاؤں آباد ہیں۔ تمام جغرافیہ داں متفق ہیں کہ اس واقعہ کے بعد علاقہ کی آب و ہوا بالکل بدل گئی۔ مالوے کی سہانی اور خوشگوار راتیں جو شب مالوہ کے دل کش نام سے مشہور ہیں بہت کچھ اسی تال کا عطیہ تھیں۔

جھیل کو خشک ہوئے اگرچہ ساڑھے پانچ سو سال ہو چکے ہیں، مگر اس کے اثرات اب بھی باقی ہیں۔ بارش میں زمین سے اتنا پانی ابلتا ہے اور اتنی دلدل ہو جاتی ہے کہ سوار و پیادے کا راہ چلنا ممکن نہیں۔ اس موسم میں سیکڑوں قسم اور رنگ کے مینڈک نمودار ہو جاتے ہیں۔ ایک مینڈک سفید رنگ کا ہوتا ہے جو بجائے اچھلنے کے اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا ہے اور کوئی اڑان آٹھ دس گز سے کم کی نہیں ہوتی۔ بعض وحشت ناک دلدلی نشیبوں میں ڈھائی تین سیر کے مینڈک بھی دیکھے گئے ہیں۔ ان کا رنگ گہرا زرد ہوتا ہے۔ سبزی کا کہیں نام نہیں۔ صورت شکل بھی عام مینڈکوں سے الگ ہوتی ہے۔ شیر کی طرح پنجے، ہرن کی سی بڑی آنکھیں، موٹی گردن اور آواز بالکل گدھے کی طرح۔ قریب سے اڑنے والے پرندوں کو اچک کر پکڑ لیتے ہیں۔ کسی موزوں طبع نے ان کا بیان ایک شعر میں نظم کر دیا تھا جو یہ ہے:

بر کنار حوض دیدم چار رنگی جانور   شیر پنجہ، چشم آہو، فیل گردن، بانگ خر

پیداوار کے اعتبار سے "تال پرگنہ" مالوے کی جان سمجھا جاتا ہے۔ ۱۸۵۶ بکرمی کے عالم گیر قحط میں جب کہ مسلسل دو سال تک آسمان سے بارش کا ایک قطرہ نہیں گرا تھا اور پریشان حال مخلوق نے دو دو روٹیوں میں اپنی اولاد کو بیچ ڈالا تھا، اس زمانے میں بھی یہاں روپیہ میں بارہ آنے پیداوار ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ایک قسم کے خودرو چاول اور بڑے بڑے کسیرو اس کثرت سے پیدا ہو گئے تھے جو روپیہ کے پانچ سیر فروخت ہوتے تھے۔ یہاں چاول کی ایک خاص قسم 'سکھوان' ہوتی ہے۔ یہ پکنے میں اتنی خوشبو دیتا ہے کہ آس پاس کی گلیاں مہکنے لگتی ہیں۔ مشہور ہے کہ جس دعوت میں سکھوان پکایا جائے تو اجنبی مہمان کو میزبان کا گھر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ چاول کی خوشبو اس کی رہنما بن جاتی ہے۔ مگر اب اس کی پیداوار کم ہو گئی ہے۔ کاشتکار اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ جب تک دوسرے دھانوں کی فصل تیار ہو کر بازاروں میں فروخت بھی ہو جاتی ہے اس وقت یہ کہیں پکنے کا نام لیتا ہے۔ صرف شوقین زمیندار تقریبات میں استعمال کے لئے تھوڑے سے قطعہ زمین میں اس کی کاشت کر لیتے ہیں۔ دوسرا چاول "ماتھاسول" (دردِ سر) ہے۔ اس کے کھانے سے سر کا درد دور ہو جاتا ہے۔

☆☆

آجکل کی فائل سے

ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عرش ملسیانی

جلد: ۱۳   نمبر: ۵   دسمبر ۱۹۵۴

[illegible] DL-[illegible]/2001 Licenced U (DN)-50/2001 to post without pre-payment
[illegible] Post) RMS Delhi
[illegible] No. 5 Rs. 7/- Ajkal (Urdu) December 2001 AD



Printed and Published by **Suresh Chopra**, Director General, on behalf of Publications Division
Printed at Aravali Printers & Publishers (P) Ltd., W-30, Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-20
Published at Publications Division, Patiala House, New Delhi-1. Editor: **M.R.Farooqi**

آجکل کی فائل سے: عرش ملسیانی

فردوسی

(ایک ریڈیائی فیچر)

راوی: آج سے قریب قریب ایک ہزار سال پہلے ایران کے قدیم شہر طوس میں وہ نامور شاعر پیدا ہوا جس کی فکر کے شاعر دنیا میں بہت کم ملتے ہیں۔ ایران کی قدیم تاریخ کو نظم کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی کا یہ کارنامہ تاریخ عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ فارسی میں شاعری کے تین پیغمبر مانے گئے ہیں۔ قصیدے کے لئے انوری، غزل کے لئے سعدی اور بیت یا مثنوی کے لئے فردوسی۔ شاہنامے کے باب میں خود فردوسی نے فخریہ انداز میں کہا ہے:

فردوسی: میں نے تیس سال کی مدت میں بہت رنج اٹھائے ہیں لیکن میں نے فارسی شاعری سے ایران کو زندہ کردیا ہے۔

راوی: شاہنامے کی عظیم تصنیف کا آغاز ایک دلچسپ واقعے سے ہوا۔ ایک بھیانک رات تھی۔ خود اس کے لفظوں میں:

فردوسی: رات نے تاریکی میں اپنا منہ دھولیا تھا۔ آسمان پر نہ مریخ و عطارد تھے نہ زحل۔ نئے چاند نے انوکھی وضع کی آرائش پیش کی۔ ابتداء شب ہی سے رخصت کی تیاریاں کرلیں۔ اس کی کمر باریک تھی اور تاج سنہری لاجوردی ہوا میں گرد کے زنگار پھیل چکے تھے۔ تاریک رات نے جنگل اور صحرا پر سیاہ فرش بچھادیا تھا۔ وہم نے کالے ناگ کی طرح منہ کھولے ہوئے شیطان آنکھوں کے روبرو کھڑے کردئے۔ ہوا کی سنسناہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ زنگی کوئلوں کی گرد اُچھال رہا ہے۔ آفتاب بے دست وپا اور زمین سیاہ چادر میں منہ چھپائے سرگرم خواب تھی۔ دنیا کے دل پر ہراس غالب گھڑیالی وقت سے بے خبر۔ سنسانی اور ہو کا عالم۔ نہ پرندوں کی چیخ اور نہ درندوں کی للکار۔

راوی: ایسی اندھیری رات میں فردوسی تنہا باغ میں سو رہا تھا۔ کسی نامعلوم وجہ سے اسے نیند نہیں آرہی تھی۔

فردوسی: (جماہیاں لینے کی آواز) کمبخت نیند کہاں چلی گئی (گھبراہٹ سے اٹھتا ہے اور بیوی کو آواز دیتا ہے) جانِ من! ذرا ادھر تو آؤ۔ چراغ لاؤ۔

بیوی: (ملحقہ مکان سے آواز دیتی ہے) حاضر ہوتی ہوں (آتی ہے) یہ کیا ہوگیا تمہیں سوکیوں نہیں جاتے۔

فردوسی: نیند کہاں سے لاؤں۔ ذرا کوئی ساز ہی چھیڑو۔

بیوی: لیجئے۔

(ساز کی آواز............)

بیوی: اگر تمہاری خوشی ہو تو دفتر پاستان سے میں تم کو ایک ایسی داستان سناؤں جو رزم و بزم، فریب اور محبت کے واقعات سے بھری ہو۔ جس کے سننے سے تم کو آسمان کی نیرنگیوں پر حیرت ہوگی۔

فردوسی: ہاں ہاں وہ داستان میں ضرور سنوں گا۔

بیوی: لیکن ایک شرط ہے۔ تمہیں اس داستان کو نظم کرنا ہوگا۔

فردوسی: مجھے منظور ہے۔

راوی: یہ تھی وہ قصہ داستان جو اس رات فردوسی کی بیوی نے سنائی۔ [illegible] کے واقعات کچھ ایسے ہیں کہ جنس لطیف کی پسند کے [illegible] فردوسی کی بیوی نے کہانی شروع کی:

بیوی: نوجوان بیژن جنگلی سوروں کو ختم کرنے کے لئے گھر سے [illegible] رخصت ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ گرگین ایساد غاباز اور کینہ پرور [illegible] بیژن اس مہم میں کامیاب ہوکر سوروں کی ورانیاں جمع کرلیتا ہے تو گرگین [illegible] حسد کرتا ہے۔ وہ بیژن کی شہرت خاک میں ملانے کے لئے فریب کا جال [illegible] ہے اور ایک خوشنما مرغزار میں لے جاتا ہے جہاں تورانی لڑکیاں سیر و تفریح کے لئے آتی ہیں۔ افراسیاب کی بیٹی منیژہ بیژن پر فریفتہ ہوجاتی ہے اور اسے خیمے میں بلواتی ہے۔

فردوسی: یہ قصہ تو بہت دلچسپ ہے۔ اس سے پہلے کبھی مجھے سنایا ہوتا۔ تو کیا ہوا انجام ہوا منیژہ اور بیژن کی محبت کا۔

بیوی: منیژہ بیژن کو اپنے محل میں لے گئی۔ افراسیاب کو خبر ملی تو اس نے بیژن کو ایک کنوئیں میں قید کردیا اور منیژہ کی جائداد ضبط اور محل لٹادیا گیا جوگن کے لباس میں شاہی محل سے نکال دی گئی۔ وہ زبانِ حال سے کہہ رہی تھی۔

منیژہ: جوگن پھرے اداس پیا بن جوگن پھرے اداس / تن پر بھبھوت گلے میں مالا / انگ انگ یوون متوالا / لوگ کریں اُپہاس / پیا بن جوگن پھرے اداس / آنسو پی کر گاتی جائے / من کا بھید چھپاتی جائے / بجھے نہ من کی پیاس / پیا بن جوگن پھرے اُداس

بیوی: روٹی جو در در بھیک مانگ کر لاتی ہے اس سے اپنا اور قیدی کا پیٹ پالتی ہے۔ رستم سات پہلوانوں کو ساتھ لے کر تاجرانہ بھیس میں توران بغرض رہائی بیژن پہنچتا ہے۔ منیژہ رستم کو پہچان کر اس سے بیژن کی رہائی کی درخواست کرتی ہے۔ رستم اس خیال سے کہ راز فاش نہ ہوجائے اسے ڈانٹتا ہے۔ اس ڈانٹ کے جواب میں منیژہ رستم سے کہتی ہے:

منیژہ: کہوں تجھ سے اپنا میں کیا حالِ زار
کہ روتی ہے خوں چشم خونبابہ بار
سن اے فخر ایران و تاج کیاں
دکھائی نہیں تیرے شایانِ شاں

بیوی: رستم منیژہ کی نشاندہی کے بعد ایک شب اس کنوئیں سے بیژن کو نکال لیتا ہے۔ رستم افراسیاب کے محل میں داخل ہوتا ہے۔ افراسیاب اس کی آواز سن کر بھاگ جاتا ہے۔ رستم اور اس کے ساتھی پہلوان ایران کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں۔ افراسیاب لشکر لے کر آپہنچتا ہے۔ سخت معرکے کے بعد رستم فتحیاب ہوتا ہے اور منیژہ اور بیژن کو ساتھ لے کر ایران واپس آتا ہے۔

باقی [illegible]

ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی۔

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمٰن فاروقی
فون: 3386994

اسسٹنٹ ایڈیٹر
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر
محمد کاظم

جلد: ۶۰ شمارہ: ۶

جنوری ۲۰۰۲ء پوس-ماگھ شک ۱۹۲۳

سرورق: تنزیل ابرار

کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ سی آہوجہ

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ: سات روپے سالانہ: ۷۰ روپے

دو سال: ۱۳۵ روپے تین سال: ۱۹۰ روپے

امریکہ یورپ اور دوسرے ممالک کیلئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۰۰ روپے سالانہ

پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۵۰۰ روپے سالانہ

خریداری اور اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر، ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتہ پر بھیجیں

سرکولیشن منیجر 'آجکل' ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر کے پورم نئی دہلی۔۶۶

رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتوں کیلئے بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱

نیا سال مبارک

ترتیب

محبوب الرحمٰن فاروقی

ادب کا نوبل انعام

سر ودیا دھر سورج پرساد نائپال (۶۹) کو جب اس سال ادب کے لئے نوبل انعام دینے کا اعلان کیا گیا تو اس اعلان پر پوری دنیا میں ملے جلے تاثرات کا اظہار ہوا۔ ہندوستان نے انھیں پوری گرمجوشی کے ساتھ مبارکباد دی۔ صدر جمہوریہ آر کے نارائنن اور وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی نے مبارکباد دیتے ہوئے اپنے اپنے پیغامات میں خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ "نائپال کی تحریروں میں ہندوستانی اقدار کی گہری نشاندہی ملتی ہے۔" انہوں نے کہا کہ "ان کی ادبی سوچ سبھی حدود سے بالاتر ہے۔ وہ ساری انسانیت کے لئے ایک جیسے اعلیٰ وارفع خیالات رکھتے ہیں" جب کہ ان کے اپنے ملک برطانیہ میں سرکاری طور پر کسی بھی طرح کے تاثر کا اظہار نہیں کیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ جب ٹائمس لٹریری سپلمنٹ (TLS) لندن نے اس سلسلہ میں سرکاری تاثرات جاننے کی کوشش کی تو ہر طرف خاموشی برقرار رہی۔ ٹی ایل ایس کے اپنے الفاظ میں "جب ہم نے ڈاؤننگ اسٹریٹ پریس آفس (وزیر اعظم برطانیہ کی رہائش گاہ) کو فون کیا کہ شاید وزیر اعظم نے اس انعام پر اپنے کسی تاثر کا اظہار کیا ہو تو جواب ملا 'جہاں تک ہمیں معلوم ہے انہوں نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس کا اعلان کب کیا گیا؟'

"۱۱ر اکتوبر کو...... دنیا بھر میں میڈیا کے ذریعہ......"

"اچھا ایسا ہے......!"

پریس آفس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلہ میں مزید معلومات حاصل کر کے ہمیں فون کریں گے۔ لیکن کوئی فون نہیں آیا اس لئے ہم نے ثقافت میڈیا اور کھیل کود کے شعبہ سے رابطہ قائم کیا۔ ان سے جو گفت و شنید ہوئی وہ حسب ذیل ہے:

"ہم ٹائمس لٹریری سپلمنٹ سے بول رہے ہیں۔ ادب کے لئے برطانوی شہری وی ایس نائپال کو جو نوبل انعام ملا ہے، اس سلسلہ میں کچھ جاننا چاہتے ہیں۔"

وقفہ......

"آپ ہولڈ کریں......"

"کیا آپ بکر انعام کے بارے میں بات کر رہے ہیں......"

"نہیں۔ ہم ادب کے نوبل انعام کے سلسلہ میں......"

"ٹھیک ہے ہولڈ کریں......" (طویل وقفہ)

"عام طور پر ہم اس طرح کے کسی انعام پر کسی تاثر کا اظہار نہیں کرتے۔"

"یہ دنیا میں ادب کے لئے دیا جانے والا سب سے بڑا اور سب سے پروقار انعام ہے۔ ۱۸ سال میں پہلی بار کسی برطانوی شہری کو یہ انعام ملا ہے۔"



"میرا خیال ہے اس پر کسی وزیر نے کچھ کہا تھا......"

انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس بابت مزید معلومات حاصل کر کے ہمیں فون کریں گی۔ لیکن کوئی فون نہیں آیا۔

ٹی ایل ایس کے مطابق ایک سال قبل سر نائپال نے بلیئر انتظامیہ کی زبردست تنقید کی تھی کہ یہ قابل نفریں حکومت ثقافت و جمالیات سے بالکل بے بہرہ سوقیانہ خیالات کی حامل سرکار ہے اور اسے اپنے سوقیانہ پن پر فخر ہے۔ اس وقت حکومت نے اس تنقید پر کسی طرح کے تاثر کا اظہار نہیں کیا اور خاموشی اختیار کر لی۔ یہی خاموشی شاید اس انعام کے لئے سرکاری تاثر بھی ہے۔

(ٹی ایل ایس۔ ۱۹ر اکتوبر ۲۰۰۱ء، صفحہ ۱۷)

اپنی ناک کے ستائے اپنی ثقافتی جڑوں کے متلاشی تمام مذاہب عالم سے بے زار سر ودیا دھر کا یہی المیہ رہا ہے کہ چالیس سال قبل جب وہ ہندوستان آئے تھے تو انھیں

یہاں ہر طرف مفلسی، دھول، گندگی ہی نظر آئی تھی اور اس ملک میں انہیں دانش ورانہ روایت کی کوئی رمق بھی نہیں ملی تھی کیونکہ اس وقت تک ہندوستان میں ان کی لکھی کتابوں کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی تھی لیکن پچھلے دس سالوں سے جب ان کا نام نوبل انعام کے مستحق ادیبوں میں آنے لگا تو ہندوستان میں بھی ان کی کتابوں کے پڑھنے والے پیدا ہو گئے اور اس لئے جب وہ دوبارہ یہاں آئے تو انہیں اس ملک میں دانشمندانہ روایت کے پاسدار ہر طرف نظر آئے۔ وہ اسلام کے زبردست معترض ہیں۔ ان کا الزام ہے کہ اس مذہب کو قبول کرنے سے، قبول کرنے والا شخص اپنی ہزاروں سال کی ثقافت سے اپنا رشتہ یکسر منقطع کر لیتا ہے بلکہ اسلام سارے نقوش کو مٹا دیتا ہے۔ Among the Believers میں انہوں نے مصر پر خصوصاً یہ اعتراض کیا ہے کہ گرچہ وہاں فراعین کے اہراموں کو سیاحی کا وسیلہ بنا کر آمدنی کا ذریعہ تو بنالیا گیا ہے لیکن فراعین مصر کی ساری قدیم ثقافت کو یکسر مٹا دیا گیا ہے لیکن اس طرح کا چلن تو سارے مذاہب میں پایا جاتا ہے اس لئے وہ سارے ہی مذاہب سے بے زار نظر آتے ہیں۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب ای ایم فاسٹر کی مشہور زمانہ کتاب A passage to India کی اشاعت کو ۷۵ سال پورے ہو رہے تھے کہ نائپال کو نوبل انعام دیا گیا۔ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ یہ دونوں ایسے ادیب ہیں جن کی تحریروں میں ہندوستان کو خاص طور پر اہمیت دی گئی ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ اس انعام کے ملنے سے چند ہفتے پیشتر نائپال نے فاسٹر کا نام اپنی اس فہرست میں شامل کیا، جس میں وہ تمام لوگ، مذاہب، تہذیب و تمدن اور ممالک کے نام ہیں جن سے نائپال کو سخت نفرت ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک فاسٹر کو ہندوستان کی کوئی سمجھ نہیں تھی ان کے خیال میں فاسٹر ایک ایسا ہم جنس پرست تھا جو اپنی جنسی تسلی کے لئے ہندوستان بار بار آتا تھا۔

انہیں انعام ملنے پر رُکن اڈوانی نے ہندو میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بھی اتفاق ہی ہے کہ انہیں یہ انعام اس وقت دیا گیا جب سفید فام عیسائی دنیا کی نفرت، اسلام اور ان کی پوری نسل کے ماننے والوں سے شدید طور پر بڑھی ہوئی ہے۔ جو خود نائپال کے نظریوں سے مطابقت رکھتی ہے اور انہیں فاسٹر سے بھی اسی لئے نفرت ہے کہ انہوں نے عیسائیت کے مقابلے میں اسلام اور ہندوازم کو ترجیح دی ہے اور جنہوں نے فرد اور مذہب کے درمیان رابطہ قائم کرنے پر زور دیا تھا۔ لیکن انعام کا اعلان جس وقت کیا گیا اس سے اس بات کو زیادہ تقویت ملتی ہے کہ شاید اب یہ انعامات سیاسی نظریات کی وجہ سے ہی دیئے جا رہے ہیں۔ رکن اڈوانی کا یہ بھی خیال ہے کہ بہت سے ادیب تنازعات کو بڑھانے اور متنازعہ موضوعات پر لکھنے میں زیادہ دلچسپی اس لئے لیتے ہیں کہ اس سے ان کی کتابوں کی فروخت کافی بڑھ جاتی ہے۔ ایک انگریز مبصر پال تھیرو کس (Paul Therox) کا کہنا ہے کہ نائپال نے ہمیشہ اپنی کتاب کی اشاعت سے پہلے اپنی نفرت انگیز فہرست میں ناموں کا اضافہ کر کے ساری دنیا میں مشتہر کیا ہے تاکہ جب ان کی کوئی نئی کتاب آئے تو اس کی اشاعت میں سہولت ہو اور اس متنازعہ شخص کی شمولیت کی بنا پر کتاب کی پبلسٹی زیادہ ہو سکے۔ لیکن اس سب کے باوجود ابھی ان کا حال ہی میں شائع ناول Half a life کی پوری دنیا میں کوئی خاص پذیرائی نہیں ہو سکی بلکہ دنیا بھر کے مبصرین نے اس ناول کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔

ان کے انعام کے سلسلے میں جب ہر طرف سے یہ آواز اٹھنے لگی کہ انہیں یہ انعام اسلام مخالفت کے لئے ملا ہے تو ان کی شریک حیات پاکستانی نژاد نادرہ خانم علوی نے اپنے شوہر کا بچاؤ کرتے ہوئے کہا کہ انہیں ان باتوں سے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے شوہر پر شروع سے ہی اس طرح کے الزامات عائد کئے جاتے رہے ہیں اور ان سے انہیں سخت دکھ پہنچا ہے۔ ہم اس دکھ سے ابھی تک چھٹکارا نہیں پا سکے ہیں۔ جب سے میرے شوہر کی دو کتابیں Among the Believers اور Beyond Belief شائع ہوئی ہیں اس وقت سے ان پر اس طرح کے الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ چونکہ لوگوں کے اندر دانشورانہ ایمانداری کی کمی ہے کہ وہ اس آئینہ میں دیکھ کر یہ قبول کر سکیں کہ ان کے تجربات یکسر غلط ہو گئے ہیں اور جب وہ یہ سمجھ سکیں گے تبھی وہ جہالت کے اس اندھیرے سے نکل سکیں گے، جس میں وہ ہر وقت مبتلا ہیں۔

جب نائپال کی پہلی انگریز بیوی پیٹ کا انتقال ہوا جس سے ان کی ملاقات آکسفورڈ میں ہوئی تھی۔ سر ودیادھر نے نادرہ خانم علوی سے ۶۴ سال کی عمر میں شادی کر لی۔ نادرہ خانم علوی اس سے پہلے پاکستان کے ایک اخبار میں ہفتہ وار کالم لکھا کرتی تھیں، ان کی ملاقات پاکستان میں ہوئی تھی جہاں سر ودیادھر کسی کتاب کے سلسلے میں تحقیق کے لئے گئے تھے۔

سر ودیادھر سورج پرساد نائپال ۱۷ اگست ۱۹۳۲ء کو ترینداد میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد ہجرت کر کے وہاں گئے تھے۔ ان کے اجداد یوپی میں گورکھپور ضلع کے بھوجپوری بولنے والے علاقے کے رہنے والے تھے۔ اپنی ۴۵ سالہ ادبی زندگی میں وہ اب تک ۲۶ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ وہ صرف ناول نگار ہی نہیں ہیں انہوں نے ناولوں کے علاوہ بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ مجموعی طور پر ادیب ہیں اور ناول سے زیادہ مضامین اور سفر نامے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی تخلیقی اڑان لامحدود ہے۔ جب وہ ۱۸ سال کے تھے تو انہوں نے اپنا پہلا ناول The Shadow Living لکھا تھا جسے پبلشر نے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح Mignet street ان کا پہلا مطبوعہ ناول ہے۔ ۱۹۵۰ء میں انگلینڈ چلے گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ دوئم درجہ کی ایک قصباتی یونیورسٹی ہے۔ گریجویشن کے بعد وہ BBC کے لئے فری لانس جرنلزم کرنے لگے۔ انہیں ۱۹۷۱ء میں In a free state کے لئے بکر انعام ملا تھا اور ۱۹۹۰ء میں سر کا خطاب۔ ان کے اجداد کا تعلق ہندوستان سے تھا۔ وہ خود ترینداد میں پیدا ہوئے اور برطانیہ کے شہری ہو گئے۔ ان تینوں کے بارے میں ان کا خیال ہے ہندوستان گندہ ہے، ترینداد پڑھا لکھا نہیں ہے اور برطانیہ ثقافتی طور پر Bankrupt ہے۔

نائپال نے ہندوستان پر تین ناول لکھے ہیں An Area of Darkness, India: A Wounded Civilisation اور India: A Million Mutinies Now۔ ان میں اول الذکر دو ناولوں میں انہوں نے ہندوستان میں پائی جانے والی جہالت کے خلاف لکھا ہے۔ اور اپنی انہی تحریروں کی وجہ سے وہ ہندوستان

میں ایک طرح سے معتوب سے ہو چکے تھے۔ بعد میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے نائپال نے کہا کہ میرے جیسے لوگوں کے لئے مشکل یہ ہے کہ "اگر وہ ایسے سماج کے بارے میں لکھتے ہیں جہاں دانشمندی اور بالغ نظری نہیں پائی جاتی تو لوگ فوراً ناراض ہو جاتے ہیں۔" لیکن ان کو سب سے زیادہ شہرت ان کے اولین دور کی تخلیق A House for Mr. Biswas سے ہوئی۔ ناقدین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کے بعد سے انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اس پائے کی تخلیق نہیں ہو سکی۔ مزاح سے بھرپور اس کتاب میں ایک ایسے بغاوت پر آمادہ شخص کی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو ہر وقت اپنے خاندان کے مسائل سے جوجھتا رہتا ہے اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات میں ہجرت سے پیدا شدہ اجنبیت کا احساس ملتا ہے۔

دراصل نائپال کے تصورات سے زیادہ ان کی اس اعلیٰ نثر کی خوبی ہے جس کی بدولت وہ صف اول کے ادیب بن گئے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آج نائپال کے جیسا نثری اسلوب پورے انگلینڈ میں کسی ادیب کے ہاں نہیں ملتا۔ حالانکہ سویڈش اکادمی نے ان کے ناول The Enigma of Arrival کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے جو ایک طرح سے ان کی سوانحی زندگی پر مشتمل ہے۔ جب وہ اپنی جڑوں سے کٹ کر انگلینڈ میں آکر بسے تھے۔ سویڈش اکادمی نے موجودہ سیاسی تنازع سے اوپر اٹھ کر ان کا انتخاب کیا ہے اور اس سلسلے میں اکادمی کے سکریٹری ہوریس اینگدل نے کہا "ادب پوری دنیا کی میراث ہے اور یقیناً یہ نفرت یا تشدد پر مبنی نہیں ہوتا۔ بلکہ لوگوں اور ثقافتوں کے درمیان آپسی سمجھ بوجھ کا راستہ بناتا ہے۔" جب کہ اسی اکادمی کے ایک دوسرے ممبر Pet Westburg نے کہا کہ "اگر آپ ان کی ساری تخلیقات کو سامنے رکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ سبھی مذاہب کے خلاف سخت ناقدانہ رویہ رکھتے ہیں۔ وہ مذہب کو ایک ایسی خطرناک بیماری سمجھتے ہیں جو ہمارے خوابوں، ہماری فکر اور جوکھم اٹھانے کی خواہش کو ختم کر دیتا ہے۔

ان کو اس انعام ملنے پر مشہور مستشرق اور کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ سعید نے انہیں مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ مغرب میں نائپال کو ایک ایسا ماسٹر، کرافٹ مین اور ناولسٹ سمجھا جاتا ہے جو خود بھی تیسری دنیا کے ٹوٹنے اور بکھرنے اور Hypocrisy کا اہم مشاہدہ کرنے والا رہا ہے۔ اسے اس دنیا سے نفرت ہے جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی اپنی جائے پیدائش کے دوسرے ہم عصر نوبل انعام یافتہ ادیب و شاعر ڈیرک وال کاٹ نے ان کی زبردست تنقید کرتے ہوئے کہا کہ 'یہ انعام ان کی انگریزی نثر کی وجہ سے ہی ملا ہے۔

"ہندوستان میں انگریزی کے مشہور شاعر Nissim Ezzekiel نے 'نائپال کا اور میرا ہندوستان' کے عنوان سے لکھے گئے ایک مضمون میں کہا ہے کہ نائپال کو خوش اور مطمئن کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ اسلام سے خوش نہیں ہوئے۔ ہندوستان کی شہری زندگی انہیں پسند نہیں۔ یہاں کی دیہی زندگی سے انہیں نفرت ہے۔ وہ جدھر بھی دیکھتے ہیں انہیں غریب ہندوستانی ہر طرف رفع حاجت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نائپال کا اس پر یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہی ان کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ کوئی دوسرا ان کا کوئی اثر نہیں لیتا۔"

نائپال نے مختلف موضوعات پر اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی ایک مختصر سی فہرست آؤٹ لک نے ۲۲ر اکتوبر ۲۰۰۱ء کے شمارے میں شائع کی ہے۔ ان کے ان خیالات کو مختلف عنوانوں کے تحت دیا جا رہا ہے۔

ہندوستان اور ہندوستانی:

۱- بیشتر ہندوستانیوں میں ایمانداری نہیں پائی جاتی۔ (۱۹۷۹ء)

۲- میں ہندوستانیوں کے لئے نہیں لکھتا جو میری کتاب بھی نہیں پڑھتے۔ میرا کام صرف آزاد خیال، مہذب، مغربی ملک میں ہی ممکن ہے۔ (۱۹۷۹ء)

۳- ہندوستانیوں کے ساتھ جو بات ہے، وہی ہندوستانی تصانیف کے ساتھ بھی ہے کہ یہ بغیر کسی تاریخ کے صرف خلا میں تحریر کی جاتی ہے۔ (۲۰۰۱ء)

۴- تاج محل بے کار سی چیز ہے، تنزلی کی نشانی..... اتنی عالم کہ وہاں زیادہ دیر تک نہیں رکا جا سکتا۔ (۱۹۹۹)

۵- بندیا کا مطلب ہے کہ میرا سر خالی ہے (ہندو عورتوں کے بندیا لگانے پر) (۱۹۷۹ء)

پاکستان پر:

پاکستان کا خواب یہ ہے کہ ایک دن مسلمانوں میں نئی بیداری پیدا ہوگی اور وہ دوتی کی مسجدوں میں نماز ادا کریں گے۔ (۲۰۰۱ء)

برطانیہ پر:

برطانیہ دوئم درجے کے لوگوں کا ملک ہے۔ (۱۹۸۳ء)

اسلام پر:

اسلام سخت اصولوں کا مذہب ہے۔ یہ بات جدید ہندوستان سے متضاد ہے۔ (۱۹۹۹ء)

ناول پر:

ناول ایک دوغلی صنف ہے۔ یہ تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے۔ ہر شخص ایک ناول لکھ رہا ہے۔ لاشعوری طور پر اور بے جانے بوجھے۔ یہ ان سبھی ناولوں کی نقل ہے جو اس سے پہلے لکھے جا چکے ہیں۔ (۲۰۰۱ء)

اپنے بارے میں:

۱- مجھے اپنا چہرہ پسند نہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ عیاش آدمی کا چہرہ ہے۔

۲- میں طوائفوں کا عادی ہوں ان سے جنسی تسکین ملتی ہے۔ مجھے سب سے زیادہ ناپسند چیز جنسی عریانیت ہے۔

دوسروں کے بارے میں:

جین آسٹن کے ناول مجھے سخت بور کرتے ہیں یہ صرف گپ شپ ہے۔ جیمس جوائس میں میرے لئے کیا ہے۔ وہ مختصر سا آدمی، جس کا تخیل بہت محدود تھا۔ کچھ اسی طرح کی تنقید انہوں نے آر کے نرائن پر بھی کی ہے۔

جب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا، انہیں یہ انعام ۱۰ر دسمبر کو اسٹاک ہوم، سویڈن میں دوسرے انعام یافتگان کے ساتھ دیا جا چکا ہوگا۔

☆☆☆

نوبل انعامات:
تنازعات اور صد سالہ جشن

یوں تو دنیا بھر میں علم وادب کے مختلف شعبوں کے لئے مختلف قسم کے انعامات دئے جاتے رہے ہیں، لیکن سائنس اور ادب کے لئے دئے جانے والے نوبل انعامات کی بات ہی کچھ اور ہے۔ پوری دنیا میں کوئی بھی انعام آج تک اس کا ہم پلہ نہیں ہو سکا ہے۔ نہ تو مجموعی رقم کے حساب سے اور نہ مجموعی وقار کے حساب سے۔ یہ وہ انعامات ہیں جن کے اعلان ہونے پر ہی انعام پانے والا شخص ایک Celeberity کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ سویڈن کے سکے کے حساب سے اس سال دئے جانے والے دس ملین کرونر انعام کی ایک ہی خاصیت ہے کیونکہ اس سال نوبل صد سالہ تقریبات منائی جارہی ہے۔ الفریڈ نوبل جس کی ڈائنامائٹ کی ایجاد کی بدولت امریکہ اور مغربی ممالک ایک ترقی یافتہ سپر پاور کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ گرچہ الفریڈ نوبل نے ڈائنامائٹ کے علاوہ دیگر اور چیزیں بھی ایجاد کیں اور ۳۵۵ ایجادات ان کے نام سے پوری دنیا میں پیٹنٹ بھی ہوئے۔ لیکن موت کا سوداگر کہے جانے کی وجہ سے وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ اپنی یادگار کے طور پر انہوں نے اپنی کل پونجی بینک میں جمع کرا کر انعامات کا وہ سلسلہ شروع کیا کہ اب لوگ انہیں مختلف ناموں سے یاد کرنے لگے ہیں۔ موت کا سوداگر کا ان کا لقب اب یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔

الفریڈ نوبل کی موت ۱۸۹۶ء میں ہوئی تھی لیکن ان کی وصیت پر عمل درآمد کا سلسلہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء یعنی موت سے پانچ سال بعد شروع ہوا۔

نوبل فاؤنڈیشن نے ان انعامات کی صد سالہ تقریبات کا آغاز پچھلے سال سے ہی شروع کر دیا تھا۔ لیکن ان کا اختتام اس سال ۱۰ دسمبر کو انعامات کی تقسیم کے ساتھ ہوگا۔ اس موقع پر پورے سال یورپ کے مختلف ممالک اور شہروں میں سیمناروں اور نمائشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سال تقریبات کے خاتمہ کے موقع سے ایک ہفتہ کا یادگاری پروگرام منایا جارہا ہے۔ اس موقع پر اس وقت دنیا میں مختلف شعبوں میں ان انعامات کے حاصل کرنے والے تمام انعام یافتگان کو خصوصی طور پر مدعو کیا گیا ہے اور ان لوگوں کا مشترکہ جلسہ بھی ہوگا۔

جہاں تک ان انعامات کے وقار کا سوال ہے تو طبیعیات میں انعام پانے والے Murrey Gellmann کا کہنا ہے "یہ انعامات حاصل کرنے والوں کو نہ صرف سائنس کی دنیا میں مرتبہ بلند کرتے ہیں بلکہ سائنسدانوں کے Elite طبقہ میں اسی لمحے سے اس کا شمار بھی ہونے لگتا ہے۔ اور اعلان کے ساتھ ہی اس کے مرتبت اور وقار میں جو اضافہ ہوتا ہے اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک ہی لمحے میں وہ شخص سپر اسٹار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن یہ انعامات جہاں اس کے مرتبہ میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں وہیں اس کی پریشانیاں بھی اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ مزید جستجو اور تحقیق کا اسے موقع بھی کم مل پاتا ہے۔" ۱۹۶۲ء میں دو دیگر آدمیوں کے ساتھ میڈیسن کے شعبہ میں انعام پانے والے فرانسس کرک نے فوراً ہی نامنظوری کا ایک کارڈ چھپوالیا جس میں مندرجہ ذیل تحریر نظم کی صورت میں شائع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر کرک آپ کے خط کے لئے شکریہ ادا کرتے ہیں لیکن معذرت خواہ ہیں کہ وہ آپ کی اس درخواست کو پوری نہیں کر سکیں گے

ہم آپ کو وہ آٹوگراف نہیں بھیج سکتے
آپ کی بیماری کا علاج نہیں کر سکتے
ریڈیو پر ناٹک نہیں لکھ سکتے
ڈنر کے بعد کوئی تقریر نہیں کر سکتے
آپ کے منصوبے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتے
مجمع سے خطاب نہیں کر سکتے
تقریب کی صدارت نہیں کر سکتے
کتاب نہیں لکھ سکتے
آپ کو فوٹو نہیں بھیج سکتے
انٹرویو نہیں دے سکتے۔
ٹی وی پر نہیں آسکتے
سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتے
آپ کا مسودہ نہیں پڑھ سکتے
کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکتے
اعزازی ڈگری قبول نہیں کر سکتے

ڈاکٹر کرک کو یہ محض اس لئے شائع کرانا پڑا کہ انعامات کے بعد انہیں جو اسٹار کی حیثیت ملی تھی، اس کی پریشانیوں سے نجات حاصل کر سکیں اور اپنے کام میں لگے رہ سکیں۔

حالانکہ اس وقار کے حاصل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ عوام نے آپ کی اس کامیابی کو مکمل طور پر سمجھ لیا ہے۔ یہی وہ بات ہے جس سے ایک نوبل انعام یافتہ ہالی وڈ کے ہیرو سے ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔

امریکہ اور یورپ کے ممالک میں وقت کا جو فرق ہے اس کی وجہ سے امریکہ میں انعام حاصل کرنے والے لوگوں کو ہمیشہ اس کی اطلاع علی الصبح چار بجے ہوتی ہے۔ جب ۱۹۹۵ء میں رچرڈ فے مین کو طبعیات کے لئے یہ انعام دیا گیا تو BBC کے نامہ نگار نے ٹھیک چار بجے جب وہ گہری نیند میں سو رہے تھے انہیں اٹھا دیا۔ خبر سن کر وہ ہکا بکا رہ گئے۔ وہ سمجھ نہیں پائے کہ کیا کہیں۔ ٹیلی فون کا ریسیور آف کر کے وہ روپوش ہو گئے بہت سے نامہ نگاروں نے انہیں تنگ کرنا شروع کیا کہ آپ کو یہ انعام کیوں اور کس لئے ملا ہے؟ آپ کے تاثرات کیا ہیں؟ انہوں نے ایک ترکیب سوچی اور انہیں جواب بھی سوجھ گیا۔ وہ ہر نامہ نگار کو ایک ہی جواب دیتے۔ سنئے مسٹر اگر میں آپ کو ایک منٹ میں اس کی تفصیل بتا سکتا تو پھر میرا یہ کارنامہ کسی انعام کا مستحق نہ ہوتا۔

الفریڈ نوبل اگر زندہ رہتا تو اس جواب سے یقیناً اسے خوشی ہوتی۔ کیونکہ اس نے تحقیق کے بہت اعلیٰ مدارج کو مد نظر رکھ کر ان انعامات کے سلسلہ میں اپنی جمع پونجی وقف کی تھی۔ انعام پانے والوں کو ۲۳ قیراط کا سونے کا جو میڈل دیا جاتا ہے اس میں ایک طرف تو الفریڈ نوبل کی تصویر ہوتی ہے اور پشت پر فطرت کی دیوی کی تصویر جس میں وہ علم کا مشعل لئے ہوتی ہے اور اس میں نیچے لاطینی میں ورجل کا ایک مشہور مصرعہ کندہ ہوتا ہے، جس کا مطلب ہے "ایجادات سے زندگی میں اضافہ ہوتا ہے اور اسے فن کے ذریعہ خوبصورت بنایا جاتا ہے۔"

الفریڈ نوبل کے اس خواب کی تکمیل پچھلے سو سالوں سے ہوتی رہی ہے لیکن اس نئی صدی میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ کیا اس صدی میں بھی اس کا وہی وقار برقرار رہے گا۔ دانشوروں میں آج کل یہ موضوع بحث ہے۔ کیونکہ نوبل کے وصیت نامے میں اب تھوڑی سی تبدیلی کر دی گئی ہے۔ ۱۹۶۸ء تک آئینی طور پر ایک انعام مشترکہ طور پر کئی آدمی حاصل کر سکتے تھے لیکن عملاً کبھی ایسا نہیں ہوا۔ وصیت نامہ کے پیرا چار میں لکھا ہوا ہے کہ ایک انعام اگر بہت ہی اہم قسم کا کوئی کام ہو تو دو یا دو سے زیادہ لوگوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ۱۹۶۸ء میں اس پیرا کے الفاظ میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی گئی ہے اور اب اسے اس طرح کر دیا گیا ہے۔

"کسی بھی حالت میں کوئی انعام تین آدمیوں سے زیادہ میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔" کیا یہ تبدیلی انسان کی اختراعی قوت کا ساتھ دے سکتی ہے۔ کیونکہ پچھلے سو سالوں میں خود سائنس کے میدان میں زبردست تبدیلی ہوئی ہے۔ اب سائنسی کارنامہ کسی شخص واحد کا کارنامہ نہیں رہ گیا ہے۔ اب کوئی بھی تحقیق، ایجاد یا کارنامہ مختلف لوگ، مختلف مقامات پر مختلف تنظیموں کے ذریعے ہی وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اب یہ کامیابی حاصل کرنے والے صرف تین شخص نہیں رہ گئے ہیں جب کوڈ کی انکشاف کیا گیا تو بھی اس کی سب سے اہم کڑی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ... اس کڑی کے بارے میں ۱۹۹۵ء میں ہی تحقیق مکمل ہو سکی اور اس وقت تقریباً ایک ہزار سے زیادہ محققین نے فزکس کے رسالے میں اپنی تحقیقات کے بارے میں مضمون شائع کرائے۔ نتیجتاً ان میں سے کسی کو بھی نوبل انعام حاصل نہیں ہو سکا ... اس بات کا بھی ہے کہ اس سال دنیا کے سولہ تجربہ گاہوں اور ایک ہی تجربہ گاہ ... کے سلسلہ میں جو تحقیق کی گئی، حالانکہ یہ بہت اہم انکشاف ہے لیکن اس میں بھی ہزاروں سائنس دانوں نے مل کر کوئی نتیجہ اخذ کیا تھا۔ امید نہیں کہ اس صدی کے سب سے بڑے انکشاف کے لئے کسی کو بھی یہ انعام مل سکے گا۔

نوبل انعامات کے سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ادبی انعامات کے ساتھ ساتھ سائنس کے سلسلے میں دیئے جانے والے انعامات بھی تنازعات سے خالی نہیں رہے ہیں۔ اکثر تو یہ ہوا ہے کہ سائنس کے شعبے میں کیے گئے کسی انکشاف کو ۵۰ سال بعد اس انعام سے نوازا گیا اور یہ بھی ہوا ہے کہ سائنس داں نے آج یہ انکشاف کیا اور جب اس کی وقعت کو سمجھا گیا اور انعام دینے کا وقت آیا تو سائنس داں کی موت ہو چکی تھی۔ خود ہندوستان میں سر ایس این بوس، جے سی بوس اور میگھا ناتھ ساہا جیسے سائنسدانوں کے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔

سائنس کے شعبے میں ان انعامات کے سلسلے میں تنازعات کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ اس کی وضاحت کے سلسلے میں پچھلے ایک سال سے نوبل فاؤنڈیشن کے تحت آکسیجن کی دریافت کو لے کر ایک ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔

کسی سائنسداں کو کوئی نیا انکشاف کرنے کے لئے کس چیز سے تحریک ملتی ہے؟ شاید اس میں سب سے اہم متحرک کرنے والا یہ جذبہ شامل ہوتا ہے کہ مقابلے کی اس دنیا میں میں بھی اوروں سے پہلے کسی چیز کا انکشاف کروں۔ اس جذبے کا اخلاقی جواز اس خاص ڈرامے کا موضوع ہے جو آکسیجن کے نام سے ان دنوں پوری دنیا میں کھیلا جا رہا ہے۔ یہ ڈراما ایک اہم عنصر سے تعلق رکھتا ہے جس کے ذریعہ سبھی اہم کیمیائی اور سیاسی انقلابات اور نوبل انعامات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

یہ ڈرامہ ۱۷۷۷ء سے لے کر ۲۰۰۱ء تک کے طویل مدت پر محیط ہے اور اس میں تین مردانہ اور تین زنانہ کردار مرکزی رول ادا کرتے ہیں۔ یہ کردار ڈرامے کے گیارہ کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ساری دنیا میں دکھایا جانے والا یہ ڈرامہ سب سے پہلے سین ڈیاگو میں ۲۰۰۱ء میں دکھایا گیا۔ جرمنی میں ۲۰۰۲ء میں کھیلے جانے کا ارادہ ہے۔ اسے کارل ریسی اور رولڈ ہاف مین نے مشترکہ طور پر لکھا ہے۔ کارل ریسی جو ان گولیوں کا موجد ہے جو برتھ کنٹرول میں کام آتی ہے اور ہاف مین کو ۱۹۸۲ء میں کیمسٹری کے لئے نوبل انعام دیا گیا تھا۔ یہ شاعری بھی کرتے ہیں اور نظم لکھنے میں ان کی دلچسپی ہے۔

کسی چیز کی ایجاد کے کیا معنی ہیں؟ اور اس ایجاد کا اولین سہرا کیوں اتنا اہم مانا جاتا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جو اس ڈرامے میں لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔ آکسیجن کی

ساتذہ پیش کرتا ہے تو کبھی ۱۰۰ سالہ جو نوبل انعامات کے صدی سال کے طور پر منایا جا رہا ہے اسی سال نوبل فاؤنڈیشن نے ایک نیا انعام ریٹرو نوبل انعام (Retro Noble Award) دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو ان اہم انکشافات و ایجادات کے لئے دیئے جائیں گے جو نوبل انعام شروع ہونے سے سو سال پہلے کئے گئے تھے۔ فاؤنڈیشن کا خیال ہے کہ ایسا کرنا اس کے لئے آسان ہوگا کیونکہ وہ اس طرح سے اس عہد کی دریافت کرے گا جب سائنسی کارنامے صرف اپنی تسکین کے لئے انجام دیے جاتے تھے اور جب ان میں کسی قسم کا تنازعہ یا اولیت کو لے کر کوئی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔

رائل سویڈش نوبل اکیڈمی آف سائنس کی کیمسٹری کمیٹی نے اس بار آکسیجن کے انکشاف کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے کیونکہ اس اہم انکشاف کے بعد ہی دنیا میں ہر طرح کے کیمیائی انقلابات آسکے ہیں لیکن اس کے لئے کسے موجد سمجھا جائے؟ فطری طور پر اس سلسلے میں انتونی بودو شیئر کا نام آتا ہے کیونکہ وہی پہلا شخص تھا جس نے سب سے پہلے انکشاف کیا کہ انجن زنگ لگنے اور جانوروں کے سانس لینے میں سانس کے ذریعہ لی جانے والی اور نکالی جانے والی ہوا یا آکسیجن ہی سب سے اہم رول ادا کرتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شیلے اور پریسٹلے کو کیا کیا جائے؟ کیا انہوں نے بھی آکسیجن کی دریافت نہیں کی تھی؟

یہ غالباً اکتوبر- نومبر ۱۷۷۴ء کی ایک شام تھی جب بودو شیئر نے جو موجودہ عہد میں کیمیائی انقلاب کا بانی ہے، سنا کہ ایک انگریز منسٹر جوزف پریسٹلے نے ایک نئی گیس کی دریافت کی ہے۔ اس کے ایک ہفتہ بعد ہی اسے سوئڈن کے شیلے کا ایک خط موصول ہوتا ہے جس میں اس فرانسیسی سائنسداں کو بتایا گیا تھا کہ کس طرح سے آکسیجن میں اور چیزیں شامل کر کے اسے بہت اہم بات بنائی جا سکتی ہے۔ کیونکہ شیلے نے اپنا کارنامہ کئی سال پہلے انجام دیا تھا۔ لیکن ۱۷۷۷ء سے قبل اس کی اشاعت نہیں ہوئی تھی۔

دراصل شیلے اور پریسٹلے دونوں نے اپنا کام ایک مختلف نظریے مایۂ احتراق کے تحت انجام دیا تھا جسے بعد میں بودو شیئر نے متروک قرار دیا تھا۔ اب بودو شیئر، پریسٹلے اور شیلے کے انکشافات کے ساتھ کیا کرتا ہے؟ کیا وہ ان دونوں کو اسے دریافت کرنے کا کریڈٹ دیتا ہے؟ اور پھر ان کے انکشافات کو وہ کس طرح استعمال کرے گا؟ جس چیز کو آپ نے انکشاف کیا ہے اگر اس کے بارے میں آپ خود کچھ نہ سمجھ سکیں تو کیا کریں گے اور اگر سمجھ گئے ہیں تو دنیا کو اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔

تخلیقی سطح پر ڈرامے میں یہ تینوں مردانہ کردار اپنی بیویوں کے ساتھ ۱۷۷۷ء میں شہنشاہ گستو و تھرڈ کی دعوت پر اسٹاک ہوم پہنچتے ہیں جہاں اس کے سامنے اس سوال کا فیصلہ کن جواب دیا جائے گا کہ ان میں سے کس نے صحیح معنوں میں آکسیجن کا انکشاف کیا تھا۔

ان کی بیویوں کی زبانی ہمیں ان کے سائنسداں شوہروں کی زندگی کے حالات کا علم ہوتا ہے اور میڈم بودو شیئر کے ایکٹرز بھی اس ڈرامے میں خاص کردار کا رول ادا کرتے ہیں۔ اسٹاک ہوم کے فیصلے کے مطابق وہ منظر پیش کیا جاتا ہے جس میں کیمیائی طور پر تجربہ کے ذریعہ سب کچھ دکھلایا جاتا ہے۔ آکسیجن کے یہ تینوں موجد اپنے اپنے تجربوں کو دوبارہ کرتے ہیں۔ ڈرامے میں ایک نظم بھی پڑھی جاتی ہے جو بودو شیئر کے دوستوں نے آکسیجن کی دریافت کے عنوان سے اس کے سامنے پڑھا تھا لیکن جس کا وجود نہیں ملتا۔

اس دوران اکیسویں صدی کی ابتدا میں نوبل کمیٹی ان تینوں کے بارے میں پورے طور پر جانچ پڑتال کرتی ہے۔ اس سلسلے میں جو بحث ہوتی ہے اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی دو صدیوں میں سائنس کے میدان میں کیا کیا اور کتنی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ اس کمیٹی کا منصف سویڈن کا سب سے بڑا نظریاتی سائنسداں بنتا ہے جب کہ ایک نوجوان مورخ ان ساری باتوں کی تفصیل جیوری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا کردار بھی بدلتا رہتا ہے۔

اس ڈرامے کا جو اخلاقی جواز ہے کہ کسے اس دریافت کا سہرا باندھا جائے، وہ آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ۱۷۷۷ء میں ہوا تھا۔ بودو شیئر سیاسی طور پر پرانے عقائد کا حامل تھا جسے جیکوبین عہد میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا تھا جب کہ پریسٹلے سیاسی طور پر انقلابی نظریات کا حامی تھا اور فرانسیسی انقلاب کی حمایت کرنے پر اسے انگلینڈ سے نکال دیا گیا تھا جب کہ شیلے صرف کیمیا کی دکان چلانا چاہتا تھا اور اپنے خالی وقت میں کیمیائی تجربے کرنا چاہتا تھا۔ کافی عرصہ تک اس شخص کو جس نے دنیا میں آکسیجن کی دریافت سب سے پہلے کی تھی، نظر انداز کیا جاتا رہا۔ کیا اب ایجاد کے دو سو تیس سال کے بعد حالات بدل جائیں گے۔

(ٹیلی گراف کے سائنسی ضمیمہ Know How کے شکریے کے ساتھ)

ترجمہ و تلخیص: ابرار رحمانی اور محمد کاظم

☆☆☆

معاشیات:

معاشیات کے لئے پچھلے دس سالوں سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ جو میڈل اور انعام دیا جا رہا ہے اس کے بارے میں خود اب ماہرین معاشیات کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ دنیا میں اس وقت جتنے بھی مشہور اور ممتاز ماہرین معاشیات اور نظریہ ساز رہے ہیں انہیں یہ انعامات دیے جا چکے ہیں اور اب آئندہ سال سے اس سلسلہ میں کوئی انعام دیا گیا تو وہ کمتر درجے کے ماہرین معاشیات ہوں گے۔ امسال معاشیات کے لئے امریکہ کے تین ماہرین جارج ایکسر لاف، مائیکل اسپنسر اور جوزف اسٹیک لیٹز کو انعام دیا جائے گا۔ ان تینوں کو یہ انعام اطلاعاتی معاشیات کے لئے دیا گیا ہے۔

امن:

امن کے شعبہ میں دیے جانے والے انعامات بھی کبھی تنازعہ سے خالی نہیں رہے ہیں۔ بلکہ اس سال جو انعام دیا گیا ہے۔ ان کے بارے میں بھی مبصرین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ امسال یہ انعام اقوام متحدہ اور اس کے سکریٹری جنرل کوفی عنان کو مشترکہ طور پر دیا گیا ہے۔

☆☆☆

اظہار اثر

نوبل انعام یافتہ سائنسداں

کیمسٹری:

۲۰۰۱ء میں کیمسٹری کا نوبل انعام تین سائنسدانوں کو ملا ہے۔ مسٹر ولیم۔ ایس۔ نولس (امریکہ، عمر ۸۴ سال) اور مسٹر ریوجی ناپوری (جاپان، عمر ۶۳ سال) کو اس سال کے انعام کی آدھی رقم ملے گی اور آدھی رقم کیلیفورنیا کے سائنس داں مسٹر کے بیری شارپ لیس (عمر ۶۰ سال) کو ملے گی۔ تازہ تحقیق سے ان سائنسدانوں نے ثابت کیا ہے کہ انسانی جسم میں کچھ سالمے "جوڑیا" ہوتے ہیں یعنی ان میں سے ہر سالمے کا ایک جوڑیا ہوتا ہے جو اصل سالمے کے برعکس ہوتا ہے جیسے شیشے میں ہر چیز کا عکس الٹا ہو جاتا ہے۔ اس تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا کہ اصل سالمہ خرابیوں کو روکتا ہے اور اس کا جوڑیا سالمہ خرابیوں کا سبب بنتا ہے۔ ان سائنس دانوں نے ۱۹۶۰ء سے تجربات شروع کئے تھے مثال کے طور پر انہوں نے "تھالی ڈومائڈ" (Thali Domide) نام کی ایک دوا تیار کر کے ایک حاملہ عورت کو کھلائی۔ اس دوا نے مریضہ میں متلی ہونے کی روک تھام کی اور جب اس دوا کو برعکس سالموں سے تیار کر کے کھلایا گیا تو اس نے ماں کے پیٹ میں "جنین" کو نقصان پہنچایا۔

اس تحقیق کا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ خطرناک امراض کی دوائیں اصل سالموں والے خلیوں سے بنائی جائیں گی جو مرض کو ختم کرنے میں زیادہ بہتر ثابت ہوں گی۔ یہی تکنیک خوشبوؤں اور میٹھا کرنے والی اشیا میں بھی استعمال کی جاسکے گی اور یہ دریافت کیمسٹری کے ساتھ "بایولوجی" کی تحقیق میں بھی مددگار ثابت ہوگی۔

فزکس:

امسال فزکس کا نوبل انعام دو امریکن اور ایک جرمن سائنسداں کو ملا ہے جن میں مسٹر ایرک کارنل اور کارل وائی مین امریکہ کے ہیں۔ جرمن سائنسداں کا نام مسٹر وولف گینگ کیٹرل ہے۔ ان سائنسدانوں نے بوس اور آئن اسٹائن کی مشترکہ تھیوری پر تحقیق کی ہے۔ تھیوری یہ ہے کہ کسی عنصر یا عناصر کے مرکب کو کثیف (condese) کرنے پر اس کی بنیادی خصوصیات پر کیا فرق پڑتا ہے۔ Dilute یعنی ہلکی کی ہوئی گیسوں میں "الکلی" کے ایٹموں پر کیا اثر ہوتا ہے۔

میڈیسن:

میڈیسن میں بھی اس سال کا نوبل انعام تین سائنسدانوں کو ملا ہے جن میں سے سائنسداں مسٹر لے لینڈ ہارٹ ول امریکہ کے باشندے ہیں اور ڈاکٹر تموتھی ہنٹ اور سرپال نرس برطانیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سائنسدانوں کی تحقیق کی مدد سے مستقبل میں ہر طرح کے کینسر کا علاج ممکن ہو سکے گا۔ کینسر کا مرض دراصل خراب خلیے پیدا ہونے سے ہوتا ہے۔ ان سائنسدانوں نے خلیوں کے شق ہو کر ایک سے دو بننے کے عمل کا گہرا مطالعہ کر کے بہت سے نتائج نکالے ہیں۔ اگر ایک خلیہ کے شق ہونے میں بھی کچھ خرابی ہو جائے تو نیا خلیہ اصل خلیے سے مختلف ہوگا اور یہی خراب خلیہ کینسر کا مرض بن جائے گا۔ دراصل ہر قسم کی حیات کی بنیادی اکائی (یونٹ) ایک خلیہ ہوتی ہے۔ ایک انسانی جسم میں کھربوں خلیے ہوتے ہیں۔ زندہ انسان کے جسم میں ہر لمحہ ہزاروں خلیے مرتے رہتے ہیں اور نئے خلیے بنتے رہتے ہیں۔ ایک خلیہ اپنی زندگی میں تقریباً ۳۵ بار نیا خلیہ بناتا ہے۔ یہاں خلیہ بنانے سے مراد یہ ہے کہ ہر خلیہ ایک مخصوص عرصہ کے بعد اپنا سائز بڑھانا شروع کر دیتا ہے اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اندر ۴۶ کروموسومز کی نقل یعنی ہر کروموسوم کی جوڑی بناتا رہتا ہے۔ جب کروموسومز کا یہ دوسرا "سیٹ" تیار ہو جاتا ہے تو وہ خلیہ درمیان سے شق ہو کر ایک سے دو بن جاتا ہے۔ کروموسومز کا دوسرا تیار شدہ سیٹ نئے خلیے میں منتقل ہو جاتا ہے اس طرح ایک خلیہ تقسیم ہو کر دو بن جاتا ہے اس پورے عمل کو خلیہ کے تقسیم ہونے کا سائیکل کہا جاتا ہے۔ نیا خلیہ بھی وجود میں آتے ہی یہی عمل شروع کرتا ہے اور ایک خاص تعداد میں خلیے بنا کر مر جاتا ہے۔ اسی لئے انسان کے جسم میں ہر وقت ہزاروں لاکھوں خلیے مرتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیے بنتے رہتے ہیں۔ یہ عمل انسان میں زندگی بھر جاری رہتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ خلیوں کے مرنے کی تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے اور نئے خلیے بننے کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ بڑھاپا آنے کی سب سے اہم وجہ یہی ہوتی ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کے جسم کا ہر خلیہ ایک سے دو ہونے کے "سائیکل" سے گزرتا رہتا ہے لیکن دماغ کا خلیہ جنہیں نیورونز کہا جاتا ہے وہ اس عمل سے نہیں گزرتے۔ ایک نیورون مر جائے تو اس کی جگہ نیا نیورون پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ نیورون بڑا پیچیدہ خلیہ ہوتا ہے اور جسم کے عام خلیوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

اگرچہ خلیے کے اس عمل سے سائنسداں بہت عرصہ سے واقف ہیں لیکن

گزشتہ چند برسوں میں سائنسدانوں کو اس راز کا پتہ چلا کہ خلیوں کے شق ہونے کے اس سائیکل کو ایک خاص سالمہ کنٹرول کرتا ہے جسے سیکلن کیناز کمپلیکس کہا جاتا ہے۔ خلیوں کی تقسیم کے اس طریقہ کار کو سمجھ کر مستقبل میں کینسر کی ابتدا سے روک تھام ممکن ہو سکے گی اور کینسر کی بہتر دوائیں بنائی جا سکیں گی۔ یہ تحقیق کینسر کے علاوہ دوسرے امراض میں بھی مددگار ثابت ہوگی۔

یہاں ہم ان انعام یافتگان کی مکمل فہرست دے رہے ہیں جنہیں پچھلے سو سالوں میں فزکس، کیمسٹری اور میڈیسن کے لئے انعام دئے گئے ہیں۔

فزکس (طبعیات)

1901- WILHELM CONRAD RONTGEN

شعاعیں یا ایکسریز دریافت کیں۔

1902 - 1-HENDRIK ANTOON LORENTZ

2- PIETER ZEEMAN

شعاع تابی کے مظہر پر مقناطیسیت کا اثر دریافت کیا۔

1903- 1-ANTOINE HENRI BECQUEREL

2-PIERRE CURIE

3- MARIE CURIE

۱۔ فوری طور پر ہونے والی ریڈیو ایکٹیویٹی دریافت کی۔

۲ اور ۳۔ ریڈیو ایکٹیویٹی کے قدرتی مظہر پر مل کر تحقیق کی۔

1904- LORD JOHN WILLIAM STRUTT RAYLEIGH

اہم گیسوں کی کثافت دریافت کی۔ اس تحقیق میں آرگون عنصر دریافت کیا۔

1905- PHILIPP EDUARD ANTON LENARD

کیتھوڈ شعاعوں پر تحقیق کی۔

1906- SIR JOSEPH JOHN THOMSON

بجلی اور گیسوں کے مواصلات پر نظریاتی اور عملی کام کیا۔

1907- ALBERT ABRAHAM MICHELSON

بالکل صحیح پیمائش کرنے والے بصری آلات بنا کر ان کی مدد سے طیف پیمائی اور موسم کی جانچ کرنے والے آلات پر تحقیق و تجربات کئے۔

1908- GABRIEL LIPPMANN

مداخلی مظاہر کے ذریعہ مختلف رنگوں سے دوبارہ رنگین فوٹوگرافی کا طریقہ دریافت کیا۔

1909- 1- GUGLIELMO MARCONI

2- CARL FERDINAND BRAUN

وائرلیس ٹیلی گرافی ایجاد کی۔

1910- JOHANNES DIDERIK VAN DER WALLS

گیسوں اور سیال اشیا کی مساوات پر تحقیق کی۔

1911- WILHELM WIEN

حرارت کی شعاع تابی "قانون فطرت" پر تحقیق کی۔

1912- NILS GUSTAF DALEN

لائٹ ہاؤس وغیرہ کو روشن رکھنے کے لئے گیس اور بجلی سے آٹومیٹک ریگولیٹر بنایا۔

1913- HEIKE KAMERLINGH- ONNES

کم درجہ حرارت کا مادہ پر کیا اثر ہوتا ہے اس پر تحقیقی کام کیا جس کی مدد سے سیال ہیلیم بنانے میں مدد ملی۔

1914- MAX VON LAUE

کرسٹل کے ذریعہ ایکسریز کا بکھرنا ثابت کیا۔

1915- 1- SIR WILLIAM HENRY BRAGG

2- SIR WILLIAM LAWRENCE BRAGG

ایکسریز کے ذریعہ کرسٹل کی ساخت (ڈھانچہ) کی وضاحت کی۔

1917- CHARLES GLOVER BARKLA

ہر عنصر کی ایکسریز میں اختلاف ہوتا ہے، یہ ثابت کیا۔

1918- MAX KARL ERNST LUDWIG PLANCK

توانائی کا کوانٹا (یونٹ) دریافت کیا۔

1919- JOHANNES STARK

برقی میدان میں کرنوں کو تقسیم کرکے ان سے بنی لائنوں کی وضاحت کی اور فزکس کا مشہور "ڈوپلر ایفیکٹ" دریافت کیا۔

1920- CHARLES EDOUARD GUILLAUME

فزکس میں نکل اور اسٹیل کے اجزا کی بالکل صحیح ناپ تول کرکے مقام بنایا۔

1921- ALBERT EINSTEIN

نظریاتی فزکس میں اہم کام کیا اور فوٹو الیکٹرک "قانون فطرت" کا اثر دریافت کیا۔

1922- NIELS BOHR

ایٹم کی ساخت کی تحقیق کی اور اس سے شعاع تابی کی وجہ دریافت کی۔

1923- ROBERT ANDREWS MILLIKAN

بجلی کے بنیادی برقی بار کی دریافت اور ان کا فوٹو الیکٹرک پر اس کے اثر کی دریافت۔

1924- KARL MANNE GEORG SIEGBAHN

ایکسرے کا طیف پیما بنایا۔

1925- 1- JAMES FRANCK

2-GUSTAV HERTZ

کوئی الیکٹرون جب کسی ایٹم سے ٹکراتا ہے تو ان کے نتائج کی دریافت کی۔

1926- JEAN BAPTISTE PERRIN

مادے کی غیر مسلسل ساخت اور اس کے ذرات میں توازن کا ہونا دریافت کیا۔

1927- 1- ARTHUR HOLLY COMPTON

2-CHARLES THOMSON REES WILSON

۱۔ فزکس کا ایک "قانون فطرت" دریافت کیا جو اسی کے نام سے منسوب ہے۔

... بھاپ کو کثیف کر کے اس کے ذریعہ برقی بار والے الیکٹرانک ذرات کے راستوں کو اس طرح نمایاں کیا کہ وہ دیکھے جاسکیں۔

1928- SIR OWEN WILLIANS RICHARDSON

حرارت کی فزکس کا ایک اہم "قانون فطرت" دریافت کیا۔ یہ قانون اسی کے نام سے منسوب ہے۔

1929- PRINCE LOUIS-VICTOR DE BROGLIE

الیکٹرون بیک وقت ذرہ بھی ہے اور "لہر" کی فطرت بھی رکھتا ہے، کی دریافت کی۔

1930- SIR CHANDRASEKHARA VENKATA RAMAN

زمین کے اوپر روشنی کے بکھرنے کا سبب بتایا۔ اس دریافت کو "رمن ایفیکٹ" کہا جاتا ہے۔

1932- WERNER HEISENBERG

کوانٹم میکینک کی تخلیق اور ہائڈروجن "ایلی ٹروپک" ساخت کی دریافت کی۔

1934- 1-ERWIN SCHRODINGER
2-PAUL ADRIEN MAURICE DIRAC

اٹامک تھیوری کے نئے فوائد کی دریافت کی۔

1935- SIR JAMES CHADWICK

نیوٹرون دریافت کیا۔

1936- 1-VICTOR FRANZHESS
2-CARL DAVID ANDERSON

۱- کائناتی شعاع تابی دریافت کی۔
۲- ایٹم کا پوزیٹرون ذرہ دریافت کیا۔

1937- 1-CLINTON JOSEPH DAVISSON
2- SIR GEORGE PAGET THOMSON

کسی کرسٹل (قلم) کے ذریعہ الیکٹرون کی تکسیر کا طریقہ اور عمل دریافت کیا۔

1938- ENRICO FERMI

نئے ریڈیو ایکٹو عنصر دریافت کئے اور مزید نیوٹرون مرکزے میں داخل کر کے نئے مصنوعی ریڈیو ایکٹو عناصر بنانے کا طریقہ ایجاد کیا۔

1939- ERNEST ORLANDO LAWRENCE

سائکلوٹرون ایجاد کی جس کے ذریعہ مصنوعی شعاع تابی کا مطالعہ ممکن ہوا۔

1943- OTTO STERN

سالموں کی شعاع کے استعمال کا طریقہ اور پروٹون کے مقناطیسی لمحات کا مطالعہ۔

1944- ISIDOR ISSAC RABI

ایٹمی مرکزے میں مقناطیسی خصوصیات کو ریکارڈ کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔

1945- WOLFGANG PAULI

"ایکس کلوژن" کا اصول بتایا۔ اس کے نام پر ہی اس کو "پالی اصول" کا نام دیا گیا۔

1946- PERCY WILLIAMS BRIDGMAN

ایسا آلہ ایجاد کیا جو انتہائی بلند دباؤ پیدا کر سکے اور دباؤ والی فزکس میں بہت سی دریافتیں کیں۔

1947- SIR EDWARD VICTOR APPLETON

فضا کے بالائی حصوں کا مطالعہ اور تجزیہ کیا اور فضا کے ... دریافت کی۔

1948- LORD PATRICK MAYNARD STUART BLACKETT

ولسن کلاؤڈ چیمبر بنایا اور اس کے ذریعہ کاسمک شعاعیں دریافت کیں۔

1949- HIDEKI YUKAWA

نظریاتی طور پر یہ ثابت کیا کہ جوہری مرکزہ میں 'میسون' نام کا ذرہ ہوتا ہے۔

1950- CECIL FRANK POWELL

جوہری مرکز میں ہونے والے عمل کی فوٹوگرافی کا طریقہ اور جوہری بنیادی ذرے "میسون" کے بارے میں اہم دریافتیں کیں۔

1951- 1-SIR JOHN DOUGLAS COCKCROFT
2-ERNEST THOMAS SINTON WALTON

مصنوعی طور پر جوہری مرکزوں کی جوڑ توڑ اور ایٹمی ذرات کی رفتار تیز کرنے کا عمل۔

1952- 1- FELIX BLOCH
2- EDWARD MILLS PURCELL

جوہری مرکز میں مقناطیسی توانائی کا صحیح جائزہ اور اس سلسلہ میں مزید دریافتیں۔

1953- FRITS (FREDERIK) ZERNIKE

بتدریج تبدیلی لانے والی خوردبین کی ایجاد۔

1954- 1-MAX BORN
2- WALTHER BOTHE

۱- کوانٹم میکینک پر بنیادی تحقیق اور نظریہ خاص طور پر اس کا لہر کی شکل اختیار کرنا۔
۲- اتفاقات کی بنیاد پر اس کی دریافتیں۔

1955 1-WILLIS EUGENE LAMB
2- POLYKARP KUSCH

۱- ہائیڈروجن کی نازک ساخت کی دریافت۔
۲- الیکٹران کی مقناطیسی حرکات کا یقینی تجربہ۔

1956- 1- WILLIAM SHOCKLEY,
2-JOHN BARDEEN
3- WALTER HOUSER BRATTAIN

نیم موصل کی دریافت اور ان کا ٹرانزسٹر عمل۔

1957- 1-CHEN NING YANG
2- TSUNGDAO LEE

نام نہاد قانون مساوات بتایا جس کے ذریعہ ایٹمی ذرات دریافت ہوئے۔

1958- 1-PAVEL ALEKSEYEVICH CHERENKOV
2- IL'JA MIKHAILOVICH FRANK
3-IGOR YEVGENYEVICH TAMM

"چیرین کوف اثر" کی دریافت اور اس کی وضاحت کی۔

1959- 1- EMILIO GINO SEGRE

2- OWEN CHAMBERLAIN

اینٹی پروٹون دریافت کئے۔

1960- DONALD A. GLASER

بلبلہ چیمبر ایجاد کیا۔

1961- 1-ROBERT HOFSTADTER

2- RUDOLF LUDWIG MOSSBAUER

۱-ایٹمی مرکزوں میں الیکٹرونز کا انتشار اور نیوکلیون کی ساخت کا مطالعہ۔

۲-گیما شعاعوں کا ایٹم کے الیکٹرونز کی حرکات پر انحصار اور انجذاب۔

1962- LEV DAVIDOVICH LANDAU

تکثیف شدہ مادہ پر نظریہ بنایا۔ خاص طور پر سیال ہیلیم پر۔

1963- 1-EUGENE P. WIGNER

2- MARIA GOEPPERTMAYER

3- J. HANS D. JENSEN

۱-ایٹمی مرکزہ اور ایٹمی بنیادی ذرات کی تھیوری میں تعاون اور اضافہ۔

۲ اور ۳۔ایٹمی خول کی ساخت پر کامیاب تجربات۔

1964- 1-CHARLES H. TOWNES

2-NICOLAY GENNADIYEVICH BASOV

3-ALEKSANDR MIKHAILOVICH PROKHOROV

کوانٹم الیکٹرونکس میں تجربات جن کی مدد سے "اوسی لیٹرز" اور "ایمپلی فائر میزر اور لیزر" کی بنیاد پر بنائے جاسکے۔

1965- 1-SIN-ITIRO TOMONAGA

2-JULIAN SCHWINGER

3- RICHARD P. FEYNMAN

کوانٹم الیکٹروڈائنامک اور بنیادی ایٹمی ذرات کی فزکس پر تجربات اور دریافتیں۔

1966- ALFRED KASTLER

ایٹم کے اندر الیکٹرونز کی حرکات دیکھنے اور سمجھنے کے لئے بصری طریقہ ایجاد کیا۔

1967- HANS ALBRECHT BETHE

نیوکلیرری ایکشن کی تھیوری بنائی اور ستاروں میں توانائی کی تخلیق کا نظریہ بنایا۔

1968- LUIS W. ALVAREZ

بنیادی ایٹمی ذرات کی فزکس میں اہم دریافت جس کی مدد سے ہائیڈروجن بلبلہ چیمبر بنایا جاسکا اور تجزیہ کاری ممکن ہوسکی۔

1969- MURRAY GELL-MANN

بنیادی ایٹمی ذرات کی دریافت کے بعد ان کی ترتیب اور آپس میں ان کے عمل اور رد عمل کی دریافت کی۔

1970- 1- HANNES ALFVEN

2-LOUIS NEEL

۱-پلازمہ فزکس کے متفرق حصوں میں "مقناطیسی ہائیڈروڈائنامک" عمل کی دریافت کی۔

۲-سولڈ اسٹیٹ فزکس پر اثرانداز ہونے والی دو اہم مقناطیسی فوٹون دریافت کئے۔

1971- DENNIS GABOR

ہولوگرافک طریقہ کار کی ایجاد کی۔

1972- 1-JOHN BARDEEN

2- LEON N. COOPER

3- J. ROBERT SCHRIEFFER

اعلیٰ موصل کی تھیوری میں جو بی۔سی۔ایس۔ تھیوری بھی کہلاتی ہے، مزید اضافہ کیا۔

1973- 1- LEO ESAKI

2- IVAR GIAEVER

3-BRIAN D. JOSEPHSON

۱ اور ۲۔نیم موصل اور اعلیٰ موصل میں سرنگ (سوراخ) کی تجرباتی دریافت کی۔

۳-جوزیفسن افیکٹ کے مظاہر میں اعلیٰ کرنٹ کی دریافت کی۔

1974- 1-SIR MARTIN RYLE

2-ANTONY HEWISH

آسٹرو فزکس ریڈیو پر تحقیقات کی۔

۱-مصنوعی اپرچر کی تکنیک پر تحقیق اور ایجاد کی۔

۲-پلسرز ستاروں کی دریافت میں اہم اور فیصلہ کن حصہ۔

1975- 1-AAGE BOHR

2- BEN MOTTELSON

3- JAMES RAINWATER

ایٹمی مرکزہ میں ذرات کی متحدہ حرکت اور غیر متحدہ حرکت میں تعلق دریافت کیا اور اس کی تھیوری بنائی۔

1976- 1- BURTON RICHTER

2- SAMUEL C. C. TING

ایک نئے قسم کا بھاری ایٹمی ذرہ دریافت کیا۔

1977- 1- PHILIP W. ANDERSON

2- SIR NEVILL F. MOTT

3- JOHN H. VAN VLECK

الکٹرانک ساخت میں مقناطیسی بے ترتیب سسٹم پر بنیادی تھیوری بنائی۔

1978- 1-PYOTR LEONIDOVICH KAPITSA

2- ARNO A. PENZIAS

3- ROBERT W. WILSON

۱۔ کمپوز حرارت کی فزکس میں بنیادی تحقیق اور ایجاد کی
۲ اور ۳۔ کائناتی مائکرو ویوز دریافت کیں۔

1979- 1-SHELDON L. GLASHOW
2- ABDUS SALAM
3- STEVEN WEINBERG

تین ایٹمی کمزور اور مضبوط قوتوں میں یکسانیت پر تحقیق کی۔

1980- 1-JAMES W. CRONIN
2-VAL L. FITCH

نیوٹرل "کے "میسون (ایک ایٹمی ذرہ) کے آہستہ آہستہ ختم ہونے میں بنیادی مساوات میں تفریق بتائی۔

1981- 1-NICOLAAS BLOEMBERGEN
2- ARTHUR L. SCHAWLOW
3- KAI M. SIEGBAHN

۱ اور ۲۔ لیزر اسپیکٹروکوپ کی ایجاد
۳۔ اعلیٰ نتائج والی الیکٹرون خوردبین کی ایجاد میں تعاون۔

1982- KENNETH G. WILSON

عبوری دور کے درجات میں تنقیدی مظاہر کی تھیوری۔

1983- 1-SUBRAMANYAN CHANDRASEKHAR
2- WILLIAM A. FOWLER

۱۔ ستاروں کے ارتقا کی تھیوری کی اہمیت پر تحقیق کی۔
۲۔ کائنات میں کیمیاوی عناصر کی بناوٹ اور ان کی اہمیت پر تحقیق کی۔

1984- 1-CARLO RUBBIA
2- SIMON VAN DER MEER

فیلڈ پارٹیکلز "ڈبلیو" اور "زیڈ" دریافت کئے جو کمزور عمل اور رد عمل میں کیونکر ہوتے ہیں۔

1985- KLAUS VON KLITZING

کوانٹائزڈ ہال ایفیکٹ (تاثر) کی دریافت کی۔

1986- 1- ERNST RUSKA
2- GERD BINNIG
3- HEINRICH ROHRER

۱۔ آپٹکس سائنس میں اہم کام اور پہلی الیکٹرونک خوردبین کا ڈیزائن بنایا۔
۲ اور ۳۔ تقطیع کرنے والی خوردبین کا ڈیزائن بنایا۔

1987- 1- J. GEORG BEDNORZ
2- K. ALEXANDER MULLER

سیرامک چیزوں میں اعلیٰ بہاؤ کی دریافت کی۔

1988- 1-LEON M. LEDERMAN
2- MELVIN SCHWARTZ
3- JACK STEINBERGER

نیوٹرینو کی دھار بنانے کا طریقہ اور میسان نیوٹرینو کے ذریعہ لیپٹون کی دوہری ساخت کا مظاہرہ۔

1989- 1- NORMAN F. RAMSEY
2- HANS G. DEHMELT
3- WOLFGANG PAUL

۱۔ علیحدہ اوسی لیٹری میدان دریافت کرنے کا طریقہ بنایا اور ہائیڈروجن میزر اور اٹامک گھڑیوں کی ایجاد کی۔
۲ اور ۳۔ "آیون" کو پکڑنے کا طریقہ دریافت کیا۔

1990- 1- JEROME I. FRIEDMAN
2- HENRY W. KENDALL
3- RICHARD E. TAYLOR

گہرے ان ایلاسٹک کے الیکٹرونز، پروٹونز اور مقید نیوٹرونز پر بکھرنے کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کی، جن سے پارٹیکلز فزکس میں کوارکس ذرات کے ماڈل بنائے جا سکتے ہیں۔

1991- PIERRE-GILLES DE GENNES

کسی آسان سسٹم کے مظہر کو سمجھنے کا طریقہ بتایا جو زیادہ پیچیدہ قسم کے مادہ کی بھی وضاحت کر سکتا ہے۔ خاص طور پر مائع کرسٹل اور پالیمر میں۔

1992- GEORGES CHARPAK

ایٹمی ذرات کی کھوج کرنے والا ڈیٹکٹر بنایا۔ خاص طور پر ملٹی وائر پروپورشنل چیمبر۔

1993- 1-RUSSELL A. HULSE
2- JOSEPH H. TAYLOR JR.

ایک نئے قسم "پلسر" ستارے کی دریافت کی جس سے شاید کشش ثقل کا راز سمجھا جا سکے۔

1994- 1-BERTRAM N. BROCKHOUSE
2- CLIFFORD G. SHULL

۱۔ نیوٹرون اسپیکٹروکوپ (طیف پیما) بنایا۔
۲۔ نیوٹرونوں میں فرق سمجھنے کی تکنیک دریافت کی۔

1995- 1-MARTIN L. PERL
2-FREDERICK REINES

۱۔ "ٹاؤ لیپٹون" کی دریافت کی۔
۲۔ نیوٹرینو کی تلاش اور دریافت۔

1996- 1- DAVID M LEE
2- DOUGLAS D. OSHEROFF
3- ROBERT C. RICHARDSON

عنصر ہیلیم نمبر ۳ کے غیر معمولی تیز بہاؤ کی دریافت۔

1997- 1-STEVEN CHU
2-CLAUDE COHEN-TANNOUDJI
3- WILLIAM D. PHILLIPS

الیکٹرون کو لیزر کرنوں سے ٹھنڈا کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔

1998 1-ROBERT B. LAUGHLIN

2- HORST L. STORMER

3- DANIEL C. TSUI

نئی ساخت کے کوانٹم بہاؤ کی دریافت کی۔

1999 1-GERARDUS 'T HOOFT

2-MARTINUS J.G. VELTMAN

کوانٹم کی ساخت اور ڈھانچے پر روشنی ڈال کر فزکس میں اس کے کمزور عمل کی وضاحت کی۔

2000- 1-ZHORES I. ALFEROV,

2- HERBERT KROEMER

3-JACK ST. CLAIR KILBY

اور ۲۔تیز رفتار اور اوپٹو الیکٹرونکس میں استعمال ہونے والے نیم موصل بنائے۔

۳۔ مکمل سرکٹ کی ایجاد میں حصہ لیا۔

2001- 1- WOLFGANG KETTERLE

2- ERIC CORNELL

3- CARL WEIMANN

بوس — آئنسٹائن قانون کے مطابق ہلکی گیسوں کی کثافت میں الکلائی ایٹموں کی دریافت اور کثافتوں کی بنیادی خصوصیات کی دریافت۔

کیمسٹری (کیمیا)

1901- JACOBUS HENRICUS VANT'HOFF

کیمیاوی ڈائنمک اور مختلف سالیوشن میں اوسموٹک دباؤ کے قوانین دریافت کئے۔

1902- HERMANN EMIL FISCHER

کیمیکل پیورین اور شوگر کو مصنوعی طور پر بنانے کا کام کیا۔

1903- SVÄNTE AUGUST ARRHENIUS

کسی کیمیاوی کمپاؤنڈ کے سالسوں میں عارضی بکھراؤ اور الیکٹرولائٹک کی تھیوری بنائی۔

1904- SIR WILLIAM RAMSAY

ہوا میں شامل ساکت (Inert) گیسوں کی موجودگی ثابت کی اور ان کے ایٹامک نمبر دریافت کئے۔

1905- 1-JOHANN FRIEDRICH WILHELM

2-ADOLF VON BAEYER

نامیاتی رنگ اور ہائیڈرو ارومیٹک کمپاؤنڈ بنائے۔

1906- HENRI MOISSAN

فلورین عنصر دریافت کیا اور برقی بھٹی بنا کر استعمال کیا۔

1907- EDUARD BUCHNER .

بائیو کیمیکل پر تحقیق کی اور خلیہ سے آزاد خمیر دریافت کیا۔

1908- LORD ERNEST RUTHERFORD

عناصر کے ٹوٹ کر بکھرنے پر اور ریڈیو ایکٹیو کیمسٹری پر تحقیق کی۔

1909- WILHELM OSTWALD

کیمیاوی اجزا میں توازن قائم رکھنے اور اس میں ہونے والے رد عمل کے بنیادی اصول قائم کئے۔

1910- OTTO WALLACH

نامیاتی کیمسٹری اور کیمیاوی انڈسٹری پر ابتدائی کام کیا اور "ایلی سائی کلک" کمپاؤنڈز پر کام کیا۔

1911- MARIE CURIE

ریڈیم اور پولونیم عناصر دریافت کئے۔ بعد میں دونوں کے کمپاؤنڈز پر تحقیق کی۔

1912- 1-VICTOR GRIGNARD

2-PAUL SABATIER

۱۔ "گرگنارڈ ریجنٹ" دریافت کی۔ آج کل بھی جس کے ذریعہ نامیاتی کیمسٹری پر اہم کام ہو رہا ہے۔

۲۔ بکھری ہوئی دھاتوں میں ہائیڈروجنیٹنگ نامیاتی کمپاؤنڈ بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔

1913- ALFRED WERNER

ایک سالمے سے ایٹم کا کیا تعلق ہوتا ہے یہ دریافت کی۔ اسی دریافت سے بعد میں نامیاتی کیمسٹری کی ابتدا ہوئی۔

1914- THEODORE WILLIAM RICHARDS

کیمیاوی عناصر کے متعدد ایٹموں کے بالکل صحیح اوزان دریافت کئے۔

1915- RICHARD MARTIN WILLST- TTER

پودوں کے بیرونی خلیوں خاص طور پر کلوروفل پر تحقیقی کام کیا۔

1918- FRITZ HABER

عناصر سے مصنوعی ایمونیا بنانے کا اہم کام کیا۔

1920- WALTHER HERMANN NERNST

تھرموکیمسٹری کے میدان میں اہم کام کیا۔

1921- FREDERICK SODDY

کیمسٹری اور ریڈیو ایکٹو اشیا کے علم میں اضافہ کیا اور آئسوٹوپس کی فطرت کو سمجھنے کے لئے تجربات کئے۔

1922- FRANCIS WILLIAM ASTON

غیر ریڈیو ایکٹو عناصر کے آئسوٹوپس کی بڑے پیمانے پر طیف پیمائی کی اور اہم نتائج نکالے۔

1923- FRITZ PREGL

نامیاتی اشیا کا خوردبینی تجزیہ کیا۔

1925- RICHARD ADOLF ZSIGMONDY

کولائڈ کلی اشیا کو سمجھا۔ کئی اصول بنائے جو آج بھی کولائڈ کی ماڈرن کیمسٹری کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں۔

1926- THE (THEODOR) SVEDBERG

کسی شے کے بکھرنے کے نظام پر تحقیق کی۔

1927- HEINRICH OTTO WIELAND

بائل تیزاب اور اس سے متعلق کیمیائی اجزا کے نظام اور ساخت پر تحقیق کی۔

1928- ADOLF OTTO REINHOLD WINDAUS

اسٹیر ولز (کولیسٹرول) اور وٹامنز کے درمیانی نظام پر تحقیق کی۔

1929- 1- SIR ARTHUR HARDEN
2-HANS KARL AUGUST SIMON VON
3-EULER-CHELPIN

شوگر کے خمیر اور انزائمس کے خمیرات پر تحقیق کی۔

1930- HANS FISCHER

کلوروفل اور "ہائی من" کے نظام کو سمجھا اور اپنی مصنوعی ہائی من پر تحقیق کی۔

1931- 1-CARL BOSCH
2-FRIEDRICH BERGIUS

کیمیاوی اعلیٰ دباؤ کا طریقہ ایجاد کیا۔

1932- IRVING LANGMUIR

سطحی کیمسٹری پر تحقیق کر کے اہم دریافتیں کیں۔

1934- HAROLD CLAYTON UREY

ہائیڈروجن کا بھاری ایٹم دریافت کیا۔

1935- 1-FR-D-RIC JOLIOT
2- IRENE JOLIOT-CURIE

نئے ریڈیو ایکٹو عناصر اور ان کی مصنوعات کو پہچانا۔

1936- PETRUS JOSEPHUS WILHELMUS DEBYE

سالموں کی ساخت کو ایکسرے اور گیسوں میں الیکٹرون کی مدد سے سمجھا۔

1937- 1-SIR WALTER NORMAN HAWORTH
2- PAUL KARRER

۱-کاربوہائیڈریٹ (نشاستہ) اور وٹامن "سی" پر تحقیق کی۔
۲-وٹامن اے، وٹامن بی اور گاجر وغیرہ میں رنگ پیدا کرنے والے اجزا پر تحقیق کی۔

1938- RICHARD KUHN

کاروٹینائڈس اور وٹامنز پر اہم تحقیقات کی۔

1939- 1-ADOLF FRIEDRICH JOHANN BUTENANDT
2-LEOPOLD RUZICKA

۱- جنسی ہارمونز پر کامیاب تجربات کئے۔
۲-پولی میتھائی لنس اور اعلیٰ قسم کی ٹرپین (پھلوں میں خوشبو وغیرہ) پر تجربات کئے۔

1943- GEORGE DE HEVESY

کیمیاوی عمل کو سمجھنے کے لئے "آئی سوٹوپس" کا استعمال کیا۔

1944- OTTO HAHN

بھاری عناصر کے مرکزوں کو تقسیم کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔

1945- ARTTURI ILMARI VIRTANEN

ایگریکلچر کے نشو ونما میں مدد دینے والی کیمیاوی اشیا بنائیں۔ خاص طور پر جانوروں کی خوراک کو محفوظ رکھنے کے طریقے ایجاد کئے۔

1946- 1-JAMES BATCHELLER SUMNER
2-JOHN HOWARD NORTHROP
3- WENDELL MEREDITH STANLEY

۱-دریافت کیا کہ انزائمس کرسٹل میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔
۲ اور ۳-وائرس کی پروٹین اور انزائمس خاص شکل میں تیار کئے۔ (انزائمس پروٹین کے ایک بڑے گروپ کو کہا جاتا ہے)

1947- SIR ROBERT ROBINSON

پودوں سے تیار شدہ الکلائڈ جیسی اشیا کی اہمیت کو سمجھا اور تجربات کئے۔

1948- ARNE WILHELM KAURIN TISELIUS

سیرم پروٹین کے پیچیدگی کی وضاحت کی اور الیکٹروفارسس (برقی ذرات کی تبدیلی) پر تجربات کئے۔

1949- WILLIAM FRANCIS GIAUQUE

سائنس کے بنیادی اصول "تھرموڈائنمکس" (حرارت کے عمل) کا کیمیاوی اشیا پر کیا اثر ہوتا ہے اس کی وضاحت کی خاص طور پر جن اشیا میں بہت کم درجہ کی حرارت استعمال کی گئی ہو۔

1950- 1-OTTO PAUL HERMANN DIELS
2-KURT ALDER

ڈائن (DIENE) کی مصنوعات بنانے کا طریقہ ایجاد کیا۔

1951- 1- EDWIN MATTISON MC MILLAN
2-GLENN THEODORE SEABORG

یورینیم عنصر سے آگے کیمسٹری میں ان کی دریافتیں۔

1952- 1-ARCHER JOHN PORTER MARTIN
2-RICHARD LAURENCE MILLINGTON SYNGE

کروموٹوگرافی کو تقسیم کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

1953- HERMANN STAUDINGER

بڑے سالموں کی کیمسٹری کے میدان میں تحقیقات کی۔

1954- LINUS CARL PAULING

کیمیکلز کے قدرتی انضمام اور ان کا مصرف بتایا۔

1955- VINCENT DU VIGNEAUD

سلفر بائیو کیمیکل کمپاؤنڈ پر تحقیق کی۔ خاص طور پر پولی پیپ ٹائڈ کے مصنوعی

1956- 1- SIR CYRIL NORMAN HINSHEL WOOD

2-NIKOLAY NIKOLAEVICH SEMENOV

کیمیاوی رد عمل پر ان کی اہم تحقیقات۔

1957- LORD ALEXANDER R. TODD

مختلف انزائمس کے مرکزی بنیادی عمل کا مطالعہ کیا۔

1958- FREDERICK SANGER

پروٹین کی ساخت کا تجزیہ کیا خاص طور پر انسولین کی پروٹین کا۔

1959- IAROSLAV HEYROVSKY

کسی تجزیہ کے لئے پولوگرافک ذرائع کی دریافت کی۔

1960- WILLARD FRANK LIBBY

کاربن چودہ کے ذریعہ کسی بھی شے کی عمر کا پتہ چلانے کا طریقہ دریافت کیا۔

1961- MELVIN CALVIN

پودوں میں کاربن ڈائی آکسائڈ کا عمل دریافت کیا۔

1962- 1-MAX FERDINAND PERUTZ

2-SIR JOHN COWDERY KENDREW

گلوبلر پروٹین کے ڈھانچوں پر بنیادی تحقیقات کی۔

1963- 1-KARL ZIEGLER

2-GIULIO NATTA

ہائی پالیمر تکنیکی اور کیمیاوی دریافتیں اور معلومات کیں۔

1964- DOROTHY CROWFOOT HODGKIN

اہم بائیوکیمیکل اشیا کا ایکس ریز کے ذریعہ مطالعہ کرکے ان کی ماہیت دریافت کی۔

1965- ROBERT BURNS WOODWARD

نامیاتی مصنوعات میں حیرت انگیز کارنامے کئے۔

1966- ROBERT S. MULLIKEN

سالموں کے الیکٹرونک ڈھانچوں اور ان کے درمیان کیمیاوی تعلق کا مطالعہ کیا۔

1967- 1-MANFRED EIGEN

2-RONALD GEORGE WREYFORD NORRISH

3-LORD GEORGE PORTER

بے حد تیز کیمیاوی رد عمل کے نتیجہ میں بجلی کی چھوٹی لہروں میں انتشار پیدا ہونے کے عمل کا مطالعہ کیا۔

1968- LARS ONSAGER

باہمی رشتوں کی دریافت جو تھرموڈائنامکس کے عمل میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

1969- 1-SIR DEREK H.R. BARTON

2-ODD HASSEL

کیمسٹری میں نظریہ اور اس کی تصدیق اور اس کے عمل کا مظاہرہ کیا۔

1970- LUIS F. LELOIR

شوگر کے موکلائی انزائمز ان کے بائیوسنتھیسس اور کاربوہائیڈریٹ پر تحقیق کی۔

1971- GERHARD HERZBERG

سالموں کی جیومیٹری اور ان کی الیکٹرونک ساخت پر تجربات کئے۔ خاص طور پر فری ریڈیکلز پر۔

1972- 1- CHRISTIAN B. ANFINSEN

2-STANFORD MOORE

3-WILLIAM H. STEIN

۱۔مرکزی تیزاب اور امینوایسڈ کے درمیان تعلق کی تصدیق کی۔

۲اور ۳۔مرکزی تیزاب کے سالموں کی بناوٹ اور ان کے کیمیاوی جوڑ توڑ کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کی۔

1973- 1-ERNST OTTO FISCHER

2-SIR GEOFFREY WILKINSON

دونوں سائنسدانوں نے اپنے اپنے طور پر نامیاتی دھاتوں کا کیمیائی تجزیہ کیا جسے "سینڈوچ مرکب" بھی کہا جاتا ہے۔

1974- PAUL J. FLORY

میکروسالموں کی فزیکل کیمسٹری میں نظریاتی اور عملی کام کیا۔

1975- 1-SIR JOHN WARCUP CORNFORTH

2-VLADIMIR PRELOG

۱۔انزائمس کے انضمام اور ان کے مسلسل قدرتی عمل کو سمجھا۔

۲۔اسٹیریو کیمسٹری اور نامیاتی سالموں کے رد عمل پر تحقیق کی۔

1976- WILLIAM N. LIPSCOMB

مختلف کیمیاوی عناصر کے اتصال کی ساخت کا مطالعہ کیا۔

1977- ILYA PRIGOGINE

غیر متوازن تھرموڈائنامکس کی دریافت اور منتشرات کے ڈھانچوں کا نظریہ بنایا۔

1978- PETER D. MITCHELL

بایولوجیکل قوت کو سمجھ کر اسے کیمیاوی نظریات کے تحت دوسری شکل میں منتقل کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔

1979- 1-HERBERT C. BROWN

2-GEORG WITTIG

بورون اور فاسفورس کے کمپاؤنڈ (مرکب) سے نامیاتی مصنوعات بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔

1980- 1-PAUL BERG

2-WALTER GILBERT

3-FREDERICK SANGER

۱۔بنیادی تیزابوں کی بایو کیمسٹری کا مطالعہ کرکے اس کا ڈی۔ این۔ اے سے تعلق بتایا۔

۲اور ۳۔مرکزی تیزابوں کی بنیادی ترتیب کو سمجھنے کا کام آسان کیا۔

1981- 1-KENICHI FUKUI

2-ROALD HOFFMANN

دونوں نے اپنے اپنے طور پر کیمیکلز کے رد عمل پر کام کیا۔

1982- SIR AARON KLUG

کرسٹل کی بنیاد پر کام کرنے والی الیکٹرون خورد بینی بنائی۔

1983- HENRY TAUBE

الیکٹرونز کے ایک مقام سے دوسرے مقام پر جانے کا رد عمل دریافت کیا۔

1984- ROBERT BRUCE MERRIFIELD

ٹھوس سانچے میں کیمیاوی مصنوعات بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔

1985- 1-HERBERT A. HAUPTMAN

2-JEROME KARLE

کرسٹل کے ڈھانچے کو سمجھنے کا طریقہ دریافت کیا۔

1986- 1-DUDLEY R. HERSCHBACH

2- YUAN T. LEE

3-JOHN C. POLANYI

کیمیکلز کے بنیادی عمل کی اہمیت دریافت کی۔

1987- 1-DONALD J. CRAM

2- JEAN-MARIE LEHN

3-CHARLES J. PEDERSEN

مخصوص ڈھانچے کے سالموں کے درمیان تال میل پر تجربات کر کے اس کی وضاحت کی۔

1988- 1-JOHANN DEISENHOFER

2-ROBERT HUBER

3-HARTMUT MICHEL

فوٹو سنتھیٹک رد عمل کے مرکز میں سہ ابعادی ڈھانچہ دریافت کیا۔

1989- 1-SIDNEY ALTMAN

2-THOMAS R. CECH .

بنیادی تیزاب آر۔ این۔ اے کو سمجھنے کا کام کیا۔

1990- 1-ELIAS JAMES COREY

نامیاتی مصنوعات پر عمل کرنے کا نظریہ بنایا۔

1991- RICHARD R. ERNST

طاقتور جوہری مقناطیس کو سمجھنے کا طیف پیما بنایا۔

1992- RUDOLPH A. MARCUS

الیکٹرون کی تبدیلی کا کیمیکل میں رد عمل دریافت کیا۔

1993- 1-KARY B. MULLIS

2-MICHAEL SMITH

۱۔ پولی مر میں چین ری ایکشن پیدا کرنے کا طریقہ دریافت کیا

۲۔ "اولی گونو سلیو ٹائڈ" نام کی ایک شے کو بنیاد بنا کر پروٹین کی [illegible] سمجھنے میں مدد دی۔

1994- GEORGE A. OLAH

کاربو کیشن کیمسٹری کے لئے بہت اہم کام کیا۔

1995- 1-PAUL CRUTZEN

2- MORIO MOLINA

3-F. SHERWOOD ROWLAND

فضائی کیمسٹری اور "اوزون" بننے کا سسٹم دریافت کیا۔

1996- 1-ROBERT. F. CURL. Jr.

2- SIR HAROLD W. KROTO

3- RICHARD E. SMALLEY

"فلری نس" دریافت کیا۔

1997- 1-PAUL D. BOYER

2-JOHN E. WALKER

3-JENS C. SKOU

۱ اور ۲۔ ایڈنائی بینک میکنزم کو سمجھا اور سمجھنے کا طریقہ دریافت کیا

۳۔ پہلی بار آئن ٹرانسپورٹنگ اینزائم دریافت کیا۔

1998- 1- WALTER KOHN

2-JOHN A. POPLE

۱۔ ڈینسٹی فنکشنل (کثافتی عمل) نظریہ کی نشوونما کی

۲۔ کوانٹم کیمسٹری کو سمجھنے کا طریقہ دریافت کیا۔

1999- AHMED ZEWAIL

مختلف کیمیکلز کے یک جان ہونے کے رد عمل کو سمجھا اور اس کی وضاحت کی۔

2000- 1-ALAN J. HEEGER

2- ALAN G. MACDIARMID

3-HIDEKI SHIRAKAWA

موصل پالیمر دریافت کیا اور ان کو قابل عمل بنایا۔

2001- 1-WILLIAM S. KNOWLES

2- RYOJI NOYORI

3-K. BARRY SHARPLESS

مختلف فطرت کے دو کیمیکلز کو ملا کر یک جان کرنے کا طریقہ دریافت کیا جس سے نئی دوائیں اور نئی چیزیں بنایا جانا ممکن ہوا۔

میڈیسن (ادویہ)

1901- EMIL ADOLF VON BEHRING

سیرم تھراپی کے ذریعہ خناق یعنی "ڈفتھیریا" مرض کا علاج۔

1902- SIR RONALD ROSS

ملیریا پر تحقیق کی اور معلوم کیا کہ یہ جسم میں کس طرح داخل ہوتا ہے۔

1903- NIELS RYBERG FINSEN

بلی "منتشر کار" شعاعوں سے مرض "لیوپس ولگیرس" کے علاج کا طریقہ دریافت کیا۔

1904- IVAN PETROVICH PAVLOV

ہاضمہ کے عمل (فزیالوجی) کی وضاحت کی۔

1905- ROBERT KOCH

مرض تپ دق (ٹی بی) اور اس کے علاج کے طریقوں پر تحقیق کی۔

1906- 1-CAMILLO GOLGI

2-SANTIAGO RAMON Y CAJAL

اعصابی نظام کی بناوٹ پر تحقیق کی۔

1907- CHARLES LOUIS ALPHONSE LAVERAN

پروٹوزوا کس طرح بیماریوں کا سبب بنتے ہیں اس پر تحقیق کی۔

1908- 1-ILYA ILYICH MECHNIKOV

2- PAUL EHRLICH

کسی مرض سے جسم کے قدرتی طور پر محفوظ رہنے کی خصوصیت کو شناخت کیا۔

1909- EMIL THEODOR KOCHER

تھایورائڈ غدود کے آپریشن کے علاوہ فیزیولوجی اور پیتھولوجی پر کام کیا۔

1910- ALBRECHT KOSSEL

خلیہ کی کیمیاوی خصوصیات کی دریافت جس میں پروٹین اور مرکزی اجزا شامل ہیں۔

1911- ALLVAR GULLSTRAND

آنکھ کی جانچ کرنے والے آلے "ڈایوپ ٹرکس" کے لئے اہم کام کیا۔

1912- ALEXIS CARREL

خون کی باریک رگوں کے جوڑنے اور چھوٹے اعضا کی پیوندکاری پر تحقیق کی۔

1913- CHARLES ROBERT RICHET

"اینافائی لیکسس" (ایک قسم کا بلڈ پریشر) کی دریافت جو کسی خاص پروٹین سے ہو جاتا ہے۔

1914- ROBERT BARANY

"ویسٹی بیولر" آلہ بنانے میں مدد کی جس سے فیزیولوجی اور پیتھولوجی میں کام لیا جاتا ہے۔

1919- JULES BORDET

جسم کے دفاعی نظام کے بارے میں تحقیقات اور دریافتیں۔

1920- SCHACK AUGUST STEENBERGER KROGH

کپلاری موٹر کے مسلسل میکنزم کی دریافت کی۔

1922- 1-SIR ARCHIBALD VIVIAN HILL

2-OTTO FRITZ MEYERHOF

۱۔ عضلات میں حرارت کس طرح پیدا ہوتی ہے دریافت کیا۔
۲۔ عضلات میں آکسیجن اور "لیکٹک ایسڈ" کے عمل پر تحقیق کی۔

1923- 1-SIR FREDERICK GRANT BANTING

2-JOHN JAMES RICHARD MACLEOD

انسولین اور اس کی خوبیاں دریافت کیں۔

1924- WILLEM EINTHOVEN

الیکٹروکارڈیوگرام ایجاد کیا۔

1926- JOHANNES ANDREAS GRIB FIBIGER

اسپائی روپٹر اکارسی نوما (ایک قسم کا کینسر) دریافت کیا۔

1927- JULIUS WAGNER JAUREGG

"ڈی مین شیا" کے فالج میں ملیریا کے انجکشن سے علاج کا طریقہ دریافت کیا۔

1928- CHARLES JULES HENRI NICOLLE

ٹائی فس مرض کے علاج پر کام کیا۔

1929- 1- CHRISTIAAN EIJKMAN

2-SIR REDERICK GOWLAND HOPKINS

۱۔ اینٹی نیوروٹک وٹامن دریافت کئے۔
۲۔ ہیجان انگیزی سے وٹامنس کی افزائش کا طریقہ دریافت کیا۔

1930- KARL LANDSTEINER

انسانی خون کے الگ الگ گروپ کی دریافت کی۔

1931- OTTO HEINRICH WARBURG

تنفس کے اینزائم کے عمل اور خصوصیات کی دریافت کی۔

1932- 1-SIR CHARLES SCOTT SHERRINGTON

2-LORD EDGAR DOUGLAS ADRIAN

نیورونز یعنی دماغ کے خلیوں کا عمل دریافت کیا۔

1933- THOMAS HUNT MORGAN

توارث میں کروموزومس کے رول سے متعلق دریافتیں کیں۔

1934- 1- GEORGE HOYT WHIPPLE

2-GEORGE RICHARDS MINOT

3-WILLIAM PARRY MURPHY

انیمیا ہونے پر جگر کا عمل اور اس کے علاج کا طریقہ دریافت کیا۔

1935- HANS SPEMANN

"جنین" کے نشوونما کے بارے میں تحقیق کی۔

1936- 1- SIR HENRY HALLETT DALE

2-OTTO LOEWI

اعصابی برقی لہریں کس طرح کیمیاوی شکل میں تبدیل ہوتی ہیں اس بارے میں اہم دریافتیں کیں۔

1937- ALBERT SZENT GYORGYI VON NAGYRAPOLT

"وٹامن سی" اور فیوماریک ایسڈ بننے کے عمل کی دریافت کی۔

1938- CORNEILLE JEAN FRANCOIS HEYMANS

سانس لینے اور دل کے نظام تنفس کو کس طرح ترتیب میں رکھتے ہیں، دریافت کیا۔

1939- GERHARD DOMAGK

"پرونٹوسل" کی جراثیم کش خاصیت دریافت کی۔

1943- 1-HENRIK CARL PETER DAM

2-EDWARD ADELBERT DOISY

۱- وٹامن "کے" دریافت کیا۔

۲- وٹامن "کے" کی کیمیاوی خصوصیت دریافت کی۔

1944- 1-JOSEPH ERLANGER

2-HERBERT SPENCER GASSER

تنہا اعصابی ریشہ (نرو فائبر) کتنے عمل ایک ساتھ کرسکتا ہے دریافت کیا۔

1945- 1-SIR ALEXANDER FLEMING

2-SIR ERNST BORIS CHAIN

3-LORD HOWARD WALTER FLOREY

پینی سیلین جراثیم کش دوا کی ایجاد کی جس سے بہت سی بیماریوں کا علاج ممکن ہو سکا۔

1946- HERMANN JOSEPH MULLER

ایکس رے کی مدد سے میوٹیشن کس طرح بنائے جاسکتے ہیں۔

1947- 1-CARL FERDINAND CORI

2-GERTY THERESA CORI RADNTIZ

3-ERNARDO ALBERTO HOUSSAY

۱ اور ۲- گلائی کوجین کی عمل انگیز تبدیلی کا طریقہ کار دریافت کیا۔

۳- شوگر کے میٹابولزم میں ہارمونز "پٹوایٹری لوب" کے اندر کیا عمل کرتے ہیں۔

1948- PAUL HERMANN MULLER

ڈی۔ ڈی۔ ٹی کے زہر کا فصلوں کے امراض پر زبردست اثر دریافت کیا۔

1949- 1-WALTER RUDOLF HESS

2-ANTONIO CAETANO DE ABREU FREIRE EGAS MONIZ

۱- دماغ اور اندرونی اعضا کے درمیان تعلق قائم رکھنے والا نظام دریافت کیا۔

۲- "لیوکٹمی" کے ذریعہ کچھ نفسیاتی تکلیفوں کا علاج اور لیوکٹمی کی اہمیت پر تحقیق کی۔

1950- 1-EDWARD CALVIN KENDALL

2-TADEUS REICHSTEIN

3 PHILIP SHOWALTER HENCH

ایڈرینل کارٹیکس کے ہارمونز اور ان کی ساخت [illegible]

1951- MAX THEILER

پیلا بخار کیوں ہوتا ہے اور اس کا علاج کس طرح [illegible]

1952- SELMAN ABRAHAM WAKSMAN

"اسٹریپٹومائی سین" دوا کی ایجاد جس کے ذریعہ تپ دق [illegible]

1953- 1-SIR HANS ADOLF KREBS

2-FRITZ ALBERT LIPMANN

۱- سائٹرک تیزاب کے ترکیبی عمل کی دریافت کی۔

۲- معاون اینزائم "اے" کی دریافت اور ان کی اہمیت کے بارے میں تحقیق کی۔

1954- 1-JOHN FRANKLIN ENDERS

2-THOMAS HUEKLE WELLER

3-FREDERICK CHAPMAN ROBBINS

پولیومائی لی ٹیز کے وائرس مختلف قسم کے ٹشوز میں پرورش پانے کی صلاحیت پر تحقیق کی۔

1955- AXEL HUGO THEODOR THEORELL

آکسائی ڈیشن اینزائمس کی فطرت اور اس کے عمل کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش۔

1956- 1-ANDRE FREDERIC COURNAND

2-WERNER FORSSMANN

3-DICKINSON W. RICHARDS

نفسیاتی اثرات کے باعث دل کے اعضا اور سرکولیٹری سسٹم میں تبدیلیاں آتی ہیں، کی دریافت کی۔

1957- DANIEL BOVET

بہت سے کیمیاوی مصنوعات کے ترکیبی کمپاؤنڈ کے عمل سے جسم کے عضلات پر عمل اور ردعمل کی دریافت کی۔

1958- 1-GEORGE WELLS BEADLE

2-EDWARD LAWRIE TATUM

3-JOSHUA LEDERBERG

۱ اور ۲- جین کے عمل میں مسلسل اور یقینی کیمیاوی تاثرات ہوتے ہیں کی دریافت کی۔

۳- جراثیم کے جینک میٹریل کی ترتیب و تنظیم کی دریافت کی۔

1959- 1-SEVERO OCHOA

2-ARTHUR KORNBERG

مرکزی نیوکلک ایسڈ میں بایولوجیکل مصنوعات کا طریقہ کار دریافت کیا۔

1960- 1-SIR FRANK MACFARLANE BURNET

2-SIR PETER BRIAN MEDAWAR

"امیونولوجیکل" قوت برداشت حاصل کرانے کا طریقہ دریافت کیا۔

1961- GEORG VON BEKESY

کان کے اندر [illegible] کی اندرونی حصہ میں فزیکل میکنزم کے ذریعہ عمل کس طرح ہوتا ہے۔

1962- 1-FRANCIS HARRY COMPTON CRICK

2-JAMES DEWEY WATSON

3-MAURICE HUGH FREDERICK WILKINS

مرکزی تیزابیہ کے سالماتی ڈھانچے کو سمجھا اور اس کے ذریعہ زندہ میٹریل تک معلومات کس طرح پہنچتی ہے اس پر تحقیق کی۔

1963- 1-SIR JOHN CAREW ECCLES

2-SIR ALAN LLOYD HODGKIN

3-SIR ANDREW FIELDING HUXLEY

اعصابی خلیوں کے ممبرین کے مرکز اور محور میں ہیجان اور سکون کس طرح ہوتا ہے اور اس کے آیونک میکنزم کو سمجھا۔

1964- 1-KONRAD BLOCH

2-FEODOR LYNEN

دونوں نے کولیسٹرول اور چربی کے تیزاب کے میکنزم کو اور ان کے مسلسل عمل کو سمجھا۔

1965- 1-FRANCOIS JACOB

2-ANDRE LWOFF

3-JACOUES MONOD

این زائمس اور وائرس کے مصنوعات پر کس طرح جینیٹک کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

1966- 1- PEYTON ROUS

2-CHARLES BRENTON HUGGINGS

۱- ٹیومر پیدا کرنے والے وائرس دریافت کئے۔

۲- پروسٹیٹک کینسر کا ہارمونز کے ذریعہ کس طرح علاج کیا جائے۔

1967- 1-RAGNAR GRANIT

2-HALDAN KEFFER HARTLINE

3-GEORGE WALD

بنیادی نفسیات اور کیمیاوی اجزا کے ذریعہ آنکھ میں دیکھنے کے عمل سے متعلق دریافتیں کیں۔

1968- 1-ROBERT W. HOLLEY

2-HARGOBIND KHORANA

3-MARSHALL W. NIRENBERG

پروٹین میں جینیٹک کوڈ اور اس کے عمل کی وضاحت کی۔

19[illegible]

[illegible]

وائرس [illegible] کے ذریعہ نقل بنانے کا میکنزم دریافت کیا۔

1970- 1-SIR BERNARD KATZ

2-ULF VON EULER

3-JULIUS AXELROD

اعصاب (نروز) کے آخری سروں تک "ہیومرل" کا ٹرانسمشن اور اس کے اسٹور کرنے کا میکنزم دریافت کیا۔

1971- EARL W. JR. SUTHERLAND

ہارمونز کے عمل کے طریقہ کار اور میکنزم کو سمجھا۔

1972- 1-GERALD M. EDELMAN

2-RODNEY R. PORTER

اینٹی باڈیز کی کیمیاوی ساخت دریافت کی۔

1973- 1-KARL VON FRISCH

2-KONRAD LORENZ

3-NIKOLAAS TINBERGEN

تنہا یا معاشرتی برتاؤ کے پیٹرن کی تنظیم دریافت کی۔

1974- 1-ALBERT CLAUDE

2-CHRISTIAN DE DUVE

3-GEORGE E. PALADE

کسی خلیہ کی ساخت اور عمل کے درمیان نظام کی دریافت کی۔

1975- 1-DAVID BALTIMORE

2-RENATO DULBECCO

3-HOWARD MARTIN TEMIN

ٹیومر کے وائرسز اور خلیہ کے جینیٹک مادوں میں مداخلت کا عمل دریافت کیا۔

1976- 1-BARUCH S. BLUMBERG

2-D. CARLETON GAJDUSEK

متعدی بیماریوں کے دفاع کے لئے نیا سسٹم دریافت کیا۔

1977- 1-ROGER GUILLEMIN

2-ANDREW V. SCHALLY

3-ROSALYN YALOW

۱ اور ۲- دماغ میں پیپٹائڈ ہارمونز کی پیدائش کا سبب دریافت کیا۔

۳- پیپٹائڈ ہارمونز کے ریڈیائی مدافعتی سسٹم کے ارتقا میں تعاون۔

1978- 1-WERNER ARBER

2-DANIEL NATHANS

3-HAMILTON O. SMITH

اینزائمس کی پابندی کے ذریعہ سالماتی جینیٹکس کے مسئلوں کا حل دریافت کیا۔

1979- 1-ALAN M. CORMACK

2-SIR GODFREY N. HOUNSFIELD

کمپیوٹر کی مدد سے "ٹوموگرافی" کے عمل کو وضاحت دی۔

1980- 1-BARUJ BENACERRAF
2-JEAN DAUSSET
3-GEORGE D. SNELL

جینز کے عمل سے خلیہ کی باہری سطح کی تخلیق جو مدافعتی نظام کے عمل کو قائم رکھتا ہے کی دریافت کی۔

1981- 1-ROGER W. SPERRY
2-DAVID H. HUBEL
3-TORSTEN N. WIESEL

۱-دماغ کے سیریبرل نصف دائرے کے عمل کی دریافت کی۔
۲ اور ۳-بصری نظام کا طریقہ کار دریافت کیا۔

1982- 1-SUNE K. BERGSTROM
2-BENGT I. SAMUELSSON
3-SIR JOHN R. VANE

"پروسٹاگلینڈ ائن" اور ان سے متعلق ایکٹو بایولوجیکل اشیا کی دریافت۔

1983- BARBARA MC CLINTOCK

حرکت کرنے والے جینیٹک عناصر دریافت کئے۔

1984- 1-NIELS K. JERNE
2-GEORGES J.F. KOHLER
3-CESAR MILSTEIN

جسم کے دفاعی سسٹم کی دریافت اور مونوکلونل اینٹی باڈیز کی تخلیق کا اصول دریافت کیا۔

1985- 1-MICHAEL S. BROWN
2-JOSEPH L. GOLDSTEIN

کولسٹرول کے اجزائے ترکیبی اور ان کے باترکیب عمل کی دریافت کئے۔

1986- 1-STANALEY COHEN
2-RITA LEVI-MONTALCINI

پرورش پانے کے حقائق دریافت کئے۔

1987- USUSUMU TONEGAWA

اینٹی باڈی اور ان کے انحراف کی تخلیق کا جینیٹک اصول دریافت کیا۔

1988- 1-SIR JAMES W. BLACK
2-GERTRUDE B. ELION
3-GEORGE H. HITCHINGS

دواؤں کے ذریعہ علاج کے اہم اصول دریافت کئے۔

1989- 1-J. MICHAEL BISHOP
2-HAROLD E. VARMUS

خلیوں میں استقامی وائرل اور "او نکو جینز" کی حقیقت دریافت کی۔

1990- 1-JOSEPH E. MURRAY
2-E. DONNALL THOMAS

انسانی بیماریوں کے سلسلے میں اعضا اور خلیوں کی پیوندکاری اور ان کا طریقہ علاج دریافت کیا۔

1991- 1-ERWIN NEHER
2-BERT SAKMANN

خلیہ میں تنہا "آیون چینل" دریافت کیا۔

1992- 1-EDMOND H. FISCHER
2-EDWIN G. KREBS

حیاتیات کے ضابطہ کے میکنزم میں پروٹین کی ماہیت بدلنے کا عمل دریافت کیا۔

1993- 1-RICHARD J. ROBERTS
2-PHILLIP A. SHARP

اپنے اپنے طور پر "شق" ہوئے جینز دریافت کئے۔

1994- 1-ALFRED G. GILMAN
2-MARTIN RODBELL

"جی" پروٹینز اور ان کے عمل کی دریافت کی جو خلیہ کے مرکز میں سگنل بھیجتی ہیں۔

1995- 1-EDWARD B. LEWIS
2-CHRISTIANE NUSSLEIN VOLHARD
3-ERIC F. WIESCHAUS

جنین پر ابتدائی دور میں جینیٹک کنٹرول کا عمل دریافت کیا۔

1996- 1-PETER C. DOHERTY
2-ROLF M. ZINKERNAGEL

خلیہ کے دفاعی نظام کی خصوصیات دریافت کیں۔

1997- STANLEY B. PRUSINER

"پرائی اونز" سسٹم دریافت کیا جسے انفکشن کا نیا بایولوجیکل اصول کہا جاتا ہے۔

1998- 1-ROBERT F. FURCHGOTT
2-LOUIS J. IGNARRO
3-FERID MURAD

قلب کی ترتیب قائم رکھنے کے لئے "نائٹرک اوکسائڈ" سالمہ سگنل کے بطور کام کرتا ہے۔ یہ اہم دریافت کی۔

1999- GUNTER BLOBEL

پروٹین تبدیلی مقام کی سگنل دیتی ہے جس سے پروٹین خلیہ میں ایک جگہ سے حرکت کرکے صحیح مقام پر پہنچتی ہے۔

2000- 1-ARVID CARLSSON
2-PAUL GREENGARD
3-ERIC KANDEL

نروس سسٹم (اعصابی نظام) میں سگنلوں کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کا فطری طریقہ دریافت کیا۔

2001- 1-LELAND H. HARTWELL
2-R. TIMOTHY HUNT
3-PAUL M. NURSE

خلیہ کے سائیکل (گردش) کے باضابطہ رہنے کی کنجی دریافت کی۔

☆☆☆

عبدالغنی شیخ

قلم، قلم کار اور کتاب

ادب اور ریاضت:

"ایک ادیب کے لئے ۹۹ فیصد ذہانت، ۹۹ فیصد ضبط و نظم اور ۹۹ فیصد ریاضت درکار ہے۔" (ولیم فالکنر)

"عمدہ ادب ایک ماہر فن مصنف کی زندگی کا خون ہوتا ہے۔" (ملٹن)

ایک نقاد کے الفاظ میں کتاب کی تخلیق بچہ جننے کے مترادف ہے۔ ایک ادیب کو کتاب تخلیق کرنے کے لئے دردِ زہ کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ امریکی قلم کار ولیم سٹیرون سے جب پوچھا گیا کہ کیا لکھنا آپ کے لئے باعث لطف انگیز ہے۔ 'بالکل نہیں' اس کا جواب تھا۔ 'جب کام ٹھیک چلتا ہے تو مجھے شادمانی ہوتی ہے۔ لیکن ہر روز لکھنے کی شروعات کرتے ہوئے وہ خوشی چلی جاتی ہے...... لکھنا قیامت ہے۔ ہمیں اس صورت حال کا سامنا کرنا چاہئے۔'

عمر خیام نے مرنے سے چند لمحہ پہلے کہا تھا 'اے خدا! میں نے تجھے پہچاننے کی بہت کوشش کی لیکن میں اس کا حق ادا نہ کر سکا اور نہ قلم سے اس کا کماحقہ اظہار کر سکا۔'

انگریز دانشور جے۔ بی پرسٹیلے نے ایک دفعہ انگریز قلم کاروں کی سوسائٹی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ 'ایک قلم کار شاید دو موقعوں پر خوش ہوتا ہے۔ یہ موقعے زیادہ دیر نہیں رہتے۔ پہلا موقع تب آتا ہے جب وہ ایک نئی کتاب سے متعلق سوچتا ہے۔ جس پر اس نے ابھی کام شروع نہیں کیا ہے اور وہ بیٹھا اپنے پائپ سے تمباکو پی رہا ہے...... پھر کام کرنے کا وقت آتا ہے اور اس کی خوشی چلی جاتی ہے۔ دوسرا موقع تب آتا ہے جب اس نے اپنا کام مکمل کیا ہوتا ہے۔ تب محسوس ہوتا ہے کہ کندھے سے ایک بڑا بوجھ اتار اگیا ہے...... پروف واپس آنے پر بے چینی بھی واپس آتی ہے۔'

جارج سایمینسن نے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔ 'لکھنا ایک عام پیشہ نہیں ہے بلکہ ایک ناشاد پیشہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ قلم کار کبھی مطمئن نہیں رہ سکتا۔'

بہت سارے نامور قلم کاروں کو شروع میں ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا ہے اور سخت ریاضت اور محنت کی بدولت آخر کار کامیابی نے ان کا قدم چوما ہے۔

نوبل انعام یافتہ ادیب گبرائیل گارشیا مارکیوز زندگی کے چالیس سال تک بطور قلم کار ناکام رہا۔ وہ اپنے متعلق لکھتا ہے۔ 'میں نے سوچا کہ بطور قلم کار یہی کام کے لئے میں موزوں نہیں ہوں۔ جذباتی اور نفسیاتی طور پر یہ لمحات میرے لئے دوبھر تھے۔ مجھے اپنے متعلق یہ خیال تھا کہ میرا کوئی وجود نہیں۔ میں فالتو اور بے کار ہوں۔ کسی شمار وقطار میں نہیں۔ تب One Hundred Years of Solitude نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔' اسی پر مصنف کو نوبل پرائز ملا تھا۔

ایک تجزیہ کار کے مطابق ۱۷ محنتی قلم کاروں میں اوسطاً ایک قلم کار کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ برسوں کی محنت کے بعد اچانک اس کی ایک کتاب قبول عام کی سند حاصل کرتی ہے۔

نئی کہانی کے باوا آدم ایڈگر ایلن پو نے اپنی ایک نظم The Raven دس سال تک بار بار لکھی اور اس کو اس کا معاوضہ صرف دو ڈالر ملے۔ پو کو شروع میں اپنی کتابوں کا کوئی معاوضہ نہیں ملا۔ ۱۳ راگست ۱۸۲۰ء کو اس نے ایک پبلشر کو لکھا۔ 'میں چاہتا ہوں کہ آپ کی فرم میری کتابیں چھاپنا جاری رکھے۔ اگر آپ میری نئی کتاب چھاپ لیں گے تو مجھے یہی شرائط قبول ہیں، جن کے تحت آپ میری کتاب چھاپتے تھے۔ سارا منافع آپ کے حصے میں رہے گا۔ مجھے اپنے دوستوں میں تقسیم کے لئے صرف بیس کتابیں چاہئیں۔'

پبلشر نے جواب میں لکھا۔ 'ہمیں افسوس ہے...... کہ ہم نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔'

چیخوف اپنے ڈراموں اور خاص خاص افسانوں کی اشاعت سے پہلے نظر ثانی کرتا تھا۔ ان کے عنوانات اور انجام بدلتا تھا۔ تاہم مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی تحریروں کو ہمیشہ تنقیدی نظروں سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے۔ 'شرط اول یہ ہے کہ آدمی بہت کچھ لکھے۔ کچھ نہ کچھ نکل آئے گا۔ لکھے جاؤ۔ لکھے جاؤ، بس لکھے جاؤ، ایک کہانی نہیں چھپتی، دوسری لکھو، تیسری لکھو۔ کوئی نہ کوئی تو چھپے گی ہی...... تیس برس کو پہنچتے ہی اپنی سمت طے ہو جانی چاہئے...... لکھ چکنے کے بعد فوراً باہر مت نکالئے۔ پڑا رہنے دیجئے کچھ عرصے۔ مسودہ تہہ کر کے کئی کئی مہینے بھول جایا کیجئے۔ اتنے میں اور کوئی نئی چیز اٹھا لیجئے۔ بعد میں جب پہلے مسودے کا رخ کریں گے تو اس میں ترمیم کے قابل بہت کچھ ملے گا۔' (مترجمہ ظ۔ انصاری)

بقول چیخوف 'ادیب کا فرض ہے کہ سب کچھ جانے، ہر بات سمجھے۔ معلوم

شیخ منزل، فورٹ روڈ بلیہ، ملداغ

کرنے کے لئے [illegible] کہا جائے۔'

ولیم فاکنر بھی ایک قلم کار کو یہی مشورہ دیتا ہے کہ اسے اپنے کام پر مطمئن نہیں ہونا چاہئے۔ وہ لکھتا ہے۔ 'ہمیشہ خواب دیکھو اور اپنی بساط سے بڑھ کر بلندی پر پرواز کرو...... ایک فنکار ایسی مخلوق ہے جسے جن چلاتے ہیں۔'

افلاطون نے اپنی شہرہ آفاق کتاب The Republic کے [illegible] کو [illegible] اور دلکش بنانے کے لئے پچاس مرتبہ لکھا۔ ہیمنگوے نے اپنے مشہور ناول A Farewell to Arms کا آخری صفحہ ۳۹ مرتبہ لکھا۔ کیتھرین [illegible] Ship of Fools [illegible] لکھنے میں بیس سال لگائے۔ پوپ ایک شعر لکھنے میں سارا دن لگاتا تھا۔ گولڈ اسمتھ چار مصرع لکھنا دن بھر کا کام سمجھتا تھا۔ The Deserted Village لکھنے میں اسمتھ نے سات سال لگائے۔ زین گیرے صرف ایک کہانی لکھنے کے لئے مہینوں بلکہ ایک سال سے بھی زیادہ مدت محنت کرتا تھا۔ وہ اسے بار بار لکھتا۔ کرداروں کو بدلتا۔ پلاٹ میں تبدیلی لاتا اور پھر اسے پڑھتا تھا۔ پانچ سال تک ان کہانیوں سے زین کو ایک دھیلا بھی نہیں ملا۔

مارگریٹ مچل نے ۱۰۳۷ صفحات پر مشتمل اپنا ضخیم اور مشہور ناول Gone with the wind کی نوک پلک سنوارنے میں بڑی ریاضت کی اور اسے بیس مرتبہ لکھا۔ جب کہ اس کا پہلا باب ۷۰ مرتبہ لکھا گیا۔

نوبل انعام یافتہ ادیب سنکلر لیویس اپنی کتاب Main Street کی وجہ سے مشہور ہوا۔ لیویس نے یہ ناول تین دفعہ لکھا اور اس کی تکمیل میں ۷ سال لگے۔

'سرمایہ' (Das Capital) کی تصنیف کے سلسلے میں کارل مارکس نے مختلف موضوعات پر پندرہ سو سے زائد کتابوں کا مطالعہ کیا اور چالیس سال کام کیا۔ ۱۸۶۵ء کے اواخر میں مارکس نے اس کی چار جلدوں کا ابتدائی مسودہ تیار کر لیا۔ اس کتاب سے پہلے آدم اسمتھ کی اقتصادیات پر معرکۃ الآرا کتاب The Wealth of Nation لکھی گئی۔ بقول ایک نقاد اگر اول الذکر کتاب ایک سو سال پہلے نہ لکھی گئی ہوتی تو 'سرمایہ' نہیں لکھا جاتا۔

برنارڈ شا اپنی نگارشات کو وسیلہ معاش کے قابل ہونے سے پہلے نو سال مسلسل لکھتا رہا۔ وہ روزانہ بلاناغہ پانچ صفحات لکھتا تھا۔ چاہے دل لکھنے کی طرف مائل ہو یا نہ ہو۔ چالیس سال کی عمر تک برنارڈ شا اپنی تخلیقات سے صرف پانچ پونڈ کما سکا۔ شا کے لئے وقت بڑا قیمتی تھا۔ وہ لوگوں سے بہت کم ملتا تھا۔ نمبر دس ڈاؤننگ اسٹریٹ میں گھنٹوں بات چیت کرنا آسان تھا لیکن اہم سے اہم فرد کے لئے شہر سے باہر آیٹ لارنس گاؤں میں شا کے پرانے بنگلے پر چند منٹ گزارنا مشکل تھا۔ جب تک کوئی ضروری کام نہ ہو۔ وہ کسی سے ملنے نہیں جاتا تھا اور اپنا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں گزارتا تھا۔ کپڑے بدلتے وقت بھی وہ میز پر کتابیں پھیلا کر رکھ لیتا۔ کپڑے بدلتا جاتا اور کتاب پڑھتا جاتا تھا۔

شا تفریح کو چوپایوں کی دلچسپی کہتا تھا۔ وہ مختصر زندگی کو زیادہ سے زیادہ کام کے لئے بروئے کار لانے کے حق میں تھا۔ (برنارڈ شا۔ عبدالمغنی)

روسی قلم کار بورس پاسترنیک جنھوں نے مشہور ناول ڈاکٹر ژواگو لکھا، وقت کا بڑا قدر دان تھا۔ بیرون ملک سے آنے والے ملاقاتی ماسکو سے ۳۰ کلومیٹر دور جب پاسترنیک کے مکان پر پہنچتے تو دروازے پر یہ نوٹ چسپاں پاتے۔

'میں اس وقت کام کر رہا ہوں۔ کسی سے مل نہیں سکتا۔ [illegible] چلے جایئے۔'

کسی کے لئے ان سے ملاقات کا پہلے سے وقت لینا بھی مشکل تھا۔ البتہ [illegible] سکھوں سے ملتا تھا اور [illegible] کو ہر [illegible] تھا۔

ہیرالڈ روبنس [illegible] لکھنے کے لئے [illegible] منزل کی اپنی مخصوص بیٹھک میں [illegible] اس کے [illegible] کی سیڑھی ہٹا لی جاتی تھی۔

بالزاک اپنے کو دن رات کمرے میں بند رکھتا تھا۔ کوئی اس کے تخلیقی کام میں مخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے کھانا دروازے پر رکھ دیا جاتا تھا۔ جو وہ خود اٹھا لیتا۔

انگریزی کے شاعر ٹینی سن نے مشہور تصنیف 'انفارنو' کا جب انگریزی میں ترجمہ کیا تو اس کے لئے وہ روزانہ وہ وقت وقف کرتا تھا جو اسے چائے بنانے میں صرف ہوتا تھا۔ چائے کی کیتلی کو اسٹو پر رکھتا اور وہ 'انفارنو' کا ترجمہ کرتا اور جب چائے ابل جاتی تو وہ ترجمہ کا کام دوسرے دن کے لئے چھوڑ دیتا تھا۔ اس طرح [illegible] 'انفارنو' کے ضخیم باب کا ترجمہ کئی سال میں ختم کیا۔

سومرسٹ مام گیارہ سال تک بطور قلم کار مفلوک الحال رہا۔ اس دوران اس نے ناولوں اور کہانیوں سے وہ سالانہ صرف سو ڈالر کما سکا۔ کبھی وہ فاقہ کشی کرتا تھا۔ مام ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کے دوستوں نے مام کو مشورہ دیا کہ وہ فکشن لکھنے کے بجائے پریکٹس کرے لیکن وہ اپنے ارادے پر ڈٹا رہا۔ پھر وہ دن آیا جب سومرسٹ مام کا شمار انگریزی کے بہترین ناول نگاروں میں ہونے لگا۔

پولیٹزر انعام یافتہ ناول نگار اور شاعر رابرٹ پین وارن رقم طراز ہے: 'کرنل شارپ کے مقدمے کے سلسلے میں جس نے Beauchamp کے مقدمے پر لکھے ایک پرانے پمفلٹ کو پڑھنے میں صرف پانچ منٹ لئے لیکن اس پر کتاب لکھنے میں چھ سال لگائے۔ میں ہر کتاب کو فوراً شروع کرتا ہوں لیکن اس کی تکمیل میں بڑا وقت لگتا ہے۔'

ایمیل زولا کے صیقل میز پر No day without its lines 'روزانہ اپنی معینہ سطور لکھو' لکھا تھا اور وہ اس پر عمل کرتا تھا۔ وہ رقم طراز ہے:

'اگر بلیک کافی کے گیلن پی کر بھی کوئی نادر خیال ذہن میں نہیں آتا تو بائبل سے اشعار قلم بند کرتا ہوں یا اپنے اخبار کے کالم کی نقل کرتا ہوں۔'

Tennessee williams تو پہلے پہ جاتا اور سیدھا اپنے ٹائپ رائٹر کے پاس جا کر گھنٹوں کام کرتا۔ اس کی یہ عادت تقریباً تادم حیات رہی۔

ولیم اسٹیرن روزانہ اوسطاً ڈھائی یا تین صفحات لکھتا تھا۔ جس پر پانچ گھنٹے لگتے تھے۔ ان پانچ گھنٹوں میں حتمی تحریر پر بہت کم وقت جاتا۔ لکھنے سے پہلے مصنف اپنی تخلیق کے حسن و قبح اور عوامل پر غور و فکر کرتا تھا۔

میکائل آرلین نے دس سال تک اپنی کہانیوں کے بیچنے میں صرف دو ڈالر کمائے۔ ایک روز شام کو چھپنے والے لندن کے ایک اخبار میں اس کی ایک افسانوی تخلیق قبول کی گئی اور وہ یک لخت شہر میں مشہور ہو گیا۔

امریکی ادیبہ ڈوروتھی پارکر لکھتی ہے کہ ایک کہانی کی تکمیل میں اس کو چھ ماہ لگتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کے نام ٹیلی فون ڈائرکٹری اور اخبارات کے Obituary (خبر مرگ) کے کالم سے لیتی ہیں۔

شیکسپیئر کی طرح ان میں اضافہ کرتے ہیں... بعد رد کیا اور اطمینان سے بیٹھ کر خیال کیا۔ اس کو شاگرد رسوا اپنے استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دوسری کے ... کی باتیں سنتا ہے... حالات پر پہنچتا تھا اور ... مسودوں کی غرض سے لئے ... ایک ہزار مسودے ... اور ... پر تبصرے لکھے۔

... اور رسائل کے مدیروں سے تخلیقات واپس آ جانا اور Rejection slip ملنا ... کے لئے معمول کی بات ہے۔ شیکسپیئر ... ان سے نہیں بچے ہیں۔

عظیم شاعر ... کو اس کا پہلا مجموعہ کلام شائع کرنے کے لئے کوئی ناشر نہیں ملا۔ ... اس سے اتنا بددل ہوا کہ اپنا مجموعہ کلام ... آگ کی نذر کر دیا۔

ولیم گولڈنگ کو اپنا ایک تخلیقی مسودہ مختلف پبلشروں سے بار بار واپس آنے لگا۔ اپنے اس تجربے کو ... ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ "میں ... (مسترد مسودہ) کے بعد سے گرنے کی معمولی کی آواز کا مانوس ہو چکا تھا، جو میں نے کسی ناشر کو بھیجا ہوتا تھا اور ڈاکیہ میرے گھر پر پھینک جاتا تھا۔ میرا پہلا مسودہ قبول کرنے سے پہلے میں نے بعد کی ایسی سترہ آوازیں سنی ہیں۔"

ولیم گولڈنگ کو اپنے ناول Lord of the Flies پر ۱۹۸۳ء میں نوبل پرائز ملا۔ جب اس نے یہ ناول لکھا تو اس کی عمر ۴۳ سال تھی۔ کتاب چھپنے پر گولڈنگ نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ ایک دن اس کو اس کتاب پر نوبل پرائز ملے گا۔

جو ہن کریسی کے پہلے ناول کی فروخت سے پہلے ۷۴۳ مرتبہ اس کی تخلیقات مسترد کی جا چکی تھیں۔

ہنری ڈیوڈ تھورو کی پہلی کتاب A walk on the concord and Merrimack Rivers چھاپنے کے لئے کوئی پبلشر نہیں ملا۔ آخر کار مصنف نے اسے اپنے خرچ پر چھپوایا اور کتب فروش کو ایک ہزار کاپیاں فروخت کرنے کے لئے دیں۔ ایک سال بعد کتب فروش نے ان میں ۷۰۶ سے زیادہ کاپیاں بلا فروخت واپس کیں۔ تھورو کے پاس دو سو کے قریب دوسری کتابیں تھیں۔ ایک دفعہ وہ مزاحاً بولا۔ "میرے پاس اب تقریباً نو سو کتابوں کی لائبریری ہے۔ جن میں سات سو سے اوپر میری اپنی لکھی ہیں۔"

جیفری فرنول کی پہلی کتاب The Braod Highway کو ۲۴ پبلشروں نے مسترد کیا۔ تاہم جب یہ شائع ہوئی تو بقول ... انگلینڈ کے ہر لڑکے اور لڑکی نے اسے خریدا۔

جیمز ... لکھتا ہے۔ "لکھنے سے میں نے قوت ارادی، بردباری اور نظم و ضبط سیکھا۔ جو ایک لکھنے والے کے اہم ترین گن ہیں۔ یہ میں نے اپنے پہلے ناول Drift سے سیکھا۔ اس ناول نے ایک پبلشر سے دوسرے پبلشر تک اٹھارہ سفر کیا اور انیسویں سفر میں اپنی منزل مقصود پر پہنچا۔"

شروع میں جین آسٹن کے شاہکار ناول Pride and Prejudice کو پبلشروں نے قبول نہیں کیا۔ جین نے اسے ۱۷۹۶ء میں لکھنا شروع کیا تھا اور سترہ سال بعد ۱۸۱۳ء میں یہ چھپنا ممکن ہو سکا۔

کپلنگ کو کم سے کم ایک مرتبہ یہی تجربہ پیش آیا۔ The Ladies Home Journal کے مدیر ایڈورڈ بوک نے کپلنگ کا ایک مضمون اس استدعا کے ساتھ واپس کیا کہ جو چھپنے کی پالیسی کے مطابق لکھیں اور کپلنگ نے دوبارہ لکھا۔

روز لوکر ج نے ایک ناول Rain Tree Country لکھا جس میں سات سال لگائے اور یکے بعد دیگرے بیسیوں پبلشروں کو اشاعت کے لئے بھیجا لیکن کسی نے بھی قبول نہیں کیا۔ بعد میں ایک فلم ساز نے اس ناول کو فلم بندی کے لئے لیا اور مصنف کو تیس ہزار ڈالر دیئے۔ غالباً مصنف نے خود اسے شائع کیا تھا۔ کتاب پہلے بہت کم بکی تھی۔ فلم بننے پر بیوی کی مجبوری سے بکنے لگی اور مصنف نے تیس ہزار ڈالر کمائے۔

نقادوں اور پبلشروں نے اکثر ایک اچھی کتاب کی پہچان میں غلطیاں کی ہیں۔ انگریزی کے ایک ادیب کے مطابق کتابیں مسترد ہونے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ پیشہ ور ادیبوں کو جن کی خدمات پبلشر حاصل کرنا چاہتے ہیں، مسودے پڑھنے کی فرصت نہیں ہوتی ہے۔ اس طرح ۸۰ فیصد مسودے پڑھے بغیر واپس کئے جاتے ہیں۔

امریکی ادیب تھامس ڈولفن نے اپنی نصف زندگی کہانیاں لکھنے میں گزار دی۔ لیکن کوئی کہانی شائع نہیں ہوئی۔ آخر کار اس نے ایک ناول لکھا۔ اس کا مسودہ ایک پبلشر کو بھیجتے ہوئے اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "میں ایک ناکام قلم کار ہوں۔ اگر یہ مسودہ بھی واپس آتا ہے تو میں کبھی نہیں لکھوں گا۔" اور یہ ناول کامیاب ثابت ہوا۔

لوئیس گولڈ رنگ کا ناول Magnolia Street سے متعلق ایک ناشر نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ ناول مصنفہ کی پچھلی کتابوں کی طرح نہیں بکے گی۔ لوئیس نے ایک مرتبہ قسمت آزمائی کا ارادہ کیا اور مسودہ کسی دوسرے ناشر کو بھیجا۔ جب کتاب کی اشاعت ہوئی تو کچھ مدت بعد روزانہ اوسطاً اس کی پانچ ہزار کاپیاں بکنے لگیں اور اس کا ۲۶ زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ اس کی دس لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس پر فلم بنی اور اسے ڈرامائی صورت بھی دی گئی۔

رچرڈ باخ کی طویل کہانی Soaring کو چھاپنے سے پہلے اٹھارہ پبلشروں نے مسترد کیا۔ آخر کار ایک پبلشر میکملن نے ۱۹۷۰ء میں اسے چھاپا۔ ۱۹۷۵ء تک اس کی ۷۰ لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئی تھیں۔

ایک کامیاب ناول Catcher in the Rye اشاعت سے پہلے تین مرتبہ مسترد ہوا۔

رچرڈ ہوکر کا جنگ سے متعلق مزاحیہ ناول Mash اکیس پبلشروں نے واپس کیا۔ جب ایک دفعہ یہ چھپا تو اس کا شمار Best seller ناولوں میں ہونے لگا۔ اس پر کامیاب فلم اور ٹی وی سیریل بنا۔

بیزاکس لیوین کے اس قول کے ساتھ ہم "ادب اور ریاضت" کے موضوع کا اختتام کرتے ہیں۔ "ایک کتاب لکھنا چھلکوں، پرانے پھولوں، خون اور زندگی کے باقیات کو جمع کر دینے کر کھاد کا ایک ڈھیر بنانے کے مترادف ہے۔ جب الفاظ اور ناکامیاں کیمیاوی کھاد بن جاتی ہیں اور چھوٹے آلو کی چھال سے کونپلیں پھوٹتی ہیں تو شاخیں کے بیج پودے بن جاتے ..... ہر شے کتاب بن جاتی ہے۔"

ادب اور حقیقت نگاری

"ترولپ کے تبصرہ ہے میں اکثر سوچتا ہوں ... بعض اوقات بڑے کمال کی دلچسپ

باتیں ملنے میں آتی ہیں" (چیخوف)

ادیب نے عمومی طور پر زندگی کی ترجمانی کی ہے اور انہی تخلیقات کو قبولِ عام کی سند ملی ہے۔ جن میں حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے۔ ایک کامیاب قلم کار لکھنے سے پہلے ریسرچ کرتا ہے۔ چاہے فکشن کیوں نہ ہو۔ مغرب میں ایک قلمکار پر سکون جگہ جاکر کام کرتا ہے۔ ایک کامیاب ادیب کے پاس تین چار سکریٹری ہوتے ہیں۔ وہ خود اگر کسی مقام کو نہ دیکھ سکے تو اپنے ایک سکریٹری کو بھیجتا ہے۔ مشرقی ملکوں میں اس ضمن میں جاپان اکیلا مغرب کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

جارج آرویل کے خودنوشت سوانحی ناول Down and out in Paris and London (مطبوعہ ۱۹۳۶ء) اس کی اپنی کہانی ہے۔ وہ ان دو شہروں میں اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں رضاکارانہ طور پر انتہائی غریبی اور بے بسی کی حالت میں زندگی بسر کرتا ہے۔ آرویل اپنے مشاہدات اور تجربات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان دنوں پیرس میں ایک غریب آدمی روزانہ ایک شلنگ پر گزارہ کر سکتا تھا۔ کتاب میں ٹیلی فون ڈائرکٹری کی طرح رین بسیراؤں کی فہرست دی ہے جہاں بے خانماں اور غریب لوگ رات گزار سکتے ہیں۔

رابرٹ ٹریسل (۱۹۱۱۔۱۸۷۰ء) نے اپنی تصنیف The Ragged Trousered Philanthropists میں انگلینڈ کے مزدوروں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے۔ مصنف نے جو تپ دق کے مرض سے قریب المرگ تھا ایک پینٹر کے طور پر کام کرتے ہوئے مالکان کے ہاتھوں مزدوروں کا استحصال ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس پر مالکان کی امارت قائم تھی۔

کلکتہ سے متعلق لائپیرے کی تصنیف The city of Joy بھی سماجی امتیاز کا نقشہ پیش کرتی ہے جو مصنف کے ذاتی مشاہدے کا نتیجہ ہے۔

چارلس ڈکنز کی ایک اولاد مونیکا ڈکنز نے ایک خادمہ کی زندگی سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ایک گھر میں بطور نوکرانی کام کیا۔

سامرسٹ مام اور چیخوف نے ڈاکٹر ہونے کے ناطے مریضوں وغیرہ سے متعلق قارئین کو اپنے تجربات میں شامل کیا ہے۔

سر آرتھر کینن ڈائل نے شرلاک ہومز کے زندہ جاوید کردار کی تخلیق اسکاٹ لینڈ کے ایک سرجن جون بیل کی غیر معمولی ذہانت سے متاثر ہو کر کی۔ سر کینن ڈائل اس کا شاگرد رہا تھا۔ جان بیل اپنے مشاہدوں اور تجربوں کے بل بوتے بیماریوں کی حیرت انگیز تشخیص کرتا تھا۔ وہ مریض کا ہاتھ دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ موچی ہے یا سرجنٹ۔

سر کینن ڈائل نے پہلے پہل Study in Scarlet میں قارئین کو شرلاک ہومز سے روشناس کرایا۔

جاسوسی اور جرائم پر لکھنے والی امریکی ادیبہ پٹریشیا کورن ویل لکھتی ہے "میں نے پہلے پہل جب جرائم کی کہانیاں لکھیں تو میری تحریر میں کوئی وزن نہیں تھا۔ مجھے لائبریری کی کتابوں اور انٹرویوز سے کہیں زیادہ مواد مطلوب تھا۔ چنانچہ مصنفہ نے سرجیکل وارڈ اور مردہ خانے میں ڈاکٹروں کے ساتھ روزانہ بارہ بارہ گھنٹے گزارے۔ وہ لکھتی ہے: 'میں شروع کے اس تجربے کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ جب میں نے ربڑ کا دستانہ پہن کر اپنے ہاتھ کو ایک مردہ انسان کی چھاتی کے اندر ڈالا [illegible] میں چونک پڑی تھی۔"

تہران میں ایک قلم کار نے حال میں ایک حقیقی ناول لکھنے کے لئے [illegible] بار بار مار اپیٹا اور گھنٹوں اس کو ایک کمرے میں بند رکھا۔ بیوی نے جج کے سامنے [illegible] طلاق کی درخواست پیش کرتے ہوئے بیان دیا کہ مار پیٹ کی وجہ [illegible] بلبلاتی تو اس کا شوہر اس کے رد عمل کو نوٹ کرتا تھا۔ پھر اس کا شوہر اس [illegible] دلجوئی کرتا اور معافی مانگتا تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ کبھی اس کو گھنٹوں ایک کمرے میں بند رکھا جاتا تھا اور اس کا شوہر ایک کھڑکی سے اس کا رد عمل جانچا جاتا تھا۔

ایک انگریز قلم کار پیٹر مور نے پچھلے دنوں انگلینڈ میں ایک دہیا تی[illegible] تقریباً ایک ماہ کے دوران اپنے کتے کے ہمراہ لگ بھگ آٹھ سو کلو میٹر کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ اپنے سفر نامہ My penniless journey میں اپنے تجربوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اس دوران کیسے کیسے ٹٹ پونجی لوگوں سے اس کا پالا پڑا۔ کیسے کیسے مسافر اس کی مدد کے لئے آگے آئے۔ اور کیسے کیسے لوگ مصنف کے ساتھ سرد مہری اور رکھائی سے پیش آئے۔

ادیب اور مطالعہ:

ایک آدمی کو پائپ دو، وہ اس سے تمباکو پئے گا
ایک آدمی کو کتاب دو، وہ اسے پڑھے گا
اس سے اس کے گھر میں اُجالا آئے گا
اور خوشیاں ناچیں گی
چاہے اس کے کمرے میں غریبی کیوں نہ جھلکتی ہو۔ (جیمز تھامسن)

"میری تمنا ہے کہ مرنے کے بعد میرا بس چلے تو اپنی قبر میں کتابیں ہی کتابیں رکھوں، تاکہ میں انہیں پڑھا کروں۔" (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

"اگر دنیا کی تمام سلطنتوں کے تاج میری کتابوں اور شوق مطالعہ کے بدلے میں میرے قدموں پر رکھ دیا جائے تو میں ان سب کو ٹھکرا دوں گا۔" (کارلائل)

برنارڈ شا نے شروع میں برٹش میوزیم کو اپنا مدرسہ، مکان اور کتب خانہ بنالیا تھا۔ برنارڈ شا یہاں متنوع علوم و فنون سے فیضیاب ہوئے، جو بعد میں ایک مصنف اور مقرر کی حیثیت سے ان کے کام آتا رہا۔

امریکی ادیب تھامس وولف سے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان بیس ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا۔

ابن سینا نے فارابی کی کتاب چالیس مرتبہ پڑھی۔ امام رازی اور سنی مسلک کے چاروں ائمہ، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور امام مالکؒ وسیع المطالعہ تھے۔

لین یوتانگ نے لکھا ہے: 'ایک مشہور فاضل کنفیوشس کے فلسفے کی کتابیں مادر زاد ننگا پڑھتا تھا۔ ایک اور عالم رات کو مطالعہ کرتے وقت اپنی چٹیا میں رسی ڈال دیتا تھا تاکہ کتابیں پڑھتے ہوئے نیند نہ آئے۔ ایک اور صاحب علم اپنی خادمہ کو پاس کھڑا رکھتا۔ جس کو ہدایت تھی کہ جونہی اسے نیند آئے تو وہ جگا دے تاکہ کتب بینی میں حرج نہ ہو۔

اردو کے متعدد قلم کاروں نے اپنی کتب بینی کا تذکرہ کیا ہے۔ چند اصحاب کی

...سے بہت اقتباسات شائع ہوئے۔

آل احمد سرور: 'ہمارے گھر میں بیت بازی کا بہت رواج تھا۔ اور شعر کی کتابیں پڑھنے کا شوق بہت چھوٹی عمر میں شروع ہو گیا تھا۔ جب پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا تو فسانۂ آزاد پڑھ ڈالی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں مراۃ العروس، توبۃ النصوح، الف لیلیٰ اور اس قسم کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ ہائی اسکول تک میں نے انگریزی کی بہت سی مشہور ناولیں پڑھ ڈالیں۔ کالج میگزین میں میری نظمیں اور مضامین شائع ہوتے تھے۔'

کرشن چندر: 'پہلی ادبی کتاب جو میں نے پڑھی وہ الف لیلیٰ ہے۔ پھر سدرشن اور پریم چند۔ میٹرک تک سارا اردو ادب کھنگال ڈالا۔ روسی ادب کا مطالعہ کیا۔ مجھے ناول نگاروں میں شولوخوف، ارنسٹ ہمینگوے اور ہاورڈ فاسٹ بہت پسند ہیں۔'

خواجہ احمد عباس: 'منشی پریم چند کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب میں صرف رومان اور سفر بازی نہیں ہوتی۔ انسانی زندگی کی سچی عکاسی ہوتی ہے۔'

مولانا عبدالماجد دریابادی: 'بچپن سے ہی کتابیں پڑھنے کا گہرا شوق تھا۔ عمر کا بارہواں سال تھا اور ساتویں درجے میں پڑھ رہا تھا کہ مضمون نگاری شروع کر دی۔ چودھویں سال میں مولانا شبلی کے زیر اثر آ گیا، ہکسلے، اسپنسر، مل، ہیگل وغیرہ پڑھ کر مذہب سے بیگانہ ہوا۔ تفسیر قرآن مجید پڑھی۔ دس بارہ سال کے الحاد اور تشکیک کے بعد از سر نو مسلمان ہوا۔'

عصمت چغتائی: 'بی اے کے بعد یونانی ڈرامہ شیکسپیئر سے لے کر اپسن اور برنارڈ شا تک بہت کچھ پڑھ ڈالا۔'

سردار جعفری: 'میرا گھر حد سے زیادہ مذہبی رنگ کا تھا۔ بزرگوں کی دیکھا دیکھی میر انیس کے رنگ کا مرثیہ لکھا۔ میں نے قرآن کی بہت سی آیتیں زبانی یاد کی تھیں۔ بعد میں آسکر وائیلڈ سے متاثر ہو کر ڈرامہ لکھا۔ گوئٹے کے فاؤسٹ سے ادب کی حقیقی بلندی اور عظمت کا احساس ہوا۔'

بعض بڑے آدمی تفریح یا الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے کے لئے ڈکشنری کا مطالعہ کرنے کے عادی تھے۔ ان میں لنکن ایٹ، براؤننگ اور لارڈ چیتھم شامل ہیں۔ موخر الذکر دو لغتوں کے ایک ایک لفظ سے واقف تھے۔ براؤننگ اور لنکن روز لغت کا مطالعہ کرتے تھے۔

ایرس کائن کولڈ ویلی جن کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں، اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ اپنی تخلیقی زندگی کے آغاز میں انہوں نے Lobster's Collegiate Dictionery کی تین کاپیاں خریدیں۔ ایک کاپی بالائی منزل کے ایک کمرے میں رکھی، جہاں وہ کام کرتا تھا۔ دوسری اپنے رہنے کے کمرے اور تیسری باورچی خانے میں رکھی۔ وہ رقم طراز ہے: 'جب بھی میں گھر میں کام کرتا تھا تو ضرورت پر یہ لغت آسانی سے ہاتھ آتی تھی۔ میں نہ صرف بارہا اس سے مفہومات اور معانی دیکھتا تھا بلکہ فرصت کے اوقات میں ناولوں اور رسالوں کے بجائے لغت کا مطالعہ کرتا تھا۔'

کئی سائنسی ایجادوں کی طرح تخلیقات کئی دفعہ اتفاق سے عمل میں آتی ہیں یا تخلیقی محرکات کے پیچھے کوئی واقعہ ہوتا ہے۔ ایک فرانسیسی سائنس داں کے مطابق ۷۵ فیصد اہم سائنسی دریافتیں نیند کے دوران ہوئیں۔ جب سائنس داں تحقیقی کام میں جٹے ہوئے نہیں تھے۔ بقول سائنس داں اس لئے قلم کاروں کو بھی یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ دماغ پر زیادہ زور نہ ڈالیں۔ خیالات لاشعور میں جمع ہوتے رہتے ہیں اور کبھی پھوٹ پڑتے ہیں۔

ایک بھیانک ناول نے کیسے جنم لیا؟ دنیا کا ایک بھیانک ناول 'فرینکنسٹن' جب ۱۸۱۸ء میں چھپا تو ساری دنیا میں اس کی دھوم مچ گئی۔ یہ میری شیلی نے لکھا تھا جب اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ یہ کیسے لکھا گیا؟ اس کا اجمال یہ ہے: مشہور شاعر لارڈ بائرن جینوا جھیل کے کنارے ایک خوبصورت مکان میں مقیم تھا۔ اس کے پڑوس میں پرسی اور میری شیلی بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک روز بارش ہو رہی تھی۔ کئی دنوں سے موسم خراب تھا اور یہ تینوں اپنے مکان میں قید ہو کر رہ گئے تھے اور اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے۔ اچانک بائرن نے دوستوں کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ کیوں نہ ہم تینوں اس وقت بھوتوں پر ایک ایک افسانہ لکھیں اور پھر یہ افسانہ ایک دوسرے کو باری باری پڑھ کر سنائیں۔ اس طرح ہمارا وقت بھی کٹ جائے گا اور ہماری اکتاہٹ بھی ختم ہو جائے گی۔ تینوں لکھنے میں لگ گئے۔ پہلے انہوں نے ایک ایک افسانہ لکھا۔ میری شیلی کا افسانہ سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ بعد میں اس نے اس کو ناول کا روپ دیا۔

Alice in Wonderland لیویس کیرول کی شاہکار تصنیف ہے۔ اس نے ایک مرتبہ دریائے ٹیمز میں کشتی رانی کے دوران ایلس نام کی ایک چھوٹی لڑکی کو ایک تخیلی کہانی سنائی۔ یہی کہانی بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔

اطالوی قلم کار ڈانٹے کی شاہکار تصنیف Divine Comedy کی محرک ایک خوبصورت لڑکی بیٹرائس تھی۔ ڈانٹے پہلی نظر میں اس پر فریفتہ ہوا۔ جب دوسری مرتبہ اس سے اس کی ملاقات ہوئی تو وہ کسی اور کی ہو چکی تھی۔ ۲۶ سال کی عمر میں وہ چل بسی۔ ڈانٹے کے دل پر اس کا گہرا زخم لگا۔

مارگریٹ مچل کے شہرہ آفاق ناول Gone with the wind کی تخلیق کا پس منظر بھی دلچسپ ہے۔ ایک حادثے میں مصنفہ کے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر نے اس کو لمبے عرصے کے لئے آرام کرنے کی ہدایت دی۔ مچل کے شوہر نے وقت گزارنے کے لئے چند کتابیں خرید دیں۔ مارگرٹ مچل صفحات الٹنے لگی۔ وہ حیران ہوئی کہ کیوں اتنی بڑی تعداد میں ایسی پھیکی کتابیں شائع ہو جاتی ہیں۔ وہ آپ ہی آپ بولی کہ وہ ان کتابوں سے ایک بہتر قابل مطالعہ کتاب لکھے گی۔ چنانچہ اس نے اپنا ناول لکھنا شروع کیا۔ وہ امور خانہ داری میں بڑی مصروف رہتی تھی اور لکھنے کے لئے روزانہ دس منٹ نکال سکتی تھی۔ اس مختصر وقفے کو بروئے کار لا کر مارگرٹ مچل نے اپنا مقبول اور ضخیم ناول تحریر کیا۔

ڈاکٹر میری اسٹوپس نے جنسیات پر کار آمد کتابیں لکھی ہیں۔ اس میدان میں وہ پیشرو مانی جاتی ہے۔ اس کی محرک ان کی اپنی ناکام ازدواجی زندگی تھی۔ جب ان کی پہلی شادی ناکام ہوئی تو میری اسٹوپس نے اس کا سبب جاننے کے لئے تحقیقی کام کیا۔ انہوں نے برٹش میوزیم میں جنسیات پر انگریزی، جرمنی اور فرانسیسی میں لکھی ساری کتابیں پڑھیں اور اپنے مطالعہ اور تجربے کی اساس پر 'شادی شدہ محبت' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ جسے نسوانی دنیا نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جب انہوں نے مسودہ پبلشر کو دیا تو وہ بولا۔ 'یہ کتاب اپنی فروخت میں دس لاکھ کا نشانہ چھو لے گی۔'

بھوتوں کی ایک مشہور کہانی کیسے لکھی گئی؟

ایک عورت نے ایک رات اپنی سنگھار میز کے پاس اپنے لمبے اور گھنے بالوں کو سنوار رہی تھی اور ہر دفعہ کنگھا چلنے کے ارتعاش سے برقی لہریں پیدا ہوتی تھیں۔ اس کا شوہر آلیور ونیٹز جو بستر میں لیٹا اس کو دیکھ رہا تھا بولا۔ "کوئی عورت کو دیکھے بغیر اس آواز کو سنے تو کتنا خوفناک لگے گا؟"

"ایسی باتیں نہ کرو" اس کی بیوی چلا پڑی۔

دوسرے روز آلیور اونیٹز نے اسی خیال پر مبنی کلاسک کہانی The beckoning Fair one لکھی، جو ایک جریدے میں چھپی۔ بعد میں یہ متعدد رسائل کے خصوصی شماروں میں دوبارہ چھپی۔ اس پر فلم بنی اور اسٹیج پر دکھائی گئی۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے مطابق بھوتوں پر اس سے بہتر کہانی نہیں پڑھی۔

قلم کار اور خواب:

سائنس کی کئی ایجادوں کی طرح خواب میں تخلیقات پروان چڑھی ہیں۔ کولرج کی مشہور نظم Kubla khan خواب میں سوجھی۔ یہ ۱۷۹۷ء کا واقعہ ہے۔ ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھتا ہوا کولرج کو نیند آ گئی۔ تین گھنٹوں کی نیند کے دوران دو سو سے تین سو اشعار اس کے ذہن میں ڈھلنے لگے۔ جاگنے کے بعد کولرج نے یہ اشعار قلم بند کئے۔

ٹھیکرے نے اپنے ناول Vanity fair کا نام اچانک خواب میں سوچا۔ اس سے پہلے اس نے ایک مناسب نام کے لئے بہت سوچا تھا۔ جب یہ عنوان اس کے ذہن میں آیا وہ اپنے بستر سے اچھل پڑا اور تین مرتبہ Vanity fair دہراتا ہوا اس نے کمرے کا چکر کاٹا۔

نیند اور خواب نے ایسے کئی مسائل حل کئے ہیں۔ آر۔ ایل۔ اسٹیونسن کو اپنی کہانیوں اور دوسری نگارشات کے لئے مواد خواب میں ملتا تھا۔ وہ اسے Dream Factory کہتا تھا۔ خواب میں اس کو پلاٹ، منظر نگاری اور کرداروں کے علاوہ جزوی طور پر مکالمے بھی سوجھتا تھا۔

ڈبلیو ڈیپنگ لکھتا ہے۔ 'میں نے خواب میں ایک کہانی پروان چڑھتے دیکھی اور صبح پانچ بجے اٹھ کر اسے تفصیل سے لکھی۔ یہ ایک بہت اچھی کہانی تھی اور میرے لئے ایک حیرت انگیز تجربہ تھا۔'

ایسے تجربات متعدد قلم کاروں کو ہوئے ہیں۔ ڈبلیو۔ ایل آلڈن کو اپنی کہانی Drewith's Dream کا پورا مواد خواب میں ملا۔ اسی طرح ولیم آرچر کو اپنے سب سے کامیاب ڈرامہ Green Gaddes کی کہانی سپنے میں ملی۔

اہم شخصیات اور کتاب:

بڑے آدمیوں اور معروف سیاست دانوں کو اپنے بارے میں لکھنے کا شوق ہوتا ہے۔ لوگ بھی مشاہیر اور معروف شخصیتوں کی زندگی سے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔ اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں کو شوق سے پڑھتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بڑا آدمی لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ کئی دفعہ ایک وزیر کی تقریر اس کا سکریٹری لکھتا ہے۔ کتاب لکھنے کے لئے ایک پیشہ ور قلم کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر چیز کی طرح ڈھونڈنے سے دنیا میں یہ بھی مل جاتا ہے۔ ایسے قلم کار کو Ghost writer کہا جاتا ہے۔ معروف سیاست دانوں اور اہم شخصیتوں نے ایک یا ایک سے زیادہ کتابیں لکھنے کے لئے کرائے کے قلم کار استعمال کئے ہیں۔ ایسی ایک سرگرمی [illegible] فراہم ہے۔ ان سے پاکستان کے فوجی صدر جنرل ایوب خان نے [illegible] ایک سابق صدر کی اہلیہ بیگم جہاں [illegible] یادداشتیں لکھیں۔

Ghost writer کو اچھا معاوضہ [illegible] شخص کرائے کے قلم کار کے کام کی کوئی سزا نہیں ہوتی لیکن [illegible] البتہ کتاب میں اس کا نام شامل کرنا کتاب میں بڑی کے مترادف [illegible]

پبلشر مشاہیر کے نام سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ [illegible] کرائے کے قلم کار سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

روزالینڈ رسل نے اپنی خودنوشت سوانح حیات کے لئے کریس چیکن کو [illegible] کیا۔ اسی طرح جارج قاصر بیٹی فورڈ نے اپنی دو کتابیں لکھنے کے لئے [illegible] کی خدمات حاصل کیں۔ وہ مصنفہ کی کتاب How to be Movie star پڑھ کر متاثر ہوئی تھیں۔

ڈونالڈ ٹرمپ نے جرنلسٹ Tony Shwartz سے کرائے پر The Art of the deal لکھوائی۔

ولیم رائٹ نے اپنی تصنیف کے لئے Luciano pavorotti کی خدمات حاصل کیں۔

ایسی درجنوں مثالیں ہیں۔

پبلشر بھی بڑے آدمیوں سے کتابیں لکھواتے ہیں۔ ٹینس کی عالمی کھلاڑی مارٹینا ناوراتی لووا کو Three Mystery ناول لکھنے کے لئے بھاری پیشگی رقم دی۔ اسٹار ماڈل ناؤمی کومپ بیل کو اپنے پہلے ناول لکھنے کے لئے اچھی خاصی رقم ملی۔ ٹی وی کے سپر اسٹار جان کولینز اپنا تیسرا ناول لکھنے میں مصروف ہے۔

۱۹۹۴ء میں پوپ جان پال دوئم کو ایک کتاب لکھنے کے لئے پچاس لاکھ ڈالر پیش کئے گئے۔

عالمی شہرت کے فٹ بال کھلاڑی ڈائیگو مارا ڈونا اب کے میدان کا کھلاڑی نہیں ہے لیکن اس کی کتاب I am Diego لاکھوں میں فروخت ہوئی ہے اور دنیا کی کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ پچھلے سال جب ۳۱۹ صفحات کی اس کتاب کی رسم رونمائی ہوئی تو ارجنٹینا میں تین ہفتے تک یہ سب سے زیادہ خریدی جانے والی کتاب تھی۔ رسم رونمائی کے موقع پر مارا ڈونا نے کہا: 'میں عوام کا ڈائیگو ہوں۔ اس کتاب میں لکھی ہوئی میری ہر بات صحیح ہے۔'

حال میں ایک ناشر نے امریکہ کے سابق صدر کلنٹن کو اپنی زندگی کی یادداشت بتانے کے لئے ایک کروڑ ڈالر کی پیش کش کی ہے۔ اس میں مزید بیس لاکھ ڈالر کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ یادداشت لکھنے کے لئے اتنی بڑی رقم آج تک کسی کو نہیں دی گئی۔

ہلیری کلنٹن کو بھی اپنی یادداشت لکھنے کے لئے ایک بڑی رقم پیش کی گئی ہے۔ پبلشروں کا خیال ہے کہ دوسرے مشاہیر کی طرح ان کی کتاب کی بھی بڑی مانگ ہوگی۔

ناشر کتابوں کی فروخت بڑھانے کے لئے مشہور ناول نگار [illegible] اور الیسٹیر میکلین کے نام سے ہر سال ایک کتاب چھاپتے ہیں۔ اگرچہ دونوں قلم کار ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء میں انتقال ہو چکے ہیں۔

کئی دفعہ خریداروں کو چکمہ دینے کے لئے ٹائٹل کور پر نامور شخصیتوں کے نام سے تعریفیں لکھی جاتی ہیں۔ اور Best seller کا تمغہ چسپاں کیا جاتا ہے۔ — [illegible]

پابہ جولاں زندگی

...شبلی

زندگی
صبح سے شام تک
پابہ جولاں رہی
کوہساروں کو گلزار کرتی رہی
تیرگی کے سمندر سے
چاند اور تارے اگاتی رہی
ریگ زاروں میں بھی
لالہ و گل کھلاتی رہی
خود تو سہتی رہی رات دن
کرب بے چہرگی
درد تنہا روی
راہ میں ہر قدم پر مگر
آرزوؤں کے دیپک جلاتی رہی
مسکراتی رہی
حوصلوں کو بھی مہمیز کرتی رہی
صبح سے شام تک
پابہ جولاں رہی زندگی!

آئینہ دیکھنے سے ڈرتا ہوں

ابرار اعظمی

آئینہ دیکھنے سے ڈرتا ہوں!
جھانکتے ہیں عجیب سے چہرے
یا ہیولے ہیں جیسے چہروں کے
عہد رفتہ کے کچھ نفیس نقوش
ذہن کو رنگ وفور دیتے ہیں
لیکن آئینہ تو ہے آئینہ
ذہن کو آئینہ دکھاتا ہے
اپنا چہرہ نظر نہیں آتا
خوش نما اور فریب کن چہرہ
یا وہ سارے شکستہ سے چہرے
میرے اپنے ہیں، حال ہے میرا
صبح کو اک گلاب کھلتا ہے
شام کو برگ زرد بن جاتا
اور رعنائی جمال، تمام
مثل صوت وصدا بکھر جاتی ہے
زندگی کا یہی ہے افسانہ
یا حقیقت ہے، دل خراش و لعین
آئینہ جھوٹ کہہ نہیں سکتا
آئینہ وقت کا ہے آئینہ
آئینہ دیکھنے سے ڈرتا ہوں!

طوفان عظیم کی یاد میں

اختر حسین شافی

[illegible] آ چمکتی بجلیاں ہوتیں
رسول پاک گھبراتے، دعائیں مانگتے، سجدوں میں گر جاتے
سمجھ میں شاعر رنگیں کے یہ سب کچھ نہ آتا
سوچتا رہتا
حسیں منظر سے گھبراتا!
ہوا بادل گھٹا بجلی سے کیا ڈرتا!
مگر جب وہ قیامت خیز اکتوبر کا طوفاں سامنے آیا
وہ ڈرنا کیوں تھا، سجدے کس لئے تھے
میں سمجھ پایا
گرجتا آسماں یہ حکم دیتا تھا
ہواؤں کو گھٹاؤں کو سمندر کو
"ہواؤ تیز تر ہو کر اڑا دو چھت ہر گھر کی
گھٹاؤ جم کے یوں برسو، در و دیوار بہہ جائیں
سمندر تو پہاڑوں کی بلندی تک اٹھا کر اپنی موجوں کو
لپکتا اک ستمگر دیو کی صورت زمیں پر اس طرح بڑھ جا
فنا ہو جائیں، مٹ جائیں سبھی، کوئی نہ بچ پائے"
تناور پیڑ سارے اور پرندے بھی درندے بھی
مجھے ایسا ہی لگتا تھا سبھی طوفاں کی زد میں تھے
یہ انساں جن بھی، فرشتے بھی
زمیں بھی چاند سورج بھی ستارے بھی
یہ سب روپوش تھے نظروں سے غائب تھے
کہاں تھے اور کیسے تھے، خدا جانے
نہ دیکھا تھا کبھی میں نے تباہی کا وہ نظارہ
ہوا کا زور و شور ایسا تھا جیسے
صور پھونکا جا رہا ہو اور قیامت آگئی ہو
اب سمجھ میں آ رہا تھا
کیوں کوئی سجدہ سرا ہوتا دعائیں مانگتا ......
...... ڈرتا سہم جاتا
نبی کو تھا پتہ اس عالم انساں کے امکاں کا
خدا کی قدرت و طاقت کا، بندوں کی حماقت کا
نگاہ شاعر رنگیں میں لیکن رنگ ہوتی ہے
مجازی اس کی دنیا ہے، تخیل بھی اضافی ہے

۵/۸۹ زین العابدین اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶
خالص پور، اعظم گڑھ ۲۷۶۱۲۸
کیسر پور، کٹک ۷۵۳۰۰۱

غزلیں

مخمور سعیدی

غم کا آغاز ہو، خوشی ہو شروع
تم جو آؤ تو زندگی ہو شروع

دوستی ہو کہ دشمنی ہو شروع
کچھ نہ کچھ ربطِ باہمی ہو شروع

ایک رستے کے دو مسافر ہم
درمیاں کوئی بات بھی ہو شروع

قصۂ دردِ ناتمام ہی کیا!
یہ کہیں ختم ہو، کبھی ہو شروع

ذہن و دل میں موافقت ہی نہیں
کس طرح کارِ زندگی ہو شروع

ہے اندھیروں کی دھوم ابھی تو یہاں
جانے کب جشنِ روشنی ہو شروع

رات گزرے کسی بہانے سے
صبح کا انتظار ہی ہو شروع

دل سے پھوٹا خیال کا جھرنا
جیسے اک سوچ کی ندی ہو شروع

حلقۂ جبر ٹوٹ سکتا ہے
کسی گوشے میں سرکشی ہو شروع

ہے مقدمہ تو دل کا غور طلب
کچھ سماعت تو سرسری ہو شروع

شہرِ مفتوح چاہتا ہے کہ اب
لشکرِ غم کی واپسی ہو شروع

کر بچھڑنے کی خود سے تیاری
عشق کی رسم آخری ہو شروع

اسے لے کر کوئی کہاں جائے
گھر کے ہوتے جو بے گھری ہو شروع

لمحہ لمحہ --- مرے زمانے کا
جس طرح اک نئی صدی ہو شروع

ہے عجب دشتِ جسم و جاں مخمور
ساتھ بارش کے تشنگی ہو شروع

(۲)

سفر کن راستوں پر کر رہا ہے
خود اپنے سائے سے وہ ڈر رہا ہے

میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہوں
سمندر مجھ سے باتیں کر رہا ہے

سیہ پوشی کی تیاری میں ہے دن
افق کے پار سورج مر رہا ہے

درختوں کے ہیں تن زخمی، کہ اکثر
ہوا کے ہاتھ میں خنجر رہا ہے

نہ گر جائے کہیں تھک کر پرندہ
بہت لمبی اڑانیں بھر رہا ہے

گزرتے وقت کا اک ایک لمحہ
نئے موسم کا پیغمبر رہا ہے

یہاں شاید نہیں دیکھا کسی نے
مری نظروں میں جو منظر رہا ہے

اکیلے کب تھے ہم اپنے سفر میں
دکھوں کا ساتھ اک لشکر رہا ہے

سلگتے دشت میں کس کی طلب کا؟
گھنا سایہ مرے سر پر رہا ہے

ہمیں کم کم ملا ہے ساتھ اس کا
ہمارے ساتھ جو اکثر رہا ہے

تصور راہ کی دشواریوں کا
سفر کو اور مشکل کر رہا ہے

ہمارے بعد کی نسلیں اتاریں
سخن کا قرض جو ہم پر رہا ہے

وہ اے مخمور میرا ہم قدم تھا
جو میری راہ کا پتھر رہا ہے

سی ۳/۱۴۱۔ سی، کرشنا کنج ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

علیم اللہ حالی

شہرِ دعا میں خاک بسر ہے مری نوا
محرومِ عرش و گنبد و در ہے مری نوا

تم ہو کہ میں، سب اپنی طرفداریوں میں ہیں
دکھ میرے ہیں تو دیدۂ تر ہے مری نوا

بے برگ و بار خطۂ ویراں میں نوحہ خواں
سوکھی ہوئی سی شاخِ شجر ہے مری نوا

ہے طورِ روزگار عیاں شعر شعر میں
ہوشیار باش حرفِ خبر ہے مری نوا

اس خاکداں میں تودۂ خاشاک کی طرح
میں ڈھیر راکھ کا ہوں شرر ہے مری نوا

ٹکرا کے بام و در سے پلٹ آئی بار بار
یعنی بس ایک عکسِ ہنر ہے مری نوا

پگھلے نہ پگھلے برفِ تعلق مگر علیم
راہِ وفا پہ گرمِ سفر ہے مری نوا

وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا۔۸۲۳۰۰۱

غزلیں

نسیم مخموری

شب بھر نہ ملا کوئی بھی پتا میری جاں کا
آسیب تھا ہر سمت عجب سودوزیاں کا

پرواز نہ بھولی میں گرفتار ہوا بھی
اس دل میں تھا آباد نگر تیرے جہاں کا

باتیں تھیں محبت کی وفاؤں کے تھے وعدے
وہ شخص لگا مجھ کو کسی اور جہاں کا

وہ تھک کے بہت دور سے آیا تھا میرے پاس
سایا مجھے لگتا ہے کسی ابرِ رواں کا

آباد ہے وہ میری سلگتی ہوئی جاں میں
اک ایسی حقیقت پہ مجھے شک ہے گماں کا

جلتا ہے سلگتا ہر ایک صبح ہر ایک شام
مسکن ہے میرے دل میں کسی برق تپاں کا

تم آج میرے ساتھ چلو دور کہیں دور
یہ بات نہ پوچھو کے ارادہ ہے کہاں کا

لفظوں میں ہے پوشیدہ میری ذات کا ہر غم
لہجہ میرا غماز ہے اس دردِ نہاں کا

مجھ سے کوئی کہتا ہے نسیم اور نہ سوچو
کیوں کرتی ہو اس طرح زیاں اپنی ہی جاں کا

بی۔۳۰۰ خیابان، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

حسنیٰ خان کشش

موسم وہ قربتوں کا سہانا عجیب تھا
مجھ کو ہنسا ہنسا کے رُلانا عجیب تھا

گڑیوں سے کھیلنا کبھی باغوں میں جھولنا
بچپن کا میرے وہ بھی زمانا عجیب تھا

ترکِ تعلقات کا کوئی بھی غم نہیں
اس بات کا ہے غم کہ بہانا عجیب تھا

کیوں میری چاہتوں کا خیال اس کو آگیا
اس کا پلٹ کے گھر کو وہ آنا عجیب تھا

وہ زور تھا کہ سینے میں خنجر اتر گیا
اپنے ہی تھے وہ جن کا نشانا عجیب تھا

اس شخص سے مرا کوئی رشتہ نہ تھا مگر
مجھ کو ملامتوں سے بچانا عجیب تھا

مجھ کو امیرِ شہر سے برتر بنادیا
اس کے غموں کا بھی تو خزانا عجیب تھا

جس سمت دیکھتی تھی کشش میرا عکس تھا
میری انا کا آئینہ خانا عجیب تھا

بازوزئی اول، نزد مدرسہ فیض عام، شاہجہانپور

اجیت سنگھ حسرت

شیشہ بدست آیا ہوں پتھر کی کان میں
وہ ہو گیا ہے جو نہ تھا میرے گمان میں

چاہے قلم ہی کیوں نہ ہو جائے سر مرا
میں تو غزل سناؤں گا الفت کی شان میں

ہیں صاحبِ ثروت وہ امیر و کبیر لوگ
ہم نغمہ گر فقیر ہیں تیرے جہان میں

وہ بھی چلا کے دیکھ لے، پھر دیکھ لیں گے ہم
اک تیر رہ گیا ہے جو تیری کمان میں

اتنی بلندیوں سے میں یوں ہی نہیں گرا
جلنے لگے تھے پر مرے اونچی اڑان میں

میری انا نے ہے مجھے قیدی بنالیا
اب گھومتا ہوں بھوت سا سُونے مکان میں

سچ بولنا محال ہوا جارہا ہے اب
دہشت کا تیر کھب گیا سب کی زبان میں

۱۸۹ اسلام گرام، لدھیانہ

غزلیں

قمر گونڈوی

ہم بھی اسی کو ڈھونڈ رہے ہیں سر بہ گریباں گلیوں گلیوں
نقش کفِ پا چوم رہے ہیں خاک بداماں گلیوں گلیوں

کون آیا تھا صبحِ درخشاں لے کے ستاروں کی محفل سے
کون گیا ہے بزم سے واپس کر کے چراغاں گلیوں گلیوں

تیرے شہرِ فتن میں آکر اب مجھ پہ یہ بھید کھلا ہے
تیرا شہر ہے مجرم آہو چشم غزالاں گلیوں گلیوں

کل میں نے اخبار پڑھا تھا اک ایسا بھی شہر ہے جس میں
ظلم کے بادل درد کی آندھی موت ہے رقصاں گلیوں گلیوں

صحن چمن کی رت بدلے گی زخم خزاں کے بھر جائیں گے
ہم سمجھے تھے اب کے ہوگا درد کا درماں گلیوں گلیوں

حق کی لڑائی لڑنے والے ہار کے بازی جیت گئے ہیں
گھر گھر بزمِ عزاداری ہے شامِ غریباں گلیوں گلیوں

اس دورِ تخریب کا حال قمر ہم کیا بتلائیں
حیرت و حسرت کا مارا ہے آج ہر انساں گلیوں گلیوں

کوچہ جگر، گونڈہ، یوپی

شباب ہاشمی



کسی کی قید میں تھا وہ، نہ ہی وہ بس میں تھا
مگر وہ پوری طرح میری دسترس میں تھا

ہر ایک شخص بلا وجہ پیش و پس میں تھا
اگرچہ مرحلۂ زیست یک نفس میں تھا

یہ اور بات کہ اب جنبشِ خفی بھی نہیں
شدید ردِ عمل طائرِ قفس میں تھا

سمجھ سکے نہ جسے اہلِ کارواں اب تک
اک ایسا کربِ نہاں نالۂ جرس میں تھا

یہ بات سچ ہے کہ توفیق تو اسی سے ملی
وگرنہ کارِ جہاں کیوں کر اپنے بس میں تھا

ستم ہے لوگ سخنور انہیں سمجھتے ہیں
شمار جن کا کبھی یونہی خار و خس میں تھا

شباب حسن پرستی کی آبرو بھی تھی
ہر ایک جذبۂ الفت جو بوالہوس میں تھا

[illegible] آباد [illegible]

راشد انور راشد

[illegible]

جن کے دل تو مرے سینے میں دھڑکتے رہنا
اے گلِ تازہ جہاں رہنا مہکتے رہنا

مطمئن تم نہ ہوئے چاند ستارے پا کر
مجھ کو راس آگیا جگنوں سا چمکتے رہنا

اب کے شاید یہ سفر خون بہا دے لیکن
لوٹ کے آؤں گا رستہ مرا تکتے رہنا

مستقل دید سے پتھر میں بدل جاؤ گے
اس طرح دیکھنا جب آنکھ جھپکتے رہنا

[illegible]

[illegible] نئی دہلی [illegible]

سجاد سید

قمر صدیقی

وہ رنج گراں اس دلِ ناداں نے دیے ہیں
سب ہیچ ہوئے وہ جو کہ دوراں نے دیے ہیں

لا میرے شکر ترے دامن پہ سجادوں
وہ گوہرِ خوں رنگ جو مژگاں نے دیے ہیں

اک عمر گزاری ہے سرابوں کے نگر میں
کیا کیا نہ فریب اک دِر امکاں نے دیے ہیں

الزام مری وحشت نوردی پہ نہ آئے
یہ خار مجھے صحنِ گلستاں نے دیے ہیں

حیرت زدہ کرتا ہے بصیرت کو جو عالم
کو رنگ سا ہے دیدۂ حیراں نے دیے ہیں

دنیا کے ستم کو کبھی خاطر میں نہ لائے
وہ حوصلے ہم کو غمِ جاناں نے دیے ہیں

(۲)

گزری نہیں کوئی بھی شب بزمِ خیال کے بغیر
جشنِ وصال یوں ہوا شامِ وصال کے بغیر

وہ حسرتوں کا ذکر ہو یا آرزو کی بات ہو
سارے سخن فضول ہیں پرسشِ حال کے بغیر

ہے مسئلہ حیات بھی ہے مرحلہ نجات بھی
اس کے جواب کے بنا میرے سوال کے بغیر

دیکھو کوئی کہ کیا ہوا وہ روٹھ ہم سے کیوں گیا
صحرا ہوا ہے دشتِ دل اپنے غزال کے بغیر

نطق و قلم، خرد، شعور اپنی اپنی جگہ بجا مگر
کامل کوئی ہنر نہیں دستِ کمال کے بغیر

سید گناہ گار تھا لیکن گناہِ عشق کا
پہنچا فرازِ دار تک بارِ ملال کے بغیر

بیتے ہوئے زمانے زنجیر ہو گئے ہیں
آنکھوں میں اس کی ہم بھی تصویر ہو گئے ہیں

نسبت نے اس کی کیا کیا منصب عطا کیے ہیں
جنگل اجاڑ بیڑ جاگیر ہو گئے ہیں

وہ دل ہو یا کہ دلّی سب بارہا لٹے ہیں
لٹ لٹ کے بارہا پھر تعمیر ہو گئے ہیں

اس ہجر تیرہ شب کے بجھتے چراغ سارے
جلنے سے داغِ دل کے تنویر ہو گئے ہیں

بس اک نگاہ تمہاری دیکھو ذرا پلٹ کر
سب ملک شام و روما تسخیر ہو گئے ہیں

ابوالفضل اپارٹمنٹ، وسندھرا انکلیو، دہلی
۷/۱۲۱/۳۔ گھانند کالونی، گووندی، ممبئی۔ ۴۰۰۰۴۳

شروَن کمار ورما

پگڈنڈیاں

رجنی وقت سے کافی پہلے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی تھی اور اب بینچ پر اکیلی بیٹھی بور ہو رہی تھی۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت سفری بیگ لئے پل سے اتری، ادھر ادھر دیکھا اور رجنی سے ذرا ہٹ کر بینچ پر بیٹھ گئی۔ وہ کچھ بے چین سی تھی۔ کچھ دیر وہ ایک دوسرے سے انجان بنی بیٹھی رہیں پھر نظر ملنے پر مسکرا دیں۔ وہ عورت رجنی کی طرف کھسک کر بولی۔ "پسنجر گاڑی اسی پلیٹ فارم سے جائے گی؟"

رجنی اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ ہونٹ بچکا کر چپ رہی۔

"مجھے کرتار پور جانا ہے۔" عورت بتانے لگی۔ "وہاں سے میرا میکہ گاؤں پاس ہی ہے۔ ماں رہتی ہے وہاں میری——" اس نے رجنی کی طرف دیکھا۔ رجنی کو متوجہ پا کر وہ بولی۔ "میں اسے لینے جا رہی ہوں۔ میری بھرجائی (بھاوج) بڑی لڑاکن اور کمینی ہے، ماں کو بہت تنگ کرتی ہے۔ میرا ابھرا (بھائی) بڑا بھمدو (چغد) ہے۔ گھر والی کے اشارے پر چلتا ہے۔ بہت دکھی ہے ماں وہاں——"

پسنجر ٹرین رینگتی ہوئی پلیٹ فارم پر آ گئی۔ عورت اپنی بات اور رجنی کو بھول کر لپکتی ہوئی سامنے والی بوگی میں جا گھسی۔ رجنی کو یہ اچھا نہیں لگا تھا۔ یہ تو کوئی مہذب ڈھنگ نہ ہوا۔ گاڑی کون سی بھاگی جا رہی تھی۔ آخر دیہاتن نکلی۔ رجنی نے خود کو جیسے تسلی دی اور گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ عورت کھڑکی کے ساتھ بیٹھی اب اپنی ہم سفر سے بتیا رہی تھی، شاید بھاوج کی چغلی کر رہی تھی۔

سیٹی بجی اور پسنجر گاڑی رینگنے لگی اور دھیرے دھیرے پلیٹ فارم سے نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ عورت بھی اس کے ذہن سے نکل گئی۔ ماحول کا سونا پن ایک دم گہرا ہو گیا تھا۔ کسی کونے میں چھپے کوے کی کائیں کائیں ماحول کو اداس بنائے دے رہی تھی۔ چڑیاں خالی، پلیٹ فارم پر زندگی اونگھتی ہوئی فضا میں اسٹیشن کی مخصوص بو۔ 'اناؤنسنگ سسٹم' پر ذرا سی کھڑ پڑ پھر خاموشی۔ ایک بوڑھا شخص پریشان سا بینچ پر اس عورت کی جگہ آ بیٹھا تھا۔ اس نے رجنی کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کسی کو کوئی پرواہ ہی نہیں۔ میں آدھے گھنٹے سے خراب ہو رہا ہوں۔ کوئی سیدھا جواب ہی نہیں دیتا۔ پتا نہیں یہ لوگ تنخواہ کس بات کی لیتے ہیں۔ یوں بولتے ہیں جیسے بے زار بیٹھے ہوں، احسان کر رہے ہوں۔ میری بیٹی بچوں کے ساتھ آ رہی ہے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے پی سی او سے فون کیا، کوئی اٹھاتا ہی نہیں یہاں۔ بڑے بڑے بورڈ لگا رکھے ہیں جگہ جگہ۔ 'آپ کی سیوا کے لئے۔' یونین بن گئی ہے، ہڑتال، جنتا سے بدسلوکی، ڈیوٹی سے غیر حاضر رہنا—— ہر کام کے لئے رشوت، سفارش۔ اخلاق اور فرض نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی۔"

"آپ دکھی نہ ہوں۔" رجنی نے ہمدردی سے کہا۔ "مجھے بتایئے میں معلوم کئے دیتی ہوں۔"

"دکھی کیسے نہ ہوں——" بوڑھا بے زاری سے بولا۔ "کسی کو نہیں معلوم کہ وہ گاڑی کب اور کس پلیٹ فارم پر آئے گی۔ جس سے پوچھو، منہ پھیر کر چل دیتا ہے۔ انکوائری آفس میں ٹیلی فون ریسیور اٹھا کر الگ رکھ دیا ہے، خود بابو رات کی شراب کے نشے میں مست ہے۔ کوئی چائے پی رہا ہے، کوئی ٹہل رہا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا ہوگا اس دیش کا۔ ہم سب ڈوبیں گے، یہ کوئی نہیں سوچتا۔"

رجنی کو بوڑھے کی باتیں سچ لگیں۔ وہ ڈھارس اور تسلی کے لفظ ڈھونڈ رہی تھی۔ اسٹیشن کے اناؤنسنگ سسٹم پر پھر کھڑ پڑ ہوئی۔ کچھ آنے جانے والی گاڑیوں کے متعلق اعلان کیا جانے لگا۔ سسٹم میں خرابی کے کارن کچھ بھی صاف نہیں تھا۔ بوڑھا دھیان سے سن رہا تھا۔ مسلسل کھڑ پڑ کے بعد اعلان ایک دم بند ہو گیا۔

"یہی کچھ ہو رہا ہے ہر جگہ۔" بوڑھے نے شکایتی انداز میں جیسے ہوا سے کہا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سارا سسٹم خراب ہے۔"

تبھی پھر اعلان کیا جانے لگا۔ بوڑھا ادھر متوجہ ہو گیا۔ قلی نے پوچھنے پر بتایا کہ ۲ بجے اپ پلیٹ فارم نمبر ایک پر آ رہی ہے۔ گاڑی کی آواز بھی سنائی دی۔ دور سگنل کے قریب دھواں بھی دکھائی دیا۔ بوڑھا جلدی جلدی سامان اٹھاتے گرتے گرتے بچا۔ رجنی نے ہمدردی سے کہا کہ "آہستہ سے جایئے یہ ٹرمینس ہے۔" لیکن بوڑھا تیزی سے پلیٹ فارم کی طرف بڑھ گیا۔ رجنی اسے جاتے دیکھ رہی تھی۔ بوڑھے کو

گلی او نشان والی، چوک پراگ داس، امرتسر۔۱۴۳۰۰۶

[illegible] ہو رہی تھی۔ پھر وہ میرے [illegible] آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

[illegible] نے رجنی [illegible] سے چائے منگوائی تھی اور اپنی جھجک کو اس [illegible] گرم مشروب سے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک نو بیاہتا جوڑا اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ لڑکی چہک رہی تھی۔ لڑکا اس کی باتوں سے زیادہ اس کے سراپے میں گم تھا۔ لڑکی اس کی اس ذہنی اور جسمانی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اور اس سے بے خبر ہونے کا تاثر بھی دے رہی تھی۔ رجنی اب پوری طرح ان کی طرف متوجہ تھی۔ بوڑھا اب اس کے ذہن کے پردے سے ہٹ گیا تھا۔ اسے لڑکی کا کھیل لبھانے لگا تھا۔ لڑکی کی کلائیوں میں سرخ چوڑی تھی جو بار بار چھنک جاتی، آنکھوں میں پرکشش چمک تھی اور ہونٹوں پر نشیلی مسکراہٹ۔ یہ سب رجنی کو برسوں پیچھے لے گئے۔ اب لڑکی کے سراپے میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ تبھی ایک مدھر، مہذب آواز اسے ماضی کے نرم، سہانے دھندلکوں سے باہر کھینچ لائی۔

"آنٹی ہم یہاں بیٹھ جائیں——"

"ہاں، آں—— بیٹھو چائے پیو گے تم لوگ——"

"نہیں آنٹی——" وہ دونوں بینچ پر بیٹھ گئے۔ لڑکی کے سراپے سے لطیف سی خوشبو آرہی تھی۔ "دو بار پی چکے ہیں۔" لڑکی نے لڑکے کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ پھر جیسے وہ ایک دوسرے میں کھو گئے۔ لڑکی بات بات پر کھلکھلا رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے سرشاری پھوٹ رہی تھی، جیسے اسے کسی سے کوئی شکایت نہ ہو، جیسے سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہو۔ لڑکی کا باریک، ریشمی دوپٹہ بار بار شانوں سے پھسل جاتا اور اس کے ساتھ ہی لڑکا بھی۔ ان کی باتیں ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ایسی باتیں جن کا کوئی خاص مطلب بھی نہیں تھا۔

رجنی ان کے ہوتے ہوئے سب کچھ بھول سی گئی تھی۔ [illegible] سسٹم کی کھڑ کھڑ بھی اب اسے پریشان نہیں کر رہی تھی۔ لڑکا ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام کر اسے بھی اٹھا لیا۔ وہ دونوں چلتے، اٹھلاتے، اتراتے چلے گئے۔

"ارے، تمہارا رومال۔" رجنی نے پکارا۔

"تھو تھینک یو ویری مچ آنٹی۔" لڑکی نے رومال لیتے ہوئے کہا۔ "بہت بھلکڑ ہو چلی ہوں ان دنوں۔" وہ ہنسی۔ "تم نے بھی نہیں بتایا کہاں کھوئے رہتے ہو۔"

"بتاؤں۔" لڑکا ہنسا۔

لڑکی نے اس کی کمر میں ہلکا سا پیار بھرا گھونسا دیا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ۔" رجنی نے پوچھا۔

"کہیں نہیں۔" لڑکی ہنسی۔ "یہاں ریٹائرنگ روم میں ٹھہرے ہیں۔ بس انجوائے کرنے چلے آئے۔ مارننگ واک۔" لڑکا اسے کھینچ رہا تھا۔ "بائے آنٹی، یہ تھوڑا امیڈ ہے۔"

رجنی لڑکی کی کمر پر جھولتے ہوئے سرخ پراندے کو دیکھ رہی تھی لڑکی کی چال میں مستی تھی۔ وہ اب بھی کسی بات پر کھلکھلا رہی تھی، رجنی کی گاڑی پلیٹ فارم پر آگئی تھی۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بوگی تقریباً خالی تھی۔ اس کے علاوہ ابھی چار چھ مسافر ہی اور ہوں گے وہاں۔ اس نے آنکھیں موندیں اور گاڑی کے چلنے کا انتظار کرنے لگی۔

ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ گاڑی چل دی۔ دھیرے دھیرے رفتار پکڑنے لگی۔ بوگی میں اب خاموشی تھی۔ پھر بھاری قدموں کی آواز ابھری جیسے کوئی رک رک کر چل رہا ہو۔ قدم اس کے کیبن میں آکر رک گئے تھے۔ ٹی۔ ٹی۔ ای تھا۔ رجنی نے ٹکٹ دکھلایا۔ وہ چارٹ میں اندراج کر کے آگے بڑھ گیا۔ رجنی باہر دیکھنے لگی۔ دور تک ہریالی تھی۔ پچھلے دنوں کی بھرپور بارشوں کا پانی کھیتوں اور گڑھوں میں کھڑا تھا، جس میں بگلے اپنی خوراک تلاش کر رہے تھے۔ کئی سال بعد گھٹاؤں نے اس خطے کا رخ کیا تھا۔ سڑک پر ایک کار بھاگی جا رہی تھی۔ ایک پلیا کے قریب گنوں کی ٹرالی الٹی پڑی تھی۔ آخری سیٹوں پر آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ کوئی بنا ریزرویشن کے اس بوگی میں سوار ہو گیا تھا۔ تھوڑی سی بحثا بحثی کے بعد شانت ہو گیا۔ ٹی۔ ٹی۔ ای مطمئن اور خوش سا لوٹ رہا تھا۔

بیاس اسٹیشن سے ایک نوجوان اس بوگی میں سوار ہوا۔ وہ رجنی کے سامنے آبیٹھا۔ کچھ وقت وہ بیگانہ سا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ایک فلمی رسالہ نکال کر دیکھنے لگا۔ پھر بولا—— "میڈم، آپ کو کتاب دوں، میرے پاس——"

"نہیں" رجنی نے حلیمی سے انکار کر دیا۔ "میں صرف ٹرین میں ہی پڑھ سکتا ہوں۔ خالی نہیں بیٹھا جاتا مجھ سے۔" رجنی نے سوچا اس سے کہے۔ "اگر یہی سب پڑھتے ہو تو وقت ضائع کرتے ہو" لیکن وہ چپ بیٹھی باہر دیکھتی رہی۔

'پینٹری کار' سے ناشتہ بردار نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ اس نوجوان نے اپنے لئے ناشتہ لیا تو رجنی سے پوچھا۔ "آپ کوفی لینا پسند کریں گی۔" رجنی نے پھر مسکرا کر انکار کر دیا۔ اسے نوجوان کا یہ شستہ چار اچھا لگ رہا تھا۔ کوفی پینے کا من تو صبح سے تھا اب اس نے ایک دم انکار کر دیا تھا۔ خود اپنا یہ رویہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ نوجوان نے ناشتہ ختم کیا۔ کوفی پی۔ جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکالی، رجنی کی طرف دیکھا اور دروازے پر چلا گیا۔ رجنی نے سوچا اگر وہ یہاں بیٹھ کر بھی پیتا تو وہ اعتراض نہیں کرتی۔

نوجوان سگریٹ ختم کر کے لوٹ آیا۔ رجنی نوجوان سے اپنے بیگ کا خیال رکھنے کے لئے کہہ کر ٹوائلٹ کی طرف چلی گئی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ گھر سے نکلتے وقت کیا گیا میک اپ اب پھیکا پڑ رہا تھا۔ جاپانی ڈائی کے باوجود سفید بالوں کی ایک لٹ نہ جانے کب سرکشی پر اتر آئی تھی اس نے اسے کالے بالوں میں چھپانا چاہا لیکن ناکام رہی۔ وہ ٹوائلٹ سے باہر آگئی۔

اپنی جگہ پر آکر بیٹھی تو نوجوان نے کہا۔ "آپ لدھیانہ جا رہی ہیں؟"

رجنی حیران ہوئی۔ اسے کیسے معلوم ہوا۔ لڑکے نے مسکرا کر بتایا کہ اس نے چارٹ میں دیکھا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی۔ اگلے ہی پل اسے اس سفید لٹ کا خیال آیا اور اس کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ لڑکا

اسے بتانے لگا کہ اس کے بہت سے رشتہ دار لدھیانہ میں ہیں۔ اس کا خاندان تجارت پیشہ ہے، لیکن اسے تجارت میں دلچسپی نہیں۔ اس نے ہوٹلنگ کا کورس کیا ہے اور اب دہلی کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل میں اچھے عہدے پر ہے۔

جالندھر سے ایک خوبصورت جوان لڑکی اس بوگی میں سوار ہوئی۔ اس کی سیٹ بھی اتفاق سے رجنی والے کیبن میں ہی تھی۔ لباس، چال ڈھال اور گفتگو سے آزاد خیال، تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانے کی لگتی تھی۔ جلدی ہی وہ ان سے گھل مل گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ نوکری کے سلسلے میں دہلی جا رہی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ وہاں اس کا کوئی قریبی رشتہ دار یا دوست نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی وہ آزادی پسند اور خود مختار قسم کی لڑکی تھی۔ دہلی شہر سے بھی وہ واقف نہیں تھی۔ وہ وہاں کسی گرلز ہاسٹل یا پرائیویٹ لاج میں رہنا چاہتی تھی۔ نوجوان خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ چپ ہوئی تو بولا۔

"میری دخل اندازی اگر ناگوار نہ گزرے تو عرض کروں۔"

"جی ضرور---"

"آپ وہاں وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے (W.Y.C.A) میں ٹرائی کریں۔ لڑکیوں کے لئے وہی ایک بہتر اور محفوظ جگہ ہے۔ میں وہاں کی ہیڈ کو جانتا ہوں، آپ چاہیں تو میں---"

"آپ لڑکیوں کے ہاسٹلز کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔" لڑکی ہنسی۔ "کیوں آنٹی، میں اس نوجوان پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔" لڑکی نے شوخی سے کہا۔

"گھر سے باہر رہنے والوں کو بہت کچھ سیکھنا، جاننا پڑتا ہے۔" وہ ہنسا۔ "لیکن میں ان آوارہ مزاجوں میں سے نہیں ہوں، جو ایسی جگہوں کے صرف چکر کاٹا کرتے ہیں۔"

"آنٹی، کیا میں نے ایسا کچھ کہا" لڑکی کے لہجے میں کھنک تھی۔

"نہیں، نہیں۔ آپ دونوں ہی ایجوکیٹڈ ہیں، ذمہ دار ہیں۔" رجنی مسکرا دی۔

لڑکی اب سنجیدگی سے وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے اور دوسرے قیام گاہوں کے بارے میں تفصیل سے پوچھ رہی تھی۔ وہ کسی ایسی جگہ پر ٹھہرنا چاہتی تھی جو اس کے دفتر سے دور نہ ہو اور زیادہ مہنگی بھی نہ ہو۔ لڑکے نے اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا اور بتایا کہ وہ جب چاہے اس سے ہوٹل میں مل سکتی ہے۔ اس کی مدد کر کے اسے دلی خوشی ہوگی اور وہ اسے ہوٹل کی بہت اچھی چائے پلائے گا۔

اس مرتبہ کوفی والا آیا تو لڑکے نے تین کپ لے لئے۔ لڑکی نے بسکٹ نکال لئے۔ لڑکی اب دہلی کا جغرافیہ سمجھ رہی تھی۔ لڑکا اسے اپنی اور اپنے خاندان کی ہسٹری بھی ساتھ ساتھ بتا رہا تھا۔ اپنی باتوں میں وہ رجنی کو جیسے بھول گئے تھے۔

گاڑی لدھیانہ پہنچ کر رکی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کی بھیڑ تھی۔ رجنی نے بیگ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ پلیٹ فارم پر اس نے جیسے سکھ کا سانس لیا۔ اپنی کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے [illegible] جیسے کسی انجانے رشتوں کی ڈور [illegible] اور لڑکی اسے الوداع کہنے کے لئے کھڑکی [illegible] وہ اپنی اپنی جگہوں پر اپنی باتوں میں [illegible] اب ایک بزرگ عورت آگئی تھی [illegible] سنبھال پڑی تھی۔ وہ لڑکی اب ان عورت کا سامان [illegible] رکھنے میں مدد کر رہی تھی۔

وہ دونوں اتنی جلدی اسے بھول گئے--- سفر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

اس کی بہن کا بیٹا جو بھیڑ میں اسے تلاش کرتا آگیا تھا اس کے پاؤں چھو رہا تھا "سفر کیسا رہا آنٹی--- کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔"

"بہت اچھا---" اس نے سوچا سفر ریل کا ہو کہ زندگی کا، ملنا، بچھڑنا تو لگا ہی رہتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی اسٹیشن کی حدود سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وفیات

آغا حشر کاشمیری کے بھتیجے اور ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود شاہ کاشمیری کے بیٹے **آغا جمیل کاشمیری** کا بنارس میں ان کے آبائی مکان واقع ناریل بازار، دال منڈی ۱۴-۱۵ اکتوبر کی درمیانی شب ساڑھے بارہ بجے انتقال ہو گیا۔ مرحوم تقریباً ۸۶-۸۷ سال کے تھے۔ وہ معدے کے کینسر میں مبتلا تھے اور تقریباً دو سال سے صاحب فراش تھے۔ پسماندگان میں ان کی بیوہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ مرحوم نے اپنی ساری زندگی ڈراموں کی تدوین اور آغا حشر کے ڈراموں کی اشاعت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ شہر کے معززترین لوگوں میں ان کا شمار تھا۔ ڈرامے کی [illegible] اور اس کی باریکیوں کا جو علم انہیں تھا وہ اب مفقود ہے۔ انہوں نے آغا حشر کاشمیری کی شاعری کا ایک انتخاب مرتب کیا جسے اتر پردیش اردو اکادمی نے شائع کیا ہے۔ آغا حشر اور اردو ڈرامے سے متعلق ان کے کئی مضامین اردو کے موقر جرائد میں شائع ہوئے، خود بہت اچھے شاعر تھے۔ لیکن فنکار کی حیثیت سے اپنی نمود و نمائش سے ہمیشہ گریزاں رہے۔ ان دنوں وہ ڈاکٹر یعقوب یاور کے ساتھ مل کر کلیات آغا حشر کی ترتیب میں مصروف تھے۔

اردو کے مشہور و ممتاز شاعر اور ادیب جناب **رگھو ناتھ گھنی** ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء کی صبح کو دل کا دورہ پڑنے سے رحلت فرما گئے۔ ان کی عمر ۸۶ سال سے زیادہ تھی اور گوڑگاؤں کے کالونی ڈی ایل ایف فیز ۲ میں مقیم تھے۔ وہ سنسکرت کے شاعر بھرتری ہری کے چیدہ کلام کا شاعری میں ترجمہ کرنے کے لئے مشہور ہو گئے تھے۔

اردو 'شمع' اور ہندی 'سشما' کے ایڈیٹر **ادریس دہلوی** کا ۲۰ نومبر کو طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ مسٹر ادریس دہلوی ۶۸ برس کے تھے اور دو سال سے انہیں کینسر تھا۔ ان کے لواحقین میں ان کی اہلیہ، دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ ادبی حلقوں میں ان کی بڑی شہرت تھی اور انہیں ہندوستان و ہندوستان سے باہر کئی ایوارڈ ملے۔ فلموں [illegible] انتخاب کے لئے وہ دوردرشن کی کمیٹی کے بھی ممبر تھے۔

ادارہ مرحومین کے لئے دعائے خیر اور پسماندگان سے تعزیت کا اظہار کرتا ہے۔ (ادارہ)

رضا جعفری

آئینہ

یہ سن اسی کی ایک شام کی بات ہے۔

چھوٹے ماموں نے کراچی سے روانہ ہو کر دہلی پہنچنے کی اطلاع کیا دی کہ سارے گھر میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ یہ خبر اتنی اچانک اور چونکا دینے والی تھی کہ ابھی تک گھر کے جو بھی حالات تھے وہ ایک دم سے جیسے اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔ اب سب کے سامنے ایک بالکل نئی اور دلچسپ صورت حال آن کھڑی ہو گئی تھی۔

اماں اپنے بیمار اور کمزور جسم کو سنبھالتی ہوئی اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں، ابا اپنی ضعیف ٹانگوں کو پلنگ سے اتار کر اپنے ڈنڈے کے سہارے کھڑے ہونے لگے۔ چھوٹا بھائی ابرار ہمیشہ کی طرح ہنگامی وقت پڑنے پر اپنے کمر بند کو کھولنے باندھنے لگا۔ اس کی بیوی جو دور کے خاندان سے بیاہ کر آئی تھی، آنکھیں پھاڑ کر سارے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ میری بیوی فاطمہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میرے ہاتھ سے تار کا کاغذ لے کر اس مضمون کو پھر سے پڑھنے لگی جس کو میں کئی بار زور سے پڑھ کر سب کو سنا چکا تھا۔ بس پورے گھر میں بچے ہی ایسے تھے جو ہر چیز سے بے نیاز اپنے کھیل کی دنیا میں مگن تھے۔

میں فاطمہ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتا ہوا اماں اور ابا کے پلنگوں کے درمیان بچی کرسیوں میں سے ایک پر آکر بیٹھ گیا۔ گھر کے اور افراد بھی دھیرے دھیرے وہاں آکر جمع ہو گئے۔ اماں جب سے صاحب فراش ہوئی تھیں ہم لوگ اسی طرح ان کے پلنگ کے گرد جمع ہو کر مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ اماں کو چونکہ گھر میں مرکزی حیثیت حاصل تھی لہٰذا زیادہ تر باتوں کی ڈور انہیں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔

اماں آج بہت خوش تھیں۔ ان کا برسوں کا بچھڑا بھائی ملنے کے لئے آرہا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح اڑ کر دلی پہنچ جائیں جہاں چھوٹے ماموں کسی انٹرنیشنل سیمینار میں شرکت کے لئے پہنچ چکے تھے۔ مگر وہ اپنے حالات اور اپنی بیماری سے مجبور تھیں۔ آج ان کی ذہنی کیفیت بتا رہی تھی کہ ان کی نگاہوں کے آگے ماضی کی کتاب کے پنے ورق ورق کھل رہے ہیں۔ انہیں یاد آرہا تھا کہ تقسیم ہند کے وقت بھرت پور سے ان کا لٹا ہوا قافلہ آگرہ پہنچا تھا اور وہاں سے اماں کے والدین ان کے پانچوں بھائیوں کو لے کر کراچی کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ اماں، ابا کے ساتھ میرٹھ آگئی تھیں کیونکہ وہ اس زمانے میں وہیں تعینات تھے۔ میں اس زمانے میں بہت چھوٹا تھا۔ اماں یہ باتیں سیکڑوں بار بتا چکی تھیں۔ وہ جب بھی سوچ میں ڈوبتیں ہم سمجھ جاتے کہ یہی سوچ رہی ہیں۔

اماں نے یکایک پوچھا۔ "تو پھر تم نے کیا سوچا۔ کب جا رہے ہو لینے؟"

میرے لئے فوری جواب دینا اتنا آسان نہیں تھا۔ بہت سی باتیں سوچنی تھیں۔ ان کا دل رکھنے کے لئے میں نے کہا۔ "آج کا دن تو نکل گیا۔ کل دیکھتے ہیں۔ آفس جا کر انتظام کرنا ہوگا——"

میں نے سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔ خوش تو وہ سب تھے مگر شاید، گھر میں بوریا نہ ہونے کا احساس ان کو اندر ہی اندر کہیں سال رہا تھا۔ اتنی بڑی نوکری اور ملکوں ملکوں گھومنے والے، عالیشان زندگی گزارنے والے چھوٹے ماموں ان کے اسی خستہ حال مکان میں کیسے رہیں گے، شاید یہی بات سب سوچ رہے تھے۔ میں نے بھی نظریں دوڑائیں تو لگا گھر واقعی بڑا بوسیدہ اور پرانا ہو گیا ہے۔ دل چاہا کاش کہیں سے علاء الدین کا وہ چراغ مل جائے، جس کا جن باہر نکل کر سارے حالات بدل کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ اس نے شاید میرے دل کا حال پڑھ لیا اور اسی لئے اس نے پلکیں جھپکا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ مگر اس وقت کوئی بھی کچھ کر سکنے کی حالت میں نہیں تھا۔ میں نے دیکھا خوش تو سب تھے دل میں، مگر ایک بے نام سی بے بسی کی بدلی گھر آئی تھی سارے گھر پر۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عجیب طرح کے تناؤ میں آگیا تھا پورا گھر۔

دوسرے دن لکھنؤ سے روانہ ہو کر جب میں نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ آخر نومبر کی خوشگوار رات تھی۔ باہر نکل کر میں نے آٹو لیا اور سیدھا اسی ہوٹل کے کاؤنٹر پر جا پہنچا جہاں چھوٹے ماموں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر سے نمبر لے کر میں نے فون ملایا۔ فون جس نے اٹھایا وہ بڑی مہذب نسوانی آواز تھی۔

میں نے کہا۔ "میں اقبال بول رہا ہوں۔ ہوٹل کی لابی سے۔"

دوسرے ہی لمحے ایسا لگا جیسے آواز میں خوشی کی

۵۰ مقبرہ، گولہ گنج، لکھنؤ-۲۲۶۰۱۸

روڑ گئی ہو۔ "اچھا اقبال بھائی السلام علیکم! آپ آ گئے۔
یں ٹھہر یئے۔ ہم آتے ہیں۔"

اور فون بند ہو گیا۔ میرا دل ایک دم سے دھڑ کنے
۔ نسوانی آواز کس کی ہے؟ کیا ممانی بھی آئی ہیں؟
دں کے فاصلوں نے کیا ظلم ڈھایا ہے کہ ہم ایک
سرے کی آواز بھی نہیں پہچانتے۔ میں نے سوچا۔

روشنی میں ہوٹل کی لابی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔
ر میرے لئے اب ایک لمحہ بھی گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔
ں وقت سامنے کی لفٹ کا دروازہ کھلا اور چھوٹے ماموں
ودار ہوئے۔ پتہ نہیں کب ہم ایک دوسرے سے بغل
ر ہو گئے۔ دونوں ملکوں کی سرحدیں درمیان سے
دوم ہو گئیں۔ ۳۴ سال کا وقفہ بھی معدوم ہو گیا۔
ب ہم نے سر اٹھا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو
ہ ایسا احساس ہوا جیسے آئینہ دیکھ رہے ہوں۔ ہماری
کلیں آپس میں اتنی ہی ملتی جلتی تھیں۔ وہ رشتے میں
رے ماموں ضرور تھے مگر عمر میں وہ مجھ سے صرف
سال ہی بڑے تھے۔

پھر چھوٹے ماموں نے پیچھے کھڑی خاتون کی
رف اشارہ کیا۔ "ان کو پہچانو۔" میں نے ان کی طرف
یکھا۔ ان کا چہرہ ان کی آواز کا آئینہ دار تھا اور خوشی سے
نار ہو رہا تھا۔

میں نے بے ساختہ کہہ دیا۔ "شکیلہ ممانی۔"

اور دوسرے ہی لمحہ شکیلہ ممانی کے دونوں ہاتھ
رے ہاتھوں میں تھے اور میرا سر ان کے ہاتھوں پر جھکا
ا تھا اور ہماری آنکھوں سے اشک رواں تھے۔

دوسری صبح واپسی کا ریزرویشن کرانے کے بعد
ب میں ان سے ملنے ہوٹل پہنچا تو چھوٹے ماموں
انے کو تیار کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

"تم اپنی ممانی کو دلّی دکھاؤ۔ میرا تو سارا دن
نفرنس میں نکل جائے گا---" اور وہ چلے گئے۔

میں اور ممانی ہوٹل کے پر تکلف ماحول سے نکل
ر ٹہلتے ہوئے باہر آ گئے۔ کناٹ پلیس کا علاقہ دور تک
پی بانہیں پھیلائے شاد و آباد کھڑا تھا اور دلّی کی زندگی
یشہ کی طرح رواں دواں تھی۔ سڑک کے کنارے لگی
کانوں میں ٹورسٹوں کو لبھانے کے لئے ہر ریاست کا
مخصوص سامان بھرا ہوا تھا۔ دنیا کے تقریباً ہر ملک کا
ٹورسٹ وہاں موجود تھا اور اتنے اچھے، خوبصورت
اور بہت سارے سامان کو لالچ بھری نظروں سے دیکھ رہا
تھا۔ ہندوستان کے بہترین کاریگروں کے ہاتھ کا بنا ہوا
سامان اتنی وافر مقدار میں دیکھ کر ممانی کچھ حیران کچھ
پریشان تھیں ایسا میں نے محسوس کیا۔ میں نے کہا۔
"آئیے قریب سے چل کر دیکھتے ہیں۔"

مگر وہ ایک دم سے بھڑک گئیں۔ "نہیں۔
نہیں۔ بس یوں ہی ٹھیک ہے۔"

میں نے محسوس کیا وہ مجمع کے درمیان جانے کو
تیار نہیں تھیں۔ وہ چل بھی بہت محتاط انداز میں رہی
تھیں جیسے کسی چیز سے خوفزدہ ہوں۔

میں نے پوچھا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں نا---؟"

"ہاں، ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ بولیں۔

"دراصل تمہارے ملک کی سڑکوں پر آج میں پہلی بار
چل رہی ہوں۔ عجیب سا لگ رہا ہے۔ ایک دم سے ماضی
کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئی ہیں---"

"ماضی کی یادیں---؟ یہاں---؟" مجھے ان کی
بات سن کر کچھ تعجب ہوا کیونکہ بٹوارے کے وقت جب
وہ یہاں سے گئی ہوں گی اس وقت یقیناً ان کی عمر اتنی
نہیں رہی ہو گی کہ جس کی کچھ یادیں بھی ہوں۔ میں نے
سوچا۔

"کیوں---؟ آپ کو تعجب ہو رہا ہے---؟"
مجھے لگا انہوں نے میرے ذہن میں چلتی ہوئی فلم کو دیکھ
لیا ہے۔ پھر وہ بولیں۔ "خیر۔ چھوڑیئے۔ یہ بتایئے یہاں
کی جامع مسجد اور لال قلعہ کہاں ہیں؟ پہلے وہ دیکھ لیتے
ہیں۔"

انہوں نے بات کے رخ کو موڑ دیا۔ میں نے بھی
زور نہیں دیا۔ ایک جاتے ہوئے ٹوسیٹر کو روک کر ہم
لوگ جامع مسجد کے لئے روانہ ہو گئے۔ راستے میں کئی
جگہ ٹریفک کے جام لگے۔ ممانی بڑے غور سے دیکھتی
رہیں۔ اتنی بھیڑ کو دیکھ کر وہ بہت پریشان تھیں۔ ان کا
دھیان بٹانے کے لئے میں راستے میں پڑنے والے
تاریخی مقامات کے بارے میں ان کو بتاتا رہا۔ جامع مسجد
کا علاقہ آتے ہی میں نے محسوس کیا ممانی یہاں کی بھیڑ
ٹوپیاں اور لمبی لمبی داڑھیاں دیکھ کر کچھ مطمئن سی
نارمل ہو گئیں۔ جامع مسجد کی عظیم الشان عمارت، لمبے
چوڑے دالان اور کشادہ صحن کو دیکھ کر وہ کچھ مطمئن
نظر آئیں۔

پھر جب ہم جامع مسجد کی سیڑھیاں اتر کر نیچے
آئے تو وہ آہستہ سے بولیں--- "چلئے خدا کا شکر ہے دلّی
کا ایک علاقہ تو ایسا ہے جہاں کچھ مسلمان نظر آتے ہیں
اور اسلامی عظمت کا احساس ہوتا ہے---"

میں نے ان کی طرف چونک کر دیکھا اور سوچا۔
"اچھا تو یہ یہاں کے مسلمانوں اور اسلامی عظمت کے
لئے اتنی پریشان ہیں۔"

مجھے خوشی ہوئی کہ ان کی سوچ کا ایک سرا تو ہاتھ
میں آیا۔ میں نے کہا۔ "یہ دلّی کا پرانا علاقہ ہے لہٰذا
مسلمان یہاں ایک خاص لباس میں نظر آ رہے ہیں اور
لباس سے ان کے مذہب کی پہچان ہو رہی ہے۔ ورنہ یہ
ملک تو دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ یہاں
لباس، بولی، خورد و نوش سے مذہب کی تمیز کرنا کچھ
آسان نہیں ہے۔"

وہ کچھ نہیں بولیں۔ مجھے لگا جیسے ان کو میری اس
بات میں کوئی وزن محسوس نہیں ہوا۔ ظاہر ہے وہ
مملکت خداداد سے آئی تھیں جہاں فوجی جنرلوں کا دبدبہ
تھا، ان کے لئے یہ بات سمجھنا آسان نہیں تھا۔

لال قلعہ جانے کے لئے جب ہم رکشا پر بیٹھے تو
وہ بڑے تاسف بھرے انداز میں بولیں۔ "اوروں کو تو
جانے دیجئے۔ میری تو سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ
یہاں آپ لوگوں کا مستقبل کیا ہے؟ ابھی تو آپ کے
بچے چھوٹے ہیں۔ کل کو جب وہ بڑے ہوں گے ان کے
روزگار کا، شادی بیاہ کا مسئلہ درپیش ہو گا۔ روزگار
چھوڑیئے۔ شادی بیاہ کا کیا ہو گا؟ یہاں کتنے سید گھرانے
ہیں؟ کیا غیروں میں کریں گے رشتے---؟"

میں نے ممانی کی طرف دیکھا۔ مجھ کو ان کی بات
سن کر افسوس اس لئے ہوا کہ وہ تو ساری دنیا گھوم چکی
ہیں پھر بھی ان کے قلب پر انسانی عظمت کا کوئی اثر
نہیں ہوا۔ وہ ذہنی طور پر ابھی تک اپنے ملک کے بند
معاشرہ میں ہی گھوم رہی ہیں۔ وہاں کی وہ خواتین جنہوں

پڑ رہا ہو گا۔ جو بھی تھی ان کا کیا حال ہو گا۔ میں ممانی اپنی بیٹی کے لئے بہت فکر مند نظر آ رہی تھیں۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ "ممانی! یہ ملک اور یہاں کے لوگ بڑے عجیب ہیں۔ شروع میں ایسا ہی لگتا ہے۔ جب آپ یہاں کچھ دن رہیں گی تب آپ کی سمجھ میں آئے گا کہ یہاں لوگوں کے دلوں میں کتنی وسعت ہے۔ یہاں آپس کی محبتیں کتنی گہری ہیں۔ خون کے رشتوں اور مذہبی تعصب سے آزاد ہو کر جب آپ یہاں کے لوگوں سے ملیں گی تبھی آپ سمجھ پائیں گی کہ اس ملک میں وہ کون سی بات ہے جو اس کو صدیوں سے قائم رکھے ہوئے ہے۔"

"بھائی! یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ ان میں کچھ نہیں رکھا ہے۔" وہ بولیں۔ "آپ کے ہاں جب فساد ہوتے ہیں تو آپ پر کیا گزرتی ہے؟ کیا اکثریتی فرقے کے ساتھ حکومت بھی آپ کی دشمن نہیں ہوتی؟ تب یہ آپ کا فلسفہ کہاں چلا جاتا ہے؟"

میں نے کہا — "ممانی! یہ حکومت والی بات تو آپ کے اخبار لکھتے ہوں گے۔ مگر آپ کو معلوم ہے یہاں مسلمانوں پر وقت پڑنے پر ان کا ساتھ کون دیتا ہے؟ کون ہوتا ہے ان کی ہر بات کے لئے سینہ سپر؟ مسلمان تو یہاں مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کا کام کرتے ہیں۔ سینہ سپر ہمیشہ ہندو ہوتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اب آپ نے چھیڑا ہے تو میں بتاؤں کہ دراصل یہاں آپس میں بے اعتباری کا دور وہاں سے شروع ہوا جب آزادی ملنے کے بعد ناعاقبت اندیش مسلمان اس ملک کو چھوڑ کر جانے لگے۔ جب مل کر بیٹھنے کا وقت تھا بچھڑنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو مسلمان یہاں بچے رہ گئے ملک سے ان کی وفاداری شکوک کے گھیرے میں آ گئی اور اس بات نے ملک میں فسادات کرائے۔ مگر آج خدا کا شکر ہے کہ سارے آئینے صاف ہو گئے ہیں۔ جو کچھ بچا ہے وہ بقول غالب گھر کی رونق کا معاملہ ہے۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی"

مجھے لگا ابھی ممانی کے دل کا آئینہ صاف نہیں ہوا ہے۔

لال قلعہ کے بازار سے گزرتے وقت ممانی وہاں کے دکانداروں کے چہرے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا۔ وہ ان کے ماتھے پر ان کا مذہب تلاش کر رہی تھیں، جو ہندو تھا اور اسی لئے شاید وہ کچھ بے کلی تھیں۔ وہ جس ملک سے آئی تھیں وہاں مذہبی فکری دھارے ایک ہی دہانے سے ہو کر بہہ رہے تھے اور اس لئے ان کی نظریں بجز یہ کہ ان کو نہ دیکھ کر محض ایک جوئے کم آب کو دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت تکلیف ہوئی۔ مگر کسی کے زاویہ نگاہ کو بدلنے کے لئے ایک مدت چاہئے۔ میں نے سوچا اور دل میں کہا۔ "میں اس مدت کا انتظار کروں گا۔"

جب ہم واپس ہوٹل پہنچے تو چھوٹے ماموں آ چکے تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی بولے۔ "بھئی پہلے یہ بتاؤ تم نے اپنی ممانی کو کچھ کھلایا پلایا بھی یا یہ ابھی تک بھوکی ہیں؟"

"بھوکی --- ہیں ---؟" مجھے سن کر شاک لگا۔

پھر مجھے ایک دم سے یاد آیا کہ راستے میں کئی مرتبہ میں نے ممانی سے کچھ لینے کے لئے کہا تھا مگر انہوں نے اپنی باتوں میں ہر بار کھانے کی بات کو ٹال دیا تھا۔

مجھے چپ دیکھ کر چھوٹے ماموں بولے۔ "جب سے یہ تمہارے ملک آئی ہیں، انہوں نے بسکٹ اور کیک کے علاوہ کچھ نہیں کھایا ہے۔ ان کے دل میں ایک خوف سمایا ہوا ہے۔ کہیں یہاں کے کھانے میں کچھ ملا ہوا نہ ہو۔"

چھوٹے ماموں ہنسنے لگے۔ مگر مجھے اپنے ملک کے بارے میں ایسی چھوٹی بات سن کر بہت دکھ ہوا۔ میں نے ممانی کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ کچھ زرد ہو رہا تھا۔

چھوٹے ماموں بولے۔ "دراصل یہ ملک کے بٹوارے کو ابھی تک بھول نہیں پائی ہیں۔ بڑی تلخ یادیں جڑی ہیں ان کی بٹوارے کے ساتھ —" پھر انہوں نے جو بات بتلائی اس کو سن کر میرے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ بولے۔ "غیر منقسم ہندوستان میں ان کے والد یہاں کی ایک ریاست میں بڑے عہدے پر فائز تھے۔ تقسیم کے وقت جب چاروں طرف اتھل پتھل مچی اور ملک چھوڑنے کا ماحول بنا تو ان کے والد بھی اپنے خاندان کے ساتھ ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ مگر راستہ میں بلوائیوں نے ان کی گاڑی کو روک لیا۔ ان کی والدہ تو کسی طرح ان کو لے کر کراچی پہنچ گئیں مگر ان کے والد راستے میں ہی مارے گئے۔ انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور اس حادثے کی تفصیل سنی ہے تب سے یہ حادثہ برابر ان کو ہانٹ کر رہا ہے۔ ان کو کسی بھی طرح یہ اعتبار نہیں ہو رہا ہے کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور یہ یہاں محفوظ ہیں — دراصل ان کو ساتھ لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ یہ احساس ختم ہو جائے۔"

انہوں نے میری طرف دیکھا۔ مجھے شرمندگی تو ضرور محسوس ہوئی مگر میں انہیں کیسے بتاتا کہ یہ المیہ تو اس دور کا ہے جو کہ دونوں طرف ہوا۔ ایک دم سے میرے ذہن میں وہ ساری گفتگو ری وائنڈ ہونے لگی جو صبح سے میرے اور ممانی کے درمیان ہوئی تھی۔ اب جا کر اس کا سارا سیاق و سباق مجھ کو معلوم ہوا تھا۔ فانوس اگر گندہ ہو تو شکلیں بھی گندی دکھائی دیتی ہیں۔ ممانی تو وہی دیکھ رہی تھیں جو وقت کے فانوس نے ان کو دکھایا تھا۔ اب یہ میرا فرض تھا کہ میں فانوس کے شیشے صاف کر دوں تاکہ وہ موجودہ وقت کی تصویر صاف دیکھ سکیں۔ مجھے ممانی پر ایک دم سے پیار آنے لگا اور وہ مجھے ایک معصوم گڑیا سی نظر آنے لگیں۔

دلّی آنے کے بعد مجھے اپنے بچپن کے دوست پنکج کی یاد آئی تو ضرور تھی، مگر چونکہ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ چھوٹے ماموں کا کیا پروگرام ہے اس لئے میں نے اس سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ اب جب کہ یہ طے ہو گیا تھا کہ ممانی کو لے کر دوسرے دن کی ٹرین سے مجھ کو لکھنؤ جانا ہے، میں نے پنکج کو اس کے دفتر میں فون کیا۔ میری آواز سنتے ہی اس کے اندر ہمیشہ کی طرح زندگی دوڑ گئی۔ میں نے اس کو اپنے دلی آنے کے مقصد سے آگاہ کیا تو وہ اور بھی زیادہ خوش ہو گیا۔

وہ بولا — "میں آفس میں چھ بجے تک ہوں۔ تم ماموں سے معلوم کر کے بتاؤ وہ شام کو کب تک میرے ہاں آ سکتے ہیں۔ میں لینے کے لئے گاڑی بھیج دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "پہلے ان سے پوچھ تو لوں۔ وہ آئیں گے بھی یا نہیں۔"

وہ ہمیشہ کی طرح دعوی سے بولا۔ "واہ! آئیں گے کیوں نہیں۔ کیا وہ میرے ماموں نہیں ہوئے؟"

اس طرح رات کو آٹھ بجے کے قریب ہم لوگ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر پنکج کے گھر پہنچ گئے۔ دلی کی ایک پوش کالونی میں اس کا چھوٹا سا مگر بڑا ہی خوبصورت گھر تھا۔ پنکج کے ساتھ اس کی بیوی دیپالی اور دونوں بچے بھی ہمارے استقبال کے لئے گیٹ پر ہی کھڑے تھے۔

ہمارے اترتے ہی پنکج بولا۔ "اس کے ساتھ آپ میرے بھی تو ماموں ہی ہوئے۔ اس لئے آپ لوگوں کو اب میرے پاس ہی رہنا ہوگا۔" اور ساتھ ہی اس نے بڑے ادب سے جھک کر ماموں ممانی کے پاؤں چھو لئے۔ اس کو دیکھ کر دیپالی اور بچوں نے بھی ان کا اسی طرح استقبال کیا۔

ماموں نے ہنس کر کہا--- "ارے بھائی! تم لوگ تو مجھے بڑا بزرگ بنائے دے رہے ہو۔ میں تم لوگوں سے تھوڑا سا ہی تو بڑا ہوں گا۔"

"وہ تو ہے۔ مگر آپ کا رشتہ تو ہماری ماتاجی کے بھائی کا ہوا نا۔ اس لئے بڑے تو آپ ہر حال میں ہوئے۔"

سب لوگ ہنستے ہوئے ڈرائنگ روم میں آ گئے جہاں گرم گرم کافی سب کا انتظار کر رہی تھی۔

تین گھنٹے کس طرح گزر گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ میں، پنکج اور چھوٹے ماموں دونوں ملکوں کے سماجی اور سیاسی حالات پر مختلف زاویوں سے گفتگو کرتے رہے۔ ممانی اور دیپالی میں گفتگو کا نہ جانے کیسا ربط پیدا ہوا کہ وہ اپنے اپنے وجود کو بھول کر ڈرائنگ روم سے کب دیپالی کے کمرے میں چلی گئیں کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔

وہ تو کھانا جب میز پر لگایا جانے لگا تو میں نے دیکھا دیپالی کے ساتھ ممانی بھی اس کا ہاتھ بٹا رہی ہیں اور اس کو کڑھائی گوشت بنانے کی ترکیب سمجھا رہی ہیں۔ میں نے دیکھا اس وقت ممانی کے چہرے پر ایک عجیب سی آب تھی اور وہ بھی دیپالی کی طرح ہشاش بشاش نظر آ رہی تھیں۔

کھانے کے بعد جب سب نے گھڑی کی طرف دیکھا تو وہ رخصت ہونے کا وقت بتا رہی تھی۔ پنکج نے بہت زور دیا کہ سب لوگ وہیں رک جائیں، وہ صبح ناشتے کے بعد سب کو پہنچا دے گا۔ مگر چھوٹے ماموں کے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ دیپالی نے ممانی کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے پر نہ جانے کیا لکھا دیکھ کر اس نے اپنی باہیں ممانی کے گرد ڈال دیں۔ آخر میں طے ہوا کہ چھوٹے ماموں اکیلے ہوٹل جائیں گے۔ کل صبح میں اور ممانی دیپالی کے ساتھ دلی کی تاریخی عمارتیں دیکھنے کے بعد ہوٹل پہنچیں گے۔

دوسرے دن لکھنؤ جانے کے لئے جب ہم اپنی گاڑی کے ریزرو کمپارٹمنٹ میں پہنچے تو وہاں حسب معمول ہنگامی حالات تھے۔ ہر مسافر کو اپنی پڑی تھی۔ ہم کسی طرح راستہ بناتے ہوئے اپنی سیٹوں تک پہنچے تو دیکھا وہاں پنکج اور دیپالی ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ ڈھیر سارا کھانا اور ناشتہ لے کر آئے تھے۔

پنکج مجھ کو دیکھتے ہی بولا۔ "ارے بھلے آدمی! فرسٹ کلاس یا اے۔ سی سلیپر میں ممانی کو لے جاتا تھا۔ یہاں سب کے بیچ سیکنڈ کلاس میں تو نے ریزرویشن کرا لیا ہے۔ ان کی عادت ہے اس کی---؟" اس نے بھیڑ کی طرف اشارہ کیا۔

"یار! تجھے پتہ نہیں۔ پہلے تو میں نے اپنی جیب دیکھ کر ریزرویشن کرایا تھا۔ مگر اب شاید اللہ کی مصلحت تھی کہ میں ان کو اس میں لے جا رہا ہوں۔ دراصل میں ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ عوام دونوں ملکوں کے ایک جیسے ہیں۔ یہ سیاست داں ہیں جو ہمیں انسان سے حیوان بنا دیتے ہیں۔ ہم ایک ہی تہذیبی ورثے کے وارث ہیں۔ بس اللہ سے دعا ہے کہ یہ سفر عزت سے کٹ جائے۔" میں نے کہا۔

"بھگوان تم لکھنے والوں کو سمجھے۔" وہ لاچاری سے بولا۔ "تم نے انسانوں کو بھی چوہے بلی کی طرح تجربے کی چیز بنا لیا ہے۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ گاڑی چھوٹنے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ دیپالی جو ابھی تک میری جگہ پر بیٹھی تھی نیچے اتر آئی۔ گاڑی روانہ ہوئی اور ہم ایک دوسرے کو دور تک [illegible]

ہمارے آس پاس کی سیٹوں پر سکھ [illegible] خاندان بیٹھے ہوئے تھے۔ ممانی کافی دیر تک [illegible] میں رہی تھیں اس لئے [illegible] تھیں۔ گاڑی روانہ ہونے کے [illegible] محسوس کیا کہ وہ یہاں سب کے [illegible] چین ہو رہی ہیں۔ گاڑی اب تیز رفتار سے [illegible] اور سارے مسافر اپنی جگہوں پر اطمینان سے [illegible] تھے۔ تھوڑے فاصلے پر چار سکھنیاں بیٹھی تھیں۔ [illegible] ان کا دھیان بٹانے کے لئے ساتھ لائے رسالے [illegible] کے آگے کر دیئے۔

میں نے یکایک محسوس کیا سامنے بیٹھی گوری [illegible] سن رسیدہ سردارنی جس کے سارے بال سفید تھے جس کے خوبصورت چہرے سے نور ٹپک رہا تھا ممانی کی صدری کو بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو پیلا عنابی رنگ کی صدری پر شیشے کی بڑی عمدہ کاریگری تھی۔ وہ صدری ممانی پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پھر وہ نظروں ہی نظروں میں م[illegible] کے پورے سراپے کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے مطمئن ہو کر، گھوم کر اپنے برابر بیٹھے سردار جی سے کچھ کہا جو ٹرین کے شور میں مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ پھر ان دونوں نے مل کر میری طرف بڑی تجسس بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ایسی نگاہیں جنہوں نے میرے پورے وجود کا ایکسرے کر ڈالا۔ مجھے ایک دم سے برسوں پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ میں سہارنپور سے لکھنؤ کا سفر کر رہا تھا۔ میرا ریزرویشن نہیں تھا اور ٹرین میں بے حد رش تھا۔ ایک بوڑھی مسلمان عورت اور اس کے لڑکے کے بیچ پورا ڈبہ لمبے چوڑے سرداروں اور ان کی [illegible] سے بھرا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت شاید بیمار بھی تھی کیونکہ اس سے ٹھیک طرح سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ ایک سردار نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو اس کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس بوڑھی عورت کو اپنی جگہ [illegible] میرے ساتھ کھڑے کھڑے لکھنؤ تک آیا۔

اس وقت بھی سردار جی اور ان کی بیوی کو [illegible]

طرف دیکھتا ہوا پا کر میں آہستہ سے مسکرا دیا۔ سردار جی کو شاید یہ جملہ ملا۔ وہ بولے۔ "آپ نے لکھنؤ جانا ہے؟"

"جی---" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ بھی پاکستان سے آ رہے ہو---؟" اب اس نے سیدھا سوال کیا۔ اس کے سوال کو سن کر مجھے تعجب ہوا۔

"نہیں تو---" میں بولا۔ مجھے خود لگا کہ میرا جملہ ادھورا ہے۔

"مگر یہ تو پاکستان کی ہیں--- پوری---" اب کی بار بزرگ خاتون کچھ اس انداز میں بولیں کہ اگر میں نے انکار کیا تو وہ شاید کسی بڑی دولت سے محروم ہو جائیں گی۔

"جی ہاں--- میں کراچی سے آ رہی ہوں---" اب کی بار ممانی نے جواب دیا۔

وہ بزرگ خاتون ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس دیں--- "تبھی میں کہوں۔ یہ اپنی مٹی کی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے---"

اور انہوں نے بے اختیار اپنے لمبے ہاتھ آگے بڑھا کر ممانی کے دونوں گال لاڈ سے تھپتھپا دئے۔ نہ جانے ان کے ہاتھوں میں کون سا جادو تھا کہ ممانی کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور ابھی تک جو تناؤ چھایا ہوا تھا دور ہوتا چلا گیا۔ پھر باتوں کا سلسلہ جو چلا تو دراز ہوتا ہی چلا گیا۔ وہ لوگ ترک وطن سے پہلے گوجرانوالا میں رہتے تھے مگر کاروبار کے سلسلے میں کراچی اور حیدرآباد سندھ بہت زیادہ آنا جانا رہتا تھا۔ وہاں کے لباس، کھانے بود و باش سبھی سے واقف تھے وہ۔ یوں تو وہ پنجابی تھے مگر سندھ کا وصف بھی در آیا تھا ان میں۔ آہستہ آہستہ پورے ڈبے کو معلوم ہو گیا کہ ان کے درمیان ایک مسافر پاکستان کا بھی ہے۔ پھر تو ایسا لگنے لگا جیسے وہ اکیلی مہمان ہیں اور باقی سارے میزبان۔ نہ جانے کتنی طرح کے اچار، چٹنیاں، پراٹھے، چھولے بھورے نکل آئے۔ ٹرین جب مرادآباد پر رکی تو چار برقعہ پوش عورتوں کو رخصت کرنے کے لئے ایک پوری جماعت ڈبے میں آ گئی۔ خوش حال اور خوش پوش تنومند مرد اور عورتیں۔ اس طرح باقی کی چار سیٹیں بھی بھر گئیں اور اس کے بعد جو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پتہ ہی نہیں چلا کہ ہم کب لکھنؤ پہنچ گئے۔ پنج اور دیہاتی کا دیا ہوا کھانا اور ناشتہ یوں ہی بندھا رہا۔

ٹرین جب لکھنؤ اسٹیشن پر رکی تو ابا اور اماں کو چھوڑ کر سارا گھر وہاں استقبال کو موجود تھا۔ میرے دوست ندیم، شائق اور تمی اور پرشوتم بھی تھے۔ ڈبے سے اتر کر باہر آتے آتے ممانی کے ہاتھ میں نہ جانے کتنے کارڈ آ چکے تھے جن میں ان کو اپنے گھر بلانے والوں کے نام اور پتے درج تھے۔ ممانی نیچے اتریں تو سارے گھر والوں نے ان کو گھیر لیا۔ وہ بھی سب کو پہچان پہچان کر گلے لگانے لگیں۔

اسی وقت میں نے دیکھا میرے باس اگروال صاحب اپنی پتنی شکنتلا دیوی کے ساتھ آ گئے۔ ممانی سے ملنے کے بعد وہ مجھ سے آہستہ سے بولے۔ "میں نے گھر جانے کا انتظام کر دیا ہے۔ گاڑیاں باہر کھڑی ہیں۔"

میں نے ان کی طرف دیکھا وہ جو اپنے اصولوں کے بڑے سخت تھے اور آفس میں ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ آج سر تا پا میزبان نظر آ رہے تھے۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب لکھنؤ میں ممانی کے قیام کی مدت پوری ہوئی اور وہ اپنا سامان سفر باندھنے لگیں۔ اتنے تحفے تھے کہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا لے جائیں اور کیا چھوڑ جائیں۔ کوئی آ رہا تھا۔ کوئی جا رہا تھا۔ ناشتے اور پھلوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ مگر وہ ہنسی اور قہقہے جو اتنے دنوں سے گھر میں گونج رہے تھے آج خاموش تھے۔ جانا تو ممانی رہی تھیں مگر سفر سب کے ذہنوں پر سوار تھا۔

جب آخری بار رخصت ہوتے ہوئے ممانی نے میری طرف دیکھا تو ان کی آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں مجھے ایک دم سے وہ لمحہ تیرتا ہوا نظر آنے لگا جب انہوں نے دہلی میں مجھ سے کہا تھا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ یہاں آپ لوگوں کا مستقبل کیا ہے؟"

اور میں بے چین ہو گیا۔ پتہ نہیں اب ان کا دماغ کیا سوچ رہا ہے؟ اسی وقت وہ آہستہ سے بولیں۔ "بھائی! میں یہاں پھر آؤں گی۔ بار بار آؤں گی۔ کوئی چیز ہے جو یہاں چھوٹ گئی ہے۔"

☆☆

الہ دین کا چراغ

شادی میں آئے ہوئے سارے مہمان رخصت ہو چکے تھے، آج ہماری روانگی تھی۔ ڈیوڑھی کے پاس سب سامان بندھا ہوا رکھا تھا، باہر جیپ تیار کھڑی تھی اس بار اماں نے اپنے میکے کے گاؤں سے ایک بچے کو ہمارے ساتھ جانے پر راضی کر لیا تھا۔ اس بار منو بھی ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔ منو برآمدے کے ستون سے لپٹا کھڑا تھا، اس کی ماں وہیں قریب میں فرش پر اکڑوں بیٹھی اسے سمجھا رہی تھی۔

"ارے دلہن بہت اچھے سے رکھے ہیں، اسکول ماں بھرتی کرے ہیں، جا منوا، کونو پریسانی کی بات نا ہیں ہے۔"

وہ نیچی نظریں کئے کھڑا رہا۔ دبلا پتلا سا، کالی رنگت والا یہ لڑکا شاید دس برس کا ہوگا۔ اس کی ماں کو بھی اس کی صحیح عمر نہیں معلوم تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس پلنگ پر بٹھالیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دیا۔

"دیکھو ہم تم کو گھمانے لے جا رہے ہیں۔ خوب کھانا پینا، طاقتور اور موٹے ہو جاؤ گے۔ اسکول میں بھرتی کرائیں گے اور پھر تم روز ٹی وی بھی دیکھنا۔ تھوڑے دن بعد گھوم پھر کر آجانا اپنی ماں کے پاس۔"

وہ یوں ہی سر جھکائے کھڑا رہا۔

میری پانچ سالہ بیٹی آفرین کے لئے یہ سب کچھ بہت دلچسپی کا سامان تھا۔ وہ اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔

"سنو ہمارے پاس ایک خرگوش اور ایک بلی بھی ہے۔ تم اس سے کھیلنا۔"

اس کی ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"جا بچوا! تہری زندگی بن جائی، دلہن اور چچی بہوت ہی اچھی ہیں، یہاں تہرے چھ ٹھو بھائی بہن ہیں، پیٹ بھر کھائے کو بھی نہ ملی۔"

جیپ میں پیچھے بیٹھا منو بہت دیر تک مسجد کے سامنے والے نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑے اپنے کئی بھائی بہنوں کو ہاتھ ہلاتا رہا۔ اس کا ایک چھوٹا ننگ دھڑنگ بھائی، کافی دور تک گاؤں کے کئی اور لڑکوں کے ساتھ جیپ کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔

علی گڑھ تک ٹرین کے لمبے سفر کے دوران وہ مستقل کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر جھانکتا رہا۔ آفرین اس کی موجودگی میں بہت دلچسپی لے رہی تھی۔

"امی اس کا ایڈمیشن ہمارے اسکول میں ہوگا۔"

اسلم نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

"دیکھا جائے گا۔"

"مگر ابو، یہ ایڈمیشن ٹسٹ پاس کر لے گا، اسے ساری اے بی سی ڈی آتی ہے؟ سو تک گنتی آتی ہے؟ کون سی کلاس میں جائے گا امی؟...... امی! یہ کون سے کمرے میں رہے گا۔ میرے کمرے میں؟"

"اُفوہ بھئی تم تو دماغ کھا گئیں، جب گھر پہنچیں گے تو دیکھا جائے گا۔"

میں نے اس کی کلرنگ بک اور رنگین پنسلوں کا ڈبہ بیگ سے نکال کر دیا تاکہ اس کے سوالات سے تھوڑی دیر کے لئے چھٹکارا ملے۔

مگر سوالات تو بہت سے ہمارے سامنے تھے۔ منو کے بارے میں جو کشمکش اور مکالمے میرے اور اسلم کے دماغ میں چل رہے تھے۔ اسے ہم دونوں جانتے تھے لیکن ایک دوسرے سے کچھ کہتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

میں بظاہر ریل کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی لیکن دل ہی دل میں خود سے الجھ رہی تھی...... اس طرح کسی کی اولاد کو ماں باپ سے چھڑا کر گھر کے کام کاج کے لئے ساتھ لے جانا...... جب اس کی ماں اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً اسے گھسیٹتی ہوئی لائی تھی تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی بکرے کو قربانی کے لئے لے جایا جا رہا ہو...... لونہہ! میں نے سر جھٹک کر سوچا کہ آخر ہمارے پڑوس میں اشرف عالم صاحب کی بیوی بھی تو ایک سات آٹھ سال کے بچے کو لے کر آئی تھیں۔ تین سال سے ان ہی کے پاس ہے، دن بھر چکر کی طرح کام کرتا ہے۔ مسز عالم کے گھر ملنے جاؤ تو وہ کیسے مزے سے بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھیں اور وہ دس برس کا بچہ چائے کی ٹرے سجا کر لاتا تھا۔ جب آیا تھا تو سوکھا مارا تھا اب اچھا خاصہ ہو گیا ہے، تن پر بوٹی چڑھ گئی ہے...... میں نے اپنے آپ کو دلاسہ دیا۔ منو بھی تو کتنا دبلا پتلا سا ہے، کم سے کم ہمارے گھر اسے پیٹ بھر کھانے کو تو مل جائے گا۔ ہم اس کو پڑھائیں گے ضرور، کسی قابل بنادیں گے، کوئی ہنر سکھوادیں گے ورنہ یہ نہ جانے کہاں قسمت پھوڑے گا۔ اس کی ماں تو اسے بیچ ہی اپنے

پوسٹ بکس۔ ۵۱۱۷۸، ریاض، سعودی عربیہ

[illegible] تھی...... وہاں جا کر کون سا تیر [illegible] کسی [illegible] خانے پڑھ لے گا۔ یہی نہیں صاف [illegible] ہو سکتا ہے کسی غلط کام میں پھنس [illegible] دماغ میں وہ ساری فلمیں گھوم گئیں جو [illegible] کے بارے میں دیکھی تھیں...... منو کو تو گھر [illegible] کی طرح رکھیں گے ہم لوگ۔ یہ سب سوچ کر [illegible] دل کو ذرا سکون ہوا۔

گھر [illegible] ہی منو کی میزبانی کی ذمہ داری آفرین نے لے لی، اسے اپنی کتابیں دکھائیں، بلی اور خرگوش سے ملوایا۔ دوپہر کو کھانے کے وقت جب سب لوگ میز پر بیٹھے تو آفرین نے منو کو بھی کھانے کے لئے آواز دی۔ میں نے اور اسلم نے گڑبڑا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اماں نے آفرین سے کہا۔

"باولی ہوئی ہو، اس کا کیا کام ہے یہاں، وہ کھانے کا لے کر وہیں باورچی خانے میں بیٹھ کر۔"

مجھ سے نہیں رہا گیا، ایک پلیٹ میں کھانا نکال کر منو کو دیا، وہ باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانے لگا۔ رات کو کھانے کے وقت آفرین نے اپنی پلیٹ اٹھائی اور باورچی خانے میں منو کے پاس جا کر کھانا کھانے لگی۔ اماں نے اسے ڈانٹ کر واپس میز پر بلایا۔ میں اور اسلم سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔

ہمارے گھر میں ایک بوا صبح شام آکر روٹی پکاتی تھی اور برتن دھوتی تھی۔ باقی کھانا میں خود بناتی تھی۔ مہترانی آکر جھاڑو پونچھا کرتی تھی۔ ایک پارٹ ٹائم مالی آکر لان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ گھر میں ہم دونوں میاں بیوی، ہماری بیٹی آفرین کے علاوہ اسلم کی ماں اور چھوٹا بھائی اختر بھی رہتا تھا جو یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اسلم جب سے اپنے ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ ہوئے تھے تو روز شام کو اور اتوار کے پورے دن ان سے ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور پھر اختر کے دوست احباب کا بھی مستقل آنا جانا تھا، مستقل چائے بنتی رہتی تھی۔ اماں کے بھی بہت سے چھوٹے موٹے کام تھے جن کے لئے مجھے دن بھر دوڑنا پڑتا تھا۔ جب آفرین چھوٹی تھی تو دن میں اس کی دیکھ بھال کے لئے بوا کی لڑکی صابرہ آتی تھی۔ دن میں اس سے اماں کو بھی دوسرا ہت ہو جاتی تھی اور وہ اپنے خیال میں اس کی تربیت بھی کرتی رہتی تھیں۔ اب آفرین اسکول جانے لگی ہے اور صابرہ کی بھی شادی ہو گئی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ اب دن میں جب میں اسکول چلی جاتی تھی تو اماں بالکل اکیلی ہو جاتی تھیں۔ بوا محلے کے ایک اور گھر میں بھی اوپر کا کام کرتی تھیں اس لئے وہ ہمارے گھر بس دو گھنٹے کے لئے دن میں آتی تھیں۔ مسز عالم نے ہی اماں کو راہ دکھائی تھی کہ وہ بھی اپنے گاؤں سے کوئی چھوٹا سا لڑکا لے آئیں، اسے ٹرینڈ کر لیں۔ ان کے کہنے پر اماں نے اپنے میکے کے گاؤں سے ایک لڑکے کا انتظام کیا۔ منو کا باپ اماں کے گھر ہی پلا بڑھا تھا۔ وہ فصل کے زمانے میں کھیتوں پر مزدوری کرتا تھا۔

ہمارے گھر میں منو کے ذمے بہت سے چھوٹے بڑے کام خود بخود سپرد ہوتے چلے گئے۔ فرج میں ٹھنڈے پانی کی بوتلیں بھر کر رکھنا۔ اختر کے جوتوں پر پالش کرنا، جب وہ گاڑی لے کر باہر جائیں تو گیٹ کھولنا اور بند کرنا، اختر کے لئے بازار سے دوڑ دوڑ کر سگریٹ لانا۔ نہ جانے اس کے آنے سے پہلے یہ کام کیسے ہوتے تھے۔ منو کو سارا گھر اپنے خیال میں ٹرینڈ کرنے لگا۔ اختر اسے چائے بنانا سکھانا چاہتے تھے تاکہ وہ وقت بے وقت ان کے اور ان کے دوستوں کے لئے چائے بنا سکے۔ ارشد اسے گاڑی دھونا سکھانا چاہتے تھے، میں اسے گھر کے فرنیچر کے جھاڑ پونچھ کرنا سکھانا چاہتی تھی۔ آفرین اس کے ساتھ کھیلنا چاہتی تھی۔ اماں چاہتی تھیں کہ وہ ان کے پاؤں دباتا رہے۔ لیکن منو کا سب سے پسندیدہ کام بازار سے سودا لانا تھا۔ وہ اپنے آپ بھی بہت کچھ دھیرے دھیرے سیکھ رہا تھا۔ اس نے خود ہی برآمدے میں لگے ہوئے بڑے کلاک میں وقت دیکھنا سیکھ لیا یا شاید آفرین نے قابلہ بن کر سکھادیا ہوگا۔ منو کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ٹی وی پر کون سا پروگرام کب اور کون سے دن آتا ہے۔

دن گزرتے گئے، دیکھتے دیکھتے چھ مہینے گزر گئے، روز مجھے خیال آتا کہ اس کی پڑھائی کا کچھ نہیں ہوا۔ ہر بار میں اپنے دل کو تسلی دیتی کہ ابھی تو وہ یہاں کے طور طریق سیکھ رہا ہے۔ ذرا ایڈجسٹ ہو جائے تو شروع کریں گے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ پڑھے گا کہاں؟ چنگی کا اسکول بہت دور تھا اور اس کے علاوہ وہ صبح کے وقت تو اسکول جا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اماں کے اکیلے رہنے کا مسئلہ تھا۔ شام کی شفٹ میں کوئی اسکول آس پاس نہیں تھا۔ محلے میں ایک مسجد میں شام کو بچے قرآن شریف پڑھتے تھے۔ میں نے منو کو وہاں بھیجنا شروع کر دیا۔ وہاں اس کا بغدادی قاعدہ شروع ہوا۔ گنتی تو دس تک اسے آتی تھی میں نے سوچا تھا کہ حساب اسے خود سکھادوں گی۔ شروع شروع میں کئی بار اس سے اس کا سبق سنا تو فر فر "الف" سے اتار سے لے کر "یٰ" سے یکہ تک سنا دیتا تھا لیکن اگر درمیان میں سے کسی حروف تہجی پر انگلی رکھ کر پوچھو تو گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھ جاتا۔ کئی بار سوچا کہ کہیں سے خوبصورت سے رنگین قاعدہ ڈھونڈ کر لادوں گی لیکن میرا اپنا اسکول کا ہی اتنا کام ہوتا تھا کہ فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ منو اکثر آفرین کے ساتھ اس کی پکچر ڈکشنری میں تصویریں بہت شوق سے دیکھتا تھا لیکن جب اماں آفرین کو منو کے ساتھ سر جوڑے بیٹھے دیکھتی تھیں تو فوراً منو کو ڈانٹ کر کسی کام کے لئے بلا لیتی تھیں۔

'تم یہاں تصویریں دیکھنے آئے ہو یا کام کرنے آئے ہو۔'

وہ مجھے سمجھانے لگیں۔ "لڑکی کا معاملہ ہے، یہ گاؤں کے لڑکے بہت گنوں والے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی یوں ڈھیل دو گی تو کھیل میں پڑ جائے گا۔ بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔"

ایک دن اختر نے کہا۔

"بھابھی یہ جو آپ منو کو اپنے خیال میں مسجد میں قاعدہ پڑھنے بھیجتی ہیں یہ حضرت وہاں جاتے ہی نہیں۔ ادھر ادھر مٹر گشتی کرتے رہتے ہیں۔"

بوا نے منو سے شروع ہی سے حریفانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ اس بارے میں کیوں نہ گل افشانی کرتیں۔

"بیگم صاحب، کون سا کلکٹر لگ جائے گا پڑھ کر یہ، میں نے خود میرے تیرے گھر برتن مانجھ کر اپنے چھوٹے والے لونڈے کو اسکول میں بھرتی کرا لیا تھا۔ اب

دسویں کا امتحان پاس کر کے ڈنڈے بجا رہا ہے۔ رکشہ وہ اب کھینچے گا نہیں۔ میں نے کہا میڈیکل کالج کے سامنے چائے کا ڈھابا لگا لے تو اس کی انسلٹ ہوتی ہے، کھانے کو اسے اچھا چاہئے، پتلون، شرٹ کے علاوہ کپڑا نہیں پہنے گا لاٹ صاحب۔ بس کہتا ہے کہ یونسٹی (یونیورسٹی) میں چپراسی کی نوکری لگے گی تو بس وہی کروں گا۔"

اماں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اور کیا، آدھا تیتر آدھا بٹیر کس کام کا۔ ارے ویسے بھی منو کا تو دماغ ہی بند ہے۔ پڑھنے والا ہوتا تو کب کا سیکھ گیا ہوتا۔ بس روز شام کو پڑھنے کے بہانے دو گھنٹے کے لئے غائب۔"

مجھے معلوم تھا کہ مسجد کے مولوی صاحب مغرب کی نماز کے بعد نیم اندھیرے کمرے میں دس بارہ بچوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر قاعدہ پڑھاتے ہیں اور بچے جھوم جھوم کر سبق رٹتے رہتے ہیں۔ مولوی صاحب شرارت کرنے پر بچوں کو قبر کے عذاب سے بھی ڈراتے رہتے ہیں۔ منو کی تعلیم کے سلسلے میں میرا احساس جرم پھر تھوڑی دیر کے لئے جاگا تو میں اس کے لئے ڈھونڈ کر چکنے کاغذ والا رنگین اردو کا قاعدہ، پنسل اور کاپی لائی۔ آفرین نے اسے اپنا ایک اچھا سا پنسل باکس، ربڑ اور شارپنر بھی دے دیا اور اس کا سارا پڑھائی لکھائی کا سامان اپنے ایک پرانے بستے میں رکھ دیا۔ میں نے کئی دن بیٹھ کر منو کو پڑھایا، حروف تہجی کو جوڑ کر دو حرفی الفاظ پڑھنا سکھانے شروع کئے اور سوچا کہ گنتی لکھنا سکھادوں تو بعد میں اسے سودا سلف کا حساب لکھنا آجائے گا تو مجھے ہی فائدہ ہوگا۔ وہ کاپی پر لکھنے میں کبھی لائن پر نہیں لکھتا تھا، گھڑی گھڑی پنسل چھیلتا رہتا تھا۔ میں اسکول میں بچوں کو پڑھا کر دن بھر تھک جاتی تھی، منو سے سر کھپانے کا نہ وقت ہوتا تھا نہ طاقت۔ لماں سے کہا کہ آپ ہی اردو پڑھادیا کریں مگر ان کو تو دن بھر نماز اور وظیفوں سے فرصت نہیں ہوتی تھی۔

لماں مجھے سمجھاتی تھیں "ارے یہ گھنا ہے۔ عمر اس کی کم نہیں ہے۔ اچھا خاصا بارہ سال کا ہوگا، کاٹھی ایسی ہے کہ بچہ لگتا ہے۔ ارے اس کا باپ بھی ایسا ہی کرنٹ مغز تھا۔"

اختر سے کہا گیا کہ ایک آدھ گھنٹہ روز اسے پڑھا دیا کرے تو وہ مذاق میں ٹال گئے۔

"اچھا پہلے یہ بتا کہ ڈاکٹر بنے گا یا میری طرح انجینئر بنے گا۔"

گرمی کی چھٹیوں میں جب ہم لوگ کچھ دن کے لئے گاؤں جاتے تو وہ بھی ساتھ جاتا اور اپنی ماں سے مل آتا۔ اس کی کوئی لگی بندھی تنخواہ نہیں تھی۔ اس کی ماں گاؤں میں ہمارے جیٹھ سے غلہ لیا کرتی تھی۔ ہم گاہے بگاہے ہزار پانچ سو روپے اس کے گھر بھیج دیا کرتے تھے۔

ہمارا بیٹا جمال پیدا ہوا، سارے گھر کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔ آفرین نے اسکول میں نئی سہیلیاں بنالی تھیں۔ اب منو کا جی بھی آفرین کے ساتھ کھیلنے میں نہیں لگتا تھا۔ وہ زیادہ تر بازار کے کام کرنے کے چکر میں رہتا تھا ایک کام کو بھیجو تو سمجھو کہ گھنٹے بھر کی چھٹی ہو جاتی تھی۔ ٹی وی پر وہ اپنے آپ گانوں کے ویڈیو والا چینل لگا لیتا تھا۔ سارے فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کے نام اسے یاد ہو گئے تھے۔

منو کا قد بھی بڑھتا جا رہا تھا اس کے کاموں کی لسٹ بھی طویل ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اسے کپڑوں پر استری کرنا بھی سکھا دیا تھا۔ ٹوسٹر میں توس سینکنے سکھادئے۔ آملیٹ بھی وہ بنا لیتا تھا، اس کی وجہ سے مجھے صبح اسکول جاتے وقت کی بھاگ دوڑ سے نجات مل گئی۔ منو میز پر برتن لگاتا، آملیٹ بناتا، توس سینکتا، گرم گرم چائے بنا کر دیتا اور ہم سب تیار ہو کر ناشتہ کر کے اپنے اپنے کام پر چلے جاتے۔ وہ ہی جھوٹے برتن سمیٹتا، میز صاف کرتا، ڈرائنگ روم کی جھاڑ پونچھ کرتا، اور اگر مہترانی نہ آئے تو سارے گھر میں جھاڑو اور پوچھا لگاتا تھا۔ قصائی کی دکان سے گوشت بھی وہی لانے لگا تھا۔ دوپہر کو کھانے کے برتن لگا کر تیار رکھتا تھا۔ کھانے کے بعد میز صاف کرتا تھا۔ اسکول میں بھی استانیاں کہنے لگیں تھیں کہ اب میں کافی ریلیکس لگتی ہوں۔ شام کو میں اسے سودا سلف لانے بھیج دیتی تھی۔ سودے کے پیسوں کا حساب وہ کسی نہ کسی طرح ٹھیک سے کر لیا کرتا تھا۔ ہمارے گھر کا ٹیلی فون نمبر، رشتہ داروں کے [illegible] فون نمبر اس نے خوب یاد کر لئے تھے۔

وقت یوں ہی دبے پاؤں گزرتا [illegible] ہائی اسکول میں آگئی تھی اور جمال تیسری کلاس میں آگیا تھا۔ میں اسکول کی ہیڈ مسٹرس ہو گئی۔ [illegible] تھا۔ اکثر لہک لہک کر فلمی گانے گاتا۔ آئینے کے سامنے بار بار جا کر بال بناتا۔ اماں کو اس کی یہ ادائیں [illegible] لگتی تھیں۔ مردم شماری کے لئے سرکاری کارندے گھر جا کر شمار کر رہے تھے۔ منو کو آفرین نے اردو میں نام لکھنا سکھا دیا تھا لہٰذا اس کے نام کے ساتھ پڑھا لکھا درج کیا گیا۔ دوسرے دن میں نے اسے جمال کے کمپیوٹر کی جھاڑ پونچھ کرنا سکھاتے ہوئے سوچا کہ میں اس کے لئے یونیورسٹی کے تعلیم بالغاں کے شعبے سے جا کر ایک اردو پڑھانے کا تعلیمی Kit لے آؤں گی۔ ایک مہینے بعد وہ کٹ آیا، ایک مہینے میں اسے کہیں رکھ کر بھول گئی۔ اس کے بعد ہمارے اسکول میں استانیوں کے لئے بچوں کے پڑھانے کے نئے اور دلچسپ طریقوں کے بارے میں ورک شاپ شروع ہو گئی تو پورا مہینہ اس مصروفیت میں گزر گیا۔ اس کے بعد میری نند ریحانہ امریکہ سے اپنے بچوں کے ساتھ آگئیں۔ گھر میں خوب چہل پہل ہو گئی۔ ایک اتوار کی صبح ہم سب ناشتے کی میز پر جمع تھے کہ ایک دم ریحانہ کو بچپن کی طرح صبح صبح گرم گرم جلیبیاں کھانے کی یاد آگئی۔ میں نے منو کو فوراً بازار بھیجا اور وہ سائیکل پر گیا اور دس منٹ میں گرم گرم جلیبیاں میز پر موجود تھیں۔

ریحانہ نے کہا۔

"بھابھی انڈیا میں یہ ہی تو ٹھاٹ ہیں، منو تو آپ کے لئے الہ دین کے چراغ والا جن ہے۔ رات دن حاضر ہے سب کا حکم بجانے کے لئے۔"

لماں نے منہ بگاڑ کر کہا۔

"ارے ذرا آہستہ بولو ورنہ اس کا دماغ خراب ہو جائے گا۔ بچپن سے اب تک ہم نے اس کی ٹریننگ کی ہے، کوئی آسان کام ہے؟"

☆☆☆

تبصرے

نام کتاب : مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں (جلد اول)

مرتب : حسن چشتی

قیمت : ۲۵۰ روپے

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔۶

اردو کے مایہ ناز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کی اب تک چودہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے چار شخصی خاکوں پر مبنی ہیں۔ بیس پچیس سال کے عرصے میں شائع ان کتابوں کو آج کے قاری کے لئے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اب پڑھنا تقریباً ناممکن سا ہو گیا ہے۔ اس لئے بہت دنوں سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ان کی تحریروں کا کوئی ایسا جامع انتخاب شائع کیا جائے جس میں نہ صرف یہ کہ ان کی اس عرصے میں کی بہترین تحریریں جمع ہو جائیں بلکہ قاری کو بھی پڑھنے، سمجھنے حظ حاصل کرنے اور سماج کی تلخیوں سے آگاہ ہونے کا موقع مل سکے۔ جناب حسن چشتی نے بڑی محنت سے ان کی ساری کتابوں کو پڑھ کر ان کا انتخاب 'بہترین تحریریں' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس (جلد اول) میں مضامین، سفرنامے اور کالموں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ غالباً جلد دوم میں شخصی خاکوں کا انتخاب ہوگا۔ جن کتابوں سے انتخاب شائع کیا گیا ہے ان میں تکلف بر طرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بالآخر، جاپان چلو جاپان، الغرض، سفر لخت لخت، آخرکار، میرا کالم اور بہرحال شامل ہیں۔ مجتبیٰ حسین کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے کیونکہ وہ اس وقت ہندوستان کے سب سے معتبر، معزز اور سب سے بڑے مزاح نگار تسلیم کر لئے گئے ہیں اور یہ بھی ہے کہ مزاح اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب اس میں طنز کی تلخیاں پوشیدہ ہوں۔

اس انتخاب کے بارے میں یہ ضرور کہنا ہے کہ کوئی بھی انتخاب کبھی بھی جامع نہیں ہوتا۔ یہ انتخاب کرنے والے کے ذوق اور ادبی مذاق پر منحصر ہوتا ہے۔ جس میں ان کے تاثرات اور ترجیحات سبھی کچھ شامل ہوتے ہیں اور یوں بھی کوئی انتخاب کبھی ایسا نہیں شائع ہوتا جو ہر پڑھنے والے کی مکمل تسکین کر سکے۔ ہم اس کو یقیناً بہترین انتخاب کا نام دیں گے۔

اس کتاب میں کچھ ایسے طنزیہ مزاحیہ مضامین بھی شامل ہیں جو لکھے تو گئے تھے کئی سال پہلے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عصریت اور اہمیت میں اور اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ان کی معنویت اور اقداری پہلو اتنے ہی اہم ہوتے جائیں گے۔ مثلاً اردو کا آخری قاری، اب یہ بات پوشیدہ نہیں رہ گئی ہے کہ جیسے جیسے اردو کی انجمنیں بڑھ رہی ہیں، کتابوں اور رسالوں کی اشاعت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ قاری سمٹتا جا رہا ہے اور اگر صورت حال یہی رہی تو شاید سارے ادیبوں، شاعروں، مدیروں اور انجمنوں کو ایک نئی انجمن بنا کر قاری کی تلاش میں نکلنا ہوگا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ادب کی ساری اصناف میں صرف طنز و مزاح کا ہی اکیلا ایسا میدان ہے جو سماج کی ناہمواریوں، بے ڈھنگے پن، بہروپیے پن اور سارے ڈھکوسلوں کو تیز عقابی اور چینی نگاہوں سے دیکھ کر انہیں شگفتگی کے ساتھ اجاگر کرتا ہے بلکہ ماتم کرتا ہے جس میں بین تو نہیں ہوتا لیکن جو ہنسا ہنسا کر مارتا ضرور ہے۔ کتاب بہت خوبصورت اور مجلد شائع ہوئی ہے۔

م۔ر۔ف

نام کتاب: کلیات عمر انصاری

شاعر :عمر انصاری

قیمت :۲۵۰ روپے

ناشر :مکتبۂ فردوس ادب، ۲۰۔امین آباد پارک، لکھنؤ

عمر انصاری خیر سے اب اپنی حقیقی عمر کی نوے منزلیں طے کر چکے ہیں۔ ان کی شعری اور تخلیقی زندگی بھی اب کم و بیش ۷۰ بہاریں دیکھ چکی ہے۔ گویا انہوں نے ہر دو لحاظ سے کافی و شافی مسافت طے کر لی ہے۔ اس عمر تک پہنچتے پہنچتے عام طور پر لوگ عمر گزشتہ کا حساب کرنے لگتے ہیں، کچھ یہی بات عمر انصاری پر بھی صادق آتی ہے۔ چنانچہ اب وہ بھی کلیات ترتیب دے رہے ہیں۔

عمر انصاری سکہ بند تحریک ور جحانات سے لاپروا و بے گانہ صرف اپنی روایات کی پاسبانی کرتے رہے۔ البتہ عمر کے فرق کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں اسی حساب سے متانت اور سنجید گی آتی گئی۔

عمر انصاری کے دور اول کی شاعری:

سیر کی خوب جلوہ گاہوں کی
جھولیاں بھر گئیں نگاہوں کی

تھی تو ان کی شاعری کا دوسرا دور

ثبات عشق نہیں ذوق دید کا ممنوں
ترا خیال مبارک، تری تلاش جنوں

سے عبارت تھا اور اب ان کی شاعری یقیناً ان کے تجربات و حوادث کا نچوڑ ہے۔

آدمی ایسا گھرا شورش افکار میں ہے
وہی سب کچھ ہے غزل میں بھی، جو اخبار میں ہے

عمر انصاری کے اب تک دس شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ قومی نظموں کا مجموعہ 'جرس کارواں' (۱۹۳۸ء)، غزلوں کا مجموعہ 'بازگشت حیات' (۱۹۴۵ء)، نظمیات، قطعات اور رباعیات کا مجموعہ 'ساز بیخودی' (۱۹۶۵ء)، غزلیات کا دوسرا مجموعہ 'صنم کدہ' (۱۹۷۳ء)، نعتیہ کلام کا مجموعہ 'ترانہ نعت' (۱۹۷۵ء)، غزلیات کا تیسرا مجموعہ 'حرف ناتمام' (۱۹۷۸ء)، غزلوں، نظموں، رباعیات اور مثنوی کا مجموعہ 'نقش دوام' (۱۹۸۲ء)، غزلیات کا چوتھا مجموعہ 'کشید جاں' (۱۹۸۷ء)، قصیدہ

اور نعت پر مشتمل 'سخن جاں' (۱۹۸۸ء)، غزلیات و نظمیات کا مجموعہ 'مصحف عصر' (۱۹۹۵ء)، ان کے علاوہ ان کی غزلوں کا ایک جامع انتخاب 'حاصل کلام' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔

زیر نظر 'کلیات' ان کی تمام تر نظموں کا مجموعہ ہے۔ سرورق پر 'حصہ اول' درج ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید حصہ دوم 'غزلوں' پر مشتمل ہو اور اسی طرح آگے کے حصوں میں دوسری اصناف کا ذکر ہے۔

عمر انصاری ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور انھیں اپنے فن پر دسترس اور عبور حاصل ہے۔ زیر نظر کلیات میں ۳۵ صفحات کی ایک خود نوشت سوانح شامل ہے جس میں شاعر نے انتہائی شگفتہ انداز میں ایک چلتی پھرتی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ اس خود نوشت سے لکھنؤ کی تہذیب اور عمر انصاری کی حیات و خدمات کے بارے میں مختصراً بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ یہ خود نوشت (دو ایک باتوں کو چھوڑ کر) اس قدر دلچسپ اور معلوماتی ہے کہ جی چاہا کہ کاش ۵۷۶ صفحے کی یہ کتاب صرف سوانح پر مشتمل ہوتی۔

نام کتاب : عزازیل

مصنف : یعقوب یاور

قیمت : ۱۵۰ روپے

رابطہ : شعبہ اردو، وسنت کالج

قلعہ راج گھاٹ، بنارس۔ ۲۲۱۰۰۱

عزازیل جسے عرف عام میں ہم ابلیس کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ 'داستان تخلیق آدم' کا ایک ایسا کردار ہے جو ہر زمانے میں، ہر قوم، ہر ملک اور ہر زبان کے ادب میں دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ ملٹن اور اقبال کے نام بالکل سامنے کے ہیں جنھوں نے اس منفی کردار میں مثبت پہلو کی جستجو کی تھی۔

مگر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

جب کہ یعقوب یاور نے اسے ناول کا ہیرو بنا کر اس کے منفی کردار کو اجاگر کیا ہے۔

زیر نظر ناول عزازیل 'قصہ آدم' کے اسی منفی کردار پر مبنی ہے۔ یعقوب یاور نے اپنے پیش نوشت میں لکھا ہے:

"پیش نظر تحریر ایک ادبی ناول ہے جہاں مجاز ہمیشہ حقیقت پر سبقت رکھتا ہے۔ اسے مذہبی، تاریخی یا تحقیقی نقطہ نظر سے نہیں پڑھا جانا چاہئے۔ اس میں بیان کردہ واقعات، تخیل کی رہنمائی میں وجود پذیر ہوئے ہیں۔ ہماری دنیا کے معلوم یا نامعلوم حقائق سے ان کا کوئی علاقہ نہیں۔ پھر بھی اگر کسی کو ایسی مطابقت کا احساس ہو تو یہ محض اتفاق ہوگا۔"

باوجود اس کے یعقوب یاور نے اس کردار کو انتہائی عرق ریزی اور تحقیق و جستجو کے بعد متشکل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن یہیں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ 'ناول' ایک ہلکی پھلکی اور شگفتہ تحریر ہوتی ہے، جسے قاری عام طور پر ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالتا ہے۔ پیش نظر ناول میں اس بات کا فقدان ہے، یہ ایک خالص تحقیقی مقالہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک ایسا تحقیقی مقالہ جو اپنی خشکی کی وجہ سے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلنے میں ناکام نظر آتا ہے۔

یعقوب یاور کا یہ دوسرا نیم تاریخی و مذہبی اور نیم ادبی ناول ہے۔ اس سے پہلے اسی مصنف نے "تمدن سندھ کے پس منظر میں "دل من' کے نام سے ایک نیم تاریخی ناول پیش کیا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ یہ خالص تاریخی اور تمدنی موضوع تھا یاور نے اسے اس قدر شگفتہ اور رواں اسلوب میں پیش کیا تھا کہ اس نے ایک شہ پارہ کی حیثیت اختیار کرلی اور عام طور پر اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ پیش نظر ناول بے کار یا بکواس ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ ناول کا فن جس روانی، سلاست اور شگفتگی کا متقاضی ہوتا ہے اس کا یہاں فقدان ہے۔ تحقیق اور ناول نگاری دو الگ الگ کام ہیں اور ایک ناول نگار کو چاہئے کہ ناول لکھتے وقت اپنی تحقیقی شخصیت کو بالکل فراموش کردے۔ ٹھیک اسی طرح کہ ایک اچھے محقق کو اپنی تحقیقی کاوش پیش کرتے ہوئے انشاپردازی سے گریز کرنا چاہئے، میں یعقوب یاور کو اس تصنیف میں داد تحقیق دینے کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔

ابرار رحمانی

نام کتاب: پنجرے والی منیا

مصنف : نریندر سیٹھ

قیمت : ۲۰۰ روپے

ملنے کا پتہ : ۲۸۶۱، کوچہ چیلان، دریا گنج، دہلی

بیسویں صدی میں اردو کہانی نے جنم لیا اور اکیسویں صدی میں کہانی کی صدی ہوگی ایسا کہا جاتا ہے۔ غرض کہانی نے ابتدائی دنوں سے ہی اپنی بنیادیں مضبوط کرنی شروع کردیں اور آہستہ آہستہ وسعت اختیار کرچکی ہے کہ عالمی ادب میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ کہانی نے مواد سے اپنا سفر شروع کیا اور تجربات کے منازل سے گزر کر ایک بار پھر مواد پر زور دیا جانے لگا۔ ایسے افسانہ نگاروں میں نریندر سیٹھ ایک نمایاں نام ہے۔

نریندر سیٹھ کہانی سناتے نہیں ہیں بلکہ ان کی کہانیاں خود بخود بولتی ہیں اور قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہے۔ یہ بات میں زیر تبصرہ کتاب "پنجرے والی منیا" کی روشنی میں کہنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

زیر تبصرہ کتاب میں کل پندرہ کہانیاں ہیں جن میں چند طویل اور چند چھوٹی ہیں۔ چھوٹی کہانیاں پڑھتے وقت کہیں بھی کمی کا احساس نہیں ہوتا اور طویل کہانیاں پڑھتے وقت یہ احساس نہیں ہوتا کہ خواہ مخواہ طول دیا جارہا ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ اگر یہ کہانی تفصیلی نہیں ہوتی تو بات ادھوری رہ جاتی۔ غرض نریندر سیٹھ کہانیاں بنا جانتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے کہانی کی طوالت کا فیصلہ کرتے ہیں اور پھر نہایت فنکاری سے اس کا تانا بانا بنتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کی تمام کہانیاں زندگی کی مختلف جہتوں کو پیش کرتی ہیں۔ زندگی کے مسائل پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مسئلہ خواہ سیاست سے جڑا ہو یا سماج کے دوسرے پہلوؤں سے، خواہ غریبی کا ہو یا پس ماندہ لوگوں کے استحصال کا، ان کی توجہ برابر رہتی ہے۔ ان مسائل سے جڑے کرداروں کی نفسیات، معاشرے میں ان کے طرز زندگی، ان کے جذبات و خیالات، عمل و رد عمل سے ابھرنے والی کیفیتوں کا بیان متاثر کن ہے۔ ان کے یہاں ابہام سے گریز اور سیدھی سادی زبان میں

اور کسی علامت کا سہارا لئے اپنی بات کہہ دینے کا فن ملتا ہے۔

نریندر سیٹھ کی کہانیوں پر منٹو، عصمت اور پریم چند کا عکس نظر آتا ہے۔ اگر ان کے یہاں منٹو کا طرز ملتا ہے تو عصمت کا نفسیاتی تجزیہ اور پریم چند کی حقیقت پسندی۔ بیدی کی کردار نگاری بھی ان کے افسانوں کا وصف ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مغربی ادیبوں کا اثر بھی کہیں کہیں دکھتا ہے۔ گویا ایک ساتھ کسی بھی کہانی میں ہمیں منٹو، عصمت، پریم چند اور بیدی کا لطف نریندر سیٹھ دیتے ہیں اور یہ انہیں کا حصہ ہے۔ افسانوں کی زبان بھی بے لوچ ہے اور ہر جگہ تسلسل بر قرار رہتا ہے۔ اس خوبصورت کتاب پر نریندر سیٹھ ہمارے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نام کتاب : انقلاب مردہ باد

مصنف : اشتیاق سعید

قیمت : ۱۰۰روپے

ملنے کا پتہ : 177/1A عائشہ منزل، پائپ روڈ کرلا، ممبئی۔ ۴۰۰۰۷۰

موجودہ عہد میں اردو ڈرامہ یا اردو تھیٹر کا نام سنتے ہی مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ اول تو اردو تھیٹر اس طور پر نہیں ہو رہا ہے جیسی ہماری روایت رہی ہے۔ یعنی اردو ڈرامہ اپنے ابتدائی دور سے لے کر پرتھوی تھیٹر تک جس آب و تاب سے اور جتنی تعداد میں کھیلا گیا۔ آج نہ تو معیار کی مناسبت سے اور نہ ہی تعداد کی مناسبت سے اتنے ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ڈرامے لکھے نہیں جا رہے ہیں۔ آج اردو کے سرمائے میں لاتعداد ڈرامے ہیں لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ زیادہ تر اسٹیج کے نقطہ نظر سے نہیں لکھے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ صرف کتاب و رسائل کی زینت بن کر رہ گئے ہیں۔ ڈراما اسٹیج پر کھیلے جانے کا عمل ہے نہ کہ رسائل و کتب کی زینت بننے کا۔ خوشی اس بات کی ہے اب بھی کم کم ہی سہی لیکن اردو ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں۔ کچھ تو اردو کے نام سے کھیلے جاتے ہیں اور زیادہ تر کو ہندی یا ہندوستانی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ ایسے میں ایک ایسے اردو ڈرامے کا منظر عام پر آنا جو اردو کے نام سے کھیلا بھی گیا ہو خوش کن ہے۔ 'انقلاب مردہ باد' ایک ایسا ہی ڈرامہ ہے۔

زیر تبصرہ ڈراما "انقلاب مردہ باد" اشتیاق سعید کا اسٹیج ڈراما ہے جسے اشتیاق سعید کی ہی ہدایت میں ۱۹ مارچ ۱۹۹۰ء کو پہلی بار ممبئی میں کھیلا گیا تھا۔ ڈراما کا عنوان چونکانے والا ہے کہ انقلاب مردہ باد کیسے ہو سکتا ہے؟ ڈراما ممبئی میں نوکری کی تلاش میں گئے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں ہر طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور آخر میں اس کا تقریباً ہر کردار اپنی ضمیر کی آواز کے خلاف غلط کام کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا مرکزی کردار بھی ایک ڈھونگی سیاست داں کے چنگل میں پھنس ہر وہ کام کرتا ہے جو ملک اور سماج کے لئے مضر ہے۔

یوں تو ڈراما آج کے سماجی اور سیاسی مسائل پر مشتمل ہے جس میں ہر اس گوشے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کو لے کر ہم آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ خواہ وہ لسانی مسئلہ ہو یا مذہبی، علاقائی تعصب ہو یا سیاسی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ڈراما میں ہلکے پن کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ کئی مسائل کو پیش کرنے کی کوشش میں کوئی بھی مسئلہ مضبوطی سے ابھر کر سامنے نہیں آسکا۔ پھر بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ڈراما لکھنے اور کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ نہ صرف زیادہ سے زیادہ تعداد میں اسٹیج کرنے والے ڈرامے لکھے اور کھیلے جا سکیں۔

محمد کاظم

نام کتاب: سلسلۂ سود وزیاں

شاعر : اطہر عزیز

قیمت : ۱۰۰روپے

ناشر : ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، ممبئی

ایک شعری مجموعہ کا نام 'سلسلۂ سود وزیاں' ہونا بڑا معنی خیز ہے لیکن دلچسپ ہے اور قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ اس مجموعہ میں غزلیں بھی ہیں، نظمیں بھی اور دو اڑیا شاعروں کی پانچ منتخب نظموں کے تراجم بھی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اطہر عزیز بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے کیونکہ جو عشق کی لپک ہے اسے غزل کے اشعار میں ہی سمویا جا سکتا ہے۔

جب بھی رات چھپاتی ہے بدن کی شکنیں
روشنی بڑھ کے ہر اک راز بتا جاتی ہے

گنگنائے ستارے تو یاد آئی تیری ہنسی
چاند پر اکثر ترے رخسار کا دھوکا ہوا

اک داغ تمنا ہے تو اک زخم وفا ہے
تنہا سا یہ دل کتنے شراروں میں گھرا ہے

جہاں عشق ہوتا ہے، وہیں عصری حسیت کا عکس بھی ملتا ہے اور غزل کے اشعار میں جذبات و احساسات کے ساتھ تجربات و مشاہدات بھی جگہ پالیتے ہیں۔

یہ دل کی آگ ہے، بھڑکی ہے اور بھڑکے گی
تلاش فکر سکوں اور وہ بھی شعلے میں

اس طرح وہ پوچھتے ہیں مجھ سے لوگوں کا پتہ
جیسے ہو یہ شہر پہلے سے مرا دیکھا ہوا

نظموں میں رقص سکوت، فرقہ وارانہ فساد کے پس منظر میں ہے تو شعلوں کی برات، زندگی کے سلسلہ سود وزیاں کا اظہار ہے۔ اطہر عزیز نے اڑیا کی پانچ نظموں کو بڑی مہارت سے اردو میں اپنایا ہے اور میں سمجھتا ہوں ان نظموں میں اصل زبان کا تاثر پوری طرح موجود ہے۔ بحیثیت مجموعی 'سلسلۂ سود وزیاں' ایک قابل مطالعہ شعری مجموعہ ہے جو ظاہری اور طباعتی خوبیوں سے بھی مزین ہے۔ ایسے شعری مجموعوں کی پذیرائی اچھی لگتی ہے۔

نام کتاب : سبزۂ نورستہ

مصنف : ساحل احمد

قیمت : ۲۰۰روپے

ناشر : اردو رائٹرز گلڈ، الٰہ آباد (یوپی)

'سبزۂ نورستہ' ساحل احمد کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس کی ابتدا میں ایک حمد بھی دی گئی ہے۔ بقول مصنف یہ اس کا دسواں شعری مجموعہ ہے (اور) اس میں وہی غزلیں شامل ہیں جو ہندو پاک کے اخبار و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غزل، جذبات و حسیات کا آئینہ ہوتی ہے اور شعری اصناف میں غزل ہی وہ مثبت اظہار یہ ہے جسے تقریباً ہر اردو شاعر نے اپنے فکر و احساس کی ترسیل کا ذریعہ بنایا ہے، لیکن گنے چنے شاعر ہی ہوں گے جن کی غزل گوئی آہ اور واہ تک لے جاتی ہے۔ وہ اردو کے شاعر بھی ہیں اور ناشر بھی۔ احمد فراز اور پروین شاکر جیسے شاعروں کے مختصر انتخاب بھی انہوں نے شائع کئے ہیں تو جنگ آزادی میں اردو

شاعری کا حصہ جیسا سنجیدہ کام بھی کیا ہے۔ سنجیدہ اور تخلیقی کاموں کے ساتھ شاعری شاید ان کا شوق ہے اور اسی شوق کا نتیجہ دس شعری مجموعے ہیں۔ ڈمائی آکٹوو سائز کے ۱۲۰ صفحوں والی اس کتاب میں ایک حمد اور ۹۹ غزلیں ہیں لیکن ۱۲۰ صفحوں میں ۱۲ نشتر بھی ڈھونڈے نہیں مل سکے۔ روایتی غزل گوئی ہے جس میں کچھ بھی تو نیا نہیں ہے۔ چند شعر دیکھئے:

چاندنی پھیلی تھی ساحل ہر طرف
آئینہ کس نے یہاں رکھ دیا

بج اٹھی زنجیر گل بھی کیا کوئی
اے جنوں شاید ہرا جنگل ہوا

وہ اٹھاکر آج جیسے میرا گھر لے جائے گا
لگ رہا ہے آج سب کچھ ہم سفر لے جائے گا

پھر لہو مہکا زمیں تا آسمان
صبح کتنی آج شرمندہ ہوئی

تو ایسے ہی ہیں زیادہ تر اشعار۔ کتابت کی اغلاط نے بھی غضب ڈھایا ہے۔ شعری مجموعوں کی پروف ریڈنگ بڑی توجہ سے ہونی چاہئے کیونکہ اس میں الفاظ کا الٹ پھیر تو بڑی بات ہے زیر زبر کا فرق بھی شعریت کو مجروح کردیتا ہے۔ کتابت اور طباعت ٹھیک ٹھاک ہے، کاغذ بھی دبیز ہے اور سرورق پر بھی سبزہ ہی سبزہ ہے۔

انور کمال حسینی، دہلی

نام کتاب : مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر

مصنف : علیم صبا نویدی
قیمت : ۸۰/روپے
ناشر : تمل ناڈو اردو پبلی کیشنز، ۲۶۔ امیر النسا بیگم اسٹریٹ، مونٹ روڈ، مدراس۔ ۲

"مولانا باقر آگاہ ویلوری کے ادبی نوادر" نامی کتاب میر و سودا کے ہم عصر جنوبی ہند کے بلند پایہ ادیب، شاعر اور نقاد جناب مولانا باقر آگاہ ویلوری کے سلسلہ میں علیم صبا نویدی کی تازہ تصنیف ہے۔ جو بلاشبہ تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک حوالہ کی چیز ہے۔

مولانا باقر آگاہ تقریباً ڈھائی سو سال قبل کے ایسے اردو شاعر اور صاحب قلم ہیں جنہوں نے جنوبی ہند کی تاریخ میں ایک امتیازی مقام حاصل کیا ہے۔ اور اپنے قلم کا لوہا منوایا ہے۔ مگر ان پر وہ کام نہیں ہو سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ صبا نویدی کی یہ کتاب یقیناً ان کوتاہیوں کی کچھ حد تک تلافی کرتی ہے جو اردو کے نقادوں اور محققین کی طرف سے ہوئیں۔ زیر نظر کتاب میں علیم صبا نویدی نے بڑی کاوشوں کے بعد ان کے حالات کے ساتھ نظم و نثر کے قیمتی نمونے جمع کردئے ہیں اور اپنے قیمتی مقدمے میں کافی ذخیرۂ معلومات فراہم کردیا ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کا پیش لفظ اور ڈاکٹر محمد علی اثر کا تعارف بھی باقر آگاہ کو سمجھنے کے لئے اہم مواد فراہم کرتے ہیں۔ کتاب میں شمالی ہند کے اہل قلم سے شکوہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے جنوب کے اس صاحب قلم کو نظر انداز کیا اور علاقائی تعصب سے کام کیا۔ اور انہیں وہ اہمیت نہ دی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر اس الزام کو درست بھی مان لیا جائے تو سوال کیا جاسکتا ہے کہ خود جنوبی ہند کے اہل قلم کو کس نے روکا تھا کہ اب تک وہ اپنے اس 'ہیرے' کی طرف توجہ نہ کرسکے۔ اور غالباً آج تک کوئی اسکالر ان کی شخصیت و کارناموں پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی نہ کرسکا۔ جب کہ آج کل تو بہت ہی کم حیثیت کے ادیبوں پر بلکہ زندہ لوگوں پر بھی پی ایچ ڈی ہو رہی ہے۔ شاید یہ کام آسان ہے اور قدیم اہل قلم پر کسی تحقیقی کام کے لئے خون جگر کی ضرورت ہوتی ہے جو آج کے تن آسان اسکالرس کے پاس نہیں۔ بہر حال نویدی صاحب نے "باقر" شناسی کے سلسلہ میں پہل کرکے اردو دنیا کو متوجہ کیا ہے۔ امید ہے ان پر مزید توجہ دی جائے گی اور ان کے ادبی و شعری کارناموں کا تفصیل سے احاطہ کیا جائے گا۔

نام کتاب : آہنگ ہاتف

مصنف : مولانا محمد حنیف ہاتف
قیمت : ۱۸/روپے
ناشر : ادارہ نور الایمان۔ اجمیری گیٹ، دہلی

زیر نظر مجموعہ کلام "آہنگ ہاتف" ایک بزرگ عالم دین اور شاعر جناب مولانا محمد حنیف ہاتف کی تقریباً پچاس سالہ ادبی کاوشوں کا انتخاب ہے جسے موصوف کے صاحبزادے خالد فلاحی نے مختلف کی بیاضوں سے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ ہاتف صاحب کا تقریباً تمام کلام دینی اور اصلاحی قسم کا ہے اور خالص کلاسیکی رچاؤ نیز روایتی آہنگ لئے ہوئے ہے مگر شگفتگی کا دامن کہیں چھوٹا نظر نہیں آتا۔ کلام کب اور کس عمر میں کہا گیا ہے اس کا حوالہ بھی تحقیق کے ساتھ موجود ہے۔ بہت ہی کم عمری میں ہاتف صاحب کی شاعری کے اچھے نمونے ملتے ہیں جس سے ان کے فطری شاعر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ نو سال کی عمر میں ۱۹۳۵ء کی ایک طرحی غزل کے یہ شعر دیکھیں:

بس یہی شغل رہا جوش جنوں میں شب و روز
ہم سے زنجیر الجھتی رہی، زنجیر سے ہم

ضبط کہتا ہے شب غم، کہ ابھی صبر کرو!
نالے کہتے ہیں کہ سمجھیں فلک پیر سے ہم

اور اب اخیر میں ایک شعر اور جو سولہ سال کی عمر میں کہا گیا ہے ملاحظہ ہو:

تجھ سے ملنے کی خبر سننے کو رک جاتے ہیں
ورنہ جانے کے لئے آتے ہیں جانے والے

یہ اور ان جیسے بہت سے اشعار دامن دل کھینچتے ہیں اور ہاتف صاحب کی کم سنی میں بلوغت شعری کا پتہ دیتے ہیں۔ غزلیات تقریباً تمام ابتدائی عمر یعنی زمانہ طالب علمی کی ہیں جن میں اس زمانہ کے مطابق تمام شعری اوصاف موجود ہیں مگر ابتذال کا کہیں نام نہیں ہے۔ بعد کے کلام میں موضوعاتی نظمیں اور نعتیہ کلام زیادہ ہے۔ کچھ فارسی کلام کے نمونے بھی شامل ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں ہاتف صاحب کے صاحبزادے خالد فلاحی کے قلم سے تفصیلی تعارف اور مصنف کے حالات افادیت میں اضافہ کا باعث ہیں۔ یہ مجموعہ روایتی ذوق رکھنے والوں نیز لائبریریوں کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے۔

قمر سنبھلی، دہلی

☆☆☆

آپ کے خطوط

● "آجکل کی فائل سے" ہر ماہ میں بہت شوق سے اور سب سے پہلے پڑھتا ہوں اور آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ نومبر کے شمارہ میں جناب دیوندر ستیارتھی کا "پنجاب کے لوک گیت" بہت اچھا لگا۔ نہایت ہی معلوماتی بھی ہے۔ لوک گیت اکٹھے کرنے میں جناب دیوندر ستیارتھی کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ پچاس کی دہائی میں ہی میں نے ان کی ایک نہایت ضخیم کتاب "پنجاب دے لوک گیت" گورمکھی میں پڑھی تھی۔ جس میں انہوں نے پنجاب کے تمام حصوں اور مختلف اقسام کے جن کے نام اس مضمون میں بھی دئے ہوئے ہیں، لوک گیت جمع کر کے لکھے تھے۔ وہ صرف پنجاب کے لوک گیتوں پر ہی انحصار نہیں ہیں۔ بلکہ انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض ـــ کامروپ سے کاٹھیاواڑ اور کشمیر سے کنیا کماری تک، گھوم گھوم کر ملک کے کونے کونے سے لوک گیت اکٹھے کئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایک سادھو اور درویش کی طرح ملک میں گھومنے میں گزارا۔

"آجکل" میں ہی میں نے ان کا ایک مضمون آندھرا پردیش کے لوک گیت بھی پڑھا تھا۔ لوک گیت اکٹھا کرتے وقت ان کے مطالب کے ساتھ وہ ان کے پس منظر اور تواریخ کی بھی کھوج کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ساحر لدھیانوی نے اپنے رسالہ "سویرا" میں "جان پہچان" میں ان کا خاکہ ان الفاظ سے شروع کیا تھا۔ "داڑھی جمع تحصیل جمع ڈائری برابر ہے دیوندر ستیارتھی۔" دیوندر ستیارتھی "آجکل ہندی" کے ایڈیٹر بھی رہے۔ لیکن ان کی پہلی محبت اور زندگی کا مرکزی مقصد لوک گیت اکٹھا کرنا ہی تھا۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کو اپنی ازدواجی زندگی کی قربانی دینی پڑی۔ ان کے بیوی بچے کو ان کی جدائی اور دیگر متعدد تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا۔ بھگوان کی کرپا سے ان کی یہ قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ ان کو اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ انہوں نے ہندوستان کی کئی زبانوں کے لوک گیتوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے۔

مضامین میں دیوندر اسر کا مضمون اچھا لگا۔ میں ان کے مضامین بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ "یہ کائنات، یہ دنیا اور یہ لوگ اپنے اندر کتنی بوقلمی کتنی رنگا رنگی، کتنی محفلوں اور کتنی تتلیوں کو سمیٹے ہوئے ہیں ..... جب تتلیاں اڑنا بند کر دیں گی یا تتلیوں کو پکڑنے کی انسان کی خواہش مر جائے گی تو ہاتھوں میں بندوقیں رہ جائیں گی اور ذہنوں میں بارود بھر جائے گا..... تخیل اور تتلیوں کے بغیر ادب کی نجات ممکن نہیں..... " یہ آفاقی سچائی ہے۔ مضمون دعوت فکر دینے والا ہے۔ اظہار اثر کا "اڑن طشتریاں" بھی نہایت ہی معلوماتی اور دلچسپ مقالہ ہے۔

افسانے بھی اچھے ہیں۔ نند کشور وکرم کا افسانہ "کاکاسب تن کھائیو......" بہت اچھا لگا۔ آخری پیرا پڑھتے وقت میری آنکھیں بھی "ڈبڈبا آئیں"۔ انہوں نے عنوان بھی نہایت ہی موزوں ضرب المثل دیا ہے۔ ہم ان کو اتنا اچھا افسانہ لکھنے کے لئے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو۔

رام پرکاش کپور، نئی دہلی

● سائنسی مضامین اڑن طشتریاں (اظہار اثر) اور کیا انسان کی کلوننگ ممکن ہے؟ (محبوب الرحمٰن فاروقی) پسند آئے۔ اول الذکر تو اب پرانا موضوع ہو گیا مگر موخر الذکر موجودہ سنسنی خیز موضوع بحث ہے۔ اس پر اکثر اخبارات میں کافی نکتہ چینیاں ہو رہی ہیں۔ بہر حال یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ "آجکل" عصری تقاضوں کی تکمیل میں پیش پیش ہے۔

کاوش بدری اور سواحی واحد کاظمی کے رشحات دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ کاوش بدری کا پتہ تو آجکل سے مل گیا مگر سواحی واحد کاظمی پردہ خفا میں رہے۔ وہ کچھ ناراض سے ہیں۔ ان سے سلام عرض کیجئے گا۔

سید اختر الاسلام، میرٹھ

● ثمیا فاروقی کا دوسرا ترجمہ "غلط فہمی" مصنفہ البرٹ کامیو کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس بات سے مسرت ہوئی کہ محترمہ نے اپنے سابقہ ترجمہ "ورثہ کا درد" کے حسن و خوبی کو برقرار رکھنے بلکہ کچھ ترقی کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ بس ایک بات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ترجمہ متن سے قبل ایک مختصر سا ہی نوٹ سہی لکھ دیتیں جس میں البرٹ کامیو کی ادبی خدمات اور ان کے ڈرامے "غلط فہمی" کی ادبی اہمیت کی وضاحت ہو جاتی تو اچھا تھا۔ اس شمارے میں ایک معقول تعداد میں تبصرہ بھی بڑی اہمیت کے حامل ہیں جن سے کسی طرح صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اختر الزماں، اعظم گڑھ

● اس بار کے مقالات بے حد معلوماتی اور وقیع ہیں۔ بالخصوص "کیا انسان کی کلوننگ ممکن ہے؟" نظمیں اور غزلیں بھی پسند آئیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ کہانیوں میں "حاشیے کے اندر کا آدمی" میری زندگی کی بچی عکاسی کرتی ہے۔ اس کہانی کے لئے محمد مظہر الزماں خاں کو جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔ دیگر کہانیوں میں "کاکاسب تن کھائیو" بھی متاثر کرتی ہے۔ کہانی "چلتے رہو" فرسودہ اور بے کار ہے ایسی کہانی شائع نہ کریں۔ کہانی 'ساگ سیٹ' بھی کوئی تاثر نہیں چھوڑتی۔

شمس الہدیٰ انصاری، دھنباد

● "آجکل' کی چھب ہی نرالی ہے۔ اس پر مستزاد سارے مشمولات ہیں۔ پٹنہ کے کسی رسالہ میں "مابعد جدیدیت" پر ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ مابعد جدیدیت اسلام مخالف بلکہ اسلام دشمن عناصر کی ایک سازش ہے۔ لیکن قدوس جاوید صاحب کی تحقیق میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ جس سے مذکورہ رائے کی تصدیق و توثیق ہو سکے۔ اظہار اثر صاحب کی ٹھوس دلیلوں کی روشنی میں اڑن طشتریوں سے متعلق عوام الناس ہی نہیں بلکہ خواص میں بھی جو مغالطے گھر کر گئے ہیں، میرا خیال ہے انہیں دور کرنے میں ایک سمت ملے گی!

کلوننگ پر بصیرت انگیز مقالے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی کلوننگ ممکن ہے۔ غلط فہمی ثریا فاروقی صاحب کا ترجمہ رفتہ رفتہ قاری کو اپنے اثر میں لے رہا ہے۔

حبیب راحت حباب، کھنڈوہ

● نومبر کا شمارہ مقالہ بعنوان "کیا انسان کی کلوننگ ممکن ہے" کی وجہ سے بہت ہی تابناک ہو گیا ہے۔ جدید تر موضوعات کو برتنے میں آپ کو معراج کمال حاصل ہے۔ مابعد جدید تصور ادب پر قدوس جاوید کا مقالہ ہندوستان کے مختلف رسائل میں شائع شدہ مقالوں سے مختلف ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مابعد جدیدیت وحدت الوجود کی نفی کرتی ہے اگر اسلام سے وحدت الوجود کو خارج کر دیا جائے تو مذہب "خدا پرستی" کی بجائے خیال پرستی بن جائے گا، جو مادہ پرستی سے بدتر ہے۔ مابعد جدیدیت کی تکثیریت وحدت الشہود کو بھی رد کرتی نظر آ رہی ہے۔ دیویندر اسر کا مقالہ "تخلیق، تخیل اور ست رنگی تتلیاں" بہت خوب ہے۔

کاوش بدری، مدراس

● موجودہ دور انسانی سماج کے ایک اہم طبقہ شعرا و ادبا سے جو تقاضے کر رہا ہے ان کی طرف اشارہ کرنے والے مقالات و مضامین اور شعری و نثری تخلیقات کی ایک تسلسل کے ساتھ اشاعت پر آپ کو دلی مبارکباد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ دور انتہائی افراتفری کا دور ہے جو بجائے خود باعث تشویش ہے۔ اس میں اضافہ اس وقت ہو جاتا ہے جب لوگ اپنے اپنے غلط یا صحیح موقف پر ہٹ دھرمی کی حد تک جم جاتے ہیں اور نہ اپنی اصل ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو ایسا کرنے دیتے ہیں۔ بعض لوگ تو اپنی باتوں کو منوانے میں اس قدر ماہر ہو گئے ہیں کہ وہ جب جو چاہتے ہیں کہہ گزرتے ہیں۔ جدیدیت کے علم بردار ہوں کہ مابعد جدیدیت کے وہ اپنے خیالات کو دوسروں پر زبردستی تھوپنے کا ہنر جاننے لگے ہیں گرچہ ان کے خیالات بے پناہ تضاد ہی کے شکار کیوں نہ ہوں۔

میرے خیال میں ایسا ہی کچھ ماہنامہ 'آجکل' کے نومبر ۲۰۰۱ء کے شمارہ میں جناب دیویندر اسر کے مضمون "تخلیق، تخیل اور ست رنگی تتلیاں" کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ مضمون بھی تضاد کا شکار ہے۔

محمد فاروق اعظم، بھاگلپور

● اظہار اثر کا مضمون "اڑن طشتری" نے ذہن میں اتنے سوالات پیدا کئے ہیں جو آخری سرحد خدا کی ذات تک جاتے ہیں اس میں سے ایک سوال زبان کا بھی ہے کہ اڑن طشتری اڑانے والوں کی زبان، بھاشا بولی کون سی ہے۔ دوسرا سوال انہوں نے تو اڑن طشتری بنانا سیکھ لیا اور زمین تک پہنچ گئے مگر ہم کب اس قابل ہو سکیں گے کہ وہاں تک پہنچ سکیں اور اس مخلوق کو اپنا تعارف کرا سکیں کہ ہم اہل مریخ امن پسند ہیں۔ پھر تیسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہماری زمین میں جواہرات، پٹرول، سمندر، پہاڑ، کپاس اور گندم جوار ہے تو کیا وہاں بھی یہ چیزیں ہوں گی۔

شیخ عبداللہ، آکولہ

● آجکل کی فائل سے دیویندر ستیارتھی کا نہایت دلچسپ مضمون "پنجاب کے لوک گیت" نظر نواز ہوا۔ سارے مقالات فکر و تحقیق کے حامل ہیں۔ علم و آگہی میں اضافہ کرتے ہیں۔ نظمیں اور غزلیں متاثر کرتی ہیں۔ کہانیوں میں نند کشور وکرم کی "کاگا سب تن کھائیو......" اور بھیشم ساہنی کی اردو میں ترجمہ کہانی "ساگ میٹ" اچھی کہانیاں ہیں جو زندگی اور آج کے حالات کی آئینہ دار ہیں۔ ف۔ س۔ اعجاز صاحب کی کہانی "ہنستے رہو" نے بھی کافی متاثر کیا کہ ان کا ایک نیا انداز ہے اور ایک مایوس رہنے والے شخص کی اچھی کردار نگاری ہے۔

اس بار آپ نے اکتوبر ۲۰۰۱ء میں کہانیوں کی کمی کی تلافی کرائی ہے۔ ان ادباء و شعرا کے ساتھ آپ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

م۔ق۔خاں، گیا

● اظہار اثر صاحب کا مضمون 'اڑن طشتریاں' بہت دلچسپی سے پڑھا جس میں انہوں نے اڑن طشتریوں کے قصے کو متھ قرار دیا ہے۔ آپ کے مضامین سائنسی فکشن سے کم دلچسپ نہیں ہوتے کیونکہ وہ اپنے خیالی پلاؤ کے چھینٹوں سے انہیں اور مزیدار بنا دیتے ہیں۔

آپ نے اڑن طشتریوں کو نظری دھوکہ ریگستانی سراب قرار دیا ہے اور سرے سے اڑن طشتری حکایتوں کی نفی کر دی ہے۔ اس کے باوجود اڑن طشتریوں کا وجود ایک حقیقت ہے۔ [illegible] ضلع [illegible] کے ایک شہر [illegible] گئے میں [illegible] والے ایک [illegible] آنکھوں سے چاندنی [illegible] سے ملحقہ [illegible] ایک اڑن طشتری سے دو آدمی نکلے۔ تھوڑی دیر [illegible] تقریباً دس منٹ بعد اڑن طشتری پر دوبارہ سوار ہو کر گئے اور پھر ان خلا میں گم ہو گئے۔

عبدالمجید [illegible]

● یہ شمارہ شیخ وادب ہے۔ یہ ایسا شمارہ ہے جو پورے عالم کی سیر گھر بیٹھے کرا دیتا ہے۔ عقل و شعور کے دریچے کھول دیتا ہے۔

آپ کا مضمون "کیا انسان کی کلوننگ ممکن ہے" ایک اوق اور مدلل تبصرہ ہے۔ ایک سے ایک حیرت انگیز ایجادات کا سلسلہ جاری ہے۔ ایک زبردست کامیابی اس وقت ہو گی جب انسان جوانی کو ہاتھ سے جانے ہی نہ دے گا۔ بغیر سرجری وغیرہ کے وہ ہمیشہ جوان رہے اور موت نہ آئے۔

لکڑی کا ایندھن ہو، مٹی کا برتن ہو، پکانے والی متحمل مزاج خاتون ہو تو اس کھانے کی سوندھی خوشبو اور اس کا ذائقہ ایسا عمدہ ہوتا ہے کہ کھانے والے محو سرور ہو جاتے ہیں۔ جناب بیکل اتساہی کی غزل اسی کی مصداق ہے۔ غزل کیا ہے حالات حاضرہ پر مکمل تبصرہ ہے۔ باقی شعرا کرام کی تخلیقات دھات کے برتن میں گیس سے پکائے ہوئے کھانے کی مانند ہیں۔

جناب ف۔س۔ اعجاز کی کہانی "ہنستے رہو" آنکھ پر بندھی پٹی کو کھول دیتی ہے۔ یہ کہانی ٹھگوں کے لئے سم قاتل ہے۔ عیار و مکار سے ہوشیار و خبردار کرتی ہے۔ جناب اعجاز صاحب کو میری مبارکباد جناب بھیشم ساہنی کی کہانی "ساگ میٹ" دلچسپ اور تفریحی ہے۔ تفکرات سے بوجھل ذہن کو کچھ دیر کے لئے سکون بخشتی ہے۔

جناب نند کشور وکرم کی کہانی "کاگا سب تن کھائیو......" انسانی ہمدردی اور انسانیت کا درس دیتی ہے۔ نیک نیتی سے دلوں کے ملنے میں سرحد کی دیوار بھی مانع ثابت نہیں ہوتی ہے۔

عبداللہ حسینی، بیگو سرائے

[illegible] الف سے داستان تو واقعی نظم کرنے کے قابل ہے۔ میں ابھی فکرِ سخن [illegible] قلم سنبھالتا ہوں۔

(پھر کسی کے چلنے کی آواز)

راوی: فردوسی نے اس طرح شاہنامے کی ابتدا کی۔ ابو منصور نے جو طوس کا صوبہ دار تھا، اس کی سرپرستی کی۔ ابو منصور کے مرنے کے بعد طوس کا عامل سلان خان [illegible] ہوا۔ یہ تک شاہنامے کا اب جو چرچا پھیلتا جاتا تھا سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی۔ فردوسی کو بلوا بھیجا۔ فردوسی نے غزنی کا عزم کیا۔ ہرات پہنچا تو اسے غزنی جانے سے روکا بھی گیا۔ لیکن اس نے سوچا کہ قسمت آزمائی کرنی ہی چاہیے۔ غرض ہرات سے چل کر غزنی میں آیا اور ایک باغ کے قریب ٹھہرا۔ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھی شہر میں جن لوگوں سے رسم و راہ تھی ان کو اپنے آنے کی اطلاع کی۔ چلتا پھرتا باغ میں جا نکلا۔ حسنِ اتفاق سے دربار کے ممتاز شعرا یعنی عنصری، فرخی، عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے اور ناؤ نوش میں مصروف تھے۔ فردوسی بھی ادھر جا نکلا۔ انہوں نے اس کو مخل صحبت سمجھا۔ طے پایا کہ رباعی کا ایک ایک مصرع ہم کہتے ہیں۔ اگر یہ چوتھا مصرع کہہ دے تو شریک صحبت کر لیا جائے۔

راوی: عنصری نے کہا:

عنصری: عارض سا ترے ماہ نہیں ہے روشن

راوی: فرخی نے کہا:

فرخی: خالی ہے گلِ رخ سے ترے ہر گلشن

راوی: عسجدی نے کہا:

عسجدی: پلکیں تری کر دیتی ہیں چھلنی جوشن

راوی: فردوسی نے بڑی بے ساختگی سے کہا:

فردوسی: جس طرح کہ ہو گیو کے نیزے سے پشن

راوی: روشن، گلشن اور جوشن کا ہم قافیہ لفظ جوشن اور پشن پر ختم ہو، فارسی زبان میں موجود نہیں تھا۔ یہی کمال ان تینوں شاعروں نے کیا کہ اگر شاعر بھی ہوگا تو کیا کرے گا۔ لیکن فردوسی نے شاہنامہ نظم کرنے کی ٹھانی تھی اور داستان پاستان میں گیو اور پشن کی لڑائی کا حال پڑھا تھا۔ عنصری اور اس کے ساتھیوں کے اصرار پر فردوسی نے یہ قصہ انہیں سنایا۔ اس کے بعد بہت سی روایتیں ہیں۔ فردوسی کو دربار تک پہنچنے میں بہت سی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سلطان محمود نے اپنے ایک دوست ماہک کی سفارش پر فردوسی کو دربار میں طلب کیا۔ کلام سنا اور بہت خوش ہوا۔

محمود: میں بہت محظوظ ہوا۔ شاہنامے کی تصنیف تمہارے سپرد کی جاتی ہے۔

فردوسی: بہت شکریہ جہاں پناہ کا۔

محمود: اور دیکھو۔ وزیر باتدبیر۔ فردوسی کو ایوان شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے جو تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ ہو اور آلات جنگ، اسلحہ حرب، شاہان عجم اور پہلوانوں کی تصویروں سے سجایا جائے اور ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی دی جائے۔

راوی: فردوسی نے چار سال تک غزنی میں قیام کیا اور شاہنامے کی تصنیف میں مصروف رہا۔ پھر وطن گیا اور کئی برس رہ کر واپس آیا۔ اس اثنا میں جو حصہ تیار ہو چکا تھا محمود کے حضور میں پیش کیا اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کیے۔ علمی تاریخ کا یہ نہایت ناگوار واقعہ ہے کہ فردوسی کو اس کی اعجاز بیانی کی داد نہیں ملی۔ جب شاہنامہ تیار ہوا تو اس کو اشرفیوں کے عوض روپے دلوائے گئے۔

فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہنامے کا صلہ پہنچا۔ فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں۔ فردوسی نے بڑی بے تابی سے دشت شوق بڑھایا۔ لیکن سونے کے پھول کے بجائے چاندی کے پھول نکلے۔ فردوسی کے دل سے آہ نکلی اور تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خون جگر ان سفید دانوں کے لئے نہیں کیا تھا۔

فردوسی نے غزنی کو چھوڑ دیا۔ ایک سربمہر لفافہ ایاز کو دیا کہ میرے جانے کے بیس دن بعد بادشاہ کو دینا۔ فردوسی ہرات کو روانہ ہوا۔ لفافے کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔

محمود نے دنیا کی بڑی سلطنتیں مٹا دیں ملک کے ملک غارت کر دئے۔ عالم زیر و زبر کر دیا۔ لیکن فردوسی کی زبان سے جو بول نکل گئے آج تک قائم ہیں اور قیامت تک مٹ نہیں سکتے۔ وہی فردوسی جس نے ایک ہزار سال پہلے جدید ایران کی بنیاد رکھی۔ جو اپنی عظمت اور اپنے بزرگوں کی عظمت کا اس قدر شیدائی تھا کہ عربوں کے خلاف یہاں تک کہہ گیا۔

"اونٹ کا دودھ اور گدھے کا گوشت کھانے والے عرب اب یہاں تک آ پہنچے کہ تختِ کیانی کی آرزو کریں۔ اس گھومنے والے آسمان پر لعنت اور ہزار لعنت۔"

یہ وہی فردوسی ہے۔ جس کے متعلق ایک فارسی شاعر کا قول ہے۔

پہلی آواز: قدر شناسی اچھی ہے کہ جب اس جھکے ہوئے آسمان نے حادثے کا تیر چلایا محمود کی شان و شوکت ختم ہو گئی اور زمانے میں اس افسانے کے سوا کچھ نہ رہا کہ اس نے فردوسی کی قدر نہ پہچانی۔

یہ وہی فردوسی ہے جس نے اتنی بڑی تصنیف میں تیس پینتیس سال اپنا خون جگر صرف کیا اور فخریہ انداز میں کہا۔

دوسری آواز: مشہور پہلوان رستم کو میں نے تخلیق کیا ہے ورنہ وہ سیستان کا ایک معمولی پہلوان تھا۔

راوی: یورپ کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا شاعر ہومر ہے۔ اس کا کارنامہ فخر رزمیہ شاعری یا ایپک پوئم ہی ہے۔ مہابھارت بھی مشہور رزمیہ نظم ہے۔ اگر دونوں کے پہلو میں کسی کو جگہ دی جا سکتی ہے تو وہ شاہنامہ ہی ہے۔

☆☆☆

آجکل کی فائل سے

ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عرش ملسیانی

جلد: ۱۳ نمبر: ۶ جنوری ۱۹۵۵

/2001 Licensed U (DN)-50/2001 to post without pre-payment
No. 6 Rs. 7/- Ajkal (Urdu) January 2002 AD

ADVERTISEMENT RATE

(ENGLISH, HINDI & REGIONAL LANGUAGES)
SHETRA (ENGLISH & HINDI)
(HINDI & URDU)
ARATI (HINDI)

	One Insertion		Four Insertions		Special Issue Rates	
	Colour	B&W	Colour	B&W	Colour	B&W
Page	8000	4000	25600	12800	12000	6000
Page	5000	2500	16000	8000	7000	4000
Cover	13000	7000	41600	22400	19000	10000
& Cover	11000	6000	35200	19200	16000	9000

& BHARAT (ANNUAL)

	INDIA (ENGLISH)		BHARAT (HINDI)	
	B&W	Colour	B&W	Colour
Spread (Front) Cover Pages	15000	30000	8000	16000
Spread (Back) Cover Pages	12500	25000	6500	13000
Full Page	5000	10000	3000	6000

MECHANICAL DETAILS:

YOJANA, KURUKSHETRA & AJKAL

Size	21 cms / 28 cms
Area	17 cms / 24 cms

INDIA, BHARAT & BALBHARATI

Size	16 cms / 24 cms
Area	12 cms / 20 cms

Print Process	Offset Process
Advt. Material Required	Artwork/Artpull/Positives
Last date of receipt of Advt. Material	60 days in advance

Payable to:
DIRECTOR, PUBLICATIONS DIVISION
15% agency commission to Advtg. Agencies. 10% Joint Rebate is allowed when advts. are for two language editions of the same issue.

Printed and Published by The Director on behalf of Publications Division
Printed at Aravali Printers & Publishers (P) Ltd. W-30, Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-20
Published at Publications Division, Patiala House, New Delhi-1, Editor: M.R.Farooqi

۲۰۰۳ سات روپے

آجکل کی فائل سے:

سعید اوّلی

مرزا غالب کی خودنوشت سوانح عمری پر ایک نظر

مرزا غالب کا سالِ وفات ۱۸۶۹ء ہے۔ اس وقت سے آج تک نہیں معلوم کتنے زاویہ ہائے نگاہ سے مرزا کی زندگی پر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ حالی، بجنوری، مہر، اکرام، لطیف، مالک رام جیسے صاحبان کمال اپنا اپنا کمال دکھا چکے ہیں۔ رسالہ "اردو" کے شاندار تحقیقی مقالے "نگار" کا غالب نمبر "آجکل" کے بلندپایہ علمی مضامین اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ مولوی مہیش پرشاد، مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، شوکت حسین سبزواری کی مساعی جمیلہ کبھی رائیگاں نہیں جاسکتیں، اسی کے ساتھ سید احتشام حسین رضوی، آل احمد سرور اور ممتاز حسین جیسے ناقدانِ فن کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن باوجود اتنے عظیم کام کے غالب پھر بھی غالب ہیں اور اس پر تحقیق و تنقید کے دروازے کھلے ہوئے ہیں......

غالب کی "خودنوشت سوانح عمری" کا سب سے پہلے علم مولانا غلام رسول مہر کی مشہور عالم تصنیف "غالب[1]" سے ہوا اور اسی کے مطالعے سے یہ پتہ چلا کہ یہ تحریر رسالہ اردو میں شائع ہوچکی ہے، کب شائع ہوئی اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو کہاں سے ملی، اس کے لئے "غالب" خاموش ہے، مگر مولانا مہر فرماتے ہیں کہ "یہ تحریر غالبًا تذکرہ مظہر العجائب کے لئے لکھی گئی تھی" لیکن تذکرہ مظہر العجائب کی کسی تذکرے میں تذکرہ نہیں ملتا اور غالب کا کوئی دوسرا سوانح نگار بھی اس پر روشنی نہیں ڈالتا۔ مگر جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کرچکی ہوں کہ اس خودنوشت سوانح عمری پر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی ایک تحریر شائع ہوچکی ہے، وہ تحریر واضح تحریر ہے، ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"جب بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں مرزا غالب کے قدیم کلام کا نسخہ انجمن ترقی اردو کی جانب سے شائع کیا گیا تھا تو اس کی ترتیب وغیرہ کا کام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے لئے بہت سی نئی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں، منجملہ ان کے ایک عجیب چیز خود مرزا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انہوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے، یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا اور انہوں نے اپنی عنایت سے مرحوم کو بھیج دیا تھا، اگرچہ یہ حالات انہوں نے اس طرح لکھے ہیں جیسے کوئی غیر شخص لکھتا ہے۔ لیکن عبارت کا ڈھنگ صاف بتارہا ہے کہ اس پردے میں خود مرزا نوشہ باتیں کررہے ہیں، دوسرے ایک دو باتیں جو وہ کہہ گئے ہیں وہ مرزا کے دل کی ہیں۔ وہ دوسرا شخص کیسے لکھ سکتا تھا۔ تیسرے خط ان کا ہے۔ میرے پاس ان کے قلمی خط ہیں، ملا کر جو دیکھا تو عین وہی شان پائی۔"

سید افتخار عالم مرحوم نے ان حالات کے ساتھ 'نیر راجستان' جلد ۲ نمبر ۵۱ کا بھی ایک مطبوعہ ورق بھیجا تھا جس میں تذکرہ مظہر العجائب کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اغلب ہے کہ یہ حالات مرزا صاحب نے اسی تذکرے کے لئے تحریر کئے ہوں۔[2]

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی تحریر سے بہت سے پردے نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں اور چند باتیں خاص طور سے سامنے آتی ہیں۔ اول یہ حالات مرزا صاب نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے، دوسرے یہ ورق سید افتخار عالم مارہروی مرحوم کو کہیں سے ہاتھ لگ گیا تھا، انہوں نے وہ بجنوری مرحوم کو بھیج دیا تھا۔ تیسرے اس تحریر کے ساتھ "نیر راجستان" جلد ۲ نمبر ۵۱ کا بھی ایک مطبوعہ ورق تھا، جس میں تذکرہ مظہر العجائب کا اشتہار شائع ہوا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ کام کی بات جو میرے نقطہ نظر سے ہے وہ یہ ہے کہ "یہ ورق سید افتخار عالم مرحوم نے بجنوری کو بھیج دیا تھا" اگر یہ بات یاد رکھی جائے اور اس کو نظرانداز نہ کیا جائے تو "یہ حالات مرزا غالب نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے" اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ پھر بھی "نیر راجستان" کی ضرورت پیش آتی ہے کہ جس میں تذکرہ "مظہر العجائب" کا اشتہار شائع ہوا تھا، بڑی تلاش و جستجو کے بعد یہ نمبر دیکھنے کو ملا۔ یہ اخبار مطبع خاور نور جے پور سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے صفحہ گیارہ پر ایک اشتہار زیرعنوان "اشتہار تذکرہ مظہر العجائب" شائع ہوا ہے جو درج ذیل ہے۔

"اشتہار تذکرہ مظہر العجائب"

"خوش مذاقان مائدہ سخن اور شیریں کامانِ علم و فن پر واضح ولامع ہو کہ عرصہ چند سال سے ایک تذکرۃ الشعرا فارسی دہلی میں تالیف ہورہا ہے آج تک ایسا تذکرہ فراہم نہیں ہوا ہے۔ مصنف اس کتاب کے جس کو ایک دفتر کہنا چاہئے عالی مرتبت معالی منصبت سند المحققین طراز المدققین، فاضل جلیل عالم نبیل، شاعر کامل، ثانی سحبان وائل برگزیدہ ایزد مطلق مولوی مظہر حق صاحب خلف الرشید و فرزند سعید علامہ ہمہ داں، فرزند دوراں، مہین قادر کلامی، شیوہ بیانی، زندہ کن انوری خاقانی، بیدہ خداوند اقلیم زباندانی، مقبول بارگاہ لم یزل مولوی محمد ظہور علی صاحب مد ظلہ عالی المتخلص بہ ظہور ہیں۔ اگرچہ یہ تاریخ ۱۲۸۱ھ میں ختم ہوچکی تھی اور نقار ریاد و نوار جو نجم الدولہ بہادر و مولانائے نظامی و حضرت ظہور وغیرہم نے عنایت کیں، ان سے کی

باقی صفحہ ۳

ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمٰن فاروقی
فون: 3386994

اسسٹنٹ ایڈیٹر:
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر:
محمد کاظم

جلد: ۶۰ شمارہ: ۷
فروری ۲۰۰۲ء ماگھ۔ پھاگن شک ۱۹۲۳

سرورق: دیپتی سیٹھی
کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ سی آہوجہ

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ: سات روپے — سالانہ: ۷۰/روپے
دو سال: ۱۳۵/روپے — تین سال: ۱۹۰/روپے
امریکہ، یورپ اور دوسرے ممالک کیلئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۰۰/روپے سالانہ
پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۵۰۰/روپے سالانہ

خریداری اور اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر،
ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتہ پر بھیجیں
سرکولیشن منیجر آجکل ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر کے پورم نئی دہلی۔ ۲۶
رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتوں کیلئے بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر آجکل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱

ترتیب

مقالات:

نظمیں:

غزلیں:

انشائیہ:

کہانیاں:

تبصرے: ۴۳

شمیم طارق

غالب اور عہدِ غالب

اگر ٹیپو شہید، جنہوں نے انگریزوں کو وطن عزیز سے نکال بھگانے کے لئے پورے ہندوستان کو متحد کرنے کی کوشش کی تھی، کے عہد سے واقعات کا تسلسل سے جائزہ لیں تو یہ حقیقت بہت واضح ہو جاتی ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران مجموعی طور پر تمام ہندوستان بدیسی حملہ آوروں سے مقابلہ کرنے کی ایک ملک گیر تحریک کی تیاری کر رہا تھا۔ اس میں صرف دو قسم کے لوگ شریک نہیں تھے۔

ایک وہ جو نئے نئے زمیندار ہوئے تھے۔

دوسرے، شہروں میں رہنے والے وہ روشن خیال لوگ جن کی دولت اور سماجی حیثیت کا تمام تر انحصار انگریزوں کی عطا پر تھا۔

غالب دوسری قسم کے لوگوں میں تھے۔ اس لئے انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی ملک گیر تحریک کی تیاری کا ان کی فکر و عمل پر کوئی اثر نہیں پڑا اور وہ بدستور یہی سمجھتے رہے کہ ان کی روزی اور عزت دونوں انگریزوں سے بنائے رکھنے پر موقوف ہے۔

۱۸۲۴ء اور ۱۸۵۷ء کا درمیانی دور انگریزوں کے لئے اضطراب و بے چینی کا دور رہا ہے اور اگرچہ اس دور میں ان کے اقتدار و اختیار میں وسعت ہوتی رہی مگر اسی دوران انہیں برما سے جنگ، سید احمد شہید کے مجاہدوں سے محاربہ، افغانوں سے زور آزمائی اور خود سکھوں سے دو مختصر مقابلے پر بھی مجبور ہونا پڑا جو ان کے پرانے رفیق اور حلیف تھے۔

غالب اس دوران ۲۵۔۲۶ برس کے کڑیل جوان تھے۔ جوانی احتجاج و انقلاب کی راہ زیادہ پسند کرتی ہے اور غالب کی مستقبل بینی، غیر معمولی شعور اور جدید ذہن پر مسلسل بہت کچھ لکھا بھی جاتا رہا ہے مگر ان کی زندگی کے حقائق ان کی غیرت و خودداری یا جدید ذہن و مستقبل بینی سے متعلق خود غالب یا ماہرین غالبیات کے دعووں کی تصدیق نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پنشن منصب اور خلعت کے حصول کے علاوہ زندگی کے کسی اور مقصد پر انہوں نے کبھی کوئی توجہ دی ہی نہیں اور اس کی طلب میں، اواخر نومبر ۱۸۲۵ء میں عازم کلکتہ ہوئے حالانکہ اس وقت ان کے حقیقی بھائی مرزا یوسف بیگ کی بیماری و دیوانگی کا آغاز ہو چکا تھا اور گھر میں کوئی ایسا مرد نہیں تھا جو ان کی اہلیہ کا خیال رکھ سکے۔

کلکتہ میں انہیں انگریزوں کی سائنسی ترقیوں کے ساتھ بنگال کے ان طبقات کو دیکھنے کا بھی موقع ملا جو برطانوی حکومت کے زیر اثر پروان چڑھ رہے تھے اور ان کی تمام تر امیدیں یورپ اور انگلستان کے متوسط طبقے کی سیاسی، معاشی اور سماجی شعبوں میں کامیابیوں سے وابستہ تھیں۔

اس امید کی ایک وجہ یہ تھی کہ روشن خیال طبقے کی پشت پر ۴۰ سالہ نو آبادیاتی "تحریک اصلاح" بھی تھی۔ تحریک اصلاح مذہب (ابتداء ۱۸۱۵ء) کے بانی اگرچہ راجہ رام موہن رائے تھے مگر دیویندر ناتھ ٹیگور (۱۹۰۵ء—۱۸۱۷ء) کی قیادت میں یہ تحریک ۱۸۴۳ء تک کامیابی کے پرچم بلند کرتی رہی۔ اسی سے معاشرتی اصلاح کی تحریک نے جنم لیا جس نے ایشور چند ودیا ساگر (۱۸۹۱ء—۱۸۲۰ء) کی قیادت میں اس وقت نمایاں کامیابی حاصل کی جب ۱۸۵۶ء میں بیوہ کی شادی کا قانون پاس ہو گیا۔

اس طبقہ کے لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے ان جاگیرداروں سے، جو برطانوی حکمرانوں سے اپنا کھویا ہوا اقتدار چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں، قانونی اور آئینی حقوق حاصل کرنے کا موقع کبھی نہیں ملے گا جب کہ ان انگریزوں کو جو خود مختار کاؤنسل اور پارلیمنٹ میں عوام کے نمائندے بن کر بیٹھے ہیں، انصاف پروری اور عقل سلیم کا واسطہ دے کر ان سے قانون اور آئینی حقوق حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے روشن خیال طبقے نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء میں سپاہیوں کی مسلح مزاحمت کو جس پر مذہبی جذبات کی گہری چھاپ تھی، ایک اتفاقیہ، جاگیردارانہ اور رجعت پسندانہ ہنگامہ سمجھ کر اس کی مذمت کی۔

غالب کا رویہ اور نظریہ بھی یہی تھا مگر تاریخ کے مطالعے کے دوران بہت ساری ایسی صورتوں سے سابقہ پڑتا ہے، جنہیں ہم تناقضات کا نام دینے پر مجبور ہوتے ہیں اور جو بہ آسانی رد نہیں کئے جا سکتے۔ اس دوران بھی یہ تناقضات سامنے آئے۔ روشن خیال طبقے میں کوئی بھی بڑا چھوٹا شخص ایسا نہیں ہوا جو کسی ایک پل کے لئے بھی بھولا ہو کہ حب وطن بہتر وصف ہے۔ اس لئے تقریباً سبھی نے بھارت ماتا کی غلامی اور حملہ آوروں کے ہاتھوں اس کی تباہی کا ماتم کیا ہے۔ البتہ ان میں سے بعض نے حملہ آوروں میں انگریزوں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی شامل کیا ہے۔ مثلاً بنکم چندر چٹرجی کے ناول "آنند مٹھ" کا ایک کردار کہتا ہے کہ اب انگریز آگئے ہیں، وہ ہمیں مسلمانوں

۲۷۔ مرزبان منشن، بائی کلا پھل مارکیٹ، ممبئی۔ ۴۰۰۰۲۷

کے مطالبات منظور کرا ہی لائیں گے۔

بنگالی اخبار "دی ہندو پیٹریٹ" کے ہریش چندر مکھرجی جیسے بھی تھے جنہوں نے جنگ آزادی کے دوران ایک طرف تو حریت پسندوں کو گمراہ اور توہم پرست قرار دیا تھا اور دوسری طرف انقلاب پسندوں کی تحریک کو دبانے میں انگریزوں کو تشدد سے کام لینے کے مشورے بھی دے رہے تھے۔

اسی دور میں "ایشور گپت" جیسے شاعر بھی گزرے ہیں جو اس حد تک انقلاب پسند تھے کہ ان کے نزدیک "غیر ملکیوں کے دیوتا کے بجائے اپنے وطن کے کتے کو عزیز رکھنا زیادہ بہتر تھا۔" اور ایسے ہی شاعروں، دانشوروں اور بیدار ذہن لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی آخری رات ختم ہونے سے پہلے ہی بنگال کا وہی روشن خیال طبقہ جو پہلے انگریزوں کو اپنے مفادات کا نگران اور اپنی اصلاحی تحریکوں کا روح رواں سمجھتا تھا، بلا تامل وسطی بنگال کی 'بغاوت نیل' میں کود پڑا اور مظلوم کسانوں کی بہبودی کے لئے پورے جوش و خروش کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ ہوا۔

لیکن غالب کی زندگی کے کسی مرحلے پر ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ نہ صرف آخری سانس تک انقلابی احساسات سے عاری رہے بلکہ بنگالی ادب کے اس تخلیقی کرب کو بھی نہیں سمجھ سکے جس میں وہ ۱۸۵۶ء اور ۱۸۶۱ء کے دوران جتلا تھا۔

اس سے پہلے یہ تیاری کے چار ادوار سے گزر چکا تھا۔

فورٹ ولیم دور

راجہ رام موہن رائے دور ۳۱ — ۱۸۱۵ء

نوجوان بنگال اور سم ودا پربھاکر دور ۴۳ — ۱۸۳۱ء اور

آخر میں ودیا ساگر موبودھنی پتریکا دور ۵۶ — ۱۸۴۳ء

آخری دونوں دور غالب کی جوانی کے ایام پر محیط ہیں مگر ان کی نگاہیں کلکتہ اور بنگال کے چہرے پر انگریزوں کے ملے ہوئے غازے سے آگے نہیں دیکھ سکیں۔ وہ انقلابی بنگال کی اس روح کو بھی نہیں پہچان سکے جو بنگال کی انقلابی اور قومی تحریکوں کی محرک بنی، نہ ہی انہوں نے ۱۸۵۷ء کے خاکستر میں چھپی چنگاریوں کی گرمی محسوس کی جو بعد میں ریشمی رومال، دیوبند اور دوسری قومی و انقلابی تحریکوں کی صورت میں شعلہ جوالہ بن کر غلامی کی زنجیروں کو پگھلا دینے کا سبب بنیں۔ یعنی غالب نے اپنے عہد کے مذہبی احیاء پسندوں، انقلابیوں اور حریت پسندوں کی ان دیکھی، ان سنی تو کی ہی اپنے زمانے کے روشن خیال طبقے اور اہل قلم کے حقیقی احساسات اور تخلیقی کرب کو بھی نہیں سمجھ سکے۔

غالب کے دفاع میں کہا جاسکتا ہے کہ ایک ۶۰۔۶۱ برس کے بوڑھے اور آفت رسیدہ شاعر سے جو نہ صرف نئے حکمرانوں کی نظروں میں مشتبہ تھے بلکہ جن کے خلاف بہت پہلے ہی سے دربار دلی سے کوچہ ہائے دلی تک مخبروں کا جال بھی بچھا ہوا تھا کیا توقع کی جاسکتی تھی؟ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں جب دلی کے بے شمار شرفا جیلوں میں تھے یا قتل کر دیئے گئے تھے یا جھوٹے سچے مقدمات میں ملوث کر دیئے گئے تھے۔ غالب نے جو کیا اس سے ان کے لئے کم از کم چند سالہ عافیت کا سامان تو ہو گیا!

اس کے علاوہ یہ دلیل بھی دی جاسکتی ہے کہ غالب نے جابجا اس بات کے بھی اشارے دیئے ہیں کہ وہ جو لکھنا چاہتے تھے مجبوری کے سبب نہیں لکھ سکتے تھے مثلاً ان کا یہ خط:

"حسرت پیتا ہوں اور سر پٹکتا ہوں کہ جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں نہیں لکھ سکتا۔ الٰہی حیات جاودانی نہیں مانگتا، انوار الدولہ سے مل کر سرگزشت بیان کروں، پھر اس کے بعد مروں۔"[12]

یا یہ کہ بے قصور موت کے گھاٹ اتار دیئے جانے والوں کا ماتم کرتے ہوئے انہوں نے ذلت کی زندگی پر عزت کی فطری موت کو ترجیح دیتے ہوئے بڑی پچی بات لکھی ہے:

"تاتا تانی کے مرنے کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ وہ اپنی اجل سے مرے ہیں۔ بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟"[13]

مگر اس عہد کے حالات اور غالب کے کردار کے سامنے ان میں سے کوئی استدلال بھی پائیدار نہیں ثابت ہوتا کیونکہ مصلحت و مجبوری اور کمزوری کس کے ساتھ نہیں ہے؟ اگر تمام لوگ غالب کا طرز عمل اختیار کرلیں تو دنیا میں ظلم کے خلاف مزاحمت کے تمام سلسلے ختم اور انقلاب کے تمام سوتے خشک ہو جائیں۔ ۱۸۵۷ء میں بھی جن لوگوں نے انگریزوں کے خلاف کلمہ حق بلند کیا تھا یا تلواریں اٹھائی تھیں، ان میں سے بہتوں کے حالات غالب سے بہتر نہیں تھے۔ اگر وہ بھی غالب ہی کا انداز فکر اختیار کر لیتے تو انقلاب کا بگل بجتا، نہ ملک آزاد ہوتا۔

غالب کی کسی تحریر یا عمل سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ایک پل کے لئے بھی انہوں نے عزت کی زندگی کے لئے ملک کی آزادی کو ضروری سمجھا ہو حالانکہ ان کے سامنے احیا پسند مجاہدین اور حریت پسند سپاہیوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو انگریزوں سے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کے باوجود ان کی مخالفت یا ان سے بیزاری کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

مثال کے طور پر مفتی صدر الدین خاں آزردہ اگرچہ انگریزوں کی ملازمت میں تھے مگر جذبہ حریت سے بے نیاز نہیں تھے۔ انہوں نے اس فتویٰ جہاد پر دستخط بھی کئے تھے جو انگریزوں کے خلاف علما کی طرف سے جاری کیا گیا تھا مگر جب انگریزوں نے انہیں گرفتار کیا تو انہوں نے صفائی دی کہ میں نے تو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ مجھ سے 'بالجبر' دستخط لئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے دستخط سے پہلے 'بالخیر' لکھا تھا۔ نقطہ نہ ہونے کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے 'بالخر' کو 'بالجبر' ثابت کیا اور جان چھڑائی، البتہ ان کی جائیداد اور املاک کا بڑا حصہ ضبط کر لیا گیا۔ غالب کی زندگی میں ایسا کوئی مرحلہ کبھی نہیں آیا۔ بہادر شاہ ظفر کے لئے ایک سکہ کہنے کا الزام تھا وہ بھی غلط تھا۔ وہ آخری سانس تک انگریزوں کی خوشامد ہی کرتے رہے۔

غالب نے اپنے ددیہال اور ننھیال میں پشتہا پشت سے سپہ گری کے پیشہ کا ذکر کرتے ہوئے بڑے فخر سے کہا ہے کہ

کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب کے آبا کا وہ پیشہ جس پر انہیں بڑا فخر تھا صرف دو پشت چل سکا تھا اور اس کے بعد ان کے لئے ذریعہ عزت اگر کوئی چیز رہ گئی تھی تو وہ صرف شاعری تھی۔

'مہر نیم روز' کے دیباچے میں ایک رباعی میں انہوں نے بڑی خوبصورتی سے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے اجداد کا ٹوٹا ہوا تیر ان کے لئے قلم بن گیا ہے۔

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم
زاں رو بہ صفائے دم تیغ است دمم
چوں رفت سپہ گری ز دم جنگ بہ شعر
شد تیر شکستۂ نیاگاں قلمم

لیکن عملاً انہوں نے انگریزوں کے خلاف کبھی تلوار اٹھائی نہ قلم، بلکہ ان کے حق میں یہ لکھ کر دعائے خیر ہی کرتے رہے کہ "انگریزوں نے شمع تو گل کر دی لیکن صبح صادق کی بشارت دے دی ہے جو آمد آفتاب کا پیش خیمہ ہے۔"

حالانکہ خود انگریزوں کے خیال میں غالب کا وہ بیان جھوٹا تھا جس کو انہوں نے "بشارت" بناکر پیش کیا تھا کیونکہ انہیں اپنی حکومت کے استحکام کے سلسلہ میں کبھی اطمینان نصیب ہوا نہ ہی وہ اپنے ان مظالم کو بہت دنوں تک چھپا سکے جو انہوں نے ہندوستانیوں پر ڈھائے تھے۔ شور کو اعتراف تھا کہ

"ہماری سلطنت ریت کے ایک جزیرے کی مانند ہے جسے کسی سیلاب نے ابھارا ہے۔ نہ تو بند باندھے گئے ہیں اور نہ ہی ایسے درخت لگائے گئے ہیں جن کی جڑیں نیچے پھیل کر ایک دوسرے کو جکڑ لیں۔"[3]

اس کے علاوہ جنگ آزادی کے دوران کارل مارکس اور دوسرے انقلاب پسندوں نے انگریزوں کو مزید احساس دلا دیا تھا:

"آہستہ آہستہ ایسے راز فاش ہو جائیں گے جن کی بنیاد پر خود جان بل کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ جسے وہ ایک فوجی غدر تصور کرتا ہے وہ درحقیقت ایک قومی بغاوت ہے۔"[4]

لہٰذا دیسی حکمرانوں کی مدد سے ۱۸۵۷ء کی قومی جنگ کو دبانے کے باوجود انگریزوں نے اطمینان کی سانس نہیں لی کیونکہ انہیں مکمل طور سے احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستانیوں میں جذبہ قوم پرستی اور انقلاب دوستی کی جو امنگ پیدا ہو چکی ہے، وہ انہیں اس ملک پر زیادہ دنوں حکومت کرنے نہیں دے گی۔ اس لئے ایک طرف تو ملکہ وکٹوریہ نے کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لے کر (یکم نومبر ۱۸۵۸ء) ہندوستانی عوام کو یقین دہانی کرانے کی کوشش کی کہ

"سوائے ان لوگوں کے جو ہماری انگریز رعایا کے قتل میں حصہ لینے کے مجرم ہیں، باقی جو لوگ بھی اسلحے رکھ دیں گے ان سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ہندوستانیوں کی گود لینے کی رسم آئندہ سے جائز سمجھی جائے گی اور گود لئے لڑکوں کو باپ کی جائیداد اور گدی کا مالک مانا جائے گا۔ کسی کے مذہبی عقیدوں یا مذہبی رسم و رواج میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ہندوستانی والیان ریاست کے ساتھ کمپنی نے اس وقت تک جتنے عہد نامے کئے ہیں ان کی تمام شرطوں پر آئندہ ایمانداری کے ساتھ عمل درآمد کیا جائے گا۔ اس کے بعد کسی ہندوستانی رئیس کی ریاست یا اس کا کوئی حق نہیں چھینا جائے گا۔ سارے ہندوستانیوں کے ساتھ ٹھیک اسی طرح کا سلوک کیا جائے گا جس طرح انگریزوں کے ساتھ۔"[5]

اور دوسری طرف "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کے تحت ہندوستان کے مختلف طبقوں اور فرقوں میں نفاق ڈالنے کی منصوبہ بند کوششیں بھی شروع کر دیں۔[6] تاکہ ہندوستانیوں میں متحدہ قومیت اور بدیسی حملہ آوروں کو اپنی سرزمین سے کھدیڑ دینے کے مشترکہ احساسات کو ختم کر سکیں لیکن [illegible] بھی انہیں جھڑک دیا جو پہلے ان کے دام فریب میں پھنس چکے تھے۔

پہلے تو بیگم حضرت محل نے عوام کو خبردار کیا:

"اس اعلان میں لکھا ہے کہ عیسائی مذہب سچا ہے، لیکن کسی [illegible] کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے گی اور سب کے ساتھ ایک طرح کا [illegible] گا۔ سچے نظام حکومت میں کسی مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے سے کیا تعلق ہے؟

سور کھانا اور شراب پینا، چربی کے کارتوس دانت سے کاٹنا اور آٹے [illegible] میں سور کی چربی ملانا، سڑکیں بنانے کے بہانے مندر اور مسجدوں کو گرانا، گرجا [illegible] گلیوں اور کوچوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے کے لئے پادریوں کو بھیجنا، ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے لوگ کیسے یقین کر سکتے ہیں کہ ان کے مذہب میں دخل نہ دیا جائے گا؟

اس اعلان میں لکھا ہے کہ ... جن لوگوں نے قتل کئے ہیں یا قتلوں میں مدد دی ہے، ان پر کوئی رحم نہ کیا جائے گا، باقی سب کو معاف کر دیا جائے گا۔ ایک بے وقوف آدمی بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس اعلان کے مطابق قصوروار یا بے قصور کوئی آدمی بھی نہیں بچ سکتا...... ایک بات اس میں صاف کہی گئی ہے وہ یہ کہ کسی بھی قصوروار آدمی کو نہ چھوڑا جائے گا۔ اس لئے جس گاؤں یا علاقے میں ہماری فوج ٹھہری ہے، اس کے باشندے نہیں بچ سکتے...... اس اعلان کو پڑھ کر جس میں کہ صاف دشمنی بھری ہوئی ہے، ہمیں اپنی رعایا کی حالت پر بہت افسوس ہے۔

اب ہم ایک صاف اور معتبر فرمان جاری کرتے ہیں کہ ہماری رعایا میں سے جن لوگوں نے بے وقوفی کر کے گاؤں کے مکھیوں کی حیثیت سے اپنے آپ کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا ہے، وہ پہلی جنوری ۱۸۵۹ء سے پہلے ہمارے کیمپ میں آکر حاضر ہوں، بلاشبہ ان کا قصور معاف کر دیا جائے گا...... آج تک کبھی کسی نے نہیں دیکھا کہ انگریز نے کسی کا قصور معاف کیا ہو۔

ہماری رعایا میں سے کوئی انگریزوں کے اعلان کے دھوکے میں نہ آئے۔"[7]

اور پھر چند کو چھوڑ کر وہ علماء بھی انگریزوں کے خلاف کھل کر بولنے لگے جو سید احمد شہید کی تحریک سے متفق نہ ہونے، شاہ اسمٰعیل شہید کے بعض اعتقاد یا معمول سے اختلاف رکھنے، برطانوی حکومت میں ملازم ہونے یا کسی اور مصلحت سے تحریک آزادی سے دور تھے۔

غالب کے قریبی دوست مولانا فضل حق خیر آبادی اور غالب کی گرفتاری پر خوشی سے بغلیں بجانے والے مولانا محمد باقر ایسے ہی علما میں تھے جن کا انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرنا ثابت نہیں ہے۔ مولانا باقر نے دہلی کالج کے انگریز پرنسپل ٹیلر کو چار دنوں تک پناہ دی تھی، اس کے باوجود اسی کے دئے ہوئے رقعہ کے سبب دوسرے احسان فراموش انگریز افسر نے انہیں گولی مار دی تھی۔

مولانا فضل حق کے فتویٰ جہاد کی بڑی تشہیر کی گئی ہے لیکن مولانا [illegible] عرشی اور مالک رام نے نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے نام لکھے ہوئے غالب کے ایک خط اور اصل مقدمہ کے کوائف اور دستاویزی شہادتوں کی بنیاد پر ثابت کر دیا ہے:

☆ مولانا نے کبھی کوئی ایسا فتویٰ دیا ہی نہیں تھا جس میں مسلمانوں کو انگریزوں کے

خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔

☆ جنگ کی ناکامی پر انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے جو مقدمہ چلایا اس مقدمہ کے دوران انہوں نے بار بار کہا ہے کہ میں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا اور فتویٰ جہاد پر جن علما کے دستخط ہیں ان میں میرا نام نہیں ہے۔

☆ مولانا نے اپنی پیرانہ سالی، اولاد کی کمسنی اور عسیر الحالی کی دہائی دے کر انگریزوں سے رحم کی پر زور التجا بھی کی ہے۔[8]

کالی داس گپتار ضا نے بھی اپنے ایک مضمون میں ذرا سے فرق یا بدلی ہوئی زبان میں مولانا عرشی اور مالک رام کے موقف کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اب صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک مولانا فضل حق خیر آبادی اور ان کے مقدمے اور آخر کار کالے پانی کی سزا کا تعلق ہے، عام روایتیں نادرست ہیں۔ عرشی صاحب اور مالک رام صاحب نے ایمانداری سے تحریری شہادتیں پیش کر کے ثابت کر دیا کہ مقدمے کے دوران اور اس کے بعد انتقال (۱۸۶۱ء) تک مولانا نے صورت حال کا جیسا بھی مقابلہ کیا اسے بہادرانہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس طرح اس عرصہ میں انہوں نے جو بھی بیان دیئے، وہ معتبرانہ بیانات میں شمار نہیں کئے جاسکتے۔ تاہم میری ذاتی رائے ہے کہ مقدمے اور بعد کے رویے سے قطع نظر جو میرے خیال میں مولانا نے اپنی جان بچانے اور رہائی حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا تھا، وہ جنگ آزادی سے پورے پورے متاثر تھے۔ انہوں نے اس جنگ آزادی میں عملی طور پر حصہ لیا ہو کہ نہ لیا ہو لیکن وہ جذباتی طور پر جنگ آزادی سے قطعی ہم آہنگ تھے۔"[9]

لیکن موصوف نے اپنے موقف کی دلیل میں مولانا کے اکتوبر / نومبر ۱۸۵۷ء میں لکھے ہوئے ایک عربی قصیدہ کا ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ اس میں دین عیسوی کو مسلط کرنے، عہد و پیمان سے مکر جانے، ظلم و طغیان میں حد سے گزر جانے، صناعوں اور کاشتکاروں کا رزق چھین لینے، کمینوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور لغویات و مکروہات کی تعلیم دینے والے مدارس کھولنے کے سبب انگریزوں کی مذمت نیز کمزور و بزدل، بہادر شاہ کی غیر مستقل مزاجی، عزم و صلاحیت کی کمی اور اس کے ارد گرد جمع ہونے والوں کی لوٹ کھسوٹ، زناکاری اور دھینگا مشتی سے بیزاری کے ساتھ اگرچہ ان سپاہیوں کی تعریف کی گئی ہے جنہوں نے انگریزوں سے اسلحے چھین کر ان کی اچھی خبر لی تھی، ساتھ ہی لشکر دہلی کے ان مٹھی بھر مخلص مجاہدین کی بھی تعریف کی گئی ہے جو بے سروسامانی میں محض رضائے الٰہی کے لئے لڑ رہے تھے مگر خود مولانا کے جنگ آزادی میں شریک ہونے، مجاہدین کی مدد کرنے یا انگریزوں کی ملازمت سے مستعفی ہونے کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ اس لئے اس قصیدہ کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ مولانا کا قلب و ضمیر مجاہدین آزادی کے ساتھ تھا اور خدمات انگریزوں کے لئے۔

کالی داس گپتا رضا کا شائع کیا ہوا قصیدہ دلی کی تاراجی کے بعد مولانا کے دلی سے نکل کر خیر آباد تک پہنچنے کے احوال پر مشتمل ہے۔ مولانا کے شہرۂ آفاق رسالہ "الثورۃ الہندیہ" اور دو عربی قصائد جن کی تخلیق نہایت کسمپرسی میں جزیرہ انڈمان میں ہوئی تھی اور جس درد و کرب اور جذب و تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں، ان میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے جو انگریزوں کے خلاف جہاد آزادی میں ان کی عملی شرکت کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاسکے۔

انہوں نے جہاد آزادی میں عملی شرکت کی بھی نہیں تھی، اس لئے بالآخر انگریزوں نے بھی ان کی بے گناہی تسلیم کرتے ہوئے ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا تھا لیکن جب ان کا پروانہ رہائی انڈمان پہنچا، جہاں وہ قید تھے تو وہ قفس عنصری سے ہی رہائی پا چکے تھے۔ وہاں پروانہ رہائی لے جانے والے نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔ مولانا نے جنگ آزادی میں شرکت کی ہوتی تو انگریز ان کی بے گناہی کیوں تسلیم کرتے؟ وہ بے گناہ تھے لیکن بے گناہی کے باوجود جب ابتلائے آزمائش میں مبتلا کئے گئے تو انہوں نے انگریزوں کی مذمت شروع کر دی۔ انہیں آزادی کی قدر و قیمت کا احساس اس وقت ہوا جب وہ دلی سے بھاگنے یا سزا پا کر جزیرہ انڈمان جانے پر مجبور کئے گئے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ جذباتی طور پر جنگ آزادی سے قطعی ہم آہنگ تھے۔

کالی داس گپتا رضا سے ایک اور جگہ سہو ہوا ہے۔ انہوں نے مولانا فضل حق کو "حامیان تقلید" کا اور مولانا سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کو "عدم تقلید" اور "وہابیت" کا علم بردار لکھا ہے۔[10] لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہید نہ تو وہابی تھے نہ تقلید کے مخالف۔ وہ کٹر حنفی، مقلد اور سلسلہ تصوف میں بیعت وارادت سے عملی اعتقادی تعلق رکھنے والے تھے اور ان کے پیروکاروں کی زبردست اکثریت بھی حنفی اور صاحب سلسلہ تھی۔[11]

شاہ اسمٰعیل شہید کے غیر مقلد ہونے کی بات بھی اگرچہ شہرت پاچکی ہے مگر صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا عبیداللہ سندھی کی یہ شہادت موجود ہے:

"امام ولی اللہ اگرچہ اپنے والد کی طرح حنفی مذہب کے پابند تھے مگر حنفی اور شافعی دونوں مذہبوں کی کتابیں محققین کی طرح پڑھاتے تھے۔ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے احوال حکمت کے موافق حدیث کی شرح لکھی ہے۔ اس میں بعض اوقات وہ شافعی مذہب کو، اگر وہ حدیث اور حکمت کے زیادہ موافق ہو راجح قرار دیتے ہیں۔

جب مولانا اسمٰعیل شہید نے حجۃ اللہ البالغہ امام عبدالعزیز سے پڑھی تو اپنے جد امجد کے طریقہ پر عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی جو حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرے اور وہ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ سنن پر عمل کرتے تھے۔ اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم ان پر اعتراض نہیں کر سکا۔

جب افغانی علاقہ میں ہجرت کا فیصلہ ہوا تو امیر شہید نے مولانا اسمٰعیل شہید سے دریافت کیا کہ مولانا! آپ رفع یدین کیوں کرتے ہیں؟ مولانا نے کہا رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لئے۔ امیر شہید نے کہا مولانا اب رضائے الٰہی کے لئے رفع یدین کرنا چھوڑ دیجئے۔ اس کے بعد مولانا شہید کی خاص جماعت نے بھی ان کی اطاعت میں یہ اعمال چھوڑ دئے۔ مگر وہ لوگ جو نجدی اور یمنی علما کے شاگرد تھے باز نہ آئے اور انہیں لوگوں کے بے جا اصرار نے مشکلات پیدا کر دیں۔ امیر شہید نے ان کے رہنما کو جو محمد اسمٰعیل اور امام شوکانی دونوں کا شاگرد تھا، اپنی جماعت سے نکلوا دیا مگر فساد کی آگ پھر بھی بھڑکتی رہی۔"[12]

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید کا آمین بالجہر یا رفع یدین کرنا غیر مقلد ہونے کے سبب نہیں بلکہ فقہ شافعی کی رعایت سے تھا اور اس

کو بھی انہوں نے آخر میں تج دیا تھا۔

اس قسم کے علمی اور فقہی نوعیت کے اختلاف کو جن لوگوں نے عوامی انتشار پھیلانے کے لئے استعمال کیا وہ دراصل انگریزوں کے ہمنوا و معاون تھے اور چاہتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف عوام میں جذبہ جہاد پیدا کر کے انہیں میدان جنگ میں اتارنے والے علما کو اتنا بدنام کر دیں کہ عوام ان کی آواز پر کان نہ دھریں۔ اسی لئے مولانا فضل حق خیر آبادی اور شاہ اسمٰعیل شہید کو ایک دوسرے کی ضد کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں ایک ہی نسبی اور علمی سلسلے کی کڑی تھے[13] اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کوئی کدورت نہیں تھی۔ بعض علمی اور اعتقادی مسائل میں اختلافات ضرور پیدا ہوئے مگر ان مسائل میں مولانا فضل حق اور غالب کی آرا بھی جدا جدا تھیں۔

حالی کا بیان ہے کہ

"مولانا فضل حق مرحوم مرزا کے بڑے گاڑھے دوست تھے...... انہوں نے مرزا پر (کذا) نہایت اصرار کے ساتھ یہ فرمائش کی کہ فارسی میں وہابیوں کے خلاف ایک مثنوی لکھ دو...... مرزا نے ایک مثنوی جو کہ ان کے کلیات میں مثنویات کے سلسلے میں چھٹی مثنوی ہے۔ لکھ کر مولانا کو سنائی......جو کچھ مرزا نے مسئلہ نظیر خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا، اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے۔ مرزا نے صاف صاف تو نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیین کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے۔ مگر اس مضمون کو اس پیرائے میں ظاہر کیا تھا کہ اس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا، دوسرا خاتم پیدا نہیں ہو سکتا لیکن خدا قادر ہے کہ ایسا ہی ایک اور عالم پیدا کر دے اور اس میں خاتم النبیین کا مثل، جو اس دوسرے عالم کا خاتم النبیین ہو، خلق فرما دے......"[14]

علمی اور اعتقادی مسائل میں اختلافات کے باوجود جب مولانا فضل حق خیر آبادی اور غالب کی گہری دوستی تسلیم کی جاتی رہی ہے تو مولانا فضل حق اور مولانا اسماعیل شہید کے علمی فقہی اختلافات کو ان کے رشتہ اخلاص کے رد میں کیوں کر پیش کیا جا سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا دوسرے نے انگریزوں کی خدمت و ملازمت کے باوجود قید و بند کی مصیبت اٹھائی تو ان کی مخالفت کرنے لگا لیکن غالب انگریزوں کی خوشامد کی اپنی پرانی وضع پر آخری سانس تک قائم رہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ فنکار کی فنی اور تخلیقی بصیرت، اجتماعی نصب العین اور سماجی تاریخ کے احساس سے مختلف ہوتی ہے۔ دوسرے غالب کو اپنے عہد میں سیاسی تہذیبی معاشرتی اور فکری سطح پر جس قسم کے حالات کا سامنا تھا ان میں اپنے داخلی نظم کو برقرار رکھنا بھی بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے پرانے استعاروں کی مدد سے تجربے اور احساس کی نئی صورتیں وضع کرنے میں جہاد و اجتہاد کا مظاہرہ کیا جو ان جیسا نابغہ روزگار ہی کر سکتا تھا۔

مگر یہ عذر اس لئے محل نظر ہے کہ اگر شاعر و ادیب کا دائرہ فکر و عمل صرف داخلی نظم کی برقراری تک محدود کر دیا جائے تو انقلاب کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں۔ تیرگی شب کے خلاف کسی میں مزاحمت کا حوصلہ پیدا ہو نہ صبح کی سپیدی پھوٹے۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ جو غالب اپنے شعروں میں از کار رفتہ اقدار کو نظر انداز کرتے ہوئے ماضی و حال کے زندہ اور صالح عناصر سے ایک نئے اور [illegible] مستقبل کی تعمیر کا درس دیتے نظر آتے ہیں یا جن کے بارے میں [illegible] کہ وہ روایتی نظام میں تعفن پیدا کرنے والے ٹھہراؤ سے اوب کر انگریزوں کی [illegible] اور اجتہاد و ایجاد پر فریفتہ ہو گئے تھے، وہ اس حقیقت کا آخر دم تک احساس نہیں کر سکے کہ حب وطنی ایک فطری جذبہ ہے جو وقتی طور پر سرد تو پڑ سکتا ہے [illegible] مر نہیں سکتا۔ اس لئے جو ہندوستان ٹیپو شہید کے وقت سے ہی انگریزوں سے فیصلہ کن معرکے کی تیاریوں میں ہے، وہ برپا ہو کر رہے گا اور بالآخر وہ معرکہ عظیم برپا ہوا [illegible] حریت نے فتح پائی اور ۱۸۵۷ء کے صرف ۹۰ برس بعد اور غالب کے انتقال کے ۷۸ برس بعد یہ ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔

حواشی

1. غالب بنام انور الدولہ شفق، اگست تا نومبر۔ ۱۸۵۸ء
2. غالب بنام یوسف میرزا، جون، جولائی۔ ۱۸۵۹ء
3. شور Notes صفحہ ۱۶۶
4. کارل مارکس (مقالہ بے دستخط) ۴ر اگست ۱۸۵۷ء نیویارک ڈیلی ٹریبیون۔
5. اس سلسلہ میں ہندوستانیوں اور برطانوی مصنفین کی کئی کتابیں جن سے تفصیلی معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ خصوصیت سے
   (الف) پنڈت سندر لال۔ سنہ اٹھارہ سو ستاون
   (ب) Charles Bull- History of the Indian Mutiny خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔
6. Stratchy's letter to secratary of state qouted from Dr. N.L. Gupta - Nehru and Communalism
7. اس سلسلہ میں مزید تفصیل کے لئے اودھ کی تاریخ اور بیگم حضرت محل کے فرمانوں سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔
8. مولانا امتیاز علی خاں عرشی، مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتویٰ 'جہاد' تحریک' دہلی۔ اگست ۱۹۵۷ء
   مالک رام، مولانا فضل حق خیر آبادی، تحریک، دہلی۔ جون ۱۹۶۰ء
9. کالی داس گپتا رضا۔ غالبیات، چند عنوانات۔ صفحہ ۱۱۴
10. کالی داس گپتا رضا، غالبیات۔ چند عنوانات، صفحہ ۱۱۱
11. سید احمد شہید کے نسب اور اعتقاد و معمول کے متعلق مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔
12. مولانا عبید اللہ سندھی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ صفحہ ۱۵۹۔ ۱۶۲
13. مولانا فضل حق خیر آبادی کا شجرہ نسب ۳۳ واسطوں سے خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق تک پہنچتا ہے۔ آپ کے جد جو ایران سے ہندوستان آئے وہ دو حقیقی بھائی تھے۔ ایک کا نام شیخ بہاء الدین تھا جو قبۃ الاسلام، بدایوں کے مفتی ہوئے اور دوسرے کا نام شیخ شمس الدین تھا جنہوں نے مسند افتاء تک سنبھالی۔ شیخ بہاء الدین کی اولاد مولانا فضل حق ہیں اور شیخ شمس الدین کی اولاد میں شاہ ولی اللہ دہلوی۔
14. خواجہ الطاف حسین حالی۔ یادگار غالب، صفحہ ۹۱-۹۰

ڈاکٹر [illegible]

معیشت وعلامت کا ادبی شعور

اگر میں یہ کہوں کہ علامت تخلیق میں ہے، زبان میں نہیں ہے تو شاید کچھ عجیب لگے مگر سچائی یہی ہے کہ ہوا میں نمی اور حرارت کی طرح علامتیں جدلیاتی شعور و عمل کے ذریعہ قوت وارادہ کی تفتیشی پابندیوں سے گزر کر اور کبھی انفرادی لاشعور کے تیز بہاؤ میں بن بلائے مہمان کی طرح تحریر میں در آتی ہیں۔ مگر لفظیات زبان میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ لفظوں کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے، آواز، آہنگ اور مشاہدہ ہوتا ہے۔ ہزاروں سال قبل زبان کی تعمیر — تمدن انسانیت کا اتنا زبردست کارنامہ ہے جس کی کوئی نظیر سائنسی تحقیق کے یہاں بھی نہیں ہے۔ خیال، احساس، ادراک اور جذبات صوتیاتی آہنگ رکھتے ہیں۔ اس لئے اپنی کیفیت و تاثرات تصوراتی شکلوں میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر انہیں تہذیب و تمدن کے کسی شعبہ اظہار وبیان میں رائج کردیا جاتا ہے۔

انسان اپنے تجربات محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اشارہ، کنایہ سے بہتر ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ جو اپنے مزاج، ماحول اور معاشرتی تجربات ومشاہدات کا شعور عکسی ہوتا ہے جس کا تعلق قوم، نسل، ذات، برادری اور اجتماعی ضرورت نفسیات سے ہے۔ توہمات اور خوف انسان کو کسی ایسی غیبی طاقت کی طرف رجوع کرنے کے لئے مجبور کرتے ہیں، جو انسانی نظروں سے اوجھل اور تمام عالم کی نگراں اور محافظ ہے۔ وہ اسے کبھی نور کی شکل میں دیکھتا ہے اور کبھی مجسماتی شعور میں اس کے وجود کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی احساسی قوت اسے آوازوں کی پہچان کراتی ہے اور حرف وصوت الفاظ کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

انسان جب لکھنے کے فن سے ناواقف تھا۔ تب اس نے غاروں میں اور چٹانوں پر ایسے نشانات بنائے جن سے اسے واقفیت تھی۔ پرندے، جانور، آفتاب، چاند، ستارے، پیڑ، پودے، انسانی چہرے، اوزار، انگلیوں کی چھاپ وغیرہ۔ کسی نے غیر مادی اور ماورائی قوتوں کو مرتسم کرنے کی رسم ایجاد کی اور خیالی دیوی، دیوتاؤں کے پیکر تراش لئے۔ کسی نے ڈر اور خوف کو بدہیئت شکل میں پیش کیا۔ بعض لوگوں نے انسانی جسم پر عقاب اور دیگر پرندوں کے چہرے لگا کر اپنے خوف واظہار کی انفرادیت قائم کی۔ دراصل جستجو اور تلاش انسانی فطرت ہے۔ بچے آج بھی ریت کے گھروندے بناتے ہیں، سیپیاں اور رنگین پتھر جمع کرتے ہیں۔ دیواروں پر لکیریں کھینچتے ہیں۔ یہ وہ فطری قوت انسانی ہے جو روز اول سے قائم ودائم ہے۔ لیکن جس طرح پانی آکسیجن اور ہائڈروجن گیس کا مرکب ہے مگر پانی کا مرکب تیار ہوتے ہی اس کی ایک مخصوص فطرت قائم ہو جاتی ہے جس کا ہواؤں سے کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا۔ علامتیں زندگی کی ابتدائی مرحلے میں انجانی کیفیات شعور وعمل کو اظہار کی طرف مائل تو ضرور کرتی ہیں مگر بیان میں آتے ہی ان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے صبح کاذب کی دھند آفتاب کی روشنی میں اپنا وجود گنوا بیٹھتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عوام کو اللہ کی بھیڑوں سے تشبیہ دی ہے۔ 'بھیڑ' اپنے گلہ بان کے حکم پر چلتی ہے۔ سیدھی، سادی اور معصوم ہوتی ہے۔ جسے ہر وقت موذی جانوروں کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ لہٰذا اس کی حفاظت کے لئے کتوں کو ٹرینڈ کیا جاتا ہے، جو اسے جھنڈ سے بچھڑنے نہیں دیتے اور اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔ 'بھیڑ' کو اگر علامت سمجھ لیا جائے تو اس کی اہمیت محض ایک جانور سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ عقل کی روشنی میں کتے کی طرح بھیڑ بھی ایک جانور ہی ہے۔ لیکن 'بھیڑ' کی نرم خوئی اور سادگی کا جذبہ فوت ہو جاتا ہے۔ کتا ایک نیم وحشی جانور ہے مگر اس طرح ٹرینڈ کیا گیا ہے کہ اس کی وحشیانہ جبلت بھیڑوں کی حفاظت میں کام آتی ہے۔ کتا، تمدنی زندگی کی علامت ہو سکتا ہے، کیونکہ اسے بھیڑ کی حفاظت کے لئے ٹرینڈ کیا گیا ہے۔ لیکن وہ کتے جو ٹرینڈ نہیں ہیں ان کی وحشیانہ جبلت بھیڑوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ بھیڑ آزاد ہے مگر تمدنی دائروں کے اندر۔ افلاطون نے 'ریاست' (Republic) میں Watch dog کی اصطلاح کو 'تمدنی' معنوں میں ہی اختیار کیا ہے۔ 'کتے' کی خصوصیت ہے کہ مالک کا وفادار ہوتا ہے اور دشمنوں کو اپنا شکار بناتا ہے۔ متمدن زندگی انسان کی دشمن تو نہیں ہے مگر وہ اپنے مالک کی وفاداری میں دیگر اقوام کی کمزور بھیڑوں کو بھی اپنے گلہ میں سمیٹ لاتی ہے۔ قانون قدرت ہے کہ موزوں اور متناسب قوتیں خواہ Evil Forces ہی کیوں نہ ہوں کامیاب ہوتی ہیں۔ انتشار وخلفشار، افراط وتفریط سے فکری توازن واعتدال ختم ہو جاتا ہے اور عمدہ سے عمدہ نظریات فکر وعمل ضائع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ دلیل، جواز نہیں ہوتی مگر تمدنی زندگی کے استحکام کے لئے جواز کو پیدا کرنا پڑتا ہے۔ یقین، اعتبار، امید، حوصلہ اور کامیابی کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے ورنہ معاشرتی خلل اور بدنظمی پیدا

★★ نیا محلہ، مرزا غالب مارگ، جبل پور۔ ۴۸۲۰۰۲

ہو جاتی ہے اور زندگی کی ظاہری صورتیں بدہیئت و بدمزاج شکلوں میں رائج ہو کر رنج و غم کا باعث ہوتی ہیں۔ مگر یہ تکمیل تصورات کا ہے، جو کسی کے لئے راحت اور کسی کے لئے دکھ کی فصل تیار کرتے ہیں۔

علامت اپنے متعین کردہ بیانیہ میں ہی بامعنی ہو سکتی ہے۔ لیکن اپنے حیطۂ اظہار کے باہر ترسیل کے سقم کا شکار ہو کر بے معنی ہو جاتی ہے۔ دوستی، وفا، عشق، محبت، ایثار، خلوص، قناعت، انسیت، خیر سگالی، امید، آرزو، رحم دلی، جوش، سادگی، سچائی، ولولہ، امنگ، صبر، ارادہ، حوصلہ یہ سبھی خدمات انسانی ---- خواہشات نفسی کی پیداوار نہیں ہیں مگر جب انہیں اناتی قوتوں کے زیر اثر بیان میں شامل کیا جاتا ہے تو الفاظ کی معنویت مدھم پڑ جاتی ہے اور ترسیل کا سقم ابھرنے لگتا ہے۔ الفاظ اپنی تاریخ کے گواہ ہوتے ہیں اور ان کی گواہی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ مثلاً سائکی (Psyche) کا تعلق روحانیات سے ہے لیکن آج اسے Science of the mind کے معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ تاریخ لفظوں کا استعمال اور مفاہیم کو بدل سکتی ہے مگر ان کی بنیادوں کو اکھاڑنے میں ناکام ہے۔ سبب یہ کہ الفاظ اظہار و بیان کی تبدیلی کو صرف ظاہری حد تک ہی گوارا کرتے ہیں اور اپنی پہچان کے ساتھ زندہ رہتے اور مرتے ہیں۔ دنیا کی بعض بہت عمدہ زبانیں محض اس لئے ختم ہو گئیں کہ لفظوں نے بیانیہ کے ساتھ مفاہمت سے انکار کر دیا تھا۔ مغربی تاریخیت کا میکنائزڈ (Machinised) فلسفہ نقد و نظر دراصل اپنے وقت اور حالات کی پیداوار ہے۔ عقلیت پرستی نے جذبوں کی حلاوت، کیف و مستی کو جنسیت زدگی اور کیف آور مشروبات کے ذریعہ حاصل کر لیا ہے۔ اب کوئی عورت معشوق نہیں اور کوئی مرد عاشق نہیں۔ ہاں رفاقت و محبت اور جذباتی رشتے دنیا کے بازار میں برائے فروخت موجود ہیں۔ انسان زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کے لئے تجارت و معیشت کی نت نئی تھیوریز (Theories) وضع کرتا ہے۔ جذبوں کی اہمیت اور ان کی قدر و قیمت تجارتی شعور میں مضمر ہے۔ جب انسان شعور و لاشعور کی گہرائیوں میں اتر کر تجارت نامی طوطے کی گردن مروڑے گا تب ہی جذبہ کو عقل و خرد کی قید سے آزادی نصیب ہو گی۔ علائم عقلیت کا وہ موثر ہتھیار ہیں جنہیں جذبات انسانی کے بیان میں زبان کی متحرک قوتوں کا بدل بنا کر پیش کیا جاتا ہے مگر زبان اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ مصنوعی پھول اور انگور کے دانے جس طرح ڈرائنگ روم کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ علامتیں یہی فریضہ اسلوب و بیان کی آرائش جمال میں انجام دیتی ہیں۔ جذبہ و احساس خلاقیت سے محروم ہو کر فنی پناہ گاہوں میں محصور ہو جاتے ہیں۔ جذبات عشق و محبت نفسی اضمحلال اور انتشار کی دھول میں اپنی انفرادیت و افادیت کھو دیتے ہیں۔ بیان جاری رہتا ہے مگر بجز احساس انانیت کے کوئی جذبہ سالم نہیں رہتا۔

زبان و بیان کے مروجہ اصول و نظریات علامیاتی تفہیم کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ سبب یہ کہ استعارہ، کنایہ، مجاز و حقیقت اور اصطلاحی نظم بیان کی اپنی اپنی ذمہ داریاں مخصوص ہیں۔ ان کا اپنا ایک وژن ہے۔ جس کا دائرہ عمل ہزاروں سال کی محنت و ریاضت پر محیط ہے۔ سیکڑوں تہذیبوں نے لفظ و بیان کے معنی و مفہوم متعین کئے ہیں۔ جذبات کو تخلیقی قوت و توانائی عطا کی ہے۔ خوف و انبساط کی حدیں مقرر کی ہیں۔ کردار کے اوصاف اور معیار صداقت و جمال مرتب کیا ہے۔ رشتوں کی تقدیس و توقیر کے لئے سماجی ضابطوں کو قلم و کردار کے ذریعہ تقویت دی ہے وہ کسی [illegible] بھلا کیوں کر دے سکتی ہیں کہ وہ ان کے صدیوں کے تجربات [illegible] کر سکے۔ ابہام و انتشار زبان و بیان کی خصوصیت نہیں۔ یہ [illegible] افکار و نظریات میں ہے۔ لفظ آئینہ ہے صورت نہیں۔ جب [illegible] پیراہن اظہار اختیار کرتی ہیں معنی و مفہوم متزلزل ہو جاتا ہے۔ [illegible] ہے۔ تحریر سے توقیر خیال، صفائی اور سادگی مفقود ہو جاتی ہے [illegible] گیاہ صحرا کی مانند دکھ اگتا ہے۔ دھوپ، ریت، پتھر۔ [illegible] بیان کے لئے کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔ شخصیت و کردار کی بجائے تصورات [illegible] سامانیاں پیش کرتے ہیں۔ ماضی حال بن جاتا ہے اور مستقبل [illegible]۔

فلسفہ عقلی لسانیاتی تہذیب و تمدن کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ سبب یہ کہ کائنات محض ایک دماغ نہیں، بلکہ دماغ کائنات کا ایک جزو ہے۔ جام جمشید کی طرح اس کی افادیت مسلم ہے۔ مگر تاریخ کے کسی دور میں کوئی بھی فلسفہ قائم و دائم نہیں رہا [illegible] کی لامحدودیت بھی زبان و بیان کی قوت و اظہار کی محکوم ہے۔ ورنہ سب کچھ تاریخ کے کسی صفحہ پر محفوظ رہ جاتا ہے۔ یا پھر کسی بے جان مجسمہ کی طرح [illegible] کی سزا کاٹتا ہے۔ انسان پھر کوئی نیا قالب تراش لیتا ہے۔ [illegible] دئے جاتے ہیں۔ فن ---- فلسفہ نہیں جذبات و تصورات [illegible] جذبات و تصورات کی حدیں متعین نہیں ہیں اس لئے فن بھی لامحدود ہے۔ فلسفہ عقل کی روشنی میں آگے بڑھتا ہے اور عصبیت قلب و [illegible] کی قیدی [illegible] اپنے دبستانوں کی تعمیر میں لگا دیتا ہے۔ جذباتی بیانیہ اس کے [illegible] کرتا ہے مگر عقل اسے علامیاتی پیکروں میں محبوس کر کے اس کی احتیاجی قوتوں کو شعور و لاشعور کی تشریحات میں صرف کرتی ہے۔ عقل نہیں جانتی کہ حقیقت کیا ہے مگر [illegible] قوتوں کا علم ہے۔ عقل کو یہ بھی نہیں معلوم کہ عالم موجودات کے باہر بھی کوئی دنیا ہے۔ مگر جذبات یہ کہتے ہیں کہ 'ہے'۔ ہونے نہ ہونے کے اسی عمل پر ہی کائنات اور انسان کی ارتقائی قوتوں کا انحصار ہے۔ ہونے کا عمل [illegible] بھی ہے [illegible] نہ ہونے کا عمل تیز رو اور پر شور ہے۔ عقل کہتی ہے کہ ہونے کی قوت ظاہر میں ہے۔ مگر جذبہ یہ سمجھتا ہے کہ ہونے کی طاقت باطن میں ہے۔ عقل کی نظر میں ظاہر ایک دماغ ہے، جذبہ کی نگاہ میں باطن ایک دل ہے۔ جذبہ اپنے تصورات عشق کے ذریعہ انسان کو آسمانوں میں لئے پھرتا ہے۔ مگر عقل اسے [illegible] کو لپیٹ کر مریخ تک لے جاتی ہے۔ کچھ لوگ دل سے سوچتے ہیں [illegible] جس کی اپنی اپنی قوت بیانی ہے۔ مگر دونوں کے [illegible] ہیں۔ لہٰذا کبھی کبھی تمثیل، استعارہ، کنایہ، اشارہ اور نشان پر علامتوں کا [illegible] اتنی قوت نہیں کہ اپنے لئے کوئی زبان تخلیق کر سکے۔ [illegible] و مفہوم بدل کر اور کبھی دلیل عقل کے سہارے [illegible] اپنے اظہار و بیان میں استعمال کرتا ہے۔

زبان کو 'خدا' اور 'علامت' [illegible] باتیں ایک [illegible] جائے گی۔ لیکن [illegible] وہ لفظ خدا کو 'اللہ' کے معنوں میں [illegible]

[illegible] جبار، قہار، غفار، ستار، مجیب، نجیب، رقیب، علیم، حلیم، [illegible] کے سوا تمام ایسے مختص کئے گئے ہیں جن سے اس کی صفات خداوندی [illegible] جو کسی بھی صورت، زبان کا وصف نہیں ہو سکتی۔ دراصل فتح ایران کے بعد [illegible] تصورات لفظیات نے مفاہیم کا ایک مخصوص قالب اختیار کر لیا تھا۔ [illegible] کو ایک نئے روپ میں دیکھا گیا تھا۔ بڑی عجیب بات ہے فتح ایران کے بعد [illegible] عقل پرستی کا دور شروع ہوا اور ان کی تمام عزت خاک میں مل گئی۔ فتح ایران کے بعد اسلامیوں میں عجمی تصوف نے زور پکڑا تھا۔ اس لئے میں سوچتا ہوں کہ عقل پرستی اور عجمی تصورات کے درمیان کوئی رشتہ باطنی ضرور ہے جس کا تعلق فلسفہ ایران کے نقطہ نظر سے ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے: "تاریخ سے رشتہ استوار کئے بغیر خوبصورت علامتوں کا ذخیرہ ہاتھ نہیں آتا۔" مگر ان علامتوں کا تعلق دور حاضر کے صنعتی شعور کے پیدا کردہ تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ انسان مختلف حالات اور مسائل کے درمیان نظریاتی توجیہات بدل کر بھی زندہ رہتا ہے۔ سری لنکا، سنگاپور اور جاپان کے بودھ مچھلی کو ایک غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں جب کہ ہندوستان میں اسے معیوب سمجھا جاتا ہے۔ عصری علامتیں اس جغرافیائی تفریق سے یکسر ناواقف ہیں۔ ان کی ایمائیت ناقابل یقین حد تک جامد ہوتی ہے۔ اس کی وجہ موجودہ صنعتی اور میکانکی تصور زندگی ہے۔ جس طرح مشین انسان کے مقابلے زیادہ پائیدار اور متحرک ہوتی ہے، صنعتی معاشرہ کا پروردہ ذہن بھی زیادہ عقل پرست ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامتیں جذبات انسانی کی حلاوت اور نرمی سے ناواقف ہوتی ہیں۔ ان میں جذبہ کی تراش خراش کی قوت استدلال تو ضرور ہوتی ہے مگر جذبہ کی تاثیر اور گہرائی نہیں ہوتی۔ جنسی خواہشات اور نفسی ضرورتوں کا تعلق چونکہ ذہن انسانی سے ہے لہٰذا شعور عقلی، تصورات فکر وفن کے ذریعہ جسمانی لذتوں کے حصول کی راہ ہموار کرتے ہیں۔

فلسفی زبان کی تخلیق نہیں کرتا بلکہ زبان پر اپنا تصرف قائم کرنے کے لئے اسلوب وبیان پیدا کرتا ہے اور انہی رجحانات فکر وعمل کو تعبیر وتشریح عطا کرتا ہے جو اقتدار زندگی کے لئے لازمی ہیں۔ اسپارٹا کی لڑائیوں میں یونانیوں کی معاشرتی قوت حیات بکھر گئی تھی۔ اس وقت فیثا غورث (Pythagorus) نے وحدت میں کثرت کا نظریہ پیش کیا اور بتایا کہ سماجی وحدت صرف اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے جب کہ مملکت مضبوط اور پائیدار ہو۔ اس نے ایک عدد کو مملکت کی علامت میں پیش کیا اور معاشرتی مثلیت کے تین درجات مقرر کئے۔ ایک وہ جو عقل کو رہبر سمجھتے ہیں دوسرا وہ طبقہ اشرافیہ جسے شہریت کے حقوق حاصل ہیں اور تیسرے وہ لوگ جو سرمایہ کے حصول میں مصروف کار ہوتے ہیں اور جن کی زندگی بااقتدار طبقات کے رحم وکرم پر ہوتی ہے۔ فیثا غورث ہی نہیں جملہ فلسفیوں کے یہاں جذبات انسانی کی سمجھ کا فقدان ہے۔ سب کے سب محض عقل کی پیدا کردہ خیالی دنیاؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں اخلاقی ضابطے مملکت کو تقویت ضرور دیتے ہیں مگر انسانی سرشت کے جذباتی پہلوؤں پر [illegible] مقرر ہے۔ شاید اس کی نفسیاتی وجہ یہی ہو کہ وہ دنیا کے [illegible] کی طرح خیال کرتے ہیں۔ [illegible] انسان کے لئے احتساب عمل اور [illegible] ضروری خیال نہیں کرتے۔ [illegible] کا نتیجہ ہے کہ آج

انسان جذباتی رشتوں کا ناقد ہو گیا۔ خواہشاتی دنیا میں آزادی کے مادی تصورات نے اس کی اجتماعی قوتوں کو قومی اور ذاتی مفاد تک محدود کر دیا ہے۔ عقل کی روشنی میں جذبات انسانی کا آفاقی تصور حیات خواہشات نفسی کا ترجمان سمجھ لیا گیا۔ عینیت پسندی اور عقل پرستی کے امتزاج نے کائنات اور انسان کے درمیان رشتوں کی ایک نئی توجیہہ پیش کی تھی، جس نے انسانی فکر وفہم کا نظریہ زندگی ہی تبدیل کر دیا۔ پردہ مجاز کا بیان مادیاتی حقیقتوں کی تفہیم کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جو کچھ آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہی سچ تھا۔ جو جذبہ پردہ راز میں مستور ہے وہ انسانی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ عشق میں آگ کے دریا سے گزر جانے کی بجائے تسکین نفسی کے سامان فراہم کر دیئے گئے۔ ہجر ووصال کے تصورات پر زندگی کی مادی حقیقتیں حاوی ہو گئیں۔ مادی علوم کی بصیرت نے عوامی ذہنوں کے دروازے کھول دیئے۔ سریت پسندی، تجسس اور جستجو کو دل کے آئینہ میں جھانکنے کی بجائے اشیا کی ماہیت وحقیقت کی تلاش میں لگا دیا گیا۔ جذباتی صداقتوں کو مادی ضرورتوں اور خواہشات عوامی کے عصری فن وفلسفہ سے مقابلہ کرنا تھا۔ جسے جمہوری سیاست، نفسی اور سائنس وٹکنالوجی کی حمایت حاصل تھی جس کے آگے مشرقی روحانیت کا پیدا کردہ شعور فن پارہ پارہ ہو گیا۔

عصانہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

زمام عقل وخرد دانشوروں، فلسفیوں اور سائنسدانوں کے ہاتھوں میں آتے ہی فن وفلسفہ کا معیار ومزاج بھی تبدیل ہو گیا۔ نظریات زندگی کی تبدیلی نے خیال، تصور اور زبان کے اصطلاحی نظم کو متاثر کیا تھا۔ زندگی کھیت، کھلیانوں سے اٹھ کر کل کارخانوں اور تجربہ گاہوں میں منتقل ہو گئی تھی۔ مشرق کو مغربی تجربات عقلی سے مستفیض ہونے کا موقع ملا اور انہیں احساس ہوا عوامی احساسات اور معاشرتی ضرورتوں کو ادب کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی میں ادب وفن ایک نئی زبان کے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ یہ زبان نسبتاً عام فہم، صاف اور سادہ تھی۔ اس کے موضوعات عوامی جذبات اور آرزوؤں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ لیکن تخلیقی سفر میں زبان وبیان کی قدیم روایتوں سے دامن بچانا فنکار کے لئے ممکن نہ تھا۔ یہ روایتیں اصطلاحوں کی شکل میں ادب میں صدیوں سے جاری وساری ہیں۔ اصطلاحیں، اشارے، کنایوں میں اپنا مفہوم واضح کرتی ہیں۔ یہ مفہوم قاری کے لاشعور میں پہلے سے محفوظ ہوتا ہے۔ جب کبھی نظام زندگی میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور معاشرتی قدریں وسعت اختیار کرتی ہیں یا پھر سماجی انحطاط انسانی شعور وادراک پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس وقت فنکار کا تخلیقی ذہن، بدلتی ہوئی قدروں کو اظہار وبیان کی سطح پر قبول کرتا ہے اور انہیں مخصوص پہچان دینے کی خاطر توجیہہ وتشریحات کے نئے حاشیے لگاتا ہے، جس سے اصطلاحی اسلوب میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ فنکار کے اس عمل میں زبان وبیان کا مخصوص اسٹرکچر متاثر ہوتا ہے۔

اصطلاحیں اردو ادب کا قدیم ورثہ ہیں۔ جن سے فنکار کی گہری بصیرت اور جذبے کا فطری جوش نمایاں ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں سب سے مقبول صنف سخن 'غزل' صدیوں کا سفر طے کر چکی ہے۔ جس میں سیکڑوں اصطلاحیں اپنے ایک خاص مفہوم میں جاری ہیں۔ اصطلاحوں کی اختراع سازی کوئی آسان کام نہ تھا۔ سیکڑوں [illegible] ذہنوں نے [illegible] طور پر انہیں تشکیل دیا تھا۔ اس عمل میں فنکار کا معاشرتی شعور بھی

کار فرما تھا۔ ایک مکمل اصطلاح معاشرتی شعور کا صحیح ادراک چاہتی ہے۔ جس میں عوامی رجحانات کے علاوہ ادبی ورثہ سے فنکار کی گہری واقفیت ضروری ہے تاکہ عوام اور ادب کے درمیان اظہار و ابلاغ کا وسیلہ قائم رہے۔ اصطلاح جس قدر واضح ہوگی کنایہ بھی بھرپور ہوگا، اور اگر کمزور ہو تو ابہام پیدا ہو جاتا ہے جس سے خیال اور مقصد فوت ہو جاتے ہیں۔ یہی مفروضہ تشبیہہ، استعارہ اور علامت پر بھی عائد ہوتا ہے۔ چونکہ اصطلاحیں نسل در نسل منتقل ہوتی چلی آتی ہیں اس لئے ان کے مضمون اور مفہوم مخصوص ہو جاتے ہیں۔ لیکن فنکار کا خلاق ذہن مضمون اور طرز بیان بدل کر اصطلاحوں کی معنویت میں تفریق قائم کر دیتا ہے۔ جس سے بیان میں ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ علامتیں ان خوبیوں سے معمور نہیں ہو سکتیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ (۱) زبان کے اصطلاحی نظم کو مشرق میں حکماء، علماء اور اتقاء نے استوار کیا تھا۔ ان کا کردار اور مقصد معاشرتی نظم اخلاق کو قائم کرتا تھا (۲) زبان و ادب کا مزاج خواہشاتی نہیں تھا (۳) اللہ کی خوشنودی اور دنیائے آخرت کا خیال ان کے پیش نظر تھا۔ (۴) بے لوث خدمت ان کا شعار تھا (۵) ان کا علم و عمل، بصیرت و وجدان تاجرانہ شعور فن سے نا آشنا تھا (۶) ان کا ذہن و کردار مادی کثافتوں سے پاک و صاف تھا (۷) خدمت خلق، عبادت و ریاضت سے وہ تزکیہ نفس حاصل کرتے تھے اور اجر و ثواب پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ (۸) دنیا کی محبت کو وہ لائق اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔ (۹) تالیف قلب و نظر کے لئے انہوں نے جس ادب کی تخلیق کی تھی اس کی افادیت مسلم ہے۔

علامتی اظہار و بیان کو ایک ایسی Consumer Society کی ضرورت تھی جو نفس انسانی کی ضرورتوں اور خواہشات کو تقویت دے سکے۔ سرمایہ داری کے جدید تصور زندگی نے یہ مشکل آسان کر دی۔ ملازمت پیشہ افراد اپنی جمع پونجی اور تنخواہوں کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ سونے، چاندی کے سکے موقوف ہوئے اور ان کی جگہ لوہا، تانبا، پیتل اور کاغذی سکے جاری کئے گئے۔ شہری آبادی مختلف ملازمتوں اور کاروبار کے لئے وقف تھی۔ ان کے پاس اشیائے ضروری کی پیداوار کے لئے فرصت نہ تھی۔ دور دراز علاقوں سے لایا گیا سامان تجارت فروخت کیا جا رہا تھا۔ روپیہ کے لین دین نے بینک اور تجارت کے معاشی اصول و ضوابط مقرر کئے اور ایک اچھے شہری کو ان نئے ضابطوں کے متعلق واقفیت ضروری تھی۔ رفتہ رفتہ معاشرتی زندگی کا سارا نظم حسابی ہو گیا۔ روپیہ، پیسہ، سونا، چاندی کی علامت بن چکا تھا۔ یہ ایک نیا شعور تمدن تھا۔ جس نے ذہن انسانی کو ایک نئی معاشرتی تشکیل کی دعوت دی تھی۔ اس نئے معاشرہ کا پروردہ دانشور، فلسفی اور فنکار اپنا ایک مخصوص ذہن رکھتا تھا۔ اسے عوامی ضرورتوں کے مشترکہ شعور کو زبان عطا کرنا تھی مگر زبان کا اصطلاحی نظم قدما کے اسلوب و بیان سے بندھا ہوا تھا۔ جدید ذہن زبان و بیان کے لئے نئے الفاظ اور اصطلاحیں وضع کرنے سے قاصر تھا Consumer society (صارفی سماج) کے تصور نے اسے یہ موقع بھی فراہم کر دیا۔

تمام دنیا آج ایک بازار میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اشیا اور جذبات دام دے کر خریدے جا سکتے ہیں۔ مگر بازار کا تمام کاروبار نقلی ہے۔ اشیا موجود نہیں اور خریدار بھی ندارد۔ فون پر آرڈر دیا جاتا ہے۔ مال گودام میں پڑا ہے۔ انٹرنیٹ پر آدمی غائب مگر پیغام حاضر ہے۔ فون علامت ہے آواز کی، آواز علامت ہے انسان کی۔ انٹرنیٹ تحریری پیغام کی علامت ہے۔ اشیا کی علامت ڈیمانڈ ہے۔ گویا خود سے جدا ہو کر انسان جب اپنے وجود کو کسی میکانکی طرز حیات میں منتقل کرتا ہے تو اس کا یہ عمل [illegible] علامتی زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ انسان سوچتا ہے کہ وہ سفر [illegible] سفر کی منزلیں ہوائی جہاز طے کر رہا ہے۔ 'آگ کا دریا' میں تمام [illegible] سفر میں شریک ہیں۔ حالانکہ ان کا معاشرتی وجود تمام ہو چکا ہے [illegible] طور پر مصنف کے زور بیان، مشاہدہ اور تخلیقی جوش میں نہاں ہے۔ [illegible] شخصیت بھی نہیں ہے۔ وہ وہی کرتے ہیں جو ان سے کہا جاتا ہے۔ [illegible] غلامی ان میں فیڈ کر دی گئی ہے۔ مصنف کے اس تخلیقی عمل کو ایک [illegible] کہا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس 'گئودان' کا کوئی کردار مردہ اور بے جان نہیں ہے وہ اپنی فطرت پر قائم ہے۔ اس لئے جب بھی موقع ملتا ہے کردار کی انا اور شخصیت ابھر آتی ہے۔ سائنسی تحقیق کے مطابق یہ دنیا اپنی ابتدا میں ایک آگ کا دریا تھی۔ اس قیاس کو حسن ظن اور تخمین کی ضرورت ہے۔ مگر 'گئودان' آج بھی دیا جاتا ہے۔ اس عمل کو کسی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' ارنسٹ ہمنگوے کے ناول یا ناولٹ The old man and the sea سے زیادہ تخلیقی ہے۔ رانو جیسی بھابی اور منگل جیسا دیور ـــ زندگی کے ایک خاص موڑ پر مردوزن کے فطری رشتوں میں معاشرتی طور پر منسلک ہو کر ہی زندگی کی تجدید تو کرتے ہیں۔ ہمنگوے کا بوڑھا صنعتی معاشرتی زندگی کی علامت ہے، جہاں جذبہ تو ہوتا ہے مگر رشتے نہیں ہوتے۔ رشتوں کا نہ ہونا ہی اس کی کرب تنہائی کا سبب ہے۔ مصنف، معاشرہ اور کردار ہی تخلیقیت کا مزاج متعین کرتے ہیں۔ کردار نہ ہو تو نرگسیت یا اسلوب تانیثیت کو کردار کا متبادل بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے جس سے زبان کی اجتماعی قوتیں کمزور ہوتی ہیں اور اصطلاحی نظم زبان میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔

بازار کی بولی اور زبان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ Stock Market کے بروکر کی طرح فنکار اپنی زبان و بیان میں اسی لب و لہجہ کو شامل کرنے کے لئے مجبور ہے جو اس کی تخلیق کو جدید میکانکی طرز زندگی، فکر و شعور سے ہم آہنگ رکھ سکے۔ ورنہ تخلیقی قدر و قیمت اور افادیت قائم نہ رہ سکے گی۔ تخلیقی انفرادیت اور ادبی شعور و عمل بے معنی ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ ایک ایسی زبان کو بروئے کار لاتا ہے جو اس کی ذاتی انفرادیت کی ترجمان بھی ہو اور اس کی فنی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ ایسی صورت میں اسے لفظوں کی ساخت کو ان کی اصل سے جدا کرنا ہوتا ہے اور یہ ایسی وقت ممکن ہے جب کہ اسے واقعہ نگاری کا کوئی ایسا گوشہ ہاتھ آ جائے جو مروجہ حقیقت نگاری سے واصل ہو یا اس سے قریب تر ہو۔ وہ اپنی ذہنی قوت اور فراست کو اپنے مزاج و کردار کی قوتوں سے آراستہ کر کے زبان و بیان کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جس میں اس کے شخصی تجربات اور مشاہدے کی آویزش لفظوں کے مفاہیم کو جب نئی صورت میں منتقل کرتی ہے اسے علامیاتی تفہیم کہنا مناسب ہوگا۔ مثلاً انتظار حسین کا ناول 'بستی' کے کردار اپنے ماضی کو زندہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ وقت کو واپس پھیرنا کسی قوم، کسی تہذیب اور انسان کے بس میں نہیں ہے۔ وہ زندہ ہیں مگر بے جان علامتوں کی صورت اور علامت کبھی متحرک نہیں ہوتی، جامد ہوتی ہے۔ مردہ یا نیم مردہ۔ اس لئے اس میں فن کا بوجھ اٹھانے کی سکت بھی نہیں ہوتی۔ مصنف لاشعوری طور پر اس حقیقت سے واقف ہے۔ لہٰذا قصہ کہانی بیان کرنے

...بیان میں شامل کر کے واقعہ اور کردار کو زندہ کرنے کی کوشش کرتا ہے... لوگ اسے کہانی کا نیا فن سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں کیونکہ عقل انسانی کو ہر دم کسی نئے تجربے کی تلاش ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے شعور عقلی کو تنگ و تازہ دے سکے۔ ...محبت اور فرحت بخش توانائیوں سے محروم ہوتی ہیں۔

...دواؤں کی طرح فلسفہ نفسیات نے علم ریاضی کے ساتھ مل کر ...و معاش پر تسلط حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ آج کل ایسی تجارتی اسکیمیں تیار کی جاتی ہیں جس کا منافع ایک طے شدہ پلان کے تحت ترقی یافتہ اور ...ملک کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ نیم، ہلدی، باسمتی چاول کو پیٹنٹ قانون کے تحت رجسٹرڈ کرا لیا جاتا ہے۔ پانی کے مشروبات کروڑوں کا منافع دے جاتے ہیں۔ دریا، کھیت، کسان، ملک اور ملازم ہمارے مگر منافع کسی اور کا۔ دراصل انسان خواہشات نفسی کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔ تاجرانہ شعور حرص و ہوس کو فروغ دے کر، تسکین نفسی کے سامان بھی اپنی قیمتوں پر فروخت کرتا ہے۔ سائنسداں، دانشور اور فنکار سبھی کی قدر و قیمت کا معیار صداقت ضرورت اور ڈیمانڈ طے کرتی ہیں۔ آفتابی روشنی اور ہواؤں کے سوا کوئی شے ایسی نہیں انسان جسے مفت حاصل کر سکے۔ ماں کی محبت بھی کچے دھاگے کی طرح کمزور ہو چکی ہے۔ بچوں کی پرورش کی ذمہ داریاں ماؤں نے نرسری اداروں پر چھوڑ رکھی ہے۔ مادری زبان سکھانے کی بجائے انہیں تاجروں کی بھاشا سکھانا زیادہ سودمند لگتا ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کے ہمراہ اور ان سے قدم سے قدم ملا کر چلنا ضروری ہے۔ علم اور قابلیت کا معیار دولت اور آسائشوں بھری زندگی کی خواہش کے سوا کچھ بھی نہیں؟ شعور زندگی جب اس تیزی سے بدل رہا ہو تو ادبی شعور میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ زبان کا تمام تر تشکیلی نظام استعاراتی اسلوب پر مبنی ہے۔ اگر استعارہ پر قابو پا لیا جائے تو دیگر جزئیات زبان و بیان خود بخود اثر آفرینی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 'اشارہ' 'کنایہ' کی مدد سے علامت استعاراتی تفہیم و ایمائیت کو اپنا ہدف بناتی ہے تاکہ اپنا وجود و اختیار قائم کر سکے۔ مگر اردو زبان کا تہذیبی قاموس اس قدر پاورفل ہے کہ علامتوں کے سیاہ بادل آفتابی روشنی کو قید کرنے میں ناکام ہیں۔ اردو افسانہ آج بھی بیانیہ پر قائم ہے اور بین الاقوامی زبانوں پر سبقت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں اردو افسانہ نگاروں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ بلراج مین را اور سریندر پرکاش کے یہاں داستانوی رمزیت کے خوابناک سایہ میں افسانہ جنم لیتا ہے۔ ماضی اور حال کے درمیان پھنسا ہوا آدمی ایک عجیب ذہنی کشمکش سے دوچار ہے۔ اس آدمی کا کرب کبھی عصری تو کبھی ماضی کے جھروکوں سے جھانکتا ہے۔ ماضی اور حال کے درمیان سگریٹ، ڈرائنگ روم، کمرہ، مشین عصری زندگی کی علامت ہے۔ لیکن انسان کی محرومیاں وہی ہیں صدیوں پرانی۔ اپنی اپنی خواہشات کے جزیروں میں قید، مرد و زن، استحصال اور جبر کا شکار بے بس انسان دولت و سرمایہ کی جستجو میں ذلت و خواری سے نبرد آزما ہے۔ سریندر پرکاش کا موضوع معاشی جبر اور استحصال ہے۔ جب کہ بلراج مین را جذباتی ذہن کے ترجمان ہیں۔ موضوع کا فرق بھی علائم کے انتخاب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سلام بن رزاق کا افسانہ 'معبر' رتن سنگھ کا 'ہزاروں سال لمبی رات' انتظار حسین کا 'وہ جو کھو گئے' کے داستانوی عناصر نے کلاسک رمزیاتی ماحول کی تعمیر میں عصری شعور کو وسیلہ بنایا ہے۔

اقبال متین، اقبال مجید، رشید امجد، عبدالصمد، انور سجاد بھی داستان، کتھا کہانیوں اور حکایتوں سے موضوع اور زبان کے انتخاب میں مدد لیتے ہیں۔ افسانہ نگار کے اس عمل میں زبان و بیان کا بدلتا ہوا پس منظر پیچیدہ مگر دلچسپ ہوتا جاتا ہے۔ خاص طور پر قرۃ العین حیدر کے یہاں 'ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی'، آئینہ فروش شہر کوراں' جیسے عنوانات اپنی ہی ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں۔ 'اسعد فلورا آف جارجیا کے اعترافات' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے محسوس ہوا جیسے رائڈر ہیگرڈ کی ہیروئن 'شی' یا 'عائشہ' پھر سے زندہ ہو گئی ہے۔ انگریزی ناولوں سے پیدا شدہ شعوری علامتوں سے وہ ایک نئی دنیا تخلیق کرتی ہیں۔ ایک ایسی دنیا جس کی جڑیں ہندوستانی مٹی میں پیوست ہیں، لیکن جس کا شعور، عہد غلامی کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر ابن فرید کے افسانوں میں بھی غضب کی اشاریت ہے۔ مذہب، تاریخ، اور شعور عصر کی آویزش سے انہوں نے موضوع اور مواد کا انتخاب کیا ہے۔ 'نشانہ' ان کی تخلیقیت کا شاہکار ہے، جس میں ایک معصوم بچی زندگی کی علامت کے طور پر ابھرتی ہے اور قاری کے احساس پر چھا جاتی ہے۔ معصومیت، سادگی اور سچائی اس کے اوصاف ہیں مگر آج وہ اپنے ہی گھر میں قید ہے۔ کتے اور سپاہی اس کے دشمن---

لاشعوری علائم کا کوئی واضح تصور ابھی تک انگریزی ادب میں بھی جڑ نہیں پکڑ سکا۔ سبب یہ کہ لاشعوری نظام فکر و عمل کے چشموں کا پتہ لگانا ماہرین نفسیات کے لئے مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ لاشعور کے متعلق صرف سوچا جا سکتا ہے مگر اسے تاویلات کی زنجیروں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ لاشعوری زبان و بیان معاشرہ اور مٹی کی فطرت سے جدا نہیں ہیں۔ جو کچھ زمین پر ہے وہی سب معاشرہ اور مٹی میں ہے۔ زمین کی حدت، تپش اور دباؤ پانی کو اوپر کھینچ لاتی ہے۔ چشمہ پھوٹ کر نشیبی راستوں پر بہہ نکلتا ہے۔ یہاں مختلف زمینوں کی خصوصیات اس کے پانیوں میں تحلیل ہوتی رہتی ہے۔ زمین پر صرف ایک ہی چشمہ پانی کو دریا میں تبدیل کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ انگنت چشمے مل کر دریا کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ چشمے دائمی نہیں ہوتے اس لئے دنیا کے کسی بھی ماہر الارضیات کے لئے ممکن نہیں کہ وہ پانی کے چشموں کا شمار کر سکے، وہ صرف نشاندہی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاشعوری عمل کے متعلق بہت زیادہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں جیمس جوائس کا ناول 'یولی سس (Ulysses) بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جس میں ہیروئن ایک بار مسلسل چالیس، بیالیس صفات پر لاشعوری کوما میں رہتی ہے۔ اس کے لاشعور میں غیر واضح اور مبہم فقرے، اتنے زیادہ لفظیات علائم کہاں سے آ گئے۔ حالانکہ وہ کوئی ادب و تاریخ کی پروفیسر بھی نہیں۔ ایک عام سی عورت ہے۔ کیا جوائس ہی ملی بلوم ہے؟ اگر جوائس ہی ملی بلوم ہے، تو ملی بلوم کہاں گئی؟ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو مگر یہ طے ہے کہ جوائس کا ذہن انگریزی زبان کے جدید اصطلاحی نظام کی طرف پیش رفت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ابلاغ کا مسئلہ اس میں ذہنی بے ربطگی پیدا کرتا ہے۔ خیال درمیان ہی میں کہیں چھوٹ جاتا ہے۔ جیسے مطلع ذہن پر بجلی سی کوند جاتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ اس کے پاس داستان، حکایات و اساطیر کا وہ ذخیرہ ہی نہیں جس پر ادب کی بنیاد رکھی جا سکے۔ دراصل جوائس کے کرب کا علاج یورپ کے ڈارک ایج (Dark Edge) میں نہاں ہے۔ اس اندھے یگ میں قدم رکھنے کی جسارت کس میں ہے؟ فرائڈ کے پاس بھی نہیں۔ وہ خود بار بار عبرانی

ادب ہی کی طرف مراجعت کرتا ہے۔

معاشرتی شکست وریخت کا سلسلہ جاری ہے۔ مشرقی عوام اور فنکار اسی قدامت پسند معاشرہ کے پروردہ ہیں جہاں صدیوں پرانی طرز فکر کو بالادستی حاصل ہے۔ جب تک زبان زندہ ہے۔ وہ تہذیبی عناصر بھی زندہ رہیں گے جنہیں قدما کے تخلیقی عمل نے زبان کا جزو لاینفک بنادیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار کا انفرادی شعور اسے اجتماعی لاشعور سے علائم اخذ کرنے پر زور دیتا ہے۔ لوٹا، بدھنا، جانماز، صندوقچہ، زیورات، تلوار، تانگہ، گھوڑا وغیرہ تہذیبی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اجتماعی لاشعور کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ اندھیرا، اجالا، ریت، پتھر، چاند، سورج، دریا، صحرا وغیرہ ذاتی اور انفرادی علامتوں کے زمرے میں رکھے جائیں گے۔ مگر یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جنگل بعض جگہ سماجی جبر کے مترادف رکھا جاتا ہے اور کبھی خواہشات نفسی اور فنکار کی ذہنی تنہائی اور آوارگی کی نشاندہی کرتا ہے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ افسانوں میں تمام نفسیاتی کردار شہر کی صنعتی زندگی کے ترجمان ہوتے۔ صنعتی معاشرہ جس قدر ترقی یافتہ ہوگا، علامتی شناخت اسی قدر پیچیدہ اور دشوار ہوگی۔ مغربی معاشرہ مشرق کے مقابلے میں زیادہ میکانائز ہے، لہٰذا وہاں جذباتی علائم ایک مختلف شعوری کیفیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ ان کا تنقیدی عمل بھی مختلف ہوتا ہے۔ مشرق میں تنقیدی شعور کی عملی جستجو فرد کے احتساب عمل پر زور دیتی ہے۔ مغرب میں اجتناب عمل کا تصور ہی مفقود ہے۔ ورنہ Suppression پیدا ہو جائے گا۔ وہ صرف فرد کی جبلت کو اہمیت دیتا ہے اور جبلت کسی احتساب کی قائل نہیں۔ معاشرتی ضابطوں اور اخلاقی بندھنوں کی پابندی بھی اسے گوارا نہیں۔ وہ آزادی چاہتی ہے۔ نفسیاتی مبلغین کی نظر میں جبلی طور پر آزادی کی خواہش فکر انسانی کا محور ہے۔ اور انسان نفسی طاقت و توانائی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اسے اپنے مادی وجود پر یقین اور اعتبار ہے۔ مشرقی اخلاقیات کا سبق اس کی نفسی ضرورتوں کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ برسر اقتدار افراد اپنی اخلاقی کمزوریوں کے باوجود نیک نفس انسانوں پر سبقت رکھتے ہیں تو اس کے دل سے اپنی قدروں کا احساس جاتا رہتا ہے۔ ایسی مہیب صورت حال میں زندہ رہنے والا انسان اپنی زبان، ادب، تہذیب سے بھلا کب تک نباہ کرسکتا ہے؟ لہٰذا ریڈی میڈ خیالات اور کتابی نالج اس کی ضرورت بن گئی ہے۔ شاندار ادبی وراثت و تہذیب، رشتے اور جذبات ایک انسان کو دولت و طاقت، عزت و شہرت عطا کرنے سے معذور ہے۔ ضرورت نفسی کے ہاتھوں مجبور انسان معاشرہ میں ثروت و افتخار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کو زبان و ادب سے وابستہ کرکے دیکھنے کا رجحان عام ہے۔ مگر عوام یہ نہیں جانتے کہ میڈیائی قوتوں نے ان کے اطراف ایک ایسا تمدنی حصار قائم کردیا ہے، جہاں سے خود انہیں اپنی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ گزشتہ برس امرتیہ سین کو معاشیات کا نوبل پرائز دیا ہے۔ افریقی ممالک بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ان کی یہ تحقیق اگر درست ہے تو انگریزوں کی معصومیت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بنگال کے کھیتوں میں 'نیل' کی پیداوار کا جبریہ فیصلہ صحیح تھا اور منافع کمانے کی غرض سے نہیں کیا گیا تھا۔ تاریخ کے عمل کو طاقتور اقوام کا دانشمندانہ شعور اپنے مفاد میں پہلے بھی استعمال کرتا رہا ہے۔

انسان سائنس و ٹکنالوجی، سیاست و معیشت کے نظم شعور کو زبان و ادب کی تخلیقیت سمجھ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سائنسی علوم [illegible] ضرورتوں کے کفیل ہیں۔ فلسفہ عمرانیات و معاشیات کو [illegible] کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان علوم [illegible] ادب کا نعم البدل سمجھ لیا جائے۔ عقل کے نزدیک دل کا کام [illegible] اور دماغ ایک مقناطیسی برقی قوت ہے۔ پانی اور بجلی کی طرح دونوں [illegible] لیکن برقی توانائی پانی کی محکوم ہے، پانی برقی توانائی کا محکوم نہیں۔ [illegible] آبپاشی کے بہتر وسائل مہیا کراسکتا ہے لیکن پانی کے بغیر وہ کچھ بھی کرنے سے [illegible] ہے۔ جذبات انسانی تخلیقی قوتوں کو مہمیز کرتے ہیں۔ دماغ جذبات کو مہمیز کرنے کی قوت نہیں رکھتا، ان کے راستے ہموار کرتا ہے۔ ذہن و دل کی اس کشمکش میں جب دماغی قوتیں دل پر حاوی ہونے کی کوشش کرتی ہیں، تب انہیں جبر و اختیار سے کام لینا پڑتا ہے۔ ورنہ جذباتی بہاؤ کسی بھی خیال اور نظریے کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ علائم کا تعلق چونکہ خیال سے ہے اس لئے وہ اپنی مضبوط عقلی ایمائیت کو جذبوں کی گہرائی میں پیوست کرتے ہیں اور خیال کو استحکام دیتے ہیں۔ تصوریت، عقل پرستی اور عینیت پسندی کا تعلق جذبوں سے نہیں خیال سے ہے۔ خیال کی توجیح ممکن ہے مگر جذبات انسانی کی عقلی توجیہات ممکن نہیں۔ جو شے ظاہر و موجود ہے، بس وہی علامت ہوسکتی ہے۔ وہ جذبے جنہیں انسان نے دیوی، دیوتاؤں کی صورت میں منتقل کردیا ہے۔ انہیں خیر و شر کی علامتوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ریا، بغض و کینہ، رشک و حسد، تکبر اور غرور کی مجسم تراشی نہ ہونے کے سبب انہیں علامیاتی اسلوب و بیان میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہے۔ جنسی جبر و استحصال، ذہنی انارکیت و انتشار، خواہشات نفسی اور ضرورت کے بیان میں چٹان، پہاڑ، دریا، سمندر، جھاگ، حشرات الارض، پیڑ، مٹی، دھوپ وغیرہ کو پیش کئے جانے کا رجحان عام ہے۔ اپنی ہی ذات کا بیان بھی ادیب و شاعر کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ڈرائنگ روم میں لگے شوپیس کی طرح علامتیں اپنے وجود کا پتہ تو ضرور دیتی ہیں۔ مگر تخلیقی ذمہ داری روز اول سے بیانیہ کے کاندھوں پر ہی ہے۔

دراصل تخلیقی زبان اور فلسفہ کی بھاشا میں فرق ہوتا ہے۔ تخلیقی زبان ہوا، پانی اور روشنی کی طرح ہر انسان کا مقدر ہے۔ فلسفہ، سائنس و ٹکنالوجی کی زبان و بیان کو سمجھنا صرف سرمایہ داری کے مقدر میں ہے۔ نثر میں شاعری کا دور ختم ہوا، آج شاعری کی زبان نثری ہوگئی ہے۔ نظم کا حسن بیان پہلے نثر کی زیب و زینت تھا۔ اب نثری بیانیہ شاعری کو زیب دیتا ہے۔ مشرقی زبانوں کا قاموس شاعرانہ اصطلاحوں کی معنویت سے معمور ہے۔ مذہبی صحیفے اور ادبیات عالم کی نثری غنائیت انہیں نظم سے قریب تر لے آئی ہے۔ سیکڑوں اصطلاحیں، محاورے اور کہاوتیں اپنی فصاحت و بلاغت سے نظم زبان کو استوار کرتی ہیں۔ زبان و ادب کا کوئی محاورہ اور اصطلاح سائنس و ٹکنالوجی اور نظم معیشت کے یہاں نہیں ہے۔ لہٰذا ان علوم کا مادیاتی شعور، توازن و عمل، زبان و ادب کی جذباتی تخلیقیت کی ترسیل میں علائم کے ذریعہ اپنے وجود کا اظہار چاہتا ہے۔ کولونیل ازم کے تصور نے صدیوں پہلے ملک و معیشت کو تاراج کیا تھا اور آج زبان و ادب علامیاتی تصورات کی زد میں ہیں ـــــ اس لئے میں سوچتا ہوں، علامت کا وجود تخلیق میں ہے، زبان میں نہیں ہے ـــــ اور جو چیز زبان میں نہ ہو، اس کی ادبی حیثیت کیا؟

☆☆

ڈاکٹر

رنجیت سنگھ کے عہد کا پنجابی ادب

اس حقیقت کی تصدیق میں بہت سے ثبوت موجود ہیں کہ یکسر ان پڑھ ہونے کے باوجود مہاراجہ رنجیت سنگھ موسیقی کا دلدادہ اور شاعری کا قدردان تھا۔ اس کا ان پڑھ ہونا اس کے شوق سماعت اور پسند آئی شاعری پر انعام واکرام عطا کرنے کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ سید محمد لطیف تصدیق کرتے ہیں کہ "وہ ان پڑھ تھا۔ وہ نہ کوئی زبان پڑھ سکتا تھا، نہ لکھ سکتا تھا لیکن اس کے دل میں علم اور علما کے لئے بہت محبت اور عزت تھی[1]"۔ اس کے بعد متعدد سوانح نگاروں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار اس نے ایک مسلمان کاتب کا تیار کیا ہوا قرآن مجید کا نسخہ دس ہزار روپے میں خریدا تھا۔ اس نسخے کو تیار کرنے میں کاتب نے دس برس صرف کئے تھے۔ ہندوستان کے مسلمان نوابین سے خاطر خواہ معاوضہ حاصل نہ ہونے سے مایوس کاتب اپنی قسمت آزمانے کے لئے یہ سوچ کر لاہور چلا گیا کہ شاید مہاراجہ رنجیت سنگھ اس کی جانفشانی کی قدر کرے[2]۔

رنجیت سنگھ کی ایک دیگر سوانح میں درج ہے کہ مہاراجہ نے اس شاعر کو اچھی خاصی رقم انعام میں عطا کی تھی جس نے اپنی نظم میں مہاراجہ کی ایک ہی آنکھ کو انصاف کی ایک آنکھ سے تشبیہ دی تھی[3]۔ اسی سوانح کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جہاں ایک طرف ہندوؤں کے پرانوں، راماین، بھگوت گیتا وغیرہ کے ترجمے میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا، وہاں دوسری طرف اس نے اسلامی کتب کی ترجمہ کاری کو فروغ دینے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ اس نے مسلمان پنجابی شاعر حاشم کو جاگیر بخشی تھی اور شاہ محمد کو اعزاز عطا کیا تھا۔ مشہور پنجابی شاعر فاضل شاہ نے مہاراجہ کے ایما پر ہی قصہ سوہنی مہیوال تخلیق کر کے اسے اسٹیج پر پیش کیا تھا۔ لاہور کے شاہ حسین نے سوہنی مہیوال کے تعلق سے پچاس کے قریب قصوں کی تخلیق کا ذکر کیا ہے، جو رنجیت سنگھ کے عہد میں منظر عام پر آئے تھے[4]۔ کے کھلر کا کہنا ہے کہ اس دور کے تمام عشقیہ قصے مثلاً سوہنی مہیوال، ہیر رانجھا، مرزا صاحباں، سسی پنو وغیرہ مہاراجہ ہی کے حکم کی تعمیل میں تخلیق کئے گئے تھے[5]۔

پنجابی شاعری کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی رغبت محض تفریح طبع نہیں تھی بلکہ وہ صدق دلی کے ساتھ اپنی مادری زبان سے محبت کرتا تھا۔ ۱۸۳۰ء میں اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ کسی انگریز مشنری کو اس کے تخلیہ میں پیش کیا جائے تاکہ وہ اس سے عیسائی مذہب کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔ اس ضمن میں اس کے شوق کا عالم یہ تھا کہ اس نے مشنری سے گزارش کی وہ اس کے لئے اپنی مذہبی کتابیں دستیاب کرائے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے جون۔ سی۔ لوری سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران اس نے لوری کو سکھ ریاست میں تعلیم سے متعلق لائحہ عمل کا تفصیلی خاکہ پیش کیا اور اسے دعوت دی کہ وہ اس منصوبے کو اپنی نگرانی میں عمل پذیر کرے[6]۔

حالانکہ امریکی مشنری جون۔ سی۔ لوری "مغربی خارجہ مشنری سوسائٹی" کی طرف سے عیسائی مشن کے قیام کی غرض سے ۵ر نومبر ۱۸۳۴ء کو لاہور آیا تھا لیکن اس کی آمد کا ایک اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور میں گورمکھی چھاپہ خانہ قائم ہو گیا۔ یہی لکڑی کا وہ چھاپہ خانہ تھا جہاں پنجابی کی پہلی ڈکشنری اور پہلی گرامر طبع ہوئی تھی[7]۔

عہد رنجیت سنگھ کے اواخر میں بڑھتی فوجی کارروائیوں نے بھی پنجابی بولی کو زبان کے رتبے تک پہنچانے کی کوششوں میں مدد دی۔ مشنری کوششوں کے نتیجے میں اس زبان کو صرف ڈبلیو کیری کی تیار کردہ گرامر ہی دستیاب نہیں ہوئی بلکہ کیپٹن سڈن کا کیا ہوا "بچتر ناٹک" کا انگریزی ترجمہ بھی حاصل ہوا جس کے ذریعے مغرب کو پنجابی کی اعلیٰ شاعری کا نمونہ دیکھنے کو ملا۔

پنجابی زبان کی ترقی میں عہد رنجیت کی ایک دین یہ ہے کہ اس دوران پنجابی کو عربی فارسی الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ دستیاب ہوا۔ یہ بیگانے الفاظ تیزی کے ساتھ پنجابی زبان میں رچ بس گئے۔ نتیجے کے طور پر پنجابی زبان سنسکرت اور برج کے دیرینہ غلبے سے آزاد ہونے لگی۔ اس سے پنجابی کو ایک زبان کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے کا موقع ملا۔ اس عہد کی ایک دوسری دین یہ ہے کہ اس دوران پنجابی بولی کے زبان بننے کی منزل کی طرف چل رہے سفر کی رفتار میں تیزی آئی۔ عام آدمی جو پنجابی بول رہا تھا، اس کے متعدد الفاظ شاعری میں داخل ہوئے۔ اسی عہد کے دوران لاہور اور امرتسر میں بولی جا رہی پنجابی ایک مرکزی زبان کے طور پر ابھری اور اپنی ادبی حیثیت قائم

شعبہ جدید پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ۔ ۱۶۰۰۱۴

کرنے کی طرف آگے بڑھی۔ بول چال کی زبان میں "سکھاں دے بولے" کہے جانے والے متعدد فوجی الفاظ کو بھی شمولیت حاصل ہو گئی۔ اسی عہد کے دوران بائبل کا پنجابی ترجمہ شائع ہوا۔ (۱۸۱۱ء) اور مشنریوں نے لدھیانہ میں پنجابی چھاپہ خانہ قائم کیا۔ یہاں سے مشنریوں نے اپنا مذہبی لٹریچر شائع کرنے کے ساتھ ساتھ پنجابی گرامر اور ڈکشنریاں بھی شائع کیں۔

پنجاب کے عوام نے حکومت رنجیت سنگھ کے قیام سے ایک طویل مدت سے چلے آرہے انتشار اور غیر محفوظ جان ومال کے عذاب سے نجات حاصل کی۔ اس کی وجہ سے پنجاب کا ماحول بہتر ہوا او۔ پنجابی عوام کی زندگی میں ان کا روایتی کھلنڈرہ پن لوٹ آیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس عہد کے دوران حسن و عشق کو موضوع سخن بنا کر ڈھیروں قصے لکھے گئے۔ اسی عہد کے پنجابی ادب میں پہلی بار پنجابیت کا کھلا مظاہرہ ہوا جس کے نتیجے میں ایک نئی فکر نے جنم لیا جس کے طفیل پنجابی شعرا مذہب، ذات اور فرقہ واریت کی پراگندگی سے باہر نکلے اور اخوت پسندی کی طرف گامزن ہوئے۔ نتیجتاً جہاں ایک طرف مسلمان شعرا نے ویشنوؤں کے طرز و اسلوب پر شری کرشن کی تعریف میں نظمیں کہیں وہاں دوسری طرف ہندو شعرا نے اسلامی الفاظ اور اسلامی تمدن کو اپنے اسلوب شاعری میں شامل کر لیا۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اس عہد کے دوران عمل پیرا سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور ادبی سرگرمیوں سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سکھوں کی آپسی لڑائیوں اور ان کی انگریزوں کے خلاف لڑائیوں نے پنجابی شاعری کو زبردست موضوع فراہم کیا۔[8] ڈاکٹر دیوانہ اس عہد کے دوران عمل پیرا نرملے سادھوؤں کی ادبی سرگرمیوں کو بھی اسی امن وامان کا رہین منت قرار دیتے ہیں، جو پنجاب کو حکومت رنجیت سنگھ کے قیام سے نصیب ہوا تھا۔[9]

البتہ اس عہد کے دوران نثر نگاری نے کچھ خاص ترقی نہیں کی۔ جو تھوڑی بہت نثر اس دور میں لکھی بھی گئی وہ بھی پنجابی کے اپنے لب ولہجہ سے تہی ہے اور اس پر عربی فارسی کا غلبہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ عربی فارسی کا غلبہ تو اس دور کی شاعری پر بھی دکھائی دیتا ہے لیکن وہ ہر طور سے پنجابی شاعری دکھائی دیتی ہے جب کہ اس دور کی نثر یا تو شدید طور پر عربی فارسی زدہ ہو کر رہ گئی ہے یا بعض ادیبوں کے یہاں سنسکرت اور برج کا چربہ بن کر رہ گئی ہے۔

زیر مطالعہ عہد کے پنجابی ادب کا جائزہ لینے کے لئے ہم اسے چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے حصے میں قصہ گوئی آتی ہے، جس میں حاشم، احمدیار اور قادریار نام کے تین شعرا امتیاز حیثیت کے حامل ہیں۔ حاشم (۱۸۲۳ء۔۱۸۵۳ء) جسے بغیر کسی پختہ ثبوت کے مہاراجہ کا درباری شاعر بھی کہا گیا ہے، جو سسی پنوں، شیریں فرہاد، سوہنی مہیوال اور ہیر رانجھا جیسے عشقیہ قصوں کے خالق کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے دوہے اور ڈھوڈھییں بھی لکھی ہیں۔ حاشم کی عشقیہ شاعری میں روحانیت کی جھلک خاصی نمایاں ہے اور وہ 'دوہیہ' چھند کے استعمال پر اپنی قدرت کا کامیاب مظاہرہ کرتا ہے۔ حاشم کا ہم عصر دوسرا شاعر احمد یار (۱۸۳۵ء۔۱۸۶۸ء) ہے جس نے ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال، لیلیٰ مجنوں، راج بی بی، کام روپ، حاتم طائی، یوسف زلیخا اور سسی پنوں سمیت ۳۵ قصے تخلیق کیے ہیں۔ احمد یار کی شاعری کا مقصد انعام معاوضہ حاصل کرنا رہتا تھا۔ اپنے تخلیق کردہ قصہ حاتم نامہ میں وہ اقرار کرتا ہے کہ اس نے اس کی تخلیق مہاراجہ رنجیت سنگھ سے انعام حاصل کرنے کی غرض سے کی تھی۔[10] احمد یار کی طرح ہی قادر یار کا مقصد بھی شاعری کے ذریعے انعام و اکرام کا حصول محض ہی دکھائی دیتا ہے۔ قادر یار (پیدائش ۱۸۰۵ء) اپنی تخلیق قصہ پورن بھگت" میں بلا دریغ اعلان کرتا ہے کہ اس نے اس قصے کے طفیل ایک گھیت اپنے نام لکھوا لیا ہے۔[11] قادر یار کے تخلیق کردہ چار قصوں (پورن بھگت، ہری سنگھ نلوہ، راجہ رسالو اور سوہنی مہیوال) میں سے ادبی نقطہ نظر سے "پورن بھگت" بہتر تخلیق معلوم پڑتی ہے۔ اس قصے کو مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ اس کا سبب شاید اس داستان کی دلعزیزی اور شاعر کا اسے دلچسپ طریقے سے پیش کرنا ہے۔ قصہ گوئی کی طرف راغب ہونے سے پیشتر قادر یار نے اسلامی طرز زندگی کی برتری ثابت کرنے کی غرض سے "معراج نامہ" تخلیق کیا تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان نوابین اور روساکی طرف سے اسلامی شاعری پر مالی طور پر حوصلہ افزائی نہ ملنے کی صورت ہی میں وہ عشقیہ داستانوں کی طرف راغب ہوا ہوگا۔ اسی دور کا ایک اور قابل ذکر شاعر امام بخش (پیدائش ۱۸۷۸ء) ہے، جو مہاراجہ کے آخری سالوں میں میدان ادب میں داخل ہوتا ہے۔ امام بخش بھی قصہ گو شاعر ہے جس کے تخلیق کردہ قصوں لیلیٰ مجنوں، چندر بدن، شاہ بہرام، بدیع الجمال، ابراہم ادہم بلخی اور ملک زادہ شاہ پری میں سے قصہ شاہ بہرام ادبی اعتبار سے ایک بہتر تخلیق ہے۔

دوسرا حصہ رزم اور حب الوطنی پر مشتمل ہے جس میں بھائی کانہہ سنگھ بنگا، شاہ محمد، مٹک اور نہال سنگھ نام کے شعرا جذبہ حب الوطنی کے اظہار اور رزمیہ شاعری میں نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس قبیل کی شاعری میں شاہ محمد کا قد اس کے ہم عصروں کے مقابلے میں بہت دراز ہے۔ اس کی مشہور تصنیف "انگریزاں اتے سکھاں دی لڑائی" میں رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد کا المیہ پنجاب انتہائی دردمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ قاری کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ شاعر کے تمام تر الزام مہارانی جنداں کے سر دھرنے کے فیصلے سے ساتھ اتفاق کرے لیکن وہ کسی طرح بھی المیے کے ایماندارانہ بیان اور شاعر کے جذبہ حب الوطنی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حب الوطنی کا اظہار تو قادر یار کی 'ہری سنگھ نلوا' میں بھی موجود ہے لیکن اس کا معیار شاہ محمد کے مقابلے کا نہیں ہے۔ اس کا سبب تاریخی واقعات کی پیش کش میں شاعر کی غفلت شعاری اور بطال پرستی ہے۔ اس کے برعکس مٹک کی شاعری میں حب الوطنی کے جذبے کا بہتر اظہار موجود ہے۔ جعفر بیگ کی شاعری کو بھی اگرچہ معیاری شاعری کہنے میں تامل ہے لیکن یہاں اس کا ذکر اس لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس نے "جیتاں رنجیت سنگھ دیاں" کو تخلیق کیا تھا۔

تیسرا حصہ مذہبی شاعری کا ہے۔ اس میں بھگتی کے تین سر نمایاں طور پر سنائی پڑتے ہیں۔ یہ ہیں ویدانت، سکھی اور صوفی۔ نرملے سادھوؤں کی شاعری ویدانتی

[illegible] اکھر [illegible] گل داس کے "وچار ساگر" اور ہردیال کے "سُتر کتاولی" کو [illegible] کے اعلیٰ نمونے قرار دیتے ہیں۔ بھائی سنتوکھ سنگھ کے "گورو پرتاپ [illegible] پرکاش" شاعر کے سکھوں کی تاریخ کے متعلق علم اور سکھ فلسفے پر ان کی [illegible] کے مظہر ہیں۔ اسی دور میں غلام جیلانی اور نور محمد صوفیانہ شاعری کرتے ہیں جو حضرت بابا فریدؒ سے شروع ہوئی پنجابی صوفیانہ شاعری کو آگے لے جانے میں معاونت کرتی ہے۔

چوتھا اور آخری دور نثر نگاری کا ہے جس میں تراجم بھی شامل ہیں۔ اس دور کے تراجم میں بائبل، آئین اکبری، اکبر نامہ اور آتم پران کے تراجم پنجابی ترجمہ کی اچھی مثالیں ہیں۔ بھائی سنتوکھ سنگھ کی تفسیر جپ جی صاحب اس دور کی اہم نثری تخلیق ہے۔ کشور داس کا "گیتا مہاتم" بھی اس دور کی ایک اور قابل ذکر تصنیف ہے۔

مجموعی طور پر ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ عہد رنجیت سنگھ کے دوران کوئی ایسا شاعر یا نثر نگار پیدا نہیں ہوا جسے اس سے پہلے کے بڑے شاعروں یا ادیبوں کی صف میں جگہ دی جا سکے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت رنجیت سنگھ نے شعرا اور ادبا کو پر امن ماحول اور محفوظ زندگی فراہم کر کے وہ ماحول ضرور تیار کیا جس کے اندر ان کا تخلیقی جوہر جلا پا سکتا تھا اور اپنا سکہ منوا سکتا تھا۔ اس دور میں شاعروں کو انعام واکرام سے بھی نوازا گیا۔ مختصراً اس عہد کی حصولیابیاں یہ ہیں کہ (۱) پنجابی بولی نے زبان کا درجہ حاصل کرنے کی طرف پیش رفت کی، (۲) تراجم کے ذریعے پنجابی ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا گیا، (۳) قومیت کی علامت کے طور پر پنجابیت کا تصور وجود میں آیا اور (۴) درجنوں عشقیہ قصے تخلیق کئے گئے۔

حوالے

۱- لطیف، ایس۔ ایم : مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ پنجاب مین آف ہسٹری۔ صفحہ ۱۶۶
۲- گلاٹی، ایس۔ پی : ایضاً: تمہید: صفحہ ۸
۳- کھلر، کے۔ کے : مہاراجہ رنجیت سنگھ: صفحہ ۱۹۰
۴- ایضاً : ایضاً: صفحہ ۸۵۔۱۸۴
۵- ایضاً : ایضاً: صفحہ ۱۹۵
۶- لطیف، ایس۔ ایم : مہاراجہ رنجیت سنگھ۔ پنجاب مین آف ہسٹری: صفحہ ۱۷۹
۷- کھلر، کے۔ کے : مہاراجہ رنجیت سنگھ: صفحہ ۱۸۸
۸- دیوانہ، موہن سنگھ : اے ہسٹری آف پنجابی لٹریچر: صفحہ ۷۰۔۶۸
۹- ایضاً : ایضاً: صفحہ ۷۰۔۶۸
۱۰ : اساں انعام منگن دی خاطر تحفہ ایک بنایا
مجلس معشوقاں دی بنیاد اسے بادشاہاں دا
احمد یار
۱۱- : پورن بھگت دی گل سنائے کے جی
اک کھوہ انعام لکھیا میں
قادر یار
۲- دیوانہ، موہن سنگھ : اے ہسٹری آف پنجابی لٹریچر: صفحہ ۷۳

☆☆☆

وفیات

اردو کے نامور ناول نگار اور افسانہ نگار **ہرچرن چاولہ** کا ۶/ دسمبر کو اوسلو (ناروے) میں انتقال ہو گیا۔ ہرچرن چاولہ تقریباً ۷۵ برس سال کے تھے اور تقریباً ۳۰ سال سے ناروے میں مقیم تھے۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ ہرچرن چاولہ کافی دنوں سے بیمار تھے اور اوسلو کے ایک اسپتال میں داخل تھے۔ ان کے مشہور ناولوں میں "درندے، چراغ کے زخم" اور "بھٹکے ہوئے لوگ" شامل ہیں۔ وہ اپنے افسانوی مجموعوں "عکس آئینے کے، ریت، سمندر، جھاگ" اور "آخری قدم سے پہلے" کے لئے ادبی دنیا میں جانے جاتے ہیں۔ نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا نے ان کے ناول "بھٹکے ہوئے لوگ" کو ۱۴ زبانوں میں ترجمہ کے لئے منتخب کیا تھا۔ ہرچرن چاولہ زیادہ تر یوروپ اور اسکینڈیویا میں بسے ہوئے ہندوستانی اور پاکستانی تارکین وطن کے مسائل پر لکھتے تھے اور انہوں نے اردو ہندی اور پنجابی کی کئی کتابوں کو نارویجین زبان میں منتقل کیا تھا جنہیں وہاں کے مقتدر ناشروں نے شائع کیا۔

اردو کے معروف و مشہور شاعر اور صحافی **شہود عالم آفاقی** کا گزشتہ ۱۰/ نومبر ۲۰۰۱ء کو کلکتے میں انتقال ہو گیا۔ پسماندگان میں دو لڑکے اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ شہود عالم آفاقی ۱۹۴۰ء میں بہار کے مردم خیز علاقے دسنہ (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کلکتہ سے میٹرک کیا۔ وہ علامہ ابر احسنی گنوری کے شاگرد تھے۔ کلکتہ سے ماہنامہ "شہود" انہی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ ان کا شعری مجموعہ "دشت بیکراں" چھپ چکا ہے۔

گزشتہ دنوں اردو کی مشہور صحافی اور ماہنامہ 'حجاب' کی مدیرہ محترمہ **ام صہیب** (احمدی خاتون) کا رامپور میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۷۰ سال تھی۔ مرحومہ کئی ماہ سے علیل تھیں لیکن انتقال سے تین دن پہلے بالکل ٹھیک ہو گئی تھیں۔ مرحومہ ام صہیب ڈاکٹر ابن فرید کی اہلیہ تھیں۔ انہیں قرآن و حدیث کے علاوہ دینی علوم پر غیر معمولی عبور تھا۔ وہ جامعۃ الصالحات کی موسس پرنسپل تھیں۔ انہیں مضامین اور افسانے لکھنے کا شوق تھا ان کی تحریریں ہندو پاک کے رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ 'حجاب' میں ان کے تحریر کردہ اداریے ہندو پاک کے علاوہ مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ میں بے حد مقبول ہوئے۔

اردو کے مشہور و ممتاز ادیب اور صحافی پروفیسر **خواجہ حمیدالدین شاہد** کا ۲۲/ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو کراچی میں انتقال ہو گیا۔ پسماندگان میں تین لڑکے ہیں۔ مرحوم ادارہ ادبیات اردو (حیدر آباد، ہند) کے ہر کام میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے دست راست رہے۔ وہ ادارے کے ماہنامہ 'سب رس' کے مدیر بھی تھے۔ پاکستان منتقلی کے بعد بھی انہوں نے حیدر آباد اور ادارۂ ادبیات اردو سے اپنی وابستگی کی یاد اس طرح باقی رکھی کہ اپنے گھر کا نام "ایوان اردو" رکھا اور "سب رس" ہی کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ وہ اردو میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ کراچی میں وہ بہادر یار جنگ اکیڈمی سے وابستہ تھے۔

ادارہ مرحومین کے لئے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

(ادارہ)

عبدالغنی شیخ

قلم، قلم کار اور کتاب

ادبی سرقہ:

یہ عام بات ہے۔ اس کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ کئی دفعہ اتفاقیہ طور پر دو قلم کاروں کی ایک جیسی تخلیقات منظر عام پر آتی ہیں۔ جن کے لئے کسی قلم کار کو مورد الزام ٹھہرانا مشکل ہوتا ہے۔ اسے توارد کہتے ہیں۔

ولیم گولڈینگ کے ناول Lord of the Flies اور لینل جارج کے Children of the Morning میں بڑی یکسانیت ہے۔ موخرالذکر ۱۹۲۶ء میں لکھا گیا تھا جب کہ گولڈینگ نے اپنا ناول اس کے بعد لکھا۔ جب گولڈینگ کی توجہ اس کی طرف دلائی گئی تو اس کا کہنا تھا کہ اس نے جارج لینل کی کتاب نہیں پڑھی ہے۔ اس کی اطلاع کے مطابق یہ کتاب دوبارہ شائع نہیں ہوئی ہے اور دستیاب نہیں ہے۔ چوری چھپے دوسروں کی کتابیں چھاپنا عام بات ہے۔

کئی قلم کاروں نے ناشروں اور قارئین کو اپنی نگارشات سے متعلق دھوکہ دیا ہے۔ ایک ناول نگار کلیفورڈ اروینگ نے پبلشر کی آنکھوں میں دھول ڈالتے ہوئے دعویٰ کیا کہ اس کو ارب پتی ہاورڈ ہاکس کی خود نوشت سوانح حیات لکھنے کا کام سونپا گیا ہے۔ اپنے ایک دوست اور بچوں کے قلم کار رچرڈ سسکینڈ سے مل کر اس نے ہاگس کے نام سے ایک پبلشر سے بارہ سو صفحات کی ضخیم کتاب چھپوائی۔ اپنے دعوے کی تصدیق میں ہاگس کی طرف سے اس کے نام لکھے ہیں جعلی خطوط بھی پیش کیے۔ جنہیں امریکہ کے پانچ ماہرین نے درست قرار دئے۔ اگر سوئز بینک نے یہ راز فاش نہ کیا ہوتا تو کبھی یہ بات منظر عام پر نہیں آتی۔ ایچ آر ہاگس کے نام سے انہوں نے زوریگ بینک میں جو اکاؤنٹ کھولا تھا، وہ دراصل کلیفورڈ اروینگ کی بیوی تھی۔ اس دھوکہ بازی کی پاداش میں کلیفورڈ اروینگ کو سترہ مہینوں کے لئے جیل کی ہوا کھانی پڑی اور کتاب کی آمدنی سے بچی ہوئی رقم واپس کرنا پڑی۔

ادبی چوری اور فریب دہی کے کچھ واقعات آپ نے پڑھ لئے۔ کئی دفعہ قلم کار تلخ تجربات سے دوچار ہوتا ہے۔ ایک قلم کار کو پبلشر سے جب اپنی کتاب کی اشاعت کی خبر چھ ماہ تک نہیں ملی تو وہ دریافت کرنے اس کے دفتر پہنچا۔ چھپنا تو درکنار، مسودے کا اتا پتا تک نہیں تھا۔ بہت ڈھونڈا۔ آخر کار سکریٹری کی کرسی کی گدی کے نیچے مسودہ ملا۔

مسودہ کی دوبارہ تخلیق:

تھامس کارلائل نے اپنی مشہور تصنیف The French Revolution کا مسودہ دو سال میں مکمل کیا اور اپنے دوست جان اسٹوارٹ مل کو ریویو کے لئے دیا جہاں اس کی خادمہ نے اسے ردی سمجھ کر جلا ڈالا۔ کارلائل کو سخت کوفت ہوئی اور بہت مدت کے لئے دوبارہ لکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ جب یہ کتابی صورت میں چھپ کر منظر عام پر آیا تو بڑا مقبول ہوا۔

نامور سائنس داں سر آئزک نیوٹن اپنی برسوں کی محنت سے تیار کردہ سائنسی تھیسس چھوڑ کر کمرے سے نکلا۔ کمرے میں موم بتی جل رہی تھی۔ ان کے پالتو کتے نے موم بتی گرا دی اور ان کا تھیسس جل گیا۔ آئزک نیوٹن کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ تاہم انہوں نے بردباری کا ثبوت دیا اور کتے سے ملائمت سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ آج تم نے کتنا بڑا نقصان کیا ہے؟"

قلم کار کی پہلی کتاب اور کامیابی:

'بعض کتابوں کے حسن و زیبائش کا دار و مدار صرف سرورق پر ہوتا ہے۔'
(آسکر وائلڈ)

'بہت ساری کتابیں اپنے پہلے صفحے پر اپنے کو مار دیتی ہیں۔' (لائیڈ ڈگلس)

'اگر تم کوئی معرکتہ الآرا کتاب لکھنا چاہتے ہو تو بہتر یہ ہے کہ موضوع بھی معرکتہ الآرا ہو۔' (ہرمن میل ول)

بہت سارے قلم کاروں کی پہلی کتاب کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور چند ہی قلم کار اس کامیابی کو قائم رکھ سکے ہیں۔

ہیروڈٹس (۴۹۰۔۲۸۰ ق۔م) نے پہلی مرتبہ دنیا میں ایک اچھی تاریخ لکھی۔ ان کو تاریخ اور جغرافیہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔

میکاولی نے سیاست پر ایک سنسنی خیز کتاب The prince لکھی۔ جس میں کہا گیا ہے کہ 'حکمراں کو بیک وقت لومڑی کی طرح مکار اور شیر کی طرح بہادر بننا چاہئے۔' اس کتاب کا صدیوں بعد بھی چرچا ہے۔

سر تھامس مور نے یوٹوپیا لکھ کر ایک مثالی مملکت کا تصور پیش کیا ہے اس کے بعد ہی لفظ یوٹوپیا مشہور ہوا ہے۔

شیخ منزل، فورٹ روڈ، لیہہ، لداخ

شوپنہار کی شہرت ان کی کتاب The world as will and Idea پر ہے۔
کنفیوشس کی تعلیمات ان کی تصنیف 'چین چو کینگ' میں دی گئی ہیں۔ چینی لوگوں کے افکار و اعمال اور روحانی تعلیمات کا صدیوں تک دور رس اثر رہا ہے۔

پروفیسر ایف۔ ایس۔ ہاری (ہارس) نے جے۔ بی۔ پریسٹلے کے ایک کتابچہ کی اشاعت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تقریر میں کہا تھا۔ 'مشہور انگریز نقاد ڈاکٹر بیکر نے انگریزی ناول نگاری پر آٹھ جلدیں لکھی ہیں، جن کا مجموعی وزن کوئی چار سیر ہوگا۔ ایک اور انگریز نقاد جے۔ بی۔ پریسٹلے نے ناول پر ایک کتابچہ لکھا، جس کا وزن چار تولے ہوگا۔ میری رائے میں اگر بیکر کی تمام جلدیں ایک پلڑے میں اور پریسٹلے کا کتابچہ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو یقیناً پریسٹلے کا پلڑا بھاری رہے گا۔'

مارگرٹ مشل اور ایما سعد ان قلم کاروں میں ہیں جن کی پہلی تصنیف پر کامیابی نے قدم چوما ہے۔ مارگریٹ مشل کا ناول Gone with the Wind اس کا پہلا اور آخری ناول تھا، جو بے حد کامیاب ہوا۔ ایک مرحلے پر سویڈن کی اکادمی نے اس ناول کے لئے مشل کو نوبل پرائز کے لئے نامزد کیا تھا۔

امریکی ادیب تھامس وولف نے زندگی میں صرف دو کتابیں لکھیں۔ انہی دو کتابوں کی بدولت امریکی ادب میں اس کا بلند مقام ہے۔

Alice Adventures in Wonderland سے لیوس کیرول کو شہرت دوام ملی ہے۔ لیوس نے ریاضی پر کئی کتابیں لکھی ہیں جو ان کی زندگی میں تھوڑی بہت مقبول ہوئیں۔ تاہم ان کے انتقال کے بعد لوگ ریاضی میں ان کے نام اور کام کو بھول گئے۔ البتہ Alice Adventures in Wonderland کی وجہ سے لیوس کو یاد کیا جاتا ہے۔

آئین اسٹائن نے کہا ہے۔ ان کے نظریہ اضافیت پر نو سو سے زائد کتابوں میں اسے وضاحت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاہم ان کے مطابق ان کی زندگی کے دوران صرف بارہ آدمیوں نے نظریۂ اضافیت سمجھا تھا۔

لوگ ڈاکٹر جانسن کی کتابوں سے اتنا لطف اندوز نہیں ہوتے، جتنا کہ بوسویل کی ان پر لکھی سوانح حیات سے محظوظ ہوتے ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں۔ 'اگر ہر مشہور آدمی کو ایک بوسویل مل جاتا تو ان لوگوں کی زندگیوں کے وہ پہلو بھی ظہور میں آجاتے جو نہ ان کے اعمال میں واضح طور پر نظر آتے ہیں اور نہ ان کی تصانیف میں۔'

ایک شاعر کی حیثیت سے عمر خیام کا مرتبہ بلند ہے۔ فزجیرلڈ کی شستہ انگریزی میں ان کی رباعیوں کا برمحل اور خوبصورت ترجمہ نے عمر خیام کی شہرت کو چار چاند لگادیا ہے۔

زود نویس اور بسیار نویس قلم کار:

جب ہم قلم کاروں اور کتابوں کی باتیں کرتے ہیں تو زود نویس اور بسیار نویس قلم کاروں کا ایک بڑا کارواں نظر آتا ہے۔ کئی قلم کار نے تب لکھنا شروع کیا جب وہ چراغ سحری تھے۔ کچھ قلم کار کم سنی سے ہی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت لے کر آئے۔ غالب نے دس برس کی عمر سے شاعری کی۔ بارہ تیرہ سال تک ان کو صرف مکتبی تعلیم ملی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے چودہ سال سے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کو قدرت سے بلا کا حافظہ ملا تھا۔ انہیں کتاب کے صفحے اور سطریں تک یاد رہتی تھیں۔ فارسی کے ہزاروں اشعار زبانی ازبر تھے۔ ان کی علمیت بڑی وسیع تھی۔ وہ حقہ اور چنگ جیسے موضوعات پر بھی معلومات کا خزانہ رکھتے تھے۔

نیاز فتح پوری اپنے متعلق لکھتے ہیں۔ 'میں قبل از وقت Preacocious فطرت لے کر آیا تھا۔ جب میری عمر سات سال کی تھی۔ سکندر نامہ کیمیائے سعادت پڑھا۔'
ٹیگور نے سات سال کی عمر میں شاعری کی۔

چارلس کنگسلے سے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چار سال کی عمر میں نظمیں اور دعائیں لکھیں۔ وکٹر ہیوگو نے تیرہ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ چودہ سال کی عمر میں انہوں نے جو ڈرامہ لکھا اسے پڑھ کر سبھی حیران ہوگئے۔ انگریزی کے مزاح نگار پی۔ جی۔ ووڈ ہاؤس نے لکھا ہے کہ وہ کمسنی سے ہی قلم کار بننا چاہتا تھا۔ چنانچہ پانچ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ فرانسیسی ناول نگار جارج سائیمیسن نے اپنا پہلا ناول سترہ سال کی عمر میں شائع کیا۔ اس نے مختلف موقعوں پر سولہ قلمی نام استعمال کئے۔ برٹرینڈ رسل نے گیارہ سال میں Euclid کے بدیہات پر انگشت نمائی کی اور اس کے نظریے کو رد کیا۔ نوبل انعام یافتہ اپٹون سنکلر نے سولہ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا۔ ہنگری کے ایک نوخیز عظیم شاعر الیکزنڈر پٹوفی نے اپنا پہلا مجموعہ کلام اکیس سال کی عمر میں شائع کیا۔ سارے ملک میں اس کے کلام کی دھوم مچی اور ہر ایک کی زبان پر اس کا نام آگیا۔ شروع میں ہر ناشر اس کے کلام کو چھاپنے سے انکار کیا۔ آخر کار ایک ناشر نے پٹوفی کی غریبی سے ناجائز فائدہ لیتا ہوا اس کا کلام پچھتر فلورن یا سو روپے میں خریدا۔ ان دنوں پٹوفی فاقے کر رہا تھا۔ اس کے بعد چار سال کے قلیل عرصے میں اس کی نظموں کے نو مجموعے شائع ہوئے۔ پٹوفی جوانی میں جنگ میں مارا گیا۔ علامہ اقبال نے پٹوفی پر ایک نظم کہی ہے۔

کیٹس پچیس سال میں اور شیلے انتیس سال میں فوت ہوئے۔ تب دونوں کی شاعری کا شہرہ انگریزی ادب کی دنیا میں دور دور تک پہنچا تھا۔

جہاں مذکورہ قلم کاروں نے کمسنی میں لکھا وہاں بہتوں نے بڑھاپے میں قلم کے جوہر دکھائے۔ ورڈی نے ستر سال کی عمر میں 'اوپیرا او تھیلو' لکھا تھا۔ شیخ سعدی نے پچاس سال کی عمر کے بعد لکھنا شروع کیا۔ ان کی کتابوں میں 'گلستاں' بہت مشہور ہے۔ فردوسی نے چالیس سال کے بعد 'شاہنامہ' جیسی عظیم تخلیق کی۔

لکھنے میں عمر کی کوئی قید نہیں۔ گوئٹے نے Faust کا آخری حصہ ۱۰۳ سال کی عمر میں مکمل کیا۔ اس کے چند روز بعد ان کا انتقال ہوا۔ پیرانہ سالی میں لکھی گئی مسز ایلس پولوک کی کتاب Portrait of my victorian youths تب چھپی، جب مصنفہ کی عمر تقریباً ۱۰۳ سال تھی۔ میری اوگیلائیو نے ۹۳ سال کی عمر میں اپنی یاد داشت لکھی۔ انہوں نے اپنی کتاب میں قارئین کو بتایا ہے کہ تقریباً ایک صدی پہلے اسکاٹ لینڈ میں ایک لڑکی کی زندگی کیسی تھی۔

وکٹر ہیوگو، برنارڈ شا، مہاتما گاندھی اور لیو ٹالسٹائی ان سرکردہ قلم کاروں میں ہیں جنہوں نے ۸۰ سال کی عمر کے بعد بھی لکھا۔

یونانی فلسفی Sophocles نے اپنی زندہ جاوید کتاب Oedipus Rex ۷۵ سال اور دوسری کتاب Oedipus colonus ۹۹ سال کی عمر میں لکھی۔ Giusippe verdi نے پچاسی سال کی عمر میں Score for a te Dum تحریر کیا۔

قدیم زمانے میں ارسطو ہی ایک ایسا فرد ہو گزرا ہے جس نے نئی دنیا کو بہت کچھ دیا۔ ارسطو نے سیاسیات، مابعد الطبعیات، اخلاقیات، حیاتیات، اقتصادیات، نفسیات،

حیوانیات، شاعری وغیرہ کے موضوعات پر تقریباً ۶۸ کتابیں لکھیں۔ وہ نظریات سے زیادہ حقیقت پر یقین رکھتا تھا۔

بسیار نویسی میں شاید الیگزینڈر ڈوماس کا نام سر فہرست ہے۔ ڈوماس نے ۱۲۰۰ کتابیں لکھیں۔ جن میں ان کا ناول Three Musketeers ان کی بہترین تصنیف مانی جاتی ہے۔

علامہ جوزی کی تصنیفات ایک ہزار تک ہیں۔ امام غزالی نے سو کتابیں لکھیں۔ البیرونی کی تصنیفات بھی سو کے ہندسے کو چھوتی ہیں۔ والٹیر کی تصنیفات ۹۹ جلدوں پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے مختلف موضوعوں پر دس ہزار خطوط لکھے۔ برٹرینڈ رسل نے سنجیدہ موضوعات پر ساٹھ کتابیں لکھیں۔ جارج سیمنین نے جن کا ذکر اوپر آیا ہے، جیسوں تجارتی نوعیت کے ناول لکھے۔ اپنے نام سے ایک سو پچاس ناول لکھے۔ جب کہ دوسرے ناموں سے تین سو پچاس ناول تحریر کئے۔ کئی ناول اس نے پچیس گھنٹوں میں مکمل کئے۔

رومانی ناول نگار بار بارا کارٹ لینڈ کا نام زیادہ اور تیز لکھنے والوں میں سر فہرست ہے۔ انہوں نے ۲۰۰۱ء مئی تک، جب ان کا انتقال ہوا، ۷۲۳ ناول لکھے تھے۔ جن کا ۳۶ زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور ایک ارب کاپیاں فروخت ہوئیں۔

کئی سالوں تک وہ ہر دو ہفتے میں ایک کتاب قلم بند کرتی تھی۔ Guinnes Book of world records میں ان کا نام دنیا کی سب سے بسیار نویس ناول نگار اور زندہ ادیبوں میں سب سے زیادہ لکھنے والی قلم کارہ کی حیثیت سے لیا گیا ہے۔ بار برا نے پہلا ناول اکیس سال کی عمر میں لکھا۔

جون کریسی نے تین سو کتابیں لکھیں۔ وہ ہفتے میں ایک کتاب لکھتا تھا۔ انتھونی ٹرولوپے ایک جز وقتی ادیب تھا اور ایک مشین کی طرح کام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ ایک گھنٹے میں ایک ہزار الفاظ لکھ سکتا تھا۔ اس کی ماں بھی ایک ادیبہ تھی۔ اس نے ایک سو پندرہ ناول لکھے۔ پہلی کتاب پچاس سال کی عمر میں تحریر کی۔

کرشن چندر نے اپنا ناول 'شکست' کشمیر کے گلمرگ ہوٹل میں اکیس روز میں لکھا۔

ایک پیشہ ور ناول نگار سال میں اوسطاً ایک ناول لکھتا ہے۔ کئی ممتاز ادیبوں نے سال میں دو ناول لکھے ہیں۔

زود نویسی اور بسیار نویسی کئی قلم کاروں کی خصوصیت رہی ہے۔ ۱۸۷۰ء میں ایک ادیب اینگر اہم نے پبلشر کی فرمائش پر ۲۴ گھنٹوں میں ۳۳ ہزار الفاظ پر مشتمل ایک طویل افسانہ لکھا۔

سعادت حسن منٹو ایک مرحلے پر روزانہ ایک کہانی قلم بند کرتا تھا۔ زود نویسی کی وجہ سے منٹو کی یہ کہانیاں اس کی دوسری کہانیوں کی طرح معیاری نہیں ہیں۔ ان دنوں منٹو شراب میں ڈوبا رہتا تھا اور شراب خریدنے کے لئے پیسے کی بڑی ضرورت رہتی تھی۔

ڈینیس روبینز نے ۱۸۰ ناول لکھے ہیں۔ وہ صبح نو بجے اپنے تخلیقی کام شروع کرتی تھی اور ایک بجے تک لکھتی تھی۔ اس کے بعد چار بجے سے وہ دوبارہ لکھنا شروع کرتی تھی اور سات بجے تک اس میں مگن رہتی تھی۔ چھٹیوں کے تین ہفتوں کو چھوڑ کر وہ سارا سال بلا ناغہ اس پروگرام پر عمل کرتی تھی۔

نیٹ گاؤلڈ نے ۱۵۰ ناول لکھے۔ اور یہ تین کروڑ سے زیادہ فروخت ہوئے۔

کنڑ زبان کے ناول نگار وشنکیس آئینگر جن کو ۱۹۸۳ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ انہوں نے لگ بھگ ایک سو بیس کتابیں لکھی ہیں۔

قلم کا دھنی:

کئی قلم کار قلم کے دھنی تھے، لیکن بولنے میں اچھے نہیں تھے۔ الطاف گوہر نے اپنے متعلق کہا ہے 'میں گفتگو کرنے میں بہت اچھا نہیں ہوں۔ ہر وہ شخص جس کے لئے جو ٹھیک طرح اظہار خیال کر نہیں پاتے، لکھنا بڑا باعث سکون ہے۔'

اردو کے خوش گو شاعر ساحر لدھیانوی سے متعلق فکر تونسوی نے لکھا ہے 'ساحر کو اپنی نظم ورد کرنا نہیں آتا، لیکن تخلیق خوب کرتا ہے۔'

قلم کار اینڈ منڈ برک کے مقالے اپنے منطقی دلائل اور اسلوب تحریر کے لحاظ سے انگریزی ادب میں بہترین سمجھے جاتے ہیں لیکن ایک مقرر کی حیثیت سے وہ ناکام تھا۔ جب وہ ہاؤس آف کامنز میں تقریر کرنے کے لئے اٹھتا تو بہت سارے ممبران ایوان سے چلے جاتے یا کھانسنا شروع کر دیتے تھے۔

جوزف کونارڈ ۱۹ سال تک انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا تھا۔ بعد میں انگریزی سیکھی اور اپنے منفرد اسلوب بیان کی وجہ سے اسے شہرت ملی۔

اکثر قلم کار یا تو شاعری میں طبع آزمائی کرتے ہیں یا نثری ادب تخلیق کرتے ہیں۔ سر والٹر سکاٹ شاعری کرتا تھا۔ بائرن کی غنائی شاعری کی وجہ سے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ پس منظر میں جا رہا ہے۔ تو نثر نگاری کی طرف مائل ہوا۔ بطور ایک نثر خاص کر تاریخی موضوعات پر لکھے ہوئے ناولوں کی وجہ سے ان کا مرتبہ بلند ہے۔

اس کے برعکس متعدد قلم کار تحریر اور تقریر دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور شاعری اور نثر نگاری دونوں میں استاد تھے۔

سسرو ایک جادو بیان مقرر اور بلند پایہ قلم کار تھا۔ لاطینی میں اس کی نثر نگاری ایک نمونہ تھی۔ جسے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کے طرز تحریر نے مستقبل کے ادب پر اثر ڈالا ہے۔ سسرو کا جنم ۱۰۶ قبل مسیح روم میں ہوا تھا۔

والٹیر تحریر اور تقریر دونوں میں استاد تھا۔ اپنی خوبصورت گفتگو کے لئے وہ مشہور تھا۔ تین ماہ میں انہوں نے انگریزی زبان میں ملکہ حاصل کیا۔ والٹیر نے ناول، ڈرامے، تاریخ، تحقیقی مضامین کے علاوہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔

فلسفی جارج سنتیانا ناول نگار اور شاعر بھی تھا۔ ان کا ناول The Last Puritan امریکہ میں بڑا مقبول ہوا۔ بہت سارے قلم کار بیک وقت شاعر، ناول نگار اور نقاد رہے ہیں۔

نابغۂ روزگار اور مجموعہ صفات قلم کار:

علامہ اقبال ایک عظیم شاعر، فلسفی، مفکر، عالم دین، ماہر لسانیات اور قانون داں تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور ایک مایہ ناز شاعر اور ناول نگار کے علاوہ مصور، ماہر تعلیم اور اداکار تھے۔ رسکن شاعر، نثر نگار، مصور اور مفکر تھے۔ ولیم فاکنر، ہمنگوے، گوئٹے اور وکٹر ہیوگو مصور بھی تھے۔ لیونارڈو ڈاونسی ایک عظیم مصور اور سنگ تراش کے علاوہ قلم کار بھی تھا۔ انہوں نے سائنسی موضوعات کے علاوہ لاطینی گرامر اور مصوری پر کتابیں لکھیں۔ فرانس کے ممتاز قلم کار البرٹ شیوائزر فلسفی اور موسیقار بھی تھا۔ انہیں نوبل پرائز ملا تھا۔

جسمانی نقص اور بیماری رکاوٹ نہیں:

[illegible] تھی۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح کھیل کود نہیں سکتی تھی۔ [illegible] کرنے کا غیر معمولی جذبہ رکھتی تھی۔ ان کی کتابیں ان کی صلاحیت [illegible] کی عکاس ہیں۔ سقراط، موپاساں اور دوستوفسکی کو مرگی آتی تھی [illegible] ان کے فکری اور تخلیقی ذہن کے لئے رکاوٹ نہیں بنا۔

[illegible] ملٹن کی بینائی چلی گئی۔ اپنی مشہور نظم Paradise Lost انہوں نے نابینائی کے عالم میں لکھی۔

ایچ۔ جی۔ ویلز کی ٹانگ بچپن میں فٹ بال کھیلتے ہوئے ٹوٹ گئی۔ اور وہ بارہ سال تک عملاً اپاہج کی حالت میں رہا۔ یہ معذوری اس کے حق میں نعمت ثابت ہوئی۔ اس دوران ویلز کو کثیر مطالعہ کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ جو بھی کتاب ہاتھ میں آئی وہ اسے پڑھ لیتا۔ جب وہ صحت یاب ہوا تو ایک بزاز کی دکان میں معمولی کام ملا۔ فرصت کے اوقات میں وہ ایک زیریں کمرے میں چپکے سے کھسک جاتا تھا اور گھنٹوں کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ اس سے ویلز کو لکھنے کی تحریک ملی۔ بعد میں ویلز نے جب لکھنا شروع کیا تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

جوانی میں کچھ وقت کے لئے الڈوس ہکسلے بصارت سے تقریباً محروم ہوا اور ایک ڈاکٹر بننے کی اس کی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ ہکسلے کے ذہن پر ساری زندگی اس کا منفی اثر رہا۔ تاہم یہ ان کے تخلیقی کام میں حائل نہیں ہوا اور اس کا قلم تخلیقات کا سوتا بہاتا رہا۔

آر۔ ایل۔ اسٹیونسن دائم المریض تھا۔ جب موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی تب بھی اس نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ اور ایک قلم کار کی حیثیت سے انگریزی ادب میں اپنا مقام بنایا۔

مارسل پراؤسٹ قریب المرگ تھا۔ اس حالت میں اپنے نوکر کو بلایا اور ایک مسودے کا فلاں صفحہ کھولنے کے لئے کہا۔ جس میں اس کے ایک ناول کے ایک مریض کردار کو سکرات کے عالم میں دکھایا گیا تھا۔ جس سے اب پراؤسٹ خود دوچار تھا۔

انگریز ادیب جارج تھامس پر فالج گرا۔ وہ مشکل سے قلم ہاتھ میں سنبھال سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ لکھنے پر تلا تھا۔ چنانچہ توازن رکھنے کے لئے وہ اپنے ہاتھ میں ایک وزنی آلہ رکھتا تھا۔ جس سے وہ لکھ پاتا تھا۔ اسی حالت میں انہوں نے پانچ سال کے عرصے میں پانچ کتابیں لکھیں۔

کرسٹی براؤن ایک اپاہج تھا۔ چلنا، کھڑا ہونا اور بیٹھنا اس کے لئے سخت دوبھر تھا۔ وہ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ ان تمام کمزوریوں کے باوجود اس نے بائیں پیر کی دو انگلیوں میں قلم تھام کر اپنی آپ بیتی لکھی۔

روجر لندن نابینا اور معذور تھا۔ ۱۹۵۲ء میں ایک بیماری سے وہ اپنی بصارت ہی نہیں کھو بیٹھا بلکہ اس کی دونوں ٹانگیں بھی بے کار ہو گئیں۔ اس کے باوجود اس نے ایک کامیاب ناٹک لکھا۔ جس میں زندگی کے حقائق کو اجاگر کیا گیا تھا۔ لندن میں جب یہ ناٹک ڈیوک آف یارکس تھیٹر میں اسٹیج کیا جاتا تو تماشائی اسے دیکھ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

ہنری اوبرگ اکیاسی سال کی عمر میں فالج کا شکار ہوا۔ وہ سویڈن کے شہر اسٹاک ہوم میں رہتا تھا۔ اس کے دل میں ایک کتاب لکھنے کا شوق جاگا۔ فالج سے اس کے ہاتھ پیر ہل جل نہیں سکتے تھے۔ اس کے لئے ایک خصوصی لیور (پیرم) بنایا گیا، جو منہ میں رکھ کر دبانے سے ایک لفظ ٹائپ کرتا تھا۔ اس کی مدد سے اس نے سات لاکھ بیس ہزار حروف پر مشتمل ایک کتاب Mariette لکھی۔ اس کے لئے اوبرگ کو سات لاکھ بیس ہزار مرتبہ اپنا منہ دبانا پڑا۔

ایک خاتون باربرا لائیڈ بھی مفلوج تھی۔ تاہم اپنے عزم صمیم اور بلند ہمت کی بدولت دو ناول لکھے۔ بچوں کے لئے لکھی اس کی کتاب The Little Green Man شوق سے پڑھی جاتی ہے۔

ایک امریکی ڈاکٹر ایرل کارلسن کو جنم سے ہی دورہ پڑتا تھا۔ لیکن اپنی محنت اور قوت ارادی کی وجہ سے وہ ایک کامیاب ادیب بنا۔

لیونارڈ وائٹ نے بیماری کی حالت میں بستر پر دراز ہو کر اپنی ساری کتابیں لکھیں۔

شہرہ آفاق ماہر نفسیات فرائڈ کے مقدر میں غریبی اور بیماری دونوں لکھی تھی۔ ان کی موت کینسر سے ہوئی۔ نفسیاتی موضوع پر لکھی گئی ان کی کتابیں ساری دنیا میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

قلم کار اور مصائب:

سنگی دیواریں جیل خانہ نہیں بناتیں
اور نہ ہی لوہے کی سلاخیں پنجرہ بناتی ہیں
ایک صاف اور معصوم دل اسے ایک شی کا مسکن بناتا ہے

(رچرڈ لاؤیس)

رچرڈ لاؤیس نے اپنی محبوبہ کو جیل خانے سے ایک نظم لکھ کر بھیجی جو ادب پارہ میں شمار ہوتی ہے۔ مذکورہ اشعار اسی سے ماخوذ ہیں۔

متعدد قلم کاروں نے اپنے نظریات کی وجہ سے بڑے مصائب جھیلے ہیں۔ ان کی فہرست طویل ہے۔ حکمراں اپنی بقا کے لئے انہیں خطرہ سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ حکومت وقت کے معتوب رہے۔ وہ اپنے وطن سے فرار ہوئے یا جیلوں میں ڈالے گئے، اذیتیں پہنچائی گئیں۔ جلا وطن کئے گئے یا جان سے مارے گئے۔

جابر حکمرانوں اور ارباب اختیار نے قلم کاروں کو لکھنے کے لئے اپنے مطلب کے موضوعات دئے جنہیں قلم کاروں نے قبول نہیں کیا۔

سولہویں صدی میں انگلینڈ میں ولیم ٹینڈیل نے انجیل مقدس کے ترجمے کا کام اپنے ہاتھ میں لیا لیکن بے جا مداخلت کی وجہ سے انہوں نے راہ فرار اختیار کی۔ بعد میں وہ پکڑا گیا اور ایک قلعے میں قید کیا گیا۔ جہاں ایک سال بعد گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا۔ اس کی لاش جلا دی گئی۔ ٹینڈیل کے آخری الفاظ یہ تھے۔ 'خدایا' انگلینڈ کے بادشاہ کی آنکھیں کھول دے۔'

والٹیر، وکٹر ہیوگو اور مارٹن لوتھر کنگ اپنے نظریات کی وجہ سے جلا وطن کئے گئے۔

سابق سوویت یونین میں نظریاتی اختلاف کی وجہ سے قلم کاروں پر بڑا ظلم کیا گیا۔ روسی دانشور لیون ٹراٹسکی کو اسٹالین سے نہیں بنی اور جلا وطن کیا گیا۔ لیکن جلا وطنی میں بھی آرام سے نہیں رہنے دیا۔ اول سارے یورپ میں اس کو کسی نے پناہ نہیں دی۔ آخر کار جب میکسیکو میں پناہ ملی۔ تو اسٹالین کا ایجنٹ وہاں بھی جا پہنچا۔

۲۰ اگست ۱۹۴۰ء کو برف توڑنے کی ایک کدال سے اسے ہلاک کیا گیا۔ اس سے ایک سال پہلے ٹراٹسکی کا ایک بیٹا پیرس میں پراسرار طور پر مر گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کو اسٹالین کے ایجنٹوں نے زہر دیا تھا۔ اس کا ایک اور بیٹا ایک روسی جیل خانے میں پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ اس کی بیٹی زینا نے جرمنی میں خودکشی کی۔

قلم کار میکسم گورکی کو انقلابی خیالات رکھنے کی وجہ سے زار کی حکومت نے جلاوطن کیا۔ گورکی کا مطلب کڑوا ہے۔ گورکی نے خود یہ نام رکھا تھا۔

پولینڈ کی ادیبہ روزا لکسمبرگ پولیش کمیونسٹ پارٹی کی بانیوں میں تھی اور جوانوں کے خفیہ گروپ کی ایک سرگرم رکن تھی۔ ایک دفعہ گرفتاری سے بچنے کے لئے وہ سوئٹزر لینڈ فرار ہوئی اور زوریک یونیورسٹی سے تعلیم پانے کے بعد ڈاکٹریٹ حاصل کیا۔ وہاں سے وہ برلن گئی اور جرمن سوشل ڈیموکریسی کی ایک سرگرم نظریاتی رہنما بنی۔ ۱۹۱۵ء میں غیر قانونی طور پر انقلابی تحریک میں حصہ لینے کی پاداش میں گرفتار ہوئی۔ کوئی ایک سال بعد ضمانت پر رہا ہوئی اور دوبارہ برلن آئی۔ ۱۹۱۳ء میں روزا نے اپنی اہم نظریاتی کتاب The Accumulation of Capital لکھی۔ وہ کئی بار جیل گئی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران جنگ کے خلاف مظاہرے کرنے پر وہ گرفتار ہوئی اور تقریباً جنگ ختم ہونے تک جیل میں رہی۔ رہا ہونے کے بعد ۱۵ اور ۱۶ جنوری ۱۹۱۹ء کی درمیانی رات جرمن فوجیوں نے روزا اور اس کے ایک قلم کار ساتھی کو ہلاک کیا۔

انٹونیو گرانسی پچھلی صدی کا عظیم ترین مارکسی نظریات کار Theorist تھا۔ وہ اٹلی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ ایک معمولی ملازم تھا۔ بچپن میں ایک حادثہ کی وجہ سے وہ کبڑا ہو گیا تھا۔ جس کے بعد وہ جسمانی طور پر کبھی نشوونما نہیں پا سکا۔ ۱۹۱۳ء کے اختتام پر وہ سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہوا۔ اٹلی میں کمیونسٹ پارٹی کے قیام میں اس کا اہم کردار تھا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ کیمونسٹ پارٹی کی ٹکٹ پر پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا۔ نومبر ۱۹۲۶ء میں انٹونیو گرانسی گرفتار ہوا۔ تب مسولینی سیاست میں آیا تھا۔ جج نے گرانسی کو بیس سال چار ماہ کی سزائے قید سنائی۔ سرکاری استغاثہ نے کہا کہ اس کے دماغ کو بیس سال کے لئے جامد رکھنا چاہئے لیکن جیل خانے میں اس کو لکھنے کا موقع ملا۔ خطوط کے علاوہ اس نے تین ہزار صفحات پر مشتمل Prison Note Book کے نام سے ایک مسودہ لکھا۔ جو اس کے فوت ہونے کے بعد ۱۹۴۷ء میں کتابی صورت میں چھپا۔ مرنے سے پہلے وہ تپ دق اور گٹھیا سمیت کئی امراض کا شکار رہا اور ۴۶ سال کی عمر میں فوت ہوا۔

'ایک انقلابی کی سوانح حیات' کے نام سے اس کی سوانح عمری چھپی ہے۔ اس میں کئی خطوط دئے گئے ہیں۔ اپنی ماں کے نام وہ ایک خط میں لکھتا ہے:

'پیاری ماں میں اس بڑے غم واندوہ کے لئے تمہیں دلاسا دے رہا ہوں۔ جو میری وجہ سے تمہیں لاحق ہوا ہے۔ میرے لئے اس کے بغیر اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ زندگی مصائب کا دوسرا نام ہے۔ اگر بیٹے مردوں کی طرح اپنی عزت و وقار کو قائم رکھنا چاہیں تو اسے کئی دفعہ ان کی ماؤں کو سخت رنج و ملال ہوتا ہے۔'

سابق سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے ملکوں کے ادب کا بڑا حصہ بیرون ممالک میں تخلیق ہوا ہے۔ کیونکہ بہت سارے ادیبوں کو نظریاتی اختلافات کی وجہ سے جلاوطن کیا گیا یا وہ خود فرار ہو گئے۔

بالشویکوں کی عنان حکومت سنبھالتے ہی اکثر قلم کاروں نے روس کو خیرباد کہا۔ ان میں کاپرن، بونن اور رینو خوف جیسے نامور اہل قلم [illegible] بورلیس پاسترنیک اسٹالین کی مداخلت سے فرار نہیں ہو سکا۔

بعد میں کینسر وارڈ اور کولگ آرچی پیلاگو کے نوبل انعام یافتہ مصنف [illegible] سولزے نٹسن اور جوزف برودسکی مغرب بھاگ گئے۔ پولینڈ سے [illegible] Czesland Miloez، رومانیہ سے فلسفی E.M. Cioran [illegible] Milan Kundera, Jaroslav Seifert, Joseph Skvorecky اور دوسرے بہت سارے قلم کار فرار ہوئے۔

انقلاب کے بعد کا بہترین ادب انتہائی ظلم و ستم اور مادی مشکلات کے ماحول میں پروان چڑھا۔ نابوکوف نے کیمونسٹ ملکوں میں لکھنے والوں کو یہ لوازمی [illegible] کرنے والا ادب، اور ٹریکٹر ناول کا نام دیا ہے۔

جلاوطن ہونے والے ادیبوں نے دیار غیر میں ادب کو پروان چڑھایا۔ ایک نقاد جارج اسٹینز نے جلاوطنی کے ادب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

'میرا وطن میرا ٹائپ رائٹر ہے'

جرمن فلسفی تھیوڈر ایڈورنو کہتا ہے۔ 'یہ معاشرتی زندگی کا دستور رہا ہے کہ اپنے گھر میں ٹھکانہ نہ ملے۔'

والٹیر اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا فرانسیسی ادیب ہونے کے باوجود فرانس کی اکادمی نے اس کو نظرانداز کیا۔ اس کے انتقال پر پیرس کے آرچ بشپ نے عیسائی مذہب کے مطابق اس کی نعش کی تجہیز و تکفین کرنے سے انکار کر دیا۔

انقلاب فرانس کے بعد انقلابیوں نے قبر سے اس کی نعش نکالی اور جلوس کی صورت میں کئی میل اس کے جنازہ کو اعزاز کے ساتھ گھما کر قبرستان لایا گیا۔ سڑک کے دو رویہ ہزاروں لوگ کھڑے تھے۔ جنازہ کے اوپر ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ جس پر لکھا تھا:

'اس نے انسانی دلوں کو بال و پر عطا کئے۔ اس نے ہم سب کو آزادی کے لئے تیار کیا۔'

اس کے جسد خاکی کے باقیات کو فرانس کے مشہور قبرستان Pantheon میں دفن کیا، جہاں فرانس کے مشاہیر اور سرکردہ افراد مدفون ہیں۔

ڈنمارک میں فلسفی سورن کریکیگارڈ نے کلیسا کے نظام میں اصلاحات لانے کے لئے تحریک چلائی۔ لیکن اس دور کے عیسائی عالموں نے اس کا غلط مطلب لیا۔ کریکیگارڈ کا مضحکہ اڑایا اور اس کے خلاف معاندانہ مہم چلائی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ ۴۲ سال کی عمر میں کسمپرسی اور بے بسی کے عالم میں مر گیا۔

قلم کار اور جیل خانہ:

'جسم کو قید کیا جا سکتا ہے لیکن فکر و ذہن کو قید نہیں کیا جا سکتا۔' (ہروے ڈےسے)

ہروے ڈے نے اپنی کتاب You too can write for money میں ایسے سو سے زائد قلم کاروں کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے اپنی قید و بند کے دوران جیل خانوں میں کتابیں لکھیں۔

جیلوں میں بہت ساری شاہکار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جیل خانوں میں کتابیں لکھنے والے چند معروف نام روجر بیکن، ڈی ہنسے، دوستووسکی، والٹیر، برٹرینڈ رسل، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، ژاں پال سارتر، اسکر وائلڈ، او ہنری کے نام [illegible]

حسرت موہانی، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، سردار جعفری، او ہنری سینکلر وغیرہ شامل ہیں۔

اپنی تحریروں کی وجہ سے والٹیر کو ۲۲ سال کی عمر میں دو دفعہ باسٹیلے کے بدنام زمانہ جیل خانہ میں رکھا گیا اور دو دفعہ ملک بدر کیا گیا۔ تب وہ فرانس میں سب سے بڑے قلم کار کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔

برٹرینڈ رسل نے اپنی مشہور کتاب Introduction to Mathematical Philosophy جیل میں لکھی۔ دوستوفسکی نے زندان میں اپنا شاہکار ناول 'جرم و سزا' کے علاوہ 'خاندانی دوست' لکھا۔ او ہنری کے لئے جیل خانے کی چاردیواری نعمت ثابت ہوئی۔ جہاں اس نے اپنی مقبول کہانیاں لکھیں۔ جون بنیان نے اپنی مقبول عام کتاب Pilgrim's Progress دوران قید لکھی۔ اپنے مذہبی نظریات کی وجہ سے انہیں جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ وہ بارہ سال قید میں رہے۔ کرینٹس نے Don Quixote جیل میں لکھنا جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ سر والٹر ریلے نے اپنی مشہور تاریخی کتاب اپنے چودہ سالہ جیل کے ایام کے دوران لکھی۔ ہٹلر نے اپنی سوانح حیات 'میری جدوجہد' جزوی طور پر جیل خانے میں لکھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے 'غبار خاطر' تحریک آزادی کے دوران احمد نگر کے جیل خانے میں لکھا جو ان کے علمی اور ادبی خطوط پر مشتمل ہے۔ سردار جعفری نے اپنی مشہور نظم 'پتھر کی دیوار' زنداں میں لکھی۔

آئرلینڈ کے ایک ڈاکٹر کرنل آر تھر لینچ کو بوئروں سے ہمدردی رکھنے کے الزام میں دو سال کے لئے جیل بھیجا گیا۔ لینچ ایک عالم بھی تھا۔ انہوں نے جیل خانہ میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا لیکن انہیں قلم اور کاغذ سے محروم رکھا گیا۔ ایسے میں آر تھر لینچ نے اپنے ذہن میں کتاب کے نفس مضمون کا خاکہ تیار کیا۔ دو سال بعد جب وہ رہا ہوا تو ایک اسٹینو گرافر کو املاء کر کے لکھوایا اور کتاب شائع کی۔

رسل براڈون نے ملایا میں جاپانی فوج کے قبضے کے دوران Railway of Death لکھا جو ایک مقبول عام کتاب ثابت ہوئی۔

اریک ولیم نے اپنی کتاب The Wooden House میں جرمن جیل کیمپ کے احوال دئیے ہیں اور قیدیوں کے اجتماعی فرار کا دلچسپ نقشہ کھینچا ہے۔ اس پر فلم بھی بنی ہے۔

کئی ذہین مجرموں کو جیل خانے میں لکھنے کی تحریک ملی ہے۔ ان میں ایک کریلیل چیس مان ہے۔ جس کے متعلق میڈیا نے بہت لکھا۔ اس نے قید خانے میں قانونی کتب کا مطالعہ کیا اور اپنے کیس کی خود پیروی کی۔ اس کی کتاب Death Row ان معتوب قیدیوں کی کہانی پیش کرتی ہے۔ جن کو موت کی سزا سنائی گئی ہے۔

ایک اور امریکی رابرٹ سٹراؤڈ نے دو آدمیوں کو قتل کرنے کے جرم میں پچاس سال کی قید کی سزا بھگت رہا تھا۔ جیل خانے میں اس نے پرندوں پر ایک مستند کتاب لکھی۔ جس میں پرندوں کے تئیں اس کے نرم گوشے کا جذبہ نمایاں تھا۔ اس تحریر کے لئے رابرٹ سٹراؤڈ کو Sobriquet Birdman of Alcatraz کے اعزاز سے نوازا گیا۔

بہت سارے لوگوں نے وہائٹ ہاؤس کو اس کی سزا تخفیف کرنے اور جیل سے رہائی کے لئے اپیل کی۔ بعد میں اسے رہا کیا گیا اور ستر برس سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود اس نے ایک قلم کار کی حیثیت سے زندگی کا آغاز کیا۔

قلم کار اور غریبی:

"اگر مجھے عیش و عشرت کے سامان سے آراستہ لیکن کتابوں سے خالی ایک محل اور کتابوں سے بھری پڑی ایک جھونپڑی میں سے ایک کو انتخاب کرنے کے لئے کہا جائے تو میں جھونپڑی کو ترجیح دوں گا۔" (میکالے)

بہت سارے قلم کاروں نے افلاس کے دن دیکھے تھے لیکن غربت ان کی تخلیقی راہ میں حائل نہیں ہوئی۔

چارلس ڈکنز نے اپنا بچپن انتہائی غربت میں گزارا تھا اس کا باپ اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا تھا۔ قرضہ ادا نہ کرنے کی وجہ سے اسے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ جس کے نتیجہ میں ڈکنس کی ماں اور بھائی بہنوں کو سخت مصائب جھیلنے پڑے۔ ڈکنز کو اکثر بھوکا رہنا پڑتا تھا۔ وہ چار سال سے زیادہ اسکول نہیں جاسکا۔ شروع میں اس کو چوہے بھری ایک کوٹھری میں بوتلوں پر لیبل لگانے کا ایک کام ملا۔ پھر جوتا پالش کرنے کی ایک فیکٹری میں کام کیا۔ اس کے بعد ایک وکیل کا کلرک بنا۔ پھر صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔

نوبل انعام یافتہ اپٹون سینکلر کی زندگی بھی چارلس ڈکنز کی مشابہ تھی۔ دس برس تک غریبی کی وجہ سے اسکول نہیں جاسکا۔ تب تک اپنی محنت سے پڑھنا لکھنا سیکھا اور ڈکنز اور تھیکرے سمیت دوسرے ادیبوں کی بیسوں کتابیں پڑھیں۔ اس کا باپ بڑا شرابی تھا۔ کمسن سینکلر رات کو اپنے باپ کی تلاش میں شراب خانوں کا چکر لگاتا تھا اور نشے میں مدہوش باپ کو گھر لے جاتا تھا۔ کالج میں اس کو پیسے کی تنگی رہتی تھی۔ اس کی ماں جیب خرچ کے لئے اس کو جزوی طور پر مدد کرتی تھی۔ تب نوجوان سینکلر کم معیار کے رسائل کے لئے ناول لکھنے لگا۔ اور معمولی رقم کے عوض لطیفے بیچنے لگا۔ کالج کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور طلبہ کے جریدوں کے لئے کہانیاں لکھنے لگا۔ ان سے وہ ہفتے میں چودہ ڈالر کماتا تھا۔ بیس سال سے کم عمر کے ایک قلم کار کے لئے یہ اچھی آمدنی تھی۔ اس طرح اس نے یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کی۔

انگریزی کے شاعر آلیور گولڈ اسمتھ گلی گلی گھوم کر اپنی نظمیں گویوں کو ایک ایک کراؤن میں فروخت کرتا تھا۔ یا سفر کے دوران بانسری بجا کر گزر بسر کرتا تھا۔ جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو اپنے پیچھے دو ہزار پونڈ قرضہ چھوڑا تھا۔

آج غالب پر فلم اور سیریلز بنے ہیں۔ جن سے دوسروں نے لاکھوں روپے کمائے ہیں۔ دیوان غالب کا دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ جس سے اچھی رائلٹی ملتی ہے لیکن خود غالب زندگی بھر تنگ دست رہے۔

اردو کے دوسرے شعرا جیسے میر، انشا، مجاز وغیرہ تنگ دست رہے۔ یہی حالت منٹو کی تھی۔ منشی پریم چند نے بڑی غریبی دیکھی۔ جو ان کی تحریروں سے بھی جھلکتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی پہلے لاہور میں کلرکی کرتے تھے اور تین تین روز مسلسل فاقے کرتے تھے۔

ہربرٹ اسپنسر، ہزلٹ، جین آسٹین اور او ہنری جیسے بلند پایہ قلم کار مفلوک الحال تھے۔ غریبی کی وجہ سے او ہنری اسکول میں تعلیم نہیں پاسکا۔ فلسفی اسپنوزا گھڑی ساز تھا۔

جان ڈرائیڈن نے اپنے دس ہزار اشعار تین سو پونڈ سے بھی کم قیمت میں فروخت کئے۔

ڈاکٹر جانسن نے اپنی ایک عزیزہ کی آخری رسوم ادا کرنے کے لئے اپنی بیش بہا تصنیف چند پونڈ میں بیچ ڈالی۔

میکسم گورکی نے اپنے گزارہ کے لئے مختلف چھوٹے چھوٹے کام کئے۔ ان کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود وہ پڑھنے کے لئے وقت نکال لیتا تھا۔

انیسویں صدی کا اہم ترین امریکی شاعر والٹ وہیٹ مین نے غریبی کی وجہ سے گیارہ سال کی عمر میں اسکول چھوڑا اور آفس بوائے سمیت کئی پیشے اختیار کئے۔

امریکہ کے ایک اور نوبل انعام یافتہ قلم کار ولیم فالکنر بھی بچپن میں غریب تھا۔ دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد مروجہ تعلیم کو خیر باد کہا اور روزگار تلاش کیا۔

کارل مارکس کا جب ننھا بچہ فوت ہوا تو اس کے پاس کفن تک خریدنے کے لئے پیسہ نہیں تھا۔ اس کی بیوی نے اپنے ہمسایہ میں رہنے والے ایک اجنبی سے کفن کے لئے روپیہ قرض لیا۔

چیخوف غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ تالستائی اور تارگنیف کی امارت اور اپنی مفلسی کا موازنہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے: 'انہیں قدرت کی طرف سے وہ شے تحفے میں مل جاتی ہے، جو ہم جیسے نچلے طبقے سے آئے ہوئے لوگوں کو اپنی نوجوانی کی آسائشیں دے کر خریدنی پڑتی ہے۔'

وہ اعتراف کرتا ہے کہ مفلسی اور محتاجی اس کی تخلیقی راہ میں رکاوٹیں بنیں۔

اسٹیفن کولینز فوسٹر امریکہ کا مشہور گیت کار گزرا ہے۔ بچپن سے ہی کولینز کو گیت لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے ماں باپ پریشان تھے کہ ان کا بچہ درسی کتابیں پڑھنے کے بجائے گیت لکھنے میں الجھا رہتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے فرمائش کی کہ اگر اس کو ایک سیٹی لا دی جائے گی تو وہ گیت لکھنا چھوڑ دے گا۔ اس کی فرمائش پوری کی گئی لیکن اس نے لکھنا نہیں چھوڑا۔

امریکی ادیب ٹرومن کاپوٹے نے بطور قلم کار اپنا سکہ بٹھانے سے پہلے مختلف کام کئے۔ وہ کشتی پر ناچنے والا، آفس بوائے اور فلموں کا اسکرپٹ پڑھنے والا بنا۔ انیس سال کی عمر میں اس کی کہانی Mirian کو او ہنری انعام ملا۔ بعد میں دوسری کہانی Shut a Final Door کو بھی اسی انعام کے لئے منتخب کیا گیا۔

انگریزی قلم کار تھامس کیم ڈن نے چودہ سال کی عمر میں ایک نائی کے ساتھ کام کیا۔ اس کو معمولی تعلیم ملی تھی۔ پھر سلائی کی ایک فیکٹری میں معمولی اجرت پر نوکری کی۔ دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی بمباری کے دوران وہ موم بتی کی مدھم روشنی میں لکھتا تھا۔ My Time, My Life اس کی کامیاب تصنیف ہے۔

کئی مفلوک الحال قلم کاروں نے محض اپنی بسر اوقات کے لئے لکھا۔ لوئیسا مے آلکوٹ اپنی بیمار ماں اور چھوٹی بہنوں کی کفالت کے لئے لکھنے پر مجبور ہوئی۔ شروع میں جب اس نے اپنی کہانیاں بھیجیں تو دھڑا دھڑ واپس آنے لگیں۔ ایک جریدے کے مدیر نے لوئیسا کو لکھا کہ وہ کبھی بھی اچھی کہانی کار نہیں بن سکتی ہے اور اسے سلائی کے کام میں پوری طرح جٹ جانا چاہئے۔ جب وہ بطور ادیبہ کامیاب ہوئی تو ہزاروں لوگ ہر سال اس کے گھر کی یاترا کرنے لگے۔

اسی طرح میری رابرٹس رینہارٹ نے اپنے اہل خاندان کے قرضے چکانے کے لئے ۴۴ کتابیں تصنیف کیں۔

قلم کار اور ان کے ناولوں کے کردار:

'ایک ادیب کے ذہن میں جب ایک جیتے جاگتے اور گوشت پوست کے انسان ہوں تو وہ اپنی تخلیق کو زندگی بخش سکتا ہے۔ جب تک (قلم کار) کسی زندہ انسان کو اپنے تخیل میں شامل نہ کرے، وہ بالکل کوئی کردار پیدا نہیں کر سکتا ہے۔'

(ترگنیف)

قلم کاروں نے زندۂ جاوید اور لافانی کردار دئے ہیں۔ قارئین انہی کرداروں کے ذریعے قلم کاروں کو جانتے ہیں۔

سر کینن ڈائل کے جاسوسی ادب کا کردار شرلاک ہومز غالباً سب سے معروف کردار ہے۔ اس پر ۱۷۵ سے زیادہ فلمیں بنی ہیں۔ ساری دنیا میں ہومز کے ان گنت پرستار اپنے ہیرو کے نام پر ایک یادگار تعمیر کرنے کی مانگ کرتے آئے ہیں۔ جاپان اور سوئٹزر لینڈ میں اس کی مورتیاں نصب ہیں۔ لندن کے ۲۲۱ بی، بیکر اسٹریٹ میں شرلاک ہومز میوزیم ہے۔ ہومز کے نام کے اس عجائب گھر میں اس کا اوور کوٹ، ٹوپی، کئی تمباکو پائپ، محدب شیشہ اور دوسری اشیا رکھی گئی ہیں جن کا ذکر کینن ڈائل کے چار ناولوں اور چھپن کہانیوں میں ہوا ہے۔

عجائب گھر میں ہومز کا دوست ڈاکٹر واٹسن بھی نظر آتا ہے۔ سر کینن ڈائل کی ایک تصویر بھی ہے۔ شرلاک ہومز کے کردار کا خالق اور کتابوں کا مصنف سر کینن ڈائل اپنے شہرہ آفاق سراغ رساں کیریکٹر کے مقابلے میں بالکل گمنام ہے۔ مصنف نے جب ایک واردات میں شرلاک ہومز کو مرتے دکھایا تو قارئین نے سخت احتجاج کیا۔ لندن میں جلوس نکلا اور سر کینن ڈائل کو نئے ناول The Return of Sherlock Holms میں اسے دوبارہ نئی زندگی دینی پڑی۔

اس دور کے ایک تنقید نگار نے لکھا ہے۔ 'شاید ہی کوئی افسانوی کردار اپنے پڑھنے والوں میں دلکش ہونے کے ساتھ اتنا حقیقی بھی رہا ہو گا۔'

جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے کہ مصنف نے ہومز کے کردار کو اسکاٹ لینڈ کے ایک غیر معمولی ذہین ڈاکٹر جان بیل سے متاثر ہو کر اختراع کیا تھا۔

شرلاک ہومز کے بعد اگاتھا کرسٹی کے عظیم سراغ رساں Hercule Poirot اور Miss Jane Marple مشہور کردار ہیں۔

ایک سراغ رساں کی حیثیت سے ۳۵ سال اپنے گوناگوں کارنامے دکھانے کے بعد مصنفہ نے Poirot کو ایک گاؤں میں سبکدوش کیا تھا لیکن وہ دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔ جب وہ ۹۰ سال سے زیادہ عمر کو پہنچتا ہے تو اگاتھا کرسٹی اپنے ناول Curtain میں اس کی قدرتی اور طبعی موت دکھاتی ہے۔ یہ ناول مصنفہ کے انتقال کے بعد چھپتا ہے۔ لیکن اس میں عمر رسیدہ سراغ رساں مس جین مارپل اپنے کارناموں کو جاری رکھتی ہے۔ کہتے ہیں مس مارپل میں مصنفہ کی دادی مسز مارگریٹ ملر کے کیریکٹر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

قلم کاروں نے عمومی طور پر اپنے کردار حقیقی زندگی سے لئے ہیں۔ Gone with the wind کے وجیہ کردار بھیٹ بٹلر مصنفہ کا پہلا شوہر ریڈ آپشا تھا۔ جس نے مصنفہ کو چھوڑ دیا اور خستہ حالی میں مر گیا۔

جارج آرویل نے اپنے اور اپنی بیوی کو مرکزی کیریکٹروں کے طور پر لیا ہے۔ گالزوردی کے ناول The Forsty saga کے اکثر کردار اس کے اپنے گھر سے

تحریر کئے ہیں۔

چارلس ڈکنز کے ناولوں کے کردار جیتے جاگتے انسانوں سے لئے گئے ہیں۔ جن [illegible] اس کے ناشر ایڈورڈ چیپ مین شامل ہیں۔ [illegible] ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتا تھا۔ اور جب کوئی کردار مر جاتا [illegible] آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور آنسو صفحات پر گرتے تھے۔

ای۔ ایم۔ فارسٹر کے A Passage of India کا اہم کردار ڈاکٹر عزیز اصل میں ایک پنجابی سید راس مسعود تھا۔ اپنے سفر کے دوران وہ ان کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ فارسٹر لکھتا ہے: 'ہم سب یہ بہانہ [illegible] کرتے ہیں کہ کردار حقیقی انسان نہیں ہوتے۔ اگرچہ یہ حقیقی ہوتے ہیں۔'

فلابرٹ کے ناول میڈم بواری کی مرکزی کردار ایک امیر زمیندار کی رنگین مزاج بیٹی تھی۔ جو بعد میں زہر کھا کر مر گئی تھی۔

ٹالسٹائی کی تند مزاج بیوی سونیا نے مصنف کی ازدواجی زندگی میں تلخی گھول دی تھی۔ اس کے ناول کی کردار Madam Pozdnuishelf اس کی اپنی بیوی تھی۔ ناول کا یہ فقرہ 'ہم دونوں مجرم تھے' جو ایک ہی زنجیر میں بندھے زندگی بھر کے لئے قید بامشقت جھیل رہے تھے۔' ازدواجی زندگی کی بدمزگی سے متعلق ٹالسٹائی کی دلی کیفیت کی غمازی کرتا ہے۔

ایف۔ اسکاٹ فیٹز جیرلڈ کے Tender is the Night میں زیلڈا جزوی طور پر اس قلم کار کی بیوی تھی۔

برنارڈ شا نے اعتراف کیا ہے کہ اس کا ایک کردار جارج سیمی لے لنکن کالج کا ایک سینئر ٹیوٹر تھا۔

سر والٹر اسکاٹ کی ایک دلنشیں کردار ربیکا فلاڈلفیا کے ایک امیر یہودی تاجر کی بیٹی ربیکا گراٹز تھی۔

مارک ٹوئین کے ناول Prince and Pauper کے مشہور کردار ہیکلبیری فن مصنف کی جوانی میں قصبے کا ایک لڑکا تام بلینکن شپ تھا۔

سامرسٹ مام نے ایک ناول نگار ہاگ والپول کو اپنے ایک ناول میں ایک کردار Alroy Kear کے روپ میں منفی طور پر پیش کیا۔ والپول نے یہ جان لیا کہ اس کو ہدف بنایا گیا ہے اور مام کو ایک احتجاجی خط لکھا۔ مام نے جواب میں لکھا کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ والپول کے انتقال کے بعد مام نے تسلیم کیا کہ یہ والپول ہی تھا۔

مام لکھتا ہے: 'مجھ پر الزام عائد کیا گیا ہے کہ میں نے اپنے کردار زندہ انسانوں سے لئے ہیں...... مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ جیتے جاگتے ماڈلوں سے کردار لینا نہ صرف آفاقی ہے بلکہ ضروری بھی ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ قلم کار اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کیوں ندامت محسوس کرے۔'

سمرسٹ مام نے اپنے ناول Cake and Ail میں ایک اہم کردار ناول نگار تھا مس ہارڈی کے نمونے پر پیش کیا ہے۔

دشمن ساز فلپ ہیزل ٹائن نے ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے ناول Women in Love میں ایک کیریکٹر جولیس ہالیڈے کو اپنے روپ میں دیکھا اور ہتک عزت کے لئے لارنس کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی دی۔

لارنس کی سیمابی فطرت کی ایک نسوانی کردار فرائی ڈا سے متاثر ہو کر چار ناول نگاروں نے اسے اپنی تخلیقات میں مختلف ناموں سے پیش کیا۔

لارنس خود کئی ناول نگاروں اور کہانی کاروں کا کردار رہا ہے۔ ان میں الڈوس ہکسلے کا کام Point Counter Point شامل ہے۔

بالزاک کے ایک نسوانی کردار فوئی ڈورا سے متعلق ۰۷ عورتوں نے الگ الگ یہ دعویٰ کیا کہ وہی فوئی ڈورا ہے۔ جسے بالزاک نے اپنے ناول میں اجاگر کیا ہے۔

آر۔ ایل۔ اسٹیونسن کے کیریکٹر ڈاکٹر جے کیل اور مسٹر ہائیڈ ے ایڈن برگ کے ایک شخص بروڈائی کیبنٹ میکر کے دین ہیں۔ جو دن کو ایک معزز تاجر اور رات کو ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا سرغنہ تھا۔

الیگزنڈر ڈوما کے ناول Camille کی کہانی اس کی زندگی کے ایک حادثے پر مبنی ہے۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی سار لیس پلا سیس پر فریفتہ ہوا جو تین سال بعد تپ دق سے چل بسی۔ یہی ناول کا مرکزی کردار ہے اور اس کا نام Armand رکھا گیا ہے۔

آسکر وائلڈ کی کہانی The Picture of Dorian Gray کی تفہیم اتفاقیہ طور پر اپنے آرٹسٹ دوست باسیل وارڈ سے ملی، جو ایک خوبصورت نوجوان کی شبیہ بنانے میں مگن تھا۔

ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں تاریخ کے اہم کرداروں کو دوسرے ناموں سے پیش کیا ہے۔

ڈی۔ ایچ لارنس سمیت کئی ناول نگاروں نے ایک ہی کردار میں کئی دوسرے کرداروں کی خصوصیات سمو کر پیش کی ہیں۔

اب ہم پھر جاسوسی ادب کے چند مقبول اور مشہور کرداروں کی طرف آتے ہیں۔ آئین فلیمنگ کے جیمز بونڈ ایجنٹ 007 اور M چند زندہ کرداروں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان میں انگلینڈ کے ایک خفیہ محکمے کا ایک سابق ڈائریکٹر جنرل مورس اولڈ فیلڈ شامل ہے۔ جیمز بونڈ کا مشہور کردار دوسری عالمی جنگ کے ایک بڑے جاسوس Dusko Ropov سے متاثر ہو کر اختراع کیا۔ یوگو سلاویہ میں پیدا اس نامور جاسوس نے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک کے درمیان برطانیہ کے لئے کام کیا تھا اور نازی آسکریٹ سروس تک رسائی حاصل کی تھی۔ وہ خطرناک صورت حال میں بھی پرسکون رہتا تھا اور جیمز بونڈ کے کیریکٹر کے عین مطابق ٹھاٹ سے زندگی بسر کرنے کا شیدا اور خوبصورت عورتوں کا رسیا تھا۔

فلیمنگ کی موت کے بعد جیمز بونڈ اور M غائب ہوئے اور لاکھوں قارئین اپنے محبوب ہیروؤں سے محروم ہو گئے۔

ایرے اسٹینلے گارڈنر کے سو سے زیادہ ناولوں کا ہیرو پیری میسن بھی مصنف کی موت کے بعد صفحہ ہستی سے غائب ہو گیا۔

چودہ جاسوسی ناولوں کے قلم کار کولین ڈیکسٹر اپنے ماہر سراغ رساں انسپکٹر مورسے کو ایک روز موت سے ہمکنار کرتا ہے۔ ایک مضمون نگار کے مطابق اس کا سبب مصنف کے لئے مزید تخیل آرائی کا فقدان تھا۔

(جاری)

☆☆☆

منیب الرحمن

خدا کی باتیں

جو ہو چکا اس کا غم کرو مت
کہ وہ اٹل ہے
جو ہونے والا ہے اس کے امکان سے ڈرو مت
کہ اس کا احساس بے محل ہے
تم آنے والے دنوں کی باتوں پہ دل دھرو مت
کہ شک پرستوں کا یہ عمل ہے
یہ زندگی صرف دن کے دن ہے
یہ رازِ ہستی کا ماحصل ہے
کہ وقت کو سوجھتے ہیں ہر دم نئے بہانے
خدا کی باتیں خدا ہی جانے

سراب

ایک دن ہم نے اس بیاباں میں
دشت بے آب، خاک ویراں میں
فصل گل کا سراغ پایا تھا
ایک ایسا چمن لگایا تھا
جس میں ہر پھول رنگ لاتا تھا
اور ہر پیڑ لہلہاتا تھا
انسیت کے گلاب کھلتے تھے
لوگ اک دوسرے سے ملتے تھے
اس چمن کی مگر بہار گئی
اس سے امید برگ و بار گئی
جب بشر کے لئے کمال نہیں
کوئی شے اس کی بے زوال نہیں
ہر عمل زندگی کا فانی ہے
بس تصور ہی جاودانی ہے
آہ شاید فقط سراب تھا وہ
پھر بھی کتنا حسین خواب تھا وہ

دل کی سیر گاہیں

ملیں گے کوہِ الم دل کی سیر گاہوں میں
چلے ہی جاؤں گا میں زندگی کی راہوں میں

طلوع ہوگا امیدوں کی اوٹ سے سورج
کٹے گی رات جو مایوسیوں کی آہوں میں

یہ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار اور یہ چمن
کھلی ہے وادیٔ آغوش تیری باہوں میں

ہزاروں خواہشیں سینے میں جاگ اٹھتی ہیں
نہ جانے کون سا جادو ہے ان نگاہوں میں

صدائیں آتی ہیں پھر روح کی خموشی سے
دعائے زیرِ لبی جیسے خانقاہوں میں

شاہین

ہم سا آخر کون ہے؟

جاگتے میں خواب دیکھیں
اور ہم خوابوں میں جاگیں
کتنی دنیائیں اکیلے ساتھ لے کر
بے ارادہ
رات بھر آوارہ سے پھرتے رہیں

کون سی آواز ہے
کون سی آواز کی خوشبو ہے
جس کا ہم تعاقب کر رہے ہیں
کون سی آواز کی خوشبو کا جادو ہے
کہ ہم جس کی طرف کھنچتے چلے جاتے ہیں
کچھ کھلتا نہیں!

ہم ہی وہ آواز ہیں شاید
خرابے میں وگرنہ
ہم سا آخر کون ہے؟

پشتارہ

پاؤں پر میرے
تری نیکی کا پشتارہ گرا
پاؤں زخمی ہوتے ہوتے رہ گیا
(شکر خدا!)
جوتیوں سے میری لیکن
داغ جاتے ہی نہیں

Post Box 2276, Station D, Ottawa, Ontario, Canada, K1P 5W4

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ
ترجمہ: ظفر اسعدی ظفر

کھوکھلے انسان

ہم کھوکھلے انسان ہیں / ہم کھنچا انسان ہیں
ایک دوسرے کار جحان
ہائے! ہمارے سر میں بھوسا بھرا ہے
ہماری خشک آواز، جب
ہم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں
مدھم اور بے معنی ہوتی ہے
جیسے کہ سوکھی ہوئی گھاس میں ہوا چلے
یا سوکھی ہوئی گھاس پر چوہا چلے
ہمارے اجڑے ہوئے تہہ خانہ میں
ٹیڑھا میڑھا اس کا نقشہ، بغیر رنگی ہوئی چھت
مفلوج طاقت، بے حس اشارے
وہ جو گزرا ہے
سیدھی نگاہوں کے ساتھ، موت کی دوسری سلطنت کو
ہمیں یاد کرے۔ پوری طرح بھولے ہوئے کی طرح نہیں
ہر جوش دل کے ساتھ، لیکن صرف
کھوکھلے انسان کی طرح / گرے ہوئے انسان
خواب میں میں آنکھیں ملانا نہیں چاہتا ہوں
موت کی خواب کے سلطنت میں
یہ نہیں موجود رہتے ہیں / وہاں آنکھیں ہوتی ہیں
سورج کی روشنی ٹوٹے ہوئے ستون پر / پیڑ جھکتا ہے
اور آوازیں ہوا کے گانے کی آتی ہیں
بہت دور اور بہت شاندار
مرجھایا ہوا تارہ سا / میرا کوئی قریبی نہ ہو
موت کے خواب کی سلطنت میں
مجھے پہننے دے بھی / جیسا میں سوچتا ہوں بھیس بدلنا
چوہے کا کوٹ، کوّے کی جلد ہمیشہ / کھیت میں
میرے ساتھ سلوک کر جیسا کہ ہوا کرتا ہے
کوئی قریبی نہیں
نہ کوئی آخری اجلاس
آدھی رات اور آدھے دن کی سلطنت میں
یہ مری ہوئی زمین ہے / یہ ناگ پھنی کی سرزمین ہے
یہاں پتھر کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں، یہاں وہ پاتے ہیں
ہاتھ جوڑے ہوئے مرے ہوئے انسانوں کو
ٹمٹماتے ہوئے اور بجھتے ہوئے ستاروں کے نیچے
کیا یہ اسے پسند کرتے ہیں / موت کی دوسری سلطنت میں
تنہا جاگنا / اس وقت، جب ہم
کمزوری سے تھرتھرا رہے ہوتے ہیں
ہونٹ جنہیں بولنا چاہیے
بچی کی طرح سے ٹوٹے ہوئے پتھر کو
آنکھیں نہیں ہیں یہاں / یہاں کوئی آنکھ نہیں ہے
اس مرتے ہوئے ستاروں کی وادی میں
اس ویران گھاٹی میں
ہماری اس کھوئی ہوئی سلطنت کے ٹوٹے ہوئے درّے میں
آخری اجلاس کی جگہ
ہم ایک دوسرے کو ٹٹولتے ہیں
اور بولنے سے کتراتے ہیں
پھولے ہوئے دریا کے ساحل پہ جمع ہوئے
کوئی نظارہ نہیں، جب تک نہیں
آنکھیں دوبارہ لوٹیں / لگاتار چمکتے تاروں کی طرح
رنگارنگ گلاب
موت کی آدھی رات اور آدھے دن کی سلطنت کی
صرف امید / کھوکھلے انسانوں کی
یہاں ہم صرف نوکیلے ناگ پھنی کا چکر لگاتے ہیں
ناگ پھنی کا۔ ناگ پھنی کا
یہاں ہم صرف نوکیلے ناگ پھنی کا چکر لگاتے ہیں
صبح کے پانچ بجے / تجربہ اور حقیقت کے درمیان
حرکت اور عمل کے درمیان / سایہ پڑتا ہے
تمہارے لئے ہے سلطنت
خیال اور تخلیق کے درمیان
جذبہ اور جواب کے درمیان / سایہ پڑتا ہے
زندگی بڑی لمبی ہے
حسرت اور کشمکش کے درمیان
قوت اور ہستی کے درمیان
تفہیم اور ڈھلان کے درمیان / سایہ پڑتا ہے
تمہارے لئے ہے سلطنت
تمہارے لئے ہے / زندگی ہے / تمہارے لئے ہے یہ
یہ وہ راستہ ہے جہاں دنیا ختم ہوتی ہے
آواز کے ساتھ نہیں۔ صرف ریں ریں کرتی ہوئی

پیترا پور، خالق نگر، گوری ہار، مظفر پور، (بہار)

عاقل زیاد

معذرت

میں اپنا جائزہ لے لوں
ذرا ٹھہرو
تمہیں دھوکہ نہیں ہوگا سمجھنے میں
مری مٹی پہ مت جاؤ
مرے ڈھانچے کو مت دیکھو
ادھر اک آگ رہتی ہے / سلگتی ہے نہ بجھتی ہے
مرے احساس کو ہر دم / جلاتی ہے
مری مٹی پہ مت جاؤ
مرے ڈھانچے کو مت دیکھو
نہیں کچھ بھی نہیں ہوگا / مرے پہلو میں بیٹھو تم
مری آنکھوں میں دیکھو تم
اسے اک آئینہ سمجھو مرے دل کا
فصیلیں قید و بندش کی بہت مضبوط پاؤ گے
میں ان سے بھاگ پاتا ہوں
نہ ان سے بھاگ سکتا ہوں
.......ہشش
یہ آوازیں سنو شاید
کسی مسجد کی میناروں سے آتی ہیں
چلو کچھ دور چلتے ہیں
یہاں سے ہٹ کے ملتے ہیں
ذرا سی دیر میں آکر
یہاں اک بھیڑ ٹھہرے گی
انہیں کچھ بھی نہیں معلوم وہ کیا ہیں
وہ مجرم ہیں!
وہ مجرم ہیں، رہیں گے بھی / اف......"
معاذ اللہ
مری مٹی پہ مت جاؤ
مرے ڈھانچے کو مت دیکھو
میں شرمندہ ہوں تم سے دوست
کہ میں خود بھی انہیں میں ہوں!

وارث نگر، سمستی پور، ۸۴۸۱۳۳

غزلیں

فضیل جعفری

خواہشیں ہیں، قصے ہیں، بے شمار ارماں ہیں
ڈاکیے کے تھیلے میں کیسے کیسے طوفاں ہیں

حال ادب کا اب یہ ہے، طبلے اور سارنگی
لکھ رہے ہیں تنقیدیں "پاگلیں" غزل خواں ہیں

شہر ہوں کہ صحرا ہوں، دشت ہوں کہ دریا ہوں
سب سے بھاپ اٹھتی ہے، سب شرار ساماں ہیں

جسم ہو گیا ڈھیلا، جلد پڑ گئی پیلی
دل کے سلسلے لیکن، عمر سے گریزاں ہیں

یہ جو میر منشی ہیں، یعنی جعفری صاحب
یہ بھی اپنے وقتوں کے سرگروہ زنداں ہیں

سیکٹر ۱۷/۱۱ اے، ۳۰۱، ۳/ شانتی نگر، میرا روڈ، تھانے

اختر سعید خاں

دل میں جب حسرتِ دیدار کی اک شمع جلی
پھر وہی ہم تھے، وہی در تھا، وہی اس کی گلی

بجھ گئی پھر شبِ امید کی لو پچھلے پہر
خواب آنکھوں میں لئے ہجر زدہ رات چلی

زندگی حسنِ یقیں ہو کہ شبستانِ گماں
اک کہانی تھی سنا آئے بری ہو کہ بھلی

ہم سے کیا پوچھتے ہو صبحِ بہاراں کا عروج
ہم نے کھلتے ہوئے دیکھی ہی نہیں دل کی کلی

ہم قدم کوئی نہ تھا رہگزرِ ہستی میں
عمر بھر اپنی ہی پرچھائیں مرے ساتھ چلی

لوگ اب پوچھتے ہیں، ہنس کے وفا کا مفہوم
تھا یہی حرف کبھی زیست کا عنوانِ جلی

یوں نہ دیوانہ بنو ہوش میں آؤ اختر
دل کی وارفتگی اک عہد میں لگتی ہے بھلی

(۲)

پرسشِ حال کی حسرت بھی نہیں
تم نہ پوچھو تو شکایت بھی نہیں

زخم خود بول اٹھے گا منہ سے
ہم کو فریاد کی عادت بھی نہیں

تھیں جو عنوانِ محبت کل تک
اب ان آنکھوں میں مروت بھی نہیں

کیجیے کیا ان سے تغافل کا گلا
یاد انہیں عہدِ رفاقت بھی نہیں

کم نہیں دشت سے ویرانۂ دل
عشق کو اب سرِ وحشت بھی نہیں

گر نہیں لب پہ تبسم نہ سہی
زندگی اشکِ ندامت بھی نہیں

جلوہ سامانیٔ ہستی معلوم
نہ سہی خواب، حقیقت بھی نہیں

شعلۂ عشق سلامت اختر
تیرگی رات کی قسمت بھی نہیں

۲۰۔ اندرون اتوارہ، بھوپال

غزلیں

کرشن کمار طور

مقام کوئی نہیں ہے ہوا کے پھرنے کو
ذرا سی دیر ہے راہ وفا کے پھرنے کو

یہاں پہ صورت احوال ہے کچھ اور ہی اب
یہ باغ عشق نہیں مسکرا کے پھرنے کو

ہمیں تو کاسۂ زہراب جان پڑتا ہے
یہ لوگ کچھ کہیں آب بقا کے پھرنے کو

وفا پہ اتنا بھی اب اعتبار کیا کرنا
یہ کاروبار زیاں ہے سدا کے پھرنے کو

بس ایک پل میں بدلتا ہے سارا نظم جہاں
یہاں پہ دیر بھی کیا ہے ہوا کے پھرنے کو

نہ کام آئے گی اے طورؔ کوئی بھی تدبیر
لگے کا وقت ابھی زخم اتا کے پھرنے کو

(۲)

چلے جہاں میں پھر ایسی ہوا دوبارہ کہاں
تمام ہوتا ہے کار فنا دوبارہ کہاں

بس ایک بار ہی ہوتا ہے فضل چشم کرم
چمکتا ہے سر دل یہ خدا دوبارہ کہاں

اسے جو دیکھا تو ساری ہوس ہوئی پوری
جنوں میں ملتی ہے اس کی رضا دوبارہ کہاں

پرانی چیزیں تو اکثر پرانی ہوتی ہیں
نیا ملے بھی تو اس میں نیا دوبارہ کہاں

چلو یہ آنکھیں کسی سرد روشنی پہ دھریں
کہ ایسی عالم ہو میں صدا دوبارہ کہاں

میں اس کے سامنے کمیاب ہوں اگر اے طورؔ
نظر مجھے بھی وہ آیا بھلا دوبارہ کہاں

134/E کھنیارا روڈ، دھرم شالہ ـ ۱۷۶۲۱۵

پی۔ پی سریواستو ارند

یہ معمہ ذہن میں اکثر ابھرتا ہے تو کیوں
روح کوئی جسم سے آزاد کرتا ہے تو کیوں

یہ سلگتا سرخ سورج، دھوپ کا لشکر لئے
گھوم پھر کر میری ہی چھت پر اترتا ہے تو کیوں

وہ تو آئینے بناتا تھا مگر اب اس طرح
اپنے ہی کمرے کے آئینوں سے ڈرتا ہے تو کیوں

جب برہنہ رات تنہائی سے ملتی ہے گلے
ایک گونگا شور گھر بھر میں ابھرتا ہے تو کیوں

دھوپ رخصت ہو تو پھر خوابوں کی چادر اوڑھ کر
غم کا سایہ صحن میں اکثر اترتا ہے تو کیوں

چاند سو جاتا ہے جب خوابوں کی چادر اوڑھ کر
اک پرانا نقش پلکوں پر ابھرتا ہے تو کیوں

رندؔ دروازے پہ میرے روز اک گہرا سکوت
دستکیں دیتا ہوا پل بھر ٹھہرتا ہے تو کیوں

آر ۱۶/۱، سیکٹر IX، نوئیڈا ـ ۲۰۱۳۰۱

غزلیں

اقبال کرشن

تو وہ شجر ہے جسے کوئی گرا نہ سکا
تو وہ حجر ہے جسے کوئی ہلا نہ سکا

لے کے چلا تو تھا اصحاب فیول بہت
کعبۂ دل کو مرے ابرہہ ڈھا نہ سکا

میرا قصور بس اتنا ہے کہ چہرہ کھلا
خط کو ترے میں کسی سے بھی چھپا نہ سکا

تو وہ چراغ جسے کوئی بجھا نہ سکا
میں وہ چراغ جسے کوئی جلا نہ سکا

رخ سے نقاب الٹ تو دیا پر مرے دوست
آئنہ کوئی زمانے کو دکھا نہ سکا

تو وہ ہدف ہے جسے کوئی بھی پا نہ سکا
میں وہ خدنگ جسے کوئی چلا نہ سکا

۳۲ڈی، ساگر دت لین، کولکاتا۔ ۷۰۰۰۲۳

رحمٰن واگلے ساز

خاموشیِ لب ضبطِ جفا بھی ہے کوئی چیز
پر جرأتِ اظہار وفا بھی ہے کوئی چیز

اٹھتے ہیں اب دستِ طلب بارہ کرم سے
ٹوٹے ہوئے پر دل کی دعا بھی ہے کوئی چیز

یاں مرضی کی مختار ہے خود فطرت آزاد
اے کاتبِ تقدیر رضا بھی ہے کوئی چیز

اب آکے ذرا عہد وفا کا تو بھرم رکھ
ترسی ہوئی آنکھوں میں قضا بھی ہے کوئی چیز

زرخیز ہوں سنگسار بھی گر اپنے لہو سے
نفرت کی مگر آب و ہوا بھی ہے کوئی چیز

ہے تیز جو یہ آتشِ جنگ امن کے رہبر
پرخون شہیدانِ وفا بھی ہے کوئی چیز

مسجد میں سدا ہوتی ہو سجدوں کی نمائش
دل جیسی عبادت کی جگہ بھی ہے کوئی چیز

مجبور ہو گر زیر نفس طائر آزاد
پر بازوئے بسمل کی ندا بھی ہے کوئی چیز

سمجھا ہے کوئی ساز کے افکار پریشاں
پر اہل نظر طرزِ ادا بھی ہے کوئی چیز

لاس انجلس، امریکہ

محسن جلگانوی



وہ سلیقے سے مری فصل ہنر کاٹتا ہے
بخش دیتا ہے مرے ہاتھ تو سر کاٹتا ہے

دھوپ کے شہر میں پانی کا سفر کاٹتا ہے
ریگِ صحرا کو مرا دیدۂ تر کاٹتا ہے

سبز جاں ہوں کہ میں بنجر نہیں ہونے پاتا
دستِ ساعت تو مجھے شام و سحر کاٹتا ہے

پاؤں میں سیل رواں ہے مرے میں جانتا ہوں
کس جگہ کون مری راہ گزر کاٹتا ہے

آہنی پنجرے میں پانی کی پھواریں دے کر
میرا ہمدرد مری جنبش پر کاٹتا ہے

۷/۱۵۰۵، شانتی گارڈن، نچارم، حیدر آباد۔۷۶

جھرجھری

جھرجھری ایک لمحاتی کیفیت ہے۔ اس کا درس نہیں دیا جاتا کیونکہ اس کی تفہیم اور تشریح خاصی مشکل ہے۔ یہ محسوس کئے جانے کی کیفیت ہے، بیان کئے جانے کی نہیں۔ جھرجھری کی میعاد حیات بہت مختصر ہوتی ہے، بس پل دو پل بلکہ بعض صورتوں میں یہ نصف پل میں ہی دم توڑ دیتی ہے۔ اس کا حال ذرا یوں سمجھئے کہ یہ آتی تو ہے لیکن اس کے آنے اور جانے میں کوئی خاص وقفہ نہیں ہوتا۔ یوں آئی اور یوں گئی اس کا معمول ہے۔ (جو جھرجھری دیر تک برقرار رہے اسے لرزہ کہا جاتا ہے) اس کیفیت کا حال یہ ہے کہ جب آتی ہے تو آدمی کو تقریباً ہلا دیتی ہے اور آدمی سر سے پاؤں تک (پاؤں سے سر تک نہیں) نہایت ملائم طور پر لرز جاتا ہے۔ ملائم کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا کہ آدمی پر جھرجھری کا وارد ہونا اتنا لطیف اور سبک ہوتا ہے کہ صرف وہی آدمی اسے محسوس کرتا ہے۔ اس کے قریب یعنی بہت ہی قریب بیٹھنے والا شخص بھی اپنے ہم نشین کی اندرونی صورت حال سے قطعی طور پر لاعلم رہتا ہے۔ جھرجھری جمال ہم نشیں تو ہے نہیں کہ ایک سے دوسرے میں منتقل ہو سکے اور نہ چھینک ہے کہ آئے تو ایک دو کو نہیں، تین چار سوئے ہوئے لوگوں کی نیند اچاٹ دے۔ جب کوئی شخص آتی چھینک کو راستے ہی میں روکنے کی کوشش کرتا ہے تو خود اس کا حلیہ تو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہی ہے چھینک بھی ایک آہ میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے لیکن یہ صدا دئے بغیر جاتی نہیں ہے جب کہ جھرجھری ایک بے آواز ساز ہے۔ یہ اندر ہی اندر گنگناتی ہے اور فی الفور رفع ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر البتہ دیرپا ہوتا ہے۔ کچھ جھرجھریاں نیم پختہ ہوتی ہیں۔ یہ جھرجھری ہو کر بھی جھرجھری سی ہوتی ہے۔ آدمی پڑھا لکھا ہو اور اس کی جبلت میں شعر فہمی کے کچھ عناصر ہوں تو یہ نیم پختہ جھرجھری، میر تقی میر کے اشعار کی یاد دلاتی ہے۔ (میر کا شعر اس وقت یاد آتا ہے جب آدمی جھرجھری سے فارغ ہو کر پر سکون ہو جاتا ہے) اس سے پہلے نہیں۔ (حوالے کے لئے یہ مصرعہ دیکھئے۔ ساری مستی شراب کی سی ہے)

اب جھرجھریاں بہت کم آنے لگی ہیں۔ آدمی میں عصری حسیت تو زیادہ ہو گئی ہے لیکن فطری حسیت پر اوس سی پڑ گئی ہے۔ سڑک کے کنارے رکھے ہوئے کچرے کے ڈبے کے گرد کمسن بچوں کو جستجو میں معروف دیکھ کر راستہ چلنے والوں کے جسم میں پہلے جھرجھری آتی تھی، اب نہیں آتی۔ اس لئے نہیں آتی کہ اگر اسے خرابی کا نام بھی دیں تو اس تغیر کا ایک پہلو یہ ہے کہ بھکمری کے اعداد و شمار، جرائم کے اعداد و شمار سے کم ہوتے ہیں۔ یہ کچھ کم کارنامہ نہیں ہے۔

تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو جھرجھری کے کئی اہم واقعات آج بھی ایک قسم کی سنسنی پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈارون کا واقعہ لے لیجئے۔ ہم نے کہیں پڑھا تھا کہ ایک دن یہ اپنے خانہ باغ میں کسی درخت پر چڑھ کر چیل کے گھونسلے میں ماس تلاش کر رہے تھے تو ایک بندر کسی دوسرے درخت پر بیٹھ کر ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ دل ہی دل میں شاید ہنس بھی رہا ہو۔ اس کے ہنسنے کی خبر تو ڈارون جی کو نہیں ملی لیکن اسے منہ چڑاتے دیکھ کر ان کے جسم میں جھرجھری سی آگئی۔ (اگر یہ مکمل جھرجھری ہوتی تو موصوف ضرور درخت سے گر کر اپنی ٹانگ توڑ بیٹھتے) غصہ تو نہیں آیا تھا لیکن گھر پہنچ کر وہ غور و فکر میں تقریباً محو ہو گئے۔ آنکھوں میں بندر کی شکل گھومتی رہی۔ اسی غور و فکر کے دوران انہوں نے اپنا اور بندر کا موازنہ بھی کر ڈالا اور ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر بندر کے دم نہ ہوتی تو یہ بھی کام کا آدمی ہوتا۔ یوں نکمانہ رہ جاتا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اچھل پڑے اور چونکہ انہیں درختوں سے بے حد دلچسپی تھی اس لئے انہوں نے اپنا 'شجرہ' بندر تک پہنچا دیا اور جب لوگوں نے ان کا شجرہ پڑھا تو ان میں سے بہتیرے غش کھا کر گر پڑے اور جن کے دل مضبوط تھے انہیں جھرجھری آگئی۔ یہ واحد جھرجھری تھی جو برسوں تک سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر ہر اس شخص پر وارد ہوتی رہی جس نے بھی یہ شجرہ دیکھا۔ اب یہ قصہ ختم ہو چکا ہے۔ اتنا ختم ہو چکا ہے کہ پہلے آتی تھی ڈارون پہ ہنسی۔ اب اسی بات پر نہیں آتی۔

جھرجھری کا دوسرا اہم واقعہ کولمبس کا ہے۔ ہمیں ٹھیک سے یاد نہیں ہے کہ کولمبس والی واردات، ڈارون کی واردات سے پہلے واقع ہوئی تھی یا بعد میں لیکن واردات واردات ہوتی ہے اس میں تقدیم و تاخیر کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ (اب یوں سمجھئے دوسری جنگ عظیم، پہلی جنگ عظیم سے پہلے واقع ہوتی تو فرق کیا پڑتا۔ یہی نا کہ ایٹم بم کچھ سال پہلے گرا دیا جاتا) یہ کولمبس، ہمارا خیال ہے طبعاً شریر آدمی تھے۔ تجسس کا مادہ اور کسی مہم پر جانے کا جوش و جذبہ تو ان میں تھا ہی لیکن شرارت کا مادہ بھی مقدار میں اسی کے لگ بھگ تھا۔ گھر سے وہ کچھ اور کہہ کر نکلے تھے لیکن ایک

۱۹۔ الہلال، ۱۳ باندرہ ریکلیمیشن، ممبئی۔ ۴۰۰۰۵۰

اسکولی بچے کی طرح اسکول کی سمت جانے کی بجائے دوسری طرف نکل آئے۔ یہ اپنی کشتی پر سوار ہو کر سمندر کے سفر پر روانہ ہو گئے اور آپ جانتے ہیں سمندر میں راستے نہیں ہوتے نہ نیشنل ہائی وے نہ گلی کوچے، سمندر میں بس سمندر ہوتا ہے۔ سمندر میں یہ اپنی کشتی جو ادھر ڈوبی اودھر نکلی کا قولی دہرا رہی تھی، بمشکل تمام چلا رہے تھے اور ہر لمحہ ایک جھر جھری ان پر نازل ہو رہی تھی ایک جھر جھری ختم نہیں ہوتی تھی کہ دوسری شروع ہو جاتی تھی۔ ان کا پورا سفر جھر جھری ہی کے سائے میں جاری رہا لیکن آدمی بچپن ہی سے خوش قسمت واقع ہوئے تھے۔ ان کا پورا نام کرسٹوفر کولمبس تھا اور یہ رہنے والے اٹلی کے تھے لیکن رہتے اسپین میں تھے۔ اپنے وطن میں خوش تھے۔ بس ہوس سیر و تماشا میں وطن کو خیر باد کہہ کر نکل پڑے۔ تاریخ عالم میں یہ پہلی ہجرت اور اپنی نوعیت کی واحد جھر جھری تھی جو بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور امریکہ جیسا دور دور تک پھیلا ہوا ملک منظر عام پر نمودار ہو گیا۔ آج امریکہ میں کولمبس کے قد آدم بلکہ قد آدم سے دگنی قامت کے مجسمے جگہ جگہ کھڑے ہوئے ہیں اور جو شخص بھی ان مجسموں میں سے کسی ایک مجسمے کو دیکھ لیتا ہے عقیدت میں ڈوب کر اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ ایسا ہونا ہی چاہئے۔ امریکہ کوئی سری لنکا جیسا چھوٹا موٹا ملک تو ہے نہیں کہ لوگ اس کے محقق کے آگے سر نہ جھکائیں۔ سری لنکا جیسے مختصر بحر کا ملک امریکہ میں ہر دس قدم کے فاصلے پر لاتعداد میں آباد کئے جا سکتے ہیں۔ سری لنکا کا ذکر یوں آ گیا کہ یہ راون کا ملک تھا اور اگر امریکہ میں کئی سری لنکا بن جائے تو اتنے راون سنبھالے کس سے جاتے۔ (یہ ایک اہم سوال ہے)

ڈارون اور کولمبس کی جھر جھریوں میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ڈارون کی جھر جھری شہر میں اور شہر میں بھی اس کے اپنے مکان میں آئی تھی جب کہ کولمبس کی جھر جھری سطح سمندر کی واردات ہے۔ اسے دیکھنے اور سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ غریب خود ہی تماشا تھا اور خود ہی تماش بین۔ (تماشائی کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے) ڈارون سے بڑے نکتہ داں اور مقالہ نگار تو بہت پیدا ہوئے لیکن کولمبس جیسا بحری سیاح دوبارہ کہاں پیدا ہوا۔ شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس خطہ ارض پر اتنے سارے ملک پہلے ہی سے دریافت شدہ حالت میں موجود ہیں۔ جب دنیا نے ترقی نہیں کی تھی ہر ملک دوسرے ملک سے کافی فاصلے پر ہوا کرتا تھا۔ اب یہ فاصلے اتنے معدوم ہو گئے ہیں کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانا ایسا ہی ہے جیسے اپنے شہر میں ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانا۔ بس زبان اور کلچر کا فرق رہتا ہے۔ ایک جھر جھری سی آئی اور آدمی دوسرے ملک میں پہنچ گیا۔

جھر جھری کو ہچکی سے بھی تشبیہہ نہیں دی جا سکتی۔ ہچکی بے آواز کہاں ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں تو ہچکیاں اس قدر تواتر سے وارد ہونے لگتی ہیں کہ ڈر لگنے لگتا ہے کہ کہیں ہچکیاں آتے آتے دم نہ نکل جائے۔ جب کہ جھر جھری اس کے مقابلے میں نہایت بے ضرر علامت ہے علالت نہیں ہے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ ہچکیوں میں ایک آخری ہچکی بھی ہوتی ہے۔ جھر جھری آئے نہ آئے اس میں آخری جھر جھری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ آسان ہچکی وہ ہوتی ہے جسے روکا جا سکتا ہے بلکہ اس کی ماہیت پر اگر توجہ سے دیکھا جائے تو ایسی ہچکی، آدمی خود منگاتا ہے۔ کھانا کھاتے وقت اگر عجلت سے کام لیا جائے اور نادانستہ طور پر ہری مرچ کھالی جائے تو ہچکی کا نزول لازمی ہے۔ ایسی ہچکی پانی کے ایک دو گھونٹ پی لینے سے رفع ہو جاتی ہے۔ کھانے کی دو موقوں [illegible] کی احتیاط کرنی چاہئے اور ایسی کوئی غلطی نہیں کرنی چاہئے جو ہچکی کے [illegible] جائے۔ ایسی ہچکی کو اتنا ہی غیر مناسب اور خلاف تہذیب [illegible] ہے۔ جھر جھری میں ایسی کوئی خرابی نہیں ہے اور اس کی [illegible] اسے بلایا نہیں جا سکتا۔ یہ خود بہ خود سرزد ہو جاتی ہے۔ [illegible] غریب ہے صرف جھر جھریاں سرزد نہیں ہوتیں بعض [illegible] ایسے اشعار سرزد ہو جاتے ہیں جو لاجواب ہوتے [illegible] بارے میں مستند سخن فہم حضرات کی رائے ہوتی ہے کہ [illegible] سے سرزد ہو گیا ہے۔ جھر جھری پر بھی اسی نوعیت کی [illegible] جھر جھری سامعین کے لئے ہوتی ہی نہیں ہے۔ (اور کیا [illegible] استعمال کی جانے والی کوئی شے ہے۔)

ہم نے جھر جھری کے صرف دو عالمی واقعات زر اختیار [illegible] تاریخ اس قسم کے واقعات سے اس قدر لبریز ہے کہ چھوٹے چھوٹے [illegible] کی واردات چھلک پڑتی ہے۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں جھر جھری کے کئی یادگار وارداتیں ہوئی ہیں۔ جب ہمارا کوہ نور ہیرا نادر شاہ کی نگاہوں میں چڑھ گیا تھا تو اسے ان گرسنہ نظروں سے چھپانے کی خاطر کیا کیا تدابیر سوچی نہیں گئی ہوں گی اور کہا جاتا ہے کہ جس کسی نے بادشاہ وقت کو یہ مشورہ دیا کہ آپ اسے اپنی پگڑی میں چھپالیں تو شاہ کے اسی مشیر نے نادر شاہ کو بھی اس خفیہ جگہ کی اطلاع دے دی۔ اس لمحے بادشاہ وقت کو بھی جھر جھری آ گئی تھی۔ اس وقت سے یہ لاقیمت ہیرا جو باہر گیا ہے تو باہر ہی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ کوہ نور ہمارے حساب سے واحد غیر جاندار این آر آئی ہے۔

ویسے جھر جھری کے گھریلو واقعات تو تقریباً روز کا، روز کا نہیں رات کا معمول ہیں۔ شوہر جب رات گئے گھر پہنچ کر دستک دیتا ہے اور بیوی دروازہ کھولتی ہے تو شوہر کی حالت دیکھ کر اس کے جسم میں جھر جھری آ جاتی ہے۔ وہ کچھ کہتی نہیں کیونکہ اتفاق سے کہئے یا شوہر کی خوش قسمتی کہئے کہ وہ پتی ورتا بیوی ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف جب کوئی اور شوہر اسی حالت میں دیر سے اپنے گھر پہنچتا ہے اور بیوی دروازہ کھولتی ہے تو شوہر اپنی بیوی کے ہاتھ میں بیلن دیکھ کر اس عالم وارفتگی میں بھی سوچنے لگتا ہے کہ یہ بے وقت بیلن کیسے ان ہاتھوں میں آ گئی اور وہ اپنے تن بدن میں سرایت کرنے والی جھر جھری پر قطعاً قابو نہیں پا سکتا۔ بات صرف جھر جھری کی حد تک [illegible] تو ہم بھی اس واردات کا ذکر نہیں کرتے۔ (اول الذکر قسم کی بیوی دیوانی اور [illegible] قسم کی بیوی فوجداری ہوتی ہے۔ یہ یاد رکھنے کا نکتہ ہے۔)

لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ شوہر کوئی غلطی کرے ہی تو اس [illegible] جھر جھری آئے۔ بے قصور شوہروں کو بھی اس سے سابقہ پڑتا ہے [illegible] کہ ایک تازہ تازہ شوہر نے جسے شادی شدہ ہوئے صرف دس مہینے [illegible] پہلے بچے کی ولادت کے سلسلے میں نرسنگ ہوم میں داخل کرایا اور [illegible] ولادت سے باہر آ کر اطلاع دی کہ دو جڑواں بچے نمودار ہوئے ہیں [illegible] تھی وہ تو ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے میں نرس نے آ کر اطلاع دی کہ [illegible] ہیں تو شوہر کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جھر جھری کیا چیز ہوتی ہے [illegible] جھر جھری نہیں تھی۔ غریب شوہر لرزہ براندام ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

بیٹی

بیٹی باپ سے ڈرتی تھی، اس کے برخلاف ماں کو اپنا دوست سمجھتی تھی۔

ماں بیٹی سے ڈرتی تھی، اس لئے کہ بیٹی دنوں دن تاڑ جیسی لمبی ہوتی جارہی تھی......

باپ کو بیٹی سے بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس لئے کہ باپ مصروف رہتا تھا اس لئے کہ باپ کا زیادہ سے زیادہ وقت اپنے کاروباری قسم کے لوگوں کے پاس گزرتا رہتا تھا...... اور اس لئے کہ بہت تھوڑے سے وقت میں، جو باپ اکثر اپنی بیٹی کے لئے چرالیا کرتا تھا، اور باپ یہ لمحے اپنی بیٹی کے ساتھ ہی گزارنا پسند کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ یہ لمحے سال میں کبھی کبھی ہی باپ کو میسر آتے تھے......

●●●

بیٹی کی مٹھیوں میں راتیں دبی ہوتی تھیں......

بیٹی کی مٹھیاں اکثر تنہائی میں کھل جایا کرتی تھیں...... اور نیلے آسمان سے اتری راتیں خاموشی سے اس میں سما جایا کرتیں---

پھر یہ راتیں چپکے چپکے اسے چھیڑنے پر آمادہ ہو جاتیں......

سنو......

وہ جیسے نشے میں ڈوبی آنکھیں لئے کسی اور دنیا میں گم ہو جاتی---

نیلے آسمان سے اتری راتوں میں شوخیاں سما جاتیں---

---اب تم ویسے نہیں ہنستی جیسے......

---جیسے؟

ہاں، اب تم ویسے، پہلے کی طرح نہیں رہتی جیسے......

جیسے......

تم بدل رہی ہو......

مستیاں، فلک سے عربی نغموں کی سواریاں لے کر آجاتیں---

تم بہت بدل گئی ہو---کیا نہیں۔ ذرا اپنے آس کی ہواؤں کو دیکھو---باغوں کو، دریا کو، دریا میں ہولے ہولے تیرتی کشتیوں کو...... کشتیوں کے کھلے، ہوا میں لہراتے بادبان کو، پھولوں کو، خوشبو کو...... اپنے اطراف اٹھی ہوئی عمارتوں کو، اور اپنے ارد گرد منڈلاتے بھونروں کو......

'بھونروں......' وہ چونک گئی۔

نیلے آسمان میں اترتی راتیں اچانک سہم گئی تھیں۔ سب کچھ نیا، ہے نا۔ بالکل تمہاری عمر کے گھوڑے جیسا، ایرانی گھوڑے جیسا۔ شکر کرو کہ ابھی اس بارے میں تمہارے گھر والوں کو پتہ نہیں ہے۔

پھر کیا ہوگا---؟

وہاں ایک سویا، سویا سا ڈر، جاگ جائے گا اور......

اور کیا؟

گھر کی آنکھوں نے ابھی تمہارے جسم کی سرگوشیاں نہیں سنی ہیں۔ پھر---پھر وہ اچانک بے چین ہو جائیں گی---اور تم---قید کردی جاؤگی۔

رات کا سناٹا---گہرا سناٹا---

بیٹی نے ہولے سے جھولتے ہوئے، جھولے پر سے ایک پھول توڑ لیا۔ پھول بالوں کے گچھے میں لگالیا، اور لہراتی ہوئی کسی خیال میں گم ہوگئی۔

تیزی سے آتے ہوئے باپ نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔

باپ الٹے پاؤں واپس لوٹ گیا تھا۔

●●●

باپ حیرانی سے آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔

باپ کو اپنا 'زمانہ' یاد تھا--- باپ کو سب کچھ یاد تھا---لیکن دنیا، اسٹیٹس سمبل، پیسوں کے لئے بھاگ دوڑ میں الجھے ماں باپ کے پاس سے جذباتی آنکھیں، آہستہ آہستہ غائب ہونے لگی تھیں--- پرانے منظر باپ کی یادوں سے پھسل کر غائب ہونے لگے۔ لیکن باپ اس لمحہ، اچانک، بیٹی، جوڑے اور پھول کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔

برسوں پہلے اس منظر کی زد میں کوئی اور تھا۔

سرسراتی ہوا، ہلتے ہوئے پیڑ، جھولا، جھولے پر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی۔ جھولتے جھولتے لڑکی کے ہاتھوں میں ایک پھول آجاتا ہے اور پھول......

باپ نے اس منظر کو وہیں فریز کرلیا۔

باپ پھر اس لڑکی کو گھر لے آیا---بیوی بنا کر۔

پھر باپ، زمانہ، اسٹیٹس سمبل اور پیسہ کمانے والی مشین کا غلام بن گیا۔ باپ حیران تھا---

تو کیا بیٹی......؟

باپ کو تعجب تھا۔ لیکن ابھی تو...... گیلی گیلی پھلیاؤں کے منظر تو آنکھوں کو ابھی بھی سہانے ہیں۔ ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔ توتلی باتوں کی پچکاریاں، وہ گود میں اٹھالیتا--- بھالو بن جاتا---اور کبھی گھوڑا---بیٹی کو

… گیتا کالونی، دہلی-۳۱

جنگل پسند تھا اور جنگل میں رہنے والے۔

لیکن ---باپ کے پاس جنگل میں گھومنے کا وقت بھی کہاں تھا۔

●●●

بھالو، گھوڑا--- بیٹی رات رات، سارا سارا دن باپ کا انتظار کرتی، باپ جب کبھی گھر لوٹتا، مصروفیت کے بوجھ سے کندھے جھکے ہوتے پھر بھی وہ تازہ دم بنے رہنے کی کوشش میں مصروف رہتا۔

بھالو، گھوڑا، جنگل--- باپ اچانک اس جنگل میں لوٹا تھا---اور حیرانیوں کی بارش لے کر وہ بیوی کے پاس آکھڑا ہوا۔

'تمہیں پتہ ہے' ہماری بیٹی اب.....

ہاں پتہ ہے۔

پتہ ہے؟ باپ چونک گیا تھا۔

ذرو مت --- پچھلے چار برسوں سے--- چار برسوں سے اس کا جسم میری آنکھوں کی دور بین میں ہے---غلط مت سمجھو--- میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اسے کھلی ہوا میں سانس لینے کا موقع نہیں دیا ہے۔

مطلب؟

بیوی ہنسی--- مطلب وہ آدھا ہنستی ہے۔ آدھا میں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ آدھا اڑتی ہے۔ آدھی اڑان میرے قبضے میں ہے۔ اڑان، ہنسی، مسکراہٹ، خواب--- بڑے ہونے اور نافرمانی کرنے کے شک میں، میں نے ایک آدھا جسم اس کے پاس رہنے دیا ہے اور آدھا---

بیوی ہنس رہی تھی۔

بیوی اپنا زمانہ بھول گئی تھی۔

بیوی نے پھر پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔

جیسے بیوی کو، اس کا جواب، اس کی دلیل، کسی کی بھی ضرورت نہ ہو---

●●●

بیٹی حیران تھی--- جیسے بہت سے پلاش کے پھول اس کی ننھی منی ہتھیلیوں میں سما کر رنگ بن گئے ہوں---رنگ--- پھر اس نے آدھے رنگوں کو اپنی ہتھیلیوں سے کھرچ دیا ہو---

تو اس کا مطلب؟ باپ برسوں بعد اپنی بیٹی سے شیئر کر رہا تھا۔

ہاں۔

تو تم آدھا ہنستی ہو اور آدھا تمہاری ماں کی تحویل میں ہے۔

ہاں۔

اور تم آدھا اڑان بھرتی ہو۔

ہاں۔

پھر تم مکمل کہاں رہ گئیں--- آدھا آدھا--- بڑے ہونے سے اڑنے تک۔ بچپن سے جوانی اور جسم سے روح تک--- گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک۔ آنکھوں سے مسکراہٹ اور مسکراہٹ سے خواب تک---

ہاں۔

راتیں--- پر اسرار راتیں--- تمہیں پتہ ہے۔ تم ایک حسین زندگی کا صرف آدھا لطف لے رہی ہو---ایک بے حد حسین کائنات کے صرف آدھے حصے کو تمہاری آنکھیں چھو رہی ہیں جب کہ......

باپ افسردہ تھا---

بیٹی نگاہوں سے زمین کھرچ رہی تھی۔

تم نے پریم کیا ہے---؟

واپس لوٹنے سے قبل باپ کا جملہ نپا تلا تھا---

پریم آدھا نہیں ہوتا۔ پریم مکمل ہوتا ہے---اور بیشک تم عمر کے اس حصے میں ہو، جہاں تمہیں پریم کے احساس سے---یعنی میرا مطلب تو تم سمجھ رہی ہو نا---

بیٹی ایک لمبی چپ لگا گئی تھی---

لیکن بیٹی کو باپ میں پہلی بار ایک دوست نظر آیا تھا۔

●●●

باپ کی باتیں اس رات بہت دیر تک بیٹی کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ وہ حیرت زدہ کرنے والی باتیں تھیں---کسی بھی باپ کے منہ سے پہلی بار اس طرح کی باتیں اس کے کانوں میں گونجی تھیں۔ وہ ان جملوں کا ذائقہ ابھی بھی محسوس کر سکتی تھی......

'تم سن رہی ہو نا اور تمہیں احساس ہونا چاہئے'

باپ کا لہجہ کچھ کچھ برف جیسا سرد تھا۔ یعنی دنیا کہاں جارہی ہے اور دنیا کہاں تک جاسکتی ہے۔ خوف اور ایتھر یکس سے الگ بھی ایک راستہ جاتا ہے--- پریم کا راستہ--- ہم ہر برس کے خاتمے کے بعد اپنے لئے

ایک ایتھر یکس کا خوف [illegible]

عجیب بات ہے اس مہذب دنیا میں [illegible]

کے درمیان ہمیں لازے کے لئے [illegible]

اپنے آپ کو دیکھو لڑکی--- [illegible]

یعنی سچ پوچھو تو کتنی بڑی [illegible]

'ہاں' میں ڈر گئی ہوں۔

باپ چپ تھے---باپ نے [illegible]

اپنے آپ سے---؟

ہاں---

اپنی بڑھتی عمر سے؟

ہاں---

باپ کے ہاتھ کھلونوں کی طرح اپنی انگلیوں سے کھیلتے رہے--- کیوں ڈر جاتے ہیں ہم۔ ایتھر یکس ہو نہیں ہے جو ہر بار ورلڈ وار کے خطرے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کچھ اور بھی ہے--- باپ کے ہاتھ کھیلتے کھیلتے ٹھہر گئے تھے۔ لیکن نہیں---بیٹی! امن رہی ہو نا تم۔ تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے---لیکن کیا کروگی--- سب ڈر رہے ہیں--- جیسے تمہارا چہرہ دیکھ کر لگتا ہے، تم اپنی ماں سے بھی ڈر رہی ہوگی۔ ماں، جو بیوی بننے تک ایک خوبصورت دنیا میں جیتی ہے اور ماں بنتے ہی ایک Cruel اور ایک کروسیڈر اس کے وجود میں پناہ لینے لگتا ہے---

باپ نے نظر نہیں ملائی...... صرف اتنا کہا---

'تمہیں اپنی ماں سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ اپنی ماں کو سمجھانا چاہئے۔'

ماں:

بیٹی اچانک بڑی ہونے لگی تھی اور اس بڑی ہونے کے خطرے کو ماں نے بھانپ لیا تھا۔ ماں کمانڈوز کی طرح بیٹی کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ کہاں جارہی ہو تم۔ نہیں۔ فون ہمیشہ نہیں سننا ہے--- اتنی دیر تک کس سے باتیں کر رہی تھی--- ماں بھی کبھی اسے شکاری کی طرح گھیر کر بیٹھ جاتی۔ ماں ایک فلاسفر کی طرح جان اسٹاپ شروع ہو جاتی...... اور اپنی ہر گفتگو میں ماں اتنی اوباؤ اتنی بوجھل باتیں کرتی نظر آتی کہ وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سے دکھ کا شکار ہو جاتی۔ اسے، بس یہ الجھن گھیر لیتی کہ ماں اپنا زمانہ بھول گئی ہے یا ماں--- کبھی بچی تھی ہی نہیں۔

... کتنا کرنٹ آگیا ہے۔
... لڑکیوں کے لئے خطرناک ہوتا ہے۔
... چلی ہے۔
ڈائٹ ---ڈائٹ کنٹرول--- یو آئی--- سب کچھ کنٹرول کرنا ہے تمہیں۔

ماں کی ہر بات پر وہ اندر ہی اندر ہوا کلڈ ہوتی چلی گئی--- کبھی ماں ایک چھتنار درخت کی طرح لگتی، جس کے سایہ میں اس کی زندگی محفوظ ہے۔

لیکن کتنی محفوظ ہے؟

ماں کیا چاہتی ہے، یہ آہستہ آہستہ اس پر منکشف ہو رہا تھا--- یعنی ماں اسے دنیا کی نظروں سے بچائے رکھنا چاہتی تھی۔ ایک بیحد خاص موقع کے لئے--- بیحد خاص--- جیسا کہ اس کی ماں نے سوچ رکھا تھا--- ایک بڑی تپسیا اور--- ایک دن اچانک اسی اُن چھوئے پودے کو نمائش گاہ میں رکھ دینا۔

یعنی ماں کے لئے، اس کے بڑے ہونے کا عمل، سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق ہو رہا تھا--- ماں، اس میں اپنے 'مستقبل' کو تلاش کر سکتی تھی۔ یعنی ایک ایسے برائٹ فیوچر کو، جہاں اس کے ساتھ ماں کی تقدیر بھی کھل سکتی تھی۔

'آہ، تم نہیں جانتی!'

یا پھر--- آہ، تمہارے لئے میں نے کیا کیا سوچ رکھا ہے، نادان لڑکی--- ماں کے ان جملوں کا مطلب تھا--- دیکھتی رہو۔ تمہیں صرف اشارے سمجھنا ہے اور چلنا ہے۔ بس۔ اس سے زیادہ نہیں۔

ماں نے بہت زیادہ اس کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ ماں اس سے کہیں زیادہ اس کے بارے میں سوچ سکتی تھی۔ لیکن بیٹی، جیسے ہر بار معصوم چڑیا کی طرح اڑتے اڑتے وہ کسی خوفناک گدھ کو دیکھ لیتی......

ڈائٹ کنٹرول--- لیکن نتیجہ کے طور پر کیا برآمد ہوا تھا...... آنکھوں میں پڑے گہرے حلقوں میں خواب کہیں گم ہو گئے تھے...... کسی مخملی فرش پر کیٹ واک کرنے والے اس کے پاؤں تھرتھرانے لگے تھے...... ماں اسے لے کر انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ہیلتھ اینڈ سروسز گئی تھیں۔

ڈاکٹر موتا برا سامنہ بنا کر بولی تھی۔ 'تم لڑکیاں--- کھانے کو دشمن کیوں بنا لیتی ہو---'

اس نے ماں کو دیکھا۔ ماں نے بیٹی کا ہاتھ دبا دیا۔

'اینوریکسیا۔ وزن میں کمی...... ڈاکٹر موتا نے برا سا منہ بنایا۔ کیلشیم اور فاسفورس کی کمی سے کیا ہوتا ہے جانتی ہو--- ہارمون، ڈس بیلنس ہو جاتے ہیں اور اینوریکسیا۔ سمجھتی ہو نا، پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ عورتیں بانجھ ہو سکتی ہیں۔

●●●

بانجھ--- بیٹی دکھ گئی ہے۔ زندگی سے کیلشیم اور فاسفورس تو ماں نے لے لئے ہیں...... وہ سچ مچ ڈس بیلنس ہو گئی ہے۔ نہیں--- اس نے توازن کھو دیا ہے--- وہ لڑکھڑا رہی ہے۔ وہ کبھی بھی گر سکتی ہے...... وہ جیسے ایک ٹھونٹھ درخت ہے۔ بانجھ--- اینوریکسیا کی شکار---

"ایک دن جب تم خود کو دیکھو گی تو--- ڈاکٹر تو بولتے ہی رہتے ہیں۔"

اس نے دیکھا۔ ماں کی آنکھوں کی سوکھی پڑی جھیل کو۔ لیکن یہ کیا...... اس جھیل میں کوئی ہے...... کوئی ہے، جو کیٹ واک کر رہا ہے......

کون ہے؟

وہ اس چہرے کو پہچان سکتی ہے۔

ارے، یہ چہرہ تو اس کے خود کا چہرہ ہے۔ لیکن یہ چہرہ اتنا مرجھایا ہوا کیوں ہے۔

پہلی بار بیٹی نے اپنا جائزہ لیا تھا۔ اپنے جسم میں وہ کتنی ہے--- اپنی روح میں، اپنے وجود میں اور اپنے آپ میں......

اس نے ماں اور باپ دونوں کو اپنے آپ میں رکھ کر دیکھا۔ پھر مطمئن ہو گئی۔ باپ کو وقت کہاں تھا۔ اور ماں--- روح سے جسم اور جسم سے وجود تک ماں نے کسی بھی حصے کو اس کی اپنی آزادی کے کے نام نہیں کیا تھا--- آدھا بھی نہیں۔ وہ مکمل ماں کے قبضہ میں تھی۔

اس لئے پہلی بار، باپ کی باتوں میں اسے ایک دوست نظر آیا تھا۔ دوست، جس کے سہارے وہ اپنی جنگ لڑ سکتی تھی۔

باپ:

لیکن شاید بیٹی ابھی بھی مطمئن نہیں تھی۔ یا پھر بانجھ ہونے کا ڈر اس کے اندر کچھ زیادہ ہی بیٹھ گیا تھا--- بانجھ۔ عورت کے لئے سب سے بڑی گالی--- ایک ایسی گالی، کمزور نحیف بیٹی جس کا سامنا کرنے کو تیار نہیں تھی--- وزن کم کرنے کے لئے وہ اینوریا کی ہدف بننے سے خود کو روکنا چاہتی تھی۔ دراصل بیٹی، باپ کو آزمانا چاہتی تھی۔ شاید اسی لئے کسی ایک مضبوط لمحہ، وہ چپ چاپ باپ کی آغوش میں سر چھپا کر بیٹھ گئی۔

باپ آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے رہے۔

"میں کچھ بھی کر سکتی ہوں؟" ذرا دیر بعد بیٹی کے لب ہلے۔

---'ہاں۔'

---'کچھ بھی؟'

---'تمہیں شک کیوں ہے؟'

شک نہیں--- ماں کہتی ہے، لڑکی پیدا ہوتے ہی اپنا ایک پنجرہ لے آتی ہے۔

باپ ہنسا--- 'لیکن تم سے پہلے تمہاری ماں اس پنجرے کو توڑ چکی تھی۔ اس نے لو میرج کی تھی۔

ماں کہتی ہے 'اس کے باوجود ہم پنجرے میں رہتے ہیں۔'

باپ نے مزاحیہ انداز اپنایا۔ 'پنجرے میں پنچھی بھی نہیں رہتے!'

بیٹی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ 'تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ اڑ سکتی ہوں۔ باہر جا سکتی ہوں۔ ڈسکو۔ تھیٹر، اور---

باپ نے اسے غور سے دیکھا--- بیٹی کے کندھے تھپتھپائے پھر بولا۔ 'سنو بیٹی۔ غور سے سنو--- تم پیدا ہوئیں، ہم نے سکھ تلاش کر لیا--- ڈھیر سارا سکھ، جو تمہارے رونے سے ہنسنے تک، کلکاری سے سمجھنے تک، بولنے سے شرارت تک، کھڑے ہونے، گرنے سے انگلیاں تھامنے اور چلنے تک--- یعنی تم نے جو دیا، یا جو تم ہر لمحہ دیتی رہی وہ کسی خزانہ سے بھی زیادہ تھا--- ہم تول مول نہیں کر سکتے۔ باپ کو تول مول کرنا بھی نہیں چاہئے کہ اس زندگی میں بچہ اپنے وجود کے احساس تک جو سکھ دیتا ہے، وہ امید کے خزانے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، ہے نا؟

باپ کو شاید اپنے باپ کی کہانی یاد آگئی تھی۔ یکلخت وہ ٹھہر گیا تھا۔ بیٹی کے ہونٹوں پر معصوم مسکراہٹ تھی۔

'اس لئے بیٹی'--- باپ نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ 'اس لئے جب تم اپنی جوانی کی زندگی شروع کرنے جا رہی ہو۔ سمجھ رہی ہو نا۔ اپنی اب کی زندگی--- تو اس زندگی پر صرف اور صرف تمہارا حق ہے۔ اپنے حصے کا سکھ ہم لے چکے ہیں اور اس کے بعد کے سکھ پر......'

'تو پنجرہ......؟'

باپ لڑکی کے بڑا ہونے کے احساس سے دکھ گیا تھا۔

پنجرہ کوئی بھی اپنے ساتھ نہیں لایا تھا اور سنو بیٹی۔ اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ اپنے حصے کے خواب، خوشیاں، عمر، رونا، ہنسنا سب کچھ اپنی ممی سے واپس مانگ سکتی ہو۔ اور بیشک تمہاری ممی کو تمہیں یہ سب واپس کر دینا چاہئے۔

اس کے بعد باپ ٹھہرے نہیں۔ باپ کو آنکھوں میں امڈ آئے قطرے دکھانا گوارہ نہیں تھا۔ باپ واپس لوٹ گئے تھے۔

حسین شامیں

پھر بیٹی نے اڑنا شروع کیا۔

بیٹی کو اب ماں کے پنجرے پر یقین نہیں تھا۔

بیٹی کو اب کسی بھی ایسے پنجرے پر یقین نہیں تھا۔

بیٹی کو صرف اور صرف اڑنے پر یقین تھا۔

پہلی بار جب وہ رات کو دیر تک ڈسکوتھے کلب سے گھر لوٹی تو ماں اس کے کمرے کے دروازے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ ماں کے ہاتھوں میں ایک ٹوٹا ہوا پنجرہ تھا۔

'آہ! تمہارے باپ جیت گئے۔'

'اور اسی لئے تم نے پنجرہ توڑ دیا۔'

'ہاں--- اس پنجرے میں ایک Sea-gull تھا۔ اس سی گل کی کہانی سنو گی۔'

'مجھے کہانیاں اچھی نہیں لگتیں۔'

ماں مطمئن تھی--- 'کوئی بات نہیں۔ تم نے اپنے لئے راتیں چنیں اور رات سے انٹرنیٹ اور ڈسکوتھے بنا لیا۔ ہے نا۔ پھر بھی تمہیں یہ کہانی سننی ہو گی۔

اس نے نائیٹی پہن لی۔

ماں کی کہانی جاری تھی۔ بیچارہ ننھا سا سی گل۔ شام میں جب دوسرے پرندوں کے پر، اڑان سے خالی ہو جاتے تو وہ اپنی اڑان شروع کرتا۔ پاگل کہیں کا۔ تھوڑی تھوڑی اڑان اور ایک دن......

'تم یہ کہانی پہلے بھی سنا چکی ہو ماں۔'

ماں نے پہلے دھیان نہیں دیا--- ایک دن جوناتھن، یہی اس سی گل کا نام تھا، وہ اڑا اور اپنے ننھے پروں سے آسمان ناپ لئے...... اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اتنی اڑان تو اس کے پروجوں میں سے بھی کسی نے آج تک نہیں بھری تھی...... اسے یقین تھا۔ وہ واپس لوٹے گا اور اس کی تاجپوشی ہو گی۔ سر آنکھوں پر بیٹھایا جائے گا۔ انعام سے نوازا جائے گا۔

'پور فیلو' بیٹی آہستہ سے بولی۔

ماں کی آنکھیں بند تھیں--- لیکن اس غریب کو کیا معلوم تھا، دھرتی پر واپس لوٹتے ہی، ضرورت سے زیادہ اڑنے کے جرم میں اسے......

ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

بیٹی نے سر پر چادر کھینچنے سے پہلے کہا۔ 'جو اڑتے ہیں، وہ کسی بھی چیز کی پرواہ نہیں کرتے۔'

●●●

انٹرنیٹ پر Chatting سے برآمد لڑکے نے ڈسکوتھے میں، اچانک اس کے سامنے آ کر حیرت زدہ کر دیا تھا۔

پھر بیٹی کی شاموں میں ٹوئٹرس کی لاطینی حسین شامیں لکھ دی گئیں--- پہلی بار وہ اداس تھی۔

لڑکا زور سے چیخا تھا---'Cry'

وہ پھر ذرا سا ہنسا۔ چیخو، چلاؤ، ناچو۔ بھول جاؤ کہ عمر کے گھوڑے کی رفتار کیا ہے۔ آگے کیا ہے اور پیچھے کیا ہے۔

'بھول گئی۔'

وہ دیر تک نائٹ اسپاٹ پر تھرکتے رہے۔ لانج میں کچھ دیر 'ڈام موریس' کی پوئٹری کا لطف لیا۔ پھر کچھ دیر تک ٹوئٹرس کی آرٹ گیلری میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے رہے۔ بیٹی خاموشی سے کمرے کی پیلی چھتوں، نیلی دیواروں اور پینٹنگس کی آڑی ترچھی لکیروں کو گھورتی رہی۔ واپس آ کر نائٹ اسپاٹ پر دونوں نے ایک ایک پیگ اور لیا۔ ریستوراں کی ڈم لائٹ میں 'چلڈ' یعنی ہر طرح کے پروگرام چل رہے تھے--- بیٹی نے اپنے جسم کو پوری طرح .... اطالوی کھانے سے فارغ ہو کر .... کو ریستوراں کی ڈم روشنی میں، چلنے والے .... کے حوالے کر دیا۔

●●●

رات گہری ہو گئی تھی۔ بیٹی ابھی تک گھر نہیں لوٹی تھی۔ ماں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔

---'دنیا بدل رہی ہے۔'

'دنیا ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے۔'

---'ہمارے زمانے کی دنیا اور تھی؟'

اس زمانے کی دنیا بھی وہی ہے۔'

---'کیا ہم اس طرح رات گئے......؟'

پہلے ہمارے شہر نے اس طرح رات پر قبضہ نہیں کیا تھا۔'

ماں گھبراہٹ میں ٹہل رہی تھی۔'

باپ مطمئن تھا۔ وہ اپنی فکر میں ڈوبا تھا۔ یعنی اس عمر میں---اس عمر میں جب کہ اس کی بیوی کو کوئی بھی ٹینشن نہیں لینا چاہئے...... وہ آہستہ سے مسکرایا۔

'بیٹی کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔'

'کیوں؟'

'کیوں کہ اب اس کی آزادی کا دور شروع ہو گیا۔'

'آزادی؟'

'ہاں، ایک عمر آتی ہے، جب ہمیں ایک دوسرے کو از سر نو سمجھنا ہوتا ہے۔ از سر نو سمجھ رہی ہو نا--- یہ وہ وقت ہوتا ہے، جب بچے اپنی عمر کے رتھ پر سوار ہو جاتے ہیں--- بیٹھو---'

ماں باپ کے ساتھ بیٹھ گئی۔

باپ نے اسے اپنے بانہوں کے حصار میں لیا--- اب ہماری اپنی ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ بیٹی کی اپنی---اس عمر کو سمجھنا بڑا کام ہے۔ تم نہیں سمجھو گی تو بوڑھی ہو جاؤ گی۔'

ماں ڈر گئی تھی---

باپ ہنسے--- 'بچوں کی آزادی میں اپنا حصہ نہیں ہوتا، ان کی عمر کا حصہ ہوتا ہے--- بیٹی اپنی آزادی سے بندھی ہے۔ وہ سنبھلتی ہے یا گرتی ہے، یہ اس کا کام

ہے۔ ہم نہیں سمجھے تو ہم اپنے اور اپنے بچوں کے بیچ ایک دیوار نہیں حائل کر لیں گے، ہم اچانک بوڑھے ہو جائیں گے۔"

لیکن۔۔۔۔ بیٹی ہے۔۔۔

'ہمارا کام ختم۔۔۔' باپ کا لہجہ سخت تھا۔۔۔ جتنی خوشیاں، جتنے سکھ ہم اس سے حاصل کرتے تھے، کر چکے۔

'اور اب اسے کرنے کے لئے.....'

باپ مطمئن تھا۔۔۔ 'یہ اس کی سمجھ داری پر منحصر ہے' باپ نے پھر موضوع بدل دیا تھا۔۔۔ 'کل سے میں نے دفتر کا کام کم کر دیا ہے۔ جلدی گھر آ جایا کروں گا۔ صبح کی چائے ختم۔ ناشتے میں.....'

ماں اب کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

کھلے دروازے سے بیٹی اندر آ گئی تھی۔

بیٹی کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔

بیٹی کی آنکھیں.....

بیٹی کے پاؤں.....

بیٹی کا جسم.....

باپ نے ماں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔

"سو جاؤ۔ اس نے اپنی آزادی خرید لی ہے۔"

ماں نے سہمے ہوئے میمنے کی طرح خود کو باپ کے حوالہ کر دیا۔

خلاصہ:

قارئین!

کہانی ختم ہو چکی ہے۔ یا آپ کہہ سکتے ہیں۔ کہانی کو یہیں پر ختم ہو جانا چاہئے تھا۔ ایسی کہانیوں کا کوئی خوشگوار انجام نہیں ہوتا ہے۔ ایسی کہانیاں ہر تبدیلی اور تاریخ کے جبر کے ساتھ بیدار ہوتی رہتی ہیں۔۔۔ زندگی نے اپنا دامن وسیع کیا تو لڑکیوں کے لئے سوچ اور فکر کے نئے دروازے بھی کھل گئے۔۔۔ یعنی تاریخ کے اس مقام پر جہاں لڑکیاں آزادانہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہیں، ایسی کہانیوں کا انجام یہی ہونا چاہئے کہ۔۔

☆ لڑکی نے اپنی ایک آزاد زندگی کا انتخاب کر لیا۔

☆ لڑکی پھسلتی چلی گئی اور بالآخر اس کی زندگی کا انت ہو گیا۔۔۔ یا

☆ لڑکا اسے چھوڑ گیا اور لڑکی نے آتم ہتیا کر لی۔

قارئین!

ایسا کچھ بھی اس کہانی کے ساتھ نہیں ہے۔ اس لئے جیسا کہ میں نے پہلے کہا تاریخ کے اس موڑ پر۔۔۔ اس بیحد اہم موڑ پر۔۔۔ بیٹی اچانک چونکی ہے۔ جیسے کسی ڈراؤنے خواب سے جاگی ہے۔ اور کئی دن گھر سے غائب رہنے، بدن کے جبر کو سہنے کے بعد، ایک اندھیری صبح۔۔۔ جس وقت سڑک پر اکا دکا سواریاں بھی نہیں چل رہی تھیں، وہ اپنے گھر کے دروازے پر آ پہنچی ہے۔ اور۔۔۔ بیل پر انگلی رکھتی ہے۔

تو قارئین یہ اس کہانی کا انت ہے۔۔۔ اور اس انت کے لئے میں اپنے آپ کو کتنا مجبور محسوس کر رہا ہوں، یہ میں جانتا ہوں۔

●●●

بیٹی کی آنکھیں نیم غنودگی میں ڈوبی تھیں۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ باہر کہرا چھایا ہوا تھا۔ اس کا بدن ابھی بھی اطالوی جن کے دھوئیں سے بھرا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ بیل بجانے والے ہاتھ سردی سے ٹھٹھر گئے تھے۔ اسے غصہ آ رہا تھا۔ سب کہاں مر گئے۔ بیل کی آواز سن کر کھولنے کے لئے کوئی آتا کیوں نہیں۔۔۔

اس نے قدموں کی آہٹ سنی۔۔۔

'آزادی.....' اسے باپ کے لفظ اب بھی یاد تھے۔ اپنے حصے کا سکھ ہم لے چکے ہیں اور اس کے بعد کے سکھ پر.....'

وہ باپ سے لڑائی کرنے آئی تھی۔۔۔ نائٹ اسٹاپ کی۔ رنگینیاں اچانک تھم گئی تھیں۔ ڈسکو تھیے کے Cry, Cry نغموں نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔ Chatling سے برآمد لڑکے نے اس کے بدن پر ہزاروں خونی لکیریں کھینچ دیں اور ایک نیپالی لڑکی کے ساتھ کسی دوسرے ٹوئٹرس کے چلڈ پروگرام میں کھو گیا تھا۔۔۔

بیٹی نیند سے جاگی تو ماں کا پنجرہ ٹوٹا ہوا اس کے بازو میں پڑا تھا۔۔۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔۔۔ وہ لڑنا چاہتی تھی۔ پیسے ختم ہو گئے تھے۔۔۔

وہ کئی دنوں سے گھر سے غائب تھی۔

اسے امید تھی۔ گھر پہنچتے ہی، جذباتی پاگل پن کے مظاہرے شروع ہو جائیں گے۔ شاید باپ نے پولیس میں ایف آئی آر بھی درج کی ہو۔ ماں کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی ہوں اور.....

ایک بیحد سرد صبح، کہرے میں ڈوبی ہوئی صبح۔۔۔ وہ گھر پہنچ گئی اور.....

'ہیلو، شیم فار سفورس.....' ماں بولے گی..... وہ اسے ایک بیحد خاص موقع کے لئے تیار کر رہی تھی۔۔۔

باپ کہیں گے۔۔۔ تم کہاں چلی گئی تھیں بنی۔

اور ماں۔۔۔ وہ اس جذباتی لمحے کی منتظر ہو گی، جب وہ اس کے بازوؤں میں گم ہو جائے گی.....

●●●

کوئی آ رہا ہے۔۔۔ قدموں کی آہٹ۔۔۔ بیٹی کا جسم سردی سے تھرتھرا رہا ہے۔ دروازہ کھولنے کی آواز۔۔۔ باپ نے لائٹ آن کر دیا ہے۔ دروازہ کھولنے والی ماں ہے۔ لیکن.....

وہ اچانک ٹھٹھک گئی ہے۔

کیا یہ ماں ہے۔ سچ مچ ماں ہے۔ ماں ہے تو ماں جیسی کیوں نہیں لگ رہی۔ ماں اپنی عمر سے کتنی چھوٹی ہو گئی ہے۔ چھوٹی موٹی سی۔ اس کے چہرے پر، بیٹی کو لے کر مستقبل کے اندیشے یا فکر کی جھریاں نہیں ہیں۔ یہ کوئی اور ہی ماں ہے۔ تر و تازہ۔ ابھی ابھی جوان ہوئی۔ اور لباس تو دیکھو۔۔۔ ریشمی ساڑی۔ چہرے پر اتنا نکھار۔۔۔

پیچھے باپ کھڑے تھے۔۔۔ ہمیشہ کی طرح اسمارٹ۔۔۔ اس وقت کچھ زیادہ ہی جوان.....

ماں کی آنکھوں میں حیرانی اڈتی ہے .....

'کون؟'

باپ کی آواز میں نشہ سا ہے.....

'کون؟'

'۴، اسکیم پارلے' ماؤنٹ روڈ سے ذرا آگے، تھرڈ لین۔ مسٹر آئی۔ جے کے..... ریسیڈینس نمبر۔۔۔'

کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی ہے۔ "ایک زمانہ میں یہاں ان کی بیٹی رہتی تھی۔"

ماں نے پیار سے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

'آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔۔۔ اب وہ یہاں نہیں رہتیں۔۔'

بیٹی نے انجانے راستوں پر ٹھٹھرتی ہوئی کہرے کی اس صبح، اپنے قدموں کو ڈالتے ہوئے ماں کا جملہ پورا کیا۔۔۔

'کیوں کہ اس نے اپنی آزادی خرید لی ہے۔ اب وہ کہیں اور رہتی ہے۔'

☆☆

ترنم ریاض

ہم تو ڈوبے ہیں صنم.....

"**ہوسکتا** ہے یہ میری آخری خواہش ہو — تم سے — کچھ — میں آخری بار مانگ رہا ہوں شاید۔" شاہد نے نادیہ کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ کر رک رک کر کہا۔

"مجھے — ڈر لگ رہا ہے — ایسا مت کہو —" نادیہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"کس بات سے — ؟ میری خواہش سے — یا میرے اندیشے سے" شاہد مسلسل اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ نادیہ نے پلٹ کر اس کے چہرے پر نظریں دوڑائیں۔ شاہد کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ جیسے کچھ شک، کچھ طلب، کچھ غصہ، کچھ انتقام اور جانے کیا کیا، جیسے سب ایک ہی لہجہ میں ملے ہوئے ہوں۔

نادیہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور گلوکوز کی نلی میں سے شاہد کے جسم میں داخل ہونے والے پانی کی رفتار دھیمی کر دی۔

"سردی لگ رہی تھی نا —" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں — تمہیں کیسے — ؟" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ نرس اندر داخل ہوئی۔

"وقت ختم ہو گیا ہے — اب مریض کو آرام کرنے دیجئے۔"

آج شاہد کیسی باتیں کر رہا ہے — گھر پر ثمرین بھی اکیلی ہے۔ نادیہ سوچنے لگی۔

"بابا کیسے ہیں امی" کل نادیہ کے اسپتال سے لوٹنے پر اس کی گیارہ سالہ بچی ثمرین نے پوچھا تھا۔

"اب شاید بہتر ہیں کچھ۔"

نادیہ نے پرس ثمرین کی طرف اچھال دیا تھا اور کرسی پر نیم دراز ہو گئی تھی۔

"پانی لاؤں امی؟" ثمرین ماں کے قریب چلی گئی تو اس نے ثمرین کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔

"نہیں بٹیا — تم بس میرے سینے سے لگ جاؤ۔"

نادیہ نے اس کا سر اپنی چھاتی سے لگا لیا تو اس نے اپنی دبلی پتلی باہیں اپنی امی کی کمر کے گرد ڈال دیں۔

"بابا اچھے ہو جائیں گے تو --- تو --- پھر پہلے کی طرح --- آپ سے لڑیں گے؟ --- آپ کو ماریں گے؟ ---"

ثمرین فرش پر بیٹھ گئی اور اپنا سر ماں کے زانو پر رکھ دیا۔

"نہیں بیٹا --- ایسا کچھ نہیں ہوگا ---"

"بابا بچیں گے نا --- ؟"

"ہاں --- اللہ میاں سے دعا کرو --- وہ رحیم ہے۔ کارساز ہے۔" نادیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

نادیہ نے شاہد کو چاہا تھا۔ عیش و آرام کو ٹھکرا کر اس کی متوسط زندگی اپنائی تھی --- اسے محبت کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے تھا --- مگر اسے جلد ہی علم ہو گیا کہ شاہد گھر میں کچھ بے چین بے چین رہتا ہے۔ جانے کتنی دوست تھیں اس کی۔ راتوں کو تک غائب رہا کرتا وہ۔

گھر میں تناؤ تھا۔

نادیہ نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ بات کرتا تو جواب دے دیتی۔

شاہد اکثر ہی غصے میں نظر آتا۔

کوئی چار ایک برس پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں نادیہ دوسری بار امید سے تھی۔

ثمرین اپنی ماں کے پیٹ پر کان دھرے ماں کے قریب لیٹی تھی۔

"بھیا کی شکل کیسی ہوگی امی" وہ ماں کے ابھرے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"تمہارے جیسی --- پیاری پیاری سی۔"

"بابا جیسی تو نہیں ہوگی نا" اس کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

"ہو سکتا ہے --- تمہارے بابا کی شکل بھی تو اچھی ہے" نادیہ چھت کی طرف دیکھتی رہی۔

"مگر، اگر وہ بابا کی طرح غصہ کرے گا --- تو --- تو؟"

ثمرین پریشان سی ہو کر بولی۔

"نہیں بیٹا --- وہ تو چھوٹا سا منا ہوگا --- وہ کیوں غصہ کرے گا --- اپنی ننھی سی باجی کو بہت پیار کرے گا --- بہت عزت کرے گا تمہاری وہ۔"

نادیہ نے ثمرین کا چہرہ چھو کر کہا۔

"امی۔"

"جی بیٹے"

"صرف بھائی ہی بہن کی عزت کرتا ہے ---

سی۔۱۱۔ جنگ پورہ ایکسٹنشن، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۴

—ور—کی؟—— کیا بابا آپ کی عزت کرتے ہیں؟"

"ہاں——شاید——"

"پھر آپ کو بری بری باتیں کیوں کہتے ہیں——؟"

"وہ——شاید——ان کی عادت——ہے۔"

"یہ تو گندی عادت ہے——ان کو دادی جان نے بتایا نہیں؟"

"کیا معلوم——وہ تو بہت پہلے اللہ میاں کے پاس چلی گئی تھیں۔"

"ہم بھیا کو بہت اچھی باتیں سکھائیں گے۔"

"انشاءاللہ"

"اسے بابا جیسا نہیں بننے دیں گے۔" ثمرین نے آنکھیں موندی ہی تھیں کہ اس کی سماعت کے قریب ایک دھماکہ ہوا۔

"کیا پٹی پڑھا رہی ہو بیٹی کو؟" یہ آواز شاہد کی تھی۔ وہ دونوں مارے گھبراہٹ کے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ثمرین سہم کر ماں سے لگ گئی۔ نادیہ متعجب سی شاہد کو دیکھنے لگی۔

"کیا سکھا رہی ہو اسے" شاہد پاس جا کر آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ نادیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں پوچھتا ہوں کیا سکھا رہی تھیں اسے تم" اس نے نادیہ کے دونوں شانے پکڑ کر جھنجھوڑے تو ثمرین جلدی سے مسہری سے اتر کر دیوار سے لگ گئی اور سہمی سی دونوں کو دیکھنے لگی۔

"امی" شاہد کانپتی ہوئی آواز میں اس نے پکارا بھی تھا۔

نادیہ اپنے دونوں ہاتھوں کے ایک جھٹکے سے شاہد کے ہاتھوں کو اپنے شانوں سے ہٹایا اور مسہری سے اتری۔ ابھی اس نے پاؤں فرش پر رکھے ہی تھے کہ شاہد نے پوری طاقت سے ایک زور کا تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ چیخ مار کر منہ کے بل چارپائی پر گر پڑی۔ اس کے گھٹنے چارپائی کے بان سے ہوتے ہوئے زمین سے لگ گئے۔ ثمرین ہچکیاں لے کر روتی ہوئی باپ کی جانب خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ماں کی طرف بڑھی تو شاہد کمرے سے باہر نکل گیا۔

"امی—— امی——" اس نے ماں کا چہرہ اپنی طرف موڑا تو دیکھا کہ امی کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ لپک کر غسل خانے سے تولیہ لے آئی اور ماں کی ناک اور چہرہ صاف کرنے لگی۔ ماں کے گال پر انگلیوں کے سرخ نشان ابھرے ہوئے تھے۔

"ثمرین" نادیہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور زور سے کراہ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ تھام لیا اور بلک بلک کر روتی ہوئی فرش پر آ گئی۔ ثمرین بے بسی سے روتی ہوئی ماں کو دیکھتی رہی اور اپنے ہاتوں سے اس کے آنسو پونچھتی رہی۔ ماں کی ناک سے خون بہنا بند ہو گیا تھا—— مگر یہ کیا؟—— ماں کے پیروں کے پاس اتنا خون——؟

"امی—— کیا ہوا—— پیر میں بھی چوٹ—— کیسے لگی ہے—— دکھایئے—— میں پٹی کرتی ہوں——"

ثمرین ماں کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی اشکبار آنکھوں میں دیکھتی ہوئی اپنے جواب کا انتظار کرتی رہی مگر امی درد سے کراہتی رہی اور ہچکیاں لیتی رہی۔

جب ثمرین کچھ نہیں سمجھی تھی—— حیرت سے امی کے پچکے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر چپ چاپ سوچوں میں گم ہو جاتی—— ایک بار امی سے پوچھا تھا تو امی بہت غمزدہ ہو گئی تھیں—— دوبارہ اس نے امی سے کبھی نہیں پوچھا۔

چھ ماہ کا حمل ضائع ہونے سے نادیہ کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ دوبارہ ماں بننے کی امید بھی جاتی رہی۔ پیٹ کے اندر Infection بھی ہو گیا تھا جس کے لئے اسے مہینوں اینٹی بایوٹک کھانے پڑے تھے۔ کوئی سال بھر بعد وہ پوری طرح صحت یاب ہوئی مگر پھر بھی خون کی جسم میں کمی رہی۔

گھر کا ماحول آسیب زدہ سا ہو گیا تھا۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔

نادیہ کے اس درجہ تکلیف اٹھانے کے باوجود بھی شاہد کا برتاؤ نہیں بدلا تھا۔ برسوں سے وہ مستقل طور پر ثمرین کے کمرے میں ہی رہ رہی تھی۔ ادھر ہمیشہ سے اپنی صحت پر فخر کرنے والے شاہد کو اچانک بخار نے آلیا۔ بخار بھی ایسا کہ ٹوٹنے کا کوئی نام ہی نہیں۔ پیٹ میں رہ رہ کر درد اٹھتا تھا۔ گولیاں وغیرہ آزمائی گئیں۔ فیملی ڈاکٹر کا نسخہ بھی کارگر نہ ہوا تو اس نے خون کی جانچ کا مشورہ دیا۔ ان دنوں شاہد نسبتاً کم غصہ کرتا تھا۔ گھر میں تناؤ کچھ کم تو ہو گیا تھا مگر نادیہ کو ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ خاموشی کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ جیسے وہ جان بوجھ کر چپ رہتا تھا کبھی کبھی نادیہ کو بغور دیکھتا اور دیکھتا چلا جاتا۔

نادیہ کسی فرض سے نہیں چوکتی، اس کی خدمت میں لگی رہتی۔ کبھی شوربہ تیار کر رہی ہے، کبھی پھلوں کا رس نکال رہی ہے۔ بار بار ثمرین کو شاہد کے پاس بھیجتی رہتی کہ اسے کچھ ضرورت تو نہیں ہے۔ اس کے کمرے میں مسلسل Room freshner چھڑکتی رہتی۔

اصل میں شاہد کو برسوں سے مالیخولیہ کا عارضہ تھا۔ اس کے مسوڑھوں سے خون رستا تھا کبھی زیادہ کبھی کم۔ اسے بار بار کلی کرنا پڑتی تھی ورنہ اس کے سانس سے کچھ زیادہ بدبو آنے لگتی۔ بستر پر پڑے رہنے سے سارے کمرے میں تعفن پھیلا رہتا تھا۔ جس سے نادیہ کو ابکائیاں سی آتیں مگر وہ چپ چاپ سب برداشت کرتی حالانکہ وہ اس تعفن کا خود کو کبھی بھی عادی نہیں کر پائی تھی اور اسے برداشت کرنے کا مرحلہ اس کے لئے سوہان روح تھا۔ ادھر کچھ برسوں سے الگ کمرے میں رہنے سے اسے اس بدبو سے نجات حاصل ہوئی تھی مگر شاہد کی بیماری کے دنوں میں وہ نہایت مستعدی سے اس کی تیمار داری میں منہمک تھی۔ اسے اور کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

خون کی جانچ کے نتیجے کی رپورٹ کے دن ڈاکٹر نے نادیہ کو فون کر کے تجربہ گاہ بلایا تھا اور اکیلے آنے کی تاکید کی تھی۔

شاہد HIV positive تھا۔ مگر وہ اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوا اور دوسری جگہ سے خون کی

اٹھ کر چلی گئی۔ شمیم روتی رہا۔

پھر اس کا باقاعدہ علاج شروع ہو گیا۔ انجکشن، دوائیاں، ہمدردی، خدمت، سب کچھ میسر تھا اسے۔ مگر ن چیزوں سے اسے سکون ملنا ممکن تھا۔ وہ اب چڑچڑا بھی ہو گیا تھا۔

جب سے شاہد کے خون کی جانچ صحیح نکلی تھی تو س کا رویہ ایسا ہو گیا جیسے اس کی بیماری کے لئے نادیہ ہی ذمہ دار ہے۔

ملنے والوں کو معلوم ہوا تو کنارہ کش ہو گئے۔ شاہد اب کبھی گھر میں ہوا کرتا کبھی اسپتال میں۔ نادیہ ہر وقت اس کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔

کئی مہینوں سے لگاتار اسپتال میں رہنے کے بعد آج مدت بعد ڈاکٹر نے اسے گھر لوٹنے کی اجازت دی تھی۔

"تم کیا تیمار داری کا ڈھونگ رچاتی ہو--- انتظار میں ہو گی کہ میں مر دوں اور تم جلد سے جلد دوسری شادی کرو" ایک دن نادیہ کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لیتے ہوئے شاہد نے کہا۔

"مگر یاد رکھنا--- تم سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ سب جانتے ہیں کہ تم دوبارہ ماں نہیں بن سکتیں بانجھ ہو تم بانجھ--- سمجھیں؟" اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور نادیہ اسے پل بھر دیکھنے کے بعد کسی کام میں مشغول ہو گئی۔ "ہاں کوئی بوڑھا، لنگڑا لولا ہو تو بات دوسری ہے--- کب کر رہی ہو شادی---؟" وہ حلقوں میں دھنسی آنکھوں کو پھیلا کر بولا--- نادیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بولو---" وہ غصے سے چیخا۔

"کیا کہہ رہے ہو--- اپنے حواس کھو چکے ہو کیا" اس نے تڑپ کر کہا۔

"سبھی عورتیں ایسا ہی کہتی ہیں--- مگر ادھر شوہر کی آنکھ بند ہوئی، ادھر وہ نیا خاوند تلاش کرنے نکل کھڑی ہوئیں۔"

نادیہ منہ پھیر کر چپکے چپکے رو پڑی۔

اس روز وہ شاہد کو دکھانے کے لئے اسپتال لے گئی تو ڈاکٹروں نے اسے دوبارہ داخل کر لیا۔

جانے اس روز ڈاکٹر نے نادیہ سے کیا کہا کہ کھانا لینے جب وہ گھر آئی تو ثمرین کو گلے سے لپٹائے کتنی ہی دیر وہ گم سم بیٹھی رہی۔

اسپتال پہنچی تو ڈاکٹر شاہد کو درد سے نجات کے لئے انجکشن لگا چکا تھا۔ شاہد بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ نادیہ نے اس کا چہرہ گیلے تولیے سے صاف کیا ہمیشہ کی طرح اس کے بالوں میں کنگھا کیا۔ آج سے پہلے نادیہ کا چہرہ کبھی اتنا بجھا ہوا نہیں تھا۔ آج وہ پتھر کا متحرک بت معلوم ہو رہی تھی۔

شاہد ہوش میں آیا تو نادیہ نے اسے جوس کے گلاس کے ساتھ دوا کی ٹکیہ بھی دی۔

"زہر تو نہیں ہے کہ تمہاری جان کا عذاب ختم ہو" شاہد دوا کی طرف دیکھ کر طنزیہ بولا۔ نادیہ نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی منہ پھیرا--- چپ چپ سی اسے دیکھتی رہی۔ شاہد کا چہرہ آج سفید پڑ گیا تھا، چہرے کی تقریباً تمام ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔

"اس طرح گھور کیا رہی ہو؟--- کیا میں بدصورت لگ رہا ہوں--- یا نیم مردہ نظر آ رہا ہوں" وہ غصے سے بولا۔

"نہیں--- ایسا کچھ نہیں--- ایک گلاس اور دوں" وہ دھیرے سے بولی۔

"نہیں" وہ برجستہ بولا اور بغور اسے دیکھتا رہا۔

دوسری صبح جب نادیہ آئی تو وہ خاموش اسے دیکھتا رہا۔

"میرے قریب آؤ---" اس نے آہستہ سے کہا۔

نادیہ اسے چونک کر دیکھنے لگی۔

"گھبراؤ نہیں--- میں کچھ نہیں کہہ رہا---"

وہ کچھ نرمی سے بولا۔ نادیہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔

"میں تمہارا چہرہ چھونا چاہتا ہوں--- چھونے سے انفکشن نہیں ہوتا۔" نقاہت کے مارے اس نے سر پلنگ سے ٹکا دیا۔ اس کی سانس بے ترتیب ہو رہی تھی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

"ہو سکتا ہے یہ میری آخری [illegible]--- سے میں--- آخری مرتبہ کچھ مانگ رہا ہوں شاید" شاہد نے آنکھیں کھول کر نادیہ کی طرف ملتجیانہ نظروں سے کہا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے--- ایسا مت کہو---" نادیہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"کس بات سے---؟ میری خواہش سے یا میرے اندیشے سے" وہ مسلسل اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ نادیہ نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ شاہد کے چہرے پر کچھ طلب، کچھ التجا اور جانے کیا کیا ایک ساتھ نظر آ رہا تھا۔

نرس نے وقت ختم ہونے کا اعلان کیا تو وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور شاہد کو دیکھتی رہی۔ وہ اب ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نادیہ نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا تو اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی بائیں طرف کی پہلی داڑھ پر خون لگا ہوا تھا۔ نادیہ کے چہرے پر عجب محرومی بھری یاسیت چھائی ہوئی تھی۔

وہ آگے بڑھ کر پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی تو شاہد دھیرے دھیرے اس کی طرف جھکا اور اس کا چہرہ اپنے دونوں کپکپاتے ہوئے ہاتھوں میں لے لیا۔

پھر کچھ لمحے خشک ٹہنیوں جیسی انگلیوں میں گھرے پھول چہرے کو بمشکل تمام وا کی ہوئی آنکھوں سے بغور دیکھنے کے بعد اپنا چہرہ اس پر جھکا دیا۔ نادیہ گل ہوتے ہوئے چراغوں جیسی اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی--- شاہد نے اپنی پوری طاقت صرف کر کے اپنے ہاتھوں کی گرفت اس کے چہرے پر مضبوط کر دی اور اس کے لب کو دانت سے کاٹنے کی کوشش میں زور سے دباتا چلا گیا تو نادیہ نے ایک جھٹکے سے خود کو اس کی گرفت سے آزاد کر لیا---

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا--- اگر اس کا ہونٹ اک ذرا سا بھی زخمی ہو جاتا تو--- تو شاہد کے مسوڑھوں کا--- خون---

اس نے زندگی میں پہلی بار شاہد کی طرف حقارت سے دیکھا اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

اسلم

الجھی راہوں کے مسافر

"اگر ابا نے اپنے سماجی تعلقات ذرا وسیع پیمانے پر استوار کئے ہوتے تو اسے بہتر ملازمت مل سکتی تھی۔"

کمار اینڈ سنز سے نوکری کا پروانہ حاصل ہوتے ہی فرید کے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہی آیا۔ ذہین ہونے کے باوجود اس سے پڑھائی لکھائی میں جانفشانی کبھی نہیں ہو سکی تھی۔ سیماب صفت طبیعت محنت اور توجہ کی راہ میں ہمیشہ حائل رہی۔ جس کا نتیجہ معمولی نمبروں سے گریجویشن کی صورت میں بر آمد ہوا۔ پھر بھی نئے فیشن کے مطابق کسی نہ کسی طرح اس نے ایک پرائیویٹ ادارے سے ماسٹر آف بزنس منیجمنٹ کا ڈپلوما تو حاصل کر ہی لیا۔ جب مقابلہ جاتی امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا تو فرید پر زندگی کی تلخ حقیقتیں آشکارا ہوئیں۔ نہ جانے کتنے سال بیت گئے اسے ہوش اس وقت آیا جب سرکاری ملازمت کے لئے متعین حدود سے اس کی عمر کا آخری لمحہ بھی گزر گیا۔

اسے وہ گھڑی اب بھی یاد تھی۔ بالکل ایسا محسوس ہوا تھا گویا پیروں تلے زمین کھسک گئی ہو۔ بہت جوتیاں چٹخانے کے بعد بھی جب وہ بے نیل و مرام رہا تو آخر کار ابا نے اپنے اصولوں کو اس کی خاطر طاق پر رکھا اور ان کی جان پہچان سے ایک اوسط درجہ کی کمپنی میں اسے ملازمت مل گئی اور اب فرید ابا کے محدود سماجی تعلقات پر تاسف کر رہا تھا۔

تندگی سے جو اعلیٰ توقعات اس نے وابستہ کی تھیں، انہیں ایک بار پھر جھٹکا لگا۔ برسر روزگار ہوتے ہی اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ جان کر وہ ششدر رہ گیا کہ اس کے رجحان سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود والدین نے اس کا عندیہ لئے بغیر رشتہ ایک ایسے گھرانے میں طے کر دیا جو اس کے خیال کے مطابق سخت قدامت پرست تھا۔ لوگ مذہبی امور کی پوری پوری پابندی کرتے تھے۔ ہر وقت اسی کا چرچا تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم تک کا اہتمام پردے میں کیا جاتا تھا۔ ایسے ماحول کی پروردہ دوشیزہ کے خیالات کیسے ہوں گے؟ گویا ایک برقعہ پوش آسیب کو اس کے سر پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں قدم رکھتے ہوئے بھی دنیا میں ایسے عجائب روزگار پائے جاتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو آخر لوگ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کناڈا جا کر بھی تو حجاب کی باتیں کرتے ہیں۔ لیکن قہر درویش بر جان درویش۔ جب سب کچھ والدین کی کوششوں کا ہی مرہون منت تھا تو وہ ان کی مخالفت کیسے کرتا۔ خصوصاً ابا سے تو آنکھ ملانے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

مگر شادی کے بعد اس کی ساری مایوسیاں دور ہو گئیں۔ ثمینہ تو اس سے بھی زیادہ روشن خیال ثابت ہوئی۔ اپنے گھر کے روایتی ماحول سے سخت بیزار، کھلی فضاؤں میں پرواز کرنے کی متمنی۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ اسے ایک نیا اعتماد حاصل ہو گیا۔ دونوں مذہب میں پورا یقین رکھتے تھے لیکن جائز و ناجائز کی باریکیوں میں الجھ کر دنیا کی ساری لذتوں سے منہ موڑ لینا بھی حماقت سمجھتے تھے۔

اپنے معیار و مذاق کے ساتھی کی معیت میں فرید کے شب و روز حسین خوابوں میں ڈھل گئے۔ اس کے رویے میں حیرت انگیز تبدیلی آگئی کیونکہ زندگی کو نئی سمتوں سے روشناس کرنے کے لئے محنت کی ضرورت تھی۔ اس کا خوشگوار نتیجہ بھی جلد ہی سامنے آگیا۔ بہتر کارکردگی کے پیش نظر کمپنی کی طرف سے اسے ترقی مل گئی لیکن ساتھ ہی تبادلہ بھی ممبئی جیسے شہر میں ہو گیا۔ عروس البلاد میں اپنی الگ گرہستی بسانا ایک سنگین مسئلہ تھا۔ مناسب مکان کی تلاش میں اسے در در کی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ کمپنی سے رہائش گاہ کے لئے منظور شدہ رقم میں جیسا گھر اور علاقہ ملا اسے دیکھ کر فرید کا دل بیٹھ گیا۔ ثمینہ کے متعلق سوچ کر وہ اور بھی ہراساں تھا۔ نہ جانے اس نے کیا کیا امیدیں لگائی ہوں گی۔ لیکن وہاں پہنچ کر ثمینہ نے اپنی مایوسی کا اظہار ہونے نہیں دیا۔ گھر جیسا بھی ہو، صرف اس کا تھا۔ مکمل آزادی کا احساس اب جا کر ہوا تھا اس لئے وہ حد درجہ مسرور تھی۔ ابتدائی دن سیر و تفریح میں گزرے۔ مگر چند مہینوں کے اندر ہی کچھ ناگزیر حالات کے باعث مکان تبدیل کرنے کی نوبت آگئی۔ بہت سی دشواریوں کے باوجود آخر کار زندگی ایک معمول پر چل نکلی۔

دھیرے دھیرے وہ یہاں کی ہنگامہ خیزیوں کے عادی ہوتے گئے۔ انسانوں اور کنکریٹ کے اس جنگل میں کس قدر اجنبیت تھی۔ پڑوسی ایک دوسرے سے بیگانہ۔ ویسے بیگانگی کے بھی کئی مثبت پہلو تھے۔ مثلاً کسی کا کسی کے معاملات میں دخل اندازی نہ کرنا۔ سماج کی پابندیوں سے بہت حد تک چھٹکارا، سلسلہ روز و شب اور

اے۔۸۸۔ چندر اروڈ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۳

اپنی مرضی۔ لیکن فرید کو اس ماحول سے بتدریج اکتاہٹ ہی ہونے لگی۔ اس کی پہچان جیسے کہیں کھو گئی تھی۔ سمندر میں ایک بوند قطرے کی حقیقت ہی کیا ہوتی ہے۔ میکانکی انداز میں روزانہ صبح اٹھ کر چائے پینا، شیو کرنا، تیار ہو کر ناشتہ اور پھر سیدھے دفتر۔ شام کو بیوی کے ساتھ کوئی نئی فلم دیکھنا یا جوہو پر بیٹھ کر بحیرۂ عرب کی لہروں کو تکنا۔ اگلے دن پھر وہی تناؤ اور وہی یکسانیت۔ دفتر بھی فضول تھا۔ کہنے کو وہ سیلز منیجر تھا لیکن درحقیقت کمپنی کے مالکوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی۔ اب کٹھ پتلی کا ناچ چاہے جتنا دلفریب اور عمدہ ہو، نفع اور شہرت تو مالک کے ہی حصے میں آتی ہے۔

فرید نے بڑی لگن اور جوش کے ساتھ اپنے کام کو ایک نیا رخ اور وسعت دینے کی کوشش کی لیکن افسران بالا کی نگاہوں میں اس کی قطعی اہمیت نہیں تھی۔ اپنے محدود دائرے سے آگے قدم بڑھانے کی اجازت اسے کبھی نہیں ملی۔ ممکن ہے یہ کاروباری مصلحتیں ہوں لیکن اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ ان پابندیوں سے اسے شدید بوریت محسوس ہو رہی تھی۔ یہاں اپنی مرضی کے مطابق کھل کر کام کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے لئے تو اپنا ادارہ ہونا چاہئے۔ لیکن ہماری قوم میں ادارہ سازی کا رجحان ہی کب ہے؟ لوگ لایعنی منصوبوں پر دولت لٹا دیتے ہیں مگر تنظیم کی طرف کبھی دھیان نہیں دیتے، وغیرہ وغیرہ سوچتے ہوئے اسے نیند آ جاتی۔ خوابوں میں وہ کبھی اپنی بڑی فرم کا پروپرائٹر ہوتا تو کبھی منیجنگ ڈائرکٹر۔ اسی طرح صبح ہو جاتی اور پھر وہی یکسانیت۔

وہ اور ثمینہ زندگی کا بھرپور لطف اٹھانے کے قائل تھے۔ لیکن اس کی محدود آمدنی روز بڑھتی ہوئی مہنگائی کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھی۔ رفتہ رفتہ گھر میں موجود ساری چیزوں کے ماڈل پرانے ہو گئے۔ ہر شئے کی چمک ماند پڑ گئی۔ پڑوسیوں میں بھی تو کسی کا تعلق اعلیٰ متوسط طبقے سے نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا شاہانہ خرچ، کار سے لے کر گیس کے چولہے تک کے شاندار اور آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دینے والے ماڈل، پارٹیاں اور آئے دن کی سیر و تفریح دیکھ دیکھ کر وہ استعجاب اور احساس کرب میں مبتلا رہتے۔ طرح طرح کے سوالات ذہن میں چبھتے رہتے۔ آخر کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں؟

"ایسا لگتا ہے کہ اب صرف ریاکار اور فریبی لوگ ہی اس دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہیں" ایک شام دفتر سے واپس آ کر کپڑے تبدیل کرتے ہوئے فرید نے انتہائی افسردگی سے خود کو مخاطب کیا۔ اس کی ترقی کا ایک اچھا موقع باس کا کوئی خوشامدی اچک لے گیا تھا۔

میز پر چائے کا طشت رکھتی ہوئی ثمینہ نے اس کا جملہ سن لیا اور معاملے کا صحیح اندازہ لگاتی ہوئی بولی۔ "صرف ایک چھوٹی سی فرم کی نوکری میں اپنی جان کھپانا اور اسی پر انحصار کرنا تمہاری سب سے بڑی غلطی ہے۔"

"تو اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟ دیگر کسی کام کے لئے وقت بھی درکار ہے" فرید کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

"یہاں آس پاس اور لوگ بھی تو رہتے ہیں۔ کیا وہ الگ سے کچھ نہیں کرتے؟"

"کرتے ہوں گے مجھے کیا معلوم۔"

"یہی لاعلمی تو تباہ کن ہے۔ سمندر میں رہ کر بھی تم نے تیرنا نہیں سیکھا۔ اس زمانے میں لوگ اپنی صلاحیتوں سے زیادہ اپنے سماجی رشتوں کے ذریعہ ترقی کے بام عروج پر پہنچتے ہیں۔"

"یہ سب بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ تمہیں نہ پرائیویٹ کمپنیوں کے بارے میں پتا ہے اور نہ میرے عہدے کے متعلق جانتی ہو کہ وہ کتنا غیر اہم ہے۔" فرید کو چائے کا ذائقہ تلخ لگنے لگا۔ لیکن ثمینہ نے ہمت نہیں ہاری۔

"کوشش کرنے سے ہی کامیابی ملتی ہے۔ میں ایسے کتنے ہی لوگوں کو جانتی ہوں جنہوں نے کسی سفارش سے اپنی بیویوں کو اسکولوں یا ایسے ہی اداروں میں نوکری دلا رکھی ہے جہاں محنت اور ذمہ داری تو محض برائے نام ہے اور تنخواہ پوری، جو دوسرے فائدے ہیں وہ الگ۔ کتنی ہی سماجی خدمات کی اسکیمیں ہیں جنہیں مختلف ذرائع سے بھرپور امداد ملتی ہے۔ اگر ان میں شامل ہو سکیں تو کہنا ہی کیا۔" ثمینہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"اسکولوں میں تو [illegible] ملازمت دلا سکتے ہیں اور سماجی خدمت [illegible] تیاگ کی ضرورت ہے۔ [illegible] ہے۔"

"تم کسی بات کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اسی لئے تمہاری یہ حالت ہے۔ [illegible] کہ ہیں کو اب کچھ نظر آتے ہیں [illegible]" ثمینہ نے ہنستے ہوئے کہا اور طشت اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔

فرید کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ [illegible] ثمینہ کا مشاہدہ بہت حد تک حقیقت پر مبنی تھا۔

وہ اس کی زیرکی اور باریک نگاہوں کا قائل ہو گیا۔

جہاں چاہ وہاں راہ۔ مسلسل کوششوں کے بعد ان کے مراسم کچھ ایسی بااثر شخصیتوں سے استوار ہو ہی گئے، جو ان کے خیال کے مطابق زندگی کی بوقلمونیوں سے آشنا کرنے میں مددگار اور ہمدرد ثابت ہو سکتے تھے۔ ہر اعتبار سے یہ ایک فسوں خیز جہاں تھا۔ فرید کو اس بات کا اعتراف تھا کہ یہ شاہراہ ثمینہ نے ہی سجھائی تھی اور اس مخصوص خول کو توڑ کر باہر نکلنے میں ہر قدم پر اس کا تعاون شامل تھا۔ آرزوؤں کے اس ہجوم میں ثمینہ نے اپنے قرینے سے خود کو جذب کر لیا تھا کہ روایتی پس منظر کا شائبہ تک باقی نہیں رہا۔ ملبوسات کے نئے ڈیزائن ہوں یا زیورات کا انتخاب یا پھر موسیقی کے تازہ ترین البم کا چناؤ۔ ہر بات میں اس کے سلیقے اور جدید انداز فکر کی جھلک نمایاں رہتی۔ گرچہ گفتگو میں نت نئی سائنسی ایجادوں اور دم بہ دم پیدا ہونے والی نئی اصطلاحوں کا تذکرہ اس کی احساس کمتری کی غمازی کرتا تھا لیکن خواب آلود آنکھوں کا سحر اور لب لعلیں پر کھلتی تبسم اس خامی کو پس پشت ڈال دیتا۔

اپنی خوش اخلاقی کے سبب [illegible] ہی مقبول ہو گئے۔ [illegible] مہذب معاشرے کے [illegible] کہتے ہیں۔ [illegible]

ہیں مختلف دنیا میں شامل ہو گیا تھا کل تک جتنا وہ سمجھ رہے تھے۔ پھر بھی اس طرح کی ملاقاتوں اور تبادلہ خیالات سے واضح طور سے ان پر کئی نئے اور حقائق منور و روشن کر دیئے۔

کسی ایسی ہی محفل میں ان کا تعارف فاران سے ہوا تھا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل فرم کا ایگزیکٹو ڈائرکٹر ہوتے ہوئے بھی نہایت ہنس مکھ اور ملنسار طبیعت کا تھا۔ فاران کی شخصیت مختلف تہذیبوں کا امتزاج تھی۔ اس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں صرف شادی اور موت کے مواقع پر ہی اپنی روایات کو یاد کرنے کا رواج تھا۔ زندگی سے متعلق اس کی آئیڈیالوجی قابل اعتراض ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ اونچ نیچ کے اوچھے پن سے کوسوں دور تھا اور اس خوبی نے اسے ایک کھلا کھلا اور دلآویز تشخص عطا کر دیا تھا جس میں بے پناہ کشش تھی۔ غیر متوقع طور پر فرید سے جلد ہی اس کی گہری دوستی ہو گئی۔

اپنے وسیع حلقہ احباب میں بھی اس نے ثمینہ اور فرید دونوں کو متعارف کروایا جن میں تاجر، افسر، اداکار، کھلاڑی، مصور سبھی شامل تھے۔ اس عزت افزائی سے وہ مسحور ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوا گویا صحرا کا سفر طے کرنے کے بعد نخلستان کی پناہ مل گئی جس کا وہ برسوں سے انتظار کرتے آئے تھے۔

فاران اپنی فرم کی طرف سے اکثر غیر ممالک کے دورے پر جاتا رہتا تھا۔ ہر بار واپسی پر وہ فرید اور ثمینہ کے لئے قیمتی تحائف کے ڈھیر لگا دیتا، لیکن یہ تو عارضی خوشیاں تھیں۔ وہ جس بات کے متمنی تھے۔ بعد مدت آخر وہ موقع آ ہی گیا۔

فاران کی سالگرہ تھی۔ مختلف النوع دوستوں کا دلچسپ اجتماع تھا۔ کیک کٹنے کے بعد دستور محفل کے مطابق دور مے نوشی کا آغاز ہوا۔ جب رات بھیگنے لگی تو ڈنر کی باری آئی۔ صبح آفس میں تاخیر ہو جانے کے خوف سے [illegible] اجازت چاہی۔

"[illegible] ایک خوبصورت سرپرائز ہے تمہارے لئے [illegible]" [illegible]

[illegible]

[illegible]

"گھبراتا ہے کیا؟" ثمینہ نے اسے ٹہوکا دیا۔

"ٹھیک ہے [illegible] یار، ایسی بھی کیا جلدی۔ ڈرائیور چھوڑ آئے گا تمہیں۔" وہ اس کے شانے تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔

جب زیادہ تر مہمان رخصت ہو چکے تو فاران نے ڈرامائی انداز میں سرپرائز دیتے ہوئے اپنی فرم میں ملازمت کی پیش کش کی۔ فی الحال ایک چھوٹا سا عہدہ دستیاب تھا مگر اس کی موجودہ نوکری سے بدرجہا بہتر کیوں کہ یہاں ترقی کے شاندار امکانات روشن تھے۔ شرط صرف یہ تھی کہ پہلے اسے ایک سال کا مخصوص تربیتی کورس مکمل کرنا ہوگا۔ ملٹی نیشنل کمپنی کے خیال سے ثمینہ کے چہرے پر قوس و قزح دمک اٹھی۔ گویا سفینہ امید لب ساحل سے ہم کنار ہونا چاہتا ہے۔ فرید نے صاف طور سے فوراً اقرار کر لینا تو مناسب نہیں سمجھا مگر دل ہی دل میں اس تجویز پر وہ ہزار جان سے صاد کر چکا تھا۔

اس دن کے بعد ان کے تعلقات میں مزید شیرینیت بھر گئی۔ فاران کو پارٹیاں منعقد کرنے کا مشغلہ کافی محبوب تھا۔ ثقافتی مراکز اور کلب وغیرہ میں تو کسی انتظام کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن جب اس کی تیاری رہائش گاہ پر ہوتی تو اس کے اہتمام کے لئے وہ ثمینہ سے گزارش کرتا۔ اس وقت ثمینہ کو بڑے فخر کا احساس ہوتا۔ وہ اندرون خانہ تزئین سے لے کر سلاد کی پلیٹ کی آرائش اور لذیذ کھانوں کی ترکیبوں کے سارے چٹکاروں کا مظاہرہ کر ڈالتی۔ اس کا ذہن ابتدا سے تخلیقی تھا لیکن ان صلاحتوں کو اجاگر ہونے کا موقع اب ملا تھا۔

اس کی نت نئی اپج کو دوستوں کے حلقے سے ہمیشہ داد و تحسین ملی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ پردے کی پابند ایک گھریلو لڑکی جس کے یہاں ایسی چیزوں کا تذکرہ بھی ممنوع تھا۔ آج اپنے تراشیدہ گیسو جھلاتی ہوئی جدید بزم آرائیوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس کی شوخ ادائیں، نفیس ذوق اور حاضر جوابی کئی الٹرا ماڈرن خواتین کے لئے بھی رشک کا باعث تھی۔ میزبان کا فرض انجام دیتے ہوئے وہ بڑے اسمارٹ اور فیشن ایبل لوگوں پر بھی ایسے برمحل اور ذو معنی فقرے چست کرتی کہ حضرات عش عش کر اٹھتے اور خواتین بل کھا کر رہ جاتیں

لیکن محفل کے اختتام پر سب کا موڈ خوشگوار ہو جاتا۔

فرید کو کبھی کبھی تنہائی میں سوچ کر یہ سب بڑا نامناسب لگتا تھا لیکن تھوڑی دیر میں ہی یہ خیال زائل ہو جاتا۔ اسے یقین تھا کہ یہ احساس فرسودہ اقدار کی محض بازگشت ہے۔ سارا قصور ہے سماجی اور اقتصادی مشکلات کی چکی میں پستے ہوئے اس کے دقیانوسی پس منظر کا جہاں مصیبتوں کو ان دیکھی شادمانیوں کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ حیات کی ساری رعنائیوں اور کامیابیوں کو فانی کہہ کر ٹھکرا دینا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

وہ ابھی ٹریننگ کے مراحل میں تھا کہ سال نو کا جشن آن پہنچا۔ کلب میں سارے احباب موجود تھے۔ ہیجان خیز موسیقی، تر و تازہ اور دلنشیں چہرے، کیف و سرور کی فضا میں مسکراتے ہوئے دنیا کے ہر غم کی نفی کر رہے تھے۔ سب کی طرح فرید اور ثمینہ بھی ڈانس فلور پر پہنچے۔ کچھ ہی دیر میں فرید اکتا کر واپس اپنی میز پر آ گیا، لیکن ثمینہ اور فاران رقص کرتے رہے۔ وہ کرسی پر بیٹھا بے دلی سے پہلو بدلتا رہا۔ بارہ بجنے کے بعد ہنگاموں میں شدت آئی اور ساتھ ہی رقص کرتے جوڑوں کی نزدیکیاں بھی بڑھ گئیں۔ فرید کو اچانک شدید غصہ آ گیا۔ یہ تو ناقابل برداشت ہے ہر چیز کی آخر ایک حد ہوتی ہے۔ انتظار میں مزید کچھ دیر پیچ و تاب کھانے کے بعد وہ تیزی سے فلور پر گیا اور ثمینہ کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً اسے گھسیٹتے ہوئے باہر نکل آیا۔

فاران دم بخود اسے دیکھتا رہ گیا۔ شراب اور سنگیت کی لہروں میں ڈوبے ہوئے لوگوں نے اس واقعے پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

گھر پہنچنے کے بعد ثمینہ نے ایک لفظ کہے بغیر خود کو کمرے میں بند کر لیا اور اس دن سے گھر میں کشمکش اور تناؤ کا ماحول تھا۔ ثمینہ کو اپنی ذلت سے زیادہ مستقبل کی فکر ستا رہی تھی۔ فرید نے اپنی حماقت سے بنی بنائی بات بگاڑ دی تھی۔ اس ہمالیائی غلطی کو سدھارنا انتہائی دشوار تھا۔

فرید کو اب اپنی ٹریننگ بے معنی نظر آ رہی تھی۔ ادھر گھر میں چھائی خاموشی اور ویران اداسیاں۔ ثمینہ جنگ بندی کے لئے ہرگز آمادہ نہیں تھی۔ فاصلے حد سے گزر نہ جائیں اس لئے فرید نے خود ہی خلیج کو پاٹنا

ایک شام گھر لوٹتے ہوئے بہت سے الفاظ اور جملوں کو ترتیب دینے کے بعد وہ سیدھے ثمینہ کے پاس جا بیٹھا اور ہمت سے کام لے کر بڑے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا جسے زور سے جھٹک دیا گیا۔ سنگار میز کے کونے سے ٹکرا کر اچھی خاصی چوٹ لگی۔ درد کو برداشت کرتے ہوئے فرید نے خود کو بہت سنبھال کر کہا۔

"ثمینہ میں ماڈرن ضرور ہوں لیکن اتنا گرا ہوا نہیں، ترقی کرنا چاہتا ہوں مگر غیرت کی قربانی دے کر نہیں، آخر وقار کے بھی کچھ معنی ہوتے ہیں۔ ہماری آسائشوں کے حصول کے لئے اس طرح کے تبادلے......"

ثمینہ کا چہرہ طیش میں سرخ ہو گیا۔ "خلوص کے رشتے کو تبادلہ کہتے ہیں؟"

"اور کیا ادھر اپنی فرم میں نوکری ادھر لمس اور قرب کیا یہ......"

"شرم آنی چاہئے تمہیں، یہ ایک معمولی سی بات ہے جو اب ہمارے کلچر کا ایک حصہ بن چکی ہے آخر اونچی سوسائٹی کے بھی کچھ آداب ہیں، جنہیں نباہنا پڑتا ہے، دراصل تم اپنے اوچھے پن سے نجات حاصل نہیں کر سکے ہو۔ بھری محفل میں اپنی قصباتی ذہنیت کا مظاہرہ کر کے تم نے یہ سنہرا موقع ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ اب اسی چھوٹی سی کمپنی میں پستے رہو اپنی نام نہاد عزت کو لے کر" ثمینہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

فرید کے دل میں ایک خلش تو پہلے سے ہی تھی۔ بیوی کی دو ٹوک باتوں نے اسے مزید بڑھا دیا۔ کہیں اس کا الزام درست تو نہیں؟ جدید معاشرے کی سہولتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس کے تقاضوں کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ صرف اپنے اصولوں کو ہی صحیح ماننا کہاں کی دانش مندی ہے۔ مصیبتوں اور محرومیوں کے احساس کے ساتھ ساری زندگی کیسے بسر ہو گی؟ آخر ایسی اضطراری کیفیت اس پر کیوں طاری ہو گئی تھی؟" خود کو ملامت کرتا ہوا وہ پریشان ہو اٹھا۔ اچانک کال بیل کا ترنم گونجنے لگا۔ بوجھل دل کے ساتھ فرید نے دروازہ کھولا۔ سامنے فاران کا مسکراتا چہرہ تھا۔ وہ سٹ پٹا گیا۔

"میں...... میں دراصل اس رات......" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آگے کیا کہے۔

فاران ہنس پڑا۔ "زیادہ پی لی ہو گی۔ کوئی بات نہیں فرید کبھی کبھی آدمی بہک ہی جاتا ہے۔ ڈونٹ وری، چھوڑو پرانی باتیں۔ ثمینہ نے کئی بار فون کیا تھا لیکن میں سنگاپور گیا ہوا تھا۔ کل ہی واپس آیا ہوں، بس فرصت ملتے ہی چلا آیا، کہاں ہیں وہ؟"

ان کی بات چیت سن کر ثمینہ اپنے غم خانے سے باہر نکل آئی۔ سوگوار حسن کچھ زیادہ ہی دلکش لگ رہا تھا۔ تینوں دیر تک باتیں کرتے رہے اور ایک دوسرے کو یقین دلاتے رہے کہ اب ان کے دل میں کوئی شکن باقی نہیں رہی۔

موسم بہار رخصت ہونے کو تھا۔ گزشتہ تلخیوں کو بھلانے کے لئے "جشن بہار" فرید کے گھر پر ہی منعقد کیا گیا۔ چھوٹے سے فلیٹ کو قنات وغیرہ کی مدد سے عارضی طور پر کشادہ بنا دیا گیا تھا۔ ثمینہ بیوٹی پارلر سے سنور کر آ چکی تھی اور کھانے کے انتظامات دیکھ رہی تھی۔ فرید نے بھی اپنا جدید طرز کا نیا سوٹ زیب تن کر کے قد آدم آئینے پر نگاہ ڈالی۔ آنکھوں پر 'رے بین' کی سیاہ میں سنہری جھلک مارتی ہوئی چمکیلی عینک، ریشمی ٹائی، ایک ہاتھ میں موبائل فون اور چوڑے پٹے کی رسٹ واچ، دوسرے ہاتھ کی تین انگلیاں مختلف نگینوں والی انگوٹھیوں سے مزین اور شخصیت کو مزید بااثر بنانے کے خیال سے مونچھوں کا نیا اسٹائل۔ مردانہ خوشبو کی شیشی اٹھاتے ہوئے فرید ٹھٹک سا گیا۔ اسے اپنا عکس اجنبی لگ رہا تھا۔ شاید یہ وہ خود نہیں بلکہ 'نئی تہذیب' کا کوئی نمائندہ تھا جو اس پر اس طرح حاوی ہو گیا تھا جیسے جن کا سایہ۔ اس کا اپنا وجود دھواں دھواں ہو کر کہیں دور سمندر کی تہوں میں سا چکا تھا۔

میوزک سسٹم پر مدھم سروں میں کوئی کلاسیکل ساز بج اٹھا۔ دوستوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ ڈرائنگ روم قہقہوں اور شہر کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ دروازے کے پاس مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے فرید کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ کسی بھول بھلیاں کے درمیان کھڑا ہے جہاں سے باہر نکلنے کی ساری راہیں الجھ کر رہ گئی ہیں۔ ☆☆

نور صبا

غزل

جگا کے راتوں میں ملنے وہ مارتا ہے مجھے
صلیبِ شک پہ چڑھا کے اتارتا ہے مجھے

تھکی تھکائی میں جب لوٹتی ہوں شام کو گھر
وہ پھاڑ پھاڑ کے آنکھیں نہارتا ہے مجھے

ذرا سی دیر پہ سنگِ سوال برسا کر
وہ پُل صراط سے ہو کر گزارتا ہے مجھے

وفا کی روح سماعت کراہ اٹھتی ہے
وہ کہہ کے "ننگ وفا" جب پکارتا ہے مجھے

میں بزم غیر میں بھی اس کو جیت رکھتی ہوں
وہ خلوتوں میں بھی، مجھ سے ہی ہارتا ہے مجھے

میں خام سونا ہوں جیسے کہ آگ پر رکھ کر
تپا تپا کے ستم گر نکھارتا ہے مجھے

بہ ایں تفاوت پیہم کبھی کبھی وہ صبا
کمال شوق سے خود ہی سنوارتا ہے مجھے

ابوالکلام آزاد ایجوکیشنل، انسٹی ٹیوٹ
آزاد نگر، ڈمریا گنج، سدھارتھ نگر۔ ۲۷۲۱۸۹

تبصرے

نام کتاب : مسند خاک

شاعر : اکرام خاور

قیمت : ۸۰روپے

تقسیم کار : نرالی دنیا پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی

اکرام خاور کی نظموں کا مجموعہ "مسند خاک" ایک ایسے وقت میں منظر عام پر آیا ہے جب لوگ نئی نسل کے شعرا سے مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد کے شعرا میں وہ تخلیقی شان نظر نہیں آتی جو ادب کے شاندار مستقبل کی ضمانت ہو۔ اس میں شک نہیں کہ نظموں کے حوالے سے ایسے چند نام ابھر کر سامنے نہیں آئے جنہوں نے اپنی انفرادیت سے لوگوں کو متوجہ کر لیا ہو۔ ۱۹۶۰ء کے آس پاس نظم اور غزل کے اتنے شعرا موجود تھے جنہوں نے چند برسوں میں اپنی شناخت قائم کر لی تھی ویسی کوئی کھیپ ادھر کے سالوں میں سامنے نہیں آئی۔ خصوصاً نظم نگاری میں تو دو تین نام کے بعد ذہن پر بہت زور ڈالنا پڑتا ہے۔ ایسے حالات میں اکرام خاور کا شعری مجموعہ 'مسند خاک' ادب کے سنجیدہ قارئین کے لئے تحفہ ہے۔ اس کے مطالعہ ہماری ، سوں کی مایوسی اور بیزاری ختم ہو گی۔ اس لئے کہ اکرام خاور کے اس مجموعہ میں جو تخلیقی چمک ہے وہ اس تیرہ و تار فضا کو روشن کرے گی۔ مجموعہ میں ۴۲ نظمیں شامل ہیں۔ جن میں بیشتر آزاد نظمیں ہیں۔ عرض شاعر کے ایک صفحہ میں اکرام خاور نے اپنی الجھنوں کا اظہار کیا ہے یہ وہی الجھنیں ہیں جو ذہین اور جنون فنکار کا مقدر ہوا کرتی ہیں۔ زندگی سے ابھرنے والے اتنے سوالات ہیں کہ ان کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہی وہ سوالات ہیں جن سے اکرام کی شاعری تحریک پاتی ہے۔

اکرام خاور کی شاعری کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ موجودہ زندگی کی مجبوریوں، اداسیوں اور سفاکیوں کا رشتہ زندگی کے طویل سلسلے سے قائم کرتے ہیں۔ ان کی نظر زندگی کی ان سچائیوں اور قدروں کی طرف بھی جاتی ہے جو اب سوالات کی زد میں آ گئی ہیں اور انسان ان تمام قدروں کو فراموش کر کے اپنی زندگی کا حل تلاش کر رہا ہے۔

مجموعہ کی نظم "دل پر خوں" اکیس مصرعوں کی پابند نظم ہے جو اس مصرعہ سے شروع ہوتی ہے "دل بہت دکھتا ہے ہر بات پہ دل دکھتا ہے" اس کا دل کیوں دکھتا ہے اس کے اظہار کے لئے شاعر نے مختلف چیزوں کے حوالے دیئے ہیں جن میں ایک فنا پذیری اور لاحاصلی نظر آتی ہے۔ نظم دیوانگی میں شاعر نے ان تمناؤں کا اظہار کیا ہے جو ایک آدمی کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ مگر اسے بعد میں احساس ہوتا ہے کہ اس کی اصل دنیا وہی ہے جو اسے مل چکی ہے۔ بقیہ سب کچھ ایک فریب ہے۔ اسی فکر کی حامل ایک نظم "تذبذب" بھی ہے۔

قفس اور بال و پر میں حشر کا شکوہ بجا، لیکن / لہو اور شورش پیہم کا افسانہ بجا، لیکن / گرفتار قفس / دیوار و در میں کسمساتا ہے / وہاں باہر، بہت ممکن اجالا ہو / سمندر ہو بیاباں ہو / سر سر ہو کا عالم ہو / ہوائیں سر بسر سفاک / دھرتی سخت، بنجر / دو پہر کا سخت پہرہ ہو / بہت ممکن / گرفتار تمنا، تشنہ لب / صحرائے ہستی میں بھٹکتا ہو / قفس اور بال و پر میں حشر کا شکوہ بجا، لیکن / لہو اور شورش پیہم کا افسانہ بجا لیکن۔

ان کی شاعری سپاٹ اور اکہری نہیں یعنی مفاہیم تک پہنچنے کے لئے لفظوں اور استعاروں کے نظام کے ساتھ سفر کرنا پڑتا ہے اور کئی بار پڑھنا ہوتا ہے۔ بعض نظموں کے اختتام چونکانے والے ہیں۔ انہوں نے اپنی ان چند نظموں کے ذریعہ جس تخلیقی صلاحیت کو پیش کیا ہے وہ ان کے شاندار مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔

نام کتاب : ریزہ ریزہ خواب

شاعر : جمیل فاطمی

قیمت : ۱۰۰روپے

ناشر : ڈاکخانہ لکھمنیا، ضلع بیگو سرائے۔ بہار

جمیل فاطمی کا پہلا شعری مجموعہ 'ریزہ ریزہ خواب' غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ مجموعہ میں شامل بیشتر غزلیں مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس لئے جمیل فاطمی کا نام اور کلام ادب کے قارئین کے لئے نیا نہیں ہے۔ ان کی شاعری میں ایک ایسی کسک موجود ہے جس کے بغیر شاعری میں کیفیت و حلاوت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کسک کا تعلق ان کی ذات سے بھی اور ان کے دور کے مختلف مسائل اور الجھنوں سے بھی ہے۔ مجھے ان کی شاعری میں وہاں زیادہ حسن نظر آتا ہے جب وہ لب و رخسار سے نکل کر زندگی کے عام مسائل سے آنکھیں ملاتے ہیں۔ وہ ان مسائل کے اظہار میں پیچیدگی سے کام نہیں لیتے۔ ایسا لگتا ہے کہ جوں ہی کوئی افتاد ان پر پڑتی ہے یا ان کا دل کسی واقعہ یا حادثہ سے اثر لیتا ہے وہ فوری طور پر اس کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی مجبوری ہے اس لئے کہ وہ بہت دیر تک اپنے جذبے اور احساس کو قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ ہر حساس شخص کا المیہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی سے ابھرنے والے مختلف مسائل اور پریشانیوں کا اظہار بڑی بے باکی اور صفائی سے کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات کا دائرہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی اور عام سچائیاں ہیں جن سے انسانی زندگی کی خوبصورتی وابستہ ہے۔ ان کی شاعری زندگی کی ان بنیادی سچائیوں کو سامنے لا کر موجودہ زندگی کی منافقت، خود غرضی اور دوسری خرابیوں کو آئینہ دکھاتی ہے۔ جدید معاشرے میں پرانی قدروں کا آدمی کیا الجھن محسوس کرتا ہے اس کا اظہار انہوں نے مختلف حوالوں سے کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

بے سبب ہر ستم اور میں
ہر قدم رنج و غم اور میں
رخ بدلتے ہوئے روز و شب
وقت کے زیر و بم اور میں
تیر و نشتر سناں، سنگ و خشت
شہر اہل کرم اور میں

پے بہ پے حادثے اور سفر
ڈگمگاتے قدم اور میں

ایسا لگتا ہے کہ اب ہر لمحہ
مجھ میں کچھ ٹوٹ رہا ہو جیسے
پشیماں آپ ہو جاتے ہیں خنجر
لہو جب بولتا کچھ بھی نہیں ہے

'ریزہ ریزہ خواب' ایک ایسے شاعر کا مجموعہ ہے جو خوابوں کی دنیا میں نہیں جیتا بلکہ حقیقت کی دنیا میں اپنے خواب کا بدن تلاش کر رہا ہے۔ اس تلاش و تعبیر میں شاعر تنہا نہیں بلکہ بہت سے لوگ ان کے ہم سفر ہیں۔ لہٰذا 'ریزہ ریزہ خواب' ہمارے عہد کی ایک بڑی سچائی ہے۔

سرور الہدیٰ، نئی دہلی

نام کتاب : خانہ بدوش

مصنف : اجیت کور
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

'خانہ بدوش' پنجابی زبان کی معروف قلم کار اجیت کور کی خود نوشت سوانح ہے جس کے لئے موصوفہ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ اس سوانح سے پہلے موصوفہ کا ناول 'گوری' اردو میں شائع ہو چکا اور اس ایک ناول نے ہی موصوفہ کے قلم کی نشتر زنی کی شناخت کرادی ہے۔ 'گوری' گونگی ہے مگر اس کے گونگے پن میں عورت کی مجبوری اور بے بسی کی داستانیں بولتی ہیں اور اجیت کور جب گونگے کردار کو زبان دے سکتی ہیں تو زیر تبصرہ کتاب تو ان کی اپنی داستان حیات ہے۔ ''خانہ بدوش'' ہے تو سوانح مگر ایک ناول کی طرح دلچسپ ہے۔ اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے جوجھتی، سنبھلتی اجیت کور اپنے قاری کو اپنے زندگی کے سفر میں ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ ''خانہ بدوش'' ایک سوانح ہے، ان کی اپنی داستان حیات، لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ ''عورت'' کی کہانی ہے جس کی زندگی میں مسائل بھی ہیں اور مجبوریاں بھی، دکھ اور تکلیفیں بھی ہیں اور مسکراتے لمحے بھی۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اپنی اس سوانح میں بھی اجیت کور نے عورت کی کہانی، عورت کی زبانی خوشیوں، تلخیوں، کمزوریوں گویا مکمل سچائی کے ساتھ پیش کی ہے۔ اجیت کور نے اپنی اس تخلیق میں اپنی زندگی کے حوالے سے عورت کے جینے کے اندازوں کو درشایا ہے۔ ایسی حقیقت نگاری کے لئے مصنفہ یقیناً قابل مبارکباد ہے۔ ''خانہ بدوش'' میں مصنفہ کا اسلوب پرکشش بھی ہے اور منفرد بھی۔ اس انداز کی سوانح کبھی کبھی ہی سامنے آتی ہیں۔

''درد ہی زندگی کا آخری سچ ہے۔ درد اور اکیلا پن۔ اور آپ نہ درد بانٹ سکتے ہیں نہ اکیلا پن۔ اپنا اپنا درد اور اپنا اپنا اکیلا پن ہمیں اکیلے ہی برداشت کرنا ہوتا ہے۔'' ساتھ ہی موصوفہ یہ بھی کہتی ہیں: ''درد اور اکیلا پن اگر اکیلے ہی برداشت کرنا ہے تو پھر یہ داستان آپ کو کیوں سنا رہی ہوں؟'' تو اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ غم میں دوسروں کو اگر شریک کر لیا جائے تو غم ہلکا ہو جاتا ہے۔ زبان سے نکلے الفاظ دل کے بھاری پن کو کم کر دیتے ہیں۔ یہ سوانح آٹھ ابواب میں تقسیم ہے اور اردو میں ان ابواب کے عنوان بڑے دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔ یہ عنوان ہیں: ون زیرو ون، ذرا سانس لینے دو، سفید اور کالی ہوا کی داستان، خانہ بدوش، حادثوں کا ہجوم، گھونگھا اور سمندر، سات نیم کش تیر اور قصہ ایک قیامت کا۔ یہ اردو ترجمہ وہاج الدین علوی کا ہے جو ہندی سے کیا گیا ہے اور شستہ اور سلیس زبان میں ہے۔ ڈمائی آکٹو و سائز کے ۲۷۶ صفحوں والی یہ کتاب لیزر کمپوزنگ میں ناشر کی روایت کے مطابق ہے۔ سرورق بھی زندگی کے الجھے سلجھے تانے بانوں سا لگتا ہے اور جاذب نظر ہے لیکن محدود صفحات کے پیش نظر قیمت یقیناً زیادہ ہے۔

نام کتاب : پریم چند کی آپ بیتی

مولف : مدن گوپال
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

ادب جو برائے زندگی ہوتا ہے، اسی کی ریڈر شپ نسل در نسل جاری رہتی ہے۔ پریم چند کا ادب زندگی کا عکاس ہے۔ پریم چند نے اپنی تخلیقات میں انسانی زندگی کو اپنے زمانے کے حالات کے مطابق بعینہٖ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی نگارشات میں دیہاتی زندگی، کسان اور مزدور، فطرت کے نظارے، سماجی دباؤ اور فرسودہ رسم و رواج کی نہ صرف عکاسی کی ہے بلکہ ان پر بھرپور تنقید بھی کی ہے۔ ان کی تخلیقات چونکہ زندگی کے مسائل اور رویوں پر انحصار کرتی ہیں اس لئے آج بھی تر و تازہ ہیں۔ کسان اور مزدور آج بھی [illegible] ہے۔ آج بھی دولت مندوں کا [illegible] آج بھی کمزوروں کا استحصال کرتے ہیں۔ [illegible] مسائل آج سے تقریباً اسی سال پہلے [illegible] ہی مسائل کسی نہ کسی شکل میں [illegible] پچھڑے ہوئے طبقوں کے لئے کسی نہ کسی طرح [illegible] بنے ہوئے ہیں۔ مدن گوپال نے اس [illegible] قلم کار پریم چند کی سوانح، پریم چند کی تحریروں سے [illegible] مرتب کی ہے۔ بقول مرتب: ''پریم چند کی (یہ) آپ بیتی منشی پریم چند کی حیات و فن اور ان کے زمانے کی کہانی ہے۔ یہ ان کے ہی لفظوں میں ان کی داستان حیات ہے۔ اس کی بنیاد ان کا ایک مضمون ہے جو ان کے ہندی ماہنامہ 'ہنس' میں فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ان کے پچاس سالوں کی تفصیل دیتا ہے۔ پریم چند کی یہ داستان ادب میں ایک نئی طرح کی کتاب ہے (کیونکہ) اس میں پریم چند کے مضامین یا افسانوں کی شکل میں پیش کی گئی یادداشتوں یا خطوط کے اقتباس کو اس طرح سے ایک مالا میں پرو دیا ہے کہ یہ ''پریم چند کی آپ بیتی، بن گئی ہے۔''

پریم چند کے حوالے سے مدن گوپال ایک جانا پہچانا نام ہے۔ پریم چند کی زندگی اور فن پر ان کی کتاب 'قلم کا مزدور' اردو میں ایک اہم پیش کش مانی جاتی ہے، دوسری کتاب ''پریم چند کے خطوط'' ہے جو انہوں نے ہندی کے ساتھ اردو میں بھی شائع کرائی۔ یہ خطوط اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں پریم چند کی زندگی کے واقعات اور حالات ہیں بلکہ خود اپنی تخلیقات کے بارے میں بھی پریم چند نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ یہ خطوط پریم چند کے ادبی رویوں اور رجحانات کو سمجھنے میں بڑے مددگار ہیں۔

یہ ایک جدت ہی ہے کہ پریم چند کی آپ بیتی، مدن گوپال کی تحقیق و تدوین ہے یعنی الفاظ پریم چند کے ہیں اور ترتیب مدن گوپال کی۔ مدن گوپال نے پریم چند کی کہانیوں، ناولوں، مضامین اور خطوط سے وہ حصے اٹھائے جن میں پریم چند کی اپنی زندگی کے حالات اور واقعات ملتے ہیں اور پریم چند کی بیوی شورانی دیوی کی کتاب ''پریم چند گھر میں'' سے مواد اخذ کر کے پریم چند کی یہ خود نوشت تیار کر دی۔ یقیناً یہ ایک اہم کام ہے اور یہ وہی کر سکتا تھا جس کا پریم چند اور ان کے ادب سے دلی لگاؤ ہو اور مدن

[illegible] ہیں۔ اس [illegible] انہوں نے [illegible]
[illegible] گرد گھومتا ہے۔ وہ پریم چند کے [illegible] سے کام کرتے رہے ہیں۔ پریم چند کی [illegible] کسی بھی پہلو پر کام کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] مختلف [illegible] ان کی تحریروں [illegible] پریم چند کی آپ بیتی اپنے موضوع پر ایک مختصر اور دلچسپ کتاب ہے جو سوانح پڑھنے والوں اور پریم چند کے مداحوں کو ضرور پسند آئے گی۔ ڈمائی آکٹوو سائز کے ۲۲۰ صفحوں کی یہ کتاب لیزر کمپوزنگ میں جاذب نظر شائع ہوئی ہے۔ سرورق پر پریم چند کی لائن ڈرائنگ میں شبیہ اچھی لگتی ہے۔

نام کتاب : (۱) بچوں کی صحت آپ کے ہاتھ (۲) ہومیوپیتھک نسخے

مصنف : (۱) ڈاکٹر مردولا پانڈے
(۲) جان۔ ایچ کلارک
قیمت : (۱) ۱۱۰/ روپے (۲) ۱۲۵/ روپے
ناشر : بی جین پبلشرز، پہاڑ گنج، نئی دہلی

ڈاکٹر مردولا پانڈے کی کتاب بچپن میں ہونے والے امراض اور بچوں کے مسائل کے تعلق سے طبی معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب میں بچوں کی صحت سے تعلق سے مفید مشورے بھی دیے گئے ہیں اور مختلف امراض کے علاج بھی بتائے گئے ہیں۔ کتاب میں امراض کی شناخت جسمانی اعضا کے حوالے سے کی گئی ہے اور انہیں انگریزی حروف تہجی کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے۔ وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اصل کتاب انگریزی میں لکھی گئی تھی اور یہ اردو ترجمہ جو پریم چند پال اشک نے کیا ہے، بمطابق اصل ہے۔ اس کتاب سے بچوں کے امراض کے بارے میں اچھی معلومات حاصل ہوتی ہے اور بچوں کی چھوٹی موٹی آئے دن کی بیماریوں اور تکلیفوں کا علاج تو ہومیوپیتھک دواؤں کے ذریعہ گھر پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں بچوں کی سو سے زیادہ بیماریوں کا تذکرہ ہے۔ یہ ایک مفید اور کارآمد پیش کش ہے جسے اردو کی طبی مطبوعات میں ایک خوبصورت اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ ڈمائی آکٹوو سائز کے ۲۴۷ صفحوں کی یہ کتاب لیزر کمپوزنگ میں سفید کاغذ پر صاف ستھری شائع ہوئی ہے جس کا سرورق موضوع کے مطابق ہے اور اچھا لگتا ہے۔

● اسی طرح کی دوسری کتاب جو اسی پبلشر نے شائع کی ہے وہ جان ایچ کلارک کی ہومیوپیتھک نسخے ہے، اس کے بھی مترجم پریم پال اشک ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ہومیوپیتھک نسخوں کا مجموعہ ہے جو Prescriber کے نام سے دنیا بھر میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں امراض کے نام سے کر دوائیں بتائی گئی ہیں۔ کتاب چونکہ انگریزی سے ترجمہ ہے اس لئے امراض کی ترتیب انگریزی حروف تہجی کے مطابق ہے جن کے ساتھ امراض کے اردو نام دئے گئے ہیں۔ اگر ایک بیماری کے ایک سے زیادہ ترنام ہیں تو وہ نام بھی دئے گئے ہیں لیکن ادویات کے نام زیادہ بیماری کے مروج نام کے ساتھ دئے گئے ہیں۔ ہر مرض کے ساتھ علامات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے اور جہاں علامات نہیں دی گئی ہیں وہاں متعلقہ مرض کی اہمیت کے حوالے سے ادویات بتائی گئی ہیں۔ یہ کتاب ان لوگوں کے لئے زیادہ کارآمد ہو گی جنہیں ہومیوپیتھک نظام علاج پر بھروسہ ہے۔ ہومیوپیتھی دوا کے موزوں انتخاب میں یہ کتاب ضرور مدد کرے گی اس لئے کہ یہ زیادہ امراض کی ادویات کی علامات کی ایک مفید ریپر یٹری ہے۔ کتاب ڈمائی آکٹوو سائز میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔ سرورق جاذب نظر ہے اور اس میں ۴۸۰ صفحے ہیں۔ کتاب کے آخر میں اردو اور انگریزی میں دواؤں کی فہرست نے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہی کیا ہے۔

انور کمال حسینی، نئی دہلی

نام کتاب : ترے خیال کی وحدت

مصنف : حبیب اجملی
قیمت : ۶۰/ روپے
ناشر : سیماب پبلی کیشنز کرونڈیا
سول لائنس ۲۔ سلطانپور، یوپی

گزشتہ کچھ برسوں سے "شعری مجموعے" جس رفتار سے منظر عام پر آرہے ہیں بالخصوص غزل کے۔ اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے غزلیہ شاعری پر بہار آئی ہوئی ہے۔ مگر اس بھیڑ میں کتنے مجموعے اہل ذوق کی توجہ اپنی طرف کھینچ پاتے ہیں یہ ایک الگ سوال ہے۔ اس وقت سلطانپور کے ایک نوجوان شاعر حبیب اجملی کا مجموعہ کلام "ترے خیال کی وحدت" پیش نظر ہے۔ غزلوں کے ساتھ ابتدا میں چند نعتیں اور اخیر میں چند نظمیں بھی اس میں شامل ہیں۔ حبیب صاحب چونکہ کہنہ مشق شاعر جناب اجمل سلطانپوری کے شاگرد ہیں اسی لئے ان کا کلام کافی حد تک موٹی موٹی فنی اغلاط سے پاک ہے۔ روایت کا رنگ گہرا ہے مگر موجودہ دور میں جس طرح کی شاعری پچھلی دو دہائیوں سے عمومی طور پر ہو رہی ہے اس کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ شاعر ابھی جوان ہے اس لئے کلام میں پختگی یا چونکا دینے والی انفرادیت کی تلاش عبث ہے۔ امید ہے جیسے جیسے مشق بڑھے گی اچھے اشعار کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

چھپا کے رکھا ہے سینے میں اس لئے دل کو
بہت عزیز ہے تیری قیام گاہ مجھے
گئی چنی مری سانسوں سے انتقام نہ لے
بس اے حیات! بہت کر چکی تباہ مجھے
ترے خیال کی وحدت نے روک رکھا ہے
میں اپنے آپ سے بھی آج تک نہ مل پایا

نوجوان ہیں اس لئے زبان و بیان کی طرف ابھی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ کتابت، طباعت مناسب ہے البتہ ضخامت کے لحاظ سے قیمت زیادہ ہے۔

نام کتاب : قطعات بدر

مصنف : مولانا بدر القادری
قیمت : درج نہیں
ناشر : المجمع الاسلامی، مبارکپور، اعظم گڑھ

یہ مختصر مجموعہ جناب مولانا بدر القادری کے ان قطعات پر مشتمل ہے جو حمد و نعت اور دیگر شعائر اسلام، اصلاحی موضوعات پر کہے گئے ہیں۔ بالعموم اسی طرح کی مذہبیات پر مبنی شاعری "کلام موزوں" کے زمرہ میں رکھی جاتی ہے مگر زیر نظر مجموعہ شعری حسن سے بھی مزین ہے اور فنی پختگی، نیز صالح فکری بصیرت کا نمونہ بھی۔ تقریباً تمام ہی قطعات صاحب قطعات کی پختہ گوئی، کہنہ مشقی اور رموز فن سے واقفیت کا پتہ دیتے ہیں ایک قطعہ سرزمین مقدس پر "کیف حضوری" کے سلسلہ کا ملاحظہ فرمائیں۔

سر کو قدم بنائیے اس سرزمین پر
اس رہگزار حسن پہ قربان جائیے
خون جگر کو اشک کے سانچے میں ڈھال کر
ہر گام پر چراغ محبت جلائیے

اہل فن نے قطعہ کی تعریف میں کہا ہے کہ یہ کم سے کم دو شعر کا ہوتا ہے اور اس میں مطلع نہیں ہوتا ہے مگر اس مجموعے میں بہت سے قطعات ایسی بھی ہیں جن میں مطلع موجود ہے۔ "مناجات بدر" ۲۴ صفحات پر مشتمل یہ مختصر رسالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے

نور محسن کی صورت میں ۱۵ بندوں پر مشتمل مناجات ہے۔ تمام بند ۵-۵ مصرعوں پر مشتمل ہیں لیکن درمیان میں ایک بند ۱۲ مصرعوں کا ہے جو اس مسلسل نظم کی ہیئت سے میل نہیں کھاتا۔ البتہ قطعیت بدر کی طرح مولانا بدرالقادری کی قادر الکلامی اس مناجات سے بھی جھلکتی ہے۔ قیمت اس پر بھی درج نہیں ہے۔

قمر سنبھلی، دہلی

نام کتاب : تادیب ادب

مصنف : ناوک حمزہ پوری
قیمت : ۱۵۰ روپے
ناشر : دارالادب، حمزہ پور، شیر گھاٹی، گیا

ایک خوبصورت عنوان سے مزین یہ کتاب دراصل ناوک حمزہ پوری کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ناوک حمزہ پوری نام و نمود اور شہرت کی ہوس سے دور ایک انتہائی دور افتادہ مگر مردم خیز علاقہ حمزہ پور (بہار) سے تعلق رکھتے ہیں۔ گوکہ ناوک صاحب کے علاوہ بھی بہت سے ساری شخصیتیں بشمول ان کے والد قوس حمزہ پوری حمزہ پور سے متعلق ہیں لیکن اب ناوک اور حمزہ پور ایک دوسرے کے لازم و ملزوم معلوم ہوتے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ میں مختلف نوع کے ۲۵ مقالات شامل ہیں۔ جن میں کچھ شخصیات پر کچھ شاعری پر اور کچھ متفرقات شامل ہیں۔ ان تمام مقالات میں سے چند ایک اپنے موضوع کے سبب ہماری توجہ کھینچتے ہیں۔ بیدی کے مسلم کردار، رستوگی اور رباعی، خواجہ احمد عباس۔ ایک کثیر الجہات فنکار، دوہے کا فن اور جیون درشن اور اقبال اور رباعی وغیرہ اپنی انفرادی ٹریٹمنٹ اور مطالعہ کے ایک اچھوتے پہلو کی وجہ سے اہم ہیں۔

مجموعہ کا ایک اہم مضمون 'رستوگی اور رباعی' ہے۔ جس میں ناوک صاحب نے ثابت کیا ہے کہ تارا چرن رستوگی گوکہ ماہر عروضیات سمجھے جاتے ہیں لیکن "رباعی" کی بحث میں وہ خود بھی گمراہ ہوئے ہیں اور اپنے قاری کو بھی گمراہ کیا ہے۔

بیدی کے مسلم کردار، اور 'اقبال اور رباعی' بھی نہایت وقیع مقالے ہیں ان میں کچھ باتیں ایسی ہیں جو بالکل نئی ہیں اور ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔

ناوک حمزہ پوری کی اس کتاب کا "عالمانہ مقدمہ" عطا عابدی نے لکھا ہے جو اس مجموعہ کے شروع میں شامل ہے۔ اسی کتاب میں ناوک حمزہ پوری کا "عطا عابدی۔ شخص اور شاعر" نام سے ایک طویل مقالہ شامل ہے۔ یہ دونوں مقالے 'من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو' کی مثال ہیں۔

نام کتاب : کیریر گائڈنس

مصنف : ناوک حمزہ پوری
قیمت : ۵۰ روپے
ناشر : دارالادب، حمزہ پور، شیر گھاٹی، گیا

چونکیے نہیں "کیریر گائڈنس" آپ کا کیریر بنانے کے طریقوں پر مشتمل کوئی کتاب نہیں جو آپ کی زندگی کو سدھار سکے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ کتاب آپ کی زندگی کے اداس اور غمگین لمحوں کو تھوڑی دیر کے لئے زعفران زار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

مذکورہ کتاب میں ناوک حمزہ پوری کے ۱۷ انشائیے اور ایک خاکہ "بتول خالہ" شامل ہیں۔ ناوک صاحب نے اپنی اس کتاب کو 'مجموعہ مضامین' کہا ہے۔ میرے خیال میں یہ غلط اور گمراہ کن ہے۔ انشائیہ اور مضمون اپنی نوعیت کے اعتبار سے دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ بہر حال۔

ناوک حمزہ پوری کے اکثر انشائیے بیباک ہیں، آپ چاہیں تو اسے بولڈ کہہ لیں۔ ناوک ہنسی ہنسی میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں جسے عام حالات میں آدمی کہنے سے احتراز کرتا ہے یا کرنا چاہئے۔ مجموعہ کا پہلا انشائیہ "حقوق مرداں کی حمایت میں" ایک اچھا دلچسپ اور طنز و مزاح سے بھرپور انشائیہ ہے۔ لیکن ناوک حمزہ پوری کے بے باک قلم نے اسے اس درجہ کو پہنچا دیا ہے جہاں اسے A سرٹیفکیٹ سے نوازا جانا چاہئے۔ پھر بھی ناوک حمزہ پوری کو ایک خلش سی رہ جاتی ہے کہ "کاش کوئی حقوق مرداں کی بھی ایک بین الاقوامی کانفرنس برپا کرتا۔"

مجموعہ کا کلیدی انشائیہ 'کیریر گائڈنس' ہے۔ روزگار آج ہی کیا، بلاشبہ ہر زمانے میں ایک بڑا مسئلہ رہا ہے۔ چنانچہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے حضرت انسان نے وہ وہ طریقے ایجاد کئے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ ناوک نے اپنے اس انشائیہ میں ان تمام قبیح اور ضمیر فروش طریقہ روزگار پر طنز کے بھرپور وار کئے ہیں۔ بلاشبہ وہ اس میں حق بجانب بھی ہیں۔ انشائیہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے انشائیے جیسے دبستان عظیم آباد، علامہ یعنی چہ......؟ آنا وزیر اعلیٰ کا حمزہ پور وغیرہ بھی دلچسپ ہیں اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

نام کتاب : [illegible]

شاعر : والد حمزہ پوری
قیمت : ۵۰ روپے
ناشر : دارالادب، حمزہ پور [illegible]

شاعر کا نام والد حمزہ پوری [illegible] ہوگا کہ یہ کسی مزاحیہ شاعر کا [illegible] مزاحیہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ اب [illegible] بھی صاف کر دیں کہ یہ حضرت والد [illegible] ناوک حمزہ پوری ہیں جو عام طور پر ناوک [illegible] دیتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر والد کا کردار بھی بخوبی نبھاتے ہیں۔ ناوک اور والد چونکہ ہم وزن ہیں اس لئے اس میں انہیں کوئی خاص دشواری بھی پیش نہیں آتی۔

ناوک / والد حمزہ پوری عام طور پر سیدھی سادی سلیس اور عام فہم زبان میں شاعری کرتے ہیں۔ آپ اسے سہل ممتنع بھی کہہ سکتے ہیں اور شاید مزاحیہ شاعری میں سہل ممتنع ناگزیر بھی ہے۔

نہ اس سی ہو، نہ اس ٹی ہو، نہ کچہری ہو، نہ [illegible] ہو
ہوئے ہو شیخ جی اس دور میں یا للعجب، والد

اردو کے حامیوں میں جھگڑا اچل گیا جو کل
زخموں سے چور چور ہوئے چند آدمی
یہ مسئلہ ترقی اردو کے واسطے
تھا زیر بحث، کون ہو صدر انجمن

ایک اونچی فیملی کا ہے یہ سچا واقعہ
والدہ سے اپنی ان کا بچہ یوں گویا ہوا
ڈارلنگ اے پیاری ممی نام ہے کس چیز کا
اس کے معنی ہوتے ہیں کیا، کون سی ہے یہ بلا
والدہ نے پوچھا کیوں؟ کیا بات ہے نور نظر
بولا تب معصومیت سے ان کا ننھا لاڈلا
ڈارلنگ ان کو کہا کرتے ہیں ڈیڈی بار بار
غائبانہ آپ کے آتی ہیں جب مس [illegible]

'مشتے نمونہ از خروارے' اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاعر نے کہیں ناوک بن کر معاشرہ کی کشتی کو صحیح سمت میں کھینے کی کوشش کی ہے تو کہیں والد بن کر سماجی برائیوں پر گرفت کی ہے۔

مجموعہ کی اکثر نظمیں / غزلیں دلچسپ اور طنز و مزاح سے بھرپور ہیں اور ایک بار انہیں ضرور پڑھا جانا چاہئے۔

احمد [illegible] حقانی

● ماہ دسمبر ۲۰۰۱ء کے سرورق اور بیک پر چھپی تصاویر کے باصرہ نواز ہونے پر ذہن فوراً ان کے خالق جناب برجندر سیال کی جانب چلا گیا۔ ہمیشہ کی طرح غالب کے اشعار کو پڑھ کر اور ان کی تشکیل کے حسن و سحر سے محظوظ ہو کر صاحب، اندر کے صفحات میں جب مضمون دیوانہ مر گیا آخر...... جو آپ کے قلم کی غمازی کرتا ہے، پڑھا تو طبیعت پر اداسی اور افسردگی کی ایسی فضا چھائی کہ آج دوسرے دن بھی اس خط کے لکھے جانے تک چھٹنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ صرف ایک صفحہ کے مختصر مضمون میں آپ نے دور غالب سے آج تک نابغہ روزگار ہستیوں کی زمانہ کے ہاتھوں روا رکھی جانے والی ناقدری اور ناشناسی کا بیان جس انداز سے کیا ہے وہ تمام اردو والوں خواہ وہ دہلی کے ہوں یا بیرون دہلی کے سب کیلئے یکساں لمحہ فکریہ فراہم کرتا ہے۔ برجندر سیال بلاشبہ ایک جینیس شخصیت کے مالک تھے۔ رسالہ 'آجکل' میں وقتاً فوقتاً ان کی غالب کے اشعار کی تشکیلات ہمارے جمالیاتی ذوق کو آسودگی فراہم کرنے کا ذریعہ تھیں۔ سنگ ریزے جو بظاہر بے جان ہوتے ہیں سیال صاحب کے ہاتھوں میں آکر غالب کی زبان بن جاتے تھے اور ہمیں غور و فکر پر آمادہ کرتے تھے۔

اس خط کے تحریر کرتے وقت میں یہ کہے بغیر نہیں رہ پا رہا ہوں کہ مذکورہ مضمون نے آپ کے اداریوں کی یاد تازہ کر دی۔ البتہ اس مضمون میں جذبہ کی شدت حاوی ہے جب کہ آپ کے اداریوں میں سوچ اور فکر کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ اس کی وجہ شاید سیال جیسے جینیس لوگوں پر زمانے کی سرد مہری اور بے اعتنائی ہے۔

کالی داس گپتا رضا پر گوشہ آپ نے شائع کیا ہے۔ اس کار خیر کے لئے ہم آپ کے مشکور ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کالی داس گپتا رضا جیسی دیو قامت ادبی شخصیت کے لئے گوشہ چہ معنی دارد۔ ان کے لئے تو ایک دفتر چاہئے۔

محمد حنیف، ہردوئی

● آپ کا اداریہ "دوانہ مر گیا آخر" پڑھ کر بڑا افسوس ہوا ہے۔ مرحوم گوجرانوالہ کے نہیں بلکہ گجرات (پاکستان) کے رہنے والے تھے وہ ہائی اسکول اور انٹر کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں میرے ہم جماعت تھے۔ کالج کے زمانے میں شاعری کرتے تھے۔ انٹر کالج گجرات کے سہ ماہی میگزین کے سب ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کا ایک شعر مجھے ۱۹۳۴ء کا یاد آتا ہے:

ہٹ جاؤ سیال دیوانہ آتا ہے

واقعی وہ دوانہ تھا۔ آرمی میں میرے ساتھ میرٹھ، اورنگ آباد دکن، بلگام اور کرناٹک میں رہے۔ مجھے ان کا آخری خط ماہ جون اس سال ملا تھا۔ وہ کچھ زندگی سے مایوس نظر آئے۔ کالج میں ان کو بیسٹ پوائنٹ ایوارڈ ملا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے اخیر میں مشرقی بنگال کے ریفوجی فنڈ میں پیسہ جمع کرنے کے عتاب میں کورٹ مارشل کی نوبت آئی تو استعفیٰ دینے پر مجبور ہوئے۔ بچوں کو لانے کے لئے گجرات گئے تو اپنے دوست منظور عالم کو اپنا مکان بلا معاوضہ کے دے دیا۔ تقسیم کے وقت دوبارہ آرمی میں آگئے اور اعلیٰ درجہ کے آفیسر رہے۔ مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب چنڈی گڑھ آئیں گے تو مجھ سے ضرور ملیں گے۔ خیر میری قسمت میں نہ تھا۔ مجھے پتہ نہ چلا ورنہ ضرور ان کے وقت آخر میں حاضر ہوتا۔ کیا خوب آدمی تھا۔ خدا مغفرت کرے۔

کرشن سروپ، انبالہ

● غالب کے اشعار حالانکہ برجندر سیال نے از سر نو دریافت کئے ہیں مگر کالی داس گپتا رضا کو اس سے بہتر خراج عقیدت اور کیا ہو سکتا تھا؟ عبدالغنی شیخ صاحب نے لداخ جیسے دور دراز علاقہ میں رہ کر بھی تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ 'بزید فرنگ' کے اعتراف میں کچھ تاخیر ضرور ہوئی مگر اشفاق احمد اعظمی کا جائزہ خوب ہے۔ شوکت حیات کا 'مرشد' اور ثریا فاروقی کی 'غلط فہمی' کا جواب نہیں۔ کتابوں پر تبصرے بھی پسند آئے۔

محمود شیخ، جبل پور

● آپ نے گوشہ 'کالی داس گپتا رضا شائع کرکے 'آجکل' کے سر سے ایک بڑا ادبی قرض اتارا ہے۔ اس ضمن میں تحریر کردہ دونوں مضامین 'کالی داس گپتا رضا' اور 'گپتا رضا کی غزل گوئی' پسند آئے۔ اول الذکر تو خصوصی تعریف کا مستحق ہے کیونکہ اس کا کینوس زیادہ وسیع ہے۔ یہ مضمون گویا ایک آئینہ ہے جو مرحوم گپتا رضا کی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں کی مختصر ہی سہی نہایت واضح عکاسی کرتا ہے۔

عبدالغنی شیخ کا مقالہ بے حد معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ یہ مصنف کے نہایت وسیع اور گہرے مطالعہ کا غماز ہے۔ امید ہے کہ یہ نوجوانوں کے دلوں میں شوق مطالعہ پیدا کرنے میں محرک ثابت ہوگا۔ اس کی دوسری قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ م۔ م راجندر کی کہانی 'میاں دور نگی' کا آخری حصہ چونکا دینے والا اور کافی موثر ہے۔ آج کے اس پر آشوب اور متعصب دور میں میاں دور نگیوں کی بڑی ضرورت ہے۔

زین الدین، ناسک

● یوں تو 'آجکل' کا ہر شمارہ لائق مطالعہ ہوتا ہے لیکن دسمبر ۲۰۰۱ء کا شمارہ بہت وقیع ہے۔ 'آجکل کی فائل سے' 'بھوپال تال اور رانی کملاپتی' خوب ہے۔ مائل نقوی نے اپنی تحریر میں داستانی رنگ پیدا کر کے اسے دلچسپ بنا دیا ہے۔

گوشہ کالی داس گپتا رضا بھی سیر حاصل ہے۔ ڈاکٹر ناظم جعفری اور عبدالاحد ساز کے مضامین پسند آئے۔ نذیر فتحپوری کا منظوم خراج عقیدت بھی اچھا ہے۔

قلم، قلم کار اور کتاب (عبدالغنی شیخ) محنت سے لکھا گیا ہے اور ہمارے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ برجندر سیال پر تحریر کردہ مقالہ "دوانہ مر گیا آخر...." آنجہانی کو اچھا خراج عقیدت ہے۔ شوکت حیات کی کہانی 'مرشد' پڑھ کر دل پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ کہانی، سرورق پر غالب کے شعر:

میں چشم واکشودہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

کی تفسیر معلوم ہوئی۔ یہ حسن اتفاق ہے یا حسن ترتیب؟ لیکن کہانی کا آخری جملہ "لیکن ان کے آبدیدہ ہونے کا سبب ذہن پر کافی زور دینے کے باوجود اس کے لئے ناقابل فہم تھا۔"

آتش بے داغ حسرت دل کا شمار یاد
کی تفسیر تو نہیں۔

بہر کیف! اتنی عمدہ کہانی لکھنے پر میری جانب سے شوکت حیات کو دلی مبارکباد۔

اقبال حسن آزاد، مونگیر

● گوشہ کالی داس گپتا رضا پسند آیا۔ لیکن صرف اتنا کر دینے سے حق ادا نہیں ہو گیا۔ ایک خصوصی شمارہ شائع کیجئے۔ رضا صاحب کی حیات اور ادبی خدمات پر۔ جیسے جوش صاحب پر شائع ہوا تھا۔ "قلم، قلم کار اور کتاب" میں جناب عبدالغنی شیخ نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ مبارکباد۔

البرٹ کامیو کا ڈرامہ اچھا ہے۔ ترجمہ بھی کافی بہتر ہے۔ عالمی ادب سے چیدہ چیدہ تخلیقات پیش کرتے رہیں۔

مہتاب پیامی، مبارکپور

● گوشہ کالی داس گپتا رضا سے شمارے کا آغاز کر کے بلاشبہ آپ نے ایک مستحسن کام کیا ہے۔ اگرچہ یہ گوشہ بہت تشنہ ہے۔ مرحوم کی خدمات اس کی متقاضی تھیں کہ آپ اختر الایمان نمبر اور جوگندر پال نمبر کی طرح 'آجکل' کا کالی داس گپتا رضا نمبر شائع کرتے تاکہ ان کی تحقیقی خدمات پر سیر حاصل گفتگو ہو سکے۔ ریسرچ اسکالرز کے لئے بھی وہ ایک قیمتی دستاویز ہوتا۔ گپتا مرحوم غالب شناسوں کے اس قبیلے کے آخری فرد تھے جس میں ان سے پہلے امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور مالک رام ہوئے ہیں۔ آپ نے اس گوشے میں انہیں بطور شاعر نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جیسا کہ ڈاکٹر ناظم جعفری صاحب نے فرمایا ہے "رضا صاحب کا اصل میدان تحقیق ہے"۔ ان کی ادبی خدمت کے اسی پہلو کو اجاگر کیا جانا چاہئے تھا۔ وہ اس میدان میں قاضی عبدالودود اور مالک رام کے ہم قدم نظر آتے ہیں، شاعری تو انہوں نے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے کی ہوگی جیسے آل احمد سرور نے کی ہے۔ (ان کا مجموعہ کلام بھی چھپ چکا ہے)

مجھے ڈاکٹر ناظم جعفری کی ان سطور سے بڑی تکلیف پہنچی کہ "رضا صاحب کو ہندوستان کے ہر مذہب سے محبت تھی..... اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ رضا صاحب ایک سیکولر ادیب ہیں تو غلط نہ ہوگا۔" سیکولر، فرقہ پرست یا اب بنیاد پرست کی اصطلاحیں سیاسی لیڈروں کے لئے استعمال ہوتی رہی ہیں لیکن اب ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی درجہ بندی بھی انہیں زمروں میں ہونے لگی۔ یہ ادب کے لئے ایک المیے سے کم نہیں۔ ابھی تک ادب میں یہ سکہ بند اصطلاحیں مروج نہیں ہیں اور انہیں ہونا بھی نہیں چاہئے۔ ادیب اور شاعر اس درجہ بندی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ مرحوم کالی داس گپتا کے لئے یہ کوئی کریڈٹ نہیں ہے کہ انہیں سیکولر قرار دیا جائے۔ انہوں نے چکبست پر اس لئے کام نہیں کیا کہ وہ ہندو تھے اور نہ غالب پر اس لئے تحقیق کی کہ وہ ہندو نہیں تھے۔ غالب اور چکبست دونوں عظیم فنکار تھے ان کا مذہب اور عقیدہ ادب میں تحقیق و تفتیش کا موضوع نہیں رہا ہے اور نہ ہونا چاہئے ادب میں مذہب اور لامذہب کی تفریق بدترین بدعت بلکہ کفر ہے۔

اطہر نقوی، نئی دہلی

● کیپٹن برجندر سیال کی موت کا مجھے غم ہے۔ مرحوم نے غالب کے شعروں کو مجسم کر دینے میں بڑی محنت کی تھی۔ اس شمارے میں سرورق پر غالب کا ایک شعر ہے اور جناب برجندر سیال کی تشکیل شعر ہے۔ میں نے نسخہ عرشی نکال کر دیکھا تو شعر میں مندرجہ ذیل دو فرق نظر آئے۔

میں چشم وا کشادہ، و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خرشید دیدہ ہوں

'آجکل' میں کشادہ کے بجائے کشودہ درج ہے اور خرشید کی جگہ خورشید چھپا ہے۔ متن کی اس تبدیلی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا 'آجکل' کا متن مستند ہے؟

جمال اویسی، دربھنگہ

نوٹ: سیال صاحب نے یہ شعر اسی طرح لکھا تھا، ہو سکتا ہے ان سے سہو ہو گیا ہو۔ ادارہ

● تقریباً پچھلے پچاس سالوں سے اردو ماہنامہ 'آجکل' خرید کر پڑھتا رہا ہوں۔ زیادہ تر خطوط صرف تعریف پر مبنی دیکھنے کو ملتے ہیں جب کہ رسالے کے مشمولات کا ادبی جائزہ لینا چاہئے۔ نیز مدیر کا بھی فرض ہے کہ زبان و بیان کو دیکھے نہ کہ صرف نام اور اسناد پر نظر رکھے۔ دسمبر کے تازہ شمارہ میں صفحہ ۲۵ پر ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے [illegible] جا سکتا ہے [illegible] یہ کہ تصرف، محاورہ، ضرب المثل استعارہ یا جمع وغیرہ کا اختیار کس کو حاصل ہے۔

'آجکل' کے کئی ایسے نمبر بھی شائع ہوئے جیسے رقص نمبر، موسیقی نمبر وغیرہ جس سے معلومات میں اضافہ ہوا مگر ادھر ایسا کوئی نمبر عرصے سے نہیں آیا۔ آخر کیوں۔ کیا شعری اصناف میں غزل یا آزاد نظم اور افسانہ، ڈرامہ یا انشائیہ ہی سب کچھ ہے۔ یہ تو ہر رسالے میں نظر آتا ہے۔ پھر 'آجکل' کی انفرادیت کیا ہوئی؟

ش۔ م۔ عارف ماہر آروی

● عبدالغنی شیخ کا "قلم، قلم کار اور کتاب" بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ اس کی دوسری قسط کا انتظار ہے۔ "دیوانہ مر گیا آخر" ہماری ادبی حس کا شفاف آئینہ ہے۔ جب ہم اس قدر اہم ادبی خدمات انجام دینے والے ادیب کی خبر تک نہیں رکھ سکتے تو اردو ادب کی فلاح اور ترقی کے لئے کیا خاک سنجیدہ ہیں۔ آپ نے کیپٹن صاحب کو خراج عقیدت پیش کر کے ایک بار پھر حساس مدیر کا فرض ادا کیا ہے۔ طارق متین کی غزل عمدہ ہے اور اس کا سب سے اچھا شعر دوبارہ چھپ گیا ہے۔

جاوید انور، وارانسی

● عبدالغنی شیخ کے مضمون کی پہلی قسط نے واقعی متاثر کیا اور دل باغ باغ ہوا۔ شیخ صاحب کے جتنے بھی مقالات آج تک 'آجکل' میں شائع ہو چکے ہیں وہ سبھی کے سبھی ان کی تخلیقی صلاحیت کی غمازی کرتے ہیں۔ چاہے دنیا کے مشہور ناولوں کا ذکر ہو یا کہانی سنانی ہو۔ شیخ صاحب اپنی لیاقت کا جوہر دکھاتے ہیں۔ قلم، قلم کار اور کتاب صرف ایک معلوماتی مقالہ ہی نہیں بلکہ دنیا کی مایہ ناز ادبی ہستیوں کے حوالے سے ایک بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ فرید پربتی کی غزل کا نشہ اب بھی طاری ہے۔ کہانیوں کا انتخاب بھی اچھا ہے اور البرٹ کامیو کی غلط فہمی سمجھنے اور اسے دور کرنے میں مترجم ثریا فاروقی نے کامیاب سعی انجام دی ہے۔

رویندر روبی، نئی دہلی

۱۸۲۸ء [illegible] ہوئے ہیں۔ مگر اب یہ تذکرہ دوبارہ ترتیم ہوا اور قریب دو ہزار شاعروں کے [illegible] ہوا۔ اور اشعار کی تو کچھ حد ہی نہیں۔ حالات جو اس میں لکھے ہیں بڑی تلاش و تجسس سے بہت ہی صحیح۔ ایک سو جلد کتب تواریخ سے جمع کی، جن کی [illegible] اکثر اخباروں میں چھپ چکی۔ اور جناب مسٹر ریکلن صاحب بہادر جج سابق دہلی کے اول اس کے بانی ہوئے، اور چھ سو شاعروں کا ترجمہ بہ زبان انگریزی انہوں نے فرمایا اور خبر ہے ولایت میں چھپا۔ سوائے ازیں جناب صاحب کمشنر بہادر دہلی اور نواب محمد ضیاء الدین خاں بہادر رئیس لوہارو و نواب اسد اللہ خاں بہادر و دیگر رؤسا نے عنایت فرما کر اچھے کتب سے بہت مدد دی اور نیز فضائل و کمالات دستگاہ، گوہر درج شرافت، اختر برج نجابت مولانا مولوی محمد انوار الحق صاحب میر منشی ایجنسی مارواڑ نے چار سو سے زیادہ شعرا کا حال اضافہ کیا۔ اور جناب منشی درگا پرشاد صاحب مدرس اول ریاضی تعلیم المتعلمین دہلی نے بھی ہر ایک طرح کی مدد دی لیکن تا ایں ہمہ جیسا کہ چاہئے شعراء بمبئی و کلکتہ و ممالک وسط ہند کے کلام فارسی اور حالات سے کچھ آگہی نہ ہوئی۔ لہٰذا یہ اشتہار دیا جاتا ہے کہ جمیع شعرا فارسی اپنا حال مفصل مع تقریظ و تاریخ و اشعار خدمت میں جناب مولف صاحب کے بھیج دیں اور جن صاحبوں کو خریداری منظور ہو تو وہ درخواست اپنی تعدادی تین روپیہ علاوہ محصول ڈاک خدمت میں جناب ممدوح کے دہلی محلہ بہرام خاں میں بذریعہ خط پیڈ ارسال کریں، اور اہل مطابع اس اشتہار کو اپنے اپنے اخبار میں درج فرمائیں۔ الدال علی الخیر کفاعلہ والسلام۔"

اس اشتہار سے اس تذکرے کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ملک صاحب کی تحریر کا ماخذ کیا ہے۔ کیونکہ مقالے کی ابتدائی سطریں بتا رہی ہیں کہ اس کے لکھتے وقت "نیر راجستان" کا یہ شمارہ سامنے تھا۔ مگر ملک صاحب کو اشتہار سے مضمون اخذ کرتے وقت یہ خیال نہیں رہا کہ "تذکرہ مظہر العجائب" کے اصل مرتب مولانا مظہر حق صاحب تھے۔ لیکن اس کے بانی مسٹر ریکلن صاحب بہادر تھے اور چھ سو شاعروں کا ترجمہ بہ زبان انگریزی انہوں نے فرمایا اور خبر ہے کہ ولایت میں چھپا، لیکن اس سے بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس تذکرے میں مرزا غالب کے جو حالات دئے گئے تھے وہ یہی حالات ہیں کہ جو "احوال غالب" میں شائع کئے گئے ہیں۔ پھر بھی ملک صاحب کے اعتماد کا یہ حال ہے کہ ---- "تذکرہ مظہر العجائب موجود نہ سہی لیکن اس میں مرزا کا جو ترجمہ درج کیا گیا تھا وہ اتفاق سے ہمارے سامنے موجود ہے اور یقین ہے کہ یہ ترجمہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔"

مگر ڈاکٹر عبدالحق صاحب کامل احتیاط کے ساتھ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ "اغلب ہے کہ یہ حالات مرزا صاحب نے اسی تذکرے کے لئے تحریر کئے ہوں......"

مگر مولانا احتشام الدین صاحب دہلوی کی ایک تحریر ہے، اس تحریر میں میرے مدعا کے علاوہ دوسرے اور بھی اہم مباحث ہیں مگر اس کی اشاعت بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اس لئے وہ پوری تحریر حاضر خدمت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"یہ غلط ہے کہ بجنوری نے یہ دیباچہ غالب کے نسخے دیوان معدوم کی دستیابی سے پہلے لکھا تھا۔ "نہیں بلکہ دستیاب ہونے پر ان کو مکمل کلام غالب کے شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا اور یہ مقدمہ اس ارادہ کی پیروی میں لکھا گیا۔ اس کے لکھنے کے بعد وہ ایک بار علی گڑھ آئے اور راقم کے پاس دو ایک روز مہمان رہے۔ یہ مقدمہ پنسل سے لکھا ہوا کتا پھٹا ان کے پاس موجود تھا اور انہوں نے خود اپنی زبان سے اس کو مجھے پڑھ کر سنایا۔ اور طباعت کے متعلق مشورے کئے، ارادہ ظاہر کیا کہ اس کے ساتھ غالب کا ایک فوٹو اور ان کے خط خاص کا نمونہ بھی دینا چاہئے، مگر اس کی بہم رسی کے لئے متردد تھے، میرے پاس وہ مختصر تذکرہ خود غالب کے قلم کا لکھا ہوا موجود تھا، جو ان سے مسٹر ہملٹن[۳] ڈپٹی کمشنر دہلی کے تذکرہ شعراء فارسی کے لئے میرے والد ماجد[۴] مرحوم نے لکھوایا تھا۔ وہ میں نے بجنوری مرحوم کو دیا، مگر ان کے انتقال کے بعد جب یہ نسخہ بالآخر شائع ہوا تو نہ اس کے ساتھ مرزا کی تصویر تھی اور نہ ان کے خط کا وہ نمونہ۔ مسٹر شعیب قریشی کی وساطت سے اس کو بہت تلاش بھی کیا کہ وہ مرحوم کے ورثاء کے واقف اور بر وقت وفات بھوپال میں موجود بھی تھے، مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر حیدر آباد آکر معلوم ہوا کہ مولوی عبدالحق صاحب (انجمن ترقی اردو) کے پاس وہ "احوال غالب" خود ان کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے۔ الحمد للہ کہ ابھی تک ضائع نہیں ہوا۔ مگر انتظار ہے کہ کب شائع ہوتا ہے۔ ۷ ۳/۵/۱۱ محمد احتشام الدین دہلوی۔[۵]

مولانا احتشام الدین صاحب دہلوی کے اس بیان سے خود نوشت احوال غالب پر پوری روشنی پڑ جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ۱۱ مئی ۱۹۴۳ء تک وہ حالات شائع نہیں ہوئے تھے۔ پھر یہ حالات خود مولانا احتشام الدین صاحب نے ڈاکٹر بجنوری کو دئے تھے۔ اور جو خود نوشت حالات ماہ جولائی ۱۹۲۸ء کے "رسالہ اردو" (اورنگ آباد۔ دکن) میں شائع ہوئے تھے وہ افتخار عالم صاحب مارہروی مرحوم کے دئے ہوئے تھے۔ احوال غالب میں اسی کا عکس ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر اس "خود نوشت سوانح عمری" کو "تذکرہ مظہر العجائب" کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

حواشی

۱۔ "غالب" مولانا مہر، صفحہ ۱۲، طبع چہارم

۲۔ رسالہ "اردو" اورنگ آباد (دکن) ماہ جولائی ۱۹۲۸ء، جلد ۸، نمبر ۳۱، صفحہ ۳۲۸

۳۔ نام کے تحریر کرنے میں مولانا احتشام الدین صاحب کو سہو ہو گیا ہے۔ تذکرہ مظہر العجائب کے اشتہار میں اور تفتہ کے نام مرزا غالب کے خطوط میں مسٹر ہملٹن نہیں بلکہ مسٹر ریکلن ہے اس لئے مسٹر ریکلن ہی صحیح ہے۔ غالباً یہ سہو دہلی سوسائٹی میں مسٹر ہملٹن صاحب کی دلچسپیوں اور مرزا غالب سے حسن عقیدت کے پیش نظر ہو گیا ہے۔

۴۔ یعنی مولانا انوار الحق صاحب میر منشی ایجنسی مارواڑ جنہوں نے تذکرہ مظہر العجائب میں چار سو سے زیادہ شعرا کے حال کا اضافہ فرمایا تھا۔

۵۔ مقدمہ نسخہ حمیدیہ صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱، تحریر قلمی۔ مملوکہ سید احتشام حسین صاحب رضوی۔

آجکل کی فائل سے

ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عرش ملسیانی

جلد: ۱۳ نمبر: ۷ فروری ۱۹۵۵

Licensed U (DN)-[illegible] to post without pre-payment
[illegible] Delhi

Rs. 7/- Ajkal (Urdu) February 2008

آجکل اور غبارِ کارواں	ادارہ	170/=
آجکل کی کہانیاں	ادارہ	162/=
آجکل اور سفر نامہ	ادارہ	108/=
آجکل اور صحافت	ادارہ	115/=
آجکل کے ڈرامے	ادارہ	125/=
آجکل کے مضامین	ادارہ	112/=
آجکل اور اقبال	ادارہ	95/=
آجکل اور طنز و مزاح	ادارہ	112/=
اردو ادب کے پچاس سال	ادارہ	95/=
اٹھارہ سو ستاون	سریندر ناتھ سین/خورشیدہ پروین	556/=
کلاسیکی موسیقار	مترجم: خورشید اکرم	137/=
عوام الناس کے لیے گائڈ	مترجم: عادل صدیقی	145/=
مہاتما گاندھی	آچاریہ کرپلانی / لکشمی چندر ریاس	300/=
مہاتما بدھ کی حکایتیں	پال کاروس / مسعود فاروقی	155/=
شہیدوں کے خطوط	ادارہ	110/=
قلی قطب شاہ	نریندر لوتھر / زبیر رضوی	280/=
[illegible]	ادارہ	95/=
آئینہ غالب (طبع دوم)	ادارہ	75/=
[illegible] (طبع دوم)	ادارہ	60/=
[illegible]	نرین جوشی / راحت جبیں	120/=
[illegible]	[illegible]	1000/=
[illegible]	[illegible]	22/=
[illegible]	[illegible]	65/=
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	122/=
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]

ہندوستان کے عظیم موسیقار	[illegible]
سروجنی نائیڈو	[illegible]
حکیم اجمل خاں	[illegible]
سردار [illegible] پٹیل	[illegible]
[illegible] احمد انصاری	[illegible]
رفیع احمد قدوائی	ڈاکٹر ہاشم قدوائی
سر سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی / اصغر عباس
حسرت موہانی	ڈاکٹر خلیق انجم
مولانا آزاد (طبع دوم)	عرش ملسیانی
بدرالدین طیب جی	[illegible]
مظہر الحق	[illegible]
رابندر ناتھ ٹیگور	[illegible]
جواہر لال نہرو	[illegible]
مشعل آزادی	ساغر نظامی
رامائن — بچوں کے لئے	مترجم: [illegible]
دنیا کی منتخب لوک کہانیاں	ادارہ
دھنواں راجہ	مترجم: [illegible]
ہیرے کی لونگ	ادارہ
امر شہید گنیش شنکر ودیارتھی	[illegible]
بھارت خلائی دور میں	[illegible]
ہم ایک ہیں	[illegible]
پھولوں کی وادی	[illegible]
روشنی کے مینار	[illegible]
چانک کتھائیں	[illegible]
ہندوستان کی مسجدیں	[illegible]
ہندوستان کے [illegible]	[illegible]

[illegible] Licensed U (DN)-50/200 1 to post without pre-payment
RMS Delhi
[illegible] / 87 (Delhi Post) [illegible]
[illegible] No.7 Rs. 7/- Ajkal (Urdu) February 2002

ادارہ کی مطبوعات

آجکل اور غبار کارواں	ادارہ	170/=
آجکل کی کہانیاں	ادارہ	162/=
آجکل اور سفر نامہ	ادارہ	105/=
آجکل اور صحافت	ادارہ	115/=
آجکل کے ڈرامے	ادارہ	125/=
آجکل کے مضامین	ادارہ	112/=
آجکل اور اقبال	ادارہ	95/=
آجکل اور طنز و مزاح	ادارہ	112/=
اردو ادب کے پچاس سال	ادارہ	95/=
اٹھارہ سو ستاون	سریندر ناتھ سین/خورشیدہ پروین	556/=
کلاسیکی موسیقار	مترجم: خورشید اکرم	137/=
عوام الناس کے لیے گائڈ	مترجم: عادل صدیقی	145/=
مہاتما گاندھی	آچاریہ کرپلانی / لکشمی چند ریاس	300/=
مہاتما بدھ کی حکایتیں	پال کاروس / مسعود فاروقی	155/=
شہیدوں کے خطوط	ادارہ	110/=
قلی قطب شاہ	نریندر لوتھر / زبیر رضوی	280/=
سفینۂ غالب	ادارہ	95/=
آئینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	75/=
گنجینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	60/=
یادیں مجاہدین آزادی کی	نوین جوشی / راحت جبیں	120/=
غالب بہ صد انداز	تشکیل: برجندر سیال	1000/=
پہیلیاں - امیر خسرو	مرتب شہباز حسین، نند کشور وکرم	22/=
کاغذی ہے پیرہن	عصمت چغتائی	65/=
کشمیر کی لوک کتھائیں	جے۔ این۔ کھر	45/=
ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر	ڈاکٹر محمد عمر	127/=
راگ راگنیوں کی تصویریں	شکیل الرحمٰن	325/=
ہند اسلامی طرز تعمیر	ضیاء الدین ڈیسائی / اختر الواسع	54/=
ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز	ضیاء الدین ڈیسائی / بہار برنی	54/=
ہماری تہذیبی وراثت	راجندر پرشاد، پی این پانڈے	50/=

ہندوستان کے عظیم موسیقار	شیمونا تھ ... / ...	[illegible]
سروجنی نائیڈو	تارا علی بیگ / ...	[illegible]
حکیم اجمل خاں	ظفر احمد نظامی	[illegible]
سردار ولبھ بھائی پٹیل	آئی۔ جے۔ پٹیل / یعقوب ...	[illegible]
مختار احمد انصاری	مشیر الحسن / فرحت احساس	[illegible]
رفیع احمد قدوائی	ڈاکٹر ہاشم قدوائی	[illegible]
سر سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی / اصغر عباس	[illegible]
حسرت موہانی	ڈاکٹر خلیق انجم	[illegible]
مولانا آزاد (طبع دوم)	عرش ملسیانی	40/=
بدر الدین طیب جی	اے جی نورانی / راجندر انجم	70/=
مظہر الحق	قیام الدین احمد، جٹا شنکر جھا، مترجم: رضوان احمد	[illegible]
رابندر ناتھ ٹیگور	ہرن مے بنرجی / اشہر ہاشمی	[illegible]
جواہر لال نہرو	ایم چلاپتی راؤ / کے بی شرما	[illegible]
مشعل آزادی	ساغر نظامی	[illegible]
رامائن — بچوں کے لئے	مترجم: ساوتری	18/=
دنیا کی منتخب لوک کہانیاں	ادارہ	11/=
دھنواں راجہ	مترجم: وشوناتھ سکہ	13/=
ہیرے کی لونگ	ادارہ	5/50
امر شہید گنیش شنکر ودیارتھی	مالتی شنکر	11/=
بھارت خلائی دور میں	موہن سندر راجن	12/=
ہم ایک ہیں	عرش ملسیانی	10/=
پھولوں کی وادی	رفعت سروش	15/=
روشنی کے مینار	مرتب: شہباز حسین	25/=
جاتک کتھائیں	مترجم: راجندر انجم	32/=
ہندوستان کی مسجدیں	ضیاء الدین ڈیسائی	18/=
ہندوستان کے دریا	شیخ سلیم احمد	11/=
پنجاب اور کلو کی کہانیاں	مترجم: آمنہ ابوالحسن	27/=
وقت کا مسافر	غلام حیدر	22/=
دادی ماں کی کہانیاں	مولف: مخمور سعیدی	10/=

نوٹ: کتابیں اور رسالے منگوانے کے لئے رقم پیشگی ارسال کریں۔
کتابیں کسی بھی صورت میں وی پی سے نہیں بھیجی جائیں گی۔
ملنے کا پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔

Printed and Published by The Director Publications Division
Printed at Aravali Printers & Publishers (P) Ltd. W-30 Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-20.
Published at Publications Division, Patiala House, New Delhi-110 001 Editor: M.R. Farooqi

آجکل کی فائل سے:

گھنشیام سیٹھی

غوّاصی: دکن کا ملک الشعراء

مُلاّ غوّاصی قطب شاہی دور کا دوسرا اہم ترین شاعر گزرا ہے۔ وہ ہندی کے مشہور شاعر گوسوامی تلسی داس کا ہم عصر تھا۔ غواصی کی صرف دو تخلیقات ہی منظر عام پر آئی ہیں۔

(۱) مثنوی سیف الملوک اور بدیع الجمال۔ (۲) طوطی نامہ

اول الذکر کی تخلیق ۱۶۲۵ء میں ہوئی اور خالصتاً شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر اس کا اسلوب "طوطی نامہ" پر فوقیت رکھتا ہے۔ 'طوطی نامہ، سیف الملوک' سے چودہ سال بعد کی تخلیق ہے اور نسبتاً سلیس اور دلکش پیرایہ انداز میں ادا کی گئی ہے۔ کیونکہ تب (۱۶۳۹ء) شمالی ہند کے اثرات نے دکن کے ادبی اور شمالی ماحول کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ "طوطی نامہ" میں فارسی الفاظ اور ترکیبیں جا بجا ملتی ہیں اور نظم کے حسن اور دلکشی میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ ۱۶۳۹ء میں غواصی ملک الشعراء کے رتبے پر پہنچ چکا تھا اور گولکنڈہ کے شاہی دربار میں اس نے خاصہ اثر و رسوخ قائم کر لیا تھا۔

قطب شاہی عہد کی تاریخیں اور تذکرے اس عظیم شاعر کے تفصیلی حالات سے بالکل خالی ہیں۔ حالانکہ اس نے سلطان محمد قلی قطب کے عہد ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا، لیکن اس کی قدر ۱۶۲۶ء کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد (۱۶۲۶ء تا ۱۶۷۲ء) میں ہی ہوئی۔ غواصی کی ابتدائی زندگی نہایت عسرت میں بسر ہوئی اور ۱۶۲۶ء سے قبل وہ بالکل گمنامی کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ غواصی سے پہلے طبعی اور ابن نشاطی کا سکہ شاہی دربار میں بیٹھا ہوا تھا۔ غواصی کے یہ دونوں ہم عصر شاہی دربار میں اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان قلی قطب شاہ جیسا عظیم شاعر بھی جسے اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے، غواصی کی قدر نہ کر سکا۔ قلی قطب کا وارث، داماد سلطان محمد قطب شاہ شعر و شاعری سے لگاؤ نہ رکھتا تھا اور نہ ہی اپنے مخصوص دائرے سے باہر نکل کر ربط ضبط بڑھانا اسے پسند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے "سیف الملوک" کے منظر عام پر آجانے کے باوجود بھی شاعر کی کوئی قدر نہ کی۔ غواصی ناامید ہو چلا تھا جب کہ اس نے تیسرے سلطان عبداللہ قطب شاہ سے انصاف کی توقع رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار لکھے اور رفتہ رفتہ اسکی قسمت موافق ہوتی گئی۔

جو سلطان عبداللہ انصاف کر	
میرے جوہراں پوتے دل صاف کر	پہ سے
دیوے داد میرا بہت مان پاؤں	عزت
اس دورتے تا گریبان پاؤں	دور سے

(سیف الملوک و بدیع الجمال)

۱۶۳۵ء میں اسے بہ حیثیت شاہی سفیر محمد عادل شاہ کے دربار میں بیجاپور بھیج دیا گیا۔ بیجاپور کے سلطان نے غواصی کی بڑی عزت کی اور بڑے بڑے انعام و اکرام سے اسے نوازا گیا۔ اس عزت کو، جو اسے اپنی غیر معمولی قابلیت اور اپنے آقا سلطان عبداللہ قطب شاہ کی بدولت حاصل ہوئی تھی، قائم رکھنے کے لئے اس نے دوسرے درباری شاعروں کی تقلید کرتے ہوئے سلطان کی جھوٹی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے۔ "طوطی نامہ میں ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

مہاراج سلطان عبداللہ ناؤں	نام
ثریا کے تارک پر اس کا ہے پاؤں	
دیکھت زور آور طالع اس راج کے	نصیب
صفا دار روشن دلاں آج کے	روشن دل والے
کہیں وہ بہک کے علی و علی	
کہ پھر جگ میں آیا محمد قلی	
سچے آج اے خسرو نیک نام	سچ مچ
ہیں اس کے کہ آثار تجھ میں تمام	

غواصی نے اپنی شاعری میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کو دنیا کا سب سے بڑا اور آزاد بادشاہ گردانا ہے۔ لیکن حقیقت اس سے الٹی ہے۔ ۱۶۳۹ء میں شکست کھا کر اس نے شاہجہاں کی اطاعت قبول کر لی تھی۔ اسی برس غواصی کا 'طوطی نامہ' بھی منظر عام پر آیا اور اسی برس گولکنڈہ کی آزادی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ لیکن اس وقت کے سبھی درباری شاعروں میں یہی بات دیکھی جاتی ہے، اس لئے ہم غواصی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔

باقی ٹائٹل ۳ پر

ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمٰن فاروقی
فون: 3386994

اسسٹنٹ ایڈیٹر:
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر:
محمد کاظم

جلد: ۶۰ شمارہ: ۸
مارچ ۲۰۰۲ء پھاگن۔ چیت شک ۱۹۲۳

سرورق: ہمت رائے شرما
کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ کی آہوجہ

فی شمارہ: سات روپے سالانہ: ۷۰/روپے
دو سال: ۱۳۵/روپے تین سال: ۱۹۰/روپے
امریکہ یورپ اور دوسرے ممالک کیلئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۰۰/روپے سالانہ
پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۵۰۰/روپے سالانہ

خریداری اور اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر،
ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتہ پر بھیجیں
سرکولیشن منیجر 'آجکل' ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر کے پورم، نئی دہلی۔ ۶۶
رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتوں کیلئے بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱

ترتیب

مقالات:

نظمیں:

غزلیں:

کہانیاں:

تبصرے: ۴۳

بلراج کومل

بیسویں صدی کا اردو ناول

برٹش راج کے خلاف ہندوستانیوں کی پہلی بغاوت کو انگریزوں نے اگرچہ 'غدر' کا نام دیا تھا مگر ہندوستانیوں نے بجا طور پر اسے آزادی کی پہلی لڑائی قرار دیا۔ اس لڑائی سے وابستہ یا اس کے نتیجے کے طور پر ظہور میں آنے والے سماجی، سیاسی اور اقتصادی واقعات و حقائق نے باعث ہندوستانیوں کی زندگی میں وسیع پیمانے پر غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پرانی وابستگیاں سوچنے کے مروجہ طریقے، رہنے سہنے کے جانے پہچانے انداز اور زندگی سے جڑی ہوئی توقعات —— سب اپنے اپنے تناسب کے اعتبار سے بدل گئے۔ نئے اور پرانے میں ایک نوع کی آویزش شروع ہو گئی۔ یہ وہ تاریخی موڑ تھا جہاں سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو اپنی قیادت اور رہنمائی سے تعلیم، مذہب اور روشن خیال اعتقاد کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا۔ وہ اور ان کے رفقا کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو نئی صورت حال اور اس سے متعلقہ معاملات سے آگاہ کیا جائے۔ وہ ان کے سامنے ایک نئی طرز فکر اور ایک نیا نظم و ضبط رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ان کو ایک ایسا نیا سائنسی رویہ سکھانا چاہتے تھے جو وقت کی ضرورت کے مطابق ہو۔ اردو فکشن جو اب تک حکایت اور داستان اور اس نوعیت کی نثری تحریروں تک محدود تھی اب مختصر افسانہ اور ناول کی جانب رجوع کرنے لگی۔ یہ تبدیلی یا تو مغربی فکشن کے زیر اثر عمل پذیر ہوئی یا پھر ۱۸۵۷ء کے بعد کے بدلے ہوئے ماحول کی دین تھی۔ اہم اردو ناول نگار —— نذیر احمد (۱۸۳۳۔ ۱۹۱۲ء) رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۴۔۱۹۰۲ء) عبدالحلیم شرر (۱۸۶۲۔ ۱۹۲۶ء) سجاد حسین (۱۸۵۶۔۱۹۱۵ء) مرزا ہادی حسین رسوا (۱۸۵۹۔ ۱۹۳۱ء) راشد الخیری (۱۸۷۵۔ ۱۹۳۶ء)۔ اگرچہ انیسویں صدی کے اواخر میں ابھر کر سامنے آئے تھے، واقعتاً بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں ہی بامعنی حصول کی منزل تک پہنچے۔

نذیر احمد چونکہ سر سید احمد خاں کے خیالات سے متاثر تھے اس لئے ان کا بنیادی جھکاؤ بچوں اور عورتوں کی تعلیم کے ذریعہ مسلم سماج کی اصلاح کی جانب ہے۔ نذیر احمد نے اپنا ناول مراۃ العروس (۱۸۶۹ء) خاص طور پر اپنی بیٹی کے لئے لکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عورت بھی ازدواجی خوشی، وفاشعاری، ایثار و محبت اور خانہ داری کے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دینے سے ہی حاصل کر سکتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ گھر کے بزرگوں کا احترام کرے اور بچوں کی نشو و نما پر مناسب توجہ دے۔ 'توبۃ النصوح' نظم و ضبط کی سختی سے پابندی کرنے پر زور دیتا ہے۔ غیر فرماں بردار کلیم کو اپنی 'حکم عدولی' کی سزا کے طور پر گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ 'فسانۂ مبتلا' مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے ایک سے زیادہ شادی کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ یہ صرف ان کا ناول 'ابن الوقت' ہی ہے جس میں وہ بذلہ سنجی، مزاح، دلچسپ تیز طرار گفتگو، واقعات کے بیان اور کردار نگاری کے ذریعے اپنے عہد کے مسلم سماج کی دوئی کی تخلیقی تجسیم کرتے ہیں جو ۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں مختلف النوع سماجی اور سیاسی متضاد وابستگیوں میں گھرا ہوا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ شکست خوردگی سے کس طرح نجات حاصل کی جائے اور نئے اور پرانے میں کس طرح توازن پیدا کیا جائے۔ نذیر احمد نے نہ صرف یہ سب کیا بلکہ مرزا ظاہر علی بیگ اور ہریالی جیسے یادگار کردار بھی تخلیق کئے۔

عبدالحلیم شرر اچھے خاصے زود نویس مصنف تھے۔ ان کی کل ملا کر ۱۰۲ تصانیف ہیں۔ وہ اکثر اسلام کے شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہیں اور مسلمانوں کے حوصلے، شجاعت، فراخدلی، مذہبی جوش اور ان کے روحانی ارتفاع کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ 'فردوس بریں'، 'آئینۂ حرم'، 'حسن کا ڈاکو' اور 'زوال بغداد' کا شمار ان کے مشہور ناولوں میں ہوتا ہے۔ وہ دل سے اگرچہ رومانی مزاج کے ہیں لیکن ترجیحات کے اعتبار سے ناصحانہ انداز میں اسلامی آدرشوں پر زور دیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ اپنے آپ کو دہراتے ہیں اور واقعات کی ترتیب و تنظیم کی طرف بھی مناسب توجہ نہیں دیتے۔ ان کے کردار شاذ و نادر خاکوں کی سطح سے اوپر اٹھ پاتے ہیں۔ البتہ ان کے مقبول عام ناول 'فردوس بریں' کا کردار شیخ علی وجودی استثنائی حیثیت رکھتا ہے۔

'صبح زندگی، شام زندگی، ماہ عجم، نوبت، پنج روزہ' کے مصنف راشد الخیری بھی نذیر احمد کی طرح مسلم سماج کے مسائل کے بارے میں لکھتے ہیں۔ مسلمان عورتیں، ان کی قربتیں، رقابتیں، ان کے جذبات کا اظہار۔ راشد الخیری کے دائرہ عمل کے اہم

ای۔۱۳۹۔ کالکاجی، نئی دہلی۔۱۱۰۰۱۹

ناصر ... ان کے مرد کرداروں میں نہ کوئی قد آور کردار ہے اور نہ ہی کوئی مجاہد۔

جہاں تک ... اور ... حلیم شرر نے طے شدہ انداز میں مسلم اخلاقی میلان طبع کے حامل کردار ہیں، ... سیاسی تعصبات اور ذہنی حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ حاجی بغلول جیسا ... مزاحیہ کردار خلق کرنا نہیں کا حصہ ہے۔

رتن ناتھ سرشار اور مرزا ہادی حسین رسوا دو ایسے اہم ناول نگار ہیں جو مسلمانوں کے مخصوص فکشن سے ماورا جاتے ہیں اور وسیع تر پس منظر میں اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں۔ 'فسانۂ آزاد'، کامنی، کندن، جام سرشار، بچھڑی دلہن، پی کہاں' کے مصنف رتن ناتھ سرشار واضح جیسے غیر مسلسل انداز میں (خاص طور پر فسانۂ آزاد میں) نکتہ سنجی، مزاح اور زندگی کے رنگا رنگ مظاہر کی مدد سے اپنے وقت کے اودھ کی تخلیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ثقافتی زوال کے ماحول میں وہ خوجی اور آزاد جیسے زندہ دل اور یادگار کردار تخلیق کرتے ہیں خاص طور پر خوجی، ککری والا۔ خوجی جو اگرچہ بونا ہے لیکن ---اپنے ارد گرد بے تکلفی کا ہالہ لئے ہوئے نتائج سے بے پروائی سے نئی مہم پر گامزن ہونے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

مرزا ہادی حسین رسوا اپنے عہد کے ایک اہم ناول نگار ہیں۔ 'امراؤ جان ادا' اور 'شریف زادہ' ان کے ناول ہیں۔ 'امراؤ جان ادا' میں انہوں نے اپنے عہد کے لکھنؤ کے معاشرے کی تصویر کشی کی ہے جس میں اس عہد کے عیاش، مہم باز اور ان کے باہم متضاد و متصادم اخلاقی رویے شامل عمل ہیں۔ امراؤ جان ادا اور قاضی سرفراز حسین کے ناول 'شاہد رعنا' میں ... (سطر) مرزا ... ' ... جان' کا موازنہ ممکن ہے دلچسپ ہو لیکن اس سے رسوا اور ان کے ناول امراؤ جان ادا کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ امراؤ جان ادا اپنے آپ میں ایک یادگار کردار ہے۔ دلاور خاں اور خانم بظاہر ٹائپ کردار ہیں لیکن اخلاقی زوال کی فضا میں گہری معنوی تعبیر و تفہیم کے حامل ہیں۔ رسوا بجا طور پر اردو فکشن کے تناظر میں اولیں حقیقت نگار اور ناول کے فن کے تعلق سے باصلاحیت فنکار کہلانے کے مستحق ہیں۔

آغا شاعر نفسیاتی مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بناتے ہیں۔ مرزا محمد سعید 'خواب ہستی' اور 'یاسمین' میں فرد اور سماج کے باہمی تصادم کی تصویر پیش کرتے ہیں اور اس عمل میں مغربی تہذیب کے کچھ روشن پہلو دریافت کرتے ہیں۔ نیاز فتح پوری ایسے رومانی ناول نگار ہیں جو ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ اس عہد کے دیگر ناول نگار --- مثال کے طور پر کشن پرشاد کول، محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی، مرزا عباس حسین ہوش، علی عباس حسینی، نذر سجاد حیدر، طیبہ بیگم یا تو رومانی انداز میں پرواز تخیل کرتے ہیں یا پھر دلچسپ انداز میں بات کہنے کا کچھ ملکہ رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند سے پہلے کے ناول کے کچھ مخصوص قابل توجہ رجحان ہیں۔ مسلم معاشرے سے تعلق رکھنے والے ناول یا تو مسلمانوں کے شاندار ماضی کو یاد کرتے ہیں یا پھر متصادم وابستگیوں کے درمیان باہم دگر ہیں۔ جہاں ناستلجیا ہے وہیں اس کے ساتھ ساتھ شاندار ماضی کی بازیافت اور تعمیر نو کا جذبہ بھی سرگرم عمل ہے۔ الجھنوں کے کارن کہیں کہیں یاسیت بھی در آئی ہے۔ جہاں 'امراؤ جان ادا' اور 'شاہد رعنا' میں طوائف مرکزی حیثیت رکھتی ہے وہیں فسانہ آزاد اور حاجی بغلول میں خوجی اور حاجی بغلول جیسے کردار ماحول کو روشن اور زندہ و تابندہ کر دیتے ہیں۔ حقیقت نگاری جیسی بھی ہے کہیں کہیں غیر مصدقہ رومانی یا اخلاقی اعتقادوں کے بے ست عمل دخل سے مجروح ہو جاتی ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد صنعت کاری کا فروغ، باہر کی دنیا سے بڑھتے ہوئے روابط، ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب اور اس کے نتیجے کے طور پر عوام کی خاص طور پر کسانوں کی بیداری، ٹریڈ یونین تحریک۔ یہ سب ان عوامل میں سے کچھ ایک ایسے عوامل تھے جنہوں نے ایک نئی حسیت کو جنم دیا اور ایسی فضا تیار کی جس میں بچی حقیقت نگاری کی جانب تیز رو پیش قدمی ممکن ہو سکی۔

پریم چند (۱۸۸۰۔۱۹۳۶ء) بیسویں صدی کے شروع میں غالباً اپنی پہلی کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن" کی اشاعت کے ساتھ ادبی منظر نامے پر ابھر کر سامنے آئے۔ وہ بیسویں صدی کے اردو ناول نگاروں میں ایک قد آور شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد کا عہد بجا طور پر 'پریم چند کا عہد' کہلانے کا مستحق ہے۔ ان کے ناول باقاعدگی سے یکے بعد دیگرے شائع ہوتے رہے اور قارئین کی توجہ کا مرکز بنتے رہے۔ 'اسرار معابد' غالباً ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۵ء کے وقفے میں لکھا گیا تھا۔ اس کا موضوع تھا مذہبی اور سماجی اصلاح۔ 'ہم خرما و ہم ثواب' کا بھی یہی موضوع تھا۔ 'جلوۂ ایثار' میں پریم چند نے پرتاپ چندر کے روپ میں دیا نند جیسا ایک کردار تخلیق کیا۔ اس ناول میں پریم چند نے فرد کے مسئلے یا مسائل کی حدود سے نکل کر وسیع تر تناظر میں انسانی مسائل کی جانب قدم بڑھایا۔ ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئے ناول 'بازار حسن' میں ان کا مرکزی کردار ایک طوائف تھی۔ کردار نگاری کے اعتبار سے اگرچہ بازار حسن کی طوائف 'امراؤ جان ادا' کے مقابلے کا وقار تو نہیں رکھتی لیکن بہر حال بڑے پر اثر انداز میں ایک طوائف کے دکھ درد کی تصویر بن جاتی ہے۔ گوشہ عافیت (۱۹۲۰ء) میں غالباً پہلی بار اردو ناول میں کسانوں کے مسائل کو موضوع تخلیق بنایا گیا ہے۔ یہ ان کی بیداری کی کہانی ہے۔ ناول کا باغی ہیرو بلراج بڑی دلیری سے لالچی زمیندار گیان شنکر اور اس کے حواریوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں اترتا ہے اور ان کے خلاف اپنی جدوجہد میں جوالا پرشاد اور ڈاکٹر عرفان علی جیسے لوگوں کو اپنا ہمدرد اور دوست بناتی ہے۔ یہ ناول محفوظ حدود کے اندر اور نمائشی انقلابی تام جھام کے بغیر بڑی کامیابی سے ظلم کرنے والوں اور اکثر ظلم سہنے والے ان کسانوں کے تصادم کا مسئلہ پیش کرتا ہے جو ذہنی طور پر بیدار ہو چکے ہیں۔ 'نرملا' کسی سیاسی جدوجہد کی کہانی نہیں ہے بلکہ یہ درمیانہ طبقہ کے مسائل خاص طور پر عورتوں کے مسائل کی کہانی ہے۔ پریم چند کا اشارہ غالباً اس بات کی طرف ہے کہ سماجی برائیاں نامساعد اقتصادی حالات ہی کی پیداوار ہیں۔ 'چوگان ہستی' ۱۹۲۲ء۔ ۱۹۲۴ء میں لکھا گیا ...... بیانیہ اور موضوعاتی دائرہ کار کے اعتبار سے یہ ناول رزمیہ تیور رکھتا ہے۔ ایسا لگتا ہے 'چوگان ہستی' میں پریم چند اپنی

اس ترجیح کو پیچھے چھوڑ آئے تھے جس کے تحت وہ اکثر و بیشتر چیزوں، انسانوں اور حالات میں سمجھوتے کی صورتیں وضع کر کے نجات کی کوئی نہ کوئی راہ تلاش کر لیتے تھے۔ پردۂ مجاز (۱۹۳۵ء) آواگون کے مسئلے سے متعلق ہے۔ پریم چند کا اشارہ غالباً اس بات کی طرف ہے کہ مقدر ہی ناگزیر طور پر انسانوں کی زندگی پر حاوی ہے۔ 'بیوہ' فی الواقع 'ہم خرما و ہم ثواب' کی نقل جیسا ہے۔ شاید شردھا بھگتی یا دیش کی سیوا ازدواجی خوشی سے بہتر خوبیاں ہیں۔ 'غبن' میں پریم چند نے سیاسی جدوجہد کی تفصیل میں جائے بغیر روحِ عصر کو کامیابی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ 'میدان عمل' کا منبع ترغیب، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ اور وہ عوامی سیاسی جدوجہد ہیں جس نے عوام کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ امرکانت اس وسیع دائرہ کار والے ناول کے موضوعاتی وقار کی جیتی جاگتی تجسیم ہے۔

'گودان' پریم چند کا شاہکار ناول ہے۔ اس ناول تک پہنچتے پہنچتے پریم چند عدم تشدد اور جاگیرداری سے سمجھوتہ کرنے کے رویے سے مایوس ہو چکے تھے۔ گودان کا مرکزی کردار ہوری دبا کچلا ہوا، غریب نادار ان پڑھ کسان ہے۔ نہ وہ فرشتہ ہے نہ ہی وہ شیطان ہے۔ وہ ظلم کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اس کا لڑکا گوبر خوشگوار مستقبل اور روزگار کی تلاش میں شہر کا رخ کرتا ہے جہاں وہ مختلف تجربات سے گزرتا ہوا بالآخر بطور مزدور ایک فیکٹری میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ اس دوران وہ سیاسی جدوجہد میں بھی حصہ لیتا ہے۔ دھنیا کے روپ میں پریم چند نے سیدھی سادی ایک ایسی ہندوستانی عورت کا کردار پیش کیا ہے جس میں بے پناہ انسانی قوت اور ہمدردیوں کا ذخیرہ ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جن کے باعث دھنیا نہ صرف پریم چند کا یادگار کردار بن گئی بلکہ ہندوستانی فکشن کے تناظر میں بھی بطور کردار اس کا اعلیٰ وقار و مرتبہ ہے۔

پورے ادبی سفر میں پریم چند کئی خارجی اثرات کے تحت سرگرم عمل رہے۔ وہ بیک وقت اصلاح پسند بھی تھے، دبے کچلے لوگوں کے دوست، گاندھی وادی، وویکانند کے مداح، ایک نو آموز مارکسی اور ایک فراخ دل انسان دوست! پلاٹ کی تعمیر و تہذیب، جزئیات و تفصیلات کے نظم و ضبط اور بیانیے میں طریقہ ترتیب میں بعض اوقات وہ غیر محتاط بھی ہو جاتے تھے لیکن کئی برسوں پر پھیلے اپنے ادبی سفر میں انہوں نے اپنی فنکارانہ کارکردگی اور صناعی کے لاتعداد شواہد فراہم کئے۔ خاص طور پر اپنے مقبول عام اور اعلیٰ ادبی وقار و مرتبہ رکھنے والے ان ناولوں میں جن میں چوگان ہستی، میدان عمل اور گودان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر یوسف سرمست نے بجا طور پر کہا ہے کہ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۶ء تک کا عرصہ اردو ناول کے تناظر میں تسلی بخش نہیں تھا۔ پریم چند کا ۱۹۳۶ء میں انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات ایک قد آور ادیب اور ناول نگار کی موت تھی۔ اگرچہ اس وقت سدرشن، محمد مہدی تسکین، قاضی عبدالغفار، مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، کشن پرشاد کول، ل۔ احمد اور کچھ ناول نگار ادبی منظر نامے پر موجود تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سب کے درمیان سے صرف قاضی عبدالغفار ہی ہیں جو اہمیت کے اعتبار سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے ناول 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' ناول کے روایتی تصور کا احترام نہیں کرتے نہ ہی ان کا کوئی باقاعدہ پلاٹ ہے اور نہ عہد کی روایتی انداز کی کردار نگاری۔ بہر حال 'لیلیٰ کے خطوط' میں ایک عورت کی کہانی ہے جو اپنے درد و کرب اور ان حالات سے نفرت کے باوجود جن کے باعث وہ مروجہ اخلاق سے باہر کی زندگی میں دھکیل دی گئی، اب طوائف کے طور پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ 'مجنوں کی ڈائری' میں لگتا ہے پلاٹ جیسا کچھ ہے۔ 'مجنوں کی ڈائری' کا مرکزی کردار مجنوں، لیلیٰ کی طرح جذباتی الجھنوں سے برسرپیکار ہے۔ دونوں سماجی اور مذہبی روایات سے نفرت کرتے ہیں۔ کبھی کبھی جب وہ اپنے حالات کے الجھاوے میں راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو انہیں اپنے وجود کا روشن خوشگوار احساس ہونے لگتا ہے۔ قاضی عبدالغفار ہمیں اپنے دور کے ایسے مرد اور ایسی عورت کی تصویر دکھاتے ہیں جو ذہنی سکون اور سماجی قوتوں کے تحفظ سے محروم ہو چکے ہیں۔

ان ناول نگاروں کے مقابلے میں جن کا حوالہ مندرجہ بالا سطور میں دیا گیا ہے عظیم بیگ چغتائی، نکتہ سنجی اور مزاح کے ساتھ بغیر مذہبی مجبوریوں کی پروا کئے تفصیلات کے ہجوم میں کردار کی مرکزیت کو پہچاننے کے سلسلے میں فعال بصارت کا ثبوت دیتے ہیں۔

۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد دنیا کے ادیبوں میں مارکسی اور اشتراکی افکار اور خیالات کے تئیں ہمدردی عام ہو گئی تھی۔ اردو زبان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہی۔ 'انگارے' کی اشاعت، ترقی پسند انجمن کی تشکیل اور بعد ازاں جاری ہونے والے انجمن کے مینی فیسٹو نے ایسی فضا تیار کر دی جو انتہا پسندانہ انقلابی خیالات کے لئے سازگار تھی۔ آزادی کی جدوجہد بھی عوام اور لکھنے والوں میں ترقی افزوں بیداری پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ ملک کی تقسیم سے پہلے اور بعد کے برسوں کا دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ خاص طور پر اردو زبان کے تعلق سے۔ نذیر احمد اور پریم چند کی حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری کے عروج و زوال کے اپنے مقامات تھے (اگرچہ یہاں وہاں مذہبی اور سماجی افکار نے انہیں متاثر کر رکھا تھا) لیکن اتفاق سے ترقی پسند تحریک کی حقیقت پسندی اور حقیقت نگاری کو اگر ہم بیان کریں اور اسے سماجی یا اشتراکی حقیقت نگاری کہیں تو یہ بھی مخصوص انداز میں ترمیم شدہ حقیقت نگاری تھی۔ تحریک کے عروج کے برسوں میں یہ تصور اگرچہ مقبول رہا لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چل سکا۔ انتہا پسندانہ انقلابی خیالات کے ساتھ ساتھ مغربی ادب کی تجربہ کاری سے وابستہ نئے نئے تصورات بھی پریم چند کے بعد کے دور میں ہندوستانی لکھنے والوں پر جن میں اردو ادیب بھی شامل تھے رفتہ رفتہ اثر انداز ہونے لگے تھے۔ سجاد ظہیر اپنے ناول (یا ناولٹ) 'لندن کی ایک رات' میں افکار اور تجربہ کاری کا ایسا امتزاج پیش کرتے ہیں جس میں 'شعور کی رو' اور دیگر متفرقات شامل ہیں۔ کہانی جیمز جوائس کے یولی سس کی طرح اگرچہ محدود مدت کی کہانی ہے کہ اپنی استعاراتی اور ہیئت کی

[illegible] ترتیب اختیار کر لیتی ہے۔

عزیز احمد ([illegible]) کا شمار آزادی سے پہلے کے برسوں میں ادبی افق پر ابھرنے والے اہم اردو ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے سفر کا آغاز اگرچہ آزادی سے پہلے کے برسوں میں کیا لیکن وہ ۱۹۸۱ء میں اپنی وفات تک متنوع ادبی کاموں میں سرگرمی سے مصروف کار رہے۔ ان کا پہلا ناول 'ہوس' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد 'مرمر اور خون'، 'گریز'، 'ایسی بلندی ایسی پستی'، 'شبنم'، اور 'آگ' شائع ہوئے۔ ان کے موضوعات کا سلسلہ کشمیری عوام کی ناداری سے لے کر بڑے شہروں میں بسے ایک مخصوص طبقے کے لوگوں کے جنسی رشتوں کی عکاسی اور پیش کش تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ انسانی رشتوں سے جڑے مردوں عورتوں کی نفسیاتی الجھنوں کا بھی تجزیہ کرتے ہیں اور جاگیرداری کے زوال کے عمل کی زد میں آئے ہوئے لوگوں کے مصائب کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی اور بلونت سنگھ بھی ملک کی تقسیم سے پہلے اردو فکشن کے افق پر ابھرے تھے۔ اور تقسیم کے بعد کے برسوں میں فعال انداز سے سرگرم کار رہے۔ حیات اللہ انصاری نے اپنے ناول "لہو کے پھول" میں اور خواجہ احمد عباس نے اپنے ناول "انقلاب" میں ہندوستانی عوام اور ان کی آزادی کی جدوجہد کو رقم کیا۔ کرشن چندر (۱۹۱۴۔۷۷ء) خاصے زود نویس تھے، وہ "شکست، جب کھیت جاگے، آسمان روشن ہے" اور بہت سے دیگر ناولوں کے مصنف تھے جہاں وہ اپنے ناول "شکست" میں دبے کچلے استحصال زدہ کشمیری عوام کی عکاسی کرتے ہیں وہیں وہ اپنے طویل ادبی سفر میں اپنے رومانی اور پرکشش اسلوب میں مختلف اور متنوع موضوعات اور سماجی پہلوؤں کو اپنی ادبی کاوشوں کا حصہ بناتے ہیں۔

اپنی انقلابی ہمدرویوں، اپنی انسان دوستی اور سماج کے دبے کچلے لوگوں کے مسائل کو سمجھنے اور پیش کرنے کے طفیل کرشن چندر ہمارے دور کے مقبول ترین اردو ناول نگار سمجھے جاتے رہے۔ لیکن بدقسمتی سے وقت گزرنے کے ساتھ ان کی مقبولیت میں کمی واقع ہوئی گئی۔

"ضدی، ٹیڑھی لکیر، معصوم" اور "سودائی" جیسے ناولوں کی خالق عصمت چغتائی (۱۹۱۵۔۱۹۹۱ء) دلیر، نڈر، کھل کر بات کہنے والی، منفرد اسلوب و اظہار کی مصنفہ تھیں۔ انہوں نے اپنی طویل و مختصر فکشن میں اپنی بذلہ سنجی، مزاح اور روشن، تیز طرار گفتگو کے فنکارانہ امتزاج کی کارکردگی سے نچلے درمیانہ طبقہ کی عورتوں کے بچپن، دوشیزگی، شباب اور زوال عمر کا انتہائی دلچسپ اور قابل توجہ منظرنامہ پیش کیا۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک کی تقسیم ہوئی اور ہندوستان اور پاکستان آزاد ہوئے۔ راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی اور بلونت سنگھ اس سے قبل ہی اردو فکشن میں اپنا نام اور مقام بنا چکے تھے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور اور قاضی عبدالستار نے بھی ۱۹۴۷ء کے آس پاس اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ البتہ راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی اور بلونت سنگھ نے اپنی مقابلتاً طویل فکشن تقسیم ہند کے بعد برسوں میں پیش کی۔ قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی اور قاضی عبدالستار نے بھی اپنی ادبی کامیابی تقسیم کے بعد کے برسوں میں حاصل کی۔ ایم۔ اسلم، محبوب طرزی، قیسی رام پوری، ابن سعید اور دیگر اس طرز کے ناول نگار۔ مقبول عام ناول نگار بھی ان برسوں میں ادبی منظرنامے کا حصہ تھے لیکن ان کی تحریریں بہرحال مختلف نوعیت کی تحریریں تھیں۔

طلوع آزادی اور برصغیر کی تقسیم نے جو پیچیدہ اقتصادی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل پیدا کئے وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں وقت گزرنے کے ساتھ بد سے بدتر صورت اختیار کرتے گئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد وسیع پیمانے پر ہونے والے فسادات اور اپنی جڑوں سے کٹ چکے آبادی کے بہت بڑے حصے کی ایک ملک سے دوسرے میں ہجرت فوری تشویش کا باعث ثابت ہوئے۔ یہ مسئلہ محض جسمانی نوعیت کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ ایک پورے ڈھانچے اور طرز زندگی کی شکست وریخت کا مسئلہ تھا۔ قائم ودائم رشتے اور ثقافتی ادارے انتشار اور اقدار کے زوال کی زد میں تھے۔ درد وکرب تھا اپنی دھرتی اپنی جڑوں سے کٹنے کا اور خاک نو پر نئے سرے سے جڑیں جمانے کا۔ ملک کی تقسیم نے دونوں ملکوں میں نہ صرف انسانی ذہن کو ناقابل علاج حد تک مجروح کر دیا اور تضادات کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کو جنم دیا بلکہ کچھ ایسی مخاصمانہ قوتوں کو حالات پر حاوی ہونے کا مواقع فراہم کیا جو اپنے ذاتی مفادات کو سماجی اور انسانی سروکاروں پر ترجیح دیتی تھیں۔

تقسیم کے بعد کی فکشن کا ایک حصہ ان ناولوں پر مشتمل ہے جو ناخوشگوار واقعات اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک وسیع پیمانے کی ہجرتوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس بحران کو دائرہ اظہار میں لاتے ہیں جس نے صدیوں سے چلے آتے طرز زندگی اور مشترکہ ثقافت کے سلسلے کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسینی، شوکت صدیقی، خدیجہ مستور، انتظار حسین اور جوگندر پال اپنے سے بڑی عمر کے ناول نگاروں کی طرح اقدار کے زوال وانہدام کے نوحہ گر ہیں۔ جہاں کرشن چندر اور شوکت صدیقی وکٹورین انداز میں زوال وانہدام کی دستاویزی صورت گری کرتے ہیں قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین اپنے اپنے انداز میں انسانیت کی بنیادی صورت حال کا رزمیہ لکھتے ہیں۔ چونکہ یہ دونوں لکھنے والے اپنے آپ کو حالات وواقعات کی دستاویز سازی تک محدود نہیں رکھتے اس لئے تاریخ، روایت، دیومالا، حکایت، تمثیل، استعارہ اور بہت سے متفرق عناصر ان کے تخلیقی عمل کا حصہ بن جاتے ہیں اور ان کی تحریروں کو ایک وسیع اور کشادہ تناظر عطا کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناول اگرچہ ہمارے زمانے میں آغاز سفر کرتے ہیں لیکن وقت کو ایک استعارے میں منقلب کر دیتے ہیں۔ تاریخ کی ناگزیریت کے احساس، انسانی ہمدردی اور فراخدلی کی فضا میں ایک ماورائی وسعت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے شاہکار ناول "آگ کا دریا" میں یہ سب خوبیاں موجود ہیں۔ انتظار حسین کے یہاں بھی ان کی

تحریروں کے تانے بانے میں یہ سب عناصر کار فرما ہیں لیکن وہ وقت، تاریخ اور اقدار کے زوال کے منظر نامے پر اپنی منفرد بصیرت کے ساتھ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے وہ ماضی کی بازیافت کرتے ہیں اور حال کو ماضی کے تناظر میں سمجھنا چاہتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ناول 'بہاؤ' میں صدیوں پر پھیلے وقت کے ساتھ بہنے کا احساس جگاتے ہیں۔ ایک ایسی تاریخ کے ہم سفر ہیں جو تاریخ بھی ہے اور قبل از تاریخ بھی۔ نیر مسعود اس کے برعکس اعلیٰ کارکردگی اور فنکاری سے گزرے دور کے پراسرار ماحول میں بنیادی انسانی سروکاروں کو فکشن کے فریم ورک میں آویزاں کر دیتے ہیں۔

ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہجرت کے دو پہلو ہیں۔ جڑوں سے کٹنا ایک کربناک پہلو ہے، دوسرا خاک غیر یا خاک نو پر نئے سرے سے جڑیں تلاش کرنا اور جڑیں جمانا ہے۔ اگرچہ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور کئی دوسرے عصری ناول نگاروں نے اپنی تخلیقات میں انسانی کرب کے اس پہلو کو اپنی کاوشوں کا حصہ بنایا ہے لیکن جوگندر پال نے اپنے ناول "خواب رو" میں کراچی کے مقامی لوگوں اور مہاجروں کی باہمی آویزش کو جس معروضی انداز کے ساتھ فنکارانہ سطح پر پیش کیا ہے وہ قابل داد ہے۔

انسانی تضادات، شدید رد عمل، ہجرتوں کا سلسلہ اور ان سے متعلقہ معاملات تاریخ کا حصہ ہیں لیکن ہندوستان اور پاکستان کے تناظر میں انہوں نے ایک مخصوص نوعیت اختیار کرلی ہے۔ ایک ہجرت وہ ہوتی ہے جو لوگوں پر تھوپ دی جاتی ہے۔ دوسری وہ ہوتی ہے جو نئے مرغزاروں کی تلاش میں خود اختیاری ہوتی ہے۔ ایک طرف وہ سماجی اقدار ہوتی ہیں جو باہمی اشتراک اور یگانگت کے رشتوں کی تشکیل کرتی ہیں۔ دوسری طرف تنگ نظری وہ مظاہر پیدا کرتی ہے جو محدود دائروں پر عمل پذیر ہونے کے باوجود بالآخر مخاصمانہ سماجی رد عمل اور نزاع کی صورت اختیار کر لیتے ہیں با حقوق اکثریت اور حقوق سے محروم اقلیت کا ٹکراؤ اور فسادات (چاہے وہ مذہبی ہوں یا سیاسی یا فرقہ وارانہ) جس نوعیت کے بھی ہوں عام طور پر بنیادی اقتصادی ناہمواریوں کے کارن ہی ہوتے ہیں۔ سماج دشمن افراد و طبقے اور سیاسی عناصر، قبائلی وفاداریوں کے ذریعہ غارت گری اور قتل وخون کو منظم کاروبار کا روپ دے دیتے ہیں اور اپنے غیر انسانی مفادات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رواں صدی میں ہم نے --- یہ سب پوری دنیا میں ہوتے ہوئے --- اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہجرتیں چاہے وہ جبری ہوں یا اختیاری یا پھر دیہات سے آبادیوں کا شہروں میں انتقال، ان کے باعث انتہائی نوعیت کے تناؤ کی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس صورت حال اور اس سے متعلقہ معاملات کو بھی بہت سے ناول نگاروں نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ جن میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبدالصمد، ظفر پیامی، عبداللہ حسینی، جوگندر پال، جتندر بلو، پیغام آفاقی، ہرچرن چاولہ، انور خان، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی اور الیاس احمد گدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

وہ گاؤں جسے پریم چند نے اپنے ناولوں میں پیش کیا تھا بہت دن پہلے اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ جو رہا سہا تھا وہ بھی مواصلات اور میڈیا کی [illegible] کے باوجود) مزید بگڑ گیا ہے۔ گاؤں چاہے وہ غلام [illegible] کا ہو یا گیان سنگھ شاطر کا۔ اپنی سادگی، معصومیت، مخصوص انفرادیت [illegible] برقرار رکھنے کی کوشش میں تیزی سے شہری ماحول [illegible] دیہات اور شہر کی دوئی اور باہمی ترسیل کا بحران [illegible] گیان سنگھ شاطر کے ناولوں کا موضوع بن کر سامنے آیا ہے۔

حال کے برسوں میں کچھ ایسے اہم اردو ناول بھی منظر عام پر آئے ہیں جو اقلیتوں اور استحصال زدہ لوگوں کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ ناول بہ حد تفصیل کے ناول ہیں اور ان مردوں عورتوں کے لئے عام طور پر [illegible] واضح راہ نہیں سجھاتے جنہیں وہ اپنے ناولوں میں پیش کرتے ہیں۔ عبدالصمد کے ناول 'دو گز زمین'، خوابوں کا سویرا' اور مشرف عالم ذوقی کے ناول 'بیان' میں کہیں کہیں روشنی کی کرن نظر آتی ہے لیکن ایسی روشن بھی نہیں کہ تاریکی پر غالب آ سکے۔

اگرچہ ہمارا سماج کھلی آزادی کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن ہم بہ تدریج [illegible] جکڑبندیوں سے باہر آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پچھلے ہی صدیوں پرانے اخلاقی اصول ہمارے یہاں کے مردوں عورتوں میں ایک ہی [illegible] پوری طرح سے درہم برہم نہ ہوتے ہوں لیکن ایک قسم کا اخلاقی بحران تیزی سے ہم پر حاوی ہو تا جا رہا ہے۔ وہ سفر جو قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، ممتاز مفتی نے "آگ کا دریا" بستی" اور "علی پور کا ایلی" سے شروع کیا تھا وہ "گردش رنگ چمن، چاندنی بیگم" (قرۃ العین حیدر) تذکرہ، اور آگے سمندر ہے۔ (انتظار حسین) الکھ نگری (ممتاز مفتی) بہاؤ اور راکھ (مستنصر حسین تارڑ) گیان سنگھ شاطر (گیان سنگھ شاطر) سفر ہے شرط (ریوتی سرن شرما) ندی (شموئل احمد) کی وساطت سے اخلاقی دریافت کے نئے سفر کے ساتھ آکر مل گیا ہے۔ جہاں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین انسانی رشتوں کے زیر و بم میں محفوظ شائستہ حدوں کے اندر رہتے ہیں، ممتاز مفتی، گیان سنگھ شاطر، مستنصر حسین تارڑ، ریوتی سرن شرما مرد اور عورت کے رشتے کے تناظر میں [illegible] اور زیادہ کھلا اور آزاد رویہ رکھتے ہیں۔

عصری اردو ناول نگار اپنی تخلیقات میں [illegible] حقیقت پسندانہ انداز میں مستحکم ثقافتی اداروں کے زوال و انتشار کو بھی [illegible] پیش کرتے ہیں۔ وہ گہری اداسی اور افسردگی کے عالم میں ماضی کی جانب [illegible] عبدالصمد کے ناول خوابوں کا سویرا کے اختتامیہ کے انداز میں [illegible] ہیں جو سلسلہ حالات سے باہر نہیں ہے۔ [illegible] کوئی پہلو ہمیں ملتا ہے تو وہ یا تو سہدیو اور مشتویہ کی موجودگی [illegible] کے ناول 'فائر ایریا' میں ہے یا پھر سید محمد اشرف کے [illegible] یہ خوش آئند امکان ہے۔

ہمارے دور کے [illegible]

عہد کو [illegible] کے لئے انہوں نے تاریخ سے کسب نور کیا ہے لیکن صرف قاضی عبدالستار [illegible] ہیں جنہوں نے تخلیقی فکشن کے میدان میں تاریخی ناول کو [illegible] کیا ہے۔ "داراشکوہ، صلاح الدین ایوبی، خالد بن ولید" ان کے ناول [illegible] ہیں [illegible] انسانی صورت حال کو ماضی و حال کے تاریخی منظر نامے میں [illegible] کرتے ہیں۔

[illegible] کی [illegible] تانیثی ادب یا تانیثی تحریک نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ راجندر سنگھ بیدی بنیادی طور پر اگرچہ افسانہ نگار تھے لیکن انہوں نے اپنے مشہور ناول (یا ناولٹ) [illegible] روایت، دیومالا اور اساسی حیاتیات کی مدد سے لسانی تجسیم کی نمائندہ ایک ایسی عورت کا کردار تخلیق کیا ہے جو اپنے جاری و ساری تسلسل میں اپنے اندر بیک وقت ایک کنواری، ہوس کی شکار ایک مصیبت زدہ، ایک دلہن اور بالآخر معنوی طور پر ایک مکمل عورت۔ ایک ماں لئے ہوئے ہے۔ قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو کے یہاں مختلف قسم کے مرد اور عورت کردار ہیں۔ کہیں کوئی بھیڑیا ہے، کہیں کوئی ہوس کی پتلی ہے۔ لیکن وہ شاذ و نادر ہی کھلی جنسی بے راہ روی کا ذکر کرتی ہیں۔ یہ صرف عصمت چغتائی ہی ہے جو اپنے افسانے، لحاف میں دو عورتوں کی ہم جنسیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ لیکن وہ بھی اپنے ناولوں یا ناولٹوں میں آزاد لیکن محدود محفوظ جنسی حدوں میں ہی اپنے کرداروں کو پیش کرتی ہیں۔ ساجدہ زیدی نے البتہ اپنے ناول 'موج ہوا پیچاں" میں نسبتاً زیادہ کھلے انداز میں غیر روایتی جنسی رشتوں کی عکاسی کی ہے۔ ایک عورت جو اپنی راہ خود تلاش کرنا چاہتی ہے۔ بطور عورت اپنی فردیت پر اصرار کرتی ہے۔ اور اپنی آزادانہ لسانی پہچان کی دعوے دار ہے۔ ایسی عورت کی مثال اردو فکشن میں اگرچہ دیکھنے کو کم ملتی ہے۔ لیکن شموئل احمد اور ریوتی سرن شرما نے بہر حال اپنے ناولوں ندی اور سفر ہے منزل میں ایسی مثالیں پیش کی ہیں۔ 'ندی' کی عورت اپنی پہچان شادی کے بندھن سے آزاد ہونے کے بعد حاصل کرتی ہے اس کے برعکس ریوتی سرن شرما کے ناول کی عورت رشتۂ ازدواج کی حدود کے اندر رہنے کے باوجود اپنی انفرادی پہچان کا حق مانگتی ہے۔

ایلون ٹافلر کے مطابق عہد حاضر ہر لحظہ تیز تر رفتار سے رونما ہوتی ہوئی تبدیلیوں کا دور ہے۔ نتیجے کے طور پر سب سے بڑی اکائیاں ٹوٹ پھوٹ کر چھوٹی اکائیوں کا روپ لے رہی ہیں۔ قوم، ملک، ادارہ ان میں سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس کی ایک عصری مثال [illegible] برصغیر ہند کی تقسیم تھی۔ جس کے نتیجے کے طور پر ہندوستان اور پاکستان الگ ملکوں کے طور پر وجود میں آگئے۔ دوسری ایسی مثال پرانی سوویت یونین کے انتشار کی ہے۔ [illegible] اور کچھ دیگر ممالک بھی اسی نوع کی دیگر مثالیں ہیں۔ تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان کی جغرافیائی تقسیم کے بعد بھی [illegible] دونوں ملکوں میں ہنوز سرگرم [illegible] اب ان کے [illegible] ہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ آبادیوں کا انتقال بھی اب کسی خاص ملک یا علاقے تک محدود نہیں رہا۔ چھٹ پٹ قتل کے واقعات اب اجتماعی قتل و غارت میں ڈھل چکے ہیں۔ لاتعداد لوگ اپنے صدیوں پرانے گھروں میں بے گھر ہو چکے ہیں۔ سیاسی دہشت گردی، بنیاد پرستی اور خود غرضانہ مفادات روز مرہ کا معمول بن گئے ہیں۔ تمام رشتے یا زہر آلود ہو گئے ہیں یا بری طرح مجروح ہو چکے ہیں۔ یہ مسلسل بحران کی صورت حال ہے۔ ہم سب ایک سیل بے پایاں کی زد میں آگئے ہیں۔ اس سیلاب کی غارت گری میں ہمارے درمیان امید، حوصلے اور تحفظ کے نقطہ نظر سے صرف چند ہی گروپ، ادارے یا بامعنی افراد جزیروں کی طرح باقی رہ گئے ہیں جو ہمیں قائم و برقرار رہنے کی قوت عطا کر رہے ہیں۔ اردو کے ادیبوں، شاعروں اور ناول نگاروں نے بھی دیگر زبانوں کے اپنے ساتھیوں کی طرح ہمیں ہماری صورت حال سے باخبر رکھنے اور بقا کی خاطر ہمارے اندر کے سسی فس (Sisyphus) کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

بیسویں صدی کے اردو ناول نگاروں--- نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی حسین رسوا، پریم چند، عزیز احمد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، بلونت سنگھ، شوکت صدیقی، ممتاز مفتی، بانو قدسیہ، عبداللہ حسینی، مستنصر حسین تارڑ، جوگندر پال، عبدالصمد، گیان سنگھ شاطر، الیاس احمد گدی، سید محمد اشرف کے نام خوب تر پیش کش اور معیار حصول کی روشن مثالیں ہیں۔ ہم ان کے کارناموں کی داد دیتے ہیں اور ان کے تخلیق کردہ--- خوجی، آزاد، حاجی بغلول، امراؤ جان ادا، ہوری، دھنیا، گوتم نیلمبر، رخشندہ، چمپا، علی پور کا ایلی، بھائیا جی جیسے یادگار کرداروں کا جشن مناتے ہیں۔ لیکن وہ بڑا اور وسیع الآفاق رزمیہ ناول جو پورے انسانی منظر نامے کو اس کی الجھنوں، نیرنگیوں اور امکانات کو دستوو سکی کے میتیا (Mitya) یا نکوس کزنتزاکی کے زوربا (Zorba) کی طرح اپنے بہاؤ میں سمیٹ لے دائرہ امکان میں تو بہر حال ہے لیکن فی الحال معرض وجود میں نہیں آیا۔ ہم امید کرتے ہیں اور اس کا انتظار کرتے ہیں۔

☆☆☆

☆ 'آجکل' میں مضامین / تخلیقات بھیجتے ہوئے 'آجکل' کے معیار اور مزاج کا ضرور خیال رکھیں۔

☆ تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو کاپیاں لازماً ارسال کریں۔ کتاب کے ساتھ تبصرہ نہ بھیجیں۔

☆ ضروری نہیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع ہو۔ تقاضہ کر کے شرمندہ نہ کریں۔

☆ غیر طلبیدہ مضامین کی واپسی کے لئے مناسب ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال کریں۔

(ادارہ)

سرورالہدیٰ

ہم شاد عظیم آبادی کو کیوں پڑھیں؟

'شب خون' اگست۔ ستمبر ۲۰۰۰ء کے شمارے میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون "شاد عظیم آبادی" شائع ہوا ہے۔ واضح رہے کہ یہ مضمون "شاد عظیم آبادی سیمینار" کی افتتاحی تقریر ہے۔ اپنی اس گفتگو میں شمس الرحمٰن فاروقی نے شاد کی غزل کے سلسلے میں جو سوالات اٹھائے ہیں ان کی طرف ہماری توجہ بہت کم رہی ہے۔ یہ سوالات اتنے اہم اور بنیادی ہیں کہ ان سے صرف نظر کر کے کسی شاعر کی اہمیت اور انفرادیت واضح نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ شاد عظیم آبادی پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود بھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ کچھ لکھنے والوں نے اپنا سارا زور اس بات پر صرف کر دیا ہے کہ غزل کو زوال سے نکالنے میں شاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لہٰذا جو سہرا حسرت موہانی کے سر باندھا جاتا ہے وہ شاد عظیم آبادی کے سر جانا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل جن آزمائشوں سے گزر رہی تھی شاد نے غزل کو ان سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی۔ کلیم الدین احمد نے اردو شاعری کی تثلیث میر، غالب اور شاد سے قائم کی ہے۔ شاد کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں بعض بھڑکتے اور بولتے ہوئے جملے ضرور سامنے آئے مگر اس عظمت کی بنیادیں کیا ہیں ان کی نشاندہی کی سنجیدہ کوشش بہت کم تحریروں میں نظر آتی ہے۔ شاد عظیم آبادی کے وہ اشعار جو زبان زد خاص و عام ہیں وہی اشعار شاد سے متعلق مضامین میں تکرار سے ملتے ہیں۔ ان اشعار کے حوالے سے کہا گیا کہ شاد کی مقبولیت میں تجربے کی مانوسیت کا بڑا دخل ہے۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ شاد کے یہاں روزمرہ کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ شاد کی غزل کی کیفیات بھی زیر بحث آئیں۔ یہ تمام خوبیاں بہت سے شعرا میں مشترک ہو سکتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شاد کو غزل کی تاریخ اور تہذیب کے حوالے سے پڑھا جائے۔ شاد نے غزل کو مشکل وقت میں سہارا دیا اس سے شاد کی تاریخی اہمیت ضرور سمجھ میں آتی ہے مگر اس سے شاد کی شاعرانہ عظمت کا بھید نہیں کھلتا۔ سوال یہ ہے کہ شاد نے غزل کی روایت سے کسب فیض کر کے اپنے لئے کون سی راہ پیدا کی؟ ظاہر ہے کہ شاد کی تخلیقی بصیرت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مضمون میں شاد عظیم آبادی میں لکھتے ہیں:

> "شاعر کی عظمت اس بات میں ہے کہ اس نے انسان کو سمجھنے، انسان اور کائنات کے بارے میں ہمارے علم میں اضافہ کرنے، دنیا کے بارے میں ہمارے احساسات اور علم میں گہرائی لانے کے سلسلے میں کیا کام کیا ہے؟ پھر یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ شاعر کس روایت، کس تہذیبی پس منظر اور کس تناظر میں ہمارے سامنے آتا ہے؟
>
> میں بڑے ادب سے کہنا چاہتا ہوں کہ شاد کا تصوف، شاد اور قومی یکجہتی، شاد اور تاریخ، شاد یہ شاد وہ وغیرہ سب باتیں بعد میں ہوں پہلے آپ شاد کی تاریخی اہمیت کو متعین کر لیں کہ شاد کیا کرنا چاہ رہے تھے؟ انہوں نے غزل کی تاریخ میں اردو غزل کی تاریخ میں جو کم از کم پانچ سو برس پرانی ہے کیا کارنامہ انجام دیا؟ دوسری بات یہ کہ شاد کس سلسلے کے شاعر ہیں؟
>
> شاد کے بارے میں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ انہیں گزرے ساٹھ سے اوپر برس ہوئے اور ان کی پیدائش کو ایک سو تیس سے اوپر سال گزرے تو وہ عہد گزشتہ کے آدمی ہیں اور آج ہم انہیں کس طرح پڑھیں کیوں پڑھیں؟"

شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ چند باتیں مطالعہ شاد کو با مقصد اور نتیجہ خیز بنا سکتی ہیں۔

شاد عظیم آبادی سے قبل اردو غزل غالب کے یہاں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ لیکن غالب کے بعد کا زمانہ غزل کے لئے آزمائشوں سے بھرا ہوا تھا۔ سرسید، حالی، محمد حسین آزاد وغیرہ کی کوششوں سے ادب کے افادی اور تعمیری پہلو پر زور دیا جانے لگا۔ موضوعاتی نظموں کا چلن عام ہوا۔ بدلے ہوئے حالات میں زبان کی صراحت وضاحت سے غزل کا علامتی نظام متاثر ہوتا ہے۔ غالب کے بعد اقبال نے بعض نئی علامتوں کو استعمال کر کے غزل کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا۔ اقبال کے نزدیک بھی ادب کا تعمیری پہلو اہم تھا مگر ان کی حد سے بڑھی ہوئی علمیت اور فلسفیانہ نظر نے ان کی شاعری کو عامیانہ پن سے بچائے رکھا۔ غالب اور اقبال کے درمیان جو وقفہ ہے اگر اس پر نظر ڈالی جائے تو داغ، امیر، جلال، اکبر، حالی اور شاد نظر آتے ہیں۔ کچھ اور شعرا بھی اس فہرست میں شامل کئے جا سکتے ہیں مگر اس عہد کی غزل کا منظر نامہ میں یہ شعرا زیادہ اہم ہیں۔ ادب کا عام طالب علم بھی ان شعرا کے نمایاں رنگ سے واقف ہے۔ غالب کے وقت میں ناسخ کا رنگ نہ صرف لکھنؤ میں مقبول تھا بلکہ باہر کے شعرا بھی ناسخ کے رنگ میں شعر کہہ رہے تھے۔ ناسخ کا زور زبان کی تراش خراش پر تھا۔ ان کے یہاں جذبے کی وہ فراوانی نہیں تھی جسے عام طور پر غزل کے لئے ضروری

۱۳۰۔ کاویری ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۶۷

تصور کیا جاتا ہے۔ غالب کے انتقال کے وقت شاد کی عمر ۲۳ سال تھی اور ناسخ کے انتقال کے وقت ۱۰ سال۔ لہٰذا شاد کی غزل کو اس عہد کے عام معیار و مذاق سے الگ کر کے بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شاد کی وہ غزلیں جو ناسخ کے رنگ میں ہیں وہ مشاعروں کی طرحوں پر کہی گئی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء میں عظیم آباد میں چھ طرحیں دی گئی تھیں۔ شاد نے اس مشاعرہ کی چار طرحوں میں دو دو غزلیں کہی تھیں۔

دن بھی تھا محو کا جو پر جوش ہوئی دھوپ
آپ چہار طرف دیکھ کے خاموش ہوئی دھوپ

کیوں ہو بہانہ جو نہ قضا سر سے پاؤں تک
ظالم ہیں آپ کی ہے ادا سر سے پاؤں تک

کٹ گئی شب، لو مبارک تم کو ہو تنویر صبح
اے موذن اے شفق اے آہ پر تاثیر صبح

کیا سر سے پاؤں تک یوں ہی روشن ہے آفتاب
یہ یوں کہ تیرے در پہ سر افگن ہے آفتاب

ڈاکٹر ذکی الحق نے زبان و ادب کے شاد عظیم آبادی نمبر میں کلام شاد اور تعین زمانہ کے عنوان سے شاد عظیم آبادی کی غزلوں کو زمانی اعتبار سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مشاعرے کی تاریخوں سے مدد لی ہے۔ ان مشاعروں کے طرحی مصرعوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاد کے وقت میں مشکل قوافی اور ردیف میں غزل کہنا شعری ضرورت میں شامل تھی۔ شاد نے ایسی بہت سی غزلیں انہیں طرحی مشاعروں کے لئے کہی ہیں، جن میں ناسخ کے رنگ کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاد عظیم آبادی نے وقتی ہنگامی ضرورت کے مدنظر ایسی غزلیں کہی ہوں گی لہٰذا شاد کی غزل کا اصل رنگ اسے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مگر سوال یہ ہے کہ ایسی غزلیں زبان و اظہار پر شاد عظیم آبادی کی بے پناہ قدرت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اب ان غزلوں میں اس فکر کو ڈھونڈنا بڑی زیادتی ہوگی، جو اس شعر میں موجود ہے:

دل اپنی طلب میں صادق تھا، گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کے ڈوب گیا

اس عہد کی غزل کے بارے میں دو باتیں عام طور پر کہی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ غزل غیر ضروری صناعی اور آرائش میں الجھ گئی تھی دوسرے یہ کہ غزل میں اخلاق، پستی اور رکیک انداز در آیا۔ جہاں تک جذبات کی سطحیت اور سوقیانہ پن کا سوال ہے تو اس کی مثالیں بعض اہم شعرا کے یہاں مل جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زندگی کے مختلف لمحات کی تصویریں ہیں۔ کبھی کوئی تصویر کسی عہد کی پہچان بن جاتی ہے۔ شاد عظیم آبادی کے یہاں بھی زندگی کی مختلف تصویریں موجود ہیں۔ مگر ان کی بنیادی تصویر وہ ہے جس کی طرف انہوں نے اپنے اس شعر میں اشارا کیا ہے۔

مرا دیوان تو یثرب ہے جہانِ پاکبازی کا
پڑھے کلمہ زبانِ فارس اس بانگِ حجازی کا

شاد کے نزدیک یقیناً فکر و خیال کی سطح پر پاکبازی اور طہارت کا اپنا ایک تصور تھا اور یہ تصور انہوں نے اپنے عہد کے عام شعری مذاق کی روشنی میں بھی قائم کیا ہوگا تاکہ وہ اپنی شاعری کو منفرد بنا سکیں۔

شاد عظیم آبادی کی قادرالکلامی کا یہ عالم ہے کہ ان کی شاعری میں فکر اور زبان کے کئی رنگ ملتے ہیں۔ انہیں ہر رنگ میں شعر کہنے کا سلیقہ ہے۔ وہ غزل کی پوری روایت سے آگاہ ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی نہ کوئی راہ ضرور تلاش کر لیتے ہیں۔ کلاسیکی شعریات کا پورا نظام شاد کے یہاں موجود ہے وہ لفظی معنوی رعایتوں سے غزل کو پر لطف بنا دیتے ہیں۔ بعض غزلوں میں قصیدے کی شان نظر آتی ہے۔

کچھ زیادہ ہوا دو قرن سے اب دوست کہ ہوں
لفظ کی طرح سے اقلیم سخن میں مشہور

دشت ایمن ہے مصر کے لئے صفحۂ شعر
روشنائی مری حل کرتی ہے خود معنیِ نور

عالم فکر میں ہوں بعث و فنا پر مختار
ہے صریرِ قلم فکر مرا نالۂ صور

حجر اسودِ تحسین ہر اک نقطہ ہے
ہر ورق ہے مرے دیوان کا بیت المعمور

شاد عظیم آبادی زبان کی پیچیدگی اور شکوہ کو قائم رکھنے پر قادر تھے۔ مگر ان کا مسئلہ صرف زبان دانی کا اظہار نہیں تھا۔ ان کی شاعری کی بنیادی فکر انسان، کائنات، خالق مخلوق، موت، قبر، تقدیر وغیرہ ہے۔ وہ ان مسائل پر طرح طرح سے اظہار خیال کرتے ہیں۔ وہ سوچنے کے عمل میں جو پہلو نکال لاتے ہیں وہ ان کی ذہنی و تخلیقی قوت کی مثال ہے۔

عدم سے آتے ہی رونے لگے تھے ہستی میں
ہم ابتدا ہی میں سمجھے تھے انتہا کی بات

وہ حسرتیں لحد میں ہیں دنیا تھی جن سے تنگ
وسعت کہاں کی آگئی دو گز زمین میں

دور تک بحر تعلق کا کنارا دیکھ آئے
کوئی کشتی نہیں اس پار اترنے کے لئے

دکھا کے صورت ظاہر مٹے حباب کی طرح
نمود کیا مری ہوتی کہ خود نما ہم تھے

بطن مادر سے تالحد اے دل
زندگی روح کی کہانی ہے

گزر ہر ایک بدونیک کا ہے بے پرشش
پتہ نہیں کہ یہ بزم خیال کس کی ہے

بلا کا نشہ ہستی نے دھند ڈال دیا
یہ چشم وہ ہے کہ جام جہاں نما ہوتی

یہ مضامین نئے نہیں ہیں۔ مگر شاد کے ان اشعار میں ایک ندرت اور جدت ضرور ہے۔ اب اس شعر پر غور کیجئے تو بظاہر سادہ سے شعر میں کیسی پتے کی بات کہہ دی گئی ہے۔

عدم سے آتے ہی رونے لگے تھے ہستی میں
ہم ابتدا ہی میں سمجھے تھے انتہا کی بات

شاد نے لفظ ابتدا اور انتہا کو کئی مقام پر استعمال کیا ہے اس سلسلے میں ان کا مشہور شعر ہے:

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

ان دو لفظوں سے شاد کی خاص دلچسپی زندگی کے بارے میں ان کے غور و فکر کو ظاہر کرتی ہے۔ بچہ دنیا میں آتے ہی ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ اس نئی زندگی کا ثبوت وہ رو کر دیتا ہے۔ گویا بچہ کا رونا ہی زندگی کی علامت ہے۔ یہ کوئی نئی اور گہری بات نہیں مگر دیکھئے کہ شاد نے اس عام بات کو زندگی کی محرومیوں اور اداسیوں کا استعارہ بنادیا ہے۔ بچہ کا رونا جو اس وقت زندگی کی علامت ہے وہ پوری زندگی پر محیط ہو جاتا ہے۔ لفظ انتہا سے ذہن صرف موت کی طرف نہیں جاتا بلکہ زندگی کے مشکل ترین سفر کا تصور ابھرتا ہے۔ جب رونا ہی مقدر ٹھہرا تو اس کی شروعات بھی دنیا میں آتے ہی ہو جانی چاہئے۔ بچہ کا رونا شعوری عمل نہیں بلکہ فطری عمل ہے۔ شاعر اس رونے میں زندگی کا شعور اور ادراک دیکھ لیتا ہے۔ شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ہم ابتدا ہی کو انتہا سمجھ بیٹھے۔ یہ شعر جدید معاشرے میں زیادہ بامعنی معلوم ہوتا ہے۔ آج بچوں کی پیشانی پر سوچ اور فکر کی جو ریکھائیں ہوتی ہیں وہ کسی لمبی عمر کا پتہ دیتی ہیں۔ شاد کا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے عام معاملات میں کوئی نیا پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں۔

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

مردے کو چھپا کر لے جانا تہذیب میں شامل ہے مگر شاد اس تہذیب کو کسی اور نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو انسان کاروبار زندگی میں مصروف تھا اس کی اس سے بڑی ذلت کیا ہوگی کہ اسے کاروبار زندگی سے محروم کر دیا جائے۔ اس لئے ایک ذلیل انسان کی سزا یہ ہے کہ اس کو پردے میں لحد تک لے جانا چاہئے۔ جس طرح کوئی چور اپنا منہ چھپا کر بھاگتا ہے۔ "بھری محفل" سے ظاہر ہے دنیا مراد ہے دنیا سے کیوں اٹھالیا گیا اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ اچھے شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی متعین فکر کی طرف نہیں لے جاتا۔ شعر میں جو غصہ اور احتجاج ہے وہ بار بار پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر لفظ 'اٹھوایا' شعر میں زور پیدا کرتا ہے۔ شعر کو پڑھ کر زندگی کی ایک بھرپور تصویر ابھرتی ہے جیسے بھری محفل سے کسی شخص کو کہا جائے کہ چلو نکلو یہاں سے۔ شاد عظیم آبادی کی غزل کے بارے میں یہ پوچھا جائے کہ اس کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے تو ایک جملے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ زندگی اور کائنات کے بارے میں غور و فکر کرنا، اب اس کی اتنی جہتیں ہیں کہ ہر جہت کا بیان اس مضمون میں مشکل ہے۔ اس غور و فکر کے عمل میں انہوں نے کسی اصول و ضابطے کو بھی مشعل راہ بنایا ہے اور ساتھ ہی کھلی نظروں سے بھی چیزوں کو دیکھا ہے۔ ان کی شاعری میں تصوف کے عناصر کی تلاش ضرور کی جانی چاہئے مگر شاد کے یہاں حیات و کائنات کے بارے میں اور جو کچھ ملتا ہے وہ تصوف سے میل نہیں کھاتا۔ شاد کس طرح سوچتے ہیں؟ ان کے یہاں زبان کی باریکیاں کتنی ہیں؟ وہ ہمارے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتے ہیں یا نہیں؟ ان حوالوں سے جب ہم شاد کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک خوشگوار تجربے کا احساس ہوتا ہے۔

چھپالے گا کسی دن عرش تک کو اپنے دامن میں
دکھادے گا تماشہ پھیل کر مشت غبار اپنا

اس شعر میں انسانی عظمت کی طرف اشارا ہے۔ مشت غبار، مٹھی بھر دھول اور مردہ انسان کی خاک کو کہتے ہیں۔ مشت غبار بظاہر حقیر سی شئے ہے بہت سے شعرا نے اس کو اسی طور پر استعمال کیا ہے مگر شاد کے اس شعر میں مشت غبار انسان کی مخفی قوتوں کا استعارا بن جاتا ہے۔ آج انسان ترقیات کی اعلیٰ ترین منزل ... شاد کے اس شعر کی معنویت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ عرش چونکہ ... ہے اور عرش تک رسائی ممکن نہیں۔ لہٰذا عرش سے مرو زندگی کی ... ہے کرنا باقی ہے۔ شاد انسان کی مخفی قوتوں سے آگاہ ہیں اس لئے وہ یہ کہتے ہیں کہ عرش تک کو مشت غبار اپنے دامن میں چھپالے گا۔ مشت غبار سے مردہ انسان کی خاک مراد لی جائے تو شعر میں معنی کا یہ پہلو بھی موجود ہے کہ زندگی میں اگر ... نہیں ہو سکیں تو مرنے کے بعد اس کی خاک وہاں تک پہنچ جائے گی۔ مشت غبار دل بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ دل کو مٹھی کا ہم شکل کہا جاتا ہے۔ عرش خدا کی وسعت و عظمت کا ایک علامتی مظہر ہے اور خدا کی ذات وراء الوریٰ ہے مگر خدا کی ذات اگر کہیں سما سکتی ہے تو وہ انسان کا دل ہے۔ شاد ایک شعر میں وسعت اور تماشہ کا ذکر کرتے ہیں۔

ہر بن مو سے مرے وسعت عالم ہے عیاں
اک تماشہ ہے خود اپنے لئے عالم اپنا

پہلے شعر میں مشت غبار کی ترکیب سے ذہن کئی پہلوؤں کی طرف جاتا ہے مگر اس شعر میں "بن مو" نے شعر کو بڑی حد تک ذاتی اور انفرادی بنادیا ہے۔ انسان جب زندگی کے مختلف تماشوں کو اپنی ذات کا حصہ بنالیتا ہے تو ان تماشوں کے جلو میں وہ اتنا بے خود اور مست ہو جاتا ہے کہ پھر وہ کسی اور کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ گویا دنیا کے سارے تماشے اس کی ذات کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس شعر کا رشتہ تصوف سے بھی قائم کیا جاسکتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ ہمارے اندر ہے۔ اپنی ذات کی طرف مراجعت اور ذات کے صحرا میں پناہ لینے کی خواہش جدید شاعری کا اہم موضوع رہی ہے۔ اب اس بحث کی یہاں پر گنجائش نہیں ہے کہ شاد کے یہاں اور جدید شاعری میں وجودیت کس راستے سے آئی تھی۔

اسی چوک نے ہمیں کھو دیا کہیں شاد کس سے یہ ماجرا
کئی عمر جن کی تلاش میں وہ ہمیں تھے ہم سے جدا نہ تھے

حقیقت کی تلاش میں انسان ٹھوکریں کھاتا ہے۔ تصور اسے کسی ایک مقام پر جمنے نہیں دیتا۔ عقل و شعور دل میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں۔ شاعر تصور اور عقل کی بھول بھلیوں سے خوف زدہ ہے۔ تصور قطرہ کو دریا اور دریا کو قطرہ بنا کر دکھاتا ہے گویا تصور دھوکا اور فریب ہے، اس لئے شاد کہتے ہیں:

کبھی دھوکے میں تصور کے نہ آنا ہرگز
نقش آنکھوں کو دکھاتا ہے مجسم اپنا

شاعر نے نقش اور مجسم کو استعمال کرکے تضاد پیدا کیا ہے۔ ان دو لفظوں کو کسی خاص فکر کے حصار میں بند نہیں کیا جاسکتا۔ تصور کسی شے کی حقیقت سے ہمیں دور کر دیتا ہے۔ اب یہ شئے کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ اس شعر کے پیچھے تصوف کا فلسفہ بھی ہو سکتا ہے اس لئے کہ صوفیا کی تعلیم رہی ہے کہ عقل اور تصور کو مغلوب کئے بغیر عشق کی منزلیں طے نہیں ہو سکتیں۔ لیکن اس کو اگر عام زندگی کے تناظر میں دیکھیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والا انسان ہمیشہ دھوکے میں رہتا ہے۔ اس لئے کہ حقیقت کی دنیا اس سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ ثانی مصرعہ سے دوسرا مفہوم یہ بھی نکلتا ہے کہ تصور نقش کو مجسم ہی نہیں دکھاتا بلکہ مجسم کو بھی نقش بنا کر دکھاتا ہے۔ گویا دونوں صورتوں میں تصور ہمیں حقیقت سے دور کر دیتا ہے۔ ایک دوسرے

شعر میں شاعر نے تصور کی جگہ "وہم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

عقل کیا وہم کے بھی پاؤں لرز جاتے ہیں
ایک عالم سے ہے گزرا ہوا عالم اپنا

عقل کا لرزہ براندام ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ مگر وہم کے پاؤں کا لرز جانا حیرت ناک ضرور ہے۔ وہم جو گمان اور خیال کے نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے اس کے پاؤں اگر لرز جاتے ہیں تو یقیناً راستے اور سفر کی دشواری اور خطرات کی طرف اشارا ہے۔ شاعر کائنات میں پھیلی ہوئی مختلف اشیا اور حقائق کی طرف اشارا کرتا ہے کہ ان کی ذات ان سب کا تجربہ اور ادراک رکھتی ہے۔ اس لئے جو کچھ نظر آرہا ہے اس کی حقیقت اس پر آشکار ہے۔ شعر میں دو جگہ عالم عالم حسن پیدا کر رہا ہے۔ ایک عالم سے دنیا مراد ہے اور دوسرا "عالم" شاعر کی اپنی ذات ہے۔ دوسرے "عالم" سے وقت اور زمانہ کا مطلب بھی نکلتا ہے یعنی شاعر حالت زمانہ کی طرف اشارا کرتا ہے کہ موجودہ وقت اور زمانہ بہت سارے زمانوں سے گزرا ہے۔ شاد نے رونے کے مضمون کو اس شعر میں دیکھئے کس طرح باندھا ہے۔

فلک کو دیکھ کے اس چشم تر کو پھر دیکھو
ابل ابل کے کہاں تک یہ آب جو نہ گئی

شعر میں رونے کا مضمون تو ہے لیکن اس کی طرف اشارا صرف چشم تر کے فقرے سے کیا گیا ہے۔ آنسو کے بہنے کا کہیں ذکر نہیں ہے بلکہ آنسو کے ابلنے کا ذکر ہے۔ آنسو کا ابلنا سوزش دل کی وجہ سے ہے۔ ظاہر ہے کہ جب آنسو ابلیں گے تو وہ بادل کی شکل میں آسمان کی طرف جائیں گے۔ اسی لئے شاعر نے آسمان یا بادل کو غبار بھی کہا ہے۔ وہ آنسو ہی ہیں جو بادل معلوم ہوتے ہیں۔ آب جو سے چشم تر مراد ہے۔ مگر چشم تر ندی نالے کو بھی کہتے ہیں۔ اس طرح اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ آنکھ سے جو آنسو بہہ رہے ہیں وہ ندی بن گئے ہیں۔ ندی جو آنسوؤں سے بہہ رہی ہے اس کا پانی یعنی آنسو بھاپ بن کر آسمان کی طرف جاتے ہیں جو بادل بن کر پانی برساتے ہیں۔ چشم کے ساتھ ابلنا بھی رعایت کی اچھی مثال ہے۔ میر نے ذرا فرق سے کہا ہے:

تم جسے آسمان کہتے ہو
وہ دلوں کا غبار ہے شاید

شاد کے چند اشعار اور دیکھیں جن میں کلاسیکی شاعری کا پورا رچاؤ موجود ہے:

مخفی تھا دل میں حیرت و حسرت کا سارا راز
آئینہ کردیا مرے سنگ مزار نے

دل کو آئینہ بھی کہتے ہیں اس میں دل اور آئینہ کی رعایت بھی موجود ہے۔ دل کو سنگ بھی کہا جاتا ہے اور سنگ سے ہی آئینہ بنتا ہے۔ اور سنگ سے ہی آئینہ ٹوٹ جاتا ہے۔ راز دل میں ہوتا ہے اس لئے راز کو آئینہ کر دینا بھی خوب ہے۔ دل کو آرزوؤں کا مدفن بھی کہتے ہیں۔ حسرت کے لئے دل اور حیرت کے لئے آئینہ برجستہ اور برمحل ہے۔

خامہ فکر ہے، نقاش ازل کا شاگرد
ہے ہر اک حرف مرا دائرۂ چہرۂ نور

خامہ فکر سے شاعر کا قلم مراد ہے۔ شاعر کو تلمیذ الرحمٰن بھی کہتے ہیں اس لحاظ سے شاعر خود کو نقاش ازل کا شاگرد بتاتا ہے۔ نقاش ازل خدا کی ذات ہے۔ جو نور ہی نور ہے۔ اس طرح نقاش ازل اور نور کی رعایت بھی پر لطف ہے پھر نقاش، خامہ، حرف، چہرہ میں مراۃ النظیر کی صفت موجود ہے۔

موج فنا مٹائے گی نام و نشاں وجود کا
مثل حباب اگر کہیں شوق ہوا نمود کا

اس شعر میں انسانی زندگی کی بے ثباتی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ میر کا مشہور شعر ہے:

اپنی ہستی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

شاد کے شعر میں لفظی رعایتیں شعر کے حسن میں اضافہ کر رہی ہیں اور شعر تمثیلی انداز اختیار کرلیتا ہے۔ موج اور حباب کا رشتہ بھی خوب ہے۔ وجود اور فنا میں صنعت تضاد ہے۔ نام و نشاں اور وجود میں بھی گہرا رشتہ ہے۔ پھر نام و نمود کی رعایت بھی ظاہر ہے۔ فنا، مٹا، نام و نشاں مٹا دینا یہ تمام الفاظ شعر میں ایک معنیاتی نظام قائم کرتے ہیں۔ ان چند اشعار کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ شاد کی غزل میں کلاسیکی شاعری کا پورا نظام موجود ہے۔ اور ان کی غزلوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کلاسیکی شاعری کا شعور رکھنا بہت ضروری ہے۔ لہٰذا شاد عظیم آبادی کے نزدیک غزل کا مطلب سادہ بیانی نہیں بلکہ گفتگو کا پر پیچ اور تہہ دار ہونا بھی تھا۔ اس طرح کے تمام اشعار میں تجربے کی مانوسیت وغیرہ کی تلاش بے سود ہوگی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ شاد کے ایسے اشعار کے مطالعہ کے بغیر شاد شناسی کا مرحلہ طے نہیں ہو سکتا۔

شاد کی فکر انگیز شاعری فلسفہ بن پاتی ہے یا نہیں اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر شاد کی شاعری جس تفکر کا پتہ دیتی ہے وہ کسی معمولی ذہن کے بس کی بات نہیں ہے۔ شاد ان معنوں میں فلسفی شاعر نہ ہوں جن معنوں میں اقبال کو فلسفی شاعر کہتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شاد کی فکر میں جو گہرائی اور انفرادیت ہے وہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ہی نہیں بلکہ اردو غزل کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ شاد کی شاعری اس مفروضے کو بھی جھٹلاتی ہے کہ شاد کے عہد میں مجموعی اعتبار سے غزل ابتذال کا شکار تھی اور کوئی غزل کے گرتے معیار کو سنبھالنے والا نہیں تھا۔ شاد کے وہ اشعار جو کسی خاص نظریہ سے وابستہ ہیں ان میں بھی ایسی نغمگی کیفیت اور دل آسائی موجود ہے:

ترے یہاں میں جہاں بٹھا سر عرش روئے زمیں سہی
ہمیں بیٹھ رہنے سے کام ہے کوئی جا نہیں تو نہیں سہی
صف اولیں تو ہے خاص صف وہاں پاؤں جا یہ کہاں شرف
صف آخریں سے بھی دور تر جو اشارا ہو تو وہیں سہی
در میکدہ کے شگاف سے تجھے جھانک لیں، یہی تھی ہوس
یہ نہ ہو تو پھر در صومعہ جو قریب ہو تو وہیں سہی

گفتگو کا یہ انداز یہ بہاؤ اور نغمگی شاد کی غزل کا امتیازی پہلو ہے۔ اس میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ گرچہ صوفیانہ اور عارفانہ ہیں مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں زبان و بیان کی لطافت اور چاشنی نہیں۔ اس دور کو سامنے رکھ کر ان غزلوں کو پڑھئے تو ایسا لگتا ہے کہ سوکھے ہوئے موسم میں کوئی پتہ ہرا ہو رہا ہے۔

شاد نے خدا اور رسول کے تعلق سے ایک غزل میں جو مکالماتی حسن پیدا کیا ہے دوسرے شاعر کے یہاں مشکل سے ہی مل پائے گا۔

اپنے گدا کو خود وہ پکارے اٹھ مرے کالی کملی والے
اٹھ مرے عاشق اٹھ مرے پیارے اٹھ مرے کالی کملی والے
چاند کی رنگت زرد ہے پیارے دیکھ ہوا کو سرد ہے پیارے
بام فلک پر کم ہیں ستارے اٹھ مرے کالی کملی والے
دل کو ہے میرے تجھ سے محبت دے نہ زیادہ جان کو کلفت
بیٹھ نہ ہردم آس مارے اٹھ مرے کالی کملی والے
رات چلی ہے جوگن ہو کر اوس سے اپنے منہ کو دھو کر
لٹ چھٹکائے بال سنوارے اٹھ مرے کالی کملی والے

شاد عظیم آبادی کی اس غزل میں جو جمالیاتی احساس ہے وہ الفاظ کے انتخاب اور ی کی آہنگ کی وجہ سے ہے۔ یہ تمام الفاظ عام طور پر شعرا نے اپنے ہرجائی محبوب کے ؛ استعمال کیا ہے مگر شاد نے جس طرح ان الفاظ کو استعمال کیا ہے اس سے موضوع کے ار میں انفرادیت آگئی ہے۔ شاد نے جاگنے اور سونے کے مضمون کو اپنی کئی غزلوں میں یف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان غزلوں میں سونا غفلت اور کوتاہی کا اظہار ہے اور نا اپنی منزل اور اپنے مقصد کی حصولیابی میں لگ جانے کی علامت ہے۔ اس مقصدیت ، اظہار میں شاد نے غزل کی لطافت اور اس کی غنائیت کو بڑی خوبی سے قائم رکھا ہے۔ غزلیں تبلیغ اور پیغام رسانی کا احساس نہیں دلاتیں۔

خوف کی منزل راہ عدم ہے جاگ کے سوا ے نیند کے ماتے
پچھلا پہر ہے رات بھی کم ہے جاگ کے سوا ے نیند کے ماتے
دیکھ لے پیارے کھول کے آنکھیں پھیر کے کروٹ باتیں کچھ کر
مان لے کہنا تجھ کو قسم ہے، جاگ مسافر رات نہیں ہے

ـ دوسری غزل کے دو شعر دیکھئے:

نیلے نیلے رنگ کے اوپر بڑھتی ہی جاتی اب ہے سفیدی
ہوگئی رنگت زرد قمر کی چونک مسافر رات نہیں ہے
آنکھیں ملتے صحن چمن میں جھوم کے اٹھے نیند کے ماتے
دیکھ صبا نے آکے خبر کی چونک مسافر رات نہیں ہے

ان اشعار میں ایک پیغام ضرور ہے مگر یہ پیغام ہمارے ذہن کو کسی متعین فکر کی رف لے جاتی ہے۔ اس کے باوجود یہ اشعار پڑھنے والے کو اپنی ذات کے حوالے سے ل کرتے ہیں۔ لہٰذا "چونک مسافر رات نہیں ہے" یا "جاگ کے سوا ے نیند کے تے" سے کسی عبادت گزار کو عبادت کے لئے تیار کرنا ہی مراد نہیں۔

شاد عظیم آبادی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ ہوں نے زیادہ وقت اس حقیقت کو سمجھنے میں صرف کیا کہ انسان کے اس دنیا میں نے کا مقصد کیا ہے؟ اس کے اختیار میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ جسم اور روح کا رشتہ ا ہے؟ خالق کائنات کے ہوتے ہوئے اس کی مخلوق پریشان کیوں ہے؟ ان حقائق ے بارے میں سوچتے ہوئے انہوں نے بعض عقائد کا پاس و لحاظ بھی رکھا مگر جب ہوں نے عقائد سے اوپر اٹھ کر چیزوں کو دیکھا تو ان کے یہاں باغیانہ تیور پیدا گیا۔ شاد عظیم آبادی کی شاعری میں ایک گہری سوچ رکھنے والے شاعر کا ذہن جود ہے، جو مختلف سوالات میں الجھا ہوا ہے۔ اسے کسی کی ہدایت کی اگر ضرورت ے تو صرف اس لالچ میں کہ شاید کوئی جواب مل جائے، اس کے ذہن کی الجھنیں دور ہو جائیں۔ شاد کی شاعری میں حیات و کائنات کے بارے میں [illegible] اپنی جگہ پر ہے مگر جو غصہ اور جھنجھلاہٹ اور انانیت ہے وہ جدید شاعر سے زیادہ ہم آہنگ ہیں۔

شاد پھر تیری بلا سے بے سُری آواز ہے
زندگی بھر اپنا گانا کیوں نہ ہم گاتے رہیں
کیا غلط زعم ہے بعد اپنے کہے غم اپنا
ہاتھ قابو میں ہے کرلے ابھی ماتم اپنا
روک لیتا اس کمزور کلائی سے پہاڑ
شاد تقدیر اگر مشکل نہ کرتی میری
خیال سود و زیاں کی اکھیڑ دی بنیاد
بڑے پہاڑ کو رستے سے میں نے ٹال دیا

شاد عظیم آبادی کا ذہن ایک طرف حقائق کو وفادار بندے کی طرح قبول کر لیتا ہے وہیں دوسری طرف سوالیہ نشان بھی قائم کرتا ہے۔ ان کی کئی غزل میں ردیف "کیوں" ہے۔ شاد کے بہت سے اشعار میں اقبال کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اقبال کی فکر حیات و کائنات کے راز سے واقف ہونے کے لئے جس مقام سے گزری ہے شاد کے اشعار بھی ان ہی مقامات کا پتہ دیتے ہیں۔

ہم سے اگر ہوا نہ ضبط کیا کریں پھر بشر ہیں ہم
ہم پہ اگر نہ تھا وثوق ہم سے بیان راز کیوں
اشہب ناز تیز تک تیغ نگاہ بے غلاف
سب تو شکار ہیں ترے اس پر یہ ترکتاز کیوں
سکھاتی ہے ان آنکھوں کو جہاں زیر و زبر کرنا
غرض کیا کیا کرشمے گردش افلاک کرتی ہے
چشم سیاہ میں سرمہ دے زلف رسا میں شانہ کر
قتل جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر
دل صد پارہ سے نسبت نہیں زنہار اے بلبل
چمن میں جاکے عاشق چیتاں پھولوں کی گن آیا

شاد عظیم آبادی کی غزل اگر شوخی، چلبلے پن اور لفظوں کے کھیل تک محدود ہوتی تو شاید اتنے دن گزر جانے کے بعد وہ اتنی پرکشش اور بامعنی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ لفظوں کا کھیل اور شوخی بہت دور تک بدلتی ہوئی فکر اور احساس کا ساتھ نہیں دے سکتی ہے۔ شاد کی غزل کا دلکشی بھی کلاسیکی غزل سے مستعار ہے اس کے باوجود اس میں ایک رچاؤ ہے اور پڑھنے کے بعد ایک لذت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شاد کا انداز فکر اور اظہار کا طریقہ ہے۔ شاد کے زمانے میں شعرا غزل میں تاثیر اور دلکشی پیدا کرنے کی کوشش میں فلسفیانہ انداز اختیار کرتے تو کبھی موت، قبر وغیرہ کے مضامین سے سنجیدگی اور جذب و کیف پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر یہ تمام کوششیں شاد کے مقابلے میں بے رنگ اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کوششوں کا تعلق داخلی ضرورت سے نہیں تھا۔ شاد عظیم آبادی نے اپنی غزلوں میں فکر و احساس کی جو آگ بھر دی تھی وہ ان کی ذات میں روشن تھی۔

ایک مقام پر اس کا ذکر آچکا ہے کہ شاد کے یہاں ایسے اشعار بھی ہیں جو جبر کے

پورے شاد کے رنگ میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاد کی تصویر بناتے وقت ان تمام رنگوں کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ کئی غزلوں میں نظموں کا سا تسلسل اور پھیلاؤ ہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاد کی غزل کے فکری و لسانی رویے میں مختلف قوتیں کار فرما ہیں۔ شاد نے کلاسیکی رنگ و آہنگ کا احترام بھی باقی رکھا اور ساتھ ہی غزل کو یکسانیت اور خشکی سے نکال کر ایک رسیلا اور دلکش اسلوب عطا کیا۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام مباحث کے نتیجے میں شاد کی غزل کی آج کیا اہمیت ہے؟ شروع میں شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک قول پیش کیا ہے کہ "آج ہم شاد کو کیوں پڑھیں کیسے پڑھیں؟" ان کا جواب شاد کا ہر قاری اپنے اپنے طور پر دے سکتا ہے۔ مگر ایک بات جو بہت اہم ہے وہ یہ کہ شاد کے بہت سے اشعار آج ہماری ذہنی الجھنوں سے ہم آہنگ ہیں۔ آج کی مصروف ترین زندگی میں شاد کے اشعار کی اہمیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے آداب اس طرح پیش کرتی ہے کہ کسی طے شدہ ضابطے یا نظریے کی تبلیغ معلوم نہیں ہوتی۔ زندگی کے آداب کا یہ تصور سدا بہار اور سبھی کے لئے قابل قبول ہے۔ اس تصور کو اس بات سے غرض ہے کہ زندگی میں ایک حسن اور ترتیب باقی رہے۔ اب یہ قاری پر ہے کہ وہ حسن اور ترتیب کا کیا پیمانہ رکھتا ہے:

اب بھی اک عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

شاد کو پڑھتے ہوئے کھلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے یہاں گرچہ عقیدتوں کی مشابہت بھی ملتی ہیں مگر یہ عقیدتیں شاد کے ذہن پر ہر جگہ اثر انداز نہیں ہوتیں۔

یہ مانا خلق اشیا میں بھی کچھ کچھ ہاتھ ہے اپنا
خدا تب کون ہے اے شاد جب خود ہی خدا ہم ہیں

شاد کے بہت سے اشعار ہماری زندگی کے تجربے سے قریب ہیں۔ انہیں پڑھ کر مسرت اور بصیرت دونوں حاصل ہوتی ہے۔ جو لوگ نئی تہذیب کے پروردہ ہیں انہیں بھی شاد کا یہ شعر اچھا لگتا ہے۔

بڑھا کے ہاتھ الگ سے الگ سبو لیتے
یہ کیا مجال کہ ساقی کا ہاتھ چھو لیتے

۲۵ر اگست ۱۹۲۴ء کے ایک خط میں علامہ اقبال شاد عظیم آبادی کو لکھتے ہیں:

"جس تمدنی نظام نے آپ کو پیدا کیا وہ تو اب رخصت ہو چکا ہے لیکن آپ کی ہمہ گیر دماغی قابلیت اور اس کے گراں بہا نتائج اس ملک کو ہمیشہ یاد دلاتے رہیں گے کہ موجودہ نظام تمدن پرانے نظام کا نعم البدل نہیں ہے۔ کاش عظیم آباد قریب ہوتا اور مجھے آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا۔"

(زبان و ادب، شاد عظیم آبادی نمبر، مارچ ۱۹۹۱ء)

اقبال نے جس ہمہ گیر دماغی قابلیت کا ذکر کیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ شاد نے اردو غزل کی روایت کے مختلف رنگوں کے امتزاج سے ایک نئے اور انوکھے رنگ کی بنیاد ڈالی۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے بعد اردو غزل شاد عظیم آبادی کے یہاں ایک نئی شکل اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ شاد کی خدمات اور کارنامہ کو صحیح طور پر سراہا نہیں جاتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس میں ہمارے شعور کا دخل ہو؟

☆☆☆

جوگندر پال

نہیں، رحمٰن بابو

میں نے کہانی کو پہلی بار میلے میں دیکھا تھا رحمٰن بابو۔ وہ ننھی منی سی تھی اور بے تحاشہ روتے ہوئے اکیلی میلے میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھی اور اتنی بھیڑ بھاڑ میں اس کی طرف کوئی بھی دھیان نہیں دے رہا تھا۔

پہلے تو میں نے بھی اسے نظر انداز کرنا چاہا بابو، مگر معصوم کی بلکتی آواز مجھ سے جھیلی نہ گئی اور میں نے آگے بڑھ کر بے اختیار اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا--- تمہارا گھر کہاں ہے بے بی؟--- تمہارا نام؟--- تمہارے بابا؟--- ماں؟--- مگر منی سی جان کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

میں نے سوچا کہ اسے پولیس کے حوالے کر آؤں۔ مگر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے وہ میرے کندھوں کو اتنے زور سے تھامے ہوئے تھی کہ میں سر جھٹک کر اسے اپنے گھر لے آیا۔

ہاں، بابو، میں اب لکھتے لکھتے بہت بوڑھا ہو چکا ہوں مگر میری کہانی بدستور ننھی منی ہے اور ویسے ہی میرے آنگن میں کھیلتی رہتی ہے اور میں اور سب کچھ بھول کر اس کے کھیل، اس کی باتوں پر ریجھتا رہتا ہوں اور ریجھ ریجھ کر موت کے کنارے آ لگا ہوں۔

ہاں، بابو، جی تو نہیں چاہتا، مگر اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے کہ مرنے سے پہلے میں بھی اسے میلے میں چھوڑ آؤں؟---

۲۰۴۔ منداکنی انکلیو، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۹

قمر صدیقی



جب نام ترا...

(انور خان کی یاد میں)

بڑے شہر میں رہنے کے تجربے کو 'آڈن' نے بڑی عمر کی عورت کے ساتھ ملوث ہونے سے مشابہ قرار دیا تھا۔ "کہ جیسے دستِ شفقت ہو بڑی عمر کی محبوبہ کا" (اختر الایمان) یعنی شہر سے رہ و رسم آشنائی، شبانہ روز متنوع اور پختہ کار احساسات سے آگاہی۔ جسم و جاں کی ہلچل--- چہروں کا ہجوم--- جھلکیوں سے لے کر تسکین کے پہلے باب تک شہر آواز کی پرچھائیں معلوم پڑتا ہے۔ کیا کسی نے آواز کو بھی دیکھا ہے؟

انور خان کا ایک افسانہ "کوؤں سے ڈھکا آسمان" ہے۔ میں نے اس میں آواز کو دیکھا ہے، اس کی پرچھائیں کے ساتھ۔ پورے افسانے میں آواز ہی آواز ہے، اپنے پورے وجود کے ساتھ۔ یخ بستہ رات، پہلا آدمی، دوسرا آدمی، تیسرا اور چوتھا آدمی، گلابی صبح، ہنستا بچہ، شرماتی لڑکی، پھونس کا مکان، مٹھی بھر چاول، مچھلی کا شوربہ، روئی کی دلائی، کوؤں سے ڈھکا آسمان اور کہانی کے آخر میں کارپوریشن کی گاڑی، سڑک کا موڑ، شدید سردی کے باعث برہنہ اکڑے ہوئے چند جسم، ان کا گاڑی میں ڈالے جانا اور گاڑی کا چل دینا--- یعنی کہانی اندر کہانی۔ وہ ایسا ہی قصہ گو تھا، لوگ زمان و مکان سے بے پروا منہ پھاڑے بس سنتے جائیں۔ گویا وہ کسی نئی دنیا کا سیاح تھا۔ حالانکہ اس کی کہانیاں لفظاً اپنے اطراف کی، اپنے ماحول کی عکاس ہیں۔

"ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت" شہر کے کوسموپولیٹن کردار میں کیا مثبت ہے کیا منفی اس کی تاویلات کو دفتر درکار ہوگا۔ مگر جو حضرات اختصار سے کام لینا چاہتے ہوں انہیں انور خان کا افسانہ "فنکاری" ضرور پڑھنا چاہئے۔ حالانکہ باقر مہدی نے اسے Circular کہانی قرار دیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہی اس کہانی کا حسن ہے۔ ہر بار ہوٹل والا شیٹی چائے کے داموں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ہر بار ہوٹل میں مختلف چیئروں پر بیٹھنے والوں میں بدہمی پیدا ہوتی ہے اور ہر بار تھوڑی جدوجہد اور ہو ہلا کے بعد سب شانت ہو جاتا ہے۔ یہ کسی ایک شہر، ایک قصبہ یا ایک ملک کی بات نہیں، بلکہ پوری تیسری دنیا کا منظر نامہ کچھ ایسا ہی ہے۔ باقر صاحب نے اس کہانی پر گفتگو کرتے ہوئے آگے لکھا ہے کہ یہ ہندی فلموں کا خاص موضوع رہا ہے۔ لہٰذا میں بھی فلمی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ کیا زندگی کی بھی اپنی Locations نہیں ہوتی؟ جس کی مناسبت سے ہمارے واسطے اور وسیلے، معاشی کے طور طریقے، رہن سہن کے اسالیب، وقت گزاری کے مشاغل، دلچسپیاں اور مواقع، ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے حلقۂ عمل اور جانے کیا کیا چیزوں کے دائرہ کار کا انتخاب اور تعین ہوتا ہے۔

ایک سوال—— کیا وقت بھی کبھی بجھ سکتا ہے؟

ایک جواب—— پڑھیے انور خان کا افسانہ "فرار"

جب فیض صاحب اپنے نقرئی لہجے میں نغمہ ریز ہوتے ہیں کہ "اے ساکنانِ کوچہ دلدار دیکھنا" تو ہمارے تخیلات کی دنیا میں رنگ برنگی روشنیوں کا دریا بہنے لگتا ہے۔ چشم غزالاں کی زمرد جیسی چمک اور ہونٹوں کے اجالوں سے پوری طرح منور شہر جگ مگ جگ مگ کرنے لگتا ہے۔ مگر شہر سے واقفیت کا یہ نشہ بہت محدود ہے۔ شہر کے یہ امیجیز دراصل معلوماتِ عامہ کی Selective channeling کا نتیجہ ہیں کہ جس کے زیر اثر ہم شہر کے مختلف حصوں کے بارے میں اس طرح کی تاثراتی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ وگرنہ میری آنکھوں سے روز چیونٹیوں کی ایک قطار نکلتی ہے جو گلیوں، سڑکوں پر وقت کے مردہ جھینگر کو سوت سوت سرکاتی آگے اور آگے کی طرف بڑھتی جاتی ہے اور میرے اس تجربے میں انور خان میرے ہم سفر ہیں۔ دیکھئے افسانہ "شام رنگ" اور نسبتاً نظر انداز کی گئی کہانی "صداؤں بھرا آدمی"+ لمحہ لمحہ واہوتی زندگی کی سفاکیاں اور حقیقت کے محور میں گردش کرتا یہ تصور کہ "جو آدمی ایک دن میں کروڑپتی بنتا ہے، وہ ایک ہی دن میں فقیر بھی بن سکتا ہے۔"

شہر اور فلم کا تعلق بہت پرانا ہے۔ کچھ مخصوص اداکاروں اور رات دن کی چکا چوند سے پرے فلم انڈسٹری کو شہر کے دل کی دھڑکن بھی فرض کیا جاتا ہے اور شہر سے باہر شہر کا جو تصور لوگوں کے ذہن میں ہے اسمیں ان جادوگری کا طلسم بھی شامل ہے۔ لیکن جس طرح چاند اپنی تابناکی کے دنوں میں بھی صرف اپنے آدھے وجود کو ہی منور کرپاتا ہے۔ اسی طرح فلم سٹی کی مخصوص ضد "کہ شہر کو میری آنکھ سے دیکھو" کے باوجود بھی کبھی کبھار شہر کے تاریک گوشوں پر بھی فوکس پڑ جاتا ہے۔ ان تاریک گوشوں کے لئے بھی روشنی کا اہتمام ضروری ہے مگر پہلے یہ تو طے ہو جائے کہ یہاں

اردو چینل۔ ۳۱۲۱/۷، گیانن کالونی، گوونڈی، ممبئی۔ ۴۰۰۰۴۳

ضروری ہے اس کے لئے ہمیں فلم کے سنہری پردے سے ذرا کترا کر نکلنا ہوگا۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ شہر جہاں سے غائب ہے، آپ آگے بڑھیں گے شہر وہاں سے غائب ہوتا جائے گا۔ آپ آگے بڑھتے جائیں گے نقشے میں خالی جگہیں بھی بڑھتی جائیں گی۔ ہو سکتا ہے یہ محض مفروضہ ثابت ہو کہ جگہیں اور ان کا احساس زندگی اس وقت کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ مگر انور خان کے افسانوں میں زندگی اتنی پیچیدہ نہیں ہے بلکہ اس سے پیچیدہ تر ہے۔ افسانہ "جب بوڑھا فریم سے نکل گیا" اور اس کے علاوہ بھی دیگر کئی افسانے اس کی مثال ہیں۔ خاص طور سے "میونسپل پارک" اس میں تو ایک جہان دیگر آباد ہے۔ "جب بوڑھا فریم سے نکل گیا" میں ابتدا سے لے کر اختتام تک ہر گلی ہر موڑ پر انور خان شہر کی تاریکی پر فوکس کرتے نظر آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ میری ذاتی سمجھ کا معاملہ ہو مگر یہ افسانہ مجھے اسی حوالے سے پسند ہے۔

انور خان کے تخلیقی سفر کا پہلا پڑاؤ "راستے اور کھڑکیاں" ۱۹۷۶ء تھا، دوسرا پڑاؤ "فنکاری" ۱۹۸۴ء تھا اور آخری پڑاؤ "یاد بسیرے" تھا۔ اگر ان کہانیوں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور انہوں نے اس سفر میں کیا کھویا اور کیا پایا طرز کا فرسودہ چارٹ ترتیب دیا جائے تب بھی وہ اپنی حیثیت منوالیں گے۔ پہلے مجموعہ سے لے کر آخری مجموعہ تک انور خان کے یہاں کمزور موضوعات یا کمزور کہانیوں کی کمی نہیں ہے مگر انہوں نے ہمیشہ اپنے قلم سے اپنی فنکاری سے کمزور سے کمزور کہانی کو پہلے قابل مطالعہ (Readable) بنایا اس کے بعد اس میں کچھ ایسی آگ رکھ دی کہ ہم اسے ناکام کہانی نہیں کہہ سکتے۔

انور خان نے کہانیاں لکھیں اور کامیاب کہانیاں لکھیں مگر میرے نزدیک اس سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے پورے کیریئر میں تجربات کرتے رہے۔ بعض دفعہ انہیں کامیابیاں ملیں اور کئی بار وہ ناکام بھی ہوئے۔ لیکن کہانی کے ساتھ، اس کی ہیئت کے ساتھ، اس کے موضوعات کے ساتھ، نت نئے Treatment کرنے کی لگن ان کے اندر کبھی کم نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ بہت کم لکھتے تھے مگر یہ بات ان کے دوست ان کے (ادبی) ملنے جلنے والے اچھی طرح جانتے ہیں۔

انور خان سے پہلی ملاقات کا دن بھی عام دنوں جیسا ہی تھا۔ سڑک پر بے تحاشا ٹریفک کے باوجود اپنے روز کے دیکھے بھالے راستوں پر رواں دواں بسیں اور دیگر موٹر گاڑیاں، لوہے کی پٹریوں پر حسب معمول دوڑتی بھاگتی لوکل ٹرینیں، ہوٹلوں میں کھانے والوں کا ہجوم سڑکوں پر چلنے والوں کا اژدہام، ہر سنیچر کی طرح اس سنیچر کو بھی مکتبہ جامعہ پر ادیبوں، شاعروں کی چہل پہل تھی اور اسی چہل پہل میں ایک مسکراتا ہوا چہرہ انور خان کا بھی تھا۔ گو کہ میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی پھر بھی اس دن وہ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے تھے۔ مگر ایک عرصہ تک ان سے میرے تعلقات بس واجبی سے ہی رہے۔ اتنے کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے، تھوڑی دیر رکتے اور پھر آنکھیں اپنی اپنی پسند کے دوستوں کی تلاش میں محو ہو جاتیں۔ ممبئی یا اس طرح کے دیگر بڑے شہروں میں اتنا سا تعلق بھی ایک دوسرے سے شناسائی کا وافر جواز ہے۔

ویسے بھی انور خان خاصے Selective تھے اور تعلقات میں، گفتگو میں ایک باوقار فاصلہ رکھا کرتے تھے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ ملاقاتیں ہونے لگیں تو یہ فاصلہ بھی کم ہو تا گیا۔ وہ جب بھی ملتے تو یہی سوال کرتے کہ آج کل کیا پڑھ رہے ہو؟ خود ان کے مطالعے کی رفتار قابل رشک تھی۔ حالانکہ نجی زندگی اور اس کے مسائل پر کبھی گفتگو نہ ہوئی (اور پھر ہم لوگ تو ان کے سامنے بچے ہی تھے) مگر علم و ادب، سیاست، سماج، سائنس، کمپیوٹر، انٹرنیٹ الغرض جن جن موضوعات پر ان سے گفتگو ہوئی میں نے ان کے مطالعے کو حیرت انگیز طور پر وسیع اور ہمہ جہت پایا۔

ان کا مطالعہ بہت Upto date تھا۔ فکشن کا (کہ جس کے وہ شہسوار تھے) شاعری کا، کلاسک کا، انگریزی اور دیگر زبانوں کا۔ معاصر اور کلاسک ادب سبھی کچھ ان کا کھنگالا ہوا تھا۔ ہمارے ادبی منظر نامے میں جو حضرات سب سے زیادہ پڑھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں ان میں ایک انور خان بھی تھے۔ افسوس ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور اب ان میں سے بھی ایک شخص کم ہو گیا۔ انور خان کی موت سے ہم نے ایک بہترین افسانہ نگار ہی نہیں کھویا ہے بلکہ ایک اچھا قاری بھی ہم سے بچھڑ گیا ہے۔

ہم میں سے کچھ لوگوں کو یہ تجربہ ضرور ہوا ہوگا کہ جب ہم کیمرے سے تصویر کھینچتے ہیں اور تصویر کھینچنے کے بعد اگر کیمرے کی ریل آگے نہ بڑھی ہو تو ایک تصویر پر دوسری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اور پھر فلم کا وہ حصہ صحیح طور پر ڈیولپ نہیں ہو پاتا۔ لہٰذا نگیٹیو دیکھیں تو ایک منظر یا چہرے کے خد و خال میں سے پچھلی تصویر کے ادھورے، دھندلے نقوش جھانکنے لگتے ہیں۔ اس وقت جب میں یہ تحریر کر رہا ہوں تو مجھے اعتراف کر لینا چاہئے کہ آج میری ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی ہے بس یوں کہہ لیں کہ "تصورات میں پرچھائیاں ابھرتی ہیں۔" ان دنوں میرا معمول یہ تھا کہ کالج سے چھوٹتے وقت اکثر مکتبہ جامعہ چلا جاتا۔ خصوصاً سنیچر کے روز وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر سنیچر کی شام شہر کے زیادہ تر ادبا شعرا مکتبہ میں اکٹھا ہوتے، مل کر بیٹھتے، باتیں ہوتیں۔ اور جب بات سے بات نکلتی تو وقت ہم لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر دور افق کے اس پار جا کر کہیں کھو جاتا۔ وہاں صرف ہم لوگ ہوتے اور ہماری باتیں اور پھر باتوں کی کوئی سرحد بھی تو نہیں ہوتی ہے۔ ممبئی سے دہلی پھر الہ آباد اور لکھنؤ۔ ذرا جی چاہا تو جنوب کی سمت حیدر آباد بھی گھوم آئے۔ لبوں نے ہلکی سی جنبش کی اور سرحد پار کی سیر کر لی۔ آج اور اجمل کمال، ناصر بغدادی اور بادبان آصف فرخی اور مبین مرزا، اوراق اور وزیر آغا۔ حالانکہ اب جو سوچو تو یہ سب ایک طلسم کا کارخانہ معلوم پڑتا ہے۔ ایک ایسا طلسم جس میں کچھ پانے کا نہیں صرف اپنوں کو کھو آنے کا احتمال ہو۔

ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، ان سے ملاقات کا لطف--- بالکل کھلے گلاب کی نتھری پتیوں جیسا تھا۔ برگد جیسی شانت دانشورانہ شفقت---ان کی گفتگو اور اس کی شیرینی میں گھلتے لفظ لفظ مباحثے--- جدیدیت، مابعد جدیدیت، شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، آجکل، شب خون اور شاعر، سلام بن رزاق، انور قمر، ساجد رشید اور علی امام نقوی، مکتبہ جامعہ، کیفے الماس اور بھنڈی بازار۔ آخر کون کون سی باتوں کا ذکر کیا جائے کہ اب تو یہ حال ہے کہ......

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

☆☆☆

انیس چشتی

مراٹھی دلت ادب کے نقوش

مراٹھی زبان میں دلت ادب کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ دلت ادب اور دلت تحریک کو سمجھنے کے تعلق سے بھی صرف غیر مراٹھی دانوں میں ہی نہیں بلکہ مراٹھی دانوں میں بھی بعض بڑی غلط فہمیاں ہیں۔ عام طور پر اچھوتوں کو ہی دلت سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ دلت لفظ کا اگر ہم اردو میں ٹھیٹھ ترجمہ کرنا چاہیں تو وہ روندا ہوا، کچلا ہوا یا مسلا ہوا ہو سکتا ہے۔ یعنی سماج کا وہ طبقہ جو صدیوں سے عدم توجہی اور جبر کا شکار ہے۔ اسے انگریزی میں Oppressed, Down trodden یا Suppressed کلاس کہہ سکتے ہیں۔ بھارت کا ہندو سماج روز اول سے ہی چار طبقوں میں بنٹا ہوا ہے، جنہیں عام طور پر برہمن، کھتری، ویش اور شودر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس سماجی تفریق کا بھارت کی ترقی پر کتنا اثر پڑا اور اس کے کیا منفی اثرات ہماری ترقی پر مرتب ہوئے یہ بھی اپنے آپ میں ایک مستقل موضوع ہے۔ دلت مراٹھی ادب اور تحریک کے بزرگ اداشناس ڈاکٹر ما۔ پ۔ منگوڑکر کے مطابق۔

"دلت سماج کی صلاحیتیں پچھلی کئی صدیوں سے اجاگر نہیں ہو سکی تھیں، اس کے نتیجے میں صرف ہندو طبقے کو ہی نقصان نہیں اٹھانا پڑا بلکہ ان صلاحیتوں کے عدم استعمال کے نتیجے میں پورے بھارت کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں اور اپنی تمام تر ترقیوں کے باوجود ورن (ذات پات) کا نظام پورے سماج کی عمارت کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے اور پتہ نہیں یہ عمارت کب زمین پر آگرے۔"

مراٹھی زبان میں دلت ادب کا سلسلہ تقریباً ۱۹۶۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن پسماندہ طبقوں کی ترقی کے لئے کوشاں رہنے والی اولین شخصیت مہاتما جیوتی با پھلے کی ہے۔ آپ ۱۱ر اپریل ۱۸۲۷ء کو ضلع پونہ میں تعلقہ پورندر کے ایک کوردہ دیہات کھانوڑی (خان واڑی) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بروز جمعرات ۲۷ر نومبر ۱۸۸۹ء میں انتقال کیا۔ پھلے کی پوری زندگی پسماندہ طبقوں کی ترقی اور تعلیمی مہم کے اطراف گھومتی ہے۔ یعنی پھلے کی ۶۲ سالہ زندگی میں غدر (۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی) گویا بالکل وسط میں پڑتا ہے۔ انگریزوں کے باقاعدہ اقتدار سے پہلے یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت تھی۔ اور اس زمانے میں پونہ، بامبے پریسڈنسی میں پڑتا تھا۔ پھلے نے دلت طبقے کی تعلیمی ترقی کے لئے کتنا کام کیا آپ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ صوبہ بمبئی کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن نے ۱۸۵۴ء میں اپنی رپورٹ شائع کی تو اس میں خلاف روایت مکتا نامی ایک اسکولی لڑکی کا مضمون شامل اشاعت کیا جس نے پھلے کے اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اس مضمون میں مکتا نے دلت ہونے کے ناطے اپنی ایسی بپتا سنائی ہے جسے پڑھ کر اچھے اچھوں کے ہوش اڑ جائیں۔ ایک اندازے کے مطابق مراٹھی زبان میں دلت ادب کی یہ اولین مثال ہے جو پھلے کی دلت تحریک کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ مضمون کا عنوان تھا ....(مانگ اور مہار قبیلوں کی تعلیم سے متعلق)

یہ عام تصور بھی صحیح نہیں کہ ہر دلت اچھوت ہوتا ہے۔ مہاراشٹر میں دلتوں کی کئی ذاتیں ہیں، مثلاً دھیڑ، مانگ (ماتنگ)، مہار، وڈاری، کولائی، گوندھلی، گوساویں، مانگ گاروڈی، وید، دھوبی، نائی، بھشتی، کوشٹی، جوتشی، کیکاڑی، مداری اور پھر مداریوں میں کئی فرقے، مثلاً بندر والے، ریچھ والے، سانپ والے، راستوں پر تماشہ دکھانے والے، سرکس میں کرتب دکھانے والے وغیرہ۔ پھر دھنگر۔ ان دھنگروں کی کئی قسمیں ہیں۔ گائے بھینس پالنے والے الگ۔ بکریوں کا ریوڑ لے کر گھومنے والے الگ اور مینڈھے پالنے والے الگ ہیں۔ ان کے علاوہ جانوروں کی اون سے کمبل بنانے والے دھنگر جدا ہیں۔ ان دھنگروں کی قسموں میں خود آپسی رشتہ داریاں اور روٹی بیٹی کا معاملہ نہیں ہوتا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ سب ذاتیں سوائے مانگ اور مہار کے اچھوت نہیں ہیں۔

مراٹھی زبان کا سب سے پہلا ناول بابا پدمجی کا..................(جمنا کی سیاحت) ہے۔ جو ۱۸۵۷ء کے آس پاس لکھا گیا۔ اس کے بعد ہری نارائن آپٹے کے دو ناول "پن لکشات کون گھیتو؟" اور "می" ہیں۔ "پن لکشات کون گھیتو؟" یعنی "لیکن دھیان کون دیتا ہے؟" کا موضوع بچپن کی شادی ہے۔ یہ ناول ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۵ء کے درمیان شائع ہوئے۔ ان ناولوں نے اپنے اسلوب، موضوع اور صنف ادب میں اولین کوشش کی وجہ سے مراٹھی ادب میں ایک نیا فکری انقلاب پیدا کر دیا۔ ہری نارائن آپٹے برہمن تھے لیکن بابا پدمجی برہمن نہ تھے۔ وہ عیسائی تھے۔ مراٹھی ادب پر پہلے بھی اور آج بھی برہمن مصنفوں کا اجارہ چلا آ رہا ہے۔ یہ خطہ ہمیشہ سے غیر برہموں کے لئے علاقہ ممنوعہ (Restricted Area) قرار دیا جا چکا ہے۔ مراٹھی

۱۹۷۔ گنج پیٹھ، پونہ۔ ۴۱۱۰۴۲

ادب [illegible] اکھل بھارتیہ مراٹھی ساہتیہ سمیلن کے اب تک چند ہی غیر برہمن صدر ہوئے ہیں۔ ان میں ایک مسلمان ہے اور دوسرے مرہٹہ۔ برہمنی تہذیب کی [illegible] ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس قوم نے مراٹھی ادب کو صدیوں سے مالا مال کیا ہے۔ اس قوم کے ادیبوں نے فکری، تحقیقی، تنقیدی، تاریخی، مذہبی، فلسفیانہ، ناول، افسانہ، شاعری، ڈرامہ، تحریکی کتابوں کی ایک دنیا آباد کر رکھی ہے۔ ان ادیبوں کی بڑی تعداد اور ان کے بڑے اشاعتی مراکز اور تحریکوں کی وابستگی عروس دکن پونہ میں پائی جاتی ہے۔ گوکھلے، تلک، اگرکر، ساورکر، بھنڈارکر، کروے اور اسی سطح کی دیگر مینارہ قد شخصیتیں پونہ سے ہی اٹھیں جنہوں نے اپنے علم و فضل کا سکہ صرف مہاراشٹر میں ہی نہیں بلکہ پورے بھارت میں یہاں تک کہ انگریزوں سے بھی منوالیا۔ جن لوگوں نے برہمنوں کی اس صلاحیتوں کا انکار کیا انہوں نے برہمن بیزاری کی ایک نئی مہم کا آغاز کر دیا۔ یہاں ایک اور غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے وہ یہ کہ دلت تحریک اور برہمن بیزاری مہم دو الگ چیزیں ہیں۔ برہمن بیزاری مہم میں صرف دلت ہی نہیں بلکہ مراٹھا اور دیگر غیر برہمن بھی شامل رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض موقعوں پر خود برہمنوں نے برہمن مخالف تحریک کی قیادت کی ہے۔

دلت ادب کی تخلیق کاری کے لئے بہت ساری شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ ادیب کا تعلق پسماندہ طبقے سے ہو۔ مراٹھی میں جن لوگوں نے دلت موضوعات پر لکھا ہے اور اگر وہ غیر دلت ہیں تو انہیں وہ مقبولیت نہیں ملی، جو دلت ادیبوں کے حصے میں آئی ہے۔

مراٹھی دلت ادب عام طور پر تین موضوعات پر محیط ہے۔ گرامین (دیہی) ساہتیہ، استری (خواتین) ساہتیہ اور خود دلت ساہتیہ۔ حیرت انگیز طور پر پورے مراٹھی ادب میں دیہی اور خواتین کے موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ کیونکہ لکھنے والوں کا بڑا حصہ شہری آبادی اور وہ بھی متوسط طبقے سے منسلک رہا ہے۔ مراٹھی ادب کی تخلیق کاری کی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ کام پونہ، ممبئی، کولہاپور، ناگپور، اورنگ آباد وغیرہ میں ہوا ہے۔ مہاراشٹر کا شاید ہی کوئی شہر، قریہ اور دیہات ایسا ہو جہاں مراٹھی کا کوئی ادیب، صحافی یا شاعر نہ پایا جاتا ہو۔ لیکن قیادت کی زمام ہمیشہ شہری علاقوں کے ادیبوں اور وہ بھی برہمنوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ دیہی زندگی کی سماجی مظالم کا وہی شخص بھرپور پیش کر سکتا ہے جو خود ان دکھوں سے گزرا ہو۔ دلت سماج ۹۵ فیصد سے زیادہ دیہاتوں میں آباد ہے۔ بندھوا مزدوری سے لے کر گدھوں پر اپنا اسباب زندگی باندھے گاؤں گاؤں جنگل جنگل بھٹکنے والے خانہ بدوش اور کیکاڑی قبیلے کے لوگ جس سطح کی زندگی جیتے ہیں وہ اکیسویں صدی کے اس ترقی یافتہ معاشرے کے ماتھے پر ایک کلنک سے کم نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض شہری علاقوں میں ان کا داخلہ قانوناً ممنوع ہے کیونکہ شہری سڑکیں آوارہ گایوں اور کتوں کے لئے تو کھلی رہ سکتی ہیں لیکن آپ یہاں گدھے اور خچر نہیں چلا سکتے۔

دلت مراٹھی ادب امبیڈکر تحریک کے نتیجے میں پیدا ہوا۔ امبیڈکر خود مہار (اچھوت) تھے۔ ان کی قیادت میں چلنے والی تحریک ہندوستان کی وہ واحد تحریک ہے جس نے عالم ادب کو سب سے زیادہ لکھنے والے فراہم کئے۔ دلت ادیبوں کا یہ دعویٰ ہے کہ گاندھی جی کی تحریک نے بھی پورے ہندوستان میں اتنے لکھنے والے پیدا نہیں کئے جو اکیلے مہاراشٹر میں امبیڈکر تحریک کی وجہ سے وجود میں آئے۔ اس میں دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ سب لکھنے والے دلت سماج کا اولین تعلیم یافتہ نسل کے نمائندے ہیں۔ ان کی اکثر کتابیں خود نوشت سوانح عمریاں ہیں، جن میں دیہی زندگی کا کرب، شودر پن کا دکھ اور ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا الم بیان کیا گیا ہے۔

دلت ادب کا آغاز گو کہ ۱۹۶۰ء سے ہوتا ہے لیکن اس کا عالم شباب ۱۹۶۵ء اور ۱۹۸۵ء کا درمیانی وقفہ ہے جس میں دیا پوار کی "بلوتن" .... (خدمت گزاری کے عوض میں سالانہ ادا کی جانے والی حقیر سی رقم یا اناج) لکشمن مانے کی "اُپرا" اور لکشمن گائیکواڑ کی اُچلیا (اٹھائی گیرا) شائع ہوئیں۔ دیا پوار کی بلوتن اور لکشمن مانے کی "اپرا" نے تو آسمان سر پر کھڑا کر لیا۔ متعدد ریاستی، انفرادی، اجتماعی انعامات کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی اور امریکہ کے فورڈ فاؤنڈیشن کے انعامات نے انہیں عالمی شہرت عطا کی۔ ان پر دستاویزی اور فیچر فلمیں بنیں۔ ان خود نوشت سوانح عمریوں میں بالترتیب مہار، کیکاڑی اور پھاسی پاردھی قبیلے پر ہونے والے مظالم کو اتنی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا اس سماج کا ہمدرد بن جاتا ہے۔

مہاراشٹر میں دلت ادب کے بڑے مراکز ممبئی، اورنگ آباد اور ناگپور ہیں۔ یہ دلت طبقہ بھی بطور خاص اورنگ آباد اور ناگپور میں زیادہ آباد ہے۔ اس کی بھی بڑی وجہ شاید امبیڈکر تحریک رہی ہو۔

دلت ادب کا ذکر اس کے اولین ادیبوں کا نام لیے بغیر ادھورا رہے گا۔ بابو راؤ باگل کی...... ...... (جب میں نے ذات چرالی)، شنکر راؤ کھرات کی .... (خلا اور خلا سے ادھر) اور نام دیو ڈھسال کی...... .... (مردار کا گوشت کھا لینے کے بعد برائے فروخت ہڈیاں سکھانے کی جگہ) اور گول پیٹھا دلت مراٹھی ادب کی اولین اشاعت تسلیم کئے جاتے ہیں۔

دلت مراٹھی ادب کے لئے یہ کہنا کہ اس میں صرف خود نوشت سوانح عمریاں ہی لکھی جا رہی ہیں پورے طور پر درست نہیں ہے۔ لکشمن گائیکواڑ تازہ دم دلت ادیب اور دلت تحریک کے فعال کارکن ہیں۔ انہیں غم جاناں کو غم دوراں بنانے کا سلیقہ آتا ہے۔ ان کا تعلق پھاسی پاردھی قبیلے سے ہے جو مراٹھواڑہ میں لاطور اور عثمان آباد کے اکناف میں واقع ہے۔ گائیکواڑ نے چین کے دورے کی روداد!............ (چینی مٹی میں بیتے دن) نامی ایک خوبصورت سفر نامے میں ترتیب دی ہے۔ ان کی دوسری اہم کتاب بھی جو خود نوشت نہیں ہے "وڈار ویدنا" کے نام سے چھپ چکی ہے جس کا تعلق پتھر کوٹنے والے قبیلے کے دکھوں سے ہے۔

۱۹۸۰ء کے آس پاس دلت خواتین نے بھی اس ادب میں معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ بے بی کامبلے کی .... (جینا ہمارا) شانتا بائی کامبلے کی .... (میری زندگی کی مصور داستان) پروفیسر کمد پاوڑے کی .... (اندرونی دھماکہ) اور جتا بائی گرمے کی .... (عالم سکرات) خالصتاً خواتین کے موضوع اور مسائل پر لکھی کتابیں ہیں۔

دلت ادب کے تخلیق کاروں میں صرف اچھوت ہی نہیں بلکہ او بی سی لکھنے والے بھی شامل ہو گئے ہیں۔ کولہاپور کے حسین جمعدار نے "جہاد" لکھی۔ چندر کانت جادھو کی .... (بدلی کا چاند) جیراج راجپوت کی .... (پردے کی اوٹ

ہے)نے ایک نئی سوچ کو مہمیز دی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے آس پاس شائع شدہ ان کتابوں میں سب سے زیادہ دلچسپ بالا صاحب گائیکواڑ کی ... . (میں عیسائی مہار) ہے۔ دلچسپ اس اعتبار سے کہ انہوں نے اپنی ذات کے نیچ پن سے پنڈ چھڑانے کے لئے عیسائی مذہب اختیار کیا۔ وہاں پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ مساوات کا دم بھرنے والے عیسائی تو اور زیادہ خطرناک ہیں۔ کم ذات لوگوں کے چرچ الگ، پریسٹ الگ یہاں تک کہ قبرستان بھی الگ۔ وہ آرمینیائی، رومن کیتھولک، گوا رنس اور گوروں کے چرچ میں جا نہیں سکتے اور قبرستانوں میں دفن نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ بالا صاحب گائیکواڑ نے عیسائیت کو بھی خیر باد کہا اور دوبارہ مہار پن اختیار کر لیا۔

اس تحریک میں دیگر پسماندہ ذات بھی شریک ہو گئے اور اپنی ذات کی خواتین کی بپتا سنانے کے لئے .... (منگلا کیولے) نے اپنے چرم کار شوہر کی کہانی .... (جینا ہے ہر ایک سکنڈ) لکھی۔ جو اسپتال کے جنرل وارڈ میں ہر سیکنڈ ایک نئی موت مرتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر شرن کمار لمباڑے دلت ادب کی مابعد جدیدیت تحریک کا ایک معتبر نام ہے۔ موصوف ناسک کے مکت ودیا پیٹھ (Open University) کے کری کولم کو آرڈی نیٹر ہیں۔ ...... (حرام زادہ) یا انگریزی میں اس کا ترجمہ (Son of a Bastered) ایک تازہ ترین خود نوشت ہے۔ والدہ دلت اور والد شاید وہی سیاست داں ہیں جن کی ہوس ناکی کی متعدد عورتیں شکار ہو چکی ہیں جن میں لمباڑے کی ماں بھی ایک ہے۔ انہوں نے ۱۹۹۵ء سے ۲۰۰۱ء تک کئی اور فکر انگیز کتابیں بھی شائع کیں جن میں .. .. (ریپبلکن پارٹی) .... (دلت پنتھر تحریک) اور شتکا تمپل وچار قابل ذکر ہیں۔

امبیڈکر تحریک سے متاثر ہو کر ڈاکٹر نریندر جادھو نے سوانح عمریوں کی تحریر کی دنیا میں .... (ہمارا باپ اور ہم) لکھ کر ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ سوانح عمری اپنے اسلوب کے اعتبار سے ایک نیا تجربہ ہے جسے ڈاکٹر نریندر کے تین چار بھائیوں نے مل کر لکھا ہے۔ ڈاکٹر گنگا دھر یان تاؤ نے ذات سے مہار ہیں۔ اورنگ آباد یونیورسٹی میں استاد ہیں اور دلت مراٹھی ادب کے بڑے نقاد اور صحافیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ دلت زبان گو کہ مراٹھی ہے لیکن اس کے تلفظ میں دیہاتی پن نمایاں ہے۔ مثلاً وہ پیٹ کے لئے مراٹھی میں .... بولنے کی بجائے .... بولیں گے اور لکھیں گے بھی اسی طرح تو انڈ، بواٹ، کیس نیا، اویا، لکشیا، کاڑیا دغیرہ اپنے مخصوص لہجے میں ادا کرتے ہیں۔

ضروری محسوس ہوتا ہے کہ کسی کتاب سے ایک اقتباس کا ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے۔ ذیل کا ترجمہ لکشمن مانے کی اُپرا سے لیا گیا ہے۔ مصنف کا تعلق کیکاڑی سماج سے ہے۔ یہ قبیلہ شادیوں کے موسم میں شادی کے گھر میں کئی کئی دنوں تک بینڈ بجانے کا کام بھی کرتا ہے تاکہ ہر رسم کے موقع پر شادی کے لئے شور میسر آ سکے۔ ان کی ایڈوانس بکنگ ہوتی ہے جسے یہ سپاری کہتے ہیں۔ لالچ میں بعض مرتبہ یہ لوگ ایک ہی وقت کے لئے کئی کئی گھروں سے سپاری لے لیتے ہیں۔ اس عمل کے نتیجے میں ایک مرتبہ لکشمن مانے اور اس کے باپ کے ساتھ کیا ہوا سنئے:

"ہم سانگوی میں شادی بجا رہے تھے۔ شادی بڑے گھر کی تھی۔ وہاں ہلدی کی رسم ختم ہوئی تو دیکھا کہ کامٹی سر پر ... گھوڑے پر سوار، راؤ صاحب داروغہ آیا ہوا ہے۔ جب وہ ... ہم لوگ ... بجا رہے تھے۔ اونچا پورا مرد، بھرے بھرے بدن کا، سر پر سبز صافہ، بدن میں نہرو کرتا، دودھ جیسی سفید دھوتی، شراب کے نشے میں ... گھوڑے کا چابک ہوا میں لہراتا ہوا دہاڑا --- ' ارے ... ! تمہارا باپ آیا ہے۔ ابھی اس کوڑے سے تمہاری چمڑی ... ' (باپ) اٹھ کھڑا ہوا۔ وجہ پوچھنے لگا؟ دیکھتے ہی دیکھتے گبرو جوان نے اپنے کوڑے کا سرا چھوڑ دیا۔ 'با' بلبلا اٹھا۔ بینڈ بند ہو گیا۔ اس وقت تک وہ جوان مرد دونوں چاروں کو پیٹ چکا تھا۔ چیخ پکار شروع ہوئی۔ ہم بھی چیخنے چلانے لگے۔ کسی نے داروغہ کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر ایک کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا تھا --- 'ان ..... کیکاڑیوں کے گھر پھونک ڈالوں گا...... ان کی...... کو جھاڑ سے باندھ کر ..... پہلے میرے پیسے ڈالو، اس بھڑوے نے ایسار (بیعانہ) لیا ہے اور چار لونڈے بھجوا دیے ہیں بجانے اور یہ یہاں اپنی میا. ...!'

دتیا کیکاڑی اس کے قدموں پر بالکل اوندھا لیٹ گیا۔ 'مالک! لڑکے سے بھول ہو گئی۔ اب نہ مارو! ہم ابھی نکل رہے ہیں --- ' وہ اپنی ناک گھسے جا رہا تھا۔ جواں مرد ٹھنڈا پڑ گیا۔ سب کو آگے ہو کر چلنے کا حکم دیا۔ سانگوی والوں نے اسے اپنی بے عزتی پر محمول کیا۔ انہوں نے ہمارے ساز چھین لیے۔ میرے کندھے پر کا ڈھول کب کا غائب ہو چکا تھا۔ لوگوں کی زبردست بھیڑ لگ گئی۔ 'با' کب کا بھاگ چکا تھا۔ دتیا پیروں پر گر گیا --- بیعانے کی رقم واپس کرنے کی بات کرنے لگا۔ سانگوی والوں نے داروغہ کی اور ہم سب کی پٹائی کر ڈالی تھی۔ اب کامٹی سر والوں اور سانگوی والوں میں ٹھن گئی تھی۔ داروغہ نے گھوڑی کو شراب پلا رکھی تھی۔ وہ سوار ہوا اور گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ وہ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ لوگ پیچھے دوڑے جا رہے تھے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ہم میں سے جسے جہاں جگہ ملی وہاں چھپ کر بیٹھ گیا۔ میں، اٹھلیا اور پھوپھا ایک چائے خانے میں گھس گئے۔ کلیجہ منہ کو آتا تھا کہ اب آگے کیا ہو گا...... اتنے میں وہاں گرام پنچایت کا آدمی آ دھمکا......"

(ماخوذ از اُپرا: لکشمن مانے)

دلت ادیب کی مثال سماج کے گندے باتھ روم میں گرے ہوئے خوشبودار صابن جیسی ہے۔ افسوس کہ اسے سماج نے اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس سماج کو قانون کی بیساکھیوں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ قانون آج کل ووٹوں کی سیاست کا دوسرا نام ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس میں جہاں نقطے لگا کر خالی جگہ چھوڑ دی گئی ہے اس کے لئے شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہاں مغلظات تحریر ہیں۔ ہم نے ادب میں بھی ادب کو ملحوظ رکھنے کی سعی کی ہے۔ کئی اور باتیں بھی ہیں، لیکن یہ مختصر مقالہ دلت مراٹھی ادب کا محض ایک تعارف ہے کل نہیں۔

☆☆☆

عبدالحی شیخ

چوتھی اور آخری قسط

قلم، قلم کار اور کتاب

قلم کار اور نقاد:

'کتنے سارے تمدن' آرٹ کے کتنے عظیم الشان کارنامے صرف اس سبب سے تباہ ہو گئے کہ اپنے وقتوں میں انہیں اچھے نقاد میسر نہیں آئے۔' (چیخوف)

'ایک ادیب کو نقادوں کی باتیں سننے کا وقت نہیں ہے۔ جو ادیب بننا چاہتا ہے وہ تبصرے پڑھتا ہے اور جو لکھنا چاہتا ہے، اسے ریویو پڑھنے کا وقت نہیں ہے۔ نقاد جو کچھ لکھتا ہے۔ ماسوائے قلم کار اس سے ہر کوئی متاثر ہوتا ہے۔

(ولیم فالکنر)

چند نقادوں نے روبرٹ لڈلم کو تاریخ کے بدترین ناول نگاروں میں شمار کیا ہے۔ لڈلم ان ناول نگاروں میں شمار ہوتا ہے جن کی کتابیں سب سے زیادہ بکتی ہیں۔ اب تک اس کے ناول مختلف زبانوں میں کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہوئے ہیں۔

لڈلم کا بارہواں ناول The Acquitaine Progression کڑی تنقید کے باوجود سب سے زیادہ فروخت ہونے والے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی اشاعت کے پہلے تین ہفتوں میں اس کی چھ لاکھ مجلد کاپیاں فروخت ہوئیں۔ صرف انگلینڈ میں اس کی ڈیڑھ لاکھ کاپیاں بکیں۔

جب لڈلم کا دھیان نقادوں کی تنقید کی طرف دلایا گیا تو وہ بولا۔ 'مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ چھ آدمی مجھے چاہتے ہوں تو آدھا درجن برائی کرنے والے ہوں گے۔'

انگریزی کے خوش گو اور غنائی شاعر کیٹس پچیس سال کی عمر میں چل بسا۔ اس کی نظم Endyonion پر نقادوں نے تیکھی تنقید کی۔ بائرن اور کئی دوسرے لوگوں نے کیٹس کی جوان مرگی کے لئے ان نقادوں کو ذمہ دار ٹھہرایا۔

چارلس ڈکنز کی کئی تصنیفات پر منفی ریویو لکھے گئے ہیں۔

سرجان اِروِن لکھتا ہے: "قلم کار اس دنیا میں اکیلے فن کار ہوتے ہیں، جنہیں نا تجربہ کار یا نالائق لوگوں کی نکتہ چینیاں سہنی پڑتی ہیں۔ ایک سرجن کو وارڈ میں پہلی دفعہ آنے والے طالب علم کی شکایات سننا نہیں پڑتا ہے اور نہ ان لوگوں کا طعن و تشنیع سننا پڑتا ہے، جن کے مریض اس کی جراحی کے دوران موت کی منہ میں چلے جاتے ہیں۔"

دو اور پیشہ وروں کا ذکر کرتے ہوئے اِروِن آگے لکھتا ہے:

"کوئی اسے انوکھا اور مناسب فعل نہیں سمجھتا، جب ایک لڑکا کچھ مشکلات کے بعد Granta میں ایک مضمون چھپوانے میں کامیاب ہوتا ہے اور ہارڈی پاشا کو ہدایت

شیخ منزل، فورٹ روڈ، لیہہ، لداخ

دینے لگتا ہے۔"

چیخوف کا مشہور قول ہے "ادب کی تنقید کے لئے خود ادیب کے ضمیر سے بہتر پولیس نہیں مل سکتی ہے۔"

انیسویں صدی کے آغاز میں امریکہ میں ایک ادبی انجمن Algonquin Round Table کے نام سے جانی جاتی تھی۔ طنز و ظرافت انجمن کی منعقدہ محفلوں کی جان تھی۔ ہفتے میں قلم کار ایک دفعہ ملتے تھے۔ شروع میں ڈرامہ کے ایک نقاد الیکزنڈر وول کوٹ کو ایک استقبالیہ دیا گیا۔ شرکاء نے سائن بورڈ پر مختلف انداز میں اس کے نام کے ہجے غلط لکھ کر اس کی ہتک کی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن الیکزنڈر وول کوٹ نے سب کچھ مذاق میں لیا۔

تاہم ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جو تنقید کو ادب کی نشو و نما کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ "اگر نقاد نہ ہوں تو قلم کار 'شتر بے مہار' ہو جائیں گے۔"

ادبی تخلیقات اور قلم کاروں کی منفرد عادتیں:

قلم کار دوران تخلیق انوکھے اور دلچسپ طور طریقے اختیار کرتے ہیں۔ جن سے اس کو سوچنے اور لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔

اِرنسٹ ہیمنگوے اپنے پندرہ ایکڑ رقبہ اراضی کے درمیان ایک سفید مینار کی بلندی پر بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔ جہاں اس کے سولہ پالتو کتے، باون بلیاں، کئی عدد گائیں اور سیکڑوں کبوتر رہتے تھے۔ لکھنے سے پہلے وہ ایک درجن پنسلوں کو تراش کر نوکیلی بناتا تھا۔ ایک مرتبہ ہمینگوے نے بیس پنسلوں کی تراش خراش کی۔

جرمن فلسفی کانٹ کے دارالمطالعہ سے ایک مینار نظر آتا تھا۔ جس پر وہ اپنے خیالات کو مرکوز کرتا تھا۔ جب مینار اور فلسفی کے درمیان ایک درخت حائل ہوا تو کانٹ نے شہری کونسل کو لکھا کہ مینار نظر نہ آنے سے وہ سوچ نہیں پاتا۔ تو کانٹ کی عظمت کے پیش نظر کونسل نے وہ درخت کاٹ ڈالا۔

ڈرامہ نگار ابسن اپنی میز پر چھوٹی مورتیاں رکھا کرتا تھا۔ ان کے بغیر وہ تخلیق کر نہیں پاتا تھا۔ شیلر نظمیں لکھتے وقت اپنے پہلو میں پکے یا گلے سڑے سیب رکھتا تھا۔ میکسم گورکی لگاتار ماچس کی تیلیاں جلاتا اور انہیں اپنی انگلیوں میں تھامے رکھتا اور جلنے کے بعد ایش ٹرے میں پھینکتا تھا۔ موپاساں اپنی کہانیاں لکھتے وقت ایک ترکی قالین پر بیٹھنا پسند کرتا تھا۔ ولیم گوا ین کپڑ چادر میں بیٹھ کر فلش لائٹ میں لکھتا تھا۔ اسٹیونسن سفیدی کی گئی دیواروں والے کمرے میں لکھنا پسند کرتا تھا۔ سعادت حسن منٹو ایک کوکھا پر بیٹھ کر

لکھتا تھا۔ عصمت چغتائی لکھتے وقت اپنے سامنے تاش کی ایک گڈی رکھتی تھی۔ کپلنگ صرف کالی سیاہی سے لکھتا تھا۔ آنگس ولسن اسکول کی مشق کاپی پر لکھتا تھا۔ جو کائی صرف نقشی روشنائی اور سرخ پنسل سے ہی روانی سے لکھ پاتا تھا۔ سمرسٹ ماہم فکشن لکھنے سے پہلے ایک گھنٹہ فلسفے کا مطالعہ کرتا تھا۔ اس دوران تمباکو کا پائپ اکثر اس کے لبوں پر ہوتا تھا۔ لکھنے سے پہلے ویلا کھترائین انگریزی میں انجیل سے ایک اقتباس پڑھتی تھی۔ اس کے پیچھے ان کی دینداری یا حصول ثواب کا جذبہ نہیں تھا بلکہ انگریزی کی اچھی نثر نگاری سے استفادہ کرنا مقصود ہوتا تھا۔ بوس بیٹ فر میں اپنا سر لپیٹ کر لکھتا تھا۔ اس کے برعکس روسو دھوپ میں ننگے سر لکھتا تھا۔ جب کہ آرتھر میلر سے دن کی روشنی میں کام نہیں کیا جاتا تھا۔ تخلیق کے وقت بجلی کا لیمپ اس کے لئے ناگزیر تھا۔ ایمائل زولا نصف دن کو اپنے کمرے میں چلمن لٹکا دیتا اور مصنوعی روشنی میں کام کرتا تھا۔ نارمن میلر لکھتے وقت ایک مخصوص لباس زیب تن کرتا تھا۔ یا پھیکے رنگ کی ڈنگری اور کھلے گلے والی قمیص پہنتا تھا۔ وہ ہمیشہ ایک ایسے کمرے میں کام کرتا تھا، جہاں سے دور سمندر میں بحری جہاز وغیرہ نظر آتے تھے۔ سر آرتھر کیتھ نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے کہ لکھنے سے پہلے وہ اپنے پرانے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ وکٹر ہیوگو نے ۱۸۵۲ء میں اپنا شاہکار ’بدنصیب‘ جزائر رود بار میں جلاوطنی کے دوران تقریباً کھڑے کھڑے لکھا۔

گوئٹے ہمیشہ پنسل اور کاغذ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جب کوئی نادر خیال ذہن میں آتا، فوراً نوٹ کر تا تھا۔ ایسے میں اگر وہ گھوڑے پر سوار ہوتا تو اتر کر اسے لکھتا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی کبھی کبھی اندھیرے منہ جاگ کر ٹیبل لیمپ جلا کر کہانیاں لکھتا تھا۔ لکھ کر پھاڑ تا اور فلابیر کی طرح بار بار کاٹتا اور چھانٹتا تھا۔ سردیوں میں وہ تین چار بجے اٹھتا تھا۔ بقول فکر تونسوی بیدی عموماً گھریلو زندگی میں مصروف رہتا تھا۔

واٹر کیبن ہر روز صبح اپنی میز پر کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی اس کے دائیں طرف ایک دستہ کاغذ رکھتی تھی۔ کچھ کاغذ اس کے سامنے رکھا جاتا تھا اور بائیں طرف آدھ درجن سگریٹوں کے کھلے پیکٹ اور سگریٹوں کے ٹکڑے پھینکنے کے لئے ایک بڑا پیالہ رکھا جاتا تھا۔

مختلف قلم کاروں نے جیسے رابرٹ فروسٹ، ملک راج آنند وغیرہ نے لکھتے وقت استعمال کرنے کے لئے اپنی پسند کی کرسیاں بنوائی تھیں۔

خشونت سنگھ اپنی نئی کتاب ایک نئے قیمتی قلم سے شروع کرتا ہے اور بقول شخصے تحریر کے لئے پیرس سے مخصوص لکیردار کاغذ والا پیڈ منگاتا تھا۔ انہوں نے خود ہندوستان ٹائمز کے اپنے ہفتہ وار کالم میں لکھا ہے کہ انہیں دوسروں کے قلم ’چرانے‘ کی عادت ہے۔ یہ موقع انہیں پریس کانفرنسوں اور میٹنگوں میں ملتا ہے۔

کچھ قلم کار اپنے سکریٹریوں کو املا دیتا ہے اور سکریٹری ٹائپ کرتا جاتا ہے۔

کئی قلم کاروں کو تخلیقی غور وفکر کے لئے بستر ایک اہم ٹھکانا ہے۔ سرونسٹن چرچل نے بستر میں چرٹ اور چائے پیتے ہوئے جنگ سے متعلق اپنی یادداشتوں کو لکھوایا۔ ملٹن نے اپنی مشہور نظم Paradise Lost کا زیادہ حصہ بستر میں لکھا۔ ایف۔ اے اسمتھ نے بستر میں سرہانوں سے لپٹے بلیک سگار کا مرغولہ اڑاتے اور وسکی کی چسکی لیتے ہوئے اپنی ساری کتابیں لکھیں۔ سموئل جانسن نے اپنی تیکھی ظرافت کا ادبی خزینہ بستر میں بیٹھ کر دیا۔ وہ دوپہر تک بستر میں رہتا تھا۔ فلسفی ہابس نے اپنی ریاضی کا فارمولا بستر میں دریافت کیا۔

بہت سارے تخلیق کاروں نے لکھتے وقت شراب کا سہارا لیا ہے۔ ہمینگوے، فالکنر، اسکاٹ فیرجیرالڈ، ایوجین او نیل اور منٹو بلانوشی میں [illegible] ہے۔ ’شراب پی کر میں نے بہت کچھ پایا ہے۔‘ اس کے برعکس [illegible] ’شراب خواہش بڑھاتی ہے لیکن کارکردگی گھٹاتی ہے۔‘

ایڈیسن شراب کے نشے میں اپنی بہترین چیزیں تخلیق کرتا تھا [illegible] دونوں برانڈی کی بوتلیں تیار رکھتے تھے۔

غالب نے اس وقت بھی میکشی نہیں چھوڑی جب ایک ہاتھ میں [illegible] جام اور دوسرے میں قلم اٹھا نہیں سکتا تھا۔ شاید ایسے موقعے پر غالب نے یہ شعر کہا تھا

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

غالب کے ذہن میں جب ایک شعر بنتا تو وہ کمربند نما ایک لمبے کپڑے پر ایک گانٹھ لگاتا تھا۔ جوں جوں اشعار بنتے جاتے وہ گانٹھ لگاتا جاتا تھا اور جب لکھنے پر آتا تو گانٹھ کھولتا جاتا اور اشعار لکھتا جاتا تھا۔

فکر تونسوی اپنے متعلق لکھتا ہے ’میں کیپسٹن سگریٹ کا متوالا ہوں۔ لکھتے وقت قلم اور سگریٹ دونوں چلتے ہیں۔ اور کبھی قلم کو سگریٹ اور کبھی سگریٹ کو قلم سمجھنے لگتا ہوں۔ لکھتے وقت چارپائی پر آگے پیچھے دو تکیے ہونے چاہئیں۔ اکثر ایک ہی نشست میں لکھتا ہوں۔‘

احمد ندیم قاسمی سے متعلق فکر تونسوی نے بہت پہلے لکھا تھا ’احمد ندیم قاسمی چارپائی پر اکڑوں بیٹھے اپنے افسانے لکھتا ہے۔ نظم یا غزل لکھنی ہو تو لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتا ہے اور دھیرے دھیرے گنگناتا ہوا شعر لکھتا رہتا ہے۔ وہ نیند کا سخت دشمن ہے۔ اس کی توڑ کے لئے چائے پر چائے اور سگریٹ پر سگریٹ پیتا ہے۔‘

تھامس کارلائل کے لئے ہلکا سا شور بھی ان کے تخلیقی کام کے لئے سد راہ تھا۔ ان کا دارالمطالعہ ساؤنڈ پروف تھا۔ ایک مرتبہ کارلائل نے اپنے نوکر سے کہا کہ پڑوس کے تمام مرغوں کو خرید لیں جن کی بانگ سے مصنف کے خیالات کی روانی ٹوٹ جاتی تھی۔ پڑوسیوں نے سستے داموں سے مرغ خرید کر کارلائل کو اچھے داموں میں بیچنے شروع کئے۔

اسی طرح مارسل پراؤسٹ گہری خاموشی میں سوچ وچار کر سکتا تھا۔ پراؤسٹ نے اٹھارہ سال تک ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں کام کیا۔ کمرے میں ہوا آنے کے لئے اس نے ایک ترکیب پر عمل کیا تھا۔

کارلائل کو جہاں شور سے خدائی بیر تھا۔ وہاں شور انگیز جی ویلز کے کانوں میں میٹھا رس گھولتا تھا۔ وہ ریڈیو کھلا رکھتا تھا اور بیکر اسٹریٹ کی اوپری منزل میں جہاں وہ رہتا تھا گاڑیوں کی آواز کے لئے کھڑکیاں کھلی رکھی جاتی تھیں۔ ویلز کسی کو پیانو بجانے کی فرمائش کرتا تھا جس سے انہیں لکھنے کی تحریک ملتی تھی۔

ایریک کوٹس بھی لکھتے وقت ہمیشہ اپنی کھڑکیاں کھلی رکھتا تھا۔ بقول ایک قلم کار ہر قسم کی اچھی بری آواز اس کے لئے سونے کی کان ثابت ہوئی۔ ان ملی جلی آوازوں کے درمیان اس نے The Enchanted Garden اور Ballet لکھے۔

ڈاکٹر جانسن کو دھیمی آواز میں میاؤں کرنے والی ایک بلی درکار تھی۔ اس کے ساتھ ان کے لئے چائے اور سنگترے کی قاشیں رکھی جاتی تھیں۔

ریبوٹ کسرت کے دوران یا چلتا ہوا ٹھیک طرح سوچ سکتا تھا۔ تھامس ہارڈی لکھنے سے پہلے اپنے جوتے اتارتا تھا۔ جوتے کے ساتھ اس کا تخلیقی ذہن ٹھیک طرح

[illegible] جب تک پورے لباس میں نہ ہوتا، کبھی تخلیقی فکر نہیں کرپاتا [illegible] ایک [illegible] مرتبہ اپنے باغ میں برفباری میں تخلیق کی تحریک [illegible]

[illegible] کتاب 'چینی کی اہمیت' میں لکھتا ہے۔ 'سونگ عہد کے مشہور [illegible] گھوڑے پر سوار، تکیے پر بیٹھ کر یا بیت الخلا میں جاکر لکھتا تھا۔'

کئی قلمکاروں کو ایک خوبصورت چہرے کی جھلک، فطرت کا ایک دلکش منظر یا [illegible] کے ایک دل آویز نغمے سے لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔

[illegible] امینسن زیو کو لکھنے کی تحریک تبھی ہوتی تھی جب اس کی ذہنی [illegible] کے لئے کمرے میں برقی روشنی میں کشیدہ کاری کئے ہوئے ریشمی پاجامے رکھے جاتے اور ان پر گلاب کی پنکھڑیاں بکھیر دی جاتی تھیں۔

ایک قلم کار فرینکلن نے Every Body نام کے اخبار کے ۲۷ر نومبر ۱۹۳۹ء کے شمارے میں چھپی ایک عورت کی تصویر پر شیدا ہوا۔ مصنف نے اخبار کے مدیر کے توسط سے خاتون کی تصویر حاصل کی اور اپنے نئے ناول Oliver Trenton کی ہیروئن بنائی۔ یہ لڑکی کے حسن کا جادو تھا کہ مذکورہ ناول مصنف کا بہترین ناول قرار دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ناول نگار خود کبھی اس عورت سے نہیں ملا۔

ممنوعہ کتابیں:

'کتابیں اچھی یا بری نہیں ہوتی ہیں۔ اچھی یا بری لکھی جاتی ہیں۔'

(آسکر وائیلڈ)

کتابوں کو ممنوع قرار دینے کی روایت بہت پرانی ہے۔ ہر زمانے میں مختلف ملکوں میں گوناگوں وجوہات کی بنا پر کتابوں کی فروخت یا انہیں رکھنے پر پابندی لگائی گئی ہے۔ تاریخ میں سینسر کا پہلا ریکارڈ ۲۴۰ قبل مسیح میں ملتا ہے۔ جب چین کے شہنشاہ ہوانگ تی کے حکم پر اس کی قلم رو میں ہر فلسفیانہ کتاب کو نذر آتش کیا گیا۔ حتیٰ کہ کتاب کے مالکان تک کتابوں کے ساتھ جلادئے گئے۔

امریکہ ان ملکوں میں پیش پیش ہے، جہاں کتابیں ممنوع قرار دی جاتی رہی ہیں۔ ہر ریاست کو اس معاملے میں خصوصی اختیارات رہے ہیں۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں بوسٹن میں چند بیسٹ سیلر مقبول عام کتابوں کو ممنوع قرار دیا گیا۔ ان کتابوں کے مصنفوں میں برٹرینڈرسل، فالکنر اور یوجین اونیل جیسے سرکردہ قلم کار شامل تھے۔

حالیہ دنوں میں جب رونالڈ ریگین برسر اقتدار آیا، شہر کے قدامت پرست میئر نے لائبریریوں سے کئی کتابیں اٹھوا دیں۔

پچھلی سولوانیا میں نوبل انعام یافتہ مقبول ادیب سٹین بیک کا ناول Of Mire and Men ممنوع قرار دیا گیا۔ لووا کے دوہائی اسکولوں میں سٹین بیک کی شاہکار تصنیف Grapes of Wrath نصاب سے خارج کردی گئی۔

فرجینیا میں آرتھر ملر کا Death of a Salesman ہائی اسکول کے نصاب سے نکال باہر کیا گیا جب کہ واشنگٹن میں جے۔ ڈی۔ سالنگر کی Catcher in the Rye ممنوع قرار دی گئی۔ ان کتابوں کے مواد کو امریکہ مخالف قرار دیا گیا۔

ریاست ٹینس سی میں چارلس ڈاروِن کی کتاب Origin of the Species پر مذہب دشمن ہونے کے الزام میں پابندی عائد کی گئی۔ سوویت روس نے اس کی پیروی کی اور ۱۹۲۶ء میں اس کتاب کو ممنوع قرار دیا۔

۱۹۰۵ء میں مارک ٹوئین کے مقبول ناول Tom Sawger اور Huck Finn کو نوجوانوں کے مطالعہ کے لئے ناموزوں سمجھا گیا۔ اور انہیں نیویارک کی ایک لائبریری سے ہٹادیا گیا۔

واٹیکن نے سارتر کی اکثر کتابیں ممنوع قرار دیں۔

روسو کی کتاب Emile پر مذہبی گروپوں نے الحاد پھیلانے کا الزام لگایا اور اسکی مشہور تصنیف Social Contract کو نذر آتش کیا۔ روسو کی گرفتاری کا حکم جاری کیا گیا اور روسو نے پروشیا کے بادشاہ فریڈرک دوم سے درخواست کی کہ اسے تحفظ دیا جائے۔ انگلینڈ میں مس ریڈ کلف ہال کا ناول The well of loneliness کو اخلاق سوز قرار دے کر پابندی لگادی گئی۔

چین میں بچوں کی کہانیوں کی پسندیدہ کتاب Alice in Wonderland اس بنا پر ممنوع قرار دی گئی کہ کتاب میں انسان اور جانوروں کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے۔

ہٹلر کے جرمن میں میکی ماؤس کے کامکس پر پابندی لگادی گئی۔

انگلینڈ کی ملکہ الزبتھ اول کی ناپسندیدگی کی وجہ سے رچرڈ دوم سے متعلق کتاب کی تمام کاپیاں لائبریریوں اور کتب فروشوں کی دکانوں سے ہٹوادی گئیں۔ رچرڈ دوم کو ایک کمزور حکمران ہونے کے پیش نظر تخت و تاج سے محروم کردیا گیا تھا۔

۱۷۸۸ء اور ۱۸۲۰ء کے درمیان شیکسپیئر کی تصنیف King Lear کو شاہ جارج سوئم پر دیوانگی کا دورہ پڑنے کی وجہ سے ممنوع قرار دیا گیا۔ شیکسپیئر کے ایک اور ڈرامہ Merchant of Venice میں یہودی قوم کے خلاف مبینہ توہین آمیز مواد ہونے کی وجہ سے اسرائیل میں اسے رکھنے اور خرید و فروخت پر پابندی عائد ہے۔

سر کینن ڈائل کے ناولوں کو 'جن میں سراغ رساں شرلاک ہومز کے کارناموں کا تذکرہ ہے' ۱۹۲۹ء میں روس میں ان کے پڑھنے اور پڑھانے پر پابندی لگادی گئی۔ کمیونسٹ حکومت شرلاک ہومز کے کردار کو روسی عوام کے لئے اچھا نہیں سمجھتی تھی۔

انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں برصغیر ہند میں تحریک آزادی اور قوم پرستی سے متعلق کتابیں رکھنا ممنوع تھیں۔ آزادی کے بعد سلمان رشدی کے ناول Satanic Verses تک متعدد کتابوں پر پابندی لگادی گئی۔ ان میں آبیرے مینن کی Rama Retold اور آرتھر کوئسلر کی The Yogi and the Commisar Nine Hours to Rama اور The Beautiful Prostitute Rani شامل ہیں۔

فلاسفروں میں ہابس، لوک، بیکن، روسو، مل اور سارترے اور ادیبوں میں ڈینیل ڈیفو، بالزاک اور فلابرٹ کی کتابوں پر سینسر کا عتاب نازل ہوا ہے اور انہیں ممنوع قرار دیا گیا۔

گبن کی The Decline and Fall of the Roman Empire جیسی مشہور تاریخی کتاب اور کاروینٹس کی مقبول تصنیف Don Quixote سینسر سے نہیں بچی ہیں۔

ایشیائی ملکوں میں خواتین قلم کاروں کی نگارشات پر گھریلو سطح پر بھی سینسر ہوتا ہے۔ باپ، بھائی اور شوہر ان کی تحریروں میں مین میخ نکالتے ہیں اور کاٹ چھانٹ کرتے ہیں۔ حال میں حیدرآباد دکن میں مختلف علاقائی زبانوں کی خواتین قلم کاروں کی ایک کانفرنس میں یہ معاملہ زیر بحث آیا۔

یہ کتاب پڑھو، وہ کتاب نہ پڑھو:

'انسان جتنا زیادہ پڑھے، اتنا ہی رجعت پسند ہوجاتا ہے۔' (ماؤزے تنگ)

'جب میں اپنے سب دوستوں کی ہمدردی سے محروم ہوگیا تو میری کتابیں ہی

میری مونس و غم خوار تھیں۔' (جارج ایلیٹ)

کتاب کے مصنف سے اگر ذاتی ملاقات کے بعد اس کی کتاب پڑھیں تو زیادہ مزہ آئے گا۔ ذاتی ملاقات نہ سہی تو تصویر میں اس کا چہرہ مہرہ، خد و خال دیکھ لیں تو کتاب کے مطالعے کا کچھ مزید ہی لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔ میرے نزدیک اپنے محبوب مصنف کا کھوج نکالنا ذہنی ترقی کا نہایت نازک اور نہایت اہم مرحلہ ہوتا ہے۔' (لین یو تانگ)

جب سے کتاب معرض وجود میں آئی ہے۔ انسان انسان سے کہتا رہا ہے۔

''فلاں کتاب پڑھو، فلاں کتاب نہ پڑھو۔''

جان آف سالسبری نے صرف کیتھولک کتابیں پڑھنے پر زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ 'تصنع سے پاک کیتھولک کتابیں ہی پڑھنا محفوظ اور محتاط راستہ ہے۔ عام لوگوں کو ملحدوں کے ادب سے روشناس کرنا خطرناک ہے۔ البتہ راسخ العقائد لوگوں کے لئے دونوں علوم میں تعلیم و تربیت دینا نہایت ہی مفید ہے۔'

چین کے ایک بڑے ادیب لین یو تھانگ کہتا ہے: 'اگر کوئی کتاب مشرق کی روح کی ترجمانی کر سکتی ہے تو وہ تاؤ (لاؤتسے) کی کتاب ہے۔'

ایمرسن نے افلاطون کے Republic سے متعلق کہا تھا: 'لائبریریاں جلا دو۔ کتابوں کی ساری اچھی باتیں اسی ایک کتاب میں ہیں۔'

اناطول فرانس نے کہا ہے۔ 'جلا دو جلا دو، وہ ساری کتابیں، نفرت سکھاتی ہیں۔'

ہر قوم اور مذہب کے تنگ نظر حکمرانوں اور متعصب فاتحین نے نہ صرف دوسرے مذاہب اور قوموں کی کتابوں کو تباہ و برباد کیا ہے۔ بلکہ وقتاً فوقتاً اپنی قوم کی ان کتابوں کو جو انہیں پسند نہیں تھیں' تباہ کیا ہے۔

مسیح سے ۴۸ سال قبل مصر میں اسکندریہ کی بڑی لائبریری جولیس سیزر کی فوج نے جلا ڈالی۔ ۳۸۹ء میں تھیوڈرس نے اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کی متعدد کتابیں یہ کہتا ہوا نذر آتش کرادیں کہ ان میں سے شرک و کفر کی بو آتی ہے۔

اس کے ڈھائی سو سال بعد مسلمانوں نے اسکندریہ پر قبضہ کیا۔ تب شہر میں ایک معمولی سی لائبریری تھی۔ بلند پایہ عیسائی مورخ فلپ۔ کے۔ ہتی نے حضرت عمر کے حکم پر اس لائبریری کو نذر آتش کرنے کے واقعہ کو ''دلچسپ کہانی لیکن بری تاریخ'' کہا ہے۔ حضرت عمرؓ سے متعلق غلط طور پر یہ بیان منسوب کیا گیا ہے۔ 'اگر لائبریری کی کتابیں قرآنی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہیں تو یہ غیر ضروری ہیں۔ اگر قرآن کے خلاف ہیں تو یہ الحاد ہیں۔'

وکرم شیلا کا کتب خانہ کئی ماہ تک جلتا رہا۔ تاتاریوں کے حملے کے وقت بغداد کے کتب خانہ 'بیت الحکمت' کی کتابیں دریا برد کی گئیں اور ان سے دریا کا پانی کئی روز تک سیاہ رہا۔

۱۱۵۰ء میں خلیفہ مستنجد نے نادر کتابوں اور علمی اور سائنسی جرائد کو جلا ڈالا۔

ماؤزے تنگ نے بیسویں صدی میں کہا تھا۔ 'بہت زیادہ کتابیں پڑھنا مضرت رساں ہیں۔' اس ضمن میں وہ یہ دلیل دیتا ہے۔ 'چین میں ینگ خاندان کے دور حکومت میں دو حکمرانوں نے اچھا کام کیا۔ ان میں ایک ناخواندہ تھا اور دوسرا چند ہی حروف پہچانتا تھا۔ بعد میں چیا چونگ کے دور حکومت میں جب دانشور ارباب اختیار بنے تو حالات دگرگوں ہوگئے۔ ''مضمون پڑھنے کا فن'' میں لین یو تانگ رقم طراز ہے۔ 'کنفیوشس کا قول ہے۔ 'پچاس برس کی عمر کو پہنچو، تو نیرنگیوں کی کتاب پڑھو۔' ہر اچھی کتاب کو ایک بار پڑھنے کے بعد دوسری بار بھی پڑھنا چاہئے۔ عمر کے ایک حصے میں ہم جداگانہ رد عمل محسوس کرتے ہیں۔

اگر آپ کے خیالات اور تجربات [illegible] کے [illegible] تو دنیا کے بڑے بڑے ادبی شاہکاروں کا مطالعہ بھی فضول [illegible] آئیں، انہیں رہنے دو۔ تاکہ انہیں دوسرے لوگ پڑھیں۔

کیا قلم کار دوسرے لوگوں سے [illegible]؟

'ہر انسان میں وجدان ہوتا ہے لیکن فن کاروں میں [illegible] زیادہ ہوتا ہے۔' [illegible]

'عام لوگوں کی نسبت ادیب کی نگاہ زیادہ صاف [illegible]' [illegible]

قلم کار بھی آخر گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان ہے [illegible] بھی احساسات اور جذبات ہوتے ہیں۔ اس کے بھی ایک جیسے مسائل اور ضرور [illegible] ہیں۔ قد، وجیہ اور دلکش شخصیت کا مالک بھی ہوتا ہے اور بھونڈی صورت [illegible] ہے۔

سقراط بد صورت تھا۔ ایسپ ٹھگنا قد اور بد شکل تھا۔

ٹالسٹائی اپنے بارے میں یوں لکھتا ہے۔ 'چوڑی ناک، موٹے ہونٹ اور چھوٹی بھوری آنکھوں والا مجھ جیسا ایک انسان کیوں کر اس دھرتی پر خوش رہ سکتا ہے؟' تاہم میکسم گورکی ٹالسٹائی کی آنکھوں اور قوت مشاہدہ سے متعلق لکھتا ہے۔ 'ان دو آنکھوں میں ایک سو آنکھیں تھیں۔'

الیگزنڈر پوپ کا قد صرف ساڑھے چار فٹ تھا۔

بائرن کو کالج میں اپنے نازک بدن کی وجہ سے 'لیڈی' کہا جاتا تھا۔

بچوں کا مقبول کہانی کار ہنس اینڈرسن کو کمزور، دبلا پتلا، بد صورت اور گندہ بتایا گیا ہے۔ وہ دو مرتبہ کسی کی زلفوں کا اسیر ہوا لیکن یہ محبت پروان نہیں چڑھی۔

قلم کار عام انسان سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ بقول ایک نقاد 'اگر کسی مالی سے چنبیلی پھول سے متعلق پوچھا جائے تو وہ کہے گا۔ یہ چنبیلی ہے لیکن شاعر کہے گا یہ مانند کی حسینہ ہے۔'

حامد اللہ افسر 'تنقیدی اصول اور نظریے' میں رقم طراز ہیں۔ ''ایک خوبصورت ہرن دیکھ کر جب ایک وحشی انسان خوش ہوتا ہے تو اس کے سامنے اس کا گوشت ہوتا ہے۔ ایک حساس آدمی اس کے رنگ، چال اور ادا پر فدا ہوتا ہے۔''

ورجینا وولف کی کتاب Intensity of the Living Moment کا ذکر کرتے ہوئے قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں۔ ''میرا خیال ہے کہ گہری حسیت صرف عورت میں ہی پائی جاتی ہے چاہے وہ کیتھرین مینسفیلڈ ہوں، ورجینا وولف ہوں یا الزبتھ بوون۔''

اگا تھا کرسٹی شرمیلی اور خلوت پسند تھی۔ ساری زندگی وہ لوگوں کی نظروں سے دور اپنے گھر میں رہی۔ ماں نے اس کو اسکول نہیں بھیجا۔ وہ خود ساز تھی۔

کریڈ گارڈ، ٹالسٹائی، چارلس ڈکنز، کافکا سمیت بہت سارے قلم کار بڑے حساس تھے۔ فرانز کافکا زندگی میں چند تلخ تجربات کے بعد مذہب اور اخلاقیات کا منکر ہوا اور اپنی ذات سے اس کو گہری نفرت ہوئی۔ اس نے اپنی کتابوں کو دوبارہ شائع کرنے، غیر مطبوعہ تخلیقی مسودہ، خطوط اور اس سے متعلق دوسروں کے مضامین اور تحریروں کو بالکل نہ چھاپنے کے لئے اپنی خواہش کا اظہار کیا اور پرزور تاکید کی کہ ان کی تمام کتابوں اور تحریروں کو جلا دیا جائے تاہم اس کے دوست میکس بروڈ کی ترغیب اور کوششوں سے کافکا کی زندگی میں شائع شدہ کتابیں بک گئیں اور ان کی وصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کافکا کے مرنے کے بعد اس کی کتابیں دوبارہ شائع کیں۔

اسکاٹ لینڈ کے نامور شاعر اور گلوکار John Breckenridge

(۱۸۴۰ [illegible] نے مرنے سے پہلے اپنی نظموں کے سارے مسودے جلا دیے [illegible] چاہتا تھا اور شہرت سے دور بھاگتا تھا۔ اس نے اپنے [illegible] کی اجازت نہیں دی۔

[illegible] کہ رسائل کے مدیروں کے نام اپنی کہانیاں [illegible] لیٹر بکس میں ڈالتا تھا۔ غالباً یہ ان کے اوائل زندگی سے [illegible]

[illegible] اپنی طرف کھینچنے کے لئے کوئی نہ کوئی انوکھی حرکت کرتے۔ چنانچہ [illegible] انہوں نے ایک مرتبہ اپنی بھنویں منڈوالیں۔

ایک روز [illegible] ہوگیا کہ وہ ایڑیوں کے بل بیٹھ کر ہوا میں اڑ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس حالت میں [illegible] کر جو دیکھنا چاہا تو مکان کی چھت سے ۱۸ فٹ نیچے زمین پر گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے۔

ہربرٹ اسپنسر کو حکومت کے اداروں پر بالکل بھروسہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اپنا مسودہ پبلشر کو ڈاک میں بھیجنے کے بجائے خود دستی پہنچاتا تھا۔

فلسفی جارج [illegible] دماغ سے تعصب مٹانے کے لئے تشکیک کو اہم سمجھتا تھا۔

گوئٹے کو یہ غلط فہمی تھی کہ اس کی شہرت علم وادب سے کہیں زیادہ اس کے سائنسی نظریات کی وجہ سے ہے۔ گوئٹے کے سائنسی نظریات غلط ثابت ہوئے ہیں۔

فلسفی اور سائنس داں کی غائب دماغی زبان زد عوام ہے۔ قلم کار بھی ان کے زمرے میں آتا ہے۔ وہ اصل یہ اپنی سوچ اور کام میں اتنے مگن اور محو ہوتے ہیں کہ انہیں دنیا وما فیہا کا خیال نہیں رہتا ہے۔ سر والٹر اسکاٹ نے ایک دفعہ اپنی ایک نظم کو بائرن کی نظم سمجھ کر بڑی تعریف کی۔

شیلے کو اس کی بیوی میری اس کے مطالعہ کے کمرے میں کھانا بھیجتی تھی۔ اکثر وہ کھانا بھول جاتا تھا۔ بعد میں وہ بیوی کے پاس آکر پوچھتا تھا کہ اس نے کھانا کھایا ہے یا نہیں۔

ایک مرتبہ قلم کار جی۔ کے چیسٹرٹن ریل گاڑی سے بے خیالی میں ہاربورو نام کے ایک مقام پر اتر گیا۔ اور حیران وپریشان بیوی کو تار بھیجا۔ 'میں ہاربورو میں ہوں۔ مجھے کہاں ہونا چاہئے؟'

قلم کار لفظوں کا سوداگر ہوتا ہے۔ مشاہدہ اس کا لباس، تجربہ اس کی غذا اور تخیل اس کی قلمرو ہے---حافظ کا ایک شعر ہے:

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوئش، بخشم سمرقند و بخارا را

امیر تیمور نے حافظ کو بلا کر جواب طلبی کی کہ اس نے کس طرح اس کی سلطنت کے دو شہر اپنی محبوبہ کے تل کے لئے پیش کش کی جرأت کی۔

قلم کاروں کی ازدواجی اور عائلی زندگی:

بہت سارے قلم کاروں نے شادی نہیں کی۔ ان کا اوڑھنا بچھونا پڑھنا اور لکھنا رہا۔

شوپنہار نے شادی نہیں کی۔ اس کا پالتو کتا 'آتما' اس کا واحد ساتھی تھا۔ جسے چھوٹا شوپنہار کہا جاتا تھا۔

فلسفی تھوریو کو بھی شادی کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ وہ بڑا خلوت پسند تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فطرت اس کی دلہن ہے۔

فلسفی کانٹ کو دو مرتبہ شادی کرنے کی سوجھی۔ پہلی دفعہ روایتی غائب دماغ فلسفی کی طرح وہ اتنا لمبا اس سے متعلق سوچتا رہا کہ ان کی ہونے والی بیوی نے انتظار نہیں کیا اور کسی دوسرے کی ہوگئی۔ دوسری لڑکی شادی ہونے سے پہلے قصبہ چھوڑ کر چلی گئی۔

ایڈورڈ گبن ایک لڑکی پر دل دے بیٹھا لیکن باپ نے شادی کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے:

تب ایک پریمی کی طرح آہ بھری
لیکن ایک بیٹے کی طرح فرماں برداری کی

امریکی ادیب اور مورخ واشنگٹن ارونگ بھی ناکتخدا رہا۔ ایک لڑکی سے اس کی سگائی ہوئی تھی لیکن شادی سے پہلے وہ مرگئی۔ اور اس کی یاد اس کی ساری زندگی کا سرمایہ تھی۔

لیوس کیرول ساری زندگی کنوارا رہا۔ لیکن اس کو بچوں سے بڑا لگاؤ تھا۔

شادی کے معاملے میں جان رسکن بڑا نازک مزاج ثابت ہوا۔ شادی کی پہلی رات اپنی نوبیاہی دلہن کی اندام نہانی کے بال دیکھ کر وہ اتنا دل برداشتہ ہوا کہ بیوی سے الگ ہوگیا اور زندگی بھر جلق سے اپنی جنسی خواہش پورا کرتا رہا۔

برنارڈ شا بھی کنوارا رہا۔ کہتے ہیں اپنے سے عمر میں زیادہ ایک بیوہ خاتون کی جنسی ترغیب کے بعد وہ اتنا متنفر ہوا کہ زندگی بھر شادی نہیں کی۔

جیمز تھامسن شاعر تھا۔ اور کبھی شادی نہیں کی۔ لیکن زندگی عیاشی سے گزاری۔

چارلس لمب کی زندگی اپنی دماغی مریضہ بہن میری کی دیکھ بھال میں گزری۔ اور کبھی شادی نہیں کی۔ میری نے دیوانگی میں اپنی ماں کو ہلاک کیا تھا۔

شادی نہ کرنے والوں میں الیگزنڈر پوپ، ہنس اینڈرسن، جوناتھن سویفٹ اور میکالے جیسے بڑے قلم کار اور آئزک نیوٹن جیسے بڑے سائنس داں شامل ہیں۔

لیکن سبھی شادی شدہ قلم کار اور دانشور بیوی کے معاملے میں خوش نصیب نہیں ہیں۔ سقراط ٹالسٹائی، ابراہیم لنکن اور چارلس ڈکنز کی بیویاں جھگڑالو، غصیلی اور زود رنج تھیں۔ انہوں نے اپنی بدمزاجی سے خانگی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔

پشکن کی ماں تیز مزاج تھی۔ باپ نے پشکن کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ بچپن کے اس گھریلو ماحول نے اس کو باپ سے برہم اور ماں سے بیگانہ بنا دیا تھا۔

اولاد کے معاملے میں کئی قلم کاروں کی زندگی میں محرومی ہی محرومی لکھی تھی۔

غالب کے سارے بچے چل بسے۔ ایک عزیز کے نام اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: 'تمہارا لڑکا پیدا ہونا اور اس کا مرجانا معلوم ہوکر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ بھائی! اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ بہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے اور لڑکیاں بھی۔ اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔'

پھر اپنے بھانجے عارف کو گود لیا۔ وہ بھی خدا کو پیارا ہوا۔ غالب نے اس کی موت پر ایک دردناک مرثیہ لکھا ہے۔

غالب کی طرح امریکی معروف ناول نگار مارک ٹوئین نے زندگی میں اولاد کا دکھ سہا ہے۔ یکے بعد دیگرے اس کے چار بیٹے بیٹیاں مرگئے۔ شادی سے پہلے اس کے بہن اور بھائی مرگئے۔ ۲۳ سال کی عمر میں اسٹیم بوٹ کے ایک دھماکہ میں اس کا ایک بھائی جل کر مرگیا۔ مارک ٹوئین نے خودکشی کرنے کے ارادہ سے اپنے سر سے پستول لگایا لیکن لبلبی دبانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تب اس نے زندہ رہنے اور اپنے غموں کو قہقہوں میں بدلنے کا تہیہ کیا۔ اس کی تحریر میں مزاح کی خوب چاشنی ہے۔ فلسفی سولن کی طرح مارک ٹوئین کا اعتقاد تھا کہ موت سے پہلے غم سے مفر نہیں۔

ایک قلم کار پر اس کے ماحول اور جغرافیائی حالات کا اثر پڑتا ہے۔ انگریزی کے بڑے شاعر ورڈز ورتھ لیک ڈسٹرکٹ میں گراس میر کے مقام پر رہتا تھا۔ یہاں ۸۰ مربع میل کے رقبے میں پندرہ بڑی خوبصورت جھیلیں ہیں۔ ورڈز ورتھ نے گراس میر کو قدرت کی طرف سے انسان کو عطا کردہ خوبصورت ترین جگہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی شاعری میں فطرت کے حسن کا ذکر ہے، جو لیک ڈسٹرکٹ کی دین ہے۔ ایک مرتبہ کسی نے تنقید نگار میتھیو آرنلڈ سے پوچھا کہ کیا ورڈز ورتھ نے جھیلوں، پہاڑوں، پھولوں اور فطرت کے علاوہ بھی کچھ لکھا ہے؟

کولرج اور جان رسکن بھی ڈسٹرکٹ لیک میں رہتے تھے۔ جان رسکن کونیسٹن جھیل کے کنارے رہتا تھا جو گراس میر سے آٹھ میل دور ہے۔

قلم کار اور انسانی کمزوریاں:

'قلم کاروں نے جو پرچار کیا۔ خود اس پر عمل نہیں کیا۔ ان میں بڑی انانیت تھی۔ وہ کبھی سوچتے تھے کہ دنیا میں انقلاب لائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو انسان دوست کے روپ میں پیش کرتے ہیں لیکن ان کا عمل ان کے دعووں کی چغلی کھاتا ہے۔'
(پال جانسن)

بقول ایک قلم کار روسو Aristocracy اشرافیہ کی مہمان نوازی پر جیا۔ اس کی کتاب Social Contract کو شروع میں سراہا گیا لیکن بعد میں اس کا اثر ختم ہوا۔ وہ عاشق مزاج اور دل پھینک تھا اور بچوں سے نفرت کرتا تھا۔

ڈرامہ نگار ابسن بڑا جھگڑالو تھا۔ عام لوگوں سے اس کو نفرت تھی اور انہیں جاہل سمجھتا تھا۔ ابسن کا خیال تھا کہ ذہانت کم لوگوں کو ہوتی ہے۔ وہ جنس زدہ مغربی معاشرے کا حامی تھا۔

ٹالسٹائی شروع میں جواری، شرابی اور زانی تھا اور اپنے ناجائز بچوں کو اپنانے کے لئے تیار نہیں تھا۔

ژان پال سارتر اور آڈین نے روسی ڈکٹیٹر اسٹالین کی پالیسیوں کی حمایت کی ہے۔

جارج سائمینن نے دس ہزار عورتوں سے جنسی تعلقات کا دعویٰ کیا ہے۔ جن میں زیادہ تر طوائفیں تھیں۔

آسکر وائلڈ دو مرتبہ حظ غیر فطری کے جرم میں دو سال جیل میں رہا۔

بائرن کی اپنی half sister سے ناجائز تعلقات تھے۔ اس اسکینڈل کی وجہ سے وہ بدنام ہوا اور سوسائٹی سے خارج کر دیا گیا۔ تب بائرن نے انگلینڈ کو خیرباد کہا اور کبھی نہیں لوٹا۔

لارڈ چانسلر کی حیثیت سے فرانسس بیکن پر بدعنوانیوں کے تیس الزامات عائد کیے گئے۔ بیکن نے اقبال جرم کیا۔ قید کی سزا ہوئی اور چالیس ہزار ڈالر کا جرمانہ کیا گیا۔

کالرج افیون کا عادی تھا۔ الیکزنڈر پوپ جھگڑالو تھا۔

شیلے اسکول میں اپنے ہم جماعتوں میں "پاگل شیلے" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ 'الحاد کی ضرورت' کے عنوان سے ایک پمفلٹ لکھنے کی پاداش میں اس کو کالج سے نکال دیا گیا۔ پھر وہ ایک لڑکی ہیریٹ کے ساتھ بھاگ گیا اور ایک لڑکی کا باپ بنا۔ ۱۸۱۴ء میں وہ ایک اور لڑکی میری کے ساتھ فرار ہوا اور ایک بچہ پیدا ہوا۔ شیلے تیس سال کی عمر میں ایک سمندری سفر کے دوران ڈوب کر مر گیا۔ بقول جانسن 'شیلے بے رحم تھا اور سازشی ذہن رکھتا تھا۔'

پوپ کی طرح ولیم ہزلٹ بھی جھگڑالو تھا۔ اس کی [illegible] دو بیویاں اسے چھوڑ کر چلی گئیں۔ بن جانسن نے اپنے ایک [illegible] کو جان سے مار دیا۔ قتل کے الزام میں اس پر مقدمہ چلا۔ تاہم ایک پادری کی [illegible] سزا سے بچ گیا۔

ایڈگر ایلن پو بچپن سے ہی بڑا لاابالی تھا۔ شراب، عورت، [illegible] اس کی کمزوری تھی۔ جوا کھیلنے کی وجہ سے اس کو کالج سے نکال دیا گیا۔ پھر وہ [illegible] جب بندوق لے کر وہ پریڈ کو جاتا تھا تو وہ شاعری کرتا تھا۔ اس لئے [illegible] شامل ہوا۔ بالٹی مور میں تشدد کے ایک واقعہ میں پولنگ [illegible] اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

انگریز ناول نگار جیفری آرچر کو عدالت میں جھوٹ بولنے اور [illegible] کے لئے چار سال کی سزائے قید دی گئی۔

کیا اعصابی مریض اچھے قلم کار ثابت ہوتے ہیں؟

'ہر بڑی چیز (Neurotics) ذہنی مریضوں سے ملی ہے۔' (پرلوسٹ)

کیا اعصابی مریض اچھے قلم کار ہوتے ہیں؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے لیکن بہت سارے قلم کار اعصابی اور نفسیاتی مریض اور Schizoid تھے۔ ایسے قلم کاروں کی فہرست لمبی ہے۔ جن کو کم و بیش دماغی دورہ پڑا ہے، ان میں سموئیل جانسن، چارلس لمب، گوئٹے، بالزاک، ولیم جیمز، ٹالسٹائی، کونارڈ، پشکن، ایذرا پاؤنڈ، رسکن، [illegible]، ہربرٹ اسپنسر، نطشے، ایڈگر ایلن پو، جیک لنڈن، ولیم کولینز، جان ڈون، [illegible] بوسویل، گراہم گرین، ورجینا وولف، کولرج، ولیم گولڈنگ، بنیان، بائرن، شیلے، [illegible] سن، برمنز، یوکیو موشیما، رابرٹ مویل وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۴۹ء میں مطبوعہ میڈیکل جرنل کے مطابق بہت سارے عظیم قلم کار ذہنی مریض تھے اور نشیلی ادویات استعمال کرتے تھے۔

ایک نفسیاتی معالج انتھونی سٹور کے مطابق انگلینڈ کے ۴۷ سرکردہ قلم کاروں میں ۳۸ کے ذہنی امراض کا علاج معالجہ ہوا تھا۔ انتھونی سٹور کے مطابق تخلیق کاروں کو تخلیق پوری دیوانگی سے محفوظ رکھتی ہے۔ اور لکھنا ایسے کے لئے Therapy طبی علاج کا کام دیتا ہے۔

کافکا Schizoid تھا اور دوسروں کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ طنز نگار [illegible] سوفٹ کے دل و دماغ پر ساری زندگی جنون کا سایہ مسلط رہا جس کی وجہ سے وہ گرم مزاج اور سخت گیر بن گیا تھا۔ تاہم اس حالت میں بھی سوفٹ نے بہترین ادب پیدا کیا۔ آخری عمر میں نطشے میں حد سے زیادہ انانیت آگئی تھی اور اپنی تحریروں کو تنقید سے مبرا سمجھتا تھا۔ چرچل کا موڈ بدلتا رہتا تھا اور [illegible] Depressine [illegible] گیا ہے۔ ولیم گولڈنگ کو بھی غم کا دورہ پڑتا تھا۔

اردو کے قلم کاروں میں مولوی محمد حسین آزاد، [illegible] دماغی دورے پڑے ہیں۔

قلم کار اور خود کشی:

یہ امر مسلمہ ہے کہ ایک قلم کار حساس ہوتا ہے۔ [illegible] کو دیکھ کر اس کے دل کے آبگینہ کو ٹھیس لگتی ہے۔ حقائق کو [illegible] اس کا دل مچلتا ہے۔ ظلم کے خلاف اس کی صریر خامہ [illegible] میں سنی جاتی ہے۔

ورجینا وولف دوسری جنگ عظیم کی [illegible]

ورجینیا وولف نے اسی عالم میں اپنے کو پانی میں ڈبو کر جان دے دی۔

کئی قلم کار ایک اور حساس دل معمولی ناکامی پر انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرتا ہے۔ امریکی شاعر ہارٹ کرین کو اظہار خیال کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملے تو اس نے خود کشی کر لی۔ ایک قلم کار جان کینیڈی ٹول نے اپنے ناول A Confederacy of Dunces کے مسودہ کے پبلشروں کی طرف سے متعدد بار مسترد ہونے پر خود کشی کر لی۔ تب وہ اکتیس سال کا تھا۔ بعد میں اس کی ماں کی کوشش سے جب یہ ناول چھپا تو یہ بہت پسند کیا گیا اور اسے امریکہ کا بہترین ادبی انعام پولیٹزر ملا۔ ٹول نے یہ ناول چھبیس سال کی عمر میں لکھا تھا۔

ہمینگوے جب لکھنے، کھانے اور پینے کے قابل نہیں رہا تو خود کشی کر لی۔

تھامس چاٹرٹن ایک نوجوان شاعر تھا۔ قلم سے اس کا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ کئی دفعہ فاقہ کشی کی نوبت آتی تھی۔ ایک مرتبہ بھوک سے وہ قریب المرگ تھا۔ مالکن نے، جہاں وہ کرائے پر رہتا تھا، کھانے پر بلایا۔ لیکن اس کی خود داری نے گوارہ نہیں کیا اور اس نے سنکھیا کھا کر خود کشی کر لی۔ تب وہ صرف اٹھارہ سال کا تھا۔

کئی نامور قلم کاروں نے اس وقت خود کشی کی جب وہ شہرت کے آسمان پر تھے۔ ان میں نوبل انعام یافتہ جاپانی ناول نگار یوکیو میشیما اور پولیٹزر اور نیشنل بک ایوارڈ پانے والا قلم کار جان بیری مین شامل ہیں۔ یوکیو میشیما نے جاپانی روایت کے مطابق ہراکیری طرز پر اپنے پیٹ میں خنجر گھونپ کر خود کشی کی۔ جان بیری مین نے دریائے میسی پی میں کود کر اپنی جان دے دی۔

کو نسٹلر زیادہ دوائیاں پی کر موت سے ہم کنار ہوا۔ وہ خون کے کینسر اور پارکنسن کے مرض کا شکار تھا۔

اسکاٹ فیز جرالڈ اور برینڈن بیہن کثرت مے نوشی سے مر گئے۔

پریمو لیوی ایک دفعہ خود کشی سے کسی طرح بچ گیا۔ لیکن دوسری دفعہ اپنے آپ کو گھر کی سیڑھیوں پر گرا دیا اور مر گیا۔ بعد میں اس کی بیوی نے بیان دیا کہ وہ زندہ رہنا نہیں چاہتا تھا۔

خود کشی کرنے والے قلم کاروں میں سسلویا پلاتھ، رومین گارے، سیمون دیل، رطزال جاریل، پاؤلو یاشی ویتے اور کیسر پاوے شامل ہیں۔

مغرب میں کامیاب مصنفوں کی کتابیں لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں بکتی ہیں:

خاص کر ناولوں کی بڑی مانگ رہتی ہے۔ گینیز بک آف ریکارڈز میں اگاتھا کرسٹی کو کامیاب ترین ناول نگار قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے ۶۹ ناول اور ۱۹ ڈرامے لکھے، جن کا ۲۱۸ سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ اور ان کی دو ارب سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق اگاتھا کرسٹی کی کتابیں انجیل مقدس اور شیکسپیئر کی تصنیفات سے زیادہ بکی ہیں۔ ان کے ڈرامے بھی لوگ بڑے شوق سے دیکھتے۔ اس کا مقبول عام ڈرامہ The Mouse Trap نومبر ۱۹۵۲ء سے ۱۹۹۱ء تک سولہ ہزار مرتبہ اسٹیج ہوا۔ اسے دنیا میں سب سے زیادہ دکھایا جانے والا ڈرامہ تصور کیا جاتا ہے اور مصنفہ کا نام ان کے [illegible] ناولوں میں سر فہرست ہے، جن کے ناول کروڑوں کی تعداد میں بکتے ہیں۔

[illegible] کا شمار [illegible] میں ہوتا ہے، جن کے ناولوں کی بڑی مانگ ہے۔ اب تک ان کے [illegible] سات کروڑ سے زیادہ کاپیاں بکی ہیں۔

اس کے شاہکار ناول Carpet Beggers سمیت تین ناولوں پر فلمیں بنی ہیں۔ نامور قلم کار نیویل شوتے لکھتا ہے۔ 'میری رائے میں ناول کے قارئین بڑے ذہین ہیں، جو ناکام ناول نگار نہیں مانتے ہیں۔ جیمز ہیڈلے نے اسی سے زیادہ جاسوسی ناول لکھے ہیں اور ان کی دو کروڑ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئی ہیں۔

The Day of the Jackal فریڈرک فورسٹھ کی مقبول ترین تصنیف ہے۔ صرف پیپر بیک ایڈیشن میں ۱۹۸۹ء تک اس کی ایک کروڑ سے زیادہ کاپیاں بکیں۔

روسی نوبل انعام یافتہ قلم کار شولوخوف کا ناول Quick Flows the Don کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہوا۔

انگریزی میں لکھنے والا ہندوستانی ادیب آر۔ کے نرائن کی تصنیفات کا تیس سے زائد زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کا شمار برصغیر ہند کے سب سے زیادہ معاوضہ پانے والے چند قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ اور ان کی کتابیں کثیر تعداد میں فروخت ہونے والی کتابوں میں آتی ہیں۔

ایک فرانسیسی قلم کار انتوئین ڈے سینٹ ایکزو پیری کی کتاب The Little Prince مذہبی صحیفوں کے بعد دنیا کی سب سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ شدہ تصنیف مانی جاتی ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں اس کا تمل، تیلگو، ملیالم، ہندی، بنگالی، مراٹھی، کنڑ، پنجابی وغیرہ میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس پر فلم بھی بنی ہے۔ مصنف ایک ہواباز تھا اور ہوائی معرکوں میں بہادری کا مظاہرہ کیا تھا۔ بچپن میں اس کی ماں اس کو ہنس انڈرسن کے پریوں کی کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ The Little Prince پر ان کا اثر ہے۔

سنجیدہ موضوعات کی کتابیں عموماً کم فروخت ہوتی ہیں۔ یہ عام قارئین کے فہم و فراست سے بالاتر ہوتی ہیں۔ تاہم کئی مصنفوں کے سنجیدہ موضوعات کی کتابیں بیسٹ سیلر میں شمار ہوتی ہیں۔ ان میں برٹرینڈ رسل، سارتر، ڈیل کارنیگی، اسٹیفن ہاکنگ، آدم اسمتھ وغیرہ شامل ہیں۔

اسٹیفن ہاکنگ کی کتاب A Brief History of Time کی کئی کروڑ کاپیاں فروخت ہوئی ہیں۔

آدم اسمتھ کی The Wealth of a Nation اور ڈیل کارنیگی کی How to Win Friends and Influence People دنیا میں بہت زیادہ بکنے والی کتابوں میں ہیں۔

تیرہویں صدی کے فارسی شاعر شیخ سعدی کی کتابیں، خاص طور پر گلستاں اور بوستاں کا دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے اور ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اسی طرح عمر خیام کی رباعیوں کا انگریزی سمیت دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ اور مقبول ہوئی ہیں۔

مغرب میں ایک کامیاب ادیب کی آمدنی بہت زیادہ ہے۔ وہ لاکھوں کروڑوں ڈالروں میں کھیلتے ہیں۔ ایک مشاہدے کے مطابق ایک مقبول ادیب کی آمدنی کے سامنے وزیر اعظم کی تنخواہ جیب خرچ جیسی لگتی ہے۔ اگر قلم کار صرف دو تین ہی اچھی کتابیں لکھیں تو ان سے معقول رائلٹی پاتا ہے اور ساری زندگی مادی طور پر آرام سے رہ سکتا ہے۔

ایلیا اہرن برگ جیسا قلم کار، جن کا شمار اگرچہ چوٹی کے ادیبوں میں نہیں ہوتا ہے، اپنی قلمی آمدنی کی بدولت ٹیکساس کے تیل کے Tyooon ارب پتی کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔

انیسویں صدی میں سر آرتھر کینن ڈائل کو ایک کہانی کے لئے ۲۵۰ سے ۵۰۰

ڈالر ملتے تھے۔ جب ڈالر کی قیمت آج سے بہت زیادہ تھی۔ ایک امریکی جریدے نے مصنف کو تین ہزار پانچ سو الفاظ پر مشتمل ایک کہانی کے لئے فی ڈالر فی لفظ کے حساب سے معاوضہ دیا۔ جریدے نے ان سے ایسی چھ کہانیاں حاصل کیں۔ اپنی کتابوں کے لئے وہ اس سے زیادہ معاوضہ پاتا تھا۔

گزشتہ صدی کے دوران ارنسٹ ہمینگوے کو ایک کہانی کے لئے چودہ ہزار ڈالر ملے۔ سوائے فلمی کہانی، کسی ادیب کو ایک کہانی کے لئے اتنی بڑی رقم نہیں ملی ہے۔

ایچ۔ جی ویلز کو ایک فلم کمپنی نے ان کی ایک کہانی کا عنوان فلم کے لئے استعمال کرنے کے عوض آٹھ سو ڈالر کا ایک چیک بھیجا۔ ویلز کو حیرت ہوئی کیونکہ ان کو یہ علم نہیں تھا کہ ان کی کہانی کا عنوان استعمال کیا گیا ہے۔

جارج برنارڈ شا نے ایک مرتبہ ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ ان کی نگارشات کا ہر لفظ ایک ڈالر کی قیمت رکھتا ہے۔ ایک شخص نے اپنے خط کے ساتھ ایک ڈالر منسلک کر کے شا کو لکھا کہ ایک لفظ دے دیں۔ شا نے اس ستم ظریف کو جواب میں ایک لفظ لکھا۔ وہ لفظ تھا۔ ''شکریہ۔''

ایڈگر والس جب شہرت کی معراج پر تھا تو انہیں سالانہ پچاس ہزار سے ایک لاکھ ڈالر کی آمدنی تھی۔ تب ڈالر کی قیمت بہت زیادہ تھی۔

زین گیرے کو رسائل کے مدیر ایک کہانی کے لئے پانچ ہزار ڈالر دیتے تھے۔ کئی دفعہ کہانی لکھنے سے پہلے رقم پیشگی ادا کی جاتی تھی۔

ولیم روجرز آج سے نصف صدی پہلے اخبار میں اپنے روزانہ کالم کے لئے ۸۰ پونڈ لیتا تھا، جو اس زمانے میں بڑی رقم تھی۔ وہ ایک مزاحیہ تقریر کے لئے دو سو پونڈ اور ریڈیو میں ایک منٹ کی بات چیت کے لئے ۶۶ پونڈ کماتا تھا۔

آج ایک کامیاب قلم کار کو اس سے کہیں زیادہ اچھی آمدنی ہے۔ اپنی کتابوں کے لئے الگ سے رائیلٹی ملتی ہے۔ ایک مشہور قلم کار تین چار سکریٹری رکھتا ہے۔ خود قلم کار ایک پرسکون جگہ تخلیقی کام کرتا ہے۔ تخلیق سے پہلے خوب ریسرچ کرتا ہے۔ وہ کسی چیز کا ریسرچ نہ کر سکے یا کسی جگہ نہ جا سکے تو تحقیق کے لئے اپنے سکریٹری کو بھیجتا ہے۔

مغرب میں لکھنے والا ایک اچھی کتاب اور اچھی تخلیق کے علاوہ ٹی وی کے ایک دلچسپ پروگرام اور ایک اچھے ریڈیائی نشریے کے لئے ناظرین اور سامعین سے اچھا Feed back پاتا ہے۔ لوویل تھامس کو اپنے ایک ریڈیائی نشریہ کے لئے دو لاکھ چھیاسٹھ ہزار تار موصول ہوئے۔ کارٹونسٹ رابرٹ ایل ریپلے کو دنیا کے مختلف حصوں سے سالانہ دس لاکھ خطوط موصول ہوتے تھے۔ ۱۹۳۲ء کے ایک سال کے دوران تیس لاکھ خطوط ملے جو اوسطاً یومیہ آٹھ ہزار سے زیادہ خطوط بنتے ہیں۔

آج کل انٹرنیٹ سے ذرائع ابلاغ اور ترسیل کی ٹکنالوجی میں انقلاب آنے کی وجہ سے ای میل وغیرہ کے ذریعے رد عمل فیڈ بیک اور اطلاعات فوری طور پر ملتی ہیں۔

غریب اور ترقی پذیر ملکوں میں کتابیں کم پڑھی جاتی ہیں:

ان ملکوں میں کتابیں خریدنے میں ایک بڑی رکاوٹ ان کا زیادہ دام ہے۔ خاص طور پر بیرون ملک میں چھپنے والی کتابیں، جو عموماً انگریزی میں دستیاب ہیں، عام مشرقی قارئین خریدنے کے متحمل نہیں ہیں۔

ابلاغ عامہ کے مختلف وسائل، خاص طور پر ٹی وی کی وجہ سے کتب بینی پر منفی اثر پڑا ہے۔ تاہم پڑھنے والے [illegible] امریکہ اور یورپی ممالک میں کتب بینی پہلے [illegible] تھی۔ اب دوبارہ کتب بینی کی تجدید ہوئی ہے۔

زمانہ حال میں ہر ملک میں قلم کاروں کی [illegible] خاص کر ترقی یافتہ ملکوں میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ پچھلی صدی کی ساٹھ کی دہائی کی ایک رپورٹ کے مطابق امریکہ میں دس لاکھ سے زیادہ قلم کار تھے [illegible] پیشہ ور تھے۔ ان کی تعداد میں اب مزید اضافہ ہوا ہوگا۔

کمیونسٹ حکومت کے قیام کے بعد سوویت یونین اور دوسرے کمیونسٹ ملکوں میں بقول شخصے شعرا حشرات الارض کی طرح پیدا ہوئے تھے۔ صرف روس میں ان کی تعداد چالیس ہزار تھی۔

قلم کار کیا کہتے ہیں:

'ہمیں اپنے قلم اور زبان کے استعمال کا فطری حق ہے۔' (والٹیر)

والٹیر کو جب جلاوطن کیا گیا تو پروشیا کے بادشاہ فریڈرک نے اسے مدعو کیا اور اپنی تعریف میں چند نظمیں لکھنے کے لئے کہا۔ لیکن والٹیر اپنے قلم کو بدنام کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوا اور سوئٹزر لینڈ چلا گیا۔

بائرن رقم طراز ہے: ''میں نے کبھی لوگوں کی چاپلوسی نہیں کی اور نہ کبھی ایسا کروں گا۔ جب تک مجھے ایک بھی قاری ملے، میں اپنے خیالات شائع کروں گا۔''

ڈبلیو۔ ڈبلیو میکسویل لکھتا ہے۔ 'میں چند قلم کاروں کے اس ذہنی رجحان کو نہیں سمجھ سکا ہوں جو بظاہر بڑے خلوص سے کہتے ہیں کہ وہ اپنی خوشی کے لئے لکھتے ہیں اور انہیں اس بات کی پروا نہیں ہے کہ کتنے زیادہ یا کتنے کم لوگ ان کی تخلیقات پڑھتے ہیں۔ ایک قلم کار کا پہلا فرض یہ ہے کہ قارئین بنالیں اور انہیں قائم رکھیں۔' اس کے جواب میں ایک ادیب ہاگ والپول کہتا ہے۔ 'ایک قلم کار کا (تخلیقی کام سے) خوشی حاصل کرنا اس کے لئے دیرپا معاوضہ ہے۔'

میکسویل کا کہنا ہے 'قلم کاروں خاص کر نوعمر لکھنے والوں کو اپنی بہترین تخلیقات منظر عام پر لانے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہئے۔'

پولینڈ کے نوبل انعام یافتہ ادیب آئزک باشیویس (Issac Bashevis) کا خیال ہے کہ ایک ادیب کے لئے یہ صحت مند امر ہے کہ کم عمری میں اسے شہرت نہ ملے...... شہرت نے بائرن کی ذات کو نقصان پہنچایا ہے۔ البتہ اس کے کام کو نقصان نہیں پہنچا ہے۔'

ارنسٹ ہیمنگوے کہتا ہے۔ 'کئی مقامات پر بڑے قلم کار کو صرف مرے ہوئے قلم کاروں سے ہمسری کرنا پڑتا ہے۔ انقلاب کے فوراً بعد کے سالوں میں روس میں رہنے والے ادیبوں نے اسی روایت کو برقرار رکھا اور اپنے فوت شدہ قلم کاروں سے مقابلہ کیا۔'

پرنس کروپاٹکن کے یہ الفاظ غور طلب ہیں:

'کیا تم قلم کار بننے کی آرزو رکھتے ہو؟ تو اپنے ملک کے معائب کی داستان پر نظر ڈالو۔ اور اگر اس کے بعد تمہارا دل خون نہیں ہو جاتا، تو اپنے قلم کو پھینک دو۔ قلم کا ''صرف'' صرف یہ ہے کہ یہ تمہارے بے حس دل کی خباثتوں کا پردہ فاش کرتا ہے۔'

☆☆☆

کرشن موہن

[illegible]

ٹیگور اور پکاسو

ٹیگور ایک بڑا شاعر تھا اور مصور بھی
لیکن اس کی کویتا اس کی تصویروں پر حاوی تھی
اور پکاسو بڑا مصور تھا اور شاعر بھی
لیکن اس کی تصویریں اس کی کویتا پر حاوی تھیں
اوجِ فن تو ایک شخص کو ایک ہی فن میں حاصل ہو سکتا ہے

ہمدرد:

کس قدر ہمدرد ہے گو سرد ہے وہ
اس قدر ایذا زدہ ہوئی میری بیوی
میرے مرنے کی دعائیں مانگتی ہے

ناگفتنی:

میں جو اپنے آپ کو رب سمجھا تھا
اسی سالہ کایا کو بھی مایا کب سمجھا تھا
لیکن اب تو حال مرا ناگفتہ بہ ہے
دیکھ کے جس کو بیوی نے یہ مجھ کو سمجھایا
اچھا مرن کیوں کر نہیں لیتے
آپ کی سیوا کرتے کرتے
جیتی ہوں میں مرتے مرتے
میں نے کایا سیوا کی مایا کو اب سمجھا ہے
سوز دروں کا مطلب سب سمجھا ہے

نا تمام:

میں نے چھبیس کتابیں لکھیں
ایک دو رہ گئیں ان لکھی بھی
لطف کیا آئے اگر کام مکمل ہو جائے
پھر تکمیل دل زار نہ چنچل ہو جائے

فالتو:

مرے بچپن کے سال و سن چہیتے پالتو تھے
کہیے یہ کرشن موہن
ضعیفی کے یہ سال و سن کٹیلے فالتو ہیں

سکھ کی دعائیں:

میرے مرنے کی دعائیں مانگتی ہے نیک بخت
تاکہ مٹ جائے بھینکر دکھ مرا، پاؤں سکوں
کتنی خدمت اور کر سکتی ہے اس کی جان سخت
اس کا دل ہے میرے دکھ میں لخت لخت
جب ہو اذیت خیمہ زن
زار و نزار ہوں جان و تن
ایسے میں
اچھا مرن ہے اچھا مرن

غزل

رنج و کلفت کی انتہا بن کر
زندگی رہ گئی سزا بن کر

میرا ماضی ہوا ہے مستقبل
سوزِ حرماں کا ماجرا بن کر

بند غم ہوگئی حیات مری
آرزوؤں کا سلسلہ بن کر

عمر افسردہ کٹ گئی آخر
شیب پر عیب کا گلہ بن کر

خواہش زر نے مار ڈالا ہے
دلِ سادہ کی آشنا بن کر

دلیش ایسا ہو جس میں پیش آئے
زیست ہر لحہ مرحبا بن کر

کرشن موہن رہِ سیاست میں
راہزن آئے رہنما بن کر

۱۵۸۔ پشپانجلی، آئی پی ایکس ٹینشن ۱۱ دہلی۔ ۱۰۰۹۲

علقمہ شبلی

چنا یہ راستہ کیسا؟

چنا یہ راستہ کیسا
اندھیرا گھپ اندھیرا ہے
دمکتا ہے کوئی چہرہ
نہ ہونٹوں پر ہمکتا ہے کوئی نغمہ
بدن جلنے کی بو،
بم کا دھماکہ
ذائقہ خوں کا
بلکتے ہیں کہیں بچے
سسکتی ہیں کہیں مائیں
جواں آنکھوں میں ہیں چنگاریاں رقصاں
بڑھاپا قفل بر لب ہے
گزرنے کو تو گزری موجِ خوں سر سے
مگر سہا ہوا ہے من کا پنچھی آج بھی، دیکھو
ذرا پتہ جو کھڑکا تیز دھڑکن ہو گئی دل کی،
لہو رنگ اب بھی ہیں دیوار و در سارے
نہ ہونٹوں پر تبسم ہے
نہ آنکھوں میں رمق ہے زندگانی کی
کہیں گم ہو گئی ہیں نیند کی پریاں
فضا میں خامشی ہے
جیسے پھر طوفان آئے گا
چنا یہ راستہ کیسا؟

۵/۸۹۔ رپن اسٹریٹ، کلکتہ۔۷۰۰۰۱۶

شاہد کلیم

یہاں جنگل نہیں کوئی

بہت سی کویلیں
ہر سال آتی ہیں
ہزاروں میل لمبی راہ طے کر کے
بہت سے جنگلوں کو چھوڑ کر
جیسے ہی رُت
گرمی کی آتی ہے،
یہاں کچھ آم کے ہیں پیڑ
کچھ سرسبز برگد کے
ہری شاخوں پہ جن کی بیٹھ کر
سُر تال پر ٹھنڈی ہواؤں کے
خوشی کے گیت گاتی ہیں
ٹھٹھرتے یخ زدہ موسم کی
آمد سے ذرا پہلے

وہ پھر
اپنے وطن کو لوٹ جاتی ہیں

یہاں جنگل نہیں کوئی
یہاں اک چھاؤنی ہے
ہمیشہ توپ، بم، بارود
گولی کے دھماکے ہوتے رہتے ہیں
یہاں وہ پھر بھی آتی ہیں
انہیں خطرہ نہیں کوئی
مگر ان پیڑوں پر
اب بیٹھتے ہیں گدھ
ہرے پتے جھلستے جا رہے ہیں
پیڑ سارے ٹنڈ ہوتے جا رہے ہیں
کویلیں
اگلے برس پھر آئیں گی — لیکن
وہ غمگیں ہو کے
واپس لوٹ جائیں گی

دودھ کٹورا، آرہ۔ ۸۰۲۳۰۱

جگن ناتھ آزاد

سادھو اور جگیاسو

سادھو:
جیون لیلا باورے، دھوپ چھاؤں کا کھیل
سکھ بھوگے ہنس کھیل کر، دکھ بھی ہنس کر جھیل
دکھ سے لڑنے کے لئے، من پر کر ادھیکار
جب تک من بس میں نہ ہو، سب جپ، تپ بیکار
آنچل اس کے ہاتھ سے، تو مت اپنا چھین
اوجھل من کی آنکھ سے، دنیا رہے نہ دین

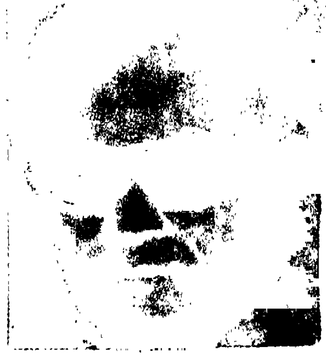
جگیاسو: (متجسس)
دکھ پہاڑ بھولے نہیں، جتن کیجئے لاکھ
میرے من سے پوچھئے، سونا ہوا ہے راکھ
ایک تو دکھ پہچان کا، گھیرے ہے دن رات
دوجا دکھ اس سے بڑا، سب نے کھینچا ہات
دنیا دونوں ہاتھ سے، کر دیتی مجبور
سکھی دیکھ سہتی نہیں، دکھ میں دوڑے دور

سادھو:
سکھ ڈھونڈے ہے تو کہاں، اپنے بھیتر جھانک
تیرے پاپوں کی گٹھڑی، تجھ سے اونچی ڈھانک
یگوں یگوں سے چل رہی اس دنیا کی ریت
سکھ دکھ جیون موت کا ملا جلا سنگیت
دکھیا سب سنسار ہے، پھل کرنی کا پائے
سکھ دوجے کا دیکھ کر دکھ بھاری ہو جائے

جگیاسو:
داتا! وہ وردان دے، گرے دکھوں پہ گاج
کل کا دن اچھا گیا، اور اچھا دے آج

ڈی۔۳۵۱ بلجیت نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۸

غزلیں



مظفر حنفی



قیصر شمیم

بشر کے ہاتھ متاعِ عزیز آئی ہے
کئی ہزار برس میں تمیز آئی ہے

ہر ایک پھول ہے فانوس کی حفاظت میں
بہار اب کے نہایت دبیز آئی ہے

نہیں گلاب پلٹ کر ابھی نہیں آیا
لہو لہان کوئی اور چیز آئی ہے

کھڑے ہیں دھوپ کے پرچم تلے درودیوار
سمجھ رہے تھے محل میں کنیز آئی ہے

کسی کے آگے مظفر نے سر جھکایا نہیں
نہ اونچ نیچ کی اس کو تمیز آئی ہے

(۲)

چراغ اپنے ہوا دینے سے پہلے
جلانے تھے، بجھا دینے سے پہلے

میاں، کیا لازمی تھا خاک اڑانا
کسی کو راستا دینے سے پہلے

نسیمِ صبح کو آیا پسینہ
خزاں کو بد دعا دینے سے پہلے

ملا سکتے ہو کیا ہم سے نگاہیں
بغاوت کی سزا دینے سے پہلے

مناسب ہے کہ پڑھ لی جائے تختی
کسی در پر صدا دینے سے پہلے

ہمارا ہارنا طے ہو چکا تھا
تمہارے ہاتھ اٹھا دینے سے پہلے

سخی مشہور تھے ہم بھی مظفر
مگر سب کچھ لٹا دینے سے پہلے

۳۵۸۔ غلہ ہاؤس، اوکھلا، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

سب کا بھلا ہو جس سے، ایسا ارادہ رکھیے
نظریں بلند رکھیے، دل کو کشادہ رکھیے

سب سے دراز دستی کرنے لگا ہے موسم
اس سے ذرا بچا کر اپنا لبادہ رکھیے

رکھتا نہیں ہے کوئی اب سن کے ہاتھ دل پر
لفظوں میں دھار والے نشتر زیادہ رکھیے

اک پل میں ہم جو چاہیں رکھ دیں بساط الٹ کر
شہ زد پہ آچکا ہے، اپنا پیادہ رکھیے

آنکھیں اگر نہیں ہیں، منزل نہ مل سکے گی
اب خواہ پیر رکھیے یا پیر زادہ رکھیے

آنے لگے ہیں ملنے میخوار شہر بھر کے
ہر وقت اپنے گھر میں اب جام و بادہ رکھیے

ہر شخص پر بھروسہ کرنے کے دن نہیں ہیں
اپنا مزاج قیصر اتنا نہ سادہ رکھیے

۱۰ ابراہیم گھوش لین، ہوڑہ۔ ۷۱۱۱۰۲

غزلیں

جعفر رضا

الٹے سیدھے الزاموں سے تنگ کرے ہے اکثر وہ
میرے اندر بیٹھ گیا ہے، تاریکی میں چھپ کر وہ

میں نے تم کو منع کیا تھا، دل کی بات نہیں کہنا
تم نے ہر اک بات بتادی، چڑ جائے گا، اس پر وہ

اب تک جو کچھ بھی سمجھا ہے، اس نے غلط سمجھا ہے مجھے
رکھتا ہے ناکردہ گنہ کی، ساری تہمت مجھ پر وہ

میں تو مخاطب دنیا سے تھا، پھر یہ کیسی بات ہوئی
چونک پڑا ہے جاتے جاتے، میری کہانی سن کر وہ

بیلا اور چمیلی مہکے، دُوب کی ہریالی لہکے
قطرۂ شبنم چمکے کرن سے، ایک خیالی پیکر وہ

اس کے مظالم یاد کروں تو، سارے بدن میں لرزہ آئے
لیکن اس کو بھول نہ پاؤں، ایسا ہے اک دلبر وہ

مجھ کو اس سے بچھڑے ہوئے تو، ایک زمانہ بیت گیا
دل میں ایک کسک ہے باقی، یاد آئے ہے اکثر وہ

شبستان، ۲۱۸/ ۲۵۴۔ شاہ گنج، الٰہ آباد۔ ۲۱۱۰۰۳

(۲)

حادثوں سے بھری بے رنگ کہانی میری
آج چھوڑو، کبھی سن لینا، زبانی میری

سر کا دیواروں سے ٹکرانا، کہانی میری
کتنے ارمان سے آئی تھی، جوانی میری

آپ بھی خوابوں سے بیزار نظر آئیں گے
سنئے گا؟ خواب کی تعبیر زبانی میری

کچھ تو کہتا، وہ دلاسا نہیں دیتا، نہ سہی
وہ تو خاموش رہا، سن کے کہانی میری

کیا سمجھ سکتا ہے، کیا کیا نہیں دکھ جھیلے ہیں
کوئی دیکھے جو طبیعت کی روانی میری

وہ تو بس ماں کی دعائیں تھیں، بچا کر لائیں
ورنہ، تھی ختم بلاؤں میں، کہانی میری

وہ مرا گاؤں، جہاں آتی ہے، جنت سے ہوا
یادیں وابستہ ہیں، کتنی ہی، سہانی میری

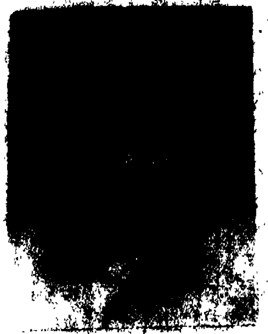
یہ نگارش نہیں، لختِ دلِ شوریدہ ہے
ہے جدا سب سے، عبارت کی روانی میری

خوں کی قلت نے، یہ پہنایا ہے جوڑا مجھ کو
اور وہ کہتے ہیں، پوشاک ہے دھانی میری

کتنا دلکش ہے دعا اور اثر کا رشتہ
صبح سے ملتی رہی، شام سہانی میری

ان کے احساس تفوق کو سدا چھیڑے گی
ہمہ دانی کی طرح، ہیچ مدانی میری

خالد عبادی



تو دل کی طلب، دل کی عطا، دل کی عنایت
منزل کے لئے چاہئے منزل کی عنایت

پٹکا کیا موجوں نے بہ دیر اپنے سروں کو
یاد آئی کبھی ہم کو جو ساحل کی عنایت

یہ دور ہی ایسا ہے مرے چاہنے والو
جینے کے لئے چاہئے قاتل کی عنایت

ہے وادیِ پر شوق مری ہو سے پریشاں
دنیا ہے مرے ادنیٰ مشاغل کی عنایت

ہنستی ہے مجھے دیکھ کے تقدیر بہاراں
گاتی ہے مجھے دیکھ کے پائل کی عنایت

انجام تو معلوم نہیں کارِ جنوں کا
پھولوں پہ رہی خوب عنادل کی عنایت

میں شعر کہوں اور سناؤں انہیں جا کر
دیکھی ہی نہیں جن نے غمِ دل کی عنایت

پابند کیا ہم کو عبادی نے وفا کا
تا دور رہی ساتھ سلاسل کی عنایت

بہار اردو اکیڈمی، اشوک راج پتھ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴

غزلیں



حنیف نجمی

بدن کی حد سے مجھے ماورا نہ ہونا تھا
اسے بھی رہن رسوم وفا نہ ہونا تھا

مجھے بھی رہنا تھا پیوستہ خاک سے اپنی
اسے بھی شاخ سے اپنی جدا نہ ہونا تھا

میں مطلقاً ہی تھا اپنے ہی پانیوں میں اسیر
اسے بھی دست ہوا سے رہا نہ ہونا تھا

میں سرنگوں تھا گراں بارئ، امانت سے
وہ قرض تھا جو کسی سے ادا نہ ہونا تھا

میں ٹھنڈی آگ میں جل کر ہوا تھا خاکستر
وہ خشک پیڑ تھا جس کو ہرا نہ ہونا تھا

میں گرد راہ تھا مجھ کو فلک سے کیا نسبت
مگر اسے بھی فلک آشنا نہ ہونا تھا

ہوس کا مارا بس اک دل گرہ میں تھا اپنی
نصیب اسے بھی دل باصفا نہ ہونا تھا

ہوا نہ شاکی میں روز سیاہ سے اپنے
کہ اس کی شب کو ستارہ کشا نہ ہونا تھا

چلن سے اس کے سروکار کچھ نہ تھا مجھ کو
میں کچھ بھی کرتا اسے غمزدہ نہ ہونا تھا

مرا اثاثہ فقط اک پرانی چادر تھی
عطا اسے بھی لبادہ نیا نہ ہونا تھا

وہ کہکشاں کا مری آخری ستارہ تھا
اسی پہ ختم مگر سلسلہ نہ ہونا تھا

بلند کر نہ سکی اس کی بندگی مجھ کو
وہ آدمی تھا اسے بھی خدا نہ ہونا تھا

یہ سب کرشمہ تھا نمرود کی خدائی کا
سو بندگی میں کسی کا بھلا نہ ہونا تھا

فیصل ولا، مودہا، ہمیر پور۔ ۲۱۰۵۰۷

نور پیکر

بس ایک ہلکی سی ٹھوکر لگی تھی پتھر سے
سنبھلنا چاہا تو دستار گر گئی سر سے

میں اپنے کنبے کا تنہا کمانے والا ہوں
چھپاؤں کیسے غریبی دریدہ چادر سے

خراش تک نہیں آتی ہے جسم پر کوئی
وہ وار کرتا ہے دل پر زباں کی خنجر سے

تری نگاہ نے جینے کا حوصلہ بخشا
میں ٹوٹ پھوٹ گیا تھا بہت ہی اندر سے

لہولہان ہوئیں ساری انگلیاں اس کی
جو چن رہا تھا شکن رات اپنے بستر سے

سنو کہ شہرت و عزت یوں ہی نہیں ملتی
یہ بات ہوتی ہے پیکر فقط مقدر سے

۲۱، کودیز گھاٹ روڈ، شب پور، ہاوڑہ۔ ۲

خاور خاں سرحدی

شوخ سی آنکھوں میں سورج دیوتا اچھا لگا
دھوپ سا چہرہ کوئی اترا ہوا اچھا لگا

کچھ کہا اچھا لگا اور کچھ سنا اچھا لگا
فاصلوں کے درمیاں اک فاصلہ اچھا لگا

ایک مصرعے کی طرح روشن ہوا غم کا چراغ
اس کے منہ سے ایک جملہ برملا اچھا لگا

ایک لڑکی خوب صورت سی بہت مغرور تھی
برف کی ٹہنی پہ کوئی گھونسلہ اچھا لگا

چائے کی پیالی اُداسی کی ردا اوڑھے ہوئے
میز پر خاموشیوں کا قہقہہ اچھا لگا

انگلیاں لکھنے لگی ہیں ڈوبتی سانسوں کے پل
زندہ رہنے کے لئے یہ سلسلہ اچھا لگا

روشنائی کی زباں پر درج ہے غزلوں کی بات
بے بسی کا دائرہ پھیلا ہوا اچھا لگا

رشتے ناطے برف کی صورت ہوئے ہیں منجمد
بے تکلف مسکرانا آپ کا اچھا لگا

کھڑکیاں کھولوں تو آئے اس کی یادوں کی مہک
اک بہتر کی طرح سے سامنا اچھا لگا

سرائے میاں، دہلی گیٹ، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱

شفیع مشہدی



سبـ وش

نجمہ نے دیکھا تھا کہ کمال احمد کئی دنوں سے بار بار ایک کاغذ جیب سے نکالتے، پڑھتے اور پھر اسے موڑ کر جیب میں رکھ لیتے تھے۔ پڑھتے وقت ان کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا مگر تھوڑی ہی دیر میں زردی مائل ہو جاتا اور وہ چھت کو گھورنے لگتے۔ ان کی آنکھیں ویران ویران سی لگتی تھیں اور وہ گھنٹوں خاموش رہتے۔ آج پھر اسی کاغذ کو غور سے پڑھتے دیکھ کر نجمہ سے برداشت نہیں ہو سکا اور وہ پوچھ بیٹھیں۔ "آخر یہ ہے کیا جسے آپ بار بار پڑھتے ہیں لیکن بولتے کچھ نہیں؟ کمال احمد نے نظریں اٹھا کر بیوی کی طرف کچھ اس طرح دیکھا کہ نجمہ ایک لمحے کو لرز سی گئیں۔ عنقریب تھا کہ وہ بات بدل دیں لیکن کمال احمد نے کاغذ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "منشی غلام رسول کا خط ہے۔۔۔ پڑھ لو۔" نجمہ نے خط لے لیا اور پڑھنے لگیں۔

"......بعد سلام بحضور چھوٹے سرکار فدوی عرض گزار حضور کی خیر و عافیت کا طلب گار ہے۔ احوال ضروری یہ ہے کہ خادم نے پہلے بھی مطلع کیا تھا کہ حویلی خستہ حال ہو چکی ہے۔ پورب کا حصہ گر چکا ہے۔ دالان کی چھت بھی مخدوش ہو چکی ہے۔ پھاٹک کی بُرجی پچھلی آندھی میں زمیں بوس ہو چکی تھی اب پھاٹک کے گرنے کا بھی اندیشہ ہے۔ اندرونِ خانہ بڑی سرکار کے کمرے کی دیوار گر چکی ہے اور چھت سے پانی آکر لکڑی کی الماریوں کو خراب کر چکا ہے۔ گزارش ہے کہ حضور فوری طور پر مرمت کا انتظام کرائیں اگر جلدی مرمت نہ ہوئی تو میرے منہ میں خاک حویلی گر جائے گی۔ اللہ نہ کرے۔

حضور فوری طور پر خادم کے لکھے پر توجہ فرمائیں اور خادم کو حکم دیں کہ وہ کیا کرے۔ چہار دیواری گرنے سے لُچے لفنگے برآمدے میں بیٹھ کر جوا کھیلتے اور تاڑی پیتے ہیں۔ منع کرنے پر بھی نہیں مانتے۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب دم نہیں رہا نہ حویلی کی حفاظت کر سکوں۔ آپ خود تشریف لا کر ملاحظہ فرمالیں۔ میرا بھی آخری وقت ہے۔ حضور کے دیدار کا طالب ہوں۔

مزید کیا لکھوں۔ کم لکھے کو زیادہ سمجھیں اور توجہ فرمائیں۔ بہو بیگم کو دعا کہہ دیں۔ عزیزوں کے لئے دعائے خیر۔

خیریت کا طلب گار

آپ کا نمک خوار

منشی غلام رسول

نجمہ حویلی کے پس منظر سے واقف تھیں۔ منشی غلام رسول کے خط پہلے بھی آئے تھے۔ گرتی حویلی کو کیسے سنبھالا جائے۔ معمولی مرمت کے لئے بھی کم از کم پچاس ہزار کی ضرورت تھی اور کمال احمد پچھلے سال ہی ریٹائر ہو چکے تھے۔ نجمہ نے کمال احمد کی جانب نظر کی جو نہ جانے کمرے کی چھت میں کیا تلاش کر رہے تھے۔

"کیا فیصلہ کیا آپ نے؟" نجمہ نے سکوت کو توڑا تو کمال احمد چونک پڑے۔

"ایں...... ہاں...... یہی تو سوچ رہا ہوں کہ کیا کیا جائے۔"

میں تو کہوں گی کہ حویلی کو بیچ دیجئے۔ اس کی مرمت کرانا ممکن نہیں ہے اور مرمت کرا کے بھی کیا کرنا ہے۔ کسے رہنا ہے وہاں۔ اچھا ہے کہ بک جائے۔" کمال احمد چونک سے گئے۔

"بیچ دوں؟" کمال احمد کی درد بھری آواز نجمہ کے دل پر کہیں گہرا اثر چھوڑ گئی۔ وہ گھبرا اٹھی گئی۔

"نہیں ...... وہ میرا مطلب ہے کہ کوئی چارہ نہیں ہے نا۔ آخر پچاس ہزار کہاں سے آئیں گے؟ آپ نے جس ایمانداری سے ملازمت کر کے صرف تنخواہ پر گزارا کیا اس کے بعد ہمارے پاس بچا ہی کیا......"

نجمہ نے محبت بھرے لہجے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ کمال احمد غور سے نجمہ کو دیکھتے رہے پھر دھیرے سے بولے......

"اماں کا کمرہ بیچ دوں؟" ابا کی خواب گاہ فروخت کر دوں؟ جس آنگن میں میرا بچپن گزرا اسے بیچ دوں؟ حویلی کے پیچھے خاندانی قبرستان میں دادا ابا، ابا، اماں کی قبریں بھی تو ہیں انہیں بیچ دوں؟" کمال احمد کے سرد لہجے میں چھپے غم کی شدت کو نجمہ نے اچھی طرح محسوس کیا اور آبدیدہ ہو گئیں۔ انہیں شوہر سے بے پناہ محبت تھی اور وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ کمال احمد کبھی غم کا اظہار نہیں کرتے۔ انہوں نے شوہر کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے دل چھوٹا مت کیجئے۔ آپ جو بہتر سمجھتے ہیں کیجئے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔" ایسا لگا جیسے کمال احمد کے زخموں پر کسی نے مرہم رکھ دیا ہو۔ ان کا چہرہ کھل سا گیا۔ "گریچویٹی کے روپے ملنے والے ہیں انہیں سے......" ان کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ نجمہ بول اٹھیں۔ "یہ گریچویٹی کے روپے کیا ہوتے ہیں؟" کمال احمد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ریٹائرمنٹ

ایف-۱، گرانڈ پلوی کورٹ، ججز کورٹ روڈ، پٹنہ-۴

کے بعد پھر ایک مکمل [illegible] ملازمت کے سال کے بدلے برسوں بعد روپوں [illegible] انعام دیتی ہے۔ اسے [illegible] تو مل ہی جائیں گے۔ [illegible]

"روپے آپ کے ہیں جیسے چاہیں خرچ کریں۔ مگر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ آپ کے روپیوں پر مردوں سے زیادہ زندوں کا حق ہے۔ سوچ لیجئے۔" کہتی ہوئی نجمہ کمرے سے باہر چلی گئیں اور کمال احمد پھر خیالوں میں گم ہو گئے۔

ان کی آنکھوں کے سامنے میران بیگھہ کی خوبصورت سی حویلی، اس کی رونق، اس کی چهل پہل رقص کرنے لگی اور سارا منظر ذہن کے پردوں پر ابھر آیا۔ نہ جانے کب تک وہ انہیں خیالوں میں گم رہے انہیں یہ بھی پتہ نہ چلا کہ نجمہ نے چائے کی پیالی لا کر ان کے سامنے رکھ دی تھی اور انہیں غور سے دیکھ رہی تھیں۔

کمال احمد کا معمول سا ہو گیا تھا کہ وہ روز منشی جی کا خط نکال کر دیکھتے اور پھر جیب میں رکھ لیتے تھے۔ انجام کار وہ دن بھی آ گیا کہ گریجویٹی کے روپے ملتے ہی کمال احمد میران بیگھہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ نجمہ انہیں جاتا دیکھتی رہیں۔ ایک ٹھنڈی سانس کھینچ کر انہوں نے صرف اتنا کہا...... "دیکھئے صحت کا خیال رکھئے گا اور جلدی واپس آیئے گا۔ میں تنہا پریشان رہوں گی۔"

"ہاں ہاں۔ جلدی آ جاؤں گا...... خدا حافظ۔"

اسٹیشن پر منشی غلام رسول کمال احمد کے منتظر تھے۔ دبلے پتلے، اسی سال کے بوڑھے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے انہوں نے کمال احمد کا استقبال کیا اور احتراماً اتنا جھکے کہ ان کی خمیدہ کمر مزید جھک گئی۔ کمال احمد کو ان کی حالت پر ترس آ گیا۔

"منشی جی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں چلا آتا۔ آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں منشی جی۔"

"کیسے نہ آتا حضور! کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں استقبال کے لئے حاضر نہ ہوا ہوں۔" انہوں نے مودبانہ انداز میں کہا۔

اسٹیشن سے میران بیگھہ کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا مگر تانگے کے ہچکولوں اور غیر ہموار راستوں نے اس مختصر سے سفر کو تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ تانگے پر بیٹھے کمال احمد نے دور سے میران بیگھہ کی طرف نظر کی تو آم کے درختوں کے بیچ حویلی کے آثار نظر آنے لگے اور کمال احمد کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ تقریباً دس سال بعد یہاں آ رہے تھے۔ اس عرصے میں سب کچھ کتنا بدل گیا تھا۔ حویلی کے شکستہ پھاٹک پر جب تانگہ رکا تو حویلی کی ویرانی کمال احمد کی منتظر تھی۔ انہوں نے حسرت بھری نگاہوں سے حویلی کی طرف دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی بھی لمحے اماں پکارتی ہوئی باہر آ جائیں گی۔ "آ گیا بیٹا۔ میں کب سے تیری راہ دیکھ رہی تھی۔" مگر وہاں تو ایک گہری خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

دروازے پر گاؤں کے کچھ لوگ کھڑے تھے۔ ان میں شبراتی میاں بھی تھے جو کبھی اس حویلی کے اہلکار ہوا کرتے تھے۔ اب گاؤں کے متمول لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کی ساری دولت اسی حویلی کی زمینوں اور باغات سے حاصل ہوئی تھی۔ شبراتی میاں نے بڑھ کر کمال احمد کا استقبال کیا اور خیریت دریافت کرنے جیسی رسمی باتوں کے بعد کہنے لگے "حضور، حویلی کو بیچ دیجئے۔ اس کی حالت خراب ہو گئی ہے۔" کمال احمد نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بول اٹھے۔ "جی ہاں۔ منشی جی کے بیٹے طاہر حسین اسے خریدنا چاہتے ہیں۔" منشی جی کو ایسا لگا جیسے کسی نے انہیں طمانچہ مار دیا ہو۔ وہ گھبرا گئے۔ کہنے لگے "نہیں۔ نہیں۔ طاہر کی کیا مجال سرکار جو حویلی خریدنے کی سوچ بھی سکے۔ ہم تو اس حویلی کے پروردہ ہیں ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔" وہ ہاتھ جوڑے مودبانہ انداز میں بول رہے تھے لیکن ان کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس لئے کہ یہ حقیقت تھی کہ ان کا بیٹا طاہر حسین جو کلکتہ میں تجارت کرتا تھا، حویلی خریدنا چاہتا تھا۔ جب اس نے پہلی بار منشی جی سے اس کا تذکرہ کیا تھا تو وہ بپھر اٹھے تھے۔

"خبردار جو ایسی بات کی۔ ہم اس حویلی کے نمک خوار ہیں۔ تمہارے پاس دولت آ گئی تو تم اپنی اوقات بھول گئے۔ اس حویلی کو خریدنے کی سوچنے لگے جس نے تمہاری پرورش کی ہے۔"

طاہر سنجیدہ ہو گیا۔ "ابا۔ حویلی گر رہی ہے۔ کمال صاحب اسے بنوا نہیں سکتے۔ ہم خرید کر بنوا لیں تو حرج ہی کیا ہے؟"

"آخر کیوں خریدنا چاہتے ہو تم؟ تم تو کلکتہ میں رہتے ہو۔ اس حویلی کا کیا کرو گے؟" منشی جی کی آواز میں غصہ تھا۔ طاہر حسین کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ حویلی ہمیں اس غربت کی یاد دلاتی ہے ابا، جب ہم اس کے محتاج تھے۔ ہم اسے خرید کر اس داغ کو دھونا چاہتے ہیں جو ہمارے دامن پر لگا ہوا ہے۔"

"ماضی کو روپیوں سے خرید کر بدلا نہیں جا سکتا بیٹا۔" منشی جی کی آواز میں بھی طنز تھا۔ میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا۔ غلام رسول کے مرنے کے بعد جو ہونا ہے ہو گا۔

طاہر حسین باپ کا لحاظ کر کے خاموش تو ہو گیا تھا لیکن پورے گاؤں میں بات پھیل گئی تھی کہ منشی غلام رسول کا بیٹا حویلی خرید رہا ہے۔

کمال احمد بالکل خاموش، حویلی کے اندر گھوم رہے تھے اور منشی غلام رسول لڑکھڑاتے قدموں سے ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کمرے، برآمدے، دالان، باورچی خانے، راہداری اور آنگن کی بوسیدہ دیواروں، چھتوں اور پایوں کو وہ غور سے دیکھتے جاتے تھے۔ دیواریں نصف سے زیادہ گر چکی تھیں۔ چھتیں بھی زیادہ تر گر چکی تھیں اور جو باقی بچی تھیں وہ بھی برسات کی منتظر تھیں۔ چلتے چلتے کمال احمد کے قدم برآمدے میں رکھے تخت کے پاس رک گئے۔ اسی تخت پر اماں بیٹھی پان بناتی رہتی تھیں۔ ایک کونے میں ان کی جانماز رکھی رہتی تھی اور ساتھ کی میز پر پانی کی صراحی اور چاندی کا وہ پیالہ جس میں وہ پانی پیا کرتی تھیں۔ سفید چاندنی پر بیٹھی سرخ و سفید اماں بھی اس تخت کا ایک حصہ لگتی تھیں۔ اب تخت پر مٹی کی ایک دبیز تہہ جمی ہوئی تھی اور سارا برآمدہ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کمال احمد کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بینائی دھندلی ہو گئی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے تخت پر اماں بیٹھی ہوئی انہیں پیار بھری نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ آنگن میں لگے ہار سنگھار کے پھولوں کی زرد ڈنڈیوں سے ایک چھوٹا سا بچہ اپنی کتاب کے ورق رنگ رہا ہو اور مریم بوا ہاتھ میں دودھ کا گلاس لئے کھڑی ہوں۔ کمال احمد نے آنکھیں پونچھیں تو سارا منظر کافور ہو گیا۔ ہار سنگھار کی جگہ برگد اگ آیا تھا، چہار جانب سناٹا تھا اور حویلی جیسے مکینوں کا ماتم کر رہی تھی۔

اس حویلی کو بنوانا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ کمال احمد

نے سوچا جو پچیس ہزار روپے لے کر وہ آئے تھے ان سے تو صرف دالان کی چھت ہی بن سکتی تھی۔ وہ گھبرا کر حویلی سے نکل کر اس سے متصل آبائی قبرستان میں چلے آئے۔ دادا کی قبر تقریباً زمیں بوس ہو چکی تھی اور اس پر اُپلے تھاپے ہوئے تھے۔ اماں کی قبر کا بیچ کا حصہ کسی ماں کی سونی آغوش کی طرح کھلا ہوا تھا۔ پورب کی جانب قبر بالکل زمین میں دھنس گئی تھی۔ کمال احمد قبر کے کنارے کھڑے کچھ سوچتے رہے پھر انہوں نے منشی جی کو مخاطب کیا:

"منشی جی راجو مستری کو بلا لیجئے، سیمنٹ اور بالو منگوا لیجئے۔ اماں کے کمرے کی جو دیوار گر گئی ہے اس کی اینٹیں اور پائے بھی منگوا لیجئے۔"

"جی حضور!" منشی جی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

لیکن دوسرے دن لوگوں نے دیکھا کہ کمال احمد دادا اور والدین کی قبروں کی تعمیر نو میں مشغول ہیں۔ وہ لوہے اور سیمنٹ سے بے حد مستحکم قبریں بنوا رہے تھے اور بار بار راج مستری کو تاکید کر رہے تھے کہ خوب مضبوط بناؤ۔ منشی جی خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ حویلی کی مرمت کی بجائے قبرستان آباد کیا جا رہا تھا۔ مگر وہ خاموش رہے۔ حد ادب جو تھی۔

اچانک کمال احمد کو گھر آتے دیکھ کر نجمہ خوشی سے کھل اٹھیں۔ پورا ہفتہ انہوں نے انتظار میں گزارا تھا۔ کمال احمد بہت تھکے تھکے سے لگ رہے تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے بھی میلے ہو رہے تھے اور آنکھوں کی کیفیت بتا رہی تھی کہ کئی راتوں سے سو نہیں سکے ہیں۔ نجمہ شوہر کے لئے فکر مند تھیں اور جانتی تھیں کہ وہ کن اذیتوں سے گزر رہے ہیں اس لئے ہنستے ہوئے انہوں نے محبت بھرے لہجے میں شوہر سے پوچھا...... "کام ہو گیا؟"

"ہاں ہو گیا۔" کمال احمد کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ جو روپے میں لے گیا تھا ان سے میں نے دادا جان، ابا جان اور اماں کی قبریں بنوا دی ہیں۔ مستحکم اور مضبوط۔ کم از کم میری زندگی تک تو انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ کمال احمد کی آواز جیسے بہت دور سے آ رہی تھی۔ پھر وہ کافی تیز آواز میں بولنے لگے۔

"پھاٹک کی برجیاں گر گئی تھیں انہیں میں نے دادا اور ابا کی قبروں کے سرہانے نصب کرا دیا ہے۔ اماں کے برآمدے میں جو خوبصورت پائے تھے انہیں اماں کی قبر کے سرہانے لگوا کر خوبصورت سی محراب اور جالیاں لگوا دی ہیں۔ پوری قبر سفید سنگ مرمر سے بنوائی ہے۔ اماں کو سنگ مرمر بہت پسند تھا نا۔ قبروں کے چاروں طرف لوہے کا گرل لگوا کر اسے خوبصورت رنگوں میں پینٹ کرا دیا ہے اور ہار سنگھار کے پودے لگوا دیے ہیں۔ پچیس ہزار خرچ ہو گئے لیکن قبرستان ایسا بن گیا ہے کہ تم دیکھتی رہ جاؤ گی...... "کمال احمد بولتے چلے جا رہے تھے۔

" اور اماں کی قبر...... اس قبرستان میں تو کیا پورے علاقے میں ایسی شاندار قبر نہیں ہو گی۔"

کمال احمد کی آواز میں ایک عجیب سا فخر تھا۔ وہ بول رہے تھے اور نجمہ انھیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک [illegible] اپنے گھروندے کی تعریف کرکے خوش ہو رہا ہو [illegible] سے نہیں رہا گیا اور وہ پوچھ بیٹھیں۔ [illegible]

کمال احمد کو جیسے بریک لگ گیا [illegible]

"حویلی اماں...... حویلی میں نے [illegible] کے نام کر دی ہے۔" کمال احمد سر [illegible] لمحے کو سکوت طاری ہو گیا۔ وہ پھر بول پڑے۔

"میں سبکدوش ہو گیا...... آج میں سبکدوش ہو گیا نجمہ......" ان کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھوں کی ویرانی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اقبال مہدی

غرق دیکھا تھا جسے وہ مہِ تاباں نکلا!

فیضان علی جب گھر میں داخل ہوئے تو چہرے پہ خاصی رونق تھی۔ ایک لفافے میں تنور کی گرم گرم روٹیاں، ایک ڈبے میں سالن، ایک پیکٹ میں مٹھائی، ایک پڑیا میں گڑیا کے دستوں کی دوا اور المونیم کی ڈولچی میں دودھ! نفیسہ نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا—

"سکندر کہاں رہ گیا؟"

"وہ گیا!" فیضان نے گھڑے سے المونیم کے کٹورے میں پانی انڈیلتے ہوئے جواب دیا۔

"گیا! کہاں گیا؟" نفیسہ ننھی گڑیا کو کمر پر لادتے ہوئے حیرانی سے بولی۔

"ایک شرنارتھی سردار نے لے لیا۔" فیضان نے کسی بھی جذبے سے عاری آواز میں کہا۔

"اللہ! تم نے یہ کیا غضب کیا۔ وہ تو تمہاری موئی ماں جائی کا پوت تھا۔" نفیسہ نے سینے پر دو ہتھڑ مارتے ہوئے کہا اور گڑیا کو پاس پڑے ادوائن سے بنے بانس کے پلنگ پر لٹاتے ہوئے پٹی پہ بیٹھ گئی۔ حیرانی اور پریشانی حدود کو چھو رہی تھی۔

"اب تجھے کیا فکر! وہ تو ایک وبال تھا سو کٹا۔ اپنا ہاتھ تو کھلا۔ تیری گڑیا کا کھانا پینا، دوا آ گئی۔ تجھے تو خوش ہونا چاہیے۔ ہمارا ہاتھ بھی تو خالی تھا۔ میں کیا کرتا؟"

"کیا مطلب؟ تو کیا تم نے سکندر کو بیچ دیا! ارے تم کتنے ظالم انسان ہو؟ وہ تو تمہارا بھانجہ تھا۔ نگوڑا یتیم بچہ!" نفیسہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"اری! اب یتیم کہاں رہا۔ ماں باپ مل گئے۔ وہ سردار کندن سنگھ بار بار اسے گھور گھور کر دیکھتا تھا۔ میں نے پہلے تو دھیان ہی نہ دیا۔ پھر وہ سردار میرے پاس آیا اور سکندر کے گالوں کو سہلاتے ہوئے بولا کہ بہت پیارا بچہ ہے بالکل میرے بیٹے سے ملتا ہے جو فسادات میں مارا گیا اور پھر اس کی آنکھوں سے جھل جھل آنسو بہنے لگے۔ مجھے ایک دم خیال آیا اور میں نے کہا کہ یہ بھی یتیم بچہ ہے جو اکیلا رہ گیا ہے۔ اچانک سردار کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور اس نے ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور عاجزی کے ساتھ بولا کہ میں سکندر کو اسے دے دوں اور بھرائی آواز میں کہا کہ میں سمجھوں گا کہ میرا بچہ واہگرو نے واپس دے دیا--- نفیسہ! پھر وہ کرتے کی جیب سے پانچ سو روپے نکال کر دینے لگا۔ میں نے سوچا کہ کیا برا ہے؟ اپنے پاس تو ایسا کچھ بھی نہیں۔ وہ لونڈا بھی ایک بوجھ ہی تھا سو میں نے دے دیا۔ پتہ ہے تجھے نفیسہ! سردار نے اسے گود میں لے کر سینے سے لگا لیا۔ ارے! تو رو رہی ہے باؤلی ہوئی ہے۔ تیرا بھانجہ تھا کہ میرا، بول!"

"رو رہی ہوں کہ ایک عورت ہوں۔ ایک ماں ہوں جو رو رہی ہوں۔ لوگ تو جانوروں تک کو باندھ کے لے آئے اور تم سے ایک لڑکا نہ سنبھلا وہ بھی تیری سگی بہن کا پوت! ایسا خون سفید ہو گیا تمہارا؟ ہائے میرا سکندر--- دیکھ لینا وہ سردار اسے بھی مار ڈالے گا، بھیک منگوائے گا۔"

نفیسہ اندیشوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔

"اری مارنے کو تو انہوں نے کتنے مار ڈالے، مگر خود بھی تو مرے۔ کیا وہ برباد نہیں ہوئے؟ مارنے کو کیا خریدنا ضروری تھا بول! اور سن سردار کبھی بھیک نہیں مانگتا۔ حق حلال کی کھاتا ہے، محنت کرتا ہے اور خون کی جو بات کرے ہے تو سکندر میرا خون تھا تیرا نہیں۔"

"ہائے! پانچ سال کا پلا پلایا بچہ بیچ آئے اور میں بیٹھ کر مٹھائی کھاؤں؟"

"دیکھتی نہیں کیسی نفسی نفسی کا عالم ہے۔ اری اس سردار کو تو سکندر اپنا بیٹا لگا تھا۔ اب تو ہی بتا نمک والی روٹی کھا کھا کر منہ کا مزہ کیسا پھیکا پھیکا سا ہو رہا تھا۔" فیضان نے بیوی کو مطمئن کرتے ہوئے کہا--- "وہ تو ہر دم ریں ریں کرے تھا۔ میری گڑیا بھی رو دیتی تھی۔ دیکھ آج کیسے چین سے سو رہی ہے۔ دوائی کے بغیر اللہ کو پیاری ہو جاتی---!"

"گڑیا کے ابا! بچھڑتے وقت اپنا سکندر رو تو نہیں رہا تھا" نفیسہ کا جی اندر ہی اندر کٹ رہا تھا۔

"وہ تو تھا ہی روتی روح۔" فیضان نے مٹھائی کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اجی بتاؤ تو سہی--- وہ تمہارے پیچھے لپکا ہوگا--- تمہیں پکارا تو ہوگا--- آواز تو دی ہوگی؟" نفیسہ نے میلے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اب بڑی ممتا جاگ پڑی۔ اری کیا تیرے پیٹ کا جنا تھا--- میں نے جو سمجھا کیا۔ خاوند کا کام ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کا دھیان رکھے خواہ کیسے ہی--- اب میرے لئے تم ہی سب کچھ ہو۔ سب چلے گئے اُدھر پر میں نہیں گیا--- تیرا میرا وطن تو یہی ہے۔ ہمارے پرکھے تو یہیں دفن ہیں۔ مجھے دوسروں سے کیا غرض؟ دیکھ نفیسہ تو رویا مت کر۔ جب تو اداس ہوتی ہے تو میری روح اندر سے پھڑپھڑاتی ہے۔ مجھے سکندر کو بھولنے دے۔ گڑیا روتی ہے تو میں دیوانہ ہو جاتا ہوں۔ اس سردار کا لڑکا مارا گیا وہ بھی میری طرح دیوانہ ہو رہا تھا۔"

"اے اللہ! اس سردار کے دل میں ایسی محبت ڈال دے کہ بچی وہ ہمارے سکندر کو بیٹا بنا کر رکھے۔ ہائے پلا پلایا بچہ تھا۔ ماں ختم ہوئی، باپ ختم ہوا اور ماموں جا کر بیچ آیا۔ قیامت کے دن کیا جواب دو گے؟"

"دیکھ نفیسہ! مصیبت کے پہاڑ انسان پر ہی ٹوٹتے ہیں۔ انہیں برداشت کرنا چاہیے، جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ انسان کے بس میں کچھ نہیں۔ ذرا سوچ بٹوارہ ہوا۔ لوگ ادھر سے اُدھر ہوئے۔ لٹ گئے، اجڑ گئے۔ دیس پردیس ہو گئے۔ اس میں کوئی بھید ہوگا جسے وہی جانتا ہے

عابد ولا، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

اپنی حکمتوں کو۔ سکندر کے ماں باپ مر گئے۔ لیکن دیکھا کندن سنگھ بھیج دیا۔ تو روتی ہے اری میں تجھے کیا بتاؤں کہ کندن سنگھ نے ایسے لپک کر سکندر کو سینے سے لگایا کہ جیسے سچ مچ اس کا مرا ہوا بیٹا دوڑتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا ہو۔"

"سوتو ہے پر......" نفیسہ کچھ بولتے بولتے رک گئی۔

"اب اپنی گڑیا کے کھانے پینے اور دوا کا بندوبست ہو گیا۔ آج بچپن کے ساتھ ماں کے برابر لیٹی ہے۔ اب اس کا کھانا بانٹنے والا تو چلا گیا مگر جاتے جاتے ہمارے کھانے پینے کا بندوبست کر گیا۔ اب دیکھتا ہوں کہ کوئی دھندا شروع کروں۔ دکان ٹھپ پڑی ہے۔ ارے پوری دلی شرنارتھیوں سے ابلی پڑ رہی ہے۔ اللہ کارساز ہے۔"

فیضان علی کے ذہن میں دین کے حوالے سے بہت سی باتیں چلی آ رہی تھیں۔ ہمارے مذہب میں بڑی وسعت اور فراخ دلی ہے۔ یہ انسان کی بقا کا مذہب ہے۔ اسے ہر حال میں جینے کا حق دیتا ہے۔ حوصلہ بخشتا ہے۔ میں نے سکندر کا سودا کر کے برا نہیں کیا۔ کندن سنگھ کے دل میں اللہ تعالیٰ نے خیال ڈال دیا کہ لڑکا خرید لو---- یہی تمہارا بیٹا ہے۔ یہ پیسے ہماری قسمت کے تھے جو سکندر کے بہانے ہم تک پہنچے۔ ورنہ کندن سنگھ کے لئے کیا مشکل تھی کہ جب انسان مٹی کے مول کا بھی نہیں، کسی کی جان، جوانی کی کوئی قیمت نہیں تو ایسے میں کسی بچے کو چھین لینا یا اغوا کر لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مگر خدا کا حکم دلوں میں نیکی بدی ڈالنے والا وہی ہے۔

انسان فانی ہے۔ مگر فنا اور شکست کی کوئی صورت بھی قبول نہیں کرتا۔ خوشیوں کے پیچھے بھاگتا ہے کہ خوشیاں زندگی کے میوے ہیں۔ زندگی ایک سیلاب محبت ہے کہ پیمانۂ دل لبریز ہو کر چھلکنے کو بے تاب رہتا ہے۔ آسمان ایسے ستاروں کا چراغاں لے کر اور زمین پھولوں سے بھرا اپنا دامن لے باہیں پھیلائے ہمیں محبت سے بلاتے ہیں اور دوسری طرف ماضی میں جب جب انسان ذلیل ہوا یا جس جس نے اسے مارنا چاہا، سب بھلا دیتا ہے۔ معاف کر دیتا ہے۔ گزرے ہوئے کامران لمحے اس کے تخیل میں ستاروں کی طرح رہتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے مدار میں اٹل حقیقت کی مانند اپنے مقام پر----

ہمارے لئے ہجرت ضروری نہیں تھی، ہم نہیں گئے۔ لیکن ہزاروں گئے۔ جنہوں نے ہجرت کی کیا ضروری ہے کہ انہیں یہ راس بھی آئے گی۔ بعض پودوں کی پنیریاں ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگائیں تو ضروری نہیں کہ وہ جڑ پکڑ لیں۔ پھر وہ سوکھ جاتے ہیں اور مانند برگ خشک اڑتے رہتے ہیں۔

فیضان علی کی پرچون کی دکان دھیرے دھیرے چلنا شروع ہو گئی۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ ہوش مند اور وسیع معلومات رکھنے والا فرد تھا۔ روپیہ اور اطمینان انسان کی سوجھ بوجھ اور علم و شعور میں آہنگ اور اعتماد پیدا کر سکتے ہیں۔

اولاد کی خواہش ایک خلش بن کر نفیسہ کو تڑپاتی رہتی تھی۔ تین بار امید سے ہوئی مگر ہر بار مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ دلگیر آواز میں کہا کرتی----

"میں تو جانوں ہوں کہ میری کوکھ کو تمہارے بھانجے کی بددعا لگی ہے جس کو تم چند روپیوں میں بیچ آئے۔ آخر وہ تمہاری مرحومہ بہن کا بچہ تھا۔"

نفیسہ کو سکندر کی پھیلی باہیں یاد آتیں جب وہ اس کی گود میں آنے کے لئے تڑپتا تھا۔ مگر گود میں گڑیا ہوتی تھی، اس کی پہلوٹھی۔ لخت جگر---- اور ایک شام جب گڑیا بہت بیمار تھی۔ فیضان علی سوتے ہوئے سکندر کو اٹھا کر لے گیا تھا، اس کے بعد اس بچے کی صورت نظر نہ آئی۔ یہ یاد کر کے نفیسہ کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔

انسان اپنی محرومیوں پر رونے کے لئے دوسروں کے دکھوں کا سہارا لیتا ہے۔ اسی کا نام ہمدردی ہے۔ اسی زنجیر کے ساتھ انسان ایک دوسرے سے بندھا ہے۔ جب یہ زنجیر ٹوٹتی ہے تو انسان خود غرض کہلاتا ہے اور اسی مقام سے زمانہ گھیرے موڑ مڑ جاتا ہے۔

وقت کا پنچھی اڑتا رہا۔ تین سال گزر گئے۔ کتنی رُتیں آئیں اور بیت گئیں۔ وہ گرونانک جی کی پیدائش کا دن تھا۔ چاندنی چوک کے گردوارے میں بے تحاشہ بھیڑ تھی۔ ہر طرف سکھوں کے خاندان امڈے چلے آ رہے تھے۔ فیضان ادھر سے گزر کر فتح پوری کی مسجد میں نماز پڑھنے جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کی نظریں ایک سکھ خاندان پر ٹھہر کر رہ گئیں، جو بھیڑ میں اس کی طرف آ رہا تھا۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر مرد اور عورت، ایک خوبرو نوجوان اور اس کی نازک اندام کم عمر بیوی تھی جس کی گود میں پھول سا بچہ ہمک رہا تھا۔

فیضان سرعت سے آگے نکلنے والا تھا کہ ادھیڑ عمر کے سکھ نے مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی آنکھیں فیضان کی آنکھوں میں پیوست ہو گئیں۔

"اے---- بے میں میکھا نئیں کھاندا فیض صاحب---- او---- فیضان علی صاحب ست سری کال----

فیضان نے مصافحے کے لئے بڑھے ہوئے ہاتھ کو میکانکی طرح تھامے رو کہ [illegible] چہرے کو گھور رہا تھا، جس کی [illegible] شام ابھر رہی تھی۔ پاس کھڑا نوجوان سکھ [illegible] معلوم کن کن جذبوں سے [illegible] آنکھوں کے ساتھ فیضان کو تکے جا رہا تھا۔ فیضان نے [illegible] کیا کندن سنگھ کہہ رہا تھا----

"او تے تم [illegible] کیا میں کندن سنگھ ہوں---- آ---- پچھانا؟ خورے تہانوں یاد ہووے، [illegible]---- ایہہ---- ایہہ---- تہاڈا سکندر!" اس نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب اے میرا پتر---- چندن سنگھ--- دیکھیا ہے---- کیڈا سوہنا گبھرو نکلیا ہے!"

اسی لمحے سردارنی آگے بڑھی اپنے شوہر کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"ایویں اینہ بہار کے نہ آکھیا کرو----" وہ [illegible] سے بہو بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"چلو---- کیرتن نوں دیر ہو جاوے گی۔"

فیضان علی پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ چند لمحوں بعد سحر ٹوٹا۔ وہ جلدی سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے جلدی سے فیضان ہونے کا اعتراف کیا۔ رسمی حال پوچھا معذرت کی اور چل پڑا۔ اس کا التفات بھی تاجرانہ تھا۔

چند قدم چل کر فیضان علی کا دھیان خود بخود پیچھے کی طرف پلٹا۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان سکھ بھی مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ محبت بھری مسلسل مسکراہٹ نے شفق پھیلا دی تھی۔ اس کی پیشانی پر ٹھہرے ہوئے لمحے جیسے کہہ رہے ہوں----

"ماموں میاں! تم نے تو مجھے مصر کے بازار میں بیچ دیا میری گھٹی ہوئی چیخیں تم تک پہنچیں بھی کیسے؟"

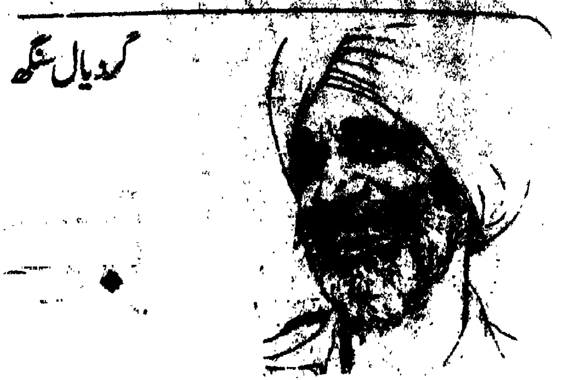
فیضان علی کے دل کو کوئی چیرے لگا رہا تھا---- کس کو چاہا---- کس کو کھویا---- کیا بچا---- کیا لٹ گیا۔

اگلے ہی لمحے وہ دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھنے۔ نوجوان اب بھی دیکھ رہا تھا---- چندن سنگھ---- چندن سنگھ دیکھ رہا تھا---- ننھا سکندر کچھ کہنا چاہتا تھا---- یہ سکندر ہی تھا---- سرخ و سفید پٹھان بچہ----!

کسی نے خزاں میں چمن کو اس طرح پھولتے پھلتے نہیں دیکھا ہوگا---- پوری فضا معطر تھی---- اس لئے کہ ایک گل پیرہن ابھی ابھی ادھر سے گزرا تھا----!

☆☆☆

گردیال سنگھ
پنجابی سے ترجمہ: کنور چند گپتا



رس مو

بہو صبح سویرے ہی چائے کی پیالی لے کر اندر آئی اور میٹھی آواز میں وہی الفاظ دہرائے جو کوڑی سنتی رہی تھی۔ "ماں جی۔ پرنام!...... چھ بج گئے۔ چائے پی لو۔"

پیالی اس کے سرہانے پڑی ہوئی تپائی پر رکھ کر چپلیں ٹپ ٹپاتے وہ واپس لوٹ گئی۔ یہ بھی نہیں دیکھا کہ کوڑی جاگ بھی گئی یا نہیں۔ (بے شک وہ پہر بھر کی جاگتی پڑی تھی۔ پچھلے ایک ہفتے سے اسے اچھی طرح نیند نہیں آرہی تھی)

کوڑی نے سرہانے سے پانی کا لوٹا اٹھایا اور غسل خانے میں جاکر منہ ہاتھ دھونے لگی۔ ایک چھوٹا سا صاف شفاف تولیہ بہو کھونٹی پر لٹکا گئی تھی اس سے منہ ہاتھ پونچھ کر وہ دوبارہ اپنی چارپائی پر آ بیٹھی۔ گھونٹ گھونٹ کر کے چائے پی اور کمبل لے کر پھر لیٹ گئی۔ کرتا بھی کیا تھا؟ لیکن کوئی بیس منٹ بعد وہ پھر اٹھ بیٹھی۔

کوئی ساڑھے چھ بجے بچے کو گودی اٹھائے سنتوکھ اندر آیا اور "ماں جی ست سری اکال" کہتے ہوئے بچہ اس کو دے دیا۔ ایک دفعہ اس کے دل کو قرار سا آگیا۔ بچے کی میٹھی مسکراہٹ دیکھتے ہی دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔ دعائیں دیتی توتلی زبان میں بچے سے باتیں کرنے لگی۔ الماری کے اوپر سے کھلونوں والی ٹوکری اٹھا کر پاس رکھ لی اور ایک جھنجھنا اٹھا کر بجانے لگی۔ مگر بچہ ہر پل رسوئی سے اپنے کمرے کی طرف اور کمرے سے غسل خانے کی طرف آتی جاتی اپنی ممی کی چپلوں کی آواز سن کر اتاولا ہو جاتا تھا۔ دروازے کی طرف دیکھتے ہی اس کی گودی میں سے اچکنے لگتا۔ پھر 'ہوں ہاں' کرتا ہونٹ بچکا کر کوڑی کے جھری بھرے چہرے کو دیکھ کر منہ بسورنے لگتا۔ کوڑی بازو اوپر اٹھا کر 'ہوں۔ ہاں۔ آ۔ آ' کرتی شور سا کرنے لگتی۔

بچہ بہل گیا تو پھر اس کو گودی میں بٹھا کر کھلانے لگی۔ "سیانا بچہ جھنجھنا بجائے گا! موٹر چلائے گا! کار چلائے گا!"

بولتے بولتے وہ بار بار رسوئی کی طرف بہو کے کمرے اور غسل خانے کی دیواروں کی طرف جھانکتی جاتی۔ (اس وقت اس کی آنکھوں میں خوف صاف نظر آرہا تھا)۔

اچانک اسے اپنا دل گھبراتا محسوس ہوا۔ آواز دی "سن...... تو...... سنتوکھ! بیٹے......"

"آیا ماں جی!" سنتوکھ نے غسل خانے میں سے ہی جواب دیا۔ دم بھر کے بعد سفید قمیص پاجامہ پہنے کھلی داڑھی کو تولیے سے پونچھتا ماں کے کمرے میں آگیا۔ اس نے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کر دی شرارتی نے وہی بات!"

"نہیں بیٹے!" میں نے تو تمہیں اس لئے بلایا تھا کہ......"

سنتوکھ جیسے اس کا فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی سمجھ گیا اور واپس لوٹتے ہوئے بولا۔ "اچھا اچھا۔ دوائی میں لاتا ہوں۔ ماں جی۔"

کوڑی کو اسی وقت کھانسی شروع ہو گئی۔ سنتوکھ پانی کا گلاس لے کر تیزی سے واپس آگیا۔ گلاس تپائی پر رکھ کر اس نے دوسرے ہاتھ میں پکڑی گولی پر سے پنا اتارا اور پیلے رنگ کی گولی ماں کو پکڑا دی۔ اس نے گولی منہ میں ڈالی تو سنتوکھ نے گلاس اٹھا کر آگے کر دیا۔ کوڑی نے گولی پانی کے ساتھ نگل لی تو سنتوکھ نے گلاس واپس لے لیا۔ پھر گلاس اور گولی سے اتارا پنا اٹھا کر بچے کو منہ کی سیٹی بجا کر ہنساتا باہر نکل گیا۔

بچہ اب دادی کے ساتھ کھیلتے ہوئے بہل گیا تھا۔

پورے ساڑھے سات بجے بچے کی ممی کندھوں پر گیلے بال پھیلائے کمرے کے اندر آگئی۔ اپنے خوبصورت ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح کھلا کر اس نے بچے کو مسکرانے کی دعوت دی۔ پھر دودھ والی شیشی کوڑی کو پکڑاتے ہوئے وہی فقرہ دہرایا جو لگاتار تین ماہ سے اس وقت یوں ہی بولتی رہی تھی۔ "لو ماں جی۔ بچے کو دودھ پلا دو۔"

مگر تین مہینوں میں یہ شاید پہلا دن تھا کہ کوڑی نے اس کو "لاؤ بیٹا" کہہ کر جواب نہیں دیا تھا۔ چپ چاپ شیشی پکڑی اور بچے کے منہ کو لگا دی۔ بچہ بھی چپ چاپ دودھ چوسنے لگا۔ بہو مسکراتی واپس لوٹ گئی۔

آٹھ بج کر پندرہ منٹ پر سنتوکھ اور بہو دونوں تیار ہو گئے۔ سنتوکھ نے ماں کے کمرے سے گزرتے ہوئے 'اچھا ماں جی ہم چلتے ہیں' کہہ کر برآمدے میں سے اسکوٹر باہر نکالا اور اسٹارٹ کر لیا۔ دونوں میاں بیوی اسکوٹر پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت کوڑی بچے کو لے کر برآمدے میں آگئی۔ دونوں نے ہاتھ ہلا کر بچے کو 'ٹاٹا' کہا۔ پھر مسکراتے ہاتھ ہلاتے چلے گئے۔ بچہ بائیں ہاتھ کا انگوٹھا منہ میں ڈالے 'بٹ بٹ' اسکوٹر کی طرف تاکتا رہا۔ اس نے کوئی ضد نہیں کی۔

کوڑی کچھ دیر برآمدے میں کھڑی رہی۔ اس کو ذرا حیرانی ہوئی کہ اسکوٹر کے جانے کے بعد فوراً ہی جو ہمسایہ گجراتی عورت باہر آجاتی تھی وہ ابھی تک کہاں تھی؟ لیکن اسی وقت ہمسایہ عورت باہر نکل آئی اور اپنے کوارٹر کے برآمدے میں سے آواز دیتی بولی۔ "آئے جاؤ بہن جی! طبیعت تو ٹھیک ہے؟ راضی ہو؟" ذرا سانس لیتے ہوئے اس نے چیخ سی مارتے ہوئے کہا: "بٹو بیٹے کیا کرتے ہو؟ او بٹو!...... آئے جاؤ ہمارے پاس۔"

لیکن کوڑی کے دل میں پتا نہیں کیا آیا کہ اس نے گجراتن کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس ایک بار اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر چنی ٹھیک کرتی واپس اندر لوٹ گئی۔

اندر آکر بچہ اونگھنے لگا۔ اس کو چارپائی پر لٹا کر کچھ دم تھپکایا تو وہ سو گیا۔ وہ اٹھ کر رسوئی کی طرف گئی تو دل پھر اتاولا ہوتا محسوس ہوا۔ ٹوٹی کے نیچے کتنے ہی جوٹھے برتن اکٹھے ہوئے پڑے تھے۔ 'مائی' کو ابھی کافی دیر میں آنا تھا مگر وہ برتنوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ بہو بیٹا ہر وقت اس کو منع

۵۴ / گرو جیتو، فرید کوٹ۔ ۱۵۱۲۰۲ (پنجاب)
اسٹریٹ ڈاکٹر موگے والا، جیتو، فرید کوٹ۔ ۱۵۱۲۰۲

کے لئے بچے تھے۔ 'ماں جی۔ آپ نے یہ کام نہیں کرنا۔'

پراٹھا اور دہی والی پلیٹ اٹھا کر وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ کھانے لگی تو جیسے پہلا ہی لقمہ گلے میں پھنس گیا۔ بمشکل آدھا پراٹھا کھایا گیا۔ باقی ماندہ دہی اور پراٹھا تپائی پر رکھ کر بڑی پلیٹ سے ڈھانپ دیا۔ پیٹ میں درد سا محسوس ہوا اور وہ بچے کے ساتھ لیٹ گئی۔ کچھ دیر چھت کی طرف تاکتی رہی۔ پھر دل اور ہی خیالوں میں جا پہنچا۔

اس کو یہاں آئے سال بھر گزر چکا تھا۔ بہو کی زچگی کرانے آئی تھی لیکن زچگی کے بہانے وہ اصل میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ اپنی بہو کا اس کے ساتھ کتنا پیار ہے جو اس کا بیٹا اپنی مرضی سے بیاہ کر لایا تھا۔ والدین کی کوئی رائے نہیں لی تھی۔ کوڑی کے سارے خاندان اور پڑوس میں لوگوں نے اس بات کی چرچا کی تھی۔ وہ تو شرمندگی کی وجہ سے کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ کوئی بارات نہیں، کوئی رسم ورواج نہیں۔ نہ جانے کس ذات برادری کی گھر میں لا کر بسالی تھی۔

بیاہ کے سال بھر بعد سنتوکھ گاؤں ماں کو لینے گیا تو اس کے باپ نے اس سے سیدھے منہ بات تک نہ کی۔ "آپ بیٹے جیسی مرضی ہو کرو۔ آگے کون سا سب کچھ مجھ سے پوچھ کر کیا ہے۔ میرا کیا ہے میں گوردوارے لنگر میں روٹی کھالیا کروں گا۔"

مگر سنتوکھ کا چھوٹا بھائی گیانا اس بات پر خوش تھا۔ ویسے بھی سنتوکھ کے ساتھ شروع سے ہی اس کا زیادہ پیار تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا: "باپو نے تو سیدھی بات کرنی ہی نہیں۔ تو ماں کو لے جا۔ ہم اپنا کام چلالیں گے۔"

کوڑی اُداس سی ہوئی۔ تذبذب میں سنتوکھ کے ساتھ چل پڑی تھی۔ چلنے کے وقت اس کے دل میں 'ہزار کوس' دور پردیس کا جو شہر تھا وہ فکر یہاں آکر بالکل ہی کافور ہو گیا تھا۔ کئی دن تو اس کو یہ 'بیگانہ دیش' جنت جیسا محسوس ہوتا رہا۔ اس کی بہو (جس کو سارا شریکہ 'ذات کذات' کی کہتا تھا) اس کی بات کو منہ سے نکالنے نہیں دیتی۔ منہ سے نکالنے سے پہلے سر آنکھوں پر اٹھالیتی تھی۔ ہر وقت 'ماں جی۔ ماں جی۔' کہتے نہیں تھکتی تھی۔ زچگی کے دنوں میں بھی اسپتال میں اس نے اسے کوئی تکلیف نہیں دی تھی۔ زچگی کی پہلی رات جب کوڑی نے اسپتال میں رکنے کی ضد کی۔ "لو بیٹے۔ آرام کو کیا میں نے کوئی زمین پر سونا ہے۔ یہاں باہر برآمدے میں پڑی رہوں گی۔ نہ جانے وقت بے وقت ضرورت پڑ جائے گرم ٹھنڈا دینے کی۔" تو بہو نہیں مانی تھی۔ اس نے سنتوکھ کو بار بار کہا تھا کہ ماں جی کو گھر چھوڑ آئے یہاں پر تکلیف ہوگی۔ اسپتال سے آکر بھی جب تک وہ خود کام کاج نہیں کرنے لگی اس نے ایک 'مائی' (نوکرانی) رکھ لی تھی۔

کوڑی اتوار کو گوردوارے جاتی تو وہاں کئی پنجابنیں مل جاتیں۔ گوردوارے کے باہر ایک پارک تھا جہاں بیٹھ کر لوگ نئی جان پہچان بناتے اور اپنے علاقہ والوں سے رفاقت کیا کرتے۔ اس نے بھی جالندھر کی ایک عورت سے جان پہچان پیدا کرلی تھی۔ اس کے ساتھ اپنا سکھ دکھ بانٹ لیتی۔ وہ بھی کوڑی کی طرح اپنے بہو بیٹے کے پاس آئی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنی 'چندری بہو' کی ایسی بری باتیں کرتی کہ سنی نہیں جاتی تھیں۔ کسی نہ کسی بہانے وہ کوڑی کی بہو کے بارے میں بھی سننے کی کوشش کرتی۔ اس کا خیال تھا کہ کوڑی بھی اس کی طرح ہی اپنی بہو کے ہاتھوں دکھی ہوگی۔ لاکھ کوشش کرنے پر بھی جب وہ کوڑی کے منہ سے کوئی بری بات نہ سن سکی تو اس کو وہ 'خوش نصیب' محسوس ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ جیسے اسے اس سے حسد ہونے لگا۔

کئی دفعہ کوڑی کا دل ہوتا کہ اس 'دو آین' کا دل رکھنے کے لئے ہی گھر کی کوئی 'من گھڑت' بری بات کردے مگر کرے کون سی؟ کونسی تکلیف بتائے؟......

دونوں بہو بیٹا اونچی نوکریوں پر تعینات تھے۔ بہو کالج میں پڑھاتی تھی۔ بیٹا کارخانے میں انجینئر تھا۔ سرکاری کوارٹر ملا ہوا تھا۔ کوٹھی نما۔ ضرورت کی ہر ایک چیز گھر میں موجود تھی۔ اس کی ساری ضرورتیں بہو رانی نے پہلے ہی معلوم کرلی تھیں۔ اس کے بعد اس کو کسی چیز کے لئے نہیں کہنا پڑا تھا۔ اس کو ہر چیز بیٹھے بٹھائے فراہم ہو جاتی۔

کبھی کبھی تو کوڑی سوچتی: 'جنت کیا کہیں اور ہو گی؟ اتنے اچھے بہو بیٹا۔ چاند جیسا پوتا۔ بھرا پرا گھر۔ جنت اور کیا ہوتی ہے؟'

لیکن پتا نہیں پھر بھی کیوں اچانک اس کا دل ہول کھانے لگتا۔ پچھلے دو ڈھائی ماہ میں اس نے کئی بار سنتوکھ کو کہا تھا: 'بیٹا مجھے گاؤں چھوڑ آ۔' وہ ہر بار ایک ہی جواب دیتا 'ماں آپ نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے؟' پھر نرمی سے سمجھاتا۔ میں گیانے کو ہر مہینے خط لکھ کر پوچھتا ہوں۔ اس کا جواب یہی آتا ہے کہ باپو راضی خوشی ہے۔ ماں جتنی دیر دل چاہے رہے۔ تم بتاؤ یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے؟'

تکلیف وہ کیا بتاتی جب کوئی تھی ہی نہیں۔ بس دل گھبرا اٹھتا۔ کبھی کبھی تو یوں دل چاہتا کہ اڑ کر گاؤں چلی جائے۔ ایسے وقت [illegible] ہو جاتی اور رات کو خواب [illegible] گھر کا کھلا صحن اور صحن میں [illegible] لڑائی کرتی مویشیوں کی [illegible] ایک دوسرے کے [illegible] اونچی آواز میں بلاتی [illegible] ہے!'

اور کبھی کبھی جب [illegible] آتا تو وہ بڑبڑاتی کہ خود اپنی آواز سے ہی اس کی نیند اچٹ جاتی۔ پسینے سے تر بتر ہوئی پڑی [illegible] بہو بیٹے کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھتی پھر [illegible] ہی اٹھ بیٹھے 'واہگورو واہگورو' کا جاپ شروع کر دیتی۔

کبھی اس کا دل اس بات سے ہی اکتا جاتا کہ [illegible] علاقے میں نہ کبھی جیٹھ اساڑھ جیسی سخت دھوپ [illegible] پڑتی تھی کہ کورے گھڑے کا پانی ہی بھر کر پی لیا جائے۔ [illegible] ہی اتنی سردی پڑتی تھی کہ چولہے کے آگے بیٹھ کر آگ سینکنے کو دل کرے۔ اس نے سنتوکھ کو کئی دفعہ پوچھا تھا یہاں موسم ایک جیسا ہی کیوں رہتا ہے؟ وہ ہنس کر ٹال[illegible] ہوئے کہتا: 'یہ موسم اچھا نہیں لگتا آپ کو ماں جی؟ [illegible] موسم کو تو پنجاب والے لوگ ترس رہے ہوں گے۔' کئی دفعہ اس نے بتا بھی دیا تھا کہ یہاں سے سمندر نزدیک ہونے کی وجہ سے موسم ایک جیسا رہتا ہے۔ کوڑی یہ [illegible] کر اور بھی حیران ہو گئی کہ موسموں کا سمندر کے ساتھ بھی کوئی تعلق ہوتا ہے۔

اور اب تو اسے ویسے ہی سب کچھ سوت کی [illegible] ہوئی ستلی کی طرح بیگانہ سا لگنے لگا تھا۔ بہو کی میٹھی [illegible] رس آواز بھی پتہ نہیں کیوں اچھی نہیں لگتی تھی۔ [illegible] دنوں سے جب وہ چائے لے کر چپلیں ٹپ ٹپاتے آتی کوڑی کو اپنی چھوٹی بہو یاد آجاتی۔ گیانے کی بیوی۔ [illegible] چوڑا منہ، ٹھگنا قد، گٹھیلا جسم، مضبوط بازو [illegible] اور [illegible] سے سنے پاؤں۔ سب کچھ تصویر کی طرح سامنے آ ہو جاتا۔ اسی وقت اس کی گرجتی آواز بھی سنائی دی[illegible] 'آتے ہو ادھر کہ نہیں!..... [illegible]!' پھر دونوں [illegible] سہم کر چولہے کی باٹ کے ساتھ بیٹھے ہی نظر آتے۔ وہ گوبر کا بھرا ٹوکرا آسانی سے ہی سر پر اٹھا کر رکھتے [illegible] پر تلووں کے زور سے مور کی طرح ناچتے ہوئے باہر [illegible] سے پہلے ایک دم آواز نرم کر کے یہ کہنا بھی نہ بھولتی [illegible] نی۔ بے بے جی ہاتھ نہ لگانا (ماں جی مت [illegible]) ان بچوں کو میرے پیچھے نہ آنے دینا۔ یہاں پر دونوں

[illegible]

...کی طرح خود بخود بے ساختہ ہنس لینے کو ہوئی۔ لیکن ... تک ہی ... کر وہ پھر اپنے کمرے کے ... کی طرف جھانکنے لگی جس طرف سے اس کے بیٹے کے کمرے کی طرف جانے کا راستہ تھا۔ جب مائی کو ... سے آتے دیکھا تو دل کچھ ٹھہر گیا۔ لیکن کئی دنوں سے مائی بھی جانے کیا خفا سے ہو کر آتی تھی کہ ٹھیک طرح سے بات ہی نہیں کرتی تھی۔ پہلے کبھی کبھار اپنی تحصیل داری کی بات کر لیتی تھی ورنہ تو اس کی عام عادت ہی تھی کہ جلدی جلدی کام کر کے چلتی بنتی۔ (ویسے بھی اس نے بیسیوں گھر دھندے ذمے لے رکھے تھے) باتیں کرنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ جب جھاڑو دیتی، برتن مانجھتی یا کرسیوں، میزوں کی صفائی کرتی تو بولنے لگ جاتی اور کوڑی کو اس کی گٹر بر' سمجھ بھی نہیں آتی تھی۔ ٹھیک ہے، بس اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتی۔ ہاں میں ہاں ملانے سے ہی جیسے اس کا اپنا دل بہلنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا کہ اس کے ساتھ کوئی کام کروا دے تا کہ وہ جلدی کام سے فارغ ہو کر دم بھر کے لئے ہی اس کے پاس بیٹھ جائے۔ دونوں آپس دکھ سکھ کی باتیں کر لیں۔ لیکن پتا نہیں مائی کو شاید بہو نے سکھایا ہوا تھا۔ وہ اسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ بلکہ دبی سی آواز میں اسے ٹوکتی: 'ماں جی۔ تم ہماری روزی مت مارو جی۔'

کوڑی کو پہلے پہل وہ بری بھی لگی۔ لیکن پھر اسے اس کی مجبوری کا پتا چل گیا۔ وہ پانچ بچوں کی ماں تھی۔ گھر والا اسٹیشن پر قلی کا کام کرتا تھا۔ جو کماتا خود ہی اپنے پیٹ میں ڈال لیتا۔ گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں دیتا تھا۔ بچوں کے لئے اسے خود کمانا پڑتا تھا۔ کوڑی کو اب اس پر ترس آنے لگا تھا۔

لیکن آج تو وہ مائی سے بھی اچھی طرح نہیں بولی تھی۔ مائی کام کر کے چلی گئی تو بچہ جاگ پڑا، وہ اسے دودھ پلانے میں مصروف ہو گئی۔ دودھ پی کر وہ کھیلنے لگا تو وہ اپنا کھانا گرم کرنے لگی۔ کھانا کھا کر فارغ ہوئی تو خیال آیا کہ بچے کو نہلانے کا وقت نکل گیا۔ جلدی سے اس کو نہلا کر کپڑے بدل دیئے۔ اس کے خراب کئے ہوئے کپڑے بھی دھو دیئے۔ اتنے میں تین بجنے کو ہو گئے۔ ایک بار پھر اس کو دودھ پلا دیا۔ دودھ پیتے ہی بچہ پھر سو گیا۔

کوڑی پھر فارغ ہو کر بے حواس سی ہوئی باہر برآمدے میں آ بیٹھی۔ اسکول سے واپس آ کر گھبراتی۔ بنگالی، مدراسی بچے باہر کھیلتے شور مچا رہے تھے۔ کچھ دیر ان کا شور اچھا لگا مگر پھر دل بے چین ہو گیا۔ اٹھ کر اندر آتے ہوئے جسم پسینے سے تر بتر ہوتا محسوس ہوا۔ خیال آیا کہ آج نہائی بھی نہیں تھی۔ ایک دفعہ دل ہوا کہ نہا لے لیکن اٹھ کر غسل خانے تک جانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

اسی وقت باہر آٹو رکشا کی آواز سنی۔ اور بہو رانی ہاتھ میں پرس لٹکائے اندر آئی۔ مسکرا کر حسب معمول 'ماں جی پرنام' کہتے اس نے بچے کی طرف دیکھا۔ پھر روز مرہ والا سوال دہرایا۔ 'بچے نے دودھ ٹھیک پی لیا تھا؟' کوڑی کے ہاں کہتے ہی وہ دوڑ کر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹ کر آئی تو ذرا حیران سی ہو کر کوڑی کو تاکتے بولی۔ 'ماں جی۔ آج آپ نہائی نہیں؟...... آپ نے بال بھی نہیں سنوارے ہیں۔ جاؤ نہا لو۔ دیکھو تو سہی کتنی گرمی ہے۔'

ساڑھے پانچ بجے سنتوکھ آ گیا۔ اس کے ہمراہ ہمیشہ کی طرح دو تین دوست تھے۔ ان سب نے کوڑی کے کمرے میں آ کر احترام سے 'ست سری اکال' کہا۔ پھر بیٹھک کی طرف چلے گئے۔ بیٹھک میں ہنسی کی جھنکار اور چٹکلوں کی ٹپ ٹپ لگاتار سنائی دیتی رہی جیسے پڑوسیوں کا لڑکا اپنی ہوائی بندوق چلا رہا ہو۔ اس کا دل پھر بے چین ہونے لگا۔

سوا چھ بجے کے قریب وہ سب پھر باہر چلے گئے۔ سیر کرنے کے لئے یا شاید سینما دیکھنے کے لئے۔ انہوں نے اس سے پوچھا نہیں۔ بہو رانی بچے کو اٹھانے آئی تو خود ہی بتا گئی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ پر کوڑی کو پتہ ہی نہیں لگا تھا۔ تین اسکوٹروں کی اکٹھی 'گھر گھر' کی وجہ سے اس کا دل گھبرا گیا تھا۔ آواز بند ہوئی تو سونا گھر کھانے کو دوڑنے لگا۔

اگلی صبح کوڑی نیند نہ آنے کی وجہ سے چائے کی پیالی اٹھانے لگی تو اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ پیالی فرش پر گر کر ٹوٹ گئی۔ سنتوکھ جلدی سے اندر آیا۔ ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تو پیشانی پر پسینہ کی بوندیں دیکھ کر گھبرا اٹھا۔ کوڑی نے دونوں ہاتھوں سے پیشانی بھینچ رکھی تھی۔ جیسے چکر آ گیا ہو۔ اس نے آگے ہو کر کندھے سے پکڑتے ہوئے کہا: 'آپ لیٹ جائیں ماں جی۔' کوڑی کا بدن بھی اسے کچھ گرم محسوس ہوا۔ لیٹتے ہوئے کوڑی نے اتنا ہی کہا۔ 'میرا دل گھبرا رہا ہے بیٹے!' وہ اسی وقت دوائی کی گولی اور پانی کا گلاس لایا۔ بہو بھی پاس آ گئی تھی۔ ان دونوں نے سہارا دے کر اٹھایا۔ اور گولی دے دی۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد کوڑی کی طبیعت بالکل سنبھل گئی۔ اس کا دھیان بہو بیٹے کے کمرے کی جانب گیا۔ سنتوکھ کی دھیمی فکر مند سی آواز سن کر اس نے کانوں پر زور دے کر اسے پوری طرح سے سننے کی کوشش کی تو آواز سمجھ میں آ گئی۔ وہ نرمی سے بہو کو سمجھا رہا تھا: 'اور علاج ہی کیا ہے؟...... مشکل مجھے بھی نظر آتی ہے مگر کوئی نوکرانی رکھ لیں گے۔'

کوڑی کو اپنا سر چکراتا محسوس ہوا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اسی دن سنتوکھ بہو کو کالج چھوڑ کر خود چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ آتے ہوئے ڈاکٹر کو بھی ساتھ لیتا آیا۔ ڈاکٹر نے جانچ پڑتال کر کے بتایا کہ فکر والی کوئی بات نہیں ہے۔

دوپہر تک کوڑی کا دل اچھی طرح سے ٹھکانے آ گیا۔ بچے کو بھی بہلانے لگی۔ سنتوکھ اس کو پوچھ کر باہر چلا گیا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد واپس آیا تو آتے ہی دھیمی آواز میں بولا 'ماں جی میں آپ کی سیٹ بک کروا آیا ہوں۔ اگلے سنیچر رات کی گاڑی سے بک ہوئی ہے۔ ہمارے ایک انجینئر نے پنجاب جانا ہے۔ وہ آپ کو گاؤں چھوڑ آئے گا۔'

کوڑی سنتے ہی جیسے بد حواس سی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد سوچ کر بولی دیکھ لو بیٹے...... اگر آپ کا کام نہیں چلتا تو میں کچھ دن اور ٹھہر جاتی ہوں۔

'کوئی بات نہیں ماں جی! اب بچہ سنبھل گیا ہے۔ ہم کام چلا لیں گے۔'

...... پھر اگلے سنیچر تک گھر کا ماحول اداس اداس سا محسوس ہوتا رہا۔ بہو رانی بے شک پہلے سے بھی زیادہ میٹھی بولتی۔ کوڑی بھی اس کے ساتھ ہمیشہ مسکرا کر بات کرتی۔ سنتوکھ 'ماں جی' سے کئی بار چھوٹے چھوٹے مذاق بھی کرتا لیکن سب کو کچھ بیگانہ بیگانہ سا لگتا رہا۔

یہ بیگانہ پن کی اداسی سنیچر کی رات کو دو بج کر سترہ منٹ پر ہی ختم ہو سکی۔ پھر سنتوکھ اپنے دوست کے ساتھ ماں جی کو گاڑی پر روانہ کر کے واپس آ رہا تھا تو کچہریوں کے نزدیک آ کر اسے اتنی سردی محسوس ہوئی کہ دانت بجنے لگے۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل بھی کوئی نہیں تھا۔ پھر اتنی سردی! وہ موسم میں اچانک آئی تبدیلی پر حیران تھا۔ گھر آتے ہی اس نے دو کمبل جوڑ کر اوپر لے لئے۔ کافی دیر بعد جب سب اعضا گرم ہو گئے تو اس نے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کیا۔ پھر ماں کا خیال آیا لیکن نیند نے غلبہ پا لیا اور گہری نیند آ گئی۔

☆☆☆

فرانز کافکا

جرمن سے ترجمہ: ڈاکٹر روبی سنگھ

گیارہ بیٹے

ELF SOEHNE



نوٹ: کافکا (۱۸۸۳ء۔ ۱۹۲۴ء) کے بارے میں معلوم ہے کہ اپنے والد سے اس کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اس کہانی کی روایتی تشریح کرنے والے اسے سوانحی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں گے لیکن باپ اور بیٹے کے رشتہ کو طاقت کی بنیادوں کا ایک استعارہ سمجھا جاسکتا ہے۔ شاید والد سوسائٹی میں فنکاروں کے بارے میں مروجہ خیالات کا اظہار کرتا ہے کہ ایسے لوگ سماج کے لئے زیادہ معاون نہیں ہوتے۔ لیکن کیا ایسا کر کے کافکا دوسروں کے ان خیالات کا اظہار نہیں کر رہا ہے کہ لوگ اسے کیا سمجھتے ہیں۔ کہانی کے ان گیارہ بیٹوں میں سے ہر ایک کی کچھ نہ کچھ خاصیت کافکا میں بھی پائی جاتی تھی۔ کیا زندگی کے یہ گیارہ پہلو کافکا کے مختلف النوع موڈ یا کافکا کی گیارہ شخصیتوں کا اظہار نہیں کرتے۔ کیا یہ ایک ادیب کی اس تنقیدی نگاہ کا استعارہ نہیں جو اپنی تخلیق پر گہری نظر ڈالتا ہے۔

یہ مختصر سی کہانی ایک طرح سے کافکا کے طنزیہ تخیل کا گہرا استعارہ بھی ہے۔ اس کہانی کا میں نے براہ راست جرمن سے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ (مترجمہ)

میرے گیارہ بیٹے ہیں۔

پہلا دیکھنے میں کافی معمولی سا ہے۔ مگر ہے سنجیدہ اور چالاک۔ پھر بھی میں اسے اسی طرح چاہتا ہوں جیسے دوسرے بچوں کو تاہم میں اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی سوچ مجھے کچھ زیادہ ہی عام معلوم ہوتی ہے۔ نہ وہ دائیں طرف دیکھتا ہے نہ بائیں طرف اور نہ ہی دور اس کی نگاہ دور بین ہے۔ بس اپنی سوچ کے چھوٹے سے دائرہ میں گھومتا ہے یا پھر یوں کہئے کہ اپنے ہی ارد گرد چکر لگاتا ہے۔

دوسرا بیٹا خوبصورت، پتلا اور سڈول ہے۔ اسے تلوار چلاتے دیکھ کر لطف آتا ہے اور وہ چالاک بھی ہے۔ اس کے علاوہ اسے دین و دنیا کی بھی پوری خبر ہے۔ وہ بہت گھوما پھرا ہے اور اسی وجہ سے ہماری دیہاتی فضا سے یہاں کے ساکنوں کی نسبت اس کی واقفیت زیادہ ہے اور اس فضا کے پرواز سے وہ واقف بھی ہے۔ ہاں، یہ خوبی یقیناً اس میں گھومنے پھرنے کی عادت کی وجہ سے نہیں آئی ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ ایسا اس کی وجہ سے ہو، اصل میں اس کی وجہ ہے اس بیٹے کا خاص انداز جس کی نقل ناممکن ہے۔ اس بات کا ہر کوئی اعتراف کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، وہ قلابازیوں سے بھرپور مگر جنگلی جانور کی نپی تلی غوطہ خوری کی نقل اتارنا چاہتا ہے۔ مگر حد سے زیادہ محتاط بھی رہتا ہے۔ غوطہ خوری، بورڈ کے کنارے تک تو نقلچی کا حوصلہ اور خواہش اس کا ساتھ دیتے ہیں، لیکن وہاں سے غوطہ لگانے کی بجائے وہ اچانک وہیں بیٹھ جاتا ہے اور معافی مانگنے کے انداز میں ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے۔ اس سب کے باوجود (یوں تو مجھے اس بچے سے خوش ہونا چاہئے) میرے تعلقات اس بچے سے کشیدہ ہیں۔ اس کی بائیں آنکھ دائیں آنکھ سے کچھ چھوٹی ہے اور بہت پھڑکتی ہے۔ یہ ہے تو چھوٹا سا عیب مگر وہ کچھ زیادہ غصہ ور دکھائی دیتا ہے۔ (حالانکہ وہ ایسا نہیں ہے) کہ دوسرے اس کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اس کی چھوٹی پھڑکتی آنکھ میں نقص نہ نکالیں۔ میں اس کا والد یہ جرأت کرتا ہوں۔ البتہ میرے لئے اس کی یہ جسمانی کمی اتنی تکلیف دہ نہیں ہے، جتنی کہ مقابلتاً اس کی روحانی کمی، اپنی خداداد اہلیت کو جو صرف اور صرف مجھ پر عیاں ہے، پوری طرح سے بروئے کار نہ لانے کی۔ کہیں کوئی نقص تو نہیں خون میں؟ بہر حال یہی وہ خصوصیت ہے جو اسے بہ زبان خود میرا اصلی بیٹا قرار دیتی ہے، کیونکہ یہی تو وہ کمی ہے جو ہمارے تمام خاندان میں پائی جاتی ہے اور اس بیٹے میں خاص طور پر نظر آتی ہے۔

تیسرا بیٹا بھی خوبصورت ہے۔ لیکن اس کی خوبصورتی ویسی نہیں، جو مجھے پسند ہو۔ یہ خوبصورتی ہے ایک مغنّی کی۔ کچھ بڑھے ہوئے ہونٹ، خوابوں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں، ایسا سر جس کے لئے پردہ کی ضرورت محسوس ہو، اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے۔ کمان کی طرح کبڑی پیٹھ، ہاتھ جو تیزی سے اوپر اٹھتے ہیں اور پھر کچھ زیادہ ہی تیزی سے نیچے گرتے ہیں، ٹانگیں جو اس قدر نازک ہیں کہ وزن نہ اٹھا سکیں۔ اور سب سے بڑی بات، اس کی آواز میں دم نہیں ہے۔ ایک لمحہ کے لئے دھوکہ ہوتا ہے۔ نزدیکی لوگوں کو بھی سانس روک کر دھیان سے سننا پڑتا ہے، لیکن جلد ہی سانس نکل جاتا ہے۔ حالانکہ عام طور پر مجھے اس بیٹے کو سب کے سامنے پیش کرنے کا اشتیاق ہونا چاہئے۔ پھر بھی میں اسے پردہ رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ خود بھی اس کی ضد نہیں کرتا۔ اس لئے نہیں کہ اسے اپنے خامیوں کا بخوبی علم ہے بلکہ

کے پی، ۲۸۷۔ مودریہ انکلیو، پیتم پورا دہلی۔ ۱۱۰۰۳۴

اس لئے کہ وہ معصوم ہے اور تو اور، وہ آپ کو آج کے ماحول میں کچھ اجنبی سا محسوس کرتا ہے جیسے کہ وہ ہو تو ہمارے گھر کا مگر اس کے علاوہ کسی اور کنبے کا بھی رکن ہو۔ جسے وہ ہمارے گھر کے لئے کھو بیٹھا ہے۔ وہ اکثر اداس رہتا ہے اور کوئی بھی چیز اسے اس اداسی سے باہر نہیں نکال سکتی۔

میرا چوتھا بیٹا ہے جسے ہر شخص پسند کرتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں آج کے دور کا بچہ ہے۔ ہر شخص اس سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ سب کے ساتھ اسی مقام پر کھڑا ہوتا ہے۔ ہر شخص اس کوشش میں رہتا ہے کہ اس کی ہاں میں ہاں ملائے۔ شاید اسی تعریف کے باعث اس کی شخصیت کو وقار ملا ہے۔ طبیعت میں کچھ پھرتی، حرکتوں میں کچھ بے تکلفی، فیصلوں میں کچھ بے پرواہی۔ سننے والے چاہتے ہیں کہ اس کی باتیں دہرائیں۔ ہاں، مگر پوری گفتگو نہیں۔ کیونکہ پوری گفتگو دہرانے سے کچھ چڑچڑاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو نہایت ہی تیز و طرار اڑان بھرتے ہیں، کبوتر کی طرح ہوا کو چیرتے ہیں۔ لیکن پھر نیچے پیچھے، تھک کر ریگستان میں گر کر ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک صفر۔ ایسے ہی خیالات ہمیشہ مجھے پریشان کرتے ہیں، جب بھی یہ لڑکا میری نظروں کے سامنے آتا ہے۔

میرا پانچواں بیٹا نیک اور سمجھ دار ہے۔ جو تھوڑی بہت امید اس کے ساتھ وابستہ تھی، وہ اس توقع سے کچھ زیادہ ہی کامیاب ہے۔ وہ اتنا معمولی ہے کہ آپ اس کی صحبت میں واقعی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کریں گے، البتہ اس نے اپنی پہچان تو بنا ہی لی ہے اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ یہ کیسے ممکن ہوا، تو میں شاید ہی اس کا جواب دے سکوں۔ معصومیت شاید سب سے زیادہ آسانی سے زمانہ کی ہلچل کے درمیان اپنا راستہ بناتی ہے۔ اور معصوم وہ یقیناً ہے۔ شاید کچھ زیادہ ہی معصوم۔ سبھی سے ملنے جلنے والا، شاید کچھ زیادہ ہی ملنسار۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا، جب کوئی میرے سامنے اس کی تعریف کرتا ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ تعریف نہایت ہی سستی ہے۔ کہ بس اسی کی تعریف کی جائے جو موٹے لفظوں میں قابل تعریف ہے۔ جیسا کہ میرا یہ بیٹا۔

میرا چھٹا بیٹا، کم از کم پہلی نظر میں، سب سے زیادہ خیالوں میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسے اپنا سر لٹکائے رکھنے کی عادت ہے۔ پھر بھی وہ بہت باتونی ہے۔ اسے سمجھنا کوئی آسان کام نہیں۔ ڈوبی ہوئی طبیعت ہو تو گہری اداسی میں اتر جاتا ہے اور طبیعت بلند ہو تو ڈھیر ساری باتوں سے اسے برقرار رکھتا ہے۔ پھر بھی میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ وہ خود کو بھلا دینے والے جذبہ سے بھرا ہوا ہے۔ دن کے اجالے میں وہ کئی مرتبہ اپنے خیالوں کی پیچیدگیوں میں اپنا راستہ ڈھونڈنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ مانو کسی خواب میں ہو۔ بنا کسی بیماری کے ——— اس کی تو خاصی اچھی صحت ہے ——— کبھی کبھی وہ صبح کے جھٹپٹے میں لڑکھڑاتا ہے۔ حالانکہ اسے مدد کی ضرورت نہیں پڑتی، وہ کبھی نہیں گرتا۔ شاید اس کا ذمہ دار ہے اس کی جسمانی نشو و نما۔ اپنی عمر کے لحاظ سے وہ کچھ زیادہ ہی لمبا ہے۔ دیکھنے میں وہ خوبصورت نہیں لگتا، باوجود اس کے کہ اس کے جسمانی عضو خصوصاً ہاتھ اور پیر خوبصورت ہیں۔ اس کا ماتھا بھی خوبصورت نہیں ہے۔ اور تو اور اس کی جلد اور ہڈیوں کی بناوٹ، دونوں ہی کچھ سکڑی ہوئی ہیں۔

میرا ساتواں بیٹا شاید باقی سارے بیٹوں سے زیادہ مجھ پر گیا ہے۔ دنیا کیا جانے کہ اس کی قدر کیسے کی جائے؟ وہ نہیں سمجھتی اس کے مذاق کے خاص انداز کو۔ میں اس کی خوبیوں کا بکھان نہیں کر رہا۔ میں جانتا ہوں کہ اس کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اگر دنیا میں اکیلا یہی عیب ہوتا کہ وہ اس کو پہچان نہیں سکی، تو بھی وہ قصوروار نہیں تھی۔ لیکن اپنے کنبہ کے دائرہ میں میں نہیں چاہوں گا کہ اس بیٹے کے بغیر رہوں۔ وہ روایت کو کچھ شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ لیکن اس کی تعظیم بھی کرتا ہے۔ جہاں تک میں محسوس کرتا ہوں، وہ ان دونوں کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔ حالانکہ یہ سچ ہے کہ اسے دوسروں سے بھی کم علم ہے کہ وہ اس مجموعہ کا کیسے فائدہ اٹھائے۔ مستقبل کے پہیئے کو دھکیلنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ لیکن طبیعت کچھ اس قدر آگے بڑھنے والی ہے اور اس قدر پر امید ہے کہ میری دلی خواہش ہے کہ اس کے بچے ہوں اور ان بچوں کے بچے ہوں۔ مگر افسوس، میری یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس کی یہ خوش فہمی میں سمجھتا ہوں اور مجھے ناگوار بھی لگتی ہے۔ اور دنیا کے نقطۂ نظر سے بھی بہت مختلف ہے۔ اس کے باعث وہ جہاں بھی ہو، اکیلا ہے۔ لڑکیوں میں بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر بھی وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔

میرے آٹھویں بیٹے نے مجھے بہت درد دیا ہے۔ مجھے قطعاً پتہ نہیں کہ وہ ایسا کیوں ہے۔ وہ مجھ سے غیروں کی طرح پیش آتا ہے تاہم میں اس سے ایک باپ کے قریبی رشتے سے بندھا ہوا ہوں۔ وقت نے اب اس درد کو کچھ کم کر دیا ہے۔ پہلے تو مجھے کبھی کبھی ایک کپکپی سی محسوس ہوتی تھی، جب کبھی میں اس کے بارے میں سوچتا بھی تھا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ میرے ساتھ تو اس نے سارے رشتے ناطے توڑ لئے ہیں۔ اس کا جسم چھوٹا، مگر کھلاڑیوں جیسا ہے۔ صرف لڑکپن میں اس کی ٹانگیں کمزور تھیں، پر شاید اس دوران ٹھیک ہو گئی ہوں گی۔ اور یقیناً اس جسم اور تیز دماغ سے وہ جس کام میں ہاتھ ڈالے گا، کامیابی اس کے قدم چومے گی۔ کئی مرتبہ میں نے چاہا کہ اسے واپس بلاؤں، اس کا حال چال پوچھوں۔ پوچھوں کہ کیوں وہ اپنے باپ سے اتنا کتراتا ہے۔ اس کے ارادے کیا ہیں۔ لیکن اب تو وہ اتنا دور نکل چکا ہے اور اتنا وقت بیت چکا ہے کہ ایسا ممکن نہیں۔ شاید آگے بھی ہمارے تعلقات ایسے ہی رہیں۔ میں نے سنا ہے کہ میرے سب بیٹوں میں سے وہی ایک ہے، جس نے اپنی داڑھی بڑھائی ہوئی ہے۔ اتنے چھوٹے قد کے آدمی کو وہ کیا زیب دیتی ہوگی۔

میرا نواں بیٹا بے حد نفیس ہے اور عورتوں کے لئے تو خاص میٹھی نظر رکھتا ہے۔ اتنی میٹھی کہ موقع ملنے پر وہ مجھے بھی پھسلا سکتا ہے، حالانکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ ایک گیلا کپڑا ہی کافی ہے باہر کی یہ ساری چمک دمک مٹانے کے لئے۔ لیکن اس لڑکے میں عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر کسی کو پھسلانے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ تو اسی میں خوش ہے کہ بس تمام عمر صوفہ پر پڑا ہوا اپنے کمرے کی چھت پر نظریں جمائے رکھے۔ پھر وہ اپنے آپ میں سمٹا ہوا اسی میں مگن رہنا چاہتا ہے۔ اس پسندیدہ جگہ سے وہ دل کھول کر باتیں کرتا ہے، اچھی نپی تلی اور صاف باتیں۔ البتہ یہ ایک محدود دائرہ میں ہی ممکن ہے۔ اگر وہ اس دائرہ کی حدیں پار کرنے کی کوشش کرے جوان کی تنگی دیکھتے ہوئے کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے تو اس کی گفتگو مکمل طور پر خالی ملے گی۔ کوئی اسے رکنے کا اشارہ تو تب کرے، جب اسے رتی بھر بھی امید ہو کہ اس کی نیند سے مخمور آنکھیں اس اشارے کو دیکھ بھی سکیں گی۔

میرے دسویں بیٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ ایماندار نہیں ہے۔ نہ تو میں اس فرضی بات سے منکر ہو سکتا ہوں اور نہ ہی میں اس کو صحیح قرار دے سکتا

ہوں۔ وہ ایسے پیش آتا ہے مانو وہ اپنی اصلی عمر سے کہیں زیادہ بڑا ہو۔ اس کا فراک کوٹ، جس کے بٹن کس کے لگائے ہوئے ہوتے ہیں، اس کی پرانی کالی ٹوپی، جسے برش سے اس نے بڑے دھیان سے صاف کیا ہوتا ہے، اس کا احساس سے عاری چہرہ، کچھ آگے کو نکلی ہوئی تھوڑی، کچھ بھاری، جھکی ہوئیں پلکیں اور کبھی اس کے ہونٹوں پر رکھی دو انگلیاں، دیکھنے والے کو یقیناً یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں، کہ وہ مکمل طور پر عیار ہے۔ لیکن ذرا اس کی گفتگو تو سنئے اوہ دوسرے کی ہر بات کو سمجھتا ہے، غور کرتا ہے۔ لیکن تیکھا بولتا ہے، سوالوں کو برے طریقے سے کاٹتا ہے۔ سارے جہاں سے اس کا حیرت انگیز تال میل ہے۔ ایسا تال میل جس سے یقیناً اس کی گردن اکڑ جاتی ہے اور اسے فخر محسوس ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ جو اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتے ہیں اور اسی لئے اس کے اس انداز کا برا مانتے ہیں، پھر بھی اس کی گفتگو سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ ہاں، کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جنہیں اس کے ظاہری انداز سے فرق نہیں پڑتا، لیکن اس کی گفتگو مکاری سے بھری ہوئی معلوم پڑتی ہے۔ میں اس کا باپ ہوں، اس لئے اس کے متعلق اپنی رائے سنانا مناسب نہیں سمجھتا، لیکن مجھے یہ ماننا ہی پڑے گا کہ دوسری قسم کے نقادوں کے رائے کچھ زیادہ وزنی ہے۔

میرا گیارہواں بیٹا، شاید میرے سب بیٹوں میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ اتنا کمزور نہیں ہے کیونکہ کبھی کبھی وہ مضبوط اور پکے ارادوں والا بھی لگتا ہے، حالانکہ اس کی بنیادی کمزوری پھر بھی کہیں نہ کہیں رہتی ہی ہے۔ لیکن یہ کمزوری ایسی نہیں جو اسے شرمسار کرے۔ محض اس سڈول زمین پر وہ ایک کمزوری کے طور پر نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر کیا اڑان کی تیاری بھی ایک قسم کی کمزوری نہیں ہے، کیونکہ یہ ڈگمگانا اور ہچکچانا اور پھڑ پھڑانا ہی تو ظاہر کرتی ہے؟ کچھ اسی طرح کی طبیعت میرا یہ بیٹا رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کوئی بھی باپ اپنے بیٹے کی ایسی خصوصیت پر جشن نہیں منا سکتا۔ ظاہراً یہ خصوصیت ایک کنبہ کو رفتہ رفتہ برباد کر دے گی۔ کبھی کبھی وہ مجھے دیکھتا ہے، جیسے کہہ رہا ہو: "میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، بابا۔" میں سوچتا ہوں: "تم تو وہ آخری شخص ہوگے جس کے سپرد میں اپنے آپ کو کروں گا۔" پھر ایسا لگتا ہے جیسے اس کی نگاہ کہہ رہی ہو: "اچھا، تو پھر میں آخری ہی سہی۔"

یہ ہیں میرے گیارہ بیٹے۔ ☆☆

وفیات

● اردو کے مشہور مزاحیہ شاعر **رضا نقوی واہی** کا ۵ جنوری ۲۰۰۲ء کو پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ ان کا پورا نام سید محمد رضا نقوی تھا۔ ان کی پیدائش یکم فروری ۱۹۱۵ء (سرٹیفیکیٹ کے مطابق) کو ضلع سیوان (بہار) کے ایک مردم خیز بستی کھجوا میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بستی کے مڈل اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد [illegible] کالجیٹ سے میٹرک اور پٹنہ کالج سے انٹر میڈیٹ کرنے کے بعد وہ کلکتہ چلے گئے۔ پھر [illegible] میں تعلیم حاصل کی اور وہیں سے کامرس میں ڈپلوما لے کر ۱۹۴۳ء میں بہار لیجسلیٹو اسمبلی میں بہ حیثیت [illegible] ملازمت شروع کی اور ۱۹۷۴ء میں بہار لیجسلیٹو کونسل کی سکریٹریٹ سے ہی بہ حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری ریٹائر ہوئے۔ ان کے شعری مجموعے "طنز و تبسم، نشتر و مرہم، متاع واہی، منظومات واہی" وغیرہ شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کا ہی ایک شعر ہے:

آخرش دنیا سے واہی کا ہوا جب انتقال
اس کے گھر والوں پہ کیا گزری نہ پوچھو اس کا حال

● بزرگ شاعر، ادیب اور افسانہ نگار **ھیرا نند سوز** کا ان کے وطن فرید آباد (ہریانہ) میں طویل علالت کے بعد ۷ر جنوری ۲۰۰۲ء کو انتقال ہو گیا۔ وہ ۸۰ برس کے تھے اور کئی ماہ سے علیل تھے۔ ہیرا نند سوز میانوالی (پاکستان) میں پیدا ہوئے اور تقسیم وطن کے وقت ہندوستان آ گئے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے "ساحل، سمندر اور سیپ" اور "کاغذ کی دیوار" شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ان کے دو شعری مجموعے "جنگل جنگل شہر" اور "سورج میرے تعاقب میں" بھی منظر عام پر آئے۔

● افسانہ نگار **ظہیر کیفی** امروہوی کا ۱۴ر جنوری ۲۰۰۲ء کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۶۱ برس کے تھے۔ وہ چھ ماہ سے کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۶۰ء میں رومانی افسانوں سے کیا تھا۔ اپنے پورے ادبی سفر میں کم و بیش ۵۰۰ افسانے لکھے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'مسکوٹ' حال ہی میں منظر عام پر آیا تھا۔ انہوں نے فلمی شخصیات پر بہت سے مضامین لکھے جو آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے نشر ہوئے۔ وہ ماہنامہ 'شمع' کے ادارتی شعبے سے بھی وابستہ رہے۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

● اردو کے ممتاز شاعر اور ماہر عروض **منوہر لعل بہار** کا ۳۱ر دسمبر ۲۰۰۱ء کی شام ساڑھے چار بجے حیدر آباد میں انتقال ہو گیا۔ ۸۳ سالہ رائے منوہر لال بہار کے سات شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے نام اس طرح ہیں (۱) بہارستان، (۲) تکرار تمنا (۳) افکار نورانی (۴) فردوس بہار (۵) پیراہن (۶) سخن در سخن اور (۷) گلستان بہار۔ ان تمام مجموعوں کو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے انعامات سے نوازا ہے۔

● پدم بھوشن ماہر ماحولیات **انل اگروال** کا ۲ر جنوری کی شب میں انتقال ہو گیا۔ وہ ۵۴ سال کے تھے۔ دہلی میں بسوں سے نکلنے والے زہر کو کم کرنے کے لئے انہوں نے عدالت کا سہارا لے کر ڈیزل سے چلنے والی بسوں کو تبدیل کر کے سی این جی بسیں چلانے پر سرکار کو مجبور کر دیا۔ ماحول کی آلودگی کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے ایک تنظیم بھی بنائی تھی اور کئی جگہوں پر زبردست تحریک بھی چلائی تھی۔ انہیں کئی بین الاقوامی انعامات بھی حاصل ہوئے تھے۔ پوری دنیا میں وہ بہتر ماحول کے چمپئن سمجھے جاتے تھے۔ وہ آئی آئی ٹی کانپور سے میکینیکل انجینئر تھے بعد میں انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ انہوں نے ماحول سے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ وہ ایک میگزین "سٹیزن رپورٹ" کے ایڈیٹر بھی تھے۔

ادارہ مرحومین کے لئے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

(ادارہ)

تبصرے

نام کتاب : شاعری کی تنقید

مصنف : پروفیسر ابوالکلام قاسمی

قیمت : ۱۵۰/ روپے

ناشر : ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی تازہ ترین کتاب 'شاعری کی تنقید' تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے ان کی دو اہم کتابیں "مشرقی شعریات" اور "تخلیقی تجربہ" شائع ہو کر سنجیدہ علمی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں۔ جن لوگوں نے قاسمی صاحب کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں جو غور و فکر کا عمل ہے وہ برسوں کے مطالعہ اور ریاضت کا نتیجہ ہے۔ میرا تنقیدی موقف میں وہ لکھتے ہیں:

"کوئی تنقیدی رویہ میرے لئے اس وقت تک قابل قبول نہیں بن پایا جب تک شعری متن کے براہ راست مطالعہ نے اس کی توثیق نہ کر دی ہو چنانچہ میرے لئے تنقید نگار کا مقصد بنیادی طور پر ایک باذوق قاری کا منصب ہے۔"

پروفیسر قاسمی کے اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک متن ہی سب کچھ ہے۔ متن کے براہ راست مطالعہ کے بعد جو حقائق سامنے آئیں وہی گفتگو کا موضوع بن سکتے ہیں۔ قاسمی صاحب نے اس کتاب کو چار عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ "غزل کے اسالیب، نظم کے اسالیب، تجزیہ و تعبیر اور تہذیبی میلانات"۔ غزل کے اسالیب میں امیر خسرو، غالب، ذوق، فراق اور جدید تر غزل سے بحث کی گئی ہے۔ انہوں نے مطالعہ کے دوران جو موقف اختیار کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کسی متن یا کسی شاعری کا مطالعہ پہلے سے طے شدہ شرطوں اور معیاروں پر کرنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ متن کے مطالعہ کے بعد ہی کوئی ایسا پیمانہ وضع کرنا چاہتے ہیں جو اس متن کے ساتھ انصاف کر سکے۔ اس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ ہر شاعر کو پرکھنے کا پیمانہ یا اسکیل ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں ان کے دو مضامین "امیر خسرو: غزلیہ شاعری کی حرکیات" اور "غالب: شعری لہجہ" بہت اہم ہیں۔ امیر خسرو کی غزلیہ شاعری کی حرکیات کے محرکات کی تلاش میں انہوں نے قدیم شعریات کی ایک اصطلاح "اجتماع النقیضین" سے مدد لی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ اس اصطلاح کو شبلی نے خسرو کی غزل کے سلسلے میں استعمال کیا تھا مگر بعد کے ناقدین نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ایک دوسرے مضمون "غالب: شعری لہجہ" مصنف نے اس بات کی ضرورت پر زور دیا ہے کہ غالب کی تفہیم میں شعری لہجہ کی دریافت بھی ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کی شاعری میں استعارہ اور تمثیل کے علاوہ بھی دوسرے شعری وسائل نے معنی میں وسعت پیدا کی ہے۔ قاسمی صاحب نے غالب کے اشعار سے یہ ثابت کیا ہے کہ لہجہ کے نشیب و فراز لفظی، معنوی رعایتیں، روز مرہ اور محاورہ نے غالب کی شاعری میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ غالب کے سلسلے میں لہجہ کی دریافت پر قاسمی صاحب نے جو زور دیا ہے وہ غالب تنقید میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا باب "نظم کے اسالیب" ہے۔ جس میں انیس: پیکر تراشی کا نظام، اختر الایمان: طنزیہ علامتی اسلوب، فیض احمد فیض: امتیازات، سردار جعفری: انفرادیت، باقر مہدی: تخلیقی تجربہ شامل ہے۔ تیسرا باب "تجزیہ و تعبیر" پر مشتمل ہے جس میں فیض، شہریار، زیب غوری، عرفان صدیقی کی ایک ایک غزل کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اس باب میں دو اور مضامین۔ "شعری متن کی تعبیر اور ہمارے تعبیری رویے" اور "شعر شور انگیز" شامل ہیں۔ انہوں نے تجزیہ کرتے ہوئے ان تمام شعری وسائل سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی ہے جو غزل کو ایک جمالیاتی پیکر عطا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تجزیے کے لئے فیض کی ایک ایسی غزل کا انتخاب کیا ہے جو نہ تو مشہور ہے اور نہ ہی ان کی نمائندہ غزل ہے۔ ان تجزیوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ اگر تنقید کو اپنے منصب اور ذمہ داریوں کا احساس دلانا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے تجزیہ و تعبیر تک محدود رکھا جائے۔ تجزیہ و تعبیر میں جس مطالعہ اور سنجیدگی کی ضرورت ہے اس کا ہم میں یارا نہیں۔ ایسے حالات میں قاسمی صاحب کے یہ تجزیے ہماری سہل پسندی کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ شعر شور انگیز کے حوالے سے انہوں نے شمس الرحمن فاروقی کی کاوشوں کو جس طرح سراہا ہے اور ان کی قدر افزائی کی ہے وہ ایک علمی دیانت داری کی مثال ہے۔ مختلف اشعار کی تشریح و تعبیر کے حوالے دے کر قاسمی صاحب نے فاروقی صاحب کے علم و مطالعہ کی وسعت کا اعتراف کیا ہے اور جہاں کہیں وہ ان کے خیالات سے متفق نہیں ہوئے وہاں انہوں نے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کلاسیکی شعریات کے بھولے ہوئے سبق کو شمس الرحمن فاروقی صاحب نے جس طرح یاد دلایا ہے ظاہر ہے کہ اس کی داد قاسمی صاحب اس لئے بہتر طور پر دے سکتے ہیں کہ ان کی نظر بھی کلاسیکی و مشرقی شعریات پر بہت گہری ہے۔ چوتھا باب "تہذیبی میلانات" ہے۔ جس میں تین مضامین شامل ہیں۔ "اردو نظم: تہذیبی تشخص، ہجری اردو غزل اور تانیثی ادب: شناخت، تعین قدر۔"

قاسمی صاحب کے ان مضامین سے ایک باذوق قاری کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ہم ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کتاب کا مطالعہ پہلی فرصت میں کرنا چاہئے تاکہ ہم ایک باذوق قاری بن کر تنقید، تجزیہ کے منصب سے انصاف کر سکیں۔

سرورالہدیٰ، نئی دہلی

نام کتاب: شکستہ بتوں کے درمیان

مصنف : سلام بن رزاق

قیمت : ۷۰ روپے

پبلشر : ایڈ شاٹ پبلی کیشنز، ممبئی

کیا آپ نے ننگی دوپہر کا سپاہی یا معبّر (افسانوی مجموعے) کا مطالعہ کیا ہے؟ اگر ہاں، تو پھر 'شکستہ بتوں کے درمیان' کا مطالعہ آپ کے لئے ضروری ہے اور اگر بدقسمتی سے سلام کے یہ دونوں افسانوی مجموعے آپ نے نہیں پڑھے تب بھی میرا اصرار ہے کہ آپ کو وقت نکال کر ایک ساتھ ان تینوں کتابوں کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

سلام کے افسانوں سے کہانیاں کبھی غائب نہیں ہوئیں۔ اس وقت بھی نہیں جب وہ ننگی دوپہر کا سپاہی لکھ رہے تھے۔ سلام کے اندر شروع سے ہی ایک ایسا داستان گو چھپا بیٹھا رہا ہے، جسے کہانیاں کہنے کا/ بولنے کا/ اور سنانے کا ہنر آتا ہے۔ کہانیاں، سلام کے قلم میں داخل ہونے کے ساتھ ہی بڑی بن جاتی ہیں۔ اتنی بڑی کہ قاری کے لبوں تک کا فاصلہ طے کرنے میں یہ اس بات کا احساس دلا دیتی ہیں کہ ---'مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اردو کہانیوں کا مقابلہ کسی بھی زبان کی بڑی کہانیوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔'

فنی اور فکری دونوں سطح پر سلام نے اپنے قارئین کو مطمئن کیا ہے۔ اردو میں 'شکستہ بتوں کے درمیان' سلام کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے، جب کہ ہندی میں "کام دھینو" کے نام سے بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ پیش نظر مجموعے میں سلام کی بہترین سولہ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ بولتی ہوئی کہانیاں نہ صرف ہمارے عہد کا زندہ استعارہ ہیں، بلکہ کہیں کہیں تو کہانی کا کوئی بنیادی خیال یا مجموعی زیریں لہریں اچانک آپ کو گنگناتی، گدگداتی ہوئی اُداس کر جاتی ہیں کہ شکستہ بتوں کے درمیان یہ کیسی آوازیں ہیں، جبر کے درمیان کا یہ کیسا لہجہ ہے؟ یہ کیسے بوجھل نغمے ہیں، سنگیت ہے— اور یہ کیسا عہد ہے۔؟

سلام کی خوبی یہ ہے فن پر فکر کو حاوی نہیں ہونے دیتے۔ کہانی کے بنیادی بہاؤ میں وہ فلسفہ کی آمیزش نہیں کرتے۔ سلام کہانیوں کو ایک مشاق سپیرے کی طرح بین کی دھن میں پہلے قید کرتے ہیں۔ اس طرح کہ کہانی (سانپ) ان کے اشارے (بین) کی محتاج بن جاتی ہے۔ پھر سلام انتہائی فنکاری، ہنرمندی اور چابکدستی کے ساتھ ایک اہم حسین کہانی کا دسترخوان اپنے قاری کے لئے چُن دیتے ہیں۔ اور قاری کہانی کی زیریں لہروں کے ساتھ بہتا ہوا اتنی دور نکل جاتا ہے کہ اس کے لئے سلام کی یہ کہانیاں ناقابل فراموش کہانیاں بن کر رہ جاتی ہیں۔

ان کہانیوں کا ادبی دنیا میں سواگت ہے۔ اور آخر میں ایڈ شاٹ پبلی کیشنز کا بھی شکریہ کہ اردو قارئین تک وہ اتنی اہم کتابیں لگاتار چھاپنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

نام کتاب: باغ کا دروازہ

مصنف : طارق چھتاری

قیمت : ۱۵۰ روپے

پبلشر : ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علیگڑھ

ہماری نسل کے ذہین دانشوروں میں طارق چھتاری کا شمار ہوتا ہے یعنی ایسے لوگوں میں جنہوں نے نہ صرف افسانے کو سمجھا ہے بلکہ افسانے پر لکھا بھی ہے۔ طارق کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اردو کے علاوہ ہندی افسانوں پر بھی ان کی نظر گہری رہی ہے اور ان سب نے کل ملا کر طارق کو ایک ایسا افسانوی شعور بخشا ہے، جس پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔

"باغ کا دروازہ" طارق کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ مجموعے میں شامل کئی افسانے اپنے عہد کا دستاویز بن چکے ہیں، جن کے ذکر کے بغیر ہم اردو افسانے کے، آج کے سفر کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ لکیر، ژرمیان، چابیاں— بیانیہ اور علامت کے یکساں استعمال نے طارق کے فن کو وہ معنویت بخشی ہے، جہاں اردو افسانے کو فخر کا احساس ہوتا ہے۔ طارق کے یہاں محض ایک سپاٹ بیانیہ نہیں ہے۔ کہانی کی زیریں لہروں کے ساتھ ایک علامتی لہر بھی آپ کو پل پل سوچنے پر مجبور کرتی جاتی ہے۔ طارق کے یہاں کہانی کی بنت اور تراش خراش کا خاصہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ اہتمام کہیں کہیں کہانی کے Original flow کو روکتا ضرور ہے۔ اور ہر بار طارق کو پڑھتے ہوئے اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ کاش طارق نے یہاں جملے بنانے کی کوشش نہیں کی ہوتی۔ یہ بات اگر وہ اسی روانی میں آنے دیتے تو شاید زیادہ معنویت پیدا ہو جاتی۔

"باغ کا دروازہ" طارق کے یہاں ایک ایسے Positive اشاریے کے طور پر آیا ہے جہاں ہم نسیم کے جھونکوں کا لطف لے سکتے ہیں۔ طارق کے افسانوں میں Pathos نہیں ہے۔ زندگی پیچ کی اداکاری کی کوششیں کسی طرح کہانی کو سامنے رکھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مجموعے کی کہانی نہ صرف پیچیدہ ہے بلکہ اپنے اندر ایک حسیت بھی رکھتی ہے، جس کی کوئی گتھی ایک پہلو سے نہیں کھلتی۔ دھند سے گھری ہوئی بوسیدہ عمارت اور عمارت کے کردار دیر تک قاری کو پریشان کرتے رہتے ہیں لیکن جب یہ دھند چھٹتی ہے تو بقول طارق چھتاری:

"اب اسے وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ سورج، نہ غبار، نہ محل۔"

ایک عجب سا Dilemma ہے اور زندگی اس پر اسرار ڈائیلما میں الجھ گئی ہے۔

اچھی کہانیاں پسند کرنے والوں کو طارق کا یہ مجموعہ ضرور پڑھنا چاہئے۔ کاش طارق یا سلام بن رزاق نے ان کہانیوں کا پیش لفظ یا مقدمہ بھی لکھا ہوتا تو آج کی کہانیوں پر اور زیادہ سنجیدگی سے بات ہو سکتی تھی۔ اور اردو افسانے کے کئی مخفی گوشے بھی سامنے آسکتے تھے۔

نام کتاب: انا کو آنے دو

مصنف : احمد صغیر

قیمت : ۱۰۰ روپے

پبلشر : استعارہ پبلشرز، غفار منزل، نئی دہلی۔ ۲۵

"انا کو آنے دو" احمد صغیر کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ پہلے افسانوی مجموعے کا نام "منڈیر پر بیٹھا پرندہ" تھا۔ آپ ان دونوں افسانوی مجموعے کے عنوان کو ایک ساتھ دہرائیں تو احمد صغیر کے اندر بیٹھے افسانہ نگار کی آواز صاف طور پر سنی جاسکتی ہے یعنی منڈیر پر بیٹھے پرند نے کہا۔ انا کو آنے دو— منڈیر پر بیٹھا پرندہ تشکیک اور خوف کی علامت ہے۔ پہلے افسانوی مجموعے کی زیادہ کہانیوں میں خوف، اندھیری رات، خاکی بوٹوں کی ٹاپ کی علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ اور ان سے موجودہ فضا بدلتے حالات اور تیزی سے آتی ہوئی تبدیلیوں پر شب خون مارنے کا کام لیا گیا ہے۔ ان کے درمیان ہم منڈیر پر بیٹھے پرندے کو ایک ایسے استعارے کے طور پر محسوس کر سکتے ہیں جو سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ یعنی صغیر کا قلم

دیکھتی کیمرہ کی آنکھیں بن کر فریم میں تیار شدہ تمام مناظر کو قید کر لیتی ہے۔

'لفا کو آنے دو' مشرف کے افسانوی سفر کا دوسرا مضبوط پڑاؤ ہے 'نئی صدی' کے بعد کا قدم۔ خوف و دہشت کے جنگلوں میں سہمے والوں کو اب لفا کا انتظار ہے۔ مگر لفا آوازیں --- لفا چپ چاپ، اچانک، خاموشی سے مضبوطی اور احتجاج کی آواز بن جاتا ہے۔ برسوں سے سوئے، لگاتار ظلم سہتے رہنے والوں کو لفا کا انتظار ہے۔ تبھی تو کھیا آپ ہی آپ یہ کہہ اٹھتی ہے:

"لفا کو آنے دو سالو، پتہ چل جائے گا۔"

وقت کے گنبد پر اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

"لفا کو آنے دو ..... لفا کو آنے دو......" بارہ کہانیوں پر مشتمل اس مجموعے میں بھی پیش لفظ کا فقدان ہے۔ پیش لفظ افسانہ نگار کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے جو اس کے خارج اور باطن میں جھانک کر، قاری کے سامنے اس کے اندر کے انسان کو کھول دیتا ہے۔ قاری جیسے جیسے افسانے پڑھتا ہے، افسانہ نگار کی زمین کا سچ بے نقاب ہوتا رہتا ہے--- ۱۲۰ صفحات پر مشتمل مجموعے کی کئی کہانیاں دعوت غور وفکر دیتی ہیں۔ جیسے جنگ جاری ہے، پیاسی ہے زمین، پیاسا آسماں ---- صغیر نئی نسل کے قافلہ میں جس تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں یہ ایک اچھی علامت ہے اور مستقبل میں ان سے اگر ہم بہت ساری امیدیں وابستہ کرلیں تو بے جا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ آہستہ آہستہ انہوں نے ادب میں اپنی جگہ مضبوط کرلی ہے۔

مشرف عالم ذوقی، نئی دہلی

نام کتاب : اردو شاعری میں ہندو تہذیب کی عکاسی

مصنف : اثر انصاری

قیمت : ۵۰ روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اثر انصاری کا شمار بیسویں صدی کے نصف اول کے معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ زیر نظر تصنیف کے علاوہ اب تک ان کے پانچ شعری مجموعے اور تین نثری تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ کم و کیف، افکار پریشاں، زبان غزل، پیراہن گل اور آئینہ در آئینہ غزلیات اور نظموں پر مشتمل ہیں۔ نثری تصانیف میں سفر حج کے شب و روز، تذکرہ سخنوران مئو اور دبستان شبلی کے نامور انشاپرداز شامل ہیں۔

اردو شاعری میں ہندوستانی رنگ غزل کی رنگینیوں اور ترنگوں میں گم ہوگیا۔ ہماری شاعری کی گوناگونی اور رنگا رنگی کی داستان نئے سرے سے لکھنے کے لئے لازم ہے کہ اردو شاعری کی بے پناہ بھیڑ میں سے تلاش کراو۔ نقد و تبصرے کی گرد سے چھان پھٹک کر ان جواہر پاروں کو برآمد کیا جائے جو اس شاعری کی کہانی کو دوبالا کرتے ہیں اور اس کے اس نادیدہ یا پس افتادہ رخ کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس راہ میں ہر کوشش قابل ستائش ہے اور اثر انصاری نے زیر نظر مجموعہ میں جو کاوش کی ہے اس کے لئے وہ قابل مبارکباد ہیں۔

اس کتاب میں اثر انصاری نے اساتذہ کے اس کلام کو جو اصل ہندوستان کی صورت گری کرتے ہیں اکٹھا کردیا ہے اور ہر نظم سے پہلے اپنا ایک تاثراتی نوٹ بھی درج کیا ہے۔ ادب کے اس پہلو کی نمائش سے قطع نظر موجودہ ملکی اور قومی حالات کا تقاضہ بھی ہے کہ ان کاوشوں کو منظر عام پر لایا جائے۔ مثال کے طور پر ان شامل اشاعت نظموں کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو اپنے وقت میں مقبول تھیں لیکن بعد میں حالات کی گرد میں دب گئیں جیسے اقبال کی "ہمالہ" حکم چند نیر کی "عروس حب وطن"، چکبست کی "خاک وطن" اور نظیر اکبر آبادی کی نظمیں۔

کتاب کو معنویاتی اعتبار سے چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے یہ کاوش کئی اعتبار سے جدتوں کی حامل ہے، اس کو پڑھنا اپنے آپ میں لطف لینا ہے۔

نام کتاب : حرف اعتبار

مصنف : شارب مورانوی

قیمت : ۵۰ روپے

ملنے کا پتہ : رضوی کلینک، بارہ بنکی

'حرف اعتبار' شارب صاحب کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں ۷۳ غزلوں کے علاوہ چند متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں چند گراں قدر تاثرات پیش کئے گئے ہیں جو شارب صاحب کی فنی خوبیوں اور کہنہ مشقی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔

شارب صاحب کی کامیابی کا راز خود ان کے کلام میں پنہاں ہے جو بیشتر غزلیات پر مشتمل ہے۔ خیالات کے اظہار کے لئے موثر لہجہ، جذبات کی ترجمانی کے لئے الفاظ کا حسن انتخاب، زبان کی سلاست و شستگی غرض کہ ان کی شاعری میں وہ تمام عناصر جلوہ گر ہیں جو ایک باکمال فنکار میں ہونی چاہئیں۔

خود نمائی کا مجھے شوق نہیں ہے ورنہ
ایڑیاں میں بھی اٹھاتا تو قد آور ہوتا

اس طرح کے اشعار قاری کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ کتابت وطباعت بہتر ہے۔

نام کتاب : آخری گھڑے کا پانی

مصنف : خلیق الزماں نصرت

قیمت : ۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ : 'آواز نو' کوام ہور بھنگہ

زیر تبصرہ کتاب تعارف اور پیش لفظ کے علاوہ نو تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جن میں سے دو مضامین 'غالب کے شعر میں ریب و تشکیک' اور 'غالب کی شاعری میں انانیت' جیسا کہ ظاہر ہے غالب کی نذر ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اتنا کچھ غالب کی نذر کیا جاچکا ہے کہ اس میں کوئی ندرت پیدا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد عبداللہ کمال کے 'بے آسمان' اور شبیر احمد راہی کی 'بیاض فطرت' پر تبصرے ہیں۔ شعری مجموعوں پر تبصرے تو عام ہیں لیکن تبصرہ نگار جس ندرت سے کام لیتا ہے وہ اصل تصنیف اور تبصرہ دونوں ہی کو منفرد بنا دیتی ہے۔ ایسا ہی کچھ نصرت کے تبصروں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یوں بھی اب تو ایسا لگتا ہے کہ تبصرہ نگار نے ایک جست میں تخلیق کار کو پیچھے چھوڑ کر خود قاری سے براہ راست رشتہ جوڑ لیا ہے اور یوں قاری کو جو کچھ ملتا ہے وہ دراصل دوسرے ہی گھڑے کا پانی ہوتا ہے نہ کہ "آخری گھڑے کا پانی" جس کا تذکرہ شاید صرف کتابوں میں ملتا ہے اب تو سامنے نل ہوتا ہے جس میں پانی ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی۔

اس کے بعد احمد فراز، ظفر گورکھپوری اور پروین شاکر کی شاعری کے چیدہ چیدہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اردو غزل میں ایک نئے آہنگ کی نمائندگی کے لئے احمد فراز کا انتخاب بذات خود بہت خوب ہے جو کسی مبسوط مضمون کا متقاضی ہے تاہم ایک نسبتاً مختصر لیکن جامع مضمون میں احمد فراز کے فکری اور فنی پہلوؤں کی نشاندہی کے لئے اشعار کا جو انتخاب کیا گیا ہے اسے حسن

انتخاب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تو پروین شاکر کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے اس لئے زیر تبصرہ کتاب میں شامل مضمون کو سمت نما کا نام دیا جا سکتا ہے۔

مضمون 'مولانا ماہر القادری کے تبصروں میں اصلاح' اس میں واقعی قند مکرر کا لطف ہے اور ابھی ایک مضمون کو زیر نظر تصنیف کے عنوان "آخری گھڑے کا پانی" کے مترادف کہا جا سکتا ہے یعنی ایک نقاد کو دوسرے نقاد کے بعد پیش کیا جائے۔

طباعت اور کتابت نہایت عمدہ اور صاف ستھری ہے۔ جس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اردو طباعت ابھی پوری طرح کمپیوٹر کی تابع نہیں ہوئی اور فن خطاطی کی جڑیں ابھی مضبوط ہیں۔

زہرہ فاروقی، نئی دہلی

نام کتاب : زندہ اپنی باتوں میں:
بیدی، عصمت اور عباس

مصنف : فیاض رفعت
قیمت : ۹۰ر روپے
ناشر : تخلیق پبلشرز، بی۔۱۰۴، یادو منزل آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۹۲

فیاض رفعت متعدد صلاحیتوں کی حامل شخصیت ہیں۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں، شاعر بھی اور مترجم بھی، محقق بھی ہیں اور رابطہ عامہ کے ماہر بھی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں انہوں نے ایک ذمہ دار آفیسر کی خدمات نبھائی ہیں اور اب وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد اردو زبان وادب کی آبیاری میں لگ گئے ہیں۔ وہ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں اور اس کا ثبوت ان کے شعری اور افسانوی مجموعے ہیں جو شائع ہو چکے ہیں۔ 'اردو افسانے کا پس منظر' ان کا تحقیقی کام ہے۔ دوران ملازمت ریڈیو اور ٹی وی کے وسیلے سے انہوں نے اردو کے دلچسپ اور معلوماتی پروگرام اردو والوں تک پہنچائے۔ ان پروگراموں میں وہ انٹرویوز بھی ہوتے تھے جو وہ اردو کی مشہور و معروف علمی، ادبی اور اہم شخصیات سے اپنے میڈیم کے لئے کیا کرتے تھے۔ زیر تبصرہ کتاب "زندہ اپنی باتوں میں" میں ان تین اردو والوں کے انٹرویوز شامل ہیں جن کی ادبی اور فلمی دونوں دنیاؤں میں شخصیت مستحکم تھی۔ یہ شخصیات راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس ہیں۔ یہ تینوں ہی اردو کے بے مثل قلم کار اور فلمی دنیا کے [illegible] نمایاں افراد ہیں جن کی کہانیوں پر ایسی فلموں کی تشکیل ہوئی جن میں زندگی اور سماج کے رنگارنگ رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ عصمت چغتائی کی 'ضدی'، راجندر سنگھ بیدی کی 'دستک' یا خواجہ احمد عباس کی 'سات ہندوستانی' اور 'انہونی' ان میں ہمارے ہی کردار اور ہمارے ہی مسئلے ہیں۔ ان تینوں قلم کاروں کی لکھی فلموں میں زندگی بہ مطابق اصل ہی ملتی ہے۔ وہی مسائل، وہی مرحلے، وہی شکوے، وہی شکایتیں جو زندگی کا حصہ ہیں، وہی سب کچھ ان کی فلموں کی بھی اساس ہے۔ فیاض رفعت نے ان لوگوں سے اپنے انٹرویوز میں ان کے خیالات اور نظریات کی شکل میں گویا ایک خاص عہد کی ثقافت، تہذیب، ادبی اور فلمی رویوں کو محفوظ کر لیا ہے جو آئندہ متعلقہ جہات میں ریفرنس کا کام دیتے رہیں گے۔ اپنے متن کے پیش نظر کتاب کا نام بہت با معنی ہے۔ اس حوالے سے اگر بیدی، عصمت اور عباس اپنی باتوں میں زندہ ہیں تو زندگی کا کریڈٹ فیاض رفعت کے لئے بھی ہے جس نے اپنے تیکھے اور پر مغز سوالات سے ان تینوں کو کھلنے اور وضاحت سے جواب دینے پر مجبور کیا۔ ڈمائی آکٹو سائز کے ۱۱۰ صفحات کی یہ کتاب لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے جو اپنے متن کے پیش نظر ایک اہم پیش کش ہے۔

انور کمال حسینی، نئی دہلی

نام کتاب : طلسم ہوشربا
تنقید و تلخیص

مصنف : ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی
قیمت : ۲۰۰ر روپے
ناشر : ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ، علیگڑھ

جدید دور سائنس اور تکنالوجی کا دور ہے اور ہر شخص سائنس اور تکنالوجی کے ایجادات پر نظر جمائے ہوئے ہیں۔ قصے کہانیوں پر سے نہ صرف اعتبار اٹھتا جارہا ہے بلکہ قصہ گوئی بالکل معدوم ہو چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اچھی کہانیاں یا ناول بہت کم لکھے جارہے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناول کے قاری بھی کم ہوتے جارہے ہیں اور صرف مختصر افسانے ہی زیادہ تعداد میں پڑھے جارہے [illegible] اب سے [illegible] داستان امیر حمزہ یا طلسم ہوشربا [illegible] مطالعے کے بارے میں تو قاری [illegible] ہاں اب بھی چند پرانے لوگ [illegible] الٹ پلٹ کر دیکھ لیتے ہیں [illegible] مطابق ان پر تنقید دیکھ کر ہی اپنا کام نکال لیتے ہیں، متن سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اگر دو چار طالب علم اس کے مطالعے کے بارے میں سوچتا بھی ہے تو اس کی ضخامت کو دیکھ کر ہمت ہار بیٹھتا ہے۔ ایسے میں داستان امیر حمزہ کے ایک دفتر یعنی طلسم ہوشربا کی تنقید تلخیص کا منظر عام پر آنا نہ صرف اردو کے نئے قاری بلکہ داستان سے دلچسپی رکھنے والے تمام قاری کے لئے خوشی کا باعث ہے۔ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے نہایت عرق ریزی سے اس کے تحقیقی اور تنقیدی پہلو کو اجاگر کیا ہے۔

قمر الہدیٰ فریدی اردو داستان کی تحقیق و تنقید میں نئی نسل کا ایک نمائندہ نام ہے۔ انہوں نے اس سے قبل "اردو داستان: تحقیق و تنقید" کے نام سے ایک گراں قدر کتاب سے داستان سے دلچسپی رکھنے والے قاری اور طالب علموں کو نوازا ہے۔ اب طلسم ہوشربا کی پہلی جلد جس کا پہلا حصہ ۹۰۰ صفحات اور دوسرا حصہ ۷۶۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے کو صرف ۳۶۴ صفحات میں پیش کر کے ہمیں داستان کے مطالعہ کی دعوت دی ہے۔ اس تلخیص کے مطالعہ کے دوران اس کا بالکل احساس نہیں ہوتا کہ کچھ چھوٹ گیا ہے۔ اس کا تنقیدی و تحقیقی حصہ بھی دلچسپ ہے جس میں داستان کی تنقید اور اس سلسلے کی بہت سی معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔

اس تلخیص کو ترتیب دیتے وقت اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے کہ قدیم املا کے بجائے جدید املا کا استعمال کیا جائے۔ آخر میں ان الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے جن کا استعمال داستان میں ہوا ہے لیکن اب وہ متروک ہیں یا اس کی شکل بدل گئی ہے۔

امید ہے کہ داستان سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اسے شوق سے پڑھیں گے۔ اس کی دوسری جلد کی تلخیص کا بھی بے صبری سے انتظار رہے گا۔

محمد کاظم

آپ کے خط

● نئے سال (۲۰۰۲ء) کے پہلے شمارے کا سرورق دیکھ کر ایک ہی لفظ منہ سے نکلا "مرحبا"۔ خوبصورت رنگوں کے پس منظر میں ابھرتا ہوا نئے سال کا سورج نئی امنگیں، نئی ترنگیں، نئی روشنی، نئے ولولے لئے ہوئے ہے۔ ماہ جنوری میں شائع ہونے والے ہندی، انگریزی، اردو کے کئی میگزین نظر سے گزرے لیکن 'آجکل اردو' کا سرورق سب سے زیادہ دلکش اور جاذب نظر لگا۔ تنزیل ابرار کو مبارکباد۔

سرورق کے علاوہ اس شمارے میں شامل سبھی تخلیقات اچھے معیار کی ہیں اور سارے کا سارا شمارہ آپ کے نئے سال کے بلند حوصلوں اور ولولوں کا پیش خیمہ ہے۔ قارئین کی امیدیں آپ سے بہت بڑھ گئی ہیں۔ خاص طور پر "ادب کا نوبل انعام، تنازعات اور صد سالہ جشن، قلم، قلم کار اور کتاب۔ "مخمور سعیدی، نسیم مخموری کی غزلیں اور شرون کمار ورما کی مختصر سی خوبصورت کہانی "پگڈنڈیاں" کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ "پگڈنڈیاں" کا شمار بہترین کہانیوں میں کیا جاسکتا ہے۔

کلدیپ جوشی، دہلی

● آجکل کی فائل سے عرش ملسیانی کا فردوسی پر ایک ریڈیائی فیچر آج بھی عصری مطابقت کا عکاس ہے۔ فردوسی — مادر محبت کی یادگار نشانی 'شاہ نامہ' کو اگر ہومر کی رزمیہ اور مہابھارت کے ساتھ تقابل کیا جائے گا تو یقیناً 'شاہ نامہ' میدان مار لے گا۔ جناب فاروقی صاحب نے نوبل انعام یافتہ نائپال کے بارے میں لکھ کر سمندر کو کوزے میں سمیٹ لیا ہے۔ فاروقی صاحب نے نائپال سے متعلق کئی نکات پر روشنی ڈالی ہے جو ان کے ادبی سفر نامے کا گہرائی سے تعین کرنے کی تحریک عطا کرتے ہیں۔ ڈائنامائٹ کے ایجاد کار کے نام پر امن کے لئے انعام یافتہ حضرات کہاں کہاں امن برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں؟ اظہار اثر صاحب کی نوبل انعام یافتہ سائنس داں صاحبان کی تفاصیل معلومات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ عبدالغنی شیخ صاحب کی "قلم، قلم کار اور کتاب" کی دوسری قسط بھی پڑھ لی۔ شیخ صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ عرق ریزی کے ساتھ یہ کارنامہ خوش اسلوبی سے انجام ہوئے رہے ہیں۔

اب کی بار گوشہ نظم و غزل میں کلام کی اچھی خاصی تعداد پاکر کچھ تشفی ہوئی۔ خواتین شعرا کا کلام بے حد پسند آیا۔ تینوں غیر مبہم کہانیاں کہانی کی روح برقرار رکھنے میں کامیاب رہی ہیں۔ تینوں کہانیوں کے پلاٹ میں کشش ہے۔ رضا جعفری کی کہانی "آئینے" سپاٹ و سلیس الفاظ و جملے میں بیان کردہ حقیقت پسندی کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

کتابوں پر تبصرے پڑھ کر کم از کم یہ احساس تو ضرور ہوتا ہے کہ سازگار اور تعمیری تنقید ہی اردو کو ایک اہم ترین زبان کا درجہ عطا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

رویندر روی، نئی دہلی

● جنوری کے شمارے میں محترمہ عذرا نقوی کا افسانہ "الہ دین کا چراغ" پڑھ کر خوشگوار حیرت و مسرت ہوئی کیونکہ اس سے پہلے میں انہیں محض ایک شاعرہ ہی سمجھتا تھا۔ ان کے افسانوی نثر کا نمونہ پہلی بار نظر نواز ہوا۔ افسانہ تو مجھے کچھ بہت معیاری اور مثالی نہیں لگا البتہ اس میں ان کی اپنی شخصیت کا کچھ پرتو ضرور جھلکتا ہے۔

سوامی واحد کاظمی، انبالہ چھاؤنی

● جیسا کہ میں نے اس مکتوب میں پہلے بھی لکھا تھا کہ میں سب سے پہلے "آجکل کی فائل سے" ہی پڑھتا ہوں۔ اور آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ منہ سے اکثر "مرحبا" نکل جاتا ہے۔ حسب معمول اس شمارے میں بھی آنجہانی جناب عرش ملسیانی کا لکھا "فردوسی" نہایت ہی دلچسپ ہے۔ اس نے اسکول میں پڑھی تواریخ کی یاد دہانی کرادی۔ اگر جناب عرش ملسیانی عنصری، فرخی، عسجدی اور فردوسی کی رباعی کے مصرعوں کے ترجموں کے ساتھ اصل فارسی مصرعے بھی لکھ دیتے تو وہ مزید باعثِ دلچسپی ہوتے۔ بہر حال انہوں نے نہایت دلچسپ ریڈیائی فیچر تخلیق کیا۔

ہمارے اسکول میں چھٹی جماعت کے تواریخ کے نصاب میں محمود غزنوی کے حالات میں فردوسی کا ذکر بھی آتا تھا۔ جو ابھی تک میری یادداشت میں محفوظ ہے۔ ہم نے کہانی اس طرح پڑھی تھی کہ جب فردوسی کو محمود غزنوی نے "شاہنامہ" لکھنے پر مامور کیا تھا تو یہ وعدہ کیا تھا کہ شاہنامہ مکمل ہونے پر فردوسی کو ایک اشرفی فی شعر انعام دیا جائے گا۔ لیکن کئی سال کی محنت کے بعد جب فردوسی نے ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل 'شاہنامہ' بادشاہ کے حضور میں پیش کیا تو محمود غزنوی نے سونے کی اشرفیوں کے بجائے ساٹھ ہزار درہم (چاندی کے سکے) انعام دینے کا حکم دیا۔ فردوسی دل شکستہ ہوگیا اور اس نے ساری رقم اسی وقت غریبوں میں بانٹ دی اور محمود غزنوی کی ایک ہجو لکھ کر سربمہر لفافے میں ایاز کو دے کر خود بادشاہ کے غضب کے خوف سے غزنی سے بھاگ گیا۔ ہماری تاریخ کی کتاب میں اس ہجو کے چند اشعار درج تھے، مجھے ان میں سے تین یاد رہ گئے ہیں۔

اگرچہ بود زادۂ شہر یار — پرستار زادہ نیاید بکار
اگر مادرِ شاہ بانو بودے — مرا سیم و زر تابہ زانو بودے
اگر شاہ را شاہ بودے پدر — کہ برسر نہادے مرا تاج سر

اس کے بعد فردوسی غزنی کبھی نہیں آیا اور اس نے باقی زندگی گمنامی میں بسر کی۔ کافی عرصہ بعد ایک بار محمود غزنوی نے کسی قلعہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور قلعہ کے فرمانروا کے پاس ایلچی بھیجا کہ ہتھیار ڈال دو نہیں تو ہم حملہ کردیں گے۔ جب وہ ایلچی واپس آتا دکھائی پڑا تو محمود نے ایاز سے کہا کہ دیکھو کیا جواب لایا ہے تو ایاز نے برجستہ ایک شعر سنادیا۔ شعر سننے پر محمود پھڑک اٹھا اور ایاز سے پوچھا کہ کس کا شعر ہے؟ ایاز نے جواب دیا۔ اسی بدبخت فردوسی کا جس نے برسوں خونِ جگر کھایا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ تب محمود غزنوی نے ایاز سے کہا کہ غزنی پہنچ کر یاد کرانا۔ غزنی پہنچنے پر جب ایاز نے محمود غزنوی کو یاد دلائی تو محمود نے حکم دیا کہ خزانہ سے ساٹھ ہزار اشرفی لے جاؤ اور فردوسی جہاں بھی ہو اسے ڈھونڈ کر یہ انعام دے دو۔ فردوسی ان دنوں نیشاپور میں رہ رہا تھا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ شہر کے ایک دروازے سے جب اشرفیوں سے لدے اونٹ داخل ہو رہے تھے تو اس شہر کے دوسرے دروازے

سے فردوسی کا جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا جارہا تھا۔ فردوسی کے وارثوں میں صرف ایک اس کی پوتی اس وقت موجود تھی، یہ رقم اس کو دے دی گئی اور اس نے اسی وقت ساری رقم غریبوں میں بانٹ دی۔

اس شمارے میں سر دیا دھر سورج پرساد نائپال اور نوبل انعام کے بارے میں نہایت معلوماتی مضمون ہے۔ جناب رکن اڈوانی کا روزنامہ ہندو میں شائع شدہ یہ تجزیہ بالکل درست اور حقیقت پر مبنی ہے۔ "انعام کا اعلان جس وقت کیا گیا اس سے اس بات کو زیادہ تقویت ملتی ہے کہ شاید اب یہ انعامات سیاسی نظریہ کی وجہ سے ہی دئے جارہے ہیں۔" اس سے پہلے بھی کئی انعام سیاسی نظریہ کے مد نظر دئے جاتے رہے۔ گویا سٹرنک کے ناول ڈاکٹر ژواگو کا بین الاقوامی ادب اور فکشن میں اہم مقام ہے لیکن اس وقت اسے انعام لٹریری میرٹ کی وجہ سے نہیں دیا گیا تھا، بلکہ سیاسی وجہ سے دیا گیا تھا۔ اس کی تحریریں تو اوسط درجے کے ادب سے بھی نیچے کی ہیں۔ سیاسی پروپیگنڈہ لگتی ہیں۔ نوبل انعام برائے ادب کے علاوہ امن کے لئے جو انعام دیا جاتا ہے وہ بھی سیاسی نظریہ کے تحت ہی دیا جاتا ہے۔ رونالڈ ریگن اور گربا چوف کو امن کا نوبل انعام کس لئے دیا گیا تھا آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

نوبل انعامات: تنازعات اور صد سالہ جشن اور نوبل انعام یافتہ سائنس داں نہایت معلوماتی مقالے ہیں اور ہمارے علم اور جانکاری میں ناقابل قدر اضافہ کرتے ہیں۔ 'قلم، قلم کار اور کتاب' بھی بہت دلچسپ لگا۔ افسانے سبھی پسند آئے۔ "آئینہ" نہایت ہی پر اثر افسانہ ہے۔ دل کو چھو گیا۔

رام پرکاش کپور، نئی دہلی

● ایک سال گزارنے کے بعد جنوری ۲۰۰۲ء کے شمارے میں انور کمال حسینی کا تبصرہ شامل اشاعت ہے۔ یہ تبصرہ نہیں بلکہ ذریعہ تحقیر و تضحیک ہے۔ انہیں سبزۂ نورستہ میں:

(۱) "معاشرہ بھی نہیں مل سکے۔ روایتی غزل گوئی ہے جس میں [illegible] بھی [illegible] نہیں ہے۔"

(۲) شاعر ان شاید ان کا شوق ہے [illegible] اردو کے شاعر بھی ہیں اور ناشر بھی۔

[illegible]

مصرع [illegible] مل

سکے جو شعر کوٹ کئے۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ کا "پر" غائب کر دیا۔ انہیں دیانت داری سے شامل غزلوں کو دیکھنا چاہئے تھا۔ ہوا میں تیر چلانا اور تحقیری جملے لکھنا اصول تبصرہ کے منافی ہے۔

ایک دوسرا جملہ ان کی کم فہمی یا کج روی کا اشاریہ ہے جب وہ کسی ادیب یا شاعر سے واقف نہ ہوں تو اصل موضوع سے ہٹنا خطرہ بن جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی ناواقفیت کا ثبوت بہم کیا ہے۔ انہیں میرے کام و نام کی خبر نہیں۔ کتابوں کی اشاعت میرا ذریعہ معاش نہیں رہا۔ صرف جذبہ خدمت کے تحت اپنے پیش روؤں کی طرح میں نے بھی اسی فعل راستی پر عمل کیا جو ان بزرگوں کا طریقہ رہا ہے۔ مجھے ناشر کہنے میں ان کی عنادیہ روش شامل ہے۔

ساحل احمد، الہ آباد

● ساحل احمد کی کتاب "سبزۂ نورستہ" پر فاضل مبصر انور کمال حسینی کا تبصرہ پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ غرض یہ ہے کہ مبصر کچھ بھی لکھے، اسے کھلی آزادی ہے لیکن جو کچھ لکھے اسے صحافتی آداب و انداز کے اندر رہ کر لکھے۔ چھوٹے سے تبصرے میں تکرار اور تضادات کو راہ دینا خانہ پری کے مترادف ہو جاتا ہے۔

رام پرکاش راہی، دہلی

● سرورق زندہ معیار کا حامل ہے۔ ویسے تو ہر شمارہ کا سرورق اچھا ہوتا ہے تیرز رسالہ ہر اعتبار سے اچھا و قابل تعریف ہے۔ مگر ایک چیز کی برسوں سے کمی محسوس کی جارہی ہے وہ یہ کہ کوئی ایک اچھا سا مقابلہ کا آغاز کیا جائے تاکہ نئی نسل اس جانب متوجہ ہو کر ملک کی ترقی کر سکے کیونکہ مقابلہ ہو تو کتابیں خریدنے والے اور پڑھنے والے میں مزید اضافہ ہو۔

ایم۔اے۔اے انعامدار، بیڑ

● عبدالغنی شیخ نے مقالہ 'قلم، قلم کار اور کتاب' صفحہ نمبر ۴۴ پر ادیب اور مطالعہ کے عنوان سے چند ادیبوں کے اقتباسات نوٹ کئے جس میں انگریز مصنفین کے ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا ایک اقتباس ہے:

"میری تمنا یہ ہے کہ مرنے کے بعد میرا
بس چلے تو اپنی قبر میں کتابیں ہی کتابیں
رکھوں تاکہ میں انہیں پڑھا کروں۔"

([illegible])

کیا یہ اقتباس صحیح ہے۔ ایک [illegible]

ایسا لگتا ہے [illegible]

[illegible] حیدر آباد

● [illegible] شمارے میں [illegible] غزلیں بھی [illegible] ڈاکٹر ابرار احمد [illegible] کی نظم [illegible] ہے۔ [illegible] بھی ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر [illegible]

● مقالات کا [illegible] اور معلومات کا خزانہ ہے۔ اگر اس شمارے کو [illegible] "نوبل انعام" [illegible] کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ [illegible] ہو جاتا [illegible] نوبل انعام یافتگان کی [illegible] بھی ایک [illegible] شائع ہو جاتی تب یہ شمارہ دستاویزی حیثیت [illegible] ہو جاتا۔

کہانیوں میں شہزادہ [illegible] اور رضا جعفری [illegible] متاثر کیا۔ غزلوں میں مخمور سعیدی، علیم اللہ حالی [illegible] ہاشمی اور راشد انور راشد کی غزلیں پسند آئیں۔

"مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں" [illegible] آپ کا تبصرہ بھی بے لاگ ہے۔ "آجکل کی فائلیں [illegible]" فردوسی پر ایک عمدہ مضمون پڑھنے کو ملا۔

انوار انصاری، جھارکھنڈ

● جناب اظہار اثر صاحب کا مضمون 'نوبل انعام یافتہ سائنسداں' ایک دستاویزی اور تاریخی حیثیت [illegible] ہے۔ یہ تفریحی مضمون کی طرح [illegible] ضائع [illegible] چیز نہیں ہے۔ [illegible] ہے۔ جناب [illegible] مضمون 'قلم، قلم کار [illegible] کتاب' [illegible] ترغیب دیتا ہے۔

جناب [illegible] افسانہ 'پگڈنڈیاں' [illegible]

[illegible]

شاعری کے میدان میں غواصی نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان بھر میں کسی کو اپنا مد مقابل نہیں گردانتا تھا۔ اس کی اس تعلی کے ثبوت میں اس وقت تک صرف دو ہی کتابیں دریافت ہو گئی ہیں جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ یہ دونوں کتابیں فارسی سے ترجمہ ہیں۔ اس لئے غواصی کی قوت تخیل اور تصرف الفاظ کا صحیح اندازہ ان دونوں کتابوں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن اس کی قادر الکلامی کا یہ ثبوت ہے کہ ان ترجموں میں بھی اس نے اصل کیفیت پیدا کر دی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار "سیف الملوک" سے اخذ ہیں۔ ان میں غواصی کا زور قلم دیکھئے:

چلیا سیر کرنے کوں جیسے چمن
سو وہ شہہ پری ناز چندر بدن
پڑی تھی سو دیکھا نجیک جا اسے   نزدیک
بدیع الجمال ہے سمجھا اسے
اگرچہ نہ دیکھا تھا اس سے اول   اس سے قبل
چلے اس کی بے مثل صورت نچھل   معصوم
جچھی اس کے نیناں میں بے اختیار
پڑیا دین زمین کے اوپر بے قرار

طوطی نامہ "سیف الملوک" سے لگ بھگ دگنے صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور چار ہزار ایک سو پچپن شعروں پر مشتمل ہے۔ "سیف الملوک" لکھتے وقت وہ ایک غریب، بے سہارا اور گمنام شاعر تھا لیکن طوطی نامہ لکھتے ہی وہ دولت و عزت کا چہیتا مصاحب بن چکا تھا اور تب تارک الدنیا ہونے کا ارادہ کر رہا تھا۔ "طوطی نامہ" سنسکرت کی عظیم اور قدیم تخلیق "شکاسپ تتی" کا ترجمہ ہے۔ شکاسپ تتی کے معنی ہیں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں۔ غواصی نے ستر کہانیوں میں سے صرف ۴۵ کو ہی اپنی زبان میں منتقل کیا ہے۔ طوطی نامہ کو مولانا سید محمد قادری نے ۱۶۸۲ء میں اور ابوالفضل نے ۱۵۳۹ھ میں سنسکرت سے فارسی میں منتقل کیا تھا۔ یہ ترجمے نثر میں تھے۔ "شکاسپ تتی" آج ادب العالیہ کی ایک عظیم کڑی سمجھی جاتی ہے اور دنیا کی شاید کوئی ہی ایسی زبان ہو جس میں اس کا ترجمہ موجود نہ ہو۔

"طوطی نامہ" میں ایک تاجر کی داستان ہے جسے تجارت کے سلسلے میں دور دراز کا سفر کرنا پڑا اور وہ وقت پر گھر نہ پہنچ سکا۔ اس کی بیوی پر یہ جدائی نہایت شاق گزری اور طرح طرح کے برے برے خیالات نے اس کے نازک دل کو اپنا مسکن بنا لیا۔ فارغ البال تاجر جدا ہوتے وقت اپنی بیوی کو طوطا اور مینا کا ایک جوڑا دے گیا تھا۔ جو بلا تکلف انسانی لہجے میں بات چیت کرنا جانتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے بالاخانے پر بیٹھی تھی کہ اس کی آنکھیں ایک خوبرو جوان سے چار ہو گئیں۔ محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں۔ نوجوان نے ایک [illegible] سمجھا۔ تاجر کی بیوی ہوا و ہوس کے [illegible]

کر دیا اور اسے اس گناہ سے باز رکھنا چاہا۔ بیوی کو اس پر بہت غصہ آیا اور اس نے مینا کو بڑی بے دردی سے ہلاک کر دیا۔ پھر وہ طوطے کے پاس صلاح لینے کے لئے آئی۔ طوطے نے سیدھا منع کر دینا خلاف مصلحت سمجھا کیونکہ مینا کا حشر دیکھ ہی چکا تھا۔ اس نے بیوی کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی ایک شرط بھی رکھ دی کہ وہ اپنے دل کا بھید کسی کے آگے نہ کھولے گی ورنہ اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس سے پہلے ایک رانی کا ہوا تھا۔ اس نے طوطے سے رانی کا قصہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔ طوطے نے نہایت دلکش اور دلچسپ انداز میں اسے بیان کیا۔ صبح ہو گئی لیکن قصہ ختم نہ ہوا اور بات اگلی رات پر ٹل گئی اور اس طرح طوطے نے لمبی لمبی اور سبق آموز ۴۵ کہانیاں ۲۹ راتوں میں بیان کیں۔ حتیٰ کہ تاجر سفر سے لوٹ آیا اور اس کی بیوی من مانی نہ کر سکی۔ ہر کہانی کے شروع میں کالی رات کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

کہ دن عاشقاں کا سو ہے پردہ دار
رین ہوئے تو آوٗں گی اس کے دھار

ذیل میں غواصی کے کچھ شعر طوطی نامہ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان کی بہار دیکھئے:

جگا جوت سورج اتم جات کا
جو کر سیر سب دن سماوات کا   آسمان
ڈبیا جا کے مغرب کے ظلمات میں   ڈوبا
لگے دیپنے جیوں دیوے رات میں   جلنے۔ چراغ
گگن ہور بن تے جھڑ جوں گل و آفتاب   آسمان، جنگل
لیا آپ سے لوں میں مغرب کی ڈاب
کنول چاند کا نرملا بے بدل   بے مثال
چمن تے جو مغرب کا آیا نکل

غواصی نے سترہویں صدی میں جو شہرت اور عزت حاصل کی ہے وہ اس کے ہم عصر یا بعد کے شعرا میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ غواصی نے طوطی نامہ کے اختتام میں تارک الدنیا ہونے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے اس پر عمل بھی کیا، کیونکہ اس کی زندگی کا آخری حصہ بھی ابتدائی حصے کی طرح بظاہر گمنامی میں گزرا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی تاریخ وفات اور جائے وفات کے متعلق بھی کوئی تذکرہ معلومات بہم نہیں پہنچ سکا۔

☆☆☆

آجکل کی فائل سے

ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عرش ملسیانی

جلد ۳ نمبر ۸ [illegible]

Regd. No. DL 12066/2001 Licenced U (DN)-50/2001 to post without pre-payment
[illegible] (Delhi Post) RMS Delhi
Vol. [illegible] No. 8 Rs. 7/- Ajkal (Urdu) March 2002 AD

Printed and Published by **P.S Bhatnagar** Director Publications Division
Printed at Aravali Printers & Publishers (P) Ltd. W-30, Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-20
Published at Publications Division, Patiala House, New Delhi-1, Editor: **M.R.Farooqi**

آجکل کی فائل سے:

تمکین کاظمی

وامق وعذرا

افسانۂ وامق وعذرا بھی ان قصوں میں سے ہے جن کی اصلیت کے متعلق اختلاف ہے، بعض ان قصوں کو "منیژہ و بیژن" "ویس ورامین" کی طرح قدیم ایرانی افسانہ سمجھتے ہیں،ان کی دلیل یہ ہے کہ دولت شاہ سمرقندی نے اس قصہ کی ایک منظوم کتاب کا تذکرہ کیا ہے جو نوشیرواں کے نام پر لکھی گئی تھی اور اس کا ایک نسخہ عبداللہ بن طاہر کے زمانے (۲۳۰۔۲۱۳)میں جو فرماں روائے خراسان تھا، موجود تھا۔

بعض ارباب ادب کا خیال ہے کہ اس قصے کی اصل "عروہ و عفراء" لیلیٰ ومجنوں اور اسی قسم کے دوسرے افسانوں کی طرح عربی ہے جنہیں سہیل بن ہارون سے نسبت دی جاتی ہے جو عہد مامون الرشید کے مشاہیر سے تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ وہ قصے ہیں جو قرن دوم ہجری میں تصنیف ہوئے۔ ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں قصص "ثعلہ وعفراء، نمرد ثعلب، وامق وعذرا" کو سہیل بن ہارون کی تصانیف میں شمار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وامق وعذرا نام سے سب سے پہلے سہیل ہی نے عربی میں قصہ لکھا ہے جس سے فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔

بعضوں کا بیان ہے کہ افسانہ وامق وعذرا وغیرہ قصے یوسف وزلیخا، سلامان و ابسال وغیرہ کی طرح باہر سے لئے گئے ہیں اور ان کی اصل یونانی ہے چنانچہ مولف مجمل التواریخ والقصص نے لکھا ہے کہ "عہد دارا ابن داراب میں قصہ وامق وعذرا یونانی زبان میں موجود تھا۔"

حمد اللہ مستوفی نے بھی تاریخ گزیدہ میں ان عاشق و معشوق کو معاصرین سکندر اعظم ظاہر کیا ہے، ان اسماء واعلام سے جو عنصری کے منظومہ نسخے میں پائے جاتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قصے کی اصل یونانی ہی تھی جس کا ترجمہ مشرقی زبانوں میں ہوا۔

ابوالقاسم عنصری نے سلطان محمود غزنوی کے حکم سے تین قدیم قصے "شاد بہر وعین الحیواۃ، خنگ بت وسرخ بت" اور "وامق وعذرا" بحر متقارب وخفیف میں نظم کئے اور حسب روایت عوفی یہ تینوں بدائع و حکم کا خزانہ تھے جن میں معانی دقیق وامثال رقیق تھے مگر افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی مثنوی بھی آج نہیں ملتی البتہ بعض رسائل اور منشات میں ان کے چند شعر نقل ہوئے ہیں۔

قصۂ وامق وعذرا دوسرے تمام قصوں سے زیادہ شہرت پاچکا ہے اور بیشتر شعرا و ادبا نے تتبع و تقلید نقل وغیرہ کی ہے چنانچہ شعیب جوشقانی نے اس قصے کی شہرت کے متعلق یہ حکایت نظم کی ہے:

حدیث وامق و عذراست مشہور   بود در ہر زباں ایں قصہ مشہور
ولے اول چو دانائے نخستیں   کہ کلکش کرد عالم شکر آگیں
زد آتش از ثریا تاثریٰ بود   گہر پیرائے معنی عنصری بود

ولی آں جلدہ کا شاہ آراست   [illegible]
نیابی زاں ہمہ شعر بجستہ   در اوراق کہن [illegible]
نہ اندرے ہنگس دارد نشانی   کہ وز دست [illegible]
ہانا بودہ یک دفتر دراں حال   کہ دست روزگارش [illegible]

ابوریحان بیرونی وہ شخص ہیں جنہوں نے (۴۲۰ھ؟) [illegible] عربی میں ترجمہ کیا ہے غالباً انہوں نے عنصری کی مثنوی یا کردہ [illegible] نظر رکھا ہے۔

دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ فصیحی جرجانی نے عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس کے دربار سے متوسل تھا قصہ وامق وعذرا کو نظم کیا ہے۔ یہ نظم بڑی اچھی ہے میں نے اس کے چند ورق دیکھے ہیں ایک شعر یاد رہ گیا، اس میں فصیحی نے اپنا حال خاندان کا حال ملک قابوس کی حکومت کا ذکر کیا۔ جو شعر مجھے یاد رہ گیا وہ یہ ہے:

چہ فرخ وجودے کہ از بہمنش
بمیرد بپائے ولی نعمتش

تامس ولیم بیل نے "فرہنگ مشاہیر شرق" میں لکھا ہے کہ "امیر فرخاری نے شعر اعہد امیر کیکاؤین کیخسرو (۶۱۰۔۶۰۹) سے تھا قصہ وامق وعذرا کو نظم کیا ہے۔"

چونکہ ہماری نظر سے نہ تو فصیحی کا منظومہ گزرا نہ فرخاری کا اور نہ عنصری کا اس لئے ہم ان تینوں مثنویوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے مگر یہ تحقیق ہو چکا ہے کہ وامق وعذرا کے قصوں میں سے عنصری کا قصہ آخر قرن دہم تک شہر ہرات اور ممالک ترکی میں موجود تھا کیونکہ حافظ اوبہی (اوبہ ہرات کا ایک قصبہ تھا) نے اصل قلمی نسخہ اور لامعی عثمانی نے اس کا ترکی ترجمہ دیکھا ہے کیونکہ فرہنگ تحفۃ الاحباب میں اس مثنوی کے بہت زیادہ شعر بطریق مثال نقل کئے ہیں اور اس ترکی منثور ترجمہ کو ترکی زبان میں نظم کیا گیا ہے۔

مرزا سنگلاخ مشہدی نے تذکرہ خطاطین میں ذکر کیا ہے کہ میں نے چند ورق عنصری کے منظوم وامق وعذرا کے علاء الدین گلستانہ کے قلم کے لکھے ہوئے دیکھے ہیں۔ نویں اور دسویں صدی ہجری کے چار نعت نویس لطف اللہ حلیمی، حسین وفائی، محمد قاسم سروری، اور ابراہیم شعوری نے اس مثنوی کے بہت سے شعر اپنی فرہنگوں میں نقل کئے ہیں، ہم نے زیادہ تر شعر عنصری ہی کے اکٹھا کئے ہیں جن میں اسمائے اعلام اشخاص پائے جاتے ہیں مثلاً۔

جزیرے یکے بد بیوناں زمین
کردنیس بد نام وشہر گزیں

کردنیس اس جزیرے کا نام ہے جہاں کا رہنے والا وامق تھا۔

کہ مکذیطس آں جایگہ داشتے
بشاہی در وتخت گہ داشتے

وامق کے باپ کا نام مکذیطس تھا۔

یکے دوستش بود ترقان نام
بسے آزمودہ بنا کام کام

باقی ۔۔۔۔۔۔ پر

[illegible]

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمٰن فاروقی
فون: 3386994

اسسٹنٹ ایڈیٹر:
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر:
محمد کاظم

جلد: ۶۰ شمارہ: ۹
اپریل ۲۰۰۲ء چیت۔بیساکھ شک ۱۹۲۴

سرورق: وگیان ورت
کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ سی آہوجہ

فی شمارہ: سات روپے سالانہ: ۷۰ روپے
دو سال: ۱۳۵ روپے تین سال: ۱۹۰ روپے
امریکہ، یورپ اور دوسرے ممالک کیلئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۷۰۰ روپے سالانہ
پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ۵۰۰ روپے سالانہ

خریداری اور اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر
ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتہ پر بھیجیں
سرکولیشن منیجر آجکل ایسٹ بلاک ۴، لیول ۷، آر کے پورم نئی دہلی۔ ۶۶
رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتوں کیلئے بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر آجکل (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱

ترتیب

اداریہ

[illegible] عزیز قارئین!

جولائی ۱۹۹۹ء کے بعد ایک بار پھر میں آپ سے اسی صفحہ پر مخاطب ہو رہا ہوں۔ اس دوران پل کے اوپر سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ ۱۱ر ستمبر کو ہوئے ایک واقعے نے پوری دنیا کو ایک طرح سے ہلا کر رکھ دیا ہے اور اس عرصے میں ہونے والی سائنسی اور تکنالوجی ترقی کے سبب دنیا بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ ہماری سوچ، ہماری فکر، ہمارے نظریے بھی یا تو مجروح ہوئے ہیں یا ان سے متاثر ہوئے ہیں یا ان میں تبدیلی آئی ہے۔ سائنس جو آج تک انسانی سماج کی ترقی کی ضامن بنی ہوئی تھی اور پچھلے دو تین سو سالوں کے درمیان جس طرح کی سہولتیں اس نے عالم انسانی کو بہم پہنچائی ہیں جن کے سبب آج سے سو سال قبل کے انسانوں کو آج کی اس دنیا کو پہچاننا اور سمجھنا شاید اسی طرح مشکل نظر آئے جیسے اصحاب کہف کو جاگنے کے بعد کی دنیا کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن یہی سائنس ترقی کرتے کرتے آج انسان کو موت کے دہانے پر پہنچا چکی ہے۔ سائنس کی اس ترقی اور ایجادات کا استعمال اب بڑے پیمانے پر تخریبی کاموں میں کیا جارہا ہے۔ آج پوری دنیا اس بات سے لرزہ براندام ہے کہ کہیں ان عناصر کے ہاتھوں میں وہ سارے فارمولے نہ پڑ جائیں جن سے ایٹم بم سے بھی خطرناک اور ہولناک کیمیائی اور جراثیمی ہتھیار تیار ہوں اور جراثیمی تباہی کا دور شروع ہو جائے۔ اقتصادی طور پر پوری دنیا سمٹ کر ایک مرکزی نقطہ کے گرد جمع ہو رہی ہے۔ ساری دنیا میں جس طرح کی اقتصادی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کے اثرات بہت جلد اس صورت میں نظر آنے لگیں گے اور شاید پوری دنیا میں ایک جیسی تہذیب کا فروغ ہونے لگے۔ اب زمانہ اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ انہیں تہذیبی کشمکش کا نام دینا بھی مناسب نہیں رہ گیا۔ بلکہ ایک تہذیب کے رنگ میں دنیا رنگنے کے لئے بے چین نظر آ رہی ہے اور اسی سمت قدم بڑھا رہی ہے۔

اگر ہم اس سارے پس منظر کا یہ سمجھ کر کہ ادب سماج کی عکاسی کرتا ہے اپنی زبان و ادب پر پڑنے والے اثرات کو دیکھنے کی کوشش کریں تو ہمیں شاید کوئی فرق نظر نہ آئے۔ یعنی ہمارے ادب کا پیمانہ وہی ہے اور ادب کے پیمانے اتنی جلدی بدلتے بھی نہیں۔ لیکن ظاہری اسباب کا اثر تو لامحالہ پڑتا ہے اور اگر ہمارے ادب میں اس قسم کا کوئی اظہار نہیں ہو رہا ہے تو اس کا مطلب آس پاس اور گرد و پیش کے حالات سے عدم [illegible]

آج انٹرنیٹ، ای کامرس، ای آفس (ایسے [illegible] ہو) نے ہمارے ذہنوں میں یہ شبہ ہی [illegible] جلد اور بہت جلد چھپے ہوئے کاغذ کی [illegible] ہوئے کاغذ کی کوئی اہمیت نہیں رہ جائے گی۔ [illegible] ہے۔ آج بھی دنیا میں کروڑوں کتابیں چھپ رہی ہیں [illegible] جن ملکوں میں ای بک اور ای ویب سائٹ کا فروغ ہو رہا ہے وہاں بھی کاغذ [illegible] کے مقابلے میں بڑھتی جارہی ہے۔ ابھی حال ہی میں [illegible] پندرہویں عالمی کتاب میلے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ الیکٹرانک بک کی بات ہمارے شبہات غلط تھے۔ کیونکہ اتنی آسانی سے [illegible] کتابوں سے ہم اپنا رشتہ نہیں چھڑا سکتے ہیں اور یہی ہمیشہ ہماری رفیق رہیں گی۔ اس بار کے اس کتاب میلے میں جتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور کتابوں کی خرید کی اس نے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بازار میں اردو کتابوں کا کیا رول رہا ہے پتہ نہیں چل سکا۔ ابھی تک ایسی کوئی واضح بات بھی نظر نہیں آسکی ہے کہ کتنی اردو کتابیں اس میلے میں فروخت ہوئیں کیونکہ اردو زبان کے بارے میں متضاد فکر چل رہی ہے۔ ایک طرف کہا جارہا ہے کہ یہ عالمی زبان بن گئی ہے اور دوسری طرف یہ ہمارے گھروں سے بھی بے دخل ہو رہی ہے۔ عام بازار میں بھی اردو کتابوں کی فروخت میں لگاتار کمی ہوتی جارہی ہے۔

اس شمارے میں ایک خصوصی مضمون بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے اردو کے مشہور ادبی رسائل کے اداریوں پر دے رہے ہیں۔ یہ بات کہہ گاہے باز خواں جیسی نہیں ہے بلکہ آج کے اردو رسائل کو روشنی دکھانے کے مصداق ہے۔ مضمون بہت طویل تھا جس میں سے بعض حصے حذف کر دئے گئے ہیں تاکہ دلچسپی قائم رہے۔ آجکل کی تاریخ میں ایک ہی قسط میں شائع ہونے والا یہ سب سے طویل مضمون ہے۔ یہ ایک استثنائی صورت بھی ہے جسے مضمون کی افادیت کے تحت ہم نے اپنایا ہے۔

اس دوران ہمارے بہت سے ایسے قلم کار جن پر ہمیں ناز تھا اور جنھوں نے اپنی اپنی فیلڈ میں ہمارے ادب کو فروغ دینے کے لئے نمایاں کارنامے انجام دئے، وہ روز بروز ہم سے جدا ہوتے جارہے ہیں۔ ابھی زخم تازہ ہی تھا کہ مایہ ناز نقاد، شاعر، انشاپرداز، بہترین نثر نگار پروفیسر آل احمد سرور بھی ہم سے جدا ہو گئے۔ کس کس کا ماتم کیا جائے، جانے والوں کا [illegible] ان سے پیدا ہوئے خلا کا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ ہم بطور خراج عقیدت آجکل کا ایک خصوصی شمارہ آل احمد سرور صاحب کی شخصیت پر جلد ہی شائع کریں۔

([illegible])

قدیم ادبی رسائل کے اداریے

[illegible] صحافتی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ اس کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود رسائل وجرائد کی ایجاد۔ اداریہ ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں علم وادب اور رفتار زمانہ کی مختلف جھلکیاں بیک وقت نظر آتی ہیں۔ ابتدا میں اس کی کوئی واضح شکل نہیں تھی اور نہ ہی اس کے نمائندہ اصول تھے لیکن زبان وادب کی ترقی کے ساتھ ساتھ اداریہ نویسی ایک فن کی شکل اختیار کر گئی اور اس کے معنی ومفہوم میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس کے باوجود دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اداریہ کے نظریات اور مقاصد رسائل وجرائد کے معیار ومسلک اور مدیران کے علمی ظرف وذوق کے تحت بدلتے رہے ہیں۔ اس کے بارے میں کوئی جامع اصول اور حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

صحافت کی کتابوں میں اداریہ نگاری یا ایڈیٹوریل کی جو تعریفات ملتی ہیں اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعہ ایڈیٹر اپنے خیالات وافکار کا اظہار زبان وادب، فکر وفن اور رفتار زمانہ کے حوالے سے کرتا ہے۔ یہ ایک سائنٹفک عمل ہے۔ سچائیاں اور اخلاص جس کی بنیادی قدریں ہیں۔ کامیاب اداریہ ایک ایسے مدیر یا اڈیٹر کے خیالات کا نیاز مندانہ اظہار ہے جو غیر معمولی قابلیت اور ہمہ گیر معلومات رکھتا ہے اور اپنی تحریروں کو ضابطہ اخلاق کے اندر رکھتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ماضی وحال پر اس کی نگاہیں ہوں اور مستقبل کے لئے اس کے پاس مستند فکر وفلسفہ ہو۔ انداز تحریر دلنشیں ہو۔ وہ چھوٹے بڑے عصری حالات، علمی واقعات اور ادبی تحریکات کو منطقی استدلال کے ساتھ پیش کرے تاکہ اس کا پیغام قاری کو متاثر کرسکے۔ ایک اچھے اداریہ نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ یہ سوچ کر لکھے کہ قاری اور سامع اس سے زیادہ باشعور اور باعلم ہے۔ اداریہ کا مقام صحیفہ ادب سے اونچا ہے۔ رسالے کا معیار مدیر کے معیار علم اور ذوق ادب پر منحصر ہے۔ رسالے کے مشمولات سے مدیر کے علمی مرتبے کی نشاندہی ہوتی ہے اور اس کا عکس اداریوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ رسائل میں مختلف النوع علوم وفنون اور مختلف اور متضاد عنوانات کے مضامین شائع ہوتے ہیں جن کی پرکھ کے لئے ایڈیٹر کے پاس مناسب علم کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ رسالے کا مدیر مافوق العلوم ہو بلکہ اس کی حیثیت ایک معلم [illegible] کی ہو تاکہ خوب اور ناخوب میں فرق کرسکے۔ تعصب، گروہ بندی، آزاریاں، شخصیت [illegible] اور ہم عصروں سے [illegible] ادبی اداریہ نگاری کے موانعات میں سے ہیں۔ عجب وغرور، انا کی ظاہری اور باطنی شکلیں، کسی مسلک ادب کی غلط تعبیریں، عصری حالات وواقعات کی مسخ شدہ تصویریں، مایوسیاں اور قنوطیت ایک شائستہ اور مثبت اداریہ نگاری کے اجزائے ترکیبی نہیں ہیں۔

بعض رسالوں میں اداریوں کا فقدان اس کی بے لباسی کا مترادف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ رسالہ لاوارث ہو اور یتیمی کا شکار ہو۔ قارئین اور ناظرین کی فکری تربیت اور علمی ذوق کی نشو ونما میں اداریوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ صاحب مدیر کو مذکورہ ضابطوں کے تحت اظہار رائے کی مکمل آزادی ہو۔ لیکن وہ رسالے جو سرکاری خرچ پر چلتے ہیں اور ریاستی اکیڈمیوں کے زیر اثر شائع ہوتے ہیں ان کے مدیران کے ساتھ مصلحتیں ہوتی ہیں اور اظہار رائے کی کھلی چھوٹ نہیں ہوتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا معاشرہ جب مختلف عنوانات سے زیادہ روشن اور خوشحال ہوگا تو یہ صورت حال بدلے گی اور ہم حالات کا محاسبہ نہایت دیانت داری اور غیر جانب داری سے کرپائیں گے۔

ہمارے پیش نظر بیسویں صدی کے ربع اول میں شائع ہونے والے چند محترم ادبی رسائل کے اداریے ہیں ان کے مطالعہ سے کئی رجحانات سامنے آتے ہیں اور ان کے ارتقائی سفر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ ابتدا میں اداریہ نویسی کا فن ناتراشیدہ تھا۔ اس کا تعلق تخلیقات اور صاحبان تخلیقات کے تعارف اور تعریف وتوصیف سے زیادہ تھا۔ اس کے نمونے 'دلگداز' اور 'مخزن' میں ملتے ہیں۔ "عصمت، سہیلی، تمدن" وغیرہ کا بھی یہی انداز تھا۔ البتہ 'زمانہ' اور 'الناظر' میں جدید اداریہ نگاری کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ 'صلائے عام' بھی فرسودہ روایات کا حامی تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جو ادبی رسائل منظر عام پر آئے وہ معنوی اعتبار سے مستند اور مکمل تھے۔ ان کے مشمولات اور ان کے اداریے، علمی وادبی اور صحافتی ادب کی جملہ خوبیوں سے بہرہ ور تھے۔ ان رسالوں میں "ہمایوں، نیرنگ خیال، نگار اور مخزن جدید" قابل ذکر ہیں۔

'مخزن' اور 'زمانہ' کے اداریوں میں ایک شان دلربائی تھی۔ سپردگی اور حسن ایثار کا یہ عالم تھا کہ مدیر کی ذات کہیں نمایاں نہیں ہوتی ہے۔ مدیر اپنی ذات کو فنکار کی ذات اور شخصیت کے مقابلے میں ادنیٰ تصور کرتا ہے۔ زبان وادب کے اعلیٰ ترین مقاصد کے پس منظر میں شیخ عبدالقادر اور دیانرائن نگم ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس کے خلاف 'صلائے عام' کے اداریوں کا مطالعہ کیجئے تو خود ستائی اور ذاتی تعریف وتوصیف

[illegible] ۲۰۰۲

[illegible] سامنے آتی ہیں۔

"مخزن" کلی طور پر ایک علمی جریدہ تھا۔ اس کی اپنی وضعداری تھی۔ علم و ادب کے تعمیری اثرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی نام و نمود، شہرت اور ناموری کی [illegible]قتوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور خدمت زبان و ادب اس کا اصل انعام ہوتا ہے۔ اس [illegible] سالہ میں اداریہ نگاری کی جدید روش نہیں تھی۔ اس کے لئے کوئی عنوان مقرر نہیں [illegible]تھا۔ اہم تخلیقات نظم و نثر کے ساتھ شیخ عبدالقادر کا جو مختصر نوٹ اور فنکار کی فنی خوبیوں پر جزوی تبصرہ ہوتا۔ تمام تحریروں میں عصری تنقید کی جھلکیاں ہوتیں اور اردو [illegible]بان کی مروجہ تہذیب و تمدن کا منظر نامہ ہوتا۔ منظوری اشاعت ہر شمارہ میں نصف [illegible]ر جن سے زیادہ اداریے ہوتے۔ یہ کام جہاں علمی تبحر، ضبط نفس اور ریاضت کا متقاضی ہے وہیں جذبہ ایثار بھی چاہتا ہے۔ شیخ موصوف کی اس روایت کو مخزن کے دوسرے [illegible]دیران مثلاً شیخ محمد اکرام، تاجور نجیب آبادی، راشد الخیری اور حضرت طور نے بھی قائم [illegible]رکھا البتہ مخزن کے دور جدید میں یہ روش بدل گئی اور اداریوں کا وہی انداز سامنے آیا جو "نگار، نیرنگ خیال، بہارستان" وغیرہ کا تھا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ ایسے تمام اداریوں کو سمیٹ کر اگر کتاب کی شکل دی جائے تو بلاشبہ یہ ایک علمی اور تہذیبی تاریخ بن جائے گی۔ کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ مدیر "مخزن" کو اپنے قلم کاروں اور معاونین تخلیقات سے کس قدر ذہنی اور جذباتی وابستگی تھی۔ دلداری اور نیاز مندی کا یہی انداز بہت حد تک مخزن کی غیر معمولی کامیابی اور شہرت کا باعث تھا۔ مدیر اور فنکار کے آپسی رشتے اور صاحب قلم سے مدیر کی واقفیت، راہ و رسم اور دوسرے تعلقات رسالہ کی کامیابی میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس دور کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب و شاعر ہو جس سے شیخ عبدالقادر کے ذاتی مراسم نہ ہوں۔ چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن سے ان رشتوں اور التفات کی نشاندہی ہوتی ہے:

"میر نذیر حسین احمد بی۔ اے جن کے کلام سے ہمارے ناظرین آشنا ہیں، یہ مختصر سا مضمون ماہیت نظم کے متعلق ہے۔ غور کرنے والوں کو اس میں نئے خیالات اور مفید اشارات ملیں گے اور یہ معلوم ہوگا کہ انگریزی مذاق کے موافق نظم ہمارے یہاں کی نظم کی طرح قیود ردیف و قافیہ میں جکڑی ہوئی نہیں ہے......"

(مخزن، اپریل ۱۹۰۲ء)

"ہمارے مکرم مرزا سلطان احمد اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جن کا فلسفیانہ سلسلۂ مضامین بعنوان 'تبادلۂ خیالات' اوراق مخزن میں شائع ہو رہا ہے اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے...... مندرجہ ذیل مضمون (تحسین و نفرین) میں جو غور و فکر کا نتیجہ ہے ہمارے اہل وطن کی طبیعتوں کے ایک انتہائی نقصان دہ ضعف کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ امید ہے ابنائے وطن اس پر غور کریں گے......" (مخزن، اگست ۱۹۰۲ء)

"......خان بہادر مولوی سید اکبر حسین اکبر سیشن جج الہ آباد کی برجستہ سخنوری کا ایک زمانہ قائل ہے۔ کچھ عرصہ ہوا انہوں نے انگریزی کی ایک نادر نظم موسوم بہ 'روائی آب' کا ترجمہ بذریعہ معارف شائع کیا تھا جسے دیکھ کر ہر سخن فہم تصویر حیرت بن گیا تھا۔ وہ ترجمہ اس قدر پسند ہے کہ ہم اسے آئندہ کسی پرچہ میں منقولات کے صیغہ میں درج کریں گے...... سردست انہوں نے ایک ایسی نظم عنایت کی ہے جو انہوں نے بہ فرمائش نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی صاحب بہادر کلکتہ کانفرنس کے لئے تیار کی تھی مگر چونکہ وہ شریک نہ ہو سکے اس لیے نہ بھی پڑھی گئی اور نہ شائع ہوئی۔ ہر چند کہ اس کا خطاب مسلمانوں کی طرف ہے [illegible] دکھلایا گیا ہے کہ ہمارے ہندو ناظرین بھی اسے [illegible] کی [illegible]

عبدالقادر"

[illegible]

"میرے محترم دوست مولانا محمد یوسف صاحب [illegible] کی اس نفیس غزل پر مصرعے لگائے ہیں جن میں حضرت [illegible] کے سارے [illegible] گن دیئے ہیں۔ مگر وہ [illegible] مصرعے اور چسپاں ہو گئے ہیں ایک اچھا خاصا تضمین ہو گیا۔ اب [illegible] ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ خواجہ صاحب کا کلام [illegible] حضرت [illegible] مصرعے سونے میں سہاگہ۔ نذر کرتا ہوں۔"

(مخزن، مارچ ۱۹۰۳ء)

"دہلی کے مشہور داستان گو میر باقر علی صاحب جن کے دم سے داستان گوئی کے مٹتے ہوئے فن کا نام اس شہر میں باقی ہے...... ذیل کا مضمون ایک [illegible] جو ہماری درخواست پر انہوں نے قلم بند کیا ہے۔ اس میں بھولے بھٹکے مسافر کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو کسی معمولی سرائے میں برسات کے موسم میں جا پھنسا ہے۔"

(مخزن، [illegible])

مخزن کے اداریوں کے مطالعہ سے ایک اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ عام ہم عصر رسائل میں جہاں خسارہ، پڑھنے والوں اور خریداروں کی کمی، قلم کاروں کی ناتوجہی اور دوسرے مسائل کا ذکر ہے وہاں مخزن کے اوراق ان ماتمی انداز فکر سے سراسر خالی نہیں۔ مخزن پر بھی برے دن آئے۔ نامساعد حالات کا سامنا ہوا [illegible] میں رسالہ کی اشاعت میں رخنہ پڑا لیکن اس کے اوراق میں چند الفاظ بھی ایسے نہیں ملتے ہیں جن سے شکوہ شکایت اور حالات کی نامہربانیوں کا اندازہ ہو۔

مخزن کا دور جدید جو دور تمامی بھی تھا بڑی تقطیع میں حفیظ جالندھری کی ادارت میں شائع ہوا۔ اداریہ نویسی کے باب میں اس رسالے کی ندرت یہ تھی کہ حفیظ جالندھری خود نہیں لکھتے تھے بلکہ یہ کام خیر ملک کے مشہور انشاپرداز اور اپنی طرز کے منفرد و ممتاز حضرت ملا رموزی کے سپرد تھا۔ جدید اصطلاح میں ان کی حیثیت مہمان مدیر کی تھی۔ لیکن مخزن کے یہ مستقل مہمان تھے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد سے اردو زبان کے نثری ادب میں فکر اور اسلوب کی سطح پر بڑا انقلاب آیا۔ انیسویں صدی کے اواخر تک سرسید اور محمد حسین آزاد نثری ادب کے معمار ان رہے۔ ۱۹۱۵ء تک نثر کی تراش خراش میں حالی، شبلی، اقبال، سجاد حیدر، عبدالقادر، اشرف الحق، حسرت موہانی، وحشت وغیرہ نے نمایاں حصہ لیا۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد سے جدید نثر لکھنے والوں کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی جس میں نیاز فتحپوری، ابوالکلام آزاد، مجنوں گورکھپوری، اختر شیرانی، پطرس بخاری، مہدی افادی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی نثر حبیب الرحمن خان شیروانی، پروفیسر محمود شیرانی، راشد الخیری اور حسن نظامی کی نثر سے بالکل مختلف تھی۔ زبان کی اس ترقی کا اثر رسائل کے اداریوں پر بھی پڑا۔ "نگار، نیرنگ خیال، خضر راہ، بہارستان" وغیرہ جرائد نے اداریہ نگاری کی پرانی روایت سے انحراف کیا۔ موضوعات میں تنوع پیدا ہوا۔ اب اداریہ نویسی صرف تخلیقات کے تعارف اور ادیب و شاعر کی دلداریوں کا ذریعہ نہیں رہی بلکہ ان میں زبان و ادب، شعر و سخن کے علاوہ سیاست، مذہب، عصری حالات و واقعات، درگاہ زمانہ، تاریخ و تمدن غرض کہ

[illegible] کے [illegible] ادب کی ترجمانی ہونے لگی۔ [illegible] رنگ ظاہر [illegible] کی عکاسی ہونے لگی۔

[illegible] مخزن [illegible] قدیم روش پر قائم تھیں جب علامہ سروری کا جتنا ہوا [illegible] تھا۔ ان کے تحریر شدہ اداریوں میں عصری [illegible] لیکن بنیادی طور پر ان کی [illegible] موضوع علم [illegible] شعر و سخن ہی رہا ہے۔ [illegible] سیاست سے انہوں نے پرہیز [illegible] کی مخالفت میں انہوں نے کوئی بھرپور علمیت نہیں کی اور اپنے مخصوص طریقے [illegible] انداز میں متعلقات زبان و ادب پر نشتر چلاتے رہے۔ لیکن وضعداری [illegible] عروج نظر آتی ہے۔

مخزن کا ہم عصر 'زمانہ' تھا۔ مخزن ۱۹۰۱ء میں جاری ہوا اور 'زمانہ' ۱۹۰۳ء میں۔ [illegible] زبان و ادب کے معاملے میں دونوں میں اشتراک فکر اور اشتراک عمل تھا۔ لیکن کئی حیثیتوں سے 'زمانہ' کا مقام اونچا تھا۔ ایک اندازہ کے مطابق یہ رسالہ مخزن کی ہمسری میں نکالا گیا تھا لیکن ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۴۸ء کی بیشتر جلدیں ہمارے مطالعہ میں شامل ہیں کہیں بھی منافرت اور مخاصمت کا شائبہ نظر نہیں آتا اور اس کے ایک ایک ورق میں اردو زبان کی تہذیب و شائستگی جھلکتی ہے۔ اس رسالہ کے بانی اور مدیر پنڈت شیو برت ورما تھے اور اپنے لئے 'مرتب' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ چند مہینوں کے بعد نومبر ۱۹۰۳ء میں اس کی ادارت کی ذمہ داریاں پنڈت دیا نرائن نگم کے سپرد ہو گئیں۔ بنیادی طور پر یہ ایک علمی و ادبی رسالہ تھا لیکن مذہب، سیاست، سائنس، اقتصادیات، صحافت، معاشرت، سیاحت، تجارت اور دیگر عنوانات پر اعلیٰ پائے کے مضامین اس میں شامل ہوتے تھے۔ مشاہیر عصر اور اس دور کے اول درجہ کے شاعر و ادیب کی سرپرستی اسے حاصل تھی۔

اس کے اداریوں میں بھی ہمہ جہتی تھی۔ لیکن کسی شمارے سے اس امر کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ اداریہ نویس کون ہے؟ کہیں بھی اداریہ، پیش لفظ، شذرات، ملاحظات جیسے عنوان کا استعمال نہیں ہوتا۔ ہر رسالہ کے آخر میں "رفتار زمانہ اور علمی خبریں" کے عنوان ہوتے اور علم و ادب سے لے کر سیاست و حکومت کی باتیں تفصیل سے ہوتیں۔ علمی، سیاسی اور مذہبی مجلسوں کی روداد، ملکی اور غیر ملکی حالات و واقعات، کتابوں اور رسالوں کی اشاعتیں، راجواڑوں اور نوابوں کے ایثار و عطا کی داستانیں، مرنے والوں کی تعزیتیں اس میں شامل ہوتیں۔ ایک وضعداری جو مخزن جدید کے اداریوں سے اسے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس رسالہ نے اپنے پچاس سالہ زندگی میں کسی ہم عصر مدیر یا صاحب قلم کی دل آزاری نہیں کی۔ نہ اس پر طنز کیا۔ اگر فن، فنکار، مسائل اور کتابوں پر تبصرے بھی ہوئے تو نہایت مہذب اور دل نشیں انداز میں۔ اس کی مثال بھی خال خال نظر آتی ہے۔ ابتداءً چند اقتباسات تاریخ وار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ زمانہ کے اداریوں کا مخصوص انداز معلوم ہو سکے:

"......زمانہ کو جاری ہوئے صرف تین چار مہینے ہوئے ہیں۔ مگر اس وقت اس کی اشاعت ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے اور کامل امید ہے کہ آئندہ جنوری تک غالباً تین چار ہزار تک پہنچ جائے گی۔ یہ زمانہ کے دلچسپ ہونے کا بڑا ثبوت ہے......"

(زمانہ، مئی ۱۹۰۳ء)

"زمانہ کو جاری ہوئے آج چالیس مہینے ہیں۔ ناظرین والا تمکین کی قدر دانی اور سرپرستی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے ملتجی ہوں کہ اس کی سالانہ قیمت بھیج کر ہماری ہمت افزائی کریں تاکہ زمانہ کے سلسلے میں ہم کو برابر خدمات انجام دینے کا موقع رہے۔"

(زمانہ، جون ۱۹۰۳ء)

"اس نمبر سے زمانہ کی زندگی کا چودھواں سال شروع ہوتا ہے۔ گزشتہ تیرہ سالوں میں اس کی اشاعت کی راہوں میں جو مشکلات کا سامنا ہوا ہے اس کا کچھ علم ہمیں کو ہے۔ تیرہ سال کے اندر ہزارہا روپیہ مالی نقصان کے باوجود جس طرح سے ہوا رسالہ اب تک جاری رکھا گیا ہے۔ تمام الزامات اردو پبلک پر ہے جن کی قدر دانی اس قدر محدود ہے کہ ملک میں ایک رسالہ بھی اپنی آمدنی سے اپنے مصارف پورے نہیں کر سکتا۔ اردو میں کیسے کیسے شاندار رسالے نکلے مگر سب دو چار برس کے اندر بند ہو گئے......اردوئے معلی، ادیب وغیرہ بند ہو گئے۔ مخزن ہنوز باقی ہے۔"

(زمانہ، جنوری ۱۹۱۶ء)

"اس پرچہ کے ساتھ زمانہ کی زندگی کا انیسواں سال ختم ہو رہا ہے۔ ابتدائی مشکلات کو دیکھ کر جن کا سلسلہ ابھی تک کچھ نہ کچھ جاری ہے۔ یہ عمر ایک بڑی عمر معلوم ہوتی ہے......۱۹۰۳ء میں جب یہ ذمہ داری موجودہ کارکنوں کے سر آئی تھی تو کس کو بھروسہ تھا کہ یہ ناچیز کوشش اتنے دنوں جاری رہ سکے گی مگر تائید ایزدی تھوڑے سے عزم و استقلال کا بھی ساتھ دیتی ہے۔ زمانہ کی ہستی کا اب تک قائم رہنا تائید غیبی کا ایک ادنیٰ معجزہ ہے۔"

(زمانہ، مئی ۱۹۲۱ء)

"اس نمبر کے ساتھ رسالہ 'زمانہ' کا چھبیسواں سال ختم ہوتا ہے۔ کوشش جاری ہے کہ آئندہ رسالہ کی موجودہ خصوصیت قائم رہے...... توسیع اشاعت ہی ہمارے ارادوں کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ ناظرین ایک ایک دو دو خریدار دے سکتے ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارے مہربان اس بارے میں تھوڑی کوشش کر کے اس ادبی کوشش کی توسیع میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔"

(زمانہ، اگست ۱۹۲۸ء)

"......زمانہ کی مالی حالت کا ذکر کر کے ہم اپنے ناظرین کو بے لطف نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن یہ ایک دل شکن حقیقت ہے کہ اتنے دنوں کی خدمت گزاری کے بعد بھی زمانہ کی آمدنی سے اس کے اخراجات پورے نہیں ہوتے چنانچہ پچھلے دو سال یعنی ۳۴-۱۹۳۶ء میں رسالہ پر دو ہزار چار سو چھ روپے تیرہ آنے کا خسارہ آیا جو قریب قریب سب اخبار 'آزاد' کی آمدنی سے پورا ہو......"

(زمانہ، جولائی ۱۹۳۸ء)

اردو رسالوں کی محرومی اور مالی بدحالیوں کا منظر نامہ آج کوئی نیا نہیں ہے بلکہ یہ داستان محرومی بہت پرانی ہے۔ تاریخ وار مسلسل ایک ہی عنوان کے اقتباسات پیش کرنے کا مدعا یہی تھا کہ ناظرین اردو اس زبان کی شکستہ پائی کا اندازہ لگا سکیں۔ ان نامساعد حالات کے باوجود اردو زبان و ادب ترقی کرتی رہی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لسانی اعتبار سے اس زبان میں ایسی خوبیاں ہیں جو قدرتی طور پر اسے زندہ و پائندہ رکھے ہوئے ہیں۔

اردو زبان و ادب کے یہ مسائل آزادی سے قبل کے ہیں۔ دس سال کے بعد منظر اور زیادہ حوصلہ شکن ہو جاتا ہے۔ اس کی روداد مدیر زمانہ کے الفاظ میں سنئے:

"تقسیم ملک نے ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا ہے۔ ادبی شعبہ بھی اس کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اردو کی بھی، جس کو ایک زمانہ سے ہندو مسلم متفقہ کوششوں سے حاصل کیا ہوا اشتر کہ سرمایہ تصور کیا جاتا تھا ایک تنگ نظر طبقہ کے ہاتھوں مٹی خراب

ہوئی اور آج اس کا مستقبل تاریک ہو گیا...... اردو زمانہ موجود میں جس انقلابی دور سے گزر رہی ہے اور اس کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ ہمارے ناظرین یا تمکین سے مخفی نہیں۔ پھر بھی ہم نے 'بانی مرحوم' کے نصب العین کی تکمیل کے راستے پر گامزن رہنے کا عزم بالجزم کر لیا ہے...... لیکن اس عزم کو قائم رکھنا ہمارے سرپرستوں کے ہاتھ ہے۔ ہم متوقع ہیں کہ ہمارے سرپرست دامے، درمے، سخنے ہر نوع ہماری امداد کر کے ہمارے عزم کو پورا کرنے میں ہماری مدد فرمائیں گے......"

(زمانہ، مئی ۱۹۴۸ء)

زمانہ کے اداریوں میں تخلیقات ادب پر تنقید و تبصرہ کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی شعر و سخن کے فنی اور شعری نکات سے بحث ہوتی تھی۔ زبان و ادب کے مختلف مسائل پیش نظر ہوتے اور علمی، تدریسی اور اشاعتی دنیا کی، اردو کے حوالے سے بے شمار تحریریں ہوتیں۔ سیاست اور تحریک آزادی کے مختلف رجحانات اس رسالہ کے دلچسپ موضوعات میں سے تھے۔ علمی خبروں کی اشاعت سے زبان و ادب کے اچھے برے پہلو سامنے آتے ہیں اور زبان و ادب کا محاسبہ کرنے میں مدد ملتی ہے۔ چند اقتباسات نذر ناظرین ہیں:

"زمانہ جنوری ۱۹۱۱ء سے چند اہم اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو گزشتہ سال بھر کا ریویو ہے۔

'منشی سورج نرائن صاحب مہر کے کلیات کی دوسری جلد شائع ہو گئی ہے۔ پہلی جلد کی کامیابی کا اندازہ کر کے آٹھ ہزار چھاپی گئی ہے۔ اردو میں اچھی کتابوں کی قدر دانی کا مادہ اب پیدا ہو رہا ہے......'

'اردو میں عمدہ سفر ناموں کی تعداد بہت کم ہے۔ حافظ عبدالرحمن نے اپنا دلچسپ سفر نامہ لکھ کر ملک پر احسان کیا ہے...... مولانا شبلی کا سفر نامہ مصر و روم، شیخ عبدالقادر کا سفر نامہ 'دارالخلافت'۔ حال میں مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار نے اپنا سفر نامہ یورپ شائع کیا ہے......'

'اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار مولوی عبدالحلیم شرر نے حیدر آباد سے واپسی کے بعد اپنی علمی خدمات کا از سر نو مستقل سلسلہ قائم کیا ہے۔ کچھ عرصہ سے وہ ہادیان دین وغیرہ کی سوانح عمریاں لکھ رہے تھے۔ اب پھر آپ نے کئی نئے افسانے لکھے ہیں۔ ان میں تین ماہ ملک، فلپا اور غیب دان دلہن شائع ہو گئے ہیں۔'

'اردو میں ادب صنائع بدائع اور فنون کے کئی رسالے پچھلے سال جاری ہوئے۔ ان میں مستورہ ناگپور، ادیب الہ آباد، لسان العصر لکھنؤ۔ پنجاب ریویو کرم آباد، اولڈ بوائے بنارس، استبصار رائے بریلی، المصنعت لاہور، سفیر لکھنؤ، میوزک گزٹ قابل ذکر ہیں۔'

'مولانا حسرت موہانی ایک عرصہ سے اردو شعرا کا ایک قابل قدر تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ قدیم شعرا کا کلام اور ان کے حالات جس قدر دانی اور دور رسی کے ساتھ مولانا نے جمع کئے ہیں اس سے امید ہے کہ یہ تذکرہ اردو میں ایک یادگار تذکرہ ہوگا۔'

'منشی دیبی پرشاد مورخ راجپوتانہ جودھپور نے ہندو شاعروں کا ایک نہایت جامع اور قابل قدر تذکرہ شائع کیا ہے۔'

'لالہ سری رام صاحب دہلوی کے مشہور و معروف تذکرہ خمخانہ جاوید کی دوسری جلد زیر طبع ہے۔'

'سال گزشتہ میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے مولوی سعید احمد صاحب کی کتاب امراء ہنود شائع ہوئی ہے۔

شعر العجم، مصنف مولانا شبلی نعمانی کی [illegible] کی مشہور تصنیف کا ترجمہ (معرکہ مذہب و سائنس) [illegible] نواب عزیز جنگ بہادر کی جلدیں۔ [illegible] مولوی سمیع اللہ خاں بہادر کی سوانح عمری۔ سیادت [illegible] معشوق حسین خان۔ مسٹر دت کی تاریخ کا ترجمہ [illegible] ایم ولایت۔ تسخیر شوہر مصنفہ مولوی سعید احمد [illegible] تاج سخن (کلیات حضرت جلیل) کلیات اکبر۔ تاریخ [illegible] سال گزشتہ کے مطبوعات میں قابل ذکر ہیں۔"

رسالہ 'زمانہ' کے اداریوں کا یہ انداز تحریر اس کے پورے [illegible] صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ذرائع ابلاغ محدود طریقہ خبر رسانی کا [illegible] ہی زبان کے قاری اتنے باشعور اور علم پرست تھے۔ اس لئے رسائل میں اس طرح کی علمی خبروں کا شائع ہونا اس وقت کی اہم ضرورت تھی۔ سال بھر کا علمی، ادبی اور اشاعتی منظر نامہ ایک ساتھ پیش کرنے کے علاوہ ہر ماہ کے شمارہ میں علمی خبریں اداریوں کے صفحات میں ضرور ہوتے تھے۔ چند مزید اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:

"جام فلک کے نام سے لالہ لال چند فلک کا ایک مجموعہ کلام شائع ہوا ہے جس میں آغاز ۱۹۱۴ء سے ۱۹۲۰ء تک کی فلک صاحب کی کل نظمیں درج ہیں......"

(زمانہ، جنوری ۱۹۲۱ء)

"ڈاکٹر اقبال کی مشہور فارسی تصنیف اسرار بیخودی کا انگریزی میں ترجمہ ہو گیا ہے اور اس کو میکمیلن کمپنی نے شائع کیا ہے۔" (زمانہ، جنوری ۱۹۲۱ء)

"انجمن ترقی اردو کا رسالہ 'اردو' محاسن ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے اردو کا بہترین رسالہ ہے۔ اس کے مضامین اردو ادب کے لئے باعث فخر ہیں۔ اور ہم ایسے اعلیٰ تنقیدی مضامین کی اشاعت پر اس کے لائق ایڈیٹر مولوی عبدالحق صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں......" (زمانہ، جولائی ۱۹۲۱ء)

"خوشی کی بات ہے کہ ہم عصر مخزن اب پھر شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس مرتبہ اس کا سائز 'زمانہ' کے سائز کے برابر کر دیا گیا ہے......" (زمانہ، جولائی ۱۹۲۱ء)

"عربی زبان میں کئی رسائل اور اخبار امریکہ اور یورپ میں نکلتے ہیں۔ حال میں اردو زبان کا پہلا رسالہ 'نوائے کیمبرج' کے نام سے کیمبرج میں جاری کیا گیا ہے۔ گو یہ ہندوستانی ہی میں چھپا ہے۔ رسالہ مذکور ہندوستانی طلبہ مقیم انگلستان کے زیر اہتمام جاری ہوا ہے۔ ہندوستان میں اس کی اشاعت مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کے ذریعہ ہو گی۔"

(زمانہ، جولائی ۱۹۲۱ء)

'مخزن' اور 'زمانہ' کا ہم عصر ایک علمی رسالہ 'الناظر' تھا جو ظفر الملک علوی کی ادارت میں ۱۹۰۹ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ اس کے اداریے 'نظرے خوش گزرے' کے عنوان کے تحت رقم ہوتے تھے جو ہم عصر رسالوں میں بہت مقبول تھے اور ان کی تحریریں دوسرے جرائد میں حوالوں کے طور پر پیش ہوتی تھیں۔ ان اداریوں میں تحریری جدت تھی۔ خیالات میں ایک باغیانہ انداز ہوتا اور طرز ادا [illegible] تھی۔ چونکہ ظفر الملک علوی سیاسی انداز فکر رکھتے تھے اس لئے سیاسی افکار و خیالات کا برملا اظہار اداریوں میں ہوتا۔ اپنے سیاسی عقائد کی وجہ سے [illegible]

[illegible] ادبی [illegible] لکھنؤ کا مشہور رسالہ الناظر جاری [illegible] کے بعد بند ہو گیا اب پھر جاری ہونے [illegible] شروع کی گئی ہے۔ ہم ایڈیٹر ظفر الملک صاحب کی [illegible] اپنے شہر کی غیر حاضری میں ان کے علمی مشاغل کو [illegible] حاصل کر رہی ہیں۔ قدر دانان اردو کا فرض ہے کہ اس [illegible] کریں۔"

الناظر کے اداریے رسالہ نیرنگ خیال کے اداریوں سے مشابہ تھے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ زبان و ادب اور علمی مسائل کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات ان کے اداریوں میں شامل ہوتے تھے۔ اردو کا تحفظ نہیں، انجمن ترقی اردو کی قیام، اردو زبان اور اس سلسلے میں پیدا ہونے والے مسائل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام اور اس کے مسائل جیسے اہم عناصر اس کے اداریوں کے اجزائے اعظم تھے۔ ان کے بعض اداریوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سیاست میں ایک خاص مسلک سیاست کا حامی تھا۔ ایک دلچسپ اقتباس اگست ۱۹۲۳ء کے الناظر سے پیش کیا جاتا ہے:

"علم طبعیات کے مالک آہستہ آہستہ سیاسیات میں بھی قابلیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ سر پی۔ سی رائے کے یہ الفاظ کہ موجودہ متمدن نظام حکومت سے طوائف الملوکی ہزار درجہ بہتر ہے، ابھی کانوں میں گونج ہی رہے تھے کہ یورپ کے مشہور سائنسداں آئنسٹائن نے لیگ اقوام سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس کے اسباب وعلل خود اس نے بیان کئے:

"لیگ کی اس وقت تک کی کارروائیوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ دول متحدہ کے جتھوں میں سے جو سلطنت جو طرز اختیار کرتی ہے خواہ وہ کتنا ہی بہیمانہ ہو لیگ اقوام اس میں دخل دینے سے عاجز ہے میں کنارہ کشی اختیار کر رہا ہوں اس لئے کہ لیگ کے دائرہ عمل سے صرف وہ مقصد اصلی خارج ہی نہیں جس کو تحریک بین الاقوامی کا گراں بہا لقب دیا گیا ہے بلکہ اس کی تضحیک بھی ہوتی ہے......" (الناظر، ۱۹۲۳ء)

چونکہ ہمارا موضوع سخن سیاست، مذہب، قومیت وغیرہ نہیں ہے اس لئے دوسرے دلچسپ اقتباسات سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے کچھ رجحانات تو وہی تھے جو ہم عصر رسالوں کے اداریوں میں پائے جاتے تھے ان کے علاوہ اس کی انفرادی خصوصیات بھی تھیں۔ وہ یہ کہ دوسرے رسائل خصوصاً 'مخزن' اور 'زمانہ' کی طرح یہ فنکار اور مدیران عصر کی بے جا دلداریوں سے پرہیز کرتا تھا اور علمی و ادبی معاملات میں مصلحت کی راہیں اختیار نہیں کرتا بلکہ اپنا مافی الضمیر نہایت بیباکانہ طور پر پیش کرتا تھا۔ دوسری یہ کہ ہم عصر رسائل میں ترقی اردو کے سلسلے میں جو تگ و دو اور جد و جہد ہوتی اس کی جزوی تفصیل دوسرے رسائل میں شائع ہوتی تھی جب کہ الناظر کے اداریوں میں اس کی جامع نمائندگی ہوتی اور تمام جزئیات کو نہایت عمدگی اور شرح وبسط سے پیش کیا جاتا۔ چند اقتباسات:

"ایک رسالہ 'شباب' (اتفاق سے اس کا واحد شمارہ ہماری ذاتی لائبریری میں موجود ہے) جو ادب اردو کا رسالہ ہے تین سال سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کی ایک نادر خصوصیت یہ ہے کہ سر ورق پر ہر ماہ سات ایڈیٹر مع القاب یعنی ایڈیٹر، آنریری ایڈیٹر، جوائنٹ ایڈیٹر، اسسٹنٹ ایڈیٹر، سب ایڈیٹر صاحب کے اسمائے گرامی کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔ ممکن ہے یہ اعلان ترقی اشاعت میں موثر پایا گیا ہو۔۔۔۔"

(الناظر، مئی ۱۹۲۳ء)

"بعض احباب نے لکھنؤ میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس قسم کی کئی انجمنیں یہاں پہلے بھی بن چکی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے کسی نے کوئی مفید کام نہیں کیا اور شاید عملاً کسی کا مقصد بھی نہیں ہے۔۔۔۔ جو لوگ بالعموم انجمن سازی کے عادی اور مجلسی کاموں کو بہ کامیابی انجام دینے کے راز سے واقف ہیں انہیں اپنی زبان کی طرف سے تغافل مخصوص ہے یہ اتفاقی ہے اور جو اصحاب اردو کے دلدادہ اور اس کے نشوونما کے لئے حتی المقدور ساعی رہتے ہیں ان کو اجتماعی صورت میں منضبط ہو کر کام کرنے کا سلیقہ نہیں۔ ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ادبی خدمت کے لئے شعرائے گرامی کے مجتمع ہونے کی ضرورت ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شعرا کی جماعت کا ایک مرکز پر جمع ہونا اور اتفاق و اتحاد سے کام کرنا اب تک ناممکن العمل پایا گیا ہے......" (الناظر، مئی ۱۹۲۳ء)

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ اردو کانفرنس اور زبان کی ترقی کے لئے منعقد کئے گئے سمینار اور مجالس مذاکرہ کی جامع تفصیل اس رسالہ کے اداریوں کا ایک حصہ ہوتی تھی۔ ایک رپورٹ (تلخیص شدہ) اس لئے پیش کی جاتی ہے تاکہ اس وقت اردو کی ترقی کے لئے کیا کیا تحریکیں ہو رہی تھیں اس کا اندازہ ہو سکے اور معلوم ہو کہ تحریک میں حصہ لینے والے وقت کے وہ نامور شاعر اور ادیب ہوتے تھے جو اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر صرف لمبے چوڑے مضامین ہی نہیں لکھا کرتے تھے بلکہ اردو زبان کی ترقی اور نشوونما میں بلا تفریق مذہب وملت عملی طور پر حصہ لیتے تھے۔

۲۹ر دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ کے قیصر باغ میں دو روزہ اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا جس کی صدارت نواب نصیر حسین خیال نے کی تھی۔ اس جلسے کی مفصل روداد گیارہ صفحات پر مشتمل 'نظرے خوش گزرے' کے تحت پیش کی گئی تھی۔

مولانا عبدالحلیم شرر کا رسالہ 'دلگداز' ۱۸۸۷ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا۔ جب مولانا موصوف حیدر آباد تشریف لے گئے تو رسالہ کی اشاعت ملتوی ہو گئی۔ ۱۸۹۵ء سے حیدر آباد میں یہ دوبارہ جاری ہوا۔ حیدر آباد سے واپسی کے بعد ۱۹۰۴ء سے لکھنؤ میں تیسری بار اس کی اشاعت شروع ہوئی۔ سولہ چھوٹے صفحات پر مشتمل یہ رسالہ قدیم اسلامی روایات کا حامل تھا۔ زبان کے اعتبار سے اس کی حیثیت علمی و ادبی نہیں بلکہ تاریخی تھی۔ ۱۸۸۸ء اور ۱۹۱۱ء کے درمیان شائع ہونے والے شماروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے بیشتر مضامین بلکہ تمام صفحات کی تحریریں خود مولانا شرر کی ہوتیں۔ ترتیب و تزئین اتنی ناقص ہوتیں کہ قاری اگر چوکنا نہ ہو تو ایک رسالہ کی پوری تحریر کو ایک ہی مضمون کا حصہ سمجھ بیٹھے۔ فہرست مضامین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ پورے رسالہ کے خالق خود شرر ہوتے۔ البتہ گاہے گاہے علامہ شبلی کے تاریخی مضامین اس میں شائع ہوتے رہتے۔

مختلف خیالات اور ریویو کے عنوان کے تحت رسائل کے مسائل، عصری پولیٹیکل حالات اردو اور ہندی کی صف آرائی اور زبان و علم کے محرکات شریک اشاعت ہوتے۔

"دلگداز نے اس سال کئی حیثیتوں سے نمایاں ترقی کی ہے ۔ ۱۸۸۷ء میں صرف خیالات سے مدد لی گئی تھی اور پورے سال کے بارہ جزوں کے سب صفحے ایڈیٹر کے جنون انگیز ولولوں اور اس کی طبیعت کے جوش سے بھرے ہوئے تھے لیکن ۱۸۸۸ء

میں مضامین پر اصل تحریر [illegible] کو دوسری جلد [illegible] مضامین شائع کئے گئے جن میں علامہ کے جو مولوی شبلی صاحب کی تصانیف سے ماخوذ کر کے لئے گئے تھے جو مولانا [illegible] دوست مولوی خلیل احمد کا [illegible] مضمون [illegible] سے متعلق تھا اور جس [illegible] کے [illegible] کی تصویریں دکھائی گئی ایسے تھیں جن کہ [illegible] اسلام کو بھی بھول جائیں۔ ہمارے خیال میں جلد بابت ۱۸۸۸ء ۵ سوم کی جلد سے کہیں بہتر ہے..... اگر یہی دنیائے اسلام ہے اور یہی ذوق و شوق ہے تو انشاء اللہ ۱۸۸۹ء میں بھی دلگداز کامیابی کے ساتھ ترقی کرے گا۔"

(دلگداز، دسمبر ۱۸۸۸ء)

دلگداز کا یہ طریقہ تحریر تھا کہ سال بھر کی کارگزاریوں اور رسالہ کے حسن و قبح کا محاسبہ کیا جاتا اور آئندہ کے لئے راہیں متعین کی جاتیں۔ آج ہی کی طرح اس وقت رسالے بڑے جوش و خروش سے علم و ادب کی خدمت کے لئے نکالے جاتے لیکن چند برسوں کے بعد رسائل کے مسائل زیادہ سنگین ہو جاتے۔ خریداروں کی کمی اور قارئین اردو کی بے توجہی کی شکایتیں بڑھ جاتیں۔ رسالہ کی اشاعت میں بے اعتدالیاں ہونے لگتیں اور انجام کار اخراجات کا بوجھ اتنا بڑھ جاتا کہ رسالہ بند ہو جاتا۔ دسمبر ۱۸۹۰ء کی اشاعت میں مولانا عبدالحلیم شرر سال بھر کا منظر نامہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

".....دلگداز کو ہمیں دو حیثیتوں سے دیکھنا چاہئے۔ ایک تو یہ کہ اس کے مضامین کیسے رہے دوسرے یہ کہ اس کے انتظام کی کیا حالت رہی۔ باعتبار مضامین چاہے کسی کے خیال میں کیسا ہو مگر ہمارے نزدیک برا نہیں رہا.....ابتدائے سال سے نو مہینے تک پرچہ ماہ بہ ماہ نکلتا رہا۔ صرف پچھلے تین مہینوں کے پرچے بٹ بٹ کے اور دسمبر کی آخری تاریخوں میں چھپتے رہے۔ یہی بدانتظامی ہے جس کا الزام ہمیں اپنے سر اٹھانا ہے۔"

(دلگداز، دسمبر ۱۸۹۰ء)

زبان و بیان کے معاملے میں یہ رسالہ دوسرے اہم رسالوں سے بہت پیچھے تھا۔ شرر کی تحریروں کا اپنا انداز تھا اور اس دور کے بیشتر قارئین تصوراتی اور غیر حقیقی طرز تحریر کو پسند کرتے تھے۔ پڑھنے والوں کی طرف سے یہ اصرار ہوتا تھا کہ دلگداز کی تمام تخلیقات شرر کے ہی زور قلم کا نتیجہ ہوں۔ لیکن موصوف کو اس امر کا اعتراف تھا کہ زبان اور اس کے اظہار میں تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ صرف خیالی اور تصوراتی مضامین کا وقت گزر گیا ہے۔ اس کے قدم زمین پر ہوں اور ادب زندگی کا نمائندہ بنے نہ کہ ذہنی اور فکری کج ادائیوں کے اظہار کا ایک ذریعہ۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کے اداریہ میں لکھتے ہیں:

"...... پہلے پرچہ میں ایک دو مضامین دیگر جادو نگاروں کے بھی تھے مگر اس کے بعد ہی سے قدر دانوں کا اصرار دیکھ کے پابندی کر لی گئی کہ اس کے صفحات پر سوائے ایڈیٹر کے اور کسی کی کوئی تحریر نہ ہوا کرے...... ان بارہ مہینوں میں دلگداز نے جیسے تازہ، نئے، اچھوتے اور ضروری واقعیت کے تاریخی مضامین پیش کئے ہیں اور کوئی کم پیش کر سکا ہوگا۔ پھر اس کے ساتھ دلگداز کی ادبی خصوصیات یعنی جیسی زبان، جیسے الفاظ، جیسے رنگ اور جس مستند اور دلچسپ لٹریچر میں دلگداز نے ان واقعات کو بیان کیا یہ اسی کا کام تھا......اب زمانہ میں خالص لفاظی اور ہوا میں خیال کے قلعے بنانے کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا......"

(دلگداز، دسمبر ۱۹۱۰ء)

[illegible] عصمت [illegible]

تھا کہ ناظرین [illegible] اصرار [illegible]

ہیں۔ ان کے بعض ناولوں میں خلاف [illegible]

خیالات [illegible] آزاد [illegible]

رسالہ دلگداز کی طرح عصمت کے اداریوں [illegible]

راشد الخیری زبان و ادب میں یکساں فکر [illegible]

کے حصول و مقاصد محدود اور غیر واضح تھے جب کہ [illegible]

اور حصول مقاصد کے متعین نظریات تھے ان [illegible]

اداریوں میں نمایاں ہیں۔ راشد الخیری لکھتے ہیں:

"خواتین کے لئے عصمت میں دینی اور دنیوی دونوں [illegible] ہے۔ کنواری لڑکیوں کو، عصمت بتائے گا کہ کنوار پنے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب، بھائی بہنوں کی خدمت، بچوں کی [illegible] سے محبت ان کا فرض منصبی ہے۔ جس نئی دنیا میں ان کو شامل ہونا ہے اس کے لئے انہیں کیا تیاری کرنی ہے۔ جو دقتیں پیش آئیں گی ان کو کس طرح دفع کرنا ہے۔ ساس نندوں کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ بیاہی لڑکیوں کو خانہ داری گھر کے حساب کتاب اور بچوں کی پرورش میں عصمت سے مدد ملے گی۔ [illegible] عصمت [illegible] جائے گا کہ انہیں گھر کس طرح کرنا ہے۔ روپیہ کا صرف کیا ہے۔ خاوندوں کس طرح بسر کرنی چاہئے۔"

(عصمت، [illegible])

دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"عصمت نے شروع کے تقریباً چار سال تک ملک و قوم کی جو خدمت کی اس کے مفصل بیان کی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنی دلچسپی سے ہزاروں دل [illegible] کر لئے۔ ایک دنیا اس کی مداح تھی اور ہندوستان کے زنانہ پرچوں میں سب سے [illegible] لڑکیوں میں ہر دل عزیز نہیں تھا بلکہ مرد بھی اس کے گرویدہ تھے۔ میری طبیعت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میں بیبیوں کو آزادی اور حریت کی ترغیب دوں۔ [illegible] میں نے دوسروں کے مضامین بھی عصمت میں لکھنے سے پرہیز کیا جو [illegible] اور لڑکیوں کو اپنے حقوق کی طلبی پر آمادہ کریں...... میرا دل مجھ کو ملامت کرتا تھا [illegible] تھا کہ کمبخت یہی بیماریاں اطاعت اور فرماں برداری کے لئے پیدا کی گئی ہیں ان مظلوموں کے بھی کچھ حقوق مردوں کی ذات پر ہیں......"

(عصمت، [illegible])

تیسرا اقتباس:

"میں ناظرین عصمت کو دو نہایت باتوں کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں سب سے پہلی چیز خلع ہے اور دوسری چیز ان بد بخت لڑکیوں کے حقوق [illegible] سے محروم کر دی گئی ہیں......"

(عصمت، جنوری [illegible])

جون ۱۹۰۸ء میں عصمت کا پہلا پرچہ شائع ہوا تھا۔ ۱۹۱۰ء میں جب عصمت لاہور سے دہلی آیا تو تقریباً تین سال تک مولانا راشد الخیری [illegible] رہے۔ اپریل ۱۹۱۱ء میں انہوں نے ایک نیا رسالہ 'تمدن' جاری کیا۔ اس کے [illegible] معاونین مرد ہوتے تھے لیکن حقوق نسواں کے لئے لکھتے تھے۔ جب اس کا [illegible] منظر عام پر آیا تو دہلی کے علم داں حلقے میں بڑی خوشی ہوئی اور [illegible] کے لاہور جانے سے دلی کو علمی اعتبار سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی [illegible]

[illegible]

[illegible] کے ساتھ ... [illegible] عطا [illegible] دہلی [illegible] اردو [illegible] نظر [illegible] مگر ان [illegible] کے سامنے [illegible] کہ ایک ہر دلعزیز [illegible] ہوا ہے۔ شہید [illegible] کے نام سے [illegible] اس میں حق نوروں کے متعلق [illegible] اس [illegible] کر خدائی شان نظر آتی ہے [illegible] علی الاعلان یہ حکم دیا کہ [illegible] مرد وں کے ساتھ و یسا ہی سلوک [illegible] جانور وں کے ساتھ۔ آج اس کے پیرو ایسے شخص کو جو صرف ان [illegible] مطالبہ کرتا ہے جو شریعت اسلام نے عطا کئے 'مار ڈالنے' کی دھمکی دیتے ہیں۔"

(رسالہ تمدن ، دسمبر ۱۹۱۳ء)

صلائے عام اپنے دور کا محترم اور معتبر رسالہ تھا گرچہ اس کے مشمولات [illegible] سے دوسرے ہم عصر رسائل کے مشمولات کے مقابلے میں کم درجہ کے [illegible] ان میں تنوعات کی کمی تھی۔ یہ رسالہ ۱۹۰۸ء میں میر ناصر علی نے جاری کیا جو ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے۔ اس لئے اس رسالہ کو حکام وقت اور سرکاری اداروں کی سرپرستی حاصل تھی اس نے حتی الوسع اردو زبان و ادب کی توسیع کے لئے سنجیدہ کوششیں کیں۔ اور اپنے اثر ورسوخ سے سرکاری اداروں میں اردو زبان کی وکالت کی اور اردو کی کتابوں کو حکومت کے اداروں میں انٹروڈیوس کرایا۔

اس رسالہ کی اداریہ نویسی کے کئی عنوانات تھے جو قارئین کے لئے باعث حیرت تھے۔ مثلاً دیباچہ مضامین، اطلاع صلائے عام، قدر صلائے عام، جواب صلائے عام، صلائے بطور دیباچہ۔ رفتار زمانہ۔ پیرایۂ آغاز۔

دیباچہ مضامین، صلائے عام بطور دیباچہ اور پیرایۂ آغاز، تینوں عنوانات ایک ہی مقصد کے اظہار کے لئے استعمال ہوئے تھے۔ 'دیباچہ مضامین' کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"جس طرح کسی سے ملنے جایئے تو صاحب خانہ کا حال جو آدمی کے ڈیوڑھی پر [illegible] اس سے پوچھ لیتے ہیں کیا میاں کیا کر رہے ہیں؟ اور شاعرانہ تخیل میں [illegible] رفتار یار کا پتہ لگ جاتا ہے۔ اسی طرح دیباچہ سے اندر کے مضامین کا حال معلوم ہو جانا چاہئے۔ جس طرح چشم تر سے دل کی رقت معلوم ہو جاتی ہے اور [illegible] آدمی خط کھولنے سے پہلے لفافہ کو ٹٹول کر دیکھ لیتے ہیں کہ اندر کیا ہے؟ اور [illegible] خط کا مضمون خط پڑھنے سے پہلے سمجھ جاتے ہیں اسی طرح آپ دیباچہ سے مضامین کا اصل قیاس کرلیں......" (صلائے عام، اپریل ۱۹۱۸ء)

پیرایۂ آغاز کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"جس طرح تعبیر سے پہلے خواب کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح صلائے عام کے ہر پرچہ کے مضامین کا ذکر پہلے ہی بیان کرنے کا دستور ہو گیا ہے۔ اسی صورت میں صلائے عام کا پہلا مضمون پیرایۂ آغاز سمجھا جاتا ہے لیکن جس طرح [illegible] اسی طرح پیرایۂ آغاز

(صلائے عام، جنوری ۱۹۲۶ء)

اوپر جتنے عنوانات کا ذکر آیا ہے سب کے سب ایڈیٹوریل کے باب میں آتے ہیں لیکن مدیر موصوف عنوان 'صلائے عام' کو بطور "تشذرات و ملاحظات و تبصرہ جات تحریر و معروضات" کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

دور مذکور کے بیشتر معیاری علمی رسالوں کی طرح یہ رسالہ بھی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا نمائندہ اور اتحاد و اتفاق کی برکتوں کا مبلغ تھا۔ اردو زبان مسلمان سے زیادہ ہندوؤں کی زبان تھی کیا اپنے Origin کے لحاظ ہی سے نہیں بلکہ خدمات کے لحاظ سے بھی۔ اس جدو جہد اور ریاضت و تگ و دو کے لحاظ سے بھی جو اردو کے ہندو اہل قلم نے اس زبان کی نشوونما کے لئے کی۔ ایک اقتباس:

"...... آپ کی زبان کی ترقی بغیر دونوں صاحبوں (ہندو مسلمان) کے ممکن نہیں۔ بلکہ زیادہ تر اہل ہنود کی توجہ کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو اردو سے ہندوستان میں آنے کی وجہ سے بعد میں کام پڑا ورنہ اردو مسلمانوں کی زبان نہ تھی۔ اس وقت اردو میں نظم سے زیادہ نثر کی ضرورت ہے۔ نظم میں ترقی کی بہت گنجائش نہیں برخلاف اس کے نثر میں جس قدر لکھا جائے تھوڑا ہے......"

(صلائے عام، اگست ۱۹۲۴ء)

بادشاہوں اور راجاؤں کے ایثار و عطا پر پلنے والی یہ اردو ہمیشہ محرومی اور افلاس کا شکار رہی۔ تمام رسالے اور رسالہ کا ہر مدیر شکوہ سنج ہیں کہ رسالہ کو جاری رکھنے کے لئے مالی وسائل نہیں۔ یہ اس رسالہ کا بھی حال ہے جس کا مدیر حکومت وقت کا اعلیٰ افسر تھا اور لیفٹیننٹ گورنر سے لے کر ریاست کا ادنیٰ اہل کار بھی اس کا ہمنوا اور اس کی علمی خدمتوں کا معترف تھا۔ میر ناصر علی لکھتے ہیں:

"یوں تو صلائے عام اردو کے رسالوں اور اخباروں کے برابر ہے مگر اس میں ایک دو خاص باتیں بھی ہیں۔ اول تو سوداگری اور بازاری اشتہاروں سے اس کا تعلق نہیں۔ دوسرے کچہریوں اور دفتروں کے نوٹس اور سمن وغیرہ اس میں نہیں ہوتے یہی دونوں ذریعے اخبار اور رسالوں کی آمدنی کے لئے بہت کارگر سمجھے جاتے ہیں۔ تیسرے ایک خاص خوبی یہ ہے کہ بغیر کسی کی شراکت امداد کے یہ عرصہ سے جاری ہے...... جب یہ سارے ذرائع آمدنی کے صلائے عام پر بند ہیں تو اس کا نکالنا معمولی زیرباری سے زیادہ زیرباری کا باعث کیوں نہ ہو......" (صلائے عام، اپریل ۱۹۲۵ء)

اردو کی ترقی کے لئے دوڑ دھوپ اور کوششوں کا جو انجام آج دیکھنے میں آتا ہے وہی سو سال قبل بھی تھا۔ ممکن ہے کہ اس منفی انداز فکر کا محرک وہ احساس ہو کہ کوئی شخص اپنے حال سے مطمئن اور آسودہ نہیں ہوتا۔

"اردو کی ترقی میں بہت جلسے، کانفرنسیں، انجمنیں، تقریریں، خطبے اور بحث مباحثے دیکھنے اور سننے میں آئے۔ ریزولوشن اور تجویزوں کی تو حد نہیں مگر اردو اگر بگڑی نہیں تو ترقی بھی نہیں کی۔ بلکہ ایک یہ بڑا نقص آگیا کہ زبان اساتذہ جسے انگریزی میں Classical (کلاسیکل) کہتے ہیں دہن یار کی طرح معدوم اور کمر یار کی طرح غائب ہے......"

(صلائے عام، جنوری ۱۹۲۶ء)

صلائے عام کے اداریوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جہاں ہم عصر رسائل تنقیدی طرز بیان اختیار کرنے سے احتراز کرتے تھے وہاں صاحب مدیر علمی مباحث میں اپنی بے لاگ رائے دینے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ اور معاملات ادب میں

[illegible] کی چودھری اور گروہ بندی کو روا نہیں گردانتے تھے۔ جنوری ۱۹۳۶ء تک [illegible] واقعات پر ہم نظریہ [illegible]

[illegible]

[illegible] نے سنا ہے کہ شعر الہند نامی تذکرہ میں لسان الملک جناب ریاض خیر آبادی کے کلام پر کسی صاحب نے اعتراض کیا ہے۔ تذکرہ نویسی کے لئے میری دانست میں پہلی شرط یہ ہے کہ خود بھی شاعری میں پورا دخل رکھتا ہو۔ فارسی میں آذر کا آتشکدہ اس لئے لاجواب ہے کہ تذکرہ نگار بڑے مرتبہ کا شاعر تھا۔ اسی طرح شعرائے اردو کے تذکروں میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ گلشن بے خار زیادہ مقبول ہے کہ خود شیفتہ کے کلام کا کیا کہنا۔

شاعری کو طالب علمی سے کیا غرض؟ مولانا جامی کے شعر پر مدرسہ کے کسی ملا نے اعتراض کیا۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ میرا شعر مدرسہ تک کون لے گیا؟

سجادہ، خانقہ سے پس خم جو آگیا
یہ کیا ہوا ریاض، یہ کیا دل میں آگئی

میں نے شعر الہند ابھی نہیں دیکھا۔ مگر اس بحث سے تذکرے کے دیکھنے کا شوق ہے کہ حضرت ریاض کے کلام پر اعتراض کرنے والے از روئے سخن فہمی (اور سخن سنجی ہو تو اور بھی بہتر ہے) کس پائے کے لوگ ہیں۔"

(صلائے عام، جنوری ۱۹۲۶ء)

بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں جو نامور علمی رسالے شائع ہوئے ان کے اداریوں کی جزوی تفصیل اور مسلک ادب مختلف رجحانات کا مختصر بیان پچھلے اوراق میں پیش کیا گیا۔ ان رسائل میں "مخزن، زمانہ، عصمت، دلگداز، الناظر، تمدن" خاص ہیں۔ ایک رسالہ جو علمی و ادبی اور تاریخی حیثیت سے اہم تھا وہ چڑھت نوبت رائے نظر کی ادارت میں شائع ہونے والا 'ادیب' تھا۔ لیکن بہ سعی بسیار اس کے شمارے ہنوز دستیاب نہیں ہو سکے۔ تیسری دہائی کے ابتدائی سالوں میں جو اہم رسالے منظر عام پر آئے ان میں "ہمایوں، نگار، نیرنگ خیال، بہارستان" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان رسالوں میں 'نگار' نے بڑی لمبی عمر پائی اور غالباً ہنوز یہ رسالہ کراچی (پاکستان) سے نکل رہا ہے۔ 'زمانہ' ۱۹۴۸ء کے بعد بند ہو گیا۔ 'عصمت' ۱۹۳۶ء تک جاری تھا۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہونے والا راشد الخیری نمبر ہمارے مطالعے میں رہا ہے۔ 'تعلیم نسواں' کے علاوہ ایک رسالہ 'نور جہاں' تھا جو امرتسر سے ۱۹۲۵ء کے آخر یا ۱۹۲۶ء کے شروع میں شائع ہوا تھا۔

'ہمایوں' علمی و ادبی رسالہ تھا۔ اس وقت اس رسالے کی بڑی قدر تھی۔ آج بھی اس کا نام اہل علم عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ یہ رسالہ بڑے سائز میں جنوری ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک و مدیر میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ انہوں نے یہ رسالہ اپنے والد مرحوم جسٹس میاں محمد شاہدین ہمایوں کی یادگار کے طور پر جاری کیا تھا۔

اس رسالہ میں ایڈیٹوریل کے کئی عنوانات ہوتے تھے۔ 'بزم ہمایوں'۔ 'جہاں نما' اور 'ہم اور آپ' کے تحت اداریے رقم ہوتے تھے۔ جہاں نما کے مشمولات کا اندازہ خود عنوان سے لگایا جا سکتا ہے۔ رسالہ زمانہ میں رفتار زمانہ کا جو مقصد اور پیغام تھا ہمایوں میں وہی 'جہاں نما' کا تھا۔ یہ مستقل عنوان تھا جس میں اندرون ملک اور بیرون ملک واقع ہونے والے سیاسی، سماجی، مجلسی، مذہبی اور سائنسی خبریں ہوتیں۔ حالات و اور تفریح کے لئے اس میں [illegible] چونکہ کس مضمون سے ان کا [illegible] جاتا ہے۔

'آپ اور ہم' اور 'بزم ہمایوں' کے [illegible] کہ 'آپ اور ہم' سال کے آخر میں [illegible] جنوری میں۔ ہم اور آپ میں براہ راست [illegible]

"یہ سال کا آخری نمبر ہے اور اس کی اشاعت کے ساتھ [illegible] منزلیں طے کر رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمایوں کے [illegible] ہوئے ہم اس سال کامیاب و کامران رہے ہیں۔ اپنی [illegible] بھی کوششیں کی ہیں وہ بہ نظر استحسان دیکھی گئی ہیں..... آپ کی [illegible] ہوئے ہماری مساعی کی جو قدر افزائی آپ نے کی ہے اس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں..... ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ترقی ہو تو سچ میں ہمایوں کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ مبذول فرمائیں گے۔" (ہمایوں، [illegible])

'بزم ہمایوں' کا نزول ہر سال جنوری میں ہوتا تھا۔ پورے سال [illegible] اداریہ ہوتا۔ سال بھر کی کارگزاریوں کا محاسبہ ہوتا۔ آئندہ کے [illegible] جاتے۔ زبان و ادب کی رفتار کا جائزہ لیا جاتا۔ مشمولات پر [illegible] جہاں تک کہ آئندہ شماروں میں شریک ہونے والے اہل قلم کی فہرست بھی دی جاتی۔ پچھلے بارہ مہینوں میں جو ادیب و شاعر شائع ہوتے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا۔ مدیر [illegible] تو ہر اہم تحریر کے ساتھ فنکار کی دلداری کے لئے چند توصیفی کلمات لکھتے تھے۔ ہمایوں میں یہ رسم سالانہ تھی۔ اس انداز دلداری سے رسالے کا وقار بھی بڑھتا ہے اور فنکار کو حوصلے بھی ملتے ہیں۔ ادیب ہو یا شاعر، مصور ہو یا مغنی ہو ہر ایک [illegible] توجہ کا محتاج ہے بقدر پیمانہ تخیل ہر ایک انسان جذبات خودی سے سرشار ہے۔ وہ جس رنگ میں بھی ہے اپنی ذات کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔

مرا [illegible] رفتن محال است
بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

'نگار' ۱۹۲۱ء میں جاری ہوا۔ یہ رسالہ نہیں ایک دبستان ادب تھا۔ زبان و ادب کی ایک تحریک تھی جس نے پوری صدی کے علمی [illegible] میں زبردست اضافہ کیا۔ اس نے مکمل آٹھ دہائیوں تک علم و ادب کی [illegible] اردو [illegible] کی دولت سے [illegible] کیا اس کی مثال اردو کی صحافتی تاریخ میں نہیں [illegible] کا ذخیرہ جمع کرنا، شخصیات کے صنم خانے تیار کرنا اور افسانوں [illegible] کو جمع کرکے شائع کرنا، سلیقہ اور ہنر مندی چاہتا ہے لیکن زبان و ادب [illegible] زاد تخلیقات اور علمی ایجادات و انکشافات سے بہرہ ور کرنے کے لئے [illegible] ریاضت درکار ہوتی ہے۔ نیاز کو عمر بھر کی علمی [illegible] کی وفات کے بعد بھی اردو دنیا نے انہیں نظر انداز کیا۔ اس کی [illegible] ایک تو یہ کہ اہل قلم نیاز کی علمی شخصیت سے مرعوب تھے اور ان [illegible] ڈرتے تھے اور دوسری [illegible]

[illegible] ... سے کوئی ... ہی
[illegible] ... کی تحریروں میں بے حد ...
[illegible] ... کے جواب کی ...
[illegible] ... دوسری تحریریں ... رسالے ... کے
[illegible]
[illegible] ... کے ... اور ...
[illegible] ... کے ... شائع ... کے
[illegible] ... کے دوران ... ہے۔
[illegible] ... کے عنوان سے لکھے جاتے تھے۔ ہر اداریہ ایک مرقع ... سے متعلق عام طور ... نہایت ... طور پر ہوتا ہے ... سیاسی ... تبدیلی بھی ... پر عمل کے تذکرے کرتے تھے۔ بعض بعض اداریے بذات خود ایک جامع مقالہ ہوتا تھا۔ نیاز کو اپنی سوچ پر بھی اور اس کے اظہار پر بھی پوری قدرت اور Conviction بھی تھا، [illegible] تمام جہت کے اندر پائے جاتے ہیں۔

اردو کے صحافتی سفر میں رسالوں کو ہمیشہ معاشی اور مالی بدحالیوں کا سامنا رہا۔ قارئین کی خدمت میں دوسرے رسائل کے اقتباسات پیش کیے جا چکے ہیں۔ اشاعت اور خریداروں کی عدم توجہی کا مسئلہ نگار کے ساتھ بھی تھا۔ دوسروں نے اس مسئلہ کو اپنی تحریروں اور اداریوں میں جس طرح پیش کیا ہے اس کا اندازہ ناظرین کو ہے۔ اب نگار اور نیاز کا انداز اظہار دیکھئے۔ دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں گزرتی۔ شکایتیں بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ پڑھنے والوں کے شعور اور لاشعور میں علم و ادب کی جو نزاکتیں اور لطافتیں شامل ہوتی ہیں انہیں ایسی تحریروں سے کتنی جلا ملتی ہے۔ مارچ ۱۹۲۵ء کے ملاحظات کا پورا اصطلا نذر قارئین ہے:

"تا چند بگویم کہ چساں ست و چساں نیست!

بار بار التجاؤں کو پیش کرنا اور ہمیشہ انہیں ناکام دیکھنا ہندوستان کے حلقہ صحافت کے لئے کتنا ہی عادت اور روائد کیوں نہ ہو لیکن اسے کیا کروں کہ میری فطرت اسے بمشکل گوارا کر سکتی ہے۔ میرا مسلک ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ مجوز نگاہوں کی التجا کو نہ سمجھ سکے اس کے سامنے زبان کو شرمندہ نہ کرے۔ تاہم ہم نے اپنی طبیعت کے بالکل خلاف اسے بھی گوارا کیا اور ناظرین نگار کو توسیع اشاعت کی طرف زائد مرتبہ توجہ دلائی۔ مگر

گوش سخن شنو کہاں دیدہ اعتبار کو؟

اس سے آپ کیا، غالباً دشمن کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اس قدر قلیل معاوضہ میں اس حجم کا رسالہ ہندوستان میں کوئی دوسرا شائع نہیں ہوتا۔ پھر کیا یہ امر حیرتناک نہیں کہ باوجود اس اعتراف کے بھی یہ سودا آپ کو اس قدر گراں نظر آتا ہے کہ اپنے حلقہ تعارف میں صرف ایک قدر شناس پیدا کر لینا دشوار ہو گیا ہے۔

داوری خواہم و سے یارب کجا و ورکنم!

جن ارباب کرم نے اس طرف توجہ فرمائی ان کا میں ممنون ہوں لیکن وہ امور جن کا تعلق ترقی نگار سے ہے صرف چند افراد کی اعانت سے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ قدم آگے بڑھا کر واپس لانا میرے طریق کار کے بالکل منافی ہے اور [illegible] کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا کہ رسالہ کی ضخامت بڑھا کر پھر کم کر دوں۔

لیکن جب آپ کا طرز عمل یہی ثابت کرتا ہے
عمر گیا کہ اصحاب پنبہ در گوش اند
تو نگار مجبور ہے کہ یہ بھی زہر پیالہ پئے گا۔
ہمارا بھی آنا زور چلتا ہے گریباں پر
چونکہ بار بار یہ گزارش التجا مجھے خوش نہیں آتی، اس لئے اس کو میری آخری جسارت تصور فرمایئے.....

گر تو اہل مکشی، من ہم سب کوہ بی کشم ــــ نیاز ــــ"

(نگار مارچ ۱۹۲۵ء)

پچھلے اداریوں کے اقتباسات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اردو صحافت کا معیار اور مزاج کیا تھا۔ نیاز اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی صحافت یوں تو ہر لحاظ سے ناقص اور نامکمل ہے لیکن اس کا سبب..... سے زیادہ کرب انگیز اس کی عدم متانت ہے اور یہ عیب بدقسمتی سے ان جرائد میں بھی پایا جاتا ہے جن کی عنان ادارت ملک کے بہترین افراد کے ہاتھ میں ہیں۔"
(نگار، نومبر ۱۹۲۵ء)

آج ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں۔ آزاد ہندوستان میں اردو رسائل کی کمی نہیں ہے۔ بارہ پندرہ ریاستوں میں اکیڈمیاں ہیں ہر ایک کا اپنا اپنا علمی رسالہ ہے۔ حکومت کی سرپرستی میں نہایت عمدہ، اعلیٰ درجہ کے رسالے نکلتے ہیں۔ لیکن تمام رسالوں کو ایک ہی شکایت ہے وہ یہ ہے کہ معیاری نثری تخلیقات میں نثر لکھنے والوں کی روز بہ روز کمی ہوتی جا رہی ہے۔ شعر و سخن کی تخلیقات کا انبار ہے۔ قطع نظر معیار سخن کے رسالوں کو اعلان کرنا پڑتا ہے کہ 'شعری تخلیقات ارسال نہ فرمائیں'۔ بہت سے رسالے وقت پر نہیں شائع ہوتے اس لئے کہ مضامین دستیاب نہیں ہیں۔ ہماری ریاست بنگال سے بھی ایک علمی جریدہ نکلتا ہے اس کی بھی یہی شکایت ہے۔ یہی صورت حال تقریباً سو سال قبل بھی تھی۔ میں نے اس سے قبل عرض کیا کہ 'دلگداز' کے صفحات برسوں صرف عبدالحلیم شرر کی نگارشات سے مزین ہوتے تھے۔ اس پس منظر میں نگار کا حسب ذیل اداریہ ملاحظہ فرمایئے:

"آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس مہینہ تقریباً سارا کا سارا رسالہ مجھی کو اپنے مضامین سے پر کرنا پڑا اور ہر چند میں نے کوشش کی کہ اس میں تنوع ہو جائے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ بعض حضرات اسے پسند نہیں فرمائیں گے مگر نگار کے دور حیات میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ گزشتہ تین سال نو ماہ کے رسالوں کی اگر ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ۲۴۴۳ صفحات میں مشکل سے ایک ہزار صفحات مضامین غیر کے ہوں گے اور باقی تین ہزار صفحات ادارت ہی کی طرف سے پیش ہوئے ہوں گے۔ اس کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ آپ میری کاوش کی داد دیں یا یہ کہ اس کو اپنی زندگی کا کوئی غیر معمولی واقعہ سمجھ کر آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں بلکہ مقصود اس ضمن میں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ملک میں اچھا لکھنے والے اس قدر کم ہیں کہ اگر ان کے اعتماد پر کوئی رسالہ جاری کیا جائے تو چند مہینے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جملہ دیگر اسباب کے یہ بھی ایک بڑا سبب رسائل کی ناکامیابی کا ہے۔ جس کو میں نگار کی اولین اشاعت میں بھی ظاہر کر چکا ہوں۔"
(نگار، اکتوبر ۱۹۲۵ء)

بیسویں صدی کے ربع اول کے رسالہ میں شاید نگار ہی ایسا رسالہ تھا جو تنہا

[illegible] جاری اور گروہ بندی کو روا نہیں رکھتے تھے۔ جنوری ۱۹۲۶ء کے [illegible]

میں نے سنا ہے کہ شعر الہند نامی تذکرہ میں لسان الملک جناب ریاض خیر آبادی کے کلام پر کسی صاحب نے اعتراض کیا ہے۔ تذکرہ نویسی کے لئے میری [illegible] میں پہلی شرط یہ ہے کہ خود بھی شاعری میں [illegible]۔ فارسی میں آذر کا [illegible] اس لئے لاجواب ہے کہ تذکرہ نگار بڑے مرتبہ کا شاعر تھا۔ اسی طرح شعرائے اردو کے تذکروں میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ (گلشن بے خار) زیادہ مقبول ہے کہ خود شیفتہ کے کلام کا کیا کہنا۔

شاعری کو طالب علمی سے کیا غرض؟ مولانا جامی کے شعر پر مدرسہ کے کسی طالب نے اعتراض کیا۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ میرا شعر مدرسہ میں کون لے گیا؟

سجادہ، خانقہ سے پس خم جو آگیا

یہ کیا ہوا ریاض، یہ کیا دل میں آگئی

میں نے شعر الہند ابھی نہیں دیکھا۔ مگر اس بحث سے تذکرے کے دیکھنے کا شوق ہے کہ حضرت ریاض کے کلام پر اعتراض کرنے والے از روئے سخن فہمی (اور سخن سنجی ہو تو اور بھی بہتر ہے) کس پائے کے لوگ ہیں۔"

(صلائے عام، جنوری ۱۹۲۶ء)

بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں جو نامور علمی رسالے شائع ہوئے ان کے اداریوں کی جزوی تفصیل اور مسلک ادب مختلف رجحانات کا مختصر بیان پچھلے اوراق میں پیش کیا گیا۔ ان رسائل میں "مخزن، زمانہ، عصمت، دلگداز، الناظر، تمدن" خاص ہیں۔ ایک رسالہ جو علمی و ادبی اور تاریخی حیثیت سے اہم تھا وہ پنڈت نوبت رائے نظر کی ادارت میں شائع ہونے والا 'ادیب' تھا۔ لیکن بہ سعی بسیار اس کے شمارے ہنوز دستیاب نہیں ہو سکے۔ تیسری دہائی کے ابتدائی سالوں میں جو اہم رسالے منظر عام پر آئے ان میں "ہمایوں، نگار، نیرنگ خیال، بہارستان" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان رسالوں میں 'نگار' نے بڑی لمبی عمر پائی اور غالباً ہنوز یہ رسالہ کراچی (پاکستان) سے نکل رہا ہے۔ 'زمانہ' ۱۹۴۸ء کے بعد بند ہو گیا۔ 'عصمت' ۱۹۳۶ء تک جاری تھا۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہونے والا راشد الخیری نمبر ہمارے مطالعے میں رہا ہے۔ 'تعلیم نسواں' کے علاوہ ایک رسالہ 'نور جہاں' تھا جو امرتسر سے ۱۹۲۵ء کے آخر یا ۱۹۲۶ء کے شروع میں شائع ہوا تھا۔

'ہمایوں' علمی و ادبی رسالہ تھا۔ اس وقت اس رسالے کی بڑی قدر تھی۔ آج بھی اس کا نام اہل علم عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ یہ رسالہ بڑے سائز میں جنوری ۱۹۲۲ء میں جاری ہوا۔ اس کے مالک و مدیر میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا تھے۔ انہوں نے یہ رسالہ اپنے والد مرحوم جسٹس میاں محمد شاہدین ہمایوں کی یادگار کے طور پر جاری کیا تھا۔

اس رسالہ میں ایڈیٹوریل کے کئی عنوانات ہوتے تھے۔ 'بزم ہمایوں'، 'جہاں نما' اور 'ہم اور آپ' کے تحت اداریے رقم ہوتے تھے۔ جہاں نما کے مشمولات کا اندازہ خود عنوان سے لگایا جا سکتا ہے۔ رسالہ زمانہ میں رفتار زمانہ کا جو مقصد اور پیغام تھا ہمایوں میں وہی 'جہاں نما' کا تھا۔ یہ مستقل عنوان تھا جس میں اندرون ملک اور بیرون ملک واقع ہونے والے سیاسی، سماجی، مجلسی، مذہبی اور سائنسی خبریں ہوتیں۔ حالات و واقعات پر [illegible]

کے عمل [illegible] کے رجحانات تک [illegible]

اور تفریح کے لئے اس میں مدیر [illegible]

چونکہ کسی مضمون سے ان کا تعلق نہیں [illegible]

جاتا ہے۔

'آپ اور ہم' اور 'بزم ہمایوں' کے مقاصد [illegible] کہ "آپ اور ہم" سال کے آخر میں [illegible] جنوری میں۔ ہم اور آپ میں براہ راست [illegible]

"یہ سال کا آخری نمبر ہے اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہمایوں [illegible] منزلیں طے کر رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمایوں کے [illegible] ہوئے ہم اس سال کامیاب و کامران رہے ہیں۔ اپنی [illegible] بھی کوششیں کی ہیں وہ بہ نظر استحسان دیکھی گئی ہیں۔۔۔ آپ کی [illegible] ہوئے ہماری مساعی کی جو قدر افزائی آپ نے کی ہے اس کے لئے ہم آپ کے [illegible] گزار ہیں۔۔۔۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ترقی و توسیع میں ہمایوں کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ مبذول فرمائیں گے۔"

(ہمایوں دسمبر ۱۹۲۸ء)

'بزم ہمایوں' کا نزول ہر سال جنوری میں ہوتا تھا۔ پورے سال کا [illegible] اور یہ ہوتا۔ سال بھر کی کارگزاریوں کا محاسبہ ہوتا۔ آئندہ کے لئے لائحہ عمل [illegible] جاتے۔ زبان و ادب کی رفتار کا جائزہ لیا جاتا۔ مشمولات پر تبصرہ [illegible] کہ آئندہ شماروں میں شریک ہونے والے اہل قلم کی فہرست بھی دی جاتی۔ پچھلے بارہ مہینوں میں جو ادیب و شاعر شائع ہوتے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا۔ مدیر مخزن تو ہر اہم تحریر کے ساتھ فنکار کی دلداری کے لئے چند توصیفی کلمات لکھتے تھے۔ ہمایوں میں یہ رسم سالانہ تھی۔ اس انداز دلداری سے رسالے کا وقار بھی بڑھتا ہے اور فنکار کو حوصلے بھی ملتے ہیں۔ ادیب ہو یا شاعر، مصور ہو یا مغنی ہو ہر ایک مر[illegible] توجہ کا محتاج ہے بقدر پیمانہ تخیل ہر ایک انسان جذبات خودی سے سرشار ہے۔ وہ جس رنگ میں بھی ہے اپنی ذات کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتا:

مرا از خود برون رفتن محال است

بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

'نگار' ۱۹۲۱ء میں جاری ہوا۔ یہ رسالہ نہیں ایک دبستان ادب تھا۔ زبان و ادب کی ایک تحریک تھی جس نے پوری صدی کے علمی [illegible] میں زبردست اضافہ کیا۔ اس نے مکمل آٹھ دہائیوں تک علم و ادب کی جتنی خدمات کی [illegible] دولت سے جتنا مالا مال کیا اس کی مثال اردو کی صحافتی تاریخ میں ممکن [illegible] کا ذخیرہ جمع کرنا، شخصیات کے صنم خانے تیار کرنا اور افسانوں [illegible] کو جمع کرکے شائع کرنا، سلیقہ اور ہنرمندی چاہتا ہے لیکن زبان و ادب کو [illegible] اور تحقیقات اور علمی ایجادات و انکشافات سے بہرہ ور کرنے کے لئے [illegible] ریاضت درکار ہوتی ہے۔ نیاز کو عمر بھر کی علمی خدمات کا صلہ [illegible] کی وفات کے بعد بھی اردو دنیا نے انہیں [illegible] ایک تو یہ کہ اہل قلم نیاز کی علمی شخصیت سے مرعوب تھے [illegible] ڈرتے تھے اور دوسری چیز جو [illegible]

[illegible] ہے کہ ایک صحافت داں [illegible] نگار کی تحریروں نے بہت سے [illegible] شباب کی سرگزشت اور حسن [illegible] دوسری تحریریں (خصوصاً نگار کی ادبی) کے [illegible] سے دوچار رہا۔

[illegible] تین سال کے شمارے دستیاب نہیں ہیں اور جو ملے ہیں [illegible] ۱۹۲۲ء [illegible] ہیں اس لئے نگار کے [illegible] ۱۹۳۰ء تک [illegible] سکے ہیں۔

[illegible] ’ملاحظات‘ کے عنوان سے لکھے جاتے تھے۔ ہر اداریہ ایک مرقع [illegible] اور رسالہ سے متعلق عام ضرورتوں کا اظہار بھی نہایت [illegible] پر عمل کے گفتگو کرتے تھے۔ اصل میں اداریہ بذات خود ایک جامع [illegible] اپنی سوچ پر بھی اور اس کے اظہار پر بھی پوری قدرت اور Conviction کی بنا پر تحریروں میں استحکام [illegible] جاتے ہیں۔

اردو کے صحافتی سفر میں رسالوں کو ہمیشہ معاشی اور مالی بدحالیوں کا سامنا رہا۔ قارئین کی خدمت میں دوسرے رسائل کے اقتباسات پیش کئے جاچکے ہیں۔ اشاعت اور خریداروں کی عدم توجہی کا مسئلہ نگار کے ساتھ بھی تھا۔ دوسروں نے اس مسئلہ کو اپنی تحریروں اور اداریوں میں جس طرح پیش کیا ہے اس کا اندازہ ناظرین کو ہے۔ اب نگار اور نیاز کا انداز اظہار دیکھئے۔ دشنام یا طنز حزیں پر گراں نہیں گزرتی۔ شکایتیں بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ پڑھنے والوں کے شعور اور لاشعور میں علم وادب کی جو نزاکتیں اور لطافتیں شامل ہوتی ہیں انہیں ایسی تحریروں سے کتنی جلا ملتی ہے۔ مارچ ۱۹۲۵ء کے ملاحظات کا پورا صفحہ نذر قارئین ہے:

”تاچند بگویم کہ چہاں ست وچہاں نیست!

بار بار التجاؤں کو پیش کرنا اور ہمیشہ انہیں ناکام دیکھنا ہندوستان کے حلقہ صحافت کے لئے کتنا ہی عادۃً اور روا کیوں نہ ہو لیکن اسے کیا کروں کہ میری فطرت اسے بمشکل گوارا کر سکتی ہے۔ میرا مسلک ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ جو نگاہوں کی التجا کو نہ سمجھ سکے اس کے سامنے زبان کو شرمندہ نہ کرو۔ تاہم ہم نے اپنی طبیعت کے بالکل خلاف اسے بھی گوارا کیا اور ناظرین نگار کو توسیع اشاعت کی طرف زائد مرتبہ توجہ دلائی۔ مگر

گوش سخن شنو کہاں دیدہ اعتبار کو؟

اس سے آپ کیا، شاید دشمن کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اس قدر قلیل معاوضہ میں اتنا ضخیم رسالہ ہندوستان میں کوئی دوسرا شائع نہیں ہوتا۔ پھر کیا یہ امر حیرتناک نہیں کہ باوجود اس اعتراف کے بھی یہ سودا آپ کو اس قدر گراں نظر آتا ہے کہ اپنے حلقہ تعارف میں صرف ایک قدرشناس پیدا کرلینا دشوار ہوگیا ہے۔

داوری خواہم ولے یارب کرا داور کنم!

بعض ارباب کرم نے اس طرف توجہ فرمائی ان کا میں ممنون ہوں لیکن وہ امور جن کا تعلق ’عمومیت‘ سے ہے صرف چند افراد کی اعانت سے کامیاب نہیں ہو سکتے۔۔۔ [illegible] طریق کار کے بالکل منافی ہے اور [illegible] کی صورت کبھی گوارا نہیں کرسکتی کہ رسالہ کی ضخامت بڑھا کر پھر کم کردوں۔

لیکن جب آپ کا طرز عمل یہی یقین دلاتا ہے کہ

حرف نالہ کہ احباب پنبہ در گوش اند

پھر مجبوراً کہے یہ بھی زہر پینا پڑے گا

ہمارا بھی آخر زور چلتا ہے گریباں پر

چونکہ بار بار یہ کہنا پسند مجھے خوش نہیں آتی، اس لئے اس کو میری آخری جسارت تصور فرمایئے۔۔۔۔

گر تو دامن می کشی من دست کوتہ می کنم —— نیاز ——“

(نگار مارچ ۱۹۲۵ء)

پچھلے اداریوں کے اقتباسات سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اردو صحافت کا معیار اور عروج کیا تھا۔ نیاز اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

”ہندوستان کی صحافت یوں تو ہر لحاظ سے ناقص اور نامکمل ہے لیکن اس کا سبب۔۔۔۔ سے زیادہ کریہہ المنظر اس کی عدم متانت ہے اور یہ عیب بدقسمتی سے ان جرائد میں بھی پایا جاتا ہے جن کی عنانِ ادارت ملک کے بہترین افراد کے ہاتھ میں ہیں۔“ (نگار، نومبر ۱۹۲۵ء)

آج ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوچکے ہیں۔ آزاد ہندوستان میں اردو رسائل کی کمی نہیں ہے۔ بارہ چندرہ ریاستوں میں اکیڈمیاں ہیں ہر ایک کا اپنا اپنا علمی رسالہ ہے۔ حکومت کی سرپرستی میں نہایت عمدہ، اعلیٰ درجہ کے رسالے نکلتے ہیں۔ لیکن تمام رسالوں کو ایک ہی شکایت ہے وہ یہ ہے کہ معیاری نثری تخلیقات میں نثر لکھنے والوں کی روز بہ روز کمی ہوتی جارہی ہے۔ شعروسخن کی تخلیقات کا انبار ہے۔ قطع نظر معیار سخن کے رسالوں کو اعلان کرنا پڑتا ہے کہ ’شعری تخلیقات ارسال نہ فرمائیں‘۔ بہت سے رسالے وقت پر نہیں شائع ہوتے اس لئے کہ مضامین دستیاب نہیں ہیں۔ ہماری ریاست بنگال سے بھی ایک علمی جریدہ نکلتا ہے اس کی بھی یہی شکایت ہے۔ یہی صورت حال تقریباً سو سال قبل بھی تھی۔ میں نے اس سے قبل عرض کیا کہ ’دلگداز‘ کے صفحات برسوں صرف عبدالحلیم شرر کی نگارشات سے مزین ہوتے تھے۔ اس پس منظر میں نگار کا حسب ذیل اداریہ ملاحظہ فرمایئے:

”آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ اس مہینہ تقریباً سارا کا سارا رسالہ مجھی کو اپنے مضامین سے پر کرنا پڑا اور ہر چند میں نے کوشش کی کہ اس میں تنوع ہوجائے لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ بعض حضرات اسے پسند نہیں فرمائیں گے مگر نگار کے دور حیات میں یہ کوئی نئی بات نہیں۔ گزشتہ تین سال نو ماہ کے رسالوں کی اگر ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ۴۴۳۷ صفحات میں مشکل سے ایک ہزار صفحات مضامین غیر کے ہوں گے اور باقی تین ہزار صفحات ادارت ہی کی طرف سے پیش ہوئے ہوں گے۔ اس کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ آپ میری کاوش کی داد دیں یا یہ کہ اس کو اپنی زندگی کا کوئی غیر معمولی واقعہ سمجھ کر آپ کے سامنے پیش کررہا ہوں بلکہ مقصود اس ضمن میں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ملک میں اچھا لکھنے والے اس قدر کم ہیں کہ اگر ان کے اعتماد پر کوئی رسالہ جاری کیا جائے تو چند مہینے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ جملہ دیگر اسباب کے یہ بھی ایک بڑا سبب رسائل کی ناکامیابی کا ہے۔ جس کو میں نگار کی اولین اشاعت میں بھی ظاہر کرچکا ہوں۔“ (نگار، اکتوبر ۱۹۲۵ء)

دسویں صدی کے ربع اول کے رسالہ میں شاید نگار ہی ایسا رسالہ تھا جو تہذیبی

مقاصد کے تحت [illegible] جاری کیا گیا۔ [illegible] ۱۹۲۷ء [illegible] ایک [illegible] ضرورت تھی [illegible]
[illegible] ادب کے لیے جاری ہوا [illegible] کا مقصد اردو زبان کی خدمت کے ساتھ ساتھ دوسرے معاشرتی اور مذہبی مقاصد بھی تھے۔ [illegible] نسواں کے حقوق و فرائض کی پاسداری کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ [illegible] بہادر میر ناصر علی نے ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد [illegible] کی تسکین کے لیے جاری کیا۔ 'خیابان' مسٹر بشیر احمد نے اپنے والد مرحوم کی یاد میں ۱۹۲۸ء [illegible] اس عصر کے دوسرے رسالوں کا ہے۔ نگار کے ساتھ زبان و ادب کے مسائل تو اہم تھے ہی مگر نیاز کے لیے حصول معاش کا ایک ذریعہ بھی تھا۔ [illegible] تھیں جس کی وجہ سے انہوں نے ترک وطن کر کے نگار کی اشاعت کراچی سے شروع کی۔ فرمان فتح پوری کی صحافتی اور فکری تربیت کی کہ مرنے کے بعد نگار کے وارث وہی بنیں اور ایسا ہی ہوا۔ اپریل ۱۹۲۸ء کے 'ملاحظات' میں رقم طراز ہیں:

"نگار تجارتی اصولوں کو سامنے رکھ کر جاری کیا گیا تھا اور اس وقت تک اسی اصول پر چلایا جا رہا ہے۔ ظاہری ترقی کے لحاظ سے غالباً یہ امر کم امید افزا نہیں ہے کہ اب وہ بجلی سے چلنے والی مشینی پریس کا بلا شرکت غیر مالک ہے۔ اسی طرح معنوی ترقی کے لحاظ سے یہ حقیقت کم دلچسپ نہیں کہ شاید ہندوستان کا کوئی رسالہ ایسا ہو جو اس کی ادائے سربلندی سے نہ جلتا ہو۔ لیکن بایں ہمہ حقیقی معنی میں مجھے اس سے اطمینان ہے نہ اس پر افتخار۔ کیونکہ مادی ترقی کے لحاظ سے اگر ایک طرف قارون میرا نصب العین ہے تو معنوی ارتقا کی حیثیت سے دوسری طرف میرا ارادہ 'الہامات' پر چشمک زن نظر آتا ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ ممکن ہے مگر محال۔ یہ محال ہے مگر ممکن۔ یعنی آج قارون کی طرح بہت سے دولت مند موجود ہیں لیکن میں نہیں ہو سکتا۔ اور آیات وجدانی کی صورت سے میں بھی اکثر چیزیں پیش کر سکتا ہوں مگر خود مجھی کو ان پر ایمان لانے میں تامل ہوگا چہ جائیکہ ساری دنیا۔۔۔۔ نیاز۔" (نگار، اپریل ۱۹۲۸ء)

نگار سے قبل اداریہ نگاری کے معاملے میں سب کے سب رسالے (بشمول ان کے جن کا ذکر اوپر آیا) جمود کا شکار تھے۔ یہ جمود حرکت کے بعد کا نہیں حرکیاتی عمل سے پہلے کا تھا۔ سائنس کی زبان میں اسے Inertia of Rest کہتے ہیں۔ اس جمود کا قدرتی نتیجہ 'نگار' اور اس کے ہم عصر رسالوں میں ظاہر ہوا۔ قبل کے اداریے بحث طلب امور، تنقید و تبصرہ، مذاکرہ اور مناظرہ، اثبات و نفی اور لسانی اور علمی معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کرتے تھے۔ تعریف و توصیف اور دلداری کا روایتی انداز تھا۔ تنقیدات اور زبان و ادب کے بارے میں تعمیری تنقید سے بھی اجتناب تھا۔ جس سے زبان و ادب میں ترقی کی راہیں مسدود ہوئیں۔ خوب اور ناخوب کا فرق جاتا رہا۔ لیکن نگار کے اداریوں نے اس طلسم نارسا کو توڑا۔ اور علمی معاملات میں کسی بھی سمجھوتہ سے گریز کیا۔ بحث طلب اور مذاکراتی معاملات پر اپنی مکمل رائے دی اور اس طرح سے ادب میں یقین و اعتماد کی بہت سی راہیں کھلیں۔ پرانا جمود ٹوٹا۔ اور اداریہ نویسی ایک فن تحریر کی شکل میں نمودار ہوئی۔ 'ملاحظات' کے اوراق ایسی تحریروں سے بھرے پڑے ہیں۔ بعض اداریے تو اتنے جامع اور مکمل ہیں کہ مستند مضمون اور قابل قدر مقالے کا درجہ رکھتے ہیں۔ چند اقتباسات:

"اس ماہ کے رسالہ میں ادبی نقطہ نظر سے سید محی الدین قادری کا مضمون جو آئندہ اشاعت میں ختم ہوگا قابل ذکر ہے۔ جناب [illegible] میں کلام نہیں کہ بہت سے کلام [illegible] میرے نزدیک قادری صاحب نے [illegible] اور اس بارے میں نظری سے کام لیتے [illegible] نہیں تھی کہ فرو داشتی تھی جس کے [illegible] مسرت ہے کہ قادری صاحب نے 'روح تنقید' [illegible] و خیال کا موضوع قرار دیا ہے اور اگر وہ اسی سے [illegible] تنقیدی مقالات سے ہمیں مستفید کرتے رہے تو ... نیاز۔" [illegible]

'نگار' میں ایک مضمون 'غالب کی ذہنیت' کے عنوان سے [illegible] میرے ایک عزیز دوست کو جنہیں عربی کی پوری استعداد [illegible] بھی ہیں لفظ 'ذہنیت' پر اعتراض ہے۔ انہوں نے [illegible] کہ ذہانت اور ذکاوت کے فرق کو اگر محسوس کر لیا جاتا تو ذہنیت کا لفظ استعمال [illegible] جاتا۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ لفظ ذہانت ذہنیت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے [illegible] نزدیک 'ذہنیت' غلط ہے۔۔۔۔۔ انگریزی میں قریب قریب اسی مفہوم کے تین لفظ [illegible] Intellect, Intelligence, Mentality اور ان کا ترجمہ اردو میں [illegible] ان الفاظ سے کیا جاتا ہے۔ ذہنیت۔ ذکاوت۔ ذہانت۔ اگر ان کے نزدیک [illegible] کے مفہوم کو ادا کرتا ہے تو پھر انہیں Mentality اور Intellect کے ترجمے [illegible] کوئی تفریق اس کے علاوہ کرنی چاہیے۔

میں اپنے فاضل دوست کو بتانا چاہتا ہوں کہ Mentality کا ترجمہ اہل مصر 'ذہنیت' ہی کرتے ہیں۔ اور اب اردو کے تمام اہل قلم اسی پر متفق ہیں اس لیے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذہنیت میں تھوڑا تغیر پیدا کر کے طوعاً و کرہاً اس کو تسلیم کر لیں اور زیادہ ذہانت سے کام نہ لیں۔" (نگار، نومبر [illegible])

"معاصر خیابان نے اگست (اکتوبر؟) کی اشاعت میں 'نقطۂ نظر' کے استعمال کے متعلق ایک دلچسپ تحقیقی نوٹ لکھا ہے۔ خیابان کے فاضل مدیر کو 'نقطۂ نظر' کی صحت میں شک تھا۔ اس لیے انہوں نے جناب طباطبائی کو حکم بنا کر اس کا فیصلہ چاہا [illegible] صاحب موصوف نے پورے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ:

'نظر انگریزی کے محاورہ میں نقطہ ہو تو ہو اردو محاورہ میں تار نظر اور مد نظر کی ترکیب اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہماری زبان میں نظر نقطہ نہیں ہے [illegible] خیال زبان میں فلاسفہ قدماء کے ایک مذہب کی رو سے پیدا ہوا کہ وہ لوگ اس کے قائل تھے۔ رویت کی حقیقت یہ ہے کہ آنکھ سے [illegible] میں یہ مذہب (یہاں مذہب کا مطلب سائنسی مفروضہ ہے) [illegible] زبان پر جو اثر پڑ چکا تھا وہ زائل نہیں ہو سکتا۔ غرض نقطۂ نظر کہنے کی [illegible] ہمارے محاورے میں نہیں ہے ہاں نظر کی صفت نکتہ داں، نکتہ بیں، نکتہ [illegible] اس اعتبار سے نکتہ نظر کہنا درست ہے۔'

'مجھے اس باب میں جناب طباطبائی سے [illegible] کے پوائنٹ آف ویو (Point of View) کا ترجمہ ہے [illegible] ہدف نظر یا مطمح نظر کا ہو سکتا ہے اس میں حقیقت [illegible] ضرورت نہیں ورنہ اس کا اثر اس پر پڑ سکتا ہے۔ جناب طباطبائی نے [illegible]

[illegible] ... صورت میں نظر کے [illegible]
[illegible] کے ان سوالوں کی تحقیق میں داخل [illegible] ... نظر کے ... [illegible] ... ظاہر [illegible] ... نظم کی [illegible] ... [illegible] نظر کے ساتھ [illegible] ... نہیں [illegible]

[illegible] ... عربی میں اس [illegible] (Point of [illegible]) کی جگہ استعمال کیا ... چنانچہ [illegible] (Dimension) کا ترجمہ "نقطۃ الاختلاف" یا "[illegible]" عربی میں ... مستعمل ہے ... خصوصیت سے ان کا ذکر اس لئے کیا کہ ... لفظ تھی ... نقطہ نظر کا ... ہو جائے ...... نیاز فتحپوری۔" (نگار، نومبر ۱۹۲۷ء)

نگار سے قبل جتنے رسالوں کے حوالے پیش کئے گئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں مشمولات سے رسالہ کا تعارف اور نگار کا تعارف مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن نگار کی خاص بات یہ تھی کہ اس نے اداریوں کے ادبی تقاضوں کو پورا کیا۔ مشمولات کا جائزہ تنقیدی پس منظر میں کیا۔ اور اداریوں کو ادب کا ایک حصہ تصور کیا۔ نگار کی اس روایت کی پیروی اس کے بعد شائع ہونے والے دوسرے جرائد مثلاً نقادیوں، نیرنگ خیال اور نگارش (دور جدید) وغیرہ نے کی۔ یوں تو نگار کا ہر اداریہ ادبی نقطہ نظر سے نہایت وقیع ہوتا تھا جس کی مثالیں آگے چل کر پیش کی جائیں گی۔ یہاں چند اقتباسات مضامین مشمولہ کے حوالے سے پیش کئے جاتے ہیں کہ مخزن کے ابتدائی انداز اور ضلائے عام کے تعارفات سے نگار کا طرز تعارف کتنا مختلف تھا اس کا فرق پتہ چل سکے۔

"اس رسالہ میں پہلا مضمون 'کیا ہندوستان ایک صناع ملک بن سکتا ہے' غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ جناب ابوالمنصور حمید عرصہ سے نگار میں معاشی مضامین لکھ رہے ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ ملک کو ایسے مقالات کی سخت ضرورت ہے۔ نگار کے ابتدائے اجراء سے اس امر کا التزام رکھا گیا ہے کہ کم از کم ایک مضمون ضرور اس قسم کا درج رسالہ ہو اور اس وقت تک اس کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ ابوالمنصور حمید جامعہ عثمانیہ کے طالب علم ہیں اور مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ وہاں کے طلبہ اکثر و بیشتر مفید مضامین کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ دوسرے کالجوں کے طلبہ جب مضمون نگاری کی طرف توجہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے 'تغزل' اور 'عشقیہ فسانہ نگاری' کی مشق کرتے ہیں۔ جو یقیناً تعلیم کا نقص ہے اور اس فضا کے غیر صالح ہونے کا ثبوت ہے جس میں تربیت حاصل کر رہے ہیں......

'اقتصادی سوجھ' ہارون احمد صاحب بی ایس سی کا نتیجہ فکر ہے لیکن اس قسم کے علمی مضامین کے لئے جس قدر سادگی بیان اور صراحت مدعا کی ضرورت ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ امید ہے کہ قابل مقالہ نگار آئندہ کوشش کریں گے کہ وہ اس سے زیادہ کامل طریقے سے اپنے مقصود کو پیش کر سکیں......

حضرت شیخ حسن محمد چشتی پر جناب محمد ناظر دہلوی کا مضمون خصوصیات کا حامل ہے جو [illegible] مضمون [illegible] کے تمام مضامین میں پائی جاتی ہیں۔ اولیائے کرام کے [illegible] عرصے سے [illegible] میں جاری ہے اور خیال ہے کہ جس وقت یہ ختم ہو جائے تو پھر کتابی صورت میں پیش کیا جائے کیونکہ بزرگان دین کے حالات لکھنے میں جن احتیاطوں کی ضرورت ہے ان سب کا ناظر صاحب نے خیال رکھا ہے اور [illegible] کی باتوں سے علیحدہ ہو کر محض سیر نگاری کے اصول پر ان کو مرتب کیا ہے......"

(نگار، جولائی ۱۹۲۶ء)

"تتیا جناب مجنوں گورکھپوری کا ایک ایسا افسانہ ہے جس پر ان کو فخر کرنا چاہئے۔ یہ افسانہ صرف اپنے جذبات انداز بیان بلکہ تجزیہ سیرت، فلسفہ اثر و تاثر اور نظریہ قتل و انفعال کے لحاظ سے بھی ایک ایسی چیز ہے جو اردو افسانہ نگاری کی طرف سے بہترین نمونہ کی صورت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ پلاٹ کے متعلق البتہ مجھے بعض جگہ کلام ہے۔ جو تتیا کی پیشین گوئی کہ سرلا اپنے شوہر کو بھی قتل کرے گی جس انداز سے افسانہ میں پوری کر کے دکھائی گئی ہے وہ میرے نزدیک قابل اصلاح ہے۔ قتل کا وقوع اس طرح بھی ہو سکتا تھا کہ 'سرلا' اس کا قصد و اہتمام نہ کرتی یا پھر اس سے پہلے اس کی دماغی حالت میں مخصوص اضطراب و ہیجان دکھانا چاہئے تھا جو ہندوستان کی ایک دیہاتی عورت کی طرف سے اس حرکت کو ممکن الوقوع بنا دیتا......"

(نگار، نومبر ۱۹۲۷ء)

"......شادی کا مضمون اجتماعی نقطہ نظر سے اور ہندوستان کی معاشیات، اقتصادی زاویہ نگاہ سے قابل قدر مضامین ہیں...... 'ارتقائے حقیقت' ہارڈی کی ایک نظم کا نہایت کامیاب ترجمہ ہے گو لفظی نہیں ہے۔ تعیین بحر اور تقسیم اوزان میں جناب فراق گورکھپوری نے نہایت دلچسپ جدت سے کام لیا ہے۔

...... غزلیں یوں تو سب خوب ہیں لیکن جناب راز کی غزل کا پانچواں، چھٹا اور آٹھواں شعر، جناب حافظ کا چوتھا چھٹا شعر، جگر بریلوی کا پہلا چوتھا اور آخری شعر۔ جناب فرح بنارسی کا آٹھواں، بارہواں شعر اور ثمر در بھنگوی کا چھٹا شعر خصوصیت کے ساتھ مجھے پسند آیا...... نیاز فتحپوری۔" (نگار، نومبر ۱۹۲۷ء)

قارئین کو ان اقتباسات سے اداریہ نگاری کی جامعیت کا اندازہ ہوا ہوگا۔ نگار سے قبل اس طرح کے اداریے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریر چاہے جس عنوان پر ہو۔ تنقید و تبصرہ ہو، انشائیہ اور افسانے ہوں یا اداریہ نویسی، ہر تخلیق پر مدیر کے علم و فضل کی چھاپ ہوتی ہے۔ علم ایک ایسا حسن ہے جو ہر جگہ ہر رنگ میں نمایاں ہو جاتا ہے اور اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس لئے ہم نے عرض کیا کہ مدیر جس علمی رتبے کا ہوتا ہے اس کا رسالہ بھی اسی پائے کا ہوتا ہے۔

نگار سے قبل اداریوں کے ادبی تقاضوں پر کم توجہ دی جاتی تھی۔ اداریے نہایت سہل پسندی سے لکھے جاتے تھے۔ نفس مضامین اور مشمولات کی فنی خوبیوں کا سرسری جائزہ ہوتا۔ نگار کا ہر اداریہ ادب کی جمالیات سے بہرور ہوتا خصوصاً مضامین نظم و نثر کی گفتگو میں لیکن چھوٹی چھوٹی گھریلو باتوں میں بھی نیاز کے حسن تحریر اور ہمہ دانی کی چھاپ ہوتی۔ صرف دو اقتباسات پر اکتفا کیا جاتا ہے:

"انسانی زندگی کے سب سے زیادہ تکلیف دہ، لیکن اس کے ساتھ نہایت دلچسپ لمحات وہ ہوا کرتے ہیں جب حوادث روزگار اس کو اپنا نشانہ بنانا ٹھہرا لیں۔ یہی وجہ ہے وہ جسے مذہب و تصوف کی زبان میں آزمائش و ابتلا کہتے ہیں اور ادبی ذوق رکھنے والے فطرت کی شوخیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن کاروباری دنیا اور مادی عالم میں

[illegible] کے سوا [illegible] کیفیت کی ہے [illegible] اس قدر [illegible] فرما [illegible] ہوتی ہیں کہ نہ صاحب کی [illegible] اس کا مداوا کر سکتی ہے [illegible] تعمیر اس کی کمیوں میں کوئی کمی [illegible]

ہر شخص اپنی اپنی جگہ امن و سکون کی جستجو میں سرگرداں ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ قدرت کا محبوب ترین مشغلہ یہی ہے کہ وہ ذاہد کے استقلال کو برابر ہم پر ثابت کرتی رہے۔ عمارتوں کو ڈھائے اور نقوش کو مٹائے۔ [illegible] اکثر و بیشتر اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنی تعمیری وجود کو چھوڑ بیٹھتا ہے لہٰذا اپنے آپ کو کل زمانہ کے حوالے کر دیتا ہے...... اس لئے ناظرین سے صرف اس قدر التجا ہے کہ وہ اپنی موجودہ ہمدردی کو بدستور قائم رکھیں اور اپنی بے اعتنائی سے میری تکالیف میں اضافہ نہ فرمائیں کیونکہ یوں بھی مجھے حزین و ملول رکھنے کے لئے کسی چیز کی کمی نہیں:

شارۂ و فلک و بخت روزگار ے ست۔ نیاز"

(نگار، مئی ۱۹۲۶ء)

رسالہ نگار کو مخزن کی علمی و ادبی کاوشوں کا ثمرہ سمجھنا چاہئے۔ اس نے اردو زبان و ادب اور صحافت میں بڑا انقلاب و اجتہاد پیدا کیا۔ اسی کی طرح ایک قابل قدر رسالہ 'نیرنگ خیال' بھی ہے جس کی اشاعت اول ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ اس کے مدیر کلیم محمد یوسف حسن تھے۔ اس رسالہ کی اہمیت کا اندازہ حسب ذیل تبصروں سے ہوتا ہے:

"...... دوسرا رسالہ جس کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ نیرنگ خیال ہے۔ اگرچہ اس رسالے کو نکلے کچھ زیادہ مدت نہیں ہوئی مگر یہ برابر ترقی کر رہا ہے......"

(مولوی عبدالحق۔ سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ رسالہ اردو)

"لاہور کے رسالہ نیرنگ خیال نے گزشتہ ڈیڑھ سال کے اندر دنیائے ادب میں کافی وقار حاصل کر لیا ہے اور اس کے ہر نمبر کی ترتیب و تدوین سے یوسف حسین صاحب کا ادبی شغف بخوبی ظاہر ہوتا ہے......" (دیانرائن نگم، رسالہ زمانہ)

یہ ممتاز علمی، ادبی، سیاسی مصور ماہوار رسالہ حکیم محمد یوسف حسن صاحب کے زیر ادارت گہوارۂ علم و ادب لاہور سے نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے......"

(مدیر حمایت اسلام، لاہور)

کلیم محمد یوسف حسن لکھتے ہیں: "نیرنگ خیال کے اجرا کے وقت ہم نے لکھا تھا کہ نیرنگ خیال ایک تجربہ ہے جو اردو صحافت کی اصلاح کے لئے شروع کیا گیا ہے۔ اس تجربے میں ہمیں ایک گونہ کامیابی ہوئی ہے۔"

اس رسالہ میں 'شذرات' کے عنوان سے اداریے لکھے جاتے۔ موضوعات کے اعتبار سے اس کے اور نگار کے اداریوں میں فرق نہیں تھا۔ لیکن اس کی تحریر نگار کی طرح ادیبانہ اور فلسفیانہ نہیں تھی۔ لیکن علمی تبحر اور وسیع مطالعہ کا عکس تو ان میں تھا ہی۔ اس رسالہ کے اداریوں میں سیاست کا زیادہ غلبہ تھا۔ چاہے وہ ملکی اور غیر ملکی سیاستیں ہوں یا صحافتی، ہر شذرات میں جگہ پاتیں۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اداریہ نویسی کا جو سفر دلگداز اور مخزن سے شروع ہوا تھا اس کی تکمیل نگار اور نیرنگ خیال سے ہوئی۔ علم و ادب کے علاوہ مذہب، تجارت اور سیاست اس کے اہم موضوعات تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کی دلداریوں کا انداز وہی تھا جو مخزن اور زمانہ کا تھا۔ لیکن اس دور کی تحریروں میں معاصرانہ چشمک اور صحافتی رقابت کی تیزی نظر آتی ہے گرچہ ان میں علم و ادب کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ چند اقتباسات:

"...... مدیر [illegible] کو بھلے [illegible]

مخزن کے بعض رسائل پر جارحانہ حملہ کرتے [illegible] پر ان کے ہوا کوئی اعتراض نہیں کہ ان [illegible] مستقل مخاطب اردو کی سے وابستہ ہے [illegible] کہ وہ اپنے محاورات کو دوسروں میں مستعمل [illegible] زبان کے ہوتے کو دل سے نکال دیں۔

...... یگانہ کتابت کی مرتع غلطیوں [illegible] خیال میں اہم پنجاب میں الف محدود [illegible] مگر لکھنؤ اور دہلی کے ٹکسالی زبان کا [illegible] یگانہ کی تسلی کے لئے اس قدر لکھنا ضروری [illegible] کے ساتھ علامت فاعلی کا استعمال درست ہے اور [illegible] دہلی اور لکھنؤ میں مختلف ہے۔ یہ فقط لکھنؤ ہی [illegible] استعمال ہوتا ہے...... یگانہ معترض ہے کہ 'شاہکار' [illegible] مستعمل ہیں اور اس کی مثال 'لاڑنس ہال' (السلام، ن۔ پ) بھی [illegible] بات کا ہے کہ قابل معترض افسانے کے فن سے کیسا [illegible] جانتا کہ گفتگو میں بولنے والے کی نفسیات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ [illegible] انگریزی الفاظ اس کثرت سے استعمال کیے گئے کہ خود یہ یگانہ بھی [illegible] کے ترجمے سو اس کے متعلق صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کہانی کا عنوان 'شاہکار' ایک ایسا لطیف ترجمہ ہے جو 'ایران شہر' سے منقول ہے۔ اور جس کی ہندوستان میں سب سے زیادہ نیرنگ خیال نے ترویج کی ہے۔ ہم اصطلاحی الفاظ کے علاوہ دوسرے الفاظ کے ترجمے کے حق میں ہیں مگر ایسا ترجمہ نہ ہو جیسا مدیر یگانہ کرتا ہے......"

(نیرنگ خیال، فروری [illegible])

"حضرت مولانا ظفر علی خاں مالک اخبار 'زمیندار' ایک افتتاحیہ [illegible] طراز ہیں: 'ادب اردو پر پنجاب نے جو احسان کئے ہیں [illegible] ستائی نہیں۔ خود غالب و انیس کے نام لینے والے معترف ہیں جو کام دہلی اور لکھنؤ سے نہ ہو سکا وہ لاہور نے کر کے دکھایا۔ صحافت کی موقت [illegible] صنف آج کل ادبیات کی جان سمجھی جاتی ہے۔ اس صنف میں پنجاب گریز پا ترقی کر رہا ہے [illegible] صحائف کا اصناف زبان و ادب ہو یا [illegible] یہ معاصر [illegible] کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن ایسی چشمک میں [illegible] مدیر نیرنگ کی طرز تحریر نامحرمانہ ہے جس میں دل آزاری کے [illegible] تناظر میں نیاز فتحپوری کا جوابی تبصرہ ملاحظہ فرمایئے جو نگار کے [illegible] شذرات کے حوالے سے نیرنگ خیال میں شائع ہوا۔ نیرنگ خیال [illegible] میں معارف کے حوالے سے میرا ذکر بھی شذرات کے سلسلہ میں [illegible] جواب میں صرف آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ اگر کوئی غلطی مجھ سے [illegible] درگزر فرمایئے۔ البتہ یہ یقین ہے کہ میں نے نیرنگ خیال سے کوئی [illegible] نقل نہیں کی کہ اس کا حوالہ دیتا...... ایک الزام مولوی [illegible] صاحب [illegible] ہے کہ میں نے تاریخ الدولتین کو اس طرح شائع کیا [illegible] ہے حالانکہ سرورق پر صراحتاً [illegible]

[illegible] ہوتا ہے [illegible] کوئی بھی [illegible]
[illegible] ہے کہ [illegible] اس وقت تک اس کا [illegible]

[illegible] ہو کر [illegible] کی نقل [illegible] کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے [illegible] درج ہیں [illegible] کے۔ یہ [illegible] پر اصل کتاب میں [illegible] کی عبارت درج نہیں کی گئی [illegible] میں سے بہت کچھ درج کر دی گئی ہے [illegible] کہیں اختلاف [illegible] ظاہر کیا گیا ہے...... آخر میں [illegible] عرض کرتا ہے کہ میں نے [illegible] نقل کا [illegible] نہیں کیا کیونکہ [illegible] کوئی [illegible] نہیں رکھتا البتہ ایک صاحب علم کی حیثیت سے لکھتے ہوئے [illegible] ضرور رکھتا ہوں اور اس مسئلہ میں [illegible] نہیں [illegible] اگر [illegible] تلخ اور درشت لہجے کے نرمی کے ساتھ گفتگو کی جائے تو کیا حرج ہے...... نیاز فتح پوری۔" (نیرنگ خیال، جنوری ۱۹۳۵ء)

اس طرح کی عالمانہ اور شاعرانہ چشمک اس وقت سے ہے جب سے رسائل و [illegible] وجود میں آئے۔ البتہ ابتدا زبان و ادب کا حلقہ اور ابلاغ کے وسائل محدود تھے اس قسم کی [illegible] خرابیاں اور سرقہ و توارد کے الزامات اور الزامات کی اتنی اہمیت نہیں تھی لیکن جیسے جیسے زبان و ادب اور صحافت نے ترقی کی اس میں سختی آتی گئی۔ سرقہ و توارد کی بحث ہی مختلف ہیں۔ بعض حالتوں میں جب تک پوری واقفیت اور مستند علم نہیں ہوتا یہ [illegible] مشکل ہوتا ہے کہ اصل کون ہے اور نقل کیا ہے۔ البتہ ایک 'طرز ادا' پہلے بھی [illegible] تھی اور اب بھی ہے۔ وہ یہ کہ ایک ہی تخلیق کو کئی رسالوں میں شائع کرا دینا۔ اب رسالے کا مدیر بیچارا کہاں تک چھان بین کرتا ہے۔ لیکن ایسی دیدہ دلیری کا آج کل جو الزام ہوتا ہے وہ اظہر من الشمس ہے وہ یہ کہ بے چارہ قلم کار ذات سے بار دیا جاتا ہے۔

سرقہ اور توارد سے متعلق نیرنگ خیال کے 'شذرات' میں اکثر تذکرہ ملتا ہے۔ ایک دو [illegible] تفریح ناظرین کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

"ہم عصر کنول نے لکھا ہے: 'حال ہی میں سالک صاحب (عبدالمجید سالک [illegible]) کا مضمون بعنوان لطیفہ 'تہذیب نسواں اور نیرنگ خیال' میں ایک ساتھ [illegible] کو سالک صاحب جیسے قلم کار پر اعتراض کا موقع مل گیا'...... اس مضمون میں فاضل ایڈیٹر صاحب نے ایک تو جناب سالک پر اعتراض کیا ہے اور دوسرا تہذیب نسواں پر۔ چونکہ ہم حقیقت سے باخبر ہیں اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے......"

مولانا سالک نے یہ مضمون نیرنگ خیال کے لئے لکھا تھا۔ چونکہ تہذیب نسواں کا سالگرہ نمبر شائع ہونے والا تھا اور یہ مضمون عورتوں کے لئے بھی ویسا ہی مفید تھا جیسا مردوں کے لئے اس لئے ہم نے اسے دفتر تہذیب میں بھیج دیا...... یہ آپس میں اشتراک عمل ہے۔ تہذیب نسواں اور نیرنگ خیال کا یہ اشتراک بالکل ایسا ہی ہے جیسا کنول امرتسر اور نیرنگ خیال، لاہور کا۔ نیرنگ خیال اور کنول ایک ہی ہیں اگر ہم نے [illegible] نقل کر [illegible] کیا ہے......" (نیرنگ خیال، اگست ۱۹۳۶ء)

[illegible] یہ اصول میں یہ تحریر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ [illegible] کیا ہے لیکن [illegible] اس شذرہ کے مطالعہ سے معلوم

[illegible] ہے کہ [illegible] ریاست کے کسی محرر نے مدرشن کا کوئی افسانہ اپنے ساتھ [illegible] میں شائع کر دیا ہے۔ اور اس پر جناب مدیر صاحب ریاست نے اس غلط کار محرر کی کمینہ حرکت پر مدرشن صاحب سے معافی طلب کی ہے...... مندرجہ بالا سطور لکھنے کے بعد ہمیں ریاست کا ایک تازہ پرچہ موصول ہوا جس میں نیرنگ خیال سے دو نظمیں نقل کی گئی ہیں جن میں سے ایک غزل کے نیچے نیرنگ خیال کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔ ہم نے پنڈت ہری چند اختر سے معلوم کیا کہ کیا انہوں نے یہ غزل مدیر ریاست کو براہ راست بھیجی تھی؟ مگر پنڈت صاحب کو اس سے انکار ہے۔ یہ غزل ہم نے پنڈت صاحب سے معقول نذرانہ پیش کر کے حاصل کی تھی......"

(نیرنگ خیال، اکتوبر ۱۹۳۶ء)

سرقہ کی بدعت ہر زبان میں پائی جاتی ہے۔ مدیر نیرنگ خیال اس معاملے میں زیادہ حساس واقع ہوئے تھے جس کی وجہ سے ان کا تحریری لہجہ ترش ہو جایا کرتا تھا۔ یہ ان کی انفرادیت تھی۔ اب تک تقریباً ایک درجن رسائل اور ان کے اداریوں کا ذکر آیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ ترجیحات تھیں۔ اندازِ سخن جدا جدا تھا۔ مقاصد و منازل الگ تھے۔ ان اداریوں سے جہاں علم و ادب کی بتدریج ترقی کا اندازہ ہوتا ہے اور اصناف ادب کے مختلف رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہیں حضرت مدیران رسائل کے علمی رتبہ اور ادب اور زندگی کے بارے میں ان کے فکر و فلسفہ کا محاسبہ بھی ہوتا ہے۔ اداریوں کے پس منظر میں مدیران رسائل اور ایڈیٹران کا نفسیاتی مطالعہ ایک عمدہ مضمون ہو سکتا ہے۔

نگار اور نیرنگ خیال کی خوبیاں یہ تھیں کہ اپنے اداریوں میں شعر و سخن اور دوسرے اصناف ادب کو تنقیدی پس منظر میں جانچتے تھے۔ اور ان کے فنی پہلو کو عالمانہ طور پر اجاگر کرتے تھے۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں فکر و فن کی سطح پر کسی تحریک یا نئے رجحان کا پتہ نہیں چلتا۔ صحافتی اعتبار سے یہ ایک عبوری دور تھا۔ رسائل و جرائد اور دوسری ادبی اور نیم ادبی انجمنیں ترقی زبان میں مصروف تھیں۔ لسانی اعتبار سے ادب میں نئے نئے رجحانات اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب زبان ترقی کی منزلیں طے کر کے نقطہ عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ ابھی تو زبان اردو میں مختلف اصناف ادب خصوصاً نثری ادب کی تراش خراش جاری تھی۔ کسی تحریک اور نئے رجحانات کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ ۱۹۱۷ء میں روس کا انقلاب ہوا ۱۸۔ ۱۹۱۴ء پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا ان کی تھوڑی سی جھلک رسالہ زمانہ کے اداریوں میں ملتی ہے لیکن دوسرے رسائل و جرائد پر عموماً اور اردو زبان پر خصوصاً اس کے اثرات نہیں تھے۔ ۱۹۳۰ء تک جب روس میں اشتراکیت کے قدم اچھی طرح جم گئے تو اس کے اثرات باہری دنیا پر پڑنے لگے۔ انہیں اثرات کے تحت ۳۶۔۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ہوا۔ ہر تحریک اور رجحان ابتدا میں نیک ارادوں اور صالح مقاصد کے تحت شروع ہوتے ہیں۔ آگے چل کر قباحتیں اور بد صورتیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہی حشر ترقی پسند تحریک کا ہوا۔ ان کے عوامل زوال پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں۔ سائنس کے Chain Reaction کی طرح جدیدیت اور مابعد جدیدیت کا غلغلہ ہوا۔ ان تحریکوں نے اردو زبان کے مقصدی ادب کو غلط راستے پر ڈال دیا۔

ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری ملکی زبان کی ترقی اور ادب کے فروغ کے لئے کئی انجمنیں اور تحریکیں کام کر رہی ہیں جن میں اردو زبان کی بہت حد تک کمزوریوں کو دور کر دیا [illegible] تفصیل سے [illegible] ہر ایک کے بارے میں موافق اور مخالف [illegible] پائی جاتی ہیں کیونکہ اس کا تعلق بحث میں شامل ہے۔

"ہمارے یہاں بار بار یہ بحث چلی ہے کہ رسم الخط کون سا اختیار کیا جائے مگر کبھی اصولی طور پر [illegible] تو بہت کم ہی ہے۔ سوچا گیا [illegible] ملک میں ایک رسم الخط ممکن بھی ہے کہ نہیں اور اگر ممکن ہے تو ترجیح کس خط کو دی جائے۔ رسم الخط مختلف صوبجات میں یہ بحث صوبوں کی حد تک محدود رہی ہے...... [illegible] جہاں تک ہندوستان میں اردو ہندی کی بحث اصل میں اردو حروف اور ناگری حروف کی [illegible] رہی اور آخر سرکار نے اس کا فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں پہلو بہ پہلو عدالتوں میں رواج پا گئیں...... ہمارے خیال سے چار چیزیں ہیں جو رسم الخط کو پرکھنے کے لئے کسوٹی کا کام دے سکتی ہیں:

۱- کون سا خط ایسا ہے جو مختلف حصص ملک میں زیادہ تر مروج ہے۔

۲- کون سا خط ایسا ہے جو اپنے ذاتی صفات کے لحاظ سے قابل پذیرائی ہے۔

۳- کس خط کے اختیار کرنے میں باہمی خانہ جنگی کا خطرہ نسبتاً کم ہے۔

۴- کس خط کا اختیار کرنا توسیع تجارت اور بیرونی دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے زیادہ مفید ہے۔

جو چار معیار اوپر مقرر کیے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک فارسی رسم خط پر پورا اترتا ہے۔ فارسی رسم خط کو اختیار کرنے کی وجوہات مختصراً یہ ہیں:

۱- یہ خط جس رفتار سے ترقی کر سکتا ہے رومن خط ملک میں اس رفتار سے نہیں پھیل سکتا۔

۲- رومن خط بہ وجوہ بالکل اجنبی ہونے کے بہت سی آوازوں کے ادا کرنے میں قاصر ہے۔ برعکس اس کے فارسی رسم خط اول ایشیائی الاصل ہے۔ دوئم صدیوں سے ہندوستان میں بود و باش رکھنے کی وجہ سے ہندوستانی ہو گیا ہے۔

۳- فارسی رسم خط کو سکھانے کے ذرائع دیہات وغیرہ میں اب تک میسر ہیں اور بغیر صرف کثیر کے حاصل ہیں۔

۴- فارسی حروف جاننے سے ہندوستان نہ صرف ممالک ایشیا، وسط ایشیا، ایران، شام عرب سے ایک مستقل تعلقات کی بنیاد رکھے گا بلکہ اس میں اگر ہمت ہو گی تو تمام شمالی افریقہ اور یوروپین ترکی تک اس کی تجارت اپنے پاؤں پھیلا سکے گی۔

ہم اپنے ملک کے فہمیدہ اصحاب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس بحث پر منصفانہ غور کر کے ایمانداری سے وہ رائے قائم کریں جن سے ان کے نزدیک ملک کی ترقی اور بہبودی منظور ہو۔ ایڈیٹر۔" (مخزن، اکتوبر ۱۹۱۰ء)

"......کچھ عرصہ سے ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی الفاظ داخل کرنے کی خواہ مخواہ کوشش ہو رہی ہے۔ اور اس سے دونوں زبانوں کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آج کل نن کوآپریشن کے زمانہ میں اردو کے معزز رسائل اور اخبارات معمولی انگریزی الفاظ کو بھی بائیکاٹ کرنے کی فضول کوشش کر رہے ہیں......" (زمانہ، اپریل ۱۹۲۱ء)

"ہم ہندی اور اردو دونوں کے قدردان ہیں اور دونوں کی ترقی کے یکساں حامی ہیں اس لئے کسی مقابلے کے خیال سے نہیں بلکہ محض اظہار واقعات کے طور پر یہ

روشن کرتے [illegible]

جماعت کو [illegible] کی [illegible]

[illegible]

اور رسالوں کی [illegible] کے [illegible]

چند اقتباسات نذر ناظرین ہیں:

"......ایک زمانہ تھا ہم لوگوں کا [illegible]

اسی اعزاز کے قدردان ہیں جو خود ملک کے [illegible]

قدر نہیں کرتے جو نقصان ملک اپنی قوم سے مصنفات [illegible]

ہیں...... جو شخص اپنے تحت خانہ میں بیٹھ کر [illegible]

جس کے مطالعہ سے ہزاروں افراد قوم مستفید ہوتے ہیں [illegible]

لٹریچر میں مفید اضافہ ہوتا ہے اور جس سے کسی غیر ملک [illegible]

میں مصنف کی قوم کی نسبت اچھی رائے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہماری رائے میں [illegible]

باوجود گوشہ نشین ہونے کے اور باوجود اپنی سادگی و وضع ہونے کے ایک [illegible]

اور محسن قوم ہے...... عبدالقادر۔" ([illegible])

"اس وقت صرف پنجاب گورنمنٹ ہی دیسی زبانوں کی خدمت [illegible] حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ہر سال لائق مصنفوں کی بیش قرار [illegible] ہوتی ہے۔ سال گزشتہ میں منجملہ اور اصحاب کے منشی عبدالرحمٰن صاحب [illegible] سورج نارائن مہر، منشی دیوی دیال صاحب کو چار چار سو روپے عطا ہوئے۔" (زمانہ، جنوری [illegible])

"اس سال نوبل پرائز کا اعلیٰ ترین انعام بنگال کے مایہ ناز شاعر مسٹر [illegible] ٹیگور کو دیا گیا ہے۔" (زمانہ، اکتوبر ۱۹۱۳ء)

"اعلیٰ حضرت حضور نظام علوم و فنون کی سرپرستی کرنا اپنا فرض خیال فرماتے ہیں۔ اردو زبان کی توسیع و ترقی میں لکھو کھا روپیہ صرف فرما چکے ہیں۔ حال [illegible] نے میور پریس دہلی کے مالک منشی بہاری داس صاحب کو دس ہزار روپیہ عطا فرمایا۔" (زمانہ، جنوری ۱۹۲۱ء)

"اعلیٰ حضرت نظام دکن نے از راہ علم پروری پنجاب سے مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کے 'مرقع دیوان غالب' کو اپنے نام سے [illegible] کی اجازت دے دی ہے اور اس کی سو جلدیں خرید کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ اس مرقع کی قیمت سو روپے فی جلد ہے۔ کاش آج غالب مرحوم زندہ ہوتے اور اپنی [illegible] قدردانی دیکھتے۔" ([illegible])

"۲۷-۱۹۲۸ء میں مندرجہ ذیل موضوعات پر [illegible] دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے...... پریم چند کو یادگار ناول 'رنگ بھومی' کی [illegible] ۵۰۰ روپے کا انعام ملا ہے۔ اردو میں [illegible] وقار الملک کو ملا ہے۔ نظم کی بہترین تصنیف مولانا [illegible] کو پانچ سو روپیہ کا انعام دیا گیا ہے......" ([illegible])

"......ہز اکسلنسی کی ادبی قدردانی کا تمام ملک [illegible]

اعلیٰ حضرت نے قرآن شریف کے [illegible]

(زمانہ، اگست ۱۹۳۱ء)

[illegible] اکیڈمی نے سال رواں کے لئے [illegible] روپیہ جدید تصانیف [illegible] ہوا ہے کہ ہندو اور [illegible] عہد کی ادبی، تمدنی، [illegible] کرائی جائیں جس کے لئے کسی اہل ادیب کا [illegible]

[illegible] کے دو مختلف کتابوں پر [illegible] انعام تجویز کئے گئے [illegible] ایک ہزار روپیہ اپنی طرف سے اس ادیب کی خدمت میں [illegible] ہندوستان کے اسلامی عہد کی معاشرتی اور تمدنی حالت پر [illegible] بھی ایک ہزار روپیہ اس کو دے گی جو تین خطبے اس کے مقررہ موضوع پر دے گا......"

(نگار، اگست [illegible])

اس طرح کے اقتباسات سے رسائل پر ہیں۔ چند پر اکتفا کیا گیا۔ وفیات کی خبریں اور تعزیتی پیغامات بھی اداریوں کا حصہ ہوتے تھے۔ چند خبریں اور تحریریں ریکارڈ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں:

"۱۹۲۶ء اپنی آخری گھڑیاں طے کر رہا تھا کہ شرر لکھنوی ہم سے جدا ہو گئے۔ اور ۱۹۲۷ء نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھایا ہی تھا کہ شاد عظیم آبادی نے منہ موڑ لیا۔ ہر چند یہ حضرات اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے لیکن اس کا کیا علاج کہ ابھی ملک ان میں سے کسی کی جدائی گوارا کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ اب خواہ ان کے فقدان پر کتنا بھی ماتم کیا جائے کتنی ہی یادگاریں قائم کی جائیں لیکن اب نہ کوئی دوسرا شرر پیدا ہو گا نہ شاد......"

(نگار، فروری ۱۹۲۷ء)

"یہ خبر غالباً رنج و افسوس سے سنی جائے گی کہ ۲۴ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ابوالبیان سید حامد حسین بیدل شاہجہاں پوری دنیا سے ہمیشہ کے لئے بے تعلق ہو گئے۔"

(نگار، مارچ ۱۹۲۶ء)

"ہمارے دیرینہ مکرم منشی نوبت رائے نظر نے اپریل کے دوسرے ہفتے میں انتقال کیا۔ نظر ایک کہنہ مشق اور خوشگو شاعر تھے۔ ادیب و انشا پرداز بھی اور اخبار نویس بھی...... لکھنؤ میں نظر صاحب کے سوا کوئی دوسرا شخص ان حیثیات کا جامع نہیں تھا۔"

(الناظر، مئی ۱۹۲۳ء)

"مسٹر ایس خدا بخش مرحوم جن کا انتقال اگست ۱۹۳۱ء کے پہلے ہفتے میں ہوا ایک غیر معمولی انسان تھے...... سات سال متواتر آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۹ء میں ہندوستان واپس آئے اور ڈھاکہ میں بیرسٹری شروع کی۔ ۱۹۰۱ء میں کلکتہ چلے گئے......

آپ کی تصانیف میں سے بعض کے نام یہ ہیں: تاریخ تہذیب اسلام (۱۹۰۵ء)، ہندوستانی اور مسلم (۱۹۱۲ء)، مسلمانوں کی تاریخ (۱۹۱۴ء)، روایتیں اور کہاوتیں (۱۹۱۷ء)، عہد خلفا کی تہذیب (۱۹۲۰ء) سیاست اور اسلام (۱۹۲۰ء)، تحفۂ محبت (۱۹۲۳ء)، تہذیب عرب (۱۹۲۶ء)......"

(زمانہ، ستمبر ۱۹۳۱ء)

"افسوس ہے کہ ۲۸ر جون ۱۹۳۳ء کو خان بہادر میر ناصر علی دہلوی کے انتقال پر ملال سے اردو کی بزم ادب سونی ہو گئی ہے۔ میر صاحب ۱۸۴۲ء میں پیدا ہوئے تھے آپ کے [illegible] عہد [illegible] میں قاضی القضاۃ تھے آپ کے جد امجد مولوی سید محمد علی بھوپالی ریزیڈنسی میں میر منشی اور میر صدیق علی خاں وزیر اعظم ناگپور کے معتمد اعلیٰ تھے۔ آپ کے والد ماجد مولوی سید ناصر الدین کئی ضخیم کتابوں کے مصنف اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے......"

(زمانہ، اکتوبر ۱۹۳۳ء)

"حضرت داغ، جناب امیر، کلیم جلال، مولانا آزاد، مولانا اشہری، ان بزرگوں کی رسم تعزیت ادا کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا...... اب تک جتنے اخبارات نظر سے گزرے، سب میں مولانا حالی و علامہ شبلی کے انتقال پر ملال کا افسوس اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ دنیائے شاعری کے دو زبردست سخنور کم ہو گئے...... تعجب اس امر کا ہے کہ مرحومین میں جو کمالات حقیقی تھے ان کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتا......"

(صلائے عام، اپریل ۱۹۱۵ء)

نواب محسن الملک کی رحلت کے بعد مسلمانان ہندوستان کو اپنی قوم کے جن سرکردہ بزرگوں کے انتقال کا صدمہ اٹھانا پڑا ہے ان میں مشیر الدولہ، ممتاز الملک آنریبل خلیفہ سید محمد حسین صاحب سعد، ممبر کاؤنسل پٹیالہ و نامور ٹرسٹی علی گڑھ کالج کا دنیا سے اٹھ جانا ایک ایسا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی محال ہے......"

(مخزن، جنوری ۱۹۰۸ء)

ابتداً ہم نے عرض کیا کہ اداریے ایک ایسا آئینہ خانہ ہیں جن میں علم و ادب کے مختلف خد و خال نظر آتے ہیں شروع میں موضوع اور مقصد دونوں اعتبار سے اداریوں کی کوئی واضح شکل نہیں تھی۔ اگر کوئی مقصد تھا تو صرف اتنا کہ مضامین، نظم و نثر کا تعارف کرا دیا جائے اور فنکار کی دلداری کی جائے لیکن زبان و ادب کوئی جامد اور غیر متحرک شے نہیں ہے۔ اس کا عروج و زوال بھی نامیاتی اصولوں پر ہوتا ہے۔ نباتات اور حیوانات میں Law of Natural Selection اور Survival of the fittest کے اصول کام کرتے ہیں۔ ان کا اطلاق زبان و ادب پر بھی ہوتا ہے۔ ادب کے مقاصد، حقائق زندگی کے اظہار اور پیغام کی آفاقیت کے اعتبار سے ہر تخلیق کی ایک عمر ہوتی ہے۔ کمزور اور ناقص تحریریں معدوم ہوتی جاتی ہیں ان کی جگہ اعلیٰ و توانا تحریریں لے لیتی ہیں۔ زبان و ادب کا سفر اسی طرح آگے بڑھتا ہے اور پھر ایک نقطہ عروج پر آ کر اپنا مقام کھو دیتا ہے۔ زبان نے جب ترقی کی تو اداریوں کا انداز بھی بدلا۔ ابتداً جو تحریریں صرف مضامین کی نشاندہی اور صاحب مضمون کی دلداریوں کے لئے استعمال ہوتی تھیں زبان و ادب کے عصری تقاضوں سے زیادہ قریب ہو گئیں۔ رسائل کی معاشی بدحالیاں تو پوری صدی کا قصہ ہیں۔ ان میں تو کوئی کمی نہیں آئی لیکن محرومی اور مایوسی کی لے بدل گئی۔ اداریہ نگاری کے موضوع اور مقصد دونوں میں تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہوئی۔ تحریروں میں جو لکنت اور سہل پسندی تھی ختم ہوئی۔ بہت سے موضوعات جو شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے اداریوں میں جگہ پانے لگے۔ مشمولات پر تنقیدی نگاہیں پڑنے لگیں۔ سیاست، مدنیت، مذہب تجارت غرض کہ علم و زبان کے علاوہ محرکات زندگی کے بیشتر پہلو اداریوں میں شامل ہو گئے۔ اور اداریہ نویسی نے بتدریج ایک فن کی شکل اختیار کر لی۔ اداریوں میں زبان کی ادبی جمالیات پر توجہ ہوئی اور اداریہ اردو زبان کے ادبی تقاضوں کو پورا کرنے لگا۔

☆☆☆

اس دور کے رسالوں سے ہندی کی ترقی اور عرب کے فروغ کے لئے کی انجمنیں اور تحریکیں قائم کی گئی تھیں۔ ان رسالوں میں ان کی جدوجہد اور کار گزاریوں کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ ہر ایک کے بارے میں موافق اور مخالف رائیں پائی جاتی ہیں کیونکہ ایسا ہونا انسانی جبلت میں شامل ہے۔

"ہمارے یہاں بار بار یہ بحث ہوتی ہے کہ رسم الخط کون سا اختیار کیا جائے مگر کبھی اصولی طور پر نہیں۔ اول تو بہت شاذ ہی یہ سوچا گیا کہ پورے ملک میں ایک رسم الخط ممکن بھی ہے کہ نہیں اور اگر ممکن ہے تو ترجیح کس خط کو دی جائے۔ دوم عموماً مختلف صوبجات میں یہ بحث صوبوں کی حد تک محدود رہی ہے...... صوبہ جات متحدہ میں اردو ہندی کی بحث اصل میں اردو حروف اور ناگری حروف کی تکرار تھی اور آخر سرکار سے اس کا فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں پہلو بہ پہلو عدالتوں میں رواج پائیں...... ہمارے خیال سے چار چیزیں ہیں جو رسم الخط کو پرکھنے کے لئے کسوٹی کا کام دے سکتی ہیں:

۱- کون سا خط ایسا ہے جو مختلف حصص ملک میں زیادہ تر مروج ہے۔

۲- کون سا خط ایسا ہے جو اپنے ذاتی صفات کے لحاظ سے قابل پذیرائی ہے۔

۳- کس خط کے اختیار کرنے میں باہمی خانہ جنگی کا خطرہ نسبتاً کم ہے۔

۴- کس خط کا اختیار کرنا توسیع تجارت اور بیرونی دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے زیادہ مفید ہے۔

جو چار معیار اوپر مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک فارسی رسم خط پر پورا اترتا ہے۔ فارسی رسم خط کو اختیار کرنے کی وجوہات مختصراً یہ ہیں:

۱- یہ خط جس رفتار سے ترقی کر سکتا ہے رومن خط ملک میں اس رفتار سے نہیں پھیل سکتا۔

۲- رومن خط بہ وجوہ بالکل اجنبی ہونے کے بہت سی آوازوں کے ادا کرنے میں قاصر ہے۔ برعکس اس کے فارسی رسم خط اول ایشیائی الاصل ہے۔ دوئم صدیوں سے ہندوستان میں بود و باش رکھنے کی وجہ سے ہندوستانی ہو گیا ہے۔

۳- فارسی رسم خط کو سکھانے کے ذرائع دیہات وغیرہ میں اب تک میسر ہیں اور بغیر صرف کثیر کے حاصل ہیں۔

۴- فارسی حروف جاننے سے ہندوستان نہ صرف ممالک ایشیا، وسط ایشیا، ایران، شام عرب سے ایک مستقل تعلقات کی بنیاد رکھے گا بلکہ اس میں اگر ہمت ہو گی تو تمام شمالی افریقہ اور یوروپین ٹرکی تک اس کی تجارت اپنے پاؤں پھیلا سکے گی۔

ہم اپنے ملک کے فہمیدہ اصحاب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس بحث پر منصفانہ غور کر کے ایمانداری سے وہ رائے قائم کریں جن سے ان کے نزدیک ملک کی ترقی اور بہبودی متصور ہو۔ ایڈیٹر۔" (مخزن، اکتوبر ۱۹۱۰ء)

"...... کچھ عرصہ سے ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی الفاظ داخل کرنے کی خواہ مخواہ کوشش ہو رہی ہے۔ اور اس سے دونوں زبانوں کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آج کل نن کوآپریشن کے زمانہ میں اردو کے معزز رسائل اور اخبارات معمولی انگریزی الفاظ کو بھی بائیکاٹ کرنے کی فضول کوشش کر رہے ہیں...... " (زمانہ، اپریل ۱۹۲۱ء)

"ہم ہندی اور اردو دونوں کے قدردان ہیں اور دونوں کی ترقی کے یکساں حامی ہیں اس لئے کسی مقابلے کے خیال سے نہیں بلکہ محض اظہار واقعات کے طور پر یہ

[illegible] عرض کرتے ہیں [illegible] جماعت کو مزید سرگرمی سے کام [illegible]

اطلاعات و اکرامات [illegible]

اور سیاستوں کی فیاضیوں کے [illegible]

چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

"...... ایک زمانہ میں ہم لوگوں کو [illegible]

اسی طرح کے قدردان ہیں [illegible] ملک کے [illegible]

قدر نہیں کرتے جو خدمات ملک اپنی قوم [illegible]

ہیں...... جو شخص اپنے کتب خانہ میں بیٹھ کر [illegible]

جس کے مطالعہ سے ہزاروں افراد قوم مستفید [illegible]

لٹریچر میں مفید اضافہ ہوتا ہے اور جس سے [illegible]

میں مصنف کی قوم کی نسبت اچھی رائے قائم ہو سکتی ہے [illegible]

باوجود گوشہ نشیں ہونے کے اور باوجود اپنی سادگی وضع [illegible]

اور محسن قوم ہے...... عبدالقادر۔"

[illegible]

"اس وقت صرف پنجاب گورنمنٹ ہی ملکی زبانوں کی [illegible] حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ہر سال لائق مصنفوں کی [illegible] ہوتی ہے۔ سال گزشتہ میں منجملہ اور اصحاب کے منشی [illegible] سورج نارائن مہر، منشی دیوی دیال صاحب کو چار چار سو روپے [illegible]

([illegible])

"اس سال نوبل پرائز کا اعلیٰ ترین انعام بنگال کے [illegible] ٹیگور کو دیا گیا ہے۔"

(زمانہ، [illegible])

"اعلیٰ حضرت حضور نظام علوم و فنون کی سرپرستی کرنا [illegible] ہیں۔ اردو زبان کی توسیع و ترقی میں کھلے دل سے صرف [illegible] نے میور پریس دہلی کے مالک منشی بہاری لال صاحب کو [illegible]

(زمانہ، [illegible])

"اعلیٰ حضرت نظام دکن نے ازراہِ علم پروری [illegible] عبدالرحمٰن چغتائی کے مرقع دیوان غالب کو اپنے نام سے [illegible] اجازت دے دی ہے اور اس کی سو جلدیں خرید [illegible] کی قیمت سو روپے فی جلد ہے۔ کاش آج غالب مرحوم [illegible] قدردانی دیکھتے۔"

[illegible]

"[illegible] ۱۹۲۸ء میں مندرجہ ذیل موضوعات پر [illegible] دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے...... پریم چند [illegible] ۵۰۰ روپے کا انعام ملا ہے [illegible] وقار الملک کو ملا ہے۔ نظم کی بہترین تصنیف [illegible] کو پانچ سو روپیہ کا انعام [illegible]

"...... [illegible] کی ادبی قدردانی کا [illegible] اعلیٰ حضرت نے قرآن شریف کے [illegible]

(زمانہ، اگست ۱۹۳۱ء)

[illegible] سال زمانہ کے لئے ۵۰۰۰ روپیہ جدید تصانیف [illegible] ہے کہ ہندو اور مسلم عہد کی ادبی تمدنی [illegible] کرائی جائیں جس کے لئے کسی اہل ادیب کا

[illegible] کتابوں پر [illegible] انعام تجویز کئے گئے [illegible] اپنی طرف سے اس ادیب کی خدمت میں [illegible] کے اسلامی عہد کی معاشرتی اور تمدنی حالت پر [illegible] ایک [illegible] روپیہ اس کو دے گی جو تین خطبے اس کے مقررہ [illegible]......"

(نگار، اگست ۱۹۲۷ء)

[illegible] طرح کے اقتباسات سے رسائل پر ہیں۔ چند پر اکتفا کیا گیا۔ وفیات کی خبریں اور [illegible] بھی اداریوں کا حصہ ہوتے تھے۔ چند خبریں اور تحریریں [illegible] کے طور پر نقل کی جاتی ہیں:

"۱۹۲۶ء اپنی آخری گھڑیاں طے کر رہا تھا کہ شرر لکھنوی ہم سے جدا ہو گئے۔ اور ۱۹۲۷ء نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھائی تھا کہ شاد عظیم آبادی نے منہ موڑ لیا۔ ہر چند یہ حضرات اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے لیکن اس کا کیا علاج کہ ابھی ملک ان میں سے کسی کی جدائی گوارا کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ اب خواہ ان کے فقدان پر کتنا بھی ماتم کیا جائے کتنی ہی یادگاریں قائم کی جائیں لیکن اب نہ کوئی دوسرا شرر پیدا ہو گا نہ شاد......"

(نگار، فروری ۱۹۲۷ء)

"یہ خبر نہایت رنج و افسوس سے سنی جائے گی کہ ۲۴ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ابوالبیان سید حامد حسین بیدل شاہجہاں پوری دنیا سے ہمیشہ کے لئے بے تعلق ہو گئے۔"

(نگار، مارچ ۱۹۲۶ء)

"ہمارے دیرینہ مکرم منشی نوبت رائے نظر نے اپریل کے دوسرے ہفتے میں انتقال کیا۔ نظر ایک کہنہ مشق اور خوشگو شاعر تھے۔ ادیب و انشا پرداز بھی اور اخبار نویس بھی...... لکھنؤ میں نظر صاحب کے سوا کوئی دوسرا شخص ان حیثیات کا جامع نہیں تھا۔"

(الناظر، مئی ۱۹۲۳ء)

"مسٹر ایس خدا بخش مرحوم جن کا انتقال اگست ۱۹۳۱ء کے پہلے ہفتے میں ہوا ایک غیر معمولی انسان تھے...... سات سال متواتر آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۹ء میں ہندوستان واپس آئے اور ڈھاکہ میں بیرسٹری شروع کی۔ ۱۹۰۱ء میں کلکتہ چلے گئے...... آپ کی تصانیف میں سے بعض کے نام یہ ہیں: تاریخ تہذیب اسلام (۱۹۰۵ء)، ہندوستانی اور مسلم (۱۹۱۲ء)، مسلمانوں کی تاریخ (۱۹۱۴ء)، روایتیں اور کہاوتیں (۱۹۱۹ء)، عہد خلفا کی تہذیب (۱۹۲۰ء) سیاست اور اسلام (۱۹۲۰ء)، تحفۂ محبت (۱۹۲۳ء)، تہذیب عرب (۱۹۲۶ء)......"

(زمانہ، ستمبر ۱۹۳۱ء)

"افسوس ہے کہ ۱۷ر جون ۱۹۳۳ء کو خان بہادر میر ناصر علی دہلوی کے انتقال پر دہلی سے اردو کی بزم ادب سونی ہو گئی ہے۔ میر صاحب ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ سید عبدالغفور عہد مغلیہ میں قاضی القضاۃ تھے آپ کے جد امجد مولوی سید محمد علی بھوپال ریذیڈنسی میں میر منشی اور میر صدیق علی خاں وزیر اعظم ناگپور کے معتمد اعلیٰ تھے۔ آپ کے والد ماجد مولوی سید ناصر الدین کئی عظیم کتابوں کے مصنف اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے......"

(زمانہ، اکتوبر ۱۹۳۳ء)

"حضرت داغ، جناب امیر، کلیم جلال، مولانا آزاد، مولانا اشہری، ان بزرگوں کی رسم تعزیت ادا کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا...... اب تک جتنے اخبارات نظر سے گزرے سب میں مولانا حالی و علامہ شبلی کے انتقال پر ملال کا افسوس اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ دنیائے شاعری کے دو زبردست سخنور کم ہو گئے...... تعجب اس امر کا ہے کہ مرحومین میں جو کمالات حقیقی تھے ان کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتا......"

(صلائے عام، اپریل ۱۹۱۵ء)

نواب محسن الملک کی رحلت کے بعد مسلمانان ہندوستان کو اپنی قوم کے جن سرکردہ بزرگوں کے انتقال کا صدمہ اٹھانا پڑا ہے ان میں مشیر الدولہ، ممتاز الملک آنریبل خلیفہ سید محمد حسین صاحب سعد، ممبر کونسل پٹیالہ و نامور ٹرسٹی علی گڑھ کالج کا دنیا سے اٹھ جانا ایک ایسا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی محال ہے......"

(مخزن، جنوری ۱۹۰۸ء)

ابتدا ہم نے عرض کیا کہ اداریے ایک ایسا آئینہ خانہ ہیں جن میں علم و ادب کے مختلف خد و خال نظر آتے ہیں شروع میں موضوع اور مقصد دونوں اعتبار سے اداریوں کی کوئی واضح شکل نہیں تھی۔ اگر کوئی مقصد تھا تو صرف اتنا کہ مضامین، نظم و نثر کا تعارف کرا دیا جائے اور فنکار کی دلداری کی جائے لیکن زبان و ادب کوئی جامد اور غیر متحرک شئے نہیں ہے۔ اس کا عروج و زوال بھی نامیاتی اصولوں پر ہوتا ہے۔ نباتات اور حیوانات میں Law of Natural Selection اور Survival of the fittest کے اصول کام کرتے ہیں۔ ان کا اطلاق زبان و ادب پر بھی ہوتا ہے۔ ادب کے مقاصد، حقائق زندگی کے اظہار اور پیغام کی آفاقیت کے اعتبار سے ہر تخلیق کی ایک عمر ہوتی ہے۔ کمزور اور ناقص تحریریں معدوم ہوتی جاتی ہیں ان کی جگہ اعلیٰ و توانا تحریریں لے لیتی ہیں۔ زبان و ادب کا سفر اسی طرح آگے بڑھتا ہے اور پھر ایک نقطہ عروج پر آکر اپنا مقام کھو دیتا ہے۔ زبان نے جب ترقی کی تو اداریوں کا انداز بھی بدلا۔ ابتداء جو تحریریں صرف مضامین کی نشاندہی اور صاحب مضمون کی دلداریوں کے لئے استعمال ہوتی تھیں زبان و ادب کے عصری تقاضوں سے زیادہ قریب ہو گئیں۔ رسائل کی معاشی بدحالیاں تو پوری صدی کا قصہ ہیں۔ ان میں تو کوئی کمی نہیں آئی لیکن محرومی اور مایوسی کی لے بدل گئی۔ اداریہ نگاری کے موضوع اور مقصد دونوں میں تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہوئی۔ تحریروں میں جو لکنت اور سہل پسندی تھی ختم ہوئی۔ بہت سے موضوعات جو شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے اداریوں میں جگہ پانے لگے۔ مشمولات پر تنقیدی نگاہیں پڑنے لگیں۔ سیاست، مدنیت، مذہب تجارت غرض کہ علم و زبان کے علاوہ محرکات زندگی کے بہتیرے پہلو اداریوں میں شامل ہو گئے۔ اور اداریہ نویسی نے بتدریج ایک فن کی شکل اختیار کر لی۔ اداریوں میں زبان کی ادبی جمالیات پر توجہ ہوئی اور اداریہ اردو زبان کے ادبی تقاضوں کو پورا کرنے لگا۔

☆☆☆

[illegible] زبان کی ترقی اور ادب کے فروغ کے لئے [illegible] اور [illegible] کام کرتی [illegible] ان کی [illegible] کر دی [illegible] سے [illegible] ایک کے بارے میں سوالات [illegible] جاتی ہیں کیونکہ [illegible] فہرست میں شامل ہے۔

"ہمارے یہاں بار بار یہ بحث چلتی ہے کہ رسم الخط کون سا [illegible] کیا جائے مگر کبھی اصولی طور پر [illegible] اول تو بہت [illegible] یہ سوچا [illegible] ملک میں ایک رسم الخط ممکن بھی ہے کہ نہیں اور اگر ممکن ہے تو ترجیح کس خط کو دی جائے۔ دوم [illegible] مختلف صوبجات میں یہ بحث صوبوں کی حد تک محدود [illegible] ہے۔ ...... صوبہ جات متحدہ میں اردو ہندی کی بحث اصل میں اردو حروف اور ناگری حروف کی تکرار تھی اور آخر سرکار سے اس کا فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں پہلو بہ پہلو عدالتوں میں رواج پا گئیں...... ہمارے خیال سے چار چیزیں ہیں جو رسم الخط کو پرکھنے کے لئے کسوٹی کا کام دے سکتی ہیں:

١- کون سا خط ایسا ہے جو مختلف حصص ملک میں زیادہ تر مروج ہے۔

٢- کون سا خط ایسا ہے جو اپنے ذاتی صفات کے لحاظ سے قابل پذیرائی ہے۔

٣- کس خط کے اختیار کرنے میں باہمی خانہ جنگی کا خطرہ نسبتاً کم ہے۔

٤- کس خط کا اختیار کرنا توسیع تجارت اور بیرونی دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے زیادہ مفید ہے۔

جو چار معیار اوپر مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک فارسی رسم خط پر پورا اترتا ہے۔ فارسی رسم خط کو اختیار کرنے کی وجوہات مختصراً یہ ہیں:

١- یہ خط جس رفتار سے ترقی کر سکتا ہے رومن خط ملک میں اس رفتار سے نہیں پھیل سکتا۔

٢- رومن خط بہ وجوہ بالکل اجنبی ہونے کے بہت سی آوازوں کے ادا کرنے میں قاصر ہے۔ برعکس اس کے فارسی رسم خط اول ایشیائی الاصل ہے۔ دوئم صدیوں سے ہندوستان میں بود و باش رکھنے کی وجہ سے ہندوستانی ہو گیا ہے۔

٣- فارسی رسم خط کو سکھانے کے ذرائع دیہات وغیرہ میں اب تک میسر ہیں اور بغیر صرف کثیر کے حاصل ہیں۔

٤- فارسی حروف جاننے سے ہندوستان نہ صرف ممالک ایشیا، وسط ایشیا، ایران، شام عرب سے ایک مستقل تعلقات کی بنیاد رکھے گا بلکہ اس میں اگر ہمت ہو گی تو تمام شمالی افریقہ اور یوروپین ٹرکی تک اس کی تجارت اپنے پاؤں پھیلا سکے گی۔

ہم اپنے ملک کے فہمیدہ اصحاب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس بحث پر منصفانہ غور کر کے ایمانداری سے وہ رائے قائم کریں جن سے ان کے نزدیک ملک کی ترقی اور بہبودی مقصود ہو۔ ایڈیٹر" (مخزن، اکتوبر ١٩١٠ء)

"......کچھ عرصہ سے ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی الفاظ داخل کرنے کی خواہ مخواہ کوشش ہو رہی ہے۔ اور اس سے دونوں زبانوں کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آج کل نن کوآپریشن کے زمانہ میں اردو کے معزز رسائل اور اخبارات معمولی انگریزی الفاظ کو بھی بائیکاٹ کرنے کی فضول کوشش کر رہے ہیں......" (زمانہ، اپریل ١٩٢١ء)

"ہم ہندی اور اردو دونوں کے قدردان ہیں اور دونوں کی ترقی کے یکساں حامی ہیں اس لئے کسی مقابلے کے خیال سے نہیں بلکہ محض اظہار واقعات کے طور پر یہ

[illegible] کرنے [illegible] عاصم کو [illegible] [illegible] اور یا [illegible] کی [illegible] [illegible] ...... ایک [illegible] اس امر کے [illegible] قدر [illegible] اپنی قوم [illegible] ہیں...... [illegible] جس کے مطالعہ سے ہزاروں افراد قوم [illegible] لٹریچر میں مفید اضافہ ہوتا ہے اور جس سے [illegible] میں مصنف کی قوم کی نسبت اچھی رائے پیدا ہو سکتی ہے [illegible] باوجود گوشہ نشین ہونے کے اور باوجود اپنی بیماری [illegible] اور محسن قوم ہے...... عبدالقادر" ([illegible])

"اس وقت صرف پنجاب گورنمنٹ ہی دیسی زبانوں کی [illegible] کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ہر سال لائق مصنفوں کی [illegible] ہوتی ہے۔ سال گزشتہ میں منجملہ اور اصحاب کے منشی عبدالرحیم [illegible] منشی سورج نارائن مہر، منشی دیوی دیال صاحب کو چار چار سو روپے عطا ہوئے۔" (زمانہ، جنوری ١٩١٠ء)

"اس سال نوبل پرائز کا اعلیٰ ترین انعام بنگال کے مایہ ناز شاعر [illegible] ٹیگور کو دیا گیا ہے۔" (زمانہ، اکتوبر ١٩١٣ء)

"اعلیٰ حضرت حضور نظام علوم و فنون کی سرپرستی کرنا اپنا فرض خیال فرماتے ہیں۔ اردو زبان کی توسیع و ترقی میں لکھو کھا روپیہ صرف فرما چکے ہیں [illegible] آپ نے میور پریس دہلی کے مالک منشی بہاری [illegible] صاحب کو دس ہزار روپیہ عطا کیا [illegible]" (زمانہ، جنوری ١٩١٣ء)

"اعلیٰ حضرت نظام دکن نے از راہ علم پروری پنجاب کے مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کے 'مرقع دیوان غالب' کو اپنے نام سے منسوب کئے جانے کی اجازت دے دی ہے اور اس کی سو جلدیں خرید کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے [illegible] کی قیمت سو روپے فی جلد ہے۔ کاش آج غالب مرحوم زندہ ہوتے اور اپنے کلام کی قدردانی دیکھتے۔" ([illegible])

"[illegible] ١٩٢٨ء میں مندرجہ ذیل موضوعات پر اردو [illegible] دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے...... پریم چند کو یادگار ناول [illegible] ٥٠٠ روپے کا انعام ملا ہے۔ اردو میں [illegible] وقار الملک کو ملا ہے۔ نظم کی بہترین تصنیف مولانا [illegible] کو پانچ سو روپیہ کا انعام ملا ہے......" ([illegible])

"......حضرت [illegible] کی ادبی قدردانی کا تمام ملک میں [illegible] اعلیٰ حضرت نے قرآن شریف کے [illegible]

(زمانہ، ستمبر ۱۹۳۰ء) [illegible]

[illegible] کے لئے [illegible] تصانیف
[illegible] ہوا ہے کہ [illegible] کی اس قدر
[illegible] جس کے [illegible] اہل ادب کا

[illegible] کتابیں [illegible] تحریر کئے
[illegible] ادیب کی خدمت میں
[illegible] کی حاضری اور [illegible] حالات پر
[illegible] کرنے کی جو تمنا تھی اس کے مقررہ
[illegible]......"

(نگار، اگست ۱۹۲۷ء)

اس طرح کے اقتباسات سے رسائل بھرے ہیں۔ چند پر اکتفا کیا گیا۔ وفیات کی خبریں اور تعزیتی بیانات بھی اداریوں کا حصہ ہوتے تھے۔ چند خبریں اور تحریریں نمونے کے طور پر پیش کی جاتی ہیں:

"۱۹۲۷ء اپنی آخری گھڑیاں طے کر رہا تھا کہ شرر لکھنوی ہم سے جدا ہو گئے۔ اور [illegible] نے اپنے چہرے سے نقاب الٹا ہی تھا کہ شاد عظیم آبادی نے منہ موڑ لیا۔ ہر چند یہ حضرات اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے لیکن اس کا کیا علاج کہ ابھی ملک ان میں سے کسی کی جگہ کو پورا کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ اب خواہ ان کے فقدان پر کتنا بھی ماتم کیا جائے کتنی ہی یادگاریں قائم کی جائیں لیکن اب نہ کوئی دوسرا شرر پیدا ہو گا نہ شاد......"

(نگار، فروری ۱۹۲۷ء)

"یہ خبر غالباً رنج و افسوس سے سنی جائے گی کہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۶ء کو ابوالبیان سید حامد حسین بیدل شاہجہاں پوری دنیا سے ہمیشہ کے لئے بے تعلق ہو گئے۔"

(نگار، مارچ ۱۹۲۶ء)

"ہمارے دیرینہ مکرم منشی نوبت رائے نظر نے اپریل کے دوسرے ہفتے میں انتقال کیا۔ نظر ایک کہنہ مشق اور خوشگو شاعر تھے۔ ادیب و انشا پرداز بھی اور اخبار نویس بھی...... لکھنؤ میں نظر صاحب کے سوا کوئی دوسرا شخص ان حیثیات کا جامع نہیں تھا۔"

(الناظر، مئی ۱۹۲۳ء)

"مسٹر ایس خدا بخش مرحوم جن کا انتقال اگست ۱۹۳۱ء کے پہلے ہفتے میں ہوا ایک غیر معمولی انسان تھے...... سات سال متواتر آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۹ء میں ہندوستان واپس آئے اور ڈھاکہ میں بیرسٹری شروع کی۔ ۱۹۰۱ء میں کلکتہ چلے گئے...... آپ کی تصانیف میں سے بعض کے نام یہ ہیں: تاریخ تہذیب اسلام (۱۹۰۵ء)، ہندوستانی اور مسلم (۱۹۱۲ء)، مسلمانوں کی تاریخ (۱۹۱۴ء)، روایتیں اور کہاوتیں (۱۹۲۰ء)، عہد خلفا کی تہذیب (۱۹۲۰ء) سیاست اور اسلام (۱۹۲۰ء)، تحفۂ محبت (۱۹۲۳ء)، تہذیب عرب (۱۹۲۶ء)......"

(زمانہ، ستمبر ۱۹۳۱ء)

"افسوس ہے کہ ۱۶ جون ۱۹۳۳ء کو خان بہادر میر ناصر علی دہلوی کے انتقال پر ملک سے اردو کی بزم ادب سونی ہو گئی ہے۔ میر صاحب ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ سید عبدالغفور عہد مغلیہ میں قاضی القضاۃ تھے آپ کے جد امجد مولوی سید محمد علی بھوپال ریاست میں میر منشی اور میر صدیق علی خان وزیر اعظم بھوپال کے معتمد خاص تھے۔ آپ کے والد ماجد مولوی سید ناصر الدین کئی ضخیم کتابوں کے مصنف اور عمل و فضل میں یگانۂ روزگار تھے......"

(زمانہ، اکتوبر ۱۹۳۳ء)

"حضرت داغ، جناب امیر، تسلیم، جلال، مولانا آزاد، مولانا اشہری، ان بزرگوں کی رسم تعزیت ادا کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا...... اب تک جتنے اخبارات نظر سے گزرے جب میں مولانا حالی و علامہ شبلی کے انتقال پر ملال کا افسوس اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ دنیائے شاعری کے دو زبردست سخنور کم ہو گئے...... تعجب اس امر کا ہے کہ مرحومین میں جو کمالات حقیقی تھے ان کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتا......"

(صلائے عام، اپریل ۱۹۱۵ء)

نواب محسن الملک کی رحلت کے بعد مسلمانان ہندوستان کو اپنی قوم کے جن سر کردہ بزرگوں کے انتقال کا صدمہ اٹھانا پڑا ہے ان میں مشیر الدولہ، ممتاز الملک آنریبل خلیفہ سید محمد حسین صاحب سعد، ممبر کاؤنسل پٹیالہ و نامور ٹرسٹی علی گڑھ کالج کا دنیا سے اٹھ جانا ایک ایسا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی محال ہے......"

(مخزن، جنوری ۱۹۰۸ء)

ابتدا ہم نے عرض کیا کہ اداریے ایک ایسا آئینہ خانہ ہیں جن میں علم و ادب کے مختلف خدوخال نظر آتے ہیں شروع میں موضوع اور مقصد دونوں اعتبار سے اداریوں کی کوئی واضح شکل نہیں تھی۔ اگر کوئی مقصد تھا تو صرف اتنا کہ مضامین، نظم و نثر کا تعارف کرادیا جائے اور فنکار کی دلداری کی جائے لیکن زبان و ادب کوئی جامد اور غیر متحرک شے نہیں ہے۔ اس کا عروج و زوال بھی نامیاتی اصولوں پر ہوتا ہے۔ نباتات اور حیوانات میں Law of Natural Selection اور Survival of the fittest کے اصول کام کرتے ہیں۔ ان کا اطلاق زبان و ادب پر بھی ہوتا ہے۔ ادب کے مقاصد، حقائق زندگی کے اظہار اور پیغام کی آفاقیت کے اعتبار سے ہر تخلیق کی ایک عمر ہوتی ہے۔ کمزور اور ناقص تحریریں معدوم ہوتی جاتی ہیں ان کی جگہ اعلیٰ و توانا تحریریں لے لیتی ہیں۔ زبان و ادب کا سفر اسی طرح آگے بڑھتا ہے اور پھر ایک نقطہ عروج پر آکر اپنا مقام کھو دیتا ہے۔ زبان نے جب ترقی کی تو اداریوں کا انداز بھی بدلا۔ ابتداءً جو تحریریں صرف مضامین کی نشاندہی اور صاحب مضمون کی دلداریوں کے لئے استعمال ہوتی تھیں زبان و ادب کے عصری تقاضوں سے زیادہ قریب ہو گئیں۔ رسائل کی معاشی بدحالیاں تو پوری صدی کا قصہ ہیں۔ ان میں تو کوئی کمی نہیں آئی لیکن محرومی اور مایوسی کی لے بدل گئی۔ اداریہ نگاری کے موضوع اور مقصد دونوں میں تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہوئی۔ تحریروں میں جو لکنت اور سہل پسندی تھی ختم ہوئی۔ بہت سے موضوعات جو شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے اداریوں میں جگہ پانے لگے۔ مشمولات پر تنقیدی نگاہیں پڑنے لگیں۔ سیاست، مدنیت، مذہب تجارت غرض کہ علم و زبان کے علاوہ محرکات زندگی کے بیشتر پہلو اداریوں میں شامل ہو گئے۔ اور اداریہ نویسی نے بتدریج ایک فن کی شکل اختیار کرلی۔ اداریوں میں زبان کی ادبی جمالیات پر توجہ ہوئی اور اداریہ اردو زبان کے ادبی تقاضوں کو پورا کرنے لگا۔

☆☆☆

اس دور کے رسالوں میں زبان کی ترقی اور ادب کے فروغ کے لئے کئی انجمنیں اور تحریکیں کام کر رہی تھیں۔ اداریوں میں ان کی جدوجہد اور کارگزاریوں کا ذکر بڑی تفصیل سے ہوتا ہے۔ ہر ایک کے بارے میں موافق اور مخالف رائیں پائی جاتی ہیں کیونکہ ایسا ہونا انسانی جبلت میں شامل ہے۔

"ہمارے یہاں بار بار یہ بحث چلی ہے کہ رسم الخط کون سا اختیار کیا جائے مگر کبھی اصولی طور پر نہیں۔ اول تو بہت شاذ ہی یہ سوچا گیا کہ پورے ملک میں ایک رسم الخط ممکن بھی ہے کہ نہیں اور اگر ممکن ہے تو ترجیح کس خط کو دی جائے۔ دوم عموماً مختلف صوبجات میں یہ بحث صوبوں کی حد تک محدود رہی ہے...... صوبہ جات متحدہ میں اردو ہندی کی بحث اصل میں اردو حروف اور ناگری حروف کی تکرار تھی اور آخر سرکار سے اس کا فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں پہلو بہ پہلو عدالتوں میں رواج پائیں...... ہمارے خیال سے چار چیزیں ہیں جو رسم الخط کو پرکھنے کے لئے کسوٹی کا کام دے سکتی ہیں:

۱- کون ساخط، ایسا ہے جو مختلف حصص ملک میں زیادہ تر مروج ہے۔
۲- کون ساخط ایسا ہے جو اپنے ذاتی صفات کے لحاظ سے قابل پذیرائی ہے۔
۳- کس خط کے اختیار کرنے میں باہمی خانہ جنگی کا خطرہ نسبتاً کم ہے۔
۴- کس خط کا اختیار کرنا توسیع تجارت اور بیرونی دنیا سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے زیادہ مفید ہے۔

جو چار معیار اوپر مقرر کئے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک فارسی رسم خط پر پورا اترتا ہے۔ فارسی رسم خط کو اختیار کرنے کی وجوہات مختصراً یہ ہیں:

۱- یہ خط جس رفتار سے ترقی کر سکتا ہے رومن خط ملک میں اس رفتار سے نہیں پھیل سکتا۔
۲- رومن خط بہ وجوہ بالکل اجنبی ہونے کے بہت سی آوازوں کے ادا کرنے میں قاصر ہے۔ برعکس اس کے فارسی رسم خط اول ایشیائی الاصل ہے۔ دوئم صدیوں سے ہندوستان میں بود و باش رکھنے کی وجہ سے ہندوستانی ہو گیا ہے۔
۳- فارسی رسم خط کو سکھانے کے ذرائع دیہات وغیرہ میں اب تک میسر ہیں اور بغیر صرف کثیر کے حاصل ہیں۔
۴- فارسی حروف جاننے سے ہندوستان نہ صرف ممالک ایشیا، وسط ایشیا، ایران، شام عرب سے ایک مستقل تعلقات کی بنیاد رکھے گا بلکہ اس میں اگر ہمت ہوگی تو تمام شمالی افریقہ اور یوروپین ٹرکی تک اس کی تجارت اپنے پاؤں پھیلا سکے گی۔

ہم اپنے ملک کے فہمیدہ اصحاب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس بحث پر منصفانہ غور کر کے ایمانداری سے وہ رائے قائم کریں جن سے ان کے نزدیک ملک کی ترقی اور بہبودی متصور ہو۔ ایڈیٹر۔" (مخزن، اکتوبر ۱۹۱۰ء)

"...... کچھ عرصہ سے ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی الفاظ داخل کرنے کی خواہ مخواہ کوشش ہو رہی ہے۔ اور اس سے دونوں زبانوں کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آج کل نن کو آپریشن کے زمانہ میں اردو کے معزز رسائل اور اخبارات معمولی انگریزی الفاظ کو بھی بائیکاٹ کرنے کی فضول کوشش کر رہے ہیں......" (زمانہ، اپریل ۱۹۲۱ء)

"ہم ہندی اور اردو دونوں کے قدردان ہیں اور دونوں کی ترقی کے یکساں حامی ہیں اس لئے کسی مقابلے کے خیال سے نہیں بلکہ محض اظہار واقعات کے طور پر یہ عرض کرنے سے بعض نہیں رہ سکتے کہ اردو کی ترقی کی رفتار قائم رکھنے کے لئے اردو داں جماعت کو مزید سرگرمی سے کام لینا ہوگا......" (زمانہ، دسمبر ۱۹۲۱ء)

انعامات و اکرامات، ایثار و عطا اور زبان و ادب کے معاملے میں حکومتوں اور ریاستوں کی فیاضیوں کے اذکار بیشتر رسالوں کے اداریوں میں شامل ہوتے تھے۔ چند اقتباسات نذر ناظرین ہیں:

"......ایک زمانہ میں ہم لوگوں کو شکایت ہوتی تھی کہ ہمارے حکام وقت صرف اسی اعزاز کے قدرداں ہیں جو وہ خود ملک کے ممتاز اشخاص کو بخشیں اور ان عزتوں کی قدر نہیں کرتے جو خادمان ملک اپنی قوم سے خدمات قومی کے صلہ میں حاصل کرتے ہیں...... جو شخص اپنے کتب خانہ میں بیٹھ کر مدت العمر میں ایک ایسی کتاب لکھتا ہے جس کے مطالعہ سے ہزاروں افراد قوم مستفید ہوتے ہیں، جس سے ملک کے ذخیرہ لٹریچر میں مفید اضافہ ہوتا ہے اور جس سے کسی غیر ملک یا قوم کے پڑھنے والے کی نظر میں مصنف کی قوم کی نسبت اچھی رائے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہماری رائے میں وہ شخص باوجود گوشہ نشیں ہونے کے اور باوجود اپنی سادگی وضع ہونے کے ایک سچا خادم قوم اور محسن قوم ہے...... عبدالقادر۔" (مخزن، نومبر ۱۹۱۰ء)

"اس وقت صرف پنجاب گورنمنٹ ہی دیسی زبانوں کی خدمت گزاروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ہر سال لائق مصنفوں کی بیش قرار انعامات سے قدر افزائی ہوتی ہے۔ سال گزشتہ میں منجملہ اور اصحاب کے منشی عبدالرحمٰن صاحب سیاح۔ منشی سورج نارائن مہر، منشی دیوی دیال صاحب کو چار چار سو روپے عطا ہوئے۔"
(زمانہ، جنوری ۱۹۱۱ء)

"اس سال نوبل پرائز کا اعلیٰ ترین انعام بنگال کے مایہ ناز شاعر مسٹر ربندر ناتھ ٹیگور کو دیا گیا ہے۔" (زمانہ، اکتوبر ۱۹۱۳ء)

"اعلیٰ حضرت حضور نظام علوم وفنون کی سرپرستی کرنا اپنا فرض خیال فرماتے ہیں۔ اردو زبان کی توسیع و ترقی میں لکھوکھا روپیہ صرف فرما چکے ہیں۔ حال میں آپ نے میور پریس دہلی کے مالک منشی بہاری داس صاحب کو دس ہزار روپیہ عطا فرمایا۔"
(زمانہ، جنوری ۱۹۲۱ء)

"اعلیٰ حضرت نظام دکن نے از راہ علم پروری پنجاب سے مشہور مصور مسٹر عبدالرحمٰن چغتائی کے 'مرقع دیوان غالب' کو اپنے نام سے منسوب کئے جانے کی اجازت دے دی ہے اور اس کی سو جلدیں خرید کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ اس مرقع کی قیمت سو روپے فی جلد ہے۔ کاش آج غالب مرحوم زندہ ہوتے اور اپنے کلام کی قدردانی دیکھتے۔" (زمانہ، اکتوبر ۱۹۲۸ء)

"۲۹-۱۹۲۸ء میں مندرجہ ذیل موضوعات پر اردو اور ہندی کتابوں پر انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے...... پریم چند کو یادگار ناول 'رنگ بھومی' کی قدردانی میں ۵۰۰ روپے کا انعام ملا ہے۔ اردو میں یہ اعزاز نثر میں مصنف صاحب سوانح عمری نواب وقار الملک کو ملا ہے۔ نظم کی بہترین تصنیف مولانا صفی کی قرار دی گئی ہے چنانچہ آپ کو پانچ سو روپیہ کا انعام دیا گیا ہے......" (زمانہ، اکتوبر ۱۹۲۸ء)

"...... ہز ہائینس کی ادبی قدردانی کا تمام ملک میں بجا طور پر شہرہ ہے۔ حال میں اعلیٰ حضرت نے قرآن شریف کے گورمکھی ترجمے کے لئے پانچ ہزار روپیہ سکہ عثمانیہ

کا انتخاب کیا ہے......" (زمانہ، اگست ۱۹۳۱ء)

"دہلی کی ہندوستانی اکیڈمی نے سال رواں کے لئے ۵۰۰۰ روپیہ جدید تصانیف کے لئے منظور فرمایا ہے...... یہ بھی طے ہوا ہے کہ ہندو اور مسلم عہد کی ادبی تمدنی، اخلاقی سیاسی تاریخ پر دو کتابیں مرتب کرائی جائیں جس کے لئے کسی اہل ادیب کا انتخاب زیر غور ہے۔

ہندو نثر و نظم کے لئے دو بہترین کتابوں پر علیحدہ علیحدہ دو انعام تجویز کئے گئے ہیں اور سر تیج بہادر سپرو نے ایک ہزار روپیہ اپنی طرف سے اس ادیب کی خدمت میں پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے جو ہندوستان کے اسلامی عہد کی معاشرتی اور تمدنی حالت پر تین خطبے پڑھے۔ اکیڈمی بھی ایک ہزار روپیہ اس کو دے گی جو تین خطبے اس کے مقررہ موضوع پر دے گا......" (نگار، اگست ۱۹۲۷ء)

اس طرح کے اقتباسات سے رسائل پر ہیں۔ چند پر اکتفا کیا گیا۔ دفیات کی خبریں اور تعزیتی پیغامات بھی اداریوں کا حصہ ہوتے تھے۔ چند خبریں اور تحریریں ریکارڈ کے طور پر پیش کی جاتی ہیں:

"۱۹۲۶ء اپنی آخری گھڑیاں طے کر رہا تھا کہ شرر لکھنوی ہم سے جدا ہو گئے۔ اور ۱۹۲۷ء نے اپنے چہرے سے نقاب الٹا ہی تھا کہ شاد عظیم آبادی نے منہ موڑ لیا۔ ہر چند یہ حضرات اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے لیکن اس کا کیا علاج کہ ابھی ملک ان میں سے کسی کی جدائی گوارا کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ اب خواہ ان کے فقدان پر کتنا بھی ماتم کیا جائے کتنی ہی یادگاریں قائم کی جائیں لیکن اب نہ کوئی دوسرا شرر پیدا ہو گا نہ شاد......"

(نگار، فروری ۱۹۲۷ء)

"یہ خبر غالباً رنج و افسوس سے سنی جائے گی کہ ۲۴ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ابوالبیان سید حامد حسین بیدل شاہجہاں پوری دنیا سے ہمیشہ کے لئے بے تعلق ہو گئے۔"

(نگار، مارچ ۱۹۲۶ء)

"ہمارے دیرینہ مکرم منشی نوبت رائے نظر نے اپریل کے دوسرے ہفتے میں انتقال کیا۔ نظر ایک کہنہ مشق اور خوشگو شاعر تھے۔ ادیب و انشا پرداز بھی اور اخبار نویس بھی...... لکھنؤ میں نظر صاحب کے سوا کوئی دوسرا شخص ان حیثیات کا جامع نہیں تھا۔" (الناظر، مئی ۱۹۲۳ء)

"مسٹر ایس خدا بخش مرحوم جن کا انتقال اگست ۱۹۳۱ء کے پہلے ہفتے میں ہوا ایک غیر معمولی انسان تھے...... سات سال متواتر آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۸۹ء میں ہندوستان واپس آئے اور ڈھاکہ میں بیرسٹری شروع کی۔ ۱۹۰۱ء میں کلکتہ چلے گئے...... آپ کی تصانیف میں سے بعض کے نام یہ ہیں: تاریخ تہذیب اسلام (۱۹۰۵ء)، ہندوستانی اور مسلم (۱۹۱۲ء)، مسلمانوں کی تاریخ (۱۹۱۴ء)، روایتیں اور کہاوتیں (۱۹۱۶ء)، عہد خلفا کی تہذیب (۱۹۲۰ء) سیاست اور اسلام (۱۹۲۰ء)، تحفۂ محبت (۱۹۲۳ء)، تہذیب عرب (۱۹۲۶ء)......"

(زمانہ، ستمبر ۱۹۳۱ء)

"افسوس ہے کہ ۱۲ر جون ۱۹۳۳ء کو خان بہادر میر ناصر علی دہلوی کے انتقال پر ملال سے اردو کی بزم ادب سونی ہو گئی ہے۔ میر صاحب ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ سید عبدالغفور عہد مغلیہ میں قاضی القضاۃ تھے آپ کے جد امجد مولوی سید محمد علی بھوپالی ریزیڈنسی میں میر منشی اور میر صدیق علی خاں وزیر اعظم ناگپور کے معتمد اعلیٰ تھے۔ آپ کے والد ماجد مولوی سید ناصر الدین کئی ضخیم کتابوں کے مصنف اور علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے......"

(زمانہ، اکتوبر ۱۹۳۳ء)

"حضرت داغ، جناب امیر، کلیم جلال، مولانا آزاد، مولانا اشہری، ان بزرگوں کی رسم تعزیت ادا کرنے میں ہم نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا...... اب تک جتنے اخبارات نظر سے گزرے سب میں مولانا حالی و علامہ شبلی کے انتقال پر ملال کا افسوس اس لحاظ سے کیا گیا ہے کہ دنیائے شاعری کے دو زبردست سخنور کم ہو گئے ... تعجب اس امر کا ہے کہ مرحومین میں جو کمالات حقیقی تھے ان کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتا...."

(علائے عام، اپریل ۱۹۱۵ء)

نواب محسن الملک کی رحلت کے بعد مسلمانان ہندوستان کو اپنی قوم کے جن سرکردہ بزرگوں کے انتقال کا صدمہ اٹھانا پڑا ہے ان میں مشیر الدولہ، ممتاز الملک آنریبل خلیفہ سید محمد حسین صاحب سعد، ممبر کاؤنسل پٹیالہ و نامور ٹرسٹی علی گڑھ کالج کا دنیا سے اٹھ جانا ایک ایسا بڑا نقصان ہے جس کی تلافی محال ہے......"

(مخزن، جنوری ۱۹۰۸ء)

ابتدا ہم نے عرض کیا کہ اداریے ایک ایسا آئینہ خانہ ہیں جن میں علم و ادب کے مختلف خد و خال نظر آتے ہیں شروع میں موضوع اور مقصد دونوں اعتبار سے اداریوں کی کوئی واضح شکل نہیں تھی۔ اگر کوئی مقصد تھا تو صرف اتنا کہ مضامین، نظم و نثر کا تعارف کرا دیا جائے اور ذنکار کی دلداری کی جائے لیکن زبان و ادب کوئی جامد اور غیر متحرک شئے نہیں ہے۔ اس کا عروج و زوال بھی نامیاتی اصولوں پر ہوتا ہے۔ نباتات اور حیوانات میں Law of Natural Selection اور Survival of the fittest کے اصول کام کرتے ہیں۔ ان کا اطلاق زبان و ادب پر بھی ہوتا ہے۔ ادب کے مقاصد، حقائق زندگی کے اظہار اور پیغام کی آفاقیت کے اعتبار سے ہر تخلیق کی ایک عمر ہوتی ہے۔ کمزور اور ناقص تحریریں معدوم ہوتی جاتی ہیں ان کی جگہ اعلیٰ و توانا تحریریں لے لیتی ہیں۔ زبان و ادب کا سفر اسی طرح آگے بڑھتا ہے اور پھر ایک نقطہ عروج پر آکر اپنا مقام کھو دیتا ہے۔ زبان نے جب ترقی کی تو اداریوں کا انداز بھی بدلا۔ ابتداءً جو تحریریں صرف مضامین کی نشاندہی اور صاحب مضمون کی دلداریوں کے لئے استعمال ہوتی تھیں زبان و ادب کے عصری تقاضوں سے زیادہ قریب ہو گئیں۔ رسائل کی معاشی بدحالیاں تو پوری صدی کا قصہ ہیں۔ ان میں تو کوئی کمی نہیں آئی لیکن محرومی اور مایوسی کی لے بدل گئی۔ اداریہ نگاری کے موضوع اور مقصد دونوں میں تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہوئی۔ تحریروں میں جو لکنت اور سہل پسندی تھی ختم ہوئی۔ بہت سے موضوعات جو شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتے تھے اداریوں میں جگہ پانے لگے۔ مشمولات پر تنقیدی نگاہیں پڑنے لگیں۔ سیاست، مدنیت، مذہب تجارت غرض کہ علم و زبان کے علاوہ محرکات زندگی کے بہتیرے پہلو اداریوں میں شامل ہو گئے۔ اور اداریہ نویسی نے بتدریج ایک فن کی شکل اختیار کر لی۔ اداریوں میں زبان کی ادبی جمالیات پر توجہ ہوئی اور اداریہ اردو زبان کے ادبی تقاضوں کو پورا کرنے لگا۔

☆☆☆

یوسف ناظم

واہی کی غائبانہ ہمراہی میں

جو شاعر اپنی زندگی میں "انتقال کے بعد" کے عنوان پر ۶۴ مصرعوں کی مقفی نظم کہے اور سنجیدہ نہیں، ظریفانہ نظم کہہ ڈالے، اس کی شاعرانہ Cum ظریفانہ قادرالکلامی، زود گوئی اور اس کے ساتھ ساتھ واقعہ نگاری کا کون معترف نہ ہوگا۔ یہ ذکر ہے اپنے بزرگ اور محترم دوست مرحوم رضا نقوی واہی کا جنہیں اپنی مطبوعہ و مصدقہ تاریخ ولادت کے بارے میں شک و شبہ تھا۔ غالباً ۱۹۸۲ء یا اس کے لگ بھگ کسی سنہ عیسوی میں انہوں نے بقلم خود لکھا تھا کہ گو سرٹیفکیٹ کے حساب سے ان کی تاریخ ولادت یکم فروری ۱۹۱۵ء ہے لیکن بعض روایتوں کے مطابق وہ اس تاریخ سے قبل ہی عالم وجود میں آچکے تھے۔ ان کے اسی اعتراف کی روشنی میں میں نے انہیں واقعہ نگار کے لقب سے یاد کیا۔ یہی صورت حال مرحوم کی رحلت کے تعلق سے بھی نمودار ہوئی وہ یوں کہ "انتقال کے بعد" کی نظم انہوں نے اپنی رحلت سے بہت پہلے کہی اور اس میں بھی "واقعہ نگاری" کی عادت کو ترک نہیں کیا۔ کہا ہے:

دم نکلتے ہی چڑھا سب پر عقیدت کا بخار
قدرداں حضرات کو شاید یہی تھا انتظار
کردیا اس موت نے ثابت یہ ہم پر کم سے کم
زندگی سے موت بہتر ہے پئے اہل قلم
اہل فن کو موت سے ہرگز نہ ڈرنا چاہئے
بلکہ ممکن ہو تو کوشش کرکے مرنا چاہئے

ادیبوں اور شاعروں کی ایک عام (بلکہ غلط العام) شکایت کو مرحوم نے اپنے فن شعر گوئی میں اپنی مہارت سے ایک طویل نظم کو شوخی سے زیادہ شگفتگی اور خوش سلیقگی کا مظہر بنادیا۔ طنز کو ظرافت کے برقعے میں اس طرح چھپاکر کہ صرف پیشانی اور آنکھیں دکھائی دیں مرصع کاری نہ سہی، صناعی ضرور ہے اور رضا نقوی واہی اس کا اچھا درک رکھتے تھے۔ رضا نقوی واہی آخر آخر میں صاحب فراش ہوگئے تھے اور یوں کہنا چاہئے کہ ان کی عملی زندگی کا اختتام بہت پہلے ہوچکا تھا، کبر سنی اور طویل علالت نے انہیں ذوق کے الفاظ میں "غسل میت ہی ہمارا غسل صحت ہو تو ہو" کی نوبت پر پہنچادیا تھا۔ ان کے نام کی رعایت سے میں کہوں گا کہ یہی رضائے الٰہی تھی جس سے کسی کو بھی مفر نہیں ہے تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رضا نقوی واہی نے بھرپور زندگی گزاری اور اسی طرح بھرپور شاعری کی اور بفضلہٖ تعالیٰ اپنی زندگی سے اس مصرعے کی نفی کی:

آدمی بلبلہ ہے پانی کا

ان کی زندگی نقش بر آب نہیں تھی بلکہ اس شفاف اور سبک رو جھرنے کی طرح تھی جو کسی پہاڑی کے کھوہ سے نکل کر بہتا ہوا زمین کی طرف آتا ہے۔

ہمارے ادب میں ایک نظریہ یہ در آیا ہے کہ ادیب اور شاعر کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے کہ وہ بنیادی طور پر کیا تھا۔ نظم گو تھا یا غزل گو۔ میرا معروضہ یہ ہے کہ ادب میں 'بنیاد پرستی' نہیں ہوا کرتی۔ شاعر مجموعی طور پر شاعر ہوتا ہے خواہ وہ مثنوی کہے یا ماہیا۔ رباعی کہے یا ثلاثی۔ ہوا تو وہ شاعر ہی نا۔ (ہاں یہ شرط لازمی ہے کہ شاعر کو شاعر ہونا چاہئے) غزل نے حالی اور اقبال تک پہنچتے پہنچتے کتنے چولے بدل ڈالے اس لئے کیا یہ منصفانہ عمل نہ ہوگا کہ تنقید کو موشگافیوں سے بچلیا جائے۔ رضا نقوی واہی کا ذکر کرتے ہوئے بر سبیل تذکرہ، ظرافت کی ساخت، ہیئت اور ماہیت کا بھی تھوڑا بہت ذکر ہونا ہی چاہئے اس لئے میں یہاں بطور جملہ معترضہ یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ نثر میں تو الجھاؤ (Confusion) بہت ہے مثلاً انشائیہ، فکاہیہ، مزاحیہ وغیرہ کے الفاظ لیکن شکر ہے کہ شاعری میں یہ الجھاؤ پیدا نہیں کیا جاسکا۔ اس لئے شاعر یا تو ظریفانہ کلام کہتا ہے یا سنجیدہ۔ اب اس تقسیم کے بعد قاری اور نقاد جتنی چاہیں ذیلی قسمیں قائم کرلیں شاعر شاعر ہی رہے گا اور ظریفانہ شاعری نہ تو فکاہیہ گوئی ہوتی ہے نہ انشائیہ نویسی۔ اپنے اس نقطہ نظر کو زیادہ پھیلانے کی اس تحریر میں گنجائش نہیں ہے اس لئے یہ فنی اور زیادہ مناسب الفاظ میں غیر ضروری "نکتہ سنجی" کسی اور موقعہ پر۔ فی الوقت صرف رضا نقوی واہی کے تعلق سے جو اپنے وقت کے یعنی عہد شباب میں بلکہ کہولت کے دنوں میں بھی مقبول اور پسندیدہ شاعر تھے، چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ اس بیان میں نہ تو کوئی ناقدانہ عناصر ہیں نہ قصیدہ گوئی کے معائب۔ یہ ایک دوست کا جو ان کا قاری اور سامع رہا ہے، ایک تاثر ہے جو مفروضہ بھی ہے اور معروضہ بھی۔ (مفروضہ زیادہ)

رضا نقوی واہی نے بہت ممکن ہے مشاعرے نہ لوٹے ہوں، بہت ممکن ہے کہ

۱۹۔الہلال، ۱۳اباندرہ ریکلیمیشن، باندرہ ویسٹ، ممبئی۔ ۴۰۰۰۵۰

(Crowd Puller) شاعرانہ واقع ہوں لیکن ظریفانہ شاعری میں ان کی ایک الگ اور مخصوص بلکہ بڑی حد تک منفرد حیثیت تھی۔ شاعری کے قارئین کی اس شکایت کو کہ ان کا معیار ٹھیک رہتا تھا اور لوگوں کی زبان پر نہیں چڑھتا تھا، شاعری اور بالخصوص مزاحیہ شاعری کو جانچنے کا پیمانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ ستم ظریفی یہی ہے کہ اس پیمانے کو صرف شاعری میں ہی استعمال لایا جاتا ہے۔ نثر نگاروں کے بارے میں کوئی یہ نہیں کہتا کہ فلاں انشاپرداز کے جملے ہماری زبان پر نہیں چڑھتے۔ (نثر نگاروں کو شکر گزار ہونا چاہئے) خاکسار بہرحال اس نظریے کا حامی ہے کہ بیشتر شاعروں یعنی سنجیدہ اور ثقہ شاعروں کے بارے میں ایک عام رائے یہ ہوتی ہے کہ ان کا کلام تو پڑھنے کے لئے ہوتا ہے اور یہ رائے اس لحاظ سے صحیح ہے کہ ادب ہے ہی پڑھنے کی چیز۔ ورنہ سننا ہے تو لوگ، لوک گیت بھی سنتے ہیں اور موسیقی کے نام پر واویلا سننے میں بھی انہیں تامل نہیں ہوتا۔ خاکسار شاعروں میں سنائی جانے والی شاعری کی ہرگز ہرگز تحقیر کا مجرم نہیں بننا چاہتا۔ مشاعروں میں بھی کامیاب بلکہ بہت زیادہ کامیاب شاعری ہوئی ہے اور ایک ہی شاعر کے کلام سے لوگ تادیر محظوظ اور مستفید ہوتے رہے ہیں۔ میں شاید اپنے موضوع سے ایک پیشہ ور مقرر کی طرح دور ہٹتا جارہا ہوں اس لئے اس جھمیلے سے (جو خود میرا چھیڑا ہوا ہے) گریز کرتے ہوئے کیونکہ یہ رضا نقوی واہی کی نظمیہ شاعری کو ظریفانہ شاعری میں ایک اضافہ ہے اور طول طویل نظموں میں ظرافت کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے نظم کو مطلع سے مقطع تک ایک توخوشگوار اور انبساط انگیز توازن کے ساتھ پہنچانے کا جو مرحلہ ہے وہ صرف نظم کا نہیں نظم وضبط کا معاملہ ہے۔ اردو میں 'طنز ومزاح' کی ترکیب رائج اسی لئے ہوئی کہ طنز کو مزاح کس طرح بنایا جائے جب کہ انگریزی میں سٹائر (Satire) اور ہیومر (Humour) کی ترکیب رائج نہیں ہوسکی۔ انگریز صرف وٹ (Wit) اور ہیومر کے قائل رہے ہیں ان کے یہاں سٹائر ایک الگ ہی ڈش ہے جو مٹھاس کے عنصر سے مبرا ہے۔ اردو میں 'طنز ومزاح' جو ترکیب ہے رضا نقوی واہی اس مرکب شاعری کے ماہرین میں سے ایک ہیں۔ ان کی شاعری مطالبہ کرتی ہے کہ انہیں صبر وسکون سے پڑھا جائے۔ (صبر کے لفظ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ خاکسار نے ان کی شاعری کو صبر آزما شاعری کہا ہے) سکون کے لفظ پر زیادہ زور دیجئے۔ ان کی ظریفانہ نظموں میں صرف مطلع ہی بیت الغزل نہیں ہوتا، اشعار کے اشعار حسن مطلع ہوتے ہیں۔ (قافیہ اور ردیف سے قطع نظر) مزاح گو شاعروں میں میں انہیں اگر مثنوی گو شاعر کہوں تو نمک کے برابر مبالغے کے ساتھ یہ بات اس لئے صحیح ہوگی کہ ظریفانہ شاعری میں طویل نظمیں کہی کس نے ہیں۔ (ضمیر جعفری سے قطع نظر)

مانا کہ ظرافت کا حسن اختصار میں ہے لیکن صرف حسن کی خاطر، ظرافت جیسی نادر اور کمیاب نعمت سے محروم ہوجانا، بڑی حد تک کفران نعمت ہے اور خوشی اس بات کی ہے کہ مرحوم سے کفران نعمت کی شرعی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ مجھے تو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہے کہ انہوں نے 'ظریفانہ نظم گوئی' کی باضابطہ تربیت کی ہے اور اسے چھوٹے سے بڑا کیا ہے جیسے اچھے والدین اپنے بچوں کے ساتھ کیا کرتے اور خوش ہوتے ہیں۔ ان کی نظمیں اسی تربیت کی پروردہ ہیں۔ وہ طنز کی روایتی تلخی کو ذائقہ دار بنانے کا گر جانتے تھے۔ ان کی نظموں کے عنوانات، بالعموم سیاسی اور سماجی ہوتے تھے اور عنوان پڑھتے ہی ان کے قاری سمجھ جاتے تھے کہ ان کا ہدف کیا کام ہے۔

معرکہ 'جہیز وذین مہر' ۷۲ اشعار پر مشتمل نظم ہے، شادی کی دلہنیز پار کرنے والے نوشہ کے والد ماجد کا تذکرہ کرنے کے لئے جو الفاظ چنے وہ یہ ہیں:

بیٹے کو چیک سمجھ لیا اسٹیٹ بینک کا
سمدھی تلاش کرنے لگے ہائی رینک کا

اور اس کے بعد کی روداد

ایجاب وقبول کا وقت آیا جب مگر
نوشہ میاں اکڑ گئے، شرعی نکاح پر
فرمایا دَین مہر کروں گا وہی قبول
جس پر ہوا تھا عقد جگر گوشۂ رسول

(کہئے سبحان اللہ)

براتیوں کی یہ حکایت ہمارے لئے شیریں تو ہے لیکن ان کے لئے صرف دراز ہے اور واہی اس نظم میں حریص والدین کی حوصلہ افزائی کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ مروت اور مدارا کے آدمی ہیں۔ اس لئے کہا ہے:

نور نظر کو مال تجارت بنایئے
لیکن زباں پہ نام شریعت نہ لایئے

جی تو چاہتا ہے کہ ان کی نظم "خدمت ادب" کے چند اشعار بھی یہاں پیش کروں لیکن ڈرتا ہوں کہ اس "نقل نویسی" کی وجہ سے سیدھا سادا مضمون اقتباسی یا اکتسابی شکل اختیار کرکے کہیں "ریسرچ" کی شق میں نہ چلا جائے۔ شاعری کی اس نظم میں روانی اور سلاست تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو واہی کی شاعری کی خصوصیت ہے، شاعرانہ فن کاری اور ظریفانہ شوخی اپنی تہہ داری کے ساتھ بلندی پر ہے۔ رضا نقوی واہی کردار نگاری کا وہ حق ادا کرتے ہیں جو روایتی طور پر اصل میں نثر نگاروں کا حصہ ہے۔ اس طرز کو انہوں نے بہ وجوہ خوبصورتی کے ساتھ بنایا ہے۔ انہوں نے 'اقتباساتی' ادب' کو 'حوالاتی' ادب کے لقب سے نوازا ہے۔ اب اسے آپ ایجاد کہئے یا ایجاز۔ دونوں صحیح ہیں۔ 'خدمت ادب' کی نظم کا مقطع سن لیجئے۔ نظم کھل کر سامنے آجائے گی۔ کہا ہے:

چھ مہینے سال بھر میں یوں چمک جائے گا نام
آپ کو حسرت سے دیکھیں گے سرور واحتشام

رضا نقوی واہی کی شعر گوئی کی عمر کوئی ۶۰۔۷۰ سال تو یقینی ہوگی لیکن ان کی شاعری میں نصف النہار کی کیفیت آخر تک خیاباں خیاباں، کی طرح جلوہ گر رہی۔ اس خیابانی کیفیت میں کسی محبوب کا نقش قدم کار فرما نہیں ہے صرف شاعر کا نقش قلم جگمگا رہا ہے۔ شعر گوئی کی اس ۶۰۔۷۰ میل کی طویل دوڑ میں شاعر کے قدم لڑکھڑائے نہیں اور نہ سانس پھولی۔ یہ بجائے خود ایک خوبصورت خوبی ہے۔ ان کی

شاعری کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ شاعر نے 'پرہیزی' شاعری کو اپنا وطیرہ بنایا اور 'ابتذال' سے بالکل پرہیز کیا ہے۔ شاعر کو اوپری منزل سے کئی سیڑھیاں نیچے اتار دیتی ہے اور یہ سانحہ ہمارے بزرگوں اور اساتذہ کے ساتھ بھی بکثرت ہوا ہے بلکہ ایک وقت تو شاعری پر 'سائے کی طرح' یوں پڑ گیا تھا کہ ابتذال کی شاعری تقریباً لازمی مضمون کی شکل اختیار کر گئی تھی اور ظریفانہ شاعری میں تو اسے سرخاب کے پر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ رضا نقوی واہی پتہ نہیں کیسے اپنا دامن بچا کر صاف نکل گئے۔ ورنہ شاعری کبھی گلشن بے خار نہیں رہی۔ شاعروں کے کلام کے انتخاب بھی ہمارے یہاں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ چنندہ شعر شاعر کی شناخت ہوتے ہیں لیکن انتخاب کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ باقی کی تمام شاعری ناقابل اعتنا ہے۔ رضا نقوی واہی کی شاعری کا انتخاب شائع نہیں ہوا لیکن اس کا قصوروار واہی نہیں ہیں۔ 'انتقال کے بعد' کی نظم میں اس کے اشارے ملتے ہیں لیکن ان اشاروں کا اشارہ کسی اور کی طرف ہے۔ رضا نقوی واہی کی حد تک میں سمجھتا ہوں انہیں بجا طور پر کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

ظریفانہ شاعری، ایک کٹھن اور جان لیوا مشغلہ ہے۔ اس میں چمک دمک (گلیمر) بہت ہے اور بیسیوں شاعر ظریفانہ شاعری سے اپنا رشتہ ازدواج قائم کرنے کے متمنی رہتے ہیں۔ یہ رشتہ اگر طے بھی ہو جائے تو اکثر صورتوں میں پائیدار اور استوار نہیں ہوتا۔ ظریفانہ شاعری، شگفتگی، تہذیب، شائستگی اور شوخی اور کچھ کچھ شرافت کا مجموعہ ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بزرگ شاعر، نام جن کا رضا نقوی تھا اور تخلص واہی، نے بہ حیثیت مجموعی پوری دیانت داری کے ساتھ طنز و مزاح گوئی کا حق ادا کیا ہے۔ رہن سہن میں وہ نہایت سنجیدہ اور متین آدمی تھے لیکن ان کی شاعری کا کوئی مجموعہ کھول کر دیکھئے وہ اصل میں کیا تھے ظاہر ہو جائے گا۔

☆☆

ایک پرانی نظم

رضا نقوی واہی (مرحوم)

انتقال کے بعد

آخرش دنیا سے واہی کا ہوا جب انتقال
اس کے گھر والوں پہ کیا گزری نہ پوچھو اس کا حال

یہ خبر جب حلقہ ہائے شہر میں پھیلی تمام
اس کے گھر پر ہوگیا اہل ادب کا اژدہام

چند اک احباب کے چندے سے جب آیا کفن
غسلِ میت دے کے تب ڈھانپا گیا اس کا بدن

ایک شاعر اشکباری جن کی گوہر بار تھی
لاش ابھی اٹھی نہ تھی، نظم ان کی اک تیار تھی

قطعہ تاریخ اک شاعر نے برجستہ کہا
نام سے مرحوم کے نکلا تھا پورا مادّہ

ریڈیو نے نشر کی جب یہ خبر چوپال سے
تعزیت کے تار آئے، سندھ سے، بنگال سے

انجمن میں تعزیت کا ایک جلسہ بھی ہوا
جا بجا مرحوم کی سیرت کا چرچہ بھی ہوا

ماہناموں نے نکالے خاص نمبر خوب خوب
تھا یہ رونا ہوگیا سورج ظرافت کا غروب

بعد مردن حق بچارے کا ادا ہونے لگا
اس کے فن پر ناقدوں کا تبصرہ ہونے لگا

ایک ناقد نے یہاں تک بڑھ کے لکھا جوش میں
اس کا فن اکبر سے بالاتر تھا تن میں توش میں

اک محقق گھر پہ اس کے رات دن جانے لگے
اس کے اجڑے گھر کی تصویریں اتروانے لگے

اس کی تحریروں کا متن و حاشیہ دیکھا کئے
اس کی نظموں کا ردیف و قافیہ دیکھا کئے

کاوشِ تحقیق سے ان کی برا تھا سب کا حال
کرتے پھرتے تھے محلے میں یہ اک اک سے سوال

کون سا روغن کیا کرتا تھا استعمال وہ
بھات کھاتا تھا کہ دونوں وقت روٹی دال وہ

نوٹ بک میں اس کی جو کاغذ ہے کتنے دن کا ہے
جس قلم سے رات دن لکھتا تھا وہ کس سن کا ہے

ایک لیڈر نے بنائی اک کمیٹی شاندار
اس میں طے پایا کہ قائم ہو اک ایسی یادگار

جس سے نامِ حضرتِ واہی سدا قائم رہے
گلشن طنز و ظرافت کی ہوا قائم رہے

اور جاری ہوگیا چندوں کا پھر تو کاروبار
خوب چمکا پیٹ کے بندوں کا پھر تو کاروبار

بمبئی سے اور دلی سے کئی اک پبلشر
اڑ کے طیاروں پہ آئے اور پہنچے اس کے گھر

اس کے مجموعوں کے حق میں ملکیت کے واسطے
اپنے نقصاں اور اس کی منفعت کے واسطے

کچھ حقوق اپنے جتائے کچھ دلیلیں پیش کیں
الغرض سب نے ہزاروں ہی سبیلیں پیش کیں

تھا الیکشن کا زمانہ اس لئے سرکار کی
مرنے والے پہ نظر جانے لگی کچھ پیار کی

ہوگئی تھوڑی سی تبدیلی مروّج رول میں
اس کے دو بچے فری پڑھنے لگے اسکول میں

الغرض اک موت سے پیدا ہوئی وہ زندگی
مشغل شعر و ادب کی بڑھ گئی تابندگی

روحِ واہی دیکھتی تھی دور سے یہ انقلاب
اس کی حیرت بن رہی تھی اک سوالِ بے جواب

زندگی بھر کوئی جس کا پوچھنے والا نہ تھا
جس کے فن کا جام پی کر کوئی متوالا نہ تھا

صبح سے تا شام جو اپنا قلم گھستا رہا
رات دن حالات کی چکی میں جو پستا رہا

ناقدوں نے مڑ کے بھی جس کی طرف دیکھا نہیں
جس کے ماتھے کا پسینہ وقت نے پونچھا نہیں

آنسوؤں کی آج برکھا ہے اسی کے نام پر
آفریں صد آفریں اس شفقت ایام پر

دم نکلتے ہی چڑھا سب پر عقیدت کا بخار
قدر داں حضرات کو شاید یہی تھا انتظار

کردیا اس موت نے ثابت یہ ہم پر کم سے کم
زندگی سے موت بہتر ہے، بچے اہل قلم

اہل فن کو موت سے ہرگز نہ ڈرنا چاہئے
بلکہ ممکن ہو تو کوشش کرکے مرنا چاہئے

پی پی سریو استو رند

ایک مجاہدۂ آزادی

کانپور کی رقاصہ عزیزن

لوگ چاہے کسی عظیم شخصیت کو فراموش کر دیں مگر تاریخ کے اوراق اسے اپنے دامن میں ہمیشہ پناہ دیتے رہتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی ایسے نام سامنے ضرور آجاتے ہیں جنہیں اس حد تک نظرانداز کیا گیا کہ لوگ عام طور پر ان سے واقف نہیں رہے۔ جنگ آزادی کے اوراق میں اس قسم کا ایک نام ملتا ہے ایک عظیم مجاہدۂ آزادی کا—— کانپور (اتر پردیش) کی حسین و جمیل اور اس وقت کی مقبول ترین رقاصہ عزیزن کا—— یہ ان کی بدقسمتی یا قوم کی بے حسی ہے کہ جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والی جری خواتین، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، اودھ کی بیگم حضرت محل اور دہلی کی زینت محل کی طرح ان کے مجاہدانہ کارناموں سے ہر خاص و عام واقف نہیں ہو سکا۔ اس مجاہدہ کی حب الوطنی، جذبۂ ایثار اور جدوجہد آزادی کے کارناموں پر پردہ پڑا رہا۔ مادرِ وطن سے غلامی کا طوق اتار پھینکنے کا عزم رکھنے والوں کی صف میں وہ کس مقام پر تھیں اور انہوں نے کیا کارہائے نمایاں انجام دئے یہ منظر عام پر نہیں آسکے۔

تحقیق سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ عزیزن کانپور (یوپی) میں رقص کی محفلیں آراستہ کیا کرتی تھیں۔ وہ کانپور کے نزدیک قصبہ بٹھور کی رہنے والی تھیں، جو اس وقت پیشواؤں کا مرکز تھا۔ کانپور میں بغاوت کے بعد کرنل ولیم نے عزیزن کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ کانپور کے محلہ لو کی محال میں رہتی تھیں اور ان پر سیٹھ کلومل کی خاص عنایت تھی۔

سچی دیش بھکت جری خاتون اور انتہائی حوصلہ مند عورت عزیزن کی زندگی میں جھانکنے پر پتہ چلتا ہے کہ ان کے سامنے بھی مادر وطن ہندوستان کو برٹش سامراج سے آزاد کرانے کا نیک مقصد تھا۔ جسے پورا کرنے کے لئے انہوں نے نہ صرف آخری سانس تک جدوجہد کی بلکہ کسی قسم کا کوئی سمجھوتہ بھی نہیں کیا۔

جون ۱۸۵۷ء کو کانپور کے پیشوا نانا صاحب نے ایک تاریخی اعلان جاری کیا کہ تمام ہندو اور مسلمان برٹش حکمرانوں کے بڑھتے مظالم کے خلاف سینہ سپر ہو جائیں اور اپنی تحریک اس وقت تک جاری رکھیں جب تک ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل نہ ہو جائے۔ یہ تاریخی اعلان ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوا۔ رقاصہ عزیزن اس اعلان سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ عیش و آرام کی زندگی تج کر ایک سچی محبِ وطن کی طرح آزادی کی جنگ میں کود پڑیں۔ جنگ آزادی کے نقارے کی آواز سن کر وہ خود کو گھر کی چہار دیواری میں بند نہ رکھ سکیں۔ وہ یہ عہد کر کے اٹھیں کہ برٹش سامراجیوں کو ملک کی پاک سرزمین سے نکالے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ اس پاک جذبہ کو دل میں لئے عزیزن نانا صاحب کی فوج کے لئے عورتوں کو بھرتی کرنے کا اہم کام انجام دینے لگیں۔ انہوں نے پرکشش اور قیمتی لباس کی جگہ فوجی وردی پہن لی۔ زیورات کی جگہ اسلحہ اور ناز و انداز کی جگہ تلوار اٹھالی۔ انہوں نے نہ صرف عورتوں میں مجاہدانہ جذبہ پیدا کیا بلکہ انہیں گھوڑ سواری بھی سکھائی اور اسلحہ چلانے کی تربیت بھی دی۔ اس طرح عورتوں کو فوجی روپ میں ڈھالنے کا تمام تر سہرا بھی عزیزن کے ہی سر ہے۔ ان کی قیادت میں قائم خواتین کی بریگیڈ نے کئی کارہائے نمایاں انجام دئے۔ اس بریگیڈ کا کام خاص طور پر زخمی فوجی مجاہدین کو فوری طبی امداد فراہم کرانا بھی تھا۔ ان کے لئے کپڑے، اشیائے خوردنی اور گولہ بارود مہیا کرنا جیسا مشکل کام بھی اسی بریگیڈ نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ اس بریگیڈ کے ذمہ ایک اور انتہائی اہم کام بھی تھا کہ جنگ کی تمام تر معلومات ان مجاہدین آزادی تک لے جائیں جو روپوش ہو گئے تھے اور جنگ آزادی میں سرگرم عمل تھے۔

عزیزن جون ۱۸۵۷ء کی جھلسا دینے والی دھوپ اور تپتی ہوئی دوپہر میں انگریزوں کی پرواکئے بغیر محبِ وطن فوجیوں کے لئے گھر گھر جاکر پھل، دودھ، میوہ، گھی اور مٹھائیاں وغیرہ اکٹھا کیا کرتی تھیں اور پھر جان پر کھیل کر ان تک پہنچاتی تھیں۔

عزیزن کی قائم کردہ یہ بریگیڈ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے پر لوگوں کتنا؟ کے لئے ایک خاص ذہن بنانے کا کام کرتی تھی۔ جو نوجوان اور بزرگ برئی کے خوف سے تحریک آزادی میں حصہ لینے سے کتراتے تھے انہیں ایک کے ساتھ "چوڑیاں" بھیجی جاتی تھیں--- بزدل نوجوانوں اور منہ چھپاکر بیٹھے ہوئے لوگوں پر اس حربے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ان کے دلوں میں ایک ایس ولولہ پیدا ہوا کہ وہ بھی ہر قسم کی قربانی دینے کا عزم دل میں لئے گھروں سے پڑے اور نانا صاحب کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔

عزیزن کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ننگی تلوار ہاتھ میں لئے گھوڑے پر سو ہو کر جب بٹھور کی سڑکوں پر نکلتی تھیں تو قصبہ کی فضا "عزیزن کی جے" کے نعر سے گونجنے لگتی تھی۔ عزیزن نہ صرف نانا صاحب کے فوجی دستے سے اپنا قائم رکھتی تھیں بلکہ اسے ہر قسم کی مدد پہنچانے کے لئے بھی بے تاب ر—— یہی وجہ تھی کہ صرف نانا صاحب ہی نہیں ان کے معتمد خاص بھی عزیز(——

آر ۱۶، سیکٹر xi، نوئیڈا۔ ۲۰۱۳۰۱

اعتماد رکھتے تھے اور ان کے جذبہ حب الوطنی، ایثار اور قربانی کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس عہد کے ایک نامور قلم کار نے لکھا ہے کہ ---"عزیزن آزادیٔ وطن کے جذبہ سے اس قدر سرشار تھیں کہ ہر وقت فوجی وردی پہنے رہتی تھیں۔ اپنے فوجی ساتھیوں سے برابر رابطہ قائم رکھتی تھیں۔ ان کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا--- ملک کی آزادی---مادرِ وطن کا برٹش سامراج کے مظالم سے چھٹکارا۔"

۱۸۵۷ء میں آزادی کی پہلی جنگ ناکام ہوئی تو برطانوی حکمرانوں پر بدلہ لینے کا جنون سوار ہوا۔ دوسرے مجاہدین کے ساتھ عزیزن کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور انہیں جنرل ہیولاک کے سامنے پیش کیا گیا۔ جنرل ہیولاک عزیزن کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اتنی حسین، اتنی خوبصورت اور اتنی نازک عورت فوجی وردی پہن کر جنگی ساز و سامان اور اسلحوں کا استعمال بھی کرسکتی ہے۔ جنرل ہیولاک عزیزن کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوا کہ خود اس نے عزیزن کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنا جرم قبول کرلے اور زندگی کی بھیک مانگ لے کیونکہ ان کی رہائی کا صرف یہی طریقہ ہوسکتا تھا مگر مجاہدۂ آزادی عزیزن نے اس بار بھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ اور انہوں نے انتہائی بے رخی کے ساتھ جنرل ہیولاک کی تجویز ٹھکرادی۔

ہیولاک کی تجویز پر عزیزن کا چہرہ غصے سے تمتما گیا، آنکھوں سے نفرت کی چنگاری پھوٹنے لگیں، پھول کی پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹ کانپنے لگے۔ انہوں نے انتہائی حوصلے اور استقلال سے کہا۔ "ہم رحم کی بھیک مانگنے پر موت کو فوقیت دینا بہتر سمجھتے ہیں" جنرل ہیولاک چونکہ عزیزن کے حسن میں کھویا ہوا تھا اس لئے وہ عزیزن کے اس جملہ پر زیادہ برہم نہیں ہوا۔ اس نے غصے پر قابو کرتے ہوئے پیار کے انداز میں کہا---"آخر تم چاہتی کیا ہو---"

"برٹش سامراج کا خاتمہ---اور آزاد ہندوستان" مجاہدہ آزادی عزیزن نے نعرے سے سر بلند کرتے ہوئے جواب دیا تو جنرل ہیولاک آگ بگولہ ہوکر---"اسے گولیوں سے اڑادو" چیخ پڑا۔

خوبصورت، نازک، حسین مگر بے انتہا جری، محب وطن، دلیر مجاہدہ کے چہرے پر اس حکم سے ایک شکن بھی نہیں ابھری۔ ان کے سینے پر پہلی گولی لگتے ہی زبان پر نعرہ گونج اٹھا---"ناناصاحب کی جے، آزاد ہندوستان کی جے"---"برٹش سامراج کا ناش ہو"---اور پھر ایک کے بعد دوسری گولیوں نے عظیم مجاہدہ عزیزن کے پھول جیسے جسم کو چھلنی کردیا مگر اس کے ہونٹ آخری سانس تک کہتے رہے---"بھارت ماتا کی جے---ناناصاحب کی جے۔" اس دیار فانی سے کوچ کرجانے کے بعد بھی عزیزن کے چہرے پر ایک لافانی مسکراہٹ تھی۔ ایسی مسکراہٹ جو جنرل ہیولاک کے دل کے لئے نشتر کا کام کررہی تھی۔ وہ گھبراہٹ میں اٹھ کر چلا گیا۔ جیسے عزیزن چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو---"اے برطانوی سامراجیو تم ہمیں زیادہ دنوں تک غلام نہیں رکھ سکو گے۔ بہت جلد یہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ عزیزن اور ان جیسے ہزاروں مجاہدین، آزادی کی جنگ میں شہید ہوکر امر ہوچکے ہیں۔ انہیں چاہے وقتی طور پر فراموش کردیا جائے مگر تاریخ کے اوراق جب بھی گردانے جائیں گے ان کی قربانیاں، ایثار اور جذبہ حب الوطنی کا ہمیں اعتراف کرنا ہوگا۔

☆☆

وفیات

اردو کے بزرگ نقاد، ماہر تعلیم، شاعر اور ادیب پدم بھوشن پروفیسر **آل احمد سرور** کا ۹/ فروری ۲۰۰۲ء کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ تدفین علی گڑھ میں ہوئی۔ ان کی عمر ۹۰ برس کی تھی۔

سرور صاحب کے ساتھ اردو ادب میں تنقید و تحقیق کا پورا ایک دور ختم ہوگیا۔ پروفیسر سرور ان معتبر ہستیوں میں سے تھے جن کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو پہچانا جاتا ہے۔

پروفیسر سرور ۹/ ستمبر ۱۹۱۲ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پیلی بھیت، غازی پور اور آگرہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اکتوبر ۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ اور جیسیوں انگریزی کے اور ۱۹۳۶ء میں اردو کے لکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۰ء سے وہ مسلم ازدواج قا شعبہ اردو میں پروفیسر ایمریٹس کے عہدے پر فائز تھے۔

اگر طے فیسر سرور نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "سلسبیل" اور استے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ان کی اہم تصانیف میں "نئے اور پرانے چراغ، تنقید کیا تہذ دب اور نظریہ، مسرت سے بصیرت تک، عرفان اقبال، اقبال اور ان کا فلسفہ، اقبال ییہ اور شاعری، جدید دنیا میں اسلام اور اردو میں دانشوری کی روایت" شامل ہیں۔ ان کی پ بیتی "خواب باقی ہیں" ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ آل احمد سرور اردو صحافت سے بھی وابستہ ہے۔ انہوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۵۰ء میں سہ ماہی رسالہ اردو ادب سے کیا۔ وہ ی زبان' کے بھی مدیر رہ چکے تھے۔

سا ہ فیسر سرور کو ملکی اور غیر ملکی اعزازات سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ اقبال نظریہ اور میں وہ نہاہیں پاکستان کے صدر کی جانب سے طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔ انہیں غالب مودی شاعری کہ واکادمی اور دلی اردو اکادمی ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور ۱۹۹۲ء میں حکومت ہند کی جانب سے "پدم بھوشن" کے اعزاز سے نوازا گیا تھا۔

پنڈت رتن موہن ناتھ زتشی **خار دہلوی** نے ۳۱/ جنوری ۲۰۰۲ء کو ممبئی میں زندگی کی آخری سانس لی۔ ان کا انتقال انتہائی مختصر علالت کے بعد دماغ کی رگ پھٹ جانے سے ہوا۔ انہیں دبستان داغ سے دو نسبتیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی جانشین داغ کے شاگرد تھے اور دوسری یہ کہ وہ علامہ پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی جانشین داغ کے فرزند تھے۔ اس اعتبار سے داغ کی زبان اور مذاق سخن ان کی سرشت میں بھی تھا اور ان کی وراثت بھی۔ خار دہلوی کی ولادت ۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء کو ہوئی۔ اس طرح انہوں نے ۸۸ سال کی عمر پائی۔ خار دہلوی نے دو شعری مجموعے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ 'خلش' اکتوبر ۱۹۷۹ء میں اور دوسرا 'خار زار' ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا۔

ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر **سلامت اللہ** کا ۲۳/ جنوری ۲۰۰۲ء کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۹۰ برس کے تھے۔ پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے اور چار بیٹیاں شامل ہیں۔ ڈاکٹر سلامت اللہ کا شمار قومی سطح کے ماہرین تعلیم میں ہوتا ہے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ تعلیم (استادوں کا مدرسہ) کے معماروں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے اردو اور انگریزی میں تعلیم سے متعلق مختلف موضوعات پر درجنوں کتابیں لکھی ہیں۔

دہلی کی ثقافتی سرگرمیوں کے روح رواں اور صحافی **رئیس مرزا** کا ۱۸/ فروری کو دہلی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۷۱ برس سے زائد تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ تارا مرزا اور بیٹی سواتی مرزا ہیں۔ مرزا کولکتہ سے شائع ہونے والے روزنامہ عکاس کے نئی دہلی میں نمائندہ تھے۔ وہ مدت تک 'قومی آواز' میں ہفتہ وار ثقافتی کالم بھی لکھتے رہے۔ (ادارہ)

غزلیں

نشتر خانقاہی



(۲)

کبھی تو ملتوی ذکرِ جہاں گرداں بھی ہونا تھا
کبھی تو اہتمامِ صحبت یاراں بھی ہونا تھا

توقع کے مطابق ہے یہ تبدیلی تو حیرت کیا!
اسے مشکل بھی ہونا تھا، مجھے آساں بھی ہونا تھا

ریاکاروں پہ کل تک جس کے دروازے مقفل تھے
اسی جنت میں جشنِ فتنہ پردازاں بھی ہونا تھا

کبھی دیکھا نہ تھا یوں ہم نے بازار وفا، ویراں
تو کیا اس شہر میں قحطِ خریداراں بھی ہونا تھا

ابھی تک جو کنارے سے بہ ظاہر شانت لگتا تھا
اسی دریا کو اب طوفاں پس طوفاں بھی ہونا تھا

بالآخر ہم بھی شب بھر جاگتے رہنے سے باز آئے
دیارِ ہجر میں کچھ وصل کا امکاں بھی ہونا تھا

یہ تازہ باب دانائی! یہاں آکر میں ششدر ہوں
جو کل تک تھے بہت دانا، انہیں ناداں بھی ہونا تھا

مری تنہائی میں رہ رہ کے تابانی سی ہوتی ہے
چمک کس کی ہے؟ سوچوں تو پریشانی سی ہوتی ہے

چھپا رکھی تھیں جس سے میں نے بداعمالیاں اپنی
اب اس کا سامنا کرکے پشیمانی سی ہوتی ہے

میں دعویٰ بھی کروں تو کون باور کرنے والا ہے
مری تردامنی بھی پاک دامانی سی ہوتی ہے

نہ چاہا، پھر بھی کتنی بار سمجھوتے کئے میں نے
کبھی جب یاد کرتا ہوں تو حیرانی سی ہوتی ہے

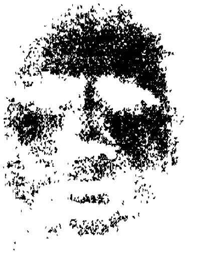
میں دن بھر قہقہوں کی بستیاں آباد کرتا ہوں
مگر ان بستیوں کی تہہ میں ویرانی سی ہوتی ہے

ہمہ دانی میں اک پہلو حماقت کا بھی ہوتا ہے
کہ حد سے بڑھ کے دانائی بھی نادانی سی ہوتی ہے

میں خوابوں کے سہارے کس لئے جیتا ہوں، جانے دو
مجھے یوں زندگی کرنے میں آسانی سی ہوتی ہے

چمنڈا روڈ، جاٹان، بی ۴، بجنور (اتر پردیش)

مصور سبزواری



یہی ہوا ہے کہ جب دوستی شدید ہوئی
رگِ خلوص سے پھر دشمنی کشید ہوئی

میانِ خیمہ و دریا لعین پہرے سہی
کس آب و تاب سے اک تشنگی شہید ہوئی

اب اس لئے بھی تجھے پاس سے نہیں دیکھا
کہ اس سے پہلے بھی جو دید تھی شنید ہوئی

ہوا ہے کیا یہ بتا مجھ کو میرے رمز کشا؟
کہ گفتگو تری سب قفلِ بے کلید ہوئی

کسی سے مٹ نہ سکی مہر ملکیت تیری
بدل بدل کے کئی چہروں کی خرید ہوئی

طویل رہگزر، خوش گماں پہ چل پڑتا
ہوں مطمئن کہ یہ نفرت تری مفید ہوئی

فصیلِ کوہ سے اترا نہ دھوپ کا دریا
نہ بڑھتے چاند کی ساعت میں تیری دید ہوئی

چودھری سرائے، سنبھل، مراد آباد (یوپی)

غزلیں

شجاع خاور



رخ ہوا کا یہ کہ جیسے اس کو آسانی پڑے
دل کی آگ ایسی کہ ہم کو روز سلگانی پڑے

نور ہو اندر تو باہر مات کیوں کھانی پڑے
وہ تجلی کیا میاں جو طور سے لانی پڑے

زندگی کی قدر تب تم پر کھلے گی دوستو
اس کے کوچے سے جب ایک اک سانس منگوانی پڑے

ایک تو مشکل کو جھیلوں اور اوپر سے یہ ہے
اپنی مشکل روز اس کو جاکے سمجھانی پڑے

خود وہ ملنے آئے تو حائل رہے یہ بے خودی
میں جو ملنے جاؤں تو رستے میں حیرانی پڑے

پڑگیا جب تو ہی ایں و آں کی الجھن میں شجاعؔ
میں لاکھ پھر سجدے میں شب بھر تیری پیشانی پڑے

(۲)

ہر اک جذبے میں حصے دار رہنا
پر اپنے آپ سے ہشیار رہنا
ہمیشہ موت سے دو چار رہنا
یہاں زندہ بھی کیا بے کار رہنا
اگر کچھ ہاتھ لگ جائے تو کیا خوب
نہیں تو صاحبِ کردار رہنا
طبیبوں سے تو ملنا چست ہوکر
پر اس کے سامنے بیمار رہنا
زمانے بھر سے کرنا عشق جم کر
اور اپنے آپ سے بیزار رہنا
ملن میں خاک ہوجانا ادب سے
بچھڑ کر گنبد و مینار رہنا
افق سے روز ملتا ہوں سرِ شام
امیدو! تم سمندر پار رہنا
امیدوں کو بڑھاوا دے رہے ہو
اداسی کے لئے تیار رہنا
خمارِ وصل جب ٹوٹے تو دن بھر
شرابِ ہجر سے سرشار رہنا
شجاعؔ صاحب یہ خالی جیب لے کر
یوں ہی کب تک سرِ بازار رہنا

۱۔ پارک لین، تال کٹورہ روڈ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۱

شہیر رضوی کھیروی

مرا اخلاق لے جاؤ مرا کردار لے جاؤ
تمہارے کام آئے گا ہمیشہ یار لے جاؤ

جہاں کی بادشاہی خود تمہیں آواز دے لے گی
مگر سینے میں اپنے جذبۂ ایثار لے جاؤ

نئی سوچیں ہماری ہیں ترقی کی تمنا ہے
ہمارے شہر سے یہ گیسوئے خمدار لے جاؤ

وہاں یہ کاغذی چیزیں بھلا کس کام آئیں گی
اگر لے جانا ہے گلہائے خوشبودار لے جاؤ

ہمارے پاس آئے گا کنارہ خود بخود چل کر
بھروسہ ہے خدا کی ذات پر پتوار لے جاؤ

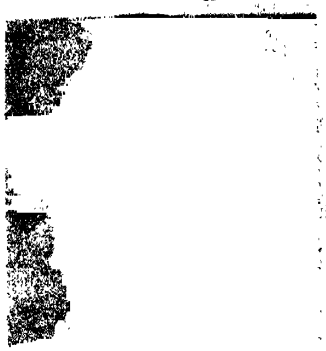
نئی ایجاد کی باتیں ہوں جس میں وہ کتابیں [illegible]
صحیفے یہ گل و بلبل کے ہیں بیکار لے جاؤ

نظر والے بتادیں گے، شہیرؔ کھیروی کیا ہے؟
چھپاؤ مٹھی میں چاہے پسِ دیوار لے جاؤ

سید واڑہ، کھیری (اتر پردیش)

اسلم-قمرالدین

ابرار اعظمی





غزلیں

کام لیا جب لفظوں ہی سے، خود کو بس ناکام کیا
بات اثر انداز ہوئی، جب شعروں کو پیغام کیا

یہ کیسے ساری دنیا میں، آج بہت مشہور ہو تم؟
ویسے تو ساری دنیا نے، تم کو بہت گمنام کیا

یک رنگی سے عاجز آکر، رنگا رنگی کی خاطر
جو مجھ کو راس آیا تھا، اس نیلم کو نیلام کیا

اکثر تنہائی میں مجھ کو، یاد آجاتا ہے وہ سب
ہاں، آغاز سے پہلے ہی جس کو میں نے انجام کیا

خاموشی بس فن ہے خدا کا، سیکھا ہم نے بھی لیکن
ہر سو روز مچایا تہلکہ، یا پیدا کہرام کیا

وقت کے ساتھ اور آپ کے ہاتھوں قدریں کتنی بدلی ہیں
ایک الزام سے کتنا کم ہے، حاصل جو انعام کیا!

کہئے حسن اور عشق کو دے کر اپنے دل کے خون کا لمس
کس نے اسے گلرنگ کیا، پھر کس نے اسے گلفام کیا؟

(۲)

خواب کیا ہوتا ہے بیداروں کے بیچ؟
ہوش کیا ہوتا ہے سرشاروں کے بیچ؟

کاڑھ کے سن لی ہے میں نے، دیکھئے
آپ کی آواز نقاروں کے بیچ

سعی اس کی تھی کہ سب ہو جائیں سرد
ایک غنچہ تھا جو انگاروں کے بیچ

چاہئے تھا ایک دروازہ— اٹھی
ایک دیوار اور دیواروں کے بیچ

رو پڑے، پھر ہنس پڑے بھی سب کے سب
تھی خبر ایک ایسی اخباروں کے بیچ

اور سب کچھ ہے زیادہ، ان دنوں
ایک فن ہی کم ہے فنکاروں کے بیچ

سوچتا ہوں، سوچتا تھا کیا بھلا
زندگی تھی جب کہ گہواروں کے بیچ

بیچتے رہتے ہیں جو اپنے ضمیر
ہوں میں اب ایسے ہی بیچاروں کے بیچ

سناٹے کی آوازیں، تاریکیٔ شب پیہم
اک ذہن کہ وامانده، اک جسم کہ بارِ غم

یہ کون سا عالم ہے، یہ کون سی منزل ہے
ماضی کا تصور بھی دکھ دیتا ہے اب کم کم

آہٹ سی کوئی آئی، یا شاخ ثمر ٹوٹی
یا تارِ نفس کا ہے نغمہ سا کوئی مبہم

تنہائی کے صحرا میں اک پھول کبھی کھلتا
اے دستِ دعا، اس کے امکان ہیں کچھ مدھم

چہرہ ہے شکستہ سا، یا آئینہ ٹوٹا ہے
یا آنکھوں میں رقصاں ہے تصویرِ شعورِ غم

اک خواب سا دیکھا ہے، تعبیر ہے کیا اس کی
تاریک سمندر میں لو دیتے ہوئے سر گم

لاش اپنی اٹھائے سب پھرتے ہیں خموشی سے
دلچسپ نظارہ ہے، گریہ نہ کوئی ماتم

ویرانیٔ ذہن اب تو، رسوا کئے دیتی ہے
گلہائے تخیل بھی، اب آئے بہ چشمِ نم

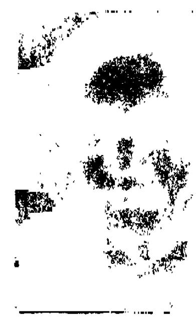
اک برق سی لہرائی، روشن سی صدا آئی
وہ لمحہ گزراں تھا یا رقص میں جامِ جم

۲۲۔ سپریم انکلیو، میور وہار، فیز ۱، دہلی۔۱۱۰۰۹۱

خالص پور، اعظم گڑھ

غزلیں

ذکاء الدین شایاں



چاروں طرف دھواں ہے، ہوا کیا کہے گی اب!
آتش سمندروں پہ! فضا کیا کہے گی اب

منظر کے ساتھ لپٹے ہوئے دیکھتے رہو
اس کی نظر بھی اس کے سوا کیا کہے گی اب؟

ہیں کرۂ زمیں کی طنابیں کٹی ہوئی!
خیموں میں شمع شعلہ نوا کیا کہے گی اب

وہ زندگی جو عزم و محبت کی تھی شبیہ
پوچھو تو جا کے اس سے ذرا کیا کہے گی اب

انساں کا خوں بہانا! خود انساں کے حوصلے!!
صدیوں کی یہ روش، یہ ادا کیا کہے گی اب

نقطوں سے جھکی شوخ نگاہوں میں کیا مقام؟
طرزِ کلام، رسمِ وفا کیا کہے گی اب

نزد اولڈ سٹی ڈاک خانہ، پکریا، پیلی بھیت۔ ۲۶۲۰۰۱

زبیر شفائی

اک تجسس تا بہ حد انتہا رہنے دیا
کس نے وا میرے لئے بند قبا رہنے دیا

جو حوادث میں رہا وابستۂ شاخِ شجر
زرد موسم نے وہ برگ آدھا ہرا رہنے دیا

وہ تصور ساختہ آئے تو کیوں ہو روک ٹوک
گھر کا پاٹوں پاٹ دروازہ کھلا رہنے دیا

گھوم سیارہ بہ سیارہ مگر اشکال دیکھ
گردشِ ایام نے کس کو نیا رہنے دیا

کس نے اپنے نفس کی تذلیل کی ہے اس طرح
زندگی بھر پیٹ سے پتھر بندھا رہنے دیا

دوسری باتیں کرو اب یہ کہانی پھر سہی
تم نے مجھ کو کس قدر لوٹا ہے کیا رہنے دیا

بو، اندھیرا، حبس، سیلن کیا نہ تھا گھر میں زبیرؔ
احتیاطاً ٹاٹ کا پردہ پڑا رہنے دیا

۹/۴۱، وہائٹ کالونی، جوہی، کانپور۔ ۲۰۸۰۱۴

عتیق حسن خاں صباؔ

نقاب رخ پہ نہ سر پہ ردا ضروری ہے
ذرا سی آنکھ میں شرم و حیا ضروری ہے

وہ کیا کرے گا بھلا چاند اور سورج کا
غریب کے لئے بس ایک دیا ضروری ہے

یزید بڑھتے چلے جا رہے ہیں دنیا میں
پھر ایک معرکہ کربلا ضروری ہے

وہ لطف لیتا ہے ہر اک کی نکتہ چینی میں
اب اس کے واسطے اک آئینہ ضروری ہے

ہمارے ملک میں ہر جرم کے لئے ہے سزا
مگر سزا کے لئے بے خطا ضروری ہے

سکونِ دل نہیں ملتا محض عبادت سے
کسی غریب کے دل کی دعا ضروری ہے

کبھی نہ حرفِ صداقت انہیں کے لب پہ ملا
جو سب سے کہتے ہیں سچ بولنا ضروری ہے

غموں سے چور ہے انسان جس طرف دیکھو
اب ہر قدم پہ صباؔ میکدہ ضروری ہے

۴۹۸۔ محمد زئی، مولانا نور احمد اسٹریٹ، شاہجہاں پور

رفعت سروش

خستہ عمارت

یہ خستہ عمارت،
پچھتر برس ہے پرانی
دراڑیں ہیں دیواروں میں
اور پلستر اکھڑنے لگا ہے
کڑی تختے اپنی جگہ سے کھسکنے لگے ہیں
وہ چھجا جھکا جا رہا ہے
اچانک کہیں گر نہ جائے کسی پر

یہاں کل تھے ہنگامے
بچوں کی کلکاریاں
چوڑیوں کی کھنک
قہقہوں کی بہاریں
مگر اب یہاں کوئی آتا نہیں ہے
ہوائے حوادث کے رخ پر عمارت یہ تنہا کھڑی ہے
زمیں بوس ہو جائے کب!
کون جانے

اے۔۸۰، سیکٹر ۲۷، نوئیڈا۔۲۰۱۳۰۱

محسن جلگانوی

غزل

کس لئے آگئے رشتے مری تنہائی میں
آنکھ میں اپنی اٹھاتا ہوں تو گھر کاٹتا ہے

اس کے اک نام سے روشن تھیں مری دیواریں
وہ نہیں ہے تو یہ محلوں کا کھنڈر کاٹتا ہے

دوست ہوگا جو مرے واسطے پھل چھوڑ گیا
ورنہ دشمن کہیں اس طرح شجر کاٹتا ہے

کیسا جلاد ہے سولی پہ چڑھا رکھا ہے
نہ معافی مجھے دیتا ہے نہ سر کاٹتا ہے

بیچ دریا کے ڈبوتی ہے مجھے تشنہ لبی
مری کشتی تری موجوں کا بھنور کاٹتا ہے

میں نئے ہاتھ سے اب ہاتھ ملاتا ہی نہیں
مجھ کو محسنؔ مرے ہمزاد کا ڈر کاٹتا ہے

۵۰۵۔ بلاک اے، شانتی گارڈنس، ناچارام، حیدرآباد

پرکاش تیواری

غزل

گلستاں گلستاں تجارت گلوں کی
سیاست کی زد میں لطافت گلوں کی

ہوا دے گئی ہے ضمانت گلوں کی
خزاں میں بھی قائم ہے عزت گلوں کی

بیاباں بیاباں ہیں دیوانے رقصاں
دلوں پر ہے کیسی حکومت گلوں کی

ہوا ہے چمن سارا دیوانہ ان کا
جنوں خیز کتنی ہے رنگت گلوں کی

ذرا چھیڑیئے تو بکھر جائیں فوراً
ہے نازک بہت ہی طبیعت گلوں کی

ہر اک دل کو مہکائے باغ جہاں میں
نہ مومن نہ کافر یہ نکہت گلوں کی

غم زندگی سے ہے گھبرانا کیسا
کہ کرتے ہیں کانٹے حفاظت گلوں کی

ہر اک شخص جھومے نظارے سے اس کے
ہے رنگین کتنی جماعت گلوں کی

ہر انساں پریشاں ہے الجھن سے اپنی
سنے کوئی یا رب شکایت گلوں کی

گھڑی دو گھڑی کھل کے غم دور کر دیں
عجب ہے جہاں کو عنایت گلوں کی

ہر اک لمحہ تڑپائے پرکاشؔ دل کو
قیامت سے کیا کم ہے چاہت گلوں کی

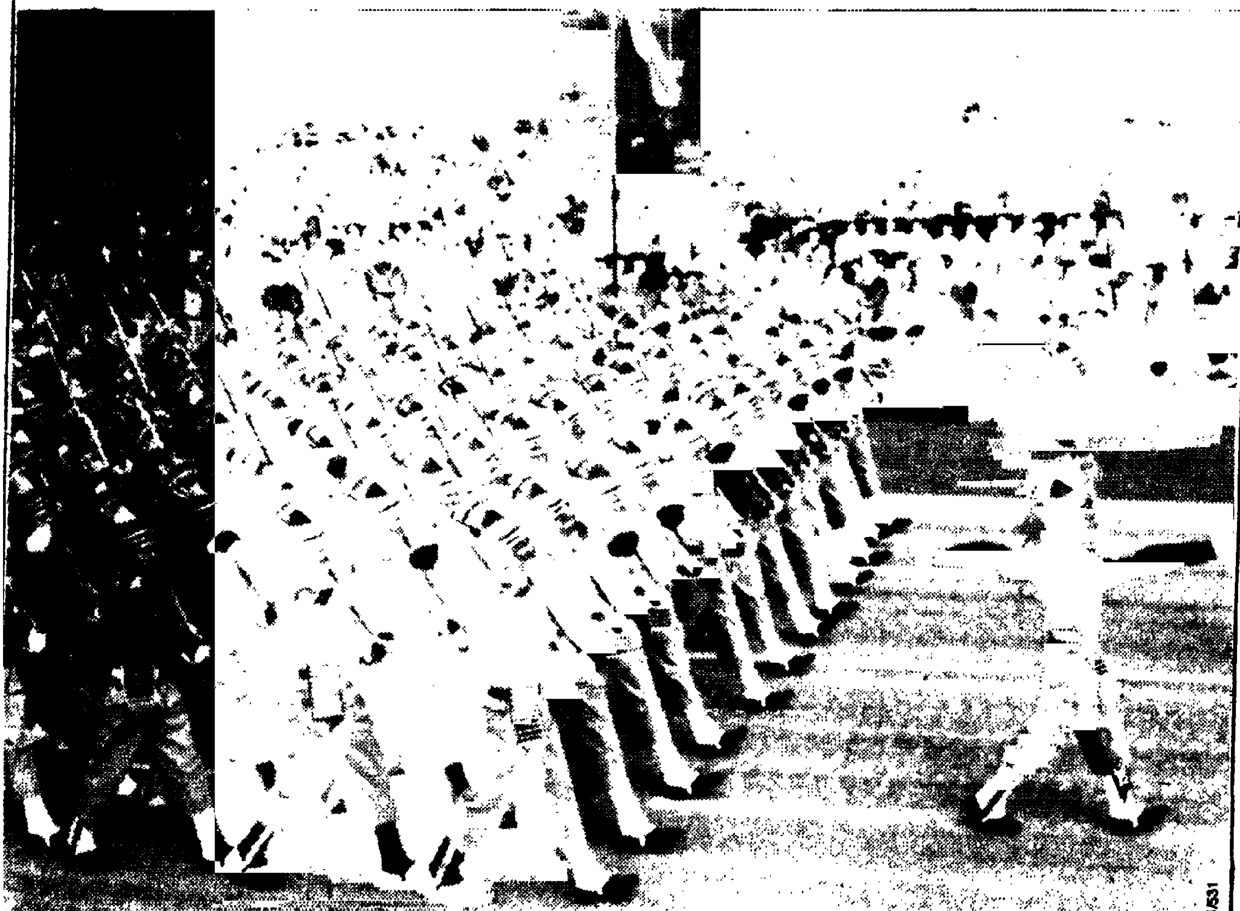
بی ۴۔ روز اپارٹمنس، سیکٹر ۱۴ (ایکسٹنشن) روہنی، نئی دہلی

دہشت گردی کے خلاف لڑائی
اس میں ہر ہندوستانی ہے سپاہی



''ہر ایک ہندوستانی کو دہشت گردی کے خلاف اس لڑائی کا حصہ بننا چاہیے۔ ہمیں اپنے ملک اور دنیا سے اس برائی کو جڑ سے اکھاڑنا ہوگا اور ہم اس کو اکھاڑ پھینکیں گے۔''

۔اٹل بہاری واجپئی
وزیر اعظم



davp 2001/531

آیئے یومِ جمہوریہ کے موقع پر دہشت گردی کو مٹانے کا عہد کریں۔

حسین الحق

تمـ ـشـ



نتیجہ سامنے آیا یہ غیر متوقع تو نہیں ہے مگر افسوسناک ضرور ہے!

جب نیا نیا گھر بنا تو اس وقت عبدالرزاق کی بڑی آؤ بھگت تھی۔ گھر کا ہر فرد گھر کے لئے عبدالرزاق کی قربانیوں کا معترف تھا۔ عبدالرزاق نے اپنے ایثار کا گھر باہر چاروں طرف سکہ جمالیا تھا۔ حالانکہ بعض نے دبی زبان سے اپنے باپوں کی قربانیوں کا بھی تذکرہ کیا مگر نزدیک و دور چاروں طرف تو عبدالرزاق زندہ باد کا نعرہ گونج رہا تھا، ایسے میں کسی اور کی بابت کوئی اور کیا سوچ پاتا، کیا کہہ پاتا، پس عبدالرزاق کے ارد گرد والوں نے جب عبدالرزاق کو "سرپرست خانہ" بنانے کا اعلان کیا تو ذرا دور والے اس اعلان کی مخالفت کی بات سوچ بھی نہیں سکے۔

عبدالرزاق نے سرپرست بننے کے بعد آمدنی، خرچ اور حفاظت اپنے ذمہ رکھ لی اور بقیہ لوگوں کو بقیہ ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ بات اگر بہت ٹھیک نہیں تھی تو بہت غلط بھی نہیں تھی۔ یہی سوچ کر سب نے عبدالرزاق کی سرپرستی مان لی بلکہ یہاں تک ہوا کہ ایک چچازاد جو شروع سے "ہم الگ رہیں گے، ہم الگ رہیں گے" کا شور مچائے ہوا تھا وہ بھی چور اُچکوں کے ڈر سے ساتھ ہی رہنے پر آمادہ ہو گیا۔

اس بیان کو آپ قوموں اور ملکوں کی تقدیر سے بھی وابستہ کر سکتے ہیں لیکن بیان کی عمدیت اس بات کی متقاضی ہے کہ اتنی چھوٹی بات کو عالمی جدوجہد سے نتھی کر کے انسانی شرافت و کرامت کے حصول کی کوشش کی تحقیر نہ کی جائے۔

سرسید کالونی، نیو کریم گنج، گیا (بہار)

بیان آگے یوں بھی بڑھ سکتا ہے کہ عبدالرزاق چونکہ ایک ہوشیار اور فعال آدمی تھا اس لئے اس نے اپنی زندگی تک گھر کے سارے معاملات کچھ اس طرح نپٹائے کہ لوگوں کو بہت زیادہ شکایت نہیں ہوئی اور اسی لئے اس کی موت پر تقریباً سبھی لوگ غمزدہ ہوئے اور عملی طور پر گھر کا نظام کئی دنوں تک گڑبڑا گیا۔ ایک عجب قسم کا جمود جس میں کوئی آگے بڑھ کر خود سے کچھ کرنے کی پوزیشن میں اپنے آپ کو نہیں پا رہا تھا۔

معاف کیجئے گا۔ ایک بات اچانک ذہن میں آگئی ہے اس لئے قلم بند کر دے رہا ہوں کہ پہلی سطر میں جو بیان درج کیا گیا، وہ اُس زمانے کا نہیں بلکہ اِس زمانے کا ہے اور یہ کوئی قول زریں نہیں ہے بلکہ موجودہ صورت حال پر میرے دوست روی شنکر بھاردواج کا تبصرہ ہے۔

جی تو میں عرض کر رہا تھا کہ عبدالرزاق کی موت کے بعد گھر پر ایک جمود سا چھا گیا تھا اور اس جمود کو اس کے بیٹے غیور خاں نے توڑا۔ اب جو بات غیور خان تک آن ہی پہنچی تو بہتر ہو گا کہ پہلے غیور خان کا تعارف کرا دیا جائے۔ اس سلسلے میں بھی گفتگو پھر عبدالرزاق کی طرف مڑ جاتی ہے جو ایک مردِ مخلص کے ساتھ مرد دانا بھی تھا اور اس نے اپنی اولاد کی پرورش میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے سبھی بیٹے ماشاء اللہ چندے آفتاب چندے ماہتاب نکلے اور ان سب میں بھی غیور خاں کی آن بان کا کیا کہنا۔ ولایت کا پڑھا ہوا ہدایت کا پایا ہوا اور عبدالرزاق کی رفاقت سے سنوارا ہوا۔ اسی غیور خان نے عبدالرزاق کے سوئم اور دسویں کے درمیان آگے بڑھ کر کچھ اتنی تیزی اور دانائی کے ساتھ "معاملات خاندان" کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا کہ بغیر دستار بندی کے وہ "ولی عہد بہادر" بن گیا۔

تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ایسا ہر قدم قومی سطح پر ایک ایسا بورڈم پیدا کرتا ہے جو بظاہر کچھ دنوں تک تو دیگر فعال قوتوں (Active Forces) کو منفعل اور مضمحل عنصر کی علامت بنا دیتا ہے مگر یہی انفعال و اضمحلال آگے چل کر پسماندہ طاقتوں کے اشتعال کا سبب بھی بنتا ہے۔

ولی عہد بہادر مرد دانا تو ضرور تھے مگر مردِ مخلص بھی تھے یا نہیں، یہ معاملہ مشکوک بھی ہے اور متنازعہ فیہ بھی۔ روی شنکر بھاردواج کا کہنا ہے کہ توڑ جوڑ کا سلسلہ کوئی نیا تو نہیں؟

فرشتہ اور فیروز شاہی سے سیر المتاخرین تک (صفحہ آپ کوئی بھی تصور کر لیجئے) غلام سلطنت سے انگریزوں تک، مثالیں تو بکھری پڑی ہیں۔

مگر اس صورت حال سے غیور خاں کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا تھا؟ اس کو تو جو کرنا تھا وہ کرتا رہا، پہلا کام اس نے یہ کیا کہ باپ کے زمانے کے بہت سے فیصلوں کو تحریری طور پر تو نہیں مگر عملی طور پر سرد خانے میں ڈال دیا، دوسرا کام یہ کیا کہ جن عزیزوں کو باپ نے اہم ذمہ داریاں سونپی تھیں ان سے وہ ذمہ داریاں لے کر دوسروں کو دے دیں، تیسرا کام یہ کیا کہ باپ اہم فیصلے لینے سے پہلے اپنے دیگر ہم عمر رشتہ داروں سے ایک ملاقات ضرور کرتا اور اسے "مختلف جرگوں کے درمیان مشورت" کا نام دیتا۔ غیور خاں نے یہ رسم اٹھا دی۔ اس نے تو ہم عمر کیا اپنے بزرگوں سے بھی مشورے کی

زحمت گوارہ نہیں کی۔

●●●

روی شنکر بھاردواج نے اچانک چینل بدل دیا اور بہت تیکھے لہجے میں بولا: "یہ بھی دیکھو!" اسکرین پر مجمع لگا ہوا تھا اور بازی گر تماشہ دکھا رہا تھا۔

بازی گری بازی گری کا سلسلہ شہر میں بہت دنوں سے جاری تھا، دراصل بازی گروں کا پورا قافلہ شہر میں اترا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے شہر کے نسبتاً ایک سنسان علاقے میں اپنا ڈیرا ڈنڈا ڈال رکھا تھا اور ہر روز کسی نہ کسی نئے علاقے میں اپنی بازی گری دکھاتے اور نتیجتاً ان کے ہر روز کے کھانے پینے کا سامان مہیا ہو جاتا۔

اسمٰعیل اور پرشوتم کالج سے آتے جاتے کسی نہ کسی راستے اور کسی نہ کسی موڑ پر انہیں مصروفِ کار نظر آتے۔ اسمٰعیل رکنا چاہتا تو پرشوتم اس کار فضول سے اسے روک دیتا اور کبھی پرشوتم اس جانب اگر راغب ہوتا تو اسمٰعیل کسی مصروفیت کا رونا رونے لگتا۔

"گویا ہم دونوں بازی گر کی بازی گری دیکھنا بھی چاہتے ہیں اور اس بازی گری سے اپنے آپ کو دور بھی رکھنا چاہتے ہیں۔" گائے گھاٹ پر بیٹھے بیٹھے گنگا کی پرسکون لہروں کو پیروں کی شرارت سے مضطرب کرتے ہوئے پرشوتم بولا۔

اسمٰعیل خاموش رہا اور اردگرد کی ساری فضا پر شام کا سایہ گہرا ہوتا رہا۔

"یار ہمارا مسئلہ کیا ہے؟" پرشوتم کے من میں آج جانے کون سی بے چینی کنڈلی مار کے بیٹھی تھی۔

جواب میں اسمٰعیل کان پر ہاتھ رکھ کے الاپا:

"بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے"

پرشوتم جھنجھلا گیا: "سالے یہ کھلی دھاندلی ہے۔ اتنا گاڑھا شعر پڑھنے کا پرمیشن تم کو نہیں مل سکتا۔"

اسمٰعیل مسکرایا اور پھر گنگنا اٹھا:

"یہ کیسا دستورِ زباں بندی ہے تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری"

"یار پلیز!" پرشوتم نے ہاتھ جوڑ دیے: "نہ تو امو شنل ہونے کی ضرورت ہے، نہ ہی سیدھی سادی بات کو کٹھن بنانے کی ضرورت ہے۔ اصل سوال شاید صرف یہ ہے کہ ضرورت کس بات کی ہے؟"

"ضرورت مجمع کی، ضرورت مند بازی گر، ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ بازی گری۔" عقب سے ایک رواں تبصرہ۔

مداری نے کئی قسم کے تماشوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ میدان میں کچھ لوہے کے گول گول دائروں کے چھڑ پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف دو بڑے اور موٹے بانسوں کے سہارے ایک رسہ تنا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک چھرا بھی رکھا ہوا تھا جہاں چھرا رکھا ہوا تھا وہیں پاس میں ایک چھوٹے سے قبر نما تنبو پر چادر ڈھکی ہوئی تھی۔

مداری کھیل دکھا رہا تھا۔ پہلے اس نے دو بچوں کو بلایا۔ دونوں بچوں نے لوہے کے گول گول دائروں والے چھڑ کو پہلے سر میں پہنا، پھر گردن بازو پیٹ سے گزارتے ہوئے پیر سے نکالا، یہ انتہائی حیرت ناک عمل تھا، جس گول چھڑ کا سر سے نیچے آنا مشکل ہو رہا تھا اسے ان بچوں نے پورے بدن سے گزار دیا۔ پھر دوسرا حیرتناک کھیل شروع ہوا۔ ایک لڑکی دو بانسوں کے سہارے تنے ہوئے رسے پر چڑھ گئی۔ اس لڑکی نے اپنے سر پر ایک دو نہیں تین تین گھڑے تلے اوپر سجا رکھے تھے۔ وہ لڑکی تلے اوپر سجے ہوئے ان گھڑوں کے ساتھ تنے ہوئے رسے پر چلنے لگی۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مداری اپنی ڈھولک کی تھاپ تیز سے تیز تر کرتا چلا گیا، لڑکی تنے ہوئے رسے پر چلتی گئی اور یوں دوسرے کنارے تک پہنچ گئی۔ پھر ایک لڑکا اس چھوٹے سے قبر نما تنبو میں چلا گیا جس کو چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ تنبو اتنا چھوٹا تھا کہ یقیناً اس لڑکے کے تنبو کے اندر جانے کے بعد یقیناً دائیں بائیں کوئی جگہ نہ بچی ہوگی۔ جب وہ لڑکا پورا پورا اندر چلا گیا تو مداری نے چھرا اٹھایا اور اس تنبو کے بیچوں بیچ پورے طاقت سے گھونپ دیا۔ کھچ کے آواز صاف سنائی دی، تنبو کے اندر سے خون بہہ کر باہر آتا صاف دکھائی دیا۔ مداری نے چھرا باہر نکالا تو چھرا بھی خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد مداری نے تنبو اٹھایا تو تنبو کے اندر خون ہی خون تھا مگر تنبو خالی تھا، لڑکا غائب تھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" اسمٰعیل نے ٹی وی آف کرتے ہوئے روی شنکر بھاردواج سے پوچھا۔

"بازی گری فن ہے مگر اس کی بنیادی حیثیت معاشی اور افادی ہے۔ مزید برآں یہ کہ افادی فن میں بھی اگر مہارت نہ ہو فن کا مظاہرہ [illegible] روی شنکر بھاردواج کھیلوں کے مبصرین کی زبان بول [illegible]

"مگر اس سلسلے میں ایک [illegible] تم بھول رہے ہو۔" اسمٰعیل بھی روی شنکر [illegible] میں بولا: "دوردرشن کے [illegible] مہارت [illegible] نہیں دے سکتی۔"

گویا فن اور اس کی افادی اہمیت کے پس منظر میں افراد کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے کہ مہارت اور دوردرشن کا تناسب کس کے یہاں کتنا ہے!

عبدالرزاق اور غیور خاں کے درمیان کم از کم ۲۵ برس کی طویل مدت حائل ہے۔ اس درمیان بے در و دیوار کے اس محل نما گھر میں کچھ بوڑھے مرے مگر اس سے دوگنا پیدا ہوئے اور عبدالرزاق کی خوش انتظامی کے سبب یا اس کی مخالفت میں کوئی آواز نہ اٹھنے کے سبب جہاں دور دراز کے رشتہ دار بھی اس گھر کا حصہ بن گئے وہیں ضرورت کے تحت عبدالرزاق نے گھر کے رقبے کو اور پھیلا دیا۔ غیور خاں کے جس زمانہ کا ذکر مقصود ہے اس وقت یہ گھر محلہ بن چکا تھا جس کے سایۂ عاطفت میں بہت سے خاندان آباد ہو گئے تھے اور ہر گھر اندر اندر چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے سبب ایک دوسرے سے جڑا ہوا تھا اور اس مشترکہ گھر کی مجموعی آبادی جہاں اس علاقے میں مچھر مکھی کی طرح پھیلی ہوئی تھی وہیں آہستہ آہستہ "آنندی" والی صورت حال بھی پیدا ہونے لگی تھی۔ حالانکہ غیور خاں سے لوگ بہت مطمئن نہیں تھے۔ اس کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں تھی، اس کا رویہ دوستانہ کیا مساویانہ بھی نہیں تھا۔ آمدنی خرچ اور حفاظت کا خود مالک بن کر ایک طرح سے وہ اس پورے جرگے کا بے تاج کا بادشاہ بن گیا تھا اور یہ بات بہت لوگوں کو ناپسند تھی۔ لوگ اپنی اپنی نجی محفلوں میں، شام کی بیٹھکوں میں اور چغل خوری کی ہر گنجائش کا فائدہ اٹھا کر اس کے غلط کاموں کا تذکرہ بار بار کرتے۔ غیور خاں کی اصل بدنصیبی یہ تھی کہ اس کے جو تھوڑے بہت اچھے کام تھے وہ کسی کو یاد نہیں تھے۔

روی شنکر بھاردواج کا سوال: "اگر اقتدار کے اچھے کارنامے یاد کیے جاتے رہیں اور خلق خدا کے سامنے اقتدار کی خامیاں نہ گنائی جائیں تو پھر حزب مخالف کو تو تیل چاول کی دوکان کھول لینی چاہیے۔ وہ سیاست کیوں کرے؟"

رودی شنکر بھاردواج کا یہ سوال فی الحال وقت کے کوڑے دان میں محفوظ کر کے آگے بڑھا جائے اور دیکھا جائے کہ غیور خاں کا کیا ہوا؟

تو اس بابت اطلاع یہ ہے کہ غیور خاں کچھ دنوں تک تو کسی طرح کھینچتا رہا مگر آخر کار اس کے خلاف عملی بغاوت ہو گئی۔ جرگہ متفقہ طور پر اس کے خلاف ہو گیا اور جرگے کی چوپال میں کھلے عام اس پر اعتراضات کی بھرمار ہو گئی اور جب غیور خاں اپنا دفاع نہ کر سکا تو اس نے اپنے گرگوں کے ذریعہ خوف و دہشت کا ماحول گرم کر دیا۔

مگر اس کے باوجود جرگے والوں نے ہمت کر کے غیور خاں کے ایک ننہالی عزیز کو جرگے کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری سونپ دی اور وہ عزیز بھی چونکہ قدرے "سورما" قسم کی چیز تھا اس لئے اس نے ڈنکے کی چوٹ پر غیور خاں سے لوہا لینے کا اعلان کر دیا۔

حزب اختلاف کبھی بھی اپنے بل پر بغاوت کا بگل نہیں بجاتا۔

اگر میں رودی شنکر بھاردواج کے اس خیال کو فی الحال پرے بھی پھینک دوں تب بھی اس حقیقت کا اعتراف تو کرنا ہی ہوگا کہ غیور خاں سے لوہا لینے والے بھی اپنے ننہالی عزیزوں یعنی اپنے علاقے کے باہر کے افراد کی مدد لینے پر مجبور ہو گئے تھے اور اب اس کے بعد صورت حال خاصی گنجلک ہے۔ پھر حزب اختلاف باہر والوں کی مدد سے جرگے کا مالک بنا پھر .....

حسب دستور روایات و خصوصیات امم سابقہ۔

جی نہیں۔ یہ رودی شنکر بھاردواج کا تبصرہ نہیں۔ یہ تو اچانک کسی کتاب کی کوئی سطر یاد آ گئی ہے۔

پھر جرگے والوں اور ننہالی عزیزوں میں مارا ماری شروع ہو گئی۔ اور اب جو لوگ جرگے کے کرتا دھرتا بن گئے تھے، انہوں نے اپنا اقتدار بچانے کے لئے ادھر ادھر نگاہ کی، اور آپ جانتے ہی ہیں کہ دو ملا میں مرغی حرام ہوتی ہے اور بندر جب بٹوارہ کرتا ہے تو ساری روٹی خود کھا جاتا ہے تو ایسا ہی کچھ جرگے والوں کے ساتھ بھی ہونے لگا کیونکہ انہوں نے ننہالی عزیزوں سے بچنے کے لئے ادھر ادھر جو "پیغامبر" بھیجے اور کچھ مدد حاصل کی اس کے نتیجے میں ننہال والے تو کنارے ہو گئے مگر "ادھر ادھر کے لوگ" اب معاملات میں اس طرح دخیل ہو گئے کہ جرگے والوں کو جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

اور اب موجودہ منظر کچھ یوں ہے کہ چاروں طرف دھکم دھکم لگا ہوا ہے، پہاڑوں کی چٹانیں گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونجتی رہتی ہیں۔ زمین پر ہر گلی کوچہ خون سے سرخ ہو رہا ہے۔ عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکائی جا رہی ہیں۔ لوگوں سے زبردستی عبادت بھی کرائی جا رہی ہے اور زبردستی رقص بھی کرایا جا رہا ہے۔

●●●

رودی شنکر نے پھر ٹی وی آن کر دیا تھا۔

ولایت کا کوئی علاقہ تھا۔ وہاں خلق خدا کی کثرت دکھائی دی۔ یہ خلق خدا ولایتی نہیں تھی۔ یہ اسی عبدالرزاق اور غیور خاں کے علاقے کی مخلوق تھی جن کی داستان رزم و بزم اوپر بیان کی گئی۔ ان کے چہرے ستے ہوئے سپاٹ اور جذبہ سے عاری تھے اور یہ اجنبی سرزمین پر بے یقینی کا درد جھیلتے ہوئے کوہستانی یوں دکھے جیسے انہوں نے اپنی کشتیاں جلا ڈالی ہوں۔

"کیا معاملہ ہے؟" میں نے رودی شنکر سے پوچھا۔

"یہ جھنڈ کا جھنڈ اس علاقے سے بھاگ نکلا اور اب اس علاقے سے جڑے ہونے کا عذاب سہہ رہا ہے۔"

انسانی تاریخ میں نظام سے بیزاری کا ایسا نمونہ شاید چشم دہر نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

یہ جملہ بھی اس تحریر میں فٹ ہوتا نظر نہیں آتا مگر میں نے صرف اس لئے درج کر دیا ہے تاکہ قارئین کو بوقت ضرورت دشواری نہ ہو۔ دوسری خاص بات یہ کہ یہ جملہ رودی شنکر بھاردواج کا نہیں ہے۔ رودی شنکر بھاردواج کا جملہ یا تبصرہ صرف اتنا ہے: "جو نتیجہ سامنے آیا یہ غیر متوقع تو نہیں مگر افسوسناک ضرور ہے۔"

ناچیز راقم الحروف نے رودی شنکر بھاردواج کے اس تبصرے پر کہنا چاہا تھا کہ نظام سے بیزاری کا ایک نمونہ تو ہم سب نے دیکھا مگر نظام سے زنا بالجبر کا جو عمومی نمونہ مسلسل پیش نظر ہے اور اس کا جو نتیجہ بالعموم سامنے آتا ہے، رودی شنکر کے لئے وہ بھی متوقع ہے یا نہیں؟

مگر میں نے یہ سوال فی الحال محفوظ کر رکھا ہے—

شاید رودی شنکر بھاردواج کے اندر یہ سوال خود ہی سر اٹھائے!

☆☆☆

فارم-۴

(قانون ۸ کے تحت)

'آجکل' کی ملکیت کی تفصیل

۱- اشاعت کی جگہ	:	نئی دہلی
۲- اشاعت کا وقفہ	:	ماہنامہ
۳- طابع کا نام	:	اراولی پرنٹرس اینڈ پبلشرز (پرائیویٹ لمیٹڈ)
شہریت	:	ہندوستانی
پتہ	:	ڈبلیو ۳۰، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۰
۴- ناشر کا نام	:	پی۔ ایس بھٹناگر
شہریت	:	ہندوستانی
۵- ایڈیٹر کا نام	:	محبوب الرحمٰن فاروقی
شہریت	:	ہندوستانی
پتہ	:	پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱
۶- ان لوگوں کے نام اور پتے جو پونجی کے ایک فیصد سے زیادہ کے شریک اور حصہ دار ہیں		پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

میں پی۔ ایس بھٹناگر تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات بالکل درست اور صحیح ہیں۔

(دستخط) پی۔ ایس بھٹناگر

سلام بن رزاق



ٹیلی ویژن سے یوم آزادی پر وزیر اعظم کی تقریر ٹیلی کاسٹ ہورہی تھی۔ تقریر کا ایک ایک لفظ اس کی روح کی گہرائیوں میں اترتا جارہا تھا۔ بظاہر اس تقریر میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ تقریر ایسی ہی تھی جیسی یوم آزادی اور یوم جمہوریت کے موقع پر عموماً وزیر اعظم کرتے ہیں، جس میں خوش آئند وعدوں کے ساتھ ساتھ قوم کو سخت محنت، نظم وضبط، نیز آنے والے مصائب کا مقابلہ کرنے اور ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہنے کی دعوت دی جاتی ہے۔

ویسے وہ تقریر تو بس ایک بہانہ تھی۔ ورنہ وہ ایک عرصے سے محسوس کر رہا تھا کہ اس کے کاندھے کسی نامعلوم ذمہ داری کے بوجھ سے جھکے جارہے ہیں اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ اس کے اندر ایک طوفان سا برپا کئے رہتا ہے۔

تقریر سنتے سنتے اس کے لہو میں بجلیاں سی دوڑنے لگیں۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور فرط جذبات سے اس کا دبلا پتلا لاغر جسم دھیرے دھیرے کانپنے لگا جیسے اسے کسی آسیب نے آدبوچا ہو۔ تقریر کے اختتام پر وزیر اعظم کی آواز میں آواز ملا کر اس نے بھی بڑے زور سے 'جے ہند' کا نعرہ لگایا۔ اس کی دو برس کی سوتی بچی اس للکار سے جاگ پڑی اور زور زور سے رونے لگی۔ بیوی اس کی بچکانہ حرکت پر بہت خفا ہوئی مگر اس نے ذرا پروانہ کی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی سات کلاس پاس ایک جاہل عورت ہے۔ اسے نہ تو حالات کی سنگینی کا علم ہے اور نہ ہی ملک وقوم کے مفاد یا نقصان کا احساس اس کی ساری سرگرمیاں اپنے ڈیڑھ کمرے کے اس چھوٹے سے گھر کی چہار دیواری تک محدود تھیں۔ وہ اخبار پہلے بھی پڑھتا تھا مگر اس دن کے بعد سے وہ اخبار کو ایک ذمہ داری کے احساس کے ساتھ پڑھنے لگا۔ وہ دفتر سے لوٹنے کے بعد کپڑے تبدیل کرکے منہ ہاتھ دھوتا اور ٹی وی پر خبروں کا چینل کھول کر بیٹھ جاتا۔ ایک چینل سے خبریں ختم ہوتیں تو دوسرا چینل لگا دیتا اور پورے دھیان سے ایک ایک خبر سنتا۔ بیوی چائے کا پیالہ لئے پاس آکر کھڑی رہتی مگر اس کی محویت میں ذرا فرق نہ آتا۔ بیوی اکتاکر پیالہ اسٹول یا میز پر رکھ دیتی اور بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی۔ اگر خبریں سنتے وقت اس کا بڑا لڑکا کارٹون دیکھنے کے لئے شور مچاتا یا چھوٹی بچی کسی بات پر رونے لگتی تو وہ انہیں بری طرح ڈانٹنے پھٹکارنے لگتا۔ بڑا لڑکا تو سہم کر چپ ہوجاتا، مگر چھوٹی اور زور زور سے رونے لگتی۔ اپنے کام سے فارغ ہوکر بیوی ٹی وی پر کوئی سیریل یا فلم دیکھنا چاہتی تو وہ بیوی پر برس پڑتا۔

"تمہیں خبر بھی ہے دنیا میں کیا ہورہا ہے اور ہماری ذمہ داریاں کس قدر بڑھ گئی ہیں۔ ان دو کوڑی کے سیریلوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ چیزوں کو ذرا گہرائی سے دیکھنے کی عادت ڈالو۔ سمجھیں ---"

بیوی چڑ جاتی، تھوڑی دیر تک دونوں میں تو تو میں میں ہوتی، پھر بیوی منہ پر دوپٹا لپیٹے کروٹ بدل کر سو جاتی اور وہ دوبارہ ٹی وی پر نظریں جماکر بیٹھ جاتا۔ ایک دن اس نے ٹی وی پر سنا کہ "ضروری اشیا کی قیمتوں پر قابو پالیا گیا ہے۔" وہ اچھل پڑا اس نے زور سے بیوی کو آواز دی۔ وہ بے چاری کچن سے دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کے اس طرح اچانک چلانے سے وہ گھبرا گئی تھی۔

"کیا ہے جی؟"

"ارے ابھی ابھی میں نے ٹی وی پر خبر سنی ہے کہ ضروری اشیا کی قیمتوں پر قابو پالیا گیا ہے۔ کل سے اپنی دال سبزی تیل میں نہیں اصلی گھی میں بنا کرے گی۔"

اس کے چہرے پر طفلانہ مسرت کے علاوہ ایک مجنونانہ جوش بھی تھا۔ بیوی بے چاری کیا بولتی۔ وہ اس کے تمتماتے ہوئے چہرے کی طرف فقط حیرت اور ترحم کے ملے جلے جذبے کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔

ایک دن بیوی نے کہا۔ "برسات آرہی ہے چھت کی مرمت کروالو۔ پچھلی برسات میں دیکھا تھا کتنی تکلیف ہوئی تھی۔"

اس نے حقارت سے بیوی کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو، ہونا آخر گنوار کی گنوار، پھر بیوی کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ "صبر سے کام لو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اب اس ٹوٹی پھوٹی چھت پر مزید خرچ کرنے کی ضرورت نہیں، سرکار ہمیں جلد ہی ڈھنگ کا مکان دینے والی ہے۔"

"سرکار کہاں سے دے گی؟" بیوی کا وہی احمقانہ سوال۔

"ارے کہیں سے بھی دے گی۔ نہیں دے گی تو اسی کو توڑ کر بنا دے گی۔"

"باپ مریں گے جب بیل بٹیں گے۔" بیوی نے چڑ کر کہا۔

اچانک اسے بیوی [illegible] آگیا۔ آخر اس عورت کو کب [illegible] بات کرنا نہیں آتا تو چپ کیوں [illegible]

"جب [illegible]

کیوں اپنا سر کھپا [illegible]

کہ تم [illegible]

[illegible]

۹/۱۱۔ ایل۔ آئی۔ جی۔ کالونی، کرلا ویسٹ، ممبئی۔ ۷۰

[illegible] ہوئے کہا۔

"میں تو [illegible] ہوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔ [illegible] آپ کی سرکار۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ برسات سے پہلے چھت ٹھیک ہو جانی چاہئے۔ ورنہ مجھے گاؤں لے جا کر چھوڑ دیجئے یہاں ٹپکتی چھت کے نیچے کیچڑ پانی میں، میں اپنے بچوں کو [illegible] نہیں دیکھ سکتی۔۔۔" بیوی تن تناتی ہوئی [illegible] اور وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہ گیا۔ ایسے موقع پر اس کا بس نہیں چلتا کہ چابک لے اور بیوی کو سوت کر رکھ دے۔ جہالت کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس عورت نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی مسئلہ کو سمجھ کر نہیں دے گی۔ مگر بیوی ہی کیوں؟ اس کے ارد گرد کتنے لوگ ہیں جو مسائل کو سمجھتے اور اپنی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہیں۔ لوگ تو جیسے ایمانداری کا چلن ہی بھول گئے ہیں، سمجھانے کی کوشش کرو تو خفا ہوتے ہیں۔ اس دن محلے کے قصائی نے اچانک مٹن پر فی کلو دس روپے بڑھا دئے۔ پوچھنے پر کہنے لگا۔

"گجرات میں زلزلے کی وجہ سے جانور کم آ رہے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "جانور کم آ رہے ہیں تو ایک کلو کی بجائے آدھا کلو دو مگر یہ دام بڑھانے کا کیا مطلب؟"

قصائی نے پہلے تو اسے گھور کر دیکھا۔ پھر بولا۔

"اے! اِدھر ٹائم کھوٹا نہیں کرنے کا کیا؟ لینا ہو تو لو نہیں تو پتلی گلی سے نکل جاؤ۔ کیا سمجھے۔۔۔؟"

"میں اس دھاندلی کے خلاف پولیس میں شکایت کروں گا۔"

"اے جا بڑا آیا پولیس والا۔ پولیس کیا اکھاڑ لے گی میرا۔۔۔"

اچانک قصائی بپھر گیا۔ پھر اس نے کسی کو آواز دی۔

"اے کالیا! دیکھ تو یہ چشمے والے کو کیا مانگتا ہے۔۔۔"

ایک موٹا تازہ بھجنگ شخص اس کی طرف بڑھا جس کے دو دانت [illegible] کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے۔ [illegible] اس سے پہلے [illegible] وہاں سے [illegible]

[illegible]

جاہل جٹ اور گنوار لٹھ قسم کے لوگوں سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ دفتر میں بھی کوئی اس سے بات کرنے کا روادار نہیں تھا کیونکہ اس نے دفتر میں وقت پر آنا اور مسلسل آٹھ گھنٹے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا۔ آخر وہ وقت کا اتنا پابند کس خوشی میں ہو گیا ہے۔ اس نے موزوں اور مناسب لفظوں میں لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بغیر پابندی اوقات اور سخت محنت کے نہ ملک ترقی کر سکتا ہے نہ قوم خوش حال ہو سکتی ہے۔ اس کے اس جواب پر وہ سب دیر تک ہنستے اور قہقہے لگاتے رہے تھے۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ پچھلے کئی برس سے اس نے اس سے زیادہ دلچسپ لطیفہ نہیں سنا۔

مگر وہ لوگوں کے ایسے پوچ ریمارک سے کہاں بددل ہونے والا تھا۔ ان سب کے ذہنوں پر تو غفلت کے پردے پڑے ہیں۔ انہیں بیدار کرنا اور انہیں مسائل کو صحیح تناظر میں سمجھنے کی ترغیب دلانا اس کا فرض ہے۔

ایک دن دفتر میں کالے، ڈیکھو اور سید بیٹھے حسب معمول گپیں ہانک رہے تھے۔ سید میز پر پیر رکھے سگریٹ اڑا رہا تھا۔ کالے بیٹھا ہتھیلی پر سرتی مسل رہا تھا اور ڈیکھو کسی بات پر بھالو کی طرح اچک اچک کر مسلسل ہنسے جا رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک انہیں خاموشی اور ضبط سے دیکھتا رہا۔ جب کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی ان کے ہنسی ٹھٹھے میں کوئی فرق نہیں آیا تو وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور ان کے قریب پہنچ گیا۔ سید نے اسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

"ہیلو ہریش! آؤ تم بھی دم لگاؤ" سید نے سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اپنے چہرے کو کرخت بناتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"مسٹر سید! تمہیں معلوم ہے۔ میں ڈیوٹی ٹائم میں سگریٹ نہیں پیتا۔"

"اور جو پی ہی لو تو کون سی آفت آ جائے گی یار۔۔۔"

"پی لو۔ ہم صاحب سے نہیں کہیں گے۔"

ڈیکھو نے لقمہ دیا۔ اس پر تینوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس کی جانب تمسخرانہ انداز میں دیکھتے ہوئے دیر تک ہو ہو کر ہنستے رہے۔

اس نے ان کے چہروں پر نظر [illegible] کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ اپنے فرائض سے غفلت [illegible] [illegible]

کالے اپنی کرسی سے اچھلتا ہوا بولا۔

"میں کہہ رہا ہوں آپ لوگ اپنے فرض سے۔۔۔"

"ساری یار!" ڈیکھو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہاتھ جوڑ دئے۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ میں آج تک تمہیں ہاف کریک سمجھتا تھا مگر تم تو پورے کریک نکلے۔۔۔ یو آر ٹوٹلی میڈ۔" ایک چھت شگاف قہقہہ۔

وہ پھر ضبط کر گیا۔ ضبط کرتے کرتے اسے ضبط کرنے کی خاصی مشق ہو گئی تھی۔ سید نے انتہائی سنجیدہ صورت بنا کر اس سے پوچھا۔

"یار! یہ تمہیں آج کل ہو کیا گیا ہے۔ جب دیکھو، کام، ڈسپلن، فرض، ملک، قوم ان فضول کی باتوں سے تمہیں ملتا کیا ہے؟"

اب اس کے لئے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں اپنے حلقوں سے ابل پڑیں۔ سانس تیز ہو گیا اور اس نے یک بیک چیخ کر کہا۔

"تم سب قوم کے غدار ہو۔"

'Treacherous of Nation'

اور وہ تیزی سے مڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی کرسی میں آ کر ڈھیر ہو گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

سید، ڈیکھو اور کالے اسے حیرت سے منہ کھولے دیکھتے رہ گئے۔ دوسری میزوں پر بیٹھے کلرک بھی گردن اٹھا اٹھا کر ان کی جانب دیکھنے لگے۔ کالے نے آہستہ سے سرگوشی کی۔

"سالے کو ہو کیا گیا ہے؟"

ڈیکھو نے غصے سے کہا۔ "یہ ایک دن میرے ہاتھ سے پٹے گا۔ تبھی سیدھا ہو گا۔"

سید نے ترس کھایا۔ "جانے دو یار۔۔۔ میں سمجھتا ہوں آج کل یہ بیمار ہے۔"

"بیمار ہے تو مینٹل ہاسپٹل میں بھرتی ہو جائے ہم کو کیوں بور کرتا ہے۔"

اس دن کے بعد سے دفتر میں کئی لوگ اس سے کترانے لگے اور وہ پورے دفتر میں کریک مشہور ہو گیا۔ مگر اسے ان باتوں کی پرواہ نہیں تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ ایک [illegible] ایک دن سب [illegible]

[illegible]

ہمیشہ سڑک کے بائیں طرف فٹ پاتھ پر چلنے کی کوشش کرتا۔ جب تک گرین سگنل نہ ہو جاتا سڑک پار نہ کرتا۔ ریلوے پل پار کرتے ہوئے 'کیپ لیفٹ' کا برابر خیال رکھتا۔ اسے یہ دیکھ دیکھ کر کوفت ہوتی کہ لوگوں کو ابھی تک سڑک پر چلنے اور پل پار کرنے تک کا شعور نہیں آیا ہے۔ ہر گھڑی، ہر مقام پر لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے روندتے یوں بے تحاشا بھاگ رہے ہوتے جیسے موت ان کے تعاقب میں ہو، ایسے مواقع پر وہ پل کے بیچ ساکت کھڑا ہو جاتا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخنے لگتا۔

"بائیں طرف سے چلئے، بائیں طرف سے پلیز—کیپ لیفٹ۔"

مگر زبردست شور میں اس کی آواز کوئی نہیں سنتا اور جو سنتا بھی ہے تو توجہ نہیں دیتا وہ کھڑا دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر، پلیز کیپ لیفٹ، چیختا رہتا۔ ایک دفعہ ایک دبلا پتلا نوجوان سیدھے اس سے آکر ٹکرا گیا۔ اس نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"وہاٹ از دس مسٹر؟"

"وہاٹس ہیپنڈ؟"

نوجوان نے بھی تیوریاں چڑھائیں۔ اس نے پل پر لگی "کیپ لیفٹ" کی تختی کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"اس پر کیا لکھا ہے؟"

"اپن کو انگلش نہیں آتا۔" نوجوان نے جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا لی۔

"اس پر لکھا ہے 'کیپ لیفٹ' بائیں طرف سے چلئے۔"

"تو تم چلو ہم کو کیا بولتا ہے۔ بڑا آیا سالا قانون سکھانے والا۔"

نوجوان منہ سے کف اڑاتا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

وہ چپ چاپ کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اسے نوجوان کی اس ہتک آمیز رویے پر کوئی صدمہ نہیں ہوا۔ کیونکہ اب اس نے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا ماننا چھوڑ دیا تھا۔

اس دن ریل کے ڈبے میں بھی چند نوجوان طلبہ اس سے الجھ پڑے تھے۔ اس نے انہیں صرف الیکٹرک سوئچ کو بار بار 'آن آف' کرنے سے منع کیا تھا۔

"تم کون ہوتے ہو ہمیں روکنے والے؟"

"میں اس دیش کا ایک ذمہ دار ناگرک ہوں۔"

"تو ہم بھی اس دیش کے بھاگیہ ودھاتا ہیں۔"

"مگر آپ لوگ جنتا کی پراپرٹی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔"

"ابے چوپ، جنتا کے بچے نہیں تو بتیسی اکھاڑ کر ہاتھ میں دے دوں گا۔"

اگر دوسرے مسافر بیچ بچاؤ نہ کرتے تو وہ لوگ اسے بیچ بیچ پیٹ کر رکھ دیتے۔ جب اسٹیشن آیا تو وہ نوجوان ہو ہلا کرتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ ایک نے اترتے اترتے اس کے ایسی چپت لگائی کہ سر ڈبے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ کسی نے فقرہ کسا۔

"اے بیوڑا!"

مگر اس کے ماتھے پر شکن نہ آئی۔ اس نے بھی طے کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے لوگ اسے کتنا ہی ذلیل کریں، گالیاں دیں، اذیتیں پہنچائیں مگر وہ انہیں ان کی غلطیوں پر روکتا اور ٹوکتا رہے گا، آخر کب تک نہیں مانیں گے۔ ایک نہ ایک دن اپنی غلطی پر نادم ہوں گے اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے لگیں گے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے رویے میں ایک طرح کی پیغمبرانہ شان پیدا ہو جاتی اور وہ زیادہ مستعدی سے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے مشن پر لگ جاتا۔ جب اس کے سامنے کوئی غلط کام کرتا تو اسے لگتا اس کے اندر سے کوئی چیخ رہا ہے۔ روکو اسے غلطی سے روکو، اسے روکنا تمہارا فرض ہے کہ تم ایک سچے اور ذمہ دار شہری ہو مگر......

پرسوں راجارام پنواڑی کی دکان کے پاس سے گزر رہا تھا کہ 'پچ' سے پان کی ایک پچکاری اس کے پاؤں کے پاس آگری۔ وہ بال بال بچ گیا تھا، ورنہ اس کی پتلون کے پائنچے لالہ زار ہو جاتے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا ایک موٹا شخص پان چباتا ہوا اسی کو گھور رہا تھا۔ "ساری---"

موٹے نے دوسری پیک کو منہ میں گھونٹتے ہوئے گردن ٹیڑھی کر کے کہا۔

"مگر مسٹر! یہ بری بات ہے۔ ایک ذمہ دار شہری کے ناطے آپ کو......"

"ہم ساری بولا نا---ابھی کیا ہے؟"

موٹے نے پاس ہی ایک دوسری پچکاری مارتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے، ہم ساری، بول دیا تم پھر بھی بھنکس کیے جا رہا ہے۔ دیکھو تمہارے پر ایک چھینٹا بھی نہیں اڑا ہے۔"

"مجھ پر چھینٹا اڑنے کی بات نہیں۔ اس طرح سڑک اور فٹ پاتھ پر پان کی پیک تھوکنا ایک ذمہ دار شہری کے ناطے آپ کو شوبھا نہیں دیتا۔"

"پن تم کیا مونسی پالٹی والا ہے؟ تمہارا پینٹ کھراب ہوا ہے تو بولو--- نہیں تو رستہ پکڑو---"

"حولدار صاحب!" اس نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک حولدار کو آواز دی۔

"کیا ہے؟" حولدار نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

"دیکھئے یہ صاحب سڑک پر تھوکتے ہیں۔"

"تو ہم کیا کریں گا---" حولدار کے ناک پر بل بڑھ گئے۔

"مگر اس طرح سڑک پر تھوکنا ڈسپلن کے خلاف ہے۔"

"اے! ہم کو کانون مت بتاؤ، ہم کو معلوم ہے ڈسپلن کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ تم اپنا کام کرو---چچ---"

حولدار نے اپنے منہ میں دبی سورتی کی ایک پچکاری ماری اور ڈنڈا ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ "تو نہہ--- ڈسپلین---" حولدار بڑبڑا رہا تھا۔ موٹا ایک بھدی سی ہنسی ہنسا۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ لوگ کس قدر بے اصول ہو گئے ہیں، آخر لوگوں کی بے قاعدگی اس ملک کو کسی نرک میں پہنچا کر دم لے گی۔ دکھ، تردد اور ندامت سے اس کے سینے میں مستقل درد رہنے لگا۔ ایک دن وہ بس کی قطار میں کھڑا لوگوں کے اُتاولے پن کو دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا۔ جب بس آئی تو لوگ قطار توڑ توڑ کر بھیڑ بکریوں کی طرح ایک دوسرے کو ٹھیلتے دھکیلتے بس کی طرف بڑھتے اور بس میں سوار ہونے کی کوشش میں ایک دوسرے پر پل پڑتے۔ جب چھ بسیں گزر گئیں اور اسے قطار میں ایک ہی جگہ کھڑے پون گھنٹہ ہو گیا تو وہ آگے بڑھا اور لوگوں کو ڈسپلن برقرار رکھنے اور قطار سے بس میں سوار ہونے کی اپیل کرنے لگا۔ مگر اس کی طرف دھیان دینے والا کون تھا؟ اس کا لیکچر جاری ہی تھا کہ اتنے میں ساتویں بس آگئی---لوگ ایک بار پھر بس کی طرف جھپٹے---

"بھائیو! قطار میں چلو--- ارے بھائی لائن میں آیئے۔"

"کون سی لائن؟"

"اے مسٹر پلیز! لائن میں--- آپ تو پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔"

"شٹ اپ---"

"مہاشے! لائن سے آیئے---لائن سے---"

"لائن کے بچے راستہ چھوڑ---"

"جنٹلمین---پلیز---"

"چل ہاٹ---"

جنٹلمین کا الٹا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا اور جنٹلمین بھیڑ کو چیرتا ہوا ارنے بھینسے کی طرح بس میں گھستا چلا گیا۔

[illegible] کے حادثے نے اب اس کے روز مرہ کا معمول [illegible] کر ان حادثوں سے اس کی ہمت پست نہیں [illegible] ایک دریائے آتشیں اس کے سامنے [illegible] اور اسے پار کئے بغیر منزل مقصود تک [illegible] تھا۔ اس نے دفتر سے لمبی چھٹی لے لی اور [illegible] جوش و خروش کے ساتھ لوگوں کے مردہ ضمیر [illegible] کے عظیم کام میں جٹ گیا۔

وہ صبح سویرے کاندھے سے ایک جھولا لٹکائے گھر سے نکل پڑتا۔ گلی گلی محلّہ محلّہ گھوم کر رشوت ستانی، بدعنوانی، کالا بازاری اور بے قاعدگی کے خلاف تقریریں کرتا۔ لوگوں کو سخت محنت، نظم وضبط، معاشی ترقی اور سماجی انصاف کے لئے جدوجہد کرنے کی تلقین کرتا اور نتیجے کے طور پر کہیں مار کھاتا، کہیں گالیاں سنتا۔ جب بیوی گھریلو مسائل کی طرف توجہ دلاتی، اپنی اور اپنے بچوں کی بیماری کا ذکر کرتی، غربت و افلاس کی دہائی دیتی تو وہ بیوی کو سمجھاتا۔

"بھاگیہ وان! کیوں پریشان ہوتی ہو۔ بہت جلد سب کے دلدر دور ہو جانے والے ہیں، صبر سے کام لو۔ کچھ حاصل کرنے سے پہلے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ ہمیں قربانی دینی ہوگی---دینی ہی ہوگی---"

"مگر قربانی ہمیں کیوں دیں؟ اور بھی تو کروڑوں لوگ ہیں۔"

"اگر سب اندھے بہرے ہیں تو کیا ہم بھی اندھے بہرے بن جائیں؟"

مگر آپ اکیلے کیا کر سکتے ہیں؟"

"میں اکیلا کہاں ہوں، میرا یقین، میرے اصول میرے ساتھ ہیں۔"

وہ ایک جنونی اعتماد کے ساتھ جواب دیتا۔

"گھر میں نہیں ہیں دانے، میاں چلے بھنانے۔ میں کہتی ہوں کیا آپ نے ساری دنیا کو سدھارنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور پھر گھر میں آگ لگا کر سڑکوں پر دئے جلانا کونسی عقلمندی ہے؟"

"تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھو گی---"

"میں سمجھنا بھی نہیں چاہتی۔ جہاں آپ سارے جگ کے لئے کام کر رہے ہیں میرا بھی ایک چھوٹا سا کام کر دیجئے۔"

"کیسا کام؟"

"کہیں سے تھوڑا زہر لا دیجئے۔ میں اور میرے بچے کھا کر سو رہیں گے۔ اس کے بعد آپ جی کھول کر لوک سیوا کرتے پھریئے۔"

بیوی اپنے میلے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور وہ حیران پریشان کمرے میں بیٹھا رہ گیا۔ مگر بیوی کے آنسو، بچوں کا بلکنا، یاروں کی خفگی، پڑوسیوں کی جھڑکی، لوگوں کی گالیاں، حقارت، دھتکار اور تذلیل کوئی چیز اسے اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکی۔ لوگ اس سے جتنا کھنچتے وہ اتنا ہی ان کے قریب ہونے کی کوشش کرتا، وہ باہر سے جتنا ٹوٹ رہا تھا، بھیتر سے اتنا ہی جڑتا جارہا تھا، صحت گر گئی تھی مگر قوت ضبط میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا، البتہ اس بیچ اس کی بیوی کی ساڑی مسک گئی اور روتے روتے اس کے زرد رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں نقش ہو گئیں۔ منی کی کھانسی میں اضافہ ہو گیا۔ بڑا لڑکا اب کچھ زیادہ ہی سہا سہاسا رہنے لگا۔ خود اس کی پتلون کا رنگ اس قدر گدلا گیا کہ اس کے اصلی رنگ کی شناخت ناممکن ہو گئی۔ قمیض کا کالر پھٹ گیا۔ چپلیں ٹوٹ گئیں اور موچی ان میں ٹانکے لگاتے لگاتے تنگ آ گیا۔ مگر اس کے جوش وخروش میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بے پناہ ذمہ داریوں کے بوجھ سے اس کے کاندھے دبے جارہے تھے اور وہ زمین میں دھنستا چلا جارہا تھا، مگر وہ اپنی پوری قوت سے زمین پر پیر گڑائے رکھنے کی کوشش کرتا مبادا قدم ڈگمگا نہ جائیں۔

اور پھر یوں ہوا کہ ایک دن علی الصبح حسب معمول وہ مٹکے کا ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی کر اپنا میلا جھولا کاندھے سے لٹکائے گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ دروازے پر ایک پولیس کا سپاہی کھڑا دکھائی دیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے استفسار کیا۔

"کیا مسٹر ہریش چندر ادھر رہتا ہے؟"

"---جی---؟" لمحے بھر کے لئے وہ کانسٹبل کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

"فرمایئے، میں ہی ہریش چندر ہوں۔"

"تم کو انسپکٹر صاحب نے چوکی پر بلایا ہے۔"

"کیوں؟"

"اپن کو نہیں مالوم، چوکی پر چل کر صاب سے پوچھو۔"

"مگر---" اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔

"خیر---چلو---"

وہ کانسٹبل کے ساتھ تھانہ پہنچا، کانسٹبل اسے ایک سیلن زدہ کمرے میں ایک بوسیدہ سی کرسی پر بٹھا کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں ایک انسپکٹر داخل ہوا۔ انسپکٹر پر نظر پڑتے ہی وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ انسپکٹر نے اسے سر سے پیر تک گھور کر دیکھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔

"تو آپ ہی مسٹر ہریش چندر ہیں۔"

"جی ہاں---آخر بات کیا ہے؟ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟"

"آپ کے خلاف شکایت ہے کہ آپ لوگوں کو پریشان کرتے ہیں اور ان کے کاموں کا حرجہ کرتے ہیں۔"

"میں---؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"جی ہاں آپ!"

"مگر میں نے کیسے پریشان کیا ہے؟ کس کے کام کا حرجہ کیا ہے؟"

"ایک نہیں درجنوں شکایتیں ہیں۔"

انسپکٹر دروازے کی طرف مڑا اور بلند آواز سے بولا۔

"مہربانی کر کے آپ لوگ اندر تشریف لایئے۔"

چق ہٹی اور ایک ایک کر کے لوگ اندر آنے لگے اور وہ ان سب لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان میں اس کے دفتر کے ساتھی کالے، سید اور ڈیلشکھ کے علاوہ ریلوے کمپارٹمنٹ کے نوجوان طلبہ، سڑک پر پان کی پیک تھوکنے والا موٹا شخص، بس کی کیو والا جنٹلمین، اس کے محلے کا قصائی اور دوسرے درجنوں لوگ شامل تھے اور وہ سب نیم دائرے کی شکل میں اس کے گرد کھڑے اسے حقارت اور غصے سے گھور رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر صرف بدبدا کر رہ گیا۔ الفاظ اپنا آہنگ کھو چکے تھے۔ اس کا سر چکرانے لگا، آنکھوں کے گرد ترمرے سے اُڑنے لگے۔ انسپکٹر اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہہ رہا تھا۔

"مسٹر ہریش! میں تمہیں شہری ڈسپلن کو برباد کرنے اور شریف شہریوں کو پریشان کرنے کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں۔"

اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں اور اسے انسپکٹر کی آواز دور کسی تہہ خانے سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس پر غشی سی طاری ہو گئی اور دوسرے ہی لمحے اس کا سر کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔

☆☆☆

رضا جعفری

جنم بھومی کا انتظار

بات تو ہلکے پھلکے ڈھنگ سے شروع ہوئی تھی، مگر حالات اتنا اہم اور سنجیدہ موڑ لے لیں گے، یہ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

دراصل ہوا یوں کہ ایک دن میرا بیٹا ایک کمپیوٹر خرید لایا۔ وہ اپنے خالی وقت میں بڑے چاؤ سے اس میں لگا رہتا۔ کبھی غزلوں کی آواز آرہی ہے، کبھی فلم چل رہی ہے، کبھی کچھ ٹائپ ہو رہا ہے اور کبھی دور دراز کے ملکوں سے خط وکتابت کا سلسلہ ملایا جارہا ہے۔ غرض کمپیوٹر نہ ہوا الہ دین کا جن ہو گیا۔ ہر کام کے لئے حاضر۔

ایک دن میں نے اس سے ہنس کر کہا— "ارے بھئی! یہ تم کیا اس میں ہر وقت لگے رہتے ہو؟ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ کیا ہو رہا ہے۔ تمہارا کمپیوٹر کیا کچھ راز کی باتیں بھی کرتا ہے جو تم ہر وقت کان میں ہیڈ فون لگائے رہتے ہو؟"

وہ مجھے بزرگانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے بولے۔

"پاپا! یہ سب طرح کی باتیں کرتا ہے۔ اس میں پوری دنیا بند ہے۔ آپ بھی اس کو آپریٹ کرنا سیکھ لیجئے۔ آپ کا اچھا وقت گزر جائے گا اور نیا علم بھی ہاتھ آجائے گا۔"

بات تو اس کی مجھے معقول لگی۔ لیکن اب اس عمر میں کمپیوٹر سیکھنے کے لئے ذہن راضی نہیں ہوا۔ مگر چند دنوں کے بعد ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری پوری سوچ ہی بدل ڈالی۔

ایک دن ایک صاحب میرا گھر تلاش کرتے ہوئے آئے اور بولے۔ "کیا آپ کے کوئی عزیز امریکہ میں رہتے ہیں؟ مقصود احمد نام ہے ان کا؟"

ان کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا۔ مگر مقصود نام کا کوئی عزیز یاد نہیں آیا۔ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہیں، ہندوستان کا تو کوئی نہیں۔ ہاں، پاکستان کے کئی عزیز امریکہ اور دوسرے ممالک میں ضرور ہیں۔ مگر یہ مقصود احمد---؟"

وہ بولے---"ہو سکتا ہے میں نام کچھ بھول رہا ہوں۔ دراصل انہوں نے میرے ایک عزیز کے ذریعے جو کہ نیویارک میں ہی رہتے ہیں آپ کا پتہ منگوایا ہے۔ ان کو آپ کے لکھنؤ میں ہونے کا علم ہے۔ آپ اپنا فون نمبر وغیرہ جو بھی ہو دے دیں۔ وہ خود ہی آپ سے رابطہ قائم کرلیں گے---"

میرا بڑا بیٹا کمرے میں موجود تھا۔ اس نے اپنا کارڈ ان کے حوالے کر دیا۔ "لیجئے۔ اس میں پتہ وغیرہ سب کچھ ہے۔ آپ ان سے کہلوا دیجئے گا کہ وہ پاپا سے اسی پتے پر بات کرلیں۔ ہم انتظار کریں گے ان کی کال کا۔"

ظاہر ہے نیویارک کے نام پر اس کا تجسس بھی بڑھ گیا تھا۔

دوسرے دن جب میرے بیٹے نے رات کو اپنا کمپیوٹر کھولا تو دو منٹ بعد ہی وہ زور سے چلایا--- "لیجئے آگیا۔ آیئے پاپا، آپ کا ای۔ میل آیا ہے نیویارک سے۔"

میں باہری کمرے میں آیا جہاں کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔ اسکرین پر لکھا تھا۔ "میرا نام عزیز احمد ہے۔ میرے والد کا رئیس احمد اور والدہ کا فخر النساء۔ تقسیم ہند کے وقت ہم بھرت پور میں تھے۔ اپنے بارے میں تفصیل سے بتایئے۔ کیا آپ میرے خالہ زاد بھائی ریاض احمد ہیں؟"

اس تحریر کو پڑھ کر مجھے ایسا لگا تھا جیسے میرا پورا جسم کسی برقی رو کی زد میں آگیا ہو۔ بچپن کا زمانہ ایک دم سے اپنے پورے منظر کے ساتھ میرے ایک دم سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ایک غیر مرئی دھواں سا اٹھ کر سارے وجود پر چھانے لگا اور ذہن سے پرت پرت وقت کے پردے کھسکنے لگے۔ تقسیم ہند سے پہلے کا بھرت پور۔ نانا کا گھر۔ لمبے چوڑے کمپاؤنڈ کے بعد بڑا سا ہال۔ ہال کے چاروں طرف کشادہ کمرے اور ان کمروں کا احاطہ کئے لمبا چوڑا دالان۔ چند سیڑھیاں اتر کے آنگن۔ آنگن میں رنگ برنگے پھولوں کے ساتھ انار، کیلے اور کھجور کے پھل دار درخت۔ باہر فصیل بند خوبصورت شہر۔ دلّی دروازہ، متھرا دروازہ۔ رات کے وقت گھر کے بڑے ہال میں ڈراموں اور قوالیوں کے پروگرام۔ سارے کام تو ماموؤں کے اسکول کے ہوتے۔ میں اور عزیز احمد تو بس پردہ اٹھاتے اور پردہ گراتے۔ شام کو ماسٹر صاحب پڑھانے آتے۔ عزیز احمد کو سزا ملنے پر میرا ہنسنا۔ میرے پٹنے پر عزیز احمد کا قہقہے لگانا۔ اور پھر ایک دم سے سارے حالات بدل گئے۔ ایسا لگا جیسے کوئی بڑی آفت آنے والی ہو۔ نانا چھٹی لے کر گھر آگئے۔ گھر کے سب لوگ ہر وقت ڈرے ڈرے رہنے لگے۔ رات ہوتے ہی گھر کے سارے چراغ کم کر دئے جاتے۔ کہیں روشنی باہر نہ چلی جائے۔ گھر کے باہر سڑک پر رات ہوتے ہی فوجی مارچ شروع ہو جاتا۔ فوجیوں کے بوٹ کھٹا کھٹ بولتے۔ ایسا لگتا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ ساری زمین ہل جاتی۔ سڑک کے کنارے لگے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں فوجیوں کے سائے لمبے ہو کر گھر کی عمارت پر پھیل جاتے اور بھوتوں کی طرح ناچنے لگتے۔ میں اور عزیز احمد، ہم دونوں ڈر کے مارے آنگن کے ایک کونے میں چھپے یہ ڈراؤنا تماشہ دیکھتے رہتے۔

ایک دن صبح جب آنکھ کھلی تو دیکھا ابا بھی آگئے تھے۔ ان کے آتے ہی گھر میں حرکت سی آگئی تھی۔

۵۰۔ مقبرہ، گولہ گنج، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۸

[illegible] نے لگا اور کہیں جانے کی تیاریاں ہونے [illegible] ہوتے ہوتے گھر کے باہر کئی تانگے آکر [illegible] جب ہم روانہ ہوئے تو مجھے یہ دیکھ کر [illegible] باہری دروازے میں بند کنڈی لگائی گئی [illegible] سب کو بس جانے کی جلدی تھی۔ لوٹنے [illegible] کو بھی نہیں تھی۔

دوسرے دن کسی طرح سب لوگ لد پھند کر آگرہ [illegible] اور پھر شام کی گاڑی سے نانا، نانی، پانچوں ماموں، عزیز احمد اور اس کے بڑے بھائی بہن سب ایک ساتھ روانہ ہو گئے۔ میں نے رو کر امی سے پوچھا تو پتہ چلا وہ لوگ کراچی گئے ہیں۔ کراچی کہاں ہے مجھے نہیں معلوم تھا۔ میں ابا کے ساتھ الٰہ آباد آ گیا۔ اور وقت کی پڑیاں تیزی سے بدلتی چلی گئیں۔

میرا ذہن وقت کے جالوں کو چیرتا پھاڑتا جب باہر آیا تو میں نے دیکھا میرا بیٹا میرے جواب کا منتظر ہے۔ میں نے بدقت تمام اس سے صرف اتنا کہا۔ "یہ تو میرا سگا خالہ زاد بھائی ہے۔ ذرا دیکھو، فانوس کی گردش کیا کیا رنگ دکھاتی ہے۔"

میرے بیٹے نے اپنی آنکھیں دوسری فضا میں کھولی ہیں۔ اسی لئے شاید وہ میرے جذبات کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ وہ لاپروائی سے کمپیوٹر کا نوٹ پیڈ کھول کر کرسی سے مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا--- "لیجئے پاپا! آپ جو چاہیں مضمون ٹائپ کر دیں۔ میں ای میل کر دوں گا۔ مگر اگلی بار سے یہ ذمہ داری آپ کو ہی نبھانی ہو گی۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کروں گا۔"

"نہ کرنا بابا---" اپنے حواس میں لوٹتے ہوئے میں نے اس سے ہنس کر کہا۔ "لگتا ہے اب تو یہ سب مجھے سیکھنا ہی پڑے گا۔"

جوش اور خوشی کی ایک لہر تھی جو میرے اندر ہی اندر کہیں بہہ رہی تھی۔ میں نے اسی رو میں اپنے بارے میں اور اپنے بچوں کے بارے میں ساری کیفیات ٹائپ کر دیں۔ میرے بیٹے نے مجھے سارے فنکشن سمجھاتے ہوئے کمپیوٹر کو ہدایات دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری عبارت عزیز احمد کے پتے پر منتقل ہونے کا اشارہ موصول ہو گیا۔

دوسرے دن صبح ابھی ہم لوگ ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ فون کی لمبی گھنٹی بجی۔ میری بیٹی نے ریسیور اٹھایا اور کسی سے عادت کے مطابق لہک لہک کر باتیں کرنے لگی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد خوشی کے لہجے میں مجھے پکارتے ہوئے بولی۔

"لیجئے پاپا! آپ کا فون ہے نیویارک سے۔ عزیز انکل بول رہے ہیں۔"

میں نے ریسیور لے لیا۔ اب میں عزیز احمد کی آواز سن رہا تھا۔ بہت ہی مدھم اور ٹھہرا ہوا لہجہ۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب کر بول رہا ہو۔

"ابھی بیٹی سے بات ہوئی۔ بہت اچھا لگا۔ کیا زمانہ بدلا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ میں تم سے مخاطب ہوں۔ جذبات کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ بہر حال، حالات یہ ہیں کہ میں یہاں اپنے دونوں بیٹوں کے پاس ہوں۔ وہ یہاں ٹریڈ سینٹر میں ملازم ہیں۔ ایک بیٹی اور تمہاری بھابھی پاکستان میں ہیں۔ تم سناؤ کیسے ہو؟"

میں نے اپنے کو اس کی آواز کے سحر سے باہر نکالا--- "اللہ کا شکر ہے۔ میں ٹھیک ہوں اور ریٹائرڈ لائف گزار رہا ہوں۔ دونوں بیٹے اپنے کاروبار میں مصروف ہیں۔ بیٹی جس سے ابھی تمہاری بات ہوئی باہر بیاہی ہے۔ آج کل آئی ہوئی ہے۔ خدا کے فضل سے بہوئیں، داماد، ناتی پوتے سب خوش و خرم اور تندرست ہیں۔ کبھی ہندوستان آنے کا پروگرام بناؤ۔ تمہاری بھابھی تم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

وہ آہستہ سے ہنسا۔ "دل تو بہت چاہتا ہے وہاں آنے کو۔ دیکھو خدا کب بلاتا ہے تمہارے پاس۔ پہلے میں یہ سمجھتا تھا کہ آدمی کی موجودہ زندگی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ مگر اب جیسے جیسے عمر کی گاڑی آگے بڑھ رہی ہے ایسا لگتا ہے بچپن کہیں قریب آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ عجب دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے یہ۔ پتہ نہیں تم کو ایسا محسوس ہوتا ہے یا نہیں۔"

وہ ہنسا۔ پھر بولا۔ "خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ بات لمبی ہو جائے گی۔ آج تم سے باتیں کر کے دل کی بے چینی بہت بڑھ گئی ہے۔ اب آج یہیں تک رہنے دو۔ انشاءاللہ پھر ملاقات ہو گی۔ اللہ حافظ۔"

اور فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مجھے لگا ابھی اس کے دل میں بہت کچھ تھا کہنے کو۔ میرے دل میں بھی ایک ادھورا پن اٹک کر رہ گیا۔

دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد اس کا فون پھر آیا۔ "یار! میں نے سوچا تم فون کرو گے تو خرچہ آئے گا۔ یہاں یہ سہولت فری ہے۔ دراصل یہاں ایسا کوئی نہیں ہے جس کے ساتھ میں اپنا دکھ سکھ بانٹ سکوں۔ پتہ نہیں کیوں، مگر میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان سے آکر مجھ پر کیا گزری اور مجھ کو کس آگ کے دریا سے ہو کر گزرنا پڑا۔ مگر میں ڈرتا ہوں، پتہ نہیں تمہارے پاس وقت ہے بھی یا نہیں۔ کیا تم میری بات سن سکو گے؟"

وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ اس کے لہجے کی بے بسی نے مجھ کو ہلا کر رکھ دیا۔ "ارے۔ تم کیسی اجنبیت کی باتیں کر رہے ہو؟ میں تو تمہاری آواز سننے کے لئے ایک زمانے سے ترس رہا ہوں۔"

ایک لمحہ کو وہ کچھ نہیں بولا۔ مجھے اس کے گلے سے کچھ عجیب سی آوازیں نکلتی سنائی دیں۔ پھر وہ اپنے الفاظ منتخب کر کے آہستہ آہستہ بولا۔ "ہم لوگ جب یہاں آئے تھے تو دماغوں میں بڑے سبز باغ تھے۔ ایک مذہب ہو گا، ایک قوم ہو گی۔ اپنا ملک ہو گا۔ مگر افسوس ہم یہاں آکر پورے مسلمان بھی نہ رہے۔ ہم یہاں آکر اتنے خانوں میں بٹ گئے کہ اپنی ہی مسجدیں اور اپنی ہی امام باڑائیں اپنے ہی لہو سے لالہ زار ہو گئیں۔ قتل گاہ بن گئیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے یہاں سے باہری ملکوں میں جانے کے اچھے مواقع ہیں۔ ورنہ وہاں رہنا ہو تو زندگی جہنم سے کم نہیں ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ اتنے برسوں کے بعد آج بھی ہم مہاجر کے مہاجر ہی ہیں۔"

وہ رکا۔ پھر بولا۔ "تمہارے والد صاحب نے اچھا فیصلہ کیا تھا جو وہاں نہیں گئے۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ تم اور تمہارے بچے وہاں خوش و خرم ہیں اور اپنے حالات سے مطمئن ہیں۔"

میں نے فوراً کہا۔ "ہاں، خدا کا کرم ہے کہ ہمارے قدم اپنی ہی زمین پر ہیں۔ ہم یہاں آزاد اور باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ آگے بڑھنے کے لئے محنت اور جدوجہد تو ہر انسان کو کرنی پڑتی ہے۔ سو ہم بھی وہی کر رہے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک کہتے ہو۔" وہ مطمئن ہو کر بولا۔ "دراصل یہی وہ فرق ہے جو میں تمہیں دکھانا چاہتا ہوں۔ تمہارے بچے جو جدوجہد کر رہے ہیں وہ دیکھنے میں تو ضرور اپنے لئے ہے مگر دراصل اس کا فائدہ تمہارے ملک کو مل رہا ہے۔ تمہارا ملک سب کی محنت سے خوشحال ہو رہا ہے۔ جب کہ میرے بچوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنی ساری توانائی غیر ممالک میں صرف کر رہے ہیں۔ اپنا ملک پاکستان تو پہلے کی طرح اب بھی، بھیک کے نور اور مانگے کے اجالے میں رہنے پر مجبور ہے۔"

مجھے لگا اس کے دل میں بہت چبھن ہے، اپنے ہی

زخموں کی۔ ظاہر ہے اس کے ہم وطن بھی اگر اس کی طرح سوچتے تو آج تصویر ہی دوسری ہوتی۔ مگر زنجیریں بھی ان کی اپنی ہیں اور محبس وزنداں بھی ان کے اپنے ہیں۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ مجھے افسوس تو بہت ہوا مگر ساتھ ہی فخر کا ایک احساس بھی ہوا۔ میں نے اپنے کشادہ گھر اور آسودہ حال بچوں کی طرف دیکھا اور ایک دم سے میرے آگے ابا کا روشن چہرہ اور چمکتی ہوئی پرنور آنکھیں آگئیں جن میں کثیر الجہات تہذیب کی روشنی اور وطن عزیز کی مٹی کا پیار بھرا ہوا تھا۔

اب میں نے کمپیوٹر پر کام کرنا سیکھ لیا تھا۔ سیکھنا ہی پڑا کیونکہ عزیز احمد اپنے دل کا حال فون کے علاوہ ای میل کے ذریعہ بھی بھیجنے لگا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے لکھا۔ "دراصل یہ ملک ہندوستان سے آئے نیک دل اور سادہ لوح انسانوں کے رہنے کی جگہ ہے ہی نہیں۔ یہ تو بلوچیوں، پشتونوں اور پٹھانوں کا ملک ہے۔ یہاں وہ رواداری اور تہذیب کہاں۔ ایک وقت تھا جب یہاں کے لوگ خواب غفلت میں تھے۔ مگر آج سب بیدار ہو چکے ہیں اور اب انہیں مہاجروں کا وجود سرے سے برداشت ہی نہیں ہے۔"

عزیز احمد نے وہاں کے پٹھانوں کا جو نقشہ کھینچا اس نے دل میں ایک دہشت سی بٹھا دی۔ اس نے لکھا تھا۔ "یہاں کے پٹھان وہ خان صاحب نہیں ہیں جو تمہارے ملک میں ہوتے ہیں۔ یہ آفریدی پٹھان ہیں، راشہ پٹھان ہیں۔ یہ فوجیوں کا روایتی لباس زیب تن کئے رہتے ہیں۔ دس گز لٹھے کی شلوار جس کا بل کھاتا ہوا گھیر ٹانگوں کو دو منقش گرزوں کی طرح بنا دیتا ہے۔ کفوں اور کالروں کے بغیر لٹھے کی لمبی قمیص اور اس کے اوپر سیاہ رنگ کی صدری جس پر سیپ کے بٹنوں کی قطاریں کسی لشکر کی صف آرائی کا منظر پیش کرتی ہیں۔ سر پر سیاہ چمکدار بالوں کے پٹے جو مشہدی پگڑی کے نیچے سے جھانکتے ہیں۔ سرخ و سفید چہرے پر بڑی بڑی رعب دار مونچھیں اور پیروں میں دو انچ موٹے تلے کے پٹھانی چپل شاید اس لئے کہ چوڑی مضبوط ہڈیاں اور منوں وزنی گوشت زمین میں دھنس نہ جائے۔ ذرا تصور کرو۔ اگر تمہارے دروازے پر دو چار ایسے آدمی آکر کھڑے ہو جائیں تو تم کیا کرلو گے؟ کیا تم ایسے آدمیوں کو اپنے دروازے پر برداشت کرو گے؟ اور کرو گے بھی تو کب تک؟ یہاں تو روز یہی ہوتا ہے۔"

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا وجود کئی حصوں میں منقسم ہوتا ہوا مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جسمانی طور سے تو امریکہ میں تھا مگر دل اس کا اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ پاکستان میں تھا۔ اور جان —— جان تو اس کی پوری طرح ہندوستان میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ یہاں آنے کا بہت خواہش مند تھا۔ کبھی وہ میر اور غالب کا تذکرہ کرتا۔ کبھی کبیر اور نانک کا۔ کبھی اس کے دل میں دتی دیکھنے کی خواہش جاگتی اور کبھی لکھنؤ، آگرہ اور اجمیر جانے کی۔ مجھے لگا وہ سارے حالات کا مطالعہ بہت غور سے کر رہا ہے اور اب یہ حقیقت اس کی سمجھ میں پوری طرح آچکی ہے کہ مملکت خداداد کا جو خواب دکھا کر ایک پوری نسل کو تقسیم کیا گیا تھا وہ خواب دن کی روشنی میں چکنا چور ہو چکا ہے۔

میں بہت دنوں تک اس امید میں رہا کہ وہ یہاں ایک بار ضرور آئے گا۔ مگر ایک دن جب میں نے اپنے کمپیوٹر پر اس کے پیغام کو پڑھا تو مجھے ایسا لگا کہ وہ ذہنی طور سے ایک ایسے دور میں داخل ہو چکا ہے جہاں سے لوٹ کر آنا اب اس کے لئے کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اس نے مجھے بہت جذباتی انداز میں لکھا تھا۔

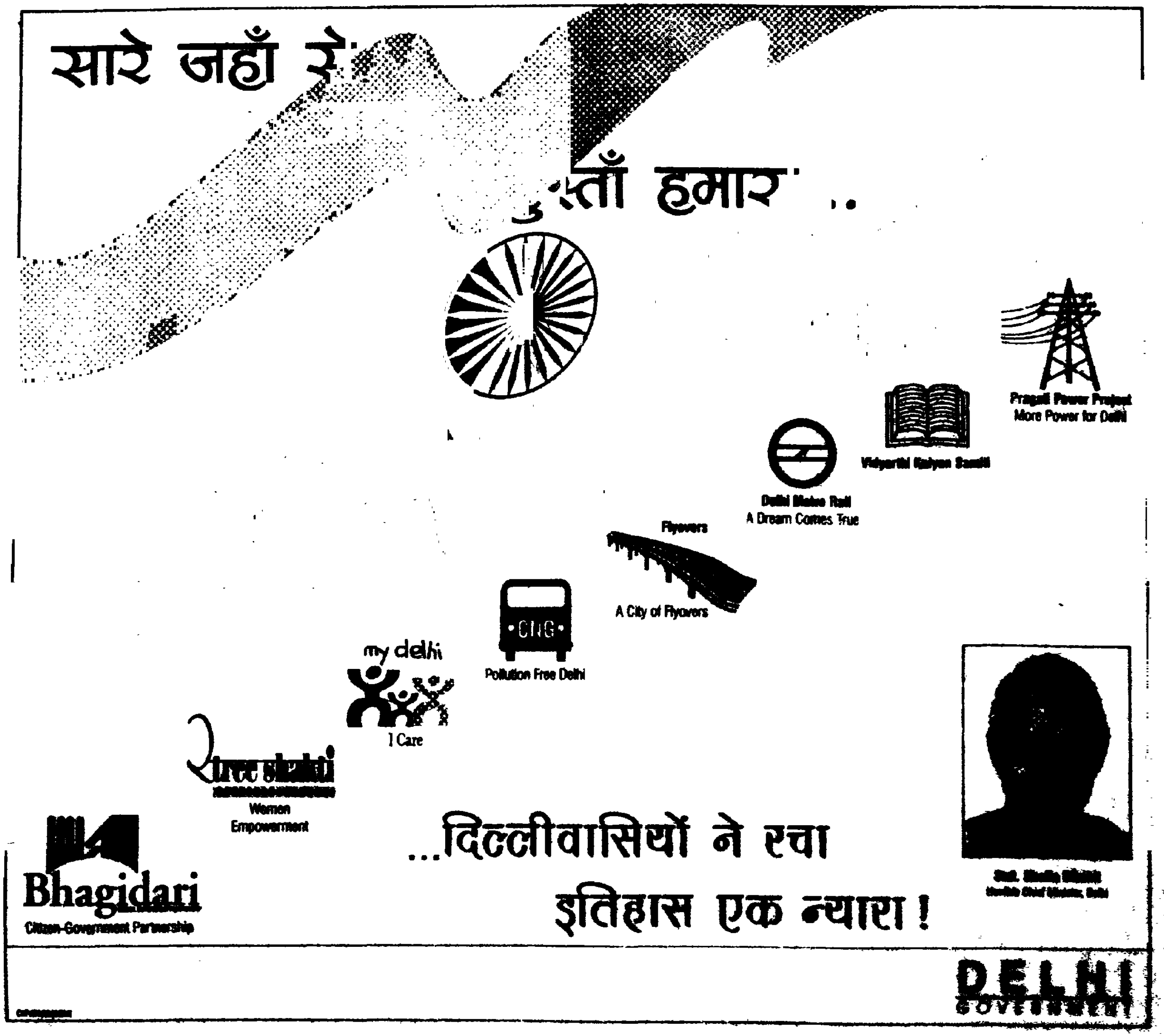
"بڑھاپے میں آدمی کا ماضی اپنی تمام تر مہلک رعنائیوں کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ بوڑھا آدمی ایک ایسے کھنڈر میں رہتا ہے جہاں بھری دوپہر میں چراغاں ہوتا ہے اور جب روشنیاں بجھا کر سونے کا وقت آتا ہے تو یادوں کے فانوس جگ مگ جگ مگ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مگر جیسے جیسے ان کی روشنی تیز ہوتی جاتی ہے کھنڈر کی دراڑیں، جالے اور ڈھنڈار پن زیادہ اجاگر ہوتے جاتے ہیں۔ بڑھاپے کے پہلے شب خون کے بعد ہر شخص پر وہ مقام آتا ہے جب دفعتاً اس کا من بچپن کی دنیا کی ایک جھلک، ایک آخری جھلک دیکھنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے۔ لیکن اسے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ بچپن اور بڑھاپے کے درمیان کوئی غیبی ہاتھ چپکے سے ہزار گنی طاقت کا ایک محدب شیشہ رکھ دیتا ہے۔ دانا کبھی اس شیشے کو ہٹا کر نہیں دیکھتے کیونکہ اس کے ہٹتے ہی ہر چیز خود اپنا منی ایچر معلوم ہونے لگتی ہے۔ کل کے دیو بالشتئے نظر آنے لگتے ہیں۔ بہروپ نگر کی ساری پریاں اڑ جاتی ہیں اور شیش محل پر کالک پت جاتی ہے۔ آدمی کو اپنی آنکھوں پر کسی طرح یقین نہیں آتا۔ وہ روپ بہروپ کیا ہوا۔ وہ چہکار مہکار کہاں گئی۔ اور یہ دھواں جو ہے یہ کہاں کا ہے وہ جو آگ تھی وہ کہاں کی تھی؟

اس نے آگے لکھا تھا۔ "تو بھائی اسارے قصے کا ماحصل یہ ہے کہ میں نے بہت سوچا، بہت منصوبے بنائے کہ میں وہاں اس ملک میں جاؤں جو میری جنم بھومی ہے۔ مگر شاید یہ سعادت میری قسمت میں لکھی ہی نہیں ہے۔ میں دراصل ان پیکروں کو ٹوٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا جو مجھ کو بہت زیادہ عزیز ہیں۔ اگر یہ پیکر ہی ٹوٹ گئے میرے بھائی! تو ذرا سوچو، پھر میں جی کر کیا کروں گا؟"

اس کے پیغام کو اسکرین پر میں نے ایک بار نہیں، بار بار پڑھا۔ مجھے ہر بار ایسا لگا جیسے شاخ سے ٹوٹا ہوا کوئی پتہ اپنی زمین کو پانے کے لئے ہوا میں لہرا رہا ہو۔ اس کے کرب کو محسوس کر کے میرا دل اداس ہو گیا۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور سوچا ابھی میں ایک کوشش اور کروں گا۔ میں اس کو لکھوں گا کہ تمہارا سوچنا ٹھیک ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ بات اس ملک کی مٹی اور تہذیب کے لئے مناسب نہیں ہے جس کے دروازے ہمیشہ اجنبیوں کے لئے بھی کھلے رہے ہوں۔ تم تو بالکل اپنے ہو۔ تم آؤ گے تو تم کو سب کچھ ویسا ہی ملے گا۔ کیونکہ تاج محل بھی نہیں بدلا اور نہ لال قلعہ۔ دتی کے بازار بھی وہی ہیں اور لکھنؤ کی شرافت بھی۔ گنگا اور جمنا کے دھارے بھی ویسے ہی ہیں اور یہاں کی دھرتی اور آسمان بھی۔ جب دل وہی ہیں تو کوئی چیز کیسے بدل سکتی ہے تمہارے لئے۔

مگر جب تک میں اس کو یہ سب لکھتا شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ منگل کا دن تھا اور ستمبر کی ۱۱ تاریخ۔ اندھیرا ہونے کے کچھ دیر بعد ہی میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ڈرائنگ روم گھر والوں سے بھرا ہوا تھا اور سب کے چہروں پر ایک تناؤ کی کیفیت تھی۔ مجھ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ سامنے کھلے ٹیلی ویژن پر امریکہ میں ہوئے ہوائی حملوں کے دلدوز مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ ایک لمحہ کو مجھ پر بھی سکتہ سا چھا گیا۔ مگر جب ذہن جاگا تو سب سے پہلے میرا دھیان عزیز احمد کی طرف گیا۔ وہ نیویارک میں تھا اور اس کے دونوں بیٹے ٹریڈ سینٹر میں ملازم تھے۔ میں نے فوراً ہی کمپیوٹر آن کیا اور خیریت بھیجنے کے لئے ای میل روانہ کر دیا۔

مگر وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میں منتظر ہی رہا۔ اس کا ای میل آیا اور نہ ٹیلی فون۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا گزر گئی اس پر۔ کاش وہ اپنا ارادہ نہ بدلتا اور لوٹ آتا یہاں۔ اپنی جنم بھومی میں جو کب سے انتظار کر رہی ہے اپنے گم شدہ بیٹوں کا۔ ☆☆



सारे जहाँ
हमार
Pragati Power Project
More Power for Delhi
Vidyarthi Kalyan Samiti
Delhi Metro Rail
A Dream Comes True
Flyovers
A City of Flyovers
Pollution Free Delhi
my delhi
I Care
Women
Empowerment
Bhagidari
Citizen-Government Partnership
...दिल्लीवासियों ने रचा
इतिहास एक न्यारा !
DELHI

تبصرے

نام کتاب : مزامیر

مصنف : ضیا میر
قیمت : ۲۰۰؍روپے
ملنے کا پتہ : مجلس ادب، ۵۰، تھرڈ کراس، اولڈ گروین پالیہ، ڈی آنر کالج پوسٹ، بنگلور۔۲۹

جناب ضیا میر کے مضامین، افسانے اور نظموں کا انتخاب "مزامیر" کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ ضیا میر کرناٹک میں اردو صحافت کا معتبر اور اہم نام ہیں۔ مزامیر کے مضامین کی فہرست پر نظر دوڑائی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ فنکار بنگلور اور آس پڑوس کے شہروں سے باہر نہیں نکل سکا ہے۔ اس کے باوجود ان کی فکر و نظر تیز تر ہے۔ مضامین کے ذیل میں محمود لیاز، محمود سعید، منیر نقش بندی کولاری، راقم قریشی، وزیر عرشی، خلیل خاور، رزاق افسر، علی حفیظ، الف احمد برق، حسنی سرور، سلیم ہاشمی اور فرحت کمال کے فن و شخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مدیر 'سوغات' محمود لیاز کے فن اور شخصیت کا احسن انداز میں جائزہ لیا ہے۔ ضیا میر نے محمود لیاز کو نہ صرف اچھا مدیر ثابت کیا ہے بلکہ عصر حاضر کا ایک حساس شاعر بھی گردانا ہے۔ محمود لیاز کی غزلوں کے چنندہ اشعار کا مطالعہ مزامیر میں کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ موصوف محمود لیاز مرحوم کے قریب رہ چکے ہیں۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مضمون میں مداحی نہیں ہے بلکہ مرحوم کی فراست اور کارکردگی پر معروضی انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

اردو میں خودنوشت اور سوانح عمریوں کی اپنی ایک روایت رہی ہے۔ اختر الایمان کی "اس آباد خرابے میں" ندا فاضلی کی "دیواروں کے بیچ" مشرف عالم ذوقی کی "سنانے میں تارا" وغیرہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ مزامیر میں بھی ضیا میر نے اپنی حالات زندگی اور ادبی سرگرمیوں کو من آنم میں سمودیا ہے۔ ضیا میر کے قلم سے نکلے ہوئے جملے ایک صدی کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ اس خودنوشت کے مطالعے سے قاری کو احساس ہوتا ہے کہ ہم فنکار کی زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ "من آنم" قاری کو فکر و آگہی دیتی ہے اور دور کا سیر حاصل احاطہ کراتی ہے یہ ضیا میر کے فن کا وصفِ خاص ہے۔

مزامیر میں شامل دو افسانے متصوفیانہ رنگ لئے ہوئے ہیں۔ "سچ بول" میں انسان کامل صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنے کی سعی جمیلہ کی گئی ہے۔ اس افسانے کا کردار سوچ میں گم ہو جاتا ہے کہ آخر یہ نور والی ہستی کیسی ہوگی۔ اس کا کردار خود دنیا چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکل جاتا ہے۔ "العطش العطش" بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔

ضیا میر ایک روشن ضمیر مضمون نگار، افسانہ نگار کی حیثیت سے قاری پر خوشگوار اثر چھوڑتے ہیں۔ مزامیر ایک ایسی کتاب ہے جو فنکار اور ان کے احباب کی حیثیت کی شناخت متعین کرتی ہے۔ انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی بصارت، بصیرت، مشاہدے اور باریک بینی کا آئینہ دار ہے۔

غضنفر اقبال سہروردی، گلبرگہ

نام کتاب : طلبہ کی بے چینی
اسباب و تدارک

مصنف : ہمایوں کبیر
مترجم : عتیق احمد
قیمت : ۷۵؍روپے
ملنے کا پتہ : ۴۴ / ۱۳۴۲ جعفر آباد، دہلی۔۵۳

آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے پی اے اور بعد میں خود وزیر تعلیم ہند ہمایوں کبیر نے حکومت ہند کو اپنی رپورٹ پیش کی جو طلبہ میں بے چینی کی نوعیت پر بحث کرتی ہے۔ وہ طلبہ میں سائنس، ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ وغیرہ کی جدید تعلیم کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ نصاب تعلیم کو کسی خاص مذہب یا اخلاق کے ماتحت رکھنا نہیں چاہتے۔ ان کی یہ کاوش کتاب کی شکل میں چھپی جس کا ترجمہ جناب عتیق احمد (اردو مترجم، دہلی میونسپل کارپوریشن) نے کیا۔ کتاب کا پہلا حصہ رپورٹ پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں وہ خطوط شامل ہیں جو ہمایوں کبیر نے اس وقت کے وزرائے اعلیٰ کے نام لکھے۔ غیر جانبدارانہ مطمح نظر کی یہ رپورٹ پسند کی گئی تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے اپنے خطوط کے ساتھ تمام ریاستوں کو ارسال کیا۔ "کتاب پڑھنے سے پہلے" ڈاکٹر شریف احمد کا مقدمہ ہے اس کے بعد مترجم و مصنف کے دیباچے ہیں اور پھر پنڈت جواہر لال نہرو کا پیش لفظ ہے۔ طباعت وڈیزائننگ صاف ستھری ہے، سرورق سادہ مگر دل کش ہے۔

کتاب طلبہ، اساتذہ، ماہرین تعلیم، حکومت اور ان سب افراد کے لئے مفید و کارآمد ہے جو تعلیم و تعلم سے شغف رکھتے ہیں امید ہے ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر توقیر احمد، دہلی

نام کتاب : نذر حبیب

مرتبین : شمیم جہاں / ڈاکٹر حسینی شاہد
قیمت : ۵۰؍روپے
ناشر : انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش

نذر حبیب ان مقالات کا مجموعہ ہے جو انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے دو روزہ سیمینار (۲۹۔۳۰ مارچ ۱۹۸۷ء) میں پڑھے گئے۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن اردو تحریک کے میر کارواں تھے۔ ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس سیمینار کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اس میں جو مقالے پڑھے گئے وہ صرف حبیب الرحمٰن مرحوم کی شخصیت اور خدمات سے متعلق نہ تھے وہ چونکہ مجاہد اردو تھے اس لئے ان پر جو سیمینار منعقد کیا گیا اس میں اردو کے ماضی، حال اور مستقبل کے حوالے سے فکر انگیز مقالے پڑھے گئے جن کی افادیت مسلم ہے۔ کسی مستقل کتاب اور مجموعہ مضامین میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ مستقل کتاب کی مجموعی قدر و قیمت کا جائزہ

ــے لئے بیحد ضروری ہے نیز آسان بھی ہوتا ہے جب کہ مضامین کے مجموعے کا معاملہ غزل کا سا ہے جس طرح غزل کا ہر شعر الگ الگ معیار کا ہوتا ہے۔ مضامین کی تنقید کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ہر مضمون کو تنقید کی کسوٹی پر کسا جائے خصوصاً جب یہ مضامین الگ الگ لوگوں کے ہوں تو ایسا کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ پیش لفظ میں پروفیسر حبیب الرحمٰن مرحوم کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی اردو دوستی کا بڑے والہانہ انداز میں اعتراف کیا گیا ہے جو مرحوم کی شخصیت کو اور بھی محترم بنا دیتا ہے۔

کنسرٹ کا نظام املا (رشید حسن خاں) اردو کی تہذیبی اہمیت (خواجہ احمد فاروقی) ہندوستان کے لسانی نقشے میں اردو کا مقام (ڈاکٹر خلیق انجم) اردو ابجد کا ساختی تجزیہ (ڈاکٹر اسلم پرویز) وغیرہ بھی مجموعہ کے بے حد اہم مضامین کہے جا سکتے ہیں۔ اور مضامین بھی ہیں جو اپنی حدود میں اہم ہیں۔ مثلاً مہاراشٹر میں اردو ماضی حال اور مستقبل (عبدالستار دلوی) اردو کے کچھ بنیادی مسائل (شہاب الدین دسنوی) ہندوستان کے لسانی نقشے میں اردو کا مقام (ڈاکٹر راج بہادر گوڑ) حبیب الرحمٰن کی شخصیت میری نظر میں (راج بہادر گوڑ) اردو کا مسئلہ (پروفیسر عبدالمغنی) حبیب الرحمٰن سیرت اور شخصیت (سری نواس لاہوٹی) اردو رسم الخط کے مسائل (پروفیسر محمد ذاکر) ہندوستان کے لسانی نقشے میں اردو کا مقام (منوہر راج سکسینہ) دکن کے ... رسید (ڈاکٹر رفیع رؤف) وغیرہ۔ ان مضامین سے بھی اختلاف کی گنجائش اگرچہ موجود ہے لیکن ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ کتاب کی قیمت نہایت کم اور چھپائی بے حد عمدہ ہے اسے ہم عصر حاضر کی ان مطبوعات میں جو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں بے جھجک شامل کر سکتے ہیں۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتابیں ادبی و غیر ادبی دونوں حلقوں میں قبول ہوں گی۔

جاوید در بھنگوی، نئی دہلی

نام کتاب : خواب بھی بکتے ہیں

مصنف : قاضی مشتاق احمد

قیمت : ۱۷۵ روپے

ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

اردو کے افسانہ نگاروں میں قاضی مشتاق احمد ایک معتبر نام ہے۔ آپ برسوں سے کہانیاں لکھ رہے ہیں اور اب تک کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'خواب بکتے ہیں' قاضی صاحب کے افسانوں کا تازہ ترین مجموعہ ہے جو ڈمائی آکٹو سائز اور لیزر کمپوزنگ میں سفید کاغذ پر صاف ستھرا شائع ہوا ہے۔ قاضی صاحب یقیناً ادب برائے زندگی کے قائل ہیں کیونکہ ان کے افسانے زندگی کی مختلف قدروں اور مسائل سے جڑے ہوتے ہیں۔ زندگی کا ہر مسئلہ انسانی فطرت کی پرتوں کو اتار کر اس کا اصلی روپ سامنے لاتا ہے۔ قاضی مشتاق احمد وسیع تجربے، رنگارنگ مشاہدے اور کھلے ذہن کے مالک ہیں اور زندگی کی صحت مند قدروں پر یقین رکھتے ہیں اسی لئے اپنے افسانوں میں ایسی قندیلیں روشن کرتے ہیں کہ سماجی تلخیوں اور مسائل کا سینہ چیر کر جینے کی امنگوں کو پنپنے اور آگے بڑھنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ 'خواب بھی بکتے ہیں' میں ۲۶ افسانے شامل ہیں جو میری نظر میں موضوعات زندگی کے رواں دواں بہاؤ پر انحصار کرتے ہیں۔ قاضی صاحب کے کردار ہم میں سے ہی ہوتے ہیں۔ وہ اجنبی نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے جانے پہچانے چہرے ہوتے ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قاضی صاحب اپنے احساس کی شدت اور جذبہ خلوص کی مدد سے ظاہری بدصورتی میں بھی حسن اور کشش تلاش کر لیتے ہیں اسی لئے انہوں نے اپنے افسانوں کے آئینے میں معاشرے کی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ ان کا اسلوب رواں اور سادہ ہے اور کہانی کی ابتدا سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اس طرح قاضی مشتاق احمد قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی 'خواب بھی بکتے ہیں' اردو کے افسانوی ادب میں ایک قابل قدر پیش کش ہے جس کا سرورق چار رنگوں کا خوبصورت اور پرکشش امتزاج ہے جو نظروں کو بھلا لگتا ہے، گویا یہ کتاب ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں سے مزین ہے۔ اردو میں اچھے افسانوں کے جویالے ضرور پسند کریں گے۔

نام کتاب : گرد سفر

مصنف : حسن داد خاں

قیمت : ۱۰۰ روپے

ناشر : مکتبہ شعر و حکمت، حیدر آباد

'گرد سفر' حسن داد خاں کا شعری مجموعہ ہے جس میں غزل اور نظم دونوں ہی ہیں۔ 'گرد سفر' سے پہلے شاعر کے دو مجموعے 'آواز شکست' اور 'ناتمام' شائع ہوئے تھے۔ ان دو مجموعوں سے بھی کچھ منتخب کلام اس کتاب کا حصہ ہے۔ کتاب کا پیش لفظ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے: "حسن داد خاں شاعری کے میدان میں کوئی پینترا دکھانے نہیں آئے ہیں بلکہ اپنے دل کی بات بتانے آئے ہیں اور ان کے دل میں فرسودہ مضامین، از کار رفتہ تشبیہات اور درد بھرے بیانات کا گزر نہیں۔ ان کے ہاں متانت اور صلابت ہے اور ان کی دردمندی اسی متانت اور صلابت کے پردے میں اپنی جھلک دکھاتی ہے ـــ غزل میں حسن داد خاں نے تھوڑے بہت بے تکلف، چلبلے لہجے کے علاوہ بھاری گمبھیر لہجہ بھی اختیار کیا ہے گویا مضمون کے اعتبار سے ہیئت اختیار کی ہے۔" اور ساتھ کچھ شعر بھی تائید کے طور پر دئے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

کبھی دل کھول کر رکھا ہے آگے
کبھی خاصی ادا کاری بھی کی ہے

وہ اب ہم کو بھول چکا ہے اس کی شکایت کیا کیجئے
ہم بھی اکثر بھول گئے ہیں کچھ دن پہلے کی باتیں

حرص و ہوس کے زخم بہت لاعلاج تھے
بے غیرتی کے زہر سے آرام ہو گیا

عرصہ ہوا کہ عہد جنوں ختم ہو گیا
اب کیوں سنبھال کر رکھی ہیں دامن کی دھجیاں

ایک مختصر سا مضمون مغنی تبسم کا ہے جس میں انہوں نے حسن داد خاں کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیا ہے۔

سفید دبیز کاغذ پر کمپیوٹر کتابت اور صاف ستھری طباعت سے مزین اس شعری مجموعہ کا سرورق بھی جاذب نظر ہے۔ حسن داد خاں کا مجموعہ 'گرد سفر' اردو شاعری کے شائقین کو ضرور پسند آئے گا۔

انور کمال حسینی، نئی دہلی

نام کتاب : ننھے منے چراغ (بچوں کے لئے)

شاعر : ضیاء الرحمٰن اعظمی

قیمت : ۴۰ روپے

ملنے کا پتہ : ۹۴۔ پچکلہ، نکیہ، اعظم گڑھ۔ ۲۷۶۰۰۱

بچے ہر ملک کے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ آج کے بچے کل کے ذمہ دار شہری بنتے ہیں جس کے سبب ان کی تعلیم و تربیت، تہذیبی اور ثقافتی

طور پر جس قدر اچھی اور مضبوط ہوگی اس کا اثر ملک کی بنیاد اور مستقبل پر پڑے گا۔ ان دنوں اردو میں بچوں کے ادب پر بہت کم توجہ دی جارہی ہے اور اس ریگ زار میں گلاب کھلانے کا عمل کم سے کم ہوتا جارہا ہے۔ ایسے میں بچوں کے لئے شعری مجموعہ 'ننھے منے چراغ' کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی درس وتدریس کے پیشے سے منسلک رہے۔ ایک معلم اور شاعر ہونے کا بہت ہی اچھا ثبوت انہوں نے اپنی شاعری میں دیا ہے۔ مجموعے میں کل ۴۲ نظمیں شامل ہیں جن میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ نظموں کی زبان عام فہم ہے جو بچوں کو آسانی سے سمجھ میں آجانے والی ہے اور اس کے ساتھ اضافت کا استعمال نہیں ہے، جو بچوں کی شاعری کے لئے حسن اور فن دونوں ہے۔ ہر نظم کے موضوع کی مناسبت سے نظم کے آخر میں ایک تصویر دی گئی ہے جس سے بچوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔ بچوں کی نفسیات اور ذہنی معیار کو شاعر نے نگاہ میں رکھتے ہوئے ان کو دلچسپی اور درس وپیام فراہم کیا ہے۔ جس میں خوشیاں، امنگیں اور رحمتوں کی وادیاں موجود ہیں۔ جس کے سیر سے بچے محظوظ ہوں گے اور ان کو اپنے ملک کے قومی ورثے کی جانکاری اور فطرت کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

اظہار ندیم، نئی دہلی

نام کتاب : پیاس کا صحرا

مصنفہ : مبینہ امام
قیمت : ۸۰؍روپے
تقسیم کار : نرالی دنیا پبلی کیشنز، 358-A بازار دہلی گیٹ، نئی دہلی۔ ۲

"لیکن میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ کیا میں خوش ہوں؟ میری تکمیل ہو چکی ہے؟ میں اب اپنے جذبات سے مجبور نہیں ہو سکوں گی؟

یہاں آکر میری سوچ تھم جاتی ہے، آگے خلا ہے۔ ایک ویران سناٹا اور وقت کی بے رحم تیز رفتاری!"

مذکورہ جملے مبینہ امام کی کہانی 'پیاس کا صحرا' سے ماخوذ ہیں، جو اس افسانوی مجموعے کا کلیدی افسانہ ہے۔ ان جملوں سے آج کی عورت کی عام سائیکی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مبینہ امام خاتون خانہ ہیں اور اپنی حدود میں جو کچھ سوچتی ہیں، اس کی یہ ایک جھلک ہے۔ ان کی کہانیوں میں عام طور پر انسانی رشتے، ان رشتوں کی ناہمواریوں، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے کرب اور بے چینی کو انتہائی حسین پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن سے آئے دن ہمیں سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

اس مختصر مجموعے میں ۱۳ افسانے اور ۹ منی افسانے شامل ہیں۔ یہ سبھی افسانے انتہائی سبک، سلیس اور عام فہم انداز میں پیش کئے گئے ہیں کہ کہیں بوجھل پن اور اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ ان میں سے زیادہ تر افسانوں میں ایسے مسائل بھی ہیں جن سے ایک خاتون خانہ آئے دن دوچار ہوتی رہتی ہے۔

"بڑے شہر کی لمبی کہانی" میں آج کے میٹرو پولیٹن سٹی کی ایک عام مرض 'مطلب پرستی' پر بھرپور طنز کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک آدمی اپنے کام کے لئے پریشان رہتا ہے اور جب اس کا کام نکل جاتا ہے تو وہ اس کی بھی ضرورت نہیں محسوس کرتا کہ 'شکریہ' جیسے رسمی لفظ بھی ادا کرے۔

مبینہ امام کے افسانوں کا عام رجحان اصلاحی ہے۔ یہ مجموعہ ایک خاتون خانہ کا دوسری خاتون خانہ کے لئے بہترین تحفہ ہو سکتا ہے۔

راحت جبیں، نئی دہلی

نام کتاب : صبح زرنگار

مرتب : محمد اسد اللہ
قیمت : ۷۵؍روپے
ملنے کا پتہ : ۳۰ گلستان کالونی، نزد پانڈے لانس (ویسٹ) عقب پولیس لائن ٹاکلی، ناگپور

'صبح زرنگار' ناگپور میں تین روزہ اردو ڈراما ورک شاپ میں پیش کئے گئے مقالات اور ڈرامے پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں تین مقالات "اردو ڈرامے کا ارتقائی سفر، جدید اردو ڈراما" اور "ڈراما: اصول اور تکنیک" کے عنوان سے شامل ہیں۔ ان تین مقالات کی مدد سے اردو ڈراما کی تاریخ و تکنیک پر اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالانکہ پوری تاریخ تو سامنے نہیں آتی لیکن اس فن کا تعارف ضرور ہو جاتا ہے۔ ڈراما: اصول اور تکنیک کی مدد سے اسٹیج، ٹی وی اور ریڈیو تینوں ہی ڈراموں کے فن پر بات کرتے ہوئے اس کے ارتقا کو ایک چارٹ کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ڈراما کے نورس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ڈراما نگاری کے فن پر بھی الگ الگ بات کی گئی ہے اور تینوں میڈیم کے لئے لکھے گئے ڈراما اسکرپٹ کے فرق کو مختصراً واضح کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ تینوں میڈیم پر الگ الگ مکمل بات ہوتی تاکہ اسکرپٹ رائٹر کو میڈیم کی ضرورت اور اسکرپٹ کی مانگ کا علم ہو سکے۔

کتاب کا خاص حصہ وہ آٹھ ڈرامے ہیں جو اس ورک شاپ کے دوران پڑھے گئے۔ یہ آٹھوں ڈرامے مختصر ہیں۔ اردو میں ڈراما کی کمی کا احساس سب کو ہے لیکن اسے دور کرنے کے لئے کوئی کوئی ہی کوشش کرتا ہے۔ یہ ورک شاپ اس ضمن میں ایک کامیاب کوشش ہے جس کے دوران آٹھ طبع زاد ڈرامے اور آٹھ ڈراما نگار منظر عام پر آئے۔ اس طرح کی کوشش مسلسل ہونی چاہئے اور اردو سے متعلق تمام اداروں کو مثبت کوشش کرنی چاہئے۔

اس کامیاب کوشش کے لئے محمد اسد اللہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خدا کرے کہ وہ اردو میں اچھے ڈراما نگاروں کی پوری کھیپ تیار کرنے کی غرض سے ڈراما نگاری پر مبنی ورک شاپ کا انعقاد کریں۔ کیونکہ اب بھی ہمیں تربیت دینے کے لئے حبیب تنویر، اصغر وجاہت، جاوید صدیقی، ساگر سرحدی وغیرہ جیسے اردو کے ڈراما نگار موجود ہیں۔

نام مجلہ : کتاب نما

(علی محمد خسرو: حیات وخدمات)

مرتب : پروفیسر اختر الواسع
قیمت : ۹۰؍روپے
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اردو میں نکلنے والے ادبی رسالوں میں 'کتاب نما' کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس رسالے نے نہ صرف اردو کے طلبہ اور ادیب وشاعر کی ضرورت پوری کی ہے بلکہ اردو زبان و ادب اور اردو تہذیب کی اعلیٰ شخصیات پر خصوصی شمارے پیش کئے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی "علی محمد خسرو: حیات وخدمات" ہے۔

علی محمد خسرو ہندوستان میں اقتصادیات اور اقتصادی انتظام و انصرام کے میدان کی ممتاز ترین شخصیات میں شمار کئے جاتے ہیں جنھوں نے مختلف سطح پر

ـ وقوم کی خدمت کی ہے۔ انہوں نے اقتصادی
ـت کے میدان میں ...ـک علی گڑھ ...یونیورسٹی میں
ہ چھوٹا بھی ہے ...ر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس
سلر اور چانسلر بھی رہے ہیں۔ فیڈرل ریپبلک آف
نی میں سفیر ہند رہے ہیں تو امریکہ اور جرمنی کی
رسٹیوں میں وزٹنگ پروفیسر اور فیلو بھی رہے ہیں
ض انہوں نے مختلف صورت میں ملک وقوم کی
مت کی ہے۔ ان کی بارہ کتابیں اقتصادیات و معاشیات
شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے ۱۵ پی ایچ ڈی اسکالرس کی
ئی بھی کی ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ ماہر اقتصادیات
نے کے باوجود اپنی تہذیب وثقافت اور زبان کو نہ
ل زندہ رکھنے میں سرگرم رہے بلکہ اس کے لئے ایک
نہ بن گئے۔

کتاب میں شامل مقالات سے نہ صرف ان کی
ـیت ابھر کر سامنے آتی ہے بلکہ ان کے خاندان اور
جودہ فیملی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کی تصنیفات اور
رونیات کا علم ہوتا ہے۔ کتاب میں شامل اختر الواسع اور
ـنت احساس کے ساتھ خسرو صاحب کا طویل انٹرویو
ـے کی چیز ہے جس سے خسرو صاحب کی شخصیت کے
ـیلی عناصر کے ساتھ ساتھ گزشتہ صدی کی تیسری
ـی دہائی کے دوران حیدر آباد کی تہذیبی زندگی کی
ـ نہایت اہم اور دلچسپ تصویریں نظر آتی ہیں اور
ـشتہ پچاس برسوں میں ہندوستان اور ہندوستانی
ـسانوں کی اہم سرگرمیوں کی تصویر بھی سامنے آتی ہے۔

اس معلومات افزا خوبصورت کتاب کے لئے
ـب نما' کے ایڈیٹر جناب شاہد علی خاں اور کتاب کے
ـتب جناب اختر الواسع مبارکباد کے مستحق ہیں۔

محمد کاظم

ـم کتاب: مقالات

ـتب : محمد ہارون

ـت : ۲۰۰ روپے

ـہ : ۸۔ فرسٹ فلور، ہندوستان بلڈنگ
۱۰/۲ ٹی پی اسٹریٹ، ممبئی۔۴

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنے کارہائے
ـاں کے سبب اپنی وفات کے بعد بھی ہمارے درمیان
ـہ اور موجود رہتی ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی ایک
ایسی ہی عبقری شخصیت کا نام ہے جنہوں نے اپنے اعمال
وافعال اور خدمات کے ذریعہ دلوں پر حکمرانی کی ہے اور
"جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ" ہوتا ہے۔

مولانا کے علمی و ادبی کارناموں کا دائرہ بڑا وسیع
ہے۔ ایک طرف تاریخ اسلامی، اسوہ حسنہ، تاریخ صحابہ،
حکمائے اسلام پر انہیں دسترس حاصل ہے اور ان
موضوعات پر گراں قدر کتابیں لکھی ہیں تو دوسری طرف
اردو شعر و ادب اور تنقید میں بھی انہوں نے گراں قدر
اضافے کئے۔ شعر الہند، اقبال کامل کے علاوہ اردو ادب
سے متعلق ان کے کئی اہم مقالات شائع ہو چکے ہیں
جنہیں 'مقالات عبدالسلام' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب 'مقالات' دراصل ان مقالات کا
مجموعہ ہے جو گزشتہ ۱۳۔۱۴ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو ممبئی میں
"مولانا عبدالسلام: حیات اور علمی فتوحات" سیمینار میں
پیش کئے گئے تھے۔ یہ مولانا کی ہشت پہلو شخصیت کے
تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ مولانا ناقد بھی
تھے، شاعر بھی۔ تاریخ داں بھی تھے، ماہر اقبالیات اور
صحافی بھی۔ عربی، فارسی اور اردو پر وہ یکساں عبور رکھتے
تھے چنانچہ انہوں نے بیش بہا ترجمے بھی کئے۔ اس کتاب
میں کوشش کی گئی ہے کہ ان کی شخصیت کا کوئی پہلو
چھوٹنے نہ پائے۔

کتاب کے مرتب محمد ہارون صاحب یقیناً مولانا
کے لائق وراث ہیں جن کی سعی مشکور کا ہی نتیجہ ہے کہ
اتنا کامیاب سیمینار منعقد ہو سکا اور اتنی خوبصورت کتاب
شائع ہو سکی۔ یہیں یہ بات بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ
مولانا کے انتقال کے ۴۶ سال بعد بھی ان کی غیر
مطبوعہ تحریریں اگر نہیں شائع ہو سکیں تو یہ ہمارے لئے
تشویش کی بات ہے۔ مبادا یہ ضائع ہو جائے اور ہم ان
سے محروم رہ جائیں۔ اس لئے اس وقت ہماری پہلی
کوشش ہونی چاہئے کہ ہم انہیں جمع وترتیب کے بعد ان
کے شائع کرنے کا اہتمام کریں۔ دارالمصنفین کے
احباب اس کام کو بحسن وخوبی انجام دے سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں ۱۴ بہترین مقالے شامل ہیں۔
ان مقالوں میں کیا کچھ ہے وہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔
آپ خود پڑھیں اور فیصلہ کریں۔

ابرار رحمانی

نام کتاب : جواز و انتخاب

(۱۹۸۰ء اور بعد کی غزلیں)

ترتیب و مقدمہ : کوثر مظہری

قیمت : ۳۰۰ روپے

رابطہ : شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

اردو کی نئی نسل کو خصوصاً ۸۰ اور ۱۹۹۰ء کی دہائی
میں منظر عام پر آنے والے شاعروں، ادیبوں کو یہ عام
شکایت رہی ہے کہ کوئی مستند نقاد ان کی کاوشوں کو نہ
سراہتا ہے اور نہ انہیں نئی نسل کا ابھرتا ہوا فنکار سمجھتا
ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ نئی نسل کے ابھرتے ہوئے
نقاد کی شکل میں کوثر مظہری نے نئی نسل کی اس شکایت
کو دور کر دیا ہے۔ اب ایسے فنکاروں کو پرانے نقادوں
سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن نئی نسل کا یہ
ابھرتا ہوا ممتاز نقاد بھی اپنی پہلی کاوش میں ہی مصلحتوں
کا شکار نظر آتا ہے۔ اس کے اندر یہ ہمت نہیں ہو سکی
کہ جہاں اس نے ان لوگوں کے نام گنائے ہیں جنہوں
نے اس کی درخواست کو درخور اعتنا نہیں سمجھا وہیں دو
شخصیتوں کے نام مصلحتاً پردۂ راز میں رکھا۔ اگر اس نئے
نقاد میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ ان دو ناموں
کو وا کر سکے تو پھر یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ تخلیق کار
کا بے لاگ مبصر ہوگا۔ کیونکہ یہ ایسے نقاد ہیں جنہوں
نے اپنے طویل دیباچے میں مابعد جدیدیت کا احاطہ
کرنے کی کوشش میں نئی نسل کو یہ باور کرایا ہے کہ علم
کے میدان میں وہ مستند نقادوں سے کم نہیں تاہم جب
مصلحت سمجھتے ہیں تو کسی ادبی تخلیق کو بھی وہ حدیث اور
قرآن کی روشنی میں بھی پرکھتے ہیں۔ حدیث و قرآن
کے اصول سے اگر ادبی تخلیقات کو پرکھا جائے گا تو ہر
تخلیق گناہوں کا مجموعہ ہی نظر آئے گی۔

اس جملہ معترضہ کے بعد عرض ہے کہ اس
انتخاب میں جن لوگوں کو شامل کیا گیا ہے اور ان پر جو
مبصرانہ نوٹ لگائے گئے ہیں اس کی تعریف نہ کرنا مناسب
نہیں۔ بہر حال یہ ایک اچھی کاوش ہے اور ممکن ہے کہ
اس سے متاثر ہو کر کچھ اور لوگ بھی اس طرح کی کوشش
کریں۔ مجموعے میں چالیس نوجوان غزل گو شعرا کو شامل
کیا گیا ہے۔ یہ 'جواز و انتخاب' ۴۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

م۔ ر۔ ف

MOTORISTS
Use Seat Belts



It is for your safety

Attention of general public is invited to the order of the Honourable Supreme Court

(dated 6.12.2001, in writ petition (civil) of 1985 - M.C.Mehta Vs Union of India.)

It is mandatory that the driver and the person seated in the front seat wear seat belts while the vehicle is in motion.

Issued in Public interest by the Directorate of Advertising & Visual publicity, Ministry of I&B,Govt. of India.

davp 2001/605

چتی خط ملتو خدا

● فروری 'آجکل' ۲۰۰۲ء کا شمارہ ملا 'غالب اور عہد غالب' غیر معتدل اور غیر متوازن مقالہ ہے۔ بدقسمتی سے مضمون نگار نے کچھ مفروضے مرتب کر کے ان پر اظہار خیال کیا ہے۔ غالب کے بارے میں ان کے قلم نے ہمدردی کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا ہے حالانکہ غالب ۱۸۵۷ء کی شورش سے بیزاری میں اکیلے نہیں تھے۔ باغی سپاہیوں کی غارت گری نے سب کو خصوصاً اہل دلی کو ان سے برگشتہ کر دیا تھا پھر بھی غالب نے انگریزی سفاکی کی مذمت کی۔ ان کا قطعہ:

بسکہ فعال، یزید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

ان کے اسی جذبہ کا مظہر ہیں۔ اگر مقالہ نگار یہ چاہتے ہیں کہ غالب "سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری" کا نعرہ لگا کر تلوار پکڑ کے باغیوں میں شامل ہو جاتے، تو ظاہر ہے ایسا نہیں ہوا لیکن انگریزوں کی سفاکی کے خلاف انہوں نے احتجاج ضرور کیا۔ سر سید نے ہنگامہ کے دوران اپنی جان خطرے میں ڈال کر انگریزوں کو بچایا اور پھر اسباب بغاوت ہند لکھ کر برطانوی سامراج کے منہ پر طمانچہ بھی رسید کیا۔ دانشوروں کا قلم ہی ان کا ہتھیار ہوتا ہے اور غالب اور سر سید نے اسے استعمال کیا۔

مقالہ نگار نے بنگال کی انقلابی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے وہابی تحریک، فرائضی تحریک وغیرہ کا ذکر نہیں کیا۔ مولانا ولایت علی صادق نوریؒ کے بھائی مولانا عنایت علیؒ نے بنگال میں وہابی تحریک کے ذریعہ بغاوت کی ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ بنگال کے مسلمان کسان اور کمزور طبقات کے لوگ سر سے کفن باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہابیوں کی تحریک جہاد کو سب سے زیادہ مجاہد بنگال سے ہی ملتے تھے۔ غالب جب کلکتہ میں تھے اس وقت وہاں وہابیوں کی تحریک سرگرم تھی۔ بنگال کے ہندو انقلابیوں میں انگریزوں کے خلاف جو بغاوت پیدا ہوئی اس پر وہابیوں کی تحریک کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہنٹر نے اپنی کتاب "آور انڈین مسلمان" میں بنگال میں وہابیوں کی انگریز دشمن سرگرمیوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

مقالہ نگار نے سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ وہ غیر ذمہ دارانہ اور بے جا تعصب پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً انہوں نے وہابی تحریک کا گہرائی اور غیر جانبداری سے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ انہیں نہیں معلوم کہ ابتدا میں وہابیوں میں مقلد اور غیر مقلد دونوں شامل تھے اس سلسلے میں مولانا آزاد کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جو انہوں نے اپنے والد مولانا خیر الدین کے بارے میں لکھا ہے:

"انہوں نے وہابیوں کو دو اصولی قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ کہتے تھے دو فرقے ہیں ایک اسماعیلیہ دوسرا اسحاقیہ۔ اسماعیلیہ سے مقصود وہ فرقہ تھا جو بدعات و رسوم کی مخالفت کے ساتھ تقلید شخصی کا بھی تارک ہو جیسا کہ مولانا اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔ اسحاقیہ سے مقصود وہ فرقہ ہے جو حنفیت و تقلید سے انکار نہیں کرتا لیکن بدعات و رسوم کا مخالف ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ شاہ محمد اسحاق نے مآۃ مسائل میں بدعات اور رسوم سے اختلاف کیا ہے مگر تقلید و حنفیت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے۔"

مقالہ نگار نے شاہ اسماعیل کو مقلد اور تارک سنت ثابت کرنے کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی کا اقتباس نقل کیا ہے حالانکہ مولانا سندھی ایک متنازعہ فیہ شخصیت ہیں اور بہت سے ثقہ دیوبندی بھی ان کی باتوں کو لائق استناد نہیں سمجھتے۔

ذرا سوچئے یہ کیسے ممکن تھا کہ سید احمد رائے بریلوی جو علم و فضیلت میں شاہ اسماعیل جیسے عالم جلیل اور مجاہد کبیر سے کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے انہیں ترک سنت کا مشورہ دیں اور وہ مجتہد عصر بلا چون و چرا اسے قبول کر لے گویا وہ امام وقت دینی حمیت، عزیمت و استقامت سے بالکل تہی دامن تھا اور اس نے قطعی یہ نہیں سوچا کہ مرشد کی ہدایت کے مقابلے میں رسول کی سنت پر عمل، عزیمت لازمی ہے۔

اطہر نقوی، نئی دہلی

● شمیم طارق نے 'غالب اور عہد غالب' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مولوی سید احمد اور مولوی شاہ اسماعیل دہلوی وہابی اور غیر مقلد نہیں تھے۔ حالانکہ یہ بات ایسا ہی سچ ہے جتنا گوئبلز کا سچ ہو سکتا ہے کہ جھوٹ بولو بار بار بولو تا کہ لوگ اس جھوٹ کو سچ سمجھ لیں۔ سہو کالی داس گپتا رضا سے نہیں بلکہ طارق صاحب سے ہوا ہے۔ یہ تجاہل عارفانہ بھی ہو سکتا ہے۔ مولوی سید احمد مقلد وہابی یعنی گلابی وہابی تھے۔ اور مولوی شاہ اسماعیل دہلوی غیر مقلد وہابی تھے۔ بلکہ ہندوستان میں غیر مقلدوں کے باوا آدم تھے۔ انہوں نے ہی انگریزوں کے ایما پر لکھی جانے والی محمد بن عبد الوہاب نجدی کی مشہور کتاب کتاب التوحید کا اردو ترجمہ تقویۃ الایمان کے نام سے کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ہندی مسلمانوں کے درمیان ایک بے چینی پھیل گئی تھی اور آگے چل کر ایک نیا فرقہ پیدا ہوا جو اہل حدیث کے نام سے مشہور ہوا۔

عبد المجید، ہانگل

● شمیم طارق کے مضمون 'غالب اور عہد غالب' میں کئی سخن گسترانہ پہلو آ گئے ہیں۔ انہوں نے تحریک ۱۸۵۷ء میں وہابیوں کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ۱۸۵۷ء کی دیسی سپاہیوں کی بغاوت کے پیچھے وہابیوں کا ہاتھ تھا جب شاہ اسماعیل اور سید احمد نے تحریک جہاد شروع کی تو وہابی کارکن واعظوں کے بھیس میں انگریزی چھاؤنیوں میں جاتے تھے اور دیسی سپاہیوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر اکساتے تھے اور انہیں تحریک جہاد میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔

حیدر آباد میں نظام دکن نواب ناصر الدولہ کے بھائی نواب مبارز الدولہ نے مولانا ولایت علی کے ہاتھ پر بیعت کی اور وہابیوں نے حیدر آباد میں انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں سے خفیہ رابطے قائم کر لئے۔ بدقسمتی سے راز فاش ہو گیا۔ مبارز الدولہ گرفتار کر کے قلعہ گولکنڈہ میں مقید کر دیے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ مولوی نجم الدین سکھ فوج کے مسلمان سپاہیوں کو جہاد میں شرکت کی ترغیب دینے کے الزام میں گرفتار ہو کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں پیش کئے گئے۔ مہاراجہ ان کی لیاقت سے بہت خوش ہوئے اور انہیں اپنی فوج میں ملازمت کی پیش کش کی۔ مولانا نے فرمایا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلے ہیں کسی کی نوکری نہیں کر سکتے۔ مہاراجہ نے انہیں پچاس روپے، دو صافے اور ایک گھوڑا انعام دے کر اپنے سپاہیوں کی حفاظت میں دریائے اٹک تک بھجوا دیا۔ بدقسمتی سے وہابیوں کی یہ کوشش مغل شہزادوں نے ناکام کر دی۔ انہوں نے جنرل بخت خان کو کام نہیں کرنے دیا۔

شمیم طارق نے سورگیہ کالی داس گپتا رضا پر سہو کا الزام لگایا ہے کہ وہ مولانا فضل حق کو صاحبان تقلید اور شاہ اسماعیل اور سید احمد کو غیر مقلد اور وہابیوں کا علم بردار کہتے ہیں۔ گپتا صاحب کی بات صحیح ہے اور غلط فہمی شمیم طارق کو ہوئی ہے۔ مولوی فضل حق نے وہابیوں خصوصاً شاہ اسماعیل کے رد میں عقیدہ امتناع النظیر پر غالب سے "معنوی بیا نموداری شان نبوت" لکھوائی اور غالب نے عقلی استدلال کے تحت شاہ اسماعیل کی فکر کی تائید کی تو انہوں نے غالب کو مجبور کیا۔

شمیم طارق کا یہ کہنا کہ سید احمد کٹر حنفی تھے وہابی نہ تھے مضحکہ خیز ہے اگر وہ وہابی نہ تھے تو وہابی تحریک کے امیر قائد جہاد اور وہابی ریاست (صوبہ سرحد) میں امیر المومنین کیسے بن گئے۔ کیا کسی عقیدہ اور نظریہ کا مخالف اس نظریہ یا عقیدہ کی علم بردار جماعت کا امیر بن سکتا ہے۔

اسی طرح شاہ ولی اللہ کو حنفی کہنا بھی غلط ہے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے صاحبزادگان گرامی شاہ عبد القادر شاہ رفیع الدین اور ان کے پوتے شاہ اسماعیل اور اسی سلسلے کی آخری کڑی ابوالکلام آزاد علمائے مقلدین نہیں علمائے مجتہدین تھے۔ اپنے علم اور بصیرت کے اعتبار سے خود امام کے مرتبہ پر فائز تھے انہیں کسی کی تقلید کی حاجت نہ تھی۔ قرآن و حدیث سے استنباط کا ملکہ اللہ نے انہیں عطا کیا تھا۔ میری درخواست ہے کہ شمیم طارق صاحب مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب "مولانا سندھی کے افکار پر ایک نظر" کے ساتھ "اہل حدیث اور سیاست" کا بھی مطالعہ فرمالیں تو ان کی غلط فہمی دور ہو گی۔

عبدالغنی شیخ کا مضمون 'قلم، قلم کار اور کتاب' اس لحاظ سے مایوس کرتا ہے کہ اس میں صرف مغربی اہل قلم کا ذکر ہے۔ زندانی ادب میں نہ کالی داس کے میگھ دوت کا ذکر ہے نہ خاقانی کی جیدٗ شاعری کا نہ حسرت موہانی کی مشق سخن اور چکی کی مشقت کا، نہ ابن تیمیہ کا ذکر کہ جب جیل میں ان سے قرطاس قلم چھین لئے گئے تو انہوں نے کوئلہ سے زندان کی دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا اور جنوں کی حکایت خوں چکاں لوح و قلم چھن جانے پر بھی لکھتے رہے۔ آخر عبدالغنی شیخ کی نگاہ اپنے گرد و پیش پر کیوں نہیں جاتی۔

امیر احمد شمسی، نئی دہلی

● جناب شمیم طارق کا مضمون 'غالب اور عہد غالب' بہت پسند آیا۔ فاضل مضمون نگار نے انتہائی معروضی انداز میں عہد غالب کا جائزہ لیتے ہوئے غالب کی شخصیت اور ان کے فکر و عمل کا تجزیہ کیا ہے جس سے نہ صرف ان کی خود ساختہ خودداری کی قلعی کھلتی ہے بلکہ ان کے ذہنی رویوں پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ شعری حصے میں محسن جلگانوی اور فضیل جعفری کی غزلیں خاص طور سے پسند آئیں۔

مقبول احمد مقبول، بیدر

● عبدالغنی شیخ کا سلسلہ وار 'قلم، قلم کار اور کتاب' معلومات کا خزانہ ہے، جس پر بیحد محنت کی گئی ہے اس کے لئے آپ دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سمپورن سنگھ ہوڑہ، میرٹھ

● شمیم طارق نے غالب کو بالکل ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ 'غالب اور عہد غالب' کا یہ رخ پیش کرنے کے لئے شمیم طارق مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ترنم ریاض نے مرد ذات کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بڑا ہی مکروہ اور قابل نفرت ہے۔ آدمی کی خود غرضی یہ انتہا ہے۔ نشاط اسلم کے [illegible] فرید کا انجام بھی موجودہ تہذیب [illegible]

عبدالغنی شیخ کا 'قلم [illegible]' ادب کا بیش بہا خزانہ ضرور ہے مگر اردو ادب کے معاملے میں بڑی تشنگی سی محسوس ہوتی ہے کیا ہوتا اگر شیخ صاحب اسی نہج کی چیز اردو ادب کے بارے میں پیش کرتے۔

ڈاکٹر محمود شیخ کا مضمون 'معیشت و کالونی شعور' ایک فکر انگیز مضمون ہے۔ میں ڈاکٹر [illegible] کو داد دینا چاہتا ہوں کہ ایک بہت ہی پیچیدہ ادبی مسئلہ آسان لفظوں میں قاری کے ذہن نشین کرا[illegible] کامیاب ہوئے ہیں۔ فضیل جعفری کی غزل کا [illegible] آج کے اردو ادب کی حقیقی تصویر ہے۔

حال ادب کا اب یہ ہے، طبلے اور سار[illegible]
لکھ رہے ہیں تنقیدیں 'پاکلیں' غزل خواں [illegible]

محمد آل رسول، سا[illegible]

● شمیم طارق کا مقالہ بہت اچھا لگا۔ انہو[ں نے] غالب کو سمجھنے کا جو موقف اپنایا ہے وہ اچھا [illegible] سعید خاں، فضیل جعفری، رحمن وا[illegible] گلے ساز او[ر] جلگانوی کی غزلیں بہت ہی اچھی ہیں۔

راجپور نجن گری، [illegible]

● عبدالغنی شیخ کا مقالہ 'قلم، قلم کار اور [کتاب]' پڑھا۔ بہت افسوس ہوا کہ شیخ نے 'شیخ شرف [الدین] بہاری' کو چھوڑ دیا جب کہ یہ عالم اسلام کے [illegible] بڑے کثیر التصنیف مصنف ہیں۔

خواجہ در[illegible]

● 'آجکل' کی روایت کے خلاف اس فروری کا شمارہ غالب نمبر نہیں ہے لیکن شمیم طا[رق کا] مضمون 'غالب اور عہد غالب' اور آجکل کی پرانی [illegible] ایک مضمون مرزا غالب کی خود نوشت سوانح [illegible] ایک نظر سے غالب نمبر کی کمی پوری ہو گئی ہے۔

شمیم طارق کا مضمون خصوصیت سے مطالعہ ہے۔ مختصر مضمون میں اس عہد کی پوری سما گئی ہے۔ مسلمانوں کی ملی اور احیا پسند تحریکو[ں]

بنگال کی قومی اور اصلاح پسند تحریکوں اور پھر اس کے بعد انقلابی تحریکوں کو جس طرح متعارف کرایا گیا ہے اور اس سے غالب کے دعووں کا تقابل کیا گیا ہے وہ کوئی معمولی کام نہیں تھا لیکن فاضل مضمون نگار نے اس مشکل کام کو بڑی خوبی سے ادا کر دیا ہے۔

غالب فارسی اور اردو کے عظیم شاعر ہیں اور ان کی عظمت کا تقاضہ تھا کہ ان کو ان کے عہد کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ عربی شاعروں پر گفتگو کرتے ہوئے عربی ادب کے ناقدوں نے عہد کا ضرور جائزہ لیا ہے۔ اردو میں بھی یہ روایت موجود ہے مگر شمیم طارق نے اس کام کو زیادہ بہتر طریقے سے کیا ہے۔

محمد شفیق ندوی، تھانہ

● غالب سوالیہ نشان بھی ہیں اور جواب بھی ہیں۔ غالب اردو ادب میں فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں۔

شیخ عبداللہ، آکولہ

● مرزا غالب سے متعلق شمیم طارق کی تحریر پڑھ کر ایسا محسوس ہوا کہ ایک چھوٹی تصویر کو بڑے فریم میں یا پھر بڑی تصویر کو چھوٹے فریم میں زبردستی لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب صرف اپنی ادبی عظمت کی وجہ سے پچھلے ایک سو پچاس سالوں سے اردو ادب پر چھائے ہوئے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ غالب کی دیگر مصروفیات اور کوتاہیوں پر لکھنے کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے لیکن ان کی ادبی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ زیر نظر سطور میں غالب کی وطن دوستی پر سوالیہ نشان لگائے گئے ہیں۔ مرزا غالب شاعر تھے انہیں اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ ویسے بھی ۱۸۵۷ء میں راجاؤں اور بادشاہوں کا اتحاد آزادی کی خاطر کیا گیا تھا ایسا کہنا صد فی صد درست نہیں۔ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ انگریزی اقتدار کا دباؤ جب بڑوں کے اپنے مفاد پر پڑا تو وہ چیخ اٹھے، رد عمل کی صورت میں ۱۸۵۷ء کا واقعہ ظہور میں آیا۔ عوام کی اکثریت اس واقعہ میں شامل نہیں تھی۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد تک ادھر لوگ متوجہ نہیں ہوئے۔ عوامی بیداری کا دور بیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اسی مضمون میں ایک جگہ مولانا فضل حق مرحوم کے تعلق سے لفظ 'بھاگنے' کا استعمال ہوا ہے۔ اردو میں اس کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ کی کمی نہیں۔

نوبل انعام سے متعلق اظہار اثر کی تحریر محفوظ کرنے کی چیز ہے۔ ادب کے نوبل انعام یافتگان کی مکمل فہرست کسی وقت ضرور شائع کیجئے۔ 'قلم، قلم کار اور کتاب' کے خالق عبدالغنی شیخ کی خدمت میں عرض ہے کہ لکھتے رہئے۔ کئی کتابوں کے مطالعہ کی 'زحمت سے بچالئے' والا معاملہ ہے۔

محمد یعقوب الرحمٰن، ایوت محل

● مقالات میں عبدالغنی شیخ کے مضمون 'قلم، قلم کار اور کتاب' کی قسط بھی بیحد وقیع اور کار آمد ثابت ہوئی۔ نظمیں اور غزلیں سبھی اچھی لگیں۔ مشرف عالم ذوقی کی کہانی 'بیٹی' چوں چوں کا مربہ ہے۔ کہانیاں ایسی ہوں کہ کچھ ہم جیسے کم فہم لوگوں کی سمجھ میں بھی آئے۔؟ دوسری کہانیاں کسی قدر اچھی ہی ہیں۔ یوسف ناظم کا انشائیہ بھی پسند آیا۔ تبصرے میں استاذی حضرت ناوک حمزہ پوری کی بیک وقت تین کتابوں پر ابرار رحمانی کا تبصرہ دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی۔

جمیل فاطمی، لکھمنیا

● 'قلم، قلم کار اور کتاب' کی تینوں قسطیں معلوماتی ہیں۔ انشائیہ 'جھر جھری' کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا۔ یوسف ناظم سے جو امید ہے وہ اس انشائیہ میں پوری نہیں ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ انشائیہ اشیا کے مخفی مفاہیم کی نشاندہی کرتا ہے اور نئے زاویہ نگاہ سے چیزوں کے پرکھنے کا نام ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ پورے ایک کالم میں 'جھر جھری' کی تعریف پر زور قلم صرف ہو۔ یوسف صاحب کے سامنے انشائیہ چھینک ضرور ہوگا۔ دیکھئے وہاں انشائیہ نگار نے وقت ضائع کئے بغیر کیسے سماج کی ناہمواریوں کی بات کی ہے۔ انشائیہ 'جھر جھری' کا آخری پیرا بس عام سا طنزیہ خیال ہے، اس میں کوئی ندرت نہیں۔ ویسے تو یوسف ناظم ایک اچھے انشائیہ نگار ہیں اور ان سے ہماری بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ 'ہم تو ڈوبے ہیں صنم' افسانے کے مقابلے میں 'ابھی راہوں کے مسافر' ایک اچھا افسانہ ہے۔

بشیر احمد گلزار پوری، پلوامہ

● نثری مضامین میں 'قلم، قلم کار اور کتاب' کی تیسری قسط نے بھی پہلی دو قسطوں کی طرح متاثر کیا۔ عبدالغنی شیخ کا یہ مقالہ ان کے وسیع مطالعہ کا غماز ہے۔ منظومات کا حصہ بھی کافی اچھا ہے۔ مگر سب سے زیادہ نور صبا صاحبہ کی غزل نے متاثر کیا۔ کافی عرصہ بعد ایک اچھی غزل پڑھنے کو ملی۔

منظور پروانہ، لکھنؤ

● تمام مشمولات بقدر ذوق حسب معمول ہیں۔ ترتیب و تقریب کے لحاظ سے بھی معیاری اور عمدہ کہنا بجا ہے۔ مقالات، نظمیں، غزلیں، انشائیے، کہانیاں اور تبصرے کی مستقل اور مسلسل ترتیب ہے۔ حسن ترتیب کو کچھ اور تابدار بنایا جاسکتا ہے۔ دیدہ زیب یکسانیت محل نظر ہے۔ اس لئے خوشگوار تبدیلی کی گزارش ہے۔

'قلم، قلم کار اور کتاب' کی پیش کش قسطوں میں جاری ہے۔ عبدالغنی شیخ نے مقالہ پر کافی محنت کی ہے۔ انداز تحریر دلکش اور دلچسپ ہے کہ 'آجکل' ایسی طویل نگارش کے لئے صفحات محفوظ کئے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر محمود شیخ کا مقالہ 'معیشت و علامت کا ادبی شعور' گراں مایہ ہونے کی بدولت قدر گراں معلوم ہوا۔ اختتامی سطور 'کولونیل ازم کے تصور نے صدیوں پہلے ملک و معیشت کو تاراج کیا تھا اور آج زبان وادب علامیائی تصورات کی زد میں ہیں۔ اس لئے میں سوچتا ہوں کہ علامت کا وجود تحقیق میں ہے زبان میں نہیں ہے۔ اور جو چیز زبان میں نہ ہو اس کی ادبی حیثیت کیا؟' اس سوال پر میں نے لمبی سانس لی۔ شیخ صاحب سے معذرت چاہتا ہوں۔

شمیم طارق نے بڑی جرأت کے ساتھ غالب کو اپنی نوازشوں سے نوازا ہے۔ گویا طارق صاحب کو غالب سے توقعات اور امیدیں کچھ زیادہ تھیں۔ یعنی ایک قلم بردار کو آزادی کا علم بردار پتہ نہیں کس نے مانا؟ مستزاد یہ کہ عہد غالب کے دوسرے ہم عصر مشاہیر جن کے متعلق عہد حاضر کے انقلاب پسند، حریت پسند، ترقی پسند، وطن پرست اور قوم پرست لوگوں کو جو خوش فہمی تھی وہ دور کی گئی ہے۔

بزرگ اور ہردلعزیز مصنف یوسف ناظم کا انشائیہ 'جھر جھری' بہت پسند آیا۔ یوسف کو ناظم قوسین

بھی کہا جاتا ہے۔ تحریریں شگفتہ، شائستہ اور برجستہ ہوتی ہیں۔ ایسی تحریریں پڑھنے کے بعد ہی مقالوں اور کچھ علمی مضامین پڑھنے کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے۔

ایچ۔ اے سید، شولاپور

● عبدالغنی شیخ کا مضمون خاص توجہ کا حامل ہے۔ مفید اور کار آمد مضامین شائع کرنے کے لئے 'آجکل' ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ دیگر مشمولات بھی تنوع اور معیار کے پیش نظر کافی اہم ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ادبی رسائل میں 'آجکل' کو مرکزیت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ شاید یہ اس لئے ممکن ہو سکا ہے کہ آپ کے حسن انتخاب، مدیرانہ صلاحیت اور مخصوص زاویہ نگاہ اس کے پیچھے بھاری پشت بن کر کھڑی ہے۔

ایک بات جس کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ آپ نے 'آجکل' کے توسط سے ان اہم ادبی شخصیتوں کو منظر عام پر لانے کی قابل قدر کوشش کی ہے جو گمنامیوں کے گوشے میں پڑے تھے۔ ان میں ایک نام دیوانہ کانپوری کا بھی ہے جن کا تعارف آپ نے ابھی گزشتہ شمارے میں کرایا تھا۔

نسیم بن آسی، مغل سرائے

● 'پریم چند کی آپ بیتی' مولفہ مدن گوپال پر تبصرہ کرتے ہوئے فاضل مبصر نے تحریر فرمایا ہے کہ 'پریم چند کی یہ داستان ادب میں ایک نئی طرح کی کتاب ہے' فاضل مبصر راقم سے زیادہ جانتے ہیں کہ غالب کے خطوط اور دیگر تحریروں سے غالب کی آپ بیتی برسوں پہلے ترتیب دی جا چکی ہے۔ مبصر محترم یہ بھی جانتے ہیں کہ 'خودنوشت' تیار نہیں کی جاتی جیسا کہ محترم نے تحریر فرمایا ہے۔

اسی طرح مبصر صاحب کا یہ تحریر فرمانا کہ "پریم چند کی حیات و فن کے کسی بھی پہلو پر بھی کام کیا جائے اس کے لئے ہندی اردو میں شائع ہوئی مدن گوپال کی تحریروں کو ہی رہنما بنانا پڑے گا۔" مجھ ناچیز کے خیال میں درست نہیں ہے۔ پریم چند پر اردو، ہندی، انگریزی، روسی اور کئی دیگر زبانوں میں کام ہوا ہے۔ مدن گوپال کی تحریریں اس زنجیر کی ایک کڑی ہیں اور کافی مضبوط کڑی لیکن 'رہنما کڑی' نہیں۔ اب سے برسوں پہلے بدایوں سے نکلنے والے ادبی رسالہ 'روشن' سہ ماہی نے جلد نمبر ۷ شمارہ نمبر ۱ ۱۹۸۴ء میں منشی پریم چند کی ایک گم کردہ بھولی بسری تحریر شائع کی تھی جو مضامین پریم چند مطبوعہ ۱۹۶۰ء میں شامل نہیں تھی۔ ڈاکٹر قمر رئیس ۱۹۶۰-۶۴ء کے درمیان پریم چند پر تحقیقی مطالعہ کرتے ہوئے کئی حقائق پہلی مرتبہ سامنے لائے۔ میرا مطلب خدانخواستہ مدن گوپال کے کام کی قیمت کم کرنا نہیں لیکن تبصرہ نگار حضرات کو متعلقہ مضمون پر پہلے ہوئے کام کو یکسر نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ انگریزی تبصرہ نگار اسی روش پر گامزن ہیں۔

سید آفتاب علی، بریلی

● 'غالب اور عہد غالب' کا فکری اور تواریخی پس منظر پورے تنقیدی جائزے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ غالب کے تعلق سے کالی داس گپتا رضا مرحوم سے جو سہو ہوا ہے اس کو بھی درست کر کے حقیقت بیان کی گئی ہے۔ 'قلم، قلم کار اور کتاب' کی تینوں قسطوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ یہ پورے مغربی ادب کا ایک تنقیدی جائزہ ہے اگرچہ اس میں بسا اوقات اردو کے ادباء کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تاہم مغربی ادب ہی اثر انداز ہے۔ مقالے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ادبی اور ادب کے قریب قریب سارے پہلوؤں اور گوشوں کی نشاندہی کی گئی ہے شاید یہ سیریز اپنی نوعیت کی پہلی اور منفرد سیریز ہے۔ شیخ صاحب اس تحقیقی و تنقیدی کام کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

رویندر روی، نئی دہلی

● آپ کی زیر قیادت 'آجکل' ادبی تحریک کا کار رہبری انجام دے رہا ہے اور یہ اردو ادب کی برتری کا پیش خیمہ ہے۔ مضامین اور افسانے اچھے اور معلوماتی ہیں۔ بالخصوص مشرف عالم ذوقی کا افسانہ "بیٹی" پسند آیا لیکن پرچہ شعری حصے کا شکار ہو گیا۔

فرخ شاہد، وارانسی

● عقل و فہم سے مبرا سرورق جو ہمیشہ دیدہ زیب ہوا کرتا تھا ناگوار ہے۔ Old is Gold کے مصداق سعیدہ ادھی کی "---ایک نظر" پھر بھی قابل مطالعہ ہے۔ غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ نہ اب ایک مجھ جیسے عام قاری کا دل غالب پر کچھ پڑھنے میں لگتا ہے اور نہ شمیم طارق جیسے "محقق" کوئی نئی کوڑی لا سکتے ہیں۔ البتہ غالب پر مواد اتنا ہے کہ ہر نو آموز مصنف کچھ نہ کچھ گل پھندنے باندھ ہی سکتا ہے۔ جتنا بڑ والا شاعر تو اردو میں اور بھی ہوئے ہیں۔ سودا، ذوق، میر، مومن، اقبال، جوش اور فیض وغیرہ ان سب پر بھی کبھی کبھی کچھ شائع کریں۔ ڈاکٹر محمود شیخ صاحب کا پرمغز مقالہ میری سمجھ میں اس لئے نہیں آسکا کہ میں فلسفہ۔ لاجک اور پولٹیکل سائنس کا طالب علم کبھو نہیں رہا۔ خدارا 'آجکل' کو ایسا مشکل نہ بنایئے کہ ہم جیسے لوگوں کے گھر والے جو شوقیہ اردو سیکھے ہوئے ہیں رسالہ کے مطالعہ سے درگزر کرنے لگیں جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ شعبہ جدید کے ڈاکٹر نریش کے جدید ہند کے شاہ کار مضمون پنجابی ادب سے اردو والوں کا کیا لینا دینا۔ "قلم، قلم کار اور کتاب" بے معنی اور گنجلک ہے۔

غزلیات میں اختر سعید خاں کے دو شعر اور فضیل جعفری کے ایک شعر سے محظوظ ہوا۔ "جھر جھری" کے لئے اتنا کہوں گا کہ پڑھ کر مجھے بھی جھر جھری آگئی۔

سید ماجد رضوی، رامپور

● گزشتہ شماروں کی طرح اس شمارہ کے مشمولات بھی قابل قدر ہیں۔ خصوصاً عبدالغنی شیخ کا سلسلہ وار مقالہ 'قلم، قلم کار اور کتاب' بڑا ہی دلچسپ اور معلومات افزا ہے اور میدان علم و ادب کے نوواردان کے لئے حوصلہ افزا بھی۔

نوشاد مہدی، پٹنہ

● یہ شمارہ بھی حسب معمول معیاری اور عمدہ مشمولات سے سنورتا ہوا نمودار ہوا۔ عبدالغنی شیخ کے مضمون 'قلم، قلم کار اور کتاب' کی اس قسط کا بے چینی سے انتظار تھا بہت عمدہ سلسلہ ہے۔ یوسف ناظم کا انشائیہ 'جھر جھری' تو اس شمارہ کی جان ہے۔ کہانیوں میں 'بیٹی' اور 'ہم تو ڈوبے ہیں صنم' بہت عمدہ ہیں۔ ظاہر ہے ذوقی اور ترنم ریاض دونوں ہی اردو کے بلند پایہ کہانی کار ہیں۔ مقالات میں ڈاکٹر محمود شیخ کا مقالہ فلسفیانہ موضوع سے تعلق رکھتا ہے اس لئے مبہم سا ہے۔ میرے خیال میں الفاظ کے چکروں میں شیخ صاحب ایسے محو ہوئے کہ پٹری سے اتر گئے۔

رؤف باقر، ممبئی

بقیہ ٹائٹل ۲ کا

ترقان وامق کا دوست تھا جس کو ساتھ لے کر وامق نے فرار کیا تھا۔

بفرمود تا آسنتاں بگاہ
بیامد بنزدیک رخشندہ ماہ

آسنتان نام تھا وامق کے خسر کا جو وامق کے ہاتھ سے مارا گیا۔

ابا او بزرگاں بماند وامق بجنگ   نہ روئے گریز نہ رائے درنگ
براں راہ اتراں دزد جویندہ نام   یکے مہترے بود پالوش نام

پالوش نامی ایک چوروں کا سردار تھا جو وامق وعذرا کے زمانے میں دریائی راستہ روک کر لوٹ مار کرتا تھا۔

بافرنجہ افراطش نامدار
یکے پادشاہے بدی ہوشیار

افرنجہ شہر کا نام تھا جو دریا کے کنارے واقع تھا جہاں کی رہنے والی عذرا کی ماں تھی جس کا نام کلیش تھا اور افراطش اس کا شوہر تھا جو عذرا کی لڑائی میں مارا گیا۔

پدر داده بودش گہہ کودکی   بآزار طوس آں حکیم کی
بمرگ خداوند آذار طوس   تبہ کرد مر خویشتن را فسوس

آذار طوس نام اس شخص کا تھا جس کو عذرا کی ماں دی گئی تھی

فلاطوس برگشت و آمدز راہ
برحجرۂ وامق نیک خواہ

فلاطوس نام کا ایک حکیم تھا جو عذرا کا استاد تھا۔

بد از کینہ عذرا چو شیر نژند
بزدوست و چشم اوانوش کند

اوانوش اس شخص کا نام تھا جو ایلچی بن کر اندردس کی طرف سے عذرا کے پاس آیا تھا اور عذرا نے غصے میں آکر اس کی آنکھیں اپنی انگلیوں سے نکال لی تھیں۔

نہ من اندر دستم بکین وبمہر
نہ ہارد و نہ نیز عذرا بچہر

اندردس ایک شخص تھا جو ہارد کا عاشق تھا اور جزیرے میں رہتا تھا اور راتوں کو جزیرے کا راستہ اندردس کو معلوم کرانے کے لئے ہارد آگ جلایا کرتی تھی تاکہ آگ دیکھ کر اندردس اس کی سمت تیرتا ہوا پہنچ سکے مگر ایک رات ہوا اتنی تیز چلی کہ آگ بجھ گئی اور اندردس سمت معلوم نہ کر سکا اور دریا میں ڈوب مرا۔

نویں صدی ہجری کے آخر سے دسویں صدی ہجری کے وسط تک چار عثمانی شاعروں نے جو صاحب خمسہ تھے اپنی اپنی مثنویوں کے نام وامق وعذرا رکھا ہے، غریبی شاعر نے اپنے ترکی تذکرے میں جو شاہ طہماسپ اول کے نام پر ۹۵۵ء میں لکھا گیا ہے۔ لکھا ہے کہ قاضی سنان بن سلیمان امر اسلطان بایزید خاں ثانی (۹۱۸_۸۸۶) اور حمزوی شاعر جو صوفی زادگان بورسہ سے تھا ہر ایک نے پانچ پانچ مثنویاں کہی ہیں جن میں سے ایک وامق وعذرا ہے۔

کشف الظنون اور دوسرے تذکروں میں ہے کہ محمود بن عثمان لامعی جو شعرا دور سلطان سلیمان ثانی (۹۷۴_۹۲۶) سے تھا اور معیدی نے جو اہل قانغامد سے تھا پانچ پانچ مثنویاں لکھی ہیں جن میں سے ایک وامق وعذرا ہے۔

محمود بن عثمان لامعی تخلص بورسہ کے رہنے والے تھے جنہوں نے مولانا عبدالرحمٰن جامی کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور جامیٔ روم کے نام سے مشہور ہیں، سنہ ۹۳۱ء میں انتقال کیا ان کی پانچ مثنویاں۔ (۱) گوئے دچوگان، (۲) فرہاد نامہ، (۳) ابسال وسلاماں، (۴) ویس ورامین، (۵) وامق وعذرا ہیں، ان کی یہ وامق وعذرا ترجمہ ہے۔

نویں صدی ہجری کے آخر تک وامق وعذرا کا افسانہ بالکل اسی طرح رہا جس طرح کہ یونانی سے آیا تھا مگر نویں صدی ہجری کے ختم ہوتے ہی جتنی بھی مثنویاں اس نام سے لکھی جانے لگیں وہ بدلتی گئیں اور بعد کو اصل قصے سے بہت دور جا پڑیں اور ہر افسانہ دوسرے افسانے سے جدا ہوتا گیا۔

نویں صدی ہجری ہی کے آخر میں ایک شاعر قتیلی نے سلطان یعقوب کے عہد (۸۹۶_۸۸۴) میں ایک قصہ وامق وعذرا کے نام سے منظوم کیا ہے جس کے تقریباً چھ ہزار شعر ہیں اس مثنوی کا پہلا شعر ہے۔

اے نام درد دہر زبانی
وے زندہ بنام تو جہانی

اس قصے میں وامق کو ایک امیر عرب یمن کا بیٹا بتایا گیا ہے اور عذرا کو بھی ایک حکمرانِ حجاز کی لڑکی بتایا گیا ہے جن کا سلسلۂ نسب سلاطین کیان سے ملتا ہے۔

حاجی محمد حسین شیرازی معاصر شاہ فتح علی شاہ قاچار نے بھی چھ مثنویاں کہی ہیں، جن میں ایک وامق وعذرا بھی ہے، یہ مثنوی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اے بنامت افتتاح نامہ ہا
وے بیادت گرمی ہنگامہ ہا

مرزا ابراہیم بیگ کرمانی نے بھی ایک وامق وعذرا کہی ہے اس کے تین شعر یہ ہیں:

سحر گہ چوں سرشک از چشم عاشق   زدریا برکنار افتاد وامق
برآمد چوں بہار آں دُرِ یکتا   زمیں بالید گفتی برثریا
چکاں آب از دو زلفِ آں شکرلب   چو در شب دانہ ہائے تاب کوکب

اس مثنوی کا ایک نفیس ترین نسخہ کتاب خانہ برلن میں موجود تھا۔ واللہ اعلم اب بھی ہے یا جنگ میں ضائع ہو گیا، مؤلف تذکرۂ روز روشن نے لکھا ہے کہ "ملا محمد علی قسمتی نے بھی ایک مثنوی وامق وعذرا کہی ہے مگر میری نظر سے نہیں گزری" مرزا محمد ملک الکتاب شیرازی نے مشہور مثنوی سوز و گداز نوعی خبوشانی میں چند شعر اضافہ اور بیشتر شعر حذف کر کے وامق وعذرا کے نام سے بمبئی سے شائع کی ہے جو عام طور پر ملتی ہے۔

☆☆☆

آجکل کی فائل سے

ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عرش ملسیانی

جلد: ۱۳   نمبر: ۹   اپریل ۱۹۵۵

Regd.No.D.L. 12033/2001 | Licenced U (DN)-50/200 1 to post without pre-payment
MF 948/57 (Delhi Post) | RMS Delhi
Vol.50 | No.9 | Rs. 7/- | Ajkal (Urdu) | April 2002

ہماری اردو مطبوعات

آجکل اور غبار کارواں	ادارہ	170/=
آجکل کی کہانیاں	ادارہ	162/=
آجکل اور سفرنامہ	ادارہ	105/=
آجکل اور صحافت	ادارہ	115/=
آجکل کے ڈرامے	ادارہ	125/=
آجکل کے مضامین	ادارہ	112/=
آجکل اور اقبال	ادارہ	95/=
آجکل اور طنز و مزاح	ادارہ	112/=
اردو ادب کے پچاس سال	ادارہ	95/=
اٹھارہ سو ستاون	سریندرناتھ سین/خورشیدہ پروین	556/=
کلاسیکی موسیقار	مترجم: خورشید اکرم	137/=
عوام الناس کے لیے گائڈ	مترجم: عادل صدیقی	145/=
مہاتما گاندھی	آچاریہ کرپلانی / لکشمی چند ریاس	300/=
مہاتما بدھ کی حکایتیں	پال کاروس / مسعود فاروقی	155/=
شہیدوں کے خطوط	ادارہ	110/=
قلی قطب شاہ	نریندر لوتھر / زبیر رضوی	280/=
سفینۂ غالب	ادارہ	95/=
آئینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	75/=
گنجینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	60/=
یادیں مجاہدین آزادی کی	نوین جوشی / راحت جبیں	120/=
غالب بہ صد انداز	تشکیل: برجندر سیال	1000/=
پہیلیاں۔امیر خسرو	مرتب شہباز حسین، نند کشور وکرم	22/=
کاغذی ہے پیرہن	عصمت چغتائی	65/=
کشمیر کی لوک کتھائیں	جے۔این۔کمھر	45/=
ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر	ڈاکٹر محمد عمر	127/=
راگ راگنیوں کی تصویریں	شکیل الرحمٰن	325/=
ہند اسلامی طرز تعمیر	ضیاء الدین ڈیسائی / اختر الواسع	54/=
ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز	ضیاء الدین ڈیسائی / بہار برنی	54/=
ہماری تہذیبی وراثت	راجندر پرشاد، بی این پانڈے	50/=

ہندوستان کے عظیم موسیقار	شمبھوناتھ مشرا / رئیس مرزا	65/=
سروجنی نائیڈو	تارا علی بیگ / لکشمی چند ریاس	125/=
حکیم اجمل خاں	ظفر احمد نظامی	75/=
سردار ولبھ بھائی پٹیل	آئی جے پٹیل / یعقوب یاور	95/=
مختار احمد انصاری	مشیر الحسن / فرحت احساس	80/=
رفیع احمد قدوائی	ڈاکٹر ہاشم قدوائی	60/=
سر سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی / اصغر عباس	35/=
حسرت موہانی	ڈاکٹر خلیق انجم	50/=
مولانا آزاد (طبع دوم)	عرش ملسیانی	40/=
بدرالدین طیب جی	اے جی نورانی / راجندر راجم	70/=
مظہر الحق	قیام الدین احمد، جٹاشنکر جھا مترجم: رضوان احمد	55/=
رابندرناتھ ٹیگور	ہرن مئے مکرجی / اشہر ہاشمی	80/=
جواہر لال نہرو	ایم چلاپتی راؤ / کے بی شرما	105/=
مشعل آزادی	ساغر نظامی	40/=
رامائن۔۔۔بچوں کے لئے	مترجم: ساوتری	18/=
دنیا کی منتخب لوک کہانیاں	ادارہ	11/=
دھنواں راجہ	مترجم: وشوناتھ سکہ	13/=
ہیرے کی لونگ	ادارہ	5/50
امر شہید گنیش شنکر ودیارتھی	مالتی شنکر	11/=
بھارت خلائی دور میں	موہن سندر راجن	12/=
ہم ایک ہیں	عرش ملسیانی	10/=
پھولوں کی وادی	رفعت سروش	16/=
روشنی کے مینار	مرتب: شہباز حسین	25/=
جاتک کتھائیں	مترجم: [illegible] انجم	32/=
ہندوستان کی مسجدیں	ضیاء الدین ڈیسائی	18/=
ہندوستان کے دریا	شیخ سلیم احمد	11/=
پنجاب اور کلو کی کہانیاں	مترجمہ: آمنہ ابوالحسن	27/=
وقت کا مسافر	غلام حیدر	23/=
وادی ماں کی کہانیاں	مولف: مخمور سعیدی	10/=

نوٹ: کتابیں اور رسالے منگوانے کے لئے رقم پیشگی ارسال کریں۔
کتابیں کسی بھی صورت میں وی پی سے نہیں بھیجی جائیں گی۔

ملنے کا پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔۱

Printed and Published by P.S. Bhatnagar, Director, Publications Division
Printed at Aravali Printers & Publishers (P) Ltd. W-30 Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-20
Published at Publications Division, Patiala House, New Delhi-110 001 Editor: M.R. Farooqi

آجکل



آجکل کی فائل سے:

رضی الدین احمد

جعفر زٹلی کی شاعری کا پس منظر

اورنگ زیب کی خشک مزاجی اور ظاہری مذہب پرستی نے شعر و شاعری میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ پشتو کا مشہور شاعر خوشحال خاں خٹک افغان بغاوت کا رہنما تھا۔ خوشحال کی طرح پشتو کے ایک اور شاعر حمید نے بھی مغلوں کے خلاف اپنے جذبات بڑی شدت سے ظاہر کئے اس طرح پشتو ہی کے مشہور شاعر خواجہ محمد نے بھی اورنگ زیب کو "انصاف کا دشمن" کہا۔

اورنگ زیب نے شعر و ادب پر پہرے بٹھائے تھے ان سے خود ان کی خشک مذہبیت اور کھوکھلی اسمیت جل اٹھی۔ ابھی تک اردو شعر و شاعری طنزیہ اور مزاحیہ شاعری سے محروم تھی۔ فارسی شاعری کی نقل اور ہندی شاعری کے اندرونی اثر نے اردو شاعری کی جو شکل بنائی تھی وہ ابھی تک سنجیدہ افکار اور سوچی سمجھی حقیقتوں کا بار پوری طرح نہ اٹھا پائی تھی کہ ہمیں ایکا ایکی ایک بالکل نئی اور نرالی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ آواز بڑی بھرپور ہے بڑی تیز طرار اور نہایت ٹھٹھے مار ہے۔ طنز و ادب کی تلوار بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ ذرا سی چوک سے خود وار کرنے والا آپ گھائل ہو جاتا ہے۔ گو اس نئی آواز کی کاٹ بڑی تیز اور تڑپا دینے والی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اورنگ زیب نے جو زبان بندی کی تھی اب اس کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں۔ اور خود مغل دربار ہی کے در و دیوار سے اس طرح یہ آواز ٹکرا رہی تھی گویا مغل حکمران کی زبان بندی کے خلاف خود اس کے بوڑھے ہاتھ پیر بولنے اور گواہی دینے لگے ہیں۔

اس زوال آمادہ نظام میں جب ہر چیز اپنی جگہ سے ہلتی اور گرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ پرانے عقیدوں سے چمٹ چمٹ کر رونا اور شخصیتوں کے مزار پر عقیدت کے دو پھول چڑھا دینا کسے دو بھر ہوتا۔ فارسی شعرا رو پیٹ کر چپ ہوئے تو میر جعفر کے جگر گداز نالوں کا شور سینوں میں آگ لگانے کو اٹھا۔

میر جعفر زٹلی کی یہ آواز مغلوں کے عہد کے لئے ایک صور بن کر رہ گئی۔ یہ آواز بظاہر بڑی غیر سنجیدہ، غیر مہذب، کھردری مگر پاٹ دار آواز تھی جو حلق ہی سے نہیں سینہ سے نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ اس میں منہ بھر کر دھتکارنے کی کیفیت تھی ناک پر انگلی رکھ کر آنکھیں دکھانے کی بات نہ تھی۔

اس آواز کے بعد ایک طرح سے پرانی دنیا کی کوکھ سے ایک نئی دنیا نے جنم لیا۔ مہذب، شستہ، سنجیدہ اور ہلکی پھلکی شعر و شاعری کی جگہ بڑی ناخوشگوار، نہایت بھدی سخت نامانوس مگر بھاری بھرکم اور اصلیت سے میل کھاتی شاعری نے لے لی۔

یہ ایک طرح سے اردو شاعری کا ایک موڑ تھا۔ وہ سب اساتذہ جو فارسی کے اثر سے مسحور تھے اب مبہوت ہو چلے تھے۔ دکن کے فقیروں اور دہقانی کسانوں نے اورنگ زیب کی کمر اور مغلوں کے تاج کو ٹیڑھا کر دیا تھا۔ فارسی کے شعرا اب بے دم تھے اور اردو کے اساتذہ دم بخود۔ اس موت کے سے سناٹے میں زندگی کی چاپ ہمیں نظیر اور میر جعفر زٹلی کے ہاں سنائی دیتی ہے۔

مغل شہزادے اپنی وراثتی فضیلت کی بنا پر ایک دوسرے پر تلواریں سونت رہے تھے بھائی بھائی پر فتح پانے کے درپے تھا۔ حیدر آباد کی تباہی اس برادرانہ جنگ کا انعام تھا۔

گولکنڈہ فتح ہوا تو جعفر نے سلطان پر بڑا بھرپور طنز کیا۔

نخستیں کلاں ترکہ بر کھنڈ کر
ہمہ کاروبارِ پدر بھنڈ کر

باپ کے کاروبار کو بیٹوں نے جب اس طرح چلایا تو ہر طرف لوٹ مار، نوچ کھسوٹ اور بھاگ دوڑ شروع ہو گئی ایک بستی لٹی تو آخر میر جعفر بھی چپ نہ رہ سکے:

چناں لوٹ شد بستی ملک نگر   نہ خذ ماصفا ماند نہ ماکدر
جہاں ہوئے ایسے **کلچھن** کپوت   لگے خلق کے منہ کو کالک بھبھوت

دوسرے بھائی اعظم پر بھی طنز کیا ہے:

دگر شاہ اعظم ہمہ کند در   بہ رسوائی انداخت کارِ پدر
بہ خوش دامن خو سپر ساختہ   بہ للو پتو کار درباختہ

اعظم معظم کی خانہ جنگی پر اس طرح ماتم کرتے ہیں:

کہاں اب پایئے ایسا شہنشاہ   مکمل اکمل و کامل دل آگاہ
رگڑ کے الجھنواں دل رووتا ہے   نہ میٹھی نیند کوئی سووتا ہے
دوا دو ہر طرف بھاگڑ مچی ہے   بچہ در گور سر کٹھیاں دھری ہے
ازاں سو اعظم وزیں سو معظم   زمیں کے واسطے لڑتے ہیں باہم
میاں جعفر زباں کو مختصر کر   زدور مختلف دل میں حذر کر

آخر ان چٹکیوں سے ان کی طبیعت کا غبار اور دل کا بخار کم نہیں ہوا تو پھر ایک لمبا چوڑا شہر آشوب تحریر کیا۔ جس میں سامنے کی سی باتیں سیدھے سادے انداز میں کہہ دیں اور چپ ہو رہے۔

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے

باقی ٹائٹل ۳ پر

ایک بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ISSN 0971 - 846 X

ایڈیٹر
محبوب الرحمن فاروقی
فون: 3386994

اسسٹنٹ ایڈیٹر:
ابرار رحمانی
فون: 3386789 Ext. 259

سب ایڈیٹر:
محمد کاظم

جلد: ٦٠ شمارہ: ١٠
مئی ٢٠٠٢ء بیساکھ۔ جیٹھ شک ١٩٢٣

سرورق: بنشی لال پرمار
کمپوزنگ: افتخار احمد

جوائنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): ڈی این گاندھی
بزنس منیجر: شکنتلا
منیجر اشتہارات: پی۔ سی آہوجہ

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ: سات روپے سالانہ: ٧٠/روپے
دو سال: ١٣٥/روپے تین سال: ١٩٠/روپے
امریکہ یورپ اور دوسرے ممالک کیلئے بذریعہ ہوائی ڈاک ٧٠٠/روپے سالانہ
پڑوسی ممالک کے لئے بذریعہ ہوائی ڈاک ٥٠٠/روپے سالانہ

خریداری اور اشتہار کے لیے منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ، پوسٹل آرڈر،
ڈائریکٹر پبلی کیشنز ڈویژن کے نام اس پتہ پر بھیجیں
سرکولیشن منیجر 'آجکل' ایسٹ بلاک ٤، لیول ٧، آر کے پورم نئی دہلی۔ ٦٦
رسالے سے متعلق استفسار اور شکایتوں کیلئے بھی سرکولیشن منیجر کو ہی لکھیں

صرف تخلیقات سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر 'آجکل' (اردو) پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔١

ترتیب

اداریہ

ہم سب کو معلوم ہے کہ کھلی ہوا صحت کے لئے کتنی ضروری، مفید اور کار آمد ہوتی ہے۔ زبان و ادب جو ایک بند کمرے کی طرح ہوتے ہیں ترجمے وہ روشندان یا کھڑکیاں ہوتی ہیں جن سے تازہ اور فرحت بخش ہوائیں کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔ ترجمے کا کام بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ کسی خیال کی ترسیل کسی اور زبان میں یا کسی اور شخص کے لئے کرنا اتنا آسان نہیں، جب تک کہ وہ شخص خود مکمل طور پر اس خیال سے، اس زبان سے یا اس کے پس منظر سے واقف نہ ہو۔ ترجمے کی روایت کب سے شروع ہوئی قطعیت کے ساتھ کہنا تو شاید ممکن نہ ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب انسان نے اتنی ترقی کرلی کہ وہ چیزوں کو نام دے سکے اور اس نام کے ذریعے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر سکے اور جب اس اظہار کو دوسرے لوگ سمجھ نہ سکیں تو ہاتھوں، تصویروں یا خطوط کے ذریعے اپنے خیالات دوسروں کو بتا سکیں بس وہیں سے ترجمے کی شروعات ہوتی ہے۔ آج بھی اشاروں سے اپنی بات سمجھانے کی یہ روایت ان لوگوں میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے جو لسانی اظہار سے قاصر ہوتے ہیں یا جن کے اندر ایسے جسمانی عیوب پیدائشی طور پر آجاتے ہیں کہ وہ لسانی طور پر ترسیل کر پانے میں اپنے کو معذور تصور کرتے ہیں۔ اشاروں کے ذریعے ترسیل کا یہ سلسلہ آگے بڑھ کر زبان کی ابتدا کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ تہذیب و ترقی کے اس دور میں جب انسان ابھی ایک جگہ سکونت اختیار نہیں کر سکا تھا اور اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر مجبور ہونا پڑتا تھا تو ان نئی جگہوں میں اپنی ضرورتوں کا اظہار کرنے کے لئے وہ اشاروں کا ہی استعمال کرتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں کے ایک جگہ پر بس جانے اور ایک دوسرے کے ساتھ متواتر تصادم اور میل جول کے سلسلے سے انہی ابتدائی تراجم کے ذریعے ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوئے، اس سے نہ صرف زبانوں میں وسعت آئی، ان کی ترقی ہوئی، ان کا فروغ ہوا بلکہ ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے میں بھی مدد ملی۔ ابتدائی ارتباط بھی انہی تراجم کی رہین منت ہیں۔

کتابوں کے ترجمے کے سلسلے میں بھی وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ممکن ہے کہ بعض ابتدائی صحیفوں کے تراجم آس پاس کی علاقائی زبانوں میں ہوئے ہوں۔ لیکن تہذیبی سفر کے اولین دور میں جو زبانیں پائی جاتی تھیں ان میں یقیناً ایک دوسرے سے تراجم ہوئے ہوں گے۔ لیکن اس سفر کے دوران آج سے ڈھائی ہزار سال قبل جن جگہوں پر علم کا فروغ ہو چکا تھا اور مخطوطے کی شکل میں کتابیں لکھی جارہی تھیں، وہاں آنے جانے والے دوسرے لوگ اپنے ملکوں کو واپس جاتے ہوئے ان مخطوطوں کو نقل کرکے اپنے ملکوں میں لے جاتے اور وہاں کے ذی علم لوگوں میں ان کی نقلیں پیش کرتے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اسلامی عہد میں یونان کی تصنیفات عربی میں منتقل کیے جانے کا سلسلہ ہمیں تاریخی تذکروں میں ملتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ ابھی Dark Ages سے گزر رہا تھا۔ اسلامی دور حکومت میں بھی عباسی خلفا کا دور علم کے فروغ کے سلسلے میں سنہری حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں نہ صرف یونانی، رومن، سنسکرت اور دوسری زبانوں سے عربی میں تراجم شروع ہوئے۔ بلکہ عربی ہی کے ذریعے یورپ کی دوسری زبانوں میں مشہور کتابیں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ آج کے یورپ کی مشہور زبانیں بشمول انگریزی ابھی اپنے ابتدائی دور میں ترقی کی منازل طے کر رہی تھیں اور ان کی وہ شناخت بھی نہیں بنی تھی جس سے ہم آج آگاہ ہیں۔ لیکن اس بات کو ہر شخص قبول کرتا ہے کہ عربی سے تراجم کی بدولت ہی یورپ کا وہ دور شروع ہوتا ہے جسے نشاۃ الثانیہ کہا جاتا ہے اور یورپ کے نشاۃ الثانیہ کے ساتھ ہی عربوں کی علم پر فوقیت ختم ہو جاتی ہے اور علم کی یہ کنجی بذریعہ ترجمہ یورپ میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ عربی ہی کے طرز پر تمام موجودہ ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ قابل قدر اور وسیع تراجم اردو میں ہوئے۔ بلکہ آج سے چالیس پچاس سال قبل انیسویں صدی کی ابتدا سے لے کر پوری انیسویں صدی ایک طرح سے اردو نثر کے میدان میں ترجموں کا ہی دور رہا ہے اور ان ہی تراجم کی بدولت اردو زبان کی نشوونما اور فروغ اس قدر تیز رفتاری سے ہوئی کہ آج بھی ہمعصر دوسری زبانیں ابھی اس کے مدمقابل نہیں ہو پائی ہیں۔ اردو میں ترجموں کا یہ کام اب بھی مفقا نہیں ہے۔ لیکن اب اس کی وہ ہمہ گیریت البتہ نہیں رہی، جو پہلے تھی۔ ترجمے اب بھی ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر افسانوں یا ناولوں کے۔ ایک زمانہ وہ بھی گزرا ہے جب کہ اردو میں کتابیں پڑھ کر ڈاکٹری یا انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن آج ہائی اسکول کے بعد کسی اور درجے کے لئے نصابی کتابیں تک اردو میں عنقا ہو چکی ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہوں گے۔ ان اسباب پر روشنی ڈالنا ہمارا مقصد نہیں البتہ یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اب دوسرے علوم کے تراجم کی طرف توجہ کم ہونے سے ہماری زبان اور ہمارا ادب دونوں سمٹ کر صرف شعر و شاعری یا افسانے و ناول تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

نئی دہلی میں منعقدہ پندرہویں عالمی کتب میلے میں اس بار ایک مذاکرہ خصوصی طور پر ترجمے پر رکھا گیا تھا اور اس کا عنوان تھا "تخلیقی کاموں کا ترجمہ افکار کے گلوبلائزیشن کے سلسلے میں بطور محرک قوت کے" مختلف ممالک سے آئے مندوبین نے دو دن کے اس سیمینار میں اپنے مقالے پڑھے۔ سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے نیشنل بک ٹرسٹ کے چیئرمین اور مشہور اڑیہ شاعر ڈاکٹر سیتاکانت مہاپاتر نے کہا کہ تخلیقی نوعیتی کاموں کا ترجمہ اس شعور کے ساتھ کیا جانا چاہئے کہ بیک وقت مختلف ممالک کو زندہ رہنا ہے اور لسانی کثرت اور ثقافتی اختلافات نہ صرف ایک دنیا کے تصور سے میل کھاتے ہیں بلکہ جسے ہم گلوبلائزیشن کہتے ہیں وہ اس کا نچوڑ ہے۔ الفاظ ہمیں زندگی کے بارے میں بتاتے ہیں۔ حقیقت کی مختلف ہیئتوں کو اجاگر کرتے ہیں اور الفاظ کا استعمال ہمیں مطلع کرنے، بھرم میں ڈالنے یا غلط فہمی پیدا کرنے کے لئے کیے جا سکتے ہیں۔ ان الفاظ کا گلوبلائزیشن کیسے ہو سکتا ہے۔ جو نہ صرف اپنے اندر مقامیت رکھتے ہیں بلکہ خاص ثقافت کی پیداوار ہوتے ہیں اور ان کے اندر معنویت کی بہت سی تہیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک ایسے وسیع منظر نامے کی ضرورت ہے جس میں لسانی تراجم ثقافتوں کی ترجمانی کر سکیں۔ اور وہ ایک دوسرے سے ترسیل کرنے اور ایک دوسرے کی تحسین کرنے میں معاون ہو سکیں۔

ہندوستان میں انگریزی کے مشہور شاعر کے۔ کی دارووالا نے ان دقتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ کسی زبان کی ساری خصوصیات کا ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔ جب کہ دوسرے کچھ مقررین نے ترجمے کے لازمی عناصر مثلاً کیا لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا جانا ممکن ہے یا کسی تخلیق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی ساری خصوصیات کو اپنی زبان میں تبدیل کرنا چاہئے۔ زبانیں بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ کچھ بہت ترقی یافتہ، کچھ ترقی پذیر، یہ ممکن نہیں کہ ترقی یافتہ زبانوں کا ترقی پذیر زبانوں میں من و عن ترجمہ کیا جا سکے۔ ایسا کرتے وقت مترجم کو اپنی زبان کے حدود اور اپنے قاری کے استعداد کا خیال رکھ کر ہی زبان میں نئے نئے الفاظ داخل کرنا چاہئے۔

ترجمہ کیسا ہونا چاہئے، کس طرح سے کیا جائے اس کے بارے میں بعد میں اظہار خیال کریں گے۔ لیکن اس شمارے میں ہم اردو میں تراجم کی روایت اور ناولوں کے ترجموں کو لے کر ایک مضمون شائع کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارے قارئین کو یہ اندازہ تو ہو جائے گا کہ اردو میں ترجمے کی روایت کتنی پرانی اور مستحکم رہی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی بھی مضمون مکمل نہیں ہو سکتا کیونکہ آج بھی ترجمے کیے جا رہے ہیں، شائع ہو رہے ہیں۔ ان کی فہرست سازی فی الحال ممکن نہیں ہو سکے گی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترجمہ بھی ایک طرح سے تخلیق ہی ہے بلکہ بعض اوقات تخلیق سے مشکل کام ہے۔ لیکن آج ساہتیہ اکیڈمی کو چھوڑ کر اردو کا کوئی بھی ادارہ نہ تو اسے تخلیق کا درجہ دیتا ہے اور نہ ہی ترجمہ کو فروغ دینے کے لئے کوئی مالی امداد یا انعام ہی دیا جاتا ہے۔

(م۔ر۔ف)

ڈاکٹر شہناز شاہین

اردو فکشن میں ترجمے کی روایت

عالمی سطح پر انسانی فکر و نظریے نے ابتدا سے ہی نئے نئے معجزات کو جنم دیا ہے۔ لیکن زبانوں کا فرق انسانوں کے درمیان ہمیشہ باہمی ارتباط، اتحاد اور یگانگت کی راہ میں حائل رہا ہے۔ جہاں دنیا کا ہر خطہ اپنی مخصوص تہذیب، رسم و رواج، زبان و الفاظ اور فکر و احساس رکھتا ہے وہاں انسان کا ذہنی و فکری شعور ایک دوسرے کے قریب جا کر باہمی تعلقات بھی قائم کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ترجمہ زبانوں کے اس فرق کو مٹا کر ایک قوم کے ذخیرۂ علم و ادب اور افکار و نظریات کو دوسری قوم تک پہنچاتا ہے اور ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے روشناس کراتا ہے۔ اس طرح ترجمہ کا فن ایک اہم لسانی و فکری عمل ہے جو ادب کے دائرے کو عالمی معیار کے تناظر میں رکھ کر مشترکہ احساسات، ادبی تصورات، نئے اسالیب بیان و طرز احساس سے وسیع کرتا ہے۔ پروفیسر ایلبرٹ گیراڈ لکھتے ہیں:

"عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔"

انگریزی و یوروپی علم و ادب کے تراجم نے اپنی وسعت، گیرائی و گہرائی سے اردو زبان و ادب میں نئی روشنی پیدا کی۔ جس سے اردو ادب میں دوسری زبانوں کے علم و آگہی، جذبہ و شعور، فکر و احساس، تکنیک و اسالیب کو سمجھنے کی قوت پیدا ہوئی۔ اس طرح ترجمے کے ذریعے مغرب کے مختلف ادبی میلانات و فنی معیاروں کے علاوہ وہاں کی روشن خیال، انسان دوستی، عقلیت پسندی اور سائنسی طرز و فکر کے رجحانات سے اردو زبان و ادب متواتر متاثر رہا۔ بقول محمد حسن:

"اردو زبان کی خوش بختی ہے کہ اس نے ترجموں کی روایت کو ابتدا ہی سے اپنایا۔ اپنے دریچے باہر سے آنے والی ہواؤں کے سامنے کھولے اور بین الاقوامی کلچر کے نقوش سے اپنی محفل کو آباد کیا۔ اس دور تک آتے آتے وہ پرانی روایت ناکافی ہو گئی اور نئی دنیا کے تہذیبی سیاق و سباق نے برق رفتاری کے ساتھ ترجمے کے کام کو پھیلانے کو ناگزیر بنا دیا۔"

ابتدا میں علما اور فقہا نے عربی اور فارسی سے اور بعد میں عیسائی مشنریوں نے انگریزی سے مذہبی صحائف کے ترجمے کئے۔ دراصل ادبی تراجم کا یہ سلسلہ مذہبی تراجم سے شروع ہوتا ہے۔ دکن میں شیخ عین الدین گنج العلم رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۹۲۔۱۳۰۶ء) نے اردو میں مختلف علوم و فنون کی ۱۳۲ کتابوں کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد شاہ میران جی شمس العشاق نے شاہ وجیہ الدینؒ کی فارسی کتاب کا ترجمہ 'سب رس' اور عبداللہ حسینی کا ترجمہ 'نشاط العاشقین' اور سید حسینی شاہؒ کا ترجمہ 'شرح تمہید ہمدانی' اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اٹھارویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ (۱۷۶۰۔۱۷۰۲ء) کی اصلاحی وہابی تحریک جو صرف مذہبی، سیاسی و معاشی ہی نہیں بلکہ ادبی بھی تھی، نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر قرآن شریف کے ترجمے ہوئے جس سے بزدانوں میں بند قرآن عوام میں مقبول ہوا۔ حالانکہ شاہ ولی اللہؒ نے قرآن شریف کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا۔ لیکن اس ترجمۂ قرآن کے ذریعے اصلاحی ادب، مذہبی صحائف کے ترجمے کا سلسلہ شروع ہوا۔

مشرق وسطیٰ کے افکار و عقائد کی نشر و اشاعت نے اردو میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان مذہبی اور نیم مذہبی ادب اور ان سے متعلق اساطیری ادب کا ضخیم حصہ رکھتا ہے۔ وید، پران، مہابھارت، گیتا، رامائن اور پھر ان کی تفصیلات اور جزئیات پر مشتمل تصانیف کا کثیر ادب قابل ذکر ہے۔ ان میں گیتا کو سب سے اونچا مقام حاصل ہے۔ یہ ہندو عقائد کی اساس ہے اور ہر دور میں اس کے ترجمے و تشریح پر توجہ دی جاتی رہی ہے۔ اردو میں سب سے زیادہ اس کتاب کا ترجمہ ملتا ہے۔ بھگوت گیتا کے علاوہ وید، پران، اُپنشد، منو سمرتی، درشن، یوگ، بھگتی، مہابھارت اور رامائن کے ترجمے بھی اردو میں کافی ہوئے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں انگریزی حکومت جب مغربی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی تو اپنے فکر و نظریے کے ساتھ اس نے مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ عیسائی مشنریوں کا مقصد دراصل ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنا تھا۔ اس لئے انہوں نے اردو میں بائبل و اناجیل مقدس کے خوب ترجمے کئے۔ ہندوستان میں مغربی زبانوں کے تراجم کی ابتدا عیسائی مشنریوں کی آمد کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ سترہویں صدی سے شروع تو ضرور ہوا لیکن اٹھارویں

۵/۱۰۳۔ کرسپاومار، دہلی کینٹ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۱۰

صدی میں اس کا عمل تیز ہو گیا۔

Society of British and Foreign Bible نے ہندستان میں چار مشنریاں --- (i)Bundson (ii)Grant (iii)Jashua Marshaman اور (iv) W.Ward نے ذریعے بائبل کے ترجمے اور طباعت واشاعت ہوئی۔ یہ ساری مشنریاں سیرام پور مذہبی تبلیغ کی غرض سے بھیجی گئی تھیں۔ جب ۱۸۱۸ء میں سیرام پور کالج کی ابتدا ہوئی تو یہ ادارہ ہندوستان میں مسیحی تعلیمات کا سب سے اہم ادارہ بن گیا جس کا بنیادی مقصد ترجمہ کر کے مسیحی تعلیم کو فروغ اور سائنسی علوم کو ہندوستان میں ترقی و ترویج کرنا تھا۔ دوسری طرف ان مذہبی صحائف کی اہمیت اس لئے بھی تھی کہ اس میں اخلاقیات یا مختلف مذہبی مسائل کے نکتے کو حکایتوں و کہانیوں کے ذریعے بیان کیا گیا ہے جو اردو فکشن کی نشوونما میں نمایاں مقام رکھتے ہیں اور اردو ادب کی افسانوی ضروریات کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ مذہبی صحائف جو عالمی ادب کا حصہ ہیں ان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد فورٹ ولیم کالج (کلکتہ)، دہلی کالج، برائے اسکول بک سوسائٹی، اودھ (لکھنؤ)، مدرسہ فخریہ (حیدرآباد)، اسکول بک سوسائٹی، دہلی، مطبع نولکشور (لکھنؤ)، سائنٹفک سوسائٹی (علی گڑھ)، ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی، یونیورسٹی اورینٹل کالج (لاہور) دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) اور اس طرح کے دوسرے تعلیمی اداروں اور سوسائٹیوں نے انگریزی و یوروپی فکشن کے ترجمے بھی متواتر شائع کئے اور انفرادی طور پر بھی لوگوں کی کوششیں جاری رہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۸۰۶ء میں 'ہندوستانی زبان کی قواعد' تصنیف کی۔ مغربی تراجم کے نقطہ نگاہ سے یہ کتاب بلاشبہ ایک عہد ساز تصنیف ہے۔ اس کا ایک حصہ شیکسپیئر سے متعلق ہے جس میں گلکرسٹ نے شیکسپیئر کے دو ڈراموں ---'شاہ ہنری ہشتم' اور 'ہیملٹ' کے ایک ایک اقتباس کا ترجمہ اردو رسم الخط میں کیا ہے۔ واضح ہے کہ اس وقت تک سیرام پور کے تراجم بائبل وانا جیل کے علاوہ کسی دوسری انگریزی ادبی تصنیف میں اس کے کسی حصے کو اردو میں منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے ان تراجم کو جدید اردو کا نقش اول ہونے کا صرف اعزاز حاصل نہیں ہے بلکہ اردو میں انگریزی سے ہونے والے اولین ترجمے ہونے کا بھی فخر حاصل ہے۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے دارالترجمہ کی ایک نایاب کتاب 'مجموعہ گنج' (۱۸۴۵ء) کلکتہ بک سوسائٹی پریس سے شائع ہوئی۔ جس کے سرورق پر حسب ذیل تحریر درج ہے۔

مجموعہ گنج

عقل روشن کرنے والی تعلیموں کا

اور

دانائی سکھانے والی تبلیغوں کا

اس میں

اکثر ملکوں کی بستی اور آدمیوں کے احوال کا بیان ہے

(ہندوستانی لڑکیوں کے لئے انگریزی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کیا گیا۔)

یہ کتاب بھی انگریزی سے اولین تراجم میں سے ہے۔ کتاب کے آخر میں یہ بھی درج ہے کہ ہندوستانیوں کو چاہئے کہ مغربی علوم کو اپنی زبان میں منتقل کر لیں۔

انگریزی کے علاوہ زیادہ تر ترجمے فارسی، عربی، سنسکرت و برج بھاشا سے ہوئے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے ان مترجمین نے داستانوں و تاریخوں کے ترجمے کئے جن کی اہمیت مسلم ہے۔ میر بہادر علی حسینی نے سنسکرت کی اخلاقی کہانیوں کا ترجمہ "اخلاق ہندی" (۱۸۰۲ء) اور شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی تخلیق "تاریخ آسام" کا ترجمہ "تاریخ آشام" (۱۸۰۵ء) کیا۔ میر شیر علی افسوس نے سعدی کی شہرہ آفاق کتاب "گلستاں" کا نثری ترجمہ "تاریخ اردو" (۱۸۰۲ء) اور منشی سجان رائے بھنڈاری کی فارسی تصنیف "خلاصۃ التواریخ" کے ایک حصے کا آزاد ترجمہ "آرائش محفل" (۱۸۰۳ء) کے نام سے کیا۔ مرزا کاظم علی جوان نے للو لال جی کی مدد سے کالی داس کی سنسکرت تصنیف ---"شکنتلا" (۱۸۰۲ء) اور "سنگھاسن بتیسی" کا ترجمہ سنسکرت سے کیا۔ انہوں نے فارسی تصنیف ---"تاریخ فرشتہ" کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ "تاریخ بہمنی" کے نام سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بارہ ماسہ و قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا تھا۔

مظہر علی خاں ولا نے سات نصیحتوں پر مشتمل ناصر علی بلگرامی کی فارسی تصنیف "ہفت گلشن" کا ترجمہ اسی نام سے کیا تھا۔ بعد میں "مادھونل" اور "کام کندلا" کا برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ ۱۸۰۱ء میں کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے فارسی کے "اقبال نامہ جہانگیری" اور سعدی کے "پند نامہ" کا منظوم ترجمہ کیا۔ "تاریخ شیر شاہی" (۱۸۰۵ء) کے نام سے فارسی تصنیف "تحفہ اکبر شاہی" کے تیسرے طبقے کا اردو میں ترجمہ کیا۔

میر امن دہلوی نے فارسی کے "چہار درویش" کا ترجمہ "باغ و بہار" (۱۸۰۱ء) اور ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف "اخلاق محسنی" کا آزاد ترجمہ "گنج خوبی" (۱۸۰۲ء) کے نام سے کیا تھا۔ حیدر بخش حیدری نے فارسی داستان 'حاتم نامہ' (۱۸۰۱ء) مصنف عبداللہ کا آزاد ترجمہ 'طوطا کہانی' (۱۸۰۱ء) اور "گلزار دانش" (۱۸۰۴ء) کے نام سے شیخ عنایت اللہ کی مشہور تصنیف "بہار دانش" کا اردو میں آزاد ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے "تاریخ نادری" کا فارسی سے اور ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف "روضۃ الشہید" کا آسان اردو ترجمہ "گلشن شہیدان" (۱۸۱۰ء) کے نام سے کیا تھا۔ خلیل اللہ اشک نے "داستان امیر حمزہ" (۱۸۰۲ء) اور "منتخب الفوائد" کے نام سے لکھی گئی فارسی کی سبق آموز کہانیوں کا ترجمہ کیا۔ انہوں نے ابوالفضل کی فارسی تصنیف "اکبر نامہ" کا ترجمہ "واقعات اکبر" (۱۹۰۹ء) میں کیا۔

امانت اللہ شیدا نے عربی کتاب "ہدایت السلام" کا ترجمہ اسی نام سے کیا۔ اس کے علاوہ عربی کے عالم مولانا جلال الدین کی معرکۃ الآرا کتاب "لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق" کا اردو ترجمہ و تلخیص "جامع الاخلاق" (۱۸۰۵ء) میں کیا۔ مولوی اکرام علی نے رسائل "اخوان الصفاء" کے ایک رسالہ کا عربی سے ترجمہ ۱۸۱۰ء میں کیا۔ مولوی حفیظ الدین احمد نے گلکرسٹ کی فرمائش پر ابوالفضل کی تصنیف "عیار دانش" کا ترجمہ "خرد افروز" کے نام سے کیا۔ مرزا محمد فطرت نے ول ہنٹر کی مدد سے

انجیل کا ترجمہ اردو میں "عہد نامہ جدید" (۱۸۰۵ء) کیا تھا۔ میر بخش علی نے منشی غلام حسین کی فارسی تخلیق 'سیر المتاخرین' کے ایک حصے کا ترجمہ 'اقبال نامہ' کے نام سے کیا۔ لیکن اس کی طباعت نہیں ہوئی تھی۔ پنڈت مدن مصر نے "ادھیاتم رامائن" کا ترجمہ 'رام چرت' کے نام سے کیا۔

اس طرح فورٹ ولیم کالج نے ترجموں کے ذریعے اچھی چیزوں کو اردو میں منتقل کیا۔ جس سے اردو میں ترجمے کی روایت کا سلسلہ چل نکلا اور براہ راست وکارگر انداز سے مغربی علمی اصولوں ومعیاروں کا اثر مرتب ہونے لگا۔

فورٹ ولیم کالج کے زوال کے بعد 'برائے اسکول بک سوسائٹی'، اودھ 'مغربی علوم وادب کے اردو تراجم کا دوسرا اہم مرکز تھا۔ نواب غازی الدین حیدر نے لکھنؤ میں سائنٹفک نظریے کو عام کرنے کے خیال سے یہ اسکول قائم کیا جس کا مقصد ایسا نصاب تیار کرنا تھا جو یوروپی دانش گاہوں کے ہم پلہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک ایسی نصابی کمیٹی ترتیب دی گئی جو نصاب کے لئے انگریزی اور فرانسیسی نصابی کتب کا انتخاب کرکے اس کا ترجمہ اردو میں کرنے کا فیصلہ کرتی تھی۔ اردو میں ترجمہ شدہ نصابی کتب کی طباعت کے لئے مطبع سلطانی (اودھ) قائم کیا گیا۔ نواب غازی الدین حیدر اور نواب نصیر الدین حیدر (۱۸۳۷۔ ۱۸۱۴ء) نے یوروپین مصاحبین کی مدد سے جدید علوم وفنون سے متعلق متعدد انگریزی کتب ورسائل کا ترجمہ کیا۔ اس سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے سید کمال الدین حیدر نے انگریزی کی ۱۹ کتابوں کا ترجمہ کیا۔

حیدر آباد، دکن میں نواب محمد فخر الدین نے سائنٹفک سوچ کو عام کرنے کے لئے ۱۸۳۴ء میں 'مدرسہ فخریہ' قائم کیا۔ اس مدرسے کے نصاب میں یوروپی دانش گاہوں کی نصابی کتب کو شامل کیا گیا۔ انہوں نے مغربی علوم وفنون کی ان کتابوں کو مقامی، فرانسیسی وبرطانوی مترجمین کے ساتھ مل کر خود اردو میں ترجمہ کیا اور اپنے سنگی چھاپہ خانہ سے شائع کرایا۔ نواب محمد فخر الدین خان کو 'علم ریاضی' اور 'علم ہیئت' سے خاص شغف تھا۔ انہوں نے ان موضوعات سے متعلق کئی رسالے خود تصنیف کئے اور سائنسی موضوعات سے متعلق انگریزی سے اردو میں ترجمے کا کام بڑے پیمانے پر کرایا۔ رسالہ 'ستہ شمیہ' مصنف ریورنڈ چارلس، چھ رسائل پر مشتمل ہے جو ۱۸۱۸ء میں لندن سے انگریزی میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دیباچے کے مطابق ترجمہ میر امن دہلوی، غلامی محی الدین حیدر آبادی، مسٹر جونسن اور موسیٰ تندوسی نے کیا تھا۔[۴]

دلّی کالج مغربی علوم کی تبلیغ واشاعت اور اردو کو علمی موضوعات سے روشناس کرانے کا دوسرا اہم مرکز تھا۔ جس نے مختلف موضوعات مثلاً ادبیات، اخلاقیات، سائنس، علوم جدیدہ، تاریخ، جغرافیہ، ریاضیات، قانون وغیرہ کی معیاری کتابوں کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا اور دلّی کالج کے ارباب علم نے پہلی بار ترجمہ کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے اصول مرتب کئے۔

انگریزی ومغربی علوم کی کتابوں کو ترجمہ کرنے کی غرض سے ۱۸۴۰ء کے اول و آخر میں 'اسکول بک سوسائٹی' قائم کی گئی۔ اس کے سکریٹری ڈاکٹر اسپنجر اور مترجمین مولوی امام بخش صہبائی، مولوی کریم الدین احمد، ماسٹر رام چندر، مولوی سبحان بخش، مولوی احمد علی، مولوی مملوک العلی، ماسٹر نور محمد، مولوی سید محمد باقر، سید کمال الدین حیدر، پنڈت سروپ نرائن اور مولوی ذکاء اللہ وغیرہ تھے۔ لیکن بعد میں جب لارڈ آکلینڈ نے دیسی زبانوں میں درسی کتابوں کو تیار کرنے کی غرض سے کمیٹی Society for the promotion of knowledge in India through the medium of Vernacular Languges بنائی۔ جس نے پانچ مختلف ناموں سے اپنی خدمات پیش کی۔ وہ یہ ہیں:

(۱) انجمن اشاعت علوم بذریعہ السنہ ملکی
(۲) دہلی ورناکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی
(۳) اردو سوسائٹی، دلّی
(۴) لائبریری آف یونیورسل نالج، دلّی
(۵) گنج علوم مفیدہ، دلّی

ان سوسائٹیوں نے سائنسی، علمی اور ادبی اصطلاحوں کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔

لیکن ان سے قبل دلّی کالج میں ترجمہ کا کام اس طرح انجام پاتا تھا کہ تین طلبہ جن میں ماسٹر رام چندر پیش پیش تھے اوقات درس کے بعد فلسفہ اور ریاضی وغیرہ کی کتابوں کا ایک ایک صفحہ اردو میں منتقل کرتے اور مسٹر بوتروس ترجمے کی اصلاح کرتے تھے۔ ترجمہ مکمل ہونے کے بعد طباعت کی جاتی تھی اور نیچے کی جماعتوں کے نصاب میں داخل کردیا جاتا تھا۔ دلّی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر الائز اشپرنگر نے 'قران السعدین' کے نام سے ہفتہ وار اخبار جاری کیا جس میں وہ مغربی ممالک کی خبروں، سائنس کے موضوعات پر کالج والوں کے مضامین، دوسرے اخبارات کے اقتباسات اور انگریزی کتابوں کے تراجم شائع کرتے تھے۔ مولانا مملوک العلی نانوتوی نے 'اقلیدس' اور حدیث کی مشہور کتاب--- 'حسن ترمذی' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مولانا امام بخش صہبائی نے شمس الدین فقر کی فارسی تصنیف 'حدائق البلاغت' کا ترجمہ ۱۸۴۲ء میں اسی نام سے کیا۔ پنڈت رام کشن نے مکناٹن کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ 'اصول دھرم شاستر' کے نام سے کیا۔ انہوں نے اسلامیات واخلاقیات کے موضوع پر مبنی ترجمہ 'سعید الاسلام' کے چوتھے باب کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک رسالہ 'علم طب' انگریزی سے ترجمہ کیا اور 'اصول قوانین دیوانی وفوجداری، اصول قانون کلکٹری، اصول قوانین گورنمنٹ کے ترجمے کئے۔

سیمول کوپر کی انگریزی کتاب Treatise of Surgery کا اردو ترجمہ جوزف ہنری ٹیلر نے 'رسالہ بیچ بیان جراحی' کے نام سے اور مولوی حسن علی خان نے ترجمہ 'قانون مال' ترجمہ 'گلستان سعدی' ترجمہ الف لیلیٰ (انتخاب)، ترجمہ کرہ ارضی، اور 'میر اشد علی' نے محمد اعظم کی فارسی تصنیف 'تاریخ کشمیر' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے 'بریف سروے آف ہسٹری' کے اردو ترجمے کی تصحیح واصلاح کی اور اس کی طباعت واشاعت میں مدد کی۔ منشی حسین نے 'تاریخ مغلیہ' کے نام سے ایک ترجمہ کیا تھا۔ مالک رام نے کالج کی جو فہرست مرتب کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

یہ انگریزی کتاب History of Moghal Empire کا ترجمہ ہے۔ اس کے ترجمے
میں ماسٹر نور محمد اور مولوی سبحان بخش بھی شریک کار تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کوئڈر صاحب کی انگریزی کتاب Modren Traveller کا ترجمہ 'تاریخ ایران' کے نام سے کیا۔ اور مسٹر مکناٹن کی کتاب کا اردو ترجمہ --- 'شرع شریف' کے نام سے کیا۔ 'سراجیہ' (اسلامی قوانین وراثت) یہ بھی مکناٹن کی اس موضوع پر انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ مکناٹن کی 'قانون محمد فوجداری' مسٹر پرنسپ کی انگریزی کتاب کا ترجمہ 'خلاصہ قوانین دیوان' اور 'اسکیپ وتھ' کی کتاب کا ترجمہ --- 'خلاصہ قوانین فوجداری' کے نام سے ہوئی تھیں۔

مولوی سبحان بخش نے علامہ الرحمٰن کی عربی تصانیف --- 'تذکرہ حکماء' اور 'تذکرۃ المغربین' ابن خلکان کی مشہور کتاب --- 'دینیات الایمان' کا ترجمہ --- 'تذکرۃ العلماء' کے نام سے اور فارسی تصنیف 'توزک تیموریہ' وغیرہ کے ترجمے اردو میں کئے۔ ہردیو سنگھ نے ڈی مارگن کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ --- 'اصول علم حساب' ماسٹر نور محمد نے مارشمین کی انگریزی کتاب کا ترجمہ --- 'تاریخ بنگال' رادھا کرشنن نے انگریزی سے 'ہندسہ بالجبر' اور 'رسالہ علم اودات' کا اجودھیا پرشاد نے ہرشل کے انگریزی رسالے Astronomy کا اردو ترجمہ 'رسالہ علم ہیئت' اور تھامس ویبٹر کی انگریزی کتاب کا ترجمہ 'اصول قواعد مائیات' اور ماسٹر رام چندر نے G. Norton کے انگریزی لکچروں کا ترجمہ --- 'اصول گورمنٹ' کے نام سے اور T. Tates کی کتاب Elements of Mechanism--- کا ترجمہ 'رسالہ اصول کلوں کے باب میں' کے نام سے کیا تھا۔

مولوی میر حسن نے مغربی تصانیف کے ترجموں کی ایک فہرست دی ہے جو ان سوسائٹیوں کی جانب سے شائع ہوئی تھیں:

(۱)	تاریخ انگلستان	(خلاصہ تاریخ گولڈ اسمتھ)
(۲)	الجبرا	ترجمہ برجیز
(۳)	اصول علم ہیئت	ترجمہ علم ہیئت ہرشل
(۴)	رسالہ کمسٹری	ترجمہ پارکر
(۵)	قانون مال	ترجمہ مارشمین
(۶)	پولٹیکل اکانومی (معاشیات)	ترجمہ ویلنڈ
(۷)	میکانیات	ترجمہ لارڈنر
(۸)	نیچرل تھیالوجی	ترجمہ پیلے
(۸)	مختصر خاکہ تاریخ عالم	ترجمہ مارشمین
(۹)	مارشمین کا سیول گائڈ مع خلاصہ شرع اسلامی و دھرم شاستر	
(۱۰)	انگریزی ڈرامے	
(۱۱)	جغرافیہ طبعی	ترجمہ ٹریل
(۱۲)	مساحت	ترجمہ تھیوڈمک
(۱۳)	طبعات	ترجمہ ارناٹ
(۱۴)	صرف و نحو انگریزی	ترجمہ ارنولڈ
(۱۵)	ہندوستان کے پیداواری ذریعے	ترجمہ رائل

ان میں زیادہ تر سائنسی رسائل ہیں۔ ادب سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مغرب علوم کی تعلیم اردو زبان کے ذریعے دی جاتی تھی۔ مشرق و مغرب کے علوم یکجا ہونے کے باعث ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی گئی۔ اور ایک ایسی نئی جماعت پیدا ہوئی جس میں نئے، روشن خیال اور بالغ النظر انسان اور مصنف نکلے۔ ادبی کتابوں میں انتخاب الف لیلہ، ترجمہ گلستاں، مہابھارت، زلیخا، بدر منیر، لیلیٰ مجنوں، حدائقۃ البلاغت، شکنتلا، سنسکرت اور انگریزی ڈرامے، رگھوونش (کالیداس کا ڈرامہ)، جامع الحکایات، تاج الملوک وبکاؤلی، قصہ چہار درویش، قصہ یونس وسلیمان، رسالہ احکام الایمان وغیرہ کے ترجمے ہوئے۔

سائنٹفک سوسائٹی سرسید کے علمی کارناموں کا حرف آغاز ہے جس کا مقصد اردو میں انگریزی کی علمی کتابوں کے تراجم کو رواج دینا اور نیا عملی و عقلی انداز نظر پیدا کرنا تھا۔ اس سوسائٹی نے مغربی تعلیم، علوم وفنون کے اعلیٰ معیاروں کو اردو میں پیش کرنے اور خاص طور پر شمالی ہند میں ایک تہذیبی نشاۃ ثانیہ کو بروئے کار لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سے قبل انگریزوں کے ذریعے یا ان کے زیر اثر جو ادارے قائم ہوئے تھے ان کو عوام کا اعتماد حاصل نہیں تھا۔ عوام انہیں مشکوک نگاہوں سے دیکھتی تھی اور مذہبی تبلیغ کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ لیکن اس سوسائٹی کے قیام نے عوام کے اندر اعتماد پیدا کیا جہاں ہندوؤں، مسلمانوں و انگریزوں نے ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر باہمی افہام و تفہیم کی فضا کو سازگار کیا۔ جب اس کا پہلا اجلاس ۱۸۶۴ء میں منعقد ہوا تو اس سوسائٹی کے دو اہم مقاصد قرار پائے:

(۱) ان علوم وفنون کی کتابوں کا جن کا انگریزی زبان یا یوروپ کی کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے، ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

(۲) ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابیں تلاش کر کے بہم پہنچانا اور شائع کرنا......

دراصل سرسید احمد خاں اور ان کی سوسائٹی کا مقصد مغرب و مشرق کے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کو ترجمہ و تالیف کرنا تھا۔ انہوں نے اپنے لندن قیام کے دوران مختلف مغربی علوم کی اہم کتابوں کی ایک فہرست علمائے لندن سے انتخاب کرا کر سوسائٹی کو ترجمہ کے لئے بھیجی تھی۔ اس کے علاوہ سوسائٹی نے 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا جس میں سماجی، اخلاقی، علمی اور پولیٹکل مضامین چھپتے تھے۔ اس میں انگریزی اخباروں کے عمدہ آرٹیکل جو معاملات ہندوستان سے تعلق رکھتے تھے وہ برابر ترجمہ ہو کر چھپتے رہتے تھے۔ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ۔ "شعبۂ علمیہ" اردو زبان وادب کی ترقی (تصنیفات، تالیفات وتراجم) سے متعلق بھی تھا۔ لیکن بعد میں اس کو علیحدہ کر کے 'انجمن ترقی اردو' (۱۹۰۳ء) کی بنیاد ڈالی گئی۔ انجمن کے اولین سکریٹری شبلی نعمانی تھے۔ وہ انجمن کے مقاصد پر بحث

کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ 'چونکہ ہر قوم کی ترقی اس بات پر موقوف ہے کہ علوم وفنون اس کی مادری زبان میں آجائیں۔ اس لئے اردو میں علوم وفنون جدیدہ کے ترجمے کی اہمیت مسلم ہے' اور وہ اعلیٰ پایہ کا ترجمہ یوروپی زبان سے کرانا چاہتے تھے، جو اس انجمن نے خاطر خواہ طور پر انجام دیے۔ شروع میں دس برسوں تک کام کی رفتار بہت سست رہی۔ ابتدائی سالانہ رپورٹوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ تجویزیں بہت پیش ہوئیں اور مترجمین کے ناموں کے ساتھ ترجمہ شدہ کتب کے نام بھی شائع کئے گئے لیکن ان میں بیشتر تراجم مسودات کی شکل میں رہے۔ انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ اصطلاحات علمیہ کا ترجمہ ہے اور اصول مع اصطلاحات پر توجہ دینا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ اہم کتابیں--- تاریخ ادبیات ایران از پروفیسر براؤن، ریاست از افلاطون، فاؤسٹ (ڈرامہ) از گوئٹے، تاریخ اخلاق یوروپ از پروفیسر لیکی، تاریخ وتمدن از ٹامس بکلے، مشاہیر یونان وروما از پلوٹارک، خطبات گارساں دتاسی، فلسفہ تعلیم از ہربرٹ اسپنسر، تاریخ ہندوستان و تاریخ عہد انگلشیہ از مارشمین یادگار ہیں۔

حیدرآباد میں علوم کے ترجمے کی اولین کوشش شمس الامراء (۱۸۳۴ء) کے دارالترجمہ میں کی گئی تھیں۔ لیکن جب دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تو دکن کی ادبی روایات، ترجمہ و تالیف میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ نظام دکن نواب میر عثمان علی خاں کے فرمان (۲۲ دسمبر ۱۹۱۸ء) میں واضح طور پر کہا گیا ہے---

"ایک شعبۂ تالیف وتراجم قائم کیا جائے جو مغربی زبانوں سے اعلیٰ درجے کی تصانیف کا ترجمہ کرے اور ضروری مباحث پر عمدہ تالیفات کا انتظام کرے۔"

اردو میں پہلی مرتبہ بڑے پیمانے پر جدید علوم اور سائنس کی اصل تصانیف کے ترجمے سائنٹفک اصول کی بنیاد پر یہاں کیا گیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی، عبدالباری ندوی، ڈاکٹر ولی الدین، علامہ احسن گیلانی، ڈاکٹر وحید الدین، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر ہارون خاں شیروانی، علی حیدر طباطبائی، مارماڈیوک پکھتال، ابوالخیر مودودی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ابن حسن، محمد نذیر الدین، ڈاکٹر یوسف حسن خاں، ڈاکٹر سید عابد حسین اور ڈاکٹر سجاد حسین وغیرہ نے دارالترجمہ کے تحت تراجم کئے۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد اردو کو نئے علوم وفنون سے روشناس کرانا تھا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے قیام کے بعد اس کا ذاتی پریس 'مکتبہ جامعہ' کے نام سے قائم ہوا۔ مکتبہ جامعہ سے متعدد اہم کتابوں کے تراجم اور رسالہ 'جامعہ' شائع ہوا، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) آپس کے گیت (ناولٹ) — مترجم — قرۃ العین حیدر
(۲) زندگی کی لہر (ناول) از ساڈنگ — مترجم — محمد خلیق
(۳) تاریخ ادبیات تاجکستان — مترجم — کبیر احمد جائسی
(۴) بوطیقا (بعنوان فن شاعری) — مترجم — عزیز احمد
(۵) انٹینی اور کلوپیٹرا — مترجم — منیب الرحمن
(۶) میں واپس آؤں گا (ناول) از فاؤسٹ — مترجم — محمد انیس
(۷) آئینہ ایام (ڈرامہ) از جے۔ پرسٹیلے — مترجم — خلیق احمد
(۸) شکست ناتمام از جان اشٹین بک — مترجم — زہری سیدین

اس کے علاوہ یہاں سے نکلنے والا ماہنامہ رسالہ 'جامعہ' میں مغرب سے تراجم کا سلسلہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کی بنیاد شبلی نعمانی نے مشرقی علوم وفنون، مذہبی مسائل اور دینیات کی ضرورت کے تحت رکھی تھی۔ لیکن اس ادارے نے مغربی تراجم کو بھی اپنے مقاصد میں شامل رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ دارالمصنفین کے دارالتصنیف سے مختلف مغربی علوم وفنون کی بیشتر کتابیں ترجمہ و تالیف ہوئیں۔ عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا حمید الدین اور پروفیسر نواب علی نے ترجمہ کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے ترجموں کی زبان عربی آمیز ہے۔ اس ادارے نے ۱۹۶۴ء تک جن اہم تصانیف کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان میں روح الاجتماع از گستاؤلی بان، انقلاب الامم از گستاؤلی بان، پیام امن از رچرڈ پال، مبادی علم انسانی از برکلے۔ مکالمات برکلے، فطرت نسواں از پارٹیسن اور 'افکار عصریہ' از چارلس آرگبن بہت نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس ادارے کا اپنا مجلّہ 'معارف' نے جولائی ۱۹۱۶ء سے علمی میدان میں مسلسل اپنی خدمات انجام دی جن میں مغربی مضامین کے ترجمے ہمیشہ شائع ہوئے۔

چنانچہ ان مختلف اداروں سے کئے گئے تراجم سے مغربی تعلیم عام ہوئی اور لوگوں کے اندر ترجمہ کرنے کا شوق پیدا ہوا اور لوگوں کی دلچسپی دوسرے ممالک کے تہذیب وتمدن کو جاننے، وہاں کے ادب کو پڑھنے میں پیدا ہوئی۔ ان مترجموں نے آگے چل کر مغربی ناولوں، کہانیوں و تمثیلوں کے ترجمے کئے جس سے تذکرہ کی جگہ تنقید، داستان و تمثیل کی جگہ ناول نویسی اور نوٹنکی کی جگہ ڈرامہ اور کہانی کی جگہ افسانے نے لے لی۔ نیز یہ کہ ان تراجم نے نئی نئی اصناف سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان اصناف کو فنی وقار بھی بخشا۔ اس لئے ترجمہ کی بدولت اردو ادب بھی ادبیات عالم کے شانہ بہ شانہ قدم ملاکر چلنے کا خواب دیکھنے لگی۔ یہ تبدیلیاں محض ہیئت کی سطح پر نہیں ہوئی تھی بلکہ مضمون کے ساتھ ساتھ ادبی رویوں میں بھی تبدیلیاں تھیں۔

اردو میں ترکی، عربی، فارسی، چینی وجاپانی زبانوں سے ناولوں و افسانوں کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں۔ ترکی زبان سے ترجمے کی ابتدا سجاد حیدر یلدرم نے کی تھی۔ انہوں نے ایرانی وترکی افسانوں وناولوں کے ترجمے اس کی فضا و ماحول کو ہندوستانی قالب میں ڈھال کر کیا ہے۔ یلدرم نے احمد حکمت کے ترکی ناول 'ثالث بخیر' (دارالاشاعت، پنجاب لاہور، بار دوئم ۱۹۲۱ء) کا لفظی ترجمہ کیا تھا۔ عام طور پر اس ناول کو سجاد حیدر یلدرم کا پہلا ناول قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس سے قبل ترکی ناول ---'ہاجرہ' کا ترجمہ کیا تھا۔

'زہرا' (مسلم یونیورسٹی بکڈپو، علی گڑھ) مطلوب حسنیاں (مسلم یونیورسٹی بکڈپو، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء) اور آسیب الفت (مسلم یونیورسٹی بکڈپو، بار اول ۱۹۳۰ء) وغیرہ ناول ترکی سے آزاد ترجمہ ہیں۔ جس میں انہوں نے ترکی معاشرت اور حسن

وعشق کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے میر محمد حجازی کے فارسی ناول ہما خانم (ادارہ ادب جدید، حیدر آباد) کا ترجمہ کیا تھا جو سلسلہ وار رسالہ 'نیرنگ خیال' میں شائع ہوا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم نے ان ناولوں کے علاوہ ترکی ڈراموں کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ ترقی پسند اور انقلابی ترکی ادیب نامق کمال کے طویل تاریخی ڈرامہ --- جلال الدین جوازم شاہ (مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۵ء) کا ترجمہ انہوں نے رشید احمد صدیقی کی خواہش پر کیا تھا جس کا بیشتر حصہ ماہنامہ 'سہیل' میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ترکی ڈرامے --- جنگ وجدل (مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۳۳ء) اور ڈرامہ 'پرانا خواب' جس میں افسانوی حسن پوشیدہ ہے کا ترجمہ کیا۔

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوی مجموعے --- خیالستان (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۱۰ء) اور حکایات واحساسات (مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ) میں زیادہ تر افسانے ترکی سے ماخذ ہیں۔ کچھ افسانوں میں انہوں نے اس قدر تصرف سے کام لیا ہے کہ وہ طبع زاد معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق خود یلدرم نے کہا ہے --- "ان میں میں نے بہت کچھ تصرف کیا ہے۔" ؎

'حکایات واحساسات' میں کچھ افسانے خالدہ ادیب خانم اور کچھ دوسرے ترکی ادیب کے ترجمے، تلخیص اور ماخوذ ہیں۔ یلدرم اس کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"افسانہائے عشق، گمنام خطوط، بزم رفتگان، کوسم سلطانی، مادر وطن، ویران صنم خانے، ترکی کی عدیم المثال مصنفہ اور وطن پرست خالدہ ادیب خانم کی سحر آفریں تخیل کا نتیجہ ہے۔ آئینے کے سامنے، تیتری، ایک مغنیہ سے التجا، عورت کا انتقام، داماد کا انتخاب دوسرے ترکی مصنف سے بہ تصرف لئے گئے ہیں۔ باقی مضامین طبع زاد ہیں......"

عربی مصنفوں میں مصطفیٰ منفلوطی، خلیل جبران، جرجی زیدان وغیرہ کے ناولوں و افسانے کے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں۔ 'ماجدولین' یا 'زیر سایہ' فرانس کے ادیب 'الفونس کار کا شاہکار ہے جس کو مصری ادیب مصطفیٰ المنفلوطی نے عربی میں تحریر کیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ (نگار۔ جنوری وفروری) ۱۹۴۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ شام کے عیسائی فاضل اہل قلم کی تصنیف ندرہ نقوی کا ترجمہ مولوی محمد حسین صاحب نے کیا تھا۔ دراصل یہ عربی رسالہ ہے جس کا موضوع تمدنی ومعاشرتی غلطیوں کی اصلاح ہے۔ آقائے سید نفسی کے لکھے ہوئے مشہور فارسی ڈرامے کا ترجمہ "سلطان محمود"، اختر شیرانی کے فارسی ڈرامہ --- 'ضحاک' اور مولانا عبدالقوی کے سرگزشت وزیر خان کے عنوان سے کیا۔ حامد حسین قادری نے ایرانی افسانے کے نام سے چند فارسی افسانوں کا اور منیب الرحمٰن نے 'جمال زادہ' کے کئی فارسی افسانوں کو اردو فضا میں تبدیل کر کے شائع کیا تھا۔ جب جدید چینی افسانوں کا مجموعہ —Living China کے عنوان سے شائع ہوا تو تمنائی نے اس کے کئی افسانوں کا ترجمہ اردو میں کر کے اس کو "زندہ چین" کے نام سے شائع کرایا۔ حالانکہ چین کے متعلق پرل ازبک کی بعض کہانیوں کے ترجمہ بھی ہونے تھے۔ ظ۔ انصاری نے چین کی پانچ کہانیوں کا مجموعہ -- چین کی بہترین کہانیاں کے نام سے شائع کیا۔ چینی افسانہ نگار لہیہ سون کو چینی پریم چند کہا جاتا ہے، ان کی متعدد کہانیوں کے ترجمے ہوئے۔ اس کے علاوہ پوتافو ماؤفون، پھوسگ لگن لاؤتن، لیوپائی، تونگ لنگ وغیرہ کی بہت سی کہانیوں کے ترجمے ہوئے۔ کچھ جاپانی افسانوں کے بھی ترجمے ہوئے۔ ظفر قریشی نے جاپانی افسانہ 'وعدہ شکن' (ساقی، جنوری ۱۹۳۷ء) میں شائع ہوا۔ چینی وجاپانی افسانے کے عنوان سے عبدالقادر سروری اور راحت بی اے نے مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا۔ عبدالقادر سروری نے "قدیم افسانے" کے عنوان سے عربی، فارسی، یونانی وروسی کے شاہکار افسانوں کو شامل کر کے شائع کیا۔ غلام عباس نے جاپانی کہانیوں کا ترجمہ 'چاند کی مٹی' کے نام سے شائع کیا تھا اس کے علاوہ انڈونیشیا، کوریا، برما وغیرہ کے بھی چند افسانے ترجمہ ہو کر مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

ہندوستانی زبانوں میں ہندی، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، پنجابی، کشمیری، تامل، تیلگو، کنڑ اور ملیالم وغیرہ زبانوں سے اردو ترجمے ہوئے ہیں۔ لیکن اردو فکشن نے سب سے زیادہ استفادہ بنگالی فکشن سے کیا ہے۔ کیونکہ انگریزی تعلیم کے فروغ اور معاشرتی اصلاحی رجحان نے ادب میں جو رد عمل پیدا کیا تھا اس کے نتیجے کے طور پر سب سے پہلے بنگلہ زبان میں مغربی ناولوں اور افسانوں کے تراجم شائع ہوئے۔ جن کے فوراً بعد طبع زاد، ناولوں کی تخلیق رابندر ناتھ ٹیگور، بنکم چندر چٹرجی، شرت چندر وغیرہ نے کی تھی۔ بنگلہ میں بنکم چندر چٹرجی نے انگریزی تاریخی ناولوں کے طرز پر کئی ناول لکھے اور ہندوستان کے تاریخی واقعات، فضا اور ماحول کو اپنا موضوع بنایا۔ منشی جوالا پرشاد برق نے بنکم چندر چٹرجی کے مشہور بنگلہ ناولوں کا ترجمہ --- بنگالی دلہن، پرتاپ، روہنی، مرنالنی، مار آستین وغیرہ کے نام سے کیا تھا۔ بنکم چندر چٹرجی کا تاریخی ناول درگیش نندنی (ایک زمیندار کی بیٹی) جو بھودیو مکھرجی کی کہانی --- "انگوریا بن مئے (انگوٹھی بدلنا) کی ہیئت اور اسکاٹ کے (ایوا ہنو) کی بنیاد پر انہوں نے اس کا پلاٹ بنایا تھا اس کا ترجمہ عبدالحلیم شرر نے کیا تھا جو "زمیندار کی بیٹی" کے عنوان سے قومی پریس، لکھنؤ سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اردو میں غالباً کسی تاریخی ناول کا یہ پہلا ترجمہ تھا۔

اردو افسانہ نگاروں میں پریم چند، نیاز فتحپوری، حجاب اسماعیل، سدرشن، اعظم کریوی، ل۔ احمد وغیرہ، ٹیگور، بنکم چندر چٹرجی وشرت چندر سے متاثر تھے جس کا اعتراف ان افسانہ نگاروں نے کیا بھی ہے۔ پریم چند نے ٹیگور کو انگریزی کی معرفت سے اردو میں متعارف کرایا تھا اور وہ اپنا پہلا افسانہ 'دنیا کا انمول رتن' لکھنے سے قبل ٹیگور کے افسانوں کے تراجم کی معرفت ادبی دنیا سے متعارف ہو چکے تھے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے انیسویں صدی کے اختتام تک بنگلہ ادب میں مقام پیدا کر لیا تھا اور ان کی نظمیں، گیت، ڈرامے، افسانے وناول شائع ہو چکے تھے۔ انگریزی کی معرفت نیاز فتحپوری نے 'عرض نغمہ' کے نام سے اور عبدالرحمٰن بجنوری نے 'گیتانجلی' کا ترجمہ کر کے اردو فکشن میں رومانیت کے رجحان کو داخل کیا اس کے علاوہ فراق گورکھپوری نے بھی گیتانجلی کا اردو ترجمہ کیا۔ کیونکہ ان نظموں میں جادو بھرے الفاظ کے پس پردہ جو جذباتی زور وخلوص تھا اس نے سبھی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ نیاز فتحپوری ان کی ماورائی عظمت اور ادبی سحر کاری سے اور بجنوری ان کی فلسفیانہ عظمت واظہار کی

بلندی سے متاثر تھے۔ اس کے علاوہ بنگلہ افسانوں کے بے شمار ترجمے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوئے تھے۔

بنگلہ ادب کی طرح دوسری ہندوستانی زبانوں میں گجراتی، مرہٹی، تامل وغیرہ کے ترجمے خوب ہوئے اور تیزی سے اردو رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ گجراتی، مرہٹی، بنگلہ، تامل زبانوں کے آٹھ مشہور افسانوں کا انتخاب 'طلوع سحر' کے نام سے نرائن دت سہگل اینڈ سنز نے شائع کیا تھا۔ کرشن چندر نے 'نئے افسانے' کے عنوان سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے نمائندہ افسانے منتخب کر کے شائع کیا۔ سدرشن نے بنگلہ و ہندی افسانوں کا ترجمہ کر کے 'چشم و چراغ' کے نام سے شائع کیا۔ ہندی سے بھی بے شمار ترجمے ہوتے رہے ہیں۔

اردو میں 'ناول' کا آغاز انگریزی و یوروپی ناولوں کے تراجم سے ہوا۔ جہاں تک مغربی فکشن کے تراجم کا تعلق ہے اس کا سلسلہ انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔ گارساں دتاسی کے کم و بیش تمام سالانہ خطبات، جن کا آغاز دسمبر ۱۸۵۰ء سے ہوتا ہے۔ ایسے ناولوں، اخلاقی قصوں، تمثیلوں اور نظموں کا ذکر ملتا ہے جو یوروپی زبانوں سے ترجمہ ہوئے تھے۔ ناول کے ترجمے کی پہلی کوشش اس وقت ہوئی تھی جب میر حسن (۱۸۳۴ء) میں انگلستان تشریف لے گئے تھے۔ انہوں نے وہاں انگریزی زبان وادب میں واقفیت حاصل کرنے کے بعد گولڈ اسمتھ کے مشہور ناول — 'دی ویکار آف ویکفلڈ' کے صرف ایک باب کا ترجمہ کیا تھا[۱۱] بعد میں اس ناول کا مکمل ترجمہ اردو میں عبدالرحمن نے ۱۸۸۵ء میں کیا۔ اس ناول کے ترجمے کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے--- بورڈ آف اگزامنرس کے سکریٹری ایم۔ ایس میرٹ نے کہا تھا---

"اس کتاب کو ختم کرو، ہمارے علم وادب میں اس کی بڑی وقعت ہے اور بجائے خود میں خیال کرتا ہوں کہ اگر اہل ہند اس کو بغور پڑھیں گے اور محاسن پر نظر کریں گے تو انہیں ناول نویسی کا ڈھنگ آجائے گا۔"

عبدالرحمٰن مترجم 'دی ویکار آف ویکفلڈ' کے بیان سے یوسف سرمست نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ انگریزی ناول کا سب سے پہلا اردو ترجمہ ہے۔ لیکن ان کا ایسا سوچنا غلط ہے۔ کیونکہ اس سے قبل ۱۸۳۹ء میں ڈاکٹر سموئل جانسن کے انگریزی ناول---دی ہسٹری آف ریسلاس کا 'پرنس آف ابی سینا کا اردو ترجمہ سید کمال الدین حیدر نے "تواریخ ریسلاس شہزادہ حبش" کے عنوان سے کیا تھا۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزی کے بعض معیاری ناولوں اور ادبی حکایتوں کے ترجمے انیسویں صدی کے وسط تک ہو چکے تھے۔

نذیر احمد نے انگریزی ناولوں کا آزاد و لفظی ترجمہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ انہوں نے انگریزی ناولوں سے ماخوذ ناول تخلیق کیے۔ نذیر احمد کا ناول 'توبتہ النصوح' ڈینئل ڈیفو کے The Family Instructor اور 'بنات النعش' ٹامس ڈے کے 'ہسٹری آف اسٹینڈ فورڈ اور مرٹن' سے ماخوذ ہیں۔ انہوں نے ان دونوں ناولوں کے قصے کو اپنے ماحول و معاشرت کے مطابق مکمل طور پر ڈھال دیا ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے یوں تو ہیئت کی کتابوں کا سلیس اردو ترجمہ 'شمس الضحیٰ' (مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۸۷۳ء) کے نام سے کیا تھا۔ لیکن ان کی تخلیق 'فسانہ آزاد' (مطبع نولکشور، لکھنؤ ۱۸۸۰ء) ہسپانوی ناول نگار سروانٹے کے ڈان کوئیکزوٹ کا آزاد ترجمہ ہے جس میں میاں خوجی Sancho Panza اور آزاد ڈان کوئکزوٹ کا پرتو ہیں۔ دوسرا ترجمہ انہوں نے اسی کتاب کا "خدائی فوجدار" (مطبع نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۰۳ء) کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے لارڈ فرن کی تصنیف کا ترجمہ کیا جو غیر مطبوعہ ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کے پولیٹیکل رسالے 'الف لیلہ' کا کئی زبانوں سے ترجمہ کیا اور "تاریخ مصر" (شارخ بنات) انگریزی سے اردو میں تدوین کی۔ ان کے دیگر تراجم میکوی کا سفر نامہ، اعمال نامہ روس، ویلس کا ترجمہ، اشیا (غیر مطبوعہ) اور رائنس کی کتاب کا ترجمہ اخلاق (مطبوعہ ۱۸۸۹ء) وغیرہ ہیں۔

عبدالحلیم شرر نے ولیم۔ ایم۔ رینالڈس کے ناول کا ترجمہ --- 'خوبی قسمت' کے عنوان سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ رینالڈس کے ایک اور سنسنی خیز ناول کے ترجمے کا ذکر ملتا ہے جو انہوں نے 'ڈاکو کی دلہن' (۱۹۰۱ء) کے نام سے کیا تھا۔ ان ناولوں کے علاوہ انہوں نے قیام دہلی کے دوران 'کتاب التوحید' (۱۸۸۱ء) کا اردو ترجمہ کیا تھا۔ 'مضامین شرر' کی پہلی جلد کے انشائیے مغربی ادب کے جواہر پاروں کے زیادہ تر ترجمے ہیں۔ انہوں نے کالیداس کے 'ریتوسمہارون' کا ترجمہ 'موسموں کی بہاریں' کے نام سے کیا۔ شرر نے انتقال سے کچھ پہلے سنسکرت کے مشہور ڈرامہ نگار کالی داس کا ڈرامہ 'شکنتلا' کا ترجمہ ناول کی شکل میں شروع کیا تھا۔ شرر نے انگریزی مورخ جان کاکس کی کتاب---وارز آف کروسیڈس کا ترجمہ 'حروب جلد' بالاقساط ہفت روزہ 'مہذب' میں شائع کیا۔ 'تاریخ تیونس' کے سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ شرر نے "پیسہ اخبار" (لاہور) کے لئے 'تاریخ دول البحار' کے اس حصے کا ترجمہ کیا تھا جو تیونس اور ترپولی کی بحری و بری تاریخ پر مشتمل ہے۔ انہوں نے انگریزی شاعر و ناول نگار کے منظوم ڈرامے The Captivity کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔

مرزا رسوا نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن سے کیا تھا۔ انہوں نے افلاطون، ارسطو کے علاوہ انگریزی رسالہ---رسالہ اصول کیمیا (۱۸۸۹ء) کا ترجمہ کیا۔ رسوا نے حکمت الاشراق (فلسفہ ۱۹۲۵ء)، مبادی علم النفس (جی۔ ایف۔ اسٹوٹ)، بنی آدم (اسٹوائٹ چیپس) مفتاح المنطق (ایچ۔ ڈبلیو۔ بی۔ جوزف)، اخلاق نقوماجس کیا۔

میری کوریلی کے انگریزی ناولوں ---خونی مصور (۱۹۱۹ء)، خونی عاشق (۱۹۲۰ء)، خونی شہزادہ (۱۹۲۱ء)، خونی بھید (۱۹۲۴ء)، خونی جورو (۱۹۲۸ء) کا ترجمہ کر کے جاسوسی ادب کو اردو میں متعارف کرایا۔ انہوں نے مارس لیبلانک کے ناول کا اخذ و ترجمہ کر کے 'بہرام کی رہائی' کے عنوان سے ایک ناول تخلیق کیا تھا۔ اس ناول کا پلاٹ انگریزی ناول پر مبنی ہے۔ لیکن اس کے کردار و مقامات ہندوستانی ہیں۔

کلیم محمد علی طبیب، منشی جوالا پرشاد برق، پنڈت کشن پرشاد کول جیسے ناول نگاروں کا ایک سلسلہ ملتا ہے جنہوں نے براہ راست انگریزی و بنگلہ زبان و ادب کا ترجمہ

کر کے مغربی فکشن کے اثرات کو قبول کیا۔ کلیم محمد علی طیب نے نیل کا سانپ (۹۷-۱۸۹۶ء) میں شیکسپیئر کے دو ڈراموں جولیس سیزر اور انتونی قلو پطرہ کا آزاد ترجمہ کیا۔ منشی جوالا پرشاد برق نے بنگلہ ناولوں کے تراجم کے علاوہ شیکسپیئر کے بعض ڈراموں کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ لیکن ان میں سے کچھ شائع نہیں ہو سکے۔ پنڈت کشن پرشاد کول نے شیاما (الہ آباد انڈین پریس) اور اناطول فرانس کے ناول 'تائیس' کا اخذ و ترجمہ 'سادھو اور بیوا' کے نام سے کیا تھا۔ آغا شاعر نے 'طلسمی بدلہ' اور محمد مہدی تسکین نے 'برف کی دیوی' کے نام سے کئی انگریزی ناولوں کا آزاد ترجمہ کیا تھا۔ رینالڈس کے ناولوں کا اردو ترجمہ حضرت ریاض نے 'حرم سرا' کے عنوان سے اور مولانا سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ نے ناول---ماسٹر نو تھیز بک کیس کا 'دعوکہ' عرف 'طلسمی فانوس' (۱۹۲۵ء) کے عنوان سے کیا تھا۔

بیسویں صدی میں ل۔ احمد نے ناول کی ہیئت میں سر تامس مور کی انگریزی مثنوی---لالہ رخ (لکھنو، نگار بک ایجنسی، طبع اول ۱۹۲۲ء) کا ترجمہ کیا جو رسالہ 'نگار' (۱۹۲۲ء) کے پہلے شمارے سے سلسلہ وار کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ اس ناول کا طرز تحریر اور اس کا قصہ اردو کے افسانوی ادب میں ایک کامیاب افسانہ تھا جو اپنی خوبیوں کے باعث تخلیقی درجہ رکھتا ہے۔ ان کا دوسرا ناول فسانہ محبت (۱۹۳۵ء) جس کی فضا و پس منظر ہندوستان ہے۔ یہ بھی کسی انگریزی ناول سے ماخوذ ہے۔ حالانکہ انہوں نے اس بات کی تشریح نہیں کی ہے کہ یہ کس انگریزی ناول سے اخذ کیا گیا ہے۔ ل۔ احمد نے براہ راست روسی زبان سے 'انیا کیسانوف' کے ناول کا ترجمہ 'نئی صبح' (ماسکو، ترقی دارالاشاعت، ۱۹۴۶ء) کے عنوان سے کیا تھا۔

قاضی عبدالغفار نے مکتوباتی ناول---لیلیٰ کے خطوط (۱۹۳۲ء) اور مجنوں کی ڈائری (۱۹۳۴ء) تخلیق کیا جو انگریزی ناول نگار ڈوما فلز کے ناول---لیڈی دوری کیمیلاس' کے ناول سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے جان گالزوردی کے The apple Tree کا ترجمہ 'سیب کا درخت' (لاہور، آئینہ ادب) کے نام سے کیا تھا۔

عنایت اللہ دہلوی نے بہ حیثیت مترجم کافی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے انگریزی زبان وادب کے اعلیٰ استعداد و علمی تخلیقوں کے ترجمے کئے۔ عنایت اللہ دہلوی نے اناطول فرانس کا خیر وشر کے موضوع پر ایک رقاصہ کے حوالے سے تحریر کیا گیا فرانسیسی ناول 'تائیس' (۱۹۲۸ء) کا ترجمہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے ۱۹۳۹ء سے قبل گستاؤ فلابیر کے دو ناول سلامبو (دو جلدیں) اور ہر دویاس (دہلی، محبوب المطابع) کا ترجمہ فرانسیسی زبان سے انگریزی کی معرفت کیا۔ انہوں نے بمبئی کی زندگی پر مبنی امریکی ناول نگار 'بہر وم فیلڈ لوئیس' کے ناول کا ترجمہ---بمبئی کی شام (لاہور۔ ادارہ ادبیات نو) اور روڈیارڈ کپلنگ کی The Jungle Book کا ترجمہ 'ژلفی' کے عنوان سے کیا۔ انہوں نے ناول نجم السحر (دہلی، ساقی بک ڈپو) اور تاریخی فکشن پر مبنی ولیم ہرلڈ کے ناول تیمور لین کا ترجمہ تیمور (اعظم گڑھ معارف پریس)، و چنگیز خاں (اعظم گڑھ، معارف پریس) کے نام سے کیا۔ عنایت اللہ نے دانتے کی Inferno Divine Comedy کا ترجمہ 'داستان جہنم' (دہلی، ساقی بکڈپو) اور ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے---میکبتھ، سفید خون، انطونی و قلوپطرہ، جولیس سیزر اور رومیو جولیٹ وغیرہ کے ترجمے کئے جو ساقی بکڈپو سے شائع ہوا۔ ان کے یہ تراجم اپنی جدت طرازی، خیال کی رنگینی اور رعنائی کے باعث اردو فکشن کو ایک نئے احساسات سے روشناس کراتی ہے۔

مجنوں گورکھپوری نے مغربی ادب کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ وہ بالخصوص انگریزی ناول نگار ٹامس ہارڈی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کے سبھی ناولٹ ٹامس ہارڈی کے ناول سے ماخوذ ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے انگریزی ناولوں سے مرکزی خیال اخذ کر کے ناولٹ تحریر کئے ہیں۔ لیکن اس کے کردار اور فضا ہندوستانی ہیں۔

"میں نے ہارڈی کے سات ناولوں کو اردو میں ڈھالنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ ان میں سے ابھی پانچ کو ہی اپنے کام میں لایا تھا...."

مجنوں گورکھپوری کا ناولٹ 'صید زبوں' (گورکھپور، ایوان پریس، ۱۹۴۴ء) ہارڈی کے ناول Wood Landers سے ماخوذ ہے جو 'من در چہ خیالم در چہ خیال' کے عنوان سے نگار میں ۱۹۲۸ء میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ بعد میں انہوں نے ضروری ترمیمات اور تبدیلی عنوان کے بعد کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ انہوں نے جارج ایلیٹ کے مرکزی خیال کو اخذ کر کے ناولٹ سرنوشت تخلیق کیا جو 'ایک نکمے کی سرگزشت' کے عنوان سے رسالہ ایوان (۱۹۳۲ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس ناولٹ کا عنوان اور تکنیک انہوں نے ترگنیف کے ناول A Dairy of Super Fluousman پر رکھا ہے۔ مجنوں گورکھپوری کا تیسرا ناولٹ 'بازگشت' بھی ہارڈی کے شہرہ آفاق ناول The Return of the Native سے ماخوذ ہے۔ جو رسالہ نگار (۱۹۲۹ء) میں مسلسل شائع ہوا تھا۔ لیکن اس کے واقعات، افراد اور مناظر سب اپنے گرد و پیش سے لئے گئے ہیں۔ ان کا چوتھا ناول 'سوگوار شباب' (گورکھپور، ایوان پریس، ۱۹۴۱ء) بھی ہارڈی کے ناول On a Tower Two سے ماخوذ ہے۔

امتیاز علی تاج نے لارڈ لیٹن کے انگریزی ناول جو محاصرہ غرناطہ سے متعلق تھا اس کا ترجمہ 'لیلیٰ' (لاہور، دارالاشاعت، پنجاب، طبع اول، ۱۹۲۴ء) اور حجاب امتیاز علی تاج نے لکاٹ لوئز کے ناول Little Women کا ترجمہ 'ننھی بیبیاں' (لاہور، دارالاشاعت پنجاب، س۔ن) کے عنوان سے کیا تھا۔ اس کے بعد عبدالمجید سالک، شیخ عبدالقادر سروری، مولانا ظفر علی خاں، عبدالرزاق ملیح آبادی، شاہد احمد دہلوی، رحمت بی۔ اے، اختر حسین رائے پوری وغیرہ نے انگریزی کے ناولوں کے ترجمے کئے۔ عبدالمجید سالک نے آر۔ ایل اسٹونیس کے تین ناولوں کا ترجمہ کیا اور لاہور سے ۱۹۲۶ء میں 'خودکشی کی انجمن' 'قصر ساحل' اور 'راجا کا ہیرا' عنوانات سے شائع کرایا۔ رحمت بی۔ اے نے انگریزی ناول---نقری گلاس آور کا ترجمہ 'بلوری آنکھیں' کے عنوان سے اور مولانا ظفر علی خاں نے انگریزی ناول کا آزاد ترجمہ 'میری عینک' کے عنوان سے شائع کیا۔ شاہد احمد دہلوی نے روسی ناول نگار ل۔ اندر لیف کے ناول کا ترجمہ 'پھانسی' (ساقی بکڈپو، دہلی)، انگریزی ناول---سرگزشت عروس (ساقی بکڈپو، ۱۹۳۶ء) گوڈفرے لیاس کے ناول Kazah Exodu کا ترجمہ عثمان بلور (کراچی اردو اکیڈمی، سندھ) کے عنوانات

سے شائع کیا تھا۔ قرۃ العین حیدر نے روسی ناول نگار واسل بائیکوف کے ناولٹ کا ترجمہ --- آلپس کے گیت (نئی دہلی، مکتبہ جامعہ) کے نام سے کیا تھا۔ اختر حسین رائے پوری نے پرل ازبک کے ناول 'گڈ ارتھ' کا ترجمہ 'پیاری زمین' کے عنوان سے کیا۔ اس طرح ۱۹۴۷ء تک بے شمار مغربی ناولوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) آرویل جارج، انیس سو چوراسی، ترجمہ ابوالفضل صدیقی، کراچی، اردو اکادمی، سندھ

(۲) آسکروائلڈ، ڈورین گرے کی تصویر، ترجمہ نامعلوم، لاہور بک لینڈ (انگریزی سے ترجمہ)

(۳) اسکروائلڈ، سلمیٰ، ترجمہ انصار ناصری، لاہور بک لینڈ (انگریزی سے ترجمہ)

(۴) آندریف۔ل، پھانسی، ترجمہ شاہد احمد دہلوی، ساقی بکڈپو (۱۹۴۷ء سے قبل شائع ہوا) (ناول The Hanged to Seven who Hanged کا ترجمہ)

(۵) آر۔ایل، اسٹیونسن، خودکشی کی انجمن، ترجمہ مولانا عبدالمجید سالک، لاہور، ۱۹۱۶ء (انگریزی سے ترجمہ)

(۶) آر۔ ایل اسٹیونسن، قصر ساحل، ترجمہ مولانا عبدالمجید سالک، لاہور، ۱۹۱۶ء (انگریزی سے ترجمہ)

(۷) آر۔ ایل اسٹیونسن، راجا کا ہیرا، ترجمہ مولانا عبدالمجید سالک، لاہور، ۱۹۱۶ء (انگریزی سے ترجمہ)

(۸) انیا کسیانوف، نئی صبح، ترجمہ ل۔احمد، ماسکو ترقی دارالاشاعت، ۱۹۴۶ء (روسی زبان سے براہ راست ترجمہ)

(۹) انیا کسیانوف، امتحان وفا، ترجمہ پروفیسر حسن رضوی ادیب، ماسکو ترقی دارالاشاعت، ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوا۔

(۱۰) بائیکوف واسل، آلپس کے گیت، ترجمہ قرۃ العین حیدر، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ، س۔ن۔ (روسی زبان سے ترجمہ)

(۱۱) بروم فیلڈ لوئیس، بمبئی کی شام، ترجمہ عنایت اللہ دہلوی، لاہور، ادارہ ادبیات نو، س۔ن۔

(۱۲) برونٹی ایمیلی، محبت کا انتقام، ترجمہ رئیس احمد جعفری، ناول Wuthring Height کا ترجمہ۔

(۱۳) بک، پرل از، پیاری زمین، ترجمہ اختر حسین رائے پوری، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی (گڈ ارتھ، ناول کا ترجمہ)

(۱۴) بک، پرل از، میں تمہاری ہوں، ترجمہ ن۔م راشد، لاہور، مکتبہ معین الادب، س۔ن (امریکی ناول کا ترجمہ)

(۱۵) بک، پرل از، بلوری آنکھیں، ترجمہ رحمت بی۔اے۔ (۱۹۳۹ء سے قبل)

(۱۶) ٹالسٹائی، کاونٹ لیو، محبت، ترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی، کلکتہ بک ہند ایجنسی، ۱۹۲۲ء

(۱۷) ٹالسٹائی، کاونٹ لیو، ترجمہ نامعلوم، ماسکو بدیسی زبانوں کا اشاعت گھر، س۔ن۔

(۱۸) خالدہ ادیب خانم، ربیعہ، ترجمہ شبلی، ایم کام، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، انگریزی کی معرفت ترجمہ۔

(۱۹) دوستوفسکی، فیودر، ذلتوں کے مارے لوگ، ترجمہ نامعلوم، ماسکو دارالاشاعت ترقی (روسی زبان سے براہ راست ترجمہ)

(۲۰) دوستوفسکی، فیودر، بے چارے لوگ، ترجمہ نامعلوم، ماسکو دارالاشاعت ترقی (روسی زبان سے براہ راست ترجمہ)

(۲۱) دوستوفسکی، فیودر، جرم وسزا، ترجمہ کمال الدین رضوی، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز

(۲۲) ڈے ٹامس، ہسٹری آف سینڈ فورڈ اور مرٹن، بابو شیو پرشاد، بنارس، نام مطبع ندارد، ۱۸۵۵ء

(۲۳) فرانس اناطول، سادھو اور بیوا، ترجمہ کشن پرشاد کول، (اخذ و ترجمہ) ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوا۔

(۲۴) فرانس اناطول، بلشازار اور بلقیس ملکہ سبا، عبدالرزاق ملیح آبادی، نام مطبع ندارد، ۱۹۳۹ء سے قبل

(۲۵) فرانس اناطول، فریب ہستی، ترجمہ تیرتھ رام فیروز پوری، لاہور نرائن دت سہگل (انگریزی سے ترجمہ)

(۲۶) کپرن، الیگزنڈر، یاما، ترجمہ ن۔م راشد، لاہور، ہاشمی بکڈپو، ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوا۔

(۲۷) کپلنگ، رڈیارڈ، جنگل میں منگل۔ مولانا ظفر علی خاں، عالم گیر بک ڈپو، The Jungle Book کا ترجمہ

(۲۸) گالزوردی، جان، سیب کا درخت، قاضی عبدالغفار، حیدر آباد دکن، اردو اکادمی، ۱۹۳۹ء سے قبل شائع ہوا۔

(۲۹) موپاساں، شیلا، ترجمہ تحسن حسن نقوی، لکھنؤ، نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، س۔ن (فضا اور مقام بدلے گئے ہیں)

(۳۰) موپاساں، ایک دل، ترجمہ سید قاسم محمود، لاہور مکتبہ جامعہ بہ اشتراک موسہ فرانکلن (فرانسیسی ناول کا ترجمہ)

(۳۱) مور، تھامس، لالہ رخ، ترجمہ۔ل۔احمد، اکبر آبادی، لکھنؤ بک ایجنسی، طبع اول، ۱۹۲۲ء

(۳۲) ویلز، ایچ۔جی، چاند میں پہلا آدمی، ترجمہ مظہر الحق علوی، لکھنؤ، نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، سن ندارد۔

(۳۳) ویلز، ایچ۔جی۔ پراسرار جزیرہ، ترجمہ مظہر الحق علوی، لکھنؤ نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، سن ندارد۔

(۳۴) ہیوگو، وکٹر، انسان، ترجمہ بشارت انور، کراچی، ایچ۔ایم سعید اینڈ کمپنی، طبع اول (Lee Misrable کا آزاد ترجمہ)

(۳۵) ہیوگو، وکٹر، بدنصیب، ترجمہ رام سروپ شرما، لاہور دارالاشاعت، پنجاب، ۱۹۲۸ء

(۳۶) ہیوگو، ولٹر، سرگزشت اسیر، ترجمہ سعادت حسن منٹو، لاہور بک اسٹال، بیرون لاہوری دروازہ، (The Last days of a Condemned کا ترجمہ)

اردو میں انگریزی و یوروپی زبانوں سے رومانی، سماجی، سیاسی، معاشرتی و ظریفانہ ناولوں کے ساتھ ساتھ جاسوسی ناولوں کے بے شمار ترجمے ہوئے ہیں۔ اردو فکشن کو جاسوسی ناول سے متعارف ظفر عمر نے فرانسیسی ناول نگار مارس لیبلانک کے عالمی شہرت یافتہ ناول کا ترجمہ 'نیلی چھتری' کے عنوان سے کر کے کرایا تھا۔ اس ناول کی فضا

اور کردار ہندوستانی قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اردو مترجمین اس ناول کی مقبولیت کے بعد جاسوسی ناول کے ترجمے کی جانب متوجہ ہوئے۔ بیسویں صدی میں سماجی ناولوں کی قدر وقیمت ایک مخصوص ادبی طبقے تک محدود تھی۔ لوگ 'خونی عاشق، انوکھا فقیر، خونی شہزادہ' جیسے ہلکے پھلکے حیرت واستعجاب سے بھرے رومانی ناولوں کے شائقین تھے۔ اس لئے ناشروں نے لوگوں کے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس قسم کے ناولوں پر توجہ دی اور جاسوسی ناولوں کے لاتعداد ترجمے شائع کئے۔ پنڈت کشور چند نے 'رتن بے بہا' (پانچ جلدوں میں)، پیاری (دو جلدوں میں) دام دلربا، ایران کا چاند، پلیڈرک کی کرتوت، نولکھاہار اور مرزار سوانے میری کوریلی کے ناولوں کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد منشی تیرتھ رام فیروزپوری، سراج الدین شیدا، صدیق احمد، اثر نعمانی اور ابن صفی وغیرہ نے میری کوریلی، مارس لیبلانک، سر آرتھر کانن ڈائل، رینالڈز، جے۔ ایس۔ فیلیچر، براؤن کارٹر، اگاتھا کرسٹی کے ناولوں کا ترجمہ کیا اور اردو فکشن میں ایک نئی روایت کا اضافہ کیا۔

اردو مختصر افسانہ اپنے تشکیلی دور میں جب مختلف منزلیں طے کر رہا تھا اس دوران مغرب کے شاہکار افسانوں کو اردو میں تیزی سے منتقل کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد انگریزی، فرانسیسی، ترکی، روسی، چینی، جاپانی، عربی، فارسی وغیرہ یوروپی وغیر یوروپی زبانوں کے افسانے کے ترجمے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو رہے تھے۔ جس کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ ان کے اثر سے خود اردو کے ادیب افسانہ نگاری کی جانب مائل ہو رہے تھے۔ ترجمہ، اخذ، تلخیص واقتباسات وغیرہ سے مغربی افسانہ اردو کے پیکر میں ڈھل رہا تھا جو نئے لکھنے والوں کے لئے شمع راہ تھا۔ اس دور کے رسائل کی ورق گردانی کرنے سے ایسے متعدد افسانوں کی نشاندہی ہوتی ہے جو مغربی زبانوں سے ماخذ تھے یا انہیں ویسا کا ویسا ہی ترجمہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ جب مغرب کے یہ تراجم اردو افسانہ نگاروں کے سامنے آئے تو انہوں نے ان سے پورا استفادہ کیا اور ان مغربی افسانوں کی روشنی میں اپنے فن کی تخلیق کرنے لگے۔ جس سے اردو فکشن کی تکنیک میں نئی زندگی پیدا ہوئی۔ ان اولین مترجمین میں --- تیرتھ رام فیروزپوری، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، عبدالمجید سالک، قاضی عبدالغفار، ل۔ احمد، پطرس، حامد علی خاں، منصور احمد، امتیاز علی تاج، خواجہ منظور حسین، عنایت اللہ دہلوی، عبدالقادر سروری، جلیل قدوائی اور بعد میں شاہد احمد دہلوی، ظفر قریشی، طاہر قریشی، فضل حق قریشی، عبدالرزاق ملیح آبادی، محشر عابدی، سعادت حسن منٹو اور تمنائی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان کی موجودہ وقدیم زبانوں کے علاوہ انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، اطالوی، روسی، ترکی، چینی وجاپانی زبانوں سے ترجمے کئے جس سے اردو افسانہ نگار، مغربی افسانوں کے فن وتکنیک کی لطافتوں، نزاکتوں اور بلندیوں سے روشناس ہوئے اور اردو افسانے میں پلاٹ کی ترتیب، کہانی کی ابتدا نقطہ عروج اور انجام جیسی تکنیکی تبدیلیاں مغربی طرز پر کی جانے لگی۔

روسی ادب کی حقیقت پسندی، زندگی کے مسائل پر گہری نگاہ، عوامی نقطہ نظر، نفسیاتی ورومانی رجحان ہندوستانی ادب کے عام میلانات سے ہم آہنگ تھے اور روسی افسانہ نگار اپنے طرز واظہار، انتخاب موضوع سے یہاں کی زندگی کے حقائق اور خوابوں سے قریب معلوم ہوتے تھے، اس لئے اردو میں روسی فکشن کے تراجم بڑی تعداد میں ہوئے۔ پشکن، گوگول، ترگنیف، چیخوف، ٹالسٹائے اور گورکی کے علاوہ دوسرے جدید روسی ادیب سیمونوف، پیٹرون، شونوفون وغیرہ کے افسانے بھی برابر ترجمے ہو کر مختلف رسائل میں شائع ہو رہے تھے۔ جلیل احمد قدوائی، ل۔ احمد، مجنوں گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری، حامد علی خاں، منصور احمد، نصیر احمد، سعادت حسن منٹو اور محمد مجیب وغیرہ مترجمین نے کچھ ترجمے براہ راست روسی زبان سے کئے اور کچھ انگریزی کے وسیلے اور واسطے سے ہوئے اور یہاں کے افسانہ نگاروں کے افسانوں پر روسی حقیقت نگاری بالخصوص چیخوف اور گورکی کے فن کے گہرے اثرات پڑے۔ پریم چند نے ٹالسٹائے کی بیس اخلاقی کہانیوں کا ترجمہ کیا تھا لیکن اس مجموعے کی اشاعت کے لئے اردو میں ناشرین کتب معقول معاوضہ دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے اسے اردو کے بجائے ہندی میں 'پریم پربھاکر' کے نام سے شائع کردیا۔ اس کے کچھ افسانے ۱۶۔۱۹۱۴ء کے دوران مختلف اردو رسائل میں ان کے اصل نام دھنپت رائے کے محض ابتدائی حروف د۔ ر سے شائع ہوئے تھے۔

سعادت حسن منٹو نے طبع زاد کہانیاں لکھنے سے قبل ٹالسٹائے کی دو کہانیاں -- 'تین سوال، شراب اور شیطان' کا ترجمہ کیا۔ چیخوف کی 'خادمہ' اور 'ایثار' گورکی کے 'چھبیس مرد ایک عورت' چیری کوف کے 'جادوگر' اور سلوگب کے دو افسانوں کا ترجمہ کر کے اس کا مجموعہ --- روسی افسانے (لاہور، دارالادب، ۱۹۳۴ء) کے نام سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ گورکی کے افسانوں کا مجموعہ --- گورکی کے افسانے (لاہور، مکتبہ شعر وادب) شائع ہوئے۔ پروفیسر محمد مجیب کے دو افسانوی مجموعے 'عورت' اور کیمیاگر (۱۹۳۲ء) کے افسانے روسی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ جلیل احمد قدوائی نے روسی شاہکار سے ماخوذ افسانے 'اصنام خیالی' اور 'سیر گل' (کانپور، زمانہ بک ایجنسی، ۱۹۳۸ء) شائع کرائے۔ اسرار احمد آزاد نے روس کے انقلابی افسانوں کا مجموعہ 'سرخ افسانے' کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ راحت۔ بی۔ اے نے چیخوف کے اصلاحی ومعاشرتی افسانوں کا ترجمہ کر کے 'مجموعہ گناہ اور دوسرے افسانے' کے عنوان سے شائع کیا۔ بعد میں انگریزی مختصر افسانوں کے لاتعداد ترجمے ہوئے اور مختلف اخباروں کے ضمیمہ رسالے میں شائع ہونے لگے۔ روسی افسانوں کی حقیقت پسندی اور فرانسیسی افسانوں کی رنگینی، سادہ نفسیاتی انداز وبیان، واقعات کے ڈرامائی موڑ نے سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر وغیرہ کو متاثر کیا جس سے نئے لکھنے والوں کا ایک کارواں سامنے آیا۔ ان افسانہ نگاروں کے نزدیک مغرب کے شاہکار تھے اور انہوں نے اسی کے طرز پر اپنے افسانوں کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ ادبی تخلیق کاروں کے یہ تراجم اردو فکشن کی توسیع وارتقا کے لئے سودمند ثابت ہوئے اور ان ترجموں کے بعد تخلیقی ادب کا دور شروع ہوا۔ تخلیق کاروں میں تخلیق کرنے کا جذبہ اجاگر ہوا اور نئے اسالیب میں وسعت پیدا ہوئی، رجحانات میں تغیر وتبدل کے امکانات روشن ہوئے۔ تراجم کے قارئین بھی اپنی تنگ دنیا اور محدود ماحول سے نکل کر وسیع تر فضا میں پہنچ کر نئی دنیا کا تجربہ حاصل کرنے لگے۔ بلاشبہ تراجم نے اردو فکشن کے نشوونما میں ہمہ گیر اثرات مرتب کئے۔

☆☆

حافظ عبدالمنان طرزی

ادب لطیف اور سجاد انصاری

سجاد انصاری، زبان اردو کے ایک منفرد دانشا پرداز ہیں جن کا تعلق نہ تو ادبی رومینٹکس سے ہے اور نہ کلاسی سیزس سے۔ یہ نہ تو ترقی پسند ہیں اور نہ رجعت پرست۔ نہ قدیم ہیں نہ جدید۔ یہ خود ایک ایسا اسکول ہیں جو انہیں کی ذات سے شروع ہو کر انہیں کی ذات پر ختم ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے دوسرے فنکاروں کے مقابلے میں سجاد انصاری کے اسلوب اور ان کی فکر پر لکھنے کی کسی نے زحمت گوارا نہیں کی۔ ترقی پسند ہوتے تو ترقی پسند مصنفین انہیں اچھالتے۔ رجعت پرست ہوتے تو یہ جماعت والے انہیں خراج تحسین پیش کرتے۔ جدیدئے ہوتے تو جدید ادبا اور ناقدین ان کا ڈھنڈورا پیٹتے۔ نومبر ۱۹۴۵ء کے 'آجکل' کے بارہویں شمارے میں 'نیم رس نالطے' کے تحت نور محمد صاحب کا ایک مقالہ سجاد انصاری پر مل جاتا ہے، جس میں ان کے اسلوب اور ان کی فکر پر بحث کرتے ہوئے ان کے ہم عصر---مہدی افادی سے سرسری موازنہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون چار صفحوں پر پھیلا ہوا ہے جب کہ "محشر خیال" میں ۲۵ مضامین، ۱۰۰ صفحے پر محیط ایک ڈرامہ، چھ نظمیں، چند غزلیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ ایسی صورت میں چار صفحوں میں کہاں تک سجاد انصاری کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا تھا۔

آل احمد سرور نے بھی انصاری صاحب کے فکر و فن پر ایک مختصر مضمون سپرد قلم کیا ہے۔

بہرحال سجاد انصاری پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ رشید احمد صدیقی اور خواجہ منظور کے اصرار پر۔ اس لئے جب بھی کوئی آدمی سجاد انصاری پر لکھنا چاہے تو لا محالہ اسے ان کے عصری پس منظر میں ان کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ زیر نظر مضمون میں ان کے اسلوب اور ان کی فکر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سجاد کے ہم عصروں میں، مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم دو ایسے فنکار ہیں جن کا نقطہ نظر سجاد انصاری کے نقطہ نظر سے کسی حد تک مشابہت رکھتا ہے۔ اول الذکر اسلوب میں اور موخر الذکر فکر میں، سجاد انصاری سے ملتے جلتے ہیں۔ لیکن بات اسلوب کی ہو یا فکر کی، سجاد ان دونوں سے قطعی طور پر جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ افادی، یلدرم اور انصاری کا ذہنی ماحول ایک ہے یعنی خالص جمالیاتی ادب اور خالص مقصدی ادب کا عبوری میدان۔ مہدی پر جمالیات کا غلبہ ہے اور یلدرم پر مقصد کا۔ سجاد کے یہاں جمالیات اور مقصد کا ایک نادر آہنگ ہے۔ اسی آہنگ نے ان کے اسلوب کو بھی متاثر کیا اور ان کے زاویہ نظر کو بھی۔ "محاسن و معاصی" ان کے فکر و فن کا نمائندہ ہے۔ اس میں حیات کا حسن اور تکوین کا مقصد---دونوں ہی سجاد کے منفرد انداز بیان کی صورت میں آجاتے ہیں۔ اس مضمون کی حیثیت کلیدی ہے۔ مسئلہ کوئی بھی ہو اسی محور کے گرد ناچتا ہے۔ زاویۂ نظر سے اتنی شدید وابستگی جتنی سجاد انصاری کے یہاں پائی جاتی ہے بلا خوف تردید اردو کے کسی ادیب کے یہاں نہیں پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے سجاد انصاری ادیب کم اور پیغمبر زیادہ ہے۔ یہی پہلو سجاد کو جرأت اظہار بخشتا ہے اور جرأت اظہار کو حسن۔ عام پڑھنے والے سجاد انصاری کو نہ تو دلچسپ پائیں گے نہ پرکشش کیوں کہ سجاد انصاری کو سمجھنے کے لئے یا ان سے متاثر ہونے کے لئے ان کے بنیادی نظریات کو سمجھنا ہوگا جو چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے مضمون میں یکساں طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ ماسی وحال، فلسفی اور شاعر، تبسم، آنسو، انسان، جھوٹ، وفا، صوفی جیسے عنوانات پر اختصار کے ساتھ جو بات پیش کی گئی ہے، عورت، اجتہاد و تحقیق، مذہب و اخلاق، پیام زلیخا، حقیقت عریاں، عفت نسوانی، محبت کی ماہیت نفسی میں وہی بات تفصیل کے ساتھ کہی گئی ہے۔ یہاں تک کہ 'روح ادب' جس کی حیثیت کلام پر تبصرہ کی سی ہے اور مکتوب بنام ایڈیٹر علی گڑھ میگزین میں جس کی حیثیت میگزین پر ریویو کی ہے اور مسلمانان ہند اور تحریک اصلاح جس کی حیثیت معاشرتی وسیاسی تبصرے کی ہے، ان میں بھی بڑی قوت اور حسن کے ساتھ سجاد انصاری نے اسی بنیادی نظریے کی تبلیغ کی ہے جو اول الذکر مضامین کا پہلو ہے۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ عام قاری سجاد انصاری کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا کیونکہ پڑھنے والے کی نظر ان کے بنیادی نظریے پر نہیں رہتی اس لئے سجاد انصاری کے اسلوب اور افکار و نظریات پر ناقدانہ روشنی ڈالنے سے قبل ان کے بنیادی تصور کو پیش کر دینا ضروری ہے تاکہ ان کے اسلوب اور فن کی صحیح قدر و قیمت معین کی جا سکے۔

نظریاتی اعتبار سے سجاد انصاری قوتوں کو ازلی اور ابدی مانتے ہیں اور انہیں قوتوں میں توازن قائم رکھنے کی سعی کو تکوین کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے کائنات اور اس کے تمام مظاہر کی حیثیت ان کے نزدیک اضافی ہے۔ خیر و شر کی بنیادی قوتوں میں توازن قائم کرنے کے لئے جو تاویلات کی گئی ہیں ان میں مدارج ہیں۔ انسان اول درجے کی تاویل کے صیغے میں آتا ہے جو خیر و شر کی قوتوں کے بلاواسطہ امکانی ٹکراؤ کو

محلہ فیض اللہ خاں، دربھنگہ۔ ۸۴۶۰۰۴

اپنی ذات کی طرف رجوع کرلیتا ہے، ورنہ نظام حیات درہم برہم ہو جائے۔ محاسن اور معاصی اضافی ہیں ان کے لئے کوئی معیار مطلق نہیں ہے۔ کائنات، تاویلات کا پرکار پردہ ہے، جس کی اپنی حقیقت کرشمۂ رنگ سے زیادہ نہیں ہے۔

یہی وہ بنیادی نظریات ہیں جن پر سجاد انصاری کے تمام مضامین کی اساس ہے۔ مسائل چونکہ بنیادی طور پر فکری اور مابعد الطبیعیاتی ہیں اس لئے اسلوب بھی لازمی طور پر ایسا ہی ہوگا جو وسیع و غیر منقسم افکار کے اظہار کا متحمل ہو سکے۔ خلیل جبران، نطشے اور دوسرے ادبا کے اسلوب میں جو بات پائی جاتی ہے کم و بیش وہی بات سجاد انصاری کے اسلوب میں موجود ہے۔ وسیع افکار کو سمیٹ کر پیش کرنے میں وضع اصطلاحات کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور غیر معمولی تحلیلی قوت کی بھی۔ اس اعتبار سے سجاد انصاری کا اسلوب مغربی مفکر بیکن سے مشابہت رکھتا ہے یعنی ایجاز و اختصار جو بیکن کا طرۂ امتیاز ہے سجاد انصاری کے یہاں موجود ہے۔ پانچ پانچ دس دس سطروں میں جن آفاقی اور کائناتی حقیقتوں کو شدت اور تاثیر کے ساتھ پیش کیا ہے، ان حقیقتوں کے بیان اور اظہار کے لئے دوسروں کو کتابیں لکھنی پڑتیں۔ آل احمد سرور فرماتے ہیں:

"ان کے یہاں فلسفہ اور ادب لطیف دونوں کا حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے اس بنا پر وہ ادب لطیف کے فلسفی کہے جا سکتے ہیں۔"

نور محمد صاحب نے سرور کے اس بیان سے اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے ادب لطیف اور فلسفے کو ایک دوسرے کی ضد مانا ہے اور اپنے اختلاف کی بنیاد ایڈ گرایلن پو کے ایک قول کو بتایا ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ روح کے پردے پر ہونے والے احساسات کی تشریح فن لطیف ہے۔ میرے خیال میں یہ قول فن لطیف کو فلسفے کی ضد ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ صرف فن لطیف کی تعریف ہے اور تعریف بھی مکمل نہیں۔ کیونکہ روح کا پردہ ایک ایسی تشبیہ ہے جو کسی طرح بھی کما حقہ سمجھی نہیں جا سکتی جب کہ تعریف کو تشبیہ و استعارات سے پاک ہونا چاہئے۔ یہاں پر میرا مقصد ایڈ گرایلن پو کے مقولے سے بحث کرنا نہیں بلکہ میرا مسئلہ نور محمد صاحب کا یہ بیان ہے۔ "فلسفہ تو دماغی ورزش کا دوسرا نام ہے اسے حسیات اور جذبات سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ تو ٹھوس حقائق سے سروکار رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے ادب لطیف انسان کے سوئے ہوئے جذبات لطیف کو بیدار کرتا ہے، دل و دماغ کو سکون بخشتا ہے اور مردہ طبیعتوں میں شگفتگی اور زندہ دلی پیدا کرتا ہے۔ لیکن فلسفہ دماغ کو سکون بخشنے کے بجائے تھکا دیتا ہے۔"

نور محمد صاحب کا یہ بیان اپنے اندر بہت طرح کے نقائص رکھتا ہے جن کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ فلسفے کو "ٹھوس حقائق" تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ان کے مطالعے کی کمی کی ایسی دلیل ہے جس کا انکار کرنا ممکن نہیں۔ ۱۹۲۵ء کے بعد تجربے سے ٹھوس حقیقتیں ختم ہو گئیں۔ ہزن برگ اور آئنسٹائن وغیرہم کی تحقیقات نے ٹھوس کے تصور کی جڑ ہی کاٹ دی۔ اب وجود غیر متعین اور سیال ہے اور حقیقت بذات خود ٹھوس نہیں ہے۔ اس لئے ایسا کہنا کہ فلسفے کا تعلق ٹھوس حقائق سے ہے، ہمالیائی غلطی ہے۔ اب جہاں تک دماغ کو سکون بخشنے اور تھکانے کا سوال ہے یہ انفرادی رد عمل ہے۔ بچوں کو سنجیدہ باتیں تھکا دیتی ہیں چاہے وہ کتنی ہی شگفتہ کیوں نہ ہوں۔ بالغ ذہنوں کو غیر سنجیدگی تھکا دیتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی دلفریب کیوں نہ ہو۔ اس لئے نور محمد صاحب کو ممکن ہے فلسفہ تھکا دیتا ہو لیکن بالغ ذہنوں کو یقیناً شگفتگی اور تازگی بخشتا ہے۔

بہر حال میں سرور صاحب کے قول سے متفق ہوں اور سجاد انصاری کو ادب لطیف کا فلسفی مانتا ہوں کیونکہ ان کا اسلوب فلسفیانہ اور ان کی فکر لطیف ہے۔ مثلاً حقیقت عریاں کا یہ جملہ:

"انسان نہ حق ہے اور نہ باطل۔ اس کا وجود محض ایک فریب کائنات ہے۔ اس کی ہستی فطرت کی اس آسان پسندی کا نتیجہ ہے جس نے فرشتے اور شیطان دونوں کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک پیکر اعتدال پیدا کر دیا۔"

یہ مثال سجاد انصاری کی ایجاز پسندانہ طبیعت کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے۔ یہاں لفظ فریب کا استعمال اس کے عام مفہوم سے الگ ہٹ کر خالص فکری مفہوم میں کیا گیا ہے۔ غالباً اردو میں تاویلات کے فکری پہلو کو پیش کرنے کے لئے فریب سے بہتر لفظ نہیں ہے۔

پیام زلیخا میں رقم طراز ہیں:

"فطرت شر نہ ارتقا کی محتاج تھی نہ مرور ایام کی وہ ایک سیرت مطلق ہے جس کی تکمیل کے لئے ان اضافتوں کی ضرورت نہیں جو فطرت خیر کے لئے لازمی تھی۔ شیطان خود اپنی ابتدا تھا اور اپنی انتہا۔ جس پیام کا وہ حامل اس کی تکمیل اسی وقت ہو چکی تھی جب وہ ملکوتیت کے گہوارے میں کھیل رہا تھا۔ قدرت صرف اس کی منتظر تھی کہ ایک حامل خیر وجود میں آئے۔ جب آدم کا تخیل مکمل ہو گیا، شیطنت مع اپنی تمام عظمتوں کے نمودار ہو گئی اور کائنات کو اپنی رنگینیوں سے لبریز کر دیا۔"

قدرت، بیان قدرت، فطرت شر اور فطرت خیر --- اتنے مختصر الفاظ میں تکوین اور اس کے متعلقات پر اتنا جامع بیان صرف سجاد انصاری کا حصہ ہے۔ اس سے اگر ایک طرف مسائل پر سجاد انصاری کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کی قوت اظہار کا احساس ہوتا ہے اور تیسری طرف ان کا وسیع مطالعہ بھی پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔ کم الفاظ میں وسیع افکار کا بیان کرنا بذات خود ایک اعجاز ہے جو صحیفۂ آسمانی میں پایا جاتا ہے۔ زمینی صحیفوں میں یہ اعجاز اس لئے نہیں پایا جاتا کہ یہ بنیادی طور پر تخلیلی ہیں کیونکہ ان کے عناصر تخلیقی ہمارے حدود حسی میں صرف وہی فنکار جنہوں نے حدود حسی کی تسخیر کر کے ماورا تک رسوخ حاصل کر لیا ہے اس بات پر قادر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں سجاد انصاری کا یہ حوالہ بھی اہمیت کا حامل ہے:

"محاسن و معاصی کا امتیاز کسی معیار مطلق پر منحصر نہیں۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سجاد انصاری کا اسلوب رواں، شستہ و شائستہ ہونے کے ساتھ ساتھ گٹھا ہوا، جامع اور بے انتہا بلیغ ہے۔ وہ کم الفاظ میں زیادہ معانی دینے کے فن پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ ان کے معانی فکری اور جاوداں ہیں۔ ان کے مسائل آفاقی اور کائناتی ہیں اور ان کے اسلوب کی بندش متوازن، بلیغ اور رمزی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ماورائی اور اجتہادی افکار کے اظہار کے لئے انہیں اصطلاحات وضع کرنا پڑی ہیں اور چونکہ وہ دیانت داری کے ساتھ اپنے نظریات سے وابستہ ہیں اس لئے ان کے یہاں چند علامتوں کی تکرار پائی جاتی ہے۔ یہ تکرار نور محمد صاحب اور ان کے جیسے قارئین کو ممکن ہے گراں گزرے لیکن کسی پیغمبر کے لئے ناگزیر ہے۔ غالباً نور محمد صاحب کی نظر قرآن پاک میں استعمال ہونے والی علامات مبارکہ کی تکرار پر نہیں تھی۔ ان کے یہاں الفاظ کا اصراف نہیں ملتا کیونکہ وہ الفاظ کی قدر و قیمت سے پوری طرح آشنا ہیں۔ معلوم نہیں نور محمد صاحب کو "سجاد کے یہاں الفاظ کا گورکھ دھندا"

کیوں نظر آتا ہے۔ انگریزی میں جس چیز کو ہم اسٹائل کہتے ہیں اردو میں ہم اسے اسلوب یا طرز نگارش کہتے ہیں۔ جس طرح حروف کی شکل معین ہے لیکن ہر شخص کا طرز تحریر جداگانہ۔ اسی طرح اظہار اور اس کے وسیلے متعین ہیں لیکن طرز اظہار انفرادی ہوتا ہے۔ اسلوب یا طرز نگارش کا دارومدار انشا پرداز کے مزاج، اس کے مطالعے ذہنی تربیت اور اس کے ماحول سے مرتب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی آڈینس یا قارئین اور سامعین بھی اسلوب کے تعین میں معاون ہوتے ہیں مثلاً کالج کے سیمینار اور اسٹریٹ کارنر انتخابی تقریر کے لب ولہجے میں فرق ہو جاتا ہے لیکن ان تمام عناصر کے علاوہ سب سے زیادہ اہمیت موضوع کی ہے جو طرز اظہار کو متاثر کرتا ہے۔ ماورائی اور مابعد الطبعیاتی موضوعات کے اظہار کے لئے افسانوی لب ولہجہ مناسب ہوتا ہے۔ اسی طرح تحقیقاتی اور حکیمانہ موضوعات کے لئے غزل کی زبان غیر موزوں ہے۔ اس لئے کسی بھی فنکار کے اسٹائل یا طرز نگارش کا تعین کرنے سے پہلے اس کے موضوع فکر کی تشخیص لازمی ہے۔ سجاد انصاری کے موضوعات ماورائی ہیں۔ موضوعات کی ماورائیت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ ان کا اسلوب فکری یا فلسفیانہ ہوتا اسی لئے ان کے اسلوب پر تفکر کا غلبہ ہے۔ فنکاری یہ ہے کہ انہوں نے تفکر کی پیچیدگی اور سنجیدگی کو ابلاغ اور ترسیل کے لئے حسن آمیز کیا ہے اور اس آمیزش میں تناسب کا ایک ایسا معیار ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی اپنی انفرادیت معین اور مشخص ہو گئی ہے۔

یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ موضوع کے لحاظ سے اسلوب وضع کیا جاتا ہے۔ غزل میں الفاظ کا دروبست جیسا ہوگا ویسا مرثیے میں نہیں ہوگا اور جو اندازِ بیان مراثی کے لئے مناسب ہوگا وہ قصائد کے لئے نامناسب ہوگا۔ اسی طرح نثر میں بھی انشائیے کا اسلوب تنقیدی مضامین کے پیرایۂ بیان سے مختلف ہوگا۔ اور تنقیدی مضمون اور تخلیقی مقالے کے پیرایۂ اظہار الگ الگ ہوں گے۔

انگریزی زبان میں Essay وسیع ترین مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ---'ذہن کی آزاد پرواز' ہے مگر جب معین مسائل اور سنجیدہ موضوعات کی بات آتی ہے تو تنقیدی سنجیدہ اور تخلیقی وغیرہ ایڈجیکٹو لگا کر اسے معین کرتے ہیں۔ اسی طرح اردو میں بھی تبصرے، انشائیے، خاکے، مقالے وغیرہ الگ الگ ناموں سے مضامین کی مختلف قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ مقالوں میں تنقیدی اور تخلیقی مقالے الگ الگ فرض کئے گئے ہیں۔ جو اسلوب یا انداز بیان فکاہیہ یا خاکے میں اختیار کیا جاتا ہے وہ تقریظ یا تبصرے میں اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح تنقیدی مضامین کی زبان تخلیقی مقالوں کی زبان سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس طرح مواد کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ہیئت میں بھی تغیر ہوتا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تخلیقی مقالات میں نفس مضمون طنز اور مزاح کا طالب ہوتا ہے یعنی ایک سنجیدہ اور اہم موضوع تلخ اور ترش حقیقتوں کو گوارا بنانے کے لئے لہجے کی ظنزاری یا انداز بیان میں لطف مزاح کا متقاضی ہوتا ہے لیکن ایسی صورت میں فنکار کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو میں رشید احمد صدیقی اور سجاد انصاری خال خال پیدا ہوئے۔ ہر نثر نگار اسلوب پر اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ سنجیدگی کے ساتھ طنز ومزاح کی صحیح آمیزش کر سکے۔ جس کے نتیجے میں یا تو پھکڑ بازی ہو جاتی ہے یا صرف مزاح رہ جاتا ہے اور طنز غائب ہو جاتا ہے۔

سجاد انصاری اردو کے ان انشاپردازوں میں ہیں جن کے مسائل بنیادی طور پر آفاقی اور ماورائی ہیں۔ جو تخلیقی مقالات سپرد قلم کرتے ہیں لیکن موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر انہیں قبولیت عام کا درجہ دینے کے لئے سنجیدگی میں طنز اور مزاح کی آمیزش ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اظہار حقیقت کے لئے مزاح اور طنز کی آمیزش ضروری ہے۔ سنجیدہ اور تفریحیہ کا امتزاج تخلیقی ادب کے لئے ناگزیر ہے۔ اچھے فنکار کے یہاں یہ آمیزش متوازن متناسب ہو کر معجزہ بن جاتی ہے۔

سجاد انصاری ایک ایسے ہی فنکار ہیں جن کے یہاں سنجیدہ اور تفریحیہ امتزاج کا مکمل ترین تناسب اور توازن پایا جاتا ہے۔ سجاد انصاری کے مسائل بنیاد طور پر ماورائی اور جمالیاتی ہیں۔ خیر وشر، محاسن ومعاصی، حسن وقبح تکوین تقدیر آدم شعور کے رد عمل، جمالیاتی حس اور اس کی تسکین کے ذرائع وہ موضوعات ہیں جن کے گرد ان کا ذہن گھومتا ہے۔ وہ نئے اور پرانے اقدار کی کشاکش کو دیکھ رہے تھے۔ اٹھارہویں صدی کی قطعیت شکست وریخت سے دوچار ہے، اور آنے والے دور کی لاتعینی بھی ایک حقیقت کی طرح راہ میں حائل ہے۔ نتیجتاً حساس ذہن باغیانہ خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس وقت اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات بڑی واضح صورت میں مرتب ہو رہے تھے۔ نطشے، شوپنہار، برگساں اور ولیم جیمس کے نظریات سے نئے تعلیم یافتہ اردو ادبا بہت زیادہ اثر لے رہے تھے۔ یہ وہ انقلابی دور ہے جس میں محقق اور مفکر پیدا ہوتے ہیں۔ نیاز فتحپوری، سجاد حیدر، مہدی افادی اور رشید احمد صدیقی اس عہد کی دین ہیں۔ ان لوگوں نے اردو ادب کو فکر اور اسلوب کے نئے افق سے روشناس کرایا۔ اسی کاروان فکر واسلوب کے رہ رووں میں سجاد انصاری ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انصاری صاحب پس کارواں ہیں اور اول الذکر حضرات سر کارواں ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ انصاری صاحب نے بہت کم لکھا۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ انصاری صاحب پر بہت کم لکھا گیا۔ سجاد انصاری نے جتنا بھی لکھا ہے اس میں ان کی شخصیت، ان کی ذہنی تربیت، ان کا فکری ماحول، ان کا عصری میلان پوری طرح جلوہ گر ہے۔

محبت کی تعریف کا مسئلہ عرصہ دراز سے ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے کیونکہ یہ مسئلہ سہ جہاتی ہے۔ اس کی دو جہتیں بذات خود بے انتہا پیچیدہ ہیں۔ نتیجتاً ان تینوں جہات کا مرکب اس قدر پہلو دار اور پیچیدہ ہو گیا کہ اس کی کوئی قطعی تعریف ممکن نہیں ہو سکی۔ محبت دو وجود کے درمیان کا ایک ایسا رابطہ ہے جس کو سمجھنے اور سمجھانے میں مفکرین نے اکثر غلطی کی ہے کیونکہ محبت کرنے والا اور جس سے محبت کی جائے دونوں ہی پہلو دار وجود ہیں۔ دونوں ہی کے اندر ہر لمحہ تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے دو وجود کے درمیان کشش کی بنا پر قائم ہونے والے ربط کو محبت کہتے ہیں۔ کشش کی بنیاد اتنی ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے کہ اس سے پیدا ہونے والا ربط کسی بھی حال میں کسی ایک آفاقی دعوے میں نہیں سما سکتا۔ سجاد انصاری نے اس دقت کو محسوس کیا۔ اور انہوں نے محبت کی تعریف کی ہر کوشش کو نامکمل اور غیر تشفی بخش قرار دے کر یہ کہا کہ "خیالات میں بھی صرف دلچسپ اور غیر دلچسپ کی تقسیم ہو سکتی ہے غلطی اور صحت کا کوئی معیار نہیں۔" ایسا کہہ کر انہوں نے محبت کی تعریف کے امکان کو یکسر ختم کر دیا۔ شاید وہ محبت کی کوئی تعریف پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ان کے مضمون "محبت کی ماہیت نفسی" کی روشنی میں ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس وقت ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں پر فرائڈ کے نفسیاتی نظریات کا غلبہ تھا، جس میں جنس بنیادی عنصر ہے۔ سجاد انصاری لکھتے ہیں:

اپنی ذات کی طرف رجوع کر لیتا ہے، ورنہ نظام حیات درہم برہم ہو جائے۔ محاسن اور معاصی اضافی ہیں ان کے لئے کوئی معیار مطلق نہیں ہے۔ کائنات، تاویلات کا پرکار پردہ ہے، جس کی اپنی حقیقت کرشمہ رنگ سے زیادہ نہیں ہے۔

یہی وہ بنیادی نظریات ہیں، جن پر سجاد انصاری کے تمام مضامین کی اساس ہے۔ مسائل چونکہ بنیادی طور پر فکری اور مابعد الطبعیاتی ہیں اس لئے اسلوب بھی لازمی طور پر ایسا ہی ہوگا جو وسیع و غیر منقسم افکار کے اظہار کا متحمل ہو سکے۔ خلیل جبران، نطشے اور دوسرے ادبا کے اسلوب میں جو بات پائی جاتی ہے کم و بیش وہی بات سجاد انصاری کے اسلوب میں موجود ہے۔ وسیع افکار کو سمیٹ کر پیش کرنے میں وضع اصطلاحات کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور غیر معمولی تخلیقی قوت کی بھی۔ اس اعتبار سے سجاد انصاری کا اسلوب مغربی مفکر بیکن سے مشابہت رکھتا ہے یعنی ایجاز و اختصار جو بیکن کا طرہ امتیاز ہے سجاد انصاری کے یہاں موجود ہے۔ پانچ پانچ دس دس سطروں میں جن آفاقی اور کائناتی حقیقتوں کو شدت اور تاثیر کے ساتھ پیش کیا ہے، ان حقیقتوں کے بیان اور اظہار کے لئے دوسروں کو کتابیں لکھنی پڑتیں۔ آل احمد سرور فرماتے ہیں:

"ان کے یہاں فلسفہ اور ادب لطیف دونوں کا حیرت انگیز امتزاج ملتا ہے اس بنا پر وہ ادب لطیف کے فلسفی کہے جا سکتے ہیں۔"

نور محمد صاحب نے سرور کے اس بیان سے اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے ادب لطیف اور فلسفے کو ایک دوسرے کی ضد مانا ہے اور اپنے اختلاف کی بنیاد ایڈگر ایلن پو کے ایک قول کو بتایا ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ روح کے پردے پر ہونے والے احساسات کی تشریح فن لطیف ہے۔ میرے خیال میں یہ قول فن لطیف کو فلسفے کی ضد ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ صرف فن لطیف کی تعریف ہے اور تعریف بھی مکمل نہیں۔ کیونکہ روح کا پردہ ایک ایسی تشبیہ ہے جو کسی طرح بھی کما حقہ سمجھی نہیں جا سکتی جب کہ تعریف کو تشبیہ و استعارات سے پاک ہونا چاہئے۔ یہاں پر میرا مقصد ایڈگر ایلن پو کے مقولے سے بحث کرنا نہیں بلکہ میرا مسئلہ نور محمد صاحب کا یہ بیان ہے۔ "فلسفہ تو دماغی ورزش کا دوسرا نام ہے اسے حسیات اور جذبات سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ تو ٹھوس حقائق سے سروکار رکھتا ہے۔ برخلاف اس کے ادب لطیف انسان کے سوئے ہوئے جذبات لطیف کو بیدار کرتا ہے، دل و دماغ کو سکون بخشتا ہے اور مردہ طبیعتوں میں شگفتگی اور زندہ دلی پیدا کرتا ہے۔ لیکن فلسفہ دماغ کو سکون بخشنے کے بجائے تھکا دیتا ہے۔"

نور محمد صاحب کا یہ بیان اپنے اندر بہت طرح کے نقائص رکھتا ہے جن کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ فلسفے کو "ٹھوس حقائق" تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ان کے مطالعے کی کمی کی ایسی دلیل ہے جس کا انکار کرنا ممکن نہیں۔ ۱۹۲۵ء کے بعد تجربے سے ٹھوس حقیقتیں ختم ہو گئیں۔ ہنری برگساں اور آئنسٹائن وغیرہم کی تحقیقات نے ٹھوس کے تصور کی جڑ ہی کاٹ دی۔ اب وجود غیر متعین اور سیال ہے اور حقیقت بذات خود ٹھوس نہیں ہے۔ اس لئے ایسا کہنا کہ فلسفے کا تعلق ٹھوس حقائق سے ہے، ہمالیائی غلطی ہے۔ اب جہاں تک دماغ کو سکون بخشنے اور تھکانے کا سوال ہے یہ انفرادی رد عمل ہے۔ بچوں کو سنجیدہ باتیں تھکا دیتی ہیں چاہے وہ کتنی ہی شگفتہ کیوں نہ ہوں۔ بالغ ذہنوں کو غیر سنجیدگی تھکا دیتی ہے، چاہے وہ کتنی ہی دلفریب کیوں نہ ہو۔ اس لئے نور محمد صاحب کو ممکن ہے فلسفہ تھکا دیتا ہو لیکن بالغ ذہنوں کو یقیناً شگفتگی اور تازگی بخشتا ہے۔

بہر حال میں سرور صاحب کے قول سے متفق ہوں اور سجاد انصاری کو ادب لطیف کا فلسفی مانتا ہوں کیونکہ ان کا اسلوب فلسفیانہ اور ان کی فکر لطیف ہے۔ مثلاً حقیقت عریاں کا یہ جملہ:

"انسان نہ حق ہے اور نہ باطل۔ اس کا وجود محض ایک فریب کائنات ہے۔ اس کی ہستی فطرت کی اس آسان پسندی کا نتیجہ ہے جس نے فرشتے اور شیطان دونوں کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک پیکر اعتدال پیدا کر دیا۔"

یہ مثال سجاد انصاری کی ایجاز پسند طبیعت کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے۔ یہاں لفظ فریب کا استعمال اس کے عام مفہوم سے الگ ہٹ کر خالص فکری مفہوم میں کیا گیا ہے۔ غالباً اردو میں تاویلات کے فکری پہلو کو پیش کرنے کے لئے فریب سے بہتر لفظ نہیں ہے۔

پیام زلیخا میں رقم طراز ہیں:

"فطرت شر نہ ارتقا کی محتاج تھی نہ مرور ایام کی وہ ایک سیرت مطلق ہے جس کی تکمیل کے لئے ان اضافتوں کی ضرورت نہیں جو فطرت خیر کے لئے لازمی تھی۔ شیطان خود اپنی ابتدا تھا اور اپنی انتہا۔ جس پیام کا وہ حامل اس کی تکمیل اسی وقت ہو چکی تھی جب وہ ملکوتیت کے گہوارے میں کھیل رہا تھا۔ قدرت صرف اس کی منتظر تھی کہ ایک حامل خیر وجود میں آئے۔ جب آدم کا تخیل مکمل ہو گیا، شیطنت مع اپنی تمام عظمتوں کے نمودار ہو گئی اور کائنات کو اپنی رنگینیوں سے لبریز کر دیا۔"

قدرت، بیان قدرت، فطرت شر اور فطرت خیر --- اتنے مختصر الفاظ میں تکوین اور اس کے متعلقات پر اتنا جامع بیان صرف سجاد انصاری کا حصہ ہے۔ اس سے اگر ایک طرف مسائل پر سجاد انصاری کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کی قوت اظہار کا احساس ہوتا ہے اور تیسری طرف ان کا وسیع مطالعہ بھی پڑھنے والے کو متاثر کرتا ہے۔ کم الفاظ میں وسیع افکار کا بیان کرنا بذات خود ایک اعجاز ہے جو صحیفۂ آسمانی میں پایا جاتا ہے۔ زمینی صحیفوں میں یہ اعجاز اس لئے نہیں پایا جاتا کہ یہ بنیادی طور پر تخلیقی ہیں کیونکہ ان کے عناصر تخلیقی ہمارے حدود حسی میں صرف وہی فنکار جنہوں نے حدود حسی کی تسخیر کر کے ماورا تک رسوخ حاصل کر لیا ہے اس بات پر قادر ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں سجاد انصاری کا یہ حوالہ بھی اہمیت کا حامل ہے:

"محاسن و معاصی کا امتیاز کسی معیار مطلق پر منحصر نہیں۔"

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سجاد انصاری کا اسلوب رواں، شستہ و شائستہ ہونے کے ساتھ ساتھ گٹھا ہوا، جامع اور بے انتہا بلیغ ہے۔ وہ کم الفاظ میں زیادہ معانی دینے کے فن پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ ان کے معانی فکری اور جاوداں ہیں۔ ان کے مسائل آفاقی اور کائناتی ہیں اور ان کے اسلوب کی بندش متوازن، بلیغ اور رمزی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ماورائی اور اجتہادی افکار کے اظہار کے لئے انہیں اصطلاحات وضع کرنا پڑی ہیں اور چونکہ وہ دیانت داری کے ساتھ اپنے نظریات سے وابستہ ہیں اس لئے ان کے یہاں چند علامتوں کی تکرار پائی جاتی ہے۔ یہ تکرار نور محمد صاحب اور ان کے جیسے قارئین کو ممکن ہے گراں گزرے لیکن کسی پیغمبر کے لئے ناگزیر ہے۔ غالباً نور محمد صاحب کی نظر قرآن پاک میں استعمال ہونے والی علامات مبارکہ کی تکرار پر نہیں تھی۔ ان کے یہاں الفاظ کا اسراف نہیں ملتا کیونکہ وہ الفاظ کی قدر و قیمت سے پوری طرح آشنا ہیں۔ معلوم نہیں نور محمد صاحب کو "سجاد کے یہاں الفاظ کا گورکھ دھندا"

کیوں نظر آتا ہے۔ انگریزی میں جس چیز کو ہم اسٹائل کہتے ہیں اردو میں ہم اسے اسلوب یا طرزِ نگارش کہتے ہیں۔ جس طرح حروف کی شکل معین ہے لیکن ہر شخص کا طرزِ تحریر جداگانہ۔ اسی طرح اظہار اور اس کے وسیلے متعین ہیں لیکن طرزِ اظہار انفرادی ہوتا ہے۔ اسلوب یا طرزِ نگارش کا دارومدار انشا پرداز کے مزاج، اس کے مطالعے، ذہنی تربیت اور اس کے ماحول سے مرتب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی آڈینس یا قارئین اور سامعین بھی اسلوب کے تعین میں معاون ہوتے ہیں مثلاً کالج کے سیمینار اور اسٹریٹ کارنر انتخابی تقریر کے لب ولہجے میں فرق ہو جاتا ہے لیکن ان تمام عناصر کے علاوہ سب سے زیادہ اہمیت موضوع کی ہے جو طرزِ اظہار کو متاثر کرتا ہے۔ ماورائی اور مابعد الطبعیاتی موضوعات کے اظہار کے لئے افسانوی لب ولہجہ مناسب ہوتا ہے۔ اسی طرح تحقیقاتی اور حکیمانہ موضوعات کے لئے غزل کی زبان غیر موزوں ہے۔ اس لئے کسی بھی فنکار کے اسٹائل یا طرزِ نگارش کا تعین کرنے سے پہلے اس کے موضوع فکر کی تشخیص لازمی ہے۔ سجاد انصاری کے موضوعات ماورائی ہیں۔ موضوعات کی ماورائیت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ ان کا اسلوب فکری یا فلسفیانہ ہوتا اسی لئے ان کے اسلوب پر تفکر کا غلبہ ہے۔ فنکاری یہ ہے کہ انہوں نے تفکر کی پیچیدگی اور سنجیدگی کو بیان اور ترسیل کے لئے حسن آمیز کیا ہے اور اس آمیزش میں تناسب کا ایک ایسا معیار ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی اپنی انفرادیت معین اور مشخص ہو گئی ہے۔

یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ موضوع کے لحاظ سے اسلوب وضع کیا جاتا ہے۔ غزل میں الفاظ کا دروبست جیسا ہوگا ویسا مرثیے میں نہیں ہوگا اور جو اندازِ بیان مراثی کے لئے مناسب ہوگا وہ قصائد کے لئے نامناسب ہوگا۔ اسی طرح نثر میں بھی انشائیے کا اسلوب تنقیدی مضامین کے پیرایۂ بیان سے مختلف ہوگا۔ اور تنقیدی مضمون اور تخلیقی مقالے کے پیرایۂ اظہار الگ الگ ہوں گے۔

انگریزی زبان میں Essay وسیع ترین مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ---'ذہن کی آزاد پرواز' ہے مگر جب معین مسائل اور سنجیدہ موضوعات کی بات آتی ہے تو تنقیدی سنجیدہ اور تخلیقی وغیرہ ایڈ جیکٹو لگا کر اسے معین کرتے ہیں۔ اسی طرح اردو میں بھی تبصرے، انشائیے، خاکے، مقالے وغیرہ الگ الگ ناموں سے مضامین کی مختلف قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ مقالوں میں تنقیدی اور تخلیقی مقالے الگ الگ فرض کئے گئے ہیں۔ جو اسلوب یا اندازِ بیان فکاہیہ یا خاکے میں اختیار کیا جاتا ہے وہ تقریظ یا تبصرے میں اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح تنقیدی مضامین کی زبان تخلیقی مقالوں کی زبان سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس طرح مواد کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ہیئت میں بھی تغیر ہوتا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تخلیقی مقالات میں نفسِ مضمون طنز اور مزاح کا طالب ہوتا ہے یعنی ایک سنجیدہ اور اہم موضوع تلخ اور ترش حقیقتوں کو گوارا بنانے کے لئے لہجے کی طنازی یا اندازِ بیان میں لطف مزاح کا متقاضی ہوتا ہے لیکن ایسی صورت میں فنکار کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اردو میں رشید احمد صدیقی اور سجاد انصاری خال خال پیدا ہوئے۔ ہر نثر نگار اسلوب پر اتنی قدرت نہیں رکھتا کہ سنجیدگی کے ساتھ طنز و مزاح کی صحیح آمیزش کر سکے۔ جس کے نتیجے میں یا تو پھکڑ بازی ہو جاتی ہے یا صرف مزاح رہ جاتا ہے اور طنز غائب ہو جاتا ہے۔

سجاد انصاری اردو کے ان انشا پردازوں میں ہیں جن کے مسائل بنیادی طور پر آفاقی اور ماورائی ہیں۔ جو تخلیقی مقالات سپردِ قلم کرتے ہیں لیکن موضوعات کی اہمیت کے پیش نظر انہیں قبولیت عام کا درجہ دینے کے لئے سنجیدگی میں طنز اور مزاح کی آمیزش ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اظہارِ حقیقت کے لئے مزاح اور طنز کی آمیزش ضروری ہے۔ سنجیدہ اور تفریحیہ کا امتزاج تخلیقی ادب کے لئے ناگزیر ہے۔ اچھے فنکار کے یہاں یہ آمیزش متوازن متناسب ہو کر معجزہ بن جاتی ہے۔

سجاد انصاری ایک ایسے ہی فنکار ہیں جن کے یہاں سنجیدہ اور تفریحیہ امتزاج کا مکمل ترین تناسب اور توازن پایا جاتا ہے۔ سجاد انصاری کے مسائل بنیاد طور پر ماورائی اور جمالیاتی ہیں۔ خیر وشر، محاسن ومعاصی، حسن وقبح تکوین تقدیر آدم شعور کے ردِ عمل، جمالیاتی حس اور اس کی تسکین کے ذرائع وہ موضوعات ہیں جن کے گرد ان کا ذہن گھومتا ہے۔ وہ نئے اور پرانے اقدار کی کشاکش کو دیکھ رہے تھے۔ انیسویں صدی کی قطعیت شکست وریخت سے دوچار ہے، اور آنے والے دور کی لاتعینی بھی ایک حقیقت کی طرح راہ میں حائل ہے۔ نتیجتاً حساس ذہن باغیانہ خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ اس وقت اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات بڑی واضح صورت میں مرتب ہو رہے تھے۔ نطشے، شوپنہار، برگساں اور ولیم جیمس کے نظریات سے نئے تعلیم یافتہ اردو ادبا بہت زیادہ اثر لے رہے تھے۔ یہ وہ انقلابی دور ہے جس میں محقق اور مفکر پیدا ہوتے ہیں۔ نیاز فتحپوری، سجاد حیدر، مہدی افادی اور رشید احمد صدیقی اس عہد کی دین ہیں۔ ان لوگوں نے اردو ادب کو فکر اور اسلوب کے نئے افق سے روشناس کرایا۔ اسی کاروانِ فکر و اسلوب کے رہ رووں میں سجاد انصاری ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انصاری صاحب پس کارواں ہیں اور اول الذکر حضرات سر کارواں ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ انصاری صاحب نے بہت کم لکھا۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ انصاری صاحب پر بہت کم لکھا گیا۔ سجاد انصاری نے جتنا بھی لکھا ہے اس میں ان کی شخصیت، ان کی ذہنی تربیت، ان کا فکری ماحول، ان کا عصری میلان پوری طرح جلوہ گر ہے۔

محبت کی تعریف کا مسئلہ عرصہ دراز سے ایک پیچیدہ مسئلہ رہا ہے کیونکہ یہ مسئلہ سہ جہاتی ہے۔ اس کی دو جہتیں بذات خود بے انتہا پیچیدہ ہیں۔ نتیجتاً ان تینوں جہات کا مرکب اس قدر پہلو دار اور پیچیدہ ہو گیا کہ اس کی کوئی قطعی تعریف ممکن نہیں ہو سکی۔ محبت دو وجود کے درمیان کا ایک ایسا رابطہ ہے جس کو سمجھنے اور سمجھانے میں مفکرین نے اکثر غلطی کی ہے کیونکہ محبت کرنے والا اور جس سے محبت کی جائے دونوں ہی پہلو دار وجود ہیں۔ دونوں ہی کے اندر ہر لحہ تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ ایسے دو وجود کے درمیان کشش کی بنا پر قائم ہونے والے ربط کو محبت کہتے ہیں۔ کشش کی بنیاد اتنی ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے کہ اس سے پیدا ہونے والا ربط کسی بھی حال میں کسی ایک آفاقی دعوے میں نہیں سما سکتا۔ سجاد انصاری نے اس دقت کو محسوس کیا۔ اور انہوں نے محبت کی تعریف کی ہر کوشش کو نامکمل اور غیر تشفی بخش قرار دے کر یہ کہا کہ "خیالات میں بھی صرف دلچسپ اور غیر دلچسپ کی تقسیم ہو سکتی ہے غلطی اور صحت کا کوئی معیار نہیں۔" ایسا کہہ کر انہوں نے محبت کی تعریف کے امکان کو یکسر ختم کر دیا۔ شاید وہ محبت کی کوئی تعریف پیش کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ان کے مضمون "محبت کی ماہیت نفسی" کی روشنی میں ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس وقت ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں پر فرائڈ کے نفسیاتی نظریات کا غلبہ تھا، جس میں جنس بنیادی عنصر ہے۔ سجاد انصاری لکھتے ہیں:

"میں محبت صرف اس لطیف جذبے کو کہتا ہوں جو ایک حسن پرست دل میں صنف لطیف کی کشش سے پیدا ہو جاتا ہے۔ جنسیات کی باہمی کشش میں کوئی راز لطیف پوشیدہ ہے اسے محبت کہا جائے یا حسن، مفہوم ایک ہی رہتا ہے۔"

یہاں سجاد انصاری خود اپنے موقف سے ہٹ جاتے ہیں جب کہ وہ پہلے کہہ آئے ہیں کہ محبت کی کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی، خود ایک تعریف دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ تعریف جیسا کہ کہا جاچکا ہے کشش جنس کے مرکزی تصور پر مبنی ہے۔ اگر سجاد انصاری نفسیات سے ہٹ کر اضافی بنیادوں پر فکر کرتے تو مضمون میں وہ منطقی بے ربطی نہیں پیدا ہوتی جس کے وہ مرتکب ہوئے۔ ایسا کرنا ان کے لئے دشوار بھی نہ تھا۔ کیونکہ وہ حسن کی اضافیت کو تسلیم کرتے ہیں، انہیں صرف اتنا کرنا تھا کہ حسن اور عشق دونوں کی اضافیت کو تسلیم کر کے کائنات میں جاری وساری اضافی تحریک رد وکشش پر مضمون کی بنیاد رکھتے۔ وہ خود کہتے ہیں "حسن ایک وجود اضافی ہے۔ محبت کے بغیر وہ قائم ہی نہیں رہ سکتا" اس طرح محبت ایک وجود اضافی ہے جو حسن کے بغیر قائم ہی نہیں ہو سکتی۔ محبت اور حسن کے درمیان کی اہم ترین کڑی محبت، ایک وجود اضافی ہے اور جو ان دونوں کے بغیر سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ اس لئے محبت یا اس کی ماہیت سے متعلق، فلسفے اور حکمت سے جدا کر کے قائم ہی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ مضمون اسلوب کے اعتبار سے اس حد تک کامیاب ضرور ہے کہ پڑھنے والا بغیر اکتائے ہوئے پورا مضمون اس توقع پر پڑھ ڈالتا ہے کہ اس میں کوئی گہری بات کہی گئی ہے۔ لیکن یہاں انصاری سے ایک کوتاہی مواد کے لحاظ سے سرزد ہوگئی ہے جس کے پیچھے ان کے فکر کا بنیادی محور یعنی خیر وشر کا اضافی تصور کارفرما ہے جس کی بنا پر وہ محبت کی جنسی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ "عفت نسوانی" میں بھی فرائڈ کی جنسی نفسیات غالب ہے۔ وہ عفت اور عصمت کو شباب کی نیرنگیوں کا تحفظ سمجھتے ہیں۔ شرم وحیا کو اس کے منافی خیال کرتے ہیں۔ مضمون عفت سے زیادہ عصمت پر ہے۔ ان پر فرائڈ کے نظریات کا کیسا شدید غلبہ ہے اس کا اندازہ اس ایک جملے سے ہو جاتا ہے --- "حسن اور شباب میں ایک رابطہ روحانی ہے۔ حقیقی نسوانیت صرف عورت کے شباب سے وابستہ ہے۔" اس میں شک نہیں کہ اگر خیر وشر کی سطح کو حرف غلط سمجھ کر دیکھا جائے اور صرف جبلت کو ہی مرکز نگاہ بنالیا جائے تو ان کے افکار و نظریات درست نظر آتے سے معلوم ہوں گے۔ لیکن خیر وشر کو اضافی کہنے سے ان کا انکار کبھی مقصود نہیں ہوتا اور یہی فکری غلطی کا ارتکاب ہوا ہے۔ ان کے نزدیک قدرت حقیقت ہے۔ فطرت خیر اور فطرت شر مظاہر قدرت ہیں جو نظام کائنات میں توازن اور ترتیب قائم رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت تلخ ہے اور بغیر کسی تصنع اور ریاکاری کے انتہائی شدت سے اس کا اظہار کیا ہے۔ "حقیقت یہ ہے کہ انسان نہ حق ہے اور نہ باطل اس کا وجود محض ایک فریب کائنات ہے۔"

انہوں نے اپنے ایک مضمون اجتہاد اور تحقیق میں فلسفیانہ نظام فکر کی کوتاہیوں کو ظاہر کیا ہے اور خاص طور پر ہیگل اور کانٹ کے فکری نظام کی تنقید کی گئی ہے جس کی بنیاد انیسویں صدی کی فرائڈین نفسیات ہے۔ اس میں چند مبہم اور ناقص جمالیاتی بنیادوں پر فکر کی اساس رکھتے ہوئے ہیگل اور کانٹ جیسے عظیم المرتبت مفکرین پر تنقید کی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہیگل اور کانٹ کے افکار کی صداقت ناقابل قبول ہو۔ لیکن ان کی فکری عظمت سے انکار ادبی دیانت داری کے خلاف ہے۔

فرائڈ کی نفسیات نے سجاد انصاری کے جمالیاتی نظریے کو حسن اور تاثیر کے ساتھ اظہار کا جادو بخشا ہے اور جہاں کہیں یہ موقع آیا ہے، ایک عجیب لطف کا مظہر بن گیا ہے۔

(الف) ایک لطیف گناہ ہزاروں خشک نیکیوں سے بالاتر ہے۔

(ب) اگر مذہب واخلاق کے خود ساختہ قوانین کو نظر انداز کر دیا جائے، حقوق وفرائض، محاسن ومعاصی کا باہمی امتیاز فنا ہو جاتا ہے۔

(ج) معاصی میں صرف وہی اعمال داخل کئے جاسکتے ہیں جو حزن وملال، بے دلی اور بزدلی کے ساتھ کئے جائیں۔

(د) بے باکی معاصی کو اعمال صالحہ میں داخل کر دیتی ہے۔

(ہ) بزدلی عموماً اعمال حسنہ کو بھی معاصی بنادیتی ہے۔

سجاد انصاری کی فکر کی جدت، برتاؤ کی تازگی، اور اپنے نظریے سے وابستگی کی شدت عجیب وغریب تاثیر اور حسن پیدا کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ مختلف چھوٹے چھوٹے جملے تاثیر کے اعتبار سے شدید، تعبیر کے اعتبار سے گٹھے ہوئے اور فکر کے اعتبار سے بلاواسطہ مضامین میں مل کر ان کے نظریہ جمالیات کی وضاحت کرتے ہیں۔

ایک مبسوط فکر، ایک مستقل نظریہ حیات وکائنات ایک معین فلسفہ جمالیات کا اظہار، انصاری کے ایک ڈرامے "روز جزا" میں ہم پاتے ہیں جس میں فطرت خیر و فطرت شر کی رزم آرائی، جمالیات کا جنسی نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے اس میں انسان کی مرکزیت، شیطان کی اہمیت کا اظہار ہے۔ عمل اور ارادے کی عظمت بیان کی گئی ہے۔ شیطان کی زبان سے۔ "وہ دوزخ جو انسان کی دلیرانہ بدکرداریوں کا نتیجہ ہو اس جنت سے بہتر ہے جو عفو ورحم سے حاصل کیا جائے۔" پھر گنہ گار انسانوں سے متعلق جن ذوق معاصی کے ساتھ حسن عمل کی رنگینیاں بھی تھیں "وہ نہ دوزخ سے خائف ہیں نہ جنت کے متمنی، ان کی خود ایک کائنات ہے"۔ "جنت کے ساتھ انسانی حرص وابستہ تھی اور دوزخ کے ساتھ انسانی خوف" ان بنیادی تصورات پر مبنی یہ ڈرامہ سجاد انصاری کی فکر، ذہنی ساخت اور زاویہ نگاہ کو پوری طرح پیش کر دیتا ہے۔

سجاد انصاری کا کل شعری سرمایہ چھ نظموں، چند غزلوں اور چند متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی چار نظمیں مختلف لوگوں کی وفات پر لکھی گئیں جو ایک ہی بحر میں ہیں اور جن کا موضوع ایک ہی ہے۔ دو نظمیں مصطفی کمال پاشا سے متعلق ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ان دونوں نظموں کی بھی بحر وہی ہے جو بہوق، حسرت موہانی، شبلی اور مولانا شوکت علی مرحوم کی وفات پر لکھی گئی نظموں کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تمام نظمیں ایک نشست میں اور ایک ہی نظم کی صورت میں اول اول کہی گئیں اور بعد میں حسب ضرورت مختلف موقعوں پر انہیں مختلف عنوانات میں بانٹ دیا گیا اور عنوانات کی مناسبت سے دو دو چار چار اشعار جوڑے گئے۔

تمام نظمیں خطابیہ ہیں کیونکہ ہر نظم "اے" سے شروع ہوتی ہے:

اے پیکر انبساط ہستی — تو حسن تبسم جہاں تھا — یاد بہوق
اے وہ جو کر چکا ہے برسوں — زندان ستم کی میہمانی — یاد حسرت
اے وہ کہ صحیفۂ ادب میں — اک آیۂ شان دلبری ہے — یاد شبلی

شوکت علی مرحوم کی یاد میں نظم یوں شروع ہوتی ہے:

اے وہ کہ بتادیا ہے تو نے — زنداں کو بھی غیرت گلستاں

"غازی مصطفی کمال پاشا کی بارگاہ میں عرض نیاز" کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

اے عقدہ کشائے بابِ عالی — دنیا ترے انتظار میں تھی

"پیام شوق" جو غازی مصطفیٰ کمال پاشا سے ہی متعلق ہے، یوں شروع ہوتی ہے۔

اے غنچۂ شاہنامۂ ملت — اے مژدہ دو بہار ملت

بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو شگفتگی ان کی نثر میں پائی جاتی ہے، اس کے برعکس ان کی نظموں میں آورد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ الفاظ کے استعمال میں حسن کاری نہیں ملتی۔ مثلاً

اک انجمنِ صفات تھا تو — حسنِ فطرت کی چیستاں تھا

مہمل شعر معلوم ہوتا ہے کیونکہ انجمن صفات، اور 'چیستاں' میں کوئی ربط سمجھ میں نہیں آتا۔

نظم "یاد بہوق" شیخ ولایت علی قدوائی کی جواں مرگی پر ہے۔ لیکن ایسی نظموں میں جو تاثیر ہونی چاہئے۔ وہ مفقود ہے:

تیرا مرنا تھا اک قیامت — ہر اک ستم کش فغاں تھا

ایک بیانیہ شعر ہے، جس میں تاثیر مطلق نہیں ہے۔ قیامت کے لفظ سے غالب نے جو شدت تاثیر پیدا کر دی ہے، اس کا شائبہ بھی سجاد کے اس شعر میں نہیں آیا ہے:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

مجموعی حیثیت سے یہ نظم ایک رسمی تعزیت نامہ ہے جس میں تاثیر اور شدت جذبات کی کمی ہے۔ ایسے موقعوں پر خطابیہ نظموں میں جیسا جوش و خروش ہونا چاہئے وہ اس نظم میں نہیں ہے۔ اس نظم میں صرف اتنا ہی احساس ہوتا ہے کہ سجاد انصاری میں موزونیٔ طبع بھی تھی۔ بذلہ سنجیوں نے "سوز تجلی بیاں" کی ترکیب صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ناتراشیدہ ترکیب ہے۔ اس میں جدت ہو تو ہو حسن ندارد ہے۔ سنجیدگی سے سوز تجلی بیان سمجھ میں آتا ہے کیونکہ سنجیدگی اور سوز تجلی کے درمیان ایک ربط ہے لیکن مسخرے پن اور سوز تجلی کے ساتھ کوئی ربط نہیں پایا جاتا۔ بہر حال اس نظم کے بارے میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک رسمی تعزیتی نظم ہے۔

حسرت موہانی کی یاد میں جو نظم ہے اس کا پہلا شعر (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) خود حسرت ہی کے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی — اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت میں

سجاد انصاری کے شعر میں ایک نقص یہ ہے کہ زندانِ ستم کی میہمانی سے ذہن یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ انہوں نے زندان ستم کو میہمان کیا، جب کہ کہنا یہ ہے کہ وہ زنداں میں میہمان رہا۔ بحیثیت مجموعی اس نظم میں بھی تاثیر کی کمی ہے۔ فارسی تراکیب کا استعمال ہے:

ہستی شکن علم باطل — اک نغمہ سازِ آسمانی
حسن تخیل کا سراپا — ہنگامۂ رنگ بوستانی
افسانہ نگار ہستی دل — آرائش عالم معانی

مندرجہ بالا اشعار میں فارسی تراکیب کا استعمال ہے لیکن نہ تو حسن صورت پیدا ہو سکا اور نہ حسن معانی۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ شاعر کی استعداد فارسی کی اچھی ہے خصوصاً یہ شعر:

افسانہ نگار ہستی دل — آرائش عالم معانی

دو لخت ہیں۔ "آرائش عالم معانی" کی جگہ "عالم آرائے معانی" ہونے سے دونوں مصرعے باہم دست و گریباں ہو جاتے ہیں اور "آرائش عالم معانی" سے "عالم آرائے معانی" کا مفہوم نکالنا اور پہلے مصرعے سے اس کا ربط قائم کرنا بعید از فہم ہے۔

علامہ شبلی کی یاد میں جو نظم ہے وہ اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

اے وہ کہ صحیفۂ ادب میں — اک آیۂ شانِ دلبری ہے

اس میں بھی تاثیر کی کمی ہے۔ ایک شعر میں غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ کیونکہ موجودہ شکل میں شعر کسی طور سمجھ میں نہیں آتا:

نیر تجلیٔ حسن کی جھلک سے — حرفوں میں فروغ ماغری ہے

ممکن ہے کہ 'شاعری' کتابت کی غلطی سے 'ساغری' ہو گیا ہو۔ اس صورت میں شعر بامعنی ہو جاتا ہے ورنہ 'فروغ ساغری' کی ترکیب نہ معنی پیدا کرتی ہے نہ لطف۔

تجلی تخیل کو صرف رہ شعلہ گستری کر کے سجاد انصاری شاید کوئی حسن معنی پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ معنی ان کے ذہن میں پیدا ہوا ہو، تو ہوا ہو، پڑھنے والوں کے ذہن پر سوائے ایک بوجھ کے یہ ترکیبیں کوئی دوسرا اثر نہیں چھوڑتی ہیں۔ نظم کے آخر میں سجاد انصاری کا طبعی توازن بھی جاتا رہا۔ وہ شبلی کو نبی بنا بیٹھے:

تو شام سیاہ کی سحر تھا — شرع نو کا پیامبر تھا

اس سلسلے کی آخری نظم یاد شوکت ہے۔ یہ نظم مولانا شوکت علی مرحوم کی یاد میں ہے۔ یہ نظم پچھلی تمام نظموں سے بہتر ہے۔ اس میں شدت تاثیر بھی ہے اور زور بیان بھی۔

اس کے بعد دو نظمیں ہیں ایک "عرض نیاز بہ بارگاہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا" اور دوسری نظم "پیام شو بہ بارگاہ سیف السلطنت غازی مصطفیٰ کمال پاشا"۔ دونوں نظمیں بیانیہ ہیں، واقعاتی ہیں اور ایک ہی موضوع پر ہیں۔ یہ دونوں نظمیں سجاد انصاری کی بہترین نظم کہی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ ان نظموں میں بھی اسلوب فارسی آمیز ہو جانے کی وجہ سے اتنا شستہ اور رفتہ نہیں ہے لیکن بہ اعتبار موضوع اسلوب گوارا ہے۔ نظمیں حسین ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق مصطفیٰ کمال پاشا اور ترکی کی تعمیر جدید سے ہے اور اس زمانے میں مصطفیٰ کمال پاشا کے حیرت انگیز کارنامے نے انہیں ہیرو کی حیثیت دے دی تھی جس نے آج بھی ان کی جنگی، سیاسی اور تنظیمی صلاحیتوں میں اگر ایک طرف ان کے دشمنوں کو انگشت بدنداں کر دیا ہے تو دوسری طرف ان کے دوستوں کو محو حیرت۔ یہ نظمیں اس تحیر کی آئینہ دار ہیں:

اے مونس سطوتِ خلافت — تو فتح مبیں کا راز نکلا
تو ایک دلیلِ مختتم ہے — اسلام کی جاں نثاریوں پر
تیری قربانیوں پہ نازاں — توقیر شریعتِ پیمبر

دوسری نظم کے ان اشعار میں جذبے کی شدت پوری طرح موجود ہے:

سعیٔ پیہم سے تیری آخر — نصرت ہوئی ہم کنار ملت
اے محور گردشِ تمنا — اے مرکزِ اقتدار ملت
ہر خاک کو کامیاب کر دے — ہر ذرے کو آفتاب کر دے

رسمی یا روایتی بے کیفی جو یاد بہوق، یاد حسرت اور یاد شبلی میں پائی جاتی ہے اس میں نہیں ہے۔ یہ نظم بہر حال کامیاب ہے۔ اگر یاد شوکت، عرض نیاز اور پیام شوق، صرف یہی تین نظمیں ہوتیں تو سجاد انصاری کی نظم گوئی کا اندازہ ہو جاتا۔ پہلی تین نظموں کے آجانے سے سجاد انصاری کی حیثیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ ان کے

نقائص سامنے آئے۔

جیساکہ عرض کرچکا ہوں کہ سجاد انصاری ایک مستقل نقطہ نظر اور فلسفہ حیات کے قائل تھے۔ ان کا نقطہ نظر اور ان کا فلسفہ اس قسم کی نظموں میں اس لئے بھی نہیں ادا ہو سکتا تھا کہ یہ نظمیں اپنے عنوانات سے بندھی ہوئی تھیں۔ ان میں ان تصورات کی گنجائش ہی نہیں تھی جو سجاد انصاری کو دوسرے ادیبوں سے ممیز اور ممتاز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ندرت خیال، تازگی فکر اور زور بیان (جو سجاد انصاری کا طرہ امتیاز ہے) کی کمی ان نظموں میں ہے۔

غزلوں میں سجاد انصاری ماہر فن کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں کیونکہ غزل کے موضوعات محدود نہیں ہیں۔ ان میں خیر و شر سے متعلق سجاد انصاری کا نقطہ نظر حسن اور شدت کے ساتھ ادا ہوا ہے:

صوفی کی میکشی بھی تصوف کا راز ہے   مخمور چشم یار سے سب بدگماں رہے
دل مایوس کو کس طرح پیغام تمنا دوں   تغافل کیش بھی پھر آمادۂ تجدید پیاں ہے
طلسم انگیز ہیں نیرنگیاں عہد تمنائی   مری تنہائیوں میں بھی وہی انداز محفل ہے
تعلق کیا سکون بے خودی کو حشر بے جا سے   مجھے بدمستیوں نے بے نیاز خیر و شر رکھا

ان کا عقیدہ ہے کہ کہیں پر ٹھہر جانا اور کسی سے وابستہ ہو جانا مرگ حیات ہے۔
یہ خیال اس شعر میں انتہائی حسن تاثیر اور فنکاری کے ساتھ ادا ہوا ہے:

نگہہ سے محو ہو جائے گی یہ رنگینیٔ عالم   وفور شوق کو اے دل نہ مجبور وفا کرنا

خیر و شر کے اضافی طور پر یہ شعر:

ہم کو تھی افسانۂ دیر و حرم سے کیا غرض   ہم تو کفر شیخ، و دینِ برہمن دیکھا کئے

حسن اور بیان حسن پر یہ شعر:

حسن کی نیرنگیاں خود ہی حجاب حسن ہیں   دیکھنے والے فقط رنگِ چمن دیکھا کئے

اضطراب شوق سے متعلق یہ شعر اردو شاعری کے سرمائے میں ایک نادر اضافہ ہے:

اچھی ہے ترے حسن کی بیگانہ وشی بھی   دل صرف ہوس کاریٔ ارماں نہ رہے گا
دیوانگی شوق ہے صحرائے جنوں ہے   اب مجھ پہ بیاباں کا بھی احساں نہ رہے گا

فکر کی تازگی، تخیل طرازی، بیان کی شگفتگی اور معنی آفرینی کا جو کمال محشر خیال کی غزلو میں ہے، کم ملتا ہے۔ نموتاً چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مرا وجود نوائے خموش حسرت ہے   مری نگاہ سے اک داستاں نکلتی ہے
بیدار ہو رہی ہیں تمنا کی سورشیں   گہوارۂ خیال میں محو جواب ہوں
کیا کام آسکیں گی تری بے حجابیاں   میں انتہائے شوق میں خود اک حجاب ہوں
تم کھو گئے تو مجھ کو ملی منزلِ حیات   میں انتہائے یاس میں بھی کامیاب ہوں
مجھ پر فروغ مہر کا جادو نہ چل سکا   میں رازدارِ تابش حسن سراب ہوں

ان اشعار میں فکر کی جو تازگی ہے وہ اس نظریے کی دین ہے جو نظریہ، فلسفے، ادیان اور مذاہب کے مطالعے سے شاعر نے وضع کیا اور جس کی تبلیغ انہوں نے اپنے نثرپاروں میں کی:

جاتی رہیں گی حسن تصور کی شوخیاں   اے ضبط شوق ہو نہ پریشانِ آرزو
میرے حسن نظر کا پرتو تھا   چمن حسن میں بہار نہ تھی
میں نے دیکھا تری نگاہوں کو   ان میں وہ شانِ اعتبار نہ تھی

یہ افکار اردو شاعری میں نئے ہیں۔ غزل کی روایات سے جدا لیکن غزل کے اسلوب میں اس حسن کے ساتھ ادا ہوئے ہیں کہ غریب نہیں معلوم ہوتے۔ مذاہب کی موجودہ انتہا پسندانہ روش سے اور تجربے کی بے نیازی سے انصاری غیر مطمئن ہیں اور اس پر وہ گہری چوٹ کرتے ہیں:

دامِ فریب حرص ہے شعبدۂ نماز کیا   دل ہے طلسم آرزو سجدۂ بے نیاز کیا
صوفیٔ حیلہ ساز بھی بے خبر جمال ہے   آئینہ مجاز میں جوہر امتیاز کیا
صورت کائنات ہی پردہ کشائے حسن ہے   زیر نقاب کچھ نہیں شور جہان راز کیا
زہد کرشمہ زبوں صبر فسون بے اثر   بادہ کش حیات ہوں مسئلہ جواز کیا

یہ پوری غزل تازگی فکر کے ساتھ حسن بیان کی مظہر ہے۔ کائنات کی کثرت میں موجود جس داخلی ربط کا اظہار شاعر نے غزلوں میں کیا ہے وہ بیسویں صدی کے مغربی مفکرین میں سے کچھ کے یہاں نئی علامتیں وضع کر کے تھوڑی فکری پیچیدگیوں اور منطقی موشگافیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نثر میں یہ افکار کچھ پیچیدہ ہو جاتے ہیں جب کہ غزل میں یہی افکار غزل کی طبعی لطافت کی وجہ سے زیادہ موثر اور قریب از فہم ہوتے ہیں مگر ان افکار کو غزل میں برتنے کے لئے غیر معمولی قدرت بیان کی ضرورت ہے۔ سجاد انصاری کی غزلیں ان کی قادر الکلامی کی دلیل ہیں:

تیری رسوائی کا باعث تھا مرا ذوق نمو   نگہ شوق ترے حسن کی غماز نہ تھی
تجکو بے پردہ کیا جلوہ فروشی نے تری   ورنہ یاں کوئی نگہ پردہ در راز نہ تھی
خود ترے حسن میں تھا ذوقِ تجلی مضمر   حیلہ جو، کیا ترے انکار کی آواز نہ تھی
تجھ پہ کچھ فرض نہ تھا پاس صدائے اَرِنی   لبِ موسیٰ میں کوئی شوخیٔ اعجاز نہ تھی
تجکو معلوم بھی تھا طور نوازی کا مآل   نگہ حسن تری بے خبر راز نہ تھی
پھر ہے کیوں موردِ الزام کلیم   کیا تجلی تری خود شعبدہ پرداز نہ تھی

اگر غزل یہاں پر ختم ہو جاتی تو صنفی طور پر اسے غزل ماننے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی صرف اسے غزل مسلسل کہہ دینا کافی ہوتا لیکن اس کا آخری شعر ایک بیت ہے جس میں پوری غزل کی تاثیر سمٹ جاتی ہے اور غزل کا تمام تر معنوی آہنگ ایک فکری نظام دے دیتا ہے۔ اس غزل کو ایک عنوان دے کر، بہترین نظموں کی صف میں رکھا جا سکتا تھا:

لن ترانی بھی بس اک حسن کا افسانہ ہے   جو اسے راز سمجھتا ہے وہ دیوانہ ہے

ممکن ہے آزاد غزل اور جدید نظم کے ماننے والے اسے غزل کہیں لیکن غزل کے صنفی بنیادوں پر اسے غزل تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسے حقیقتِ حسن پر ایک عمدہ نظم کہا جا سکتا ہے۔ ان کے فرائڈ آمیز تصورات بھی ان کی غزلوں میں حسن کے ساتھ آئے ہیں:

آج دنیا میں نہیں محرم شیطاں کوئی   ورنہ ہوتا ہی نہیں بیگانۂ یزداں کوئی
ناز و نیاز کچھ نہیں ایک فسون آز ہے   عشق بھی ہے بہانہ جو حسن بھی حیلہ ساز ہے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سجاد انصاری کی غزلوں میں ان کی فکر اور ان کے فن کا غیر معمولی آہنگ پایا جاتا ہے۔ وہ ایک عصر ساز غزل گو کی حیثیت سے پیش منظر پر ابھرتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کم ہی غزلیں کہی ہیں لیکن ان کی غزلیں صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے منفرد ہیں۔ نثر نگاری اور نظم نگاری میں وہ غالباً اتنے کامیاب نہیں ہیں جتنے اپنی غزلوں میں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں فکر کو جذبہ بنا دیا ہے اور اپنی غزلوں میں وہ صحیح طور پر ادب لطیف کے فلسفی کی حیثیت سے ابھرتے ہیں۔ ☆☆

اسلم مرزا

دیوانِ عزلت اردو کا نسخہ احمد نگر



ولی اورنگ آبادی کے فوراً بعد دکن اور شمالی ہندوستان میں جن شعرا نے اردو غزل کو نئے آہنگ اور لہجے سے خوش رنگ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ان میں سورت (گجرات) کے سید عبدالولی عزلت ایک اہم نام ہے۔ سید عبدالولی عزلت ایک عالم، فاضل، باصلاحیت، تنوع پسند اور پرگو شاعر تھا۔ عزلت کی غزلوں میں نئے نئے مضامین اور فکر و خیال کے اچھوتے پہلو سامنے آتے ہیں:

کیا بلا تھا مرے دریائے جنوں کا طوفاں　　چاک جوں موج ہے ہر تارِ گریبان کے بیچ

میں وہ مجنوں ہوں کہ آباد نہ اجڑا سمجھوں　　مشتِ خاک اپنی اڑا کر اسے صحرا سمجھوں

سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں　　اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہوگا

اٹھارویں صدی کا وسط آتے آتے عزلت کی دیو قامت شخصیت جسمانی اور دانشورانہ دونوں طرح سے سارے برصغیر پر اپنا نقش بٹھا چکی تھی۔ ان کا کلام ولی سے تسلسل قائم کرتا ہے اور اس طرح دکنی اور ریختہ کو نزدیک لاتا ہے۔ بعد کے شعرا حتیٰ کہ خود میر نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔ (شمس الرحمٰن فاروقی۔ قدیم کلاسیکی اردو ادبی تہذیب اور تاریخ کے پہلو۔ رسالہ جامعہ جلد نمبر ۹۶، شمارہ نمبر ۱، ۱۹۹۹ء)

عزلت کی پیدائش ۱۶۹۲ء کو سورت میں ہوئی۔ عزلت کے والد سید سعد اللہ سلونی ایک صاحب دین اور ذی علم بزرگ تھے جن کا اورنگ زیب عالمگیر معتقد خاص تھا۔ درس و تدریس ان کا مشغلہ تھا اسی لئے عزلت کی تعلیم و تربیت خود انہوں نے کی۔ عزلت نے منقولات و معقولات میں فضل و کمال کا درجہ حاصل کیا۔ ان کے والد کا انتقال ۱۷۲۵ء میں ہوا۔

(دیوان عزلت ——— مرتبہ عبدالرزاق قریشی۔ ادبی پبلیشرز، ممبئی۔ ۱۹۶۲ء)

"تذکرہ گلشن گفتار" کے مطابق سید عبدالولی عزلت، آصف جاہ اول کے اخیر عہد میں اورنگ آباد آئے جہاں نواب ناصر جنگ کی شہادت تک مقیم رہے۔ اورنگ آباد اس وقت عربی، فارسی اور اردو کے عظیم المرتبت اہل علم کا مرکز تھا۔ کچھ عرصہ دکن میں قیام کے بعد عزلت اپنے وطن سورت لوٹ گئے اور ۱۷۵۰ء میں دہلی پہنچے۔ دہلی کے شعرا سے عزلت کے گہرے مراسم رہے جن میں سراج الدین علی خاں آرزو، میر تقی میر اور سید فتح علی گردیزی کے نام خصوصیت سے لئے جاسکتے ہیں۔

میر تقی میر جب اپنا تذکرہ "نکات الشعراء" ترتیب دے رہے تھے اس وقت عزلت دہلی میں مقیم تھے۔ میر نے دکنی شعرا کے حالات عزلت سے دریافت کئے اور عزلت کی بیاض سے استفادہ کیا۔ میر نے اپنے تذکرہ میں عزلت کو "سید زادہ" لکھا ہے۔ نکات الشعراء میں میر نے ولی اورنگ آبادی کے ۲۲، سراج اورنگ آبادی کے ۱۳ اور عزلت کے ۱۹ اشعار درج کئے ہیں۔

دہلی میں چند سال بسر کرنے کے بعد عزلت مرشد آباد گئے جہاں نواب علی وردی خان مہابت جنگ نے ان کی قدر کی اور نہایت لطف و کرم سے پیش آئے۔ ۱۷۵۵ء میں یا اس سے ذرا قبل عزلت حیدر آباد دکن پہنچے۔ حیدر آباد میں نواب سید محمد خان بن آصف جاہ نے ان کی عزت افزائی کی۔ لچھمی نرائن شفیق کی کوششوں سے نواب موصوف نے عزلت کی گزر بسر کے لئے ایک گاؤں عنایت کیا تھا۔ عزلت نے اپنی بقیہ زندگی حیدر آباد میں گزاری۔ ۴ر اگست ۱۷۷۵ء کو ان کا انتقال ہوا اور حیدر آباد میں میر مومن استر آبادی کے دائرہ میں تدفین ہوئی۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی، عبدالوہاب افتخار دولت آبادی، خواجہ خان حمید اورنگ آبادی، لچھمی نرائن شفیق، مرزا افضل بیگ قاقشال، سید فتح علی گردیزی، خواجہ عنایت اللہ خاں فتوت اور میر تقی میر نیز ان کے بعد کے تمام تذکرہ نگاروں نے عزلت کے عالم و فاضل اور اچھا شاعر ہونے کی گواہی دی ہے۔ یہ تمام معاصر تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ عزلت درویش سیرت، نیک نفس اور وسیع المرتبت انسان تھے۔ موسیقی، خطاطی، مصوری اور شطرنج میں مہارت رکھتے تھے۔ بقول میر تقی میر وہ مثل آب ہر رنگ میں شامل تھے۔

عزلت گو سورت نژاد تھے لیکن انہوں نے اپنی زبان کو گجری یا ریختہ کی بجائے ہندی بتایا ہے۔ اپنے دیوان اردو کا دیباچہ عزلت نے اردو میں لکھا اور یہ اپنی طرح کی اردو نثر میں پہلی تحریر ہے۔ عزلت نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ شفیق کا بیان ہے کہ عزلت کا کلیات فارسی چودہ ہزار اور کلیات ریختہ دو ہزار ابیات پر مشتمل تھے۔ عزلت نے ہندی میں بھی شعر کہے ہیں اور نرگن تخلص کرتے تھے۔ عزلت کی کہہ مکرنیوں کا رنگ دیکھئے:

سیج اوپر موہ لیت جھنجھوڑیں　　ٹانگیں اٹھات وہ ہات مروڑیں

تن مل نیہ سے کرت چکنیا　　سکھی کوئی پی؟ ناری مردنیا

(مردنیا: مالش کرنے والی)

ہاتھ پکڑ میرو لیو دبائے　　جوں روؤں پھرائے ہی جائے

دھیرج دیت جو کروں پکار　　سکھی کوئی پی؟ ناری منہار

(منہار: منہارن: چوڑیاں پہنانے والی)

عزلت نے پہیلیاں بھی کہی ہیں اور دوار تھیاں بھی۔ دوار تھیوں میں مختلف قسم کے دو یا دو سے زیادہ سوال کئے جاتے ہیں جن کا جواب ایک ہوتا ہے۔ عزلت کی یہ دوار تھی دیکھئے:

۸۔ سلیم کامپلیکس، دیوڑھی بازار، روبرو برہانی نیشنل ہائی اسکول، اورنگ آباد۔ ۴۳۱۰۰۱

پانی کیوں باسی ہے؟ من کیوں اداسی ہے؟

(پیا نہیں)

مشہور ہے کہ عزلت نے صرف ایک دن میں محمد فقیہہ دردمند اودگیری کے "ساقی نامہ" کے جواب میں ایک ساقی نامہ لکھا تھا جس کا تاریخی نام "بیان ظہور" ہے۔ اس میں ۱۳۳۱ اشعار تھے۔ عزلت نے مراثی یا قصائد نہیں کہے۔ عزلت نے غزل کی روایات کو بہت آگے بڑھایا اور اپنے عہد کے شعری رویوں میں ایک خوشگوار تبدیلی کی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے چند اشعار:

گرا ہے چھاتی پہ کوہ جنوں یہ بادل دیکھ کسی جلے ہوئے دل کا دھواں اٹھا ہوگا

سجن کی بے وفائی چاند کے گھٹنے سے روشن ہے
کہ جوں جوں آنکھ موندی ہم نے تیوں تیوں دیر دیر آوے

تجھ سے اے بلبل زیادہ گل میں ہے تاثیر عشق
دل میں خوں، لب پر ہنسی، اوس کے پیراہن میں آگ

جس خوش نگہ کو پہنچوں غفلت کی نیند لیوے
میں خفتہ بخت شب کا افسانہ ہورہا ہوں

اوس زلف میں کئی دن سے بے تابیٔ دل گم ہے
زنجیر چھنکتی نہیں کیا مرچکا دیوانہ

ہے ہجر کی رات سنسناتی
ناگن سے پھنکار کیوں کے جاوے

عبدالرزاق قریشی نے ۱۹۶۲ء میں تین قلمی نسخوں کی مدد سے دیوان عزلت مرتب کیا اور اپنے وقیع مقدمہ کے ساتھ اسے شائع کیا۔ دیوان عزلت مرتب کرتے وقت ان کے سامنے جو تین نسخے تھے ان میں ایک قلمی نسخہ جو انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی تحویل میں ہے۔ دوسرا انڈیا آفس لائبریری لندن سے عزلت کے دیوان غزلیات کا ایک انتخاب جوان کی ایک اور شعری تخلیق "راگ مالا" کے ساتھ محفوظ تھا اور جس کی فوٹو کاپی حاصل کی گئی تھی۔ تیسرا دیوان عزلت کا وہ نسخہ تھا جسے پروفیسر عبدالقادر سروری نے حیدر آباد سے روانہ کیا تھا۔ عبدالرزاق قریشی اپنے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں کہ جب مندرجہ بالا تین نسخوں کی مدد سے دیوان کی ترتیب مکمل ہو چکی اس وقت انہیں سخاوت مرزا نے اطلاع دی تھی کہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے کتب خانہ میں بھی دیوان عزلت کے دو نسخے موجود ہیں۔ چونکہ ان دو نسخوں کی فوٹو کاپی انہیں نہیں ملی تھی اس لئے عبدالرزاق قریشی ان دو نسخوں کی مدد نہیں لے سکے۔ قریشی نے اپنے مرتبہ دیوان عزلت میں ایک ضمیمہ بھی شامل کیا ہے جس میں انہوں نے عزلت کے وہ متفرق اشعار اور غزلیں یکجا کر دی ہیں جو مختلف تذکروں اور بیاضوں میں بکھرے ہوئے تھے لیکن مندرجہ بالا تین نسخوں میں شامل نہیں تھے۔

عبدالرزاق قریشی سے بہت پہلے ۱۹۳۰ء میں شیخ چاند مدیر مجلہ عثمانیہ حیدر آباد نے عزلت کی حیات اور شاعری کے بارے میں ایک مضمون شائع کیا تھا (مجلہ عثمانیہ جلد ۳، شمارہ ۳۰، ۱۹۳۰ء) گمان غالب ہے کہ شیخ چاند کا یہ مضمون عبدالرزاق قریشی کی نظر سے نہیں گزرا۔ اپنے مضمون "سید عبدالولی عزلت" میں شیخ چاند نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہیں عزلت کے فارسی اور اردو دیوان دیکھنے کا اتفاق احمد نگر میں ہوا تھا۔ شیخ چاند لکھتے ہیں "فارسی دیوان جس میں بقول شفیق کم و بیش چودہ ہزار ابیات ہیں میری نظر سے گزرا۔ یہ دیوان اسلامیہ لائبریری احمد نگر میں موجود ہے۔ محفوظ حالت میں نہیں ہے اور نہ اس کی حفاظت کا کسی کو دماغ ہے۔"

عزلت کے دیوان اردو کے بارے میں شیخ چاند آگے رقم طراز ہیں "اردو دیوان کے دو نسخے میری نظر سے گزرے ہیں، ایک تو اسلامیہ لائبریری احمد نگر میں اور دوسرا مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کے کتب خانہ میں۔ احمد نگر والا نسخہ اچھی حالت میں نہیں ہے۔ آخر کے دو تین ورق خراب جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب مدظلہ کے کتب خانہ کا نسخہ اب اچھی حالت میں ہے۔ شروع کا ایک ورق اور آخر کے چند اوراق غائب ہیں۔ درمیان سے بھی ایک ورق تلف ہوگیا ہے جس کی وجہ سے "بیان ظہور" کے گیارہ شعر کم ہوگئے ہیں۔ اس دیوان میں دو ہزار ابیات ہیں۔ ساقی نامہ (بیان ظہور) رباعیات، بارہ ماسی، پہیلیاں، مکرنیاں، کبت، دوہے، جھولنے، سورٹھ، سوال جواب سب کچھ ہے۔"

احمد نگر (مہاراشٹر) کے اسلامیہ لائبریری میں عزلت کے فارسی اور اردو دیوان کے نسخے کب، کیسے اور کس کے توسط سے پہنچے تھے یہ جاننا اب بہت مشکل ہے۔ تقریباً ۱۹۱۰ء میں شہر احمد نگر کے چند اہل ذوق حضرات نے پانچ پیر کی چاوڑی کی مزار سے متصل بلند چبوترہ پر ایک قدیم مسافر خانہ کی چھوٹی سی عمارت میں اسلامیہ لائبریری قائم کی تھی۔ مسافر خانہ کی کچی اینٹوں سے بنی موٹی موٹی دیواروں میں کتابیں رکھنے کے لئے الماریاں بنائی گئی تھیں جن میں مختلف موضوعات پر کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ اسی میں عربی، فارسی اور اردو کے قلمی نسخے بھی تھے۔ ۲۵۔۳۰ برس تک یہ کتب خانہ عوام کی علمی پیاس بجھاتا رہا لیکن چونکہ اس کتب خانہ کے کرتا دھرتا انتقال کر چکے تھے اس لئے کتب خانہ کا نظم و نسق بگڑ گیا اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء کے درمیان یہ کتب خانہ بند ہوگیا۔ مٹی کی دیواروں میں بارش کے پانی کی نمی اور دیمک کی وجہ سے بے شمار کتابیں ضائع ہوگئیں۔ کچھ کتابیں سرقہ کر لی گئیں۔ جو بچ رہی تھیں انہیں درالعلوم احمد نگر کے کتب خانہ میں منتقل کر دیا گیا۔

شیخ چاند نے اپنے مندرجہ بالا مضمون میں اسلامیہ لائبریری احمد نگر کے دیوان عزلت اردو کے جس قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے وہ نسخہ فی الحال راقم الحروف کی تحویل میں ہے۔ عزلت کے فارسی دیوان کے نسخہ کے بارے میں احمد نگر میں اب کسی قسم کی معلومات نہیں ملتی۔

دیوان عزلت اردو کے اس نسخہ احمد نگر پر نہ کسی کی مہر ہے، نہ کسی کا نام ہے نہ کسی کے دستخط۔ اس نسخہ کے کل ۶۳ اوراق (۱۲۵ صفحات) ہیں۔ کئی اوراق کرم خوردہ اور پانی کے دھبے نیز دھوئیں کی وجہ سے خراب ہو چکے ہیں۔ جلد ٹوٹ چکی ہے اور اوراق الگ ہو رہے ہیں۔ نسخہ ناقص الاخیر ہونے کی وجہ سے کاتب کا نام، سن کتابت وغیرہ نہیں ہے۔ اس قلمی نسخے کا سائز ۲۳×۱۶½ سینٹی میٹر ہے۔ کاغذ ہاتھ کا بنا ہوا نفیس اور چکنا ہے۔ چند ورق دبیز اور چند نہایت مہین ہیں۔ نسخہ کا خط نستعلیق ہے اور ایک ہی کاتب کی تحریر ہے۔ حواشی میں مختلف اوراق پر وہ اشعار تحریر ہیں جو غزل میں اپنے مقام پر نقل کرنے سے رہ گئے ہوں۔ دو ورق کے حواشی پر چند الفاظ، مصرع اور اشعار لکھے ہوئے ہیں جو کاتب دیوان کے خط سے مختلف ہیں۔ دیوان عزلت مرتبہ عبدالرزاق قریشی میں عزلت کی تحریر کے نمونہ کا ایک بلاک شائع کیا گیا ہے۔ اس میں عزلت کے خط کا جو نمونہ ہے وہ اور احمد نگر کے نسخہ کے حواشی کے چند مصرعوں /

الفاظ کا خط بالکل مشابہ ہے۔ گمان غالب ہے کہ حواشی کے یہ چند الفاظ، مصرع اور اشعار عزلت نے تحریر کئے ہوں۔ یہ خط بہت خوبصورت ہے۔

نسخۂ احمد نگر کے ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں۔ کم از کم ایک صفحہ پر تیرہ اشعار لکھنے کی ترتیب رکھی گئی ہے۔ چند صفحات پر ۱۲ اور چند صفحات پر ۱۴ یا ۱۵ اشعار بھی لکھے گئے ہیں۔ عنوانات، بیت، اشعار، رباعیاں، مکرنیاں وغیرہ کو نمایاں کرنے کے لئے سرخ روشنائی سے نشانات لگائے گئے ہیں جو اب ماند پڑ رہے ہیں۔

نسخہ کے صفحہ ۲ سے صفحہ ۱۱۳ تک غزلیں اور اشعار ہیں۔ ان میں دو رباعیاں بھی شامل کرلی گئی ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۱۱۳ تا صفحہ ۱۱۶ پر ایک خمسہ ہے جس کے ۱۵ بند ہیں۔ صفحہ ۱۱۶ اور ۱۱۷ پر سات رباعیاں ہیں۔ اسی صفحہ ۱۱۷ پر "بارہ ماسہ" شروع کیا گیا ہے جو صفحہ ۱۲۳ تک ہے۔ صفحہ ۱۲۴ اور ۱۲۵ پر مکرنیاں ہیں۔ صفحہ ۱۲۶ کے بعد کے صفحات ضائع ہوچکے ہیں اس لئے اس نسخہ میں دوارتھی، شش ارتھی، کبت، دوہرے، بروا، سورٹھ اور جھولنے نہیں ہیں جو عزلت کا ایک خاص رنگ تھا۔

اس نسخہ میں متفرق اشعار اور غزلوں کے اشعار کی کل تعداد ۱۴۶۹ ہے۔ اس نسخہ میں سات اشعار ایسے ہیں جو دیوان عزلت مرتبہ عبدالرزاق قریشی میں نہیں ہیں۔ اسی طرح عبدالرزاق قریشی نے ضمیمہ میں جو اشعار اور غزلیں یکجا کی ہیں وہ بھی نسخۂ احمد نگر میں نہیں ہیں۔

عبدالرزاق قریشی کے مرتبہ دیوان عزلت سے نسخۂ احمد نگر کا تقابلی مطالعہ اور موازنہ کرنے کے لئے ہم دیوان عزلت مرتبہ عبدالرزاق قریشی کو اس کے بعد صرف دیوان عزلت کہیں گے۔

نسخۂ احمد نگر کے پہلے ورق پر صرف "دیوان عزلت اردو" تحریر ہے۔ صفحہ نمبر ۲ پر "نثر دیباچہ ہندی" ہے جو تیسرے صفحہ پر چودھویں سطر پر ختم ہوتا ہے۔ دیباچہ کے اختتام پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد پہلی غزل کا حمدیہ شعر ہے۔ اس کے بعد صفحہ ۴ سے صفحہ ۱۱۳ تک غزلیں اور متفرقہ اشعار ہیں۔ درمیان میں دو رباعیاں ہیں۔ نسخہ کے آخری صفحہ ۱۲۵ پر مکرنی کے اشعار ہیں۔ نسخہ کے صفحہ ۲ پر دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

یافتاح

تمم بالخیر　　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　رب یسّر

الفاظ یافتاح، رب یسّر اور تمم بالخیر سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد سرخ روشنائی سے "نثر دیباچہ ہندی مخترع فقیر عزلت عفی اللہ عنہ" لکھا ہے۔ یہ دیباچہ من وعن وہی ہے جو دیوان عزلت میں ہے۔ صرف یافتاح اور نثریہ دو الفاظ دیوان عزلت کے دیباچہ میں شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح دیوان عزلت میں لفظ "مختصر" لکھا ہوا ہے جو نسخۂ احمد نگر کے دیباچہ میں نہیں ہے۔

دیوان عزلت کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کا نسخہ جو ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے وہ انڈیا آفس لائبریری اور کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کی بہ نسبت مکمل ہے۔ انجمن اسلام والے نسخہ کے ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں اور پورا نسخہ ایک ہی خط میں ہے۔ البتہ حواشی میں مختلف صفحات پر عزلت نے اشعار کا اضافہ کیا ہے۔ لندن کی فوٹو کاپی اور کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ کی کتابت اور طرز املا کا موازنہ انجمن اسلام والے نسخہ سے کرنے کے بعد قریشی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تینوں نسخے ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔

دیوان عزلت کے دیباچہ اور مقدمہ میں جن تین نسخوں کا مندرجہ بالا حوالہ دیا گیا ہے وہ تینوں نسخے راقم الحروف کے سامنے نہیں ہیں لیکن ان تین نسخوں میں کتابت، املا اور سطروں کی جو خصوصیات قریشی نے دیکھی ہے وہی خصوصیات ہم نسخہ احمد نگر میں بھی دیکھتے ہیں، مثلاً

(۱) غیر منقوط نون کی جگہ بھی نون منقوطہ لکھا ہوا ہے جیسے ہون، مین، ہو نٹون وغیرہ۔

(۲) یائے مجہول کی جگہ بھی یائے معروف استعمال کیا ہے جیسے سی (سے)، کی (کے) وغیرہ۔

(۳) کہیں کہیں یائے معروف کے لئے یائے مجہول استعمال کیا ہے جیسے کسے (کسی)، پے (پی) وغیرہ۔

(۴) گ پر ایک ہی مرکز لگایا ہے مثلاً رک (رگ)، کریبان (گریبان)، بکھولا (بگھولا) وغیرہ۔

(۵) ٹ اور ڈ کو اس طرح لکھا ہے ت د یا ت د

(۵) ڑ کو ر لکھا ہے۔

(۷) مجھ کو، تجھ کو، مجھکو، تجھکو، اور مجھ سے تجھ سے کو مجسے تجسے لکھا ہے۔

(۸) ہائے مخلوط کو ہائے ہوز سے لکھا ہے جیسے سلجھانا (سلجہانا)، پھر (پہر)، پھل (پہل) وغیرہ۔

(۹) اکثر دو لفظوں کو ملا کر لکھا ہے جیسے پلمیں (پل میں)، سچکہ (سچ کہ)، کہانجام (کہاں جام)، جبکری (جب کرے)، عقلونکا (عقلوں کا) وغیرہ۔

(۱۰) کبھی کبھی تین لفظوں کو ملا کر لکھا ہے مثلاً کمظرفونکا (کم ظرفوں کا)، صافدلونکی (صاف دلوں کی)، ایکداغدل (ایک داغ دل) وغیرہ۔

(۱۱) مرا، ترا، کو ہمیشہ میرا، تیرا اور مرے، ترے کو میرے تیرے لکھا ہے۔

(۱۲) یاں کو یہاں اور واں کو وہاں لکھا ہے۔

(۱۳) اس کو اوس اور ان کو اون لکھا ہے۔

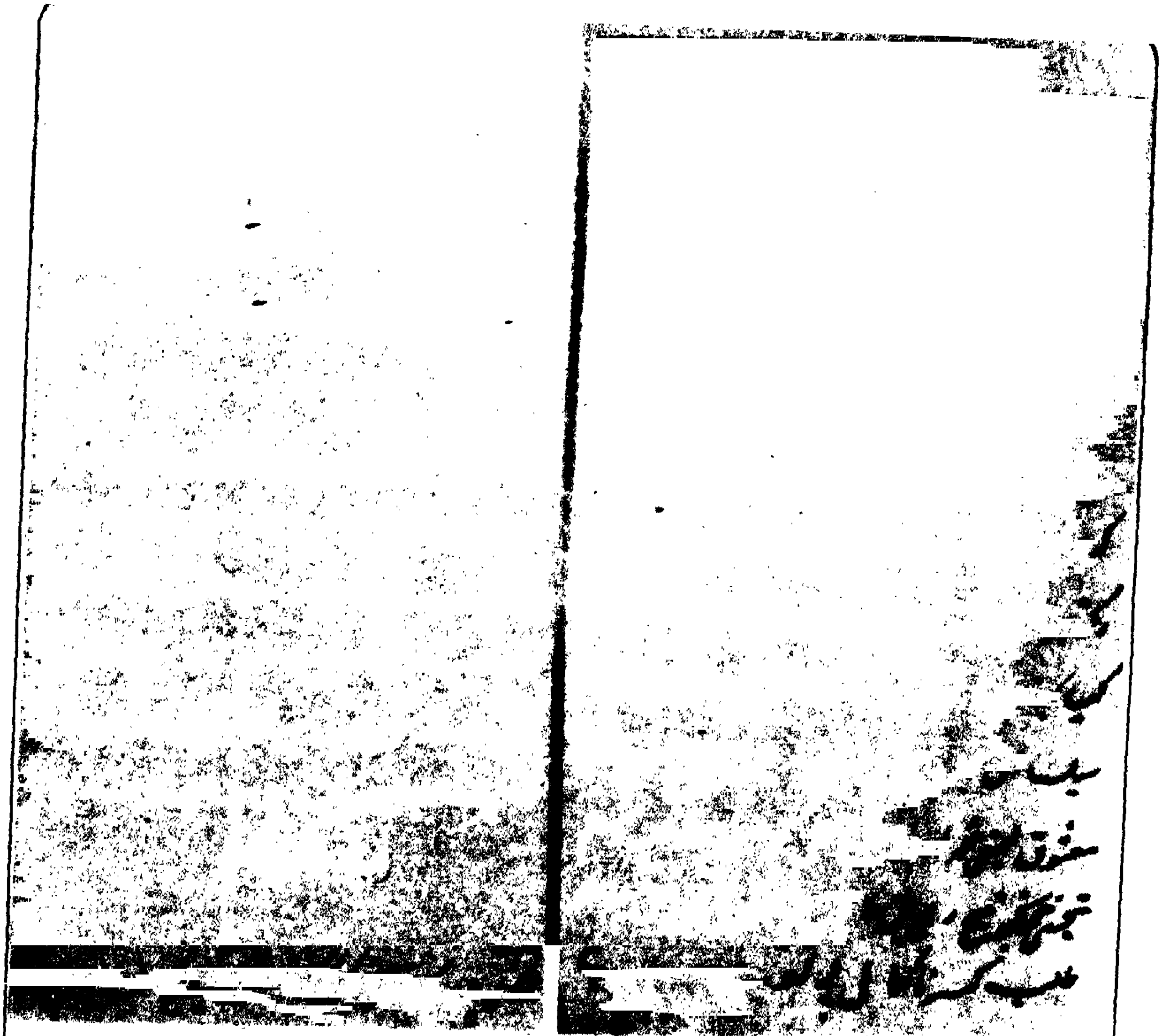
(۱۴) اک کو ہمیشہ ایک لکھا ہے۔

(۱۵) بعض عربی اور فارسی الفاظ کو صوتی لحاظ سے لکھا ہے مثلاً مصفا (مصفیٰ)، مزا (مزہ)، ستارا (ستارہ) لالہ (لالا) وغیرہ۔

نسخۂ احمد نگر کا خط نستعلیق ضرور ہے لیکن اس میں پاکیزگی اور صفائی نہیں ہے۔ غزلوں کے مصرع نیز چند اشعار اوپر نیچے اور ترتیب بدل کر لکھے گئے ہیں۔ کئی مصرعوں میں الفاظ چھوڑ دئے گئے ہیں۔ دیوان عزلت کے ۱۵ اشعار اور دو مصرع نسخہ احمد نگر میں نہیں ہیں۔ اسی طرح نسخۂ احمد نگر میں ۱۵ اشعار ایسے ہیں جو دیوان عزلت میں نظر نہیں آتے۔ دیوان عزلت میں بارہ ماسہ مکمل ہے لیکن نسخۂ احمد نگر میں بارہ ماسہ کے ماہ آسو کا چوتھا شعر کاتب نے چھوڑ دیا ہے۔

دیوان عزلت میں گیارہ مکرنیاں ہیں لیکن نسخۂ احمد نگر میں ۱۲½ مکرنیاں ہیں۔ چونکہ صفحہ ۱۲۶ آخری ہے شاید صفحہ ۱۲۷ پر مکرنی کا دوسرا شعر اور دیگر کلام رہا ہوگا جو تلف ہوچکا ہے۔ نسخۂ احمد نگر کے صفحہ نمبر ۳۲ پر پانچ اشعار کی ایک غزل ہے۔ اس غزل کے اختتام کے بعد سرخ روشنائی سے سرخی لگائی گئی ہے "در چہار وزن" اس کے بعد کاتب نے لکھا ہے۔

یکی فاعلاتن، فاعلاتن فاعلات　　　دوم فعلن فعلن فاعلات



عزلت کے دیوان اردو کے دو صفحوں کا فوٹو گراف

سوم فاعلاتن، مفاعلن مفعلات   چہارم فاعلاتن، فعلان فعلن
رمل مسدس مجذوب   رمل مجنون سالم صدر وابتدا مخذ وباشعار ہیں

اس کے بعد بائیں سمت حاشیہ میں مندرجہ ذیل عبارت ہے:

"این را سریع مطوی موقوف نیز گویند سریع مقطوع خفیف مخنون متصور"

دیوان عزلت میں قریشی نے مندرجہ بالا عبارت کا حوالہ نہیں دیا اور نہ ہی یہ بتایا کہ جن تین نسخوں سے دیوان مرتب کیا ہے ان میں سے کسی میں یہ عبارت شامل ہے یا نہیں۔

دیوان عزلت میں اشعار کی تعداد ۱۴۸۵ ہے۔ نسخہ احمد نگر میں یہ تعداد ۱۴۶۹ ہے۔

دیوان عزلت میں مخمس کے ۱۵ بند ہیں اور ۹ رباعیاں ہیں اور یہی تعداد نسخہ احمد نگر میں ہے۔

انجمن اسلام والے نسخہ کے خاتمہ پر کاتب نے تاریخ تکمیل ۲۷رذی الحجہ ۱۱۷۲ھ مطابق ۱۷۵۸ء لکھی ہے۔ انڈیا آفس لندن والے نسخہ کے خاتمہ پر کاتب کی کوئی عبارت نہیں ہے لیکن اس دیوان کے ساتھ عزلت کی مثنوی "راگ مالا" ہے جس کے خاتمہ پر کاتب نے ۲۵رمحرم الحرام ۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) تحریر کیا ہے۔ بقول قریشی یہ دونوں دیوان عزلت کی فرمائش پر ہی تحریر کئے گئے تھے۔ انجمن اسلام والے نسخہ پر حواشی میں عزلت نے متعدد مقامات پر اپنے ہاتھ سے تصحیح کی ہے اور حواشی میں اشعار کے اضافے بھی کئے ہیں۔ اسی طرح نسخہ احمد نگر میں بھی کئی اشعار ایسے ہیں جن میں تصحیح کی گئی ہے اور حواشی میں مصرع، اشعار اور چند الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے اور یہ تحریر اس کاتب کی تحریر سے مختلف ہے جس نے نسخہ کی کتابت کی ہے اس لئے راقم الحروف کا قیاس ہے کہ نسخہ احمد نگر بھی عزلت کی فرمائش پر ۱۱۷۲ھ یا ۱۱۷۳ھ میں اسی کاتب نے لکھا ہوگا جس نے انجمن اسلام بمبئی اور لندن آفس لائبریری کے دیوان لکھے تھے۔ اسی طرح نسخہ احمد نگر بھی عزلت کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ ☆☆

ادارہ

ملیریا جینوم کا پردہ فاش

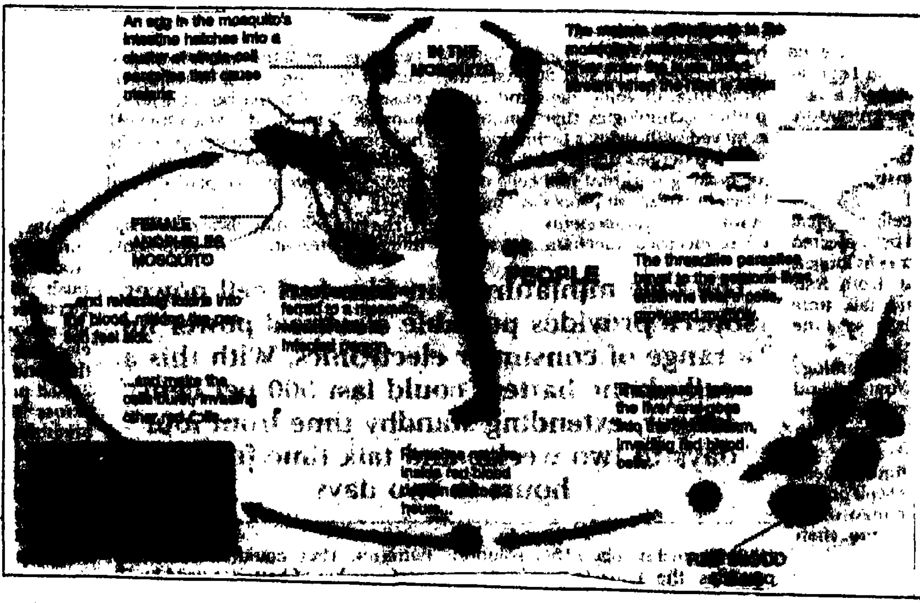
مچھر، ایک مختصر ترین ذی حیات اس دنیا میں، تقریباً دو سو ملین سال سے موجود ہے۔ ایک چوتھائی انچ کی لمبائی اور ایک اونس کے کم ترین وزن کے برابر آج بھی یہ دنیا کا سب سے بڑا بایو دہشت گرد ہے جو ہر ۱۲ سیکنڈ پر ایک انسان کی جان لیتا ہے۔ اس کے ہتھیاروں میں مہلک ترین ہتھیار ملیریا، بم یا میزائل سے بھی زیادہ خطرناک ہے، جو ہر سال ایک سے تین ملین آدمیوں کو مار سکتا ہے اور پانچ سو ملین لوگوں کو تقریباً مفلوج کر دیتا ہے۔ انسان کے اس بدترین دشمن کا خاتمہ اب سائنسدانوں کی جستجو اور لگن کے سبب بہت جلد نظر آنے لگا ہے۔

امریکہ اور برطانیہ کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے ملیریا جینوم کو ڈی کوڈ کرنے میں کامیابی حاصل کرلی ہے۔ اس کامیابی سے ابھی تک بار بار دھوکے سے پھیلنے والی مہلک بیماری سے اب نجات پانے کا راستہ صاف نظر آنے لگا ہے۔

یہ جینوم اپنے آپ میں مکمل ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس سے دواؤں اور ٹیکوں کو ایجاد کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ اس جراثیم کے جینوم میں تقریباً ۲۵ ملین یونٹ DNA پایا جاتا ہے۔ ان میں سے اب تک ۵۶ سو جینس میں معلومات پائی جاتی ہیں۔ عالمی صحت ادارے WHO کے مطابق اس بیماری سے افریقہ میں ہر سال دس لاکھ بچوں کی موت ہو جاتی ہے۔

ان میں تقریباً تمام اموات Plasmodium Falciparum جو ملیریا جرثومے کی چار قسموں میں سے ایک قسم ہے، زیادہ تر لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ فالسی پیرم اس لئے لوگوں کی جان لیتا ہے کیونکہ یہ ہر عمر کے لوگوں کے خون کے سرخ خلیوں کو متاثر کرتا ہے۔ جب کہ دوسرے اقسام صرف نوجوان خون کے خلیہ پر حملہ کرتے ہیں اور وہ اپنے کو انسانی دماغ کی خون کی رگوں میں آسانی سے آسن جمالیتے ہیں۔ اس طرح سے خون کی روانی رک جاتی ہے۔ چھ سالوں کی لگاتار کوشش کے بعد اب فالسی پیرم جینوم کے راز فاش ہوئے ہیں۔ اس کے جراثیم واحد خلیہ پر مشتمل ہوتے ہیں جنہیں Protozoan کہاجاتا ہے۔ لیکن اس کی پیچیدہ جینوم زیادہ تر جانوروں کی طرح کے ہوتے ہیں یہ نسبت بیکٹیریا کے۔ یہ پیچیدگی اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ اس جراثیم کا نظام بھی بہت پیچیدہ ہے۔ اپنی زندگی کے ہر مرحلہ میں یہ ایک نئی شکل اختیار کرلیتا ہے اور اس طرح مریض کے بچاؤ کے نظام کو لگاتار دھوکہ دیتا رہتا ہے۔ یہ حملہ آور مچھر کی آنت میں ایک انڈے کی شکل میں اپنی زندگی کی شروعات کرتا ہے۔ یہ انڈا مختلف کیڑوں کی جیسی شکل کے خلیوں سے سجتی ہے جو فوراً ہی اپنی جگہ بدل کر مچھر کے تھوک کے غدودوں میں پہنچ جاتا ہے اور جیسے ہی یہ کسی کو کاٹتا ہے یہ فوراً انسان کے جگر کے خلیوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ فوراً وہاں سے نکل کر خون کے خلیوں کو کاٹتا ہے اور سرخ ذروں سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔

سائنسدانوں نے منظم طریقے سے دوا نزائم کا پتہ لگایا اور DNA ترتیب سے دوا اور انزائم کا پتہ لگایا ہے۔ اس جینوم کی وجہ سے اس جرثومے کے دھوکہ دینے والی چالوں پر روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ یہ جن خلیوں کو متاثر کرتا ہے انہیں تلی کے اندر ختم ہونے سے روکتا بھی ہے۔ خلیوں کے اندر غذا حاصل کرتے ہوئے یہ ایک خاص قسم کے پروٹین کا فضلہ نکالتا ہے جو خون کے خلیوں کی جھلی میں چپک جاتا ہے۔



اس انکشاف کے بعد سے عوام کو ملیریا سے نجات ملنے اور ملیریا کے خلاف دوائیں بنانے میں کامیابی ملے گی۔ ابھی تک اس سلسلہ میں جتنی بھی کوششیں کی گئی تھیں وہ سب اس لئے ناکام ہو گئیں کہ اس کے جینوم کی ترتیب معلوم نہیں تھی۔ یہ جرثومہ اپنا زیادہ وقت جگر یا خون کے خلیوں میں گزارتا ہے اور لگاتار اسے پروٹین میں تبدیل کرتا رہتا ہے اسی لئے یہ جسم کے تحفظی نظام کو نظر نہیں آتا۔

ماہرین کو امید ہو چلی ہے کہ وہ اب ایسی دوائیں بنانے میں کامیاب ہوں گے کیونکہ اس جرثومے کا جینوم انسانوں میں نہیں پایا جاتا اس لئے اب زیادہ موثر دوائیں نکالی جاسکیں گی۔

(نیویارک ٹائمز / ہندو ۲۸ر فروری ۲۰۰۲ء)

مہتاب پیکر اعظمی

رباعیات

الفاظ تراشوں تو گہر بن جائے
جو شعر کہوں رشکِ قمر بن جائے
احساس کا وہ کرب مجھے دے مولیٰ
یہ فکرِ جواں، روحِ ہنر بن جائے

ظلمات کے ساحل پہ سجائے ہیں چراغ
طوفانِ مخالف میں جلائے ہیں چراغ
وہ جشنِ چراغاں کیے ہم نے ہر سو
خورشید و قمر دیکھنے آئے ہیں چراغ

تنہائی کو اوڑھو گے تو ڈر جاؤ گے
سناٹے میں چیخو گے تو ڈر جاؤ گے
تم کو نہ رہی اپنے ہی چہرے کی خبر
آئینے میں دیکھو گے تو ڈر جاؤ گے

خوابوں کا حسیں تاج محل ہو تم تو
شاداب و درخشندہ کنول ہو تم تو
محبوب کو خط میں یہی لکھا میں نے
تفسیرِ وفا، روحِ غزل ہو تم تو

قیام منزل، اسٹیشن روڈ، براکر، بردوان۔ ۷۱۳۳۲۴

شاہین

زخموں کی برات

دھیرے دھیرے
یوں تو جل بجھتی ہے
آتش دان کے شعلوں میں رات
راکھ میں پھر بھی سلگتی رہتی ہیں بے نام سی یادیں
کہ جن سے ماند پڑ جاتی ہے کچھ بے مہریٔ اوقات
اور ہم تان لیں چادر
تو آنکھوں میں سمٹ آتے ہیں وہ لمحات
جن کے قرب سے تازہ ہے فصلِ ممکنات

اور پھر اک بار
جنت اور دوزخ میں بیک وقت
اپنے رکھتے ہیں قدم ہم
صبح دم
جب بند ہو جاتا ہے بابِ التفات

تم نے تو پایانِ کار
ڈھونڈ لی اپنے لئے اک کائنات
ہم کہ پاگل تھے
لئے پھرتے رہے ناحق
زمانے بھر میں زخموں کی برات

ایک ہیں جنت کے اور دوزخ کے رستے
جس طرح ملتی ہے مل جائے نجات

Post Box 2276, Station D,Ottawa
Ontario K1P 5W4, Canada

عرفی آفاقی

او عصرِ نو!

منہ چنگ، نپٹ ہے بے سُر، بے تال ترا
گل پھانس الجھتی سانسیں جنجال ترا

اندر بھی خالی خالی، باہر بھی غلو
تنہائی ہے چلتا سکہ، کنگال! ترا

ماضی نہ کوئی مستقبل مٹھی میں تری
اُڑتا ہوا بس اک لمحہ، کیا حال ترا

قدریں ہمہ اعلا بالا ٹھوکر میں تری
کیا مذہب وذہب سب کچھ پامال ترا

تعمیر سے عاری یکسر تخریب تری
بے گانۂ 'الا' 'لا' کا بھونچال ترا

دنیا ہے تری تنگ اتنی جتنی کی نظر
اور پیٹ بڑا اے بنیے بقال ترا

'پنجاب' کو ترے از بس شہرت کی ہوس
دولت کا اَت گت بھوکا 'بنگال' ترا

ہیں تحتِ ثریٰ سے اندھے افلاک ترے
چمکا بھی تو کیونکر چمکا اقبال ترا

۳۵۹/ ۱۲۔اے اندرانگر، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۱۶

غزلیں

کرشن کمار طور

رہا ثبات گماں لایقیں سراغ اس کا
جہاں پہ گم ہے ملے گا وہیں سراغ اس کا

دلوں میں جھانکنا ہوگا جو اس کو ڈھونڈنا ہے
یہ دہر کہتے ہیں جس کو نہیں سراغ اس کا

اس آستانے سے ہٹ کر نہیں جہاں میں کچھ
جو چاہتے ہو ہے میری جبیں سراغ اس کا

سراغ اس کا ملے گا سراغ کے اندر
نہیں ہے پھر تو کہیں بھی نہیں سراغ اس کا

خرابہ مٹ کے بھی دیتا ہے خوئے بوئے مکاں
کہیں نہیں ہے مگر ہے کہیں سراغ اس کا

اسے تلاش نہ کر تو پرانے زاویے سے
ستارہ نقش ہے اے ہم نشیں سراغ اس کا

میں آسمان کی خبروں پہ طور قادر ہوں
میں کیا بتاؤں ہے زیر زمیں سراغ اس کا

۱۳۴۔اے، خانیارہ، دھرم شالہ۔۱۷۶۲۱۵



چندر پرکاش شاد

خود کو سپنوں میں رولتا بھی ہوں میں
اندر اندر کوئی سزا بھی ہوں میں

ساتھ چلتا رہے تو دوست ہے وہ
رستہ روکے تو پھر بلا بھی ہوں میں

اپنی پہچان کھوجنے کے لئے
اپنے سائے میں ڈوبتا بھی ہوں میں

کبھی چٹان بے حس و بے جان
گرم لو سا کبھی اڑا بھی ہوں میں

قافلے جس میں لٹ چکے ہیں بہت
اسی رستے کا رہنما بھی ہوں میں

کاٹ دیتا ہوں بات میں سب کی
ہر محلے کا ہم صدا بھی ہوں میں

سب اندھیروں کو چیرنے کے لئے
اک لپکتا چراغ سا بھی ہوں میں

روٹھ کر گھر سے بھاگتا ہوں بہت
مڑ کے کھڑکی میں جھانکتا بھی ہوں میں

یوں تو بس ایک حاضری ہے بہت
وقت آئے تو بارہا بھی ہوں میں

(۲)

سفر اپنا دعائے نارسا بھر
قیام اپنا بس اک موجِ ہوا بھر

سبھی رنگینیاں رنگ حنا بھر
سبھی آرائشیں حد انا بھر

ہماری صبح تھی اک پینترا بھر
اور اب یہ رات ہے جلتا دیا بھر

ہزاروں تہمتیں بہکی ہوا بھر
بہت کچھ ہو رہا تھا رمز پا بھر

اکھڑتے پیڑ کو ٹھوکر میں رکھنا
دکھاوے کے لئے پھر تھامنا بھر

بہت ناکامیاں دیکھی ہیں میں نے
اب آگے زندگی ہے اکتفا بھر

کہاں آنا کہاں جانا صفر سب
قدم سے تا قدم بس سوچنا بھر

قلم کاغذ لئے خود میں سمٹ جا
کہانی آگ رہی ہے انتہا بھر

کہ زنگ آلود سی باتیں ہیں ساری
کہیں سے لے کے آؤ کچھ نیا بھر

جے۔۲۱۲۔جیون نکیتن، (LIC کالونی) پچھم وہار، نئی دہلی۔۱۱۰۰۸۷

غزلیں

یعقوب عامر

سب میں ہر وقت گھرا لگتا ہے
پھر بھی وہ سب سے جدا لگتا ہے

جان پر چھایا ہے وہ رنگِ خزاں
دل کا ہر زخم ہرا لگتا ہے

کیسے احوال زمانہ لکھوں
پڑھنے والوں کو گلہ لگتا ہے

گفتگو میں تو قیامت ہوگا
خامشی میں جو بھلا لگتا ہے

اب وہ سیلاب نہیں آنکھوں میں
زور بارش کا گھٹا لگتا ہے

وقت دیتا ہے کچھ اس طرح فریب
راہزن راہ نما لگتا ہے

ہرقدم راہِ وفا میں رکھنا
مستقل ایک سزا لگتا ہے

لب کشا ہوتا ہے جس دم رہبر
ہر سخن عقدہ کشا لگتا ہے

سامنے اس کے جسے کہئے بھلا
اس کو وہ اور برا لگتا ہے

دھوپ میں پیڑ کے نیچے عامر
تھوڑا سایہ بھی گھنا لگتا ہے

(۲)

بے تکلف سلسلہ اچھا لگا
اس کا ملنا روز کا اچھا لگا

شہر کے ہر گھر کی بندش دیکھ کر
اپنے گھر کا در کھلا اچھا لگا

سب تھے اک ظالم کے آگے سرنگوں
ناگہاں اک سرپھرا اچھا لگا

مل گیا ہے زندگی کو ایک رخ
زیست کا اب ذائقہ اچھا لگا

روز چھوٹا سا سفر ہے اس کے ساتھ
اک مسافر راہ کا اچھا لگا

کب بھلی لگتی تھی اپنی زندگی
اس سے جب تک دل لگا اچھا لگا

خوب نکلی دل کی زنداں میں بھڑاس
وہ مقام جانفزا اچھا لگا

دوسرے ہر شخص کے نقصان پر
سب کو اپنا فائدہ اچھا لگا

دوستوں میں گرم جوشی آگئی
ہم کو شہری فاصلہ اچھا لگا

آدمی کو آدمی کی ہے تلاش
'اشتہار گم شدہ' اچھا لگا

راہِ آساں میں تھا ہر سجدہ گزار
ہم کو مشکل راستہ اچھا لگا

ہم میں کیا اچھائی دیکھی آپ نے
ہم کو غصہ آپ کا اچھا لگا

موجزن ہیں دین ودنیا شیخ میں
آدمی ہے کام کا اچھا لگا

فطرتاً آزاد تھا عامر اسے
شاعری کا مشغلہ اچھا لگا

بیکل اتساہی

یہ آسماں بھی نہیں اور یہ زمیں بھی نہیں
جو تو نہیں ہے نظر میں، تو کچھ کہیں بھی نہیں

میں آسمان سے رشتہ جو توڑ کر نکلا
تو یوں لگا مرے پیروں تلے زمیں بھی نہیں

وہ میرا سب سے بڑا خیر خواہ بنتا ہے
مگر اسے مرے حالات کا یقیں بھی نہیں

میں ایک سجدے کی تکمیل کو ترستا ہوں
یہ تیرا در بھی نہیں اور مری جبیں بھی نہیں

کبوتر اجڑی حویلی سے کرگئے ہجرت
جہاں پہ میں ہوں وہاں اب کوئی مکیں بھی نہیں

یہ تخت وتاج امانت ہماری ماضی کی
ہمارے جیسا کوئی بوریا نشیں بھی نہیں

تجھے بھلا کے میں اس کو سجاؤں پلکوں پر
وہ ہے حسین مگر اس قدر حسیں بھی نہیں

سنائے کون سنے کون داستاں بیکل
وہ بیٹھکیں بھی نہیں ہیں وہ شہ نشیں بھی نہیں

۲۵۴۔ غالب اپارٹمنٹس، پروانہ روڈ، پیتم پورہ، دہلی۔ ۱۱۰۰۳۴

سول لائن، بلرام پور۔ ۲۷۱۲۰۱

غزلیں

شاہد اختر

ایک ہی بنتی بگڑتی شکل ہے چاروں طرف
اصل غائب ہے اور اس کی نقل ہے چاروں طرف

عمر بھر جاری یہی تو شغل ہے چاروں طرف
ہجر ہے پھیلا ہوا یا وصل ہے چاروں طرف

اپنے طور پر یہاں ہر چیز قائم ہے مگر
اک محبت ہی ذرا بے دخل ہے چاروں طرف

کاٹ لینا چاہئے موقع غنیمت جان کر
لہلہاتی جو لہو کی فصل ہے چاروں طرف

وصل آمادہ ہوائیں چل رہی ہیں چار سو
دیدنی خوابوں کا میرے نخل ہے چاروں طرف

ہر طرف سے میں بھی تھا مایوس راہِ عشق میں
شاہد اختر اب خدا کا فضل ہے چاروں طرف

گیا کالج۔ گیا

عمر انصاری

ہوتے مدہوش، تو ہاں ہوش میں لایا جاتا
ہوش مندوں کو بھلا کیسے جگایا جاتا

واقعہ واں کوئی پیش آگیا اچھا ہی ہوا
کچھ نہ ہوتا بھی، تو افسانہ بنایا جاتا

بے نیازی کی بھی اے دوستو حد ہوتی ہے
اب تو خوابوں میں بھی تم سے نہیں آیا جاتا

لگ گیا ہے یہ زمانے کی ہوا کو کیا روگ
کوئی دیوانہ کہیں اب نہیں پایا جاتا

ہائے وہ دشت ختن، اف وہ دھویں کے بادل
کیا اندھیرے میں کوئی تیر چلایا جاتا

قصہ درد اکیلے میں بیاں کیا کرتے
سننے والا کوئی ہوتا، تو سنایا جاتا

ماسوا میرے عمرؔ، تھا وہاں ہر ایک مدعو
ہاں میں ہاں بھی ملاتا، تو بلایا جاتا

۲۰۔امین آباد پارک، لکھنؤ۔۲۲۶۰۱۸

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی

جب بھی سرخ جوڑوں میں بیٹیاں نظر آئیں
وقت کی چتاؤں پر ارتھیاں نظر آئیں

سرزمیں دہل اٹھی آسماں لرز اٹھا
اتنی خون ناحق کی سرخیاں نظر آئیں

بستیوں کا سناٹا بام و در کو ڈستا تھا
بند سب مکانوں کی کھڑکیاں نظر آئیں

پست حوصلے دیکھے جب بھی ناخداؤں کے
غرق ہوتی ساحل پر کشتیاں نظر آئیں

ایٹمی ہواؤں میں وہ غضب کی حدت تھی
سردیوں کے موسم میں گرمیاں نظر آئیں

جبر و جور کا درپن جب کسی نے دیکھا ہے
بیکسوں کے چہروں پر برچھیاں نظر آئیں

رات کے اندھیرے میں، بیکسی کے عالم میں
جلتی بجھتی شہروں کی بتیاں نظر آئیں

عصر نو کا آئینہ جب بھی جگمگایا ہے
حسن عہد رفتہ کی جھلکیاں نظر آئیں

رازؔ، جب بھی لوگوں نے امن کی دعا کی ہے
ظالموں کے ہاتھوں میں برچھیاں نظر آئیں

اردو محلہ، اٹاوہ۔۲۰۶۰۰۱(یوپی)

غزلیں

محبوب راہی

مری بے مائیگی پہچان میری
زبوں حالی ہے عالی شان میری

نہیں مجھ سے ابھی پہچان میری
ابھی ہے شخصیت انجان میری

مری دشمن اے میری صاف گوئی
خدا را چھوڑ اب تو جان میری

خدا حافظ کہے کب کون جانے
مری ہر سانس ہے مہمان میری

بڑی ہرجائی ہے پیارے یہ دنیا
نہ پیچھے بھاگ اس کے، مان میری

جو ہے نادان دانا تو وہی ہے
ذرا یہ بات سن نادان میری

سکون وعافیت کا کوئی لمحہ
اے مری زندگی، اے جان میری

کوئی در اور جاکر کھٹکھٹاؤ
بڑھادی میں نے اب دوکان میری

ابھی تک ساتھ میرا دے رہی ہے
حیات بے سروسامان میری

یہ دنیا، ہاں یہ پر اسباب دنیا
کبھی تھی تابع فرمان میری

وسیلے سے مرے شعروں کی راہی
زمانے بھر میں ہے پہچان میری

سابق پرنسپل، جی۔این۔اے کالج، برسی ٹکلی۔اکولہ

نثار جیراجپوری

زیرِ افلاک ڈھل گیا سورج
دورِ حاضر نگل گیا سورج

ان کے چہرے کی روشنی پاکر
منجمد تھا، پگھل گیا سورج

آگ اس طرح تھی لگی تن میں
مجھ کو چھوتے ہی جل گیا سورج

کل کھلی تھیں کرن ٹہنیوں پر
آج دیکھا تو پھل گیا سورج

آج دیکھا جو اس پری وش کو
راہ چلتے مچل گیا سورج

دل کی وادی سے رفتہ رفتہ وہ
دور کتنا نکل گیا سورج

جھیل آنکھوں میں دیکھ کے تارے
دل کا اجڑا بہل گیا سورج

کھو کے کرنیں نثار دھرتی پر
اپنے ہاتھوں کو مل گیا سورج

شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ۔۲۷۶۰۰۱

مصطفیٰ مومن

یہ تمنا ہے کہ اب شوق سفر دے کوئی
بے زباں خوابوں کو بھی برگ و ثمر دے کوئی

آگ جنگل میں لگی ہے کہ شبستانوں میں
برف پگھلی ہے، زمانے کو خبر دے کوئی

جبر ہی ہے تو میں یہ جبر گوارا کرلوں
میری راتوں کو جو عنوانِ سحر دے کوئی

کیا عجب ہے، اُگے پتھر کے بدن سے پانی
گیلی مٹی کو اگر سوزِ ہنر دے کوئی

آگ کے جسم سے پھوٹیں گے لہو کے چشمے
ورنہ آنکھوں کو مری شعلہ تر دے کوئی

ہاتھ ساکت ہیں [illegible]
آنکھ خاموش ہے [illegible] دے کوئی

رحمت گنج [illegible]

شوکت حیات

مادھو

ایک مدت کے بعد طرح طرح کے اچھے برے ... مادھو کی آنکھیں کھلیں تو اس کا ارتفاع ہو چکا تھا۔

اس نے حیرت سے اطراف کا جائزہ لیا۔

اس کی آنکھوں میں رات کے ٹھرّے کا خمار اب ... جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

چاندنی رات کے آخری پہر میں اس نے دیکھا۔

شراب خانے کے باہری دالان میں ادھر ادھر ... ٹھے دونے بکھرے پڑے تھے۔

بیشتر مٹی کے پیالے اوندھی حالت میں جگہ جگہ ... ٹ کر رونی صورت اختیار کئے ہوئے تھے۔

اس کے پہلو میں اس کا باپ گھیسو اب بھی پاؤں ... پیٹ میں ڈالے گٹھری بنا ہوا گہری نیند میں سویا تھا۔

اس نے باپ کو اٹھانا چاہا۔

"اٹھ جاؤ بابو صبح ہو گئی......!"

باپ نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا ... کروٹ بدل کر گہرے خراٹے لینے لگا۔ اسے بڑی ... وحشت ہوئی۔

"اسے تو سوتے رہنا ہے...... اور اسے کم سے کم اب بھی تو جاگ جانا تھا!"

وہ بڑبڑایا۔

بہت دیر ہو گئی---اس نے سوچا۔

لیکن ابھی بھی امکانات کے افق پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

صبح ہونے میں [illegible] ابھی دیر تھی۔ اس نے کروٹ بدلنی چاہی۔ کمزور کمزور اور چرمراہٹ کی آواز فضا میں [illegible] اس نے گردن کے

[illegible]

طور پر پوریاں کھائی تھیں، وہ موسم کے کئی سرد و گرم جھیلنے کے بعد سوکھ گئی تھی اور اس کے جسم کے بوجھ کے خلاف بطور احتجاج کراہتے ہوئے ٹوٹ رہی تھی۔

مادھو نے یاد کرنا چاہا۔

پتا نہیں اس کی بیوی بدھیا کی ارتھی اور کفن کا کیا ہوا۔ لوگوں نے اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک ہار کر آخر کار انتم سنسکار کر ہی دیا ہوگا۔

اس نے سوچا۔

وہ کتنا بدنصیب ہے۔ اپنی اچھی بھلی بیوی کے داہ سنسکار کا پیسہ نہ صرف شراب میں اڑا گیا بلکہ اس کے آخری سفر میں اس کا ساتھ دینے سے بھی محروم رہا۔

"بدھیا......!"

ہوا کا ایک خوشگوار خوشبودار جھونکا اسے چھوتا ہوا گزر گیا۔

اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی رفتار تیز ہو گئی۔

بدھیا پر جوانی کے گل بوٹوں نے کچھ اس طرح اپنے نقوش ابھارے تھے کہ جب کبھی پانی بھرنے مٹکا لے کر وہ پنگھٹ کی طرف جاتی ہوتی، راہ گیر اسے دیکھ کر دل تھام کر رہ جاتے سب کی زبان پر بیک وقت ایک ہی بات ہوتی۔

"مادھو رے مادھو...... ترے نصیب کا کمال ہے......!"

روکھی سوکھی کھاتے ہوئے بھی بدھیا کے جسم کے کس بل میں کئی برس تک کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ اپنے گداز اور چھریرے نرم بدن سے وہ مادھو کو بھرپور لذت بہم پہنچانے کی پوری کوشش کرتی تھی۔

شادی سے پہلے اپنی ہم عمر دور کے رشتے کی شادی شدہ موسی سے جس کی شادی کئی سال قبل ایک عمر دراز آدمی کے ساتھ ہوئی تھی، اس نے مردوں کو سکھ پہنچانے کی بہت سارے ہنر سیکھ لئے تھے۔ عیش و عشرت کے لمحوں سے وہ مادھو کو اس طرح ہمکنار کرتی کہ خود رفتگی کے عالم میں وہ اسے اپنے بازوؤں میں جکڑے ہوئے آسمانوں کی سیر کرتا۔ مادھو جب کبھی ٹھرّا پیے ہوئے ہوتا، بھوکے کتے کی طرح بدھیا پر ٹوٹ پڑتا اور اسے ایسی ایسی اذیتیں پہنچاتا کہ وہ بلبلا اٹھتی ... اس کے آنسو نکل آتے ... کچھ دیر تک گہری گہری سانسیں لینے کے بعد وہ خود کو سنبھالتی اور پھر زیر لب مسکرانے لگتی ... اسے ٹکر ٹکر تکے جاتی ....

وہ کمال کی عورت تھی۔ آدھا پیٹ کھا کر بھی اکثر اس طرح کھل کھیلتی جیسے اس کا معدہ مرغ و ماہی اور شراب سے بھرا ہوا ہو---ہائے رے نامراد بدھیا! میں نے تجھے کھو کر سورگ کی دیوی کھو دی ... تری جیسی عورت اب مجھے اس جنم میں ملنے سے رہی....

اناڑی پن اور مردانہ تونگری کے جوش میں کئی بار اس کے پیٹ کا بچہ اسقاط ہو چکا تھا...... اور پچھلی بار تو حد ہی ہو گئی...... اندر کی کوٹھری میں درد زہ سے وہ تڑپتی رہی...... اور دونوں باپ بیٹے باہری دالان میں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون کر کھاتے رہے۔ بغیر ٹھنڈا کیے...... گرم گرم آلو چھیل کر کھاتے ہوئے آلو کے اندرونی گرم حصے سے ان کی زبان، تالو اور حلق جل رہے ہوتے اور وہ انہیں جلدی جلدی گویا نگل رہے تھے...... کسی طرح پیٹ کی آگ شانت ہو جائے۔ اس کوشش میں بار بار ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

لیکن پیٹ کا جہنم ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنے عمل سے وہ باز نہ آرہے تھے۔

بدھیا درد زہ سے پچھاڑیں کھاتی رہی..... چیختی چلاتی رہی... اس کے منہ سے دلخراش صدا نکلتی رہی اور وہ اس ڈر سے کہ اس کا باپ اس کے پیچھے میں بھنے ہوئے آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کردے گا، تیمارداری کے فرائض ادا کرنا تو دور، بدھیا کو اندر دیکھنے تک نہ گیا۔

گاؤں کی دائی کو پیسے دینے کے اندیشے سے اس نے اس کی خدمت حاصل نہیں کی۔ بدھیا کے خوبصورت بدن میں زہر پھیل گیا اور وہ اور پیٹ میں اس کا بچہ دونوں مرگئے۔

"چھی!" اسے اپنے آپ سے گھن آئی۔

"کتنا گرا ہوا تھا وہ... !"

"کمینگی کی انتہا تھی... !"

اس کے منہ پر مکھیاں بھنبھنانے لگیں۔

اسے اپنے باپ گھیسو پر بھی غصہ آیا۔ اگر وہ نوجوانی، ناتجربہ کاری اور قلاشی کے سبب بدعقلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھول کر رہا تھا تو کم سے کم اسے تو اپنے تجربے اور عقل کی بنیاد پر ہوش سے کام لیتے ہوئے دائی کا انتظام کر دینا تھا۔ گاؤں کی دائی سکھیا موسی کو وہ خود جا کر کہہ آتا تو مجال ہے وہ نہ آتی۔ اسے پیسے بعد میں دیئے جاتے۔

ہائے نامراد بدھیا... تو مفت میں بھری جوانی کی موت مرگئی...

اسے اپنے باپ پر متواتر غصہ آتا رہا۔ کیسے پاؤں پیٹ میں ڈالے گہری نیند میں سو رہا تھا۔ خبیث کہیں کا اس رنڈوے کی تو خود اس کی بیوی پر نیت خراب تھی۔ اگر موقع ملتا تو وہ اسے نگلنے سے باز نہ آتا۔ اپنی بیوی کو تو وہ کب کا اپنی لاپروائی میں مار چکا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی ازدواجی زندگی کے سکھ سے محروم ہو جائے۔

اکثر اس نے اپنے باپ کو بدھیا کے جسمانی ابھاروں کو للچائی ہوئی ہوسناک نظروں سے گھورتے ہوئے دیکھا تھا۔ رات میں باہری کوٹھری میں سوتے ہوئے وہ جان بوجھ کر زور زور سے کھانسا کرتا تھا تاکہ ملحق اندرونی کوٹھری میں اس کی اور بدھیا کی بدمست محویت میں مخل اندازی ہو۔ جانے اس سے اس کی تشنگی کو کیسی تسکین ملتی تھی۔

واقعی کئی بار ایسا ہوا بھی تھا کہ بڈھے کی کھانسی سے تنگ آکر وہ بے حس و حرکت ہو جایا کرتا اور بدھیا بے بس نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے تڑپ تڑپ کر رات بھر کروٹیں بدلتی رہ جاتی۔

تدارک کے طور پر اسے دوسری رات ٹھرا پی کر آنا پڑتا تھا کہ ٹھرے سے پیدا شدہ اس کے خون کا تیز ابال بوڑھے کی کھانسی پر غلبہ حاصل کر لے اور اس کی بدھیا کی سیرابی ہو سکے۔ بدھیا کو یاد بھی نہیں رہتا کہ وہ سونے سے قبل ہاتھوں کی چوڑیاں اتار لیا کرتی۔ یوں بھی اکثر مادھو کے اتاولے پن کے آگے وہ ساری احتیاطی تدابیر پر عمل کرنا بھول جایا کرتی۔

اس کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ بوڑھے گھیسو کو اپنی بیوی چھمیا کی یاد دلاتی اور اس کا سونا محال ہو جاتا۔ تانبے کی طرح ٹن ٹن کرتی ہوئی گٹھیلی چھمیا کی اسے یاد آتی تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ اس کے خیال میں بدھیا کے جسم میں زوردار چھمیا والی بات نہ تھی لیکن..... بدھیا بھی کچھ کم نہ تھی۔ اس کے سڈول جسم اور سانولی سلونی رنگت والی جلد سے شہد ٹپکتا تھا۔ مادھو کی کھس پھس بوڑھے گھیسو کو بہت ناگوار گزرتی۔ اس کی ڈھیلی رگوں میں بھونچال آجاتا اور اسے کھانستے ہوئے ریگزاروں کے سفر پر روانہ ہونا پڑتا۔ اسے کہیں کوئی چشمہ سیرابی میسر نہ آتا۔ تشنگی اور محرومی ایک عرصے سے اس کا مقدر بنی ہوئی تھی۔ ہراساں و لرزاں کبھی کبھی وہ رو اٹھتا۔

چھمیا..... تو مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئی!

اس کے دل سے آہ نکلتی اور وہ نیم تاریکی میں مادھو کی کوٹھری کی طرف بے بسی سے دیکھتا ہوا مسلسل کھانستا رہتا۔

وہی بدنصیب تھا جو اس کی قدر نہ کر سکا۔ اس کی لاپروائی کے چلتے مادھو کو پیدا کرتے ہوئے وہ اس دنیا سے سدھار گئی۔ بعد میں نکھٹو کہتے ہوئے پوری برادری میں اس کی بڑی بدنامی ہوئی۔ لوگوں نے چھمیا کی موت کو ہتیا گردانا اور بہت چاہنے کے باوجود کوئی اسے اپنی لڑکی دینے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔

چھوٹی سی جھونپڑی میں اور کوئی گنجائش بھی تو نہ تھی کہ مادھو اپنے اور باپ کے سونے کا انتظام دوسری طرح کر سکتا۔ لے دے کر دو ستی ہوئی کوٹھریاں تھیں۔ اور کھانا پکانے کی تھوڑی سی جگہ۔ حوائج ضروری کے لئے ان کی عورتوں تک کو کھیتوں کی راہ اختیار کرنی پڑتی تھی۔ صبح کی کرن پھوٹنے سے پہلے ان کی عورتیں بول براز سے فراغت حاصل کر لیا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ کئی بار دلچسپ اور ناخوشگوار حادثے پیش آچکے تھے۔

کبھی کبھی مادھو اور بدھیا کو ڈسٹرب کرنے کے ارادے سے وہ زور زور سے "دھادھا" کرتا ہوا چلانے لگتا جیسے دروازے پر آئے کسی کتے کو ہنکار رہا ہو۔ مادھو تڑپ کر رہ جاتا۔

درد زہ کے عالم میں گھیسو کے ذریعے مادھو کو اسے دیکھ آنے کی ہدایت تو محض اس کا دکھاوا تھی۔ تجربہ کار بوڑھا جانتا تھا کہ آلو کھانے کے چکر میں وہ بدھیا کو نظر انداز کرے گا اور دائی کی عدم موجودگی میں وہ اس دنیا سے سدھار جائے گی۔ اسے رات میں سوتے ہوئے بدھیا کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ، گدگدی، کھلکھلاہٹ اور دبی دبی سسکاریوں سے نجات مل جائے گی۔ اس طرح کی موت کے بعد مادھو کی بدنامی ہوگی تو کوئی اسے لڑکی نہ دے گا اور اسے ہمیشہ کے لئے ان جھنجھٹوں سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔

جب تک مادھو کنوارا تھا، گھیسو نے اسے بیک وقت ماں باپ دونوں کا پیار دیا..... اس کی پرورش و پرداخت کی..... لیکن شادی ہوتے ہی وہ باپ کے بجائے صرف ایک مرد میں تبدیل ہو گیا اور رقابت اور رشک و حسد میں مبتلا رہنے لگا..... یہاں تک کہ......

"لعنت ہے اس زندگی پر... !"

اس کے حلق میں بلغم جمع ہو گیا جسے گلا کھنکارتے ہوئے اس نے پوری قوت سے پرے پھینک دیا۔ اسے کچھ راحت ملی۔ جیسے ایک لحظے کے لئے گندگی سے اسے نجات مل گئی ہو۔

اچانک دور سے الیشین کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔

وہ کمبخت رات بھر جاگتا اور زمیندار کے اثاثے کی حفاظت کرتا۔

زمیندار کے خاندان کے افراد کے علاوہ جس کسی کی بھی ارتھی یا جنازہ اس راستے سے جا رہا ہوتا، بے تحاشا بھونکنا اس کی خباثت میں شامل تھا۔ جب کہ زمیندار کے خاندان کے افراد کے جنازے میں وہ ہجوم کے پیچھے خاموشی کے ساتھ سر جھکائے ہوئے چلتا۔

یہی نہیں؟ شادی بیاہ، درگا پوجا، عید بقر عید، محرم اور دیگر تیوہاروں کے موقعوں پر بھی اس کا امتیازی برتاؤ کانٹوں کی طرح چبھتا۔ زمیندار کے گھر کے افراد، اس کے

رشتہ دار، اس کے احباب اور بڑے لوگ اگر ایسی کارروائیوں میں ملوث ہوتے ہوئے ادھر سے گزر رہے ہوتے تو یہ خون خوار کتا ان کی کارگزاریوں میں پوری دلچسپی سے شامل رہتا۔ دم ہلاتا ہوا ان کا ایک حصہ بن جاتا۔ ان کے ساتھ اچھلتا، کودتا اور اٹکھیلیاں کرتا۔

اس کے برعکس اگر گاؤں کے دیگر لوگ خاص طور سے سیدھے سادے عام اور غریب غربا قسم کے لوگ، خواہ وہ کسی مذہب، مسلک اور ذات برادری سے تعلق رکھتے ہوں ایسے موقعوں پر زمیندار کی حویلی کی طرف سے تہوار کے موقع میں جشن مناتے ہوئے گزرنے کی کوشش کرتے تو انہیں وہ رگید دیتا۔

حتیٰ کہ جلسوں اور جلوسوں کے موقعوں پر بھی اس کا اختصاصی رویہ جگ ظاہر تھا۔ ایک طرح سے زمیندار کی حویلی والا علاقہ گاؤں کے عام لوگوں کے لئے اس کتے کی وجہ سے ممنوعہ علاقے کی صورت اختیار کر چکا تھا۔

مادھو نے طے کر لیا تھا کہ وہ اسے چھوڑے گا نہیں۔ زمیندار، رئیس، وزرا اور تمام بڑے لوگوں کی ہیکڑی اسی کتے پر ٹکی تھی۔ ان کے لئے وہ سائرن کا کام کرتا۔ جیسے لال، پیلی بتیوں والی وزرا اور افسران کی گاڑیوں کے سائرن پلک جھپکتے میں سڑک کے بیچ والے حصے کو ویران اور ساکت کر دیتے تھے، ویسے ہی یہ کتا ان بڑے لوگوں کی مدافعت میں سارے ماحول کو ہموار کر دیا کرتا تھا۔

عجیب کتا ہے ...... حرام زادہ......

وفاداری کے بجائے غلامانہ ذہنیت کا حامل......

مادھو کو کتے پر بے حد غصہ آیا۔

ذلیل و خوار......

اگر اسے موقع ملا تو وہ کتے کی ضرور خبر لے گا......

اسے چھوڑے گا نہیں ......!

اس نے مصمم ارادہ کیا۔

اس نے چاہا کہ باپ کو اٹھائے۔ لیکن ایسا کرنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔ شاید اس کا سوتے رہنا ہی اس کی زندگی اور مقدر کا ماحصل ہے۔ اور خود اسے...... اسے تو بہت پہلے جاگ جانا چاہئے تھا...... لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی...... اس کے اندر سے کوئی سرگوشیاں کر رہا تھا۔

(۲)

نزدیک کے کھیت میں حوائج ضروری سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے دوست جلیل نداف کی یاد آئی۔ وہ ناشتہ کئے بغیر اپنے باپ کو اسی طرح سوتا چھوڑ کر گاؤں کے کچے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

لیکن یہ کیا۔

کچا راستہ پختہ ہو گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔

وہ کتنی دیر تک سویا رہا؟

اس نے آنکھیں ملتے ہوئے غور کیا۔ سڑک کی دونوں جانب کچے مکانوں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ پختہ مکانوں نے ان کی جگہ لے لی تھی۔ اس نے ایک آدمی سے پوچھا۔

"بھائی ...... جلیل نداف کا مکان کس طرف ہے......؟"

"مکان تو اسی سمت میں ہے جدھر آپ جا رہے ہیں لیکن اب جلیل جی گاؤں میں نہیں رہتے۔"

اسے مزید حیرت ہوئی۔

اس نے قدم آگے بڑھائے۔ گاؤں کے کنویں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے مشاہدہ کیا کہ اس کے بغل میں ایک چاپا کل گڑا ہوا تھا۔ اور اس کے چاروں طرف وسیع و عریض چبوترا بنا ہوا تھا۔

کتنی تبدیلی آگئی...... اور وہ اب تک نیند میں مبتلا تھا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا، پختہ مکانوں کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا تھا۔

(۳)

دوپہر ہو گئی۔

کسی نے اسے بتایا کہ آج زمیندار کے السیشین کتے کا مقابلہ اس آدمی سے ہوگا جو اسے قابو میں کرتے ہوئے زمیندار کے دس ہزار روپے جیت لے۔

ندی کنارے پیپل کے درخت کے نیچے بنے چبوترے کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا۔

ٹھیک چار بجے مقابلہ تھا۔ صلائے عام تھی اس مقابلے میں شرکت کی۔

زمینداری کے خاتمے کے بعد بھی زمیندار صاحب کی شان شوکت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ان کا کتا دیکھنے میں شیر کی طرح لگتا تھا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا کہ زمیندار صاحب نے اسے دس ہزار روپے میں خریدا ہے۔ کوئی کہتا کہ کسی انگریز نے جاتے وقت بطور تحفہ انہیں مرحمت فرمایا ہے۔

سب لوگ اس کتے سے خوف کھاتے تھے۔

ان کے کتے کو دیکھ کر لوگ خوف و دہشت میں مبتلا ہوتے تو زمیندار صاحب کو عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ کتا بھونکتا اور لوگ بھاگ کھڑے ہوتے تو کتے کی لپلپاتی زبان اور بھاگتے قدموں کو دیکھتے ہوئے انہیں یک گونہ راحت ملتی تھی۔

اس نے سوچا۔ ابھی تک یہ کتا زندہ ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ کتے کی عمر اتنی لمبی کہاں ہوتی ہے، ضرور اس کا بیٹا یا پوتا ہوگا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کتے کا مقابلہ کرے گا۔

ایک راہ گیر نے اسے بتایا کہ اعلان کے مطابق مقابلے میں شامل ہونے کے لئے زمیندار کے دربان کے ہاں دوپہر سے پہلے تک اطلاع دینی ہوگی۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا زمیندار کی حویلی تک پہنچا۔

دربان نے اسے متنبہ کیا کہ وہ خواہ مخواہ خطرہ مول لینا چاہتا ہے۔ کتا بہت خونخوار ہے اور اس کی بوٹی بوٹی کر سکتا ہے۔

"میں ہر حال میں لڑوں گا ...... اور اس کا ...... یا وہ نہیں یا میں نہیں ......!"

مادھو نے سخت لہجے میں کہا۔

دربان حیرت و استعجاب میں مبتلا تھا۔ بھلا ایسا پھٹا حال دبلا پتلا آدمی کس طرح اس خطرناک کتے سے لڑنے کی جسارت کر رہا ہے۔

اس نے اپنا نام دربان کے رجسٹر میں درج کروایا۔

دفعتاً اس کے ذہن میں بجلی سی کوند گئی اور وہ جلیل نداف کے گھر کی طرف تیز قدموں سے روانہ ہوا۔

(۴)

ندی کنارے پیپل کے پیڑ کے پاس لوگوں کا مجمع اکٹھا تھا۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی اس دلچسپ مقابلے کو دیکھنے کے لئے آئے تھے۔

چبوترے کو منچ کی طرح استعمال کیا گیا تھا۔

متعدد کرسیاں اس پر سجی تھیں۔ اس علاقے کے سربرآوردہ لوگ مختلف کرسیوں پر براجمان تھے۔ درمیانی کرسی پر زمیندار صاحب تن کر بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی کڑی مونچھوں کو تاؤ دے رہے تھے۔ ان کے رعبیلے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ ان کی

بغل میں ان کا لیفٹیننٹ کتا ان کے قدموں میں بیٹھا تھا اور بڑی بے اعتنائی کے ساتھ مجمع کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دربان نے رجسٹر کھولتے ہوئے پاٹ دار آواز میں کہا۔

"حضور! بار بار کے اعلان کے باوجود حضور کے کتے سے مقابلے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوا......!"

زمیندار صاحب نے بڑی حقارت، شان استغنائی اور زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ مجمع کی طرف نگاہ دوڑائی اور اپنے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"لیکن حضور ایک آدمی ....."

دربان کی زبان میں ارتعاش پیدا ہوا۔

زمیندار کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"حضور! مادھو نام کا ایک آدمی مقابلہ کرنا چاہتا ہے....!"

"مادھو......!"

زمیندار نے تمسخرانہ انداز میں اس نام کو دہرایا۔

"ہاں حضور......!"

"کون مادھو.....؟"

"گھیسوا چمار کا بیٹا حضور......!"

"اچھا...... اچھا.....وہی جس نے اپنی پتنی کی ہتیا کر دی تھی......؟"

"زمیندار نے مزید استفسار کیا۔

"ہاں حضور وہی مادھو! جس نے اپنی پتنی بدھیا کے کفن کے لئے چندے کے پیسے شراب اور ٹھرے میں اڑادئے تھے.....اور جس نے.....جس نے!"

دربان کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

"پوری بات کہہ!"

زمیندار نے حکم دیا۔

"جس نے کفن کے بچے ہوئے چندے کے پیسے بھکاریوں کو دان کرتے ہوئے کہا تھا، میں بھی جمیندار سے کم ہوں کیا۔ لے جا..... کھوب کھا اور پی اور اسیر باد دے...... جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی۔ مگر ترا اسیر باد جرور پہنچ جائے گا......روئیں روئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں..... میں بھی جمیندار سے کم ہوں کیا......!"

"اچھا..... !ایسا کہا تھا اس حرامزادے نے......؟"

"ہاں حضور......!"

"تو نے اسے سب سمجھا دیا ہے......!"

"ہاں حضور......!"

"اسے بتا دیا ہے کہ اس کے سارے کس بل نکل جائیں گے...... مفت میں اس کی جان چلی جائے گی.....!"

"جی حضور......!"

"تو دیکھتا کیا ہے...... لا اس کتے کو میرے کتے کے......!"

زمیندار صاحب کی آواز میں غصہ اور کڑواہٹ تھی۔

دربان نے کتنے کی زنجیر پکڑ لی اور زور دار آواز میں مجمع سے مخاطب ہوا۔

"مادھو حاضر ہو......!"

"حاضر ہوں جناب......!"

بھیڑ کو چیرتا ہوا کسی بندھے ہوئے گٹھڑ کے ساتھ ایک دبلا پتلا آدمی سامنے آیا۔ زمیندار صاحب نے کہا۔

"تجھے انگوٹھا لگانا ہوگا ڈیکلریشن پر......!"

"میں دستخط کروں گا جناب..... لیکن کیسا کاغذ ہے، پڑھنا چاہوں گا......!"

زمیندار صاحب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر کڑکتے ہوئے بولے۔

"تمہیں اعلان کرنا ہوگا کہ تم اپنی مرضی سے مقابلے میں شامل ہو رہے ہو اور اپنی موت کے ذمہ دار تم خود ہوگے......!"

"لیکن آپ کو بھی ایک بات لکھنی ہوگی......!"

زمیندار صاحب چونکے۔

"کیا......؟"

"اگر کتا مرا تو میرا کوئی قصور نہیں ہوگا اور میرا جیتا ہوا دس ہزار روپیہ سوخت نہیں کیا جائے گا......!"

"اچھا.....اچھا......!"

زمیندار صاحب نے اس کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ ان کی تمکنت میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ مسلسل اپنی رعب دار مونچھوں کو تاؤ دیتے رہے۔

کاغذی کارروائی مکمل ہونے کے بعد مقابلے کا آغاز ہوا۔

نقارچی نے ڈنکا بجانا شروع کیا۔ شروع میں ہلکی تھاپ دی۔ پھر بڑھتے ہوئے جوش کے ساتھ تھاپ کی ضرب میں شدت آتی گئی۔ اچھل اچھل کر تھاپ دیتے ہوئے وہ مادھو کی طرف دیکھتا جاتا تھا اور اس کے حق میں بھگوان سے پرارتھنا کرتا جاتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں رعشہ تھا جس پر بہت کوشش کرکے عبور حاصل کر رہا تھا۔

مادھو نے ایک جست لگایا اور گٹھڑ میں بندھی ہوئی رضائی کو کھول کر ہاتھوں میں پکڑے ہوئے آگے بڑھا۔ اس کی اور کتے کی آنکھیں آمنے سامنے تھیں۔

کتے نے ایک چھلانگ لگائی اور قریب تھا کہ وہ مادھو کو دبوچتا اور تکا بوٹی کرتا ہوا لہولہان کر دیتا، مادھو نے پلک جھپکتے میں اسے رضائی کے پہاڑ سے ڈھانپ دیا۔

کتا اس اچانک اور غیر متوقع حملے کے لئے تیار نہ تھا۔ رضائی کے اندر اندھیرے میں گرفتار ہوتے ہی گھبرا گیا۔

دوسرے ہی پل مادھو رضائی کے اوپر سے کتے کی پیٹھ پر سوار تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اس کی گردن کو آہنی شکنجے کے مانند جکڑے ہوئے تھے۔

آہنی شکنجے کا دائرہ دھیرے دھیرے تنگ ہوتا جارہا تھا۔

مادھو اس وقت تک اس کے اوپر سے نہ اترا جب تک کتے نے دم نہ توڑ دیا۔

مجمع مادھو کی جے کے نعرے لگا رہا تھا۔

زمیندار صاحب پسینے میں شرابور چہرے کو بار بار رومال سے پونچھ رہے تھے۔

(۵)

لوگوں نے اسے کندھے پر اٹھا لیا اور مادھو زندہ باد کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔

دفعتاً اسے بہت سارے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں دور سے آتی سنائی دیں۔

اس کے چہرے سے کڑواہٹ مترشح ہونے لگی۔

کندھوں سے ایک جھٹکے سے کود گیا۔

جنگل کے اس پار سے نگاڑوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دور کسی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز فضا میں گونجی۔ ہجوم کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثر ابھرے۔

معنی خیز نظروں سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے وہ جنگل کی طرف کوچ کر گیا۔

اس کے ہونٹوں پر رینگتی ہوئی پراسرار مسکراہٹ دھیرے دھیرے پھیلتی جارہی تھی۔ ☆☆

ارمان شمسی

تاری جنو

آج صبح سے ہی میرے محلے میں لوگوں کی آمد و رفت زیادہ تھی، حاجی ثناء اللہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ حاجی صاحب بہت بڑے آدمی تھے، بہت بڑے بزنس مین۔ ملک میں ان کی کئی فیکٹریاں چل رہی تھیں، کئی شوروم تھے اور وہ کئی بلڈنگوں کے مالک تھے۔ ان کے جنازے میں شرکت کے لئے صبح سے لوگ جوق در جوق آکر جمع ہو رہے تھے۔

میں گھر میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا کہ میرے بیٹے نے آکر خبر دی جنازہ تیار ہو گیا ہے، اب میت کو قبرستان لے جانے والے ہیں، میں سنی اَن سنی کرتے ہوئے اخبار میں ڈوبا رہا۔ تو میری بیوی نے چونک کر مجھے دیکھا اور ایک کراری آواز نکالی۔ کیا آپ جنازے میں شرکت نہیں کریں گے جو مزے سے بیٹھے ہوئے اخبار پڑھ رہے ہیں۔

مجھے نہ جانے کیوں دولت مند آدمیوں سے الجھن ہوتی ہے اور میں ہمیشہ ان کی قربت سے کتراتا ہوں۔ معاملہ خوشی کا ہو یا غم کا مجھے ان کے ماحول سے گھٹن ہوتی ہے، میں نے اپنی بیوی کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا پھر نظریں جھکا کر دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

کچھ دیر تک تو میری بیوی نے صبر کی پھر ذرا تند لہجے میں گویا ہوئی، میں کیا کہہ رہی ہوں کب جایئے گا جب جنازہ چلا جائے گا تب؟...... اتنے بڑے آدمی کا انتقال ہوا ہے، دور دور سے لوگ شرکت کے لئے آرہے ہیں اور آپ گھر میں بیٹھے مزے سے اخبار پڑھ رہے ہیں۔

میں نے مذاق کرتے ہوئے جواب دیا کتنے بڑے آدمی تھے مجھ سے چھوٹے تھے وہ قد میں بھی اور عمر میں بھی۔

میری بیوی اس قسم کی میری باتوں سے ہمیشہ نالاں رہی ہے۔ چیخ کر بولی دولت مند کو بڑا آدمی کہا جاتا ہے۔ آدمی بڑا چھوٹا قد اور عمر سے نہیں کہلاتا سمجھے...... پھر برا سا منہ بنا کر بولی آپ کی تو منطق ہی نرالی ہے خدا جانے آپ کو سمجھ کب آئے گی۔

میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اخبار ایک جانب رکھ دیا اور پھر ایک چٹکی لی، کیا عقل اور علم سے بھی آدمی چھوٹا بڑا نہیں کہلاتا؟

جب آدمی کے پاس پیسہ آتا ہے تو ہر شعبہ پر حاوی ہو جاتا ہے، عقل کیا اور علم کیا۔ جایئے اور جلدی جایئے محلے کا معاملہ ہے۔

میں نے سوچا بیگم صاحبہ مجھے چین سے اخبار تو پڑھنے دیں گی نہیں اس سے بہتر ہے جنازے میں ہی شرکت کر لوں---

میں جب گھر سے نکلا جنازہ جا رہا تھا میں بھی لمبے لمبے قدم بڑھاتا کلمہ شہادت پڑھتا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بے شمار آدمی تھے، خلقت کا ایک اژدہام تھا، جنازہ جدھر سے نکلتا اس جانب کا ٹریفک جام ہو جاتا، دوپہر کا وقت، گرمی بہت سخت تھی لوگ دھوپ کی تپش سے لاپروا جنازے کو کاندھے دینے کی خاطر ایک دوسرے پر چڑھے جا رہے تھے۔ جیسے بس اسٹینڈ پر صبح صبح دفتر جانے کے لئے ہم جیسے لوگ سامنے سے بس آتی دیکھ کر ایک دوسرے پر چڑھنے کی مشق کیا کرتے ہیں۔ ابھی ایک شخص گہوارے کا ہتھہ اپنے کاندھے پر رکھ کر سیدھا ہوتا اور چاہتا کہ کلمہ پڑھنا شروع کرے کہ دوسرا آدمی جھپٹ کر اسے ہٹا دیتا اور جنازہ اپنے کاندھے پر رکھ لیتا وہ بھی دو قدم نہیں چل پاتا کہ تیسرا شخص پھر حاضر ہو جاتا غرض کہ اسی جوش و خروش سے تمام راستہ کٹ گیا۔

قبرستان پہنچ کر ایک درخت کے سائے میں جنازہ رکھ دیا گیا اور لوگ ادھر ادھر بکھر کر مختلف ٹولیوں میں درختوں کے سائے تلے کھڑے ہو کر آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ میں بھی وہاں کھڑا ہو کر ان کی باتیں سننے لگا۔

ایک صاحب جو بہت ہی باتونی تھے اور مسلسل بولے جا رہے تھے نہایت رازدارانہ لہجے میں بولے: سنا ہے ثناء اللہ صاحب کے بیٹوں نے چار لاکھ ٹکے دے کر قبر کی جگہ خریدی ہے۔

دوسرے صاحب نے فوراً ہی تردید کی کہ چار لاکھ نہیں پورے بیس لاکھ ٹکے دئے گئے ہیں، پانچ قبروں کی جگہ ریزرو کی گئی ہے۔

ایک آواز ابھری: بھلا پانچ قبروں کی جگہ کیوں؟

ارے بھئی ایک قبر حاجی صاحب کے لئے اور بقیہ ان کے خاندان کے لئے اس طرح ایک قطعہ زمین کے لئے بیس لاکھ کی ادائیگی کی گئی ہے۔

جواب میں ایک موٹے اور بڑی سی توند والے صاحب نے مسمسی صورت بنائی اور پھر ایک لمبی سانس کھینچ کر پہلے تو اپنے پیٹ میں ہوا بھری پھر ایک جھٹکے سے اس ہوا کو خارج کرتے ہوئے بولے۔ بچی کھچی جو جگہ ہے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ دیکھئے گا کچھ دنوں میں جگہ کے لالے پڑ جائیں گے۔

میں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری بیوی مجھ سے مخاطب ہو: زندگی بھر کرائے کے مکانوں میں دھکے کھاتے رہئے گا یا بچوں کے مستقبل کے لئے بھی کچھ سوچ رہے ہیں۔ اگر زمین نہیں خرید سکتے تو کوئی فلیٹ ہی قسطوں پر لے لیجئے کم از کم سر چھپانے کا ٹھکانا تو ہو جائے۔

مجھے احساس ہوا میری بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے وہ واقعی دانشمند ہے میں تو اس کی باتوں کو جھک سمجھ کر ہمیشہ ٹال جایا کرتا تھا۔ مجھے اب پتہ چلا کہ میں قطعی دھوکے میں تھا اب تک میں یہی رونا روتا رہا ہوں کہ غریبی بڑھ رہی ہے مگر آج انکشاف ہوا غریبی نہیں بلکہ امیری بڑھ رہی ہے۔

کا/۱۲-۱۱ لال باغ روڈ، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

میں اسی غور وخوض میں مبتلا تھا کہ دیکھا پانچ چھ آدمی ایک جنازے کو اٹھائے لئے چلے آرہے ہیں۔ ہانپتے کانپتے پسینے میں شرابور آپس میں کاندھا تبدیل کرتے۔

ان کو دیکھ کر ایک صاحب بولے معلوم ہوتا ہے کہ کسی غریب کا جنازہ ہے، دوسرے صاحب طنزیہ مسکرائے، معلوم کیا ہوتا ہے صاف پتہ چل رہا ہے بے چارے غریب ہی ہیں ان کا حلیہ نہیں دیکھ رہے ہو۔

پھر ایک آواز ابھری کیا غریبوں کے عزیز رشتے دار نہیں ہوتے۔ ان کے رشتے دار تو ہوں گے وہ کیوں نہیں آئے۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے خود ہی بولے ہاں بھائی غریب کا کوئی نہیں ہوتا۔ کئی آوازیں بیک وقت آئیں ہاں صاحب بات تو یہی ہے۔

مزید ایک آواز ابھری جنازے کو کاندھا دینا ثواب ہے ہم لوگوں کو چاہئے کہ چل کر کاندھا دیں یہاں کھڑے کھڑے بے کار باتیں بنا رہے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں نے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھا اور سب خاموش ہوگئے۔ آن واحد میں وہاں قبرستان کی مخصوص خاموشی چھاگئی۔

---جب لوگوں نے بات چیت بند کردی تو مجھے اکتاہٹ محسوس ہوئی دفن میں ابھی دیر تھی کیونکہ قبر کھودی جارہی تھی میں وہاں سے چلا آیا، سر جھکائے لوگوں کی باتوں پر غور کرتا ہوا میں چلا جارہا تھا کہ میری سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔ صاحب...... میرے بچے کے کفن کے لئے کچھ دیدیجئے، میں نے سر اٹھا کر دیکھا ایک بوڑھا مجھ سے مخاطب تھا۔

سامنے ہی روش کے کنارے ایک پیلا کپڑا بچھا ہوا تھا اس کے اوپر ایک لڑکے کی لاش رکھی ہوئی تھی اردگرد چند نوٹ بکھرے ہوئے تھے، ابھی میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ ایک گورکن اس بوڑھے کے قریب آیا اور اس سے مخاطب ہوا صبح سے دوپہر ہوگیا تم ابھی تک لاش لئے بیٹھا ہے۔ لاش پھول رہا ہے تم کب تک چندہ جمع کرے گا کیا بیٹے کو مٹی دینے کا کھیال نہیں ہے۔

---جواب میں اس بوڑھے نے گورکن کو بڑی بے چارگی سے دیکھا۔ اس سے قبل کہ بوڑھا کچھ جواب دے گورکن دوبارہ بولا۔

ارے پاگل اس کو جندگی میں تو نیا کپڑا ملا نہیں اب مرنے کے بعد اس کو نیا کپڑا دینے کی کیا جرورت ہوگئی۔

آج گرمی بہت ہے لاش میں بو آجائے گی جلدی جاکر جنازہ پڑھالے۔

بوڑھے نے گورکن سے کچھ نہیں کہا مسمسی سی صورت بنا کر مجھے تکنے لگا۔

میں نے گھبرا کر اپنی جیب ٹٹولی دس ٹکے کا ایک نوٹ پڑا ہوا تھا جو میری واپسی کا کرایہ تھا میں ابھی تذبذب میں ہی تھا کہ بوڑھے نے میرے آگے ہاتھ پھیلا دیا صاحب......

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے وہ نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور اس سے قبل کہ وہ کچھ اور کہے میں وہاں سے آگے بڑھ گیا---

---دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں بلا مقصد چہل قدمی کررہا ہوں اپنے استاد اور عالم وقت مولانا سلطان احمد کی قبر پر جاکر فاتحہ کیوں نہ پڑھ آؤں۔

یا حیرت مولانا کی قبر کہاں گئی تمام نشانیاں کھوج ڈالیں۔ تلاش بسیار کے بعد بھی مجھے ان کی قبر نہیں ملی آخر میں نے گورکن کو پکڑا اور اس سے پوچھا تو جواب ملا وہ جگہ کھود کر سب جمین برابر کردی گئی ہے۔

میں نے سوال اٹھایا بھائی کیوں ایسا کیوں کیا گیا؟

تو وہ میری سادگی پہ مسکرایا اور بولا آپ کو معلوم ہے۔ ڈھاکہ کی آبادی کتنی ہے؟ اور کتنے لوگ یہاں روجانہ مرتے ہیں، اگر کبریں نہ کھودی جائیں تو پورا ڈھاکہ کبرستان بن جائے---

اچانک میری نظر لاش کے کنارے کھجور کے درخت کے پاس گئی جہاں ایک پختہ تربت تیار ہورہی تھی اس پر دیدہ زیب ٹائل چڑھائے جارہے تھے میں نے گورکن سے پوچھا یہ کیسی قبر ہے اس پر ٹائلس کیوں چڑھائے جارہے ہیں کیا صرف چار ماہ کے لئے؟

--- میرے اس سوال پر گورکن نے بے اختیار اپنے پیلے پیلے دانت نکال دئے اور مسکراتے ہوئے بولا صاحب آپ بھی کیسا پاگل ہے۔ ارے اس مجار کو بناتے بناتے پورا چھ مہینہ تو چلا گیا ادھر کی جمین جنرل نہیں ہے یہ جگہ بکری ہوچکا ہے۔

---او آئی سی، یہ تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا اسپیشل لوگ، اسپیشل زمین، جنرل لوگ ، جنرل معاملات...... بے چارے جنرل لوگ جو ہمیشہ جنرل وارڈ میں پیدا ہوتے ہیں پھر بیمار ہوکر کسی جنرل وارڈ میں داخل ہوجاتے ہیں اور مرکر جنرل زمین میں کھپ جاتے ہیں، مجھے لفظ جنرل کی وسعتوں پر پیار آنے لگا کہ گورکن کی آواز آئی کیا سوچنے لگا صاحب۔ یہ شہر کے بہت بڑے لوگ کی بیگم کا مجار ہے۔ الیاس بھائی مدھو ریتا سنیما والے ہیں ناپہ مجار انہوں نے اپنی بیگم صاحبہ کے لئے بنوایا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گورکن ساحر کی مشہور نظم تاج محل گنگنا رہا ہے تو کیا...... تو کیا ساحر گورکنوں میں بھی مشہور ہے؟

میں نے گھبرا کر گورکن کو دیکھا وہ غریب تو گریبان کے اندر ہاتھ ڈالے اپنا جسم کھجلا رہا تھا، قبرستان کی مٹی اس کے جسم پر جگہ جگہ چپک کر خشک ہوگئی تھی وہ اسے کھرچنے میں مصروف تھا۔

میں نے اردگرد نظر ڈالی آس پاس اور بھی کئی پختہ قبریں موجود تھیں کچھ پرانی کچھ نئی کچھ کا سیمنٹ کئی جگہ سے پھٹ گیا ہے اور درزوں میں سے خود رو پودے اگ آئے ہیں۔ کچھ پر تازہ تازہ سفیدی پھیری گئی ہے، بڑی بڑی کوٹھیاں صاف ستھرے بنگلے آبادی سے الگ تھلگ، قطار در قطار، شور نہ غوغا، سکون ہی سکون اور پھر شہر کے ہنگامے، چیخ وپکار، کچے مکانات بجلی سے محروم چھوٹے چھوٹے کمرے، گرمی، حبس، چیختی چنگھاڑتی ریل گاڑیاں پٹری کے کنارے کنارے جھونپڑیاں۔

---ابھی کل کی بات ہے ریلوے پٹی کی جھونپڑیوں کو خالی کرانے کے لئے پولیس نے لاٹھی چارج کیا--- ہنگامہ چیخ وپکار آہ وبکا، مرد عورت، بچے بوڑھے چیتھڑوں میں لپٹے نیم برہنہ اپنی اپنی گٹھریاں سنبھالے المونیم کے ٹیڑھے پچکے گلے لئے ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ بلڈوزر چلنے کا ارتعاش، مفلسی، بے بسی، بے کسی......

---بلڈوزر مسلسل چل رہا ہے قبریں اکھاڑی جارہی ہیں زمین ہموار ہورہی ہے، ادھ گلی ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں، کچھ کھوپڑیاں دور اس طرف کی پختہ تربتوں کو تکتے ہوئے اپنی قسمت پر نوحہ خواں...... میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ گورکن نے میرا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ جایئے صاحب دیکھئے وہاں آپ کے مردے کو مٹی دیا جارہا ہے۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا وقت کتنی جلدی گزر گیا۔

اور جب سب مٹی دے چکے تو ایک آواز آئی دعائے مغفرت مانگ لیجئے۔ میں نے بھی اپنے ہاتھ اٹھادئے۔ سب مردے کی مغفرت کے لئے دعا مانگ رہے تھے ان میں چھوٹے بھی تھے اور بڑے بھی۔ ہاں شاید یہی وہ نقطہ اتصال ہے جہاں چھوٹے بڑے سب برابر دکھلائی دے رہے ہیں، سب بے بس، سب لاچار، سب مجبور......

☆☆

ڈاکٹر زاہد قاضی

آخری سجدہ

تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے، بہار کا شہر مظفر پور ہے۔ قحط پڑا ہوا ہے۔ خوشحالی بہت نیچے گری ہے۔ مگر شرافت کچھ اوپر اٹھ گئی ہے۔

مجسٹریٹ سید علی کریم صاحب کی بیگم منابی سے ایک فاقہ زدہ غیر مذہب کی عورت اپنی گود میں دو بچیوں کو لئے ہوئے صاف لفظوں میں التجا کر رہی ہے کہ میری "ان دو بیٹیوں کو خرید لو، بیگم جی ان دونوں کو رکھ لو۔ منابی نے دس روپے نکال کر اس عورت کے ہاتھ پر رکھے کہ یہ لے لو اور اپنی بچیوں کو بھی لے جاؤ۔ وہ پھر دکھ بھرے لہجے میں بولی بی بی میں ان بچیوں کو نہیں پال سکتی۔ بی بی جی آپ ان کو رکھ لیں۔ ان کو پال پوس دیں مجھے مرنے دیں۔ آپ چاہے جو بنا کے ان کو رکھیں۔ مگر ان کو رکھ لیں۔ آپ کی مہربانی کے سائے یہ جو بھی بنے گی وہی ان کے لئے اچھا ہوگا۔ منابی کی آنکھیں ہمدردی، رحم اور دردمندی کے بوجھ سے نیچے جھک گئیں۔ وہ عورت کچھ دیر شکریہ بھری آنکھوں سے منابی کو دیکھتی رہی پھر دونوں بچیوں کی طرف نظر ڈالی۔ جدائی کی تیز برچھی دل میں چبھی اور ایک بے پناہ سسکی کے ساتھ دونوں بیٹیوں کو جن میں ایک نابینا تھی، منابی کی چارپائی کے قریب چھوڑ کر تیزی سے روتی اور لڑکھڑاتی میلے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی دوڑ کر بھاگ گئی۔ منابی نے حالات اور ماں کی ممتا کی کشمکش کا دردناک منظر دیکھا۔ بچیوں پر دکھ اور شفقت کی نگاہ ڈالی سر پر ہاتھ پھیرا اور خادمہ سے کہا۔ ان کو نہلا کر کپڑے پہنا دو۔ اور پھر منابی نے ان کو ماں کا پیار دیا۔ دونوں کی پرورش ماں کی طرح کی۔ ایک کا نام مہتابی رکھا اور دوسری کا نام مہتیابی۔

Qazi Court 7820 South Garnett Road
Broken Arrow, Oklahoma 74012 USA

دونوں بچیاں بڑی ہوئیں تو ان سے منابی نے پوچھا کہ تم دونوں دوسرے مذہب کو ماننے والی ماں کی بیٹی ہو میں نے بیٹیوں کی طرح تمہاری پرورش کی ہے اب تم صاحب اختیار ہو، چاہو تو اپنی ماں کے مذہب پر رہو، میں تمہاری شادیاں اسی مذہبی گھرانے میں کر دوں گی۔ لیکن وہ دونوں ان کی بیٹیاں بن کر رہنے میں خوش رہیں تو منابی نے دونوں کی شادیاں کر دیں۔ دونوں اپنی اپنی سسرال چلی گئیں۔ بہت دنوں بعد مہتابی کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو وہ پھر منابی کے گھر چلی آئی۔ اور جب منابی کی لڑکی امت خاتون کی شادی حکیم سید رحمت حسین سے ہوئی تو مہتابی بھی جہیز میں امت خاتون کے ساتھ سکچی گاؤں میں امت خاتون کے سسرال آگئی۔ مہتابی نے بہت خواہش اور محنت سے نماز پڑھنا سیکھ لیا اور نمازی بن گئی۔ جب امت خاتون کی بچی پیدا ہوئی تو میری والدہ طیبہ خاتون کی آیا بن کر پرورش میں مصروف ہو گئیں۔

تقریباً ایک نسل گزر گئی یہ ۱۹۴۶ء کا زمانہ ہے۔ بہار کے اکثر حصوں میں فسادات کی خون ریزیاں ہو رہی ہیں۔ طیبہ خاتون کا گاؤں سکچی ایک چھوٹا سا گاؤں، جس میں صرف ۷۰ گھر ہیں۔ بیس گھر اقلیت کے اور پچاس اکثریت کے خاندان کے ساتھ امن، آشتی اور محبت کی زندگی گزار رہا ہے۔ فرقہ وارانہ واقعات سے بچنے کے لئے قریب کے گاؤں والوں اور اپنے گاؤں والوں کے ساتھ سبھی نے مل کر امن سبھا کی تشکیل کی۔ طیبہ خاتون کے والد حکیم سید رحمت حسین صاحب امن سبھا کے صدر چنے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی حفاظت کا عہد و پیمان کرتے ہیں۔ ۸ بقر عید کو گاؤں کا نائی "ننو" حکیم صاحب کے مکان پر آتا ہے اور یہ خبر سناتا ہے کہ کل ۹ بقر عید کو تمام مسلمانوں کو امن سبھا کے نام پر جمع کیا جائے گا اور پھر اسی مقام پر ان کو شہید کر دیا جائے گا۔

حکیم صاحب نے سکچی گاؤں کے دو پہلوان مانگو ماہتوں اور گندوزی کو بلایا اور فسادات کے گاؤں تک پہنچنے کے خطرہ کا اظہار کیا۔ ان دونوں نے کہا کہ مالک اور رعیت کا رشتہ باپ اور بیٹے کا ہوتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا جس وقت فسادیوں کا مجمع گاؤں تک پہنچ جائے گا کیا یہ رشتہ اس وقت بھی باقی رہے گا۔ دونوں نے کہا باقی رہے گا۔ حکیم صاحب نے مطمئن ہو کر انہیں رخصت کر دیا۔

بہار کے بہت سے مقامات پر آگ اور خون کی بارش ہو رہی تھی۔ قریب بھی جھونکے آرہے تھے۔ بری بری خبریں آرہی تھیں۔ اسی دوران مہابیر ماہتوں حکیم صاحب کے گھر آئے۔ بولے حکیم صاحب، جب فسادیوں کا مجمع آجائے گا تو ہمارے دل بدلے جا سکتے ہیں۔ ہمارے دلوں میں بھی دوسرے لوگ دشمنی کو بھڑکا سکتے ہیں۔ آپ لوگ اس گاؤں سے کسی دوسرے محفوظ مقام پر روانہ ہو جائیں سبھی لوگ سوچ و فکر میں تھے خواتین بچے، ایسی خواتین جو کبھی برقعے میں بھی دن میں باہر نہیں نکلی تھیں۔ ڈولی اور کہار کا انتظام کیسے کیا جائے۔ اسی سوچ و فکر میں پوری رات گزر گئی فجر کی نماز کے بعد سجدے سے جب حکیم صاحب اٹھے تو دیکھا کہ ایک شخص اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک نالی بندوق لئے گھوڑے پر سوار ہے۔ اس شخص نے حکیم صاحب کو سلام کیا اور کہا حالات بہت خراب ہیں۔ فسادیوں کا مجمع بالکل قریب ہے۔ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ آیا ہوں تا کہ آپ لوگوں کو محفوظ مقام پر پہنچا دوں۔ وقت

بالکل نہیں ہے آپ لوگ اسی حالت میں جانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ چودہ افراد کا قافلہ سکھی سے روانہ ہوتا ہے۔ جس میں طیبہ خاتون والدہ طیبہ خاتون اور مہتابی بھی شامل ہیں یہ طیبہ خاتون کا پہلا سفر ہجرت ہے۔ اس قافلے میں شامل افراد کے اکثر رشتہ دار ایک ہفتہ پہلے ہی مختلف محفوظ مقامات پر روانہ ہو چکے تھے۔ خواتین جنہوں نے کبھی بھی باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ چادروں میں لپٹی چل رہی تھیں ندی کو پار کرتے ہی بیکھا پر گوالوں کے مجمع نے قافلہ کو روکا۔ لیکن گھوڑ سوار نوجوان بندوق تان کر کھڑا ہو گیا کہ پہلے ہم مریں گے تب قافلے والوں پر آنچ آئے گی۔ گوالے کچھ خوف زدہ، کچھ غصہ ہو کر بندوق دار نوجوان کو طعنہ دیتے ہیں کہ تو دھرم بھرشٹ ہو گیا ہے۔ قافلہ کیروا پہنچتا ہے۔ کیروا پٹھانوں کی بستی تھی، مقبول خان سرپنچ تھے انہوں نے بستی کے دو طرف خندق کھود دیا تھا۔ انہوں نے قافلہ کے افراد کو پناہ دی، حکیم رحمت حسین نے نوجوان اور ان کے ساتھیوں کا شکریہ ادا کیا، نوجوان نے اپنے چہرے سے نقاب اٹھایا اور کہا حکیم صاحب آپ نے مجھے پہچانا؟ میں پریاگی سنگھ ہوں۔ حکیم صاحب ہم نے کوئی احسان نہیں کیا یہ پرماتما کا احسان ہے۔ یاد کیجئے وہ بارش والی رات کے سیلاب آیا ہوا تھا، میں آپ کے گھر آیا آپ رات کے دو بجے گھوڑے پر میرے گھر آئے اور میرے اکلوتے بیٹے کا علاج کیا جو کہ ہیضہ کا شکار تھا۔ آپ نے دوا بھجوادی اور ایک پیسہ نہیں لیا۔ میرا بیٹا بچ گیا میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ یہ پرماتما کا احسان ہے ہم نے جو کام کیا ہے وہ آپ کے احسان کا بدلہ نہیں ہے بلکہ اب مجھے تھوڑا سا سکون ملے گا کہ کچھ اچھا کام کیا ہے۔ بقرعید کو سکھی بستی پر حملہ ہوا فسادی لوگ بہت ناراض تھے کہ بستی خالی تھی صرف دو خاندان رہ گیا تھا۔ چماری بھائی مع خاندان کے اور سامو بھائی تنہا رہ گئے تھے ان لوگوں نے جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن بستی والوں کو اس کا علم نہیں تھا، ۱۰ بقرعید کی دوپہر کو پاسی ستلا جو تاڑ کے درخت کے اوپر تھا اس نے سامو بھائی کو دیکھ لیا اور اس کی خبر فسادیوں کو پہنچادی انہوں نے چماری بھائی کے گھر والوں اور سامو بھائی کو پکڑ لیا موت کا رقص شروع ہوا اور بہت اذیت سے سات افراد کو قتل کر دیا گیا۔ چماری بھائی اور ان کے خاندان کو کنویں میں پھینک دیا اور سامو بھائی کو جلا ڈالا۔ مسجد اور گھروں کو آگ لگادی گئی۔

طیبہ خاتون اپنے شوہر قاضی سید محمد غفران اور بچوں کے ساتھ بستی اوگانواں میں آباد ہو جاتی ہیں۔ مہتابی بستی استھانواں میں امت خاتون کی ہمشیرہ کے ساتھ قیام کرتی ہیں، اوگانواں تقریباً ہر ہفتہ آتی جاتی رہتی ہیں۔ اسلام کے نام پر ایک نیا ملک بنتا ہے۔ زمین، ملک، تہذیب، محبت سب کا بٹوارہ ہو جاتا ہے۔ قاضی سید محمد غفران کے بڑے بھائی قاضی سید محمد عثمان جو اس وقت کلکتہ کے میئر تھے، نئے ملک کے لے روانہ ہو جاتے ہیں ایک روشن امید کے ساتھ۔

۱۹۵۹ء میں بڑے بھائی سید محمد عثمان کے اصرار پر سید محمد غفران نے نئے ملک کا دورہ کیا۔ مختلف شہروں میں قیام کرتے ہیں اور حیرت میں ڈوب جاتے ہیں ان کا تصور اسلامی اخوت اور انسانی ہمدردی کا ختم ہو جاتا ہے۔ صوبائی، لسانی عصبیت انتہا کو پاتے ہیں ان کی ہندوستان واپسی ہوتی ہے اور ایک مختصر ساخط جانے سے قبل اپنے عزیز بھائی کو رائیونڈ بھیج دیتے ہیں کہ ہمارا ہندستان دارالکفر ہونے کے باوجود آپ کے دارالسلام سے بہتر ہے۔ یہ قاضی غفران صاحب کا پہلا اور آخری سفر تھا اس اسلامی ملک کا۔ سید محمد غفران کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ طیبہ خاتون اہل خاندان کے بے حد اصرار پر نئے ملک کا سفر کرتی ہیں یہ ان کی دوسری ہجرت تھی، ساحلی شہر میں رہائش اختیار کرتی ہیں۔

یہ ۱۹۹۴ء کا واقعہ ہے صبح کی اذان سے پہلے شمالی شہر کے ایک محلہ کو پولیس اور رینجر نے حصار میں لے رکھا ہے۔ اعلان ہو رہا ہے کہ کوئی شخص باہر نہ نکلے، گھر کے دروازے کھول دیں اور کمروں کو کھلا رکھیں۔ طیبہ خاتون تہجد کی نماز ادا کر رہی ہے نماز ختم ہونے پر وہ پولیس والوں سے پوچھتی ہیں، تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔ جواب ملتا ہے، خاموش بیٹھی رہو۔ طیبہ خاتون کو جلال آگیا۔ میں کیوں بیٹھوں گی خاموشی سے، ہم نے کون سا جرم کیا ہے، ہم تمہارے ہم مذہب ہیں، انسان ہیں، تمہیں کیا حق پہنچتا ہے اور کس نے یہ حق دیا ہے کہ ہمیں مجرموں کے جیسا حکم دو، مجرموں جیسا سلوک کرو، ہمارے گھر میں ہی ہمیں حصار میں لے لو۔ گھر کے دوسرے افراد مصلحتاً خاموش ہیں۔ رینجر کے سپاہی غصے میں گھر کا سامان ادھر ادھر پھینک رہے ہوتے ہیں۔ اسلامی ملک کے ان مسلمان رینجر کے سپاہیوں کا سلوک اسی ملک کی شریف زادیوں کے ساتھ بالکل غیر انسانی اور غیر ایمانی تھا۔ طیبہ خاتون کے اسلامی اور انسانی شعور کو اس دورنگی سے سخت چوٹ لگی وہ تلملا کر رہ جاتی ہیں۔

۱۹۹۵ء کا واقعہ ہے طیبہ خاتون وضو کر رہی ہیں کہ دروازے کی گھنٹی بجتی ہے، پوچھتی ہیں کون؟ آواز آتی ہے آنٹی ہم لوگ مہاجرین کے نمائندہ ہیں اور چندہ لینے آئے ہیں--- کس بات کا چندہ--- آپ لوگوں کی حفاظت کا--- تم ہماری کیا حفاظت کرو گے۔ اللہ محافظ ہے۔ اب وہ لوگ دھمکیاں دینے لگے۔ طیبہ خاتون لوٹے کو ہاتھ میں لئے دروازہ کھولتی ہیں وہ حفاظتی نمائندے پستول لئے کھڑے ہیں۔ طیبہ خاتون کہتی ہیں کہ خبردار جو ایسی بات کی۔ جاؤ اپنی حفاظت کرو اور اللہ کے عذاب سے بچو تم لوگوں کا حشر برا ہونا ہے۔

ساحلی شہر میں بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ پولیس، رینجر، غنڈے ایک دوسرے کا قتل عام کر رہے ہیں کوئی بھی تو محفوظ نہیں ہے۔ طیبہ خاتون پریشان ہیں، دعائیں کرتیں ہیں، کہتی ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء سے بس فساد ہی فساد ہے۔ مذہب کے نام پر، زبان کے نام پر، صوبائی، علاقائی بنیاد پر ملک کو تقسیم کر دیا گیا۔ پھر کہتی ہیں کہ ملک، زمین تو تقسیم ہو نہیں سکتا یہ اللہ کی ملکیت ہے ملک تقسیم نہیں ہوتا ہے، خاندان تقسیم ہوتے ہیں، نفرتوں کا بیج بویا جاتا ہے، محبت اور خلوص کی دیواروں کی بنیادیں ڈھائی جاتی ہیں۔

بیٹا اور بیٹی کے اصرار پر امریکہ کا سفر کرتی ہیں۔ امریکہ پہنچتی ہیں، امریکہ کے شہر تلسا میں قیام ہوتا ہے، زمین سے مٹی اٹھاتی ہے، کہتی ہے کہ اللہ یہ ساری زمین اور ساری کائنات تیری ملکیت ہے، طبیعت خراب ہوتی ہے۔ اصرار ہے کہ مجھے ہندوستان یا ہجرت کے ملک لے چلو۔ جون ۱۹۹۷ء میں وہ اپنے نئے ملک میں آجاتی ہیں۔

رمضان کا مہینہ ہے طیبہ خاتون کا معمول تھا کہ فجر، ظہر اور عصر کی نماز کے بعد قرآن کی تلاوت کرتی ہیں۔ تلاوت کے بعد معنی ضرور پڑھتی ہیں۔ مہتابی بھی رمضان کے آنے سے پہلے جزدان صاف کرتی ہیں اور عصر کی نماز کے بعد قرآن کو انتہائی احترام کے ساتھ رحل پر رکھ کر قبلہ رخ ہو کر بیٹھ جاتی اور تلاوت شروع کرتی، ورق الٹتی اور سب ہی صفحات پر سورہ فاتحہ پڑھتی اور ورق الٹ دیتی، روزانہ کا یہی معمول تھا۔ اور اگر طیبہ خاتون ٹوکا

۱۵ر مضان کو ایک قرآن پڑھ چکی ہوتیں تو مہتابی بھی ایک قرآن ختم کر کے دوسرا شروع کر چکی ہوتیں۔

۱۶ر جنوری ۱۹۹۸ء۔ جمعہ کا دن ہے۔ آج کا دن یوم فاتحہ ہے۔ آج کا دن طیبہ خاتون کے لئے بہت اہتمام کا دن ہوتا ہے۔ صبح سے تیاری ہوتی ہے۔ صبح کی نماز کے بعد ہی جمعہ کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ قرآن کی تلاوت اور ترجمہ کے بعد فاتحہ پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جیسے جیسے طیبہ خاتون کی عمر گزرتی گئی جن لوگوں کے لئے فاتحہ پڑھتی تھی ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی---مہتابی نے بہت مشکلوں سے سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص یاد کیا تھا جو اس کی کل قرآنی کائنات میں جائداد تھی، نماز کی بڑی پابند لیکن پوری نماز میں صرف سورہ فاتحہ اور اخلاص ہی پڑھتی تھی۔ مہتابی کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہتی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد کوئی اس پر فاتحہ اور درود نہیں بھیجے گا، شوہر نہیں، بال بچے نہیں، ماں باپ کا علم نہیں، بچپن سے جوانی کی تنہائی، کچھ دنوں شوہر کی رفاقت پھر تنہائی، جوانی سے بڑھاپا آیا، بڑھاپا گزر رہا ہے مر جاؤں گی کون یاد کریں گے؟ کون فاتحہ پڑھے گا، اکثر کہتی کہ "مر گیا مردود فاتحہ نہ درود۔" ایک دن طیبہ خاتون نے مہتابی کو یقین دلایا کہ مہتابی تم تنہا نہیں ہو تم نے میری پرورش کی ہے میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہر ہفتہ تمہارے لئے فاتحہ پڑھوں گی۔

آج جمعہ کا دن ہے لمبی لسٹ ہے، سب کے لئے فرداً فرداً فاتحہ پڑھ رہی ہیں، دعائیں کر رہی ہیں۔ فاتحہ اور دعائیں ختم ہونے کا نام نہیں ہیں۔ زار وقطار رو رہی ہیں، لیکن رونے کی آواز نہیں آ رہی ہے۔ عشا کی نماز ختم کی جو بہت طویل ہوتی تھی، اس کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا، سینے میں درد محسوس ہوا اور درد بڑھتا گیا۔ ایک بجے رات کو ٹیکسی والے کو بلایا گیا کپڑے خود ہی تبدیل کئے اور خود ہی چلتی ہوئی ٹیکسی میں آئیں، ان کی بڑی لڑکی ذاکرہ بانو ساتھ ہیں۔ اصغر اسپتال جاتے وقت ٹیکسی کا پٹرول ختم ہو گیا۔ پٹرول لینے کے لئے گاڑی رکتی ہے۔ طیبہ خاتون کی آواز آتی ہے کہ گاڑی کو کہاں رکوا رہے ہو، دیر ہو رہی ہے۔ دس منٹ کے وقفہ کے بعد گاڑی روانہ ہو جاتی ہے۔ اصغر اسپتال میں گاڑی داخل ہوتی ہے۔ وہیل چیئر پر بٹھایا جاتا ہے۔ لفٹ میں وہیل چیئر رکھی جاتی ہے، درد میں کافی کمی ہے، سکون سا ہے، لفٹ آہستگی سے اوپر کی طرف روانہ ہے۔ لفٹ دوسری منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ آواز آتی ہے لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور گردن ایک طرف کو جھک جاتی ہے۔ لفٹ رک جاتی ہے، ڈاکٹر موجود ہے C.P R دیا جاتا ہے، بجلی سے جھٹکے دئے جاتے ہیں لیکن بالکل پرسکون ہے، چہرے پر نور ہی نور ہے۔ طیبہ خاتون آخری سفر پر روانہ ہو چکی ہیں جو سفر پہلی بار سلہٹ سے ۹ بقرعید کو شروع ہوا تھا، دوسرا سفر اپنے ملک سے نئے ملک ہوا تھا اور ۷ار جنوری ۱۹۹۸ء کو نئے ساحلی شہر سے ملک بقا کی طرف مکمل ہو رہا ہے، جہاں مہتابی بھی ہے جن پر فاتحہ پڑھنے کا وعدہ طیبہ خاتون نے کیا تھا۔ ان کے ساتھ وہ طویل فہرست بھی ہے جن ناموں پر وہ ہر جمعہ کو فاتحہ پڑھتی تھیں اور روتی تھیں اور اس ٹوٹی پھوٹی دنیا کا ماتم کرتی تھیں جو اپنی خوبی کھو چکی ہے اس پر بسنے والے انسانیت کھو چکے ہیں۔ محبت فراموش کر چکے ہیں، تعلق بھول چکے ہیں، رشتہ توڑ چکے ہیں۔ آج جس کے ساتھ بیٹھتے ہیں کل اس کو پہچانتے نہیں۔ اب طیبہ خاتون اس کشمکش سے نکل چکی ہیں دیکھئے دنیا کب اس کشمکش سے نکلتی ہے:

آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(اقبال)

افسر احمد

بنگلہ کہانی

انگریزی سے ترجمہ: حیدر جعفری سید

پناہ

وہ آئی اور دوبارہ پپیتا کے درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ درخت آنگن سے ایک قدم ہٹ کر چھت کے نیچے ایک نالی کے قریب تھا۔ اس سے متصل ایک لیموں کا پیڑ تھا۔ مرغیوں کا ایک جھنڈ گیلی زمین پر دانے چگ رہا تھا۔ چینگی پوٹے چوں چوں کر رہے تھے۔ ایک ملائم اندھیرے نے پپیتا کے پیڑ کو تیزی سے اپنے آپ میں لپیٹ لیا۔ باہری کمرے سے پہلے۔ پکے فرش پر تاریولن کی ایک چادر لٹکی ہوئی تھی۔ ادھر ادھر بانس گاڑ کر ایک باڑ سی بنادی گئی تھی۔ بھاری تاریولن سے ایک شامیانہ بنایا جارہا تھا۔ نیچے بیٹھنے کے لئے قالین بچھائے جارہے تھے۔ چار، چھ تکیے ان میں دو گاؤ تکیے۔ خوابگاہوں سے تمام چادریں اور تکیے باہر لے آئے گئے تھے۔ قاضی زین العابدین کے یہاں ایک محفل میلاد۔ کلکتہ سے ایک مولانا تشریف لارہے تھے۔ بہت سے لوگ آئیں گے۔ پکا آنگن ان سے بھر جائے گا۔ درود شریف بہ آواز بلند پڑھا جائے گا۔ پپیتے کی پتیوں میں ابھی یہیں نظر آنے والے جگنو اب آسمان کی جانب اڑ گئے تھے۔ آسمان اتنا بڑا اتنا اونچا۔ سات منزلوں والا آسمان۔ کوئی وہاں جا نہیں سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وہاں رہتے ہیں۔ اللہ ہر جگہ ہے اس کا گھر ہمارے دل میں بھی تو ہے۔

اندھیرا زیادہ گھنا اور زیادہ دبیز ہوگیا۔ صرف جگنو اس کی کالی تہوں کو کاٹ کر مختلف سمتوں میں اڑ رہے تھے۔ پپیتے اور لیموں کے درخت اندھیرے میں ڈوب گئے۔ کسی طرح فریدہ کا جسم بھی گم ہوگیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے کو پا نہیں سکتی۔ ایک لالٹین جلائی گئی۔ روشنی پھیل گئی۔ جگنو غائب ہوگئے۔

جب ایک لمبا سایہ چلا گیا، فریدہ نے دھیمی آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"فریدہ کیا تم ہو؟ میں راشد ہوں۔ میں نے تمہیں نہیں دیکھا" سایہ آیا۔

"تم زیادہ قریب کیوں آرہے ہو؟"

"تمہارا چہرہ دیکھنے کے لئے، کیا تم واقعی فریدہ ہو؟"

"دیکھنے کا یہی طریقہ ہے!"

"کیا تم مجھے ایک گلاس پانی دوگی؟"

"دفع ہو!"

ٹھیک اسی وقت مالک کی والدہ کو پکارتے ہوئے سنا جاسکتا تھا "فریدہ---فریدہ!"

فریدہ کے جیسے پر لگ گئے ہوں۔ وہ صرف کچن کے سامنے رکی۔ مالک کی والدہ نے اپنا کرتہ اتار دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو پنکھا جھل رہی تھیں۔ ان کا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔

سیاہ کائی کے داغ گورے گورے چہرے پر۔ اس نے اپنا بھاری بدن فرش پر دھم سے نیچے گر جانے دیا۔ اس کی کمر پر بندھی چاندی کی چینی لالٹین کی روشنی میں چمک رہی تھی "چھنال، تو مٹکنے چلی گئی تھی۔ یہاں میں نمٹنے کی کوشش کررہی ہوں۔ صرف سولہ سال کی ہے اور ابھی سے خون میں گرم لہریں اٹھنے لگی ہیں۔"

اب مالک کی ماں بک بک کرتی رہے گی۔ بار بار اسی انداز میں۔ فریدہ اپنے ہی سائے میں سمٹ گئی۔

بہت سے برتن صاف کرنے تھے۔ فریدہ ایک ایک برتن کو جھنجھنا کر ڈھیر لگاتی رہی۔ اس نے چولہے پر رکھے چاول کے برتن کے نیچے لکڑیاں ایک نئی ترتیب سے رکھیں۔ چھوٹا سا کیروسین لیمپ پاس ہی میں جل رہا تھا۔ اس نے دوسرا جلایا اور پچھلے دروازے سے باہر گئی۔ وہ شور کرتی ہوئی برتن مانجنے لگی، ساڑی کے ایک جھونکے نے لیمپ پر پانی ڈال دیا۔ جگنو دوبارہ واپس آگئے قاضی کی بیوی کی نقرئی چینی کی طرح چمکتے ہوئے۔ بیزار اور ناخوش فریدہ نے اچانک ایک جگنو ساڑی میں اس طرح باندھ لیا جیسے اشرفی ہو اور ساڑی کا پلو اپنے شانے پر اس طرح پھینکا جیسے اس میں چابیوں کا گچھا بندھا ہو۔ فریدہ گھر بھر کی خادمہ ہے اور کسی کی بیوی۔ ایسی عورت برتن بھی مانجتی ہے اور گھر کا کام کاج بھی کرتی ہے۔ مچھلی کی ایک نوکیلی ہڈی فریدہ کی انگلی میں چبھ رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے قلم پکڑ کر دستخط کرسکتی ہے۔ فریدہ خاتون۔ والد کا نام محمد یوسف علی۔ پتہ امراگری---- ہینڈ رائٹنگ کی مشق میں بار بار لکھا ہوا۔ درجہ سوئم میں دوسرے ماسٹر کی بینت اوپر گھومتی ہے۔ بانس کا قلم رگڑتا ہے انہیں رائٹنگ دکھانے کے لئے۔ نیچے وہ املا لکھتی ہے۔ ف ر ی د ہ --- خ ا ت و ن۔ ایک ایک حرف۔ وہ اپنے نام کا املا نہیں بھولی ہے۔ وہ اپنے والد کا نام، اپنا نام اور اپنا پتہ کسی غلطی کے بغیر گھسیٹ سکتی ہے۔ قاضی صاحب کی تیسری بیٹی نے 'شبینہ' کے بجائے 'شوبینہ' لکھا ہے۔

جب ہونے والے سسرالی رشتے دار اسے دیکھنے آئے تھے۔ صرف 'و' کا فرق تھا لیکن کیسی غلطی تھی۔

کریا، نائنان، ہوڑہ (مغربی بنگال)

معرفت صدف۔ ۱۵۳/۸۸۔ چمن گنج، کانپور۔ ۲۰۸۰۰۱

اس سے کوئی بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس کی شادی کہیں اور ہوئی۔

وہ کسی دور دراز ملک سے فریدہ کو دیکھنے آئیں گے۔ وہ اپنی رائٹنگ کی نمائش کے دوران کوئی غلطی نہیں کر سکتی۔ شادی کے بعد جب سسرالی رشتے دار دلہن کی منہ دکھائی کریں تو اسے اپنی آنکھیں بند رکھنی چاہئیں۔ یہ بری بات ہے کہ کوئی اسے ہنسا دے، کھانا پکانا کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اس نے بنیان بننا، بانس کی چھوٹی بڑی ٹوکریاں بنانا بہت پہلے سیکھ لیا تھا۔ اگر اس کے پاس اون ہوتا تو وہ سویٹر بننا بھی سیکھ سکتی تھی۔ یہ آسان ہے۔ ایک لو، ایک چھوڑو۔ فرض کرو جب وہ آئیں تو پوچھیں وہ پہلے سے جواب تیار رکھے گی۔ اگر وہ کہیں چہرے پر گومڑ---'عب' کان کے لئے ہیرا۔ 'ڈل' ماں کہتی۔ میں کہا---خا---والد کہتے ہیں لکھو---لق۔ یہ پہیلی زبانی ہے۔ عبدالخالق۔ فرض کرو دولہا کا نام عبدالخالق ہے؟

زین العابدین قاضی کے سب سے بڑے لڑکے کا نام قاضی عبدالمالک ہے بالکل ایک جیسے خالق، مالک 'خ' کی جگہ 'م' اور 'ق' کی جگہ 'ک' اور 'ک' کی جگہ 'ق'۔ فریدہ نے یہ نام اس کے رومال پر سونے کی نوک والی سوئی سے کاڑھا تھا۔ مان لو دولہا 'مالک' کی طرح دکھائی دے۔ بکواس، سب جھوٹ۔ کیا کوئی کبھی کسی دوسرے کی طرح نظر آتا ہے؟

اس نے اپنی بائیں ہتھیلی پر مہندی سے چاند اور ستارے کا نشان بنالیا تھا۔ ہوسکتا ہے مہندی کا رنگ اڑنے سے پہلے شادی کی تاریخ طے ہو جائے۔ ہر وہ کام جو وہ کرتی تھی اس کے پس پشت یہی خواہش ہوتی تھی۔ اس نے کسی کو بتایا نہیں تھا۔

اماں کہتی ہیں کہ اپنی سسرال میں کبھی زور سے نہ بولنا۔ ایک عورت کی آواز کسی دوسرے کمرے میں سنائی نہیں دینی چاہئے۔

وہ زور سے بولتی ہے اس لئے تنبیہ۔ وہ دوسرے لوگوں کا خیال کم نہیں رکھ سکتی۔ کوئی اسے رکھتا نہیں ہے۔ وہ صرف اس لئے کھاتی ہے کہ وہ محنت سے کام کرتی ہے۔

فریدہ کے سامنے ایک کنکری آکر گری..... پانی میں ایک آواز آئی لہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پانی نے اس کے چہرے اور آنکھوں کو بھگو دیا۔ بجلی کی روشنی سے اس کی آنکھیں چوندھیا گئیں "ارے تم احمق!"

روشنی اس کی آنکھوں کے پاس حرکت کرنے لگی۔ درختوں کے سائے جھولنے لگے۔ پرچھائیوں کو پھاڑ کر روشنی کی کرنوں نے اپنا نشانہ فریدہ کی آنکھوں میں تلاش کرلیا، روشنی بار بار آتی رہی اس سے فریدہ لرزنے لگی۔ اس کے سینے پر گھونسے لگنے لگے۔ روشنی سمٹنے لگی۔ اب اور قریب۔ مختصر اور مختصر۔ روشنی اس کے بہت قریب آکر رک گئی۔

"کیا، برتن دھل گئے؟"

"مالک بھائی؟"

"ہاں، مہمان آگئے ہیں۔ تمہیں دیر ہوگئی اس لئے اماں نے تمہیں بلانے بھیجا ہے۔"

"میں نے کام ابھی ابھی ختم کیا ہے" فریدہ نے برتن اکٹھا کئے "کیا مولانا کلکتہ سے آگئے ہیں؟"

"ہاں مٹیا برج سے۔"

مالک کی روشنی گھومتی رہی۔ فریدہ آگے بڑھی۔ مالک اس کے پیچھے چلا۔ مالک پھسل کر فریدہ سے ٹکرا گیا۔

"آپ کے چوٹ تو نہیں لگی مالک بھائی؟"

"نہیں"۔

"تو ہم چلیں؟"

روشنی کی طرح فریدہ کا دماغ بھی مختلف سمتوں میں دوڑ رہا تھا۔

مالک نے امتحان پاس کرلیا تھا۔ وہ ایک اچھے گھر میں شادی کرے گا۔ یہ کوئی جرم نہیں ہے اگر وہ تمہارے اوپر گر جائے اگر وہ خود لڑکھڑا جاتی تو کوئی جرم نہ ہوتا۔ ایک ارتعاش جیسے کوئی تار چھو جائے۔ فریدہ کا خود کو تار میں بدل دینا۔ وہ ایک قسم کی بزدلی محسوس کرتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ جھپٹ، لیک جیسے کہ بجلی، روشنی۔

قاضی کی بیوی چکی پیس رہی تھی۔ چاندی کی پینی روشنی میں چمک رہی تھی۔

"ہمارے مہمان مولانا آگئے ہیں۔ تم تلیا پر کیا کر رہی تھیں۔ انہیں پان شربت پیش کرنا ہوگا۔"

فریدہ شربت بنانے کے لئے اندر لپکی۔ مولانا کی گلوری اور شربت خصوصی تھے۔ اس نے ایک تھالی میں ایک گلاس سادہ پانی اور ایک میں رنگین شربت زعفرانی رکھا اور بانس کے خوان پوش سے ڈھکا۔

"خالہ---!"

وہ قاضی کی بیوی کو خالہ کہتی تھی "خالہ، شربت تیار ہے۔"

"مالک، مالک---! اب مالک کہاں غائب ہو گیا— تم ہی جاکر پیش کرو۔"

فریدہ گلاس لے کر باہری کمرے میں پہنچی--- وہاں روشنی تھی۔ وہ مولانا کے پاس جانے سے ڈرتی تھی اگر مالک نظر آجاتا تو گلاس اس کے حوالے کرتی۔ وہ دروازے کی دہلیز کے پاس رک گئی لیکن مالک نظر نہیں آیا۔ وہ سہم گئی۔ وہ دوسری لالٹین جلا کر باہر پکی جگہ پر قالین احتیاط سے بچھا رہے تھے۔ وہاں کافی لوگ تھے۔ وہ مولانا کے بیٹھنے کے لئے مسند بچھا رہے تھے چھ تکیے، دو گاؤ تکیے، اس نے کپکپاتے دل سے اندر جھانکا۔ مولانا بستر پر اکیلے بیٹھے تھے۔ وہ ہمت کرتی ہوئی اندر گئی۔ باہر دو لالٹین جل رہی تھیں۔ دو، تین، چار، چھ تکیے---دو گاؤ تکیے۔ دوبارہ وہی احساس۔ جیسے کہ مالک کی ٹارچ کی روشنی فریدہ کے جسم پر گھوم رہی ہو۔ مالک کا جسم فریدہ کے بدن پر گر رہا ہو۔ اس کا بدن تار کا ارتعاش ہے۔ فریدہ کا تمام بدن کانپ رہا ہے وہ جگنو جو اس کی ساڑی کے پلو میں بندھا تھا لگتا ہے اب اس کی آنکھوں میں دھڑک رہا ہے۔ ایک لمس کافی ہے ارتعاش کے لئے۔

فریدہ کانپتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ راشد آکر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"فریدہ جانتی ہو کہ میں نے اپنی بیوی کو اس کے میکے واپس بھیج دیا ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟"

"پھر؟"

"ہاں، پھر؟"

فریدہ نے مولانا کے گلاس کا بچا ہوا پانی راشد کے منہ پر چھلکا دیا اور کچن واپس لوٹ گئی۔ وہ غصے میں کھول رہی تھی۔ کچن میں چکر لگاتی ہوئی وہ چیزوں کو بس یوں ہی چھوتی رہی۔

وہ مولانا کے لئے لذیذ پراٹھے پکانے لگی۔ وہ پسینے سے نہا رہی تھی۔ پسینے کے قطروں نے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا تھا اس نے انڈے اور آلو تلے۔

زین الدین قاضی اندر زنانخانے میں آئے۔ شادی سے متعلقہ رشتے دار خواتین بھی اندر آئیں۔

مالک کی والدہ بھی چمن چھوڑ کر ان کے پاس آ گئی۔ وہ گلے ملیں اور ایک دوسرے کے بوسے لئے۔

قاضی جی دہاڑے۔ "فریدہ!"

اسے لگا کہ اسے اب زیادہ پسینہ آ رہا ہے "جی، کیا ہے؟"

"مجھے ایک گلاس پانی دو۔"

قاضی کی بیوی مہمانوں سے بجائے اپنے شوہر کو پنکھا جھل رہی تھی۔

"مولانا صاحب تشریف لائے؟" قاضی جی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بس تھوڑی دیر میں۔"

"کیا نہیں پان شربت پیش کیا؟"

"بیشک!"

"ناشتہ وغیرہ؟"

"فرائی انڈے اور آلو بھرے پراٹھے بنا رہی ہوں۔"

فریدہ زین الدین قاضی کے لئے ایک گلاس پانی لے آئی تھی۔ قاضی صاحب اپنی ریش دراز میں خلال کر رہے تھے۔ دریں اثنا انڈے چھن چھن کرنے لگے تھے۔ قاضی جی نے اطمینان سے پانی پیا۔ فریدہ کھانے کا انتظام کرنے اندر چلی گئی۔

قاضی صاحب چلائے "مالک، مالک! مالک کہاں ہے؟"

مالک دوڑتا ہوا آیا "کیا بات ہے ابو؟"

"مولانا انتظار کر رہے ہیں اور تم نے ناشتہ پیش نہیں کیا ابھی تک۔ تم ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ تمہیں کیسی تربیت دی گئی ہے۔ اگر مولانا قاضی کے گھر میں ناراض ہو گئے تو یہ کوئی قابل فخر بات نہ ہوگی۔"

مالک کچن میں بھیگی بلی بن کر داخل ہوا۔ فریدہ نے اسے مولانا کے لئے کھانا دیا۔ کپڑے کا ایک ٹکڑا سر پر رکھ کر مالک باہر گیا۔

فریدہ چولہے میں جلتی ہوئی لکڑیوں کے ساتھ اضطراری حرکتیں کرتی رہی۔

مختلف فرمائشیں پوری کرتی ہوئی اور مختلف کھانے پکاتی ہوئی فریدہ کی سانس پھول گئی تھی۔ چولہے کی آنچ مسامات کے ذریعے اس کے جسم میں گھس رہی تھی۔ اس نے اپنے بال کھول دئے اس نے اپنے بدن کو ایک زاویے سے الگ کیا لیکن آنچ ہر طرف سے آ رہی تھی۔ تالاب میں ایک کنکر۔ مالک اس سے ٹکرایا۔ مولانا باہری کمرے میں ہیں۔ راشد بیوی کو علیحدگی کے لئے لکھ رہا ہے اور پھر...... ہاں پھر...... !

قاضی صاحب کے گھر میں آج محفل میلاد ہے، گاؤں کے لوگ اکٹھا ہو رہے ہیں۔ لڑکے، نوجوان، بوڑھے جوق در جوق آ رہے ہیں۔ عورتیں سیدھی زنانخانے میں آ رہی ہیں۔ قاضی جی کی بیوی پان سے ان کی خاطر مدارات کر رہی ہیں۔ محفل گرما رہی ہے۔

قاضی زین الدین موقع کے حساب سے ملبوس۔ سر پر ٹوپی۔ کان میں عطر کے پھوئے۔ آنکھوں میں سرمہ۔ عربی میں کچھ پڑھتے ہوئے پاس سے گزرے۔ ان کی چھڑی کی پراعتماد کھٹ کھٹ دیر تک سنائی دیتی رہی۔

ایک سیاہ بلی کچن میں ایک برتن پر جھپٹی۔ فریدہ چلائی "بچاؤ"--- وہ ڈر سے پلٹ گئی۔ ڈر، اتنا زیادہ ڈر۔ بھوت کا ڈر--- جنات کا ڈر، بدن کا ڈر کیونکہ بدن میں گناہوں کے ٹوکرے بھرے پڑے ہیں۔ بدن کو آزاد نہیں چھوڑ دینا چاہئے۔ یہ بد معاشی ہوگی۔ گناہ۔

محفل میلاد جم گئی تھی۔ مولانا تقریر کر رہے تھے۔ فریدہ کا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ کمرے میں اس نے لیمپ اوپر کیا تاکہ آئینے میں دیکھ سکے۔ وہ خوفزدہ سی لگ رہی تھی۔ اس کے بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بالوں میں کنگھا کیا۔ اپنی پیشانی پر لال کم کم کی بندی لگائی اور اپنے کپڑے ٹھیک ٹھاک کئے۔

وہ پپیتا کے درخت کے پاس آئی جو آنگن کے پاس لگا تھا۔ لالٹینوں کی کچھ روشنی اس کے پاس آ رہی تھی۔ لیموں کا درخت ہوا میں ہل رہا تھا وہ آہستہ آہستہ روشنی کی لکیر پر بڑھتی گئی۔ مولانا طول بیانی سے کام لے رہے تھے۔ سارے متقی لوگ سر ڈھک کر بیٹھ گئے تھے۔

مالک کی والدہ اپنے رشتے داروں اور پڑوسیوں کے کمرے کے باہر چٹائی پر بیٹھ گئی تھیں ان کے سامنے ایک ساڑی بطور پردہ لٹکا دی گئی تھی تاکہ مولانا انہیں دیکھ نہ سکیں اور نہ وہ مولانا کو دیکھ سکیں لیکن وہ ان کا وعظ سن سکی تھیں۔ [illegible]

[illegible] کی [illegible] "[illegible] کہا" [illegible] ہے؟"

[illegible] کی [illegible] کی کوئی دلہن دیکھو، وہ خوبصورت ہونی چاہئے۔"

"بہن، تم خوبصورتی کا بھلا کیا کروگی۔ [illegible] سیرت اچھی ہونی چاہئے۔"

خورشید کی اماں نے پان کی پیک منہ میں روکنے کی کوشش کرتے ہوئے سادگی سے کہا "جوہر کی بہن کل اسے چھوڑ کر چلی گئی۔"

مالک کی اماں نے کہا "کسے بھاگی میں نے تو نہیں۔"

"ارے اس میں کوئی نئی بات نہیں مولا پارہ نے جوڑے کے ہنگامے پرانی کہانی ہیں۔ جوہر اپنی بیوی کی پسند کا نہیں تھا۔ اس غیر شادی شدہ ہارون کے ایسے لچھن......!"

"توبہ، توبہ" مالک کی والدہ نے اپنے گالوں پر چپت لگائے۔ "اس عورت کو بھاری مرد چاہئے۔ ایک دن اس کی جوہر سے ملاقات ہوگئی۔"

"اس نے کچھ نہیں کیا؟" جمال کی اماں نے پوچھا۔

"وہ زنانہ کیا کر سکتا ہے! میرا خیال ہے کہ جورو کے پیچھے ممیاتا ہوا چلا آیا ہوگا۔ وہ کہتی ہے کہ اٹھو تو کھڑا ہو جاتا ہے وہ کہتی ہے کہ بیٹھو تو بیٹھ جاتا ہے۔"

"توبہ، توبہ! اور یہ ہارون کیسا مرد ہے کسی دوسرے کی بیوی کے پیچھے پڑا ہے۔"

"ہارون تو ایک کہانی ہے، پچھلی بار دو سو کا جرمانہ، ناک دھول میں رگڑی، جوتے سر پر رکھے اور اس کے باوجود پھر وہی حرکت......"

مالک کی اماں کے ایررنگ نرمی سے ہل رہے تھے۔ وہ ناک میں ہیرے کی کیل اور چاندی کے بازوبند پہنے تھی۔ ایک دوسری گلوری منہ میں ڈال کر اسے چباتے ہوئے بولی۔ اس کے نتھنے خود اعتمادی سے پھول رہے تھے۔ "مالک سے زیادہ سنجیدہ لڑکا کوئی اور نہیں ہے۔ کبھی گھوم کر عورت کو نہیں دیکھتا، ہمیشہ یہ ہی کہتا ہے کہ خاندان کی عزت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اس

کے نانا اتنے معزز تھے کہ لوگ دور دور سے ان کے پاس فیصلے کرانے آیا کرتے تھے۔ مالک بھی اپنے والد کے آگے نہیں بولتا۔ اس کے والد نے کہا ہے کہ بیٹے پانچ وقت نماز پڑھو۔ اس دن سے بچہ نماز یا روزہ نہیں بھولتا ہے۔ اگر اس کے والد نے اسے حکم عدولی کرتے دیکھ لیا تو اسے زندہ دفن کر دیں گے۔"

"سچ ہے، سچ ہے آج کے نوجوان مالک کے والد سامنے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکیں گے۔ ان کا پیشاب نکل جائے گا۔" جمال کی ماں کو مکمل اتفاق تھا۔

اس دوران مولانا جوشیلی تقریر کر رہے تھے، دو گاؤ تکیے دائیں طرف اور ایک تکیہ کہنی کے نیچے، ان باتی.... چار چھ تکیے۔ تاریولن کے فریم سے جو پائیوں سے بنا تھا دونوں طرف ایک ایک لالٹین لٹکی تھی۔ کیڑوں کے جھنڈ جھاڑیوں کے نیچے سے نکل کر مجمع پر پھیل رہے تھے۔ ہر بار جب مولانا کا ترنم ساتویں سر میں پہنچتا ان کی سیدھی ہتھیلی بائیں کان کی جانب اٹھتی۔ ان کے بائیں گال پر براؤن رنگ کا مسہ تھا۔ ان کی سیاہ رنگ کی داڑھی پر مہندی اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ ان کے لمبے نیلے کرتے کی آستین پر ایک کڑھا ہوا سفید دوپٹہ تھا۔ آنکھوں میں سرمہ لگا ہوا تھا۔ وہ دلکش انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ وہ مقدس کتابوں سے دل کھول کر حوالے دے رہے تھے اور سامعین سے اصرار کر رہے تھے کہ وہ صراط مستقیم پر چلنے کے لئے ان اصولوں کی پابندی کریں۔

گلاب چھڑکا گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے گلاب پاشی کی جا رہی تھی۔ تب لڑکے ایک دوسرے پر گرنے لگتے۔ ہر بار جب سامعین اونگھنے لگتے تو مولانا اجتماعی طور پر درود شریف پڑھنے کی دعوت دیتے۔

اللھم صل علیٰ سیدنا......

ٹارچ کی بندھی ہوئی روشنی فریدہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ کمر دیوار سے لگا کر نیچے کو سرک گئی۔ روشنی اس کی آنکھ پر گر رہی تھی۔ متلاشی کرن تلاش کرتے ہوئے دائروں میں پہنچ رہی تھی --- جامن کا درخت، کیلے کے پیڑوں کا جھنڈ اور پھر اس طرف۔ لگتا تھا جیسے روشنی اپنے سامنے ایک احتیاج کو ڈھکیل رہی تھی۔ اچانک فریدہ نے محسوس کیا کہ وہ ایک دھاگے سے لٹکی ہوئی ہے خواہش اور اجتناب کے درمیان، ترغیب اور دہشت کے بیچ۔ رگڑ سے چنگاری پکڑ رہی تھی، کون آتا ہے؟ کون ہے؟ مالک بھائی۔ ڈھونڈتی ہوئی، تلاش کرتی ہوئی روشنی --- مالک بھائی کے ہاتھ سے آتی روشنی کی گھومتی آنکھ اس کے بدن میں جذباتی طوفان پیدا کر رہی تھی۔ فریدہ ادھر ادھر جھول رہی ہے۔ اس کی ساڑی نیچے کو سرسراتی معلوم ہوتی ہے۔ خون میں ایک کارنیوال، رقص، دل میں ایک دیوانہ وار گہری کھوج۔ روشنی کی کرن کی رفتار دم بخود کر دینے والی تھی۔ فریدہ اب اس کے حصار میں تھی۔

"کیا مالک بھائی ہیں؟"

"ہاں۔ میں تم ہی کو تلاش کر رہا تھا۔"

"کیوں؟"

"بس یوں ہی۔"

"کیوں؟"

"بس دیکھ رہا تھا۔ او کے۔ مجھے ماچس دو۔"

فریدہ دل ہی دل میں ہنس پڑی، کیا مالک بھائی بس اتنا ہی کہنے کے لئے آئے تھے؟ اور اس کا دل لرز گیا تھا۔ کیا یہ ہی سب کچھ تھا؟ اور کیا ہو سکتا تھا؟ کچھ نہیں بلاشبہ کچھ بھی نہیں۔ وہ اس کے علاوہ کچھ اور فریدہ سے نہیں کہہ سکتا تھا.... ایک لڑکی کی --- ایک عورت کی زندگی؟ اندرونی ہنسی کے ایک دور کے بعد فریدہ دوڑی۔ جب وہ کچن کی طرف دوڑی تو اس کی کھنکتی ہوئی ساڑی نے تاریکی میں سے ایک آواز نکالی بے تکلف سرگوشیوں کی اور خاموش ہنسی کی۔ وہ لوٹی ساڑی کے پلو کو اس کی جگہ پر رکھتی ہوئی۔ مالک بھائی نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ "تو تم ہو دولت مند شخص کے داماد۔"

مالک نے دیا سلائی رگڑ کے بیڑی جلائی۔ "اماں نہیں سیکھ سکتیں۔"

"خالہ اپنی رشتے دار خواتین کے ساتھ لطف اندوز ہو رہی ہیں۔"

"اس لئے وہ نہیں دیکھ سکتیں۔"

"نہیں، نہیں۔"

مولانا وعظ فرما رہے تھے۔ "بھائیو، ہم اسلام کے راستے پر نہیں چل رہے ہیں۔ ہم اپنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ بھول گئے ہیں۔ ہم رزق حلال نہیں بلکہ رزق حرام کھاتے ہیں۔ ہم بے ایمان ہو گئے ہیں۔ دھوکہ، ظلم، بے روک ٹوک جنسی تعلقات ہم میں عام ہیں۔ روز جزا کے بعد ایسے گناہ گار انسانوں کو دوزخ کی آگ میں جلنا ہوگا۔"

"مالک بھائی، نہیں، یہ کچھ نہیں ہے۔"

"کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"میں بھول چکی ہوں۔"

لگتا تھا کہ مالک ـــــ یا کر ہنس رہا تھا۔

فوراً ہی باہر کی کمرے میں مولانا کی مسکراہٹ فریدہ کے سینے کو گھلانے کے لئے آ گئی۔ تو یہ اچھے لوگ ہیں۔ مولانا اتنا زیادہ جانتے ہیں کہ انہیں برا نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے ہزاروں عربی کتابیں پڑھی ہیں۔ تم اتنے اہم انسان کے سامنے جا بھی نہیں سکتیں۔ بھری بھری داڑھی۔ آواز شیر جیسی، وہ کانپتی ہوئی دروازے پر گلاس لئے کھڑی تھی، مولانا کمرے میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے تھے۔ ایک مدھم سا لیمپ جل رہا تھا۔ گاؤ تکیے بچھائے جا رہے تھے دو چار چھ تکیے۔ دو گاؤ تکیے۔ فریدہ پان شربت لے کر داخل ہوئی سر تا پا کانپتی ہوئی۔ دانت کس کر بھینچے ہوئے، نتھنے پھڑکتے ہوئے۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" اس کی آواز گم ہو گئی تھی۔

"تم حسین لڑکی ہو، دلکش" وہ کپکپاہٹ میں تحلیل ہو گئی۔

"لاؤ ذرا تمہارا ہاتھ دیکھوں۔"

کیا یہ ہاتھ دیکھنے کا طریقہ تھا؟ کیا تھا؟ ... وہ بارعب شخص.... نہیں.... اسے چھوڑو.... او ہاں، وہ شخص بہت کچھ جانتا ہے، ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ میں کیسے پھنسایا جائے، وہ نہیں جانتی تھی۔ کیسے ایک گیلا سانپ جیسا ہاتھ برقی چنگاریاں چھوڑتا ہے جب یہ چھننے کے لئے گھومتا ہے۔

تو کیا ہوا اگر اس کے پیروں میں پازیب نہیں ہیں؟ اور اس کے ہاتھ میں چاندی کی چوڑیاں نہیں ہیں، ناک میں ہیرے کی کیل نہیں ہے؟ بدمعاش، بدمعاش، بدمعاش گناہ گناہ گناہ۔

نام فریدہ خاتون، والد کا نام یوسف علی۔ پتہ امرا گری --- وہ مجھے دیکھنے آئیں گے۔ ف ر ی د ہ خ ا ت و

ن۔ پھیلی عب چہرے پر ڈال ،کان میں والد کہتے ہیں
خا ...والدہ کہتی ہیں لق ...

"مالک بھائی۔"

"بتاؤ تو، تمہارے دل میں کیا ہے؟"

"میں بھول جاتی ہوں۔"

"مجھے بتاؤ۔"

"کتنی دیر ہو چکی ہے؟"

"ایک بجا ہے۔"

"کیا چاند اوپر نہ آئے گا۔"

"یہ سیٹ ہو چکا ہے۔"

"کیا میلاد جاری رہے گا؟"

"تمام رات۔"

مالک بیڑی کا کش لگاتا ہوا فریدہ کے اور قریب آیا۔ جسم اس طرح پگھلتا ہوا معلوم ہوا جیسے موم شعلوں میں۔

"مالک بھائی کیا یہ گناہ نہیں ہے؟" فریدہ نے سرگوشی کی۔

"حماقت، یہ سب جھوٹ ہے۔"

"لیکن مولانا کی تقریر؟"

مالک نے کس کر بیڑی کا کش کھینچا اور اس کا دھواں فریدہ کے منہ پر چھوڑ دیا پھر مالک کو ہم آغوش کر. فریدہ رات کے اندھیرے میں محبت کا مجسمہ بن گئی۔

اچانک ایک گڈ مڈ شور جلسہ گاہ سے سنائی دیا۔ مولانا کی آواز خاموش ہو گئی تھی۔ صرف پُر شور افراتفری۔

زین الدین قاضی گرجے "مالک، مالک!"

فریدہ ساکت کھڑی رہی۔ مالک پر سکون خاموشی سے نکل کر دوڑا۔

فریدہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی باہری کمرے کے کونے میں پہنچی --- پپیتا کے درخت کی پناہ گاہ کے پیچھے۔ وہ مولانا کو بستر طے کرتے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔

قاضی جی اپنی چھڑی کھٹ کھٹاتے ہوئے اندرونی کمرے میں داخل ہوئے۔ لمبے آدمی کا سر کچھ زیادہ لٹکے ہوئے ٹائل سے ٹکرا گیا۔ وہ غصے میں بڑبڑاتے ہوئے پکے فرش پر چڑھ آئے "یہ کس کی حرکت ہے؟"

ان کی بیوی نے ساڑی کا پلو اپنے سر پر رکھ لیا "کیا غلطی ہو گئی؟"

"ہماری عزت مٹی میں مل گئی۔ سب کچھ چلا گیا، مالک کی اماں۔"

"آپ یہ کیوں نہیں بتاتے کہ کیا غلط ہو گیا؟"

"تکیے میں ایک سوئی تھی مولانا کی چھاتی......"

فریدہ پپیتے کے پیڑ کے نیچے ساکت وصامت کھڑی تھی۔ اندھیرے میں کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن وہ اسے ڈھونڈ لیں گے۔ مجرم ہر حال میں تلاش کیا جانا چاہئے۔ اور پھر؟ اس نے بے خوفی اور انوکھی مسرت کی کیفیت میں کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن دن کے آخری حصے نے اسے سکڑا اور سمٹا ہوا بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ اندھیرے میں دوسری پکار کا انتظار کر رہی تھی اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر ایک دو تین گنتے ہوئے ...

☆☆☆

وفیات

علاقہ ملناڈ کے مشہور اردو شاعر اور افسانہ نگار جناب **انور خاں انور** بھدراوتی میں ۲۵ر فروری ۲۰۰۲ء کی رات میں مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ پانچ سال قبل ایک حادثے کے بعد روز بروز ان کی صحت گرتی گئی اور ادھر چند ماہ سے وہ بالکل مفلوج ہو چکے تھے۔ وہ ایک خوش فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ملناڈ کے ادبی حلقوں میں ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

پیلی بھیت کے بزرگ ترین شاعر **عبدالحفیظ نعیمی** ایڈوکیٹ ۹۲ سال کی عمر میں ۱۳ر فروری ۲۰۰۲ء کی شب میں اپنے مکان واقع محلہ فیل خانہ میں انتقال کر گئے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ گریجویشن بریلی کالج سے اور ایم۔ اے اردو مع امتحان وکالت ۱۹۳۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کیا۔ ان کی تصنیفات میں 'مرثیہ اندلس' (طویل نظم) اور تین شعری مجموعے 'محراب گل، روزنِ خواب' اور 'پس دیوار گل' شائع ہوئے۔ 'کوفتے' کے عنوان سے ایک مزاحیہ نثر کا کتابچہ بھی ہے۔ مرحوم آخری وقت تک 'بزم ادب پیلی بھیت' کے سرپرست رہے اور گزشتہ پچیس سال سے جدید شاعری کے رنگ سے بھی متاثر ہوئے۔ لیکن ان کے یہاں مومن، داغ، اور اقبال ہی کا طرز حاوی ہے۔ وہ رشید احمد صدیقی مرحوم کے شاگرد بھی تھے۔

۳ر فروری ۲۰۰۲ء کو اردو کے خادم مولوی **عبدالقیوم مسلم بالقرآن** کا ۵۹ سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے بدایوں میں اردو کی ترقی اور فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ اردو اخبار ورسائل کے ایجنٹ تھے اور اپنی سائیکل سے گھر گھر جا کر اردو کے اخبار اور رسالے سپلائی کیا کرتے تھے۔ ہندو بیرون ہند سے شائع ہونے والے زیادہ تر اردو اخبار ورسائل سے وہ وابستہ تھے۔ ان کا تعلق ادبی، علمی خاندان سے تھا۔ ان کے والد مولوی عبدالصمد مسلم بالقرآن تقریباً تیس مذہبی کتابوں کے مصنف تھے اور اپنے مذہبی عقیدے 'اہلِ قرآن' کے زبردست مبلغ۔ مولوی عبدالقیوم کی پیدائش بدایوں میں ۷ار ستمبر ۱۹۴۲ء کو ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے والد کی یاد میں ایک لائبریری 'صمد لائبریری' بھی قائم کی تھی جس میں ہزاروں کی تعداد میں اردو، ہندی، انگریزی، عربی اور فارسی کی کتب محفوظ ہیں۔

برطانیہ کے مشہور ترقی پسند شاعر اور انجمن ترقی اردو برطانیہ کے روح رواں نیز انجمن ترقی پسند مصنفین برطانیہ کے صدر جناب **بخش لائل پوری** کا ۵ اور ۶ر مارچ ۲۰۰۲ء کی درمیانی شب میں لندن کے ایک اسپتال میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ وہ اردو زبان وادب کی ترقی اور فروغ کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔

ادارہ مرحومین کے لئے مغفرت اور پسماندگان کے لئے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔

(ادارہ)

تبصرے

نام کتاب : سوامی اور دوست

مصنف : آر کے نارائن

قیمت : ۲۵؍روپے

ناشر : نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا۔ نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'سوامی اور دوست' کے مصنف آر کے نارائن (اصل نام: رشی پورم کرشن سوامی) ہیں۔ نارائن کے بیشتر ناولوں کا ترجمہ عبرانی سمیت تقریباً سبھی یوروپی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ سادہ و سلیس انداز بیان اور طنز و مزاح کی چاشنی سے آراستہ اسلوب کے پروردہ ان کے کرداروں نے ادب کے منظر نامہ پر ایسے لافانی نقوش چھوڑے ہیں جن کی اپیل آفاقی ہے۔

قومی اشاعتی ادارے نیشنل بک ٹرسٹ نے آر۔ کے نارائن کے پہلے ناول Swamy and friends کا اردو ترجمہ اپنے نہرو بال پستکالیہ سیریز کے تحت شائع کیا ہے۔ اس دلچسپ کتاب کے مترجم مشہور مزاح نگار دلیپ سنگھ ہیں جنھوں نے اپنے ترجمے میں مصنف کی فنکارانہ خوبیوں کو برقرار رکھا ہے۔ کتاب ترجمہ ہے لیکن ہمیں ترجمے کا احساس نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک طبع زاد تخلیق لگتی ہے۔ 'مالگوڈی ڈیز' ٹیلی ویژن کا ایک مقبول سیریل بھی رہا ہے جسے اردو اور ہندی والوں نے یکساں دلچسپی اور شوق سے انجوائے کیا ہے۔ اسی وجہ سے اردو ہندی حلقوں میں ان کا تعارف فلم گائیڈ اور ٹی وی سیریل 'مالگوڈی ڈیز' سے ہی ہوا ہے۔ سوامی اور دوست ایک بہت دلچسپ کتاب ہے اور اس میں سوامی اور اس کے دوستوں کی شرارتوں اور رویوں کو آر کے نارائن کے تصوراتی قصبہ مالگوڈی کے ماحول میں بڑی چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے۔ مالگوڈی مصنف کی ذہنی پیداوار ہے لیکن جیتا جاگتا قصبہ ہے جس میں سب ہی ذاتوں اور پیشوں کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں پنڈت بھی ہیں، اسکول ماسٹر بھی، سرکاری نوکر بھی ہیں اور پوسٹ ماسٹر بھی، لیکن سب ہی لوگ جذبات و احساسات سے مملو انسانی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جیتے ہیں۔ سوامی بھی ایک خیالی کردار ہے لیکن حقیقی لگتا ہے کیونکہ بچے اسی کی طرح اتاولے، شریر اور نٹ کھٹ ہوتے ہیں۔ بچے چین سے بیٹھنا جانتے ہی نہیں، وہ کہیں بھی کچھ بھی کر سکتے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ خود ان کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آر کے نارائن کی مالگوڈی کے دس سالہ سوامی ناتھن کی زندگی کا مطلب بھی کلاس ٹیچر، ہوم ورک، دوستی، کرکٹ میچ، دادی اور بہت کچھ ہے۔ نئے نئے تجربے کرنا اس کا شوق ہے اور اپنے دوسرے کارناموں میں وہ اتنا مگن ہو جاتا ہے کہ تعلیم سے بھی لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً اسے اسکول سے دوبار نکالا جاتا ہے اور ایک دن وہ خود بھی گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ آر کے نارائن نے اپنی مشاقی اور مہارت سے اپنے افسانوی شہر مالگوڈی کے افسانوی کرداروں کو زندہ جاوید کر دیا ہے۔ جنوبی ہند کے مقامی رنگ اور مقامی زندگی کی عکاس یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جو بچوں کو تو پسند آئے گی ہی بلکہ بڑے بھی اسے شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر نہ چھوڑ سکیں گے۔ اس میں تصویریں بھی ہیں۔ سرورق موضوع کے تعلق سے پرکشش ہے۔

نام کتاب : آخر کب تک

مصنف : اقبال نظامی

قیمت : ۱۲۰؍روپے

ناشر : تخلیق کار پبلشرز۔ بی۔ ۱۰۴، یاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی۔ ۱۱۰۰۹۲

'آخر کب تک' اقبال نظامی کا پہلا ناول ہے جس کی اشاعت میں بہار اردو اکیڈمی کا مالی تعاون شامل ہے۔ ناول بالکل روایتی انداز میں ہے اور اس میں وہ سب مسالہ بھرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک ہندی فلم کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اس ناول میں سب ہی انسانی جذبوں کی عکاسی ملتی ہے۔ یہاں محبت بھی ہے اور نفرت بھی، دوستی بھی ہے دشمنی بھی، امیری بھی ہے غریبی بھی، رسم و رواج بھی ہیں، فطری اور غیر فطری رویے بھی، غرض زندگی کے تقریباً سب ہی اتار چڑھاؤ کی عکاسی اقبال نظامی نے اپنی اس کاوش میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کا مرکزی خیال محبت ہے جس کی ابتدا کالج کی زندگی میں ہوتی ہے۔ طبقاتی فرق لڑکا اور لڑکی میں نمایاں ہے لیکن کیوپڈ اپنا تیر چلاتے وقت کوئی اونچ نیچ نہیں دیکھتا۔ اس ناول میں خوبی اور خامی مشترک ہے کہ اس میں مصنف نے انگریزی اقوال بار بار دئے ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ اس سے مصنف کی انگریزی زبان سے دلچسپی سامنے آتی ہے۔ خامی یہ ہے کہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف کو اپنی شخصیت اور اپنے اظہار خیال پر بھروسہ نہیں اور وہ اپنی بات کے استحکام کے لئے غیر زبان کے اقوال کا سہارا لیتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ناول نہ تو ایک مکمل فنی پیش کش ہے اور نہ اس میں ایسے مسائل یا مسئلہ کو برتا گیا ہے جس کی سماج میں اہمیت یا افادیت ہو لیکن اس کی پذیرائی اس لئے کی جا سکتی ہے کہ ہمارے سماج کے ایک فرد نے اپنی تخلیقی اپج کے اظہار کے لئے اس وسیلے کو چنا ہے اور اس میں اپنی زندگی کے پرتو میں اپنے ماحول اور سماج کی عکاسی کی ہے۔ کہیں کہیں زندگی، اس کے رویوں اور شخصیات سے متعلق بڑے کھلے ڈلے تبصرے بھی ہیں اور طنز و مزاح کی چاشنی بھی، لیکن اسلوب میں وہ روانی نہیں ہے جو محبت بھری کہانیوں کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ اس ناول کی ایک خوبی اس کے کرداروں کے نام ہیں جو خوبصورت، اور جاذب نظر شخصیات کو مجسم کرتے ہیں۔ اقبال نظامی نے اپنا تخلیقی سفر ابھی شروع کیا ہے اور یقیناً یہ بہتر سے بہتر کے لئے جاری رہے گا۔ امید کی جاتی ہے کہ ان کی اگلی کاوش ہر طرح سے قابل پذیرائی ہوگی۔ ڈمائی آکٹو سائز کے ۲۸۲ صفحات کا یہ ناول لیزر کمپوزنگ میں بہت صاف ستھرا شائع ہوا ہے جس میں کہیں کہیں پروف کی غلطیاں بدمزہ کرتی ہیں۔ سرورق تجریدی آرٹ کا عکاس ہے اور اس سوال کے لئے جواب طلب ہے کہ 'آخر کب تک' محبتیں طبقاتی رویوں کا نشانہ بنتی رہیں گی؟

انور کمال حسینی، نئی دہلی

نام کتاب: مکتوبات ساغر نظامی

مرتب : فیروز مظفر
قیمت : ۲۵۰روپے
پتہ : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

خطوط نگاری کو باضابطہ طور پر ادب میں بطور ادب کے مرزا غالب کے خطوط کے بعد تسلیم کیا گیا۔ ان سے پہلے بھی مشاہیر نے خطوط لکھے ہیں۔ بلکہ صوفیا کرام اور فقہا کے بہت سے خطوط موجود تھے مگر اردو ادب میں ان کی اہمیت نہیں تھی۔ مرزا غالب نے ایک دم سے پانسہ پلٹا اور اپنے خطوط کو اپنی زندگی ہی میں شائع کرا کے نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ اس کے بعد تو پھر گویا سلسلہ چل پڑا۔

زیر تبصرہ کتاب مشہور شاعر و صحافی و نغمہ نگار جناب ساغر نظامی کے خطوط پر مشتمل ہے۔ فیروز مظفر جو پیشے سے انجینئر ہیں، شعر و ادب کے ایک اچھے پارکھ بھی ہیں۔ انہوں نے بڑی دقت نظری اور نظم وضبط کے ساتھ ساغر نظامی کے خطوط کو جمع کر دیا ہے۔ خطوط شائع ہونا بظاہر کوئی بڑا ادبی کارنامہ نہیں، مگر اس میں بعض ایسے گوشے سامنے آجاتے ہیں جو عام طور سے عوام کی نظروں سے یا مداحوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ نجی زندگی کے بعض وہ پہلو جو شاعری یا ادب پارے میں کسی طرح نہیں آسکتے وہ خطوط میں کہیں نہ کہیں روشن ہو جاتے ہیں۔ فیروز صاحب نے اس کتاب میں ذاتی نوعیت کے خطوط کم شامل کئے ہیں۔ والد کے نام اور بھائی کے نام جو خطوط ہیں ان میں کچھ جھلکیاں ہیں۔ فیروز صاحب نے اس کتاب میں اس کی وضاحت کی ہے کہ ان کے خطوط جو انہوں نے اپنی اہلیہ کے نام لکھے تھے، وہ بھی محفوظ ہیں۔ البتہ انہوں نے اس کی ترتیب و تدوین سے اپنی معذوری کا اظہار کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کل ۱۰۸ خطوط شامل کئے ہیں۔

ساغر نظامی کی زبان بڑی شستہ اور پختہ ہے۔ انہیں مخاطب کی ذہنی سطح کا خوب خوب اندازہ ہے۔ جب وہ مولانا آزاد کو خط لکھتے ہیں تو اس طرح کی انشا پردازی کرتے ہیں:

''سیدی و مولائی، آداب و نیاز،
ہندوستان کی آزادی پر ہدیۂ تشکر قبول فرمائیے۔ غلامی کی زنجیروں پر جس نے ضربات پیہم لگائیں، وہ آپ ہی کی نوائے آہن گداز تھی۔ آزادی کا یہ تحفہ آپ ہی کا عطیہ ہے جس کے نقش و نگار سے آزادی کامل کا تبسم پھوٹا پڑتا ہے .....'' (صفحہ ۷۴)

آگے لکھتے ہیں:

''محروم زندگی میں ایک 'غبار خاطر' کا چراغ روشن ہے۔ جب تاریکی بڑھ جاتی ہے اس سراج تنہائی سے اکتساب نور کرتا ہوں۔ پھر اُجالے بن جاتے ہیں، زندگی میں اک نئی تاب مقاومت محسوس ہوتی ہے۔'' (صفحہ ۷۵)

اس میں ساغر نظامی کا دلکش اسلوب بھی ہے اور مولانا آزاد کے تئیں ان کے عقیدت مندانہ جذبات بھی۔

اور بھی کئی گوشے ہیں جن سے ساغر صاحب کی تاریخی و تہذیبی دلچسپیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ تقسیم وطن کے سخت مخالف تھے۔ مسٹر جناح کی پالیسی کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے مسلم لیگیوں کو بالکل پسند نہیں کیا ہے۔ کچھ خطوط پڑھ کے گرچہ انتہا پسندانہ نظریے کا بھی اندازہ ہوتا ہے مگر ان کی وابستگی کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ ایک خط پڑھ کر (کے آصف، پروڈیوسر مغل اعظم) معلوم ہوا کہ ساغر نظامی نے بھی مغل اعظم کے لئے تین گیت لکھے تھے۔ اس خط میں انہوں نے گیت کے پیسے مانگے تھے۔ حالانکہ فلم میں شکیل بدایونی کے گیت ہیں۔

فیروز مظفر نے ساغر نظامی کے خطوط شائع کرکے ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے اس میں بہت دلچسپی اور معلومات موجود ہیں۔ انہیں چاہئے کہ ان کے خطوط 'ذکیہ کے نام' (ان کی بیوی) بھی مرتب کرکے جلد شائع کر دیں۔ ان خطوط میں نجی زندگی کے گوشے پوری طرح روشن ہو جائیں گے۔ کتاب موڈرن پبلشنگ ہاؤس نے خوبصورت طبع کی ہے۔

کوثر مظہری، نئی دہلی

نام کتاب: جگر بسوانی: حیات اور کارنامے

مصنف : ڈاکٹر محمد صغیر عالم خاں (اجمل بسوانی)
قیمت : ۱۲۵روپے
ناشر : ادارہ تحقیق و تنقید، جامع مسجد بسوان، سیتاپور

زیر نظر کتاب جگر بسوانی اور اس کی حیات اور کارناموں پر اس تحقیقی مقالے کا احاطہ کرتی ہے جو اجمل بسوانی نے بنارس ہندو یونیورسٹی کے سورگیہ پروفیسر
حکم چند نیر کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا
لئے تحریر کیا ہے۔ ترتیب و تہذیب
پانچ ابواب پر مشتمل ہے جو مختصر اور جزوی
باب اول بیسویں صدی کے
حالات کے تعلق سے عام طور سے
سرگرمیوں اور خاص طور سے سیتاپور کے
کا احاطہ کرتا ہے۔
باب دوم حالات شخصیت اور شا
اسلاف، ولادت، تعلیم و تربیت، تجا
طباعت، بیماری اور موت کے علاوہ شخصیہ
آغاز تلمذ اور تلامذہ جیسے ضمنی موضوعات
مطالعہ فراہم کرتا ہے۔ باب سوم شاعری
حیثیت استاد سخن اور بہ حیثیت غزل گو
کے تحت، جگر کے کلام پر امیر مینائی کی اصلا
اصلاحیں تلامذہ کے کلام پر، ماحول اور معا
حوالے سے موصوف کے مطبوعہ اور غیر مطب
زیر بحث لاتا ہے۔ باب چہارم اپنی تفصیلات
اصناف سخن یعنی نظم نگاری، مثنوی، قطعات، ر
نعت، قصائد، تضمینات اور تاریخ گوئی کو اپنی گر
لیتا ہے۔ باب پنجم میں بہ حیثیت نثر نگار جگر کو
اسلوب نثر نگاری، ناول نویسی، افسانہ نگار
و تنقیدی مضامین اور مکاتیب کے ملے جلے آئینہ
میں منعکس کیا گیا ہے۔
کتابیات کی فہرست مصنف کی تحقیقی تہذ
وسعت مطالعہ کی مستحکم دلیل ہے۔ جہاں جہاں
کی شاعری، متفرق کلام کی خصوصیات، انفرادیت
میں فکر و نظر کی طرفگی کا ذکر خیر در آیا ہے اسے من
اشعار اور اقتباسات کے ذریعے سے واضح کیا گیا ہے۔
پر کتاب کا کچھ حصہ مخصوص کرنے سے اسے خواہ
بوجھل بنانے سے گریز کیا گیا ہے۔ اسلوب نگارش
اظہار کو رواں دواں رکھنے میں کامیاب ہے۔ کتاب
قابل مطالعہ ہے کیونکہ یہ ایک ایسے شاعر اور ادیب
منظر عام پر لاتی ہے جس کی طرف ارباب نقد و نظر کی تو
کم کی گئی ہے۔ ضخیم اور اچھی چھپائی میں رچی بسی یہ کتاب
سرکار کی طرف سے مالی امداد کو مد نظر رکھتے ہو
مناسب قیمت پر ہی وقف قارئین کی گئی ہے۔

رام پرکاش راہی، دہلی

نام کتاب :حرف دلنواز

شاعر : کمال جعفری

قیمت : ۱۴۵ر روپے

ناشر :ہارون رشید فردوسی، 114/A، مدن موہن برمن اسٹریٹ، کلکتہ۔۷

کمال جعفری کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آیا تھا، جس کی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔ 'حرف دلنواز' کمال جعفری کا دوسرا مجموعہ کلام ہے، جو حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، جن کی روشنی میں ... درد مندی، مذہبی و اخلاقی قدروں سے وابستگی اور ... کلاسیکی تشکیل کا بہ آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ... شار احمد فاروقی اور پروفیسر اعزاز افضل نے اپنی ... میں ان امور کی طرف اشارے کئے ہیں۔ لیکن ... خیال ہے کہ غزل گو شاعروں کی بھیڑ میں جو وصف ... جعفری کا نشان امتیاز ہے، وہ ان کا تعمیری اور اصلاحی ... نظر ہے۔ یہ نقطہ نظر کسی نظریاتی کمٹ منٹ کا نتیجہ ... بلکہ ان کی شخصیت کے وسیلے سے ان کی شاعری کے ... اتر آیا ہے۔ میں یہاں ان کی ابتدائی غزلوں کے ... چند اشعار پیش کرتا ہوں:

انا کو خاک میں اپنی ملا کے دیکھ ذرا
فنا کی شکل میں جلوے بقا کے دیکھ ذرا
شمار ہوگا ترا بھی فلک نشینوں میں
زمین والوں کو اپنا بنا کے دیکھ ذرا

خاکساری میں سربلندی ہے
اے زمیں ہم کو آسماں نہ کر
کبر کی جس میں ہو جھلک شامل
خود میں پیدا وہ آن بان نہ کر

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے دور حاضر کے ... میں یہ اوصاف نایاب ہوتے جارہے ہیں۔ مگر ... یہ ہے کہ اپنی شخصیت یا شاعری میں ان اعلیٰ ... کی موجودگی پہ کمال جعفری زیادہ نازاں نہیں ... تے۔ بزم احباب ہو یا انجمن غیر ہر جگہ خوش اخلاقی ... خاکساری سے کام لینا، دل آزاری کی کوئی بات نہ کہنا ... دل میں یہ احساس رکھنا کہ

اخلاق سے ملنا کوئی احسان نہیں ہے
... ہی کا کام ہے۔ اسی طرح خود ستائی کے اس دور میں یہ ... بھی کچھ آسان نہیں ہے:

وہ لوگ جن کو میں اکثر برا سمجھتا تھا
انہیں قریب سے دیکھا تو مجھ سے بہتر ہیں

کمال جعفری کے بارے میں اہم بات میرے خیال میں یہ ہے کہ ان کا لب ولہجہ براہ راست اور سیدھا سادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک بڑی ادبی جماعت شاعری میں ابہام پہ زور دیتے ہوئے 'برہنہ حرف نہ گفتن' کی قائل رہی ہے اور آج بھی ہے، مگر پچھلے چند برسوں کے دوران یہ محسوس کیا جانے لگا ہے کہ براہ راست مخاطبت کی اپنی افادیت اور تاثیر ہے۔ اس اعتبار سے کمال جعفری کی غزلیں دعوت فکر دیتی ہیں۔

مجموعی طور پر کمال جعفری کا پیش نظر مجموعہ کلام صوری و معنوی اعتبار سے نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ خوب سے خوب تر کی طرف، ان کے ادبی سفر کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔

اعجاز علی ارشد، پٹنہ

نام کتاب : من خوب می شناسم

شاعر : بازغ بہاری

قیمت : چھ ہزار پیسے

ناشر : بھارتی برادرز، ۱۴۵، بی چترنجن ایونیو، کلکتہ

طنز و مزاح کرب کی کوکھ سے جنم لیا کرتے ہیں۔ بقول دلاور فگار:

طنز ہے آتش الم کا شرار
اور ظرافت ہے غم کی پیداوار

'من خوب می شناسم' اسی تسلسل سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہے۔ جس میں بازغ بہاری کے گوناگوں تجربات کے تمام ٹھوس مادے موجود ہیں۔

ظریفانہ شاعری نہ صرف انسان کے مسکرانے کا سبب بنتی ہے بلکہ اس کی دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھ کر چپکے چپکے رلاتی بھی ہے اور اسے اصلاح کے حسین مواقع بھی فراہم کرتی ہے۔ بظاہر یہ فن جس قدر آسان نظر آتا ہے اسی قدر پُر آزمائش بھی ہے۔ کیونکہ اپنی خامیوں کو سامنے رکھ کر دوسروں کو آئینہ دکھانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس منزل سے وہی شخص گزر سکتا ہے جو خود کو نشانہ بنانے کی قدرت رکھتا ہو اور اپنے آپ پر قہقہہ لگانے کے فن سے بھی بخوبی واقف ہو۔

'من خوب می شناسم' اسی ہنر کاری کا خوبصورت مرقع ہے۔ جس میں مزاح نگار نے خود کلامی کی آڑ میں سماجی برائیوں اور سیاسی گندگیوں کی جانب بڑی چابکدستی کے ساتھ انگشت نمائی کی ہے۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

کالے دھن کا محل دیکھنا ہو اگر
آپ بازغ بہاری کا گھر دیکھئے

بازغ جو ایک جاہل مطلق تھا شہر میں
اللہ نے اسے بھی سخنور بنادیا

سکھ و ہندو اور مسلم کو لڑا کے ایک دن
ملک کا بازغ بہاری حکمراں ہو جائے گا

بڑھاپے کی رچنا، جوانی کا فوٹو
یہ بازغ بہاری سیانے بہت ہیں

فلاپ منچ پہ بازغ بھی ہوگیا آخر
تمام داد سخن ہے تو شاعرہ کے لئے

بازغ بہاری کی ظریفانہ شاعری زندگی کے رنج والم سے شکست اور فرار کا محرک نہیں بلکہ عزم و حوصلہ کا درس دیتی ہے۔ ان کا یہ شعر اسی بات کا غماز ہے:

میں نے مزاح و طنز کا گل قند چھوڑ کر
دنیائے رنج و غم کو انگوٹھا دکھادیا

خوبصورت طباعت سے آراستہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ لائق مطالعہ ہے۔ مجھے یقین ہے اسے دنیائے ادب میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

فراغ روہوی، کلکتہ

نام کتاب: دوماهی 'دستخط' رباعی نمبر

مرتب : فراغ روہوی

قیمت :۵۰ر روپے

پتہ : آؤٹ پوسٹ روڈ، نئی بستی، بارک پور، ۲۴ پرگنہ (نارتھ) ۷۴۳۱۰۱ (مغربی بنگال)

رباعی ہر اعتبار سے محظوظ کرنے والی صنف سخن ہے خواہ سامع یا قاری ہو یا تخلیق کار۔ دوماہی دستخط کا رباعی نمبر پیش نظر ہے جس میں ایک سو گیارہ شعرا مع رباعیوں اور مختصر تعارف شامل ہیں۔ گیارہ مضامین رباعی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بھی دئے گئے ہیں۔

ایک دو کے علاوہ ہر مضمون کا آغاز رباعی کے فن کی بحث سے شروع ہوا ہے حالانکہ مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فن پر سب نے تفصیل سے لکھا ہوگا لیکن مرتب یا مدیر نے شاید ان جملوں یا پیراگرافوں کو حذف کردیا ہے، جن کی تکرار رہی ہوگی۔ آج رباعی جس مقام پر ہے مجھے نہیں لگتا کہ اس کے فن سے لوگوں کو متعارف کرایا جائے ہاں اس کی بحث میں قدم

آگے بڑھاکر بات کرنا ممنوع نہیں۔ شیران اسماعیلی نے چار سوالات قائم کر کے مختلف معتبر رباعی گو شعرا سے جوابات حاصل کئے ہیں۔ یہ چار سوالات اس طرح ہیں۔

(۱) کہا جاتا ہے فن رباعی صرف اساتذہ کرام کا حصہ ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا یہ ایک تلخ سچائی ہے یا ؟

(۲) ایک مکمل رباعی میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں؟

(۳) کیا سبب ہے کہ جدید شعرا فن رباعی سے گریز کرتے ہیں؟

(۴) رباعی کے اوزان کے بارے میں استادوں میں اختلاف رائے ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ صحیح اوزان کیا ہیں؟

یہ سوالات اگر پچیس تیس سال قبل قائم کئے جاتے تو شاید مفید ثابت ہوتے۔ آج ان سوالات کی وہ اہمیت نہیں۔ جب ہر معتبر رسائل و جرائد میں رباعیاں مل ہی جاتی ہیں اور رباعی گویوں میں تینوں قسم کے (اساتذہ، جدید و نئی نسل) شعرا ہوتے ہیں 'اثبات و نفی' میں تو رباعیات کے لئے گوشہ ہی قائم ہے۔ پھر بھی چاروں سوالات کے چند جوابات سے کچھ خاص پہلو روشن ہوئے ہیں۔ اس نمبر کی ایک خاص بات یہ ہے کہ بہ حیثیت رباعی گو جتنے بھی شعرا شامل ہیں ان کے مختصر بایوڈاٹا بھی دئے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رباعی کے سلسلے میں یہ ایک اچھی کاوش ہے۔

غفران راغب، نئی دہلی

نام رسالہ :لمحے لمحے (قلم سیتھلی نمبر)

چیف ایڈیٹر : حسیب سوز۔ ایڈیٹر: خان فہیم

قیمت : ۲۵۰؍روپے

پتہ : سرائے جالندھری، بدایوں۔۲۴۳۶۰۱

'لمحے لمحے' (سہ ماہی) کا زیر نظر خصوصی شمارہ مرحوم قلم سیتھلی کو خان فہیم کا خراج عقیدت ہے۔ اس کی اشاعت سے سہ ماہی 'لمحے لمحے' کے خصوصی شماروں کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔

مرحوم قلم سیتھلی کے فن کو متعدد اہل قلم حضرات نے اپنے اپنے دائرے میں مختلف النوع طریقوں سے نقد و نظر کے آئینے میں پرکھا ہے، مثلاً قلم سیتھلی کی رباعی گوئی سے متعلق زار علامی، ناوک حمزہ پوری اور ڈاکٹر نجمی حسن کی تحریریں ہیں تو غزلیات کے فن پر پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کی۔ پروفیسر شاکر حسین نقوی نے خاکہ لکھ کر مرحوم کی قلمی تصویر کھینچ دی ہے تو پروفیسر زماں آزردہ نے قلم سیتھلی کی مدحیہ نظموں پر خیالات تحریر کئے ہیں۔ عشرت کرتپوری نے ان کی شخصیت کے بارے میں لکھا ہے تو مناظر عاشق ہرگانوی نے ان کی فکری بالیدگی پر توجہ مرکوز کی ہے۔ ڈاکٹر نجابت ادیب نے قلم سیتھلی کی شاعری میں پیکر تراشی کی طرف دھیان دیا ہے تو ویریندر پرشاد سکسینہ نے اردو ادب میں قلم سیتھلی کا مرتبہ متعین کرنے کی سعی کی ہے۔

اس خصوصی شمارے میں قلم سیتھلی کا ڈرامہ 'انجام محبت' بھی شائع کیا گیا ہے جس کے ساتھ ڈاکٹر کفایت طارق اور ڈاکٹر نثار کے تنقیدی مطالعے و جائزے بھی ہیں تاکہ 'انجام محبت' کی قدر و قیمت کا تعین کیا جا سکے۔

علاوہ ازیں قلم سیتھلی کے کلام کا انتخاب بھی شریک اشاعت ہے۔ امید ہے قلم سیتھلی کے حوالے سے "لمحے لمحے" (سہ ماہی) کا یہ شمارہ ایک دستاویزی حیثیت حاصل کرے گا۔ کتابت و طباعت اور جلد بندی کا معیار بھی اچھا ہے۔ سرورق رنگین ہے جس پر مرحوم قلم سیتھلی کی تصویر ہے۔

عادل اسیر دہلوی، دہلی

نام کتاب :بیسویں صدی کی اردو شاعری

انتخاب و ترتیب : اوصاف احمد

قیمت : ۳۰۰؍روپے

ناشر : انجمن ترقی اردو، اردو گھر

راؤز ایونیو، نئی دہلی۔۲

شعر و ادب کا انتخاب ایک ضرورت بھی ہے اور فیشن بھی۔ لیکن یہ فیشن اور ضرورت سدا بہار رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں اس طرح کے انتخابات کئے جاتے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی انتخاب پر مشتمل ہے۔ بلکہ یہ ایک پوری صدی بیسویں صدی کی شاعری کا انتخاب ہے، اس لئے زیادہ اہم ہے اور اس کا استقبال کیا جانا چاہئے۔

۷۷۸ صفحات کی اس کتاب میں خلیق انجم کی دو صفحے کی ایک تحریر اور مرتب کی آٹھ صفحے کی "کچھ اس کتاب کے بارے میں" شامل ہے۔ باقی ساری کتاب شاعری کے انتخاب پر مشتمل ہے جسے موٹے طور پر تین عناوین 'ایوان نظم، ایوان مزاح' اور 'ایوان غزل' کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ مرتب کی اپنی سمجھ ہے نے ایوان نظم اور ایوان غزل سے الگ ایک ایوان کے قیام کی ضرورت محسوس کی ورنہ یہاں قطعی ضرورت نہ تھی اور اسے انہیں دونوں ایوانو بآسانی رکھا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اس انتخاب کو " صدی کی اردو شاعری کا بھرپور انتخاب" کہا ہے کہ خود مرتب نے اپنے اس کام کو 'ایک مہم' سے کرتے ہوئے غالب کے الفاظ میں اس قسم کی کے لئے 'شوق فضول' اور 'جرأت رندانہ' کی ضرو احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔

یہ شوق فضول بھی ہو سکتا ہے اور ' رندانہ' بھی۔ آیئے کتاب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ نظم میں محمد حسین آزاد سے خود مرتب مو' اوصاف احمد تک ۹۵ شعرا کی نظمیں شامل ہیں۔ مزاح میں اکبر الہ آبادی سے امیر الاسلام ہاشمی ۱۵ شعرا شامل ہیں جب کہ ایوان غزل میں الطاف حالی سے رونق نعیم تک ۱۶۰ شعرا کی غزلیں شامل ہیں

میں یہاں اس سے بحث نہیں کروں گا کہ شعرا میں کتنے اچھے اور جنوین ہیں اور ان کی نظمو غزلوں میں کتنی اچھی ہیں اور کتنی بری۔ یہ انتخا معاملہ ہے اور یہ مرتب کے صوابدید پر اور اس تنقیدی شعور پر ہے کہ وہ کسے منتخب کرتا ہے۔ ظاہ کسی بھی انتخاب سے پوری طرح اتفاق کرنا مشکل ہر کسی کی پسند اور ناپسند اس کے اپنے ذوق پر ہوتی اور اس کا فائدہ مرتب کو ملتا ہے۔

لیکن مشمولات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ اس میں پوری صدی شعری ادب کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد عام پر آنے والی نسل کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ایک بات اور۔ یہاں ناموں کی ترتیب میں واضح اصول کو نہیں اپنایا گیا ہے، نہ سن کو نہ حروف کو۔ اس سے ایک بے ترتیبی اور انتشار کا احساس ہے۔ اشاریہ بھی غیر سائنسی طریقے پر ترتیب دیا ہے۔ پھر بھی اس ۷۷۸ صفحے کی کتاب میں جتنی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں وہ مرتب کی محنت شاقہ پر د ہیں۔ اس کے لئے ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

ابرار رحما

کہتی ہے خلقِ خدا

'آجکل' کے مارچ کے شمارے میں تمام [مشمولات] معیاری اور فکر انگیز ہیں، مگر سرورالہدیٰ کا [مضمون] 'شاد عظیم آبادی کو کیوں پڑھیں' خاص طور پر [پسند] آیا۔ سب سے خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے شاد [کے] متن پر اپنا دھیان مرکوز کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ [انہ]وں نے شاد کے اشعار کی تشریح اور تجزیہ میں بعض [نئے] پہلو ڈھونڈ نکالے ہیں، ان تجزیوں سے اختلاف تو [کیا ج]ا سکتا ہے مگر اس سے انکار مشکل ہے کہ انہوں نے [شاد] کو سمجھنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ ان کا یہ مطالعہ [اور ا]چھا ہو سکتا تھا اگر وہ اقبال اور انشا کے رنگ والی بحث [تف]صیل سے گفتگو کرتے، یہ پہلو تشنہ معلوم ہوتا ہے، [بہر]حال شاد پر مضمون شائع کر کے آپ نے اپنی ادبی [دیا]نتداری کا ثبوت پیش کیا ہے۔

اسرارالحق صدیقی، دربھنگہ

● شاد عظیم آبادی پر سرورالہدیٰ کا مضمون [ہ]م شاد کو کیوں پڑھیں' پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ایک [عر]صے کے بعد کسی اہم اردو کے رسالے میں شاد پر اتنا [اچ]ھا کوئی مضمون شائع ہوا ہے۔ اگر اس مضمون میں [س]رورالہدیٰ 'شاد عظیم آبادی کو کیوں پڑھیں' پر بھی [ا]ظہار خیال کرتے تو کچھ نئی باتیں سامنے آسکتی تھیں۔

عبدالجلیل، مدھوبنی

● شفیع مشہدی کا افسانہ 'سبکدوش' لاجواب [ا]فسانہ ہے۔ مٹتے ہوئے جاگیرداری نظام کی تصویر کشی تو [م]تعدد فنکاروں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں کی ہے [ل]یکن اس افسانے میں Pathos ہے وہ کہیں اور پڑھنے [م]یں نہیں آیا۔ بالخصوص جب افسانے کے آخر میں کمال احمد اپنی بیوی نجمہ سے کہتا ہے 'حویلی! ہاں...... حویلی میں نے منشی غلام رسول کے نام کر دی ہے' اس وقت خاندانی وقار اور عزت نفس کا بڑا انوکھا احساس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی فضا میں ایک عجیب سی اداسی چھا جاتی ہے۔ جو لوگ اس حویلی کو خریدنے کا منصوبہ بنا رہے تھے ان کے ماضی کی حقیقت کو جھٹلانے کے جذبے پر کمال احمد کے اس اقدام سے بڑھ کر طنز ممکن نہیں تھا۔ اگر یہ افسانہ کسی اور طرح ختم ہوا ہوتا تو اتنا گہرا تاثر نہ چھوڑتا۔

ریاض الرحمٰن شیروانی، علی گڑھ

● بلراج کومل صاحب نے بیسویں صدی کا اردو ناول جن غیر مبہم الفاظ و دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے ان سے صدی کے ناول کے بارے میں پوری واقفیت حاصل کرنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آتی۔ یہ مقالہ غیر ضروری طوالت سے آزاد ہے جو اس کی ایک سب سے بڑی خوبی ہے۔ ہم شاد عظیم آبادی کو اس لئے پڑھیں کہ بیشک انہوں نے غزل کی بہار کو خزاں کے پت جھڑ سے بچایا۔ سرورالہدیٰ صاحب نے اشعار کے حوالے سے شاد صاحب کی شاعرانہ عظمت کو اجاگر کیا ہے۔ جوگندرپال صاحب کا تخلیقی تجربہ خالی از معنی نہیں ہے۔ سوچنے پر ضرور مجبور کرتا ہے۔ مراٹھی دلت ادب کے نقوش پر انیس چشتی صاحب کا مختصر تحقیقی مقالہ دلت ادب کو منظر عام پر لانے کے لئے ایک اہم اور لازمی کوشش ہے۔ اس سے نہ صرف مراٹھی بلکہ پورے ہندوستان میں رہنے والے دلتوں کے ادب کو پرکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملے گا۔ 'قلم، قلم کار اور کتاب' کی آخری قسط پڑھ کر شیخ صاحب کی عرق ریزی کی داد دئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ہے۔ نقد و نظر جمع تنقید و تحقیق جمع اقوال بر مبنی شیخ صاحب کی یہ آخری قسط بھی ان کی مطالعاتی وسعتوں اور تحقیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے اگرچہ ان کی چاروں قسطوں میں مغربی ادبا کے ہی نظریے حاوی رہے مگر پھر بھی ادب کی اصلی روح کو اور جاننے میں کافی مدد ملی۔ کیونکہ ادب کی حدیں شاید متعین کی نہیں جا سکتیں۔

رویندر روی، نئی دہلی

● عبدالغنی شیخ کا جاری قسط وار مضمون 'قلم، قلم کار اور کتاب' بیحد معلوماتی، فکر انگیز اور دلچسپ ہے۔ اس قسم کے مضامین علم میں اضافہ تو کرتے ہی ہیں ساتھ ہی مختلف ممالک کے مختلف ادبا و شعرا کے جذبات، احساسات اور تصور حیات سے بھی متعارف کراتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین کے اعتبار سے 'آجکل' کی انفرادی شان دوبالا ہو گئی ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

جاوید انور، وارانسی

● جوگندرپال، شفیع مشہدی اور اقبال مہدی کے افسانوں کے پلاٹ میں کشش ہے۔ سبھی پسند آئے۔ خاص کر جوگندرپال کی کہانی 'نہیں رحمن بابو' چھوٹی سی کہانی ہے جس کی گہرائی میں بہت کچھ ہے۔ سرورالہدیٰ کا مضمون 'ہم شاد کو کیوں پڑھیں' میں ایک نیا نکتہ ہے۔ جس کو انہوں نے خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے شمس الرحمٰن فاروقی کی تقریر کے سوالات کا بہ خوبی جواب دیا ہے جس کو سراہا جا سکتا ہے۔

بلراج کومل کا مقالہ 'بیسویں صدی کا اردو ناول' پڑھا۔ یہ تحقیقی اور تنقیدی مضمون ہے جس نے واقعی متاثر کیا اور قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ یہ بلراج کومل کی تنقیدی صلاحیت کی غمازی کرتا ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے سبھی ناول نگاروں کا تذکرہ کیا اور ان پر کچھ تفصیلی روشنی بھی ڈالی جیسے عبدالحلیم شرر، نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا اور پریم چند۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ مضمون پریم چند کی خدمات کو ذہن میں رکھ کر لکھا گیا کیونکہ دیگر تمام حضرات، پریم چند کے ناولوں، ان کے کرداروں اور اس دور کے مسئلے مسائل پر کافی تفصیلی تحریر ہے۔ پریم چند کے بعد یعنی ۱۹۵۰ء کے آس پاس کچھ ایسے بھی ناول نگار گزرے ہیں جنہوں نے اس دور میں سماجی زندگی کے حقائق کو سنجیدگی سے اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان میں علی عباس حسینی، دیویندر ستیارتھی، اے حمید اور رضیہ سجاد ظہیر وغیرہ ہیں جنہوں نے اپنی تخلیقات سے ناول کی فنی سطح کو اس مقام پر پہنچانے کی سعی کی جہاں پر پریم چند نے پہنچا دیا تھا۔

اگرچہ علی عباس حسینی اردو افسانہ نگاری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں لیکن ان کے تین ناول 'سر سید احمد پاشا یا قاف کی پری' (۱۹۱۹ء) 'شاید کہ بہار آئی' (۱۹۵۴ء) اور 'زیتون کا بادشاہ یا حکیم بانا' (۱۹۵۵ء) بھی ہیں جو اپنے دور میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ علی عباس حسینی، امراؤ جان ادا کے خالق مرزا ہادی رسوا کے شاگرد رہ چکے تھے اور پریم چند کے ہمعصر۔

احمد عباس حسینی، نئی دہلی

● 'آجکل کی فائل سے' میں گھنشیام سیٹھی کے ذریعہ تحریر کردہ 'غواصی: دکن کا ملک الشعرا' سینچ کر رکھنے والی منظومات میں سے ہیں۔ سرورالہدیٰ کی معرفت شاد عظیم آبادی کے مرتبے کا اعادہ قابل دید ہے۔

تابش رحمٰن گیلانی

'قلم، قلم کار اور کتاب' کا مطالعہ کیا۔ کافی دلچسپ اور قابل تعریف مضمون ہے۔ محترم غنی صاحب نے بڑی محنت، لگن اور عرق ریزی کے ساتھ اس مضمون کو ترتیب دیا ہے جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مشتاق احمد تیلی، سوپور

● 'بیسویں صدی کا اردو ناول'، اور 'ہم شاد عظیم آبادی کو کیوں پڑھیں' 'جب نام ترا لیجئے' وغیرہ وغیرہ۔ نظمیں چنانچہ راستہ کیسا؟ مٹھی بھر نظمیں و غزل یہاں جنگل نہیں کوئی وغیرہ وغیرہ بہت پسند آئے۔ سرورق زندہ معیار کا حامل ہے ویسے تو ہر شمارہ کا سرورق اچھا ہوتا ہے نیز رسالہ ہر اعتبار سے اچھا اور قابل تعریف ہے۔

ڈاکٹر مصباح الدین ذوق، بوکارو تھرمل

● بلراج کومل کا مضمون 'بیسویں صدی کا اردو ناول' کافی معلوماتی ہے۔ سرور الہدیٰ نے اپنے مضمون کے ذریعہ شاد عظیم آبادی پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔ کہانیوں میں شفیع مشہدی کی 'سبکدوش' کرپال سنگھ کی 'بے رس موسم' جس کا ترجمہ کنور چند گپتا نے کیا ہے کافی اچھی لگی۔

منظر سلیمان، در بھنگہ

● تین مقالے کافی طویل ہیں، لیکن معیار واقدار کے لحاظ سے صرف بلراج کومل کا مقالہ ہی قابل تعریف ہے۔ سرور الہدیٰ کا مقالہ مقالے کے زمرے میں آنے کے قابل نہیں، اسے طویل مضمون کہیں تو درست ہوگا۔ اگرچہ انہوں نے شاد جیسی نابغۂ روزگار شاعر کی شاعری پر خامہ فرسائی کر کے ان کے شاعرانہ قد کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ اس میں ناکام رہے ہیں۔ عنوان کے ساتھ بھی بھائی سرور نے انصاف نہیں کیا ہے۔ باوجود ان خامیوں کے سرور بھائی کا مضمون اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہوں نے شاد پر گفتگو کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ عبدالغنی شیخ کا مقالہ بعنوان 'قلم، قلم کار اور کتاب' میں غالب سے متعلق یہ جملے کہ 'غالب کے ذہن میں جب ایک شعر بنتا تو وہ کمربند نما ایک لمبے کپڑے پر ایک گانٹھ لگاتا تھا۔ جوں جوں اشعار بنتے جاتے وہ گانٹھ لگاتا جاتا اور جب لکھنے پر آتا تو گانٹھ کھولتا جاتا اور اشعار لکھتا جاتا تھا۔ یہ کس قدر لائق تحقیق ہے یہ بات تو جناب عبدالغنی شیخ کو ہی معلوم ہوگی۔ خدا جانے انہوں نے غالب سے متعلق یہ بات کہاں پڑھ لی ہے۔ حصہ نظم میں کرشن موہن کی نظم 'ٹیگور اور پکاسو' کو نظم کہنا تو دور کی بات ہے، اثر میں ڈوبی نثر بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ جعفر رضا، خالد

لگیں۔ جناب شفیع مشہدی کی کہانی بھی اچھی ہے۔

اعجاز احمد عادل، ویشالی

● شاد واقعی اردو غزل کے ایک اہم شاعر تھے اور ان سے متعلق باتیں بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں۔ شاد کی جس طرح پذیرائی ہونی چاہئے تھی نہ ہو پائی، نہ زندگی میں اور نہ ہی مرنے کے بعد بھی۔ سرور الہدیٰ نے شاد پر قلم اٹھا کر دانشور طبقہ کو شاد کی طرف متوجہ کرنے کی جو سعی مستحسن کی ہے، وہ بلاشبہ اہم ہے، لیکن اس مضمون کو پڑھتے وقت جگہ جگہ تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ شفیع مشہدی کا افسانہ معیاری ہے۔ کرشن موہن، مظفر حنفی، قیصر شمیم، خالد عبادی اور جعفر رضا کی غزلیں اچھی ہیں۔

ظفر انصاری ظفر، نئی دہلی

● 'آجکل کی فائل سے' کے ضمن میں میں بھی نئی دہلی کے رام پرکاش کپور صاحب سے اتفاق کرتا ہوں۔ اگر آپ پورا شمارہ ہی پرانے شماروں سے لے کر Repeat کرنے لگیں تو بہتر رہے گا اور آپ زحمت سے بھی بچ جائیں گے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہر جریدہ ماہ بہ ماہ خوب سے خوب تر ہونے کے بجائے سمت مخالف میں جارہا ہے۔ اردو ناول کی تاریخ کی کوئی بھی عامیانہ کتاب سامنے رکھ کر بلراج کومل جی کا 'گھسیٹا' گیا بے جان مضمون ہے۔ البتہ سرور الہدیٰ نے اپنے مقالہ میں شاد عظیم آبادی کے کلام کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ جوگندر پال نے اپنے نام کی شہرت کا فائدہ اٹھا کر یہ نئی کہانی شائع کرالی۔ ورنہ اگر یہ کسی غیر معروف ادیب کی ہوتی تو نذر آتش ہی ہوتی۔ 'جب نام ترا......' پڑھ کر معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ اردو افسانہ نگاری میں کوئی انور خاں بھی تھے۔ 'مراٹھی دلت ادب کے نقوش' پڑھ کر یہ بات پکی ہوگئی کہ جو کہیں شائع نہ ہو سکے 'آجکل' میں ہو جاتا ہے۔ عبدالغنی شیخ کے قلم میں بہت روانی ہے اور اس روانی میں وہ نہیں سوچتے کہ کس پر کیا تہمت تراش رہے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بارے میں جو باتیں لکھی گئی ہیں وہ نامناسب اور غیر مصدقہ ہیں۔ آٹھ قیمتی صفحات 'آجکل' کے ضائع ہوگئے مگر اطمینان کی بات یہ رہی کہ شیخ صاحب کی کتھا کے آخر میں 'جاری' دیکھنے کو نہیں ملا۔ غزلیات میں مظفر حنفی، خالد عبادی پسند آئے۔ شفیع مشہدی کا افسانہ 'سبکدوش' دل کو چھو لیتا ہے اور اچھا افسانہ ہے۔ اقبال مہدی کی کاوش بھی اچھی ہے۔ کردیال سنگھ کے افسانے ہمیشہ ہی اچھے ہوتے ہیں۔ شناسا نام سردار صاحب کا ہی لگا

مشہدی جو آجکل میں شریک ہوتے رہے گم ہو گئے۔ اب تو وہ مواد Matter آجکل ہے جو کہیں شائع نہیں ہو سکتا۔

سید ماجد رضا

● میرا طویل مقالہ 'قلم، قلم کار اور کتاب' نے پسند کیا ہے۔ کئی قارئین نے مجھے وادی کشمیر کے ایک قلم کار جناب حسن ساہو صورت میں شائع کرنے کی تجویز کی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ پبلی کیشنز ڈویژن نے مقالے شائع کرنے کے لئے انتخاب کیا ہے۔

مقالہ ہٰذا اور اضافی مواد میرے تسم کی یاد داشتوں کی دین ہے۔ میں موضوع موضوعات سے متعلق وقتاً فوقتاً نوٹ کرتا 'آجکل' کے مارچ کے شمارے میں حیدر آ قاری ڈاکٹر م۔ ق سلیم صاحب نے مو مودودی کے اس قول سے متعلق 'میری مرنے کے بعد میرا بس چلے تو اپنی قبر میں کتابیں رکھوں تاکہ میں انہیں پڑھا کروں گا کیا ہے۔

بہت سال پہلے مولانا ابوالاعلیٰ مودود کے بعد پاکستان میں مولانا سے متعلق ایک اجرا ہوا تھا جسے دہلی میں (غالباً جماعت اسلا شعبہ اشاعت) نے دوبارہ شائع کیا تھا۔ میں لیا تھا۔ اسی جریدے میں مولانا سے یہ قول منس ہے۔ کسی نے یہ نمبر مجھ سے لے کر واپس نہیں ان کا قول دوسرے مقولات کے ساتھ میرے ہیں۔ میرے خیال میں یہ خصوصی نمبر بھتوا ہونا چاہئے۔

میری دانست میں مولانا کے بیان میں نہیں ہے۔ علم کی فضیلت پر قرآن مجید کی کئی علاوہ متعدد احادیث ہیں۔ کتاب حصول علم کا امر بھی ملحوظ رہے کہ مولانا نے صالح ادب اور پر لکھا ہے اور مغرب الاخلاق کتابوں سے اجتناب ہدایت دی ہے۔ ایک حدیث ہے 'مہد سے لے علم حاصل کرو' اگر مرنے کے بعد لحد میں بھی ان کی نیک خواہش کا اظہار کرے تو اس میں کوئی منع نہیں آتا۔

عبدالغنی شیخ

نہ بولے راستی کوئی عمر سب جھوٹ میں کھوئی
اتاری شرم کی لوئی عجب یہ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی چہ بیگانہ چہ زن گھر کی
بھلادی بات سب ہر کی عجب یہ دور آیا ہے

یہ انداز ایسا سیدھا سادہ غمگین اور سنجیدہ تھا کہ ان کی بات بقول نواب نصیر حسین خاں خیال ہونٹوں نکلی اور کوٹھوں چڑھی۔

میو دتاسی کا خیال ہے کہ میر جعفر نے ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) کے بعد وفات پائی۔ جعفر نے خود جو ماحول دیکھا تھا اب اس کا ٹھاٹھ باٹھ خواب و خیال ہو رہا تھا اسے یاد کرتے ہیں تو کس درد مندی سے کہتے ہیں۔

اب ہابا روں پیا پڑوں لیہوں بلیاں
لنڈوں میں نہ مل بیٹھ پکڑ بہار جو ہے
وہ ذوق ہر دم کا کہاں وہ عطر بیگم کا کہاں
درخاک شد آں کرو فر کہ جعفر اب کیسے بنے

حکومت کا خزانہ فوجی مہمات پر ختم ہو چکا ہے۔ فوجی کی تنخواہیں ادا کرنے کے لئے سلطنت کو امرا سے روپیہ قرض بھی نہیں مل سکتا، امرا اپنی جگہ خوف زدہ اور غم دیدہ ہیں عوام سخت پریشان اور فوجی بغاوت پر آمادہ ہیں۔ دربار کے لئے یہ عقدہ اب لاینحل ہو چلا ہے۔ میر جعفر اس بے کاری کا حال بیان کرتے ہیں تو زمانے کی سماجی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

بشنو بیان نوکری جب گانٹھ ہوتی کھوکری
تب بھول جاوے چوکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
مردم پشیمان یک دگر کشتہ سپاہی در بدر
خوردہ بسے خون جگر یہ نوکری کا خبط ہے
دھنیا جو لایا طاق ہے کنجڑا تھائی چاک ہے
دیوس قرم ساق ہے یہ نوکری کا خبط ہے
ہر صبح ڈھونڈیں چاکری کوئی نہ پوچھے بات ری
سب قوم ڈھودیں لاکڑی یہ نوکری کا خبط ہے
دن بیں مجرے میں کٹے دن بیں غشی نے لئے
دن بیں جھگڑے میں کٹے یہ نوکری کا خبط ہے
کیسے رہیں ایمان سے عاجز ہمیشہ نان سے
بیزار ہیں مہمان سے یہ نوکری کا خبط ہے
جعفر خدا کو یاد کر غمگین دل کو شاد کر
یہ گفتگو برباد کر یہ نوکری کا خبط ہے

فوج کی حالت کا ہو بہو نقشہ ذیل کے بندوں میں بیان کر دیا ہے جو حقیقت حال پر مشتمل ہے۔

جب دوڑ کو سب اٹھ چلے سوار بیٹھے یوں کہے
ٹٹو بچارا نہ ہلے یہ نوکری کا خبط ہے
امرا ہیں سب بے خبر احدی بے چاری بے دقر
اسوار باجی سے تبر یہ نوکری کا خبط ہے
صاحب عجب بے داد ہے محنت ہمہ برباد ہے
اے دوستاں فریاد ہے یہ نوکری کا خبط ہے
ہم نام کو اسوار ہیں روزگار سے بیکار ہیں
یارو ہمیشہ خوار ہیں یہ نوکری کا خبط ہے
دم خیر ہو گھوڑا رہا یہ دکھ بے چارا سہہ گیا
پیشاب کر کے سو رہا یہ نوکری کا خبط ہے
دیکھو مہاجن کا جیا جن سود کا لالچ کیا
بے قرض پوتا ہے دیا یہ نوکری کا خبط ہے
دربار دیکھا خان کا بیڑا نہ پایا پان کا
توکا نہ پایا نان کا یہ نوکری کا خبط ہے

اپنی نئی تصنیف پر خود تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مسلمان ہندو سہاگن چہ رانڈ   عزیزش بدارند چوں کھیر و کھانڈ
اگرچہ ہمہ کوڑا و کرکٹ است   بہندی روندی زبان لٹ پٹ است
ولیکن کسی نے بھلی یہ کہی جسے پیو چاہے سہاگن وہی
بتاریخ اثنا عشر نی سنہ لط مدو مہر شد ایں زٹلی نامہ قط

زندگی کی یہ زندہ بدبختیاں تھیں جن پر جعفر زٹلی نے دھول ڈالنے کی جگہ ان کو ذرا پاس لے جا کر دیکھا۔ اس عہد کا بہروپیا پن ظاہری دینداری اور نہایت پست دنیا داری جب جعفر کے سامنے عریاں ہوئی تو اس نے اس سے آنکھیں چرانے کی جگہ اس پر خوب خوب قہقہے لگائے اور اس کے قہقہے مغلوں کے در و دیوار سے ٹکرا کر اور بھی پر شور اور پر رعب ہو گئے۔

اپنے عہد کی یہ تاویل انہوں نے کس طرح پیش کی ہے:

اینٹیں پرانی ہو گئیں مائی نمائی گھس چلی   کیا دوش ہے معمار کو کہ جعفر اب کیا کیجئے
آئی امنڈ دھول گھٹائیں میں رہا کپڑا پھٹا   چلتا بڑے بازار کا کہ جعفر اب کیا کیجئے

یہ تھا مغل شہنشاہ کا وہ ماہی اور ہوا خواہ جس نے تعریف میں تضحیک اور تضحیک میں حقیقت بیان کرنے کی کوشش کی اور جیسے تیسے آخر تک اپنی تصورات سے چمٹا رہا مگر ان کی گراوٹ کو بھی دیکھا اور آپ ہی آپ ہنسا لیا۔ اس کی ہنسی صرف ایک بھرپور طنز ہے اور بس۔ اس نے ہمدردی کی ہمت نہیں کی۔ حقیقت کو مکمل طور پر نہیں لیا اور اس کے متعلقات کو صحیح طور سے نہیں سمجھا لیکن اس کی یہ خصوصیت نہایت اہم ہے کہ اس نے اپنی تردید آپ کی ہے اور اپنے عہد کے تضاد کو شدت تاثر سے بیان کر دیا ہے۔

☆☆☆

آجکل کی فائل سے
ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عرش ملسیانی
جلد: ۱۳ نمبر: ۱۰ مئی ۱۹۵۵

ہماری اردو مطبوعات

آجکل اور غبار کارواں	ادارہ	170/=
آجکل کی کہانیاں	ادارہ	162/=
آجکل اور سفر نامہ	ادارہ	105/=
آجکل اور صحافت	ادارہ	115/=
آجکل کے ڈرامے	ادارہ	125/=
آجکل کے مضامین	ادارہ	112/=
آجکل اور اقبال	ادارہ	95/=
آجکل اور طنز و مزاح	ادارہ	112/=
اردو ادب کے پچاس سال	ادارہ	95/=
اٹھارہ سو ستاون	سریندر ناتھ سین/خورشیدہ پروین	556/=
کلاسیکی موسیقار	مترجم: خورشید اکرم	137/=
عوام الناس کے لیے گائڈ	مترجم: عادل صدیقی	145/=
مہاتما گاندھی	آچاریہ کرپلانی/لکشمی چندر یاس	300/=
مہاتما بدھ کی حکایتیں	پال کاروس/مسعود فاروقی	155/=
شہیدوں کے خطوط	ادارہ	110/=
قلی قطب شاہ	نریندر لوتھر/زبیر رضوی	280/=
سفینۂ غالب	ادارہ	95/=
آئینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	75/=
گنجینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	60/=
یادیں مجاہدین آزادی کی	نوین جوشی/راحت جبیں	120/=
غالب بہ صد انداز	تشکیل: برجندر سیال	1000/=
پہیلیاں-امیر خسرو	مرتب شہباز حسین، نند کشور وکرم	22/=
کاغذی ہے پیرہن	عصمت چغتائی	65/=
کشمیر کی لوک کتھائیں	جے-این-کمر	45/=
ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر	ڈاکٹر محمد عمر	127/=
راگ راگنیوں کی تصویریں	شکیل الرحمٰن	325/=
ہند اسلامی طرز تعمیر	ضیاء الدین ڈیسائی/اختر الواسع	54/=
ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز	ضیاء الدین ڈیسائی/بہار برنی	54/=
ہماری تہذیبی وراثت	راجندر پرشاد، بی این پانڈے	50/=

ہندوستان کے عظیم موسیقار	شبھوناتھ مشرا/رئیس مرزا
سروجنی نائیڈو	تارا علی بیگ/لکشمی چندر یاس
حکیم اجمل خاں	ظفر احمد نظامی
سردار ولبھ بھائی پٹیل	آئی جے پٹیل/یعقوب بہادر
مختار احمد انصاری	مشیر الحسن/فرحت احساس
رفیع احمد قدوائی	ڈاکٹر ہاشم قدوائی
سرسید احمد خاں	خلیق احمد نظامی/اصغر عباس
حسرت موہانی	ڈاکٹر خلیق انجم
مولانا آزاد (طبع دوم)	عرش ملسیانی
بدرالدین طیب جی	اے جی نورانی/راجندر انجم
مظہر الحق	قیام الدین احمد، جٹا شنکر جھا مترجم: رضوان احمد
رابندر ناتھ ٹیگور	ہرن مے بنرجی/اشہر ہاشمی
جواہر لال نہرو	ایم چلاپتی راؤ/کے پی شرما
مشعل آزادی	ساغر نظامی
رامائن—بچوں کے لئے	مترجم: ساوتری
دنیا کی منتخب لوک کہانیاں	ادارہ
دھنواں راجہ	مترجم: وشوناتھ سنگھ
ہیرے کی لونگ	ادارہ
امر شہید گنیش شنکر ودیارتھی	مالتی شنکر
بھارت خلائی دور میں	موہن سندر راجن
ہم ایک ہیں	عرش ملسیانی
پھولوں کی وادی	رفعت سروش
روشنی کے مینار	مرتب: شہباز حسین
جاتک کتھائیں	مترجم: راجندر انجم
ہندوستان کی مسجدیں	ضیاء الدین ڈیسائی
ہندوستان کے دریا	شیخ سلیم احمد
پنجاب اور کلو کی کہانیاں	مترجم: آمنہ ابو الحسن
وقت کا مسافر	غلام حیدر
دادی ماں کی کہانیاں	مولف: مخمور سعیدی

نوٹ: کتابیں اور رسالے منگوانے کے لئے رقم پیشگی ارسال کریں۔
کتابیں کسی بھی صورت میں وی پی سے نہیں بھیجی جائیں گی۔
ملنے کا پتہ: بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی د

Printed and Published by **P.S. Bhatnagar,** Director, Publications Division
Printed at Aravali Printers & Publishers (P) Ltd. W-30 Okhla Industrial Area, Phase-II, New Delhi-20
Published at Publications Division, Patiala House, New Delhi-110 001 Editor: **M.R. Farooqi**